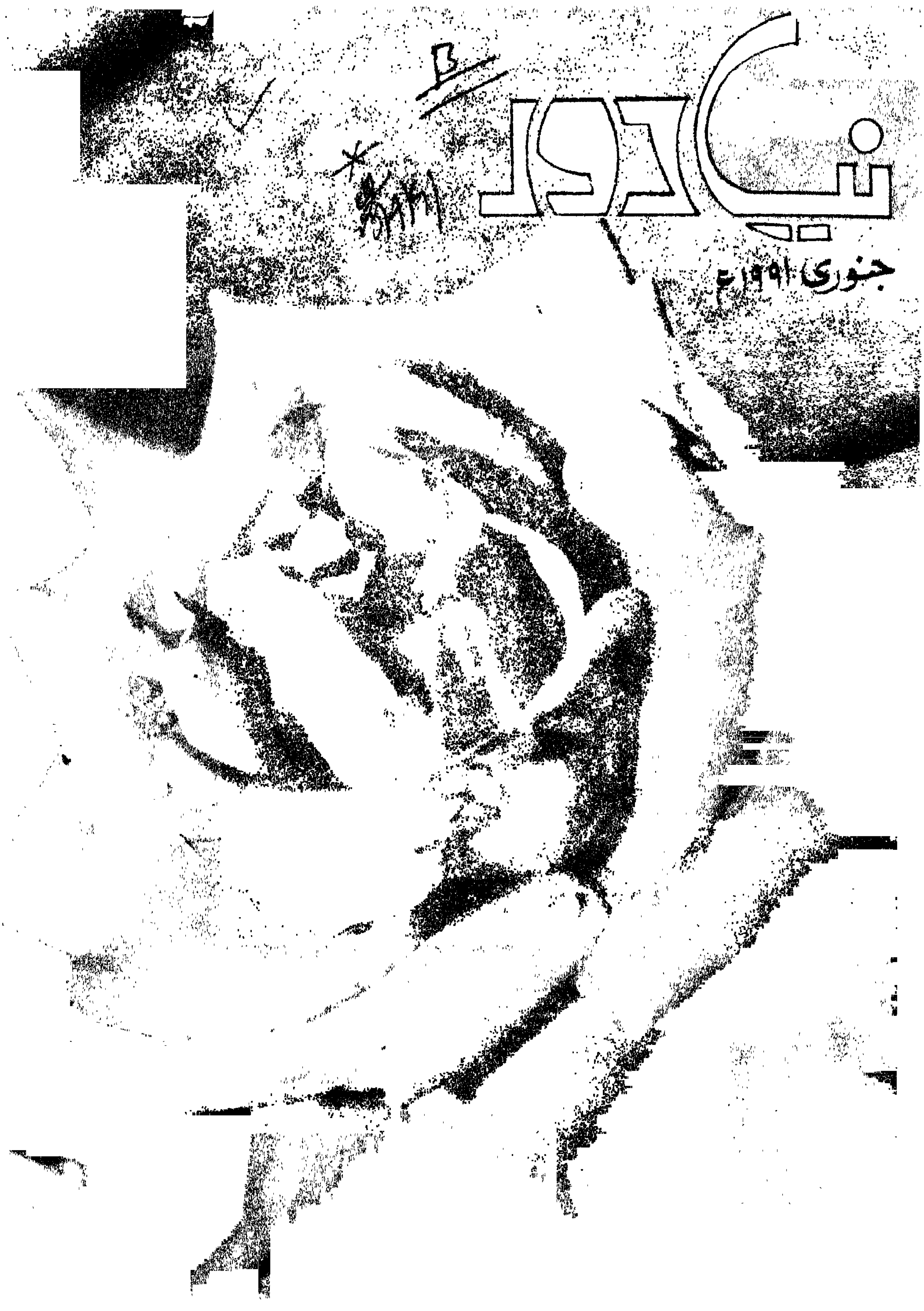
DUE DATE

Cl. No. ____________ *Acc. No.* 123177

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1/- per day, Over night book Re. 1/- per day.

نیا دور

جنوری ۱۹۹۱ء





گزشتہ دنوں رڑکی یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر گوپال سروپ پاٹھک [illegible]
کے چانسلر اور اتر پردیش کے گورنر شری بی. گوپال ریڈی سے ڈاکٹر [illegible] کی ڈگری [illegible]
یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر [illegible]

ایڈیٹر
شاہ نواز قریشی
ٹیلیفون : ــــ ۲۲۴۱۰۸

پبلشر
شیلیش کرشن
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش)

انتظامی و ادارتی معاونین
محمد الیاس خاں۔ نجیب انصاری

مطبوعہ
یونائٹیڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ
ــــ شائع کردہ ــــ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش

فی شمارہ : ــــ ایک روپیہ
زرِ سالانہ : ــــ دس روپئے

ــــ ترسیلِ زر کا پتہ ــــ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

ــــ خط و کتابت کا پتہ ــــ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

ــــ بذریعہ رجسٹری ــــ
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
یو پی۔ لکھنؤ

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومتِ اترپردیش اُن سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

ہندستان ایک ایسا ملک ہے، جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے، مختلف تہذیبوں کے لوگ اور مختلف زبانیں بولنے والے بستے ہیں، اور یہ سارے لوگ اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے سلسلے میں ایک دوسرے پر منحصر بھی ہیں۔ تجارت ہو یا کہ زندگی کے دیگر امور، یہ سارے لوگ ہر معاملے میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ روزمرہ کی ضرورتوں سے متعلق بعض کام ایسے ہیں جو کسی ایک مخصوص فرقے کے لوگ ہی کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ لوگوں کی تمام ضرورتیں ان کے ہم مذہب افراد سے ہی پوری ہوسکیں یعنی کوئی اگر یہ سوچ لے کہ ہم اپنے سارے کام اپنے فرقے کے لوگوں سے ہی کرائیں گے تو عملی طور پر یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عملی طور پر فرقہ پرستی ممکن ہی نہیں ہوتی۔ بعض فرقوں کی کچھ مخصوص ذاتیں اپنے تجارتی پیشے سے پہچانی جاتی ہیں اور تمام فرقوں، تمام ذاتوں کے لوگ اپنی متعلقہ ضرورت کی تکمیل کے سلسلے میں ان مخصوص فرقوں اور مخصوص ذاتوں کے لوگوں پر منحصر نظر آتے ہیں۔ خاص طور سے ہمارے معاشرے میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کسی فرقے کے تاجر اپنی اشیا، اپنا سامان صرف اپنے ہی فرقے کے لوگوں میں فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیں، یا کوئی یہ طے کرے کہ ہم ہر شے اپنے ہی فرقے کے لوگوں سے خریدیں گے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ اس طرح روزمرہ کی عملی زندگی میں فرقہ پرست ہو کر رہ پانا ممکن نظر نہیں آتا۔

لیکن جب افواہیں پھیلا کر کشیدگی کا ماحول پیدا کر دیا جاتا ہے تب لوگ ضرور ایک دوسرے سے بدگمان نظر آنے لگتے ہیں، یہی نہیں ایک دوسرے سے خوفزدہ بھی نظر آنے لگتے ہیں، اور جب یہی بدگمانی اور خوف حد سے زیادہ ہو جاتا ہے تو منافرت اور پھر تشدد کا بازار گرم ہو اٹھتا ہے۔ اس طرح کی صورت حال اور اس طرح کے واقعات کو برا سب کہتے ہیں۔ ان کے خلاف بڑے بڑے جلسے اور سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں، جن میں بڑی دانش ورانہ تقریریں ہوتی ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک بڑے ہی خوبصورت ہال میں منعقدہ ایک سیمینار میں شریک ہونے کا ہمیں بھی موقع ملا۔ جس میں ایک دانشور نے یہ بحث چھیڑ دی کہ فرقہ پرستی کیا ہے، سیکولرازم کیا ہے؟ ان کی تعریف متعین ہونا چاہیے — یعنی جب کئی مقامات پر تشدد اور تصادم کے شعلے بھڑک رہے تھے، تو ہمارے دانشور فرقہ پرستی اور سیکولرازم پر عالمانہ بحث میں مصروف تھے۔ (سیمینار کے اختتام کے بعد حاضرین کی تواضع کافی سے کی گئی، جس میں فرقہ پرستی کا سارا مسئلہ حل ہو گیا) جلسوں اور سیمیناروں کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے، مگر جب آگ لگی ہو تو آگ پر بحث نہیں کی جاتی، آگ کی تعریف نہیں بیان کی جاتی، بلکہ تمام لوگ آگ بجھانے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ ایک بار کسی نے فساد کے زمانے میں گاندھی جی سے اکثریتی اور اقلیتی فرقوں کے ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد جاننی چاہی تو انھوں نے کہا — "مجھے یہ مت بتاؤ بلکہ یہ بتاؤ کہ کتنے ہندو مسلمانوں کو بچاتے ہوئے اور کتنے مسلمان ہندوؤں کو بچاتے ہوئے مارے گئے؟" — اب بھی صورت حال یہی ہے کہ تقریریں تو بہت ہو رہی ہیں، اخباروں میں بیانات اور اپیلیں خوب شائع ہوئی ہیں۔ مگر تقریریں کرنے والے، بیان دینے والے اور اپیلیں کرنے والے لوگ عملی طور سے سامنے نہیں آتے، کسی کو بچانے کے سلسلے میں اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالتے۔ اس سلسلے میں اسی جذبے کی ضرورت ہے جس کے تحت بے خطر کود پڑے آتشِ نمرود میں عشق" تشدد اور تصادم کے ماحول میں بھی انسانیت بہرحال زندہ رہتی ہے اور مختلف فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کو بچاتے بھی ہیں۔ مگر وہ لوگ بڑے غیر معروف اور گمنام سے ہوتے ہیں۔ وہ تقریریں نہیں کرتے، اخباروں میں بیان اور اپیلیں نہیں شائع کراتے بس اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ایک دوسرے کو بچاتے ہیں۔

ایڈیٹر

ڈاکٹر عابد پیشاوری
شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی
جموں

شاملِ نصاب

کلاسیکی متون کی تدوین

اب سے پہلے تدریس کی غرض سے کلاسیکی متون کی تدوین کا نہ کوئی مسئلہ تھا نہ ضرورت، اس لیے کہ قدیم متون کے پڑھانے والے اساتذہ کی کمی نہیں تھی لیکن آج ان سالوں میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اُردو پر نظر دوڑائیے تو تدریسِ متن کے اساتذہ خال خال ہی نظر آئیں گے۔ سبب؟ پرانی پود کے وہ اساتذہ جو عربی، فارسی سے کماحقہ واقف تھے ریٹائر ہوگئے یا مرکھپ گئے۔ اسکولوں، کالجوں میں فارسی کی تدریس نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے اور جہاں فارسی کی تدریس ہوتی ہے وہاں بھی انتظام خاطر خواہ نہیں ہے۔

آزادی اپنے ساتھ بہت سی برکتیں لے کر آئی لیکن اس کے ساتھ تقسیم ملک کا شاخسانہ بھی لگا ہوا تھا۔ اگرچہ ہر شعبے اور ہر میدان میں ترقی کے امکانات پیدا ہوئے لیکن یہ ترقی اتفاقاً ہوئی، مقصوداً نہیں۔ ملک بانٹنے والے تو صاف نکل گئے۔ تقسیمِ وطن کا سارا الزام بے چاری اُردو پر آیا اور اب اُردو نصاب کا لازمی جز نہیں تھی بلکہ اب ہر اُردو پڑھنے والا قربانی کے جذبے سے اُردو پڑھتا تھا اور آپ جانیں یہ دور بے لوث قربانیوں کا نہیں۔ وفا کرنے والے صلہ چاہتے ہیں۔ چنانچہ اُردو اساتذہ اور طلبا کے درمیان بے طلب، غائبانہ اور از خود ایک سمجھوتہ ہو گیا کہ کوئی اُردو پڑھنے والا امتحان میں فیل نہ ہو۔ مگر اُردو پڑھنے والے امتحانوں میں فیل ہوں گے تو والدین اپنے بچوں کو اُردو کیوں پڑھائیں گے۔ اُردو کی اس خاموش بہی خواہی نے اس کی تباہی کی بنیاد رکھ دی۔ اب ہمارے یہاں پڑھے لکھے کے بجائے سند یافتہ طبقہ پیدا ہونے لگا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی سند یافتہ طبقہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں در آیا اور اب مملکتِ تعلیم پر انہیں دراندازوں کا قبضہ ہے جو کتاب خواں بھی نہیں۔ ذرا سوچیے جب اُستاد خود کتاب نہیں پڑھ سکتا وہ پڑھائے گا کیا؟ شاعر نے بہت پہلے کہا تھا ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

اب یہ "خواہد شد" "شدہ است" میں بدل چکا ہے اور اسی لیے شاملِ نصاب متون کی تدوین کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

تدوینِ متن تحقیقِ ادب کی سب سے مشکل شاخ ہے۔ اُردو کے قدیم شعری اور نثری ادب کا ایک سرسری جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اب تک جو شعری یا نثری متون مرتب ہو کر سامنے آئے ہیں ان میں بیشتر غیر معیاری ہیں اور جنہیں معیاری سمجھا جاتا ہے ان میں بھی کئی جگہ جائے حرف ہے۔ تدوینِ متن کا باقاعدہ آغاز عہدِ سرسید کو سمجھنا چاہیے۔ غالباً تدوینِ متن کا پہلا نمونہ آئینِ اکبری ہے۔ اس روایت کو حافظ محمود شیرانی نے آگے بڑھایا۔ ان کے کارناموں میں نصاب الصبیان یا خالق باری اور مجموعۂ نغز شامل ہیں۔ گویا شیرانی صاحب نے نظم و نثر ہر دو طرح کے متنوں کو مرتب کرنے کی مثال پیش کی۔ شیرانی صاحب کی روایت پر اضافہ کیا مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے۔ دیوانِ غالب، مکاتیبِ غالب اور فائقہ دستور الفصاحت سے توضیحی اور تفصیلی حاشیہ نگاری کی بنیاد پڑی۔ اگرچہ ہمارے ذہن کے

سب سے بڑے محقق قاضی عبدالودود نے بھی کچھ متن مرتب کیے۔ لیکن ان میں وہ نظم و ضبط نظر نہیں آتا جس کی قاضی صاحب سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی۔ بہرحال ان سب بزرگوں کے مرتبہ متون ترتیبِ متن کے عام مروجہ اصولوں کے تحت مرتب ہوئے ہیں لیکن فی زمانہ نصابی ضرورتوں کے تحت مرتب ہونے والے متون اس طریقِ کار میں ترمیم و اضافے کے متقاضی ہیں۔ مثلاً طلباء کو مفصل اختلافِ نسخ یا تمام تر مخطوطات کے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں لیکن بہت سی ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جنھیں عام طور پر تدوینِ متن کا جز نہیں سمجھا جاتا۔ اب سے پہلے اعراب نگاری تدوینِ متن کا لازمی جز نہیں تھی۔ توقیف نگاری (پنکچوئیشن) کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ حواشی کی نوعیت بھی بالکل مختلف ہوتی تھی لیکن نصابی غرض سے مرتب کیے جانے والے متون میں سب سے زیادہ زور انھیں باتوں پر دینا ہوگا۔

آج عموماً طلباء فارسی سے ناواقف ہیں۔ ان کے لیے ہر ہر لفظ کا تلفظ ایک مسئلہ ہے۔ چنانچہ نصابی متون میں مرکبِ اضافی و توصیفی میں اضافت کا زیر ضرور لگایا جائے گا۔ اسی طرح حسبِ ضرورت تشدید کو ضرور لکھا جائے گا، تاکہ طالب علم ایسے مقامات کو صحیح طور پر پڑھ سکے اعراب یعنی زبر، زیر، پیش حسبِ ضرورت لازماً لگائے جائیں گے آج سے پہلے مفصل فرہنگ کو ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ الا ماشاءاللہ لیکن آج کا طالب علم (بلکہ استاد بھی) نہ فارسی جانتا ہے نہ عربی لہٰذا عربی، فارسی کے مشکل الفاظ کے علاوہ عربی کے ٹکڑے، احادیث و آیات، سب کو فرہنگ میں شامل کیا جائے گا، اور مناسب حدود میں ان کی توضیح و تشریح کی جائے گی۔ فارسی اشعار کی شرح بھی لازمی ہوگی۔

صحیح خواندگی کے لیے توقیف نگاری انتہائی اہمیت کی حامل ہے پہلے تو خیر پنکچوئیشن کا تصور ہی نہیں تھا۔ اب انگریزی میں موجود علامات مثلاً کاما، فل اسٹاپ، سیمی کولن، انورٹیڈ کاما، بریکٹ وغیرہ کے علاوہ اگر ضرورت پڑے تو مزید علامات بھی وضع کرنا ہوں گی۔ غنہ کے لیے بھی یکانگی سے علامت کا استعمال ضروری ہوگا۔ جان گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کے لیے اعراب و علامات کا ایک مکمل نظام وضع کیا تھا مناسب ترمیم و اضافے کے ساتھ اس کو نصابی متون کی تدوین کے لیے اپنایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ضروری تنقیدی مباحث کو بھی شاملِ مقدمہ کرنا ہوگا تاکہ طلباء اور اساتذہ کی مناسب رہنمائی ہو سکے۔ اگرچہ یہ تدوینِ متن کا حصہ نہیں ہے اور یہ بھی درست ہے کہ تنقید و تدوین کے نہ صرف تقاضے مختلف ہیں بلکہ دونوں کے لیے مختلف مزاج کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اب مرتبینِ متن کو اس پر بھی توجہ دینی ہوگی۔ اور یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں ہے۔

اب سے پہلے نصابی تقاضوں کے تحت ترتیبِ متن کی ضرورت کو کسی نے محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ اب خوش قسمتی سے جناب رشید حسن خاں نے اس طرف توجہ دی ہے اور فسانۂ عجائب کو مرتب کر کے پیش کر دیا ہے جو حال ہی میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ اس کام کو دیکھ کر اکثر حضرات کہیں گے کہ یہ مثال قابلِ عمل نہیں ہے۔ یعنی یہ طریقہ بہت دیر طلب اور دقت طلب ہے، اگر ایک ایک متن کی تدوین پر کئی کئی سال صرف کیے جائیں گے تو ہماری نصابی ضرورتیں تاقیامت پوری نہیں ہو سکتیں۔ ہماری گزارش یہ ہوگی کہ یا تو آپ مناسب ترمیم و تنسیخ کے ساتھ اس مثال کو نمونہ بنا کر نصاب کے لیے کلاسیکی متون کو مرتب کروائیں ورنہ نصابوں سے کلاسیکی ادب کو خارج کر دیں اور زبان و ادب کے یک رُخے اور ناقص طلباء پیدا کریں (اور بہ ظاہر یہی مقدر لگتا ہے) اگر یہ منظور نہیں تو مل کر کام کر نا سیکھیں۔ منصوبے بنائیں اور اس فن کے موجودہ عالموں سے نصابی متون مرتب کروالیں کیوں کہ کچھ مدت بعد یہ کام ناممکن ہو جائے گا۔

آیئے اب رشید حسن خاں کے مرتبہ متن کو دیکھیں اور اس میں مناسب ترمیم و اضافے کے حدود پر غور کریں۔ فسانۂ عجائب کے مذکورہ ایڈیشن میں متن کے علاوہ مبسوط مقدمہ (ص ۱۵-۱۱۴) فرہنگ اور سات ضمیمے شامل ہیں۔ ضمیموں کی تفصیل مرتب کے الفاظ میں اس طرح ہے:

(۱) پہلا ضمیمہ ان نثروں پر مشتمل ہے جو سرور نے مختلف اشاعتوں کے آخر میں لکھی تھیں۔ ان نثروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے کن نسخوں پر نظرثانی کی تھی۔ اشاعتِ اوّل کے آخر میں شرف الدولہ کی مدح میں طویل نثر بھی اسی ضمیمے میں شامل ہے۔

(۲) دوسرا ضمیمہ تشریحات کا ہے۔ اس متن میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جن کو کسی نہ کسی لحاظ سے تشریح طلب یا وضاحت طلب کہا جا سکتا ہے، ایسے مقامات سے متعلق وضاحتی حاشیے لکھے گئے ہیں تاکہ ان کے سمجھنے میں طلبا کو آسانی ہو سکے۔

(۳) تیسرا ضمیمہ انتساب اشعار کا ہے۔ اس کتاب میں سرور نے اپنے، اپنے استاد نوازش کے اور دوسروں کے اشعار اچھی خاصی تعداد میں شامل کیے ہیں۔ جن اشعار کے انتساب کا سراغ لگ سکا، ان کی نشان دہی کی گئی ہے۔۔۔۔ میر سوز کے اشعار کے لیے ان کے دیوان کا کئی جگہ حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے مراد وہ دیوان ہے جو رسالہ اردوے معلیٰ کے "میر سوز نمبر" میں شائع ہوا تھا۔ میر تقی میر کے اشعار کے لیے کلیات میر مرتبہ آسی کا حوالہ دیا گیا ہے۔۔۔۔ نوازش کے اشعار کا تعلق ان کے قلمی دیوان مخزونہ۔۔۔ پٹنہ سے کیا گیا ہے۔ میرے علم میں اس دیوان کا یہ واحد نسخہ ہے (یہ دیوان اب تک غیر مطبوعہ ہے)۔۔۔۔ ناسخ کے اشعار کے لیے کلیات ناسخ طبع اول (۱۲۵۸ھ) اور طبع ثانی (۱۲۶۲ھ) دونوں نسخے پیش نظر رہے ہیں۔

(گویا مرتب نے نہ صرف انتساب اشعار کی نشان دہی کی ہے بلکہ ان کا صحیح اور مستند متن بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے)۔

(۴) دیباچۂ کتاب میں (ص۱ سے ص۱۳ تک) افراد، مقامات، عمارات (وغیرہ) کے جو نام آئے تھے (اس میں شعرا کے تخلص بھی شامل ہیں) چوتھے ضمیمے میں ان کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

دیباچۂ کتاب میں (اور کتاب) میں جمشید، رستم، اسفندیار، حاتم جیسے متعدد نام آئے ہیں (جیسے: جم شوکت) ایسے ناموں کو فرہنگ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ کتاب میں معروف شعرا کے جو نام (یا تخلص) آئے ہیں (جیسے انشا، مصحفی وغیرہ) ان سے لوگ عموماً واقف ہیں، اس لیے ان کو اس ضمیمے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ یہی صورت معروف شہروں کے ناموں کی ہے (جیسے، کلکتہ، ملتان، کان پور، دہلی وغیرہ)

(۵) پانچواں ضمیمہ تلفظ اور املا سے متعلق ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ خاص خاص الفاظ پر جو اعراب لگائے گئے ہیں یا جو املا اختیار کیا گیا ہے، اس کی وجہ اور جواز کیا ہے۔

(۶) چھٹا ضمیمہ "الفاظ اور طریقۂ استعمال" پر مشتمل ہے۔ اس میں ایسے لفظوں اور عبارت کے ٹکڑوں کو یک جا کر دیا گیا ہے جو اس عہد کی زبان پر کام کرنے والوں کے لیے مفید مطلب ہو سکتے ہیں اس ضمیمے کے اندراجات سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرور کی زبان کا احوال کیا ہے، اس میں کس قدر پرانا پن ہے اور کچھ لفظوں کو انھوں نے کیسے عجیب ڈھنگ سے استعمال کیا ہے جمع الجمع، معدود معدود میں واحد جمع کی نسبت کا احوال کیا ہے۔ اور معینہ متروک لفظوں کا کس قدر ذخیرہ ان کی اس کتاب میں محفوظ ہے۔

(۷) ساتواں ضمیمہ اختلاف نسخ کا ہے۔ اس ضمیمے کے سلسلے میں دو وضاحتیں ضروری ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ ضمیمہ صرف دیباچۂ فسانۂ عجائب پر مشتمل ہے (یعنی ص۱ سے ص۱۳ تک) دوسری بات یہ کہ ابتدا میں۔۔۔۔ یہ طے کر لیا گیا تھا کہ مکمل متن پر مشتمل ضمیمۂ اختلاف نسخ تیار کیا جائے گا۔۔۔۔ یہ ضمیمہ پچاسی صفحات میں سمایا تھا۔۔۔۔ جب سب کام مکمل ہو گیا تو معلوم ہوا کہ زیادہ ضخامت کی وجہ سے یہ کتاب نہیں چھپ سکتی۔۔۔۔ مشورہ کیا گیا، طے یہ ہوا کہ اختلاف نسخ کے اس حصے کو شامل نہ کیا جائے۔ اس طرح کچھ تو ضخامت کم ہوگی۔ یہ ایسی مجبوری تھی جس کا علاج میرے پاس نہیں تھا۔ اصول تدوین کے لحاظ سے یہ صحیح طور پر درست نہیں، مگر مجبوری ہے۔۔۔۔

اس سلسلے میں یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ دیباچۂ کتاب کا حصہ اختلاف نسخ کے لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔۔۔۔ اس لیے مناسب یہ ہوگا کہ اس حصے کا اختلاف نسخ مرتب کر لیا جائے گا۔۔۔ افادیت کے لحاظ سے یہ مختصر حصہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔

اس تمام تفصیل کو دیکھ کر، پوری طرح نہ سہی کسی حد تک

اس نسخے کی افادیت اور مرتب کی محنت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان اجزا پر فرداً فرداً گفتگو کریں۔ یہ دیکھ لینا مناسب ہوگا کہ آیا یہ نسخہ واقعی طلبا کی نصابی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے؟ کبھی گفتگو میں جناب رشید حسن خاں نے کئی بار اس بات کا ذکر کیا کہ میں نے نصابی متن مرتب کرنے کا نمونہ پہلی بار پیش کیا ہے۔ مقدمہ میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

"کسی کتاب کے مختلف نسخوں کو..... سامنے رکھنا ازبس ضروری بلکہ لازم ہے۔ جب بھی مختلف نسخوں کو پیش نظر رکھ کر... عبارت کی تصحیح کی جائے گی، اور اس سلسلے میں لفظوں کی شکل و صورت کا تعین کیا جائے گا تو بہت سے مسائل پیدا ہوں گے۔ یوں ضروری ہوگا کہ حواشی میں ایسے ہر لفظ سے متعلق ضروری تفصیلات درج کی جائیں بہت سے جملوں کی ترتیب اور معنویت بھی وضاحت کی محتاج نظر آئے گی، حواشی میں ان سے متعلق وضاحتوں کا پیش کرنا بھی ضروری قرار پائے گا۔

وہ متن اگر شاملِ نصاب بھی ہے تو ایک اور مسئلہ بھی سامنے آئے گا، تدریس سے جس کا حقیقی طور پر تعلق تو نہیں، مگر صحتِ متن کی تکمیل اور خواندگی کی آسانی کے لحاظ سے اس کی حیثیت اب کچھ کم نہیں "اب" کی تخصیص یوں کی گئی ہے کہ ہمارے زمانے میں حالات کے اثر سے زبان کی تعلیم کا معیار پست ہو چکا ہے، فارسی سے عام طور سے ناواقفیت پائی جاتی ہے اور اب یہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ طالب علم (اور بہت سے اساتذہ بھی) بہت سے لفظوں کے تلفظ سے واقف ہوں، یہی احوال اضافت اور تشدید کا ہے۔ قواعد سے ناواقفیت عام ہے اور مشکل متنوں کو پڑھنے کا سلیقہ گویا اٹھتا جا رہا ہے اور صلاحیت مرحوم ہوتی جا رہی ہے۔ جملے میں ذرا سا الجھاؤ ہو تو طالب علم بہت زیادہ الجھتا ہے.... اس صورتِ حال میں مشکل کلاسیکی متنوں کو، جو شاملِ نصاب بھی ہوں، بہتر طور پر اور مفید طور پر پیش کرنے کے لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ منتخب لفظوں پر اعراب ضرور لگائے جائیں، اضافت کے زیر لازماً لگائے جائیں، تشدید ضرور لگائی جائے۔ معروف و مجہول اور غنہ آوازوں کے لیے علامات سے کام لیا جائے۔ اسی کے ساتھ توقیف نگاری (مقدمہ ص ۲۳) (پنکچویشن) کا اہتمام بھی بہ طورِ خاص ملحوظ رکھا جائے تاکہ اجزائے جملہ کا ٹھیک ٹھیک تعین کیا جا سکے اور معنویت روشن ہو سکے ــــ جب یہ ساری باتیں ملحوظ رکھی جائیں گی، تو مرتب کے سامنے اور بہت سی الجھنیں آ کھڑی ہوں گی اور بالآخر یہ ضروری قرار پائے گا کہ حواشی میں وسعت پیدا کی جائے تاکہ تلفظ، اضافت تشدید، تذکیر و تانیث اور اجزائے جملہ کے تعین سے متعلق ضروری وضاحتیں پیش کی جا سکیں اور حسبِ ضرورت الجھے ہوئے جملوں کی معنویت پر بھی گفتگو کی جائے۔ یہ سب کچھ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی وضاحتوں کے بغیر وہ کام ادھورا اور غیر مفید رہے گا۔ پڑھنے والوں کی نظر جگہ جگہ رکے گی، ذہن میں الجھن پیدا ہو سکتی ہے اور ایک اچھے طالب علم کے نقطۂ نظر سے جو معلومات ازبس ضروری ہو سکتی ہے وہ موجود نہیں ہوگی۔"

(مقدمہ ص ۲۳)

اس طویل اقتباس کی ضرورت اس لیے پڑی کہ مرتب کے اندازِ فکر کی کما حقہٗ وضاحت ہو جائے۔ اس اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں، لیکن اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مرتب کے مخاطب اصلی طلبا نہیں علما ہیں۔ طلبا کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خاں صاحب نے طلبا کی بہت سی ضرورتوں کا خیال رکھا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس شانِ تدوین میں اس کا حق نہیں ادا ہو سکا۔ ہمارے اس خیال کی تائید مقدمے کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو خاں صاحب نے نصابی متون کی ترتیب کے پیش نظر اپنے طریقِ کار کی وضاحت کے سلسلے میں درج کیا ہے:

"خاص لفظوں میں ضروری مقامات پر اعراب
لگائے گئے ہیں اور علامات کو بھی شامل کیا گیا ہے یہ
بات بہ طور خاص ملحوظ رکھی گئی ہے کہ علامات کو داخل
کرنا یا ہر لفظ پر، یا لفظ کے ہر حرف پر حرکت یا جزم کو لانا
غیر مناسب بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ بے امتیازی
کے اس عمل سے عبارت بوجھل نظر آئے گی اور افادیت
کا حصول نہیں ہوگا۔"

(مقدمہ ص ۱۰۴)

اس اقتباس میں کوئی لفظ مشکل ہے نہ کوئی بات نامناسب۔ لیکن ہم بہ صد ادب عرض کرنا چاہتے ہیں کہ خان صاحب کو طلبا سے اس طرح واسطہ نہیں پڑتا جس طرح ہمیں پڑتا ہے۔ "خاص لفظ" یا "ضروری مقام" کا فیصلہ اگر ایک عالم اپنے نقطۂ نظر سے کرے گا تو عین ممکن ہے کہ وہ طلبا کے نقطۂ نظر سے بہت سے ضروری مقامات اور الفاظ کو غیر ضروری سمجھے۔ امتیاز اور بے امتیازی کا فیصلہ ایک عالم تو کر سکتا ہے طالب علم نہیں، خصوصاً وہ طالب علم جن کے لیے خود خان صاحب نے "ادب" اور صلاحیت کے مرحوم ہوتے جانے کی بات لکھی ہے۔ اس زمانے میں ہمارے پاس عام طور سے صلاحیت مفقود طالب علم ہی آتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی نظر میں رہنا چاہیے کہ اب بیش تر غیر مادری زبان والے طلبا بھی اردو پڑھتے ہیں، ابتدائی سطح پر جن کی تربیت کما حقہٗ نہیں کی جاتی۔ خود خان صاحب اسی مقدمے میں ہر ہر لفظ کے تلفظ کو مسئلہ ٹھہرا چکے ہیں۔ اوپر کے اقتباس ہی کو لیجیے، آسان اور عام ہونے کے باوجود اس میں کئی الفاظ (عام طالب علم کے نقطۂ نظر سے) توجہ طلب ہیں اس لیے کہ ان پر نہ اعراب لگائے گئے ہیں اور نہ علامات کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً لفظ ضُروری ہے یا ضَروری، مُقامات ہے یا مَقامات۔ اِعراب ہے یا اَعراب، عَلامت ہے یا عِلامات، شامِل ہے یا شامَل (یہ واقعہ ہے کہ ہمیں موخرالذکر تلفظ اکثر سُننے کو ملتا ہے) بہ طور ہے یا بہ طُور، صُرف ہے یا صِرف، داخِل ہے یا داخَل، حَرف یا حَرَف، جزْم ہے یا جزَم۔ مُناسِب ہے یا مناسَب، اِفادیت یا اَفادیت، حُصول ہے حُصول۔ ہمیں تو اَفادیت بھی الفاظ سننے کو ملتا ہے۔ اب اگر ہم عبارت کے بوجھل پن سے خوف کھاتے رہیں گے تو پھر ہمارا مقصد بہ خوبی حاصل نہیں ہوگا۔ ہم نے ابھی جن الفاظ کا ذکر کیا ہے ان میں کچھ متن کتاب میں بھی وارد ہوئے ہوں گے اور اگر ان میں اعراب نگاری سے احتراز کریں گے تو شامل نصاب متون کی تدوین کا حق ادا نہیں ہوگا۔

مرتب نے جو علامات و اعراب متن کتاب میں استعمال کیے ہیں ان کی وضاحت اور تفصیل اس طرح پیش کی ہے:

"معروف، مجہول، مخلوط اور غنّہ آوازوں کے تعین
کے لیے بہت سے مقامات پر علامتوں کا شمول ضروری
ہوتا ہے، اسی طرح بعض نشانات بھی ضروری ہوتے
ہیں، اسی بنا پر علامات اور نشانات کو شاملِ متن
کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:"

(مذکورہ علامات، نشانات نقل کرنے سے پہلے یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ علامات اور نشانات صرف متن زیرِ ترتیب ہی میں لازمی نہیں ہوتے بلکہ اپنی عام تحریر میں بھی ان کو لازماً استعمال کرنا چاہیے ورنہ ایک ہی کتاب میں صورت نگاری کی دو مختلف صورتیں سامنے آئیں گی جو پڑھنے والے کے لیے الجھن کا سبب بن سکتی ہیں۔ مقدمۂ کتاب میں مجوزہ اعراب و علامات کی کارفرمائی کم سے کم ہے لیکن متن کے لیے خان صاحب کا بیان یہ ہے:)

۱. درمیانِ لفظ واقع یائے معروف کے لیے، اس کے
نیچے چھوٹی سی کھڑی لکیر (مقدمہ ص ۱۴۳) جیسے ہِیل،
اِیل، تِیر۔

۲. یائے مجہول کے لیے اس کے حرف ماقبل کے نیچے زیر
جیسے بِیل، تِیل، دِیر۔

۳. یائے لین (ماقبل مفتوح) کے لیے حرف ماقبل پر زبر
جیسے، مَیل، دَیر، عَیب۔

۴. یائے مخلوط کے لیے اس پر آٹھ کے ہندسے کا
نشان، جیسے: پیار، کیا، گیانی۔

(پیار اور کیا جیسے الفاظ اتنے عام ہیں کہ اس ملک میں کسی علاقے کا

ہ ان کے تلفظ میں غلطی نہیں کرتا۔ اگر انھیں خاص الفاظ سمجھا
سکتا ہے تو اوپر جن الفاظ کی نشان دہی ہم نے کی ہے انھیں عام
ہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہاں ایک تجویز پیش کر دینا بے جا نہیں ہوگا
یہ کہ ہر لفظ، جس کا پہلا حرف مفتوح کے علاوہ ہو اس پر مطلوبہ حرکت
زما لگائی جائے، اگر مکسور ہو تو کسرہ اور مضموم ہو تو ضمہ)

۵. واوِ معروف پر الٹا پیش، جیسے دُور، حُور، طُور۔

۶. واوِ مجہول کے لیے حرفِ ماقبل پر پیش، جیسے: چُور، گُور، ڈُول

۷. واوِ ماقبل مفتوح کے لیے حرفِ ماقبل پر زبر، جیسے: دَور، فَور، جَور

۸. واوِ معدولہ کے نیچے خط، جیسے: خورِاد، خورِشید، فراخورِ کمال۔

(آخری مرکب پر حاشیے میں لکھا ہے: خُود سر اُس خودِ سر کا کاٹا لفظ خُودسر کوئی اجنبی لفظ نہیں لیکن اس جملے میں وہ ’خُود‘ کے ساتھ جس طرح آیا ہے، اس بنا پر اسے ’خودِ سَر‘ لکھنا مناسب سمجھا گیا۔ یہ مثال یوں نقل کی گئی کہ اس سے مرتب کے طریقِ کار کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے)۔

۹. درمیانِ لفظ واقع نونِ غنہ پر قوس کا اُلٹا نشان، جیسے: آنت
کُونپ، کھانڈ۔

۱۰. خاص ناموں پر خط کھینچا گیا ہے، جیسے: دہلی۔ فسانۂ عجائب....
(ایک وضاحت: جو لفظ بہ طورِ خاص نام آئے ہیں، ان پر بھی خط کھینچا گیا ہے، جیسے: سرور نے نوآدش کے اشعار سے پہلے کسی جگہ لفظ ”استاد“ لکھا ہے، ظاہر ہے کہ یہاں یہ لفظ نام کے بدل کے طور پر آیا ہے، اس لیے اس پر خط کھینچا گیا ہے۔)

(مقدمہ ص ۱۵)

رموزِ اوقاف

سکتہ یعنی کاما (،)، وقفہ (؛)، بیانیہ (:)، ندائیہ [ندا، تحسین، تاسف اور تعجب کے لیے] (!)، استفہامیہ (؟)؛ ان رموزِ اوقاف کو معنوی نسبت کے لحاظ سے شاملِ عبارت کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں التزام برقرار رکھا جائے۔

اس سلسلے میں ایک اور التزام کو بھی شامل کیا گیا ہے، جس کی صراحت ضروری ہے۔ بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں دو لفظوں یا دو ٹکڑوں میں باہم فصل ضروری ہے، لیکن وہاں کاما نہیں لگایا جا سکتا (کاما لگانے سے معنوی سطح پر قباحت پیدا ہو سکتی ہے) ایسے مقامات پر اس کا التزام کیا گیا ہے کہ ایسے اجزا کی کتابت اس طرح کی جائے کہ ان کے (ص ۱۶) درمیان ذرا سا فصل پیدا ہو جائے، جو پڑھنے والے کی نظر میں بہ آسانی اور فوری طور پر آجائے اور وہ سمجھ لے کہ یہاں خواندگی میں ان دو لفظوں کو الگ الگ آنا چاہیے۔ اس کی وضاحت کے لیے میں شروعِ متن ہی سے ایک مثال پیش کروں گا:

”سزاوارِ حمد و ثنا خالقِ ارض و سما، جلّ و علیٰ، صانعِ
بے چون و چرا ہے“ (ص ۱)

(ضمیمہ تشریحات میں اس فقرے کے تیسرے ٹکڑے کو اس طرح لکھا ہے: جلّ و عُلا؛ اور اس کے املا کو اختیار کرنے کی وجہ بھی لکھی ہے؛ اس کے باوجود متن کے اقتباس میں مختار املا کا خیال نہیں رکھا گیا، سبب؟) اس جملے میں چار ٹکڑے ہیں۔ ان میں دوسرے اور تیسرے ٹکڑے کے بعد کاما آیا ہے، مگر پہلے ٹکڑے (سزاوارِ حمد و ثنا) کے بعد کاما نہیں آسکتا، کیوں کہ یہ ٹکڑا اس طرح الگ اور معنوی طور پر خود مکتفی نہیں، جس طرح دو ٹکڑے ہیں، مگر ہے یہ بھی الگ سا؛ اس لیے اسے اس طرح لکھا گیا ہے کہ اس کے بعد ذرا سا فصل پیدا ہو گیا ہے۔ اس اندازِ کتابت کو (اور اس کی افادیت کو) ہر جگہ بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے ..... (بے شک! لیکن یہ اندازِ کتابت اس لیے برقرار رہ سکا کہ دہلی یونیورسٹی ایک بادسائل ادارہ ہے ایک مستقل کاتب کل وقتی طور پر یونیورسٹی کا ملازم تھا جس نے اس نسخہ کی کتابت کی۔ بھلا کوئی بے وسیلہ و مقدور مرتب اس انداز سے کتابت کیوں کر کروا سکتا ہے؟ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ اعراب و علامات اور رموزِ اوقاف کی پابندی بھی کوئی نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں کیا نصابی متون کی ترتیب محض ایک خواب ہو کر رہ جائے گا؟)

متعدد حرفوں پر تشدید ضرور لگائی گئی ہے۔ اسی طرح اضافت کے زیر بھی پابندی کے ساتھ لگائے گئے ہیں اور اس التزام کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اضافت کا مسئلہ بعض مقامات پر خاصا پریشان کن ہوا کرتا ہے ویسے بھی یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے، ان دونوں باتوں کو ذہن نشین کر لیا گیا تھا اور پیشِ نظر رکھا گیا۔ اس سلسلے میں (مقدمہ ص ۱۶)

یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ جن مقامات پر اضافت کا ہونا یا نہ ہونا بحث طلب ہو سکتا ہے، ایسے مقامات سے متعلق یا تو ضمیمہ تشریحات میں یا پھر ضمیمہ تلفظ و املا میں وضاحت ضرور کی گئی ہے۔ میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کروں گا: اس کتاب میں ص۱۵۸ پر "صاحب فراش" آیا ہے۔ یہ مرکب مع اضافت بھی درست ہے اور بغیر اضافت بھی، لیکن اس متن میں اسے مع اضافت مرجح قرار دے کر "صاحبِ فراش" لکھا گیا ہے اور ضمیمہ تلفظ و املا میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ اسے مع اضافت کے کیوں مرجح سمجھا گیا۔

(ظاہر ہے کہ اس قسم کی ترجیحات طے کرنے کے لیے بہت زیادہ محنت اٹھانا پڑتی ہے لیکن مرتب نے منشائے مصنف کے مطابق متن کو مرتب کرنے کے لیے یہ سب مشقت برداشت کی۔ اس کی افادیت سے بہر حال کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے کی ایک آخری بات اور، اس کے بعد ہم اس تالیف پر بہ حیثیت مجموعی اپنی رائے کا اظہار کریں گے)۔

کتاب میں معروف شعرا کے جو نام (یا تخلص) آئے ہیں (جیسے: انشا، مصحفی وغیرہ) ان سے لوگ عموماً واقف ہی ہیں، اس لیے ان کو ضمیمے میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہی صورت معروف شہروں کے ناموں کی ہے (جیسے: کلکتہ، ملتان، کانپور، دہلی وغیرہ)....

گویا بہ خیالِ خویش مرتب نے جن ناموں یا تخلصوں کو معروف سمجھا انھیں ضمیمے میں شامل نہیں کیا۔ مرتب کو اپنے پر اہلِ دہر کا قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ یہ عین ممکن ہے جسے وہ معروف سمجھتا ہے وہ دوسروں کے لیے خصوصاً آج کے طلبا کے لیے غیر معروف ہو۔ انشا اور مصحفی اس دور کے طالب علم کے لیے اتنے معروف نہیں، خصوصاً مصحفی کہ ہر جگہ کے نصاب میں ان کا کلام شامل نہیں ہے۔ اگر کوئی تذکروں سے واقف نہ ہو تو اس کا مصحفی کے نام سے آشنا ہونا ضروری نہیں۔ یہی بات ملتان جیسے شہروں کے لیے کہی جا سکتی ہے جو اب بہر حال ایک غیر ملک کا شہر ہے۔ پھر اگر آتش، میر امن اور ناسخ جیسے نام ضمیمے میں داخل کیے جا سکتے ہیں تو انشا، مصحفی اور ملتان کیوں نہیں۔

سو صفحے کے اس عالمانہ مقدمے میں بہت سے مسائل زیرِ بحث آئے ہیں اور بہت سی مفید معلومات اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ "بیانِ لکھنؤ" پر بحث کے دوران ضمناً سرور کے زبان و بیان پر تنقید بھی آ گئی ہے۔ ترتیب متن کے ضروری مسائل، مشکلات اور مرتب کے طریق کار پر بھی اس مقدمے سے خاصی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ بیشتر مباحث یا معلومات علما، اساتذہ یا محققین کے لیے ہیں، طلبا کے مفید مطلب نہیں، اس لیے کہ طلبا کو مختلف نسخوں کے تعارف یا تفصیل سے سروکار نہیں ہوتا۔ ان کے لیے تو وہ مباحث ضروری ہوتے ہیں جنھیں عموماً تدوینِ متن کے دائرہ کار سے خارج سمجھا جاتا ہے مثلاً "بیانِ لکھنؤ" پر ضمناً جو تنقیدی معلومات مقدمے میں آ گئی ہیں ان کے خاتمے پر مرتب نے لکھا ہے:

> "اوپر جو کچھ لکھا گیا، اس کا مقصد یہ نہیں کہ تنقیدی
> نقطۂ نظر سے بھی اس کتاب کا جائزہ لیا جائے .....
> تنقیدی جائزہ ایک مختلف چیز ہے۔ تدوین میں اصل بات
> متن کی صحت اور متعلقاتِ متن کی وضاحت ہوتی ہے۔"

اصولِ تدوینِ متن کے لحاظ سے یہ درست ہے لیکن نصابی متون کی تدوین کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں (اور جن کی جانب ہم شروع میں اشارہ کر چکے ہیں)۔ خان صاحب نے کام کے حدود کا تعین کرتے ہوئے آگے چل کر لکھا ہے:

> "متن کی کما حقہ تصحیح اور متعلقاتِ متن کی ترتیب کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ تنقیدی مباحث کو شاملِ کتاب نہ کیا جائے۔ ویسے بھی تنقید اور تدوین دو الگ الگ موضوع ہیں۔ متضاد تو نہیں، لیکن مختلف ضرور ہیں۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں اور دونوں کے مباحث بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ان دونوں مختلف الاحوال موضوعات کا حق ادا کر سکے اور اس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوں موضوعات دو مختلف اندازِ نظر، طریق کار اور طرزِ فکر کے متقاضی ہوتے ہیں۔ عام طور پر اس غلط بحث سے یعنی مقدمۂ کتاب میں طویل تنقیدی مباحث کو شامل کرنے سے یہ نقصان ضرور ہوتا ہے کہ متعلقاتِ متن کی ضروری تفصیلات

زیرِ بحث نہیں آپاتیں۔ مرتب کا اصل کام یہ ہے کہ وہ متن کو صحیح طور پر پیش کرے اور اس متن سے متعلق بحثوں کو مناسب تفصیل کے ساتھ لکھے، جس میں قابلِ ذکر حصّہ لسانی مباحث کا ہوگا۔ اس کے فرائض میں یہ شامل نہیں کہ وہ تنقیدی رائے بھی دے۔ اسی لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس سلسلے کی زیرِ ترتیب کتابوں کے مقدمے میں تنقیدی مباحث کو شامل نہ کیا جائے؛

طویل اقتباس، خصوصاً اس کے آخری حصّے سے اس دعوے کی نفی ہوتی ہے کہ یہ متن طلبا کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے یا یہ کہ نصاب میں شامل متون کی تدوین کا نمونہ یہ ہے۔ نصابی ضرورتوں کے تحت متن کو مرتب کرنے والے کو ضروری تنقیدی مباحث کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل کرنا ہوگا، ورنہ ہم نے جو شروع میں کہا تھا کہ مل کر کام کرنا سیکھیے اس سلسلے کے کاموں کے لیے کم سے کم دو اشخاص کو مل کر ایک متن مرتّب کرنا چاہیے۔ ایک کے ذمّہ متعلقات متن کا احاطہ اور دوسرے کے ذمّے تنقیدی تجزیہ ہونا چاہیے تاکہ متن نصاب اور طلبا کی ضرورتوں کو بوجوہِ احسن پورا کرسکے۔

ہمیں یہ کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے کہ تدوینِ متن کا یہ مثالی نمونہ جسے ڈاکٹر گیان چند جین نے مرتب کے نام اپنے ایک خط میں، تدوینِ متن کے موجودہ کاموں میں سرِ فہرست رکھا ہے۔ طلبا کی ساری ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا۔ یہ ان کی قوتِ خرید سے بھی باہر ہے۔ اس کتاب کی قیمت ۱۲۵/ روپے ہے اور اس کے طلبا کے لیے اڈیشن کی قیمت ۷۰/ روپے مقرر کی گئی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ مہنگائی کے اس دور میں ایک طالب علم ایک کتاب پر ستر روپے خرچ کرسکتا ہے۔ پھر محض کچھ حصے کو کم کرکے اور غیر مجلد صورت میں کتاب کی قیمت نصف کردینے سے طلبا کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ ان کی ضرورتوں کو بہ طورِ خاص نظر میں رکھ کر الگ سے ان کے لیے کلاسیکی متون کو مرتّب کرنا ہوگا۔

خود مرتب کا بیان ہے کہ ضخامت زیادہ ہونے کے سبب اس کتاب کے چھپنے میں رکاوٹ پیدا ہوئی، اور ضخامت ہی کو کم کرنے کے لیے متن کے اختلافِ نسخ کو شاملِ کتاب نہیں کیا گیا۔ ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ زیرِ گفتگو کتاب میں بے جا طول سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً مرتب نے جن قدیم اڈیشنوں کو بہت اچھا (ہر لحاظ سے) بتایا ہے ان کی کتاب ۱۳۰ سے ۱۷۰ صفحات سے زیادہ نہیں۔ مرتب کا اساسی نسخہ ۲۱۰ صفحات کو محیط ہے لیکن موجودہ اڈیشن میں صرف متن ۳۶۳ صفحات میں آیا ہے۔ گویا نصف ضخامت محض بے حد جلی اور کھلی کتابت کی وجہ سے بڑھی۔ مثلاً ضمیموں میں عام طور سے سطر ۲۵ سطری ہے اور متن کتاب میں ۱۹ سطری۔ مقدمے کی کتابت ۲۳ سطری مسطر پر ہوئی ہے (اور یہ خاصی جلی کتابت ہے) ہم سمجھتے ہیں کہ اسی کو متن میں بھی قائم رکھا جاسکتا تھا۔ ضمیموں کی کتابت غیر ضروری طور پر خفی اور ۲۵ سطری مسطر رکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ۲۳ سطری مسطر شروع سے آخر تک برقرار رکھا جاسکتا تھا اور اس سے بھی کتاب کی ضخامت اتنی کم ضرور ہوجاتی کہ چھوڑے ہوئے اختلافِ نسخ بہ آسانی اس میں سما جاتے اور کچھ مزید صفحات کی بچت بھی ہوجاتی۔

اس کے علاوہ نصابی متن میں اختلافِ نسخ کی ضرورت نہیں۔ مقدمے کے بہت سے مباحث بی۔ اے (اور ایم اے بھی) کے طلبا کے لیے غیر ضروری ہیں، انھیں مختلف نسخوں کے تفصیلی تعارف کی بھی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ان کی رہنمائی کے لیے ایک یا زیادہ سے زیادہ دو صفحوں میں علامات اور رموزِ اوقاف کی تشریح و تعارف کافی ہوگا تاکہ اس کی مدد سے وہ متن کو صحیح پڑھ سکے۔ زیادہ سے زیادہ ۲۰، ۲۵ صفحات میں متن اور مصنف سے متعلق ضروری معلومات اور تنقیدی آرا کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ نصابی متن کے لیے ضروری باتیں یہ ہوں گی:

۱۔ مختصر سوانحِ مصنف۔ ۲۔ داستان کا مکمل خاکہ۔ ۳۔ کردار نگاری اور اہم کرداروں پر تبصرہ۔ ۴۔ زبان و بیان (خوبیاں اور خامیاں) اور اگر ضرورت ہو تو کسی دوسرے متن سے مختصر موازنہ، یہ اس لیے کہ شروع سے ایک رسم چلی آرہی ہے کہ ہم دو مختلف طرزوں یا مصنفوں کے موازنے اور مقابلے کے عادی ہوگئے ہیں۔ میر کا ذکر آئے تو سودا سے موازنہ معمولی بات ہے۔ گلزارِ نسیم کی بات ہو تو سحر البیان سے اس کا موازنہ ضرور کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارا تنقیدی جائزہ متن اور کچھ بے حد ضروری ضمیمے (تفصیل آگے آتی ہے) ملاکر کتاب کی ضخامت ۲۰۰ صفحے سے نہیں بڑھے گی۔

(باقی صـ۱۹ پر)

غزل

پروفیسر مظفر حنفی
شعبۂ اردو
کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ

درخشندہ ہے وہ لیکن ہمیں پیارا نہیں ہے وہ
علم بردارِ شب ہے، صبح کا تارا نہیں ہے وہ

پڑوسی کو ستا کر کس لیے مسرور ہوتے ہو
جسے مارا ہے تم نے نفسِ امّارہ نہیں ہے وہ

وہ برگِ زرد، جس کو شاخ نے آزاد فرمایا
بگولے کی کلاہِ زر ہے، بیچارہ نہیں ہے وہ

فرشتہ موت کا چپکے سے آکر داب لیتا ہے
نظیر اکبرآبادی کا بنجارہ نہیں ہے وہ

اسے مہ پارہ کہنا چاند ہی کے فائدے میں ہے
بخوبی جانتے ہیں ہم کہ مہ پارہ نہیں ہے وہ

مظفر کے لئے یہ کلمۂ خیر کیا کم ہے
کہ بے شک سر بریدہ ہے مگر ہارا نہیں ہے وہ

خورشید افسر بسوانی
کٹرہ بازار، قصبہ بسواں
ضلع سیتاپور

کبھی کنایہ کبھی رمز و استعارہ ہوا
عجیب ڈھنگ سے تو مجھ پہ آشکارہ ہوا

سبھی نے آئینہ دیکھا ابھی مسلّم تھا
تری نگاہ پڑی اور پارہ پارہ ہوا

رکھا گیا ہے حفاظت سے شیلف میں مجھ کو
کہ جیسے میں بھی خصوصی کوئی شمارہ ہوا

ہمیں نے آگ لگائی تھی اپنے دامن میں
پھر اس کے بعد نہ آنسو کوئی ستارہ ہوا

لہو کا قطرہ تھا وہ بھی جو اپنی گردش میں
کہیں چراغ بنا اور کہیں ستارہ ہوا

ہوا ہے یہ بھی ستارے تھے زخم تھے نہ گلاب
کبھی کبھی یہی دل سب کا گوشوارہ ہوا

نفس نفس تری ہمسائیگی ملی مجھ کو
میں تیرا پردہ ہوا تو مرا نظارہ ہوا

کبھی پہاڑ پہ کھلتا تو چور ہو جاتا
وہ ایک راز جو افسر پہ آشکارہ ہوا

اوپیندر ناتھ اشک
۵ خسرو باغ روڈ، الہ آباد

سچ گاؤں کا بانکا شاعر
وامق جونپوری

وامق کو جب میں نے پہلی بار ترنم سے اپنی نظم پڑھتے ہوئے سُنا وہ شام چالیس سال گزر جانے پر آج بھی جوں کی توں میری یاد کے پردے پر نقش ہے۔

۱۹۴۸ء کا سال ہے، میں سینی ٹوریم سے نیا نیا الہ آباد آیا ہوں جولائی اگست کا مہینہ ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے یونین ہال میں اردو ہندی کا کوئی مشترکہ مشاعرہ ہے۔ لیکن کس نے مشاعرے کا اہتمام کیا ہے۔ مشاعرہ کس تقریب میں منعقد ہوا ہے؟ صدارت کون کر رہا ہے؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ نظامت ہندی کے ترقی پسند شاعر شمشیر بہادر سنگھ کر رہے ہیں اور ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ میں بھی شعرا میں شامل ہوں۔ اسٹیج کے ایک جانب شعرا کے لیے لگی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر میں فراق گورکھپوری کے قریب بیٹھا ہوں۔ صدر کے دائیں طرف رکھے مائک پر نظم پڑھنے کے بجائے صدر کے آگے لگی میز کے بائیں کونے پر سامعین کی طرف کو منھ کیے وامق صاحب ایسے بیٹھے ترنم سے نظم سنا رہے ہیں کہ ان کا بایاں پاؤں اٹھا ہے اور دایاں اسٹیج سے لگا ہے۔ میری آنکھیں ان کی کھلے گلے کی کالردار قمیص، کریز والی پتلون پاؤں کے خوبصورت چپل، ان کے نوکیلے گورے چہرے، لمبی ستواں ناک، کشادہ پیشانی، لمبے بالوں اور ان کے اس پوز پر جمی ہے اور میرے کانوں میں ان کے بول گونج رہے ہیں ؎

جواب اس کا کون دے
کسے اب اتنا ہوش ہے
کہ آج ملک کس کے سوگ میں سیاہ پوش ہے۔

جواب اس کا کون دے
یہ کس کا خون بہہ گیا
یہ کون جاتے جاتے دل کا راز سب سے کہہ گیا
یہ کون قتل ہو گیا
فسانۂ حیات کون کہتے کہتے سو گیا
جواب اس کا کون دے
کہ خود ہمارے ہاتھ اس لہو میں ہیں رنگے ہوئے۔

پورے ہال میں ایک دم سناٹا چھایا ہوا ہے۔ میں ہی نہیں تمام حاضرین ہمہ تن گوش ہیں۔ بے پناہ سوز، لوچ اور درد سے بھری ان کی آواز ہال میں گونج رہی ہے۔ نغمے کا ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے اور اپنے ساتھ سب کو بہائے لیے جا رہا ہے ؎

وہ بے کسوں کا پاسباں
دلوں کا میر کارواں
نظر سے دور ہو گیا
وہ جام جو چھلک رہا تھا
حریت کے میکدے میں دیر سے مہک رہا تھا
چور چور ہو گیا

نظر سے دور ہوگیا
وہ بوڑھی سوکھی ہڈیوں کا ایک کانپتا بدن
مگر اسی میں اس قدر جواں لہو تھا موج زن
کہ جس کی بوند بوند میں بسی تھی الفتِ وطن
لہو وہ آج بہہ گیا
وہ بوڑھا جسم مر گیا
مگر وہ کام کر گیا
جسے وہ جیتے جی نہ اپنے آگے پورا کر سکا۔

میں نے وامق کو ۱۹۴۸ء کی اس شام پہلی بار دیکھا اور سنا تھا ان کا خوبصورت چہرہ اور اس کی ہر جنبش میری یادداشت کے پردے پر آج تک نقش ہے۔

وامق کی کچھ اور چیزیں پڑھنے اور انھیں کچھ بہتر طور پر جاننے میں مجھے تھوڑا بہت وقت لگا۔ اس تاخیر کے اسباب خارجی اور داخلی دونوں تھے۔ خارجی سبب تو یہ کہ وامق تب اتنے مشہور نہ تھے اور نہ ہی ان کا کلام زیادہ چھپا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں ہی ان کی شہرت اور ان کے کلام سے اس وقت واقف اور روشناس نہ رہا ہوں! اس کے علاوہ پنج گنی سینے ٹوریم سے آنے کے بعد میں الہ آباد میں بسنے، ہندی میں لکھنے اور اس میدان میں اپنی جگہ بنانے کی جدوجہد میں منہمک ہوگیا تھا، اور کسی دوسری طرف توجہ دینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

داخلی وجہ یہ تھی کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ مہاتما گاندھی کے قتل پر اتنی زوردار اور موثر نظم سنانے والا ایک ڈپٹی کلکٹر اور الہ آباد کے سپلائی آفس میں ایک اعلا افسر ہے تو میرا آدھا جوش ختم ہوگیا۔ اس کے باوجود مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں الہ آباد کے سپلائی آفس میں ان سے ملا ضرور تھا۔ کیا باتیں ہوئیں؟ اس ملاقات کا دل پر کیا اثر پڑا؟ اس سلسلے میں کچھ یاد نہیں۔ ظاہر ہے کہ میں کسی نامعلوم پریجوڈس کا مارا تھا۔ میرے دو تین احباب ایسے بھی رہے ہیں جو مرکزی یا صوبائی حکومت میں اعلا ملازمتوں پر فائز ہونے سے پہلے بہت اچھے شاعر اور افسانہ نگار تھے ان میں سے ایک تو افسانہ نگار کے ناتے خاصے مشہور بھی ہوگئے تھے لیکن پھر ان کے دماغ میں فائلوں پر مدلل اور پراثر نوٹ لکھنے اور بتدریج ترقی کرتے ہوئے اپنے شعبے کی چوٹی پر پہونچنے کی دھن سما گئی اور وہ میرٹ بورڈ کے چیرمین ہوکر ریٹائر ہوئے۔ میں کبھی کبھی ان کے بارے میں سوچتا (وہ میرے دوست ہی نہیں محلے دار بھی تھے) کہ افسر تو ان جیسے دسیوں ہوجائیں گے لیکن ادیب تو وہ اپنے جیسے منفرد ہوئے۔ خدا سب کو قوت اظہار نہیں دیتا، لیکن جو لوگ خدا کی اس دین کو نظر انداز کر دیتے ہیں مجھے ان سے بڑا ناشکرا اور بر خود غلط آدمی کوئی دوسرا نہیں لگتا۔ جب میں الہ آباد کے سپلائی آفس میں وامق سے ملا ہوں گا اور میں نے انھیں ڈپٹی کلکٹر کی کرسی پر بیٹھے دیکھا ہوگا تو یقیناً سوچا ہوگا — خدا نے اس شخص کو اظہار کی قوت دی ہے۔ بے حد سوز و گداز بھری آواز دی ہے لیکن یہ ڈپٹی کلکٹر سے کلکٹر، کلکٹر سے کمشنر ہوتا ہوا سرکار کے کسی شعبے کا سکریٹری و کرسیٹری ہوکر ریٹائر ہوجائے گا اور اپنی شعری کاوشوں کو ایسے یاد کرے گا جیسے آدمی سنہری خوابوں کو یاد کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جانبدار اور یک رخے نقطۂ نظر کے تحت نہ میں وامق میں اور نہ ہی ان کی شاعری میں زیادہ دلچسپی لے سکا اور نہ ان کی کوئی دوسری نظم ہی ڈھونڈ کر پڑھ سکا۔ کتاب تو شاید ان کی اس وقت تک شائع نہیں ہوئی تھی لیکن جیسا کہ اب مجھے معلوم ہے وہ کچھ بہترین نظمیں تخلیق کر چکے تھے۔ وہ الہ آباد ہی میں تھے اگر میں ان سے رابطہ قائم کر لیتا، ملتا جلتا، ان کے قریب اٹھتا بیٹھتا، انھیں قریب سے جانتا تو ان کی نظموں اور غزلوں سے بھی لطف اندوز ہوتا۔ لیکن میں تو اپنی حماقت میں ان کے مستقبل کے بارے میں من ہی من فتویٰ دے چکا تھا۔ پھر چونکہ میری بیوی نے ۱۹۴۹ء میں سرکار سے قرض لے کر ایک اشاعتی ادارہ قائم کر لیا تھا ہندی میں لکھنے کے علاوہ میں اس ادارے کو استحکام دینے میں جٹ گیا، اس لیے وامق اور ان کی شاعری کو یکسر بھول گیا۔

میں اس وقت غالباً کافی ناتجربہ کار تھا، وامق نے نہ صرف میرے تمام اندازے اور پیشین گوئیاں غلط ثابت کرتے ہوئے ملازمت کو خیرباد کہہ دیا بلکہ زندگی کو محض ایک شاعر ہی کے طور پر نہیں بلکہ ایک کمیٹڈ اور ترقی پسند شاعر کے طور پر گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب میں نے سنا تو مجھے خوشی ہوئی تھی۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ مہاتما گاندھی کے قتل پر اتنی پراثر اور دل کو جھنجھوڑ دینے والی نظم لکھنے والا شاعر کیونکر سرکاری نظام میں مقید ہو سکتا تھا۔ اچھا ہوا وامق اس قید سے آزاد ہوگئے۔

انھوں نے باقاعدہ ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے اپنے خیالات کے اظہار کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی مجھے اچھا لگا۔ میں خود ترقی پسند طرز خیال کی مثبت قدروں کو اپنا چکا تھا اور ایسی تخلیقات کے حق میں نہیں تھا جو فرد یا سماج کی بہبود کے لیے نہ ہوں اور کورے فن کی پرستش میں وجود میں لائی گئی ہوں۔

لیکن اس کے باوجود نہ میں وامق کو قریب سے جان سکا نہ ان کی چیزوں کو زیادہ پڑھ ہی سکا۔ کیونکہ وہ پہلے کشمیر چلے گئے پھر جون پور کے اپنے گاؤں جاکر بس گئے۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ وہ کچھ احباب کے ساتھ میرے یہاں بھی آئے تھے۔ کن احباب کے ساتھ؟ کچھ بھی یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ میری اسٹڈی میں، میرے سامنے لگی میز کے کونے پر بالکل اسی پوز میں بیٹھ گئے تھے جس پوز میں برسوں پہلے الٰہ آباد یونیورسٹی کے یونین ہال کے مشاعرے میں نظم سناتے ہوئے بیٹھے تھے۔

اس کے بعد ایک بار 'جن سنسکرتی منچ' کے سالانہ جلسہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ منچ کے سربراہ چاہتے تھے کہ وامق اس انجمن کے صدر بننا منظور فرمالیں۔ وامق نے بڑے پیارے ڈھنگ سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ترقی پسند ادیبوں کی انجمن سے وابستہ تھے اور کسی دوسرے ادارے سے منسلک ہونا انھیں منظور نہیں تھا۔ وضعدار قسم کے آدمی ہیں اس لیے انھوں نے انکار کر دیا تھا۔

دو تین مختصر سی ملاقاتوں میں مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ وامق نہایت شائستہ، مہذب اور مرنجاں مرنج قسم کے انسان ہیں، ان کے طور طریقوں سے کچھ عجیب سی اعلانسبی، نجابت اور شرافت ٹپکتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ نہایت خوددار اور آزاد منش آدمی ہیں۔ خواہ 'جن سنسکرتی منچ' والوں کو انکار سن کر مایوسی ہوئی ہو۔ ترقی پسند ادیبوں کی انجمن سے وابستہ رہتے ہوئے بھی ویسے اگر وہ 'جن سنسکرتی منچ' کے صدر بننا منظور کر لیتے تو منچ والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن وامق نہیں مانے اور تبھی مجھے محسوس ہوا تھا کہ یہ اوپر سے ڈھیلا ڈھالا مرنجاں مرنج دکھائی دینے والا شخص اندر سے کتنا سخت اور مضبوط ہے اور مجھے ان کا ایک مشہور شعر یاد آ گیا، جو میں نے کبھی کسی سے

آہن نہیں کہ چاہیے جب موڑ دیجیے
شیشہ ہوں مڑ تو سکتا نہیں، توڑ دیجیے

جہاں تک وامق کی شاعری کا تعلق ہے، ان کا اولین مجموعۂ نظم 'چیخیں' تو میری نظر سے نہیں گزرا لیکن 'شب چراغ' اور 'جرس' میں نے دیکھے ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں میں کسی نقاد کی نظر سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے پاس نہ وہ نظر ہے نہ الفاظ — ان کی جو نظمیں یا اشعار مجھے اچھے لگے ہیں ان کے حوالے سے میں ان کی شاعری، اس کے اسلوب، اس کی ہیئت، ان کے فکر و فن، ان کی شخصیت اور خیالات کے بارے میں اپنی بات کہوں گا۔

سید احتشام حسین مرحوم نے 'جرس' کے دیباچے میں وامق کی نظم 'مینا بازار' کی بہت تعریف کی ہے اور بنے بھائی مرحوم نے اپنی کتاب 'روشنائی' میں وامق کے گیت 'بھوکا ہے بنگال رے ساتھی' کو اس زمانے کا بہترین انقلابی اور عوامی گیت گردانتے ہوئے اسے سنہرے الفاظ میں لکھے جانے کے قابل بتایا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' مجھے 'شب چراغ' میں سب سے پہلے وہی نظم اچھی لگی جو میں نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے مشاعرے میں پہلی بار سنی تھی — مہاتما گاندھی کے قتل پر۔

میر کارواں!

شب چراغ ہاتھ میں آتے ہی 'مینا بازار' اور 'بھوکا ہے بنگال' دیکھنے کے بعد میں نے اسی کو پڑھا۔ اس نظم کو دوبارہ پڑھتے ہوئے نہ صرف چالیس برس پہلے یونیورسٹی کے اس مشاعرے کی یاد تازہ ہو گئی بلکہ دل و دماغ پر اس نظم کا پھر کچھ ویسا ہی اثر ہوا۔ بات یہ ہے کہ میرے لڑکپن میں مہاتما گاندھی نے بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی کے تختے سے بچانے کے لیے وائسرائے کو لکھنے اور اس سلسلے میں دیگر کوئی کوشش کرنے سے جو انکار کر دیا تھا — اس سے میرے حساس دل کو سخت صدمہ پہونچا تھا۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ نواکھالی کی خطرناک مہم پر نکل کر ہندوؤں کے تحفظ اور دلی میں مسلمانوں کو ظلم و ستم کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے جب انھوں نے اپنے اصولوں کی خاطر جان دے دی تو ان کی شہادت اور آخری

دونوں میں ان کے بیانات کا میرے دل پر جو اثر ہوا تھا، اس کی وجہ سے میں ان کے بارے میں دوبارہ سوچنے لگا تھا۔ وامق کی اس نہایت زوردار اور موثر نظم نے میری اس سوچ میں مدد دی تھی۔ مجھے لگا کہ میں مہاتما گاندھی سے دیوتا ہونے کی امید رکھتا تھا، لیکن آخر وہ دیوتا نہیں انسان ہی تھے ہاں وہ معمولی انسان نہیں غیر معمولی انسان تھے اور ایسے عظیم انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

میرے جذبات پر اس نظم کا جو اثر ہوا تھا اس کے علاوہ مجھے اس کا اسلوب، اس کی ہیئت کی پختگی، اس میں ابہام کا یکسر فقدان اور اس میں خیالات کی گہرائی، گیرائی اور صفائی پسند آئی۔ اس نظم میں بے ساختہ کچھ ایسا رچاؤ، گٹھاؤ، زبان کی روانی اور خیالات کا سلجھاؤ نیز درد و غم کے باوجود ایک عجیب سی امید کی کرن نظر آتی ہے کہ میرے نزدیک 'سیر کارواں' وامق کی تین بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔

دوسری نظم جو مجھے اچھی لگی 'تقسیم پنجاب' ہے۔ چوں کہ میں پنجابی ہوں اور پنجاب کی تقسیم نے میرے دل پر ایسے زخم چھوڑے ہیں جو آج بھی مندمل نہیں ہوئے ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ نظم مجھے اسی لیے اچھی لگی ہو۔ لیکن بات اتنی ہی نہیں ہے، 'تقسیم پنجاب' میں 'سیر کارواں' ہی کی طرح اسلوب گٹھا ہوا ہے۔ اس میں کسی طرح کا جھول نہیں ہے۔ وامق اس کی وساطت سے جو کہنا چاہتے ہیں، اپنے قارئین تک جو بات پہونچانا چاہتے ہیں وہ انھوں نے بغیر کسی الجھاؤ یا ابہام کے پوری شدت کے ساتھ پہنچا دی ہے شاید اسی لیے قاری کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوتا ہے۔

لیکن ان دونوں سے زیادہ جو نظم مجھے پسند آئی وہ 'نیلا پرچم' ہے۔ وامق نے اسے منظوم تقریر کا نام دیا ہے لیکن اسے پڑھتے ہوئے کہیں بھی مجھے اس کا انداز خطیبانہ نہیں لگا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ جب چاروں طرف جنگی اسلحہ اور جنگی ساز و سامان تیار ہو رہے ہیں تو کچھ لوگ جنگ کے خلاف امن کے حق میں پرچم اٹھائے ہیں اور اپنے اس عمل کے سلسلے میں مخالفین کو صفائی دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ کیوں امن و شانتی کے خواہاں ہیں۔ ان کے انداز میں فریاد ہے، اپنے کردار کی صفائی ہے، جنگ کی تباہ کاریوں کی دل دہلا دینے والی تصویر بھی ہے اور جنگ کے خلاف عوام کو خبردار رہنے کی تلقین بھی!

'نیلا پرچم' ہر لحاظ سے ایک اعلیٰ پائے کی نظم ہے اور کم سے کم میرے نزدیک وامق کی بہترین نظم۔ اس میں شاعر کی حب الوطنی ملک کی سنسکرتی اور ثقافت سے لگاؤ، اس کی حفاظت کی فکر، اپنے دیس باسیوں کی ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لوگوں کی خیر خواہی اور سارے عالم میں امن و سکون کے قیام کی زبردست خواہش پنہاں ہے، کیوں کہ امن کے بغیر نہ ملک کی ترقی ممکن ہے نہ دنیا کی۔ یہ سارے جذبات اس نظم میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ وامق اپنے ملک کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے پڑوسی ممالک کے لئے بھی سکون اور شانتی کے خواہاں ہیں اور کہتے ہیں ؎

پڑوس میں آگ جب لگے گی
تو شعلے اڑ کر ضرور لپکیں گے اپنے پیارے وطن کی جانب
تمھیں ابھی کچھ پتا نہیں ہے
یہاں کبھی بم گرا نہیں ہے
اگر نہ یہ جنگ رک سکی تو
نہ جانے کتنے سہاگ بھٹی میں ہوگی کی سلگ اٹھیں گے
نہ جانے کتنے دلوں کے ارماں دلوں کے اندر ہی جل بجھیں گے
نہ جانے کتنے مہکتے آغوش خون سے تر بتر ملیں گے
کروڑوں معصوم ماتا کی تلاش میں دربدر پھریں گے
کوئی سہارا نہ ہوگا جن کا۔

تیسری جنگ، جو ظاہر ہے کہ ایٹمی جنگ ہوگی، ہمارے ملک اور ساری دنیا میں کیسی کیسی آفتیں نازل کرے گی، اس کا نہایت صحیح اور برجستہ بیان وامق نے نہایت موثر اور دل و دماغ کو جھنجھوڑ دینے والے انداز میں اپنی اس نظم میں کیا ہے۔

ترقی پسند اور وابستہ ادیبوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو شروع سے آخر تک ــــ یعنی جب سے وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اس وقت سے لے کر اب تک ــــ زندگی بھر کوئی سمجھوتہ کیے بغیر، نام و نمود، انعام و اکرام، شہرت و عظمت کی دوڑ میں حصہ لینے کا

چونکہ وامق کی طرح چپ چاپ ثابت قدمی سے اپنی ڈگر پر چلتے رہے
وامق کا نام اُردو کے ایسے چند فن کاروں میں سرِفہرست آتا ہے۔ انھوں نے ایک سچے ترقی پسند شاعر کی طرح حیات و ممات، امن اور جنگ انصاف اور بے انصافی، مساوات و استحصال، ترقی پسندی اور رجعت پسندی میں انتخاب کرتے ہوئے زندگی، امن، انصاف اور مساوات، ملک کی خوش حالی اور ترقی کو منتخب کیا اور عمر بھر انھیں مثبت قدروں کے لیے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعہ جدوجہد کرتے رہے۔ اس وقت بھی جب ترقی پسند تحریک مدھم پڑ گئی اور اچھے خاصے بڑے "ترقی پسند شاعر اور افسانہ نگار" انفرادیت "اور سمجھوتہ پرستی کا شکار ہو گئے"، وامق ثابت قدمی سے اپنی روش پر چلتے۔ انھوں نے مسلسل فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف آواز بلند کی اور بد سے بدتر حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔

مہاتما گاندھی کے سانحۂ قتل پر لکھتے ہوئے بھی انھوں نے نظم کے آخر میں اسی امید افزا لہجے میں کہا ؎

غلط کہ میر کارواں
غلط کہ اپنا پاسباں
نظر سے دور ہو گیا
نظر سے دُور ہوتے ہی دلوں میں کھنچ کے آ گیا
شکستہ تارِ رُوح و جسمِ قوم کو ملا گیا

اور آخر میں ؎

نقیبِ وقت سے کہو
کہ انقلاب کے وہی پُرانے نعرے پھر لگائے
جو راستوں سے ہٹ گئے ہیں ان کو راہ پھر دکھائے
یہاں تلک یہاں تلک
کہ باقی کوئی رہ نہ جائے
دلوں میں جن کے چور ہیں
وہ خوب اس کو جان لیں
کہ رات اب نہ آئے گی
گھٹا کبھی نہ چھائے گی
کہ جس کی آڑ میں کوئی کمند پھر لگا سکے
جو سو رہے ہیں جاگ اُٹھیں
وہ چاند جو نظر سے چھُپ گیا تھا بن کے آفتاب
دلوں کو اک نئی شعاعِ زندگی سے گوندھتا
بلند ہوتا جا رہا ہے مشرقی فضاؤں میں

نظیر اکبر آبادی کی طرح وامق جون پوری بھی پورے طور پر ہندستانی شاعر ہیں۔ اُردو کی شاعری میں کافی لمبے عرصے تک گل و بلبل، ساغر و مینا، سنبل و ریحان، سوسن و لالہ، طوطی و قمری، دجلہ و فرات، موسیٰ و کوہ طور، کے عربی فارسی استعارے مستعمل رہے۔ میری جوانی کے دنوں تک اردو غزل کا محبوب ایک خوبصورت و کم سن ترک غمزہ زن ہی رہا۔

نظیر نے اپنے زمانے میں اس روش کے خلاف بغاوت کی تھی بعد میں علامہ اقبال نے بھی حب الوطنی سے بھرپور نظمیں لکھ کر اس پرانی روش سے بغاوت کی اور رام، گرو نانک، گوتم بدھ، سوامی رام تیرتھ، جیسے رہ نماؤں پر نظمیں کہیں اور پھر ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت کے خلاف گنگا جمنی زبان میں اپنی مشہور نظم "نیا شوالہ" لکھی۔ اسی زمانے میں تحریک آزادی بھی اپنے عروج پر تھی، اس کے زیرِ اثر جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، عظمت اللہ خاں اور ان کے احباب نے نہایت سیدھی سادی زبان میں دیس کی مٹی کی خوشبو میں بسی نظمیں اور گیت لکھے۔

بعد کے شعرا میں وامق ہی واحد ایسے شاعر ہیں جو سو فیصدی اپنے ملک کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں نہ صرف دیس کی مٹی کی خوشبو ہے بلکہ پیڑ، پودوں، پھول پتوں، چرند پرند، ندی نالوں، ٹیلے پہاڑوں صنعت و حرفت کا بھی ذکر ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا وہ ہمارے مشترکہ کلچر سے محبت کرنے والے اور اس کی بقا کے خواہش مند ہیں۔ ذرا وامق کی نظم "نیلا پرچم" کے یہ مصرعے دیکھیے ؎

ہماری تہذیب، جس کے معمار تلسی و کالی داس جیسے
برہنہ انسانیت کے تن پر پہنایا جائے لباس جیسے
ہماری تہذیب کے غزل خواں ٹیگور، رس خان و میر جیسے

ہماری تہذیب کے نگہباں ہر شینڈ اور نظیر جیسے

حیات جاوید پا چکے ہیں
مگر یہ ڈر ہے کہ مر نہ جائیں
یہ سچے موتی بکھر نہ جائیں
کتھا کلی کا وہ پیرہن تم سے امن کی بھیک مانگتا ہے
منی پور کا کنوار پن تم سے امن کی بھیک مانگتا ہے
کتھک اوادوں کا بانکپن تم سے امن کی بھیک مانگتا ہے
اگر نہ یہ جنگ رک سکی تو
یہ صنعتیں، جن کو سینے سے ہم لگائے رکھے ہوئے ہیں اب تک
ہمارے گمنام دستکاروں کے ساتھ ہی ساتھ جل بسیں گی

اور اس مشترکہ ثقافتی سرمائے میں وامق نے اس نظم میں بنارسی پوتھ اور ساڑیوں، لکھنؤ کے کھلونوں، چکن اور زردی کے کپڑوں، سری نگر کے نرم و ملائم پشمینے اور ملک کے دوسرے حصوں کی دست کاریوں کا بھی ایسا ذکر کیا ہے، جیسا اردو کے کسی دوسرے عصری شاعر کے ہاں نہیں ملتا. وامق ان صنعتوں اور دست کاریوں کی ترقی اور بہبود کے خواہاں ہیں. اسی لیے وہ جنگ کے خلاف ہیں اور دنیا بھر میں امن چاہتے ہیں.

وامق سچے عوامی شاعر ہیں۔ میں ہر دلعزیز شاعر کو عوامی شاعر کے مترادف نہیں مانتا. کوئی شاعر لاتعداد پڑھے لکھے لوگوں میں ہر دلعزیز ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہمارے کروڑوں ناخواندہ مزدور کسان بھی اسے اتنا ہی سمجھ پائیں یا پسند کر سکیں.

سچے عوامی شاعر کو سب سے پہلے اپنی زبان کو عوامی زبان کے قریب لانا ہوتا ہے. وامق کے شعری مجموعے پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی ہے. اس مقصد کے تحت انھوں نے اپنی تحریر میں نہ صرف ان الفاظ کو لے لیا جنھیں اساتذہ استعمال کرتے تھے لیکن انھیں متروک قرار دے دیا گیا. انھوں نے ہندی کے روزمرہ کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں. اس کے ساتھ ہی غیر شاعرانہ لیکن اپنے اندر اظہار کی بے پناہ قوت رکھنے والے اور آسانی سے سمجھ میں آجانے والے الفاظ، فقرے اور محاورے وضع کرنے اور انھیں استعمال کرنے سے پرہیز نہیں کیا. اس کے علاوہ انھوں نے اپبھرنش سے بھی کام لیا اور اپنے عوامی گیتوں کے لیے ایسی زبان استعمال کی جو عوام کے بالکل قریب ہو. یہ سارے تجربے انھوں نے اپنی ان نظموں میں بھی کیے ہیں جن میں نہ صرف فارسی کے دقیق الفاظ ہیں بلکہ خیالات بھی عمیق ہیں. لیکن عوامی تخلیقات کو وامق نے عوام کی زبان ہی میں قلم بند کیا ہے. ذرا ان کی نظم "بھوکا ہے بنگال" کے تین بند دیکھیے ؎

پورب دیس میں ڈگی باجے پھیلا سکھ کا کال
دکھ کی اگنی کون بجھائے سوکھ گئے سب تال
جن ہاتھوں نے موتی رولے آج وہی کنگال
ساتھی آج وہی کنگال

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال
پیٹھ سے اپنی پیٹ لگائے لاکھوں الٹے کھال
جیون مرن کے ڈانڈے ملائے بیٹھے ہیں چنڈال
ساتھی بیٹھے ہیں چنڈال

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال
کوٹھریوں میں گانجے بیٹھے بنئے سارا اناج
سندر ناری بھوک کی ماری بیچے گھر گھر لاج
چوپٹ نگری کون سنبھالے چاروں طرف بھونچال
ساتھی چاروں طرف بھونچال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

زبان کی فصاحت، سلاست اور روانی کے باعث سجاد ظہیر نے اسے عہد کا بہترین عوامی گیت کہا تھا. ذرا مزدوروں کا کورس گیت کے تین بند ملاحظہ فرمایئے ؎

جے جے بھارت ماتا
ہم سارے مزدور بھکاری!
کوئی تو آپ چھاتی سے لگاتا
جے جے بھارت ماتا
ہم سب محنت کرنے والے
جگ کی خاطر مرنے والے

جے جے بھارت ماتا

اپنے ہاتھ میں اپنی سینا
اپنی ناؤ کو خود ہی کھینا
اپنی کھیتی اپنا جاتا

جے جے بھارت ماتا

واثق اُردو شاعری کے دونوں اصناف نظم اور غزل پر یکساں دسترس رکھنے والے قادر الکلام شاعر ہیں۔ کچھ لوگ تو یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ بہتر غزل گو ہیں۔ بات شاید ایسی نہیں ہے۔ چونکہ نظمیں انھوں نے عوام کے لیے لکھی ہیں اور شعوری طور پر ایسے گیت قلم بند کیے جنھیں عام کسان مزدور سمجھ سکیں، اسی لیے اپنے گیتوں میں نہ صرف انھوں نے زبان نہایت سیدھی سادی اور عام فہم استعمال کی ہے بلکہ اپنی بات کو قدرے پھیلا کر بھی کہا ہے۔ غزل میں شعر کے دو مصرعوں میں چونکہ پوری بات کہی جاتی ہے اس لیے زبان کی سلاست کے باوجود بات گہری ہو جاتی ہے اور یوں جن باتوں کو واثق جیسے کمیٹڈ ترقی پسند شاعر نے اپنی نظموں میں پھیلا کر کہا ہے انھیں کو اپنے اشعار میں اختصار کے ساتھ رمزیہ انداز میں کہا ہے۔

کسی چھوٹے سے مقالے میں واثق کی غزلوں سے پورا انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے روایتی غزلوں سے لے کر انفرادی عشق و محبت تک اور دوست کے جذبات کی عکاسی کرنے والے نہایت مؤثر رومانی اشعار کہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے عصری آگہی اور ترقی پسندی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ چونکہ اس مختصر مقالے میں واثق کی ترقی پسند شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس لیے میں اپنے آپ کو ان کی غزلوں کی اسی جہت تک محدود رکھوں گا۔

واثق کو اپنی آواز کے جادو کا پورا احساس ہے اور اس پر فخر بھی ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہماری طرزِ نوا پہ واثق مذاقِ محفل کچھ ایسا بدلا
کہ آ رہا ہے نظر ہر اک شنواز بدظن خود اپنی نے سے

یہ تیری جادو نوائی اور تغنّی سلامت رہے ہمیشہ
ترانۂ وقت گا رہا ہے تو گانے والے عجیب لے سے

واثق جذباتی شاعر ہیں، غم و اندوہ، صعوبتوں اور مصیبتوں سے وہ ہارنے والے شاعر نہیں ہیں اور نہ ہی وہ ذہنی عیاشی کی طرح غم کی لذت میں سکھ پانے والے شاعر ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

دست و پا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں
لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں

نالہ کرنا مرا دستور نہیں
آسماں ورنہ بہت دُور نہیں

دل لرزتا ہے کہ وہ وقت نہ آ جائے کہیں
غم میں ہونے لگے جب لذتِ غم کا احساس

مت کہ ناصحا، مرے نکتہ چیں تجھے میرے دل کی خبر نہیں
میں حریفِ مسلکِ زندگی تجھے سنگِ در کی تلاش ہے

واثق اندھی عقیدت، کورانہ تقلید اور کھوکھلی روایات کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی وہ قسمت کے سہارے جینے میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ خود اعتمادی اور جدید علوم کی مدد سے زندگی کو بہتر بنانے میں یقین کرتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں ؎

یقیں سے کام لو وہم و گماں سے کچھ نہیں ہوتا
زمیں کے رہنے والو آسماں سے کچھ نہیں ہوتا

اور

امیدی پر جیتے رہنا توہین ہے جینے والوں کی
اس علم و یقیں کی دنیا میں جینے کے سہارے اور بھی ہیں

بندھوا مزدوروں اور بیگاری مزدوروں کے بل پر اپنی حکومت کو برقرار رکھنے والے نظام کے خلاف اپنے غیظ و غضب کا اظہار انھوں نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے ؎

ہمت ہے نام پہ ظلم کہیں ہے برقرار
ظلم کہیں برقرار دیکھئے کب تک رہے

تحریک آزادی اور دیگر عوامی تحریکوں میں حصہ لیے بغیر کوئی لیڈر سچا لیڈر نہیں بن سکتا۔ خود ساختہ اور نام نہاد لیڈروں کے خلاف ان کا غصہ دیکھئے ؎

جن ہاتھوں نے پھاڑے نہ کبھی جیب و گریباں
ان ہاتھوں سے ہو سکتی نہیں بخیہ گری بھی

واثق اظہار رائے کی آزادی کے زبردست حامی ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ صرف اظہار رائے کی آزادی بلکہ حقیقی آزادی حاصل کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ انھیں یقین ہے کہ یہ نظام بدل کر رہے گا ؎

جہاں گفتگو پہ زباں کٹ رہی ہو
جہاں گردنِ فن پہ تیغیں اٹھی ہوں
دماغ اور دل پہ جہاں بندشیں ہوں
وہاں مشقِ فکر و نظر ہو تو کیسے
یہ اندھیر نگری بہت دور تک ہے
لیڈروں کی بستی بہت دور تک ہے
گزرنا ادھر ہی سے ہے کارواں کو
بغیر تصادم گزر ہو تو کیسے
غرض یہ کہ واثق زمانے کی صورت
نہیں آج تو کل بدل کر رہے گی
جو ہونا ہے وہ آج ہی ہو بھی جاتا
یہ دل چاہتا ہے مگر ہو تو کیسے

آخر میں بہتر سماج کے لیے واثق کی خواہش کا ذکر کرتے ہوئے میں اس باب کو ختم کرنا چاہوں گا۔ واثق محسوس کرتے ہیں کہ ہر انقلاب کے لیے نئی قدریں بنانی پڑتی ہیں اور نئے معیار قائم کرنے کے لیے ان میں تبدیلی ناگزیر ہے وہ کہتے ہیں ؎

ہر تغیر کے لیے قدر نئی بنتی ہے
ظلم بڑھتا ہے معیار بدلنے کے لیے

□□

کلاسیکی متون کی تدوین: مذاکرہ کا بقیہ

موجودہ ڈی لکس ایڈیشن کی ضخامت ۱۹۷ صفحات پر حساب ایک اور ساڑھے تین کا ہوا۔ سیدھے سادے حساب سے طلبا ایڈیشن کی قیمت گھٹ کر ۳۵، ۴۰ روپے تک آجائے گی۔

موجودہ کتاب انجمن نے چھاپی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے قیمت میں اپنا منافع بھی شامل کیا ہوگا۔ اگر یہی کتاب یوپی اردو اکیڈمی جیسا ادارہ "نفع نقصان مساوی" کی بنیاد پر چھاپے تو یہی کتاب طلبا کو ۱۷، ۱۸ روپے میں دستیاب ہو سکتی ہے۔

نصابی متن کے لیے اتنے ضمیموں کی بھی ضرورت نہیں، ایک ضمیمہ اسماء اماکن کا اور ایک فرہنگ۔ بس یہ دو ضمیمے کافی ہوں گے۔ البتہ فرہنگ میں جو الفاظ شامل کیے جائیں گے ان کے صفحات کا حوالہ ضرور دیا جائے گا۔ اگر کتاب کی ضخامت اجازت دے تو انتخاب اشعار کا ضمیمہ بھی نصابی متن میں شامل کیا جا سکتا ہے ورنہ اس کمی کو استاد اس مفصل ایڈیشن کی مدد سے خود پورا کرے گا جو الگ سے علما اور اساتذہ کے لیے شائع کیا جائے گا جیسا کہ یہ موجودہ ایڈیشن ہے۔ اس ایڈیشن میں بھی مناسب ترمیم و اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اس میں سے چوتھا ضمیمہ "الفاظ اور طریق استعمال" بے دریغ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کے مشمولات ضمیمہ "تلفظ اور املا" وغیرہ میں آ گئے ہیں۔ "تشریحات" اور "فرہنگ" سے بھی یہ کمی پوری ہو گئی ہے۔ مرتب چاہے تو تنقیدی حصے کو نصابی سلسلے کے اساتذہ ایڈیشن میں شامل رکھے (واضح کی گنجائش تو چھٹے ضمیمے کے حذف سے نکل ہی آئے گی) ورنہ دانش گاہوں کی لائبریریوں میں تو دونوں ایڈیشن موجود ہوں گے ہی۔ استاد طلبا ایڈیشن سے بھی مدد لے سکتا ہے اور خود اپنے علم اور تجربے کی بنا پر بھی تدریس کے تقاضے پورے کر سکتا ہے۔

□□

غزلیں

علی احمد جلیلی

مکان نمبر ۲۲-۲-۳۴۴
سلطان پورہ۔ حیدر آباد

وہ شخص آج جو ہنسنے کی بھول کرتا ہے
فریب کھانے کی کوشش فضول کرتا ہے

جو تھام لیتا ہے بڑھ کر کسی شکستہ کو
یہ کام بھول نہیں، ہاں بھول کرتا ہے

کرے جو کام جراحت کا وہ کلام نہیں
کلام وہ ہے جو پتھر کو پھول کرتا ہے

بڑا ہے خون کے رشتے سے درد کا رشتہ
جو سب کو اپنا سمجھ کر قبول کرتا ہے

نہ پوچھ آنکھ ہے کیوں میری ڈبڈبائی ہوئی
زمانہ ہنسنے کی قیمت وصول کرتا ہے

نظامِ وقت نے کب کس سے ہار مانی ہے
مٹا کے سب کو وہ قدموں کی دھول کرتا ہے

گناہ کیا ہے علی، ہے گناہ کا احساس
گنہ کی یاد سے کیوں دل ملول کرتا ہے

اقبال ٹانڈوی

حیات گنج۔ ٹانڈہ
فیض آباد

غرقاب سفینوں کی خبر لے کے نہ جانا
ساحل پہ بھی طوفاں کا اثر لے کے نہ جانا

کانٹوں پہ بھی چلنا تو لیے عزمِ بہاراں
پھولوں میں کبھی کانٹوں کا ڈر لے کے نہ جانا

دیوانوں میں رہنا تو ذرا ہوش میں رہنا
فرزانوں میں لیکن یہ ہنر لے کے نہ جانا

اک تم ہی نہیں اور بھی ہیں ہوش کے مارے
سائے سے جب اٹھنا تو شجر لے کے نہ جانا

درشام ہے آئینہ ابھی دیدہ وروں پر
اقبال وہاں داغِ جگر لے کے نہ جانا

حکیم مسعود احمد عباسی مُبصّر امروہوی

نگر سہا یکا یونانی ڈسپنسری
شاہ پیر گیٹ۔ میرٹھ

معطّر ہیں وہ گلہائے چمن سے
نہیں واقف جو کانٹوں کی چبھن سے

پڑا جب واسطہ اک دل شکن سے
ہوئے آگاہ دُنیا کے چلن سے

نمودِ عشق ہے سینہ بہ سینہ
معطر پیرہن ہے پیرہن سے

دیا ہے خونِ دل اک اک کلی کو
چمن شاداب ہے اہلِ چمن سے

میں خود اپنی جگہ اک انجمن ہوں
غرض کیا مجھ کو اہلِ انجمن سے

دماغ و دل ہیں اپنے بے تعلق
نشاط آرائی کام و دہن سے

زمانہ درپئے جاں ہے مُبصّر
ملا کیا اکتسابِ فکر و فن سے

پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری

معرفت راج پارک ویو ہوٹل
امین آباد۔ لکھنؤ

نوادرِ غالب

اس وقت میرے پیشِ نظر مجموعۂ خطوطِ غالب عودِ ہندی کے دو ایڈیشن ہیں۔ ایک وہ جو غالب کے انتقال کے چند مہینے پہلے ستمبر ۱۸۶۸ء میں ممتاز علی خاں کے اہتمام سے مطبع مجتبائی میرٹھ میں شائع ہوا تھا، اور دوسرا وہ جو مطبع نول کشور کان پور میں مئی ۱۸۸۷ء میں چھپا تھا۔ یہ نسخہ نایاب ہے اور اس کی تاریخِ طبع منشی بھگوان دیال تخلص عاقل نے کہی تھی ؎

عود ہندی است طرفہ انشائی
غالب از بس دُرِ معانی سُفت
سالِ تاریخ طبع او عاقل
"چہ عجب رقعات غالب گفت"

۱۸۸۷ء

یہ نسخہ جناب میر کرامت علی خاں صاحب انچارج مخطوطات، حکومت آندھرا پردیش (سابق کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد) کی ملکیت میں ہے۔ نسخے کے استفادے کے لیے میں ان کا ممنونِ کرم ہوں۔

عودِ ہندی کے بعد مرزا غالب کے خطوط کا دوسرا مجموعہ مولانا حالی کی نگرانی میں ۱۸۹۹ء میں پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی دہلی میں میر مہدی مجروح کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ یہ نسخہ بھی راقم حروف کے پیشِ نظر ہے۔

عودِ ہندی اور اردوئے معلی کی پہلی اشاعتوں کے بعد آج تک خطوطِ غالب کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان میں سے میرے پاس فی الحال مولانا مہر کے خطوطِ غالب طبع پنجم ۱۹۸۲ء اور ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کے "غالب کے خطوط" مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی (۱۹۸۷ء) کی پہلی، دوسری اور تیسری جلد موجود ہیں۔ ذیل میں غالب کے وہ خطوط ان کے عکس کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں جو غالب کے ابتدائی مجموعوں میں نہیں ملتے ہیں۔ کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جو غلام رسول مہر، ڈاکٹر خلیق انجم یا کسی اور صاحب نے شائع نہیں کیے ہیں۔ تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

وصل بلگرامی اُردو کے مشہور شاعر، صاحبِ طرز انشا پرداز اور صحافی تھے۔ انھوں نے جنوری ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ سے "مرقع" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا تھا اس کے سرورق پر اقبال کا شعر ہوتا تھا۔ یہ شعر خود اقبال نے انھیں ایک خط کے ساتھ بھیجا تھا جسے راقم حروف نے "نوادراتِ اقبال" کے نام سے "شاعر" بمبئی اقبال نمبر ۱۹۸۸ء کے صفحہ ۷۷ پر شائع کرایا ہے۔ "مرقع" لکھنؤ بابت مارچ ۱۹۲۶ء میں غالب کے دو خط شائع ہوئے ہیں۔ یہ دونوں خط عودِ ہندی یا اُردوئے معلی میں نہیں ہیں۔ دوسرا خط جو نواب انوار الدولہ تخلص شفق کے نام ہے پہلی مرتبہ "اُردو" اورنگ آباد (انجمن ترقی اُردو) بابت جنوری ۱۹۳۴ء ص ۱۹۳ - ۱۹۵ میں بغیر حوالے کے چھپا تھا۔ یہ خط جناب خلیق انجم صاحب نے اپنی کتاب "غالب کی نادر تحریریں" ص ۳۳ اور ۳۴ میں شائع

[illegible] نے اس خط کو "غالب کے خطوط" میں شامل نہیں کیا۔ موصوف نے کتاب کی تیسری جلد میں ص۹۰۹ سے ص۱۰۳۲ تک شفق کے نام ۲۰ خطوط درج کیے ہیں۔ صفحہ ۱۳۱۰ سے ۱۳۱۲ تک انھوں نے شفق کے نام خطوط کے ماخذ لکھے ہیں۔ لیکن یہ خط کہیں درج نہیں ہے۔ راقم نے ان کے نام رجسٹری کر کے خط لکھا جس میں زیر نظر خط شامل نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تھی۔ انھوں نے جواب لکھنے کی زحمت نہیں فرمائی۔ جناب غلام رسول مہر نے شفق کے نام کا خط "خطوط غالب" ص۴۹۴ بار پنجم ۱۹۸۲ء میں بغیر کسی حوالے کے شائع کیا ہے۔

جناب مالک رام (تلامذۂ غالب بار دوم ۱۹۸۴ء) اور غلام رسول مہر نے نواب انوار الدولہ شفق کو نواب وزیر الملک عماد الملک میر شہاب الدین غازی الدین خان بہادر ثالث تخلص نظام کا پرپوتا لکھا ہے جبکہ میر کرامت علی خاں (ریسرچ آفیسر اورینٹل لائبریری حکومت آندھرا پردیش سابق کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد) جو خانوادۂ آصف جاہی کے شعرا پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ ان کی رائے میں شفق عماد الملک نظام کے پرنواسے تھے۔ شفق کے والد نواب احمد خاں بخش تخلص بیتاب تھے۔ ان کے والد ناصر الدولہ تخلص ناصر نظام کے داماد تھے۔

شفق پہلے سید امجد علی قلق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ بعد ازاں مرزا غالب سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینے لگے۔ یہ سلسلہ آخر تک قائم رہا۔ شفق اور غالب کے درمیان غائبانہ ملاقات تھی۔ کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ غالب ان سے ملاقات کے لیے ہمیشہ بے قرار رہتے تھے۔ لیکن انھیں کالپی جانے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ ہی شفق ہی کبھی دہلی آ سکے۔ مرزا ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اپنے خطوط میں انھیں قبلۂ حاجات، قبلہ و کعبہ، خداوند نعمت اور پیر و مرشد وغیرہ کے معزز القاب سے یاد کرتے تھے۔

شفق صاحب دیوان تھے لیکن راقم الحروف کی نظر سے ان کا دیوان کہیں نہیں گزرا ہے۔ دو مثنویاں "چشمۂ فیض"، "شعلۂ جاں سوز" اور ایک اور مولود منظوم حضرت رسالت مآبؐ کی تعریف میں "مخزن السعادت" کے نام سے ۱۸۵۳ء میں شائع کیا تھا۔ ایک نظم "قصۂ مہر و ماہ" اردو میں تصنیف کی تھی ۱۲۶۵ھ میں۔ ان کے علاوہ ایک مثنوی "بہار" بھی تھی۔ اس کی تاریخ تصنیف میر امجد علی قلق نے کہی تھی:

بلبل طبع شفق زد ایں نوا
طرفہ دیر حسن و عشق جاں فزا
۱۲۴۴

شفق کا انتقال ۱۲۹۸ھ (۸۱-۱۸۸۰ء) میں ہوا۔ اپنے پیچھے اولادِ جسمانی میں چار بیٹے چھوڑے۔ ان کے چھوٹے بھائی نواب نور الدین خاں عرف سانولے صاحب بھی شاعر تھے اور شیفق اور فروغ تخلص کرتے تھے۔ نساخ نے سخن شعرا میں ان کا ذکر کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ وصل بلگرامی نے غالب کے دو خط "حضرت غالب مرحوم کے دو خطوں کا عکس" کے عنوان سے "مرقع" لکھنؤ بابت مارچ ۱۹۲۶ء میں شائع کیے تھے۔ دونوں خطوط کی سند کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:-

خط نمبر (۱)

"مکرمی جناب مولوی ابوالحسن ابن جناب مولانا عبد الحق صاحب حقانی مرحوم دہلوی نے مجھے عنایت فرمایا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ خط کس کے نام ہے اور اس میں جس رباعی کا ذکر ہے وہ رباعی بھی نہ مل سکی۔ بہر حال یہ تحریر حضرت غالب مرحوم کی ہے جو ایک یادگار چیز ہے۔"

خط نمبر (۲)

"حضرت غالب مرحوم نے اپنے شاگرد جناب نواب انوار الدولہ سعد الدین خان بہادر معاش دار ریاست کوورا تخلص بہ شفق کے نام تحریر فرمایا ہے۔ یہ خط جناب نواب شفق بہادر کے صاحبزادے جناب نواب سعید الدولہ محمد محی الدین خاں بہادر سے جناب سید احمد حسن صاحب بن سید شاہ قطب اعظم مرحوم ساکن و گزارہ دار ریاست باؤنی کوورا کو ملا، اور اب میں نے اس کو مکرمی جناب سید شریف احسن

صاحب حبیب کنتوری سے لے کر عکس لیا۔ اڈیٹر"

خط نمبر (۱)

"بندہ پرور! آج میں نے دو انگریزی عرضی روانہ کر دی اور صبح کو آپ کا کہا ر مسودہ اور میرے محسن کا رقعہ آپ کے نام مجھ کو دے گیا۔ ۱۲

اس عنایت کے شکریے میں کیا خدمت بجا لاتا۔ بارے ایک رباعی بھیجتا ہوں۔ اس کو آپ پڑھ کر اور لطف اٹھا کر راجہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیجئے۔ ۱۲

امید پہ تشدید میم و تخفیف میم دونوں طرح مستعمل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جناب ممدوح اس کو زحاف سمجھیں۔ پہلے اور دوسرے مصرعے میں بہ تخفیف میم ہے اور تیسرے مصرع کا میم مشدّد ہے۔ ۱۲

غالب ۱۲"

اس خط کا ذکر غالب کے کسی مجموعۂ خطوط میں نہیں مل رہا ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا مکتوب الیہ کون ہے اور غالب کی اس رباعی کا کیا ہوا۔

خط نمبر (۲)

شفق کے نام اصلاحی ہے۔ اس میں گرامر اور تذکیر و تانیث کا ذکر کیا گیا ہے۔ خط کے آخری جملے یہ ہیں :۔

"خداوند آئین بندہ پرور ہے۔ بھول نہ جاؤ۔ گاہ گاہ نامہ و پیام بھیجتے رہو۔ کیا میں یہ نہیں لکھ سکتا کہ میں نے دو خط بھیجے اور آپ نے ایک خط کا جواب نہیں لکھا۔ ہاں یہ عرض کرتا ہوں کہ آج صبح کو آپ کا خط آیا۔ ادھر پڑھا ادھر جواب لکھا۔ سچ یوں ہے کہ ڈاک میں اکثر خطوط تلف ہوتے ہیں۔ بیرنگ پر ضائع ہونے کا گمان کم ہے۔ اس دستور کا عادی اور بانی میں ہوتا ہوں۔ یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں۔ آپ بھی اب جب کبھی بغرض محال خط بھیجیے تو بیرنگ بھیجئے۔ زیادہ حدِ ادب۔ عرضداشت، غالب۔ نگاشتہ چہارشنبہ سیوم شعبان دہم مارچ

سال حال ۱۲"

خط نمبر (۳)

مرزا غالب خاندانی نواب تھے۔ لیکن ہمیشہ معاشی بدحالی میں مبتلا رہے۔ اخراجات زیادہ اور آمدنی قلیل تھی۔ مجبوری کے عالم میں لوگوں کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی لاچاری اور مجبوری ان کی خودداری کو ٹھیس پہونچاتی تھی۔ پنشن کی واگزاری کے لیے انھیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

غالب کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اس میں سبھی مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ انہی میں منشی کشوری لال ایک صاحب تھے۔ انھوں نے راجا بیکانیر سردار سنگھ (متوفی ۱۸۷۲ء) سے مشورہ کر کے غالب سے سکے کے لیے مسودے مرتب کرائے۔ اس کے عوض غالب کو ایک ہزار روپیہ ملا تھا۔ غالب نے اپنے خط میں تعارف کے طور پر مہاراجہ کو یہ بھی لکھا تھا:۔

"یہ گوشہ نشین سرکار فیض آثار انگریزی کا بعوض پنشن دار اور گورنمنٹ کے دربار میں سات پارچے اور تین رقم خلعت پانے والا اور ..... ملکۂ معظمۂ دوراں کا مداح اور بقلم وزرائے شاہنشاہی سارٹی فکٹ خوشنودی کا پائے ہوئے ہوں۔"

خط کے آخری الفاظ یہ ہیں :۔

" اب نیازمند اس عنایت کا متوقع ہے کہ اُنڈ میں راج کا متوسل اور سری مہاراج کا دولت خواہ اور دُعاگو گنا جاؤں اور جو کام میرے لائق ہو بے تکلف اس کے سرانجام کا مجھ کو حکم ہوا کرے۔ زیادہ ادب بہارستان جاہ و جلال بے خزاں و بہار دولت و اقبال جاوداں باد۔ نیازمند اسد اللہ غالب"

یہ خط اطہر پرویز کی دریافت ہے۔ اس کا عکس سب سے پہلے "آجکل" دہلی بابت ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں زعفرانی روشنائی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اسے ڈاکٹر خلیق انجم نے تخفیف کر کے "غالب کے خطوط" جلد دوم ص ۹۵۶ میں شائع کیا۔ عکس اتنا باریک

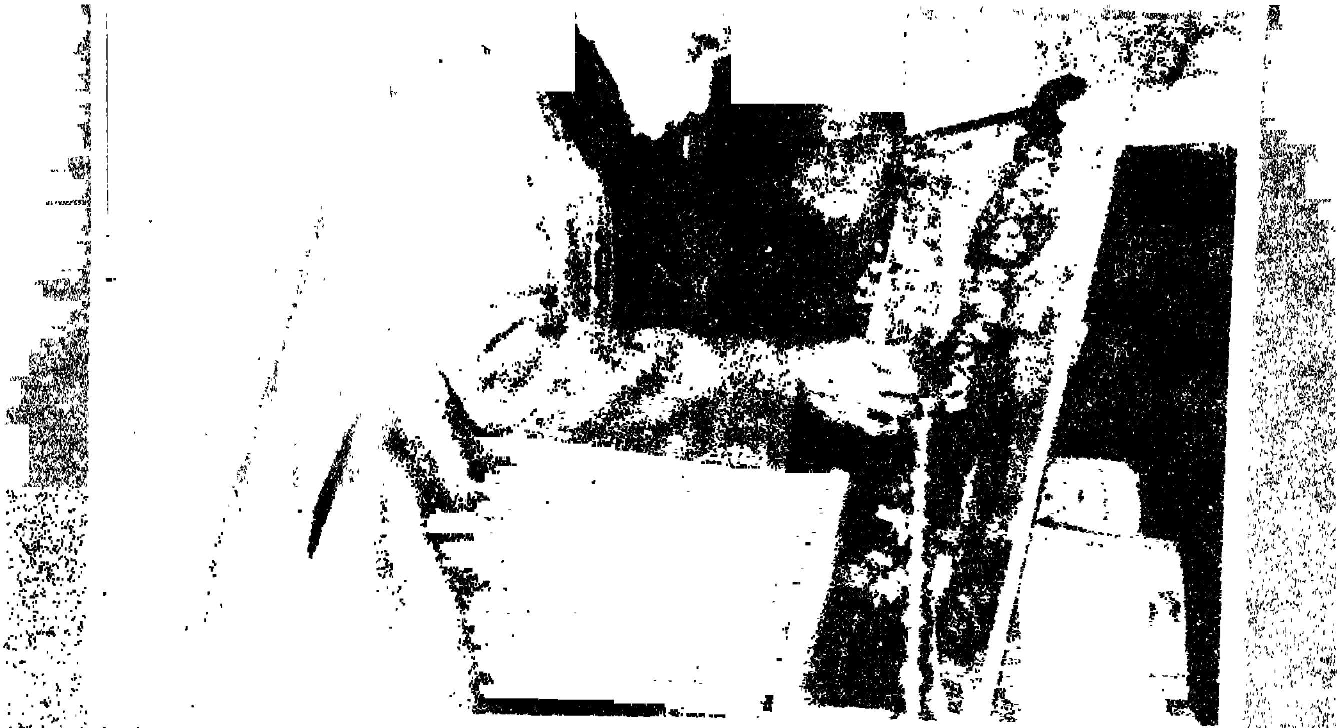


گورنر اترپردیش شری بی ستیہ نرائن ریڈی ۱۳؍جنوری ۱۹۹۱ء کو راج بھون میں ہفت روزہ "عـزم نو" (لکھنؤ) کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے

وزیر اعلا اترپردیش شری ملائم سنگھ یادو ۲۰؍جنوری کو لکھنؤ میں ہندی ہفتہ وار "وشو دوت" کی رسم اجراء ادا کرتے ہوئے



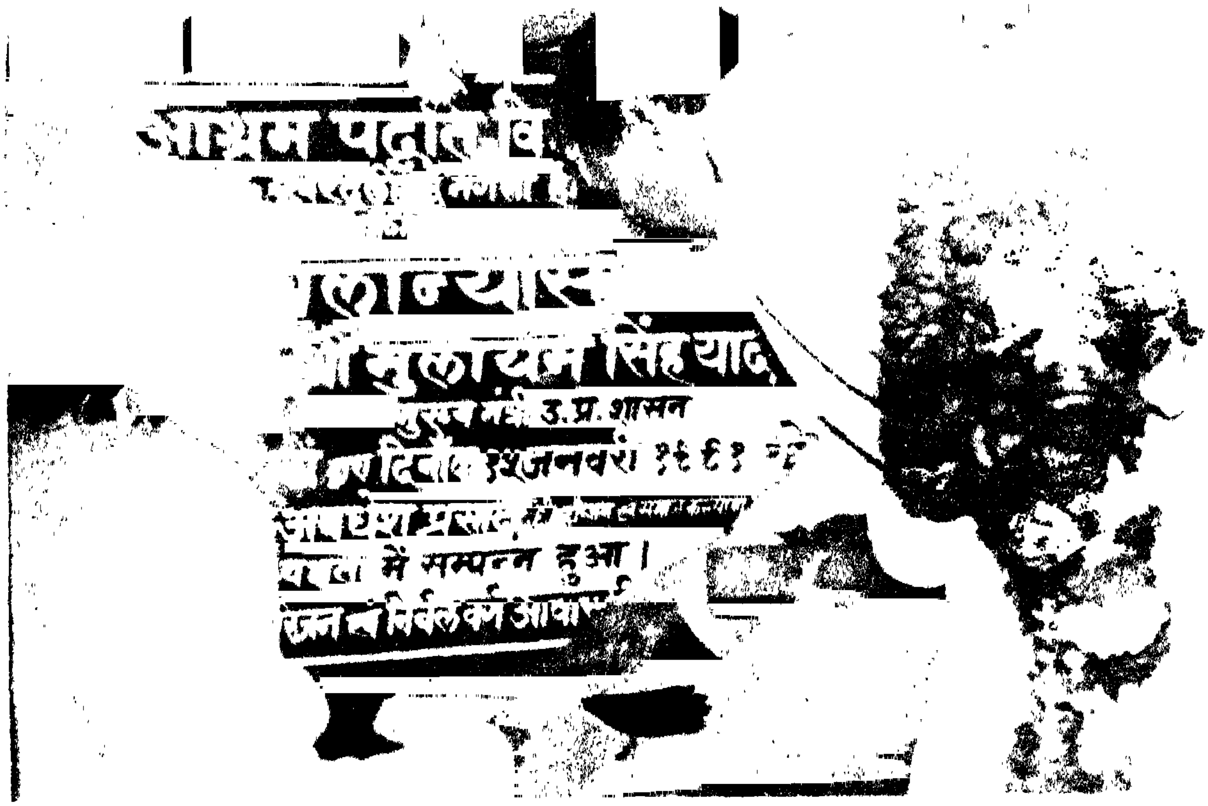




یوپی قانون ساز کونسل کے چیرمین شری شیو پرشاد گپتا سہکاریتا بھون (لکھنؤ) میں کلیان ہندی پریشد (اترپردیش) کے زیر اہتمام ۲۳ جنوری کو نیتا جی سبھاش چندر بوس کے یوم پیدائش کے موقع پر منعقدہ تقریب میں نیتا جی کی تصویر کی گل پوشی کرتے ہوئے۔

وزیر اطلاعات اترپردیش شری رام سنگھ یادو ۱۹ جنوری کو کینٹ اسپاٹ (لکھنؤ) میں محکمہ کے افسران کو خطاب کرتے ہوئے۔





وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو ۱۵ر جنوری کو ضلع اٹاوہ میں آشرم طرز کے اسکول کی عمارت
کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔

وزیر تعلیم شری اشوک باجپئی ۲۳ر جنوری کو گنّا سنستھان (لکھنؤ) میں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ
کے امتحان میں اولین مقام حاصل کرنے والی طالبات کو انعامات تقسیم کرتے ہوئے۔



نثر کو دیکھا اور اس کو موافق حکم آپ کے بعض جا درست کر دیا۔ بعض موقع پہ منشائے اصلاح بھی لکھ دیا ہے مجھ کو یہ پایہ نہیں کہ آپ کی نثر میں دخل کروں۔ بمصداق الامر فوق الادب حکم بجالایا ہوں۔ مرحبا! آفرین بخدا خوب نثر لکھی ہے۔ اللہ سبحانہٗ آپ کو مدارجِ اعلیٰ کو پہونچادے اور سلامت رکھے۔

مرقومہ دوشنبہ ۱۴ جولائی ۱۸۶۲ عیسوی
خوشنودیِ احباب کا طالب۔ غالب"

خط نمبر (۶)

سید علی ہاشم پٹنہ نے مولانا شاد عظیم آبادی پر ایک مضمون "حضرت مولانا شاد مدظلہ" کے عنوان سے لکھا جو حسرت موہانی کے مشہور و معروف رسالہ "اردوئے معلی جلد ۳، نمبر ۴ بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء صـ۳۸ پر شائع ہوا تھا۔ اس میں ہاشم صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۲۷۴ھ یا ۱۲۷۵ھ میں جب مولانا شاد بارہ تیرہ برس کے تھے تو انھوں نے لفظ "گیت" کے مذکر و مؤنث ہونے کے بارے میں مرزا دبیر کو خط لکھا تھا ان کی طرف سے جب کوئی جواب نہیں آیا تو شاد نے ایک منظوم خط مرزا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت غالب نے اس نظم کو بہت پسند کر کے جو جواب لکھا تھا وہ اس زمانے میں دست بدست پھرا کیا اور جناب سید علی ہاشم صاحب نے اردوئے معلی میں شائع کیا۔ یہ خط غالب کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔

" اورنگ نشین فصاحت زیب وسادۂ بلاغت۔

سلامت

دل پسند یافتم و بررسائی ذہن وقّاد گرامی عش عش گفتم۔ ایں کہ لفظ "گیت" بروزن صیت معمول ہندستاں را ازیں گم کردہ راہِ حقیقت تحقیق فرمودی۔ نہ آں چناںست کہ دیرین مہر کوشش اسد اللہ، مرزا دبیر سلمہ اللہ القدیر بپاسخ آں گراید .... و ضیعان ایں جا مذکرش خوانند۔ زیادہ عشق۔ خاکپائے
اسد اللہ غالبِ مغلوب

خط نمبر (۷)

دیوانِ غالب کا تیسرا ایڈیشن غالب کی زندگی میں "مطبع احمدی واقع دلہائی اموجان کے اہتمام سے بیسویں محرم الحرام ۱۲۷۸ ہجری کو مطبوع ہوا۔" ابتدا میں وہی دیباچہ ہے جو پہلے ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں شامل ہے۔ دیوان کے صـ۸۸ میں نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر رئیس لوہارو تخلص نیر رخشاں کا قطعہ تاریخ انطباع" (پانچ اشعار) درج ہے۔ اس کے بعد غالب کے دوسرے شاگرد مرزا یوسف علی خاں تخلص عزیز کا " قطعہ تاریخ انطباع دیوان طبع زاد" بھی پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ آخری شعر قطعہ کا یہ ہے ؎

لکھی عزیز خستہ نے تاریخ انطباع
حاسد کے سر کو کاٹ کے دیوانِ ریختہ
۸
۱۲۸۶-۸ : ۱۲۷۸ھ

اس تاریخ کے ساتھ ہی اہل مطبع نے غالب کا خط بھی شامل کیا خط کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:۔

" داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوانِ اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و دادِ آئین میر قمر الدین کی کارفرمائی اور خان صاحب الطاف نشان محمد حسین خان کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی ....."

جب دیوان کا یہ نسخہ چھپا اور غالب کی نظر سے گزرا تو وہ اس کی غلط طباعت سے چراغ پا ہو گئے۔ انھوں نے اپنے قلم سے اوپر کا حصہ قلم زد کیا یعنی اس کی ایک ایک سطر پر خط کھینچا۔ یہ خط متن کے علاوہ حواشی پر چاروں طرف چھپا تھا۔ خط کو قلم زد کر کے غالب نے اپنی مہر بھی نیچے ثبت کی ہے۔

دیوانِ غالب کا یہ نسخہ نادر الوجود ہے۔ اس کا ایک نسخہ حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد کی لائبریری میں اچھی حالت میں موجود ہے غالب اس کی تصحیح کرنا چاہتے تھے۔ پورے دیوان میں انھوں نے اپنے دستِ خاص سے سطروں کے نمبر بھی الگ سے دیے ہیں۔ مگر یہ وہ تصحیح شدہ نسخہ نہیں ہے جیسا کہ ان کے خط سے معلوم ہوتا ہے۔ غالب نے آخری صفحہ ۸۸ کی داہنی طرف کا حاشیہ کا غذ چپکا کر کوئی ڈیڑھ انچ بڑھایا

نثر کو دیکھا اور اس کو موافق حکم آپ کے بعض جا درست کر دیا۔ بعض موقعہ پر مقتضائے اصلاح بھی لکھ دیا ہے مجھ کو یہ پایہ نہیں کہ آپ کی نثر میں دخل کروں۔ بفحوائے الامر فوق الادب حکم بجالایا ہوں۔ مرحبا، آفرین بخدا خوب نثر لکھی ہے۔ اللہ سبحانہٗ آپ کو مدارج اعلیٰ کو پہونچا دے اور سلامت رکھے۔

مرقومہ دوشنبہ ۱۴ جولائی ۱۸۶۲ عیسوی
خوشنودی احباب کا طالب۔ غالب"

خط نمبر (۶)

سید علی ہاشم پٹنہ نے مولانا شاد عظیم آبادی پر ایک مضمون "حضرت مولانا شاد مدظلہ" کے عنوان سے لکھا جو حسرت موہانی کے مشہور و معروف رسالہ "اردوئے معلٰی" جلد ۳، نمبر ۴ بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۵ پر شائع ہوا تھا۔ اس میں ہاشم صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۲۷۴ھ یا ۱۲۷۵ھ میں جب مولانا شاد بارہ تیرہ برس کے تھے تو انھوں نے لفظ "گیت" کے مذکر و مؤنث ہونے کے بارے میں مرزا دبیر کو خط لکھا تھا ان کی طرف سے جب کوئی جواب نہیں آیا تو شاد نے ایک منظوم خط مرزا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت غالب نے اس نظم کو بہت پسند کر کے جو جواب لکھا تھا وہ اس زمانے میں دست بدست پھرا کیا اور جناب سید علی ہاشم صاحب نے اردوئے معلٰی میں شائع کیا۔ یہ خط غالب کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔

" اورنگ نشین فصاحت زیب و سادۂ بلاغت۔

سلامت

دل پسند یافتم و بر رسائی ذہن وقاد گرائی عش عش ہا گفتم۔ این کہ لفظ "گیت" بروزن صیت معمول ہندستان را ازیں گم کردہ راہ حقیقت تحقیق فرمودی۔ نہ آں چنانست کہ دیرین مہر کوش اسداللہ، مرزا دبیر سلمہ اللہ القدیر بپاسخ آں گراید.......... وضیعان ایں جا مذکرش خوانند۔ زیادہ عشق۔ خاکپائے

اسداللہ غالب مغلوب

خط نمبر (۷)

دیوانِ غالب کا تیسرا ایڈیشن غالب کی زندگی میں "مطبع احمدی واقع دلہائی محمد حسن جان کے اہتمام سے بیسویں محرم الحرام ۱۲۷۸ ہجری کو مطبوع ہوا۔" ابتدا میں وہی دیباچہ ہے جو پہلے ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں شامل ہے۔ دیوان کے صفحہ ۱۸ میں نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر رئیس لوہارو تخلص نیر رخشاں کا قطعہ تاریخ انطباع (پانچ اشعار) درج ہے۔ اس کے بعد غالب کے دوسرے شاگرد مرزا یوسف علی خاں تخلص عزیز کا قطعہ تاریخ انطباع دیوان طبع زاد بھی پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ آخری شعر قطعہ کا یہ ہے

لکھی عزیز خستہ نے تاریخ انطباع
حاسد کے سر کو کاٹ کے دیوان ریختہ

۸
۱۲۹۶ - ۱۸ = ۱۲۷۸ھ

اس تاریخ کے ساتھ ہی اہل مطبع نے غالب کا خط بھی شامل کیا جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

" داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و داد آئین میر قمر الدین کی کارفرمائی اور خان صاحب الطاف نشان محمد حسین خان کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی....."

جب دیوان کا یہ نسخہ چھپا اور غالب کی نظر سے گزرا تو وہ اس کی غلط طباعت سے چراغ پا ہو گئے۔ انھوں نے اپنے قلم سے اوپر کا حصہ قلمزد کیا یعنی اس کی ایک ایک سطر پر خط کھینچا۔ یہ خط متن کے علاوہ حواشی پر چاروں طرف چھپا تھا۔ خط کو قلمزد کر کے غالب نے اپنی مہر بھی نیچے ثبت کی ہے۔

دیوانِ غالب کا یہ نسخہ نادر الوجود ہے۔ اس کا ایک نسخہ حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد کی لائبریری میں اچھی حالت میں موجود ہے غالب اس کی تصحیح کرنا چاہتے تھے۔ پورے دیوان میں انھوں نے اپنے دستِ خاص سے صفحوں کے نمبر بھی الگ سے دیے ہیں۔ مگر یہ وہ تصحیح شدہ نسخہ نہیں ہے جیسا کہ ان کے خط سے معلوم ہوتا ہے۔ غالب نے آخری صفحہ ۸۰ کی داہنی طرف کا حاشیہ کاغذ چپکا کر کوئی ڈیڑھ انچ بڑھایا

یہ اوراق پر اپنے ہاتھ سے ذیل کا خط لکھا ہے جس کا عکس یہاں شائع کیا جاتا ہے ۔

"جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہونچے۔ دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخے کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اسی میں درج کر دیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بیکار محض ہو گیا ہے۔ خاتمہ کی عبارت کیا۔ میرا بیان کیا۔ میر قمرالدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں، کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ مجلد گویا مسودہ ہے اسی کو بھیج دیجئے۔ غالب ۱۲"

خط نمبر (۸)

غالب کا ایک نایاب خط جناب سید قدرت نقوی کو نومی عجائب گھر کراچی میں دستیاب ہوا۔ موصوف نے اس خط کی نقل اور تفصیلات "ہماری زبان" بابت ۸ راپریل ۱۹۹۰ء میں درج کی ہیں۔ ذیل میں یہ خط 'ہماری زبان' کے حوالے سے درج کیا جاتا ہے:

"خان صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان، سعادت واقبال توامان سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد ادائے ہدیہ سلام مسنون و دعائے ترقی دولت روز افزوں۔ غالبِ خونیں جگر کہتا ہے۔ اللہ اللہ میرے آقائے نامدار صاحبِ دُلدل و ذوالفقار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول حق ہے:

"عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِم"

آپ کا قصد تھا کہ کان پور سے الٰہ آباد اور وہاں سے کلکتہ جائیں۔ سو یہ واقع ہوا کہ کان پور سے آپ پھر لکھنؤ آئیں۔ ۱۲

اللہ! احسان حسین خان بہادر کا حال سُن کر بیتاب ہو گیا۔ اتنی طاقت کہاں کہ یہاں سے علی گڑھ تک ڈاک اور وہاں سے آگرہ تک اور کان پور تک ریل اور پھر کان پور سے لکھنؤ تک ڈاک میں پہونچوں اور ان کو دیکھوں۔ ناچار دعا پر مدار ہے۔ خالصاً للہ جلد جناب کی صحت کی نوید بھیجو۔ ۱۲

یہ نہ جاننا کہ غالب نے اس خدمت محقر میں قصور کیا۔ کتاب فروشوں کو کہہ رکھا ہے۔ مولویوں سے سوال کر چکا۔ تعلیقات شیخ ولی اللہ کا کہیں پتا نہ لگا۔ یہ کتاب معرض الطباع میں نہیں آئی۔ قلمی کہیں موجود نہیں۔

ہائے ہائے برادر دوست نوروز علی خاں خدا بخشے اس کو۔ کیسا لطیف اور خلیق اور دانا آدمی تھا۔ میں کیوں افسوس کروں؟ کیا مجھ کو ہمیشہ یہاں رہنا ہے بموجب قول شیخ علی حزیں ؎

مست گذارہ ایم چوں موج از قضائے ہم
در کاروان ما قدمے نیست استوار

آگے پیچھے سب ادھر کو چلے جاتے ہیں۔ کوئی دو دن آگے گیا۔ کوئی دو دن پیچھے چل نکلا۔ ۱۲

نجات کا طالب
۱۴ فروری ۱۸۶۴ء غالب"

نوٹ: اس مضمون کی تیاری کے لیے راقم حروف جناب میر کرامت علی خاں صاحب (انچارج مخطوطات حکومت آندھرا پردیش لائبریری)، ڈاکٹر رحمت علی خاں (سالار جنگ میوزیم)، محترمہ لطیف النساء بیگم (انچارج شعبۂ مطبوعات سالار جنگ میوزیم) محترمہ رفعت رضوانہ اور جناب عبدالصمد خاں (اردو ریسرچ سنٹر حیدر آباد) کا ممنون ہے کہ انھوں نے مواد کی فراہمی میں تعاون کیا۔

□□

کچھ خطوط کے عکس اگلے صفحہ پر دیے جا رہے ہیں

خط نمبر (۱)

بحضرت غالب مرحوم کے دو خطوں کا عکس

خط نمبر (۱) کرمی جناب مولوی ابو الحسن صاحب ابن جناب علامہ احسان الحسن صاحب عثمانی مرحوم مولوی نے بکمال عنایت فرمایا ہے جس معلوم ہوتا ہے کہ یہ عکس کے نام ہے اور سمین جس پاس ہی کا ذکر ہے وہ سامی ہی مدراس کی ہے بحوالہ حضرت غالب مرحوم کے قلم کی ہے جو کہ یادگار ہے۔

خط نمبر (۲) حضرت غالب مرحوم نے اپنے ہاتھ کی جناب جناب نواب اللہ سالار جنگ بہادر صاحب اپنا سکہ تخلص بشاعری کرنا تحریر فرمایا ہے۔

یہ خط جناب سالار جنگ بہادر کے صاحبزادے جناب سید الدولہ عمدۃ الملک بہادر سے جناب سید محمد حسن صاحب مرحوم سکی کر اسے واسطہ مانگ کر دیا کر لا - اور اب ان سے اسکو کرمی جناب سید شریف الحسن صاحب نجیب لکھنوی سے لیکر عکس لیا - اڈیٹر

خط نمبر ۱

بندہ پرور آج میں نے وہ انگریزی عرضی روانہ کردی اور صبح کو

آپ کا کبار مسودہ اور میری عرضی کا رقعہ آپکے نام کا

مجھکو مل گیا ۱۲

اس عنایت کی شکر میں کیا خدمت بجا لاتا باری

ایک سہرا لکھا ہوں اسکو آپ پڑھکر اور بعد

اوس کے راجہ صاحب کے خدمت میں بھیجدیجے ۱۲

امید بلند یہ میم وتخفیف میم کو کس طرح مستعمل کی

ایسا نہو کہ جناب ممدوح اسکو زحاف سمجھیں پہلی اور

دوسرے مصرع میں بہ تخفیف میم ہے اور تیسرے مصرع

کا میم مشدد ہے ۱۲ غالب ۱۲

خط نمبر (۲)

خط نمبر ۲

[illegible]

خط نمبر (۳)

[illegible]

ان سب کا ہر ایک سکہ کے ہو اور منبع ہو الحسنہ حوالہ کر دیجیے

[illegible]

خط نمبر (۴)

سبحان اللہ سارے فلک کے لکھنے کا کس وقت میں اتفاق

ہوا ہے کہ میں نے سمجھا چند روز کا رہنا ہوتو رہنا بہر حال

غذا بالکل مفقود صرف گوشت کے پانی پر مدار ہے

او ٹھنا دشوار اگر او ٹھوں تو دوران سر سے گر پڑوں

۲ سید محمد زکریا نجیب نسب ہیں سید امیر زادہ عالی

خاندان انکی بزرگ ورزات کا منصب پا چکے ہیں

جاگیر ایک تھی بہر بعوض جاگیر پنسن مقرر ہو الحمد

یہ شخص بذات خود نیک اور صاحب علم اور متواضع

اور دانشمند اور نیک طینت اور رنگین طبع ہیں

طبیعت کو علاقہ اچھا ہے شعر کہتے ہیں اور خوب

کہتے ہیں اس فن میں بحیر شناگر رشید ہیں —

اسد اللہ خان غالب ۱۲

صدق غالب بقلم ذکی مع مہر و دستخط

غزلیں

احترام اسلام

۵۷۴ - اتر سوئیا
الٰہ آباد

دیکھ منظر اور پس منظر سمجھ
اس کے خالی ہاتھ کو خنجر سمجھ

چشم پوشی جب ترے بس کی نہیں
خود کو اندیشوں سے کیوں باہر سمجھ

زندگی کو رکھ حدِ برداشت میں
ہر نفس کو اپنے اک محشر سمجھ

اب سیاہی کا سفر ہے تا بہ کے
صبحِ نو کے مہر کو سر پر سمجھ

چاہتا ہے تو اگر دل کا سکوں
ہر دھڑکتی چیز کو پتھر سمجھ

شفیع اللہ خاں رازؔ اٹاوی

ایس - این کالج بکرہ پردل خاں
اٹاوہ

زمیں پر ایٹمی شعلے سجے تھے
گھٹاؤں کو پسینے آ رہے تھے

پرندے ڈالیوں سے جھانکتے تھے
شکاری جال میں جکڑے ہوئے تھے

سروں پر ناگنیں سایہ فگن تھیں
سپیرے دھوپ میں سوئے ہوئے تھے

چراغِ خانۂ دل بجھ گیا تھا
اندھیرے جسم و جاں کو ڈس رہے تھے

تماشا گاہ تھی اے رازؔ دنیا
مداری خود تماشا بن گئے تھے

ندیم اشرف

قصبہ جائس
رائے بریلی

غیر تراشیدہ پتھر سے سنتے ہیں آزر کی صفات
اپنی خاموشی پر نادم نقش و نگارِ لات و منات

پچھلی رات سجھائے اس نے جانے کتنے موضوعات
صبح کو میری عقل کا ماتم کرتے ہوئے سادہ صفحات

دل کا خوف بدن کی الجھن سانسیں تیز ہوا مرطوب
لفظ و معانی ہاتھ پسارے حرف کی عزت تیرے ہات

بنتی مٹتی چند لکیریں خلط ملط ہوتے کچھ رنگ
دھندلا دھندلا سا اک چہرہ تاریکی اور میری ذات

بکھرے کتنے شوخ رنگ تھے دیکھ کے ہم لوٹے مایوس
اے رب رحم کہ ختم ہو چکا فرقِ اصل و مصنوعات

ریزہ ریزہ ہونے کو ہوں شیرازہ بندی کی خیر
جلد یہ خواب بھیانک ٹوٹے تھوڑی چھوٹی کر دے رات

ڈاکٹر افضال احمد
ڈیوڑھی آغا میر
لکھنؤ

حیاتِ جگر کا ایک اہم باب

ایک خط کی روشنی میں

حضرت مسعود حسن ذوقی صاحب مرحوم جگر مرادآبادی مرحوم کے بہت قریب رہے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ جگر پر ایک اچھی اور معلوماتی کتاب تصنیف کریں۔ ہر طرف سے حالات جمع کر رہے تھے۔ مرحوم نے جناب وگیندر پال صابر، جن کا قیام ۱۹۶۰ء میں شکوہ آباد میں تھا، ان کو جگر اور شیراز بی صاحبہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے مین پوری بھیجا۔ صابر صاحب نے شیراز بی سے ملاقات کی اور تمام حالات ایک خط کی صورت میں ذوقی صاحب کو بھیج دیئے۔ یہ خط انھوں نے ۱۴ر نومبر ۱۹۶۰ء کو لکھا تھا۔ خط کی عبارت حسبِ ذیل ہے:-

"میں آج ۱۲ر نومبر ۱۹۶۰ء کو شیراز صاحبہ سے ملنے کی غرض سے مین پوری گیا۔ دوپہر کے وقت محلہ چھبٹی مین پوری میں پہونچ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ پاکستان نہ چلی گئی ہوں۔ مگر محلہ میں پہونچنے پر معلوم ہوا کہ وہ وہیں ہیں اور اسی مکان میں ہیں جس میں وہ جگر مرحوم کے زمانے میں رہتی تھیں اور جس مکان کو جگر مرحوم "اپنا طور" کہا کرتے تھے۔ جس مکان میں شیراز صاحبہ رہتی ہیں اس کے کئی حصّے ہیں اور زیادہ حصّے کرایہ پر اُٹھے ہوئے ہیں لیکن صحن سے ملا ہوا جو حصّہ ہے اس میں شیراز صاحبہ، ان کی ماں اور ایک بہن رہتی ہیں۔ میں اندر چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر ایک بوڑھی عورت باہر نکلی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں شیراز صاحبہ سے ملنے آیا ہوں اور ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ شیراز صاحبہ کی بہن تھیں۔ میری بات سن کر وہ اندر چلی گئیں اور تھوڑی دیر بعد دونوں بہنیں باہر آئیں۔ مجھے اندر بُلا لیا گیا اور ایک چوکی پر جس پر قالین بچھا تھا، بٹھا دیا گیا۔ خود دونوں بہنیں برابر کے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ پہلے بڑی دیر وہ مہمان نوازی میں معروف رہیں۔ اپنی بیماری کا ذکر کیا، میرے حالات دریافت کیے۔ پھر میں نے خود ہی کہا کہ میں ایک خاص غرض لے کر حاضر ہوا ہوں۔ غرض یہ ہے کہ حضرت مسعود حسن صاحب ذوقی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، حضرت جگر مرادآبادی مرحوم پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ ذوقی صاحب جگر صاحب کے خاص دوست رہے ہیں وہ جگر مرحوم کی زندگی کے ہر پہلو سے بخوبی واقف ہیں۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ جگر مرحوم کے اس زمانے کے حالات جمع کروں، جب مرحوم مین پوری میں رہتے تھے۔ جگر صاحب کے ان تاثرات کے سلسلے تلاش کروں جن کے تحت جگر مرحوم نے شعلۂ طور میں بہت سی غزلیں کہی ہیں اور جن کا تعلق مین پوری اور آپ کی (شیراز صاحبہ) ذات سے ہے۔ شیراز صاحبہ بڑی معاملہ فہم عورت ہیں۔ میری غرض

ا۔ یہ خط اور شیراز صاحبہ کی تصویر دونوں میرے پاس موجود ہیں۔ —— افضال احمد

کو چھو بھی لیا اور پھر نہایت دل نشیں لہجے میں تمام حالات بتائے۔

یہاں شیراز صاحبہ کے متعلق کچھ بتانا ضروری ہے۔

شیراز صاحبہ کا اصل وطن شکوہ آباد ہے۔ اب ان کی عمر تک بھگ ساٹھ سال ہے۔ جب وہ پندرہ، سولہ سال کی تھیں، تب اپنی ماں کے ساتھ مین پوری چلی آئیں اور پھر یہیں کی ہو گئیں۔ تیس سال کی عمر تک انھوں نے خاص اور اونچے درجے کی طوائفوں کی طرح زندگی گزاری وہ شروع ہی سے کافی مشہور تھیں۔ شکوہ آباد میں ایک پختہ مکان تھا اور مین پوری میں کئی مکان ہیں۔ اس کے علاوہ نقد روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ کبھی روپے کی بھوکی یا محتاج نہیں رہیں۔ اس کے علاوہ وہ کافی تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں۔ اسی لیے انھوں نے عام طوائفوں کی سی زندگی نہیں گزاری۔ ۱۹۲۸ء تک وہ مستقل اور پابندی کے ساتھ مین پوری کے ایک رئیس کے ساتھ رہیں۔ ۱۹۳۰ء میں حج کعبہ کو چلی گئیں اور وہاں سے واپس آکر پردہ اختیار کر لیا۔ قریب ۳۰ سال پردہ میں رہیں۔ اس عرصہ میں اپنے شرعی محرموں کے علاوہ کسی مرد سے نہیں ملیں۔ ان رئیس سے بھی نہایت شریفانہ اور مہذب طریقے سے ملتی ہیں۔ ان کی موجودہ زندگی نہایت پاک صاف اور شریفانہ ہے۔ نماز کی سختی سے پابند ہیں۔ ذریعۂ معاش مکانوں کا کرایہ ہے۔ ان کے ساتھ ان کی بوڑھی ماں اور اعجاز صاحبہ (بہن) رہتی ہیں۔

شیراز صاحبہ نے جگر مرحوم کے حالات خود بتائے۔

جگر مرحوم شیخ اصغر حسن اصغر مختار کلکٹری مین پوری کے یہاں رہتے تھے۔ اصغر صاحب خود بھی اچھے شاعر تھے اور بڑے شاعر نواز نیز مہمان نواز آدمی تھے۔ جگر صاحب ان کے یہاں برسوں رہے ہیں۔ اصغر صاحب کے ساتھ جگر صاحب شیراز صاحبہ کے یہاں جایا کرتے ہیں اور غالباً جس دن شیراز صاحبہ کو پہلی مرتبہ دیکھا اسی دن سے عشق ہو گیا اور پھر وہ برابر بڑھتا ہی گیا۔ جگر صاحب کا رندی کا زمانہ تھا شراب بے حد پیتے تھے۔ شیراز صاحبہ شراب کو سخت ناپسند کرتی تھیں جگر صاحب اس سے واقف تھے، اس لیے ان کے پاس اکثر بغیر پیے ہی جاتے تھے لیکن جب کبھی وہ پی کر جاتے تو شیراز صاحبہ ان کے سامنے سے اٹھ جاتی تھیں۔ اس پر جگر صاحب اصغر صاحب کے پاس جاتے اور کہتے تھے کہ "سرکار مجھ سے خفا ہیں"۔ اصغر صاحب تسلی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی بات نہیں۔ آج تم نے پی لی ہے اس لیے خفا ہیں۔ پھر جگر صاحب غسل کرتے اور کپڑے بدل لیتے تھے اور دوبارہ جاتے تھے تب شیراز صاحبہ انھیں اپنے پاس بٹھا لیتی تھیں۔

جگر صاحب مرحوم شیراز صاحبہ سے جلوت و خلوت ہر حالت میں ملے مگر ہمیشہ تہذیب محبت کی حدوں میں رہے۔ بدمستی و خلوت میں بھی انھوں نے شیراز کو کبھی "عورت" نہیں سمجھا ہمیشہ محبوب اور بعض اوقات تو مسجود تک ہی سمجھتے رہے۔ اس سلسلے میں حد یہ ہوتی تھی کہ وہ شیراز صاحبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے۔ ہتھیلی اوپر کو کر کے نہایت نرمی سے پوچھتے تھے:

"سرکار کے مزاج کیسے ہیں؟

اور اس کا جواب پاکر ہاتھ چھوڑ دیتے تھے۔ بوسہ صرف قدموں کا لیا ہے۔

اکثر یہ ہوا ہے کہ جگر صاحب شیراز صاحبہ کے کمرے میں آئے زط محبت میں نیم غشی کا عالم ان پر طاری ہو گیا۔ پھر جو کچھ کہا وہ بزبانِ خاموشی ہی کہا۔ انتہائی نشے کے عالم میں بھی وہ کبھی بے تمیزی کی بات یا حرکت نہیں کرتے تھے۔ جب غافل ہو جاتے تو چپ چاپ لیٹ جاتے تھے۔

شیراز صاحبہ جگر مرحوم سے محبت کرتی تھیں اور احترام کرتی تھیں اور آج تک نہایت خلوص و احترام سے ان کا ذکر کرتی ہیں۔ ان کا ذکر کرتے وقت کبھی مسکرا دیتی ہیں اور کبھی آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔

جگر صاحب شیراز صاحبہ کو ہمیشہ سرکار کہتے تھے اور ان کے گھر کو "طور" کہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے دیوان "شعلۂ طور" کا نام بھی اسی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ جگر صاحب شیراز صاحبہ کی بہن اعجاز صاحبہ کو ہمیشہ "اعجاز بہن" کہہ کر پکارتے تھے۔ اس سے اعجاز صاحبہ کے کردار پر تو خیر کوئی روشنی نہیں پڑتی مگر جگر صاحب کی شرافت اور خلوص روشن ہو جاتا ہے۔

جگر مرحوم کی توبہ کی وجہ بھی شیراز صاحبہ ہی ہیں۔ جب وہ ۱۹۳۹ء

میں حج سے واپس آئیں تو جگر صاحب اپنے ایک مین پوری کے دوست کے ساتھ شیراز صاحبہ سے ملنے گئے۔ شیراز صاحبہ پردے میں تھیں۔ وہیں سے انھوں نے مین پوری والے صاحب کے لیے کچھ کھجوریں اور ایک گلاس آبِ زمزم بھیجا۔ انھوں نے کھجوریں کھالیں اور آبِ زمزم پی لیا اور کہا کہ آپ نے جگر صاحب کو یہ چیزیں کیوں نہیں بھیجیں۔؟"

شیراز صاحبہ نے پردے سے جواب دیا" انھیں صاحب اس سے کیا حاصل ؟ آج اس حلق میں آبِ زمزم جائے گا اور کل پھر شراب جائے گی۔ زمزم کی بھی توہین ہوگی اور پینے والے کو بھی کچھ لطف حاصل نہ ہوگا۔"

جگر صاحب یہ سُن کر فوراً کھڑے ہوگئے۔ اپنے دوست کو وہیں چھوڑ کر اصغر صاحب کے گھر چلے گئے۔ غسل کیا، کپڑے بدلے اور پھر واپس آگئے اور بلند آواز سے کہا ؎

" اب زمزم بھیجیے۔ میں اسے پیوں گا اور انشاءاللہ اب اس حلق میں کبھی شراب نہ جائے گی۔" زمزم بھیجا گیا اور جگر صاحب نے پیا اور اس کے بعد تمام زندگی شراب نہیں پی۔

مجھے شیراز صاحبہ نے ایک تصویر دکھائی۔ گروپ کے بیچ میں جگر صاحب کھڑے ہیں۔ تصویر کی پشت پر جگر صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک شعر ہے ؎

اب بھی ہیں تیرے تصور سے وہی رازو نیاز
اپنے اجڑے ہوئے آغوشِ محبت کی قسم

(جگر مرادآبادی)

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ جگر صاحب کا خط نہایت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ جگر صاحب حج سے واپس آئے تو شیراز صاحبہ سے نکاح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ شیراز صاحبہ نے انکار تو نہیں کیا مگر یہ کہا کہ وہ نکاح ایک سال بعد کرسکیں گی۔ جگر صاحب کو شاید یہ بات پسند نہیں آئی اور وہ گونڈے چلے گئے۔ ادھر اصغر گونڈوی صاحب کا انتقال ہوچکا تھا۔ جگر صاحب نے اپنی پہلی بیوی سے، جو اصغر صاحب کے عقد میں تھیں، دوبارہ شادی کرلی۔ شیراز صاحبہ کی زبانی معلوم ہوا کہ جگر صاحب نے غصّے میں انھیں طلاق دے دی تھی اور جب شیراز صاحبہ سے ملے تو اپنی اداسی اور تکلیف کو چھپا نہ سکے۔

شیراز صاحبہ آٹھ آٹھ مہینے کراچی میں رہی ہیں۔ جگر صاحب بھی کراچی مدتوں رہے ہیں اور وہاں بھی دونوں حضرات برابر ملتے رہتے تھے۔ جگر صاحب اور شیراز صاحبہ کی آخری ملاقات دسمبر ۱۹۵۶ء میں کراچی میں ہوئی تھی اس کے بعد وہ ہندستان چلی آئیں اور پھر کبھی ملاقات نہ ہوسکی۔

جب جگر صاحب کے انتقال کی خبر مین پوری پہونچی تو شیراز صاحبہ کے گھر میں کہرام مچ گیا اور انھوں نے بہت کچھ خیرات وغیرہ بھی کی۔ انھیں اس بات کا ملال ہے کہ ان کے پاس گونڈہ سے کوئی خط وغیرہ نہیں آیا۔

آج کل شیراز صاحبہ بیمار ہیں۔ پہلو میں درد ہے۔ مجھ سے ہنس ہنس کے کہہ رہی تھیں کہ " معلوم ہوتا ہے جگر صاحب کی روح مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔ جب وہ یہاں تھے تو اکثر اپنا شعر پڑھتے تھے ؎

ستم آپ الفت میں آساں نہ سمجھیں
تڑپ جائیے گا جو تڑپا ئیے گا

خیر میں نے انھیں کبھی تڑپایا نہیں مگر وہ اب مجھے ضرور تڑپا رہے ہیں۔"

میں نے شیراز صاحبہ سے کہا کہ اگر آپ اپنی کوئی تازہ تصویر عنایت کردیں تو بڑا کرم ہو۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا: "خیر آپ مانگتے ہیں تو لے جائیے۔" یہ کہہ کر مجھے تصویر دے دی۔ میں نے اسے شائع کرنے کی اجازت چاہی تو پھر تھوڑی دیر کو خاموش ہوگئیں اور پھر کہا" اچھا کوئی بات نہیں آپ اسے شائع کرسکتے ہیں۔"

میں شیراز صاحبہ کے پاس تین گھنٹے بیٹھا۔ وہ نہایت خلوص و محبت اور تہذیب سے پیش آئیں۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ شکوہ آباد آکر میں نے حاجی عبدالحفیظ خاں صاحب درانی شکوہ آبادی سے جگر صاحب کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے شیراز صاحبہ کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کی۔ حاجی صاحب بڑے نمازی اور اللہ والے ہیں ان کی صداقت اور حق گوئی کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔"

۱۲ نومبر ۱۹۹۰ء

یوگیندر پال صابر

□□

ڈاکٹر سلمان عباسی
۵۵، موتی لال بوس روڈ
لکھنؤ

ہماری جمہوریت

فکری اور عملی پہلو

جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جو شخصی نظام حکومت کے برخلاف شخصی آزادی کا نقیب اور ترجمان ہوتا ہے۔ مشہور مفکر ابراہم لنکن کے مطابق جمہوریت ایسے نظام کا نام ہے جو عوام کے ذریعے عوام کا اور عوام کے لیے ہو۔ اس قول کی روشنی میں ہم اس منزل تک پہونچتے ہیں جہاں فرد کی اہمیت ہوتی ہے شخصیت کی نہیں۔

جمہوری نظام میں امیر غریب، چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ یہاں سب کے حقوق یکساں، سب کے اختیارات برابر اور سب کی ذمہ داریاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ سب کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ تحریر و تقریر کی آزادی، حصول تعلیم کی سہولیات اور ہر شعبۂ زندگی میں سب کے ساتھ یکساں سلوک اور برتاؤ ہوتا ہے۔

یوں تو دنیا کے بیشتر ملکوں میں جمہوری نظام قائم ہے جن میں انگلینڈ، امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا اور فرانس وغیرہ نمایاں ہیں، لیکن ہندستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ چنانچہ ساری دنیا کی نگاہیں ہندستانی جمہوریت کی جانب مرکوز ہیں اس لیے یہاں کے ارباب حکومت اور عوام کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جمہوریت کی حفاظت کے لیے ہر دم مستعد ہوں۔ کیونکہ ہمارے ملک کو جتنا خطرہ سرحد پار کی طاقتوں سے ہے کم و بیش اتنا ہی اندرونی انتشار پسندوں سے بھی ہے۔ آج ہندستان میں علاقہ پرستی اور فرقہ پرستی کی جو وبائیں پھوٹ نکلی ہیں وہ جمہوریت کے لیے خطرناک علامت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جمہوریت کی حفاظت کے لیے ہمیں ان خطروں سے ہر میدان میں ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم سوشلزم اور سیکولرازم کو مستحکم کریں۔ سارے ملک کے فائدے میں اپنا فائدہ اور اس کے نقصان میں اپنا نقصان محسوس کریں۔ اور یہ سمجھ لیں کہ جب تک سوشلزم اور سیکولرازم کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا اس وقت تک ہماری ترقی اور خوش حالی ممکن نہیں ہے۔

ہمارے آئین میں بھی جمہوریت کی بقا اور ترقی کے لیے کافی گنجائش رکھی گئی ہے جس نے ہندستان کو سیاسی استحکام بخشا ہے اور اس کی بدولت ہمیں معاشی ترقی کے مواقع حاصل ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگ آزادی کے لیے ہمارے نعرے اور جمہوریت کے لیے ہماری خواہشات کا مذاق اڑایا کرتے تھے، لیکن آج جب وہ انسانی تاریخ کے سب سے بڑے آزادانہ عام انتخابات کو دیکھتے ہیں تو حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔

ایک آزاد جمہوری ملک کی حیثیت سے قائم و دائم رہنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے تمام لوگوں کا ایک مشترکہ ثقافتی پس منظر ہو جس کی جڑیں تاریخ میں دور تک پھیلی ہوں اور اس کے علاوہ لسانی و سماجی گروپوں میں باہمی رواداری کا جذبہ موجود ہو۔

ابھی ہماری جمہوریت نو عمر ہے اسے پروان چڑھانے کے لیے

ابھی مزید توجہ درکار ہے۔ ہمارے قومی لیڈروں سے جمہوریت کو کچھ غیر معمولی طاقت اور قوت ضرور ملی ہے۔ لیکن ایک بہتر زندگی کے لیے ہماری جدوجہد سے یک جہتی، اتحاد، محنت اور رواداری کے جذبوں کو مزید تقویت پہونچنا چاہیئے۔ اس کے لیے ہمیں پہلے سے زیادہ با عمل ہونا پڑے گا۔

اگر ہم ان مقاصد کے حصول میں کوتاہی کریں گے تو دنیا میں ہماری ساکھ گر جائے گی۔ ہمارے ملک کی جمہوریت جو ساری دُنیائے جمہوریت کا مستقبل بن چکی ہے اپنی اس عظیم حیثیت سے محروم ہو جائے گی اور دنیا بجا طور پر یہ طعنہ زنی کرے گی کہ ہم اپنی جمہوریت کی حفاظت نہ کر سکے۔

اس لیے ہندستان کے ہر شخص کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں جس قیمتی ورثہ سے مالا مال کیا ہے اور جو جمہوری نظام ہماری امانت میں دیا ہے اس کی حفاظت اور اس کے فروغ کے لیے اپنے تن من دھن کی بازی لگادیں، اور پوری ذمہ داری کے ساتھ اس امانت کو آنے والی نسلوں تک پہونچا کر، سچے اور فرض شناس ہندستانی ہونے کا ثبوت دیں۔ یہی عصر حاضر کا تقاضا ہے اور مستقبل کا منشا بھی اسی میں مضمر ہے۔

لیکن کیا ہم اپنے ملک کی جمہوری قدروں کے تحفظ کے لیے عملی طور پر سرگرم ہیں۔ یہاں یہ بھی لازم ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے اپنے ان اقدامات کا جائزہ لیں جو جمہوریت کے تحفظ و بقا کے لیے ہم نے کیے ہیں۔ کیا اس زمرے میں ہم اپنے فرائض سے کما حقہ، عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ اگر ہاں تو کس حد تک۔ اور اگر نہیں تو اس کے اسباب کیا ہیں؟

حقوق اور فرائض کی یکسانیت کا جمہوری نظام کی کامیابی میں بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ اگر طلب صادق ہو تو سب کچھ مل سکتا ہے، لیکن فرائض ادا کرنے میں کوتاہی اور تساہلی یا نیت کا فتور کبھی کبھی انسان کے مصمم ارادوں کو کمزوری اور زوال پذیری کی طرف ڈھکیلنے کا عمل انجام دیتے ہیں۔ کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے وقتی مفادات کے مقابلے میں ہم بڑے مفادات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن عام طور پر اس کا احساس کم لوگوں کو ہوتا ہے۔

دراصل بیداریِ احساس کا دوسرا نام فرض شناسی ہے۔ یہی فرض شناسی جمہوریت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے تازہ خون مہیا کر کے حیاتِ نو بخشنے کا خوش گوار فریضہ انجام دیتی ہے۔

□□

رزاق افسر
حیدر علی روڈ، محلہ لشکر
میسور

نظمِ سالِ نو

سالِ نو کے نت نئے کیلنڈروں کا روپ
ترجماں انسانی فکر و آگہی کا
ہر ایک رنگ جاذبِ نظر ہے
دل نشین ہے، بے ضرر ہے
سوچتا ہوں اپنا بھی ہر ایک رنگ
کم سے کم اس سالِ نو میں
نت نئے کیلنڈروں کے
رنگ کے مانند ہو جاذبِ نظر
علم کا، سچائیوں کا، امن کا ہو ترجمان
سب کے حق میں بے ضرر ہو
اس طرح سے
اک سکوں کی سانس لینے کی سبیل
سالِ نو میں نوعِ انساں کو ملے

ظفر مرزاپوری
بیساں ٹولہ۔ دلیل گنج
مرزاپور

التجا

اے خدا! تیرا ہر اک شے میں ہے جلوہ پنہاں
آدمی کے رگ و ریشے میں تیری کاریگری آئی نظر
دی ہوئی تیری ذہانت سے
یہ انسان کہاں تک پہونچا
رنگ و نکہت سے گلاب اور چنبیلی کو سجایا تو نے
اور جنگل کو بھی رونق بخشی
برگد و نیم اور پیپل رہے شاداب مئی جون میں بھی
آب اور خاک ہوا، دھوپ سے قائم ہے جہاں
آئی برسات تو پودوں کو نئی جان ملی
سوکھی مٹی پہ ہری گھاس بنی مخمل سی
اور جاڑوں میں نئے پھل سے سجائے باغات
تیری قدرت کے کرشمے نظر آئے ہر سو
کر دیا شب میں ستاروں سے فلک کو روشن
اور دن میں نظر آتا ہے وہ نیلا نیلا
ان پرندوں کو چرندوں کو بھی خوش رنگ بنایا تو نے
تیری قدرت نے تہِ آب بنائی مچھلی
جانداروں کے لیے تو نے غذا بھی بخشی
حسنِ دنیا بھی ترے دم سے نظر آتا ہے
اے خدا!
کون سی قدرت پہ نگاہیں روکوں
ہر طرف تیرے ہی انوار کے پرچم ہیں بلند
تو ہی سنتا ہے ہر اک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
التجا تجھ سے یہی کرتے ہیں بیوہ و یتیم
اب تو عالم کے تباہی و فسادات کو روک

غلام صابر قدیری سندیلوی
۱۰۳/۱۴۴ رام گنج حسین آباد
لکھنؤ

ایک ہندستانی کی دُعا

وطن کو میرے یارب منبعِ امن و اماں کر دے
پھر اپنی رحمتوں کا رُخ سوئے ہندوستاں کر دے
غریبی دُور ہو پسماندگی کے ابر چھٹ جائیں
عطا اِس ملک کو گنجینہ ہائے بیکراں کر دے
جہالت دُور ہو جائے وطن کے کونے کونے سے
الٰہی بچّے بچّے کو یہاں کے علم داں کر دے
ہمارے دوست ہوں ہمسائیگانِ مشرق و مغرب
ہم اُن پر مہرباں ہوں ان کو ہم پر مہرباں کر دے
اِدھر ہر برہمن کے لب پہ ہو توحید کا نغمہ
اُدھر ہر شیخ کو دلدادہ کوئے بتاں کر دے
کھلا دے ایسے گُل یارب جو کھل کر پھر نہ مرجھائیں
عطا میرے چمن کو پھر بہارِ بے خزاں کر دے
وسیلہ ہے یہی آپس میں اظہارِ محبت کا
ہم اہلِ ہند کو دلدادۂ اُردو زباں کر دے
بچا ہم کو نگاہِ حاسدانِ دہر سے یارب
ہمارے دُشمنوں کی سازشوں کو رائیگاں کر دے
ترانہ ہم کو گانا ہے وطن کی شان و عظمت کا
عطا یارب ہمیں اقبال و حالی کی زباں کر دے
نکاتِ امن و آزادی سکھانے ہیں زمانے کو
ہمیں اب نکتہ سنج و نکتہ بیں و نکتہ داں کر دے
وہ ہندو ہوں مسلماں ہوں کہ سکھ ہوں یا کہ عیسائی
دُعا صابر کی ہے یارب ہر اک کو شادماں کر دے

غزلیں

وقار طاہری

۹۹/۳۳۳ اے، بالہ روڈ
چمن گنج، کانپور

پھوٹ کبھی کونپل کی طرح
آنے والے کل کی طرح

ٹھیر تو دل پر ہو جا نقش
جا تو گزر جا پل کی طرح

دل کو چھوڑ کے سب کچھ نرم
سارا بدن مخمل کی طرح

چلے تو شرمندہ ہوں غزال
بولے تو کوئل کی طرح

لہراتی ہے رہ رہ کر
اک خوشبو آنچل کی طرح

سانپ کئی لپٹے ہیں وقار
مجھ سے بھی صندل کی طرح

اشعر ہاشمی

۱/۲ ۔ بشیرالدین منشی لین
ہوڑہ

سفر کے زخم کہیں تیرے بال و پر پہ نہیں
ابھی اڑان تری اوجِ معتبر پہ نہیں

نہ تھا نہ ہے کوئی احسان مجھ پہ بادل کا
کہ اک بوند بھی اسکی مرے شجر پہ نہیں

یہ ڈگریاں ہیں کہ ہیں ردیاں، جلا ڈالو
تمہارا نام کسی لوحِ معتبر پہ نہیں

اُجاڑ دشت، کڑی دوپہر، اکیلا میں
غبار سر میں بہت، ابر کوئی سر پہ نہیں

اٹھی ہے چار طرف سے وہ موجِ ہمدردی
ٹکی ہوئی کوئی شے اپنے مستقر پہ نہیں

ظفر اکبرآبادی

۹۹/۹۶ سے ۔ چمن گنج
کانپور

ہو کر میں بیباک ننا در کیا کرتا
حائل تھے جب سات سمندر کیا کرتا

بند صدف سی تاریکی ہے چار طرف
زرخیزی شاداب یہ منظر کیا کرتا

خاکستر میں روشن ہے تاریخ مری
دیواروں سے کان لگا کر کیا کرتا

آخر کو تھک ہار کے میں بھی بیٹھ گیا
دیکھ لیا انجامِ سکندر کیا کرتا

مجھ سا روشن دشت سفر میں کون ہوا
اور کوئی راہوں کو منور کیا کرتا

جھوٹے ہوئے سب عہد و پیماں اسکے ظفر
ٹھہرا جب وہ بے حس پتھر کیا کرتا

ہسپانوی افسانہ

اکٹویو پاز

ترجمہ: شکیل صدیقی
مرتضیٰ حسین روڈ۔ باغ قاضی
لکھنؤ

نیلی آنکھوں کا گلدستہ

سال ۱۹۹۰ء کا نوبل ادب انعام میکسیکو کے عالم گیر شہرت کے شاعر اور ادیب اکٹویو پاز کو دیا گیا ہے۔ وہ ہسپانوی زبان کے شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ اس زبان میں بہت اچھا بلکہ آج کا بہترین ادب تخلیق ہو رہا ہے اکٹویو پاز ۳۱ مارچ ۱۹۱۴ء میں میکسیکو شہر میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمری میں ہی ان کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہو گیا تھا جو خاصا موضوع بحث بھی رہا۔

وہ ہندستان میں میکسیکو کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔ اور انھیں آج بھی ہندستان سے پیار ہے۔ چند سال قبل وہ بھارت بھون بھوپال میں منعقدہ عالمی شاعری کے جشن میں بھی شریک ہوئے تھے۔

ش۔ ص

میں سو کر اٹھا تو پسینے سے شرابور تھا۔ لال اینٹوں والے کمرے کے فرش پر ابھی ابھی چھڑکاؤ ہوا تھا اور اس سے گہری بھاپ اٹھ رہی تھی۔ بھورے پروں والی ایک تتلی اس چمک دمک سے بیزار پیلی روشنی والے لیمپ کے چکر کاٹ رہی تھی۔ میں دائرے میں کودا اور ہوشیاری سے ننگے پاؤں رکھتا ہوا کمرے کو پار کر گیا۔ خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں میرا پاؤں بل سے تازہ ہوا کھانے کے مقصد سے نکلے کسی بچھو پر نہ پڑ جائے۔ میں نے کھڑکی پر جا کر گاؤں کی تازہ ہوا کا لطف لیا۔ رات جیسے کسی بھرپور جوان عورت کی مانند سانس لے رہی تھی میں پھر کمرے کے درمیانی حصے میں آگیا۔ مرتبان سے جستے کے پیالے میں پانی نکالا اور اپنے تولیے کو بھگو لیا۔ بھیگے تولیے سے میں نے اپنے سینے اور ٹانگوں کو رگڑا۔ تھوڑا اپنا بدن سکھایا اور اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ میرے کپڑوں کی تہ میں کھٹمل نہیں چھپے ہیں، کپڑے پہنے اور ٹیڑھی سیڑھیاں اترتا ہوا بھاگا۔

لاج کے دروازے پر میری ٹکر لاج کے کانے مالک سے ہو گئی۔ وہ کم گو تھا اور اس وقت بانس کی چوکی پر بیٹھا دھواں اڑا رہا تھا، اس کی آنکھیں آدھی بند تھیں۔ اس نے بھاری آواز میں پوچھا:

"کہاں جا رہے ہو۔؟"

"ٹہلنے، بہت گرمی ہے"۔ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اوہ ...... سب کچھ بند ہے اور یہاں سڑک پر روشنی بھی نہیں ہے۔ بہتر تو یہی ہوگا کہ نہ جاؤ"۔

میں نے کندھے سکوڑے اور "جلدی لوٹ آؤں گا"۔ بڑبڑاتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔ پہلے تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں خوبصورت پتھروں والی سڑک پر ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک کالے بادل کے پیچھے سے چاند نکل آیا جس سے جگہ جگہ سے اکھڑی ایک سفید دیوار چمک اٹھی۔ اتنی چمکدار سفیدی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آیا اور میں رک گیا۔ ہوا ہلکی ہلکی سیٹیاں

بجا رہی تھی۔

میں نے املیوں کی ہوا لی۔ پتّوں اور کیڑے مکوڑوں سے بھری رات جیسے مدھم سُروں میں ہولے ہولے چیخ رہی تھی۔ جھینگر اونچی گھاس میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے سر اٹھایا۔ آسمان میں تاروں نے بھی ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ ستاروں کی دنیا میں اشاروں کا ایک بڑا نظام تھا یعنی مواصلات کا ایک پورا محکمہ۔ عظیم ملکوں کے درمیان مکالمہ۔ میرے معمولات، جھینگر کی کٹ کٹ، ستاروں کی ٹمٹماہٹ۔ کچھ اور نہیں اسی مکالمہ کے فل اسٹاپ حروف کے جز اور جملے تھے جو بکھرے پڑے تھے۔

کون سا لفظ ہو سکتا ہے وہ جس کا میں صرف ایک چھوٹا سا حصہ تھا؟ کون بولتا ہے وہ لفظ؟ کون بول سکتا ہے اسے؟ میں نے اپنی سگریٹ کو پگڈنڈی پر پھینک دیا۔ وہ ایک روشن کمان بناتی ہوئی اور ایک ننھے دُم دار ستارے کی طرح رہ رہ کر چنگاری چھوڑتی ہوئی دُور جا گری۔

میں دیر تک دھیرے دھیرے ٹہلتا رہا۔ میں اپنے آپ کو ان تاریکیوں میں آزاد اور محفوظ محسوس کر رہا تھا جو اس وقت مجھے ماحول کا پُورا لطف لیتے ہوئے ٹہلنے کا حوصلہ دے رہی تھیں۔ رات میری آنکھوں میں جیسے ایک باغ بن کر اتر آئی تھی۔

سڑک پار کرتے وقت میں نے کسی کو ایک دروازے سے باہر آتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے پیچھے گھوم کر دیکھا مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ میں تیز قدموں سے آگے کی جانب بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد ہی مجھے گرم پتھر پر کسی کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں پیچھے گھومنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ سایہ مجھے ہر قدم کے ساتھ اور قریب آتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے بھاگنا چاہا لیکن بھاگ نہیں سکا۔ اچانک میں رک گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا دفاع کر پاتا، مجھے اپنی پیٹھ میں چاقو کی نوک چبھتی محسوس ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی ایک سرد سا لہجہ ــــ

"ہلیے نہیں صاحب! نہیں تو گھونپ دوں گا۔"

بغیر مڑے ہوئے میں نے پوچھا: "کیا چاہتے ہو۔؟"

"آپ کی آنکھیں صاحب۔!" نرم اور درد بھری آواز میں جواب ملا۔

"میری آنکھیں۔؟ مگر کیا کرو گے میری آنکھوں کا۔؟ دیکھو میرے پاس کچھ رقم ہے، زیادہ تو نہیں مگر کافی ہے۔ اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میرے پاس جو کچھ ہے، سب تمھیں دے دوں گا۔ مجھے مت مارو۔"

"ڈریئے نہیں صاحب! میں آپ کو ماروں گا نہیں۔ میں صرف آپ کی آنکھیں لوں گا۔"

"لیکن تمھیں میری آنکھیں کیوں چاہئیں ــــ؟" میں نے پھر دریافت کیا۔

"یہ میری دوست کی خواہش ہے۔ وہ نیلی آنکھوں کا گلدستہ چاہتی ہے اور یہاں نیلی آنکھیں مشکل سے مل پاتی ہیں۔"

"میری آنکھوں سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ بھوری ہیں ــ نیلی نہیں۔"

"مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کیجیے صاحب! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کی آنکھیں نیلی ہیں۔"

"میں تم جیسا آدمی ہوں۔ میری آنکھیں مت لو۔ میں تمھیں کچھ اور دے سکتا ہوں۔"

"میرے سامنے سادھو سنت مت بنو۔" اس نے اپنے لہجے میں کرختگی لاتے ہوئے کہا۔ "ادھر گھومو۔"

میں گھوم گیا۔ وہ چھوٹے قد کا مریل سا آدمی تھا۔ تاڑ کے پتّے کا چوڑے کنارے کا ٹوپ اس کے چہرے کو آدھا ڈھانپے تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک گنوار و چھُرا تھا۔ جو چاندنی میں چمک رہا تھا۔

"اپنا چہرہ مجھے دیکھنے دو۔"

میں نے ماچس کی ایک تیلی جلائی اور اسے اپنے چہرے کے پاس لایا۔ اس کی چمک سے میری آنکھیں لمحہ بھر کو چکا چوند سی ہو گئیں۔ اس نے مضبوط ہاتھوں سے میری پلکوں کو کھولا۔ اسے ٹھیک سے دکھائی نہیں دیا۔ پنجوں کے بل اُچک کر اس نے نظریں گڑا کر مجھے دیکھا ــ ماچس کی جلتی تیلی کی لو سے میری انگلیاں جلنے لگیں۔

میں نے تیلی گرا دی۔ ایک خاموش لمحہ گزر گیا۔ (باقی صفحہ ۸۴ پر)

افسانے

سہیل کاکوروی
۲۶۔ قندھاری لین۔ لکھنؤ

نشتر

پہلے تو وہ تصویرِ حیرت بنی رہی۔ پھر اس کا چہرہ جگمگانے لگا اور دوسری طرف میری انگلی کی تکلیف تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ وہ نہ جانے کیوں دُور کھڑی تھی اور ایک تماش بین کی حیثیت سے اپنے وجود کو نشاط انگیز تاثر سے بھرنے کا ایک بہت خاموش کھیل کھیل رہی تھی وہ ایذا پسند نہیں تھی لیکن ہر کام انوکھے انداز میں کرنے کا اسے جنون تھا۔

میری زبان کی نوک پر یہ التجا ایک چھوٹے سے زخم کی طرح ٹیس دے رہی تھی کہ اس کے ایک عمل سے میری ساری تکلیف ختم ہو سکتی تھی وہ اس عمل میں کیوں تاخیر کر رہی تھی۔ اسے میرے احساس پر ضرب کاری لگانے میں کیا انوکھا پن محسوس ہوتا تھا، اور اس کے ردِ عمل کا تماشہ دیکھنے کے لیے وہ بے قرار رہتی تھی۔ میں کئی بار چاہ چکا تھا کہ اس سے ہر تعلق ختم کر لوں کیونکہ میں اس درمیانی راستے پر چلنا نہیں چاہتا تھا جس پر چل کر وہ مطمئن رہتی، شاید اس لیے کہ وہ اسی راستے پر چلنا اپنے لیے زیادہ محفوظ سمجھتی تھی یا یہ بھی اس کی کوئی غیر معمولی عادت تھی جبکہ محفوظ تو وہ بہر حال تھی، لیکن خود کے تحفظ کا احساس اس پر حاوی تھا۔ اس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ ارادوں سے سخت بیزار ہے اس کا یقین تھا کہ ہر منظر نفسا میں بے ارادہ ابھرا ہے جن میں اچھے منظر بھی ہیں، خراب بھی۔ لیکن اس کے لیے ان کا وجود تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ غیر ارادی طور پر ابھرے ہیں۔

میں اس کا اشارہ سمجھتا تھا لیکن وہ غیر ارادی طور پر نہ ابھرنے والا منظر میرے لیے ایک المیہ تھا اور اس کے لیے وجہ انبساط نہیں۔ نہیں میں غلط کہہ گیا۔ وجہ انبساط اگر سمجھا جائے تو میری اور اس کی وابستگی کے معنی کیا رہ جاتے ہیں۔ تعلق میں بے تعلقی کا ایک طلسم تھا۔

اس دن مہابھارت کی کہانی ٹی۔ وی پر چل رہی تھی جس میں اس ارادے کو سراہا گیا تھا جس کو خود میں واپس لے لینے کی صلاحیت موجود ہو اگر ایسا نہیں ہے تو ارادے کا استعمال کرنے کا اختیار کہاں رہتا ہے وہ یہ دیکھ کر مسکرا دی تھی اور میں تو بالکل حیرت میں پڑ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کمان سے نکلا تیر بھی واپس آ سکتا ہے۔

لیکن جیسے اسے میرے بارے میں یہ گمان تھا کہ میں اسے واپس لینے کی کلا جانتا ہی نہیں سکتا۔ میں خود سے مطمئن تھا اور وہ اس اطمینان کی راہ میں ہمیشہ ایک بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آجاتی تھی۔ اس کشمکش کا اگر اس پر اثر ہوتا تو بھلا یہ کشمکش کیوں ہوتی اور تب وہ بھی نہ ہوتی۔ اس نے تو ایک رنگ کی مسکراہٹ کو اپنی پہچان بنا لیا تھا۔ وہ اتنی بے پرواہی کہ مجھے کشمکش میں ڈال دینے کے لیے کافی تھی۔ ہاں ہاں وہ اداس بھی ہوتی تھی اور تب ہی تو میرا ہر حوصلہ پست ہو جاتا تھا۔

میں اسے چھوڑ دینا چاہتا، بھول جانا چاہتا۔ میں چاہتا کہ کوئی اور ایسا ہوتا جس سے ایسی امید کی جاتی، جس کے ٹوٹنے کا اندیشہ نہ ہوتا، لیکن اس سے وابستہ ہر امید پیدا ہی ٹوٹنے کے لیے ہوتی تھی اور کبھی کبھی تو ایسا ہو جاتا کہ وہ امید ٹوٹ جاتی جس کا ہر زاویہ حصول سے جڑا ہوتا۔

مثال کے طور پر اس دن کا ہی تذکرہ کر دیا جائے جب میں بے وہم و ن اس وقت عقبی دروازے سے گھر میں داخل ہوا جو وقت میرے ا ہونے کا ہوتا۔ میں یہیں تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ موجود ہے۔ خوشی ہوئی کہ وہ اتفاقاً مل گئی اور سب کچھ بے وہم وگمان ہوا، اور تنہائی بھی بے وہم وگمان ہوگئی، لیکن اس نے کہا کہ یہ وقت تو اس نے ت اس لیے منتخب کیا تھا کہ میں یہاں نہ ملوں اور تنہائی نے میرے جذبوں ایک بھرپور تھپیڑ مارا اور ایک دل خراش مسکراہٹ تنہائی کے چہرے نظر آئی۔

ذرا مرجھائے پھولوں کو گلدان سے نکال کر پھینک دوں۔ یہ ے تک نہ ہٹیں گے نئے پھول لگیں گے کیسے۔

وہ اہم واقعہ بھی غیر ارادی طور پر رونما ہوا تھا جو اب اس کی زندگی کا سور بن گیا تھا لیکن وہ اپنے ناسور پر مرہم لگاتی رہتی ہے اور ایک ہم ایسا آتا ہے جب اس کا یہ زخم بہت چمکتا ہے لیکن تب وہ اور وہ ہنستی ہے۔ وہ واقعہ تو اس کی زندگی سے جڑا ہے اور اس پہ نے کے عمل سے تو میں انگشت بدنداں ہوں۔ یعنی وہ خود پر ہنستی ہے پر ہی نہیں، اپنی ایذا پر بھی ہنستی ہے۔ وہ اس مردہ جسم سے مل کر ج کا راس رچاتی ہے۔ یہ تضاد زندگی کا شیوہ ہی نہیں ہے لیکن سارے مناظر کو یہی بتا رہی ہے کہ زندگی کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ مجھے جب یہ بتاتی ہے تو حقیقت کی تلخی میری قوت برداشت کے ایک چیلنج بن جاتی ہے۔ وہ اس Skeleton کو اس طرح ساتھ لیے چلتی ہے جیسے اس کو علامت بنا کر کسی بہت بڑے مشن پر انہ ہوئی ہے۔ اور پھر ٹیس برداشت کرنے کا وہ موسم گزر جاتا ہے تب لوگ اس سے اس انسانی ڈھانچہ سے متعلق سوال کرتے ہیں لیکن بے جان سوالات سے تب وہ آزاد ہو جاتی ہے۔ اس کے ب سوالات سے صلح کر لیتے ہیں۔ وہ لوگوں کو بتاتی ہے کہ وہ میلہ پھر سی سال لگے گا۔ یہاں کے آنے والوں کو اس ڈھانچے سے خاص چسپی ہے۔ میں نے کئی بار اس کی پراسراریت کو جاننا چاہا۔ اور پھر مجھے چلا کہ اس نے اس ڈھانچے سے ایک کہانی جوڑ رکھی ہے جس کو سنا کر وہ لوگوں کو شک اور خوف کی راہ سے اپنے بارے میں سوچنے دیتی ہے، دلوں میں کھنک پیدا کر دیتی ہے اور سامانِ آرائش لے کر آئینے سے کھلواڑ کرنے لگتی ہے۔

وہ میری طرف آ جاتی ہے اور میری روح سے اس فعل کا تاثر پوچھنے لگتی ہے جس میں وہ میلہ لگتا تھا اور انسانی ڈھانچے کو زندگی کا حوالہ بنانے کا عبرت ناک کام وہ کرتی تھی۔

میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ ڈھانچہ وجہ تفریح ہے تو اسے ضرور ساتھ رکھے لیکن میلوں ٹھیلوں میں وقت برباد کرنے سے کیا حاصل ہے۔ بھلا بے جان ڈھانچہ وجہ نزاع کیا بن سکتا تھا۔ لیکن میلے کے چکر میں بہت سے قیمتی لمحات ضائع ہو جاتے تھے۔ میں نے اس کو منع کیا تو اس نے مجھ سے ہر بات مان لینے کا وعدہ کر لیا اور نہ جانے اُسے کیا یاد آیا۔

اور اس دن ساون کی پہلی تاریخ تھی۔ ساون برسا، بجلی تڑپنے لگی۔ میرا جسم بھیگ گیا۔ میں نکلا کس ارادے سے تھا اور ہو کیا گیا۔ تمام راستہ نشیبی تھا۔ خوب پانی بھر گیا۔ زمین کی تو تقدیر جاگ گئی تھی لیکن آسمان اُداس تھا۔ بہرحال میلے کا تصور پہلے دھندلا ہوا پھر مٹ گیا۔ یہ کام پانی نے کیا۔ اب مجھے کہاں جانا تھا۔ میں ٹھہرا رہا۔ پاس ہی کہیں کوئی کبیر کا دوہا گا رہا تھا۔

لالی مورے لال کی جت دیکھوں تت لال
لالی دیکھن میں گئی سو میں بھی ہوگیوں لال

اس نے بڑے اعتماد سے کہا کہ اس دوہے میں جو تصویر کھینچی ہے اس سے جو تصور ابھرتا ہے وہ سب بے اختیارانہ ہے۔ یہ ساری سرخی بے اختیارانہ ابھری ہے۔ جو لالی دیکھنے گیا اس کا رنگ بھی سرخ ہو گیا۔ وہ بھی اچانک۔ میں بھی قائل ہوا لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر بھی تھا کہ روزمرہ کی زندگی میں ایسا کب ہوتا ہے اور یہ سوچنے کا کون سا انداز ہے اسے کون بتاتا کہ میلہ لگتا ہے ارادے سے، وہ ڈھانچے کو صاف کپڑے پہناتی ہے ارادے سے۔ لیکن اس موضوع پر آ کر وہ موضوع ہی سے اجتناب کر جاتی ہے۔

وہ تو میری روح سے تاثر جاننا چاہتی ہے، میلے کا —— بے حقیقت ڈھانچے کا —— اور میری روح تاثر کو چھپاتی ہے

اورصرف آئینے اورآرائش کے قصے پر ہر بات رُک جاتی ہے۔ کیوں کہ وہی راہِ فرار ہے۔

میری انگلی میں یہ پھانس پہلے کبھی لگی تھی اور اس نے سوئی سے یہ پھانس نکال کر ہی تو مجھے خود سے آشنا کیا تھا۔ پھانس نکل گئی تھی اور میں اسے جان گیا تھا۔

آج پھر وہی ہوا ہے ـــ لیکن وہ دُور کھڑی رہی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ آج وہ یہ پھانس نہیں نکالے گی۔ وہ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ میں تو خود کہیں چلا گیا تھا ـــ پھانس کی کھٹک سے کہیں پرے ـــ اتنی دیر میں وہ بھی نکل لی۔ اور مناظر جانتے ہیں کہ وہ کیوں نہیں آئے گی۔ جب تک یہ پھانس نہ نکل جائے۔

کیا میں نے جان بوجھ کر یہ پھانس لگائی تھی ـــ نہیں! بالکل غیرارادی طور پر ہوگیا تھا ایسا ـــ تو پھر اسے کون بتائے کہ ایک ہلکی سی نشتر کی نوک مسئلے کا حل ہے۔ لیکن اس کو تو ارادے سے ضد ہے۔

□□

نیلی آنکھوں کا گلدستہ

ـــ صفحہ ۳۶ کا بقیہ

"اب تو تسلی ہوگئی تمھیں؟ یہ نیلی نہیں ہیں۔"

"بہت ہوشیار ہو کیوں۔؟" اس نے جواب میں کہا۔

"لاؤ دیکھتے ہیں، ایک اور تیلی جلاؤ۔"

میں نے ایک اور تیلی جلائی اور اسے اپنی آنکھوں کے پاس لے گیا۔

میری آستین پکڑتے ہوئے اس نے حکم دیا ـــ

"نیچے جھکو۔"

میں گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال پکڑے اور میرے سر کو پیچھے کر لیا۔ وہ میرے اوپر تجسس اور تناؤ کے ساتھ جھک آیا۔ اس کا چہرہ آہستہ آہستہ اس طرح نیچے آیا کہ میری پلکوں کو چھونے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"انھیں کھولے رکھو۔" اس نے حکم دیا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ماچس کی لَو سے میری پلکیں جلنے لگیں۔ اچانک اس نے مجھے چھوڑ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ نیلی نہیں ہیں۔ پھوٹ لو۔"

وہ غائب ہوگیا۔

میں دیوار پر جھک گیا۔ میں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالا۔ لڑکھڑاتا، گرتا پڑتا میں ایک گھنٹے تک اس سنسان قصبے میں پاگلوں کی طرح دوڑتا رہا۔

جب میں چوک میں پہونچا تو مجھے لاج کا مالک دکھائی دیا۔ وہ اب بھی دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں بغیر ایک لفظ کہے اندر چلا گیا۔

دوسرے روز میں نے وہ قصبہ چھوڑ دیا۔!

□□

صدف جعفری
۲۶۔ زکریا اسٹریٹ
کلکتہ

غزل

کیا خاک، ہو کے خاک بسر، مانگتے ہیں لوگ
دریا کنارے ریت پہ گھر مانگتے ہیں لوگ

کل تک فروغِ آتشِ گُل تھا انھیں پسند
اب آسماں سے شمس و قمر مانگتے ہیں لوگ

دھڑکا لگا ہی رہتا ہے سورج کے قہر کا
اک شب بھی چاندنی کی اگر مانگتے ہیں لوگ

خوگرِ ستم کے ایسے ہوئے ہیں کہ کچھ نہ پوچھ
رہنے کو آج شہرِ شرر مانگتے ہیں لوگ

پردہ پڑا ہوا ہے ابھی عقل پر صدفؔ
کیوں شہرِ شب میں نورِ سحر مانگتے ہیں لوگ

افسانہ

شیما رضوی
ریڈر، شعبۂ اردو
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

روح

ساری فضا پر موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھر کی ہر چیز جو کچھ دیر پہلے مسکرانے کے لیے بے تاب تھی اب اپنی بد قسمتی پر آنسو بہانے پر مجبور تھی۔ امّی کو غش پر غش آ رہے تھے۔ ابّو غموں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبے سر کو ہاتھوں پر تھامے مغموم اور افسردہ سے بیٹھے خلا میں گھور رہے تھے۔ کریمن بوا باورچی خانے کے ایک کونے میں بیٹھی سٹر سٹر کرتی ہوئی ناک کو دوپٹے سے بار بار پونچھ رہی تھیں۔ نانی اماں روتے روتے بے حال سی نڈھال پڑی تھیں اور نرگس کے تو جیسے لب سل گئے تھے۔ آنکھیں گرم لوہے کی طرح ہو گئی تھیں اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر چیز کو دیوانوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔ محلے کے لوگ ماتم پرسی کے بعد ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے گھر پر ایک ہولناک سی اداسی اور ایک پُراسرار سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نرگس کی حالت سب سے زیادہ دگرگوں تھی۔ اس کا دماغ جیسے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور چند ساعتوں میں کیونکر ہو گیا۔ اس نے حسرت بھری نگاہ جمال بھیا کے کمرے کی طرف ڈالی، جہاں کل صبح خوشیاں اور مسرتیں جاگنے والی تھیں۔ کمرے پر نظر پڑتے ہی ایک ایک کر کے یادوں کے دریچے وا ہوتے گئے۔ پورے چھ سال بعد جمال بھیا ڈاکٹری کی ڈگری لے کر امریکہ سے واپس آ رہے تھے۔

انھوں نے اطلاع دی تھی کہ وہ ۲۷ تاریخ کو تین بجے صبح ہوتے دہلی پہونچیں گے اور ۲۸ کو دس بجے کی فلائٹ سے چل کر گیارہ بجے تک امو سی ہوائی اڈے پہونچ جائیں گے۔ گھر کے سبھی لوگ صبح ہی سے جمال بھیا کو رسیو کرنے امو سی جانے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے امی اور ابو تو خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے اور کیوں نہ ہوتے ان کا بھانجا، جس کو وہ اپنے بیٹے سے کسی طرح کم نہیں سمجھتے تھے ان کے خوابوں کی تعبیر بن کر واپس آ رہا تھا۔

جمال بھیا کے سر پر سہرا دیکھنے کے ارمان ان کے بوڑھے دلوں میں کروٹیں لے رہے تھے۔ امی کی نظروں سے فریدہ خالہ کا وہ بیمار چہرہ ایک لمحے کے لیے بھی اوجھل نہیں ہو پاتا تھا جب ان کی بیوہ بہن نے ننھے یتیم بچے کا ہاتھ امّی کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا تھا کہ:

"آپا! جمال کو اپنا ہی بیٹا سمجھنا۔ اگر وہ تمھارے لائق بن سکا تو نرگس سے بہتر میری نظر میں اس کے لیے کوئی دوسری لڑکی نہیں، یہ میری آخری خواہش ہے۔" یہ کہتے ہوئے فریدہ خالہ نے دم توڑ دیا تھا امی نے اپنی بہن کی اس نشانی کو ان کی خواہشات سے بڑھ کر سنبھال کر رکھا تھا، اور دیکھنے میں بھی آیا تھا کہ وہ نرگس سے زیادہ جمال بھیا کا خیال کرتی تھیں۔

جمال بھیا اس وقت بہت چھوٹے تھے لیکن اپنی عمر کے لحاظ سے ان کی شرارتیں کہیں بڑھی ہوئی تھیں اور عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شرارتوں میں بھی پختگی آتی جا رہی تھی۔ اسے یاد آیا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی اپنے شباب پر تھی۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ لحاف میں دبکا پڑا تھا۔ لیکن بھیا کا

کا شرارتی دماغ اس وقت بھی کوئی نئی شرارت سوچ رہا تھا۔

صحن میں اندھیرا تھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھے۔ گھڑونچی پر رکھا ہوا پانی کا گھڑا اُٹھائے وہ دبے پاؤں نرگس کے پلنگ کے قریب پہونچے۔ لحاف کے اندر سے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ انھوں نے آہستہ سے تھوڑا سا لحاف کھسکایا اور جلدی سے پانی سے بھرا پورا گھڑا الٹ کر بجلی کی سرعت کے ساتھ بھاگ کر اپنے کمرے میں اوندھے منہ بستر پر ڈھیر ہو گئے۔

پانی پڑتے ہی لحاف کے اندر سے ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی اور دوسرے ہی لمحے نانی اماں پانی سے شرابور لحاف کے اندر سے برآمد ہوئیں۔

امّی بے تحاشہ نانی اماں کی چیخ سُن کر اپنا لحاف پھینک کر اُن کی طرف لپکیں، اور نرگس جو اس دن نیند کی وجہ سے پریشان ہوکر قریب ہی بچھے نانی اماں کے پلنگ پر سوگئی تھی، کسمسانے لگی۔

"ارے باپ رے غضب ہوگیا" اپنے پلنگ پر لحاف کے اندر دُبکے ہوئے جمال بھیّا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اور نانی اماں نے صلواتیں سُنا سُنا کر اُس رات سب کا سونا حرام کردیا۔

ڈانٹ اس دن بھی نرگس کو پڑی۔

اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اسکول جانے کے لیے بالکل تیار کھڑی ہے، بس ڈرائیور نے آواز دی۔ وہ بستہ اٹھانے اندر کمرے میں بھاگی تو سارا بستہ مع کتابوں کے غائب۔ اب وہ لاکھ پیر پٹخ رہی ہے۔ گھر کا کونا کونا چھان رہی ہے لیکن بستہ ہو تو ملے۔ بس ڈرائیور نے دو تین آوازیں دیں، اور انتظار کرکے اسکول بس روانہ ہوگئی۔

امّی غصّے سے چلائیں۔ "نرگس! میں خوب جانتی ہوں۔ جب تیرا اسکول جانے کا دل نہیں چاہتا، ایسے ہی نرالے بہانے بنانا شروع کردیتی ہے۔ بستہ بھی بھلا کھونے کی چیز ہے، پر تو کہتے نہیں اس کے کہ وہ اُڑ گیا۔ آخر تلاش بسیار کے بعد وہ اسی کے بکس میں کپڑوں کے نیچے رکھا ہوا پایا جاتا۔ اب وہ لاکھ اپنی صفائی دینے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہاں سنتا کون ہے۔ اسکول کا ناغہ ہوا سو الگ۔

اور عید کا وہ موقع تو اسے کبھی نہیں بھولا تھا جب ابّو نے اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے جمال بھیا کو اس کا جوتا لانے کی ہدایت کی تھی۔ جمال بھیا بڑی سعادت مندی سے راضی ہوگئے تھے۔ عید کا دن آپہونچا لیکن جمال بھیا نے جوتا لاکر نہیں دیا۔ تب اس نے امّی سے ان کی شکایت کردی۔ امّی نے ہمیشہ کی طرح جمال بھیّا کا پارٹ لیا:

"امتحان کی تیاری میں بھوت کی طرح تو لگا رہتا ہے۔ ذہن سے اتر گیا ہوگا۔ پُرانا ہی پہن لوگی تو کیا غضب ہوجائے گا"...

ابھی امی کا جملہ پُورا بھی نہیں ہوا تھا کہ جمال بھیّا ایک انتہائی خوبصورت سا پھول دار ڈبّہ ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے شاید امّی کا آخری جملہ سُن لیا تھا—

"ارے پُرانا کیوں پہنے گی۔ میں کیا اتنا کام بھی نہیں کرسکتا۔"

اتنا خوبصورت ڈبّہ دیکھ کر وہ اپنی شکایت پر شرمسار ہوئی۔ جھٹ ڈبّہ ہاتھ میں لے جلدی جلدی ڈوری کھولی۔ ڈھکن اُٹھایا۔ لیکن یہ کیا—!؟ وہ روہانسی ہو پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے۔ جمال بھیّا جھٹ بول اُٹھے:

"دیکھئے نا امّی! آج عید ہے اس لیے تمام دکانیں بند ہیں۔ بڑی مشکل سے ایک دُکان کھلوا کر جوتا تلاش کیا۔ ان کی ناپ کا کوئی جوتا ہی نظر نہیں آیا۔ سوچا خالی ہاتھ جانے سے بہتر ہے یہ ہوائی چپل ہی لیتا چلوں۔ بھئی، نئی چیز سے مطلب۔ اب وہ جوتا ہو یا ہوائی چپل فرق کیا پڑتا ہے۔ اور یہ بڑی بی ٹھہریں روزہ نماز کی پابند۔ پانی میں کتنا ہی بھگولیں، خراب نہیں ہوسکتی۔ میں نے سوچا ایک پنتھ دو کاج دیکھیے خالہ امی۔ ہاتھ میں لے کر دیکھئے کیا آرام دہ چپل ہے۔ واہ کیا خوبصورت رنگ ہے، خوب جچے گی نرگس کے گورے گورے چمپئی جیسے سفید پیروں میں" وہ نہ جانے کیا کیا لن ترانی ہانکتے رہے اور نرگس بیچاری دل مسوس کر رہ گئی۔

دن تیز رفتاری سے گزرتے رہے اور پھر اُنھیں قہقہوں، چہچہوں کے بیچ ابّو نے انھیں ایم، بی، بی، ایس کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے امریکہ بھیج دیا۔ اس نے سوچا چلو آفت ٹلی۔ لیکن اس نے جلد ہی محسوس کیا کہ جمال بھیّا کے چلے جانے سے جیسے گھر کی رونق ہی چلی

گئی۔ ایک عجیب سی وحشت اور اکیلے پن کا احساس چھوڑ گئے تھے وہ۔ کبھی کبھی تو ان کی یاد اتنی شدت سے آتی کہ وہ گھنٹوں لحاف میں منھ ڈالے سسکتی رہتی۔

یہی وہ زمانہ تھا کہ اس نے بی اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا اور اس موقع پر جمال بھیا نے امریکہ سے دو خوبصورت پیکٹ بھیجے تھے۔ ایک چھوٹا اور ایک بڑا۔ بڑا پیکٹ اس قدر خوبصورت تھا کہ اس نے پہلے اسی کو کھول ڈالا۔ لیکن فوراً ہی اسے منہ پر دوپٹہ رکھ لینا پڑا۔ ڈبے کے اندر سے سڑی ہوئی چھپکلیوں کی بدبو سے اس کا جی متلا اٹھا۔ اور چڑ کر اس نے چھوٹا ڈبہ دور اچھال دیا۔ لیکن یہ کیا ایک جھناکے کے ساتھ چار خوبصورت سنہری چوڑیاں ڈبے سے باہر نکل آئیں۔ فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ چمک اٹھا اور وہ سوچنے لگی کہ اُف میرے خدا! کتنے شریر ہیں جمال بھیا بھی۔ ابھی تک ان کی شرارتوں کا وہی حال ہے۔

۲۵ر کو فون پر ان کے آنے کی اطلاع ملی تھی۔ ۲۸ر کی صبح وہ امو سی پہونچنے والے تھے۔ انتظار کے یہ تین دن تین برس ہو گئے۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ اس نے صاف کرنے کی غرض سے جمال بھیا کا کمرہ کھولا جو شاید ان پانچ چھ برسوں میں صرف پُتائی کی غرض سے ایک بار کھولا گیا تھا۔ کمرہ گرد سے اٹا پڑا تھا۔ اس نے کمرے کی ایک ایک چیز بڑے سلیقے سے قرینے سے صاف کر کے اپنی اپنی جگہ رکھی۔ کریمن بوا نے مدد کرنا چاہی لیکن اس نے انھیں ایک چیز میں بھی ہاتھ لگانے نہ دیا۔ کمرے کے باہر کا دروازہ کھولا جو جمال بھیا کے رہنے پر ہر وقت کھلا رہتا تھا اور ان کے پرمذاق دوستوں کے آنے جانے کا سلسلہ بدستور لگا رہتا تھا۔ گرد میں اَٹے ہوئے گلدان کو اس نے صاف کیا اور نرگس کے تازہ پھولوں سے بھر دیا۔ پھولوں کو گلدان میں سجاتے ہوئے اسے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ اس لیے کہ جمال بھیا کو نرگس کے پھول بے حد پسند تھے اور وہ اکثر جھک کر ان پھولوں کو پیار کر لیا کرتے تھے اور وہ ان کی اس حرکت پر شرما کر رہ جاتی تھی۔

کمرے پر ایک آخری نظر ڈال کر وہ باہر نکلی ہی تھی کہ ابو نم ناک آنکھوں کو پونچھتے ہوئے ہاتھ میں ایک سفید کاغذ لیے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور کاغذ امی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بے اختیار پھپھک پڑے۔

"ہائے اللہ یہ کیا ہے"۔ امی حواس باختہ ہو اٹھیں۔ نرگس نے دوڑ کر کاغذ ہاتھ سے لے لیا۔ یہ ٹیلی گرام تھا، دہلی سے آیا تھا جمال بھیا کے کسی دوست نے اطلاع دی تھی کہ دہلی پہونچتے ہی جمال بھیا کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا۔ اب وہ ان کی لاش لے کر کسی وقت بھی پہونچ سکتے ہیں، ان کے اگلے ٹیلی گرام کا انتظار کیا جائے۔

گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ امی غش کھا کر گر پڑیں۔ نانی اماں نے چھاتی پیٹ لی۔ کریمن بوا سارے محلے کو خبر دے آئیں اور نرگس کو تو جیسے سکتہ ہو گیا۔ رات گئے تک پُرسہ دینے والوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ دیوار پر لگی گھڑی کے گھنٹے بج اٹھے۔ اس کی آواز سے وہ چونک اٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بجے تھے صبح ہونے کو آئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بے جان لاش کی طرح آہستہ آہستہ اس کے قدم جمال بھیا کے کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ پردہ اٹھایا، اور ایک بھیانک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ وہ بے تحاشا الٹے پیر بھاگی۔

"امی ـــ امی روح ـــ جمال بھیا کی روح ـــ سچ امی بالکل جمال بھیا کی طرح ـــ!!" وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔

امی کے آنسوؤں میں اور اضافہ ہو گیا۔ انھوں نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔ "ہائے میری بچی! یہ تو بالکل پاگل ہو گئی"۔

"نہیں امی نہیں ـــ میں پاگل نہیں ہوں۔ میرے حواس بالکل درست ہیں۔ آپ میرے ساتھ چلئے ـــ میں آپ کو دکھلاتی ہوں"۔

اور نرگس کی بہکی بہکی باتوں کے باوجود وہ اس کا دل رکھنے کے لیے کمرے کی طرف چل دیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ایک لمحہ کو ٹھٹھکیں ـــ انھوں نے دیکھا سامنے پلنگ پر سچ مچ نیلی بشرٹ اور سفید پینٹ میں ملبوس جمال بھیا کی روح نیم دراز نظر آئی اور وہ ایک چیخ مار کر پلنگ پر گر پڑیں۔

اچانک جمال بھیا کی رُوح نے آنکھیں کھول دیں اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ۔۔۔ اور وہ دروازے میں چپکی تھر تھر کانپنے لگی ۔

" ارے ۔۔ خالہ امی آپ کو کیا ہو گیا ۔۔ اوہ ! یہ تو بیہوش ہوگئیں ۔ ارے نرگس ! تم کھڑی کھڑی منھ کیا دیکھ رہی ہو ۔۔ پانی لاؤ دوڑ کر ۔" اور پھر انھوں نے خود ہی سامنے میز پر رکھے ہوئے جگ سے پانی انڈیل کر امی کے منھ پر چھینٹا دیا ۔ امی نے کراہتے ہوئے آنکھ کھول دی ۔

" اوہ جمال بیٹے ، میں کیا دیکھ رہی ہوں ۔" انھوں نے جلدی جلدی جمال بھیا کو سب طرف سے ٹٹول ڈالا ۔ " تم سچ مچ زندہ ہو یا یہ تمھاری روح ۔ ۔ ۔ ۔" وہ جملہ پورا نہ کر سکیں ۔

" رُوح ۔۔۔ ! کیا مطلب ۔ ؟ اوہ ۔ اچھا ۔" جمال بھیا کو جیسے کچھ یاد آیا اور انھوں نے ایک زبردست قہقہہ لگایا ۔ امی کی حیرت کچھ اور بڑھ گئی ۔ اور اس کی نرگسی آنکھیں حیرت سے کچھ اور پھیل گئیں ۔

" ہاں خالہ امی ! آپ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں ۔ لیکن بھئی رُوح کی بھی ایک ہی رہی ۔ غالباً آپ اس ٹیلی گرام کا ذکر کر رہی ہیں ۔ بھئی میں کل دہلی آگیا تھا ۔ ایر پورٹ پر اترتے ہی معلوم ہوا کہ فلائٹ لیٹ ہے صبح کے بجائے رات کو پہونچے گی ۔ میں نے سوچا کیوں نہ چلتے چلاتے نرگس کو چھیڑا جائے ۔ بس ایک فرضی ٹیلی گرام دے ڈالا امید یہی تھی کہ میں اور ٹیلی گرام ساتھ ہی ساتھ پہونچیں گے ۔ لیکن بھلا ہو اس مستعدی کا ۔ وہ آپ کو جلدی مل گیا ۔ میں رات دو بجے یہاں پہونچا ۔ میں نے سوچا اس وقت تو آپ سب لوگ سو رہے ہوں گے ۔ پھاند کر اندر آنے کی ترکیب سوچ رہا تھا کہ اپنے کمرے کی جلتی ہوئی لائٹ دیکھ کر اس طرف آگیا ۔ اچانک کمرے کے اس پچھلے دروازے پر ہاتھ پڑ گیا ۔ دروازہ کھلا تھا ۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی ۔ اندر آیا تو ایسا لگا جیسے میرا کمرہ میرا منتظر ہو ۔ ہر چیز صاف ستھری ۔ میں نے سوچا صفائی کرتے وقت کمرے کا پچھلا دروازہ کھلا رہ گیا ہوگا پھر بند کرنا رہ گیا ہوگا ۔ رات زیادہ ہو چکی تھی ، میں نے آپ لوگوں کو جگانا مناسب نہیں سمجھا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا ۔ تھکا ہوا تو تھا ہی گھر کا آرام نصیب ہوا تو نہ جانے کب آنکھ لگ گئی ۔ ابھی میں پہاڑوں کی ایک حسین وادی کی سیر کر رہا تھا کہ ایک بڑا سا تیندوا مجھ پر آگرا ۔۔ میری آنکھ کھل گئی ۔ دیکھا تو آپ میرے اوپر ڈھیر تھیں ۔"

" ہائے جمال بیٹے ! تم نے تو ہم لوگوں کی جان ہی لے لی تھی ۔ اتنا خطرناک مذاق ۔" اور اب وہ مارے خوشی کے رو رہی تھیں ۔

نرگس ابھی تک دروازے سے چمٹی پردہ پکڑے حیرت سے کھڑی ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی کہ اچانک سُرعت کے ساتھ جمال بھیا پلنگ سے اچھلے اور نرگس کی دونوں چوٹیاں پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بولے ۔۔۔

" ادھر تشریف لایئے نرگس صاحبہ ! آپ کے جمال کی رُوح آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہی ہے ۔"

اور وہ لفظ " رُوح " پر نہ جانے کیا سوچ کر مسکرا پڑی ۔ اس کی سُرخ سُرخ بوجھل آنکھوں میں دو ننھے موتی جگمگانے لگے ۔ کون جانے ان میں کتنی خوشیاں کتنی مسرتیں اور کتنی آرزوئیں پنہاں تھیں ۔ !!

□□

سلیم اختر سیتاپوری
شیخ سرائے ۔ سیتاپور

غزل

عقل تو کرتی نہیں کچھ فیصلہ ہم کیا کریں
اے جنوں اب تو تو ہی دے مشورہ ہم کیا کریں

اس کی اس معصومیت پہ کیوں نہ ہو پھر دل نثار
سُن کے دل کا حال جب اس نے کہا ہم کیا کریں

عشق کی روداد سُن کر عقل نے ہنس کر کہا
مسئلہ دل کا ہے یہ اس میں بھلا ہم کیا کریں

گردشِ حالات اختر زندگی کے ساتھ ہے
گردشِ حالات کا شکوہ گلہ ہم کیا کریں

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے
دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: سر شاخ طوبیٰ

شاعر: فضا ابن فیضی ۔ قیمت ۵/- روپئے

ملنے کا پتہ: فیضی پبلی کیشنز ۔ مئو ناتھ بھنجن

ریاضت سخن سے معجزہ فن تک کا سفر جس عمیق مطالعہ، انہماک، عزلت گزینی اور خون جگر کا متقاضی ہے، اس کے اسرار فضا ابن فیضی پر کچھ اس طرح کھلے کہ تقریباً نصف صدی سے وہ ایک معتبر نام بن کر فضائے ادب پر چھائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے آداب شاعری کو اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر اس طرح برتا کہ ماضی کی صالح روایات کی چمک بھی قائم رکھی اور عصری تقاضوں کا بھی لحاظ رکھا اور یہی انفرادیت ان کی پہچان بن گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جام شریعت کو سندان عشق کے ساتھ ملاکر رکھنے کا سلیقہ فضا صاحب خوب جانتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں رہے، لیکن مثبت رویوں کو قبول کرنے سے انھوں نے کبھی گریز نہیں کیا۔ اسی خوش مذاقی کے سبب وہ ہمیشہ مقبول ارباب نظر رہے۔ نئی زمینوں کی تلاش، حیات و کائنات کی وسعتوں کو سمیٹنے کا ہنر اور اپنے مخصوص اسلوب کی بنا پر وہ ہزاروں میں اکیلے نظر آتے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ زندگی ہی میں ان کی عظمت کا اعتراف کرلیا گیا۔ فضا صاحب آج بھی انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ شاہراہ ادب پر سرگرم سفر ہیں۔

"سر شاخ طوبیٰ" اصلاً حمدیہ اور نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے مگر اس میں "منظر و پس منظر" کے عنوان سے نثری تخلیقیں نیز "نغمہ گل" کے تحت کچھ ترانے بھی شامل ہیں۔ یہ سارا سرمایہ افکار شاعر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ حمد و نعت کہنا آسان کام نہیں ہے۔ صاحبان نظر اس راستے میں قدم رکھتے ہوئے لرزتے ہیں۔ یہ بڑی احتیاط کا سفر ہے۔ ذرا چوکے اور کام سے گئے۔ دیکھا گیا ہے کہ عموماً شعرا حمد و نعت کہنے میں بے احتیاطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بہرنوع فضا صاحب کے نعتیہ کلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے سلامت روی سے یہ راستہ طے کیا ہے۔

جناب اطہر نقوی اپنے مقدمہ میں حمد و نعت کی حدود کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"فضا سلفی العقیدہ عالم ہیں اور فکر و عقیدہ کی ان نزاکتوں کو سمجھتے ہیں۔ انھوں نے دم تیغ پر پوری احتیاط اور ہوشیاری سے قدم رکھا ہے اور کہیں قلم کو بھٹکنے نہیں دیا ہے۔ انھوں نے جو حمد لکھی ہیں ان میں عقیدہ توحید کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

ان کے عنوانات آیات قرآنی سے لیے گئے ہیں جس نے ان نظموں کو ایک نئی دلکشی اور تقدیس عطا کی ہے۔ انھوں نے کبھی بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، نہ خالق کائنات سے شوخی کی ہے نہ ذات رسالت کو کبریائی کے درجہ تک پہونچایا ہے۔ یہی احتیاط اور اعتدال ان کے کلام کا مابہ الامتیاز وصف ہے۔"

دیگر منظومات کے سلسلے میں اطہر نقوی صاحب کی یہ سطور بھی قابل توجہ ہیں:-

"جبرئیل و ابلیس اور خضر و فردوس سے لے کر بھوپال اور مئو کے المیہ تک فضا کے ذہنی سفر کی یہ داستان دلچسپ بھی ہے اور دردناک بھی۔ فضا کے فکر و فن نے عروج و ارتقا کی جو منزلیں طے کیں، اس نے ان کے کلام کو وہ سوز، درد اور کرب بخشا ہے کہ ان کی شاعری اب تاریخ کربلائے حیات بن گئی ہے۔

لیکن کربلائے حیات کی یہ تاریخ بڑی جاندار اور

فکر انگیز ہے:
قضا صاحب کی شخصیت و شاعری کے مختصر تعارف کے بعد آیئے
مذکورہ کتاب سے کچھ اشعار آپ کی نذر کر دیں ؎

حمد

شامِ سحر، رنگ اور نو، خوشبو کا سفر
منظر منظر رنگ جلانے والا تو
مٹی کو امکاں کا شرف دینے والا
آگ کو خلدِ سبز بنانے والا تو

دانشِ عقدہ کشا پر بھی یہ عقدہ نہ کھلا
کتنے اسرار ابھی زیرِ نقاب اس کے ہیں

میں ہوں ہر چند سرابِ ہستی
مجھ میں زندہ ہے سمندر اس کا

نعت

تجھ سے قائم حرفِ رسالت کی حرمت
روحانی اقدار سکھانے والا تو

جگمگا اٹھی "شبِ اسریٰ" کی گلگوں رہگزر
فرش سے تا عرش تیرا نقشِ پا سرسبز ہے

دھواں دھواں تھا سماں ہر چراغ تیرے بغیر
نہ آرزو تھی شگفتہ، نہ مدعا روشن

آفسیٹ پر چھپی ہوئی معیاری کتابت اور اعلیٰ درجہ کے کاغذ نیز دیدہ زیب سرورق سے مزین "سرشاخِ طوبیٰ" معنوی حسن کے ساتھ ساتھ صوری حسن سے بھی جگمگا رہی ہے۔ یقیناً ایسی کتاب اہلِ ذوق کے کتب خانوں کی زینت بنے گی۔

——— رباب رشیدی

نام کتاب: "کربِ صدا" (شعری مجموعہ)
شاعر: راشد صدیقی　　قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتہ: دفتر اشتراک ویکلی۔ قاضی پورہ خورد۔ گورکھپور

"کربِ صدا" راشد صدیقی کے دس سالہ کلام پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں میں بیشتر اشعار روایتی طرزِ سخن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مگر کہیں کہیں انھوں نے جدید غزل کی لفظیات کو برتنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جہاں تک شاعری کے موضوعات کا تعلق ہے، راشد صدیقی ایک غیر آسودہ ذہن اور پُرسوز دل و دماغ کے ساتھ اپنے ماحول پر نظر ڈالتے ہیں اور اپنے ردعمل کو زیادہ تر صاف اور سیدھے طریقے سے پیش کر دیتے ہیں۔
ان کی شاعری میں پیچ و خم بہت کم ہیں، صاف اور سیدھے بکھرے اشعار زیادہ ہیں جو سامع اور قاری کو براہ راست متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ راشد صدیقی کے بعض اشعار اس طرح ہیں ؎

کٹ گئی عمر راشد اسی فکر میں
جانے کب آئے گی راہ پر زندگی

ہر شخص اپنے پاؤں سے کچلا کیا مجھے
جیسے کہ میں زمیں پر اُگی سبز گھاس ہوں

پتھرا نہ جائیں مردہ پرستوں کے شہر میں
ڈھونڈا چلے ہیں زندہ خیالوں کے آئینے

کتاب عمدہ چھپی ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ اہلِ ذوق میں مقبول ہوگا۔

——— نامی انصاری

نام کتاب: "جدید ہند کے سیکولر معمار" (تاریخ)
مصنف: ڈاکٹر مجیب اشرف　　قیمت: ۸۰ روپے
ملنے کا پتہ: نوید اشرف، ۲۹ اشرف ولا، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر مجیب اشرف صاحب کی زیر تبصرہ کتاب "جدید ہند کے سیکولر معمار" (۱۸۰۰ء تا ۱۹۵۰ء) تاریخ جیسے اہم موضوع پر ایک مفید، دل چسپ اور معلوماتی کتاب ہے جو سینئر سکنڈری، بی۔ اے اور بی۔ اے (آنرز)

کے طلبا کی نصابی ضرورت اور معیار کے مطابق تحریر کی گئی ہے۔

کتاب کی ابتدا سید شریف الحسن نقوی (سکریٹری اردو اکیڈمی دہلی) کے "پیش آہنگ" اور خود مصنف کے "پیش لفظ" سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد جدید ہند کے خصوصی پہلو، ۱۸ویں صدی کے وسط میں ہند کے سیاسی حالات، اقوام یورپ کی ہندستان میں آمد، انگریزوں کا سیاسی تسلط اور ان کی سماجی اصلاحات، ۱۸۵۷ء کا غدر، ۱۹ویں صدی کی تحریکیں، کانگریس اور مسلم لیگ کا قیام، گاندھی جی کا عروج، ترک موالات، ہندستان چھوڑو تحریک، آزادی اور تقسیم ہند اور ہندستان کے سیکولر سماجی دستور کا ارتقا جیسے موضوعات پر مصنف نے مختصر لیکن جامع طور پر روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب سے ہندستان میں سیکولرازم، قومی یک جہتی، انسان دوستی، رواداری اور امن و آشتی کے جذبے کو فروغ تو ملتا ہی ہے، ساتھ ہی ہندستان کی صحت مند تاریخ اور صالح روایات و اقدار کو بھی تقویت پہونچتی ہے۔ کتاب دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کی تاریخ کثرت میں وحدت کا نمونہ پیش کرتی آئی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں ہمیشہ قومیت، رواداری اور یک جہتی کا عنصر غالب رہا ہے۔ موجودہ ماحول میں اس کتاب کی اہمیت و افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں فن تاریخ نویسی کے اعلیٰ معیار و اصول کو برتتے ہوئے تاریخی حالات و واقعات کو نہایت دیانتداری اور احساس ذمہ داری کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

کتاب کی زبان سادہ و سلیس اور عام فہم ہے۔ کتاب مجلد ہے جس کی کتابت و طباعت بھی معیاری ہے۔

——— انور حسین خاں

نام کتاب: "افسر شناسی"
مرتب: ڈاکٹر مصطفٰے نصرت
قیمت: دس روپے
ملنے کا پتہ: ڈاکٹر مصطفٰے نصرت۔ ۱۴۹ حسن پوریہ لکھنؤ

"افسر شناسی" میں لکھنؤ کے ایک ایسے بزرگ شاعر کے فکر و فن کا جائزہ لیا گیا ہے، جس کے ساتھ اودھ کی شائی تہذیب و شائستگی کا ایک عہد ختم ہوگیا۔ جناب بہادر حسین خاں انجم کے فرزند جناب سید نواب افسر کی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت گزاری میں بسر ہوئی۔ ان کا مجموعہ کلام "غم حیات" اور قصائد و رباعیات کے کئی مجموعے اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ افسر صاحب نے اردو زبان کو نہ صرف اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا بلکہ وہ اس زبان کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے "غم حیات" میں لکھنؤ کی ان علمی و ادبی تحریکات کا تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے جن سے ان کی جذباتی و عملی وابستگی تھی۔ وہ ایک انتہائی ذی حس، باشعور اور زمانہ شناس بزرگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام جتنا گزشتہ کل کی بازگشت محسوس ہوتا ہے اتنا ہی موجودہ دور کا آئینہ نظر آتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ مستقبل کی بشارت بھی ہے۔ "افسر شناسی" ان تمام مجمل حقائق کو مفصل طریقہ پر پیش کرنے کی ایک کامیاب اور قابلِ تعریف کوشش ہے۔

اس کتاب میں جن مضامین کو شامل کیا گیا ہے وہ کافی متنوع اور جان دار ہیں۔

"افسر شناسی" کا سب سے زیادہ دل چسپ مضمون خود مرحوم سید نواب افسر صاحب کا تحریر کردہ ہے جس کا عنوان ہے "میری ادبی زندگی" مرحوم نے دو تین صفحات میں اپنا تعارف کرا کے گویا سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

اس مجموعہ میں نثری مضامین کے ساتھ ساتھ بلند پایہ منظومات بھی شامل ہیں۔

"افسر شناسی" صوری و معنوی لحاظ سے ایک قابلِ مطالعہ ادبی کتاب ہے۔

——— ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی

معاونین سے: اشاعت کی غرض سے ارسال کردہ نثری یا شعری تخلیقات کی اصل کاپی ہی ارسال کریں، کاربن کاپی یا فوٹو اسٹیٹ کاپی قابل قبول نہ ہوگی۔ (ایڈیٹر)

رقم کرتے رہیں گے......

"دنیا میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس سے ایک عرصہ کے بعد انسان کا دل اُچاٹ نہ ہو جائے۔ مگر اسے ہم قہر الٰہی ہی کہیں گے کہ قومی یک جہتی پر تقریر سے نہ صرف لوگوں کا دل اُچاٹ ہوا ہے بلکہ لوگ ایک طرح سے بدکنے لگے ہیں — لیکن آپ نے جس خوبصورتی سے یہ نمبر نکالا ہے وہ ہر پڑھنے والے کو اپنا گرویدہ بنا کر رہے گا۔ اس لیے کہ آپ کے تجربہ کار ذہنوں نے اسے سنوارا ہے اور جس طرح آپ نے ہندوستانی اعلا قدروں کی بات کی ہے وہ آپ کا ہی حصّہ ہے۔ جب اعلا قدریں اپنی صحیح شکل میں سامنے آتی ہیں، تو اپنے آپ قومی یک جہتی روشن ہو جاتی ہے — یہ ایک اہم کام ہے۔ آپ کی محنت کی قیمت آنے والا وقت بھی لگائے گا۔

میری مبارک باد !"

———— ولایت جعفری
ڈائرکٹر لکھنؤ دُور درشن کیندر

"ایک شمارہ قومی ہم آہنگی کے نام" نہ صرف وقت کی دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھنے کے مصداق ہے بلکہ زخموں کا مداوا بھی ڈھونڈھ نکالنے کی سعی کرتا ہے۔ خصوصاً بشمبھر ناتھ پانڈے صاحب کا مضمون بعنوان "ہندوستان میں قومی یک جہتی کی روایت" اس میں مصنف نے بڑی چابک دستی سے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اتنے کارآمد اور مفید موضوع کے انتخاب کے لیے مبارکباد قبول فرمایئے۔"

———— ڈاکٹر آصفہ زمانی
ریڈر شعبہ فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

"قومی ہم آہنگی کے نام" نیا دور کا خصوصی شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ اس میں کیا بہت اچھا ہے اور کیا کم اچھا۔ اسے آپ کی تالیفی کوششوں کا ایک سنگ میل کہا جانا مناسب ہوگا۔ یہ بھی ہے کہ معیار کے اعتبار سے آپ نے اسے نقطۂ عروج پر پہونچا دیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک قابل رشک کاوش ہے۔

آج جب کہ فضا جذباتی اور مسموم ہے، افراتفری کا ماحول ہے مذکورہ شمارہ قارئین کے ذوق اور ذہن کو ایک خاص سمت دینے کے پاکیزہ مقصد کے حصول میں یقیناً معاون ثابت ہوگا۔

ساحرؔ کی طرح آپ بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

———— جگدیش چندر چڈھا
سکریٹری یوپی اردو اکیڈمی
لکھنؤ

"قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی اصطلاحوں کی معنویت کے گم ہونے کا آپ نے بجا طور پر ذکر کیا ہے، اور اکثر ایسے شمارے اس قدر ہنگامی ہوتے ہیں کہ ان کی ادبی حیثیت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس شمارے کو آپ نے خوب خوب سجایا ہے۔ خاص طور سے بشمبھر ناتھ پانڈے، عابد سہیل ڈاکٹر سید محمود الحسن، شیخ سلیم احمد اور علی میاں کی نگارشات اس شمارے کی جان ہیں۔ رتن بھول کی کہانی بہت مشہور ہے۔ آپ نے صحیح لمحہ میں اس کا استعمال کیا ہے، کرفیو افسانہ بھی اچھا ہے۔ اس خوبصورت شمارہ کے لیے میری طرف سے ایک بار پھر مبارک باد۔"

———— ظہیر الدین
کلکتہ

نیا دور

جلد ۴۵ نمبر ۱۱

فروری سنہ ۱۹۹۱ء

عنوانات

پنی بات

علم ایک ایسا سمندر ہے جس کے متعلق کوئی یہ دعوا تو کر ہی نہیں سکتا کہ اس نے یہ پورا سمندر کھنگال ڈالا ہے۔ مطالعہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو، یہ دعوا تو ہم کر ہی نہیں سکتے کہ ہم نے سب کچھ پڑھ لیا ہے۔

علم زیادہ ہو، مطالعہ گہرا ہو تو ہم میں ایک انکسار آنا چاہیے تکبر نہیں۔ قدم قدم پر اپنے علم اور مطالعے کی گہرائی کا اظہار و اعلان بھی کوئی مستحسن چیز نہیں ہے۔ اپنے علم اور مطالعہ کی بنا پر دوسروں کو کمتر اور حقیر سمجھنا تو اور بھی غلط بلکہ قابلِ مذمت ہے۔ عالم اور دانش ور کو منکسر المزاج ہونا چاہیے۔ اس مصرعے کی تفسیر نہیں کر " جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے"۔

کتابی علم اور مطالعہ ہمیں باخبر بناتا ہے لیکن اس خبر سے اگر ہم میں نظر نہ پیدا ہو سکے تو کیا فائدہ؟ یہ علم کا مقصد ہی نہیں، منصب اور رول بھی ہوتا ہے کہ وہ ہمیں باخبر بنانے کے ساتھ ساتھ عرفان و آگہی کی منزل تک پہونچائے۔

ہمارا علم بہت ہے، ہمارا مطالعہ گہرا ہے، لیکن اگر اسے ہم 'ڈائجسٹ' نہیں کر سکے تو ذہنی بدہضمی لازمی ہے۔ چنانچہ ہم نے کتابوں میں جو کچھ پڑھا ہوتا ہے اسے ہر قدم پر موقع بے موقع اگلنے کو بے تاب رہتے ہیں۔

ہم اتنے کتابی اور مکتبی ہو گئے ہیں کہ شئے لطیف سے محروم ہو گئے ہیں اسی لیے ہر فن پارے کا تجزیہ دو اور دو چار کے حسابی انداز میں کرنے لگے ہیں۔ شعر و ادب کو میتھیمٹکس کی طرح دیکھنے لگے ہیں۔ اسی طرح اس کی لطافت، نغمگی اور دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دینے والی کیفیت سے متاثر ہونے اور حظ اٹھانے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔

فیات

گزشتہ دنوں ظ۔ انصاری صاحب چل بسے۔

ویسے تو ہم ہر شخصیت کو بڑی آسانی سے اور رسماً 'ایک انجمن' 'ایک عہد' قرار دیتے رہے ہیں۔ لیکن ظ انصاری صاحب حقیقتاً ایک ایسی شخصیت تھے جو اپنی ذات سے ایک انجمن اور اپنے ادبی کارناموں کی بنا پر ایک عہد سے عبارت تھی۔ انھیں متعدد زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ محقق بھی تھے اور نقاد بھی۔ انھوں نے روسی ادب کے فن پاروں کا اردو میں اور اردو کے فن پاروں کا روسی میں ترجمہ بھی کیا۔ انھیں تحریر و تقریر دونوں پر ملکہ حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی منکسر المزاج بھی تھے۔ ان کا انتقال بلاشبہ ہماری زبان و ادب کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

ممتاز مصور جمیل اختر فاروقی صاحب کا بھی اسی ماہ فروری میں انتقال ہو گیا۔ وہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش میں تقریباً ۳۱ سال ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے برسرِ کار رہے اور ۱۹۹۰ء کے آخر میں سبک دوش ہوئے۔ وہ فکر و خیال اور احساس کو رنگوں اور اشکال کے توسط سے کاغذ پر زندہ کر دیتے تھے۔ ان کی کلر اسکیم بڑی دل کش اور منفرد ہوتی تھی۔ کلر اسکیم کے انتخاب میں وہ بے مثل تھے۔ مختلف تقریبات اور نمائشوں کے لیے بنائے گئے ان کے فن پاروں کو انعامات بھی ملے۔ ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۰ء میں یوم جمہوریہ کے موقع پر دہلی میں اتر پردیش کی جو جھانکیاں پیش کی گئیں وہ انھیں کی ڈیزائن کی ہوئی تھیں یا ان کی نگرانی میں تیار کی گئی تھیں۔ ان تینوں جھانکیوں کو مرکزی حکومت کی جانب سے اولین انعام ملا تھا۔

ایڈیٹر

عنوان چشتی
بی ۱۱۷ - جامعہ نگر، نئی دہلی

مرزا مظہر جانِ جاناںؒ

مرزا مظہر جانِ جاناں، تاریخ ادب اور تصوف کا ایک روشن نام ہے۔ ان کے والد مرزا جان اورنگ زیب کے منصب داروں میں شامل تھے، جنھوں نے آخری عمر میں درویشی اختیار کرلی تھی۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کا سنِ ولادت قیاساً ۱۱۱۱ھ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا مظہر کا نام اورنگ زیب نے ان کے والد مرزا جان کی نسبت سے 'جانِ جان' رکھا تھا لیکن کثرتِ استعمال سے "جانِ جاناں" ہوگیا۔ اس لیے مرزا مظہر جانِ جاں سے مرزا مظہر جانِ جاناں ہوگئے۔ یوں تو مرزا مظہر جانِ جاناں کے پیر کا نام حضرت نور محمد بدایونی ہے لیکن انھوں نے کئی بزرگوں سے روحانی فیض اٹھایا، جن میں شیخ محمد عابد سنامی اور حافظ سعد اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ مختصراً یہ کہ مرزا کا نام جانِ جاناں تخلص مظہر اور لقب شمس الدین حبیب اللہ ہے۔ عام طور پر مرزا مظہر جانِ جاناں کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ مرزا نسباً علوی، مذہباً حنفی اور مشرباً نقش بندی ہیں۔ آپ نے ۷ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ کو جامِ شہادت نوش کیا۔ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مرزا مظہر جانِ جاناں کی شخصیت میں وجاہت اور انفرادیت تھی — بقول خلیق انجم:—

"مرزا صاحب خوبصورت، وجیہ اور تندرست آدمی تھے۔ بقول نعیم اللہ بہرائچی دراز قد تھے۔ عمامہ باندھتے تھے۔ لباس بہت معمولی مگر صاف ہوتا تھا۔ قمیص ہمیشہ چاک پہنتے تھے۔ انشاء نے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرزا مظہر سفید قمیص اور سفید کلاہ پہنے ہوئے تھے اور کاندھوں پر ناسپاتی رنگ کا ڈوپٹہ سموسہ بنا کر ڈال رکھا تھا۔ مرقع شعراء مرتبہ رام بابو سکسینہ میں جو ان کی تصویر ہے، اس میں ان کے پٹے بال ہیں۔ کشادہ پیشانی، باریک بھویں، بڑی بڑی آنکھیں، لمبی ستواں ناک اور گھنی داڑھی ہے۔"

(مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط ص۱۱)

مرزا مظہر جانِ جاناں کی ظاہری شخصیت تو وجاہت کا پیکر تھی ہی، ان کی داخلی شخصیت بھی دلآویز اور منفرد تھی۔ ان کے مزاج میں لطافت، نازک مزاجی اور حسن پرستی کا واضح رنگ تھا۔ انھیں ہر کام میں سلیقہ اور باقاعدگی پسند تھی۔ اگر کوئی چیز اپنے مستقر پر نہ ہوتی، یا اسے خلافِ معمول پاتے تو بے چین ہوجاتے۔ ایک بار مرزا مظہر جانِ جاناں امروہہ گئے وہاں خانقاہ شاہ عبدالباری میں قیام کیا۔ رات کو ایک عمدہ سُتلی سے بنی ہوئی چارپائی پر لیٹے مگر رات بھر نیند نہ آئی۔ بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ میزبان کو اس بات کا پتہ چلا تو نیند نہ آنے کے اسباب کی تلاش کی گئی۔ چارپائی ناپی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں ہلکی سی کان ہے، جو مظہر جانِ جاناں کی طبع لطیف و نازک پر گراں گذری، اور جس کی بدولت رات بھر بے آرام رہے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں کے مزاج پر تصوف کا گہرا اثر تھا جس میں اخلاقی اقدار، روحانی طرزِ فکر و کار اور وسیع المشربی کا گہرا رنگ ہے۔ مرزا کے معمولات میں انسان دوستی کا اہم مقام ہے۔ اگرچہ مرزا صوفی اور شاعر

ہونے کے سبب ہندوانی طریقۂ کار کافی رائج تھے۔ لیکن مذہبی اور سماجی معاملات میں قطعی طریقۂ کار کو کام میں لاتے تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ہندستان کے غیر مسلموں کو بت پرست نہیں مانتے تھے بلکہ انھیں بہ الفاظِ دیگر "خدا پرست" تسلیم کرتے تھے۔ اکثر صوفیا اپنی وسیع النظری، انسان دوستی اور لچک دار مذہبی اور سماجی رویے کے لیے مشہور ہیں۔ لیکن مرزا مظہر جانِ جاناں نے اس دائرے کو اپنے علمی استدلال اور طریقۂ فکر و کار سے بہت وسعت دی ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کا خیال ہے کہ چاروں وید آسمانی کتابیں ہیں۔ مرزا صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ مسئلہ تناسخ یعنی آواگون پر یقین رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا۔ مرزا مظہر کے یہ افکار و خیالات مذہب کے دائرے میں انقلابی حیثیت رکھتے ہیں۔ موجودہ حالات میں ان خیالات کی معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ان افکار پر از سر نو سوچنے اور ان کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ غالباً مرزا مظہر جانِ جاناں سے متاثر ہو کر حسرت موہانی نے دوسرے مذاہب اور اُن کے پیشواؤں کے لیے ایسا ہی رویہ اختیار کیا تھا۔

تصوف میں "نسبت" وہ کسوٹی ہے جو انسان کے فکر و کار کو نہ صرف یہ کہ متاثر کرتی ہے بلکہ ان کا تعین بھی کرتی ہے "نسبت" کے مسئلے کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک پزاوے سے دو جگہ اینٹیں جاتی ہیں۔ ایک سے گندی نالی اور دوسری سے عبادت گاہ بنائی جاتی ہے۔ چونکہ ایک جگہ کی اینٹوں کا تعلق یا نسبت نالی سے ہے اسلیے اس میں غلاظت بہائی جاتی ہے۔ دوسری اینٹوں کی نسبت ایک اعلیٰ مقام یعنی عبادت گاہ سے ہے اس لیے وہاں سجدہ ادا کیا جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ نسبت جیسی ہوتی ہے اس کے اثرات، مضمرات اور نتائج بھی ویسے ہی ہوتے ہیں تصوف میں اصل مسئلہ "نسبت" کا ہے یعنی انسان کو حقیقتِ اعلیٰ اور کائنات سے کیا نسبت ہے؟ یہ نسبت خیر پر مبنی ہے یا شر پر؟ صداقت پر مبنی ہے یا توہم پر۔ اس بات پر متصوفانہ افکار و خیالات کا انحصار ہوتا ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں نے "نسبت" پر روشنی ڈالتے ہوئے "تصورات" سے بھی بحث کی ہے۔

"صوفیوں کی اصطلاح میں نسبت کے کیا معنی ہیں؟ جاننا چاہیے کہ عربی لغت میں نسبت کا مطلب "طرفین کا تعلق" ہے اور اس قوم (صوفیا) کی اصطلاح میں وہ تعلق مراد ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان ہوتا ہے' اور جسے متکلمین "صانع اور مصنوع" کے رشتے سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے کوزے کا کمہار سے رشتہ ہوتا ہے اور بظاہر کتاب و سنّت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ صوفیا اگر وہ وحدت الوجود کے ماننے والے ہیں تو اس "نسبت" کی تعبیر کثرت میں وحدت کے ظہور سے کرتے ہیں۔ جیسے موج و حباب کی صورتوں میں پانی کا ظہور۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کثرت ہماری حقیقی وحدت میں کبھی مزاحم نہیں ہوتی۔ اس تعبیر کا حاصل "عینیتِ حق" سے تعلق کا اثبات ہے اور اس مطلب کو تاویلوں اور تمثیلوں کے ساتھ شرعی اور عقلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ (صوفیا) وحدتُ الشہود کے ماننے والے ہیں تو اس نسبت کو "اصل اور ظل" کے تعلق سے ثابت کرتے ہیں جیسے سورج سے نکلنے والی روشنی کو سورج سے نسبت ہے۔ یہاں "ظل" سے "تجلی" مراد ہے یعنی مرتبۂ ثانیہ میں کسی چیز کا ظاہر ہونا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کثرتِ وجوداتِ ظلی، وحدتِ وجودِ حقیقی میں مخل نہیں ہوسکتی۔"

(مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط ص ۱۴۳)

مرزا مظہر جانِ جاناں نے نہ صرف یہ کہ نسبت کے مسئلے کو واضح کیا بلکہ تصورات کے دونوں پہلوؤں یعنی وحدت الوجود اور "وحدت الشہود" کی صراحت بھی کردی ہے، جس کی روشنی میں خدا اور انسان کا رشتہ جگمگانے لگتا ہے اور انسان کو پاکیزہ، ارفع اور ممتاز مدارجِ حیات حاصل ہوجاتا ہے۔ یہ رشتہ دریا سے موج و حباب کا ہو یا روشنی کا سورج سے، دونوں صورتوں میں انسان بشری کدورتوں سے الگ ہو کر خدائی صفات سے متصف ہونے لگتا ہے اور تمام مخلوق کو "عیال اللہ" تصور کرنے لگتا ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں نے عمر بھر اپنے نظریے اور رویے سے اسی نسبت کی پہچان کرائی ہے۔

اُردو میں مرزا مظہر جانِ جاناں کا شعری سرمایہ بہت کم ہے ان کے کچھ اشعار تذکروں میں بکھرے ملتے ہیں جن کے مطالعے سے مرزا جانِ جاناں کے ادبی اور تخلیقی رویّے کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں اپنے دور کے ان بالغ نظر اساتذہ میں شامل تھے جنھوں نے ایک طرف شاعری کو "ایہام گوئی" کی تحریک سے نجات دلائی اور شاعری میں صاف گوئی، سادہ اور سلیس اندازِ بیان کو فروغ دیا۔ دوسری طرف انھوں نے زبان کی سطح پر ردّ و قبول کے عمل کو تیز کیا۔ بہت سے الفاظ کو متروک ٹھہرایا۔ زبان کی صحت اور روز مرہ کی درستی پر زور دے کر زبان کے معیار بندی کے رجحان کو تقویت پہونچائی۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے اُردو کلام میں یہ دونوں رجحان صاف نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گُل اپنا باغباں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی طلبگار نہ تھا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مُفت جاتی ہے بہار

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

آتش کہو، شرار کہو، کوئلا کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

(باقی ۳۳ پر)

منظر سلیم
۱۲۰۔ بیگم اعظم بیگ
بارود خانہ۔ لکھنؤ

زمینیں پوچھتی ہیں....

زمینیں پوچھتی ہیں اپنی نہروں سے
یہ کن خطوں کی ندیوں سے
تمھیں ملتا ہے پانی اب
پگھلتی ہے کہاں اتنی پُرانی برف
روز و شب
کہ ہر موسم میں یہ گدلا ہی رہتا ہے
ہمیشہ گرم گاڑھے خون کی مانند
دھیرے دھیرے بہتا ہے
یہ تم سے پھوٹتی ہے ایسی بدبو کیوں
کہ جیسے منجمد لاشیں
کہیں سے بہہ کے آئی ہوں
تمھارے سینوں میں پگھلی ہوں سڑتی ہوں

یہ پانی لے کے آتا ہے وبا کیسی
بڑے ہوتے ہی پودے سب
کہیں ہو جاتے ہیں پیلے، کہیں کالے
سب ان کی بالیاں پھلیاں
نظر آتی ہیں پھوڑوں سی
پرندوں تک کو گھن آتی ہے دانوں سے

مگر نہریں ہمیشہ ان سوالوں سے
لرز اٹھتی ہیں، سی لیتی ہیں اپنے لب
چُرانے لگتی ہے نظریں
زمینوں، ان کے کھیتوں سے

□□

ضیاء الدین اصلاحی
دار المصنفین، شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ

بعض ہندو شعرا کی حمدیہ شاعری

قدرت کی فیاضیاں دشت وچمن ہر جگہ جاری اور سب کے لیے عام ہیں، اس کا ابر کرم سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برستا اور سب کو سیراب کرتا ہے ؎

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی

کارخانہ عالم کے ہر گوشہ میں ہونے والی بخشش وانعام سے ہر شخص متمتع ہو رہا ہے اور کائنات کی ہر چیز سے آشکار جلوہ ربانی کا سب ہی مشاہدہ کر رہے ہیں، اس لیے ہر شخص کے اندر خدا کے شکر وامتنان کا جذبہ موجزن ہونا اور اس مبدء فیض کی خوبی وکمال اور اس کی عطا وفیضان کے اعتراف میں تحمیدی وتمجیدی نغمے گانا فطری ہے۔

دراصل حمد وثنائے خداوندی انسانی فطرت میں داخل اور اس کے دل کی آواز ہے۔ اس کے بغیر نہ اس کے قلب وروح کو تسکین وقرار ملتا ہے اور نہ چین واطمینان نصیب ہوتا ہے، وہ جب خدا سے دعا والتجا کرتا ہے تو اس کی روح میں کیف وسرور پیدا ہوتا ہے اور اس کے سامنے گریہ وزاری کرنے سے انسان کی طبیعت کو فرحت وانبساط حاصل ہوتا ہے۔

آدمی جب دنیا کے ہمہ گیر اور محکم نظام اور خود اپنے وجود پر غور کرتا ہے تو اسے اس سارے عالم اور خود اپنے وجود اور اپنی زندگی کے اندر ربوبیت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات نظر آتی ہے۔ یہی احساس وتاثر اس کو شکر وسپاس کے جذبات سے لبریز کر دیتا ہے اور وہ قصد وارادہ کے بغیر ہی خدا کے گن گانے لگتا ہے کیونکہ آسمان وزمین کے ہر ہر گوشے سے حمد ومعرفت کا یہی نغمہ ابل رہا ہے اور یہ پوری کائنات ہی زمزمہ توحید میں مصروف ہے۔

جس طرح کائنات کا پتہ پتہ اور بوٹا بوٹا معرفت کردگار کا صدر دفتر ہے اسی طرح اس کا ذرہ ذرہ اور گوشہ گوشہ انسان کو حمد باری کی دعوت اور اس کے شکر وسپاس کا پیام دیتا ہے، خدا کی ہستی کا اقرار وشہادت فطرت انسانی کا مسلمہ اور عالمگیر اذعان ہے۔

شعرا عام لوگوں سے زیادہ قوی الاحساس ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات فطرتاً نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں اس لیے خدا کی حکمت وکاریگری، اس کے گوناگوں جلووں اور اس کی بخشش عام اور فیض تام سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، ان کا یہی احساس وتاثر شعر ونغمہ کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان کی شاعری میں خدا کی حمد ومعرفت کے زمزمے اور دعا ومناجات کے ترانے ملتے ہیں، اردو شاعری کا خزانہ بھی اس سے اس حد تک مملو ہے کہ جو شعرا اپنی رندی وہوسناکی کے لیے بدنام ہیں ان کا شعری دفتر بھی اس صنف شاعری سے خالی نہیں۔ اکثر قدیم شعرا کے دواوین وکلیات کا آغاز حمد ونعت اور منقبت کے اشعار سے ہوا ہے۔

حمد ومناجات اور نعت ومنقبت کو مذہبی تقدس کا درجہ حاصل ہے اور یہ سب اصناف شاعری عربی وفارسی کے اثر ووسیلہ سے اردو میں داخل ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی طرح ہندو شعرا نے بھی ان میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں، اگر صرف حمد کے تعلق سے ان کے کلام کو موضوع بحث بنایا جائے تو ایک پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے، اس لیے اس مضمون میں صرف چند ہندو شعرا

یہ ترانہ ہائے موزوں ہی تک بحث و گفتگو محدود رکھی گئی ہے۔

ت دیا شنکر نسیم

یہ اصلاً کشمیری برہمن تھے، کشمیر ہی ان کے بزرگوں کا وطن ہے
د نسیم ۱۸۱۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور عین عالمِ شباب
۱۸ اء میں یہیں پیوندِ خاک ہوئے، ان کو غزل گوئی سے بھی
تھی اور ایک مختصر دیوانِ غزلیات یادگار بھی چھوڑا ہے لیکن ان
۔ اور بقائے دوام عطا کرنے والی ان کی مثنوی "گلزارِ نسیم"
ردو کی ان چند مثنویوں میں سے ہے جن کو قبولِ عام کی سند
ہے۔ اُردو کی یہ نازِ مثنوی سحر البیان کے بعد بلکہ اس کے ساتھ
ں کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی طبع زاد نہیں ہے بلکہ نسیم
پرانی داستان کو اُردو کا جامہ پہنا کر اپنے کمالِ فن سے اُسے
یدہ بنا دیا ہے۔ واقعہ نگاری، مصوری اور جذبات نگاری سے قطع
ی کا خاص جوہر ایجاز و اختصار ہے۔ رعایتِ لفظی اور صنائع
کے استعمال کے باوجود اندازِ بیان کے سلیقے اور بندش
نے اسے معراجِ کمال پر پہونچا دیا ہے اور مثنوی کے بہت
وں کو ضرب المثل کا درجہ دے دیا ہے۔
مثنوی میں گُلِ بکاولی کا قصہ نظم ہوا ہے اور یہ قصہ گل بکاولی
اسے بھی مشہور رہے۔ اس کا آغاز جن چار شعروں سے ہوا
ان میں سے دو ملاحظہ ہوں ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
حمدِ حق و مدحتِ پیمبرؐ

بعد اور اصل قصہ شروع ہونے سے پہلے یہ عنوان درج ہے:
"خواستگاری جنابِ باری سے مثنوی گلزارِ نسیم
کی ترتیب کے واسطے"
عنوان کے تحت کئی اشعار دیے گئے ہیں۔ پہلا شعر پیش
ہے ؎

یارب مرے خامے کو زباں دے
منقارِ ہزار داستاں دے

منشی جگن ناتھ خوشتر

ان کی ذات کائستھ سریواستو تھی، اصل وطن قصبہ بڈسہ ضلع اناؤ تھا۔ تلاشِ معاش میں ان کے بزرگ لکھنؤ آئے اور سرکارِ شاہی میں ملازم ہوئے۔ خوشتر ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا، وہ اچھے خوش نویس اور کامیاب شاعر تھے، شاعری میں ان کا میلانِ طبع مذہبیات کی طرف تھا، انھوں نے سری مدبھاگوت منظوم، مثنوی چترگپت کتھا، ستونرائن منظوم اور سداما چرتر وغیرہ کتابیں تصنیف کیں، جو مطبع نول کشور سے طبع ہو چکی ہیں۔

خوشتر کی معرکۃ الآرا تصنیف رامائن خوشتر ہے، انھوں نے ۱۸۵۱ء میں تلسی کی رامائن کا ترجمہ حرف بحرف نہایت سلیس اور دلکش انداز سے کیا جو بہت مقبول ہوا۔ اس کتاب کو ان کا بڑا کارنامہ اور اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ خیال کیا جاتا ہے، پُر شکوہ الفاظ و تراکیب، دلآویز و نادر تشبیہات و استعارات، چستی بندش، صفائی کلام اور اعلا تخیل و بلند مضامین کے لحاظ سے بھی یہ ایک مایہ ناز تصنیف ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو ادب کا خزانہ ہندوؤں کے مذہبی عناصر سے بھی مملو ہے رامائن سے ان کی مناجات کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں ؎

مناسب ہے بشر کو وقتِ حاجات
کرے درگاہِ باری میں مناجات

وہی حاجت روائے دو جہاں ہے
کرم فرمائے عالم بے گماں ہے

وہی آمرزگارِ ہر خطا ہے
وہی رزاقِ دو شاہ و گدا ہے

اسی کی ذات ہے غفار و ستار
اسی کا نام ہے قہار و جبار

وہی دوزخ وہی دیتا ہے جنت
وہی ذلت وہی دیتا ہے عزت

بوقتِ رنج گر فریاد و زاری
کرے کوئی سوئے درگاہ باری

شتابی رفع ہوں سب اس کی حاجات
زروئے بید ہے منقول یہ بات[1]

ایک اور دُعائیہ شعر ملاحظہ ہو ۔

خدایا نامے کو نام آوری دے
قلم کو جلوۂ بال و پری دے[2]

یہ شعر بھی غالباً انہی کا ہے ۔

گل افشاں حمد باری میں قلم ہے
بیاضِ نامہ گلزارِ ارم ہے[3]

منشی شیو پرشاد وہبی

لکھنؤ کے باشندہ اور ذات کائستھ سکسینہ سے تعلق رکھتے تھے، شاعری میں آفتاب الدولہ خواجہ ارشد علی خاں بہادر قلق کے شاگرد تھے۔ منشی نول کشور کے مطبع میں اودھ اخبار کے منیجر تھے۔ منشی صاحب وہبی کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

وہبی کی زندگی میں ان کا کلیات موسوم بہ مرقع ارژنگ ۱۸۸۰ء میں طبع ہوا، جو غزلوں، مخمس، تاریخوں، قصائد، سہرے اور رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ دستورِ زمانہ کے مطابق وہبی کی شاعری میں عاشقانہ رنگ غالب ہے۔ زبان شستہ اور بندشیں پختہ ہیں، سادگی و صفائی کلام کی شیرینی و شگفتگی اور محاوروں کی برجستگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

کلیات کی ابتدا میں ایک نظم "مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات جل جلالہٗ" پرزور اور دل آویز ہے، یہ محاوروں اور الفاظ کی بندش مضامین کی خوبی اور زبان کی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اچھی ہے اس کے دو بند پیش کیے جاتے ہیں ۔

تو قادر و غیور و غنی و کریم ہے
تو مالک و سمیع، بصیر و علیم ہے
تو وارث و حلیم، غفور و رحیم ہے
تو حافظ و حفیظ، عزیز و حکیم ہے
واحد ہے تو قدیر ہے تو کبریا ہے تو

چاہے جو تو گدا کو بھی بادشاہ کرے
ذرے کو اوجِ نیرِ اعظم عطا کرے
دُر کو خذف، خذف کو دُرِ بے بہا کرے
قطرے کو دم میں قلزمِ بے انتہا کرے
بحرِ عطا و بخشش و جود و سخا ہے تو[4]

منشی دیبی پرشاد سحر

۲۴ دسمبر ۱۸۴۴ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے، اجداد کا وطن بلگرام تھا دہلی اور لکھنؤ میں عمر گزاری، محکمۂ تعلیمات میں ڈپٹی انسپکٹری کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔ سحر نے متعدد نثری رسالے تصنیف کیے۔ بعض کے نام یہ ہیں: معیار البلاغت، معیار الاملا، خلاصۃ المنطق، محیط المساحت، تکمیل المساحت، مرآۃ العلوم، بے نظیر، گلدستۂ ادب اور آرزنگ چین۔

ان کا پہلا دیوان سحر سامری اور دوسرا طلسمات سحر کے نام سے شائع ہوا۔ وہ شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے، زود گوئی، ریاضی اور خطاطی میں مشہور زمانہ تھے۔ شاعری اور خوشنویسی میں ان کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔

سحر جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے، بڑے نکتہ سنج و فصیح البیان تھے تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ان کا کلام عاشقانہ جذبات سے مملو اور حسن و عشق کا مرقع ہوتا ہے، قلبی واردات اور عاشقانہ جذبات کو بڑی خوبی اور جدتِ ادا کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ زبان کی لطافت اور نادر تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے ان کے کلام کی دل چسپی اور دلآویزی بہت بڑھ گئی ہے۔ کہیں کہیں معرفت و تصوف کا رنگ بھی ملتا ہے۔ ماحول کے زیر اثر رعایت لفظی کے دلدادہ تھے ان کے دور میں آزاد و حالی جدید شاعری کی صدا زور و شور سے بلند کر چکے تھے مگر اس کی صدا ان تک نہیں پہونچی اور وہ شاعری کے قدیم طرز و آہنگ ہی کو اپنائے رہے[5]

سحر کے چند حمدیہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

زینت عنواں ہے مضمون عالم توحید کا

مطلعِ دیواں نہ کیوں مطلع بنے خورشید کا
دیر میں سجدہ نہ کعبہ میں، اور ہو سب کہیں
طالب نظارہ کو گر ہے سلیقہ دید کا
ہو جو اس کے نام پر آغاز پورا ہو وہ کام
ہے بر آرندہ وہی ہر شخص کی امید کا

منشی درگا سہائے سرور

جہاں آباد پیلی بھیت کے ایک معزز کالستھ خاندان میں دسمبر ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان شاہجہاں کے عہد میں دہلی چھوڑ کر جہاں آباد میں آباد ہو گیا تھا۔

سرور کو شعر و سخن کا ذوق خداداد تھا۔ شروع میں مولوی سید کرامت حسین بہار سے مشورۂ سخن کرتے تھے، انہی سے ادب اور فارسی کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ ابتدا میں وحشت تخلص تھا مگر بعد میں سرور اختیار کیا۔ بیوی اور اکلوتے بیٹے کی جدائی کا غم غلط کرنے کے لیے بادۂ ناب کا سہارا لیا اور اس کے ایسے رسیا ہوئے کہ ۳۷ برس کی عمر میں دسمبر ۱۹۱۰ء میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے فن شاعری کے علاوہ انھیں طب و حکمت میں بھی دستگاہ تھی جو ان کا آبائی پیشہ تھا۔ ان کے والد پیارے لال ایک علم دوست شخص اور اچھے طبیب تھے۔

شراب کی کثرت نے افلاس اور تنگ دستی میں مبتلا کر دیا، اس کی وجہ سے دوسروں نے ان کا کلام ہتھیا لیا اور خود انھوں نے بھی اسے کوڑیوں کے مول بیچا۔ کلام کے تین بڑے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ خمخانۂ سرور، جام سرور اور خمکدۂ سرور۔

یہ مجموعے سرور کی قومی، وطنی، تاریخی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی نظموں پر مشتمل ہیں اور ان سے ان کے کمالِ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔

جدید اردو نظم نگاری کو رواج دینے کا سہرا آزاد اور حالی کے سر ہے لیکن ہندو شاعروں میں اس کو منتہائے عروج پر پہونچانے والے درگا سہائے سرور ہیں، جنھوں نے اپنی جدت طرازی اور معجز بیانی سے اردو شاعری کے قالب میں نئی روح پھونکی۔ انھوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں اپنا جوہرِ طبع دکھایا ہے۔ لیکن کہیں زبان کی صفائی، شستگی اور روانی میں فرق نہیں آنے دیا۔

سرور کا کلام حقیقت، اصلیت، صداقت، جوش، سادگی اور سوز و گداز کا مرقع ہے۔ ان کی اصل خوبی جذبات نگاری اور درد و اثر ہے۔ وہ اپنے دیس کی چیزوں کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ تخیل کی بلند پروازی، حسنِ بندش، شکوہِ الفاظ اور واقعہ نگاری سرور کا خاص حصہ ہے۔ انھوں نے نظموں میں بھی تغزل کی دلفریبی اور تاثیر پیدا کر دی ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر جناب حکم چند نیر نے سرور پر تحقیقی مقالہ لکھ کر انھیں نئی زندگی بخشی ہے۔ نوائے سرور کے نام سے نیر صاحب نے ان کے کلام کا ایک انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ اس میں حمد اور زمزمۂ توحید کے عنوان سے دو نظمیں شامل ہیں جن کے کچھ بند پیش کیے جاتے ہیں ؎

عقلِ دقیقہ رس کا دوڑا سمند برسوں
روندا کیا جہاں کے پست و بلند برسوں
ڈھونڈا کیا تجھے میں زار و نژند برسوں
بامِ فلک پہ پھینکی اڑ کر کمند برسوں
تیرا پتہ نہ پایا او لامکان والے
سارے جہاں میں ڈھونڈا سارے جہان والے

بلبل کا ہم نوا میں اکثر رہا چمن میں
بیٹھا کیا بہت دن پھولوں کی انجمن میں
خلوت نشیں رہا میں غنچوں کے پیرہن میں
دوڑا کیا میں برسوں اس وادیِ کہن میں
دنیا کو چھان ڈالا تیرا پتہ نہ پایا
نقشِ قدم کا تیرے جلوہ نظر نہ آیا

آوارہ مدتوں سے ہوں تیری جستجو میں
کھویا رہا ہوں اکثر میں کوئے آرزو میں
جلوہ نظر آئے کیا تو پھولوں کے رنگ و بو میں
کیا تیرے زمزمے ہیں بلبل کی گفتگو میں
میں محوِ ذوق تیری وحدت کے راگ کا ہوں

پرواز صرف تیری اُلفت کی آگ کا ہوں

حسرت کش تکلم تیرا ہے اک زمانہ
ہے بلبلِ چمن کے لب پر ترا ترانہ
وحدت کا تیری یارب بہ میں بھی سنوں فسانہ
یا سوزِ عاشقانہ یا سازِ مطربانہ
پردے میں بانسری کی مجھ کو صدا سنا دے
بنسی بجانے والے وحدت کا گیت گا دے

دوسری نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

تیری شمیم وحدت ہے ہر کلی میں پنہاں
ہر گل میں دیکھتا ہوں یارب بہار تیری
گردوں پہ مہر و مہ ہیں پرتو سے تیرے تاباں
تاروں کی روشنی ہے آئینہ دار تیری
ہر شے میں ہے تجلی پروردگار تیری

اے منعمِ حقیقی اے بیکسوں کے والی
ہر دکھ کی تو دوا ہے، ہر درد کا ہے درماں
پتلا بنا کے مٹی کا تو نے جان ڈالی
بحرِ کرم کا یارب تیرے نہیں ہے پایاں
بندوں پہ تیرے شفقت ہے بیشمار تیری

وہ دل ہو خون جس میں تیری نہ آرزو ہو
وہ آنکھ کور ہے جو تیری نہ ہو شناسا
ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو تیری نہ جستجو ہو
پہلو میں دل ہے تیرا حسرت کشِ تمنا
قالب میں جان مضطر امیدوار تیری

ہر شاخِ بارور کو تو نے فروتنی دی
سبزے کو دلفریبی، پھولوں کو رنگ و بو دی
پروانے کو تپش دی جگنو کو روشنی دی
بخشا صدف کو گوہر، گوہر کو آبرو دی
بخشش ہے عام سب پر آمرزگار تیری

مبدأ آفرینش یارب ہے ذات تیری

جلوے سے تیرے قائم ہے شانِ ادنیٰ و پستی
جلوہ گہہ ازل ہے یہ کائنات تیری
اے علتِ علل تو ہر چیز کی ہے ہستی
ہستی مگر ہے سب سے بیگانہ وار تیری

منشی جوالا پرشاد برقؔ

۱۸۶۲ء میں قصبہ محودی ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں بعارضہ طاعون انتقال کیا۔ پہلے وکالت شروع کی، پھر منصفی کے عہدے پر تقرر ہوگیا۔ ذہین و طباع شخص تھے، نثر سلیس و رواں لکھتے تھے، ترجمہ پر اچھی قدرت تھی۔ بنگالی کے کئی ناول اور شیکسپیر کے بعض ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ زبان دانی اور مذاق شاعری کے اعتبار سے لکھنؤ کے اچھے سخن سنجوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ شاعری میں امیرؔ کے شاگرد تھے، اودھ پنچ ان کی نگارشات سے برابر متمتع ہوتا رہتا تھا۔ مثنوی بہار ان کی مشہور تصنیف ہے جو زبان کی خوبی، اختصار اور دلچسپ پیرایۂ بیان کی وجہ سے مشہور و مقبول ہوئی، اس کی بحر وہی ہے جو مثنوی گلزارِ نسیم کی ہے مگر اس میں تناسبِ لفظی کی کثرت نہیں ہے، الفاظ کا انتخاب و استعمال خوبی سے کیا ہے اور یہ دراصل لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور روزمرہ کا بہترین نمونہ ہے۔[۶]

حمد کے چند شعر دیکھئے ؎

دنیا میں ظہورِ صبح ہوا، گلشن پہ کیا جوبن ہے
خورشید کا غنچہ کھلنے لگا، اللہ کی قدرت روشن ہے
ہر پھول میں اس کی خوشبو ہے، اکسیر ہے بوٹی بوٹی میں
ہر شاخ میں اس کی خاصیت، تاثیر ہے پتی پتی میں
پودوں میں جڑوں میں زہر بھرا، زہروں میں یہاں تاثیرِ شفا
دیکھو خاصیت برگ و شجر، یاد کرو ان کچھ ان سے ذرا[۸]

سورج نرائن مہرؔ دہلوی

یہ بڑے فاضل شخص، ویدانت کے ماہر اور باکمال شاعر تھے، ۱۹۳۰ء سنِ وفات ہے۔ سنسکرت، انگریزی، فارسی اور اردو سب میں دستگاہ تھی، ان کی

زندگی علمی مشاغل، ادبی خدمات اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی۔ سررشتۂ تعلیم پنجاب میں ملازم اور مدارس کے انسپکٹر تھے، اسکول کے طلبا کی ریڈروں کے لیے بچوں کی متعدد نظمیں لکھیں جو مقبول ہوئیں، سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ اردو نظم و نثر میں کیا۔

مہر نے ویدانت کے پیچیدہ مسائل اور دقیق نکات کو سبق آموز طریقہ پر اردو نظم و نثر میں بیان کیا ہے۔ ان کا پیرایۂ بیان مؤثر اور عام فہم ہے۔ ان کو جملہ اصناف سخن پر دسترس تھی۔ دو دیوان موسوم بہ کلام مہر جلد اول و جلد ثانی یادگار چھوڑا۔ ان کی ایک قابل قدر تصنیف رامائن مہر ہے جس میں رامائن کو نظم کیا ہے۔ مہر کا کلام قصائد، غزلیات، ترکیب بند، مخمس، مسدس، مثمن، مثنوی، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ غزلیں کم کہتے تھے، نظموں میں حقائق و معارف پند و اخلاق اور تصوف و معرفت کو بھی موضوع بنایا ہے۔

مہر کی حقانی اور عارفانہ نظموں میں توحید، واجب الوجود، آرزوئے دیدار، تو ہی تو ہے، ہمہ اوست اور حمد الٰہی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حمد الٰہی پر نظم بہ شکل مسدس ہے، اس میں بارہ بند ہیں۔ یہاں دو بند پیش ہیں ؎

برسات کا ہے موسم، جگنو چمک رہے ہیں
تاروں کے آسماں پر ہیرے دمک رہے ہیں
کلیاں چٹک رہی ہیں گلشن مہک رہے ہیں
کوئل کی ہیں صدائیں بلبل چہک رہے ہیں
سب میں ہے نور تیرا سب میں ضیا ہے تیری
سب کی زباں پہ یارب حمد و ثنا ہے تیری

تو نے زمیں بنائی، تو نے زماں بنایا
خود لامکاں ہو کر تو نے مکاں بنایا
تو نے ہی چاند سورج اور آسماں بنایا
ان پر ہی حصر کیا ہے سارا جہاں بنایا
سب میں ہے نور تیرا، سب میں ضیا ہے تیری
سب کی زباں پہ یارب حمد و ثنا ہے تیری

مہر ہمہ اوست کے قائل تھے اور ان پر وحدت الوجود کا غلبہ تھا ان موضوعات پر ان کی متعدد نظمیں ہیں، ان کے مزید چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہر ساز کے پردے میں صدا تیری سنی ہے
ہر شکل کے اظہار میں میں نے تجھے دیکھا

زاہد کے دل پاک میں تو جلوہ نما ہے
اور صوفیٔ سرشار میں میں نے تجھے دیکھا

جلوے ہیں جلالی و جمالی ترے دونوں
ہاں نور میں اور نار میں میں نے تجھے دیکھا [10]

حواشی:

[1] گپت سہائے سرواستو: اردو شاعری کے ارتقا میں ہندوؤں کا حصہ ص ۶۶۴ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۶۹ء

[2] ناظر کاکوروی: اردو کے ہندو ادیب ص ۶۹

[3] ایضاً ص ۳۸

[4] اردو شاعری کے ارتقا میں ہندوؤں کا حصہ ص ۲۶۱

[5] ایضاً ص ۲۸ و ص ۲۸۵

[6] دیبی پرشاد سحر: دیوان سحر ملقب بہ سحر سامری جلد اول ص ۲ مطبع نول کشور کان پور

[7] گپت سہائے سرواستو: اردو شاعری کے ارتقا میں ہندوؤں کا حصہ ص ۴۴۹

[8] ناظر کاکوروی: اردو کے ہندو ادیب ص ۲۵

[9] اردو کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ ص ۳۲۳

[10] اردو کے ہندو ادیب ص ۱۱۸

معاونین سے گزارش ہے کہ ارسال کردہ تخلیقات کی اشاعت کے لیے عجلت نہ کریں کیونکہ تخلیقات کی ایک بڑی تعداد پہلے ہی اشاعت کی منتظر ہے

——— ایڈیٹر

مصوّر سبزواری

پوسٹ نوہ۔ ڈی گڑگاؤں
ہریانہ

غزلیں

چھپائے ہوئے ملتا ہے نقابوں میں ہمیں
ت بھر ساتھ لیے پھرتا ہے خوابوں میں ہمیں

ص خوشبو نہ الگ سے کوئی پہچان اپنی
نگھ لیتا ہے وہ کاغذ کے گلابوں میں ہمیں

اند مصلوب تھا کیکر کی جو ٹہنی پہ کوئی،
س نے شامل کیا راتوں کے عذابوں میں ہمیں

سلسلہ کرنے زخموں کا نئے لوگوں سے
ڈال دے جاتی ہوئی رُت کے حسابوں میں ہمیں

حرفِ بدبخت کو اوڑھے ہوئے جیتے ہی رہے
زندہ رکھا ہے سیاہی نے کتابوں میں ہمیں

بجلی چمکے تو بنے اس کی صدا کا شعلہ
ساتوں رنگ اس کے نظر آئیں سحابوں میں ہمیں

کوئی تو گھات کسی رہگذار میں ہوگی
دیا جلاؤ ہوا انتظار میں ہوگی

نکل سکو گے نہ اس دشتِ خود فریبی سے!
یہ عمر ختم اسی کاروبار میں ہوگی

نظر نہ آؤں گا میں آخری اڑان کے ساتھ
بس ایک چیخ بکھرتے غبار میں ہوگی

یہ کیا خبر تھی کہ ہم جس سے چھپ کے آئے تھے
وہ دھوپ بھی شجرِ سایہ دار میں ہوگی

لکھا ہوا تھا یہ روشن خزانے کے اندر
تمہاری موت اسی اندھے غار میں ہوگی

نہ مر سکیں گے مصوّر یہ کج کلاہ شہید
سروں کی فصل کھڑی کوئے دار میں ہوگی

عابد سہیل
علی گنج، لکھنؤ

غالب: حیوانِ ظریف

(ریڈیائی فیچر)

راوی: غالب کی نثر ہو یا نظم، خطوط ہوں یا دوستوں سے بات چیت بذلہ سنجی، شوخیِ طبع اور بات میں بات پیدا کرنے کا انداز، ہر جگہ غالب رہتا ہے۔ ان کے اشعار کی فضا اور اندازِ کلام میں ایک زیرِ لب تبسم، ایک طنز زیرِ لب اور کہیں کہیں طنزیہ قہقہہ بھی ملتا ہے۔ یہی حال ان کے لطائف کا بھی ہے۔ انھیں بھی اسی شوخی، بے ساختگی، بے تکلف اظہار اور الھڑپن کی توسیع ہی سمجھنا چاہیے۔

غالب: سنو، عالم دو ہیں۔ ایک عالمِ ارواح اور ایک عالم آب و گِل حاکم ان دونوں کا ایک ہے —— ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گِل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ ہجری میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ ہجری کو میرے واسطے حبسِ دوام صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پیر میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا —— جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے تو دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔

راوی: یہ آواز اس شاعرِ بے بدل کی ہے جس نے تخلص بھی غالب کیا اور مقام بھی غالب پایا۔ یہ کھلی ڈلی شخصیت جو نہ پیغمبر ہے نہ فلسفی، نہ جوگی نہ سنیاسی، نہ فرشتہ، اپنی عظمت منوانے کے لیے کوئی مکھوٹا نہیں پہنتا، غموں کی یورش پر اسی طرح ملول ہوتا ہے جیسے ہم آپ۔ لیکن ہم سے مختلف بھی ہے اور یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں۔ اسے یہ کمال حاصل ہے کہ بڑے سے بڑے غم کو لطف و انبساط کا ایک پہلو بخش کر خود بھی مسکرا دیتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی غم کو قہقہ آمیز بنا دیتا ہے۔

راوی ۲:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

حالی نے غالب کو حیوانِ ظریف قرار دیتے ہوئے کہا "الغرض مرزا (غالب) کی کوئی بات لطف و ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی ان کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطافت و ظرافت کی جمع ہو جاتی"۔ غالب کے نہ جانے کتنے لطائف و ظرائف سے ہم محروم رہ گئے لیکن جتنا کچھ بھی ہم تک پہونچا ہے اس میں تبسم زیرِ لب بھی ہے، خندۂ دنداں نما بھی، طنز بھی، شوخی بھی، البیلا پن بھی، لیکن پھکڑ پن کہیں نہیں۔

دلی میں رتھ کو اس وقت بعض مؤنث بولتے تھے اور بعض مذکر۔ کسی نے مرزا سے پوچھا:

آواز: حضرت! رتھ مؤنث ہے یا مذکر؟

غالب: بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

راوی: غالب نے زندگی ہنستے کھیلتے نہیں گزاری۔ مصیبتوں کا کون سا پہاڑ تھا جو ان پر نہیں ٹوٹا ہو۔ ابھی پانچ ہی برس کے تھے کہ ان کے والد عبداللہ بیگ کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے اپنے ذمہ لی۔ تین ساڑھے تین سال بعد وہ بھی چل بسے۔ ابھی تیرہ برس ہی کے تھے کہ الٰہی بخش خاں کی بیٹی امراؤ بیگم سے ان کی شادی ہو گئی اور وہ دہلی منتقل ہو گئے۔ آگرہ میں جو تھوڑی بہت فراغت تھی وہ دہلی میں کہاں۔ پنشن حاصل کرنے میں بھی الجھن پڑی اور بعد میں بالکل ہی بند ہو گئی۔ اپنی طبیعت پر جبر کر کے قلعہ سے تعلق پیدا کیا۔ ذوق کے انتقال کے بعد استادِ شہ بھی بنے، لیکن دو ہی برس بعد یہ بساط بھی پلٹ گئی۔ بہادر شاہ ظفر رنگون بھیج دیے گئے اور غالب کو داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی شمع کی طرح اجڑی ہوئی دہلی میں رہنا پڑا۔ قماربازی کے الزام میں جیل کی سزا بھی کاٹی۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے حادثات ان کے پاس سے موّدب نہیں گزرے انھوں نے غالب کو ستایا بھی اور بکھیرا بھی۔ غالب نے انھیں حقیقت کے طور پر تسلیم کیا اور نہ صرف تسلیم کیا بلکہ مزاح کی آمیزش سے ان کی تندی کم کر دی۔ غالب کا یہ خاص انداز تھا کہ وہ غم و اندوہ میں ظرافت کی شیرینی شامل کر کے انھیں قابلِ برداشت بنا لیتے ہیں۔

راوی نمبر ۲: چھوٹی پھوپھی کے انتقال پر لکھتے ہیں:

غالب: میری پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھے بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی۔ آپ کو معلوم ہو کہ پرسوں گویا میرے یہاں نو آدمی مرے۔ میری تین پھوپھیاں، تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔

راوی: گرفتاری اور سزا مرزا کو بہت شاق گزری۔ اگرچہ چھ ماہ کی قید گھٹ کر تین ماہ رہ گئی اور اس دوران بھی ان کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی اور قید خانہ میں اسی آرام سے رہے جیسے وہ گھر میں رہتے تھے۔ کھانا کپڑا ان کو گھر سے پہونچتا رہا، دوست اور احباب ملنے کے لیے برابر جاتے رہے لیکن چوں کہ اس وقت تک شرفا میں کسی کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوا تھا اسلئے وہ اسے بڑی بے آبروئی تصور کرتے تھے۔

راوی نمبر ۲: قید سے رہائی کے بعد مرزا صاحب نے حضرت محمد نصیر الدین عرف کالے میاں کے یہاں قیام کیا۔ ایک روز کالے میاں کے پاس بیٹھے تھے کہ کسی نے آکر رہائی کی مبارک باد دی، تو مرزا غالب نے کہا:

غالب: کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں۔

راوی: ایک مدت تک، قیام کی حد تک، کالے میاں کے مہمان رہے۔ دہلی میں پچاس سال کے قیام کے باوجود انھوں نے کوئی مکان اپنے لیے نہیں خریدا اور کرایہ کے مکانوں میں قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اس کے آس پاس رہے۔ آخری مکان جس میں ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے کے پاس ایک مسجد کے پیچھے تھا۔ اسی مکان کی نسبت سے انھوں نے کہا ہے ؎

غالب:
مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

راوی نمبر ۲: اپنے لیے "بندۂ کمینہ" کی ترکیب استعمال کرنے کے باوجود غالب کی جو دلنواز شخصیت دل و دماغ میں ابھرتی ہے وہ آلامِ روزگار سے ہاری تو ہے لیکن ٹوٹی نہیں ہے۔ ایک

لطیف مزاح جو اس شعر میں موجِ تہ نشیں بن کر سما گیا ہے، ان کے متعدد دوسرے اشعار میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے جن میں انھوں نے اپنی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے۔

آواز: خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

آواز: پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

آواز: چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

راوی: آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے؟ جی ہاں۔ مرزا کی شکل و صورت ایسی نہ تھی کہ کوئی اس پر انگلی اٹھاتا اور کہتا "آپ اور خوب رویوں کو چاہیں؟" — کیوں کہ بقول حالی دہلی میں جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا ان سے سنا گیا کہ عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین اور خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے اور آخر عمر میں بھی "چوں کہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے، اس حالت میں بھی ایک نو وارد تورانی معلوم ہوتے تھے"۔

غالب: ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

راوی: لیکن اب نہ شہ، نہ ان کے مصاحب، دہلی میں غدر برپا ہوا تو ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں گھس آئے۔ کچھ لوٹ مار تو نہ کی لیکن مرزا، دو نو عمر بچوں، اور تین نوکروں کو کرنل براؤن کے حضور میں پیش کر دیا۔ اس وقت کلاہ پپاخ مرزا کے سر پر تھی۔ کرنل براؤن نے پوچھا:

کرنل براؤن: ول، تم مسلمان؟
مرزا: آدھا۔
کرنل: اس کا مطلب؟
مرزا: شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔

(کرنل ہنستا ہے)

کرنل: ول تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟
مرزا: میں چار کہاروں کا افسر تھا۔ وہ چاروں مجھے چھوڑ بھاگے۔ میں کیوں کر حاضر ہوتا؟

راوی: غدر کے حالات پر اپنی کتاب دستنبو مکمل کر لی تو فرصت ہی فرصت تھی۔ اسی فرصت کے زمانے میں انھوں نے قاطعِ برہان مکمل کر لی، اس کا چھپنا غضب ہو گیا۔ ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ اعتراضات کی بھرمار لگ گئی۔ کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے گمنام خطوط بھیجنے شروع کر دیے۔ ایسا ہی ایک خط اس وقت پہونچا جب حالی ان کی خدمت میں حاضر تھے۔ خط پڑھا۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی تھی مسکرائے اور بولے:

غالب: الّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے اور ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرمساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے، اس سے زیادہ بے وقوف کون ہوگا؟

راوی: مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر اٹھتے بیٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ اس میں جھک کر جانا پڑتا تھا۔ ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے

وقت مرزا سے ملنے چلے آئے۔ اس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ وہ مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے دیکھ کر کہنے لگے۔

استاد: ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے۔ مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہوگیا۔

مرزا: قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے۔

راوی: اسی سلسلے کا ایک اور لطیفہ سنیے۔ ایک دفعہ ماہ رمضان کے بعد مرزا قلعہ میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا۔

بادشاہ: مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟

غالب: پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا۔

راوی: مرزا کی بیوی نہایت متقی، پرہیزگار اور روزے نماز کی سخت پابند تھیں۔ اس تفاوت کے باوجود دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ غالب ان کی جملہ ضروریات اور اخراجات کا خیال رکھتے تھے۔ مگر شوخی اور ظرافت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ کوئی بات سوجھ جائے تو اس کے اظہار سے انھیں کوئی چیز روک نہیں سکتی تھی کسی نے امراؤ سنگھ نامی ایک شاگرد کی دوسری بیوی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو۔ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

مرزا: امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں جال میں پھنستا ہے۔

راوی نمبر ۲: جاڑے کا موسم تھا اور توتے کا پنجرہ ان کے سامنے رکھا تھا اس پنجرے میں سردی کی وجہ سے توتا پیروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا اسے دیکھ کر بولے۔

مرزا: میاں مٹھو! تمھارے جورو نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو؟

راوی: ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ خود جاکر مکان کا دیوان خانہ دیکھ آئے لیکن محل سرا نہ دیکھ سکے۔ بیوی کو اسے دیکھنے کے لیے بھیجا۔ وہ مکان دیکھ کر آئیں تو مرزا صاحب نے ان سے مکان کے بارے میں رائے پوچھی۔

مرزا: مکان پسند آیا؟

بیوی: اس مکان میں لوگ بلا بتاتے ہیں!

مرزا: (ہنستے ہوئے) کیا دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے؟

راوی: ایک بار مرزا صاحب کسی کتب فروش کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ایرانی نوجوان آیا اور اس نے دکاندار سے فارسی میں پوچھا۔

"دیوانِ غالب ہے؟"

دکان دار نے جواب دیا "دیوانِ غالب تو نہیں البتہ نظیری اور ظہوری کے دیوان موجود ہیں"۔ اس پر ایرانی نے کہا "نہیں نہیں، یہ نہیں چاہئیں۔ دیوانِ غالب ہو تو دیدو۔ یہ ظالم ساقی خوب کہتا ہے"۔

یہ سن کر دکان دار نے کہا "دیوانِ غالب تو نہیں، ہاں حضرت غالب موجود ہیں"۔

یہ سن کر ایرانی چونکا اور اس نے مرزا صاحب کو دیکھا تو شرمندہ ہوا۔ لیکن مرزا صاحب اسے شرمندہ دیکھ کر لپٹ گئے اور بولے "شرمانے کی بات نہیں۔ واللہ ساری عمر میں سچی داد آج ملی ہے"۔

راوی نمبر۲: ایک بار مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے ہمراہ مرزا غالب
کسی دوست کے یہاں یا مشاعرے سے رات گئے واپس
آ رہے تھے۔ راستے میں ایک تنگ و تاریک گلی پڑی۔ وہیں
ایک گدھا کھڑا تھا۔ مولانا فیض نے کہا:

مولانا فیض: مرزا صاحب! دلی میں گدھے بہت ہیں۔

مرزا: نہیں صاحب! باہر سے آجاتے ہیں۔

راوی: آم کا نام آتے ہی منہ میں شیرینی گھلنے لگتی ہے۔ اس لذیذ
پھل کی تعریف ماہیان، ہون سانگ اور ابن بطوطہ جیسے
مورخوں نے کی ہے۔ حضرت امیر خسرو نے اسے "فخر گلشن"
کہا ہے۔ نظیر اکبر آبادی اور اقبال نے اسے موضوع سخن
بنایا ہے لیکن غالب کی بات ہی اور تھی۔ انھیں تو آم اس
قدر پسند تھے کہ آخر عمر میں جب وہ ہر سال اپنی تاریخ
وفات کہا کرتے تھے، اپنی موت کو ایک سال ٹالنے کے لیے
تیار تھے کہ اس سال آم ہر جگہ کم تھا۔

راوی نمبر۲: ایک دن مرزا صاحب بہادر شاہ ظفر کے ہمراہ چند مصاحبوں
کے ساتھ باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔
آم کے پیڑ پھلوں سے لدے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ
یا سلاطین یا بیگمات کے علاوہ کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔
مرزا صاحب بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔
بادشاہ نے پوچھا، "مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو"
مرزا نے فارسی کا ایک شعر پڑھا جس کے معنی ہیں کہ ہر دانے
پر لکھا ہے کہ وہ کس کا ہے اور کہا "یہی دیکھتا ہوں کہ
کسی دانے پر میرا یا میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے
یا نہیں"
بادشاہ مسکرائے اور اسی دن ایک ٹوکری عمدہ عمدہ آموں
کی ان کے یہاں بھیج دی۔

راوی: مرزا صاحب آم کی تو بس دو خوبیوں کے قائل تھے، میٹھا ہو
اور بہت سا ہو۔ ان کے ایک دوست کو آم پسند نہ تھے
ایک دن مرزا کے مکان کے برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی
وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے
گلی سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر
چھوڑ دیے تو حکیم صاحب نے کہا۔

حکیم صاحب: دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔

مرزا: بے شک گدھا نہیں کھاتا۔

راوی نمبر۲: غالب کی باتیں، چٹکلے اور فقرے نہیں، شربت کے گھونٹ
ہیں اور ان سے ہر صاحب ذوق اسی طرح لطف اندوز ہوتا
ہے جس طرح ان کے اشعار سے۔ شوخی و ظرافت کے نمونے
ان کی شاعری میں بھی جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔

آواز: جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

دوسری آواز: کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

آواز: کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

دوسری آواز: ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

راوی: غالب کی نثر و نظم میں سے ظرافت، شوخی، بظاہر معصومانہ
لیکن بباطن طنزیہ انداز، بے تکلفی، انداز گفتار کا انوکھا
رنگ اور مزاج کے عناصر نکال دیے جائیں تو ساری فکری
اور فلسفیانہ عظمت و رفعت کے باوجود ان میں وہ دلپذیری

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

علی عباس اُمّید
[illegible] بھوپال

گیان

میں کہ صبحِ ازل
جستجوئے بشر میں چلا تھا
آج تک
رات دن صفر چلتا رہا

○

اب جو پہنچا ہوں اس دشت میں
تو یہ بوسیدہ قبروں کے مٹتے خطوط
مجھ سے کہتے ہیں
آگے
ان فصیلوں سے کچھ ہی پرے
ایک بستی بھی
آباد ہے!

●●

نوکِ خار

ہزاروں سال
لمبا راستہ
طے کر کے
ہم
تہذیب کے اس موڑ تک پہنچے!

○

سفر کی گرد
چہرے سے ابھی دھونے نہ پائے تھے
ابھی
اس موڑ کے ملنے پہ ہم
مسرور بھی ہونے نہ پائے تھے
کہ یکسر حوصلہ کھونا پڑا ہے
قدم صدیوں پہ رکھنا
جس کی اُنگلی تھام کر سیکھا
اسی تہذیب کو
رونا پڑا ہے!!

●●

محمد شریف قریشی
۱/۹۱ - بھوسہ منڈی
فتح گڑھ - فرخ آباد

آوارگی

میں ان عذابوں میں مبتلا ہوں
جو آئینوں پر اُتارے جائیں
تو سنگریزے پناہ مانگیں
مری مُسافت کے راستے میں
یہ زندگی اک حادثہ ہے
گئے زمانے کے ہم نواؤ!
مجھے صدا دے کے مت بُلاؤ
مرے تعاقب میں بددُعا ہے

□□

ڈاکٹر رئیس انور

شعبۂ اردو
ایل این میتھلا یونیورسٹی
دربھنگہ

بنگال کے اُردو تذکروں کی نوعیت

انیسویں صدی اُردو ادب بالخصوص نثر کے لیے نہایت اہم ثابت ہوئی۔ اس کی ابتدا ہی میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے کلکتہ کو علم و ادب کے ایک گہوارے کی حیثیت حاصل ہوئی اور اُردو کے خاص مراکز سے مشاہیر اس نئے گہوارے میں اکٹھا ہوئے۔ بعض تو انگریزوں کے منصوبے بند عمل کے تحت آئے اور بعض قسمت آزمانے پہونچے، جس سے اردو شعر و ادب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر مظفر اقبال نے ان علمی و ادبی کارگزاریوں کا بہت عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے :-

"ان مصنفین کے کام پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے پانچ قسم کے کام کیے ہیں ؛ ترجمہ، تالیف، تسہیل، تلخیص اور تصنیف ....." ؎۱

اگر اس تجزیہ کی بنیاد پر ۱۹ویں صدی میں بنگال کے اُردو تذکروں کا جائزہ لیا جائے تو ان کی نوعیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے منسلک صرف تین تذکرے ہیں یعنی حیدر بخش حیدری کا 'گلشن ہند'، مرزا علی لطف کا 'گلشن ہند' اور بینی نارائن کا 'دیوانِ جہاں'۔ حیدری ۱۸۰۱ء میں کالج سے باقاعدہ طور پر وابستہ ہوئے لیکن 'گلشن ہند' کے دیباچے اور قطعہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنا تذکرہ کلکتہ آتے ہوئے سمندری سفر کے دوران ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰ء) میں لکھا۔ چونکہ حیدری کی زود بیانی مسلم ہے ؎۲ اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ یہ تذکرہ کلکتہ ہی میں بہ عجلت مکمل کیا گیا اور اربابِ اقتدار سے شناسائی پیدا کرنے کے لیے گلکرسٹ کو پیش کیا گیا۔ لیکن گلکرسٹ نے اسے سرد خانے میں ڈال دیا۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ حیدری نے بغیر حوالہ و ذکر کے علی ابراہیم خان خلیل کے تذکرۂ 'گلزارِ ابراہیم'، مولفہ ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۴ء) کا مختصر چربہ اتار لیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ 'گلزارِ ابراہیم' فارسی میں تھا جب کہ گلشن ہند اُردو میں لکھا گیا۔ اس بنا پر مذکورہ تذکرے کو تلخیص و ترجمہ کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

گلکرسٹ کی ایما پر مرزا علی لطف نے اپنے قیام کلکتہ کے دوران ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء) میں ایک تذکرہ مرتب کیا اور 'گلشنِ ہند' نام رکھا۔ اس کا ماخذ و منبع 'تذکرۂ گلزارِ ابراہیم' ہے لیکن سوانحی حصہ خاصے اضافے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کلام میں بھی کمی بیشی کی گئی ہے، اس لیے یہ محض ترجمہ و تلخیص نہیں، ایک عمدہ تالیف ہے۔

گلکرسٹ کے انگلستان جانے کے بعد ٹامس رو بک نے بینی نارائن سے 'تذکرۂ دیوانِ جہاں' لکھوایا۔ اس کا سنِ تالیف ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۲ء) ہے۔ بینی نارائن فنِ تذکرہ نگاری سے زیادہ واقف نہ تھے، اس لیے یہ تذکرہ خام ہے۔ سوانحی حصے مختصر ہیں۔ بعض اوقات تو تخلص کے سوا کچھ نہیں ملتا جس سے اس کی حیثیتِ انتخاب کلام یا بیاض کی سی ہو گئی ہے۔ تذکرے کے آخر میں چار ضمیمے بھی ہیں۔ رُباعیات، مطلعات اور فردیات کے علاوہ رُودادِ مشاعرہ (منعقدہ کلکتہ) بطور ضمیمہ ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر اس تذکرے کو بعض محققین نے بیاض یا مجموعہ کہا ہے۔ دراصل بینی نارائن نے ایک خوانشی کام کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے لطف کا تذکرہ بھی دیکھا ہو جس میں جدید معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ غالباً اسی بنا پر بینی نرائن نے

[illegible] کی کوشش کی لیکن کم علمی کی وجہ سے انھیں [illegible] ملی۔ بہرحال اگر اسے تذکرے کا ایک معمولی نمونہ سمجھا جائے تو بہر [illegible] سے تالیف کے زمرے میں رکھا جانا چاہیے۔

فورٹ ولیم کالج کے یہی تین تذکرے بنیادی حیثیت کے حامل ہیں ان ہی کی تقلید میں اردو میں تذکرہ نگاری کا چلن ہوا اور ایک مقامی بنگالی ہندو راجا جنم جی متر ارمان نے اس سلسلے میں پہل کی۔ اس نے شعرائے اردو کے دو تذکرے لکھے۔ پہلا تذکرہ 'منتخب التذکرہ' ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں مرتب ہوا۔ دیباچے میں تمام ماخذات کا ذکر ہے۔ مصحفی کا تذکرہ ہندی، گردیزی کا 'ریختہ گویاں'، میر حسن کا شعرائے اردو' اور بینی نارائن کا 'دیوانِ جہاں' ماخذات کے زمرے میں رکھے گئے ہیں۔ ارمان نے شعر وادب کا تاریخی دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کی اور بعض مقامی شاعروں کو بھی شامل کیا۔ اس طرح یہ تذکرہ ایک اچھی تالیف ہے۔

ارمان کا دوسرا تذکرہ 'نسخۂ دل کشا' ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں مکمل ہوا۔ یہ بھی ایک عمدہ تالیف ہے اور اول الذکر کے مقابلے میں ضخیم ہے۔ اس میں تقریباً ساڑھے آٹھ سو شعراء اور شاعرات کا ذکر ہے اس میں بھی بنگال کو ایک ادبی مرکز کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور ڈھاکہ، ہگلی اور کلکتہ کے ہندو اور مسلمان شاعروں پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس طرح مؤلف نے نہ صرف اپنے سیکولر ذہن کی آئینہ داری کی ہے بلکہ ہمعصر ماحول کی جھلک بھی پیش کردی ہے۔ یہ کام اردو ادب میں ایک قابلِ ذکر اضافہ ہے۔

عبدالغفور نساخ نے ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں ایک منفرد تذکرہ 'قطعۂ منتخب' تالیف کیا۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ بعض لکھنوی نمونوں کی تقلید میں انتخاب کلام غزلوں کے بجائے قطعات سے کیا گیا ہے۔ لکھنؤ میں اس طرح کے تجربے ہوئے تھے اور قصیدہ و مرثیہ نگاروں کے تذکرے لکھے گئے تھے 'قطعۂ منتخب' اسی اختراعی رجحان کی ایک مثال ہے۔ اس کی بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں شاعروں کے بجائے قطعات حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ جن شاعروں کے ایک سے زائد قطعات ہیں، ان کا ذکر بار بار ملتا ہے اور کسی قدر بدمزگی پیدا کرتا ہے۔ پھر بھی تاریخ قطعہ نگاری کی ترتیب میں یہ تذکرہ بہت عمدہ و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

نساخ کا دوسرا تذکرہ 'سخن شعراء' مولفہ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) بڑا ضخیم ہے اس کی تالیف میں دیگر تذکروں کے علاوہ نسخۂ دل کشا' اور منتخب التذکرہ' سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ بنگال اور بہار کے بعض غیر معروف شاعروں کی شمولیت بھی ان ہی کی تقلید میں ہوئی ہے۔ ۱۹ویں صدی کے آخری دور یعنی ۱۸۷۴ء میں نساخ کے دونوں تذکرے نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئے دونوں میں شاعروں کے حالات کم و بیش یکساں ہیں 'سخن شعراء' میں کہیں کہیں تحقیق و تنقید کے نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ نساخ نے بعض تذکروں کے تراجم پر محققانہ اور ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے اور حوالہ کے ساتھ اختلاف کیا ہے جس سے تذکروں میں ایک نئی خصوصیت پیدا ہوگئی ہے اور 'سخن شعراء' کی تالیفی حیثیت وقیع ہوگئی ہے۔

اجمالی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹ویں صدی کی آمد کے ساتھ ہی اردو میں تذکرہ نگاری کی جو ابتدا ہوئی، اس میں نوعیت کے اعتبار سے ترجمہ و تلخیص کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ اگر لطف کے 'گلشن ہند' کی اس حیثیت کو ملحوظ رکھا جائے تو ترجمہ و تلخیص کے صرف دو نمونے ملیں گے اور دونوں فورٹ ولیم کالج سے کسی نہ کسی طور پر منسلک ہیں۔ کالج ہی کے زیر اثر مرزا علی لطف کے ذریعہ تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے بنگال کے دیگر تذکرے تالیفی حیثیت رکھتے ہیں اور تذکرہ نگاروں کی انفرادی صلاحیتوں کے غماز ہیں۔

حواشی:

۱ے بہار میں اردو نثر کا ارتقا ص۲۲ ڈاکٹر مظفر اقبال مطبوعہ پٹنہ لیتھو پریس پٹنہ جنوری ۱۹۸۰ء

۲ے گلشن ہند ص۱/۲، ص۱۳ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی فروری ۱۹۶۷ء

غزلیں

ہیرانند سوز
۱،۴۳/اے ۷، فرید آباد

غلو تھا طرزِ بیاں میں زباں سیاسی تھی
ہر ایک بات جو اس نے کہی قیاسی تھی

عجیب ڈھنگ کا موسم تھا شہر میں اب کے
دلوں میں خوف تھا چہروں پہ بدحواسی تھی

کہاں کی عزت و ناموس کیسی شرم و حیا
جب اس کے جسم کی قسمت میں بے لباسی تھی

تمام شہر ہی سنسان لگ رہا تھا مجھے
ترے بغیر وہاں کس قدر اداسی تھی

ہے تشنگی کی کہاں انتہا محبت میں
برس رہی تھی گھٹا اور روح پیاسی تھی

وہ عرضِ حال پہ کیوں اس قدر خفا ہیں سوز
مرے خیال میں وہ بات تو ذرا سی تھی

سید حیات وارثی
باغ مولوی انوار، لکھنؤ

حیرت ہے آئینوں کے خریدار کیا ہوئے
سب لوگ پارسا ہیں گنہگار کیا ہوئے

اب کوئی بھی لگاتا نہیں سایہ دار پیڑ
ہے سب کو فکر، صاحبِ ایثار کیا ہوئے

چاروں طرف سے آنے لگے مشوروں کے تیر
مشقِ ستم ہوئے ترے بیمار کیا ہوئے

جو کرب کی زمیں پہ کھلاتے تھے لب کے پھول
اے زندگی ترے وہ اداکار کیا ہوئے

اپنے سے بھی حیات تعلق نہیں رہا
ہم تم سے دوستی کے طلبگار کیا ہوئے

عرفان عباسی
ڈاکٹر صدیقی ہال، بوس روڈ
لکھنؤ



پُراسرار ناول نِگار
خوش فِکر شاعِر
اسرار احمد ابنِ صفی

(۱۹۲۷ء-۱۹۸۰ء)

اُردو کے جاسوسی ادب کا مقبول و محبوب نام "ابن صفی" اپنے منفرد و دل نشین انداز تحریر سے کئی دہائیوں تک جاسوسی ادب کے شائقین کو خصوصاً اور عام اُردو داں کو عموماً بے حد متاثر اور اپنی نئی تخلیق کے انتظار میں بے چین کرتا رہا۔

ابن صفی کا شمار ان مخلصین و محسنین اردو میں کیا جانا چاہیے جو اس کے بُرے وقتوں میں آڑے آئے ہیں۔ ابن صفی نے اُردو کی سخت مخالفت کے زمانے میں اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر زبان و بیان کی انفرادیت، دل چسپ و دل کش کرداروں کی تخلیق اور شیریں و شگفتہ بیانی کے حسین مرقعے جاسوسی ناولوں کی شکل میں پیش کر کے شائقین کو مسحور کیا جب اردو دُنیا پر ایک جمود طاری تھا۔ علمی، ادبی اور تخلیقی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ بعض قلم کاروں نے مایوسی کا شکار ہو کر قلم رکھ دیے تھے اور عملاً اردو زبان و ادب کے تذکرے سے بھی گریز کیا جانے لگا تھا، اس دور میں ابن صفی کے سحر انگیز ناولوں کی تعداد میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا ان کے دل کش کرداروں سے دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ ان کے ناول کثیر تعداد میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگے، ملک کے مختلف گوشوں میں ایسے مرکز قائم ہو گئے جہاں اُردو داں ان کے ناول پڑھتے تھے اور کم علم یا غیر اردو داں انھیں دل چسپی سے سُنتے تھے۔ جا بجا یہ ناول معمولی کرایہ پر بھی فراہم کیے جاتے تھے تاکہ قوتِ خرید سے محروم، دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی پڑھ سکیں۔ ان کے طرزِ تحریر کے شیدائیوں میں ایسے لاتعداد نوجوان اور بزرگ بھی تھے جو اُردو زبان یا رسم خط سے ناواقف تھے لیکن دوسروں سے سُن کر لطف لیتے اور آنے والے نئے ناول کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جنھوں نے اس زمانے میں صرف ابنِ صفی کے جاسوسی ناول پڑھنے کے شوق میں اُردو کی تعلیم حاصل کی۔ حرف شناس ہوئے اور ناولوں کے مسلسل مطالعہ، ذوق و شوق اور مشق و محنت سے رفتہ رفتہ علمی استعداد میں اتنا اضافہ کر لیا کہ اب ان میں سے بعض کا شمار اچھے ادبا اور صحافیوں میں ہوتا ہے۔

اس طرح ابن صفی کے اُردو جاسوسی ناولوں نے یہی نہیں کہ ایک خاص حلقہ کو متاثر کیا بلکہ اُردو زبان کی شیرینی و لطافت کے لاتعداد شیدائی پیدا کر کے زبان کی خدمت کی، اسے استقامت بخشی اور اُردو زبان پڑھنے لکھنے اور جاننے والوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ کیا۔

ابنِ صفی کا اصل نام اسرار احمد اور مولد و مسکن قصبہ نارہ ضلع الہ آباد تھا۔ یہ وہی نارہ ہے جس کی شاعر خیز و شعر انگیز مٹی نے نوح (ناروی) جیسا معروف، کثیر التلامذہ استاد اور قادر الکلام شاعر پیدا کیا۔ نوح نے اپنے وطن عزیز کا جغرافیہ یوں بتایا تھا:

جو آنا ہے ان کو تو اے نوح آئیں   وہ رستہ، طرف، فاصلہ کچھ نہ پوچھیں

چڑھیں ریل پر اور پہنچیں "سراتھو"
سراتھو سے نو میل دکھن ہے "نارہ"

ابن صفی اسی نارہ کے ایک زمیندار گھرانے میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مروجہ تعلیم نارہ و الہ آباد میں حاصل کی اور معاشی تگ و دو میں لگ گئے۔ ان کا تقرر بحیثیت مدرس یادگار حسینی اسکول الہ آباد میں ہوگیا تھا جہاں تدریسی خدمات انجام دینے کے ساتھ وہ اپنی علمی استعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے اور حصول علم کے شوق محنت، مطالعہ و لگن کے بل پر مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند حاصل کی۔

ابن صفی بحیثیت مجموعی ذہین، طباع، خوش اخلاق، قوی الحافظہ دلچسپ، ہمدرد، کم سخن و کم آمیز اور دل آویز شخصیت کے مالک تھے۔ شعر و ادب کا ذوق خداداد تھا لیکن اسے نکھارنے میں ان کے وطن نارہ کے شعر انگیز ادبی ماحول کا تاثر بھی شامل تھا۔ ان کے بچپن میں وہاں شعر و ادب کا بڑا چرچا تھا۔ متعدد خوش فکر و ممتاز شعرا اور ادبا وہاں موجود تھے جن کے دم سے ادبی چہل پہل رہتی تھی۔ اس ماحول نے ابن صفی کو شاعری کی طرف مائل کیا پھر دوران قیام الہ آباد وہاں کی محفلوں و صحبتوں سے فیض یاب ہوئے اور اسرار تخلص اختیار کرکے باقاعدہ شاعری شروع کر دی۔ جلد ہی اپنے کو اسرار ناروی کی حیثیت سے متعارف کرالیا۔ انھوں نے جس مختصر مدت میں شہرت، ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل کی اس کی مثال ملنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

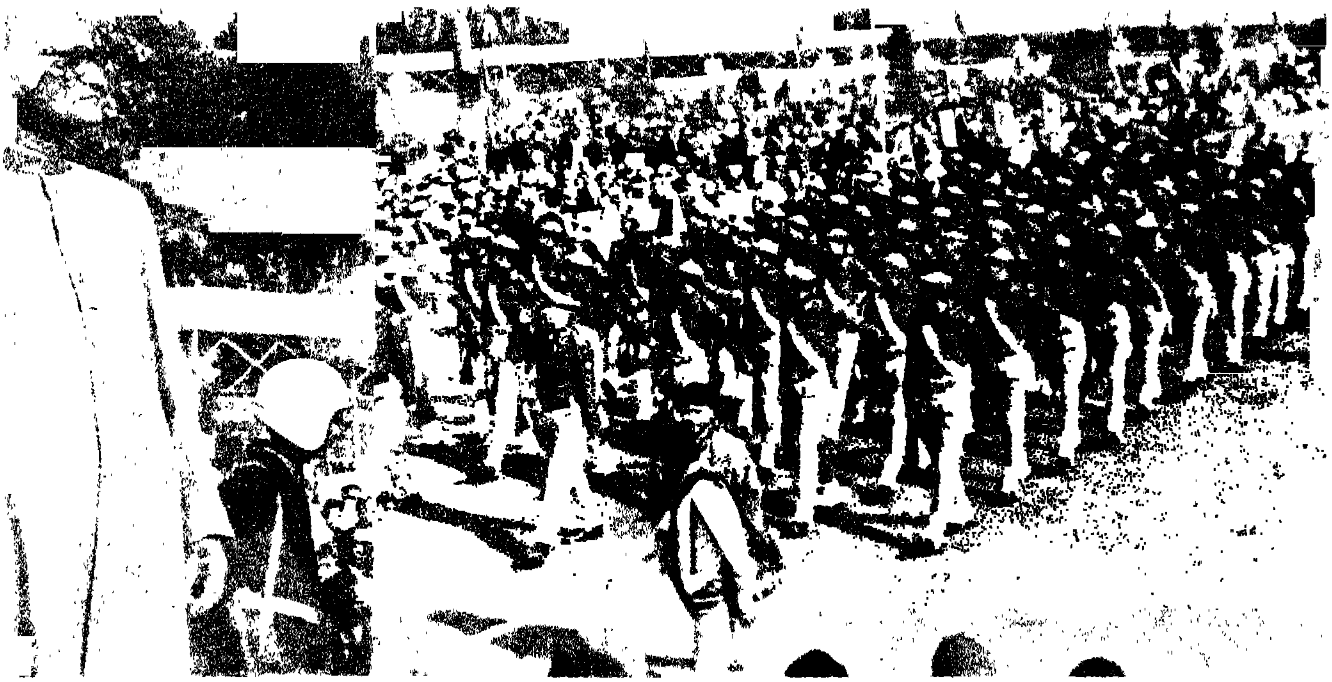
ابن صفی زود گو اور سوچ سمجھ کر شعر کہنے والے شاعر تھے۔ انھوں نے بہت کہا۔ سارا کلام تو محفوظ نہیں ہے لیکن سنا ہے پاکستان میں ان کے صاحبزادے "متاعِ قلب و نظر" کے نام سے ان کا ایک دیوان شائع کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔

اسرار ناروی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صنف غزل سے کیا تھا جسے اردو شاعری میں حرفِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔ انھیں احباب کی محفلوں اور گھریلو نشستوں کے دائرے سے نکل کر عوامی شاعروں تک پہونچنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ موزونیِ طبع اور خداداد صلاحیتوں سے مالا مال اسرار ناروی کو جلد ہی خوش فکر و پسندیدہ شعرا کی صف میں جگہ مل گئی۔ ان کا کلام زبان کی شیرینی، بیان کے لطف اور جذبات کی پاکیزگی کی خوبیوں سے مرصع ہے اور دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ کلام میں شعری توانائی و حسن و مسرت کی تہ نشینیاں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تین سو سے زائد جاسوسی ناولوں کا مصنف ہمہ وقت سراغ رسانی اور تجسس و اعجاز کے تانے بانے بننے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ادیب یہ شعری پیکر ڈھالنے کا وقت کب اور کیسے نکالتا ہوگا۔

قلمی نام "ابن صفی" اختیار کرنے سے قبل اور گیسوئے سخن سنوارنے کے ساتھ ان کی مضمون نگاری کا بھی آغاز ہوگیا تھا۔ وہ "طغرل فرغان" کے فرضی نام سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور خاکے لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ان کے دوست عباس حسینی نے ماہنامہ "نکہت" الہ آباد سے جاری کیا تو وہ بحیثیت نائب مدیر شعبۂ ادارت سے منسلک ہوگئے اور اسرار ناروی کا کلام و طغرل فرغان کے مضامین و خاکے "نکہت" میں مسلسل چھپنے لگے۔

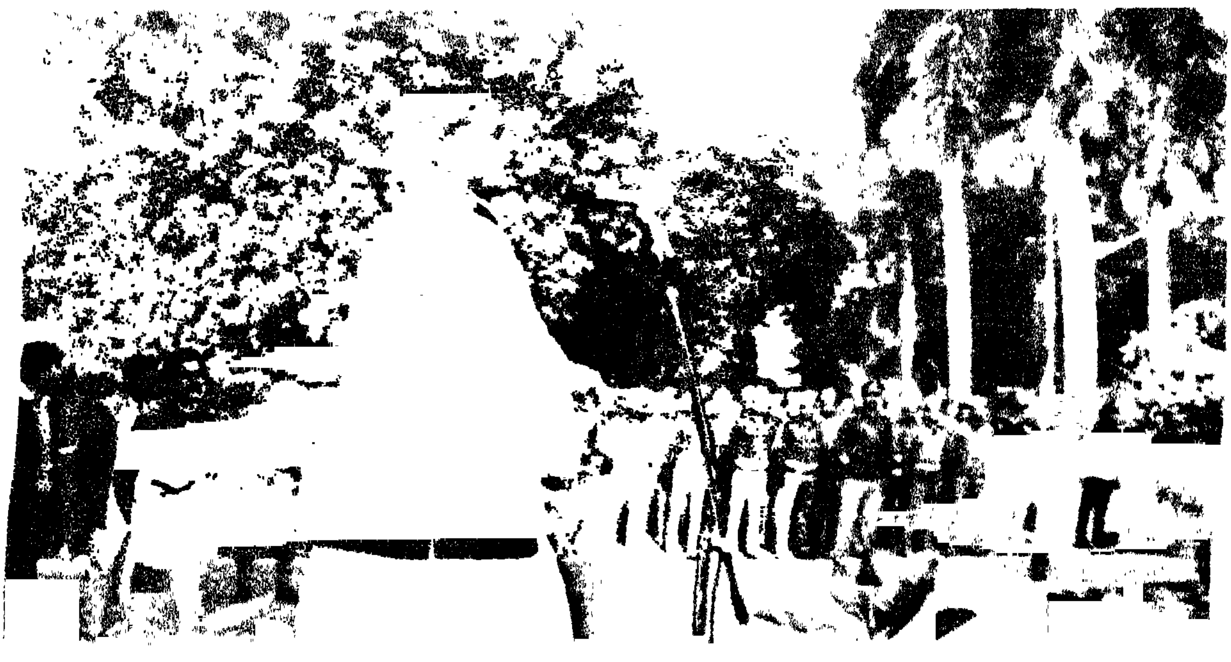
۱۹۵۳ء کے قریب اسرار ناروی و طغرل فرغان کے چہرے بے نقاب کرکے ادبی اسکرین پر "ابن صفی" نمودار ہوئے۔ اسی سال ماہنامہ جاسوسی دنیا کے ان مقبول عام ناولوں کا آغاز ہوا جن کی تعداد تقریباً تین سو تک پہونچی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ابن صفی جاسوسی ادب کے باکمال منفرد و کامیاب فن کار کی حیثیت سے سحر انگیزی، شگفتہ بیانی، رواں دواں الفاظ، چھوٹے چھوٹے دلچسپ جملوں اور مزاح کی چاشنی کی بدولت جادو نگاری کا لوہا منوا کر شہرت و مقبولیت کے بام عروج تک پہونچ گئے۔ ان کے ناولوں کے انفرادی، مضبوط اور مکمل کردار کرنل فریدی۔ عمران۔ حمید۔ قاسم۔ جوزف اور جولیا وغیرہ جیتے جاگتے حقیقی کردار معلوم ہوتے تھے۔ ناول شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر رکھ دینا شاید ہی کسی شائق کے بس میں رہا ہو ورنہ۔ عموماً لوگ ایک ہی ناول بار بار پڑھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔

اردو والوں میں جاسوسی ادب سے ایسی دلچسپی پیدا کرنے والے جس کے جاسوسی ناولوں سے لطف لینے کے لیے لوگ اردو سیکھیں ابن صفی کا نام ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ بے پناہ ذہانت، عمیق مطالعہ، معلومات کی وسعت۔ مغربی ادب و جدید رجحانات سے واقفیت، انتھک محنت اور عالی حوصلگی کے جو نقوش



گورنر اترپردیش شری بی۔ ستیہ نرائن ریڈی ۲۶ر جنوری ۱۹۹۱ء کو یوم جمہوریہ کے موقع پر
لکھنؤ میں پریڈ کی سلامی لیتے ہوئے

وزیر اعلا اترپردیش شری ملائم سنگھ یادو ۲۶ر جنوری ۱۹۹۱ء کو یوم جمہوریہ کے موقع پر کالیداس مارگ
(لکھنؤ) میں اپنی رہائش گاہ پر پرچم کشائی کے بعد تقریر کرتے ہوئے





وزیر اعلا اترپردیش شری ملائم سنگھ یادو ۲۰؍فروری کو مال۔ اٹونجہ مارگ پر گومتی مدی پل کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد عوامی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے

وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو ۱۳؍فروری کو عوامی نظام تقسیم کو مستحکم بنانے کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے





وزیر قومی یک جہتی شری بھگوتی سنگھ اتر پردیش اردو اکادمی کے ہال میں "معلم اردو" کے ۱۰۰ ویں شمارے کی رسم اجرا
کی تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے۔

وزیر ہریجن و سماجی بہبود شری اودھیش پرشاد ودھان بھون لکھنؤ میں کرناٹک کے پسماندہ طبقات
کے نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے۔





...اج جامی

مقابل شہباز اکیڈمی
پیر روڈ۔ کراچی

...کمال تک پہنچا
...ِصال تک پہنچا

...ے دیکھ کے غرور بڑھا
...ن اپنے کمال تک پہنچا

...چمک اُٹھے تارے
...ِ لال تک پہنچا

...تا رنگیں تھا قصۂ آدم
...ر اپنے آل تک پہنچا

...سے مدعا دل کا
...ِ حال تک پہنچا

...نے جامی زوال میں کاٹی
...می وہ کمال تک پہنچا

پیام فتحپوری

۲/۶ - فہیم آباد کالونی
چمن گنج۔ کان پور

پھول دامن میں ہیں رندوں کے نہ اب ہاتھوں میں جام
کاش کوئی دیکھتا یہ گردشِ دوراں کی شام

بطن میں پلتا ہے جن کے آفتابِ انقلاب
ان سیہ راتوں کو میری سمت سے لاکھوں سلام

جن شہیدوں کے لہو سے یہ زمیں ہے لالہ زار
ان شہیدوں کو گلستاں کی بہاروں کا سلام

میرا نعرہ کیا ہے، امن و اتحاد اور دوستی!
آج اے اہلِ وطن ہے تم کو یہ میرا پیام

جس کو کہتے ہیں محبت، ہے بہارِ زندگی
زندگی ہے پھول برسا کر گزر جانے کا نام

پھر بدلتے موسموں سے دن بھی بدلیں گے پیام
زندگی کے روز و شب اور یہ فسردہ صبح و شام

غزل

بشیر فاروقی

۵۱۵ مراد علی لین
نئی بستی۔ لکھنؤ

جشنِ چراغاں یوں بھی ہوا تھا
تم بھی جلے تھے میں بھی جلا تھا

جانے اس کے ذہن میں کیا تھا
میرا مقدر جس نے لکھا تھا

اپنی ہی دہلیز پہ بیٹھا
وہ گھر اپنا ڈھونڈھ رہا تھا

شام کے سائے جان کے جُب ہیں
سُورج کیسے قتل ہوا تھا

اتنا زمانہ ساز نہ تھا وہ
پہلے پہل جب مجھ سے ملا تھا

شہروں کی کچھ اور فضا تھی
خبروں میں کچھ اور چھپا تھا

دل نے سُنیں کتنی ہی صدائیں
اور کسی نے کچھ نہ کہا تھا!

کس سے کہتے پیاسے پرندے
پانی میں تیزاب ملا تھا

اس کی محبّت اس کی وفا کا
رنگ تھا کچّا چھوٹ گیا تھا

مجھ کو بشیر اس بزمِ جہاں میں
جو بھی ملا وہ مجھ سے بھلا تھا

رئیس انصاری

نعمت اللہ روڈ۔ امین آباد
لکھنؤ

صبا کے چہرے پہ سچائیاں نکلتا ہے
وہ جس کا جھوٹ پہ سب کاروبار چلتا ہے

قبیلے والے یہ آئے ہیں دیکھنے کے لئے
ہوا کے سامنے کس کا چراغ جلتا ہے

وہ جن کے گھر میں دیا تک نہیں جلانے کو
یہ چاند صرف انہی کے لئے نکلتا ہے

وہ ساتھ چھوڑ گیا ہے تو کچھ گلا نہ کرو
تمام عمر کہاں کوئی ساتھ چلتا ہے

یہ تلخیاں مجھے اجداد سے ملی ہیں رئیس
اسی لیے تو یہ لہجہ نہیں بدلتا ہے

مہدی پرتاپگڈھی

معرفت ایگزیکیوٹیو انجینیر
اریگیشن ڈویژن
پرتاپ گڈھ

کوئی ادا نہ نظر آئی مجھ کو غیرت سی
تھی اسکی آنکھوں میں رقصاں عجب شرارت سی

ہمارا گاؤں ہو یا تیرا شہر دونوں میں
نہیں رہی جو تھی اک پیار کی روایت سی

فضا میں آج کہیں کچھ نیا نیا سا ہے
ملی ہے برگِ شجر کو کوئی بشارت سی

نئی غزل نے دیے لفظ کو نئے معنی
ہے بطنِ شعر میں مخفی کوئی علامت سی

وہ دَورِ بے ہنری اب گزر چکا مہدی
پُرانے وقتوں کی باتیں ہیں سب حکایت سی

غزل

...اعظمی
...ظم گڑھ

...ردو ناول کے ارتقاء میں خواتین کا حصہ

...ل ادب کی ایک انتہائی اہم صنف ہے جو "ہماری زندگی
...قیوں کو سلجھانے میں مدد دیتی ہے"[1]
...ل انگریزی لفظ ہے، انگریزی ادب کے ساتھ ہمارے یہاں
...تے ہی دیکھتے سارے ادب پر چھا گیا"[2]
...ول میں پرانے قصّوں، افسانوں اور داستانوں کے برعکس
...کا قصّہ ہوتا ہے اسی لیے اسے موجودہ عہد کا رزمیہ بھی کہا
...[3]
...یزی میں تو ناول کا آغاز اٹھارھویں صدی عیسوی ہی میں ہو
...ردو میں یہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں وجود میں آیا
...کے مطابق اردو کا پہلا ناول "خطِ تقدیر" مانا جاتا ہے۔
...ودُ الٰہی نے دریافت کیا ہے ورنہ مارچ ۱۹۶۵ء سے قبل
...ے قریب قریب ناواقف تھے"۔[4]
...تقدیر کی دریافت سے پہلے مولوی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس"
...ناول قرار دیا جاتا تھا، جسے نذیر احمد نے ۱۸۶۹ء میں تصنیف
...نگاری کا فن آج اپنے عروج پر پہونچ چکا ہے۔ اُردو میں متعدد
...لکھے جا چکے ہیں جنھیں بقائے دوام حاصل ہو چکا ہے اور انھیں
...زین ناولوں کی صف میں فخر کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔
...ے فن کو جہاں مرد ناول نگاروں نے پروان چڑھایا ہے وہیں
...نگاروں نے بھی اس کی آبیاری کی ہے۔ گو کہ خاتون ناول
...مردوں کے مقابلے میں بہت بعد میں اس وادی میں

قدم رکھا ہے پھر بھی ناول کے ارتقا میں ان کا تعاون فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

خاتون ناول نگاروں نے بیسویں صدی کے آغاز میں ناول کی تخلیق شروع کی، اور تب سے آج تک یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ کئی خاتون ناول نگار تو آج بین الاقوامی شہرت کی مالک ہیں۔ انھوں نے فن اور موضوع دونوں اعتبار سے اسے وسعتیں بخشیں۔ بیشتر خاتون ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں عورتوں کے بنیادی مسائل کو جگہ دی ہے اور ناول کے ذریعہ عورتوں کی تعلیم اور تربیت نیز سماجی، اخلاقی اور معاشرتی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق عورتوں کا ناخواندہ ہونا ہی تمام خامیوں اور برائیوں کی جڑ ہے۔ اگر عورت تعلیم یافتہ ہوگی تو وہ کامیاب زندگی گزار سکے گی اس کے علاوہ انھوں نے سماج کے فرسودہ رسم و رواج کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں محمدی بیگم کے ناول "آج کل" "سگھڑ بیٹی" اور "شریف بیٹی" اور طیبہ بیگم کا ناول "انوری بیگم" قابلِ ذکر ہیں۔ طیبہ بیگم نے اپنے ناول "انوری بیگم" میں عورتوں کے اندر خانگی ذمہ داریوں کے احساس کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ نذر سجاد بھی اس دور کی ممتاز ناول نگار ہیں، انھوں نے اپنے ناول "آہِ مظلوماں" میں بے جوڑ شادی کے خطرناک نتائج کو پیش کیا ہے۔ نذر سجاد نے اپنے دوسرے ناول "اختر النساء" میں عورتوں کی تعلیم و تربیت پر کافی زور دیا ہے۔ ان کے خیال میں اگر لڑکی پڑھی لکھی ہوگی تو اپنی عقل

ر اپنے شعور سے زندگی کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے۔ ان ابتدائی ناول روں کے یہاں کہیں کہیں نئے زمانے کے تقاضوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت پسندی اور فن کارانہ پختگی کا آغاز صحیح معنوں میں خاتون ناول نگاروں کے دوسرے دَور سے ہوتا ہے جس کا سہرا حجاب امتیاز علی، صالحہ عابد حسین، بیگم احمد علی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے سر جاتا ہے۔

ان خاتون ناول نگاروں کے یہاں ماحول کے مشاہدے کے ساتھ ساتھ غور و فکر کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ان کے یہاں صرف جذبات نگاری نہیں ہے بلکہ فکر کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ اپنے موضوعات کے ساتھ انھوں نے انصاف کیا ہے کیوں کہ ان موضوعات پر ان کی پوری گرفت تھی۔

صالحہ عابد حسین کے ناول "عذرا"۔ "آتشِ خاموش" اور "قطرے سے گہر ہونے تک"۔ حجاب امتیاز علی کے ناول "ظالم محبت" "اندھیرا خواب" اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ ان ناولوں میں انسانی حرکات و سکنات کی نفسیاتی ناویل بہتر طور پر پیش کی گئی ہے۔ اور یہی فن کارانہ چابکدستی عصمت چغتائی کے یہاں بہت تیز اور گہرا رنگ لیے ہوئے ہے جس کی مثال دوسری خاتون ناول نگاروں کے یہاں نہیں ملتی۔

عصمت چغتائی کے کرداروں میں جو نفسیاتی اور تجزیاتی جھلک ملتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ماحول کے اثرات فرد کی زندگی پر کیسے پڑتے ہیں، اسے انھوں نے اپنے شہرہ آفاق ناول "ٹیڑھی لکیر" میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "ٹیڑھی لکیر" نہ صرف عصمت چغتائی کا شاہکار ہے بلکہ اگر اسے اردو کا ایک اہم ناول کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی رائے ہے کہ:

> "ٹیڑھی لکیر میں عصمت نے ایک متوسط گھرانے میں پروان چڑھنے والی لڑکی کی جذباتی اور نفسیاتی زندگی کو اور وہ ماحول جس میں وہ پرورش پاتی ہے، اس فنی تکمیل کے ساتھ اور اس درجہ فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ٹیڑھی لکیر اردو ناول نگاری کی تاریخ میں سنگ میل بن گئی ہے۔" ؎

ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> "اردو ناول نگاری میں اس کا (ٹیڑھی لکیر کا) جواب نہیں ملتا۔" ؎

عصمت کے یہاں مغربی فن کے رچاؤ کا عکس بہت نمایاں ہے اور اردو ناول نگاری کے فن پر یہ مغربی رچاؤ وقت اور زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اور تیز اور گہرا ہوتا چلا گیا ہے جس کی زبردست مثال قرۃ العین حیدر کے یہاں ملتی ہے، ان کے ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غمِ دل" پر یہ رنگ پوری طرح غالب ہے۔ ان ناولوں کا پس منظر مغرب زدہ امیروں کی دنیا ہے قرۃ العین حیدر نے مغربی تکنیک اور مغربی اندازِ فکر کو بڑے سلیقے کے ساتھ مشرقی روایت کے حسن میں سمویا ہے۔ انھوں نے فرد کی زندگی اور اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کو موضوع بنایا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے بعد غائشہ جمال کے ناول "گردِ سفر" اور الفت منہاس کے ناول "بے چارہ" اور "یہ کیا" میں بھی فن اور موضوع کی رنگا رنگی کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

واجدہ تبسم اردو ناول کی دنیا میں ایک بے باک ناول نگار کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔ ان کے بیشتر ناول سماجی روایت سے بغاوت کے حامل ہیں خصوصیت کے ساتھ حیدرآباد کے روایتی ماحول اور معاشرے میں عورت کے استحصال پر انھوں نے کھل کر نشتر زنی کی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ واجدہ تبسم کی بے باکی کبھی کبھی اعتدال کی حد کو پار کر جاتی ہے لیکن اکثر و بیشتر وہ حقیقت پسندی اور حق بیانی ہی سے کام لیتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں زیادہ تر جنس کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن بقول خود انہی کے "کیا عورت اور مرد کے درمیان جنسی جذبہ نہیں ہوتا؟ روٹی کپڑا اور مکان کے بعد انسان شادی کرتا ہے، یہ انسان کی چوتھی ضرورت ہے، پھر اتنے اہم موضوع کو کیوں نظر انداز کریں۔ "پھول کھلنے دو"، "شہر ممنوع" اور "روزی کا سوال" وغیرہ ان کے بہترین ناول ہیں۔

عطیہ پروین اور بشریٰ رحمٰن بھی اس دَور کی مقبول ناول نگار ہیں۔ انھوں نے اردو کو درجنوں ناول دیے ہیں۔ بشریٰ رحمٰن نے موجودہ سماج کے بیشتر مسائل پر بڑی خوبی اور چابک دستی سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے ناولوں میں موضوع اور فن دونوں کا تنوع ملتا ہے۔ انھیں کردار

۔ری کا بھی بڑا سلیقہ ہے۔ عطیہ پروین نے یوں تو متعدد ناول تخلیق کیے ہیں جو مقبول عام ہو چکے ہیں مگر ان کے ناول "جس کو کہتے تھے مسیحا" اور "یہ میرا ظرف دیکھیے" خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ موجودہ دور میں خاتون ناول نگاروں میں اور بہت سے نام لیے جا سکتے ہیں جو اُردو ناول کے اُفق پر ستاروں کی طرح اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ غرض کہ خاتون ناول نگاروں اور ان کے ناولوں کا ایک کارواں سا نظر آتا ہے جو اپنی منزل کی طرف تیزی کے ساتھ رواں دواں ہے۔

مثلاً سرور جہاں کے ناول "اُجالے"۔ "اچانک"۔ "رنگ ہزار"۔ "درد کا ساحل"۔ "ایک مٹھی بوجھ"۔ "بیکر"۔ "خزاں سے دور"۔ "پیار کا رشتہ"۔ "راہوں میں" اور "اپنا خون" وغیرہ۔ عفت موہانی کے ناول "بھنور"۔ "درد کا درماں"۔ "آگ میں پھول"۔ "پندار"۔ "داغ دل" "ہمسفر اور ہیجان" وغیرہ۔ مینا ناز کے ناول "بدنام"۔ "انجانی منزل" "پکار"۔ "پاگل بینا"۔ "درد آشنا"۔ "پہاڑی چاند"۔ "بہار آنے تک" اور "بند آنکھوں میں سپنے" وغیرہ۔ دیبا خانم کے "پتھر کے صنم"۔ "پھول کی زنجیر"۔ "پتھر کا گلاب"۔ "راز دل"۔ "پیاسے کو شبنم"۔ "دھوپ اور چاندنی" اور "خوشبو تیرے نام کی" وغیرہ۔ رضیہ بٹ کے ناول "روپ"۔ "سنگ ریزے" اور "گل بانو"۔ زلیخا حسین کے ناول "پتھر کی لکیر"۔ "ایک ہی ڈگر"۔ "اپنے اور پرائے"۔ "تاریکیوں کے بعد" اور "آسمان کے تلے" وغیرہ۔ شکیلہ اختر کا ناول "تنکے کا سہارا" جمیلہ ہاشمی کا ناول "داغ فراق"۔ آمنہ ابوالحسن کا ناول "واپسی" اور جیلانی بانو کا ناول "نغمے کا سفر" اور صغریٰ مہدی کے ناول "دھند"۔ "پروائی" "بام جولاں" وغیرہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ہاجرہ مسرور کا ناول "آنگن" اور خدیجہ مستور کا ناول "گھروندے" تو غیر فانی نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان تمام ناولوں میں عہد حاضر کی منتشر اور مضطرب زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا خواب بھی پنہاں ہے۔ ان میں حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل پر بھی زور دیا گیا ہے اور بدلتے ہوئے زمانے کے دوش بدوش چلنے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔

ناول نگاروں نے موضوعات کی وسعت اور رنگارنگی کے ساتھ ساتھ اُردو ناول کو دلچسپی اور دلنشینی سے بھی ہمکنار کیا ہے۔ بقول وقار عظیم:

"جہاں تک کہانی کہنے اور اسے کہانی کی طرح کہنے کا تعلق ہے عورتوں کے قصے اور ناول اپنی مثال آپ ہیں اور یہ مثال قدیم اور جدید کے فرق کے بغیر عورتوں کے سب ناولوں میں موجود ہے۔" ؎۷

حواشی:

؎۱ اُردو ادب کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر سلام سندیلوی
؎۲ تنقیدی اشارے، آل احمد سرور
؎۳ آج کل، نئی دہلی۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء
؎۴ نذیر احمد: ڈاکٹر اشفاق اعظمی
؎۵ اُردو ادب کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر سلام سندیلوی
؎۶ بیسویں صدی میں اردو ناول: ڈاکٹر یوسف سرمست
؎۷ داستان سے افسانے تک: وقار عظیم

غزل

پربھا نسیم
۲۴۔ شیواجی پارک
جالندھر

کچھ کہیں گے نہ ہم بندہ پرور
اب لبوں پر ہے دم بندہ پرور
آپ آتے تو پھر اور ہوتی!
صورتِ شامِ غم بندہ پرور
دیکھیے کس محبت سے آئے
خیر مقدم کو غم بندہ پرور
میں تو ہوں مبتلائے محبت
آپ کو کیا ہے غم بندہ پرور
کوئی تازہ ستم اور مجھ پر
درد دل میں ہے کم بندہ پرور
تخلیہ میں نسیم اب کریں گے
جو ہیں باتیں اہم بندہ پرور

ملیالم افسانہ

ایس، کے، پوٹےکاٹ
ترجمہ: نہال الدین عثمانی
۵۰۵/۱۶ - اندرانگر۔ لکھنؤ

تکشلا کی یاد میں

ملیالم کے ممتاز شاعر اور افسانہ نگار شری ایس، کے، پوٹےکاٹ کو ۱۹۸۰ء کا گیان پیٹھ ایوارڈ ان کے ناول "اورو دیسلتنتے کاتھو" (ایک صوبے کی کہانی) پر حاصل ہوا تھا۔ یہاں ان کی ایک ایسی کہانی کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو فرقہ وارانہ خیرسگالی کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔

"تکشلا جل کر خاک ہو رہا ہے"۔ یہ خبر پڑھتے ہی میں حیران رہ گیا۔ مجھے فوراً حمید خاں کی یاد آئی۔ میں بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگا — "بھگوان! میرے پیارے حمید خاں کو آگ کی لپٹوں سے بچانا۔"

ابھی دو سال بھی تو نہیں گزرے۔ میں تکشلا گیا تھا اور گاؤں کے دیومالائی کھنڈروں کو دیکھتا گزر رہا تھا۔ میں سخت گرمی سے نڈھال ہو رہا تھا۔ بھوک پیاس ناقابل برداشت ہو گئی تو میں کھانے کی تلاش میں اس بازار کی طرف چل پڑا جو ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ایک میل کی دوری پر تھا۔

ہاتھ کی لکیروں جیسی سڑکوں سے بھرا تنگ بازار — دھول، مکھیاں اور گندگی —— ساتھ ہی چمڑے کی بدبو۔ لحیم شحیم پٹھان آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔

بازار میں چاروں طرف تلاش کرنے پر بھی کوئی ہوٹل نظر نہیں آیا۔ تبھی ایک دکان سے روٹی کی خوشبو آئی اور میں بے ساختہ اسی طرف کھنچا چلا گیا۔

ادھیڑ عمر کا ایک آدمی تنور کے پاس بیٹھا روٹی پکا رہا تھا۔ میں وہاں پہونچا ہی تھا کہ اس نے آٹا گوندھتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں مسکرایا۔ وہ مشکوک نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا

"کھانے کے لیے کچھ ہے؟"

"روٹی اور سبزی ہے۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔"

اس نے ایک بنچ کی جانب اشارہ کیا تو میں وہاں بیٹھ گیا۔ میں نے دکان کے اندر نظر دوڑائی تو دیکھا فرش کچا ہے۔ ادھر اُدھر بالو بچھی ہے، ایک طرف کوئی داڑھی والا بوڑھا ہاتھ کے سہارے لیٹا ہوا حقہ پی رہا ہے اور دُنیا سے بے نیاز وہ تمباکو کے دھوئیں میں گم ہے۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" روٹی کو تنور میں ڈالتے ہوئے اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

"مالابار سے۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے ایسا منھ بنایا گویا اس جگہ کا نام اس نے پہلی بار سُنا ہو۔ اس نے آٹا گوندھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ہندستان میں ہی ہے۔؟"

"جی ہاں، جنوبی سرے پر — مدراس میں۔"

"آپ ہندو ہیں نا۔؟"

"ہاں، میں ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوا تھا"

اس نے پوچھا، "کیا آپ لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں کا کھانا کھا لیتے ہیں۔؟"

"عمدہ چائے اور بریانی کے لیے ہم مسلم ہوٹل میں ہی جاتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اسے شاید میری بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ مجھے اسی طرح دیکھتا رہا۔ میں نے پھر کہا،

"ہندو اور مسلمان ہمارے گاؤں میں مل جل کر رہتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعمیر کردہ اولین مسجد ہمارے ہی گاؤں کاتگنور میں ہے ہمارے یہاں ہندو مسلم جھگڑے کبھی نہیں ہوتے"۔

وہ غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا:۔"میں آپ کی بات مانتا ہوں۔ لیکن مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا کہ آپ ہندو ہیں۔ یہاں کا کوئی ہندو کسی مسلمان سے ایسی باتیں کہہ ہی نہیں سکتا۔ ان کی نظر میں تو ہم ہندوستان کے تمدن پر بدنما داغ ہیں۔ ہمیں ہر جگہ اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔"

اس کی باتوں میں ایک کرب تھا، ایمان داری اور دیانت کا جذبہ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"حمید خاں۔ اس چارپائی پر جو صاحب لیٹے ہیں وہ میرے والد ہیں۔ آپ دس منٹ انتظار کیجیے، ابھی گوشت تیار ہوا جاتا ہے۔" اتنا کہنے کے بعد اس نے آواز لگائی:

"عبدل۔"

عبدل اس لڑکے کا نام تھا جو آنگن میں مرچیں سکھا رہا تھا۔ وہ فوراً اندر آیا۔ حمید نے اس سے پشتو میں کچھ کہا اور وہ فوراً دکان کے پیچھے چلا گیا۔ اس کے بعد حمید خاں میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"میرے بھائی! بے یقینی جہاں ہے وہاں شیطان رہتا ہے۔ پیار کو آپ جبراً خرید نہیں سکتے۔ بھیک مانگ کر بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ یہاں چلے آئے آپ۔ اب اس پیار اور بھروسے کا ردّعمل میرے دل پر بھلا کیسے نہ ہوگا۔ ہر ہندو بھائی ہر مسلمان بھائی کو اسی طرح پیار کرے تو کتنا اچھا ہو۔" اتنا کہہ کر حمید خاں نے آخری روٹی سینک کر رکھ دی اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔

تب تک عبدل ایک تھالی میں چاول لے آیا اور میرے سامنے رکھ دیے۔ حمید میاں نے تین چار روٹیاں تھالی میں رکھ دیں۔ ایک پیالے میں کچھ گوشت بھی تھا۔ لڑکا گلاس میں پانی لے آیا۔

میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے میں نے حمید سے پوچھا:

"بھائی صاحب! پیسے کتنے ہوئے؟"

اس نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بھائی معاف کرنا مجھے پیسے نہیں چاہئیں، آپ میرے مہمان ہیں۔"

ایک روپیہ کا نوٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔ "یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ ٹھہرے دکان دار۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پیسے ضرور لے لیں۔"

ایک لمحے کے لیے اس نے مجھے دیکھا۔ پھر ایک روپے کا نوٹ لے لیا اور پھر فوراً ہی اسے میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا:

"بھائی! میں نے آپ کی بات تو مان لی۔ میں نے اپنی چیز کا دام لے لیا۔ اب آپ اسے میری طرف سے اپنے پاس رکھیں اور جب مالابار پہونچیں تو کسی مسلم ہوٹل میں بریانی کھا لیجیے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ کو تکشلا کے بھائی حمید خاں کی یاد آئے۔ بس۔"

حمید نے ایک بچے کی طرح مجھے گلے لگایا۔ پھر اس نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ میں اس لمحے ایک عجیب سی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ کتنا خوش گوار لمحہ تھا وہ ـــــــ!!

آج میں دوبارہ تکشلا کے کھنڈروں کی جانب بڑھا۔ لیکن اس مرتبہ میں حمید خاں کو نہ دیکھ سکا۔ "تکشلا کے بھائی حمید خاں کو یاد کرنا۔" یہ الفاظ اور اس کی ہنسی میرے ذہن میں گونج رہی ہے۔ میں آج بھی برابر تمنا کر رہا ہوں کہ تکشلا کے فرقہ وارانہ فساد کی آگ سے میرے حمید خاں محفوظ رہیں۔ اور ان کی وہ دکان بھی محفوظ رہے جس نے مجھے گرمی میں راحت پہونچائی، کھانا کھلایا اور مجھے ایک عزت دی۔

□□

غزل

ظفر اقبال ظفر

۱۰۰۔ تحصیلدار
فتح پور

آج کا شخص ہے مٹی کے گھروندے کی طرح
روز بنتا ہے بگڑتا ہے کھلونے کی طرح

جانے یہ کیسا تعلق ہے کوئی نام نہیں
اک خلش سی ہر دل و ذہن میں کانٹے کی طرح

ہم میں پوشیدہ ہیں تاریخ کے اوراق مگر
پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہیں فسانے کی طرح

میں تو سمجھا تھا کوئی پھول سا لہجہ ہوگا
لفظ کانوں میں پگھلتے رہے سیسے کی طرح

لے کے ہر صبح نئے خواب میں اٹھتا ہوں ظفر
ٹوٹ جاتا ہوں مگر شام کو وعدے کی طرح

رشید قریشی

۳۰۔ محمد علی لین۔ امین آباد
لکھنؤ

راتوں کے اندھیروں کی قسم جاگ رہے ہیں
اے اہلِ ستم اہلِ قلم جاگ رہے ہیں

کچھ بات ہوئی ہے کہ ہمیں سوئے ہوئے ہیں
حالانکہ ابھی دیر و حرم جاگ رہے ہیں

جس راہ سے جی چاہے سفر شرط ہے یارو
ہر راہ میں کچھ نقشِ قدم جاگ رہے ہیں

یہ کیسا دوراہا ہے ہمیں خود نہیں معلوم
ہم سوئے ہیں اور دیدۂ نم جاگ رہے ہیں

تقدیر رشید اپنی جداگانہ لکھی ہے
میرے لیے دنیا کے الم جاگ رہے ہیں

محمد مشتاق شارق

۵۶۔ کوٹلا،
میرٹھ

آنکھوں سے لہو بن کے بکھرنے کیلئے تھے
وہ حادثے جو دل پہ گزرنے کے لیئے تھے

وہ لوگ فقط عمرِ ابد کے تھے سزاوار
جو وقت کی مٹھی میں ٹھہرنے کے لیے تھے

اک آس بھی جو دل کو سنبھالے رہی ورنہ
جو خواب بھی دیکھے وہ بکھرنے کے لیے تھے

کانٹوں کو لہو بخشا نہ پھولوں کو سنوارا
یہ کام تو فن کار کے کرنے کے لیے تھے

جینے کے لیے بھی تھی سلیقے کی ضرورت
آیا نہ جنھیں جینا وہ مرنے کے لیے تھے

شارق جنھیں فن کار نے سینچا تھا لہو سے
وہ پھول بہر رنگ سنورنے کے لیے تھے

صادق ہدایت
ترجمہ: نیّر مسعود
"ادبستان" دین دیال روڈ
لکھنؤ

ایرانی افسانہ

فرانسیسی قیدی

میرا قیام بیزانسن میں تھا۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ میرا ملازم مکھا نیلا ایپرن باندھے جھاڑ دلگا رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے میز پر سے ایک کتاب اٹھائی جو جنگ کے بارے میں تھی اور حال ہی میں جرمن سے ترجمہ ہوئی تھی۔ کہنے لگا:

"آپ یہ کتاب مجھے پڑھنے کو دے سکتے ہیں۔؟"

میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا:

"یہ بھلا تمھارے کس کام کی؟ کوئی ناول تھوڑی ہے۔"

اس نے جواب دیا:

"مجھے پتہ ہے صاحب۔ لیکن آخر میں بھی تو لڑائی پر گیا تھا۔ مجھ کو بشوں نے پکڑ لیا تھا۔"

فرانسیسی میں جرمنوں کو حقارت کے طور پر بُش کہتے ہیں۔ میں نے جرمنوں کی بدسلوکیوں کی بہت سی جھوٹی سچی داستانیں سُن رکھی تھیں اس لیے مجھے گُدگُدی سی ہوئی۔ سوچا اس سے کچھ اگلوایا جائے۔ پھر خیال آیا یہ بھی چھوٹتے ہی جرمنوں کو لاکھوں مغلظات سُنا کر رکھ دے گا۔

خیر، میں نے پوچھا:

"کیا واقعی بشوں نے تم لوگوں کے ساتھ بہت بُرا برتاؤ کیا تھا ذرا اپنے قید ہونے کا حال تو سناؤ۔"

میری پرسش نے اس کے زخموں کو چھیڑ دیا۔ اس نے مجھے اپنی داستان سنائی:

"میں دو برس جرمنی میں قید رہا۔ مجھے بھرتی ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ ننسی کے قریب جھڑپ ہو گئی۔ ہم کوئی تین سو آدمی رہے ہوں گے۔ جرمنوں نے ہمیں گھیر لیا اور لگے ہوائی فائر کرنے ہم سے کچھ بن نہیں پڑا۔ مقابلہ تو کر ہی نہیں سکتے تھے۔ آخر سب نے بندوقیں پھینک پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ کچھ جرمن سپاہی آگے بڑھے اور ان میں سے ایک نے فرانسیسی میں کہا:

"تم لوگ قسمت کے اچھے رہے کہ تمھارے لیے تو لڑائی ختم ہو گئی۔ ہمارا بھی بہت جی چاہتا تھا کہ تمھاری جگہ ہم ہوتے۔"

اس کے بعد انھوں نے ہماری تلاشی لے کر سارے ہتھیار رکھوا لیے اور ہمیں الگ الگ ٹولیوں میں پہرے داروں کے ساتھ روانہ کر دیا ہم میں کچھ زخمی بھی تھے ان کو اسپتال بھیج دیا گیا۔ دو دن کے سفر کے بعد مجھے اور ایک اور فرانسیسی کو بیمار روسی قیدیوں کے وارڈ میں سنتری بنا دیا گیا، لیکن یہ کام بڑا گھناؤنا تھا۔ بیمار زمین پر تھوکتے تھے کتے بہت تھے۔ میں نے کہا، مجھے کوئی اور کام دیا جائے، اور انھوں نے منظور بھی کر لیا۔ اب مجھے کو ان کے پاس کے ایک گاؤں میں کھیتی باڑی پر لگا دیا گیا۔ میرا وہ ساتھی بھی وہیں بھیج دیا گیا۔ ہم صبح چھ بجے اٹھ کر گھڑسال میں کام کرتے گھوڑوں پر کھریرا پھیرتے۔ پھر آلو کے کھیتوں میں لگ جاتے۔ ہمارا اصل کام کھیتی باڑی ہی کا تھا۔ وہیں میں نے اور میرے دوست نے بھاگنے کی سوچی۔ دو رات، دو دن اِدھر سے اُدھر پیدل مارے مارے پھرتے رہے۔ سوچا تھا ہالینڈ ہوتے ہوئے فرانس نکل جائیں گے۔ زیادہ تر رات ہی رات چلتے تھے۔ بدقسمتی سے جرمن زبان بھی نہیں آتی تھی۔ میرے کان تُش سے تھے، میں تو کچھ لفظوں کے آگے جانتا ہی نہ تھا، البتہ

میرے دوست کو مجھ سے اچھی آتی تھی۔ غرض یہ کہ ہم دھر لیے گئے۔ اب بدلی کر کے ہم کو کھنی جرمنی بھیج دیا گیا ....."

"اور سزا نہیں دی گئی ۔ ؟"

"کہیں بھی نہیں۔ بس دھمکایا گیا کہ اگر پھر یہ حرکت کی تو باہر نکلنا بند کر کے ٹیڑھے کاموں پر لگا دیے جاؤ گے۔ لیکن کام ہمارا وہی کھیتی باڑی کا رہا، جگہ بھی پہلے سے اچھی ہی ملی۔ وہاں ہم چھوکریوں کے ساتھ عیش کرتے تھے۔ دن کے وقت جب ہم کھیت میں کام کرتے تب تو تھوڑی تھوڑی دور پر سنتری کھڑے رہتے تھے کہ کوئی قیدی بھاگ نہ نکلے، لیکن رات کو ہم چپکے سے باہر کھسک لیتے تھے۔ میرے دوست نے تو ایک عورت کے پیٹ میں بچہ بھی چھوڑ دیا۔ ہمارے سینوں پر نمبر کڑھے ہوئے تھے، ان پر ہم سفید رومال ٹانک لیتے اور ہر رات آٹھ بجے کھیتوں سے باہر آجاتے۔ ملاقاتوں کا ٹھکانا ریلوے اسٹیشن کے پاس بنا رکھا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ ہم کو ان لڑکیوں کی زبان نہیں آتی تھی ۔ میری آشنا کے بال سنہرے تھے۔ میں اس کو بہت پیار کرنے لگا تھا اور کسی بھی وقت وہ میرے دھیان سے نہیں اترتی تھی۔ آخر یاروں نے تاڑ لیا اور ہماری شکایت جڑ دی۔ ہم بھی ایک دو رات باہر نہیں نکلے۔ پھر ہم نے ملاقاتوں کی جگہ بدل دی ......"

"تو آخر جرمنوں نے تمھارے ساتھ برائی کیا کی ؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ہم اپنا کام پکا کرتے تھے، اس لیے وہ بھی ہم سے راضی تھے اور ہمارے مطلب سے مطلب بھی نہیں رکھتے تھے۔ ہاں دو تین بار یہ ضرور ہوا کہ انھوں نے ہمارے خط نہیں پہونچائے۔"

"کیسے خط ؟"

"خطوں کی ادلا بدلی ہوئے جارہی تھی نا ؛ جرمن قیدیوں کے ناتیوں کے خط فرانیسی وصول کرتے تھے، اسی طرح فرانسیسیوں کے خط جرمن وصول کرتے تھے اور ایک دوسرے کو پہونچا دیتے تھے۔"

"پھر کیا بات ہو گئی ؟"

"ان کا کہنا تھا کہ فرانس میں جو جرمن افسر گرفتار ہوئے ہیں انھیں فرانسیسیوں نے الجیریا بھیج دیا ہے اور وہاں ان سے کڑی محنت کرائی جاتی ہے اور دوسرے جرمن قیدیوں کے ساتھ بھی برا برتاؤ ہو رہا ہے۔ اس لیے جرمنوں نے بھی ہمارے خط روک لیے۔ مگر خیر، جب ہم نے سنا کہ جرمنی کی ہار ہو گئی اور ہماری فرانس واپسی پکی ہو گئی ہے تو خوب خیل مچائے۔ اب کس کی مجال تھی کہ ہم سے بولتا۔ جو ریل گاڑی ہم کو فرانس لا رہی تھی اس کے ڈبے پر ہم نے قیصر ولیم کی تصویر بنا دی تھی، اس کا بدن سور کا بنایا تھا اور نیچے لکھا تھا "جرمنی مردہ باد"۔ اس پر ان لوگوں نے ریل روک لی اور ..... بس، بلوا ہوتے ہوتے رہ گیا۔"

قریب آدھے گھنٹے تک اپنی اسیری کی روداد بیان کرنے کے بعد اس نے ایک آہ بھری اور بولا :

"میری زندگی کے سب سے اچھے دن وہی تھے جب میں جرمنی میں قید تھا۔"

پھر اس نے جھاڑو اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

□□

غالب : جیوان ظریف ... ص۱۱ کا بقیہ

اور دل کشی نہ رہ جائے گی جس نے انھیں غالب اور چچا غالب بنا دیا۔

راوی ۲: یہ تو نہیں معلوم کہ خلد میں رضواں کے ساتھ ان کی کیسی گزری اور یہ کہ جب خواب اور خیال کا ایک دوسرے سے سامنا ہوا تو حقیقت نے اپنی حقیقت ان پر کس طرح ظاہر کی لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ ہماری دنیا کو رشکِ بہشت بنانے میں غالب کا حصہ کسی سے کم نہیں۔

آواز: ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر ایک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

□□

نائلہ حسین کوثر
۸۸/۳۹۶ چمن گنج،
کان پور

افسانہ

ایکشن ری پلے

انیس خان کے نام

"اُف یہ کم بخت سردی بڑھتی چلی جارہی ہے"۔۔۔ آرٹ گیلری کا بڈھا دربان دانت پر دانت جماکر بڑبڑایا۔ "نہ جانے کتنوں کو مارے گی ....."

دربان نے آرٹ گیلری کی شیشہ دار کھڑکیوں کے باہر نظر دوڑاتے ہوئے ایک زوردار چھینک ماری اور اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر "الحمدللہ" نکل گیا۔ اچانک ہی اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ شاید اسے ایسے واہیات موسم میں اللہ کا شکر ادا کرنا اسے اچھا نہیں لگا۔ پھر اسے اپنے کفری خیال پر ندامت ہوئی اور اس نے سر ہلاکر ہاتھوں کے اشارہ سے توبہ بھی کر ڈالی۔ اب وہ پھر باہر کا جائزہ لینے لگا۔

کھڑکی کے باہر کا سارا شہر جاگ رہا تھا۔ اگرچہ ہمالیہ پر زبردست برف باری کے بعد میدانی علاقہ کا یہ شہر بھی "سرد لہر" سے خاصہ متاثر ہوا تھا لیکن لوگوں کے معمولات کسی نہ کسی طور پر جاری تھے۔ سائیکل رکشہ، کار، بس اور پیدل چلنے والے سب لوگ معمول کے مطابق چل رہے تھے لیکن انھوں نے خود کو گرم کپڑوں سے لپیٹ رکھا تھا۔ سرسراتی ہوئی برفیلی ہوا سے کان کو محفوظ رکھنے کے لیے مفلر اور اونی ٹوپیوں کی فروخت بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک پرانی اور سکنڈ ہینڈ جنگلہ دیشی ٹوپی دربان کے سر پر بھی منڈھی تھی۔

"کون آئے گا، اس کڑاکے کی ٹھنڈ میں یہاں" بیڑی کا کش لیتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑایا۔۔۔ اس آرٹ گیلری کے گڑے مُردوں کی صورتیں دیکھنے کی زحمت کون کرے گا؟ لوگوں کو خود ہی اپنی جان کے لالے پڑے ہیں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ خراب موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے منتظمین کچھ دنوں کے لیے یہ تماشہ بند کر دیتے اور مجھے سکون کے چند لمحے میسر آتے چھٹیاں ملتے ہی میں لحاف میں منہ ڈال کر پڑ جاتا۔ میری نواسی روشنی اپنی میدے جیسی نرم نرم انگلیوں سے میرے سر پر مالش کرتی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے میرے لیے گرما گرم چائے بنا کر لاتی۔۔۔ کتنی اچھی ہے میری لاڈو۔ میری راج دلاری۔ میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ اس کی شکل تو اس شہزادی سے مشابہہ ہے جسے آرٹ گیلری کی سب سے خوبصورت تصویر سمجھ کر لوگ بہت دیر تک دیکھا کرتے ہیں۔ ویسے، وہ تصویر ہے ہی ایسی کہ اسے آدمی دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو بھی بھول بیٹھتا ہے۔۔۔ ایک معصوم سی نوعمر شہزادی ..... جو کسی گہری سوچ میں ڈوب کر یہ بھول بیٹھی کہ کاندھے پر بیٹھا کبوتر اس کے کان کے آویزے پر چونچ مارنا ہی چاہتا ہے۔ دیکھنے والوں کو یہ گمان گزرتا ہے کہ بس اگلے ہی لمحے کبوتر شہزادی کے آویزے پر چونچ مار ہی دے گا..... میری روشنی .... ہاں میری روشنی بھی ایسی ہی خوبصورت ہے۔ وہ معصوم بھی ہے اور سمجھدار بھی۔ کتنی محنت کرتی ہے بیچاری۔ اپنی ماں کے ساتھ چکن کے کرتے اور ٹوپیاں بنانے کا کام ابھی سے کرنے لگی ہے۔

مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ عربی بہت روانی سے پڑھتی ہے اب اس کا داخلہ کسی اچھے سے اسکول میں کرادینا چاہیے۔ لیکن — اس جدید دور کی مہنگی تعلیم کے اخراجات .... کون اٹھاتا..... وہ معصوم گڑیا ابھی حالات اور اپنے باپ کی ناوقت موت کے احساس سے ناواقف ہے۔ لیکن اس ننھی سی جان نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا اور اپنی بوڑھی ہوتی ہوئی ماں کے ہاتھ سے ہاتھ ملالیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ جوان ہو جائے گی اور مجھے اس کی شادی وغیرہ کرنا ہوگی۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں لیکن جو پیدا کرتا ہے وہ حالات سے نپٹنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ انشاء اللہ — میری شہزادی کا ڈولا بھی شان سے اٹھے گا۔

"دربان چاچا!" اچانک چائے والے نیپالی لڑکے کی آواز نے اس کی سوچ کی لہروں کو منتشر کر دیا — "تم چا بولا تھا۔ ؟"

"ہاں بہادر۔" دربان بے صبری سے بولا — "لاؤ۔ خوب گرماگرم مجھے ہر گھنٹے پر بغیر کہے سنے چائے لاکر دیتے رہنا۔"

"آج تمہارے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" اس نے چائے کا بھاپ نکلتا ہوا گلاس دربان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا — "تم کو سب تصویریں خود دیکھنا پڑیں گی۔"

"چولھے بھاڑ میں گئیں تصویریں۔" دربان نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ "میں تو وقت گزار رہا ہوں۔ ڈیوٹی ختم ہوتے ہی گھر بھاگوں گا۔"

گرماگرم چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے دور کھڑکی کے شیشوں کے پار کلاک ٹاور پر دربان کی نظریں جم گئیں — گھڑی کی سوئیاں زمانے کے سرد و گرم سے بے پروا اپنے کام میں مشغول تھیں اور اب تک دربان کی ڈیوٹی کے تقریباً تین گھنٹے پورے ہو چکے تھے۔ نیچے سڑک پر ایک جلوس گزر رہا تھا۔ مظاہرین ہاتھوں میں تختیاں، بانسوں سے لپٹے بینرز اور جھنڈے تانے چل رہے تھے بھانت بھانت کے نعروں سے فضا میں گرمی آگئی تھی اور اسی بہانے لوگوں کو ٹھنڈ سے بچتے ہوئے ہاتھ پیر ہلانے اور "انقلاب۔ زندہ باد" کرنے کا موقع ہاتھ لگ گیا تھا۔

"الو کہیں کے۔" دربان نے چائے کا گلاس خالی کر کے جیب میں بیڑی ٹٹولتے ہوئے ایک لمبی سانس کھینچی۔ میں نے بھی بہت نعرے لگائے اور کیا میں کسی سے کم انقلابی تھا۔ مگر ٹھوکریں کھائیں .... دھکے اور لاٹھیاں جھیلیں .... لیکن کیا ملا مجھے؟ وہی موت کا پچھلواڑا میں۔۔ اونچ نیچ کا خاتمہ دیوانے کی بڑ اور مساوات محض ایک خواب ہے — جاگتی آنکھوں کا خواب — امیری اور غریبی کے درمیان موجود خلیجوں کا پٹنا ناممکن ہے۔ استحصال کا دیو ہمیشہ پوری طاقت کے ساتھ زندہ رہا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگانے والے کیڑوں کا خون چوس چوس کر روز فربہ ہوتا رہے گا۔ حرامزادہ — دیکھتے ہی دیکھتے میرے بیٹے کو نگل گیا۔ کام کرتے کرتے اسے ٹی۔ بی ہوگئی اور اس نے خون تھوکنا شروع کردیا۔ مگر یہ بے رحم نہیں پسیجا۔ اس غریب کو نگل کر ہی اس کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔ کم بخت۔ اب اس کی نظر میری بہو اور معصوم نواسی روشنی پر ہے مگر میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔

"ہاں — میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" وہ پیر پٹخ کر کھڑا ہوگیا۔ گرماگرم چائے نے اس کی یخ بستہ رگوں میں گرمی دوڑادی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم شہزادی کی تصویر کی طرف اٹھ گئے۔ آخر اس ننھی سی جان کو کون سا روگ لگ گیا ہے۔ کیوں اتنی اداس ہے یہ شہزادی۔ کیا سوچتی رہتی ہے؟ پھر وہ دوسری تصویروں کا جائزہ لینے لگا۔ تمام تصویریں اس کی متعدد بار کی دیکھی ہوئی تھیں اور ہر منظر سے اس کی پرانی پہچان تھی — میدان جنگ میں دست و گریباں دو فوجیں۔ مسند انصاف پر متمکن شہنشاہ اور اس کے سامنے لگا ہوا دربار عام وزن دار پتھروں کے بوجھ سے جھکا ہوا مزدور۔ کمر کے بل پڑا اور بجھی بجھی آنکھوں سے آسمان کو تکتا ہوا لاغر سا بچہ۔ موسیقی کے اسرار کا اظہار کرنے والا موسیقار۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا اور ہاتھوں میں قلم اٹھائے ہوئے ایک مدقوق ادیب۔

"سب مرے ہوئے لوگ ہیں یہ۔" اس کا تخاطب غالباً اپنے آپ سے تھا۔ شاید اس طرح بڑبڑا کر وہ اپنے اندر گھسی ہوئی سردی کو بھگانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کی نظر کھڑکی سے باہر کلاک ٹاور پر جم گئی —

"ایں! یہ کیا ہوا؟ کیا گھڑی کی مشین بھی سردی سے جم گئی؟"

وہ حیرت سے گھڑی کی غیر متحرک سوئیوں کو دیکھتا رہ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل جب اس نے گھڑی دیکھی تھی تو اس وقت ایک بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے اور ابھی بھی وہی وقت نظر آرہا ہے۔ یہ گھڑی تو ہمیشہ پابندی کے ساتھ چلتی رہی ہے۔ اپنی طویل مدت ملازمت میں کبھی اسے بند ہوتے نہیں دیکھا..... تو پھر آج اسے کیا ہو گیا۔ بھلا سردی سے گھڑی کی مشین کیوں جمے گی۔ سردی گرمی تو جانداروں کے لیے ہے۔ موسمی تغیرات سے مشینوں کو کیا لینا دینا ــ دربان نے گردن کو جنبش دے کر اپنی نظریں سڑک پر گاڑ دیں۔ وہ اچھل پڑا۔ اس کا چونکنا قطعی غیر فطری نہیں تھا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، وہ کسی کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھا۔

اگرچہ کاروبارِ دنیا معمول کے مطابق ہی چل رہا تھا لیکن لحظہ بہ لحظہ اس کی رفتار مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ دھیرے دھیرے وقت کی گردش سست پڑتی جا رہی تھی اور سارا منظر خوابناک ہو گیا ہے۔ دربان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور محویت کے عالم میں پلک جھپکائے بغیر وہ سارا کھیل تماشہ دیکھنے لگا۔ سڑک پر دوڑنے والا ٹریفک اور فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگ ..... سب کچھ دھوئیں کے سمندر میں تیر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے کسی منظر کو دوبارہ آہستہ آہستہ دکھایا جا رہا ہے۔ ایکشن ری پلے شروع ہو گیا ہے یا کسی فلم کا کوئی ایکشن زدہ منظر یا خواب ناک رومانٹک سین مروجہ رفتار سے کم رفتار میں پیش کر کے کیمرہ مین اپنی مہارت کا مظاہرہ کر رہا ہے ــ اس نے پھر کلاک ٹاور کو دیکھا۔ ابھی بھی اس میں ایک بج کر پینتالیس منٹ کا وقت نظر آرہا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دربان نے کھڑکی کھولی۔ سرد ہوا کے زوردار جھکڑ نے اس کے چہرے پر زناٹے دار طمانچہ جڑ دیا۔

"او بہادر ــ!" دربان نے پوری قوت کے ساتھ چائے والے کو آواز دی۔ "چائے لا جلدی۔" یہ کہہ کر اس نے جھٹکے کے ساتھ کھڑکی بند کر لی۔

"دھم" کی زوردار آواز کے ساتھ کھڑکی کے کواڑ بند ہوتے ہی آرٹ گیلری میں ایک لرزہ دار گونج دیر تک تھرتھراتی رہی اور پھر دھیرے دھیرے گم ہوتی ہوئی بھیانک گونج کے پس منظر سے عجیب سا شور ابھرنے لگا۔ دربان نے گھبرا کر دحشت زدہ آنکھوں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر اس کی گگھی بندھ گئی کہ آرٹ گیلری میں لگی ہوئی تمام تصویروں میں جان پڑ گئی ہے اور وہ سب بھی ایکشن ری پلے (Action re Play) اسٹائل میں متحرک ہو چلی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ جنگ میں بھڑی ہوئی فوجوں کے درمیان مارکاٹ شروع ہو گئی۔ پتھروں کے بوجھ سے دبے ہوئے مزدور نے کمر سیدھی کر کے سینہ تان لیا۔ کمزور اور مریل بچے کی بجھی ہوئی آنکھوں میں یکایک بے پناہ چمک عود کر آئی اور اس کے مریل بدن کے گڑھے گوشت سے پُر ہونے لگے۔ معصوم شہزادی کے چہرے سے تفکر کی پرتیں اترنے لگیں اور غٹرغوں کرتا ہوا دودھیا کبوتر اڑنے کے لیے پر پھڑپھڑانے لگا۔ متفکر ادیب کے مرجھائے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ رینگنے لگی گویا اسے کسی کہانی کا خوش گوار انجام مل گیا ہو۔ موسیقار نے مسرت کی راگنی چھیڑ دی۔ اور دربارِ عام میں مسندِ انصاف پر جلوہ افروز شہنشاہ نے فیصلہ سنانا شروع کر دیا ــ استحصال امیری، غریبی اور انسانوں کے درمیان پھیلی تمام تفریق و امتیاز کے خاتمے کا فیصلہ ـــــ دربار میں موجود رعایا نے "مرحبا" اور "سبحان اللہ" کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔

یہ دیکھ کر دربان نے بھی اپنی لڑکھڑاتی اور کپکپاتی ہوئی زبان سے پوری قوت کے ساتھ خدا کی عظمت اور اس کی حاکمیت کا اعلان شروع کر دیا اور اس کا سر بے ساختہ سجدۂ شکر میں جھکتا چلا گیا۔

"جی ہاں!" مردہ گھر کے انچارج نے بوڑھے دربان کی لاش اس کی بیوہ بہو کے حوالے کرتے ہوئے کہا ــ ان کی موت سردی سے اکڑ جانے کے باعث گزشتہ روز ایک اور دو بجے دن کے درمیان واقع ہوئی تھی ــ اب آپ ان کی لاش تدفین کے لیے لے جا سکتی ہیں۔"

□□

محمد اسحاق صدیقی
A-5 گوشن تالاب
لکھنؤ

شیر: کہانیاں اور حقائق

ماہرین حیوانات کا کہنا ہے کہ شیر کا اصلی وطن شمالی ایشیا ہے۔ چنانچہ شیر کے قدیم ترین پتھرائے ہوئے ڈھانچے دائرہ قطب شمالی (ARCTIC CIRCLE) کے بعض جزیروں میں ملے ہیں۔ شیر اب بھی اموولینڈ، کوریا، مشرقی سائبیریا، منگولیا اور منچوریا میں پائے جاتے ہیں۔

عہد قبل تاریخ میں شیر شمالی اور وسطی ایشیا سے ہجرت کر کے انام، کوچین چائنا، سیام اور جزیرہ نمائے ملایا پہونچے۔ وہاں ان کی دو شاخیں ہوگئیں۔ کچھ جاوا، ساترا، بورنیو اور بالی میں جا بسے اور کچھ آسام کے پہاڑوں سے ہو کر ہندستان میں داخل ہوگئے۔ پہلے وہ ہمالیہ کے نشیبی جنگلوں میں بسے اور پھر ملک کے بیشتر حصوں میں پھیل گئے۔

مسکن

ایشیا میں شیر کی چھ نسلیں پائی جاتی ہیں۔ ہندستانی نسل ہمالیہ سے راس کماری تک پائی جاتی ہے۔ مشرق میں یہ نسل برما تک پھیلی ہوئی ہے۔ شیر راجستھان، پنجاب، کچھ اور سندھ کے ریگستانوں میں نہیں ہوتا۔ شیر جنوبی ہند کے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لنکا ہندستان سے جڑا ہوا تھا۔ پھر جب دونوں کو جوڑنے والا خشکی کا خطہ سمندر میں ڈوب گیا تب دونوں الگ ہوگئے۔ اس لیے شیر کو لنکا پہونچنے کا موقع نہ ملا۔ افریقہ، آسٹریلیا، شمالی اور جنوبی امریکا میں شیر نہیں ہوتے۔

ہمالیہ میں جاڑے کی برف میں شیر کے قدموں کے نشان ۳.۵ میٹر (۱۰،۰۰۰ فٹ) کی بلندی تک ملتے ہیں۔ اس نے اپنے کو ہندستان کی متنوع آب و ہوا کے مطابق بنا لیا ہے۔ برف پوش ہمالیہ کے علاوہ وہ مرطوب سدا بہار جنگلوں میں خشک آب و ہوا والے کھلے جنگلوں میں ترائی کی گھاس والی دلدلوں میں اور سندربن میں درختوں، کیچڑ اور پانی سے ڈھکے خطوں میں پایا جاتا ہے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہزارہا سال تک ہندستان کی گرم آب و ہوا میں رہنے کے باوجود شیر کو اب بھی گرمی کی تاب نہیں۔ گرمی سے بچنے کے لیے وہ غار یا درختوں کے جھنڈ میں پناہ لیتا ہے۔ دوپہر کو پانی میں جا کر آرام کرتا ہے۔

جسامت

شیر کی لمبائی ۳۰۰ سنٹی میٹر (۱۰ فٹ) سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اوسطاً ۲۷۵ سے لے کر ۲۹۰ سنٹی میٹر (۹ فٹ سے لے کر ۹½ فٹ تک) ہوتی ہے مادہ کی ناپ ۲۶۰ سنٹی میٹر (۸½ فٹ) ہوتی ہے۔ شیر کا قد ایک میٹر سے کچھ زیادہ اونچا ہوتا ہے۔ نر کا وزن اوسطاً ۱۸۰ سے ۲۳۰ کلو (۴۰۰-۵۰۰ پونڈ) تک ہوتا ہے۔ مادہ کا وزن نر سے تقریباً ۴۵ کلو (۱۰۰ پونڈ) کم ہوتا ہے۔ ہمالیہ کا شیر مدھیہ پردیش اور جنوبی ہند کے شیروں سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا ہے۔

رنگ-روپ

شیر کی کھال کا رنگ چمک دار بادامی ہوتا ہے۔ مادہ کا رنگ نر سے زیادہ چمکیلا ہوتا ہے۔ کھال پر کالے رنگ کی آڑی ترچھی دھاریاں ہوتی ہیں۔

یہ دھاریاں ریڑھ کی ہڈی سے پیٹ تک ہر پہلو میں اوپر سے نیچے کی طرف جاتی ہیں اور نامکمل ہوتی ہیں۔ بدن کے پچھلے حصے میں ان کا رنگ ہلکا ہوتا ہے بدن کے اگلے حصے میں دھاریاں کم ہوتی ہیں۔ سینہ اور پیٹ سفید ہوتا ہے۔ عمر رسیدہ ہونے پر دھاریاں کچھ ہلکی پڑ جاتی ہیں اور ان کا باہمی فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔

شیر کے جسم کے بال چھوٹے ہوتے ہیں۔ سردی کے موسم میں اس کے بال زیادہ گھنے ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جاڑے میں شیر زیادہ شاندار نظر آتا ہے۔ گرمی آتے ہی اس کے بال جھڑنے لگتے ہیں اور دھاریوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔

شیر کی مونچھیں سفید اور سخت ہوتی ہیں۔ چہرے کا کافی حصہ سفید ہوتا ہے۔ کانوں کے کنارے کالے ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے سفید دھبے ہوتے ہیں۔ بادامی دم پر کالے رنگ کے گنڈے ہوتے ہیں۔

شیر کا بادامی رنگ اور کالی دھاریاں اسے جنگل میں چھپ کر شکار کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ درختوں خصوصاً بانس اور لمبی سوکھی گھاس کے درمیان وہ مشکل سے نظر آتا ہے۔

جسمانی خصوصیات

شیر عام طور پر رات کو شکار کرتا ہے۔ اندھیرے میں اس کی گول پتلیاں کافی پھیل جاتی ہیں جس کی وجہ سے اسے صاف نظر آتا ہے۔ اندھیرے میں روشنی پڑنے پر اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں۔ دن کی تیز روشنی میں پتلیاں سکڑ جاتی ہیں۔

شیر کے کان کافی تیز ہوتے ہیں۔ وہ ہلکی سے ہلکی آواز سن لیتا ہے۔ اس کی سونگھنے کی قوت بھی تیز ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ اندھیرے میں اپنے شکار کا پتہ لگا لیتا ہے۔

شیر کے اگلے پنجے پچھلے پنجوں کے مقابلہ میں زیادہ بھاری زیادہ گول لیکن چھوٹے ہوتے ہیں۔ اسی لیے چلتے وقت کبھی کبھی اس کے پچھلے پنجوں کے نشان اگلے پنجوں کے نشانات کو ڈھک لیتے ہیں اور پاؤں کے صرف دو نشان نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے شکاریوں کو اس کا سراغ لگانے میں پریشانی ہوتی ہے۔ شیر اپنی انگلیوں کے بل چلتا ہے۔ چلتے وقت اپنے تلوے اور ایڑیاں زمین سے اوپر اٹھاتا ہے۔ وہ ایک قدم میں ایک میٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ پنجوں کے نشانات سے شیر کے قد و قامت اور جنس کا پتہ لگنے میں مدد ملتی ہے۔

شیر کے اگلے پنجے میں پانچ ناخن ہوتے ہیں اور پچھلے پنجے میں چار۔ بلی کی طرح شیر کے ناخن بھی پاؤں کی نرم گدیوں میں چھپے رہتے ہیں، جنھیں وہ ضرورت پڑنے پر باہر نکال لیتا ہے۔ فرصت میں وہ انھیں پیڑ کی چھال پر تیز کرتا رہتا ہے۔

شیر کی زبان کھردری ہوتی ہے جس سے ہڈیوں پر سے گوشت کو کھرچنے میں مدد ملتی ہے۔ علی الصبح اور شام کے وقت وہ اپنی زبان سے اپنے پنجوں، سینے اور پیٹھ کے بال چاٹ کر جسم کی صفائی کرتا ہے۔

وہ اپنی دم کو دائیں بائیں ہلاتا رہتا ہے لیکن خوشی اور غصے کی حالت میں اس کی دم تن جاتی ہے۔

اس کے جسم سے ایک خاص قسم کی بو آتی ہے جس کی وجہ سے جنگلی جانوروں کو اس کی آمد کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ بھاگ نکلتے ہیں۔

عادتیں

شیر ایک تنہائی پسند جانور ہے۔ وہ تنہا شکار کرتا ہے۔ جنگل کے ایک حصے میں ایک ہی شیر رہتا ہے۔ جب تک وہ بھوکا نہ ہو کسی جانور کو نہیں مارتا۔ وہ چھ دن سے زیادہ بغیر کھائے نہیں رہ سکتا۔

شیر عام طور پر چپ رہتا ہے۔ جب وہ جوڑا بنا کر رہنا چاہتا ہے تب اپنی مادہ کو بلانے کے لیے دہاڑتا ہے۔ شیرنی اپنے بچوں کو بلانے کے لیے آواز دیتی ہے۔

شیر شور و غل، تیز روشنی اور مجمع سے گھبراتا ہے۔ عام طور پر آگ یا ٹارچ کی روشنی سے ڈر کر بھاگ جاتا ہے۔ سفید رنگ سے بدکتا ہے۔ اگر اس کے سامنے سفید کپڑا ڈال دیا جائے تو رک جاتا ہے زخمی شیر بدلا لینے کے لیے اور بچوں والی شیرنی اپنے بچوں کو بچانے کے لیے حملہ کر دیتی ہے۔

شیر کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے:- آس پاس بڑے جانور ہوں جن کا شکار کر سکے، سونے کے لیے کافی سایہ ہو اور پانی نزدیک ہو جسے پی کر اپنی پیاس بجھا سکے۔

اسے تیز دھوپ ناپسند ہے۔ دن بھر سوتا ہے، گرمی کے موسم میں

اکثر ندی یا تالاب کے پانی میں اپنے بدن کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پڑا رہتا ہے۔ وہ آسانی سے پانی میں تیر سکتا ہے۔ بھاری بھرکم ہونے کے باوجود اس کا جسم کافی لچک دار ہوتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ آسانی سے درخت پر چڑھ جاتا ہے۔ اونچی جگہ پر رہنا پسند کرتا ہے، جہاں سے وہ آس پاس کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ سردی کے موسم میں دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ اکثر کسی چٹان پر پاؤں پھیلا کر لیٹا رہتا ہے۔

عام طور پر شیر شام سے لے کر سویرے تک شکار کرتا ہے۔ اگر موسم موافق ہو یعنی سردی، بدلی یا بارش ہو تو وہ دن میں بھی شکار کی تلاش کر سکتا ہے۔

شیر چھوٹے بڑے ہر طرح کے جانور مارتا ہے۔ عام طور پر ہرن، چیتل، چوسنگا، سانبھر، نیل گائے، بھینسا، گور، جنگلی سور، ریچھ، تیندوا اور بندر اس کا شکار ہوتے ہیں۔ موقع ملنے پر طاقت ور شیر کمزور شیر کو مار کر کھا جاتا ہے۔ ہاتھی تک پر ہاتھ صاف کر دیتا ہے (عام طور پر ہتھنی اور اس کے بچے شیر کا شکار ہوتے ہیں) جب شکار کے لیے جنگلی جانور نہیں ملتے تب وہ مویشی یا انسان مار کر کھانے لگتا ہے۔

مشہور ہے کہ شیر صرف اپنا مارا ہوا شکار کھاتا ہے لیکن یہ بات غلط ہے۔ وہ دوسرے کا مارا ہوا یا خود سے مرا ہوا جانور حتیٰ کہ کیڑے پڑی لاش تک کھا لیتا ہے۔ جب ندیوں میں باڑھ آتی ہے اور شکار کے لیے بڑے جانور نہیں ملتے تب وہ چھوٹے جانور مثلاً جنگلی مرغ، مینڈھک، مچھلیاں اور کچھوے کھا کر زندہ رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ہری گھاس کھاتا ہے شاید دوا کے طور پر۔

شیر اپنے شکار پر جھپٹتا نہیں بلکہ دبے پاؤں جا کر اسے دونوں پنجوں سے اچانک دبوچ لیتا ہے۔ وہ گردن کے پچھلے حصے یا گلے پر اپنے دانتوں سے گہرا زخم کرتا ہے اور پھر بجلی کی سی تیزی سے گردن کو اس طرح گھماتا ہے کہ گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ اپنے شکار کو بڑے سلیقے سے کھاتا ہے۔ جانور کو مارنے کے بعد وہ اسے پچھلے حصے سے کھانا شروع کرتا ہے۔ وہ گوشت اور ہڈیاں ہی نہیں بلکہ کھال اور بال تک کھا جاتا ہے۔ آنتیں البتہ نہیں کھاتا، انھیں بڑی صفائی سے الگ کر دیتا ہے۔ وہ ایک وقت میں ۲۵ سے ۳۰ کلو تک گوشت کھا لیتا ہے۔

شیر جنگلی کتوں کے غول سے ڈرتا ہے۔ گیدڑ سے نفرت کرتا ہے۔ گیدڑ اس کے پیچھے اس لالچ میں لگے رہتے ہیں کہ جب وہ شکار کرے تو انھیں اس کی چھوڑی ہوئی لاش کھانے کو مل جائے۔

بعض جانور ایسے بھی ہیں جو مجبور ہو کر شیر سے مقابلہ کرتے ہیں۔ مثلاً ہاتھی، تیندوا، جنگلی سور، جنگلی بھینسا لیکن مقابلے میں جیت اکثر و بیشتر شیر ہی کی ہوتی ہے۔

افزائشِ نسل

شیر اور شیرنی کا ملاپ برسات کے بعد ہوتا ہے۔ بچّے عموماً فروری اور مئی کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔ یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ شیر ایک ہی مادہ پر قناعت کرتا ہے۔ اکثر ایک شیر کے ساتھ ایک سے زیادہ شیرنیاں دیکھی گئی ہیں۔ اگر شیرنی ایک ہوتی ہے اور شیر دو، تو اسے حاصل کرنے کے لیے دونوں میں خونخوار جنگ ہوتی ہے۔ جو جیتتا ہے مادہ اسی کے ساتھ جوڑا بناتی ہے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد نر مادہ عام طور پر الگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی زچگی کے بعد بھی دونوں ایک ساتھ کچھ عرصہ کے لیے رہتے ہیں۔

حمل کی مدت پندرہ سولہ ہفتے بیان کی گئی ہے۔ عام طور پر ایک جھول میں دو تین اور کبھی کبھی پانچ چھ بچے ہوتے ہیں۔ بچے کا وزن پیدا ہونے پر تقریباً سوا کلو ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں پیدائش کے نویں دن کھل جاتی ہیں لیکن وہ دو ہفتے سے پہلے اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا۔ بچے کی کھال روئیں دار مٹیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ گہرا بادامی ہو جاتا ہے اور دھاریاں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔

شیرنی اپنے بچوں کو غاروں، چٹانوں اور درختوں کے کھوکھلے تنوں میں چھپا کر رکھتی ہے۔ مشہور ہے کہ شیر اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے۔ غالباً اسی لیے شیرنی اپنے بچوں کے پاس شیر کو پھٹکنے نہیں دیتی۔ ضرورت پڑنے پر وہ بلی کی طرح اپنے دانتوں سے بچوں کی گدّی کی ڈھیلی کھال کو پکڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔

جب بچّے کچھ بڑے ہو جاتے ہیں تو اپنی ماند کے آس پاس گھومتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کی دُم کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اس پر پنجے مارتے

ہیں۔ دانتوں سے پکڑتے ہیں گویا دم نہ ہو کوئی شکار ہو۔ وہ ایک دوسرے پر بھی اچھل کود کر حملہ کرتے ہیں۔ جب وہ تقریباً چھ ہفتے کے ہو جاتے ہیں تب ان کی ماں انھیں اپنے ساتھ باقاعدہ شکار پر لے جاتی ہے۔ اور شکار کے گر سکھاتی ہے۔ تربیت کے دوران وہ اپنے بچوں کو ہلکا سا تھپڑ مار کر یا غرّا کر ڈراتی دھمکاتی بھی ہے۔

پروجیکٹ ٹائگر

ملک میں شیروں کی تیزی سے گھٹتی ہوئی تعداد کے پیش نظر حکومت ہند نے ۱۹۷۰ء میں ان کے شکار پر پابندی عائد کر دی۔ ۱۹۷۲ء میں جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لیے ایک قانون پاس کیا گیا۔ نومبر ۱۹۷۲ء میں WILD LIFE BOARD کی سفارش پر حکومت ہند نے شیر کو قومی جانور قرار دیا۔ جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے بین اقوامی ادارے (WORLD WILD LIFE FUND) کی مالی امداد سے ۷۴-۷۳ء میں شیروں کے لیے ۹ جنگل محفوظ کیے گئے تھے اور اب ان کی تعداد ۱۷ تک پہونچ گئی ہے۔ یہ محفوظ جنگل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) باندی پور (کرناٹک)۔ (۲) کاربیٹ (اترپردیش)
(۳) کانہا (مدھیہ پردیش)۔ (۴) مانس (آسام)
(۵) میل گھاٹ (مہاراشٹر)۔ (۶) پالامؤ (بہار)
(۷) رن تھمبور (راجستھان) (۸) سملی پال (اڑیسہ)
(۹) سندربن (مغربی بنگال) (۱۰) پیری یر (کیرل)
(۱۱) سرسکا (راجستھان)۔ (۱۲) بکسا (مغربی بنگال)
(۱۳) اندراوتی (مدھیہ پردیش)۔ (۱۴) ناگ ارجن ساگر (آندھرا پردیش)
(۱۵) ناموا پھا (اروناچل پردیش)۔ (۱۶) دُدھوا (اترپردیش)
(۱۷) کلاکڈ منڈیر تھرئی (تمل ناڈو)

ان محفوظ جنگلوں کا مجموعی رقبہ ۲۶۶۴۳ مربع کلو میٹر ہے۔ جب شیروں کو رہنے کے لیے ایسے محفوظ جنگل ملے جہاں شکار کی کمی نہ تھی تو ان کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں مذکورہ بالا نو جنگلوں میں کل ۲۶۸ شیر تھے۔ جون ۱۹۷۷ء میں ان کی تعداد ۴۰۵ ہو گئی ۱۹۸۳ء میں شمار کیا گیا تو ان کی تعداد ۸۵۴ نکلی اور جب ۱۹۸۸ء میں گنے گئے تو معلوم ہوا کہ ان کی تعداد بڑھ کر ۱۲۱۱ تک پہونچ چکی ہے۔

اس طرح ہمارے جنگلوں کا یہ شاندار جانور نابید ہونے سے بچ گیا لیکن اس کے لیے ہمیں بھاری قیمت چکانا پڑی۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت ہر شیر کو زندہ رکھنے کے لیے حکومت ہند ساٹھ ہزار روپے سالانہ خرچ کر رہی ہے۔

محفوظ جنگلوں کے آس پاس رہنے والے انسان اور ان کے مویشی اکثر شیروں کا شکار ہوتے ہیں۔ بہت سے شیر اب بھی چوری چھپے مارے جاتے ہیں۔ ان کی کھالیں اور ہڈیاں دوسرے ملکوں میں بھاری قیمت پر فروخت کی جاتی ہیں۔ شیر کی ہڈیاں شراب بنانے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ ایسی شراب کی چین اور اس کے آس پاس کے ملکوں میں بڑی مانگ ہے۔ ہڈیوں کی قیمت کا تو علم نہیں لیکن ۱۹۸۱ء میں شیر کی کھال ۷۰۰۰ ڈالر تک فروخت ہو جاتی تھی۔

پروجیکٹ ٹائگر کی اہمیت کے پیش نظر محکمہ ڈاک نے ۲۲ر نومبر ۱۹۸۳ء کو دو روپے والا ایک خصوصی ڈاک ٹکٹ جاری کیا تھا اور اس سلسلے میں جو سوچنا پتر (اطلاع نامہ) شائع کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ ۱۹۷۲ء میں ہمارے ملک میں کل ۱۸۲۷ شیر باقی رہ گئے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں جب پورے ملک میں شیروں کا شمار کیا گیا تو ان کی تعداد ۳۰۱۵ نکلی۔ ۱۰ر فروری ۱۹۸۸ء کی ایک خبر کے مطابق شیروں کی تعداد ۴۱۰۰ ہے جن میں سے بیشتر سندر بن میں ہیں۔ یہ اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ فی الحال ہندوستان سے شیروں کی نسل ناپید ہونے کا خطرہ ٹل گیا ہے۔

□□

اتر پردیش کا ترقیاتی منظرنامہ

روشن مستقبل کی ضمانت

گزشتہ ایک سال کے دوران اتر پردیش کے وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو کی قیادت میں حکومت اتر پردیش کی کوشش رہی ہے کہ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے آدرشوں کے مطابق دیہی عوام اور پس ماندہ افراد کو بھی سماجی انصاف ملے اور انھیں ترقی کے وافر مواقع حاصل ہوں۔ اس مقصد کا حصول بدلی نظام کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ یہ کام بے حد چیلنجوں کا تھا لیکن اس میں ریاستی حکومت کو قابل ذکر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مواضعات کو ترقیاتی پروگراموں کا محور بنایا گیا ہے۔ منصوبہ جاتی اخراجات کا ۳۰ فیصد صرف مواضعات کی ترقی پر صرف کرنے کا تاریخ ساز فیصلہ کیا گیا ہے۔ سماجی و تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ طبقوں کو سرکاری ملازمتوں میں ۲۷ فیصد ریزرویشن دیے جانے کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ اعلا ذات کے غریبوں، پسماندہ علاقوں کے عوام اور خواتین کو بھی ریزرویشن سے فائدہ پہونچے، اس پر غور و خوض کے لیے کو شک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔

کابینہ نے اپنی پہلی میٹنگ میں کسانوں، بنکروں، کھیت مزدوروں اور دیہی دست کاروں کے دس ہزار تک کے قرضوں کی وصولی کو روک دیا تھا جسے بعد میں معاف کر دیا گیا۔ اس طرح ۱۳۱۸۰، کروڑ روپے کے قرضے اب تک معاف کیے جا چکے ہیں۔ گنے کی قیمت میں اضافہ کرنے اور ضعیفی پنشن کی رقم میں اضافہ کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ کسانوں کو راحت پہونچانے کے لیے ۲۰ر۱۱ ارب روپے کے بجلی کے بقایاجات کو معاف کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ اس سال بھی گنے کی قیمت تین روپے فی کوئنٹل بڑھا کر کسانوں کو دی جا رہی ہے۔ گنا کسانوں کو آزادی کے بعد پہلی بار زیادہ قیمت حاصل ہوئی ہے۔ رکشہ چلانے والوں کو رکشے کا مالک بنایا جا رہا ہے۔

ریاست کے ترقیاتی کاموں کے واسطے سال ۹۲-۱۹۹۱ء کے لیے منصوبہ بندی کمیشن نے ۳۰۱۰ کروڑ روپے منظور کیے ہیں، جو اس سال کے منصوبے کے مقابلے میں ۵۱۰ کروڑ روپے زیادہ ہے۔ پس ماندہ علاقوں، خاص طور پر مشرقی اتر پردیش اور بندیل کھنڈ کی ترقی کی جانب خاص توجہ دی گئی ہے۔ ان کی ترقی کے لیے ایک خصوصی فنڈ قائم کیا گیا ہے۔

اوسر اور بیہڑ کو قابل کاشت بنانے کے لیے ایک مخصوص منصوبے پر عمل کرتے ہوئے "بھومی سینا" کی تشکیل کی گئی ہے اور اس اسکیم کو ۲ اکتوبر (گاندھی جینتی) سے ۱۷ اضلاع میں نافذ بھی کیا جا چکا ہے۔ ہمہ جہت ترقی اور سماجی انصاف کے لیے ۱۲ نکاتی پروگرام بنا کر اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔

زرعی پیداوار کے میدان میں ۹۰-۱۹۸۹ء میں ریاست میں کل ۳۲۶٫۹۵ لاکھ میٹرک ٹن اناج اور ۱۱٫۸۱ لاکھ میٹرک ٹن تلہن کی پیداوار ہوئی۔ سال ۱۹۸۹ء کے مقابلے میں ۱۹۹۰ء میں تقریباً

۹ فیصد سے زائد رقبے کو آبپاشی سہولت مہیا کرائی گئی۔

اس سال ۶۴۳ ٹیوب ویلوں کی بجلی کاری کی گئی جس سے مزید ۶۴۴۰۰۰ ہیکٹیر رقبے کے بقدر آبپاشی صلاحیت پیدا ہوئی۔ آبپاشی کے بندوبست کو یقینی بنانے کے لیے دیہی علاقوں کو ۱۲ سے ۱۴ گھنٹے بجلی کی سپلائی کی گئی۔ بجلی پیدا کرنے کی جانب خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

سال ۹۱-۱۹۹۰ء کے دوران اب تک تقریباً ۱۵ ہزار چھوٹے صنعتی واحدوں کا قیام عمل میں آچکا ہے۔

عام آدمی کو اسپتال میں سستے علاج کی سہولت مہیا کرانے کے لیے رجسٹریشن فیس دو روپے سے گھٹا کر ایک روپیہ کردی گئی ہے اور دیہی اسپتالوں میں رجسٹریشن فیس ختم کردی گئی ہے۔ جنرل وارڈ میں بھرتی ہونے والے لوگوں کو دوائیں مفت مہیا کرائی جارہی ہیں۔

مزید دیہی ترقیاتی اسکیم کے تحت درج فہرست ذات کے کنبوں کا ریزرویشن ۵۰ فیصد سے بڑھا کر ۶۰ فیصد کیا گیا اور گرانٹ کی رقم کو ۳ ہزار روپے سے بڑھا کر پانچ ہزار روپے کر دیا گیا۔ عوامی نظام تقسیم سے زیادہ سے زیادہ افراد کو مستفید کرنے کے مقصد سے ہر گاؤں سبھا میں کم سے کم ایک سستے غلے کی دکان کھولنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اینٹوں کی قیمت میں غیر مناسب اضافے کو روکنے کے لیے ایک آرڈیننس جاری کیا گیا جس کے نتیجے میں اینٹ کی قیمت میں اسی روپے فی ہزار کی کمی آئی۔

تعلیم کے میدان میں سال ۹۱-۱۹۹۰ء میں درجہ ۹ سے ۱۲ تک کے طلباء کو ٹیوشن فیس سے بھی مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

بھارت رتن ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی یاد میں لکھنؤ میں قائم کی جانے والی یونیورسٹی کے لیے پانچ کروڑ روپے کا بندوبست کیا جا چکا ہے اور یونیورسٹی کے قیام کا کام شروع ہو چکا ہے۔

ریاست میں سرکاری ملازمتوں میں انگریزی کی لازمی حیثیت ختم کر دیا گیا ہے اور ہندی کے وقار کے تحفظ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ تمام سرکاری کام لازمی طور سے ہندی میں ہونے لگا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دیگر آٹھ ہندوستانی زبانوں کی تدریس کا کام بھی شروع کیا گیا ہے۔

اقوام و قبائل درج فہرست و پس ماندہ طبقے کے افراد کو تقسیم شدہ آراضی کا قبضہ دلائے جانے کے لیے خصوصی مہم چلائی گئی ہے۔ قدرتی آفات راحت فنڈ قائم کیا گیا ہے، جس میں ۹۰ کروڑ روپے جمع کیے گئے ہیں۔

ملازمت پیشہ خواتین کے لئے ہوسٹلوں کی تعمیر کی جا رہی ہے۔

دیہی خواتین کی سہولت کے لیے دیہاتوں میں دو لاکھ صاف ستھرے پاخانوں کی تعمیر کی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے۔

جنگلات اور ماحولیات کے تحفظ کو ۱۲ نکاتی پروگرام میں شامل کیا گیا ہے۔

پوری ریاست میں اگست ۱۹۹۰ء سے چنگی ختم کر دی گئی ہے ریاست میں فرقہ واریت کا مقابلہ کرنے کے لیے شانتی ٹرسٹ بل (امن تحفظ فورس) کی تشکیل کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے۔

عوامی نظام تقسیم کے توسط سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مستفید کرنے کے مقصد سے ہر گاؤں سبھا میں کم سے کم ایک سستے غلہ کی دکان کھولنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان دکانوں کو اقتصادی طور پر خود کفیل بنانے کے واسطے دیگر اشیاء کی فروخت کے لیے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ دکانوں کے الاٹمنٹ میں امداد باہمی انجمنوں اور پردھانوں کو جس میں مٹی کے تیل کی ڈیلر بھی شامل ہیں، ترجیح دی گئی ہے۔

کارڈ ہولڈروں کو اپنی من پسند دکان سے اپنا کارڈ وابستہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ نئے راشن کارڈ جاری کرنے، پرانے راشن کارڈ بدلنے اور یونٹ بڑھانے یا گھٹانے اور حوالگی سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے طریقۂ کار کو آسان کر دیا گیا ہے۔

اینٹ کی قیمت میں غیر مناسب اضافے کو روکنے کے لیے اتر پردیش اینٹ (سپلائی ریگولیشن) آرڈیننس ۱۹۹۰ء نافذ کیا گیا جس کے نتیجے میں اینٹ کی قیمت میں ۸۰ روپے فی ہزار کی کمی آئی ہے۔

ریاستی حکومت نے موجودہ کرایہ کنٹرول قانون میں بڑے پیمانے پر ترمیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ کمزور مکان مالک کا استحصال طاقتور کرایہ دار نہ کر سکے نیز کمزور کرایہ دار کو طاقتور مکان مالک نہ ستا سکے۔ □□

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے
ہر کتاب کے دو نسخے
آنا ضروری ہیں

نام کتاب "متاعِ فکر"

شاعر: رحمٰن ربّانی　　قیمت: ۲۵/- روپے

ملنے کا پتہ: نگہبان پبلی کیشنز کالپی۔ ۲۸۵۲۰۴

رحمٰن ربّانی کے اس شعری مجموعے کا نام متاعِ فکر یوں ہی نہیں رکھا گیا ہے بلکہ حقیقتاً یہ متاعِ فکر ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے دیوان میں فکری سرمایہ نہیں ہوتا بلکہ فکر سے میری مراد ہے رنگا رنگ پیکروں کا نگار خانہ، ایک ایسا آئینہ جس میں بہت سے عکس ہوں اور ہر عکس ایک دوسرے سے مختلف ہو، متاعِ فکر میں اسی قسم کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اس میں غزلیں بھی ہیں، رباعیات بھی اور طنز و مزاح کی چاشنی میں بھیگی ہوئی کچھ نظمیں بھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رحمٰن ربّانی اپنی بات کہنے کے لیے کوئی ڈھانچہ اختیار نہیں کرتے۔ وہ صرف اپنی بات کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جہاں عرفانِ ذات اور عرفانِ الٰہی کے جلوے ملتے ہیں وہیں طنز کے نشتر بھی موجود ہیں جو لطف کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے ؎

فرقت کی رات ہم سے یقیناً بسر نہ ہو
آئے نہ یادِ یار تو ہرگز سحر نہ ہو

راہِ جنوں میں ہم حدِ امکاں سے بڑھ گئے
اہلِ ہنر جہاں تھے وہیں کے وہیں رہے

یوں تو پھولوں سے بھی نازک ہے مزاج اپنا مگر
وقت پڑ جائے تو تلوار بھی ہو سکتے ہیں

متاعِ فکر میں رُباعیات بھی ہیں جن میں شاعر کے مزاج کی بیباکی بہت نمایاں ہے۔ علاوہ ازیں رحمٰن ربّانی کی شاعری پر مشاہیرِ فن اور مخلصین شعر و ادب کی آرا بھی ہیں جو شاملِ کتاب ہیں۔ ان سے رحمٰن ربّانی کی شاعری کے نشیب و فراز اور تہہ در تہہ کروٹیں لینے والی لہروں کا سُراغ ملتا ہے۔

———— عشرت ظفر

نام کتاب: "مختصر حیاتِ حمید"

مرتبہ: عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی　　قیمت ۶/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح۔ سرائے میر، اعظم گڑھ (یو، پی)

مولانا حمیدالدین فراہی مولانا شبلی نعمانی کے ممیرے پھپھیرے بھائی تھے۔ مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور مولانا حمیدالدین ۱۸۶۲ء میں وہ علم و فضل و کمال میں شبلی سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ انھیں فارسی و عربی پر تو دسترس حاصل ہی تھی، انگریزی و عبرانی زبان و ادب کی بھی اچھی واقفیت کے ساتھ ساتھ فلسفہ اور منطق سے بھی شغف رکھتے تھے۔

مولانا حمیدالدین فراہی کا خاص میدان قرآنی تعلیمات کی توضیح و تشریح تھا۔ انھوں نے قرآن مجید کی ایک ایک آیت پر اس طرح غور کیا تھا جس طرح کہ اس پر غور کرنے کا حق ہے آپ نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے ان تمام تحریروں کو بھی نہایت اشتیاق و انہماک سے لیکن تنقید و تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جو قدیم و جدید دونوں راستوں سے مل سکیں اور جو قرآن شریف کو سمجھنے میں کسی نوعیت سے بھی معین ہو سکتی تھیں۔

مولانا حمیدالدین فراہی عربی و فارسی دونوں زبانوں کے ادیب و شاعر بھی تھے لیکن آپ نے قرآنی علم کو فروغ دینے میں اپنی عمر صرف کی۔ آپ ہندستان کے مستند دینی و علمی اداروں سے وابستہ رہے اور آخر میں سرائے میر اعظم گڑھ میں مدرسۃ الاصلاح قائم کر کے قرآن کریم کو پڑھنے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ماحول سازگار کرنے میں مصروف ہو گئے۔

مولانا حمیدالدین نے تمام عمر علم و ادب سے ہی شغف کیا، نیز صائع علم کی تلاش و جستجو و تحقیق سے تشنگیِ علم بجھانے کی کوشش کی۔

اس طرح اپنی ۶۸ برس کی عمر اس طرح بسر کی کہ کوئی لمحہ بھی بے مقصد نہیں گوارا۔

مولانا حمید الدین فراہی جیسی عظیم المرتبت شخصیت کے مختلف گوشوں سے واقف ہونا اور دوسروں کو ان کے علمی وادبی کارناموں سے روشناس کرانا ایک سعادت ہے۔ عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی نے اس فریضہ کو بطریق احسن بطور ایک مختصر کتابچہ کے اس طرح انجام دیا ہے کہ مطالعے سے دلچسپی نہ رکھنے والا بھی اسے پڑھنے میں کشش پاتا ہے اور بہت کچھ جان جاتا ہے۔

اسے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسی کیسی عظیم شخصیتیں ایسی ہیں جن سے ہم اپنی کم علمی کے باعث ہنوز ناواقف ہیں۔

——— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: **"مبادیات منطق وفلسفہ"**

مصنف: حکیم تسخیر احمد قیمت ۲۵/- روپے

ملنے کا پتہ: تسنیم احمد آر۔ایس ۴/۳۰ ۔ ٹکیٹ رائے ایل ڈی اے کالونی، لکھنؤ ۱۷

"منطق وفلسفہ" مروجہ یونانی نصاب تعلیم کا ایک لازمی مضمون ہے مگر یہ عجیب المیہ ہے کہ اس مضمون سے متعلق جن رسائل اور کتابوں کے مطالعہ کی سفارش سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن نے کی ہے یا دیگر جو کتابیں بازار میں دستیاب ہیں وہ تمام تر آج کے طلبائے طب کی علمی وذہنی استعداد سے مطابقت نہیں رکھتیں جس کی وجہ سے طلبا اور اساتذہ دونوں کو دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے اس مشکل صورت حال کے پیش نظر ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت تھی جو مجوزہ یونانی نصاب کے عین مطابق ہو اور جس میں طلبا کی علمی وذہنی استعداد کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

مقام مسرت ہے کہ حکیم تسخیر احمد صاحب (استاد کلیات۔ اسٹیٹ تکمیل الطب کالج لکھنؤ) نے اس اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے "مبادیات منطق وفلسفہ" کے نام سے ایک مفید کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم تسخیر احمد نے آج کے طلبائے طب کی علمی وذہنی استعداد نیز مجوزہ نصابی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کتاب تالیف کی ہے۔ انھوں نے صرف انھیں مباحث کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے جو طب کے لیے لازمی اور داخل نصاب بھی ہیں انھوں نے نہایت سادہ زبان اور آسان طرز بیان اختیار کیا ہے تاکہ طلبا اور اساتذہ دونوں کو سہولت ہو، نصابی تقاضہ کے مطابق علم ہیئت کے چند ضروری مسائل کا بیان اور بذریعہ تقویم ان کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب "مبادیات منطق وفلسفہ" لکھ کر حکیم تسخیر صاحب نے ایک اہم اور قابل قدر طبی خدمت انجام دی ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب بجا طور پر اس بات کی مستحق ہے کہ اسے مطالعہ کے لیے نصاب میں شامل کر لیا جائے تاکہ طبی تعلیمی حلقوں میں رواج پائے اور طلبا واساتذہ کے کام آئے۔

——— ڈاکٹر محمد طیب صدیقی

نام کتاب: **کلیات نبض وبول وبراز**

مصنف: حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن (کان پور)

قیمت: ۱۸ روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ: ترقی اردو بیورو۔ ویسٹ بلاک ۸/۱ آر کے پورم نئی دہلی

حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن اپنی سماجی خدمات اور طبی تحریکات میں دلچسپیوں کی بدولت سماجی، طبی اور سیاسی حلقوں میں اچھی طرح متعارف ہیں۔ وہ تصنیف وتالیف کا جذبہ اور شعور بھی رکھتے ہیں۔ اس وقت ان کی تصنیف "کلیات نبض بول وبراز" ہمارے پیش نظر ہے۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کو ترقی اردو بیورو، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

یونانی طب میں "کلیات" ایسا اہم اور ضروری موضوع ہے جس کی فراہم کردہ بنیادوں پر اصولی حیثیت سے طب یونانی کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ "کلیات۔ نبض۔ بول۔ براز" اسی ضروری موضوع کا اہم حصہ ہے جس کے مکمل علم کے بغیر کوئی علمی وفنی حیثیت سے یونانی علم العلاج کا نہ تو طالب علم ہی ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس فن کا طبیب ہونے یا کہلانے کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر چوں کہ تجربات اور مشاہدات سے پہلے اس میں کچھ منطقی دلائل، فلسفیانہ مسائل اور حکیمانہ تنقیحات سے بحث ہوتی ہے اس لیے آج کا طالب علم اس کو خشک، بے مزہ اور غیر مفید سمجھ کر اس کی

طرف سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت تھی کہ اس موضوع پر اس طرح قلم اٹھایا جائے کہ جدید ذہن بھی اس کو آسانی کے ساتھ قبول کر سکے۔

خوشی کی بات ہے کہ حکیم حبیب الرحمٰن نے اس طرف توجہ کی اور ایک آسان، پُر از معلومات اور مفید کتاب تیار کی۔ ان کی یہ کوشش قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔ دنیائے طب کو بالعموم اور طلبائے طب کو بالخصوص اس کی پذیرائی کرنا چاہیے۔

——— ڈاکٹر تسخیر فہمی

نام کتاب، "حدیثِ افتخار" (شخصیت)

مصنف: سید افتخار مہدی زیدی   قیمت، چھ روپے

ملنے کے پتے: (۱) سید افتخار مہدی زیدی، ڈاک خانہ و مقام موتک پور ضلع بارہ بنکی۔

(۲) نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

"حدیثِ افتخار" سید العارفین حضرت سید علیم الدین محمد ثانیؒ (۱۳۸۴ - ۱۴۷۹ء) کی شخصیت، حیات اور سیرت پر مشتمل ہے۔ سید صاحب موصوف حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے مرید و خلیفہ اور سلطان ابراہیم شرقی کے داماد اور ان کی مملکت کے امرا میں سے تھے۔ سید صاحب کو پٹہ بلاؤں (تحصیل حیدر گڑھ ضلع بارہ بنکی) کی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ انھوں نے وہیں قلعہ تعمیر کرا کے رہائش اختیار کر لی۔ علاقہ سید واڑہ کے سید زادگان کا، جو کثیر تعداد میں نسل در نسل متعدد مواضعات میں آباد ہیں، نسبی تعلق آپ ہی کی ذات سے ہے۔

اس کتابچے میں سید صاحب کی سوانح و شخصیت کے علاوہ ان کے اہل و عیال پر روشنی ڈالی گئی ہے، شجرۂ نسب درج کیا گیا ہے اور ان مواضعات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو سید صاحب کی اولاد سے متعلق اور ان کے تصرف میں تھے۔

یہ کتابچہ سید صاحب کے خانوادے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے لیے بھی مفید اور کارآمد ہے جو علمی و تاریخی ذوق رکھتے ہیں۔

——— انور حسین خاں

نام کتاب: "سلگتے نشیمن" (افسانوی مجموعہ)

مصنف: ڈاکٹر جلیس سہسوانی   قیمت، نو روپے

ملنے کا پتہ: ڈاکٹر جلیس سہسوانی۔ رستم ٹولہ۔ سہسوان۔ بدایوں

"سلگتے نشیمن" ڈاکٹر جلیس سہسوانی کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں پندرہ افسانے شامل ہیں۔ ڈاکٹر جلیس کا افسانہ کردار نگاری، پلاٹ سازی اور قصہ گوئی کے اعتبار سے ان کے فن کی پختگی کا ثبوت دیتا ہے۔ ان کے کردار نہایت جان دار ہیں جن کا تعلق طلسمی دنیا سے نہ ہو کر اسی ارض خاکی سے ہے۔ ان کی قصہ گوئی میں جو ماجرا اور کہانی پن ہے وہ علامت سے بوجھل نہیں ہے۔ ان کا افسانہ سماج کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ان کے کردار نچلے متوسط طبقے کے افراد ہیں جن کے توسط سے وہ موجودہ سماج کی گندگی کی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں۔

"میرے اپنے" ان کا ایک ماڈل افسانہ ہے جس سے انھوں نے بخوبی ظاہر کر دیا ہے کہ مجرم ضمیری کس طرح سولی پر چڑھا دیتی ہے اور سماج کا خوف کس طرح احساس پر بجلی بن کر گرتا ہے۔

"عزم راسخ" ایک بدنصیب طوائف کی کہانی ہے جس میں جلیس صاحب نے ایک ماہر نفسیات کا رول ادا کیا ہے۔ "نیلم" کوشش کے باوجود اخلاق کو نہ ٹھکرا سکی اور ٹھاکر صاحب کو اپنے گھر لے گئی۔ لیکن یہی واقعہ ارون کے ذہن میں شک کا سبب بنا اور اس کی خانگی زندگی بکھر کر رہ گئی۔

"انگوٹھی کی قیمت" میں مسز شرما کو راز انکشاف کرنا ہی پڑا۔ یہاں کلائمکس پر پہونچ کر قاری کو جھٹکا لگتا ہے اور وہ انگوٹھی کو بھول کر سماج کی برائی پر نظر مرکوز کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر جلیس کے زیادہ تر افسانے رومانی ہیں۔ وہ اپنا افسانہ کبھی کبھی انجام سے شروع کرتے ہیں۔ ان کے طرز تحریر میں انفرادیت ہے نقالی نہیں۔

——— ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

ہمارے نام گلوں کے مراسلات

نیادور کا قومی ہم آہنگی سے متعلق شمارہ وقت کی ضرورت ہے شعیب شمس کی نظم پسند آئی۔ بشمبھر ناتھ پانڈے جی کا مضمون معلوماتی اور اہم ہے شیخ تصدق حسین کا مضمون بھی پسند آیا۔ سچ پوچھیے تو اب تاریخ کو روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔

—— (ڈاکٹر) شہناز نبی

کلکتہ

آج وقت کی پکار ہے "قومی یک جہتی" اور "فرقہ وارانہ ہم آہنگی" اس کی عملی شکل رسالہ نیادور کے ماہ اگست و ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں نظر آئی۔

اس مجلہ میں شامل سبھی مضامین خوب سے خوب تر ہیں خصوصاً بشمبھر ناتھ پانڈے جی نے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔

رسالہ کا گٹ اپ اور اس کی ظاہری خوبصورتی اپنی جگہ ہے جس میں یقیناً آپ کے ذوق لطیف کو کافی دخل ہے۔

—— شمیم رضوی

لکچرر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی

لکھنؤ

نیادور کا قومی ہم آہنگی نمبر بہت خوبصورت اور باوزن ہے جس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

آپ نے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ دانشوروں اور قلم کاروں نے اپنے قلم روک لیے ہیں۔

میرے خیال میں ہمارے سماج کا دانشور اور قلم کار طبقہ ابھی بھی کام کر رہا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہ قومی ہم آہنگی کے بجائے فرقہ پرستی کو ہوا دے رہا ہے اور پڑھنے والے غلط انداز سے پیش کی گئی باتوں کو حرف بہ حرف صحیح مان رہے ہیں کیونکہ وہ حقیقت سے بالکل ناآشنا ہیں۔

—— شاہدہ صدیقی

لکھنؤ

نیادور کا اگست ستمبر ۱۹۹۰ء کا شمارہ قومی یک جہتی و ہم آہنگی کو وقف ہے۔ تمام مضامین آپ کی ادبی صلاحیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یوں تو سبھی مضامین بہت پسند آئے لیکن میں خاص طور سے جناب منظر اعجاز صاحب کے مضمون "شاعر یک جہتی نظیر اکبرآبادی" کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس مضمون کے ذریعہ موصوف نے میاں نظیر کی شخصیت، ان کے کلام اور موجودہ دور میں اس کی اہمیت و معنویت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ گو کہ مضمون چند صفحات پر محیط ہے مگر جامع انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔

نیادور کے اس خصوصی شمارہ کے لیے آپ، اراکین نیادور اور قلم کار مبارک باد کے مستحق ہیں۔

—— ششی ٹنڈن

آگرہ

نیادور کا شمارہ "قومی ہم آہنگی کے نام" موضوع اور معنوی افادیت کے اعتبار سے نہایت ہی جاندار اور شاندار ہے۔ تقریباً تمام مضامین اپنی اپنی جگہ بے حد اہم معلوم ہوئے۔ ترتیب کا حسن بھی سحر انگیز اور

دل کش ہے۔ یہ چار ذیلی عنوانات: ـــــــ

"راز مضمر ہے توانائی کا یک جہتی میں"۔ "یکساں ہیں معنی دیر و حرم اپنی نظر میں"۔ "شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے"۔ اور "آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں" بہت اچھے لگے۔

منظومات میں چندر پرکاش جوہر بجنوری کی دو نعتیں، عشرت ظفر کی نظم "نہ دا غدار نگار وطن کی حرمت ہو" سعید تابش کی "مرے محبوب وطن" خاص طور سے پسند آئیں۔ شعیب شمس کی نظم بھی کافی اچھی ہے۔ یہ دعائیہ بیت بہت خوب ہے ؎

یا خدا فطرتِ انساں کو سمندر کر دے
جذبۂ امن سے ہر دل کو منور کر دے

لیکن مجھے ایک بات اس میں کھلی یعنی ؎

گھر سے نکلو تو دعا مانگ کے نکلو یارو

مخاطب "جمع حاضر" ہے لیکن ؎

کسی دوشیزہ کی سہمی ہوئی چیخیں تیرا

یہاں مخاطب "واحد حاضر" ہے۔ مجھے نظم میں یہ تغیر کھلتا ہے لیکن یہ معاملہ ساخت کی گرامر سے متعلق ہے۔ موضوع، اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے نظم کافی جان دار ہے۔

ـــــــ **منظر اعجاز**

عظیم آباد۔ بہار

نیا دور کی خصوصی اشاعت بابت ماہ اگست، ستمبر ۱۹۹۰ء "ایک شمارہ قومی ہم آہنگی کے نام" موصول ہوا۔ مندرجات معیاری ہیں موجودہ صورت حال کے پیش نظر اس شمارہ کی ضرورت تھی۔ واقعتاً آپ کی ادارت کا یہ لائق تحسین کارنامہ ہے۔ مشمولات کو آپ نے عنوانات سے مزین کر دیا ہے جس سے شمارہ کا حسن دوبالا ہو گیا ہے

(ڈاکٹر) **آفاق فاخری**

جلال پور۔ فیض آباد

نیا دور کا خصوصی مشترکہ شمارہ بابت اگست، ستمبر ۱۹۹۰ء جو "قومی ہم آہنگی کے نام" موسوم ہے اس کی ترتیب و تدوین آپ نے نہایت عمدہ طور پر کی ہے۔ نگارشات اور موضوعات کو جن دل کش عنوانات سے آپ نے نوازا ہے اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے اور تخلیقات بھی اتنی جان دار ہیں کہ ان کا مطالعہ ہر ایک کے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ ان کی روشنی میں ان خیالات کو دور کیا جا سکے جن کی گونج ملک بھر میں سنائی دے رہی ہے، اور جس سے ملک کی فضا مکدر ہو رہی ہے۔

جناب علی میاں ندوی صاحب نے بڑے پتے کی فکر انگیز باتیں کہی ہیں ان امور پر غور کرنا بے حد ضروری ہے۔

ـــــــ **محمد مصباح اللہ**

مدراس

بشمبھر ناتھ پانڈے جی کا ۱۹ صفحاتی مضمون "ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات" کا مطالعہ کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ پانڈے جی کا شکریہ ادا نہ کرنا بڑی احسان فراموشی ہوگی۔

ـــــــ **جمیل احمد مدنی القاسمی**

سید ر ولائی۔ تامل ناڈو

نیا دور کے قومی یک جہتی سے متعلق شمارہ میں جن مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے وہ سب یک جہتی کے بنیادی اصولوں کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں آج کے ماحول میں اگر صاف ذہنوں سے اس شمارہ کو پڑھا اور سمجھا جائے تو یہ مرہم کا کام ضرور کر سکتا ہے۔ اگر اتنا بھی ہو جائے تو آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

ـــــــ **ظاہر قزلباش**

لکھنؤ

نیا دور اب واقعی نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ ساتھ ساتھ اصناف سخن بھی پروقار اور سرزمین لکھنؤ کے لیے قابل افتخار ہیں۔ نومبر کے شمارہ میں "ارض ویراں کے شہپر" کا منظوم ترجمہ شامل کر کے ہم سب پر آپ نے احسان کیا ہے

احسان الٰہی صاحب مرحوم نے مجھے یہ انگریزی نظم خود سنائی تھی اور میں کسی قدر متعجب بھی ہوا تھا۔ "ورق آشنائی" کا ترجمہ قابل قدر ہے۔

ـــــــ **اسلم واحدی**

لکھنؤ



نیا دور

جلد ۴۵، ۴۶ | نمبر ۱، ۲

مارچ، اپریل سنہ ۱۹۹۱ء

ایک شمارہ ڈاکٹر امبیڈکر کے نام

عنوانات

ایڈیٹر

شاہ نواز قریشی

ٹیلیفون: ——— ۲۴۷۱۰۸

پبلشر

شیلیش کرشن

(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ، اتر پردیش)

انتظامی و ادارتی معاونین

محمد الیاس خان ۔ نجیب انصاری

مطبوعہ

یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

——— شائع کردہ ———

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش

فی شمارہ: ——— ایک روپیہ

زر سالانہ: ——— دس روپے

——— ترسیلِ زر کا پتہ ———

سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

——— خط و کتابت کا پتہ ———

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

——— بذریعہ رجسٹری ———

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

یو، پی، لکھنؤ





اپنی بات

بیسویں صدی ہندستان کے لئے بیداریٔ نو سے عبارت ہے۔ اس صدی کے دوران پورے ملک میں ایک نئی بیداری اور سماجی شعور پیدا کرنے میں جن شخصیتوں نے اپنا سب کچھ وقف کر دیا تھا، ان میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت تھی۔ انھوں نے تحریر و تقریر اور اپنے کردار و عمل سے دبے کچلے اور ستم زدہ طبقوں میں ایک نئی روح پھونک دی، ان میں ایک نئی زندگی پیدا کی اور اپنے حقوق کے لیے لڑنے کا عزم پیدا کیا۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں وہ ہندستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ وہاں اپنی اولین تقریر میں ہی انھوں نے "ہندستان ایک ہو" کا نعرہ دیا۔ ۱۹۴۷ء میں انھیں آئین کا مسودہ تیار کرنے کی غرض سے تشکیل شدہ کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس حیثیت سے انھوں نے جمہوریۂ ہند کے آئین کا جو مسودہ تیار کیا، اس پر انھیں تمام سماجی و سیاسی حلقوں کی جانب سے مبارک باد دی گئی اور ان کی زبردست ستائش ہوئی۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی شخصیت ہشت پہلو تھی۔ ایک مجاہدِ آزادی، دبے کچلے اور ستم رسیدہ طبقوں کے نجات دہندہ اور ان کے حقوق کے محافظ، ایک جید عالم اور دانش ور، ایک ماہر اقتصادیات و سماجیات، ایک قانون داں، ایک مدرس اور مصنف، آئینِ ہند کے معمار، ایک سیاسی مدبر و مفکر اور ایک باعمل اور مخلص انسان۔ ان تمام حیثیتوں سے ان کی شخصیت ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے، جس سے آئندہ نسلوں کو بھی تحریکِ عمل ملتی رہے گی۔

وہ محض باتیں کرنے والے دانش ور یا محض سوچتے رہنے والے مفکر نہیں تھے۔ وہ بنیادی طور سے ایک عملی انسان تھے وہ ایک ایسے مردِ خود آگاہ تھے جس کی تدبیر ہی تقدیر ہوا کرتی ہے۔ انسان دوستی کا ان کا جو نظریہ تھا، اس میں کسی بھی طبقے یا کسی بھی ذات کے لیے منافرت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ تو بس اتنا چاہتے تھے کہ بلا تفریقِ مذہب و ملت اور رنگ و نسل تمام انسانوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں کسی انسان سے نفرت نہ کی جائے، ذات پات اور رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی کو چھوٹا یا بڑا نہ سمجھا جائے کسی انسان کے ساتھ غیر انسانی سلوک نہ کیا جائے۔ ہر انسان کو انسان کی نظر سے دیکھا جائے، اسے خانوں میں نہ تقسیم کیا جائے۔ اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے وہ تمام زندگی لڑتے رہے اور جدوجہد کرتے رہے۔ اس جدوجہد میں انھیں بڑی حد تک کامیابی بھی ملی۔ یہ ان کی کوششوں اور جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ چھوت چھات کو جرم قرار دے دیا گیا۔ یہ کام انھوں نے آئینِ ہند کے معمار کی حیثیت سے انجام دیا، جس کے قانونی بندوبست کے تحت ذات پات اور رنگ و نسل کی بنیاد پر تفریق و امتیاز کرنا جرم ٹھہرا۔

ایڈیٹر



پی۔ ستیہ نرائن ریڈی
(گورنر اترپردیش)



ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر اور قومی یک جہتی

بھارت رتن ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر گوناگوں صفات کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کے لیے اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ سماج کی ترقی اور بنی نوع انسان کی بہبود کے لیے وہ ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے اور مخالفت و اہانت کے باوجود مساوات اور سوشلزم کے اپنے نصب العین سے کبھی نہیں ہٹے۔

قدیم ہندستان کے تہذیب و تمدن اور تاریخ پر نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے رشیوں، منیوں اور صوفی سنتوں نے انسانی فلاح کے لیے ہمیشہ اتحاد، تعاون، رواداری، بقائے باہم، عالمی امن اور ساری دنیا کو ایک کنبہ سمجھنے کا اُپدیش دیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ہی سبھی مذاہب کا احترام کرنے پر بھی زور دیا ہے۔ درحقیقت "مذہب" انسان کو ایک مثالی زندگی گزارنے کی طاقت دیتا ہے جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان سچائی، عدم تشدد، انصاف، امن اور محبت کے ساتھ اپنی زندگی گزارے۔ "مذہب" ایک ایسی طاقت ہے جسے انسان "برہم" یعنی خدائے مطلق سے بے پناہ محبت کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ دُنیا کے سبھی مذاہب میں ایک ہی خدا کی عبادت ہوتی ہے۔ ویدانت میں کہا گیا ہے: —

"برہم ایک ہی ہے۔ اس کے برابر کوئی دوسرا نہیں ہے۔"

اسی طرح شویتا شوتر اپنشد میں بتایا گیا ہے کہ — "ایشور ایک ہے، جو سبھی کے دل میں موجود ہے۔" — مذہب اسلام کی بنیاد ہی "لا الٰہ الا اللہ" ہے، یعنی اللہ ایک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عیسائی مذہب کے مطابق "گاڈ از ون" یعنی خدا ایک ہے۔ سکھ مذہب میں بھی "ایک اونکار، سری واہ گرو" کہا گیا ہے جس کا مطلب ہے: "گرو کہتے ہیں، خدا ایک ہے۔"

یہی نہیں — ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے لوگ مندر، مسجد، گرودوارے اور گرجا وغیرہ میں ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ ان سبھی مذاہب میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ اپنے مذہب پر خلوص دل کے ساتھ عمل پیرا رہتے ہوئے دوسرے مذاہب کا بھی پورا پورا احترام کرو اور ان سے نفرت مت کرو۔ معصوم کو پریشان کرنا یا بے قصور کو قتل کرنا گناہ ہے اور جھوٹ بولنا لائق تعزیر۔

پامال اور استحصال زدہ انسانیت کی بہبود ایک ایسا کار نیک ہے جسے "مادھو سیوا" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بات قدیم ویدک یا ہندو مذہب ہی میں نہیں کہی گئی ہے بلکہ اس قسم کی تعلیم سبھی مذاہب میں دی گئی ہے مذہب کی بنیاد پر آپس میں نفرت، تشدد اور علاحدگی پسندی مناسب نہیں ہے۔ کسی بھی مذہب کا سچا پیروکار کسی بھی شخص سے نفرت کرنے، رنجش رکھنے یا اسے کسی طرح کا کوئی نقصان پہنچانے کی بات تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ صرف مذہب سے بھٹکے ہوئے کچھ سماج دشمن اور علاحدگی پسند عناصر کا کام ہوتا ہے جو اپنے مفادات کے لیے معصوم لوگوں کو مذہب



کے نام پر بھڑکانے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جن سے ہمیشہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں گاندھی جی نے "مذہب" کے بارے میں اپنا یہ نظریہ واضح طور پر پیش کیا کہ مذہب وہ نہیں ہے جو اندھی عقیدت پر مبنی ہو اور تشدد کی بات کرتا ہو۔ سچا مذہب وہی ہے جو انسان کو دوسروں کے ساتھ وہی رویہ اپنانے کی ترغیب دے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے، کیوں کہ محبت اور احترام کے بدلے میں ہی محبت اور احترام کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ جب انسان دوسرے مذاہب کا احترام کریگا تو دوسرے بھی اس کے مذہب کا احترام کریں گے۔ اس طرح لوگوں میں سبھی مذاہب کے تئیں یکساں احترام کا جذبہ پیدا ہوگا اور اس سے قومی یک جہتی مستحکم ہوگی کیونکہ یہ ہماری روایت رہی ہے۔

اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم ہندستانیوں نے ہمیشہ مذہبی پیغامات پر نہ صرف پوری عقیدت مندی کے ساتھ عمل کیا ہے بلکہ ہم نے دوسرے ممالک کے رہنے والوں کو بھی اتحاد، رواداری اور بھائی چارے کا پیغام دیا ہے۔ یہ سلسلہ عہد قدیم سے آج تک جاری ہے۔ اس عظیم دھرتی پر عہد جدید میں راجہ رام موہن رائے، لالہ لاجپت رائے، بال گنگا دھر تلک، مہاتما گاندھی، جے پرکاش نرائن، مولانا ابو الکلام آزاد، رام منوہر لوہیا اور ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے ملک میں آزادی، اتحاد اور رواداری کا ماحول قائم کرنے میں اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایسے عظیم لوگ جو اپنی پوری زندگی بنی نوع انسان کی بہبود کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ انھیں اپنے زمانے میں اتنی مقبولیت نہیں ملتی جتنی ملنی چاہیے۔ ایسے عظیم لوگوں میں مارٹن لوتھر، ماسٹر ڈڈلے وغیرہ کے علاوہ ڈاکٹر امبیڈکر کا نام بھی عقیدت سے لیا جاتا ہے۔

انھوں نے تاریخ، اقتصادیات، سیاسیات اور قانون جیسے مضامین میں اعلا تعلیم حاصل کی نیز برطانیہ اور امریکہ کی تین یونیورسیٹیوں سے اعلا ترین ڈگریاں حاصل کیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے سب سے پہلے ۱۹۲۷ء میں جب استحصال زدہ اور انسانی حقوق سے محروم سماج کی بہبود کے لیے آواز اٹھانا شروع کی تو اس کی حمایت کرنے کے بجائے انتہا پسندوں اور فرقہ پرست عناصر نے ان کی تذلیل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہندستان کا یہ بہادر سپوت سماج کی بہبود کے اپنے مقصد سے ہٹا نہیں بلکہ اس نے سماج میں برابری لانے کے لیے اپنی پوری طاقت لگا دی۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ برتری کسی مخصوص ذات میں پیدا ہونے پر منحصر نہیں ہوتی اور اس پر کسی مخصوص مذہب کی بھی اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ ہندستان کے موجودہ آئین کو وجود میں لانے کے لیے ان کے رول کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آئین تیار کرنے والی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے انھوں نے ۲۹ر اگست ۱۹۴۷ء سے لیکر ۲۵ر نومبر ۱۹۴۹ء تک جس محنت شاقہ سے آئین کا مسودہ تیار کیا اس کے لیے ان کی بہت ستائش کی گئی۔ اس اہم آئین ساز کو "بھارت رتن" کا اعزاز ان کی زندگی میں ہی دیا جانا چاہیے تھا جسے حاصل کر کے وہ خود مسرور ہوتے۔

بہر حال دیر آید درست آید، مرکزی حکومت نے انھیں "بھارت رتن" کا اعزاز دے کر اس اعزاز کے وقار میں اضافہ ہی کیا۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں بھی آئین کے معمار ڈاکٹر امبیڈکر کی ایک تصویر لگائی گئی۔

ڈاکٹر امبیڈکر سماجی مساوات کے زبردست حامی تھے۔ ۲۲ر فروری ۱۹۱۸ء کو جب ساؤتھ بر وکمیشن کی رپورٹ پیش کی گئی اور رووٹ دینے کے لیے ڈاکٹر امبیڈکر کو مدعو کیا گیا تو انھوں نے سب سے پہلے دلتوں کے لیے ان کی تعداد کے تناسب سے سیٹیں محفوظ کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ آزادی سے قبل سماجی مساوات کو یقینی بنایا جائے۔ آزادی اسی طرح ایک مہار کا بھی پیدائشی حق ہے جیسا ایک برہمن کا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جب تک دلت ذاتیں علم کی طاقت سے آراستہ نہیں ہوں گی اس وقت تک وہ ترقی نہیں کر سکتیں۔ انھوں نے آئین میں دلتوں کے بنیادی حقوق شامل کرنے پر بھی زور دیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر، مہاتما بدھ، سنت کبیر اور جیوتی با پھلے کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے سماج کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں مساوات، آزادی اور بھائی چارے کی حکمرانی ہو۔ وہ دلت پامال اور استحصال زدہ طبقے کے لوگوں کا حوصلہ برابر بڑھاتے رہتے تھے نیز برتری اور کمتری کے جذبے سے سماج کو نجات دلانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر ہندستان کے اتحاد، آزادی اور سالمیت پر بہت



زور دیتے تھے۔ درج فہرست ذاتوں سے بھی ان کا کہنا تھا کہ وہ انتہائی مشکلوں سے حاصل کی ہوئی آزادی کی حفاظت کریں۔

ڈاکٹر امبیڈکر ایک منصف مزاج انسان تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ناانصافی، ظلم وستم اور استحصال کے خلاف جدوجہد کی۔ وہ ہر مسئلے کا حل آئین کی روشنی میں تلاش کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ملک میں طوائف الملوکی پھیل جائے گی۔

ڈاکٹر امبیڈکر شخصی آزادی کے زبردست حامی تھے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ نظریہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ "سماج میں رہنے کی وجہ سے انسان کی شخصیت معدوم نہیں ہوسکتی"۔ اس کی ایک آزادانہ زندگی ہے، آزادانہ وجود ہے۔ اس کا وجود ہی شخصی ترقی کے لئے ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں شخصی آزادی کو سلب نہیں کرتیں۔

جہاں تک بابا صاحب کا تعلق ہے انھوں نے مساوات، آزادی اور اخوت پر ہمیشہ زور دیا۔ جمہوریت کے لیے وہ ان تین چیزوں کو ضروری سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے درج فہرست اقوام وقبائل اور پسماندہ ذاتوں کے افراد کو خود مختاری اور خود اعتمادی کی بنیاد پر اوپر اٹھنے کے لیے ہمیشہ متوجہ کیا۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ حقوق اور وسائل سے محروم افراد کو ترقی کرنے کا موقع ملے اور ملک خوش حال بنے۔

بابا صاحب ہمیشہ مذہب، ذات، زبان اور علاقہ پرستی سے بلند ہوکر قومی یک جہتی کو مستحکم کرنے پر زور دیتے رہتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ مذہب انسانیت کو اختیار کیے بغیر نہ تو یک جہتی قائم رہ سکتی ہے اور نہ جمہوریت ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ جمہوریت میں عوام کی آواز ہی سب کچھ ہے۔ سماج میں جب افراد کو تحریر وتقریر اور اپنے رسم ورواج نیز مذہبی امور کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے تو اس سے قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کو تقویت ملتی ہے۔

ہندستان میں یک جہتی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انھوں نے ایک بار کہا تھا ——— اکثریتی طبقے کا یہ عظیم کام ہوگا کہ وہ ہندستان میں رہنے والے سبھی طبقوں کو اتحاد کی لڑی میں پرونے کی کوشش کریں۔ اگر مستقل اتحاد قائم کرنا ہے تو یہ بھائی چارے کے جذبات پر منحصر ہونا چاہیے یعنی ایسے جذبات پیدا ہونے چاہئیں جن کی مدد سے روحانی اتحاد قائم کرنے میں مدد ملے۔

ڈاکٹر امبیڈکر ہندو سماج کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندو سماج کی تنظیم دو اصولوں کی بنیاد پر ہو ——— مساوات اور ذات پات کی تفریق سے پاک سماج ——— انھوں نے یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ موجودہ پجاری اور پروہت نظام کو جمہوری بنایا جائے تاکہ ہر اس شخص کو یہ کام اپنانے کی آزادی ہو جسے اس میں دل چسپی ہے۔ اس سے ذات پات، چھوت چھات اور اونچ نیچ کے جذبات کو ختم کرنے میں مدد ملے گی، اور عوام کے درمیان اتحاد اور مساوات قائم ہو سکے گا۔

ڈاکٹر امبیڈکر قومی یک جہتی کے ساتھ ساتھ قومیت پر بھی ہمیشہ زور دیتے رہتے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ "بغیر قومیت کے جذبے کے قوم پرستی نہیں پیدا ہوسکتی"۔

اس کے علاوہ وہ قومی یک جہتی اور قومیت کے لیے سماجی اصلاح کو بھی ضروری سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ "سماجی اصلاح کے بغیر حقیقی قومیت ممکن نہیں ہے"۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ذات پات کی تفریق کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ذاتیں ہندو سماج کی اقتصادی اور سماجی تنظیم میں حائل ہوتی ہیں، اس لیے انھیں توڑ دینا چاہیے"۔

آزادی کے بعد جب انھوں نے سماج میں خرابیاں دیکھیں تو وہ بہت فکرمند ہوئے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ:

> "مجھے پڑھے لکھے لوگوں نے بڑا دھوکا دیا ہے۔ ان لوگوں سے امید تھی کہ پڑھ لکھ کر اعلا تعلیم حاصل کرکے سماج کی خدمت کریں گے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ غلام کلرکوں، افسروں اور سیاست دانوں کی ایک بھیڑ اکٹھا ہوگئی ہے جو سماج کی خدمت کے بجائے اپنا پیٹ پالنے میں لگی ہے۔"

اس طرح یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر جنھوں نے ہندستان کا آئین بنایا تھا اور ملک کے اتحاد اور آزادی کو دائمی بنانے پر زور دیتے رہے تھے، صرف اتنا ہی چاہتے تھے کہ جیسے بھی ممکن ہو ہندستان میں ایک "مثالی سماج" کے قیام کو یقینی بنایا جائے۔

آج کے بدلے ہوئے حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ڈاکٹر امبیڈکر کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں اور ہندستان کو خوش حال، متحد اور طاقتور

[illegible] (... انصاری)

حسن واصف عثمانی

آئین ساز امبیڈکر

ہندستان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں آزادی کے بعد جو غیر معمولی تبدیلیاں آئی ہیں ان کی بنیاد ہندستان کے اس تحریری آئین پر ہے جس کو آئین ساز اسمبلی نے مرتب اور منظور کیا تھا اور جس کو مرتب کرنے کا سہرا سب سے زیادہ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے سر تھا کیوں کہ آئین سازی میں ان کا ذہن مزاج اور کردار ابتدا سے انتہا تک غالب رہا۔

آزاد ہندستان کے لیے دستور سازی کرنے کی خاطر آئین ساز اسمبلی کا قیام تقسیم سے پہلے ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو عمل میں آگیا تھا۔ چند ہی مہینوں بعد جون ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کی وجہ سے پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کے نمائندے آئین ساز اسمبلی کی رکنیت سے الگ ہو گئے اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ڈاکٹر سچدانند سنہا کی صدارت میں صرف ہندستان کی آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد آئین ساز اسمبلی کے صدر مقرر ہوئے لیکن آئین سازی کے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل کا سارا کام آئین کی مسودہ کمیٹی کے سپرد تھا جو ڈاکٹر امبیڈکر کی سربراہی میں خاموشی سے بہت بڑا کام کر رہی تھی۔ اس وقت جب کوئی آئین نہیں تھا، صرف ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا کے خاکے میں رنگ بھرنا تھا۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے آزاد ہندستان کو بنیادی حقوق، جمہوری آزادی اور ضمیر کی آزادی کے ان تصورات کا تحفہ دیا جن پر آج ملک کی جمہوریت کی ساری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اس عمارت کی مضبوطی اور دلکشی کے حقیقی معمار ڈاکٹر امبیڈکر اس لیے ہیں کہ مسودہ کمیٹی نے آئین کا جو مسودہ مرتب کیا تھا اس کا شاید ایک ایک حرف ان کے ذہن میں ڈھل کر ان کے قلم سے نکلا تھا۔

یہ مسودہ جب فروری ۱۹۴۸ء میں شائع کیا گیا تو اس کو بجا طور پر آئین سازی کی عالمی تاریخ میں ایک معیاری نمونہ قرار دیا گیا۔ کیوں کہ اس میں غیر تحریری روایتوں پر بھروسہ کرنے کی جگہ نظریات و مقاصد کو بڑی تفصیل کے ساتھ تحریری شکل دے دی گئی تھی۔ مسودہ اس قدر مکمل اور مبسوط تھا کہ آئین ساز اسمبلی میں اس پر غور و فکر اور کھل کر بحث کرنے کے باوجود اس میں کوئی حقیقی اور بنیادی تبدیلی کی نوبت نہیں آئی۔ بہت سی ترمیمات پیش ہوئیں۔ سب سے زیادہ ترمیمیں آسام کے سر سعد اللہ نے پیش کیں جو خود بھی ایک بڑے آئینی ماہر اور سیاست کا بڑا تجربہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی جوابی تقریر میں ترمیمات پیش کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا اور خاص طور پر سر سعد اللہ کی ترمیموں پر ان کی تعریف کی۔ لیکن یہ تمام ترمیمات لفظی یا الفاظ کے دروبست سے تعلق رکھتی تھیں۔ آئین سازی کا مجموعی خاکہ ان سے متاثر نہیں ہوا آخر کار ڈاکٹر امبیڈکر کی ساری محنت یوں ٹھکانے لگی کہ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو آئین ساز اسمبلی نے یہ تحریری آئین منظور کر لیا۔ اور پھر ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو یہ نافذ کر دیا گیا۔

ہندستانی آئین میں برطانوی پارلیمانی نمونے پر ہونے کے باوجود ایک اہم فرق یہ ہے کہ برطانیہ میں پارلیمنٹ کو پوری بالادستی حاصل ہے

اور کوئی عدالت اس کی قانون سازی کو نہ مسترد کر سکتی ہے اور نہ اس میں کوئی بنیادی تبدیلی کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کا یقین تھا کہ برطانیہ میں غیر تحریری روایات کی وجہ سے پارلیمنٹ کی یہ بالادستی کوئی خرابی نہیں پیدا کر سکتی۔ لیکن ہندستان میں یہ روایات موجود نہیں تھیں۔ ان کو پروان چڑھانے کا فرض بھی تحریری آئین پر عائد ہوتا تھا اس لئے ڈاکٹر امبیڈکر نے پارلیمنٹ کی جگہ آئین کی بالادستی کا اصول اختیار کیا اور عدلیہ کو قانون سازی کی تشریح و تعبیر کا حق دے دیا۔ ہندستانی آئین میں عاملہ، عدلیہ اور قانون ساز اداروں کے درمیان اندرونی تناسب شامل کر کے ڈاکٹر امبیڈکر نے آئین کے بنیادی ڈھانچے اور راہبر اصولوں کو ترمیم اور تنسیخ سے ماورا قرار دے دیا جس پر اب بھی عمل ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے ایک تحریری آئین کو سیاسی، جمہوری اور سماجی زندگی میں تبدیلیوں کا ذریعہ بنایا۔ ایک ہریجن گھرانے میں جنم لینے والے بھیم راؤ امبیڈکر نے اپنی زندگی، حالات سے کشمکش اور حالات کو بدل کر رکھ دینے کے حوصلے سے لبرل ازم کے مغربی تصورات میں بڑی کشش محسوس کی تھی۔ وہ ایک روشن خیال، انسانیت دوست سماج کے خواب دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے آئین سازی کے ایک نازک مرحلے میں بڑی بے خوفی اور استقلال سے ایک بڑی جنگ بھی لڑی۔ آئین ساز اسمبلی میں گاندھی جی کے تصورات کے حوالے سے یہ نکتہ اٹھایا گیا تھا کہ جمہوریت و آئین کی بنیادی اکائی فرد کو نہیں بلکہ گاؤں کو بنایا جائے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے بڑی شدت سے اس کی کامیاب مخالفت کی اور ہندستانی گاؤں کے بارے میں اس رومانی تصور کو سختی سے مسترد کر دیا کہ گاؤں ایک مربوط سماجی زندگی کا نمونہ اور صدیوں سے ہندستانی عوام کی جمہوریت کا نمونہ ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اس پہلو کو اجاگر کیا کہ گاؤں کی سماجی زندگی کا دار و مدار ہمیشہ سے اس اونچ نیچ پر رہے جو جنم اور پیدائش کی بنیاد پر تسلیم کی جاتی ہے اس لیے یہ بیسویں صدی میں ناقابل قبول ظلمت پسندی ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے گاؤں کی جگہ فرد کو بنیادی اکائی قرار دینے پر زور دیا اور اس میں پوری طرح کامیاب رہے۔ اس طرح ہندستان واقعی بیسویں صدی کی روشن خیالی کو قبول کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ اس وقت ساری دنیا میں فرد کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انسانی حقوق، انفرادی آزادیوں اور ذہن و ضمیر کے احترام کی روایت کی تابندگی سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ تمام سیاسی اور سماجی نظریات اب انھی اخلاقی مطالبات کی کسی نہ کسی شکل میں تکمیل کرنے کی خاطر اپنے آپ کو بدل رہے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے ۱۹۵۰ء میں ہندستان کے کروڑوں انسانوں کو ایک فرد کی حیثیت سے وہ سب کچھ دے دیا تھا جو بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اب دنیا کے عوام ہر جگہ حاصل کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی آئین سازی پر ان کے ذہن، ان کی زندگی اور ان کی امنگوں نے بلاشبہ اپنی گرفت رکھی تھی۔ ۱۹۵۰ء کا آئین ان کی ذاتی جیت تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ زندگی کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں فرد کی ضرورتوں اور حوصلوں میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ سماجی حالات ایک حالت پر قائم نہیں رہتے، اس لیے انھوں نے اپنے مکمل، مربوط آئین کو بھی ایک بے جان تحریری مجموعہ بنائے جانے سے روک دیا اور آئین کے آرٹیکل ۳۶۸ کے تحت آئین میں ترمیم کا اختیار بھی پارلیمنٹ کے سپرد کر دیا۔ آرٹیکل ۳۶۸ کے بموجب پارلیمنٹ کا یہ اختیار لامحدود نہیں تھا اور بنیادی حقوق اور رہبر اصولوں کی بالادستی کو سلامت رکھنے کی خاطر آئینی ترمیموں کے جائزے لینے کے حق و اختیار بہر حال عدلیہ کو دیے گئے تھے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ زندگی کی ضرورتوں کی وجہ سے آئین میں ترمیم بھی ہوگی اور ان ضرورتوں کا احساس دراصل عاملہ کو ہوگا جو نظم و نسق کا ایک وسیلہ ہے۔ عدلیہ کا دباؤ یا شورہ قانون سازوں کو متاثر کرے گا اور حرکت میں لائے گا۔ ڈاکٹر امبیڈکر کا یقین تھا کہ یہ سب فطری اور قابل قبول عمل ہے جو مستقبل میں ہندستان کی سیاسی اور سماجی زندگی اختیار کرے گی۔ اس کا دروازہ کھلا رکھنے کی خاطر آرٹیکل ۳۶۸ ضروری تھا لیکن ڈاکٹر امبیڈکر نے فرد کی بالادستی، اس کی اہمیت اور سماجی زندگی میں اس کو عزت و وقار سے مالا مال رکھنے کے فرض پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ ترمیم کا محدود اختیار اور پھر عدلیہ کے ذریعے چارہ جوئی کے دروازے بھی انھوں نے کھلے رکھے۔ یہ دروازے ہمیشہ

(باقی صفحہ ۳۹ پر)



عابد سُہیل

آزمائشِ دار و رسن

ضروری نہیں کہ جہاں جہاں آگ ہو وہاں دُھواں بھی ہو۔ شعلے بلند ہوتے رہتے ہیں اور دھویں کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں جہاں دھواں ہو وہاں آگ ضرور ہوتی ہے۔ اگر دھویں کو اس احساس کی علامت سمجھا جائے جو آگ میں جلنے سے پیدا ہوتا ہے تو اکثر اس احساس کے نمودار ہونے میں وقت لگتا ہے۔ ابتدا میں تو اکثر اس آگ میں جلنے والے کو اپنی تکلیف کا احساس بھی نہیں ہوتا، پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اکثر صورتوں میں صدیوں بعد کسی ایک واقعہ، حقارت کی ایک نظر یا ماحول کی گھٹن اور اجتماعی بے آبروئی سے ان سارے لوگوں کے دل، جنھوں نے اس صورت حال کو اپنا مقدر، قدرت اور نوشتۂ تقدیر سمجھ رکھا تھا، اس دھویں سے بھر جاتے ہیں اور یہ دُھواں فضائے بسیط میں اس طرح پھیل جاتا ہے کہ آگ، سب کچھ جلا کر خاکستر کر دینے والی آگ، اس دھویں کے سامنے حقیر بن جاتی ہے

یہ انسانی سماج، انسانی زندگی اور انسانی احساس کا ایک ایسا کلیہ ہے جس میں درد حد سے گزر جانے کے بعد دوا نہیں بنتا، شعلہ جوالہ بن جاتا ہے جو اس آگ کو بھی جلا ڈالتا ہے جس میں وہ خود ایک عرصے جلتا رہا ہے۔

لیکن انسان نے اب اپنے تجربوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور سماج نے صدموں کو جذب کر لینے کے ایسے طریقے ایجاد کر لیے ہیں جن سے اکثر تصادم ٹل جاتے ہیں اور مفاہمت کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ ہمارے سماج کے اس بہت بڑے طبقے کے لیے جو صدیوں سے معاشی، سماجی اور تعلیمی طور پر اور ترقی کے دوسرے میدانوں میں پچھڑے رہنے کی وجہ سے اس منزل پر پہونچ گیا تھا جس کے نیچے کوئی منزل نہیں، قوم کے مصلحوں نے سماج کی ایسی بخیہ گری کی کوشش کی کہ قبائے ملک و قوم چاک نہ ہو جائے۔ ان کوششوں میں ان لوگوں کا ہاتھ بھی تھا جو اس طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود جس کے لیے ترقی کے دروازے کھلے تھے۔ مستقبل میں جھانک کر دیکھ سکتے تھے۔ اور جنھیں احساس تھا کہ اس ہمالیائی بلندی اور پستی کا فرق اگر نہ مٹایا گیا تو یہ پستیاں بلندیوں کو ختم کر دیں گی، اور وہ بھی جو اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جنھیں ان بلندیوں کو دیکھنے کے لیے بھی اس دستار کو سنبھالنا پڑتا تھا جو اس کے سر پر تھی ہی نہیں۔ ایک طرح سے یہ دونوں نقطہ ہائے نظر عظیم فاصلوں کے کونوں پر تھے، ایک دوسرے سے بہت دور لیکن اس کے باوجود کہ سارے سماجی رشتے معاشی رشتے ہوتے ہیں، انسانی تاریخ عبارت ہے ٹکراؤ اور کشمکش اور اس کشمکش کے بعد مفاہمت سے۔ چنانچہ بلندیوں اور پستیوں کے ان سروں کو ملانے کی کوششوں کو اس نقطۂ اتصال کی جستجو بھی قرار دیا جا سکتا ہے جس میں تصادم، ہم آہنگی کو جنم دیتے ہیں۔ اسے فلسفۂ جدلیات کے THESIS اور ANTI THESIS کے تصادم سے SYNTHESIS کے حصول کی کوشش کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

ہندستانی سماج نے اپنی آبادی کے ایک بڑے طبقے کو غلاموں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنے یا اسے تسلیم کرنے کے



عمل کو آسانی سے قبول نہ کیا ہوگا کہ انسان فطری طور سے اذیت پسند نہیں لیکن جہاں آمدنی نہ ہو کہ سب کے لیے کافی ہو وہاں چوری بھی ہوگی ڈاکے بھی ڈالے جائیں گے اور دوسروں کا حق بھی مارا جائے گا اور جب یہ سلسلہ طویل عرصہ تک چلتا رہتا ہے تو دلِ شوریدہ سر پناہ ہیں ڈھونڈھتا ہے اپنے ضمیر کے کچوکوں کو قابلِ برداشت بنانے کے لیے کبھی مذہب کا سہارا لیتا ہے، کبھی رسم و رواج کا ہاتھ تھامتا ہے، تعیّنات کی اصطلاح میں اس "ناقابلِ برداشت صورتِ حال کو عقلی طور پر قابلِ قبول بنانے کی کوشش (Rationalisation) کا نام دیا جاتا ہے۔

تاریخ کا عمل بہ ظاہر پُرسکوت سمندر کی سطح پر بھی ارتعاش کی لہریں پیدا کرتا ہے۔ اس ملک میں ہر نئے آنے والے نے، وہ اسے اپنا نیا گھر بنانے والا ہو یا اس سے اپنی معیشت کو ترقی کی نئی منزلوں سے روشناس کرانے والا، اس بظاہر منجمد سماج میں نئی اتھل پتھل کو جنم دیا۔ ان نئے آنے والوں میں کچھ ایسے تھے جو انسان اور انسان کے فرق کو سمجھتے ہی نہ تھے اور دوسرے ایسے جو ہمارے ہی بل بوتے پر اپنی زمامِ حکومت کی گرفت مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ لیکن تاریخ کسی کو نہیں بخشتی، ظالم و جابر فاتح کو تو ہرگز نہیں۔ اور وہی دوا جو خانہ ساز سمجھ کر استعمال کی گئی تھی خانہ خرابی کا باعث بن گئی۔

اس "خانہ خرابی" کی ایک شکل وہ تھی جو ہندستان میں سماجی اصلاح کی کوششوں اور بعد میں اس عظیم سیاسی تحریک کا سبب بنی جس کے سبب ملک نے کم و بیش سو سال کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا اور ان دونوں عظیم تحریکوں نے ہندستان میں راجہ رام موہن رائے، موتی لال نہرو، سرسید، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، جے پرکاش نرائن، ایس۔ اے۔ ڈانگے، رام منوہر لوہیا اور ــــ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کو جنم دیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء کو مدھیہ پردیش میں مہو نامی مقام پر جنم لیا اور تعلیم کی بالکل ابتدائی منزلوں میں ہی مروجہ سماجی نظام کی زیادتیوں کا انھیں شکار ہونا پڑا۔ اسکول میں انھیں دوسرے طلبا سے الگ بٹھایا جاتا تھا۔ پیاس بجھانے کے لیے کنویں سے پانی پینے کی انھیں اجازت نہیں تھی اور ان سے یہ تک کہا گیا کہ ان کے بال کاٹنے سے حجام کا اُسترا اور قینچی ناپاک ہو جائے گی۔ حد یہ ہے کہ بمبئی میں کالج کی تعلیم کے دوران قدم قدم پر انھیں اس ظلم، جبر اور محرومی کا شکار ہونا پڑا، جو سماج کے ایک بڑے طبقے کو برداشت کرنا پڑتے تھے۔ یہ تھا وہ پس منظر جس نے بھیم نامی نوجوان کو ایک طویل جدوجہد کے بعد جب بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر بنا دیا اور آئینِ ہند کے اس معمار کی تصویر کو اس کے انتقال کے ۳۵ سال بعد پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں جگہ ملی اور انھیں ملک کے عظیم ترین اعزاز 'بھارت رتن' سے نوازا گیا۔

یہ تصویر اور یہ اعزاز کچلے ہوئے اور پسماندہ عوام کے مسائل کا حل نہیں ہیں لیکن اس احساس کی علامت ضرور ہیں کہ ملک ترقی اور صحیح معنوں میں انصاف کی راہ پر اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک اس ظلم و جبر کو ختم نہیں کیا جاتا ہے اور اس طبقے کو، جس کے لیے آزادی اور اس کے جلو میں حاصل ہونے والے فوائد دُور کے جلوے کی حیثیت رکھتے ہیں، اقتدار میں شریک نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹر امبیڈکر کو یہ اعزاز بخش کر ملک نے دراصل ان امیدوں اور آرزوؤں کو احترام بخشا ہے جن کے لیے ڈاکٹر امبیڈکر نے ساری زندگی جدوجہد کی۔

مانٹ فورڈ اصلاحات (۱۹۱۹ء) سے کیبنٹ مشن پلان (۱۹۴۶ء) تک ملک میں سماجی اور سیاسی انصاف کی ہر جدوجہد کے ہر اہم موڑ پر ڈاکٹر امبیڈکر موجود رہے۔ ان کے نقطۂ نظر، خیالات اور جدوجہد نے سیاسی شعور کی تشکیل میں زبردست حصہ لیا۔ خوش قسمتی سے ہندستان کی سیاسی اور سماجی قیادت بڑی حد تک ان روشن خیال لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو ان کے درد سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اسے دُور بھی کرنا چاہتے تھے۔ اختلاف صرف اس پر تھا کہ اس کارواں کی سست یا تیز رفتار کیا ہو۔

ڈاکٹر امبیڈکر تیز تر گام زن کے قائل تھے جب کہ بہت سے دوسرے ذہن سطحِ عالم کی ناہمواری کے سبب آہستہ روی کے حامی تھے۔ لیکن گاندھی جی نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کر لیا تھا اور

جب انگریز حکمرانوں نے ملک کے مختلف طبقوں کے درمیان اختلافات کی خلیج میں اضافہ کرنے کے لیے پس ماندہ طبقوں کے لیے علاحدہ حق رائے دہندگی کی تجویز رکھی تو انھوں نے بڑودہ سنٹرل جیل سے سکریٹری آف اسٹیٹ سر سیموئل ہوور کے نام اپنے ۱۱ مارچ ۱۹۳۲ء کے خط میں لکھا کہ اگر اس تجویز کو عملی شکل دے دی گئی تو وہ مرن برت شروع کرنے سے خود کو باز نہ رکھ سکیں گے۔ لیکن گاندھی جی نے اپنے اس خط میں یہ بھی لکھا کہ:

"میں پس ماندہ طبقوں کو قانون ساز مجلس میں نمائندگی دینے کے خلاف نہیں ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ پس ماندہ طبقے کے ہر فرد کو، وہ مرد ہو یا عورت حق رائے دہندگی دیا جائے اور ان پر اس حق کے لیے موجودہ تعلیم اور املاک کے حقوق کا نفاذ نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسروں کے لیے حق رائے دہندگی کے شرائط کو سخت کر دیا جائے۔" ۵

لیکن کم و بیش سات ماہ تک خط و کتابت کرنے کے بعد جب وہ پس ماندہ طبقہ کو حقوق دینے کے حامیوں اور مخالفوں اور علاحدہ حق رائے دہندگی کی تجویز کے متوقع خطرات سے حکمراں طبقہ کو قائل نہ کر سکے تو انھوں نے اپنے ۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کے بیان میں یہ تک کہہ دیا کہ:

"اگر عام ہندوؤں کا ذہن چھوت چھات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اب بھی تیار نہیں ہے تو اسے معمولی سی ہچکچاہٹ کے بغیر مجھے قربان کر دینا چاہیے مشترکہ حق رائے دہندگی کے مخالفوں کے ساتھ کسی قسم کا جبر و تشدد نہیں برتا جانا چاہیے۔ ان کی شدید مخالفت (کے اسباب) سمجھنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں مجھ پر عدم اعتماد کا انھیں پورا حق ہے کیا میں اس ہندو طبقے کا فرد نہیں ہوں، جسے غلطی سے اعلا طبقہ یا اعلا ذات کے ہندو کا نام دیا جاتا ہے۔" ۶

اپنے اسی بیان میں، جو انھوں نے بڑودہ جیل سے جاری کیا تھا، گاندھی جی نے کہا تھا کہ ____

"مشترکہ حق رائے دہندگی کی بنیاد پر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور پس ماندہ طبقے کے نمائندہ رہنماؤں میں اگر کوئی ایسا سمجھوتہ ہو جائے جسے سارے ہندو بڑے عوامی جلسوں میں تسلیم کر لیں تو میں اس کا پابند رہوں گا۔" ۷

گاندھی جی کے بیان کے اس آخری حصے نے ہی اس "تاریخی" پونا معاہدہ کے لیے راستہ ہموار کیا جس پر پنڈت مدن موہن مالویہ اور سر تیج بہادر سپرو کے علاوہ ڈاکٹر امبیڈکر نے بھی اپنے دستخط ثبت کیے تھے۔ ۸

اسی معاہدہ کے تحت نشستوں کے تحفظ کا جو اصول طے ہوا تھا آئین ہند کی تشکیل کے وقت اسے پیش نظر رکھا گیا۔

لیکن پس ماندہ طبقوں کے لئے ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے اور کامیابی کے ہر موڑ پر یہ طبقے، خواہ ان کا تعلق کسی بھی ذات یا مذہب سے ہو، ڈاکٹر امبیڈکر کی جدوجہد اور ملک کے ذہن کو بیدار کرنے کی کوششوں کو نہ بھول سکیں گے۔ ایک نہ ایک دن ڈاکٹر امبیڈکر کے خواب حقیقت کی شکل ضرور اختیار کریں گے اور وہ دن ہندستان میں صحیح معنوں میں آزادی اور جمہوریت کا دن ہوگا۔

حواشی:

۱ تا ۸ انسائیکلوپیڈیا آف دی انڈین نیشنل کانگریس ۳۵-۱۹۳۲ء۔ جلد ۱۰ صفحات ۲۴۶ تا ۲۶۱

□□

شیما رضوی

آئین مساوات کے نقیب
ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

سنسد بھون کی گیلری میں اعلیٰ خاندان کے قومی لیڈروں کی صف میں بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر کی تصویر دیکھ کر میرے دل نے یہ سوال کیا کہ اس مردِ مجاہد کو عزت کی یہ کرسی عطا کرنے والے کیا ہم ہیں؟ —— ہرگز نہیں —— یہ کمال ہے اس پُرعزم مستقل مزاج آہنی شخصیت کا جس نے یہ مقام خود حاصل کیا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ اتنا اچانک نہیں ہوگیا۔ اس تصویر کو ذلت کی جھونپڑی سے نکل کر سنسد بھون کی گیلری تک پہونچنے میں پوری زندگی صرف ہوئی۔ وہ زندگی آبلہ پائی جس کا پس منظر رہی۔ شہر میں داخل ہونے سے لے کر مندر کی سیڑھیوں پر قدم رکھنے تک ایک جد و جہد کرنا پڑی ہے اور اسکول کی پڑھائی سے لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے تک روح فرسا مشکلات سے گزرنا پڑا ہے۔

اس کہانی کا آغاز ہوتا ہے اس وقت جب مہاراشٹر کے مھو نامی مقام پر بھیما بائی کے بطن سے اچھوت مہار ذات کے ایک فوجی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رام جی سکپال کے گھر ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء کو ان کے چودھویں (آخری) بچے بھیم راؤ کا جنم ہوا۔ ان کے دادا کا نام مالوجی سکپال تھا۔ ان کا تعلق بھی فوج سے تھا۔ اس لیے کہ مہار قبیلے کے لوگ اپنی بہادری اور جواں مردی کے باعث عموماً فوج میں داخل کیے جاتے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ مہاراشٹر کا نام بھی اسی مہار قبیلے کے تعلق سے بعد کو مہاراشٹر ہوگیا۔

بھیم راؤ کے والد ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ستارا چلے گئے۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء میں ستارا کے ایک مقامی ہائی اسکول کے پہلے درجہ سے بھیم راؤ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ یہیں امبیڈکر نامی ایک استاد سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے امبیڈکر کو اپنے نام کا ایک جز بنا لیا اور اس طرح وہ بھیم راؤ سے بھیم راؤ امبیڈکر ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان میں نسبی اونچ نیچ کا تعصب اپنے عروج پر تھا۔ اونچ نیچ کے اس تصور نے چھوا چھوت کو جنم دیا۔ ہندستان میں اچھوت کہلانے والی برادری تہذیبی، تمدنی، تعلیمی اور ثقافتی ہر اعتبار سے پچھڑی ہوئی تھی۔ ان کے لیے اونچی ذات والوں کے دلوں میں اس قدر نفرت تھی کہ پیاسا ہونے پر وہ انھیں پانی تک دینے کے روادار نہیں تھے۔ اگر کسی کو بہت ترس آگیا تو ان کے منھ میں دور سے پانی ٹپکا دیا جاتا تھا۔ معاشرے سے علاحدگی کا یہ عالم تھا کہ بھینسوں کے بال تو حجام تراش سکتا تھا لیکن اچھوتوں کے بال تراشنے پر اسے اعتراض تھا۔ دھوبی ان کے کپڑے دھونے پر رضامند نہیں ہوتے۔ اسکول میں ایسے بچوں کو کونے میں ٹاٹ کی پٹی پر بٹھایا جاتا اور یہ پٹی بھی وہ اپنے گھر سے خود لاتے تھے۔ استاد ان کی کاپیوں کو چھوتے تک نہیں تھے۔ یہ ماحول تھا جب بھیم راؤ امبیڈکر نے

ذہنی انتشار کے ساتھ تعلیمی ماحول میں قدم رکھا۔ سیاجی راؤ کی مدد سے پچیس روپیہ ماہانہ وظیفہ حاصل کرتے ہوئے انھوں نے بمبئی کے الفنسٹن کالج میں قدم رکھا۔ کہنے کو تو وہ ہاسٹل میں داخل ہو چکے تھے لیکن ذلت کے برتاؤ کا یہ عالم تھا کہ کوئی انھیں اپنے ہاتھ سے کھانا پانی تک دینے کو تیار نہ تھا۔ کیسی ذہنی اذیت کا دور رہا ہوگا۔

بھیم راؤ امبیڈکر نے دو شادیاں کیں۔ ان کی پہلی شادی چودہ سال کی عمر میں نو سالہ رام بائی نامی ایک لڑکی سے ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء میں ان کی دوسری شادی ڈاکٹر شاردا کبیر کے ساتھ ہوئی جو آج شریمتی سویتا امبیڈکر کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ خانگی زندگی کو انھوں نے اپنے پیروں کی بیڑیاں نہیں ہونے دیا۔ تمام نفرتوں کے باوجود وہ انتہائی محنت اور لگن سے اپنی تعلیم کی تکمیل میں لگے رہے۔

۱۹۱۲ء میں انھوں نے بی، اے کی ڈگری حاصل کی۔ گریجویشن کرنے کے بعد وہ بڑودہ راج میں لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہوئے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مہاراجہ بڑودہ کی جانب سے حاصل ہونے والے وظیفہ کی بنیاد پر انھوں نے کولمبیا (امریکا) کا سفر کیا۔ کولمبیا یونیورسٹی کے گایک وارڈ اسکالر کی حیثیت سے ۴؍جون ۱۹۱۴ء کو داخلہ لینے والے مہار ذات کے وہ پہلے طالب علم تھے۔ ۱۹۱۵ء میں "قدیم ہندستانی تجارت" کے عنوان سے لکھے گئے تحقیقی مقالے پر انھیں ایم، اے کی ڈگری حاصل ہوئی۔

جون ۱۹۱۶ء میں ان کے تحقیقی مقالے بہ عنوان :-

"NATIONAL DEVELOPMENT FOR INDIA

HISTORICAL AND ANALYTICAL STUDY"

پر انھیں ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کی ڈگری دی گئی اور اس طرح کل کا نظر انداز کیا ہوا بچہ بھیم راؤ امبیڈکر اپنی محنت اور جاں فشانی کے سبب آج کا ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر بن گیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر کے اس تحقیقی مقالے نے بعد کو "THE EVOLUTION OF PROVINCIAL FINANCE IN BRITISH INDIA" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو کر خراج تحسین وصول کیا۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت ڈاکٹر امبیڈکر ہلٹن ینگ کمیشن کے مالیاتی مسائل پر بحث کر رہے تھے تو اس وقت وہاں موجود ہر ممبر کے ہاتھ میں یہ کتاب ریفرنس بک کے طور پر موجود تھی۔

امریکہ کے قیام کے دوران ڈاکٹر امبیڈکر کی ملاقات لالہ لاجپت رائے سے بھی ہوئی جہاں انھوں نے ہندستان کی آزادی پر سنجیدگی سے غور کیا۔ امریکہ کے دوران قیام انھوں نے ہندستان کے ذات پات اور اونچ نیچ کے نظریات سے متعلق زوردار مضامین شائع کیے جس میں "THE CAST IN INDIA, THEIR MECHAN-ISM, GENESIS AND DEVELOPMENT" کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے اس مضمون نے بھی بعد کو کتابی صورت اختیار کی۔

امریکہ کے دوران قیام وہ دو چیزوں سے خاص طور پر بے حد متاثر ہوئے۔ اول امریکن آئین کی چودھویں تصحیح، جس کی رو سے نیگرو قوم کی غلامی کو ختم کیا جانا منظور کیا گیا۔ دوسرے بوکر ٹی۔ واشنگٹن کی شخصیت، جو نیگرو قوم کے مصلح کی حیثیت سے پہچانے گئے۔

امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر امبیڈکر ۱۹۱۶ء میں لندن گئے۔ وہاں رہ کر وہ قانون اور معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہاں لندن اسکول آف اکنامکس" سے معاشیات میں ایم۔ ایس۔ سی کا پہلا سال مکمل کیا۔ گریز ان سے انھوں نے بار ایٹ لا کی تعلیم مکمل کی اور ۱۹۲۳ء میں انھوں نے ڈی۔ ایس۔ سی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ڈاکٹر امبیڈکر مزید تعلیم کے لیے جرمنی کی بون یونیورسٹی بھی گئے لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے انھیں ہندستان واپس آنا پڑا۔

اگرچہ تعلیمی اعتبار سے وہ کسی سے کم نہیں تھے لیکن ہندستانیوں کی طرف سے اپنے لیے احترام کا درجہ وہ ابھی تک حاصل نہیں کر پائے تھے۔ بمبئی پہونچنے پر ڈاکٹر امبیڈکر الفنسٹن کالج کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن اچھوت ہونے کی پیدائشی چھاپ ان پر چسپاں تھی چنانچہ پرنسپل ہونے کے باوجود طلباء ان کے پاس جاتے ہوئے اپنی توہین محسوس کرتے تھے۔



ڈاکٹر امبیڈکر اب عملی طور پر اس کلنک کو دھونے کے لیے میدان میں اتر آئے ۔ انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر کے ذریعے برابری کا حق پانے کے لیے پرزور آواز بلند کی ۔ انھوں نے بمبئی کے قیام کے دوران ۱۹۱۷ء میں ایک کتاب "SMALL HOLDINGS IN INDIA AND THEIR REMEDIES" لکھی ۔ اپنی قوم کو تعزلیت سے نکالنے کے لیے انھوں نے کئی مجلے شائع کیے جن میں ۱۹۲۰ء میں شائع کردہ "موک نائک" اور ۱۹۲۷ء میں شائع کردہ مراٹھی مجلہ "بہشکرت بھارت" کافی مشہور ہیں ۔ انھوں نے اس کام کے لئے کئی تنظیموں کی تشکیل بھی کی جن میں "بہشکرت ہت کاری سبھا" اور "پیپلس ایجوکیشن سوسائٹی" قابلِ ذکر ہیں ۔ سیاسی طور پر بھی انھوں نے اپنی کوشش جاری رکھی ۔ اس کے لیے انھوں نے INDEPENDENT LABOUR PARTY کی تشکیل کی ۔ یہی وہ پارٹی تھی جس نے بمبئی کی ودھان سبھا میں سترہ میں سے پندرہ سیٹیں حاصل کی تھیں ۔

ڈاکٹر امبیڈکر جولائی ۱۹۴۲ء میں گورنر جنرل کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر منتخب ہوئے ۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۴۶ء تک فائز رہے ۔ ۱۹۴۷ء میں وہ وزیرِ قانون کے عہدے پر فائز ہوئے جب انھوں نے ہندستان میں قومی یک جہتی کا پرزور نعرہ بلند کیا ۔ ایکتا کا نعرہ دینے والے وہ پہلے شخص نہیں تھے ' اچھوتودھار ' کی آواز اٹھانے والوں میں جین ، مہابیر ، شنکر ، کبیر ، ریداس اور دادو جیسی شخصیتیں بھی شامل تھیں ۔ پھر گاندھی جی ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھے اور انھوں نے کہا : " اب وقت آگیا ہے کہ ہندو جاتی سے انوسوچت جاتی کا قرض اتار دیا جائے ۔"

ڈاکٹر امبیڈکر نے گاندھی جی کے الفاظ میں پنہاں درد کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کیونکہ کسی دوسرے کے نزدیک یہ درد پڑوسی کا درد ہو سکتا تھا ، لیکن یہاں تو یہ درد خود ان کا درد تھا ۔ اس بے باک اور مؤثر لیڈر نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں بھی ' اچھوتودھار ' کی بات اٹھائی ۔ ہندستان کے سیاسی لیڈروں نے ان کے تیور کو پڑھ لیا تھا ۔ وہ دل ہی دل میں ان کی ذہانت اور دانش مندی کے معترف تھے ۔ چنانچہ ہندستان کی آزادی کے بعد وہ ہندستان کے آئین کا خاکہ تیار کرنے والی کمیٹی کے صدر منتخب کر لیے گئے اور اس میں شک نہیں کہ ہمارا ہندستانی آئین انھیں کی فراست کا مرہونِ منت ہے ۔ اس کام کی تکمیل کو سراہتے ہوئے کولمبیا یونیورسٹی نے ۵ جون ۱۹۵۲ء کو ایل ڈی کی اعزازی ڈگری تفویض کی ۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے تین عظیم ہستیوں کو اپنی زندگی کا رہنما بنایا ۔ اول کبیر ، جن سے انھوں نے بھگتی بھاؤنا اخذ کی ، دوسرے جیوتبا پھولے جن سے انھوں نے اونچی ذات کے مظالم کے خلاف آواز اٹھانا سیکھی تیسرے مہاتما بدھ جن سے ان میں اچھوتوں کی ترقی کے لیے لڑنے کا جذبہ بیدار ہوا ۔ اس کے علاوہ وہ یورپین فلاسفر ڈارون اور کارل مارکس کی STRUGGLE FOR EXISTENCE کی تھیوری سے بھی بے حد متاثر تھے ، کیوں کہ یہی تو ان کی زندگی کا بنیادی نصب العین تھا ۔

□□

جہادِ زندگانی اور امبیڈکر

ص ۴۲ کا بقیہ

شایانِ شان ہے مگر انھیں حقیقی خراجِ عقیدت اسی وقت پیش کیا جا سکتا ہے جب ان کے خوابوں کو عملی جامہ پہنایا جائے ۔ جن مقاصد کے لیے وہ تاحیات جدوجہد کرتے رہے ، جبر و استبداد کی قوتوں سے نبرد آزمائی کرتے رہے ۔ لاٹھیاں کھائیں ، لہولہان ہوئے مگر ان کے پائے استقلال متزلزل نہیں ہوئے ۔ ان اعلا اقدار پر کاربند رہ کر ہی ہم انھیں حقیقی خراجِ عقیدت پیش کر سکتے ہیں ۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا تھا : ــــــ

" میں نے یہ عہد کیا ہے کہ میں انہی پس ماندہ افراد کی خدمت کرتے ہوئے ان پر اپنی جان قربان کر دوں گا ، جن کے درمیان میں پیدا ہوا ہوں ، میری پرورش و پرداخت ہوئی ہے اور میں رہ رہا ہوں ۔"

□□



عشرت ظفر

نا آفریدہ لمحوں کی خلوت کا راز دار

کیوں کر نہ ہو بلند زمانے میں شانِ ہند
روشن نہ کیوں ہو شلِ گہر آسمانِ ہند
امبیڈکر، وہ شعلۂ نقش و نشانِ ہند
وہ آبروئے قوم وہ روحِ روانِ ہند

تاریخ کے افق پہ ہے تابندہ جس کا نام
ہر صفحۂ حیات پہ ہے زندہ جس کا نام

میخانۂ شعور کا وہ رندِ معتبر
دانش وری کی آتشِ صد رنگ کا شرر
عالی دماغ، پیکرِ تہذیب، خوش نظر
آئینہ زارِ زیست کے عکسوں سے بہرہ ور

نا آفریدہ لمحوں کی خلوت کا راز دار
صحرائے ماہ و سال کی وسعت کا راز دار

ہر پل مزاجِ صبحِ بہاراں سے باخبر
ہر لمحہ انقلابِ گلستاں سے باخبر
دانائے عصر، محفلِ یاراں سے باخبر
فن کاریٔ سیاستِ دوراں سے باخبر

احساس کے افق سے ابھرتا رہا مدام
پیچاکِ آگہی سے گزرتا رہا مدام

وہ شعلہ زارِ وقت، وہ رنجِ مسافرت
چالاکیاں کہیں نہ کہیں کوئی مصلحت
انساں کی تھی نگاہ میں وہ قدر و منزلت
روشن تھی جس کے لمس سے دل کی پرت پرت

بس فکر یہ تھی بانیٔ آئینِ ہند کو
میرا وطن غلامی سے آزاد کیسے ہو

سینے میں سرفروشی کا جذبہ جواں رہا
تھا حوصلہ بلند بہت بھیم راؤ کا
آندھی کی طرح بڑھتا لپکتا چلا گیا
احباب کا خلوص ہمہ وقت ساتھ تھا

برطانی سامراج کے چھکے چھڑا دیے
ہر دل پہ سکے مہر و وفا کے بٹھا دیے

تاریکیوں میں ڈوبی فضائیں نکھر گئیں
زنجیرِ شب پگھل گئی کڑیاں بکھر گئیں
تقدیریں اہلِ ہند کی یکسر سنور گئیں
یکلخت بھاگتی ہوئی صدیاں ٹھہر گئیں

ہر خار خونِ دل کی تراوش سے نم ہوا
قانونِ باغبانیٔ صحرا رقم ہوا

ذرات سے ہوئی جو نمودِ بساطِ گل
چمکا مہ و نجوم سا ہر سُو نشاطِ گل
ہر ساغرِ حیات میں تھا انبساطِ گل
جاگا فضا میں سلسلۂ ارتباطِ گل

پھر رنگِ رُخِ نگارِ وطن کا نکھر گیا
گردن سے اس کی طوقِ غلامی اتر گیا

ہے اعتراف مجھ کو کہ ہوں شخصِ بے ہُنر
لفظوں میں آب ہے نہ صدائیں مری اثر
اک جذبۂ خلوص مرے دل میں ہے مگر
اشعار یہ خراجِ عقیدت کے طور پر

کرتا ہوں اس کو پیش جو عالی وقار ہے
جمہوریت کے چہرے پہ جس سے بہار ہے

رباب رشیدی

ایک جوہرِ قابل

قدرت کی فیاضی بے حد و بے حساب ہے یہ تو ہم ہیں کہ ہم نے حدیں اور خانے مقرر کر رکھے ہیں۔ پست و بلند، کمتر و برتر، چھوٹا بڑا ہمارے ہی سماج کی دین ہے۔ جو طاقت ور ہوا وہ اعلا و ارفع ٹھہرا، جو کمزور پڑا اسے طرح طرح سے استحصال کا شکار ہونا پڑا۔ یہیں تک نہیں بلکہ ایک تحریک چلاکر نسل در نسل یہ باور کرایا گیا کہ تم اوپر اُٹھ ہی نہیں سکتے۔ تمام ذلتیں تمہارا مقدر ہیں۔ خبردار جو ہماری برابری کا تصور کیا۔ ایسی صورت میں تمہاری تباہی یقینی ہے۔ تمہارا کام یہی ہے کہ ہماری خدمت کرو اور اُجرت میں ہم چھوٹے موٹے اناج سے تمہاری پرورش کریں۔ پڑھنا لکھنا تمہارے لیے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے طبقے میں جینے کی اُمنگ کہاں سے آتی۔ سرفرازی کا خیال کہاں سے پنپتا اور نتیجہ یہ ہوا کہ عمریں پس ماندگی میں گزر گئیں۔ جہالت و غربت کے اندھیرے آنگنوں میں ڈیرا جمائے رہے۔

یہ سلسلہ ہزاروں سال سے ایک نظام کی صورت میں پھیلا ہوا تھا۔ انسانیت سسکتی رہی۔ زندگی کے تقاضے روتے رہے مگر کون تھا جو اُن کی فریاد سنتا۔ آخرکار وقت نے اپنا فیصلہ سُنایا اور نرگس کی بے نور آنکھوں میں روشنی جگمگانے لگی۔ یعنی ایک دیدہ ور مدھیہ پردیش کے مہو ضلع میں ۱۴؍اپریل ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوا۔ بعد میں بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر کے نام سے دُنیا نے اس دیدہ ور کو پہچانا۔

گلشنِ ہستی میں وہ ایک ایسے پھول کی طرح مہکے جو سدا بہار بھی تھا اور گل سرسبد کی بھی حیثیت رکھتا تھا۔

وقت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، انھیں دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی نہیں بدل سکتی۔ اور وقت نے طے کر لیا تھا کہ امبیڈکر کو کچلے ہوئے طبقوں کا نجات دہندہ بننا ہے اور ہزاروں سال سے بھوک اور افلاس کے اندھیروں میں زندگی گزارنے والوں کا مسیحا بننا ہے۔

اچھوت ہونے کے ناطے شروع ہی سے انھیں آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکول اور کالج میں ان کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا گیا لوگ انھیں گری ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ حصول علم میں جو پاپڑ بیلنا پڑے ان کا اندازہ ہم لگا سکتے ہیں۔ مگر کش مکش کے اس ماحول میں وہ بڑے حوصلے اور ثابت قدمی سے تعلیمی مدارج سے گزرتے رہے۔ خداداد ذہانت اور انتھک محنت کی بدولت کامیابی کا سہرا ان کے سر بندھ گیا۔ بعد میں مزید تعلیم کے لیے وہ امریکہ چلے گئے جہاں پی ایچ ڈی اور قانون کی ڈگری حاصل کی۔ پھر جب وطن عزیز واپس پلٹے تو سماج کی ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر ایک طویل جدوجہد شروع کی۔

اب ہندستان کی آزادی یعنی ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کا روزِ سعید آگیا۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں اور "انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ" نافذ ہوگیا۔ اس کے چوتھے روز یعنی ۱۹؍اگست کو ایک دستور ساز کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس میں ڈاکٹر امبیڈکر کو چیرمین منتخب کیا گیا اور وہ اس کمیٹی کے روح رواں ثابت ہوئے۔ انھوں نے اس سلسلے میں بڑی



محنت کی۔ ان کی نشستیں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے تک چلا کرتی تھیں۔

ان کی جاں سوزی کا احوال مسٹر کرشنا چاری کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے جو اس کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ انھوں نے ۵ر نومبر ۱۹۴۸ء کو آئین ساز کمیٹی کی ایک میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ دستور ساز کمیٹی کے سات ممبروں میں بیشتر مختلف وجوہ کی بنا پر اس کام میں ہاتھ نہیں بٹا سکے اس لیے مجموعی طور پر آئین سازی کی ذمہ داری پوری کی پوری ڈاکٹر صاحب پر آ گئی۔ شاید ایسے ہی مواقع کی مناسبت سے یہ مصرعہ کہا گیا ہے ؎

قرعۂ فال بنام دلِ دیوانہ زدن

اب اگر جواہر لال نہرو انھیں "معمارِ دستورِ ہند" قرار دیتے ہیں یا بہ قول ڈاکٹر راجندر پرشاد کہ :

"ہم نے اس سے اچھا دوسرا کام ہی نہیں
کیا کہ ڈاکٹر امبیڈکر کو دستور ساز کمیٹی میں شامل
کیا نیز انھیں چیرمین منتخب کیا"...

تو یہ حضرات بیجا نہیں کہتے بلکہ اعتراف حقیقت کرتے ہیں۔ ان کی عظمت و اہمیت سے انکار کرنا مہرِ عالم تاب کی ضیا پاشیوں سے آنکھیں چرانا بلکہ اپنی بے بصیرتی کا ماتم کرنا ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے دستور ہند کی شکل میں ایک عدیم المثال تحفہ ہم ہندستانیوں کو دیا ہے۔ بچپن سے لے کر تعلیمی مراحل تک اور عملی جد و جہد سے ملک کی آزادی تک، ہر ہر مرحلے میں ان کی سوچ مضطرب اور پریشان رہی ہے۔ بظاہر کوئی راستہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کچلے ہوئے پس ماندہ طبقات کو کس طرح اس دلدل سے نکالا جائے، جس میں وہ صدیوں سے پھنسے ہوئے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ ان کی احتجاجی سرگرمیاں بھی دم توڑ چکی تھیں اور وہ رامنی بڑھائے سماج بن کر رہ گئے تھے۔ ایسے ہی عالم کرب میں قدرت نے ڈاکٹر امبیڈکر کو ایک موقع فراہم کر دیا۔ اور وہ دستور ساز کمیٹی کے کرتا دھرتا بن گئے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ان کی بے چینی ہی انھیں اس طرف لے آئی تھی وہ ایک عظیم مقصد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے سوچا اس طرح وہ زخمی انسانیت کی مدد کر سکیں گے۔ افسردہ چہروں کو شگفتگی دے سکیں گے، بجھتی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی چمک لا سکیں گے۔

جمہوری نظام کی شکل میں جو آئین ڈاکٹر امبیڈکر نے مرتب کر کے قوم کو دیا وہ ایک روشن مستقبل کی ضمانت ہی نہیں ملک کے اتحاد و سالمیت کی گارنٹی بھی ہے۔ اس آئین کی موجودگی میں ہماری جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر ایک عظیم و مربوط فکر کے مالک تھے جس کے سوتے مہاتما بدھ کے سرچشمۂ تعلیم سے ملتے ہیں۔ وہ بار بار فرد کی اہمیت، عرفان ذات اور خود احتسابی کی بات کرتے ہیں۔ وہ مادی وسائل پر انحصار کرتے نظر نہیں آتے، نہ ہی انقلاب فرانس سے براہ راست متاثر ہونے کا اقرار کرتے ہیں بلکہ وہ روحانی اقدار پر ہی یقین رکھتے ہیں اور انھیں کو انسانیت کے زخموں کا مرہم سمجھتے ہیں۔ انھوں نے جینے کا فلسفہ مہاتما بدھ سے سیکھا ہے۔ ان کے فکر کی تمام تر اساس مہاتما بدھ کی تعلیمات پر ہے اور مہاتما بدھ کی تعلیمات کے بنیادی عناصر انسانی برادری کے ہمہ گیر تصور، زندگی کی ناپائیداری اور اخلاقی قدروں سے مملو ہیں، جس میں برابری، آزادی اور ضمیر کی آواز کا پاس بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ لامحدود آزادی کی بھی نفی کرتے نظر آتے ہیں، کیونکہ اس سے انتشار و بے راہ روی کو بڑھاوا ملتا ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر ایک ایسے نظام حیات کے متلاشی نظر آتے ہیں جس میں امن و امان، بھائی چارہ، مساوات اور ایک دوسرے کے جذبات کی پاسداری موجود ہو، جہاں لوگ اپنے ہی جیسوں کو نفرت و حقارت سے نہ دیکھیں۔ جہاں نسلی امتیاز اور تفرقہ نہ ہو۔ جہاں مذہب انسانی اقدار کا ترجمان و نگہبان ہو۔ جہاں حقوق و فرائض یکساں اور مساوات کی بنیاد پر ہوں۔ یہی صورت اختیارات کے سلسلے میں بھی ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں کہ کسی کو اختیارات سے بالکل محروم کر دیا جائے اور کسی کو اختیارات سے حاکم بنا دیا جائے۔ جیسا کہ ہوتا آ رہا تھا، اسی لیے انھوں نے آئین کی تشکیل کرتے وقت

ایک نئے اور خوش حال سماج کا تصور پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ بات ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی کہ جب تک عقائد میں بنیادی چیزوں کی اصلاح نہیں ہوتی، سماج میں برابری کا تصور ادھورا رہے گا۔ اس ضمن میں وہ ہمیشہ سرگرم کار رہے۔ اگر موجودہ معاشرہ پوری طرح ان نظریات کو قبول کر لے تو اس عظیم ملک کی تاریخ کچھ اور ہی ہو جائے۔ بابا صاحب ایک ایسا دریائے فیض ہیں جہاں سب کی تشنگی بجھنے کا سامان ہے کسی بھی قوم میں ایسے افراد باعث صد افتخار ہوتے ہیں اور اس قوم کو کسی شرمندگی اور احساس کمتری کی ضرورت نہیں جس میں ڈاکٹر امبیڈکر موجود ہوں۔

ہندستان کی سماجی ناہمواریوں نیز طبقاتی نظام کی خامیوں پر جیسی نظر ڈاکٹر امبیڈکر کی تھی اس کا ادراک گاندھی جی کے علاوہ شاید اوروں کو کم تھا۔ اس کا بڑا سبب خود ان کا ایک نچلے طبقے میں پیدا ہونا تھا۔ لہٰذا ان سے زیادہ کسی کو یہ درد ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ چیتھڑوں میں لپٹے بچے، زیورات و آرائش سے محروم کی گئیں عورتیں، بے دوا علاج موت کی آغوش میں سانس لیتے بوڑھے۔ رات دن خدمتیں کرتے مرد، عبادت خانوں کے دروازے ان کے لیے بند، پانی پینے کے لیے گاؤں سے خاصی دور کنوئیں۔ غرض ایک ایسی گھناؤنی تصویر جو انسانیت کے نام پر گہرا داغ تھی۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ اس ملک میں سب کچھ تھا مگر مساوات آزادی اور جذبۂ اخوت ہی نہیں تھا۔ پھر انصاف و رواداری کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے۔ ریزرویشن پر تنقید کرنے والے ان تلخ حقائق کو نظر انداز کر جاتے ہیں جن کو صدیوں سے ایک بڑا طبقہ جھیل رہا تھا اور جس کو بعض تحفظات دے کر اسی استحصال کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ اس پر احسان نہیں تھا بلکہ اپنی خامیوں کا اعتراف تھا اور انسانیت کی ایک بڑی عظمت تھی

آزادی کو اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی ابھی وہ منزل نہیں آئی ہے جس کا خواب ڈاکٹر امبیڈکر نے دیکھا تھا۔ ابھی معاشرہ میں وہ خرابیاں موجود ہیں، ہاں تناسب ضرور گھٹا ہے۔ ان باتوں کا اندازہ دیہی علاقوں میں آج بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے مگر آنے والا کل روشن ہے، اسے آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ اس کل میں جہالت کافور ہو جائے گی افلاس و پسماندگی ماضی کی داستانیں بن جائیں گی۔ ظلم و استبداد کے قصے پرانے ہو جائیں گے۔ علم کی روشنی اپنا جادو جگائے گی۔ ہر گھر جگمگائے گا اور تاریخ ہند کے صفحات ان کے کارناموں سے تابندہ نظر آئیں گے۔

ہمارے اس یقین کو کوئی متزلزل نہیں کر سکتا کہ ڈاکٹر امبیڈکر آئین ہند کا عنوان جلی ہیں اور اس عنوان کے بغیر جمہوریت کی بات بے معنی ہے۔ جب تک جمہوریت ہے، امبیڈکر کا نام آفتاب کی طرح چمکتا رہے گا ـــــ ایسا آفتاب جس کو کبھی گہن نہیں لگتا

□□

"راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ملک کے مفاد کے لئے میں نے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ میں ملک کے لیے جتنا لڑا جھگڑا اتنا کوئی اور نہیں لڑا۔ انگریزی حکومت پر جیسی تنقیدیں میں نے کی ہیں ویسی شاید ہی کسی .... نے کی ہوں گی۔ مجھے آپ یہ کہنے کی اجازت دیں کہ جتنا آزادی پسند میں ہوں اتنا کوئی نہیں ہے۔ میں اپنے ملک کے جلد آزاد ہونے کا متمنی ہوں۔"

ـــــ ڈاکٹر امبیڈکر

"اس میں (ڈاکٹر امبیڈکر میں) قربانی کا جذبہ ہے۔ قربانی دینے کی طاقت ہے۔"

ـــــ مہاتما گاندھی

ڈاکٹر امبیڈکر

دبے کچلے طبقوں کے مجاہد و محافظ

بشیر فاروقی

ڈاکٹر امبیڈکر کی شخصیت ڈاکٹر اقبال کے مصرعے "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا" کی تفسیر تھی۔ انیسویں صدی میں سرزمینِ وطن میں جن عظیم شخصیتوں نے اپنے کارہائے نمایاں سے چار چاند لگائے، ان میں ڈاکٹر امبیڈکر کا نام بہت نمایاں ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے جب ہوش سنبھالا تو انھوں نے دیکھا کہ ہندستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ انسانی حقوق اور شخصی آزادی پر پابندیاں عائد تھیں۔ انگریزی سامراج نے اپنی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی سے ہندستان کو خانوں میں بانٹ دیا تھا۔ اگرچہ مذہبی پیشواؤں نے سماجی اصلاح کی کوشش کی لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے وہ ہندستان کو ایکتا کے دھاگے میں باندھنے میں ناکام رہے۔ انگریز حکمراں ذات پات کی تفریق اور مذہبی کٹرپن کا پوری طرح فائدہ اٹھاتے رہے۔ اسی بکھراؤ کے باعث ہندستان کو کافی عرصہ تک انگریزوں کا غلام رہنا پڑا۔

انیسویں صدی کے آخری برسوں میں ہندستان کی قومی تحریک نے واضح شکل اختیار کرلی۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا آزادی کا مطالبہ تاریخی واقعہ تھا، جس نے تحریکِ آزادی کو ایک نئی جہت عطا کی اور قومی ایکتا کو استحکام بخشنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ درحقیقت یہ ایسا دور تھا جب پہلی بار ہندستانیوں نے ملک کے نظم و نسق میں دلچسپی لینا شروع کی۔ اسی دوران ایک ایسا بھی وقت آیا جب انگریز حکمراں ملک کے دستوری ڈھانچے میں کچھ تبدیلی لانے پر غور کرنے لگے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ پس ماندہ اقوام اپنے حقوق کے لیے لڑیں، لیکن اس قومی تحریک میں ہندستان کے پس ماندہ طبقے کی نمائندگی کی کمی تھی۔ اچھوت اس قومی دھارے سے بالکل الگ تھے۔ پس ماندہ طبقے میں سیاسی شعور کی بھی کمی تھی۔ یہی سبب تھا کہ سیاسی طاقتیں پس ماندہ اقوام کی اہمیت سے بالکل بے نیاز تھیں۔ سیاسی سطح پر ان کا وجود غیر تسلیم شدہ تھا۔

ڈاکٹر امبیڈکر ۱۹۱۷ء میں لندن سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب ہندستان واپس آئے تو اس وقت یورپ میں آزادی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ملک میں بھی غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تحریک عروج پر آرہی تھی۔ ڈاکٹر امبیڈکر کو اپنی زندگی میں جس تفریق اور سماجی غلامی کا احساس ہوا، اس نے ان کے آزادی کے تصور کو اور بھی مستحکم بنادیا۔ اپنے غیر ملکی قیام کے دوران وہ مہذب سماج کی سیاسی بازی گری سے آشنا ہو چکے تھے۔ دورانِ تعلیم ان کا رابطہ اس وقت کے عظیم مفکروں اور قانون دانوں سے قائم ہوا۔ پچھڑے فرقہ کی غلامی کو ختم کرنے سے متعلق نظریے نے ان کو بہت متاثر کیا۔ جس کے نتیجے میں انسانی حقوق، مساوات اور آزادی کی طرف وہ اور متوجہ ہوئے۔ ہندستان آتے ہی انھوں نے غیر منظم پس ماندہ سماج کو منظم کیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر ۱۹۱۸ء میں بمبئی کے سیڈنہم کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے

جہاں انھیں چھوت چھات کا شکار ہونا پڑا۔ انھوں نے جنوری ۱۹۲۰ء میں "موک نائک" نام سے مراٹھی میں ایک اخبار نکالا جس کے توسط سے پس ماندہ طبقے کی اصلاح کا کام شروع کیا۔

۱۹۳۰ء کا سال ان کے لیے سخت امتحان کا سال تھا۔ یہ ستیہ گرہ کا زمانہ تھا۔ جب انڈین نیشنل کانگرس اور گاندھی جی ہندستان کی سیاسی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر امبیڈکر اچھوتوں کی سماجی آزادی اور ان کے سیاسی حقوق کے لیے لڑ رہے تھے۔ وہ انگریزی سامراج اور مذہبی کٹرپن دونوں ہی کے زبردست مخالف تھے۔ وہ ایسی سماجی تنظیم کے روح رواں تھے جو انسان کی سیاسی اور سماجی برابری کی علمبردار تھی۔ چنانچہ پہلی گول میز کانفرنس میں جو ۳۱-۱۹۳۰ء میں منعقد ہوئی تھی، انھوں نے کہا تھا:۔

"جب ہم موجودہ صورت حال پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آگے بڑھنے کے بجائے ہم صرف وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ کیا انگریز حکومت نے چھوت چھات کو ختم کرنے کے لیے کچھ کیا؟ انگریزی حکومت سے پہلے ہم مندر میں نہیں جا سکتے تھے کیا اب جا سکتے ہیں؟"

اپنے واضح خیالات کی بنا پر انھیں ملک کا باغی تک قرار دیا گیا۔ وہ ان سب الزامات کی پروا کیے بغیر پس ماندہ طبقوں سے تعلق رکھنے والے کروڑوں لوگوں کو ان کے حقوق دلانے کے لیے لڑتے رہے۔

انھوں نے ان طبقوں کو للکارا کہ وہ منظم ہو کر لڑتے رہیں۔ مذہبی کٹرپن اور سماجی نابرابری نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ وہ دَورِ غلامی کو ختم کرنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ اسی دوران ہندستان کے لیے آئین سازی کی ذمہ داری ان کے کاندھے پر آگئی۔ اس طرح انھیں اپنی زندگی کے نصب العین کو ایک شکل دینے کا موقع ملا۔ انھوں نے بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ ہندستان کا آئین تیار کیا، جس میں تمام اہلِ وطن کے لیے مساوات اور انصاف کا پورا پورا خیال رکھا۔ ان کا خیال تھا کہ جمہوری نظام کا خواب اس وقت تک ادھورا رہے گا جب تک سماجی اور معاشی جمہوریت کا قیام عمل میں نہیں آتا۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی پوری زندگی دبے کچلے اور پسماندہ طبقوں کو ان کے حقوق دلانے، مذہبی کٹرپن دور کرنے کے لیے وقف کر دی درحقیقت وہ ہندستان کے پس ماندہ طبقوں کے مصلح اور ایک سچے قوم پرست تھے۔ وہ سیاسی آزادی اور سماجی برابری کے مابین ایک مستحکم رشتے کے قائل تھے، ان کے افکار و خیالات جمہوری نظام کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

□□

بیداری کے محرک

صد ۲۵ کا بقیہ

کہ ہم نے بہادروں کی طرح جینا چھوڑ دیا ہے آج ہمیں قسم کھانی ہوگی کہ ہم مُردہ جانور کا گوشت نہیں کھائیں گے۔ بھیک میں ملے باسی روٹی کے ٹکڑے قبول نہیں کریں گے۔ اپنی روزی محنت سے خود کمائیں گے دوسروں کے دست نگر نہیں رہیں گے۔ ہم دوسروں کے شانہ سے شانہ ملا کر ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ جن حقوق سے ہمیں محروم رکھا گیا ہے انھیں ہم حاصل کرکے رہیں گے۔"

ڈاکٹر امبیڈکر نے اعلا ذات کے لوگوں سے التماس کیا کہ اچھوتوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک نہ کیا جائے، عدم مساوات کا رویّہ چھوڑ کر ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے۔ امبیڈکر نے خود اعلا تعلیم حاصل کی اور دوسروں کو بھی تعلیم کی ضرورت کا احساس دلایا۔ جو کام بڑے بڑے سادھو سنت نہ کر سکے امبیڈکر نے کر دکھایا یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ ہندستان کا دستور بھی ایسے شخص نے تیار کیا جس کی ذات کو اچھوت کہہ کر معتوب کیا جاتا رہا۔ انھوں نے دستور لکھ کر ثابت کر دیا کہ کوئی بھی شخص ذات سے بڑا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا کردار اور کارنامے ہی اس کو بڑا بناتے ہیں۔ □□

عطیہ خاتون

مقابلہ عمل پیہم کی تصویر

ڈاکٹر امبیڈکر

آزاد ہندستان کے آئین کے معمار بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر ہندستانی سماج کے مصلحین کے عظیم سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔ انھوں نے سماج کے پچھڑے ہوئے لوگوں، خاص کر ہریجنوں کو ان کے جائز حقوق دلانا اپنی زندگی کا واحد مقصد قرار دیا تھا۔ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے تھے جب سماج کے نچلے طبقے کے لوگ خاص کر ہریجن بڑی کٹھنائیوں، دقتوں اور مظالم کا شکار تھے انھیں انسان کے بنیادی حقوق تک سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ان سے زبردستی بیگار کرائی جاتی تھی اور انھیں دو وقت کی روٹی بھی آسانی سے میسر نہیں ہوتی تھی۔ ہریجنوں کو اونچی ذات والوں کے کنوؤں سے پانی بھرنے تک کی اجازت نہیں تھی۔ مندروں میں ان کا داخلہ ممنوع تھا۔ غرض یہ کہ وہ سماج کے دوسرے طبقوں سے بالکل کٹ کر رہ گئے تھے۔ سماج میں ان کے لیے کوئی مرتبہ یا عزّت کا مقام حاصل کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔

ایسے ماحول میں ۱۴ ر اپریل ۱۸۹۱ء کو مہاراشٹر کے ایک غریب خاندان میں ڈاکٹر امبیڈکر پیدا ہوئے۔ امبیڈکر کا تعلق بھی سماج کے اسی طبقے سے تھا جو صدیوں سے سماجی نابرابری، ظلم اور استحصال کا شکار تھا۔ وہ ایک دردمند دل ایک رسا ذہن اور ہمّت و شجاعت کی دولت لے کر پیدا ہوئے تھے جس کا ثبوت ان کی بعد کی ساری زندگی سے ملتا ہے۔

انھوں نے سماج میں ہونے والے ظلم و استبداد اور ناانصافیوں کو نہ صرف محسوس کیا تھا بلکہ انھیں جھیلا بھی تھا۔ اسی احساس اور انھیں تلخ تجربوں نے ان کے باغیانہ ذہن کی تعمیر کی اور سماج کی اصلاح اور ظلم و ناانصافی کی بیخ کنی کی خواہش کو پختگی بخشی۔

ان کا کہنا تھا کہ وہی انسان عظیم ہوتا ہے جو معاشرہ میں حرکت و عمل برقرار رکھنے کے لئے ایک ہاتھ میں برائیوں پر ضرب لگانے کے لیے چابک اور دوسرے ہاتھ میں گندگی کو دور کرنے والی جھاڑو ہر وقت لیے رہے۔ ان کی ساری زندگی ان کے اسی قول کی آئینہ دار رہی ہے۔

چاروں طرف پھیلی ہوئی ناانصافی، ظلم اور استبداد کے اس ماحول کے سبب ڈاکٹر امبیڈکر مستقبل میں ملک کی سالمیت اور آزادی کے لیے فکرمند تھے، ان کے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہے تھے کہ کیا ہندستان اپنی آزادی اپنے ہی لوگوں کے چھل کپٹ اور وشواس گھات کے سبب دوبارہ کھو دے گا؟ ملک کے جمہوری آئین کا کیا ہوگا؟ کیا ملک آگے چل کر اس کی حفاظت کر پائے گا؟ وغیرہ وغیرہ

ان کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ اگر لگاتار محنت ہمّت اور لگن سے کام لیا جائے تو غریبی ناسازگار ماحول اور راستے کی تمام رکاوٹیں مل کر بھی انسان کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے اور پھلنے

چھونے سے روک نہیں سکتیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے، انھوں نے مخالف ماحول سے ٹکر لی اور اس کو شکست دیتے ہوئے ترقی کی آخری حدوں کو چھو لیا۔ انھوں نے قلی گیری کی اور سخت جسمانی محنت کی، ان کو اپنی ابتدائی زندگی میں ان تمام دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جو ان کے طبقے کا مقدر بن چکی تھیں، اس کے باوجود انھوں نے ہمت نہ ہاری اور استقلال کا دامن نہ چھوڑا، اپنی تعلیم جاری رکھی اور اس منزل تک پہونچ گئے کہ جب ملک کا آئین بنانے کا سوال اٹھا تو ان کی خدمات حاصل کرنا ضروری سمجھا گیا۔

وہ ہندوستان کے اعلا ترین تعلیم یافتہ لوگوں میں سے تھے۔ انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی سے ایم، اے اور پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگریاں لیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ کیا۔ برطانیہ میں رہ کر بار ایٹ لا، اور کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انھوں نے معاشیات، سماجیات، سیاسیات، فلسفہ، تاریخ اور اخلاقیات کی اعلا تعلیم حاصل کی تھی۔

اپنی ذاتی زندگی کے تلخ تجربوں نے ان کے اندر سماجی ناانصافی کے خلاف بغاوت کی آگ دہکا دی تھی اور اچھوتوں، کچلے اور پچھڑے ہوئے عوام کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ میں شدت پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ مہاراشٹر کے کولابہ ضلع میں ۱۹۲۷ء میں انھوں نے اونچے طبقے والوں کے خلاف اپنی پہلی زوردار تحریک شروع کی۔

ملک کے آئین کی تیاری میں ان کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ ہندوستان کے آئین میں ان کی فکری بلندی، حقیقت پسندی، وسعتِ نظر نیز ان کی ہمہ جہت شخصیت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ہمارے آئین کی تیاری میں یوں تو ملک کے متعدد ماہرینِ قانون نے تعاون دیا لیکن سر بینگل نرسنگھ راؤ - این گوپال سوامی آئنگر ڈاکٹر اے۔ کرشنا سوامی ایّر، کے۔ ایم۔ منشی اور ڈاکٹر امبیڈکر نے اس میں عملی حصہ لیا۔ اول الذکر آئینی کمیٹی کے قانونی مشیر اور ڈاکٹر امبیڈکر نیز دیگر تینوں حضرات آئین کی تیاری کے لیے تشکیل کردہ کمیٹی کے ممبر تھے۔ ہندوستانی آئین کی خصوصیات کی نشان دہی کرتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا ہے:

> "ہمارے آئین کے ڈھانچے میں اقلیتوں کے بنیادی حقوق دیے گئے ہیں حالانکہ ریاست کو نیا قانون بنانے کا حق ہے پھر بھی ہمارا آئین ان کے تہذیبی اور تعلیمی حقوق کو بھی بنیادی حقوق کے زمرے میں شامل مانتا ہے اور ان کے تحفّظ کا اقرار کرتا ہے۔"

آئین کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر امبیڈکر نے آئین کی تشکیل اس طرح کیے جانے میں خصوصی کردار ادا کیا ہے کہ اس کی رو سے چھوت چھات غیر قانونی قرار پائی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ان کی انصاف پسندی اور وسعتِ نظر کی ایک مثال ہے کہ ہمارے آئین میں سب کے لیے یکساں حقوق اور ہریجنوں کے لیے دوسروں کی طرح ہی یکساں سہولتیں فراہم کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ہندوستان کے پہلے وزیرِ قانون کی حیثیت سے ڈاکٹر امبیڈکر نے پارلیمنٹ میں ہندو کوڈ بل پیش کیا تھا جو ہندوستانی تہذیب اور سماج کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے بلاشبہ ایک مفید بل تھا لیکن وہ اس وقت پاس نہ ہو سکا تھا، جس سے بد دل ہو کر انھوں نے وزیرِ قانون کے عہدے سے استعفا دے دیا تھا۔ بعد میں اس کی اہمیت کو سمجھا گیا اور اسے قسطوں میں پاس کیا گیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر شخصیت پرستی کے بھی سخت خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں شخصیتوں کو نہیں بلکہ اصولوں کو اہمیت دینی چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ شخصیت نہیں دیش عظیم ہوتا ہے۔ وہ ایک آہنی شخصیت کے مالک تھے جس بات کو سچ سمجھتے تھے اس کی حمایت کرنے میں وہ بڑی سے بڑی دشواری کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ناانصافی کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے میں کبھی نہ ہچکچاتے تھے۔

□□

سلیمان صدیقی

مظلوم طبقوں کا نجات دہندہ

ڈاکٹر امبیڈکر کے مشاہدے میں یہ تلخ حقائق بچپن سے ہی آ گئے تھے کہ اچھوتوں کے لیے بعض راستے تک ممنوع تھے جن پر صرف اونچی ذات والے چل سکتے تھے۔ اچھوتوں کے گلے میں گھنٹیاں باندھ دی جاتی تھیں اور جہاں تک گھنٹیوں کی آواز جاتی تھی وہاں تک سب کچھ ناپاک تصور کیا جاتا تھا۔ انھیں عام تالابوں کا استعمال نہیں کرنے دیا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی کنوئیں کی جگت پر چڑھ جاتے تھے تو کنواں ناپاک ہو جاتا تھا۔ مندروں کے دروازے ان کے لیے بند تھے۔ ان کے گھر گاؤں سے باہر ہوتے تھے اگر ان سے برتن چھو جاتے تو برتنوں کو آگ میں تپا کر پاک کرنا پڑتا تھا، اتنا ہی نہیں ان کی پرچھائیں بھی اعلا ذات والوں پر پڑ جاتی تو اس کا کفارہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر غلطی سے کوئی اچھوت صبح صبح گھر سے نکلتا ہوا دیکھ لیا جاتا تھا تو اونچی ذات والوں میں ہلچل مچ جاتی تھی۔ اس کو مار مار ادھ مرا کر دیا جاتا تھا اور اسے گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کے اور بھی نہ جانے کتنے ظلم کے پہاڑ ہریجنوں پر توڑے جاتے تھے۔

انھوں نے ان مظالم، اس ذلت و نفرت اور اس وحشیانہ سلوک کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ ان کے خیال میں اس صورت حال کا سب سے بڑا سبب جہالت تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس صورت حال کو بدلنے کے لیے زبردست جدوجہد کی اور اس کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ وہ چاہتے تھے کہ سیاسی آزادی کے ساتھ ہی لوگوں کو اقتصادی آزادی بھی ملے۔ امیر غریب کا فرق مٹ جائے۔ ملک میں ایک بھی ایسا شخص نہ ہو جو مفلسی میں زندگی بسر کرے، ملک میں ایک بھی بچہ ایسا نہ ہو جسے مناسب غذا نہ ملتی ہو۔ ایک بھی خاتون ایسی نہ ہو جسے ظلم کا نشانہ بننا پڑے۔

انھیں اپنے وطن کے ذرّے ذرّے سے پیار تھا۔ وطن سے محبت کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ وہ یک جہتی کے بھی زبردست حامی تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا:

> "ہندستانیوں کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ ہندستان میں رہنے والے سبھی طبقوں کے افراد کو ایک دھاگے میں پرونے کی کوشش کریں۔ اتحاد ہماری قومی امانت ہے۔ اس کے بغیر ہم ٹوٹ سکتے ہیں بکھر سکتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مخالفین کو بھی اپنے دوش بدوش رکھیں ان کو ہمراہ لینے سے ہماری راہ کی رکاوٹیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔"

ایک مرتبہ مہار ذات کے کچھ لوگوں کے ایک بڑے جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ "ناانصافی کا انسداد کرنے کے لیے ہم کو جسمانی طاقت، دولت کی طاقت اور ذہنی طاقت

میں اضافہ کرنا ہوگا۔ انسان مذہب کے لیے نہیں ہے بلکہ مذہب انسان کے لیے ہے۔ جو مذہب ہماری انسانیت کی قدر نہیں کرتا، اسے مذہب کہنا انسانیت کو فریب دینا ہے۔"

رفتہ رفتہ انھوں نے مہار ذات پر عائد پابندیاں ختم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ چنانچہ اس ذات کے لوگوں کو فوج میں ملازمت ملنے لگی۔ وہ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم بھی حاصل کرنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں قومی بیداری کی لہر تیزی سے اٹھنے لگی تھی۔ مہاتما گاندھی نے ملک کی آزادی کے لیے سچائی اور عدم تشدد کا نظریہ پیش کیا اور سب کی فلاح و ترقی کا خواب دیکھا۔ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ہریجنوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کا خاتمہ ضروری تھا اور ان لوگوں کو بھی اعلا ذات والوں کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے گاندھی جی نے شودروں کو ہریجن جیسا نام دیا۔ انھیں گلے سے لگایا، ان کی بستیوں میں قیام کیا۔ ان باتوں سے ڈاکٹر امبیڈکر کو بے حد مسرت ہوئی۔ انھوں نے مہاتما گاندھی سے کہا:

"گزشتہ ہزاروں برسوں میں ایک سچا سادھو اس روئے زمین پر آپ کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے۔"

ڈاکٹر امبیڈکر کو اپنے وطن اور وطن کے لوگوں سے بے حد پیار تھا۔ انھوں نے اونچی ذات والوں سے کبھی نفرت نہیں کی۔ وہ اس مذہب کو اچھا نہیں سمجھتے تھے جو نفاق اور تفریق و امتیاز کی حوصلہ افزائی کرتا ہو، جو عداوت پیدا کرتا ہو، جو مذہب دوسرے مذہب سے نفرت کے جذبات ابھارتا ہو وہ مذہب نہیں ہے۔

انھوں نے سوشلزم کی بابت کہا تھا: ریاست معاشرہ کا معاشی نظام ایسا بنائے جس سے پیداوار میں اضافہ ہو، سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں تمام دولت نہ جانے پائے بلکہ دولت کی مساوی تقسیم ہو۔ انھوں نے کہا تھا:

"ایک جمہوری ملک میں دستور وضع کرنے والوں کو خود انسانیت ... پیار ہونا چاہیے۔ میں نے صدیوں سے کچلے ہوئے اچھوتوں کی فلاح، انھیں انسانی وقار، عزت اور مساوات کے حقوق ملنے کی بات کہی ہے۔ میں واضح طور پر کہتا ہوں کہ اگر بہت سے افراد، غذا، لباس اور مکان سے محروم رہیں گے تو ہماری جمہوریت کا مقصد ناکام ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر امبیڈکر کی شخصیت ایک عہد ساز شخصیت تھی۔ ان کا پورا فلسفہ شخصی آزادی اور مساوات کو فروغ دینے پر مبنی تھا۔ انھوں نے ہندستان میں پس ماندہ اور مظلوم افراد کو انصاف دلانے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے جتنا کام کیا، اتنا کام کسی دوسرے شخص نے نہیں کیا۔ وہ حقیقتاً دبے کچلے لوگوں کے نجات دہندہ تھے۔

□□

ایک مردِ آہن ----- ص ۴۳ کا بقیہ

انسانی سماج میں کوئی تفریق و امتیاز اور تفرقہ نہیں ہونا چاہیے۔

"ہم سب ایک پتا کی سنتان ہیں"

"ہم ایک ہیں، ہم نیک ہیں" "ہم ایک آکاش تلے رہتے ہیں"

"ہمارا خون ایک ہے" —— یہ باتیں ڈاکٹر امبیڈکر اکثر دہرایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر امبیڈکر دیکھنے میں تو معمولی لگتے تھے لیکن ان کی صلاحیتیں غیر معمولی تھیں، جن کی مدد سے انھوں نے غیر معمولی کام انجام دیے۔ وہ زبردست قوتِ ارادی کے مالک تھے اور بڑی بیباکی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ وہ اپنی بات اس طرح کہتے تھے کہ دل میں اتر جاتی تھی۔ ان کا عمل، کردار اور ان کے خیالات آئندہ نسلوں کے لیے بھی مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

□□

مخمور کاکوروی

دبے کچلے طبقوں میں بیداری کے محرک

بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں سماج میں تبدیلی لانے کی تحریک شروع کرنے کے لیے ایک جلسہ کا اہتمام کیا تھا، جس کی صدارت کے فرائض بھی ڈاکٹر امبیڈکر نے انجام دیئے تھے۔ اس موقع پر لاکھوں اچھوتوں کے بیچ ایک سماجی تنظیم کی بنا ڈالی۔ اس تنظیم نے تعلیم پر خصوصی توجہ دی اور تعلیم کی اہمیت سے لوگوں کو واقف کرانے کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ جگہ جگہ جلسے کرکے اچھوتوں کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ترغیب دی۔ ان کا کہنا تھا کہ تعلیم حاصل کرکے اپنی فلاح و بہبود کی راہ خود ہموار کرکے ترقی کی منزلیں طے کرو۔

ایک بار عوام کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا تھا:

"تمہارے یہ معصوم چہرے اور تمہاری یہ افسردہ حالت دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ تم اپنی مصیبت زدہ زندگی سے دنیا کی مصیبتوں میں اضافہ کیوں کرتے ہو۔ تم ماں کے پیٹ میں ہی کیوں نہ مر گئے۔ اگر اب بھی مر جاؤ تو دنیا پر تمہارا احسان ہوگا۔ اگر جینا چاہتے ہو تو زندہ دل بن کر جیو، بزدلی چھوڑ دو۔ روٹی، کپڑا اور مکان جیسے دوسروں کو حاصل ہے ویسے ہی تم کو بھی ان کی ضرورت ہے۔ یہ تمہارا پیدائشی حق ہے۔ اپنے اس حق کو حاصل کرنے کیلئے تمہیں خود ہی آگے آنا پڑے گا اور ہمت سے کام کرنا پڑے گا۔"

اسی زمانے میں مالابار کے اچھوتوں کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی۔ وہاں کے اچھوت دودھ اور گھی کا استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ عورتوں کو اوپر کا نصف جسم اور پیر کھول کر چلنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے مالابار پہونچ کر اپنے خیالات سے اچھوتوں میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں دوسرے دن ایڑی تک کپڑے پہن کر ان سے ملنے گئیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر اخبارات و رسائل کے ذریعہ بھی اپنے خیالات لوگوں تک پہونچاتے رہے۔ وہ ۱۹۲۶ء میں سماجی برائیوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے میدانِ عمل میں اتر آئے۔ ایک طرف تو اچھوتوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی ترقی کی کوششوں میں مصروف ہو گئے اور دوسری طرف سیاسی حقوق کی حصولیابی کے لیے برسرِ پیکار ہو گئے۔ جلسے کرتے، کانفرنسیں بلاتے۔ اچھوتوں کے لیے اسکول کھلواتے کنوؤں، تالابوں اور مندروں میں اچھوتوں کے جانے پر لگی پابندی کی مخالفت کرتے۔ ایک کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"اب ہمیں اپنی یہ حالت دیکھ کر بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ ہمارے زوال کی خاص وجہ یہ ہے

(باقی ص ۳۰ پر)

ڈاکٹر امبیڈکر اور اُن کا سماجی نظریہ

سُریش اُجالا
ترجمہ: نجیب انصاری

ڈاکٹر امبیڈکر کا خیال تھا کہ صرف اچھوت ہی نہیں بلکہ اعلا ذات کے لوگوں میں بھی روحانی تشنگی کی وجہ سے بے حد بے چینی موجود ہے۔ ذات پات کی تفریق کی وجہ سے موجودہ سماج میں ان کے لیے بھی بہتر مواقع نہیں ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر کو ہندو مذہب وراثت میں ملا تھا۔ ان کا پورا کنبہ مذہبی جذبات سے سرشار تھا۔ نتیجے کے طور پر ان پر بھی اس ماحول کا گہرا اثر پڑا۔ کیوں کہ فطرت کا قانون ہے کہ جو شخص جس ماحول میں رہتا ہے وہ اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ انھیں ایسے مظالم کا شکار ہونا پڑا کہ اپنے مذہب پر ان کا یقین ہی متزلزل ہوگیا۔ ذات پات کی وجہ سے ان کے دماغ میں ٹیسیں اُٹھنے لگیں کہ ہندو مذہب کا پیروکار ہونے کے باوجود ان کے ساتھ ہندو مذہب ہی کے ماننے والوں کا یہ سوتیلا سلوک کیوں؟ ہندو مذہب اس قدر خانوں میں منقسم کیوں ہے؟ وہ مسلسل اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے کہ آیا ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کے درمیان اس قدر نفرت ہو سکتی ہے؟ کیا مذہب انسانیت خود انسانیت کا دشمن ہو سکتا ہے!

ڈاکٹر امبیڈکر سماج کے موجودہ ڈھانچے کے بارے میں بہتر طریقے سے انداز میں سوچنے لگے اور سماج میں مکمل بیداری لانے کے لیے کوشاں ہوگئے۔ ہندو سماج میں پامال طبقے کی افسوسناک صورت حال پر انھیں بے حد رنج تھا مزید تکلیف دہ بات یہ تھی کہ پامال طبقے میں بھی کئی طبقے تھے اور وہ سب ایک دوسرے کو کمتر سمجھتے تھے۔ لہٰذا امبیڈکر کا خیال تھا کہ ذات پات نہ صرف یہ کہ غیر اخلاقی ہے بلکہ سماج کی تنظیم میں بھی یہ ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ ہر سماج میں خود احتسابی کی گنجائش رہنی چاہیے اور اس میں جدید اقدار اور تصورات کے تئیں اپنائیت اور جوش و خروش میں کمی نہیں آنی چاہیے۔ عصر حاضر کے تناظر میں اگر ہم غور کریں تو اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ بابا صاحب نے انہی سماجی ناہمواریوں کے خلاف جدوجہد کی تھی۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے ساری کوششیں کر کے دیکھ لیں لیکن اعلا ذات کے لوگوں نے مساوات کے وسیع تر اثرات کو قدم نہیں جمانے دیا۔ بابا صاحب کا خیال تھا کہ سماجی نفرت کا اثر تشدد سے بھی زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے پامال طبقہ استحصال کے جال میں پھنستا چلا گیا۔ پامال طبقے کے ساتھ دن دہاڑے مظالم ہوتے رہے۔ ان کی بہو بیٹیوں کو مسلسل ذلیل کیا جاتا رہا لیکن یہ طبقہ اپنی شدید غربت اور محرومی کی وجہ سے خاموش رہا۔ اس طبقے کا اگر کوئی شخص کبھی سر اٹھانے یا مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کرتا تو اسے گولی کا شکار بننا پڑتا۔ اس لیے پامال طبقہ ہمیشہ گونگا اور بہرا بنا رہا۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے پامال طبقے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم یافتہ بنو، منظم رہو اور جدوجہد کرتے رہو۔ آدمی کے ساتھ جانور سے بھی بدتر سلوک انھیں ہمیشہ کھٹکتا رہا۔ انسان کے لیے انسان کا اتنا خونخوار رویّہ دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

ڈاکٹر امبیڈکر کے خیال میں سماج کو ایک ایسا رُخ دیے جانے کی ضرورت تھی جس میں انسانیت کو فروغ ملے۔ دکھ سکھ میں ایک ایک کا دل دوسرے کے لیے دھڑکے، نہ کہ سب حسن کے حصار میں مقید رہے

ڈاکٹر امبیڈکر چاہتے تھے کہ سماج کا ڈھانچہ انسانیت کی بنیاد پر قائم ہو۔ آدمی آدمی کے باہمی تعلقات مضبوط ہوں۔ انصاف، مساوات، برادرانہ تعلقات، آزادی اور بے خوفی بابا صاحب کی زندگی کے آدرش تھے۔ انھوں نے عوام الناس کی بہبود پر آئین بنا کر ہندستان کو ایک خوش حال ملک بنانے کے لیے زندگی بھر کوشش کی اور اسی مقصد کے لیے وہ زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا ہے کہ ——

"ہر شخص کے پاس ایک فلسفۂ حیات
ہونا چاہیے جس کے ذریعہ اس کا تجزیہ
ہو سکے۔ تجزیہ کا معیار ہر شخص کو خود
بنانا چاہیئے"

غیر طبقاتی سماج کے لیے مارکس نے بھی کم غور و خوض نہیں کیا تھا کئی ممالک نے غیر طبقاتی سماج کے قیام کے نظریے کو تسلیم بھی کیا تھا لیکن آج تک ایسا سماج وجود میں نہیں آ سکا۔ استحصالی طبقے کو استحصال کرنے کی عادت پڑ گئی اور استحصال زدہ طبقے کو استحصال برداشت کرنے کی۔

ڈاکٹر امبیڈکر جن لوگوں کے لیے جدوجہد کرتے رہے ان کے پاس نہ تو دولت تھی اور نہ ہی طاقت۔ اس کے برخلاف اعلا طبقے کے پاس دولت بھی تھی اور طاقت بھی، اس لیے وہ جو کچھ چاہتا تھا حاصل کر سکتا تھا۔ مسلسل جدوجہد کے بعد بابا صاحب نے محسوس کیا کہ بغیر تبدیلیٔ مذہب کے پامال طبقے کی بہبود ناممکن ہے۔ بالآخر اپنے مقصد میں کامیابی نہ ملنے کی وجہ سے ڈاکٹر امبیڈکر نے بدھ مذہب قبول کر لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں ہندو مذہب کا سخت مخالف قرار دیا گیا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر زمانہ، ہر عہد اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی چھوت چھات کسی حد تک کم ہوئی لیکن ذہنی چھوت چھات میں اضافہ ہی ہوا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سماجی برابری کے لیے ذہنی چھوت چھات کا خاتمہ بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کا کہنا ہے کہ:

"ذات پات سے پاک سماج کے قیام کے
بغیر آزادی کے حصول کی کوئی
اہمیت نہیں ہے"

ڈاکٹر امبیڈکر مکمل طور پر انسانیت نواز تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان کے ساتھ انسان جیسا سلوک کیا جائے۔ ان کی فکر ہر طبقے کی بہبود کے لیے تھی۔ وہ آزادی، مساوات اور برادرانہ جذبات کو اخلاقیات کے ساتھ جوڑ کر دیکھتے تھے۔ ان کی نظر میں زندگی اخلاق کے بغیر بیکار تھی۔

ڈاکٹر امبیڈکر کا خیال تھا کہ (ہندستانی معاشرے میں) مذہب ہمیشہ سماجی یکجہتی میں آڑے آتا ہے۔ اس لیے انھوں نے مذہب کا ہمیشہ تجزیہ کیا۔ ان کے سماجی نظریے کی بنا پر ان کا شمار دنیا کے عظیم مفکرین میں ہوتا ہے۔ وہ انسانیت نواز سماج کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ انسانیت نواز سماج کے قیام کے حامی رہے۔

□□

"جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں، مذہب افیون کی طرح نہیں ہے۔ جو کچھ بھی اچھی باتیں مجھ میں ہیں یا سماج کو میری تعلیم و تربیت سے جو بھی فوائد پہونچے ہیں وہ میرے اندر مذہبی جذبات کی وجہ سے ہی ممکن ہوئے ہیں۔ میں سچا مذہب چاہتا ہوں لیکن مذہب کے نام پر کسی قسم کا ڈھونگ نہیں چاہتا۔"

—— ڈاکٹر امبیڈکر

انیس نصرت

ڈاکٹر امبیڈکر اور سماجی انصاف

حکومتِ ہند نے بھارت رتن بابا صاحب ڈاکٹر امبیڈکر کی یاد میں ۱۹۹۰۔۹۱ء کو سماجی انصاف کا سال قرار دیا ہے بابا صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ سماجی انصاف صرف اسی وقت ممکن ہے جب سماج میں ناانصافی ختم ہوجائے اور سماجی انصاف سماج کے نظام کی مکمل تبدیلی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ آج کے سماجی نظام میں جہاں ایک طرف ذاتوں کی بنیاد پر کام کی تقسیم نے مزدوروں کی قدر و منزلت اور ان کی مزدوری کم کی ہے تو دوسری طرف زر، زمین، تعلیم اور علوم و فنون کو ایک خاص طبقہ تک محدود کر دیا ہے۔

بابا صاحب نے جب دیکھا کہ عوامی نظامِ تقسیم میں تبدیلی آنے کے بجائے متعدد ذاتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں سماجی اور معاشی نابرابری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے تو انھوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانے اور اس برائی کو جڑ سے ختم کرنے کا عزم مصمم کر لیا۔ ہندستان میں سماجی، معاشی اور تعلیمی نابرابری ختم کرنے اور ہر ہندستانی کو یکساں مواقع فراہم کرنے کے لیے بابا صاحب نے ایک نئے انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ ایسا انقلاب جو پورے نظام کو بدل دے۔ نہ کوئی غریب ہو اور نہ کوئی امیر۔ ہر ایک کو زندگی گزارنے کے لیے یکساں مواقع ملیں۔ ہر شخص برابری کی فضا میں سانس لے۔ اونچ نیچ چھوٹے بڑے اور غریب امیر کا فرق ختم ہوجائے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں پورے ہندستان میں پُرامن طریقہ سے جمہوری نظامِ تقسیم کے ذریعہ ایک نیا انقلاب لاؤں گا۔

بابا صاحب امبیڈکر کا سب سے بڑا کارنامہ ہے بدھ مذہب کی ترویج نو۔ اس کی سب سے بڑی مثال ہے ہندستان کے قومی پرچم پر چکر کا نشان، ہندستانی کرنسی پر اشوک کی لاٹ کا نقش اور ہندستان کے صدر جمہوریہ کی سرکاری کرسی پر چکر کا نشان۔ بابا صاحب نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا تھا کہ جس ملک میں گوتم بدھ پیدا ہوئے اسی ملک کے لوگوں نے ان کے عظیم مذہب کو بھلا دیا۔ میں اس ملک سے مذہبی تفریق اور اونچ نیچ مٹا کر رہوں گا۔

انھوں نے کہا تھا کہ میں اس طبقہ سے تعلق رکھتا ہوں جو جمہوریت کا حامی ہے، ملک کی باگ ڈور کسی فردِ واحد کے ہاتھ میں ہونے کے بجائے عام لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ مذہب کو بنیاد بنا کر جمہوری نظام قائم کرنا ناممکن ہے۔

بابا صاحب کی آرزوؤں کی تکمیل اس وقت ہوئی جب انھیں بھارت کا آئین بنانے کی دعوت دی گئی۔ بھارت کے آئین میں ہندستان کے ہر شہری کے لیے "ہندستان کے عوام" کے الفاظ کا استعمال کرنے اور ہر ایک کو آزادی، انصاف اور برابری کا درجہ دینے کے عہد سے ہی ایک مکمل اور طاقتور سماجی ڈھانچہ بنانے کا مصمم ارادہ کیا گیا ہے۔ بابا صاحب نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اب ہندستان میں دو آئین نہیں چل سکتے۔ وہ چاہتے تھے کہ بنیادی

ڈاکٹر امبیڈکر







شخصیت اور سرگرمیاں





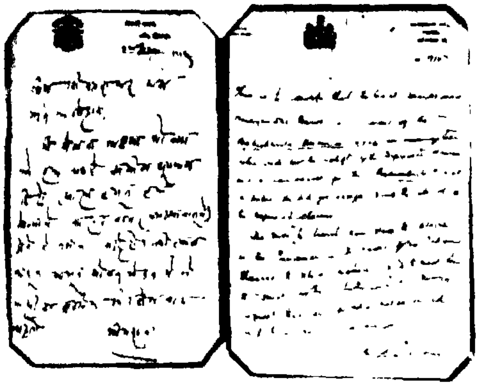
















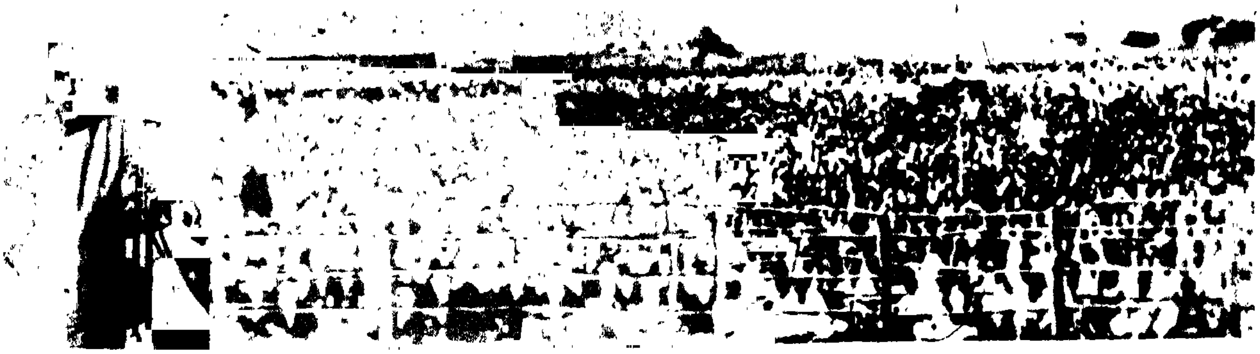







मूकनायक
प्रबुद्ध भारत
जनता
THE PEOPLE








































حقوق کے ساتھ عوامی نظام تقسیم کو جوڑ دیا جائے۔ ایک شخص اور ایک ووٹ کے ساتھ ہی ہر شخص کو مکمل طور پر برابری دی جائے صنعت اور زراعت کو قومیا لیا جائے۔

پس ماندہ طبقوں کو ملازمتوں اور دوسرے زمروں میں تحفظ دینے کے لیے جدوجہد کی گئی کیونکہ وہ صدیوں سے بنیادی سماجی انصاف سے محروم تھے۔ انھیں مساوی حقوق نہیں ملے تھے۔ سماجی تعلیمی، معاشی اور ہر طرح کی ترقی کے دروازے ان پر بند تھے۔ چوں کہ پسماندہ طبقوں نے اپنی اس غلامی کو آسانی سے قبول کر لیا تھا اس لیے بعض خدمات نہ صرف ان کے لیے مخصوص کر دی گئیں بلکہ سماجی معاشی اور تعلیمی طور پر ان کو جان بوجھ کر پس ماندہ رکھا گیا تاکہ وہ اس غلامی سے کبھی نجات نہ پا سکیں۔

بابا صاحب نے محسوس کیا کہ اتنے بڑے پس ماندہ طبقے کو ترقی کے مواقع سے محروم کر کے ہندستان کو جمہوری ملک نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہندو سماج میں خواتین کی حالت شودروں جیسی دیکھ کر بابا صاحب نے کہا تھا:

"ہندستان کے آئین میں خواتین کی ترقی کے لیے بھی خاص طور سے قانون بنے اور عورتوں کو اہمیت دی جائے۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو بھارت کا آئین پیش کرتے ہوئے بابا صاحب نے کہا تھا:

"آزادی تو ہمیں ملی ہے مگر ہندستان میں برابری اور سماجی انصاف کی کمی ہے۔ سماجی اور تعلیمی آزادی ایک مخصوص طبقے تک ہی محدود ہے۔ اگر ہم نے اس سماجی نابرابری کو ختم نہیں کیا تو بہت جلد ہندستان کا جمہوری نظام مٹی میں مل جائے گا اس جمہوریت کی بنیاد آزادی، برابری، بھائی چارے اور انصاف پر رکھی گئی ہے۔ یہی ہماری زندگی کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ یہ بات ہر شخص کو ماننا پڑے گی کہ آج یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کے دن ہم سامنے ہندستان میں جمہوری نظام قائم کر رہے ہیں۔ اس کے بعد اگر سماجی اور معاشی نابرابری قائم رہی تو سارے ملک کو خطرہ ہے۔ اگر بھارت کے آئین کو عملی شکل دینے والے لوگ اچھے نہیں تو عام لوگوں کو سماجی انصاف نہیں مل سکے گا۔ کیا ہندستانی اپنے مذہب، خیالات اور نجی فائدے سے بلند ہو کر اپنے ملک کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں؟ ہمارا اپنا خیال ہے کہ ہمیں اپنے خون کے آخری قطرے تک ملک کی آزادی کی حفاظت کرنی چاہیے۔"

بابا صاحب نے کہا تھا کہ جمہوری نظام کے معنی ہیں مذہب اور اونچ نیچ اور سماجی برائیوں سے پاک نظام کی تشکیل۔ ہندستان میں جمہوریت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس کی بنیاد سماجی جمہوریت پر نہ ہو۔ سماجی جمہوریت سے ہماری مراد یہ ہے کہ کام کی تقسیم پیدائش کی بنیاد کے بجائے قابلیت کے معیار پر کی جائے۔ بدھ مذہب کی سماجی انصاف اور برابری کی تعلیم سے ہی ہمارے آئین کو متشکل کیا جا سکتا ہے۔ ہندستان کے آئین کے منظور ہونے سے بابا صاحب کو سب سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق ملے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

"جن راجوں مہاراجوں اور زمینداروں کی ڈیوڑھی تک غریب اور پس ماندہ طبقہ نہیں پہونچ پاتا تھا، اب وہی راجہ مہاراجہ اور امیر طبقہ کے افراد ووٹ حاصل کرنے کے لئے غریب کی جھونپڑی کے چکر لگائیں گے۔"

لکھنؤ میں اتر پردیش شیڈول کاسٹ فیڈریشن کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ کمزور اور پس ماندہ طبقے کے لوگوں کو کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنا چاہیے کیونکہ ان دونوں کے مسائل یکساں ہیں۔

ہندستان کا آئین دنیا کا عظیم ترین آئین ہے۔ اسی لیے ہندستان کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہا جاتا ہے۔ اس آئین کی تشکیل کرنے والے بابا صاحب امبیڈکر نے جب لکھنؤ کی کانفرنس میں



یہ کہا تھا کہ غریب اور پس ماندہ طبقہ اپنی صفوں میں سے نہرو جیسے وزیر اعظم پیدا کر سکتا ہے، تو یہ بات بہتوں کو پسند نہیں آئی تھی ۔

بھارت کا آئین تیار کرنے کے بعد بابا صاحب کو دوسرا قلم دان وزارت دینے کا وعدہ کرنے کے باوجود جب اس وعدے کو پورا نہیں کیا گیا تو انھوں نے ۲۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کو وزیر قانون کے عہدے سے استعفا دے دیا جو کہ دوسرے ہی دن منظور کر لیا گیا۔ بابا صاحب سے جب اس بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا۔

"جب وید لکھوانا تھے تو ویاس کو بلوایا گیا تھا
جو اعلا ذات سے تعلق نہیں رکھتے تھے، جب مہا بھارت
لکھوانا تھا تو والمیکی کو بلایا گیا جو اچھوت تھے اور
جب بھارت کا آئین بنانے کی ضرورت پیش آئی تو
مجھے بلایا گیا۔"

ملک کو تقسیم ہونے سے بچانے کے لیے بابا صاحب نے جو فارمولا تیار کیا تھا اگر اسے ہندو اور مسلمان مان لیتے تو شاید ملک تقسیم نہ ہوتا۔ ان کا کہنا تھا کہ وطن بڑے سے بڑے فرد سے بڑا ہے لیکن افسوس اس پر عمل نہیں ہوتا ۔ ہندستان کی تقسیم کے بعد لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ متحد ہندستان ہی بہترین حل تھا ۔ بابا صاحب نے کہا تھا کہ اگر سماجی اور معاشی ڈھانچے میں تبدیلی نہ لائی گئی تو عوام قدیم سیاسی ڈھانچے کو اکھاڑ پھینکیں گے اور جمہوریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر یہاں جمہوریت ناکام ہوئی تو واحد حل اشتراکی نظام ہی رہ جاتا ہے ۔

ان کا کہنا تھا کہ ہندستان میں پُرامن تبدیلی لانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بدھ مذہب کو عروج حاصل ہو ۔ کارل مارکس اور گوتم بدھ کے درمیان فرق بس یہ ہے کہ کارل مارکس کا خیال تھا کہ اس وقت کے سماج میں غریبوں کا استحصال ہوتا تھا اور گوتم بدھ کا کہنا ہے کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہیں۔ دکھ سے گوتم بدھ کی مراد غربت تھی ۔

زمانۂ قدیم کے رواج کے مطابق اعلا تعلیمی عہدہ دار، منصفِ اعلا اور وزیر وغیرہ صرف اعلا ذات والے ہی ہو سکتے تھے ۔ گویا یہ جگہیں صرف ان کے لیے محفوظ تھیں مگر آج جب آئینِ ہند کی دفعہ ۳۴۰ کے تحت پس ماندہ طبقوں کو ریزرویشن ملا تو اسے سماج کو تقسیم کرنے کی کوشش قرار دے کر اس کی مخالفت کی جا رہی ہے ۔ جبکہ صدیوں تک اونچی ذات کے لوگوں کے لیے بڑے عہدے محفوظ رہے ۔ قانونی حیثیت کچھ بھی رہی ہو لیکن عملی طور پر ہوا یہی ۔ بابا صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کی خدمات کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ انھیں وہ عزت نہیں دی گئی، جس کے وہ مستحق تھے ۔ بابا صاحب کی ری پبلکن پارٹی برابر یہ مانگ کرتی رہی کہ آئینِ ہند کے معمار بابا صاحب کی تصویر لوک سبھا کے سنٹرل ہال میں لگائی جائے ۔ آخر برسوں گزرنے کے بعد مرکزی حکومت نے اس مطالبہ کو تسلیم کیا۔ پورے ملک میں بابا صاحب کے حامی ایک عرصے سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کے یوم پیدائش یعنی ۱۴ اپریل کے دن کو سرکاری چھٹی قرار دیا جائے ۔ لیکن طویل عرصہ تک اس مطالبہ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ۔ آخر کار حکومت نے اس مطالبہ کو تسلیم کر کے ایک ایسا کام کیا جو بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا ۔

مرکزی حکومت نے بابا صاحب کو "بھارت رتن" کے اعزاز سے سرفراز کیا اور ان کی تصویر پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں لگائی گئی ۔ ان کے یوم پیدائش یعنی ۱۴ اپریل کو چھٹی کا اعلان کیا گیا ۔ بدھ مذہب کے استحصال کو روک کر اسے کچھ مراعات دی گئیں ۔ یہ سب ہونے کے باوجود بابا صاحب کے نظریات کو ابھی پوری طرح فروغ نہیں مل سکا ہے اور ان کے خواب ابھی شرمندۂ تعبیر ہونے کے منتظر ہیں ۔

□□

> "برہمن واد سے میرا مطلب ایک طبقے کے طور پر برہمنوں کی طاقت، مفادات اور اختیاراتِ خصوصی سے نہیں ہے ۔ یہ پیمانہ نہیں ہے جس کی بنا پر میں اس لفظ کا استعمال کر رہا ہوں ۔ برہمن واد سے میرا مطلب آزادی، مساوات اور برادرانہ جذبات کی نفی سے ہے ۔ اس معنی میں ۔ برہمن واد ہر طبقے میں موجود ہے اور صرف برہمنوں تک ہی وہ محدود نہیں ہے ۔" — ڈاکٹر امبیڈکر



شعیب احمد قدوائی

عدم تشدد ۔ اور ڈاکٹر امبیڈکر

انسانی ارتقا کی تاریخ شاہد ہے کہ جب آدم و حوا کی تخلیق کی گئی تو ان کے کھانے کے لیے ماسوائے گندم (عیسائیوں کے مطابق سیب) تمام فواکہات و میوہ جات تفویض کیے گئے، لیکن گوشت کو ان روز مرہ غذاؤں سے قطعی مستثنیٰ رکھا گیا۔ اس وقت تک یا تو ہزارہا حیوانات اور چرند پرند کی تخلیق ہی نہیں ہوئی تھی یا جو موجود بھی تھے ان کے طریقہ استعمال پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی تھی۔ بائبل میں ارتقا سے متعلقہ آیات ۳۰-۲۸ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا ہے:

"سنو، جتنے بیج والے چھوٹے چھوٹے پیڑ پودے زمین پر موجود ہیں اور درختوں میں جتنے بیج والے پھل ہیں، یہ سب میں نے تمھیں تفویض کیے۔ یہ تمھاری غذا ہیں"۔

اس کے بعد حضرت نوحؑ کو مع ان کے متعلقین کے حکم باری تعالیٰ ہوا:

"پھلو، پھولو، پیدا وار بڑھاؤ اور اس زمین میں جہاں تک ہو سکے پھیل جاؤ۔ تمھارا شرف اور خوف روئے زمین پر موجود تمام جانوروں اور رینگنے والے کیڑوں اور آبی مچھلیوں پر بنا رہے گا۔ یہ سب تمھارے قبضے میں کر دیے گئے ہیں اور ان سب کو تمھاری غذا قرار دیا گیا ہے"۔

(آیت ۳-۱، نواں باب)

پھر چھٹی آیت میں کہا گیا ہے:

"جو بھی انسان کا خون (بلا وجہ) بہائے گا، اس کا لہو (بہ طور بدل) بہایا جائے گا کیونکہ میں نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا ہے"۔

اس طرح انسان کے بتدریج ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ اسے ہدایات جاری کی جاتی رہیں یعنی پہلے قطعی طور پر پھلوں اور پیڑ پودوں پر گزارہ کرنے اور بعد میں جانوروں پر بھی تصرف حاصل کرنے اور پھر انسانوں کا خصوصی طور پر بلا وجہ خون نہ کرنے کی ہدایات ہمارے سامنے آتی ہیں یہاں تاریخی طور پر ان احکامات میں عدم تشدد یا اہنسا کے دو پہلو واضح طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

(۱) **بامقصد ذبیحہ**: جسے جائز قرار دیا گیا، کہ آپ جانور کا گوشت، ہڈی، چمڑا اور سینگ وغیرہ اپنے استعمال میں لے آئیں جبکہ انسان کو کسی وجہ سے صرف سماج یا عدالت کی رو سے مجرم قرار دے کر ہی جانی نقصان پہونچایا جا سکتا تھا۔ بیشتر مواقع پر درندوں کا خوف بھی انسان کو شکار پر راغب کرتا رہا ہے کیوں کہ اگر انسان انھیں نہ مارتا تو وہ انسان کو مار ڈالتے۔

(۲) **بے مقصد ذبیحہ**: بلا وجہ کسی کی جان لی جائے اور اسے بالکل استعمال نہ کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ ان احکامات کا اثر قطعی طور پر وقتی تھا کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے بعد دنیا نے ایک بار پھر گمراہ ہو کر ان اصولوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی اور بنی نوع انسان کا خون بڑے ہی ظالمانہ ڈھنگ سے بہانا شروع کر دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب تشدد میں بے تحاشا اضافے

کے باعث، عیسائیت عدم تشدد کا پیغام لے کر جلوہ گر ہوئی۔ بائبل کا یہ عدم تشدد بڑے وسیع تر مفہوم میں ہمارے سامنے آتا ہے جس میں کسی کے دل کو ٹھیس نہ پہونچانا، قطعی بدلہ نہ لینا، تمام جان داروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھنا، کسی کا مال واسباب نہ لوٹنا، استعمال سے زیادہ کی ذخیرہ اندوزی اور جبراً عزت لوٹنے سے اجتناب وغیرہ شامل ہیں۔ ان اصولوں کا عظیم تر پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گال پر طمانچہ مار دے تو آپ بڑی انکساری سے اسے دوسرا گال بھی پیش کر دیں۔ اس اصول کے تحت انتہائی درجہ کے صبر و تحمل اور ضبط وانکسار کی تلقین ہمارے سامنے آتی ہے۔

ان احکامات سے حالات میں صد فی صد نہ سہی، پچاس فی صد تغیر ضرور واقع ہوا۔

کم و بیش یہی وقت تھا جب برصغیر میں مہاویر اور گوتم بدھ امن اور عدم تشدد کے پیغامبر بن کر ہندستان کے افق پر رونما ہوتے ہیں اس وقت یہ خطہ راجوں، جاگیرداروں اور مہاجنوں وغیرہ کی وجہ سے نہ صرف ظلم و تشدد کا گہوارہ بنا ہوا تھا بلکہ تین سو سے زائد حکمرانوں کی چیرہ دستیوں، لوٹ مار، قتل و غارت گری اور آپسی جنگوں کا بدترین نمونہ پیش کر رہا تھا۔ اشوک کی وجہ سے یہ خطہ فوراً ہی عدم تشدد پر ایمان لے آیا۔

چونکہ یہ علاقہ اپنی معدنی، زرعی اور حیوانی پیداوار کے لیے خصوصیت سے ان ممالک میں، جن کی زرعی پیداوار نہ ہونے کے برابر تھی، کافی مشہور ہو رہا تھا۔ اس لیے یہاں بیرونی قافلوں کی آمد میں بھی دن بہ دن اضافہ ہوتا رہا تھا۔ آریوں کے بعد مختلف حملہ آوروں میں کرات، شک، ہون، یونان وغیرہ کی آمد اور آبادکاری کے بعد پارسی اور مسلمان بھی یہاں داخل ہوئے مختلف مسلم اقوام نے یہاں آباد ہونا شروع کر دیا اور مغلوں کے داخلے سے اس رجحان کو مستقل طور پر استحکام ملا، جنھوں نے خطۂ ہند کو ہی اپنا وطن قرار دیا اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ رہنے بسنے اور انھیں اپنانے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کیا۔ صوفیوں اور مسلم ولیوں نے اس سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ناقابل فراموش ہیں پھر تجارتی مقاصد سے یہاں انگریز، ڈچ اور فرانسیسی آئے۔

یہاں کی کمزور سیاسی صورت حال اور مختلف النوع مذہبی تفریق نے انھیں اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اکسایا، جس میں انھیں بھرپور کامیابی ملی۔ لیکن چوں کہ وہ گائے اور سور دونوں کا بے دریغ استعمال کرتے تھے، اس وجہ سے انھیں نہ تو ہندوؤں نے مستقل طور پر اپنانا پسند کیا اور نہ مسلمانوں نے۔ علاوہ ازیں ان کی حکومت کبھی بھی ایک ہندستانی حکومت نہ بن سکی البتہ انھوں نے تعلیم کو روزی روٹی سے مربوط ضرور کر دیا اور ملک کو صنعت و حرفت اور نقل و حمل کے میدانوں میں خاطر خواہ ترقی دی۔ لیکن سیاسی محاذ پر وہ قطعی طور پر ناکام رہے اور اپنی اس ناکامی پر انھوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی اختیار کی لیکن اس میں بھی ان کی کامیابی دیرپا نہیں تھی کیوں کہ بعد کا تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص گوکھلے، لالہ لاجپت رائے اور علی برادران نے ان کی اس پالیسی کو نہ صرف بے نقاب کیا بلکہ سخت الفاظ میں اس کی مذمت بھی کی اور یہیں سے اس قوم کے خلاف ایک قسم کی منافرت نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اس منافرت اور انتشار کو دبانے کے لیے انھوں نے تشدد اور ظلم و ستم کا راستہ اختیار کیا، جس کے جواب میں گاندھی جی نے ستیہ اور اہنسا کے عیسائیت پر مبنی اصولوں کو انھیں کے خلاف بڑی چابک دستی سے استعمال کیا جس میں انھیں بین الاقوامی سطح پر کامیابی ملی۔ تشدد کے مقابلے میں عدم تشدد کی تحریک کو تقویت ملتی گئی اور اہنسا کا بھولا ہوا سبق ایک بار پھر ہندی عوام کے ذہنوں میں تازہ ہو گیا جبکہ انگریز عدم تشدد اور اخلاقی اقدار کے سامنے خود بہ خود پسپا ہوتے چلے گئے اور ملک آزاد ہو گیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ایک اعلا تعلیم یافتہ شخص، جو انگلینڈ، امریکہ اور جرمنی کا آزادانہ ماحول اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا، جس نے تحریک آزادی میں گاندھی جی کی رفاقت میں ایک نمایاں کردار ادا کیا تھا، آزاد ہند کے سیاسی افق پر ایک تابندہ ستارہ بن کر جگمگانے لگا۔ دلت اقوام کے مسلسل استحصال کی ایک طویل تاریخ اس کے سامنے تھی، اس نے دلت اقوام کی ذلت بذات خود دیکھی تھی۔

ڈاکٹر امبیڈکر ایک اعلا تعلیم یافتہ اور بے حد وسیع النظر شخصیت کا نام تھا۔ انھوں نے دلت اقوام کے برسہا برس سے ہونے والے استحصال کا بغور مطالعہ کیا اور ان ذلتوں سے تنگ آکر دلی سکون کی خاطر انھوں نے اشوک کی طرح بدھ مت کو اپنا لیا۔ کیونکہ ان کی تعلیمات نہ صرف

(باقی صفحہ ۵۱ پر)



سُہیل کاکوروی

ایک مردِ آہن

بھیم راؤ امبیڈکر نے اپنی بے پناہ صلاحیتیں اپنی حیرت انگیز جرأت اور اپنی شعلہ نوائی غرض جو کچھ تھا وقف کر دیا تھا دکھی انسانوں کے درد کا مداوا تلاش کرنے میں۔ امبیڈکر کی آنکھوں میں شجاعت کے ایسے شعلے روشن تھے جن کی لپٹوں کو دیکھ کر وہ کانپ گئے جنھوں نے غریبوں کو پیشے کی بنیاد پر اچھوت بنا کر انسانی زندگی سے کاٹ دیا تھا۔

امبیڈکر پر انسان کی اس سفاکی کا بڑا سخت ردِعمل ہوا اور یہ ردِعمل سچ کے لیے لڑنے میں ایک آہنی ہتھیار بن گیا، ان کی ماں نے ان سے کہا تھا کہ دنیا وہی کرتی ہے جسے پرماتما کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ انھوں نے نصیحت کی تھی کہ تم بڑے ہو کر خوب پڑھنا لکھنا اور یہ جو ایک انسان دوسرے انسان کو حقیر سمجھتا ہے اس روایت کو ختم کرنا۔ ان کی ماں پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن روکھی سوکھی روٹیاں کھلا کر انھوں نے اپنے بیٹے کو وہ درسِ انسانیت دیا کہ جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے۔

اپنے ماں باپ کی ۱۴ویں اولاد ہونے کی بنا پر لوگ انھیں "پتا کا ۱۴واں رتن" کبھی کہتے تھے وہ آدمیت اور محبت کو ہی جیون "رتن" سمجھتے تھے۔

امبیڈکر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ غریبی میں رہ کر بھی انھیں کمتری کا احساس کبھی نہیں ہوا۔ وہ بچپن سے ہی پڑھائی لکھائی میں بہت تیز تھے اور شاید یہ علم کی روشنی اور ذہانت کا نور تھا جس نے ان میں کمتری کا احساس پیدا نہیں ہونے دیا۔ یہ اندھیرا علم کی روشنی سے شکست کھا گیا۔ یوں تو نفسیاتی طور پر غریبی میں پلنے والے اکثر خود شناسی سے محروم رہتے ہیں لیکن امبیڈکر پر ایسی کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوئی۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کو حدِ پرواز سے بہت آگے جانا ہے۔

انھوں نے ہائی اسکول امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ سارے طلبا میں ان کے نمبر سب سے زیادہ تھے۔ انھوں نے تمناؤں کو مختصر نہیں کیا تھا بلکہ عمل کو تیز تر کر لیا تھا۔

ڈاکٹر امبیڈکر کو ہندستان کی اس روح کی پہچان تھی جس کے طفیل یہاں کی سرزمین نے ہزاروں روحانی پیشوا پیدا کیے اور یہ روح تھی پریم۔ یعنی بلا تفریق محبت کرنا اور محبت بانٹنا۔ ایک بار ایک اچھوت نے اپنی محرومی کا ذکر ان کے سامنے کچھ اس قدر دلدوز انداز میں کیا کہ ان کے دل میں ایک طوفان برپا ہو گیا اور انھوں نے اس دن سے یہ طے کر لیا کہ وہ غریبوں اور اچھوتوں کو آبرومندانہ انداز میں جینے کے لیے جو حق نہیں حاصل ہیں وہ دلائیں گے۔ "موک نایک" اخبار کے ذریعے انھوں نے اچھوتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی جو دلوں میں اترنے لگی۔ مہاتما گاندھی کے اقدام سے بھی امبیڈکر کو اپنے مشن میں حوصلہ ملا۔ دونوں کی منزل ایک تھی۔ دونوں ہی اچھوتوں کو انسانی سماج میں واپس لانا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کا مذہب انسانیت تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سب ایک مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور سب کے خون کا رنگ ایک ہے اس لیے

(باقی صفحہ ۱۴۲ پر)

ڈاکٹر امبیڈکر کا بچپن

مشہور ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے لیے پیدا ہوتے ہیں اور کچھ دوسروں کے لیے۔ کچھ کو اپنی ابتدائی زندگی میں ہی ہر قسم کی آسائشیں حاصل ہو جاتی ہیں اور کچھ کو ابتدا میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ فرد کی شخصیت کی تعمیر اس کے بچپن ہی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر انہی میں سے ایک تھے جن کو ابتدا میں ہی مخالفت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن انھوں نے سخت پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے خود کو مرد آہن ثابت کیا

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب اچھوتوں کے گزر جانے پر راستے کو پانی چھڑک کر پاک کیا جاتا تھا اور انھیں سماج میں اس حد تک حقیر سمجھا جاتا تھا کہ کوئی انھیں چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ فرقہ آدم زاد ہوتے ہوئے بھی آدمی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سے زیادہ تو جانوروں کو محبت مل جاتی تھی۔ لیکن ملک کے دو ایک مخصوص مذاہب نے انھیں کافی متاثر کیا، جن میں کوئی اونچ نیچ نہیں تھی بلکہ سب کو مساوی حقوق حاصل تھے جس سے اس طبقے کو زندگی کی ایک نئی جہت ملی۔ اور اس طبقے میں ایک انقلاب آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ طبقہ جو فضول اور بے وقعت سمجھا جاتا تھا، اب اونچی ذات والوں کے نزدیک سماج کی ایک اہم ضرورت بن گیا۔ وہی جو صدیوں سے ان کے اوپر ظلم و جبر کرتے آئے تھے، اب ان کی طرف متوجہ ہونے کے لیے مجبور ہو گئے۔

اگرچہ ایک زمانے میں سیاسی ضروریات کے مد نظر معاشرے میں تبدیلی لانے کی کافی کوششیں کی گئیں، لیکن اس وقت بھی انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ اونچی ذات والے بچوں کے اسکولوں میں ان کے بچوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ اس کے باوجود کہ یہ لوگ وہی تہوار مناتے تھے اور وہی عبادت کرتے تھے جو اونچی ذات والے کرتے ہیں لیکن یہ عبادت گاہوں میں بھی نہیں داخل ہو سکتے تھے۔ مندروں کے دروازے ان کے لیے بند تھے، نیز ادب و تعلیم پر بھی اعلا ذات والوں کو بالادستی حاصل تھی۔

۱۸۳۱ء میں حکومت وقت نے جب ان لوگوں کی تعلیم کے لئے سنسکرت اسکول کھولا تو اعلا ذات والوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ یہاں تک کہ اس سنسکرت اسکول سے استعفے دے دیے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کے والد رام جی سکپال، برٹش فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ انھیں یہ عہدہ ملٹری اسکول میں صدر مدرس ہونے کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ وہ مراٹھی اور انگریزی کے علاوہ ریاضی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ساتھ ہی جفاکش فوجی سپاہی بھی تھے۔ چونکہ خود تعلیم یافتہ تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ ان کے بچے بھی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہو کر معاشرے میں اپنا مقام حاصل کریں ۱۸۹۲ء میں حکومت وقت نے "مہار" ذات کی فوج میں بھرتی پر پابندی عائد کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہار ذات کے افسروں کے بچوں کی لازمی تعلیم بھی تعطل کا شکار ہو گئی۔ اس لیے ڈاکٹر امبیڈکر کے والد نے اس حکم کی سخت مخالفت کی جس کی وجہ سے یہ حکم واپس لے لیا گیا۔ اور ان کے بچوں کی لازمی تعلیم پھر بحال کر دی گئی۔

ان سخت حالات میں ۱۴ر اپریل ۱۸۹۱ء کو رتنا گری ضلع کے



ایک گاؤں میں بھیم سکپال (ڈاکٹر صاحب کے بچپن کا نام) پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے دادا مولاجی سکپال کی دو اولادیں تھیں۔ ایک رام جی سکپال اور دوسری لڑکی میرا دیوی۔ رام جی سکپال کی چودہ اولادیں ہوئیں۔ ان میں ڈاکٹر امبیڈکر سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی ماں کا نام بھیما بائی تھا وہ انتہائی منکسر المزاج اور نیک خاتون تھیں۔ ان کا تعلق ایک متمول خاندان سے تھا۔ یہ تھانے ضلع کے مرباد گاؤں کی رہنے والی تھیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی پیدائش کے دو سال بعد ان کے والد ریٹائر ہوگئے۔ جس کی وجہ سے وہ دپولی (ایک گاؤں) چلے گئے۔ یہیں پر پانچ برس کی عمر میں انھیں ایک پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن ابھی کچھ ہی مدت گزری تھی کہ ان کے والد رام جی سکپال کو ملٹری کوارٹرس ستارا میں دوبارہ ملازمت مل گئی۔ اور وہ وہاں چلے گئے۔

ابھی ان کی عمر صرف چھ برس کی ہوئی تھی کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی پانچ اولادیں حیات تھیں باقی نو کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان میں بلرام سب سے بڑے، دوسرے آنند راؤ اور دو بہنیں منجلا اور تلسی تھیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر ان میں سب سے چھوٹے تھے۔ دونوں بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اس لیے ان تینوں بھائیوں کی ذمہ داری رام جی سکپال کی بہن میرا بائی پر تھی، جو ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔

اگرچہ امبیڈکر کے والد نے اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن وہ اپنے اس فیصلے پر قائم نہ رہ سکے اور دوسری شادی کرلی۔

ڈاکٹر امبیڈکر کے ذہن پر اس واقعہ کا بہت گہرا اثر پڑا۔ وہ کسی بھی طرح اپنی ماں کی جگہ پر دوسری ماں کو قبول کرنے کے لیے خود کو تیار نہ کرسکے اور طے کیا کہ اب آزادانہ زندگی گزاریں گے۔ یعنی اب وہ اپنے والد پر منحصر نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اسی دوران انھیں اپنی بہن سے معلوم ہوا کہ محلے کے ایک لڑکے کو ستارا کی ایک مل میں ملازمت مل گئی ہے۔ اس لیے ان کے دل میں بھی بمبئی جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بمبئی جائیں کیسے؟ پیسے کہاں سے آئیں؟ اس لیے انھوں نے اپنی آنٹی کا پرس چرانے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ملی۔ تین راتیں بیکار چلی گئیں چوتھی رات پرس چرانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے ہوا کیا؟ پرس میں صرف آدھ آنہ ملا، جس سے بمبئی نہیں جایا جا سکتا تھا۔ اب انھیں اپنے اس فعل پر شرمندگی ہوئی۔ اس لیے انھوں نے اس طرح سے پیسہ جمع کرنے کے منصوبے کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔ یہی واقعہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ انھوں نے بھاگنے کی خواہش کے علاوہ اپنی وہ تمام عادتیں بھی بالکل چھوڑ دیں جن کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم پر پوری توجہ نہیں دے پاتے تھے، اور طے کیا کہ اب پوری تندہی سے اپنی تعلیم مکمل کریں گے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کے ذہن میں پیدا ہونے والی اس تبدیلی کی وجہ سے ان کے وہ اساتذہ جو ان سے مطمئن نہیں تھے، وہ بھی ان کے والد سے کہنے لگے کہ آپ انھیں اعلیٰ تعلیم دلوائیں۔ یہ یقیناً ہونہار ثابت ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کو مطالعہ کا شوق بڑھ گیا اور اپنے نصاب کی کتابوں کے علاوہ نئی نئی کتابیں پڑھنے کے لیے ہمیشہ خواہش مند رہنے لگے۔ ان کے والد بھی چاہتے تھے کہ یہ ایک بڑے اسکالر ثابت ہوں۔ اس لیے ان کا مطالعہ کا شوق پورا کرنے کے لیے وہ قرض لینے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ گھر کے زیورات بھی بیچنے اور رہن رکھنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کے ذوقِ مطالعہ سے متاثر ہوکر ان کے والد نے انھیں بمبئی کے الفنسٹن کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ لیکن ہائی اسکول میں داخلے کے ساتھ ہی نئے نئے تجربات کا سلسلہ ایک حادثہ کے ساتھ شروع ہوا۔

گرمیوں کے دن تھے، ایک دن وہ اپنے بڑے بھائی اور چھوٹے بھتیجے کے ساتھ اپنے والد سے ملنے کے لیے گورے گاؤں گئے۔ جہاں ان کے والد خزانچی تھے۔ جب یہ ڈپولی سے ستارا ریلوے اسٹیشن پہنچے تو ان کے والد کسی وجہ سے انھیں لینے نہیں آسکے۔ نئی جگہ، نیا ماحول، سب کچھ نیا۔ کسی اور کو جانتے بھی نہیں تھے جس کی وجہ سے



کافی پریشان ہوئے۔ آخرکار انھوں نے اپنی پریشانی اسٹیشن ماسٹر کو بتائی۔ اس نے ازراہ ہمدردی ایک بیل گاڑی کا انتظام کر دیا۔ گاڑی بان اونچی ذات کا تھا، اسے جیسے ہی پتہ چلا کہ یہ بچے اچھوت ہیں، اس نے انھیں فوراً بیل گاڑی سے اتار دیا۔ اگرچہ انھوں نے اسے دوگنا کرایہ دینے کی پیش کش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ انتہا یہ کہ راستے میں جب انھیں پیاس لگی تو کسی نے پانی نہیں پلایا۔ یہ تینوں بھوکے پیاسے پیدل چل کر آدھی رات میں اپنے والد کے پاس پہونچے۔ تب ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں وہ اچھوت ہے اور معاشرے میں تنفر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

آئین ہند کے اس معمار کے ساتھ ایک بار ایسا ہوا کہ انھیں شدید پیاس محسوس ہوئی۔ تو انھوں نے ایک کنوئیں سے پانی پی لیا لیکن جیسے ہی کچھ لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا ان لوگوں نے بھیم راؤ کی بے رحمی کے ساتھ پٹائی کر دی۔ اسی سلسلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ جب یہ اسکول جا رہے تھے، اتفاق سے اس دن ان کے ساتھ بڑے بھائی نہیں تھے اور بارش کا بھی کوئی امکان نہیں تھا ورنہ انھیں تنہا اسکول نہ جانے دیا جاتا۔ ابھی انھوں نے آدھا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ یکبارگی موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ تیز بارش سے بچنے کے لیے انھوں نے پاس کی ایک دیوار کے نیچے پناہ لینی چاہی، لیکن اس گھر کی ایک عورت انھیں دیکھ رہی تھی، اسے معلوم تھا کہ یہ اچھوت ہیں۔ ابھی یہ ٹھیک سے کھڑے بھی نہیں ہو پائے تھے کہ اس عورت نے انھیں برستے پانی میں دھکا دے دیا جس سے یہ کیچڑ میں جا گرے اور ان کی کتابیں وغیرہ کیچڑ میں لت پت ہو گئیں۔

اسی طرح اسکول میں بھی ڈاکٹر امبیڈکر کو محسوس ہوا کہ انھیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ نہ تو وہ دوسرے طلبا کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں، نہ ہی ان کے ساتھ گھل مل سکتے ہیں۔ اس لیے اس کم عمری میں ہی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ان کے ساتھی بھی ان سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ بھی تو انہی کے جیسے ہیں۔ بلکہ ہم عمروں میں بہت سے طلباء سے زیادہ باصلاحیت بھی ہیں، صاف ستھرے بھی رہتے ہیں۔ پھر کیا بات ہے اور کیوں؟ کیا ذات انسان سے زیادہ بڑی ہوتی ہے؟ انسان کی عزت ذات سے کیوں؟ پیدا ہوتے ہی آدمی کے گلے میں یہ کیسا پھندا ڈال دیا گیا ہے، کہ وہ چاہے جتنی کوشش کرے، لیکن اس پھندے سے فرار نہیں ہو سکتا۔ یہ پھندا کس نے ڈالا اور کیوں؟

ڈاکٹر امبیڈکر مذہب پر آ کر رک جاتے۔ مذہب کیا ہے؟ آدمی آدمی کے بیچ نفرت پھیلانا، ذات پات کی دیوار کھڑی کرنا؟ آخر ہمارا جرم کیا ہے جو اپنے ہی ساتھیوں کے تنفر کا شکار ہو رہا ہوں ——؟ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ نہ ہی اس سلسلے میں کسی سے کچھ پوچھ پاتے کیا پوچھیں؟ کس سے پوچھیں؟ کون جواب دے گا؟ انھیں محسوس ہوتا کہ معاشرے اور آدمی کی ایک بے ترتیب بھیڑ نے اپنے حصار میں لے لیا ہے اور وہ اس حصار سے نکل نہیں سکتے۔

بمبئی میں انھیں غریب مزدوروں کی کالونی میں گھر ملا تھا جس میں صرف ایک کمرہ تھا جو باورچی خانہ، غسل خانہ، خوابگاہ اور مطالعہ گاہ تھا، جس میں دو افراد کے لیے بھی ٹھیک سے سونے کی جگہ نہیں تھی۔ اسی کمرے میں چاروں طرف گرہستی کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اتنے چھوٹے کمرے میں پورا کنبہ کس طرح بسر کرتا ہوگا، یہ سوچا ہی جا سکتا ہے۔ ایسے ماحول میں پڑھائی لکھائی ایک مذاق لگتی ہے۔ لیکن ان کے والد نے اس کا بھی ایک راستہ نکالا، وہ یہ کہ شام کو پہلے بھیم سو جائیں اور دو بجے رات میں والد انھیں اٹھا دیں گے۔ اس کے بعد صبح ہونے تک یہ اپنا مطالعہ کریں۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب اپنے مطالعہ کے لیے جگہ اور وقت سے مطمئن نہ تھے، اس لیے وہ ذہنی تناؤ کا شکار رہتے۔ اس کے ساتھ ان کے اسکول کا ماحول بھی کافی تکلیف دہ تھا۔ اگرچہ یہ اسکول سرکاری تھا، اس کے باوجود یہاں بھی ذات پات کا بہت خیال رکھا جاتا تھا، جس کی بنا پر انھیں اکثر تضحیک آمیز جملے سننا پڑتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب غیر معمولی قوت برداشت کے مالک تھے، وہ اپنے ساتھیوں کی بات کا برا نہیں مانتے، یہاں بھی ایک روز یہ ہوا کہ ان کے استاد نے بلیک بورڈ پر ایک اپیل حل کرنے کے لیے پکارا، جس کی وجہ سے اونچی ذات کے طلبا میں ہل چل مچ گئی۔ کیوں کہ یہ لوگ اپنے ناشتہ دان اسی بلیک بورڈ



کے پیچھے رکھتے تھے، اور بلیک بورڈ بھیم راؤ کے چھونے سے نجس ہوجاتا جس کی وجہ سے ان کا کھانا اور برتن بھی نجس ہوجاتے۔ اسلئے اس سے پہلے کہ ڈاکٹر صاحب بلیک بورڈ تک پہونچیں، سبھی طلبا ر نے اپنے ناشتہ دان وہاں سے اٹھا لیے۔ جس کی وجہ سے انھیں ایک بار پھر کمتری کا احساس ہوا۔

غالبًا اسی واقعہ کے نفسیاتی ردّعمل کے طور پر انھوں نے اور زیادہ محنت اور مشقت شروع کردی۔ روزانہ رات میں دو بجے مٹی کے تیل کے بغیر چمنی والے چراغ کی پیلی اور مدھم روشنی میں پڑھنے بیٹھ جاتے اور صبح ہونے تک مطالعہ کرتے رہتے۔ یہ اسی محنت کا صلہ تھا کہ ۱۹۰۷ء میں میٹریکولیشن کے امتحان میں سات سو پچاس میں سے چھ سو بیاسی نمبروں کے ساتھ انھوں نے امتیازی مقام حاصل کیا، جس کی بنا پر ایس۔ کے۔ بھولے کی صدارت میں ایک جلسہ کا انعقاد کرکے انھیں استقبالیہ دیا گیا۔ اس جلسہ میں مراٹھی زبان کے مشہور مصنف کرشن جی ارجن بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کو اس استقبالیہ میں "لائف آف گوتم" نامی کتاب بھی تحفہ میں دی گئی، نیز کرشن جی ارجن نے ان کی ستائش کی اور جلسہ کے اختتام پر انھوں نے بھیم راؤ امبیڈکر کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کی رائے دی۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا یہ دن ناقابل فراموش تھا انھوں نے اپنے دُھندلے ماضی کو بھلا کر کچھ دیر کے لئے مستقبل کے بارے میں سوچا، اس وقت وہ سن بلوغ کو پہونچ رہے تھے۔ جدوجہد کی آندھی گزر جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو احساس ہوا کہ انھیں مستقل آگے بڑھتے رہنا ہے، اگرچہ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہوگا۔ تاہم ان کے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ تھا اور شدید خواہش بھی۔

اس وقت ان کے سامنے زندگی کا ایک مبہم مقصد تھا، لیکن وہ اپنے مقصد کو واضح کرنا چاہتے تھے۔ علم کی طلب جو ایک بار پیدا ہوچکی تھی اسے وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ نہ ہی اپنی زندگی میں کبھی اس سے تائب ہوئے۔ یہ ان کے والد بھی جانتے تھے انھیں اپنی ہونہار اولاد پر فخر تھا نیز ان کے علاوہ اس ذات اور اس طبقے کو بھی اس انمول رتن پر فخر تھا جو آگے چل کر ان کا سچّا مسیحا ثابت ہوا۔

□□

شفق وارثی بدایونی

غریبوں کا مسیحا

وہ جس ماحول میں پیدا ہوا
اس میں گھٹن تھی، کرب تھا اور آہ و زاری تھی
سسکتے ہوئے، مُرجھائے ہوئے چہرے، بجھی آنکھیں
مسرت، قہقہے، خواہش، تمنا
جُرم ہو جیسے
جہالت، مفلسی میراث میں پائی تھی صدیوں سے
عجب ماحول تھا
اور رہنے والے بھی عجب تر تھے
لڑکپن ہی سے
وہ اس سوچ میں خود سے الجھتا تھا
کہ آخر کن گناہوں کے سبب
یہ لاکھوں مرد و زن
دُکھوں کی زندگی جینے پہ ہیں مجبور
بےچارے
کسی کو کیوں ترس آتا نہیں
ان پر
مگر پھر جلد ہی اس کی سمجھ میں آگیا سب کچھ
بہت سی اس نے تحریکیں چلائیں
مسیحا بن کے اُبھرا وہ دبے کچلے غریبوں کا
دیا دستور ایسا جس کے باعث
بہاروں کا سلام اُن کو ملا
جن کا خزاں گویا مقدر تھا
وہی تھا ہاں وہی
کہتے ہیں سب امبیڈکر جس کو

□□



برتھا

ترجمہ: ظفر انصاری

معمولی خاندان کی ایک غیر معمولی شخصیت

اپنے عہد میں دُنیا کے چہ عظیم ترین دانش وروں میں شمار کیے جانے والے غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک بابا صاحب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر ۱۴ر اپریل ۱۸۹۱ء کو مدھیہ پردیش کی مہو چھاؤنی کی ایک فوجی بیرک میں پیدا ہوئے۔

تعلیم حاصل کرنے کی بابا صاحب کی شدید خواہش تھی لیکن اس وقت کے ذات پات اور چھوت چھات کے ماحول کی وجہ سے انھیں تذلیل اور توہین کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر ایک اعلا انگریز افسر کی مدد سے بھیم راؤ کو پرائمری اسکول میں داخلہ مل سکا لیکن اس میں بھی سماجی نابرابری کی تمام شرطیں شامل تھیں۔ مثلاً بھیم راؤ درجہ میں دیگر طلبا کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ وہ درجے میں الگ بیٹھیں گے، درجے میں دیگر طلبا کے داخل ہونے کے بعد ہی داخل ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس تذلیل کا بھیم راؤ کے دل پر شدید اثر ہوا۔ اچھوت سمجھے جانے کی وجہ سے نل کی ٹونٹی کھول کر پانی نہیں پی سکتے تھے۔ ان مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے بھیم راؤ نے اپنی تعلیم مکمل کی۔

اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ بڑودہ کے مہاراجہ سیاجی گائکواڑ سے وظیفہ لے کر امریکہ گئے اور وہاں کولمبیا یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں سے ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد وہ انگلینڈ گئے۔ لندن میں رہ کر انھوں نے اقتصادیات اور قانون کی تعلیم حاصل اور وہاں سے بار ایٹ لا اور ڈی۔ ایس۔ سی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ سنسکرت پڑھنے کی ان کی شدید خواہش تھی، لیکن اُس وقت کے ذات پات کے نظام کی وجہ سے وہ ہندستان میں سنسکرت نہ پڑھ سکے۔ عزم محکم رکھنے والے بھیم نے جرمنی جا کر سنسکرت ادب کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے ۱۹۵۲ء میں ایل۔ ایل۔ ڈی اور ۱۹۵۳ء میں ڈی۔ لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان جیسی صلاحیتوں کا انسان ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ اعلا پائے کے ماہر سماجیات ماہر اقتصادیات، ماہر قانون اور بے مثل سیاست داں تھے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی نجی لائبریری اتنی بڑی تھی کہ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا یہ کوئی بین الاقوامی لائبریری ہو۔ اس لائبریری کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں تھی کہ اس میں بابا صاحب کے نٹ نوٹ پنسل سے نہ لکھے گئے ہوں۔ ایسے تو بہت سے لوگ مل جائیں گے جن کا مطالعہ وسیع ہو، لیکن اس مطالعے میں تنقیدی رجحان کی بھی آمیزش ہو، ایسے بہت کم لوگ ملیں گے۔ ڈاکٹر امبیڈکر زبردست صلاحیتوں کے مالک ایک غیر معمولی انسان تھے۔

۱۹۳۰ء میں لندن میں پہلی گول میز کانفرنس ہوئی تو ڈاکٹر امبیڈکر اس میں اچھوتوں کے نمائندے بن کر گئے اور اچھوتوں کو برابری دلانے کے لیے ان کے حقوق کی خاطر ناقابلِ تنسیخ دلائل پیش کیے۔

۱۹۴۷ء میں وہ آزاد ہندستان کے پہلے وزیر قانون بنے اور دستور ساز کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے۔ ویسے تو ہندستان کا دستور بنانے والی کمیٹی میں سات اراکین تھے۔ ان میں سے ایک کا انتقال ہوگیا، دوسرے امریکہ چلے گئے۔ ایک نے استعفا دے دیا۔ چوتھے حکومت کے دوسرے کاموں میں مصروف رہے۔ پانچویں رکن دلی کے باہر رہے، اور چھٹے رکن



نے کبھی تعاون نہیں دیا۔ اس طرح اکیلے انھوں نے ہی جی توڑ محنت کرکے ہندستان کے آئین کا مسودہ تیار کرکے دستور ساز کونسل کے سامنے پیش کردیا۔ اس عظیم کام کے لیے ملک ہمیشہ ان کا احسان مند رہے گا۔ ہندستان کا آئین پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا تھا:

"آزادی تو ہمیں مل گئی لیکن ہندستان میں مساوات کا فقدان ہے۔ یہاں کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں عدم مساوات کا بول بالا ہے۔ اس عدم مساوات کو ہمیں جلد از جلد ختم کردینا چاہیے ورنہ سخت محنت سے تعمیر کی گئی جمہوریت کی یہ عمارت خاک میں مل جائے گی۔

مجھے سب سے بڑی فکر اس بات کی ہے کہ ماضی میں اس ملک کو اپنے ہی لوگوں کے فریب سے آزادی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ملک کو اہمیت دیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو آزادی ایک بار پھر خطرے میں پڑ جائے گی اور ہم ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہو جائیں گے۔ ہمیں اپنے خون کے آخری قطرے تک اس کی حفاظت کرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر امبیڈکر نے نصیحت کی تھی: ——

"تعلیم یافتہ بنو، منظّم رہو اور جدوجہد کرتے رہو۔"

انھوں نے بیس سے زیادہ کتابیں لکھیں، متعدد اخبار جاری کیے اور ان کی ادارت کی۔ ملک کو اپنے اس عظیم فرزند پر ناز ہے۔

آئین ساز امبیڈکر — ص۸ کا بقیہ

کھلے رہیں گے اور ہندستان میں آئین و قانون کو فرد کا لازمی احترام کرنا پڑے گا، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

ہم بیسویں صدی کی آخری دہائی میں سانس لے رہے ہیں، جب شعر و ادب، سیاسی اور سماجی فلسفوں اور انسانی ذہن میں فرد کی اہمیت اور تقدیس کو مرکزی درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن آج سے چار دہائیوں پہلے ۱۹۵۰ء میں فرد اور اس کے انسانی حقوق کی تقدیس پر یقین صرف ڈاکٹر امبیڈکر ہی کو تھا۔ یہ ان کی عظمت اور ان کی امتیازی شان تھی۔ فرد کی اہمیت اور عزت و وقار کے لیے ان کی فکرمندی نے ہندستانی آئین کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ فکرمندی اور دل سوزی ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی اپنی زندگی کے تجربوں اور احساسات کا نتیجہ تھی۔ ان کے شعور میں انسانیت اور انسان دوستی کی جو روشنی جلوہ گر تھی وہ ہر ظلمت پسندی سے لڑتی رہی اور برابر فتح حاصل کرتی رہی۔ لیکن ہندستان کا آئین ان کی سب سے بڑی فتح اور کامرانی تھی۔ اس کی وجہ سے امبیڈکر ہندستان کے ماضی سے نکل کر ہندستان کے مستقبل کا ایک حصّہ بن گئے۔ ایسے مستقبل کا حصہ جس کی تعمیر امبیڈکر نے شروع کی تھی، اور آج بھی ایک فرد کو امید اور اعتماد کے سہارے فراہم کرتا ہے، حوصلہ عطا کرتا ہے اور یہ یقین دلاتا ہے کہ فرد ہی سب سے بالاتر ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ فرد کے لیے، فرد کے ذریعے اور فرد کے مفاد میں ہے کیونکہ فرد ہی انسانی زندگی کی اکائی ہے۔

"مذہب کو ضابطۂ اخلاق کی آزادی، مساوات اور برادرانہ جذبے کے آدرشوں کو پورے طور پر تسلیم کرنا چاہیے۔"
—— ڈاکٹر امبیڈکر



ایم جمال علوی

امبیڈکر
بحیثیت مدرس و مصنف

۶ سالہ بھیم راؤ امبیڈکر کو جن کا پیدائشی نام سک پال تھا' اپنی ماں کے انتقال کے بعد' اپنے والد صوبیدار میجر رام جی مالو جی کے ذریعہ بڑی دشواریوں کے بعد' ایک انگریز افسر کی سفارش کی وجہ سے قصبے کے ایک چھوٹے سے اسکول میں داخل کرا یا گیا۔ لیکن اچھوت ہونے کی وجہ سے انھیں کلاس سے باہر' دروازے کے قریب' سب سے الگ تھلگ بٹھایا جاتا تھا۔ ساتھ ہی انھیں ہر چھوٹے بڑے کے چبھتے ہوئے طنز اور زہر میں بجھے ہوئے تیر جیسے جملے بھی صبح و شام برداشت کرنا پڑتے تھے۔ نہ یہ بچہ اسکول میں پانی پی سکتا تھا۔ کسی کے ساتھ کھیلنا کودنا تو کجا' پر تو کسی سے بولنے یا مخاطب ہونے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ وہی دور تھا جب دلت سماج' ہزاروں برسوں کی پس ماندگی کی وجہ سے خود بری طرح احساس کمتری کا شکار تھا اور خود ہی عام آدمیوں سے دور' کہیں بھی زمین پر بیٹھ جانا پسند کرتا تھا۔ ان کے کپڑے شرفا کے کپڑوں کے ساتھ بھلا کس طرح دھل سکتے تھے اور نام نہاد شریفوں کے ساتھ یہ بھلا اپنے بال کس طرح کٹوا سکتے تھے۔ ان حالات میں امبیڈکر کو کیسی کیسی تکلیفیں جھیلنا پڑیں' ایک منظر خود ان ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

"میرے والد کا تبادلہ سورت سے گوری گاؤں ہو چکا تھا۔ میں پہلی بار اپنے بڑے بھائی آنند راؤ کے ساتھ ان سے ملنے گوری گاؤں جا رہا تھا۔ میسور اسٹیشن پر ٹرین سے اترنے کے بعد وہاں بجز ایک بیل گاڑی کے اور کوئی سواری موجود نہ تھی۔ ہم نے گاڑی والے سے درخواست کی کہ وہ ہمیں کرایہ لے کر گورے گاؤں پہونچا دے۔ گاڑی والا اس پر تیار ہو گیا۔ راستے میں اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران' اس نے ہمارے حالات ہمیں سے معلوم کر لیے۔ ہم نے بڑی معصومیت سے اسے اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی بتا دیا۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ہم ایک نیچ ذات سے متعلق ہیں' اس نے فوراً گاڑی روک دی اور ہمارے گاڑی سے اتر جانے پر اصرار کیا۔ جب میرے بڑے بھائی نے اس کی کچھ زیادہ ہی خوشامد کی تو وہ بڑی مشکل سے اور بے دلی سے صرف اس بات پر راضی ہوا کہ ہم اسے ڈبل کرایہ بھی ادا کریں اور گاڑی بھی خود چلائیں کیوں کہ وہ ہمارا نوکر بننے پر قطعی تیار نہیں تھا۔ میرے بھائی نے اس کی دونوں باتیں مان لیں اور گاڑی خود ہی ہانکنا شروع کر دی۔ اس شخص نے ہمیں راستے بھر کسی بھی کنوئیں سے پانی نہیں پینے دیا۔ وہ ہر جگہ چیخنا چلانا شروع کر دیتا کہ ہم اچھوت ہو کر اس کنویں کو نجس کرنے جا رہے ہیں' تنگ آکر



پیاس کی شدت میں ہمیں ایک گندے جوہڑ کا پانی پینا پڑا۔"

(مراٹھی رسالہ مُک نائک شمارہ ۸ جولائی ۱۹۲۱ء)

ان کے والد رام جی، ریٹائر ہونے کے بعد بمبئی آ گئے اور انھوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور اپنے دونوں بچوں کا داخلہ بھی یہاں کے الفنسٹن اسکول میں کرا دیا۔ یہاں بھیم کو قدرے آزادی، سکون اور طمانیت کا احساس ہوا، اور یہ بچہ سب کے ساتھ برابری اور بے خوفی سے بنچوں پر بیٹھ کر دل لگا کر پڑھنے لگا۔ لیکن درجات میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اسٹڈی کے لیے اب ان کی چھوٹی سی کوٹھری قطعی ناکافی ثابت ہو رہی تھی، اس لیے پرسکون مطالعے کے لیے بھیم چرنی روڈ گارڈن چلے جاتے جہاں سٹی ہائی اسکول کے پرنسپل کرلوسکر بھی بلاناغہ ٹہلنے آتے تھے۔ انھیں اس بچے کے انہماک اور تعلیم سے اس کی رغبت دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ ایک دن انھوں نے بھیم سے اس کے بارے میں بات کی اور محنت اور تعلیم سے اس کی رغبت پر ہمت افزائی کرتے ہوئے اسے خاطر خواہ داد بھی دی۔ آگے چل کر یہی حضرت بھیم کی اعلیٰ تعلیم کے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے کیونکہ انھیں کی کوششوں سے مہاراجہ بڑودہ نے بھیم کے لیے پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ جس کی وجہ سے بھیم راؤ امبیڈکر نے ۱۹۱۲ء میں فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے پاس کیا۔

پھر انہی کرلوسکر صاحب کی مزید کوششوں سے بڑودہ کے مہاراج نے انھیں اعلا تعلیم کے لیے امریکہ بھیجنا منظور کر لیا، جس کے بدلے میں انھیں دس سال تک مہاراجہ کے یہاں نوکری کرنا تھی۔

اس طرح انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی سے ۱۹۱۵ء میں نہ صرف امتیازی نمبروں سے ایم۔ اے پاس کیا بلکہ اپنی پہلی کتاب بھی جو ہندستان کی قدیم تجارت سے متعلق تھی، مکمل کی۔ اس کتاب کا نام انھوں نے اینشینٹ انڈین کامرس (ANCIENT INDIAN COMMERCE) رکھا اور یہیں سے امبیڈکر کی تحریری زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

مئی ۱۹۱۶ء میں "پروفیسر گولڈن ویزر سمینار آن ہیومن بی انگ" میں ذات پات پر ان کا تحقیقی مقالہ بے مثال قرار دیا گیا۔ اس مضمون نے ان کی عزت و شہرت میں وہاں زبردست اضافہ کیا۔ یہ مقالہ بعد میں کاسٹس ان انڈیا (CASTES IN INDIA) نام کی ان کی دوسری کتاب میں جو جنوری ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی، شامل ہے۔ یہ کتاب ہندستان میں ذات پات سے متعلق اس دور کے حالات کی نہ صرف بہترین عکاس ہے بلکہ یہ ہندی اچھوتوں کے احساس کمتری سے مملو جذبات اور ان کی روزمرہ کی خواہشات کا ذہنی تجزیہ بھی پیش کرتی ہے۔ اسی سال مئی میں ان کی تیسری کتاب "نیشنل ڈوی ڈینڈ آف انڈیا" (NATIONAL DIVIDEND OF INDIA) لندن سے شائع ہوئی اور اسی تحقیقی کتاب پر کولمبیا یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے سرفراز فرمایا۔ یہ کتاب ہندستان کی قومی آمدنی سے متعلق ہے اور اسے اس موضوع پر ہندستانی معیشت کی اولین کتب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اسی دوران ڈاکٹر امبیڈکر، اپنے والد کی جان لیوا علالت کی خبر سن کر کالج سے چار سالہ تعطیل منظور کروا کے ۱۲ر اگست ۱۹۱۷ء کو واپس بمبئی پہونچے۔ لیکن ان کا سامان، جس میں بہت سی بیش قیمت اشیاء و کتب شامل تھیں، دوسرے بحری جہاز سے آ رہا تھا، غرقاب ہو گیا۔ جس سے ڈاکٹر صاحب کو شدید دھکا لگا کیونکہ اس سامان سے انھیں مالی منفعت کی امید تھی۔ اب ان کے پاس راجہ صاحب بڑودہ سے ملنے، بڑودہ تک جانے تک کے لیے رقم نہیں بچی تھی۔ نقصان کے ازالہ کے لئے لندن کی فرم ٹامس اینڈ سنس نے، جس نے ان کی ایک کتاب شائع کی تھی انھیں کچھ رقم ارسال کی تب وہ بڑودہ کے لیے روانہ ہو سکے۔

اس دوران بے کار بیٹھنے کے بجائے انھوں نے راجہ صاحب کے کہنے سے ان کے یہاں ملٹری سکریٹری کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ لیکن بڑودہ میں انھیں رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ میسر نہ آ سکا۔ مجبوراً انھوں نے ایک پارسی دھرم شالہ میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر فی الوقت وہیں قیام کیا لیکن چند ہی دنوں بعد دھرم شالہ میں ٹھہرے ہوئے ایک مسافر کی شکایت پر کہ یہاں اچھوتوں کو ٹھہرایا جا رہا ہے، انھیں ۲۴ گھنٹے کے اندر وہاں کی رہائش ترک کرنا پڑی۔

یہاں ایک بار پھر انھیں نت نئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ یہ

بات اب سب کے علم میں آچکی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اچھوت ہیں، ان کے ماتحتوں نے ان کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ علاوہ ازیں دوسرے افسروں نے بھی انھیں موقع بے موقع ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ تنگ آکر انھوں نے تمام حالات سے مہاراجہ کو مطلع کر دیا، جنھوں نے بڑی فراخ دلی سے ڈاکٹر امبیڈکر کو اس معاہدہ سے آزاد کر دیا جس کے تحت انھیں وہاں دس سال تک ملازمت کرنا لازمی تھی۔

اس طرح ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر بمبئی واپس آگئے اور چند روزہ تجارت میں نقصان اٹھانے کے بعد اپنا گزارہ ٹیوشن پر کرنے لگے۔ اسی دوران ڈاکٹر سدھنم جن سے ان کا تعارف یورپ کے قیام کے دوران ہو چکا تھا، بمبئی آگئے۔ ان کے کالج میں ایک پروفیسر کی جگہ خالی ہونے کی خبر سن کر ڈاکٹر صاحب نے وہاں درخواست روانہ کی۔ ان کی قابلیت کی وجہ سے کالج میں فوری طور پر ان کا تقرر ہو گیا۔ ان کے لیکچروں سے متاثر ہو کر مہاراجہ کولھاپور نے ان کی بڑی تعریف کی اور ترقی پذیر اقوام کی حالت میں سدھار لانے کے لیے چوں کہ وہ خود بھی عملی طور پر میدان میں تھے، اس لیے انھوں نے بڑی فراخ دلی سے ڈاکٹر امبیڈکر کے لیے سرمایہ فراہم کیا۔

یہی وہ وقت تھا جب ڈاکٹر صاحب نے صحافتی زندگی میں بھی عملی طور پر قدم رکھا اور مہاراجہ کولھاپور کی اعانت سے ایک ماہنامہ "موک نائک" شائع کیا۔ جس کا اصل مقصد پس ماندہ اقوام کا سدھار تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس رسالہ کے لیے بے حد معیاری مضامین تحریر کیے جن کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب سیاسی، سماجی اور تعلیمی اسٹیج پر معلم، مقرر اور مصنف کی حیثیت سے نہ صرف مشہور ہوئے بلکہ ان کے مضامین نے اچھوتوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ انھوں نے مراٹھی میں کچھ اشعار بھی کہے ہیں۔

۵ جولائی ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر امبیڈکر ایک بار پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے لندن روانہ ہوئے اور بیک وقت لندن اسکول آف اکنامکس سے ایم۔ایس۔سی اور گریزان سے بار ایٹ لا کرنے کے لیے انھوں نے داخلہ لے لیا اور صرف دو سال کے عرصہ میں سخت محنت و جاں فشانی کے بعد دونوں امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیے

ان تعلیمی مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر صاحب اپنے میگزین کے لیے مضامین لندن سے بمبئی ارسال کرتے رہے۔

جون ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی چوتھی کتاب "پراونشل ڈی سینٹرالائی زیشن آف امپیریل فائننس ان برٹش انڈیا" (PROVINCIAL DE-CENTRALISATION OF IMPERIAL FINANCE-IN BRITISH INDIA) شائع کی جس میں ہندستان میں انگریزوں کی سرمایہ کاری کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ اسی سال انھوں نے ایم۔ایس سی کی ڈگری حاصل کر لی۔

اکتوبر ۱۹۲۲ء میں انھوں نے "پرابلم آف دی روپی" (PROBLEM OF THE RUPEE) لکھ کر ڈی۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی۔ چند دنوں بعد آپ کو محنت کا ایک اور ثمر یعنی انھیں بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

یہی وہ وقت تھا جب آپ کو بون یونیورسٹی جرمنی سے سنسکرت کے ایسوسی ایٹ پروفیسر کا عہدہ تفویض کیا گیا اور وہ لندن سے جرمنی چلے گئے لیکن زیادہ عرصہ تک وہاں نہ رک سکے کیونکہ انھیں ڈگری سے متعلق تقریب میں شرکت کے لیے لندن واپس آنا پڑا، جہاں سے ان کی ایک اور کتاب "ریسپونسیبلیٹیز آف اے ریسپانسبل گورنمنٹ ان انڈیا" (RESPONSIBILITIES OF A RESPONSIBLE GOVT. IN INDIA) شائع ہوئی۔ اس طرح بحیثیت طالب علم ایم۔اے۔ پی ایچ۔ڈی، ایم۔ایس۔سی، ڈی۔ایس۔سی اور بار ایٹ لا وغیرہ ڈگریوں سے آراستہ ہو کر انھوں نے اپریل ۱۹۲۳ء میں ہندستان واپسی کا قصد کیا اور بمبئی پہونچ کر ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو وہ چالیس گاؤں اسٹیشن سے خود ہی تانگہ ہانکتے ہوئے ایک آدی واسی گاؤں کی جانب جا رہے تھے کہ تانگہ پلٹ گیا جس سے ان کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی اور انھیں تین ماہ تک بستر پر پڑا رہنا پڑا۔ اس بیچ انھوں نے ایک اور کتاب جو مولویوں، پنڈتوں اور پادریوں کے مختلف ادوار کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کرتی ہے، تیار کی، جو "ایوولوشن آف پریسٹ ہڈ" (EVOLUTION OF PRIEST HOOD)



کے نام سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی آخری تالیف ہندستان کا دستور اساسی ہے جسے انھوں نے اپنی علالت کے دوران بڑی ہی عرق ریزی اور جاں فشانی سے تیار کیا۔ انھوں نے سوشلزم اور جمہوری اقدار پر اس کی بنیاد رکھتے ہوئے اور عوام کو غور وفکر، تحریر وتقریر اور مذہب کی مکمل آزادی دیتے ہوئے اسے دنیا کے بہترین منشور کی صف میں لا کھڑا کیا۔

ہندستان کا دستور اساسی، ڈاکٹر صاحب کی بھارت واسیوں کو دی گئی وہ اہم کتاب ہے جس پر ہمارا سر اقوام عالم میں فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔

یہاں میں مہاراجہ کولہاپور کے الفاظ میں، ان کی وہ پیش گوئی دہرائے بغیر نہیں رہ سکتا جو انھوں نے مان گاؤں میں ڈاکٹر امبیڈکر کے ضمن میں تقریر کرتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں کی تھی:۔

"بھائیو!

ہمارے لیے یہ بڑی خوش قسمتی کا موقع ہے کہ آج آپ کے سامنے امبیڈکر جیسا مضبوط اور مہذب اچھوتوں کا محافظ موجود ہے۔ یہ ہندستان کے اچھوتوں کو پہنائی گئی پس ماندگی کی بیڑیوں سے انھیں آزاد کرانے کے ضمن میں ایک لیڈر کی حیثیت سے چمکے گا۔ مستقبل قریب میں یہ سلسلہ لگاتار بلندیوں سے ہمکنار ہو کر اپنی آب و تاب میں خود ہی اضافہ کرے گا۔"

——— چھترپتی ساہو جی مہاراج

پریس رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۵۶ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹۔ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ نیا دور کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کی جا رہی ہیں:۔

(۱) مقام اشاعت: ——— لکھنؤ

(۲) وقفۂ اشاعت: ——— ماہوار

(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ: ——— شری راجیو اروڑا، ہندستانی، یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ: ——— شری شیلیش کرشن۔ ہندستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش، لکھنؤ

(۵) ایڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ: ——— شری شاہ نواز قریشی، ہندستانی، ایڈیٹر نیا دور، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ

(۶) ان اصحاب کے نام اور پتے جو اس رسالہ کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمائے کے ایک فیصد سے زیادہ حصہ دار ہیں۔ } 'نیا دور' سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا، جو اس جریدہ کے مالک یا حصہ دار ہیں، یا ساری پونجی کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصہ دار ہیں، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں شیلیش کرشن اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) شیلیش کرشن

(پبلشر)



شمیم فاطمہ

جہادِ زندگانی اور امبیڈکر

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے بیسویں صدی کے اس دور میں آنکھیں کھولیں جب ہندوستان ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ انگریزوں کی غلامی کے شکنجے سے ہندوستان کو نجات دلانے کی تمنا بیشتر ہندوستانیوں کے دلوں میں انگڑائیاں لے رہی تھی۔ آزادی کی اس جنگ میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہرلال نہرو، سردار پٹیل، سروجنی نائیڈو، مدن موہن مالویہ، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر وغیرہ کے دوش بدوش ڈاکٹر امبیڈکر بھی شامل تھے۔ وہ ایک جید عالم، ماہر قانون اور زبردست مقرر تھے۔

وہ مہاراشٹر کے ایک مفلوک الحال مہار خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ان تمام مظالم، اہانت، نفرت اور انسانیت سوز سلوک کو خود برداشت کیا تھا جو پست ذات میں جنم لینے والوں کا مقدر ہوتا تھا۔ ان کے زمانے میں شودروں کو عبادت گاہوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ انھیں دیہاتوں میں کنویں یا تالاب سے پانی بھرنے کی ممانعت تھی۔ ان کے بچوں کو اسکولوں میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ ان کے چھونے سے یا ان کی پرچھائیوں سے اونچی ذات والے ناپاک ہو جاتے تھے۔

چھوت چھات کے انسداد کے لیے اور ہریجنوں کو انسانی حقوق دلانے کے لیے وہ پوری طرح میدان عمل میں کود پڑے۔ انھوں نے اچھوتوں کی زندگی کو ان لعنتوں سے نجات دلانے کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔ انھوں نے اس طبقے کے افراد کے تعلیمی معیار کی اصلاح کے لیے اور ان کے سماجی مرتبے کو بلند کرنے کے لیے زبردست جدوجہد کی۔ انھوں نے ہندوستان کے آئین کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا جس نے قانونی طور پر چھوت چھات کی لعنت کا خاتمہ کر دیا۔

دستور ہند کے آرٹیکل "۱۷" کے مندرجات کو ۱۹۵۵ء میں منظور شدہ چھوت چھات کے ایکٹ ـ UNTOUCHABILITY (OFFENCES) ACT ـ کے تحت دوبارہ نافذ کیا گیا ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے اگر کوئی شخص کسی سے چھوت چھات برتتا ہے تو وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ ہندوستان کا آئین اقوام و قبائل درج فہرست کو بعض مراعات دیتا ہے۔ مثلاً ملازمتوں میں ان کے لیے رزرویشن، پارلیمنٹ اور اسمبلی میں بھی ان ذاتوں کے امیدواروں کے لیے بعض نشستیں محفوظ ہوتی ہیں، پنچایتوں اور بلدیاتی اداروں میں بھی ان کی مناسب نمائندگی ہوتی ہے۔ ان طبقات کے طلبا و طالبات کو تعلیم حاصل کرنے کے دوران فیس میں رعایت ملتی ہے۔ وظائف دیے جاتے ہیں اور کتابیں و یونیفارم بھی مفت فراہم کیے جاتے ہیں تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ معاشرے کا کوئی بھی طبقہ اقتصادی خوش حالی حاصل کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی پوری زندگی معاشرے کے پامال، پس ماندہ مفلوک الحال اور مظلوم طبقے کے لیے وقف کر دی تھی، ان کی زندگی کا نصب العین معاشرے کے محروم افراد کو تمام محرومیوں اور مظالم سے نجات دلانا تھا تاکہ ان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

حکومت ہند نے ان کے انتقال کے بعد انھیں "بھارت رتن" کا اعزاز دے کر ان کی جو عزت افزائی کی ہے وہ ہر طرح ان کے

(باقی ص ۱۴ پر)



ڈاکٹر غلام معین الدین

ڈاکٹر امبیڈکر کی سوانح

ایک نظر میں

○ پیدائش :— ۱۴ر اپریل ۱۸۹۱ء

تعلیمی لیاقت

○ ابتدائی تعلیم :— ستارا اور بمبئی میں

○ ہائی اسکول اور انٹرنس :— الفنسٹن کالج بمبئی سے

○ بی۔ اے :— ۱۹۱۲ء میں فارسی کے ساتھ
اسی سال اعلا تعلیم کے لیے امریکہ روانگی۔

○ ایم۔ اے :— ۱۹۱۴ء میں معاشیات اور سماجیات میں۔

○ پی ایچ۔ ڈی :— ۱۹۱۶ء میں
برٹش انڈیا میں صوبائی معیشت کے ارتقار پر، اسی سال ڈی۔ ایس۔ سی کے لئے لندن میں تحقیقی کام کا آغاز۔ موضوع تھا "ایک جمہوریہ کے مسائل"

○ ہندستان واپسی :— ۱۹۱۷ء میں مہاراجہ بڑودہ کے بلانے پر۔ اسی سال بمبئی کے سیڈنہیم کالج میں سیاسی معاشیات کے لکچرر کی حیثیت سے تقرری۔

○ دوبارہ لندن روانگی :— ۱۹۱۹ء میں، جہاں سے ڈی ایس سی اور بار ایٹ لا کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہاں سے جرمنی گئے اور بون یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۲ء تک وہاں تحقیقی کاموں میں منہمک رہے۔

○ واپسی :— ۱۹۲۳ء میں، معاشی دشواریوں کی بنا پر ہندستان واپس آگئے اور یہاں بیرسٹری کا آغاز کیا۔

سماجی اور سیاسی سرگرمیاں

۱۹۲۶ء میں — کولابہ ضلع کے مہاد نامی مقام پر مہاد تحریک کی قیادت کی۔ اسی سال ناسک ستیہ گرہ کی قیادت بھی کی۔

۱۹۳۰ء میں — پہلی گول میز کانفرنس میں اچھوتوں کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت۔

۱۹۳۷ء میں — انڈی پنڈنٹ لیبر پارٹی قائم کی۔

۱۹۵۰ء میں — ۲۶ر جنوری کو آپ کے وضع کردہ آئین کا ہندستان میں نفاذ۔

۱۹۵۶ء میں — ۱۴ر اکتوبر کو ناگ پور کے ایک جلسے میں بدھ مذہب اختیار کیا۔

○ انتقال — ۶ر دسمبر ۱۹۵۶ء

□□

ڈرامہ

باباصاحب امبیڈکر

زین الدین حیدر

افراد

بھیم راؤ امبیڈکر : — باباصاحب

بالک بھیم راؤ : — باباصاحب ۸، ۱۰ سال کی عمر میں

رام جی راؤ : — باباصاحب کے والد

ہیڈ ماسٹر

مہاراجہ بڑودہ

مہاتما گاندھی

ماتا بھیما بائی : — باباصاحب کی والدہ

ملازم : — مہاراجہ بڑودہ کا ملازم

چار اشخاص

راوی

پہلا منظر

بھیم راؤ کا گھر۔ ایک پس ماندہ اور غریب خاندان کا معمولی سامان۔ ان کی ماں گھر کے کام کاج میں مصروف نظر آتی ہیں

راوی : باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر ۱۴؍اپریل ۱۹۹۱ء کو اندور کی فوجی چھاؤنی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد رام جی راؤ فوج میں ملازم تھے۔ آپ کے دادا بھی فوجی ملازمت میں تھے اور اپنی دلیرانہ اور نمایاں کارکردگی کے صلے میں بہت سے میڈل اور انعامات حاصل کر چکے تھے، اچھے عہدے پر فائز تھے لیکن باپ دادا دونوں کو اس بات کا بےحد دُکھ رہتا تھا کہ ان کو اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں بےشمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ اچھوت تھے اور اونچی ذات کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

(۱، ۲، ۳، ۴ اشخاص جو پڑوسی ہیں، شکایت کرنے کے لیے گھر میں داخل ہوتے ہیں اور بھیما بائی سے مخاطب ہوتے ہیں :)

پہلا شخص : دیکھو بھئی اب تمھارے لڑکے کی شرارتیں برداشت سے باہر ہو گئی ہیں۔ دن بھر آوارہ لڑکوں کی طرح مارا مارا پھرتا ہے۔ کبھی اس کو مارا، کبھی اُس کو پیٹا، کبھی اس کو ڈھکیلا، کبھی اُس کو دھکا دیا۔ کیا سمجھتا ہے وہ اپنے آپ کو — کل اس نے تلسی داس کے لڑکے کو مارا، آج بھگوان داس کے لڑکے کو ایسا دھکا دیا کہ وہ مندر کے پتھر پر گر گیا اور اس کا سر پھٹ گیا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے ڈانٹا تو کہنے لگا کہ روز ماروں گا اور سب کو ماروں گا۔ یہ لوگ مجھے اپنے پاس اسکول میں کیوں نہیں بیٹھنے دیتے، مجھے پانی بھی نہیں پینے دیتے۔ مجھے اپنے پاس سے بھگا دیتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے اس میں ان بچوں کا کیا قصور ہے؟ وہ کسی مہار کو اپنے پاس کیسے بٹھا سکتے ہیں۔؟ دین دھرم بھی تو کوئی چیز ہے۔



دوسرا شخص: بالکل! کیا وہ اپنا دھرم نشٹ کریں گے؟
تیسرا شخص: لڑکوں کو بُلا کر پوچھ لو۔ اسکول میں بھی سب سے لڑا کرتا ہے۔
چوتھا شخص: اسکول کے لڑکوں کو، محلے کے لڑکوں کو، سب کو اس نے دشمن بنا رکھا ہے۔
بھیما بائی: (بھیم راؤ کو پکڑ کر مارتی ہیں اور کہتی ہیں) کیوں؟ ہر وقت مار پیٹ کرتا رہتا ہے۔ ہر وقت شکایت سننے کو ملتی ہے، ناک میں دم کر رکھا ہے۔ یہاں رہنا مشکل کر دیا ہے۔ آنے دے تیرے باپ کو، کہوں گی کہیں اور مکان لے لیں، اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔ بھگوان کو پیدا ہی کرنا تھا تو کہیں اور پیدا کرتے، مہار کے گھر میں پیدا کر کے کونسا انصاف کیا ہے اس نے؟ — بھائی صاحب جایئے۔ — آپ لوگ جایئے۔ میں جلدی مکان ڈھونڈھ کر کہیں اور چلی جاؤں گی اس کو لے کر۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔
بالک بھیم راؤ: (سسکیاں لیتے ہوئے، بات کاٹ کر زور سے چیختے ہوئے) ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں رہیں گے اور سب کو ٹھیک کریں گے۔
پہلا شخص: دیکھا تم نے؟ — یہ سب کو ٹھیک کرے گا — رام رام۔ چھی چھی۔
بھیما بائی: (بالک بھیم راؤ کو پھر پکڑ کر مارنے لگتی ہیں) تو سب کو ٹھیک کرے گا۔ اس سے پہلے میں تجھ کو ٹھیک کر دوں گی۔ تو نے جینا دوبھر کر دیا ہے نالائق ....
(چاروں اشخاص باہر جاتے ہوئے) "رام۔ رام۔ چھی چھی۔ رام رام .....!"

دوسرا منظر

(ستارہ میں ایک اسکول۔ ہیڈ ماسٹر کا دفتر)
رام جی راؤ: (ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں داخل ہو کر) نمستے سر۔ آپ نے بلوایا تھا سر؟
ہیڈ ماسٹر: ہاں میں نے آپ کو بلوایا تھا۔ آپ کو بتا دوں کہ آپ کے لڑکے کا داخلہ میں نے لیفٹننٹ سائمن صاحب کے کہنے سے کر لیا تھا اور بہت مجبور ہو کر، مینجمنٹ کے ممبروں کو سخت اعتراض تھا۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ صرف یہ کہ کر لوگوں کو مطمئن کیا کہ سائمن صاحب بضد ہیں۔ ان کی بات رکھنے کے لیے داخلہ کر لیا ہے۔ اچھوت لڑکا ہے یہ کیا پڑھے گا — کتنے دن اسکول میں رہے گا۔ مہینے دو مہینے میں خود ہی چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں مگر ہر روز لڑکوں کی شکایتیں آتی رہتی ہیں — اس کے خلاف — ٹیچرس بھی برابر اس کی شکایت کر رہے ہیں — یہ تو وہ ضرور کہتے ہیں کہ پڑھنے میں بُرا نہیں۔ دماغ اچھا ہے۔ پڑھنے میں کلاس کے سارے بچوں سے اچھا ہے مگر ہر وقت گالی گلوج، دھکا مکی، مار پیٹ کی شکایتیں بچوں کی طرف سے آتی رہتی ہیں — ٹیچرس کی بھی نافرمانی کرتا رہتا ہے — میں بہت عاجز آگیا ہوں — آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ اس کو اسکول سے اٹھا لیجیے......
رام جی راؤ: سر! اس کو بھی کچھ شکایتیں ہیں اسے بھی سُن لیتے آپ — پھر جو بھی حکم دیتے —
ہیڈ ماسٹر: کیا شکایت ہے اس کو؟ کس سے شکایت ہے اس کو؟ کیا کہتا ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟
رام جی راؤ: وہ باہر کھڑا ہے۔ کہیے تو آپ کے سامنے پیش کروں۔ پوری بات سن لیجیے۔ پوری تحقیقات کر لیجیے — پھر جو حکم دیجیے.....
ہیڈ ماسٹر: بلایئے اُسے —
(بالک بھیم راؤ ایک جانگیہ، پھٹا ہوا قمیص پہنے ننگے پاؤں داخل ہوتا ہے۔ سلام بھی نہیں کرتا۔ سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار ہیں)

ہیڈ ماسٹر: (اس کی طرف دیکھ کر — پھر باپ کی طرف دیکھ کر) دیکھا آپ نے — ؟ سلام تک نہیں کیا، کتنا بدتمیز لڑکا ہے — دیکھ لیا آپ نے —؟

بالک بھیم راؤ: سر! میں کیسے سلام کروں — میں نے ہندی والے سر کو سلام کرکے ان کا پیر چھوا تھا جیسا کہ سب لڑکے کرتے ہیں تو انھوں نے ایک لات ماری۔ کہنے لگے — تیری یہ ہمت کہ میرے پیر چھوتا ہے: دھرم نشٹ کر دیا — اب مجھے اشنان کرنا پڑے گا۔ میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں کمینے نے مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ کہتے ہوئے وہ کلاس چھوڑ کر اشنان کرنے چلے گئے — سر آپ کو میں نے مارے ڈر کے سلام نہیں کیا۔

(یہ کہتا ہوا بالک بھیم راؤ ہیڈ ماسٹر کے پاؤں چھونے کے لئے آگے بڑھتا ہے)

ہیڈ ماسٹر (اُچک کر کرسی سے کھڑے ہو جاتے ہیں) نہیں نہیں یہ ٹھیک ہے — ٹھیک ہے — — — یہ بتاؤ تمھیں شکایت کیا ہے؟"

بالک بھیم راؤ: ایک تو یہ کہ میں اپنے ٹیچر لوگوں کو سلام کرنا چاہتا ہوں — سب لڑکوں کی طرح ان کے پیر چھونا چاہتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ جب تک کلاس میں ٹیچر نہیں آجاتے میں کھڑا رہتا ہوں۔ لڑکے مجھ کو اندر نہیں جانے دیتے۔ میں نے ایک دن سر سے بتایا تو انھوں نے کہا تم باہر ہی کھڑے رہا کرو۔ اندر آکر تم دوسرے اونچی ذات کے لڑکوں کے پاس بیٹھ جاؤ گے ان کو چھوؤ گے پھر ان کا دھرم نشٹ کر دوگے لڑائی ہوگی — سر میں باہر کھڑے کھڑے تھک جاتا ہوں — پیاس لگتی ہے تو مجھے پانی بھی نہیں ملتا۔ میں پائپ نہیں چھو سکتا۔ جس دن دائی جی نہیں ہوتیں کوئی ٹونٹی نہیں کھولتا۔ میں دن بھر پیاسا رہتا ہوں — گھر جاکر پانی ملتا ہے — سارے لڑکے بنچ پر بیٹھتے ہیں ہم کو اور بھائی کو ٹاٹ پر بیٹھنا پڑتا ہے — سر مجھ کو یہ اچھا نہیں لگتا۔ پھر جس ٹاٹ پر ہم بیٹھتے ہیں وہ روز لانا لے جانا پڑتا ہے۔ سر سے میں نے کہا کہ یہیں رکھ دیا کروں تو انھوں نے کہا کہ تم سب کا دھرم نشٹ کر دوگے — یہاں کہیں رکھو گے۔ یہاں دوسری ذات کے بچے بھی پڑھتے ہیں کسی نے چھو لیا تو کیا ہوگا؟ — اور تو ہمارے پڑھ لکھ کر کیا کرے گا۔

ہیڈ ماسٹر: بس بس۔ میں سمجھ گیا (رام جی راؤ کی طرف دیکھتے ہوئے جو ابھی تک کھڑے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر نے انھیں بیٹھنے کو بھی نہیں کہا) یہ لڑکا جو شکایت کر رہا ہے وہ کوئی معقول شکایت نہیں ہے۔ اور بھی دو ایک اچھوت لڑکے یہاں پڑھتے ہیں ان کو کوئی شکایت نہیں۔ یہ کون سا انوکھا لڑکا ہے جس کو تمام شکایتیں ہیں۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا — ہاں اسے لے جایئے۔ کل سے اسکول بھیجئے مگر آئندہ کوئی شکایت نہ ملے۔

(رام جی راؤ اپنے بچے بھیم راؤ کو لے کر باہر نکل جاتے ہیں۔)

تیسرا منظر

راوی: ابتدائی تعلیم کے بعد بھیم راؤ اپنے پتا کے ساتھ بمبئی پہونچے جہاں اس خاندان نے انتہائی مفلسی اور تنگدستی میں زندگی گزاری کسی طرح کوشش کر کے انھوں نے بھیم راؤ کو الفنسٹن اسکول میں داخل کرا دیا، جہاں کے ہیڈ ماسٹر ایک انگریز تھے۔ وہ چھوا چھوت کے سخت خلاف تھے اس لیے یہاں بھیم راؤ کو زیادہ تکلیف نہیں اٹھانی پڑی کیونکہ لڑکے اور ٹیچر باوجود اچھوتوں سے نفرت کرنے کے بھیم راؤ کو کچھ نہیں کہہ پاتے تھے اور بھیم راؤ ستارہ کے مقابلے میں یہاں کچھ زیادہ خوش اور مطمئن تھے۔ اگر انھیں کوئی تکلیف تھی تو گھریلو حالات، ماں باپ کی پریشانیاں اور مالی مشکلات، ان کی مجبوریاں اور محرومیاں



پھر ماتاجی بھیما بائی کی بیماری اور ان کی موت . . . . اس سے بالک بھیم راؤ بہت دکھی ہوئے۔

یہاں بھیم راؤ کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ جسمانی نشوونما بھی ہونے لگی ــــ وہ ایک گورے چٹے، خوبصورت اور مضبوط جسم کے پُرکشش نوجوان کی شکل میں ابھر کر سامنے آئے۔ پڑھنے لکھنے میں بہت تیز ہونے کے ساتھ وہ کھیل کود میں بھی بہت آگے اور نمایاں تھے ــ کالج میں وہ سنسکرت پڑھنا چاہتے تھے مگر برہمن ٹیچروں نے انھیں اس کی اجازت نہیں دی۔ مجبوراً انھوں نے فارسی مضمون اختیار کیا ــ انگریزی کے پروفیسر میولر اور فارسی کے استاد شیخ محمد اصفہانی نے ان کی تعلیم میں بہت دل چسپی لی اور وہ ہر طرح سے ان کی مدد کرتے رہے۔ پروفیسر میولر انھیں کپڑے بنوا کر دیتے۔ شیخ محمد اصفہانی نے انھیں ایک کمرہ رہنے کو دیا۔ وہ لوگ ان کے ہاتھ کا پانی پینے اور کھانا کھانے میں کوئی اعتراض نہیں کرتے تھے ــــ اس طرح بھیم راؤ نے بی اے پاس کرلیا اور بڑودہ سرکار کی فوج میں لیفٹننٹ کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ مگر اعلا تعلیم حاصل کرنے کی خواہش دل میں انگڑائیاں لیتی رہی اور قدرت نے اس میں ان کی بھرپور مدد کی۔

[مہاراجہ بڑودہ سیاجی راؤ سے ملاقات
مہاراجہ بیٹھے ہیں اور خادم انھیں ایک سلپ لا کر دیتا ہے ـ سلپ پڑھ کر ...]

مہاراجہ: "آنے دو ــ!" (خادم باہر جاتا ہے اور بھیم راؤ اندر آتے ہیں۔ مہاراج کو سلام کرتے ہیں)
"کہو بھیم راؤ ــ کیسے آئے؟"

بھیم راؤ: سرکار! میری رہائش کا مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا...

مہاراجہ: سنو۔ میں تم کو بلانے والا تھا ــ کیا تم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ جا سکو گے؟

بھیم راؤ: میں بخوشی جانے کے لیے تیار ہوں، اگر مہاراج بھیجنے کی مہربانی فرمائیں۔

مہاراجہ: میں نے خود ایسا سوچا تھا۔ میری یہ خواہش تھی ــــ تم ایک انتہائی ذہین اور ہونہار نوجوان ہو۔ مجھے امید تھی کہ تم انکار نہیں کرو گے اور مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب ہو کر وطن واپس آؤ گے اور میرے لیے، ریاست کے لیے اور اپنے وطن کے لیے باعثِ فخر ثابت ہو گے۔

بھیم راؤ: سرکار! آپ کے مشیروں میں اونچی ذات کے لوگ موجود ہیں۔ جب یہ ذکر آئے گا تو وہ لوگ میری مخالفت کریں گے۔

مہاراجہ: بھیم راؤ! تم میرے خیالات سے واقف ہو۔ میرے ذہن میں اونچی ذات، نیچی ذات، چھوٹے بڑے کا کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ میں صاف دل اور کھلے دماغ کا انسان ہوں۔ تمھارے مسئلہ میں کسی سے مشورہ نہیں کروں گا اور کسی کی ہمت نہیں کہ بغیر مشورہ طلب کیے مجھے صلاح دینے لگے۔ اور اگر کسی نے ایسی گستاخانہ جرأت کی تو ہم اس کو صرف جواب ہی نہیں دیں گے بلکہ اس کی اچھی طرح خبر لیں گے ــــ ہاں تم جاؤ اور کل تک اس سلسلے میں ایک درخواست لکھ کر پیش کرو۔

بھیم راؤ: سرکار! امریکہ میں کس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا ہوگی؟

مہاراجہ: ہاں ـ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی ــ کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ وہاں تم تین سال تک رہو گے اور تمھیں ساڑھے گیارہ پونڈ کا وظیفہ ملے گا۔ ہاں اس سلسلے میں میری ایک شرط ہے جو انتہائی اہم ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اسے نامنظور نہیں کرو گے۔ تعلیم پوری کرنے کے بعد تم کو ریاست میں واپس آنا ہوگا اور میری سرکار میں دس سال ملازمت کرنا ہوگی۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔ تمھاری مرضی ہو تو یہیں ملازمت میں رہنا ورنہ جہاں جی چاہے چلے جانا۔ تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی ــ اچھا! اب تم جا سکتے ہو۔

(مہاراجہ کچھ کاغذات دیکھنے لگتے ہیں اور بھیم راؤ سلام



کرکے باہر نکل جاتے ہیں)

چوتھا منظر

راوی : بھیم راؤ امبیڈکر اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں مہاراجہ بڑودہ کے وظیفے پر داخل ہو گئے اور اکنامکس خصوصی مضمون کے طور پر اختیار کر کے ایم، اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ بعد ازاں لندن سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اکنامکس کی مزید تعلیم کے لیے جرمنی گئے مگر معاشی پریشانیوں کے باعث انھیں ہندستان لوٹنا پڑا۔ اور یہاں بیرسٹری شروع کر دی۔ نصیب کی بات ہے کہ ان کے ہاتھ ایک ایسا مقدمہ آیا جو بہت کمزور تھا اور دیگر بیرسٹروں نے اسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس مقدمہ پر امبیڈکر جی نے بہت محنت کی اور اسے جیت لیا۔ اس سے ان کی بہت شہرت ہوئی اور ان کے پاس مقدمات کا تانتا بندھ گیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر کے ذہن میں بچپن سے ہی اونچی ذات کے لوگوں نے اپنی نفرت اور ناانصافانہ سلوک سے جو الجھنیں پیدا کر دی تھیں وہ اب تک ان کے دماغ کو الجھائے ہوئے تھیں۔ انھوں نے ہندو مذہب کے مطالعہ کے ساتھ بدھ مذہب کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور اس طرح ان کے دل میں بدھ مذہب سے رغبت بڑھتی گئی۔ آخرکار انھوں نے بدھ مذہب اختیار کر لیا ــــــ "بدّھم شرنم گچھامی ـ بدھم شرنم گچھامی۔"

اب وہ ذلت ـ پامال اور پس ماندہ اچھوتوں کے ادھار کے لیے عملی طور پر سرگرم ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی دلچسپیاں سیاست میں بھی بڑھتی گئیں۔ کیوں کہ انھوں نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ سیاست اور حکومت میں حصّہ لیے بغیر وہ اچھوتوں اور پس ماندہ لوگوں کی خاطر خواہ خدمت نہیں کر سکیں گے۔

اب ڈاکٹر امبیڈکر ہندستان کی عملی سیاست میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ گاندھی جی کی پالیسی اور عمل سے وہ پورے طور پر متفق نہیں تھے۔

گاندھی جی نے ڈاکٹر امبیڈکر کو خط لکھ کر ملاقات کے لیے بلایا اور ڈاکٹر امبیڈکر ان سے ملنے گئے۔

گاندھی امبیڈکر ملاقات

(گاندھی جی چرخہ لیے بیٹھے ہیں، جسے وہ بغل میں سرکا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر ان کے پاس بیٹھتے ہیں)

گاندھی جی : مسٹر امبیڈکر آپ نے گول میز کانفرنس میں جو اسپیچ دی اس سے میں بہت پربھاوت ہوا۔ آپ میں بے پناہ صلاحیت ہے۔ ہمارے دیش کو آپ جیسے ذہین اور باصلاحیت افراد کی ضرورت ہے۔ آپ میں دیش بھگتی کی بھاؤنا ہے ــــ میں نے سنا ہے کہ آپ مجھ سے کچھ ناراض رہتے ہیں میں نے آپ کو اسی لیے بلایا ہے کہ آپ سے دو بدو بات کر کے معلوم کروں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔؟

امبیڈکر : آتم ادّھار ــ اور اپنی ماتر بھومی پر ادھیکار ــ

گاندھی جی : مسٹر امبیڈکر، کانگریس کو اچھوتوں کا بہت خیال ہے ہم اچھوت بھائیوں کی حالت سدھارنا چاہتے ہیں، ان کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ہم جو کچھ کر سکتے ہیں، کر رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ وہ لوگ ہمارے اپنے ہیں اور ہم میں سے ہی ہیں۔ کانگریس نے چوبیس لاکھ روپے اچھوت ادّھار پر خرچ کیے ہیں ــ رہا ماتر بھومی پر ادھیکار، تو وہ تو ہے ہی ــــ ہاں ابھی ایک ہی کام ہمارے سامنے ہے، ہم کو ماتر بھومی کو آزاد کرانا ہے اور اس کے لیے ہم سب کو مل جل کر جدوجہد کرنی ہے۔ بھارت آزاد ہو جائے گا تو ہم جو بھی چاہیں گے اپنے دیش باسیوں کے لیے کر سکتے ہیں۔

امبیڈکر : گاندھی جی ! آپ مجھے معاف کریں، کانگریس نے جو کچھ اچھوتوں پر خرچ کیا اس کا صحیح فائدہ ــ جتنا اچھوتوں کو ملنا چاہیے تھا، نہیں ملا۔ اگر یہ رقم ہمارے ہاتھوں خرچ ہوتی تو اچھوتوں کی حالت میں حیرت انگیز طور پر تبدیلی آتی۔ سب سے بڑا مسئلہ



ہے چھوا چھوت اور اونچی ذات والوں کی بالا دستی کا۔ وہ لوگ ہمیں جانوروں سے بھی زیادہ گرا ہوا سمجھتے ہیں ــــ ہم لوگ پبلک پلیس پر پانی نہیں پی سکتے، مندروں میں داخل نہیں ہو سکتے، دھارمک جلسوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔ ہم کیسے مان لیں کہ ماتر بھومی ہماری ہے ــــ ماتر بھومی پر ہمارا ادھیکار ہے۔ ہم ایک عجیب کشمکش سے دوچار ہیں۔

گاندھی جی : مسٹر امبیڈکر! آپ کی باتیں درست ہیں۔ لیکن یہ باتیں بہت پہلے سے چلی آرہی ہیں اور ناسمجھی کی باتیں ہیں ہم انھیں خود بہت ناپسند کرتے ہیں۔ لیکن ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی ــ اس میں تھوڑا وقت لگے گا۔ ہم کو آپ کو سب کو مل کر اس کے لیے کام کرنا ہوگا ــ سب سے پہلے ایک ہوکر ماتر بھومی کی آزادی کی لڑائی لڑنا ہوگی ــ دیش آزاد کرانا ہوگا ــــ اور جب دیش آزاد ہو جائے گا تو یہ سارے مسائل ہم ایک ساتھ بیٹھ کر حل کرلیں گے۔ اس میں دیر نہیں ہوگی، اس میں کوئی وقت نہیں لگے گا۔ رہا اس روپے کے خرچ کرنے کا سوال تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کانگریس کو آپ لوگوں سے مشورہ کرنا چاہیے تھا اور آپ میں سے کچھ لوگوں کو ساتھ رکھنا چاہیے تھا۔ اب آگے ایسا ہی ہوگا۔

امبیڈکر : آپ یقین کریں، ہم اس بات سے پورے طور پر متفق ہیں کہ جب تک دیش آزاد نہیں ہوتا ہم کچھ نہیں کر سکتے ــــ ہم آزادی کی لڑائی میں آپ کے ساتھ ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے شانہ بشانہ کام کریں گے ــــ رہا اچھوتوں کے ادھار کا معاملہ، تو دیکھتے ہیں کہ آپ اور آپ کی کانگریس پارٹی اس کے لیے کیا پروگرام بناتی ہے۔ کون سا قدم اٹھاتی ہے!...... اچھا! اب اجازت دیجئے ــ

(یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر اٹھ کر باہر جاتے ہیں اور گاندھی جی چرخہ کاتنے لگتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

□□

عدم تشدد اور امبیڈکر... صفحہ ۳۲ کا بقیہ

ہندی ماحول اور تقاضوں کے عین مطابق تھیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں بھی بخوبی محفوظ تھیں۔ مہاراجہ بڑودہ کے ملٹری سکریٹری کی حیثیت سے اپنی بے عزتی پر انھوں نے بدلہ لینے کے خیال کو دبا کر اس اعلا عہدے سے مستعفی ہوجانا بہتر تصور کیا تھا۔ اسی قسم کی بہت سی باتیں ان کی آئندہ کی ترجیحات کی جانب واضح اشارے کرتی ہیں۔

اہنسا کا مطلب ان کے ذہن میں واضح طور پر ایک وسیع تر نظریہ کا ضامن نکلا۔ یہ وہی نظریہ تھا جس کی تبلیغ حضرت عیسیٰؑ سے لے کر مہاتما بدھ تک بڑی شد و مد سے ہوئی تھی۔ اہنسا کے اس نظریے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے زمیندارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں کو محسوس کرتے ہوئے، کیونکہ یہ نظام ایک طویل عرصہ سے پس ماندہ عوام اور مزدوروں کا خون چوس رہا تھا، ان کا خاتمہ کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

خدمت خلق اور مساوی انصاف کے جذبے نے ان میں جمہوری اقدار اور سوشلزم کی جانب جھکاؤ پیدا کر دیا تھا، اسی لیے انھوں نے انسانی فلاح کے خلاف ہونے والے کسی بھی کام کو اہنسا کا نام دیا۔ عوام کے تمام طبقوں کو زیادہ سے زیادہ راحت اور سہولت مہیا کرانے کے لیے انھوں نے اپنی تمام زندگی وقف کردی تھی۔ اس سلسلے میں ان کی کوشش ہندستان کے دستور اساسی کی شکل میں ہمارے سامنے آئی، جس میں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل پر زور دیا گیا تھا جو تفرقۂ مذاہب سے پاک، ذات پات، مرد و زن، امیر و غریب، علاقوں اور صوبوں کے نفاق سے مبرا ہو، جس کی فکری اساس انسانیت، اہنسا اور سماج واد پر ہو۔

ڈاکٹر امبیڈکر سوشلزم اور جمہوری طرز حکومت کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے، جس میں انھیں کامیابی و سرخروئی کلی حاصل ہوئی اور آج ہمارا یہ آئین جو دنیا کے اعلا اصولوں اور بہترین نظام حکومت پر مبنی ہے، خود ڈاکٹر امبیڈکر کو خراجِ تحسین پیش کر رہا ہے۔ ہمارا آئین "اہنسا پرمو دھرما" کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

□□

اقبال ٹانڈوی

سیکولرازم

یہ نام ایک نئی فکر کی علامت ہے
"یہ فکر" جس کی ابھی قوم کو ضرورت ہے
"یہ فکر" ایک نئے عہد کی ضمانت ہے

"یہ فکر"
یعنی
یہ عزم و یقین کا تیشہ
اسے اُٹھا کے اگر کوئی بن سکے فرہاد
تو
جوئے شیر کا لانا نہایت آساں ہے
"یہ فکر"
یعنی
یہ حرفِ عمل، طلسم کُشا
جو لوحِ دل پہ اسے کندہ کر سکے کوئی
تو
مرگِ "سامریِ وقت" کا یہ ساماں ہے

"یہ فکر"
جو ہے ابھی
مثلِ طفلِ نو مولود
پلا کے خونِ تمنّا اسے جوان کرو
جو دے سکو تو اسے اتحاد سے اپنے
وہ حوصلہ دو کہ کوہِ گراں سے ٹکرا جائے
مقابل آئے اگر
ظلم بھی تو شرما جائے
"یہ فکر"
یعنی
یہ انسانیت کی فکرِ جمیل
اگر دلوں میں سلیقے سے یہ جگہ پائے
تو چھوت چھات کی تفریق خود ہی مٹ جائے

یہ نام ایک نئی فکر کی علامت ہے
"یہ فکر" جس کی ابھی قوم کو ضرورت ہے
"یہ فکر" ایک نئے عہد کی ضمانت ہے



حامد مینائی

نذرِ امبیڈکر

اے کہ صاحبِ نظر بابا امبیڈکر
محترم مقتدر بابا امبیڈکر
قوم کے راہبر بابا امبیڈکر
تابشِ رہ گزر بابا امبیڈکر
کیا بنایا ہے دستورِ ہندوستاں
کس قدر باخبر بابا امبیڈکر
بھر کے آئین میں رنگِ جمہوریت
بن گئے ذی ہنر بابا امبیڈکر
کارناموں سے سب کے دلوں میں یہاں
کر لیا تم نے گھر بابا امبیڈکر
روشنی فکر کی، آگہی وقت کی
رشکِ لعل و گہر بابا امبیڈکر
کچلے طبقوں کے تم ہی مسیحا بنے
معتبر معتبر بابا امبیڈکر
جو گرفتار اندھیروں میں صدیوں سے تھے
ان کے شب کی سحر بابا امبیڈکر
جن کا غم بے مداوا ہمیشہ رہا
ان کے بھی چارہ گر بابا امبیڈکر
حامدِ خوش بیاں کا ہے یہ ماننا
فیض کا تھے شجر بابا امبیڈکر

□□

نسیم نکہت

محسنِ ساکنانِ دیارِ ستم

تیرے بارے میں میں کیا لکھوں؟
میرا ننھا قلم
اور پہاڑوں سے اونچی ہے قامت تری
تیری عظمت کہاں تک کروں میں بیاں
ایک خوشبو تھا تو
درد کی بیمار کی
اک علامت تھا تو جہد و ایثار کی
دھندلی دھندلی سی آنکھوں میں کچھ خواب تھے
تونے خوابوں کو تعبیر بھی بخش دی
ان اندھیروں کو تنویر بھی بخش دی
تونے اس ملک کو دستور دیا
رات اندھیری تھی بہت نور دیا
تیرا لکھا ہوا ہر لفظ چراغوں جیسا
دے دیا تونے ہمیں مستقبل
ہمتِ جہد و عمل تونے ہی بخشی ہم کو
اپنا حق مانگنا بھی ایک عبادت ہی تو ہے
تونے بخشا یہ ہنر تیری عنایت ہی تو ہے
ساری انسانیت تجھ پہ نازاں ہے آج
تو مسیحا غریبوں کا بیماروں کا
تو کہ ہمدرد تھا درد کے ماروں کا
بے سہاروں کا تو آسرا بن گیا
ہر سیہ رات میں تو دیا بن گیا
تو کہ تاریخ کا فیصلہ بن گیا

□□

ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی

ڈاکٹر امبیڈکر اور قومی اتحاد

کسی ملک کو متحد رکھنے کے لئے یہ لازم ہے کہ اس ملک میں رہنے والے افراد باہمی اخوت، پیار، محبت اور بھائی چارہ کے جذبات سے معمور ہو کر ایسے عمل میں اشتراک و تعاون کا نمونہ پیش کریں جس سے ملک کی ترقی اور بہتری یقینی ہو۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی ملک میں صرف ایک مذہب، فرقہ اور نسل کے افراد یا ایک زبان بولنے والے ہی نہیں رہتے بلکہ زمانۂ قدیم سے ہر تہذیب اور ہر ملک میں ایسے فرقے اور طبقے دیکھنے کو ملتے ہیں جو اس اکثریتی فرقہ سے لسانی یا مذہبی اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ خود ہندوستان کی قدیم تاریخ شاہد ہے کہ یہاں ایسے فرقے رہتے آئے ہیں جو نظریاتی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف تھے اور سبھی فرقے سرزمینِ ہند پر امن و آشتی اور باہمی میل ملاپ کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ بعد ازاں بدھ اور جین مذہب کے لوگوں نے بھی خود کو اسی مذہب کا جز بنالیا اور بیرون ملک سے آنے والے افراد جو مذہبی اعتبار سے یہاں کے باشندوں سے قطعی مختلف تھے، انھوں نے بھی مادرِ ہند کی گود میں پناہ لی۔ اس کی تہذیب اور تمدن کے رنگ میں ایسے رنگ گئے کہ اب خود ان ممالک میں، جہاں سے وہ آئے تھے اور جہاں ان کی عبادت گاہیں موجود تھیں وہاں بھی ان کی پہچان مادرِ ہند کے سپوت کی حیثیت سے ہونے لگی۔

ایک باہری طاقت، جس نے ہندستان کو محض استحصال کا وسیلہ سمجھا تھا اور اسے غلام بنالیا تھا، اس طاقت کو ملک سے باہر نکالنے کی طویل جنگ میں سبھی فرقوں اور زبانوں کے بولنے والوں نے شانے سے شانہ ملاکر اپنے جان و مال کی قربانی دی اور بالآخر مادرِ وطن کو آزاد کرالیا۔

حصولِ آزادی کے بعد جدید ہندستان کی تعمیر میں مختلف فرقوں، لسانی طبقوں اور مذاہب کے ماننے والوں میں باہمی میل محبت اور بھائی چارہ کے روابط کو مستحکم کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئیں انھیں قومی یک جہتی کی اصطلاح سے موسوم کیا گیا۔ اس اصطلاح کی تعریف اور اس کی ضرورت کے ضمن میں مختلف سیاسی رہنماؤں اور سماجی کارکنوں نے اپنے اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کیا ہے۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے مادرِ وطن کی اہمیت و عظمت کا ذکر ان الفاظ میں کیا کہ ؎

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اسی طرح مختلف سیاسی رہنما بھی مختلف العقائد لوگوں کو محض وطن کے بارے میں سوچنے کی تلقین کرتے ہوئے قومی اتحاد



اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ عظیم سماجی رہنما اور مفکر ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے بھی کہا تھا:

"وطن پرستی سماجی بیداری سے عبارت ہے۔ اتحاد کے لیے مشترکہ جذبات کا احساس ضروری ہے جس کے تحت لوگ ایک دوسرے کو اپنا سگا رشتہ دار سمجھنے لگتے ہیں......"

ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنے ان نظریات کے مطابق سماج کی تعمیر و تشکیل اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ اس سلسلے میں درپیش مسائل کی جانب بھی انھوں نے توجہ دی۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی نظر میں مذہب قومی اتحاد قائم کرنے کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ تھا اسی لیے انھوں نے کہا تھا:

"مذہب کو نظر انداز کرنا بجلی کے تار کو نظر انداز کرنا ہے۔"

بالفاظ دیگر جس طرح بجلی کے ننگے تار کے ایک جھٹکے سے موت ہو سکتی ہے اسی طرح اگر مذہب (سے متعلق مسائل) پر قابو نہ پایا گیا تو یہ ملک کا شیرازہ بکھیر سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی اور لسانی اختلافات ملک کے اتحاد اور قومی یک جہتی کو برقرار نہیں رہنے دیں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے مذہب کے بارے میں ایک دوسری جگہ اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

"ان کتابوں کو ضائع کر دینا ہوگا جو منطق کو کوئی مقام دینے سے انکار کرتی ہیں ان کتابوں کو بارود سے اڑا دینا ہوگا جو اخلاقیات کو کوئی مقام دینے سے انکار کرتی ہیں۔ میرا یہ نظریہ کافی غور و خوض پر مبنی ہے۔"

ڈاکٹر امبیڈکر یہ بھی کہتے ہیں کہ:-

"ہر وہ فرد جو انسانیت کی ترقی اور پیش رفت کا خواہش مند ہے، مذہب کے مقدس اصولوں کے سماجی نتائج سے متعلق جذبات کی آواز کو سنے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

گوتم بدھ کی تعلیمات کے بارے میں بھی ڈاکٹر امبیڈکر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

"بدھ کے بارے میں ایک بات بڑے ہی یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے یعنی وہ کچھ نہ ہوتے اگر ان کے اقوال عقل و منطق سے بھرپور نہ ہوتے...... جو بات عقل کے لیے قابل قبول ہے، جو بات منطقی ہے وہی بدھ وچن (بدھ کا قول) ہے۔"

ان اقوال اور نظریات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر مذہب کے نام پر جو استحصال کیا جاتا تھا اسے ختم کرنے پر زور دیتے رہے۔ آئین ہند اور متعدد قانونی اصلاحات کے ذریعہ انھوں نے آزادی، مساوات اور بھائی چارہ کے جذبات کو فروغ دیا۔ انھوں نے عورتوں اور مردوں کے درمیان تفریق اور نابرابری کو ختم کیا۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے ان دیواروں کو گرانے کی کوشش کی جو انسانوں کے درمیان تلخی اور نفرت کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ ان کی اِن خدمات کو سراہتے ہوئے شری محمد کریم بھائی چھاگلا نے کہا تھا:

"ہر ہندوستانی کو جب وہ اپنے حقوق کا استعمال کرتا ہے، ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کا احسان مند ہونا چاہیے۔"

قومی اتحاد کو مضبوط کرنے کی غرض سے ڈاکٹر امبیڈکر نے ہندوستان کے تمام محبان وطن سے کچھ سوالات کیے ہیں:

"ہندوستان ایک عجیب ملک ہے اور اسکے وطن پرست اور قوم پرست بھی عجیب ہیں۔ ہندوستان میں وطن پرست اور محب وطن وہ شخص



ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ ایک انسان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے لیکن اس کی انسانیت اس کے خلاف بغاوت نہیں نہیں کرتی۔ وہ جانتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کو بلاوجہ ہی انسانی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے لیکن اس کا شہری جذبہ اسے مدد کے لیے جگاتا نہیں اس کے سامنے یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کے ایک طبقہ کو ملازمتوں سے دور رکھا جاتا ہے تو بھی اس کا جذبۂ انصاف بیدار نہیں ہوتا۔ سیکڑوں بُری رسوم جو انسانی سماج کو زخمی کر رہی ہیں اسکے سامنے ان پر عمل ہوتا ہے لیکن یہ اسے بے چین اور بے قرار نہیں کرتا۔ ہر محبِ وطن کی ایک ہی خواہش ہے کہ اسے اور اس کے طبقے کو اقتدار ملے"۔

ڈاکٹر امبیڈکر نہ صرف آئین ہند کے معمار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ انھوں نے سماج کی ان برائیوں اور کمزوریوں کی جانب بھی عوام کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے جن کو اگر دور نہ کیا گیا تو قومی اتحاد اور قومی یک جہتی کے تمام منصوبے محض کاغذی باتیں ثابت ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا واضح نظریہ تھا کہ جب تک ہندستانی سماج میں سبھی مذاہب کے لوگوں، تمام طبقوں اور لسانی اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق نہیں دیے جاتے ہیں، انھیں سماج میں مساوی درجہ نہیں ملتا ہے، ان کو ملک کی ترقی کے لیے بھرپور تعاون دینے کا موقع نصیب نہیں ہوتا، اس وقت تک قومی یک جہتی اور قومی اتحاد کی منزل تک پہونچنا دشوار ہے۔ □□

"ایسا کہا جاتا ہے کہ میں امن کا مخالف ہوں،
یہ درست نہیں ہے۔ میں تو امن میں یقین رکھتا ہوں۔
لیکن اس امن میں جو انصاف پر مبنی ہو، نہ کہ قبرستان
کے امن میں۔
جب تک دنیا میں انصاف کا احترام نہیں ہوتا تب تک
کسی قسم کا امن قایم نہیں ہو سکتا۔"

ڈاکٹر امبیڈکر

نیا دور

جلد ۴۶ نمبر ۲

مئی سنہ ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر
شاہ نواز قریشی
ٹیلیفون ۔۔۔۔۔ ۴۴۲۱۰۸

پبلیشر
شیلیش کرشن
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

انتظامی و ادارتی معاونین
محمد الیاس خاں ۔ مجیب انصاری

مطبوعہ
یونائٹیڈ پرنٹرس لکھنؤ
شائع کردہ

عنوانات

اپنی بات

تنگ نظری، عصبیت اور فرقہ وارانہ تعصب ختم کرنے اور قومی یک جہتی نیز جذباتی ہم آہنگی کو قائم و دائم رکھنے کے لیے محض جلسوں اور سمیناروں کا انعقاد کافی نہیں ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ مثبت عملی اقدام کیے جائیں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور پر توجہ مرکوز کرنا اور عملی قدم اٹھانا ضروری ہے:

- **تاریخ پر نظر ثانی** — تاریخ ہند کو فرقہ وارانہ عصبیت سے پاک کرنا انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔ برطانوی دور حکومت میں تاریخ کو جس طرح آلودہ کیا گیا اور اس میں فرقہ واریت کا زہر بھرا گیا، اس پر روشن خیال اور ترقی پسند قلم کاروں اور مورخین کو پوری توجہ مرکوز کر کے اسے پاک و صاف کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے (سابق گورنر اڑیسہ) نے خاصا کام کیا ہے۔ چنانچہ اس کام کے لیے ان کا تعاون بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔
- **ٹیلی ویژن اور فلم کا رول** — قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو مستحکم کرنے اور فروغ دینے کے لیے ٹیلی ویژن اور فلم کے وسائل سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جانا چاہیے، کیوں کہ یہ وسائل آج سب سے زیادہ موثر حیثیت رکھتے ہیں۔
- **اسکولوں میں ذہنی تربیت کا خصوصی بندوبست** — طلبا کے ذہنوں کو فرقہ وارانہ عصبیت سے محفوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر طلبا کے ذہن صاف نہ ہوں گے تو مستقبل کی تعمیر بھی صحیح خطوط پر نہ ہو سکے گی۔ اس لیے اسکولوں میں اس ضمن میں ذہنی تربیت کا ایک خصوصی نصاب شروع کرنا ہوگا۔
- **تیوہار میل جل کر منانے کی ضرورت** — مختلف فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کے تیوہار مل جل کر منائیں اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوں۔ مختلف سماجی اور ثقافتی تنظیمیں اس سلسلے میں موثر رول ادا کر سکتی ہیں۔ جگہ جگہ محلے محلے ہولی ملن اور عید ملن جیسی تقریبات کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔
- **اخبارات کا رول** — اس سلسلے میں اخبارات بھی موثر رول ادا کر سکتے ہیں۔ انھیں ایک ضابطۂ اخلاق پر عمل کرنا ہوگا تاکہ افواہوں کی بنیاد پر کوئی خبر شائع نہ ہو سکے اور اشتعال انگیز مواد کو اخباروں میں کوئی جگہ نہ مل سکے۔
- **امن کمیٹیاں** — ان کمیٹیوں کی تشکیل محلے محلے ہونی چاہیے اور انھیں مستقل طور پر سرگرم عمل رہنا چاہیے۔ ان کمیٹیوں کو ایسے ذمہ دار اور بااثر افراد پر مشتمل ہونا چاہیے جو اپنے علاقے اور اپنے محلے میں کسی بھی قیمت پر تصادم اور تشدد کے حالات نہ پیدا ہونے دیں، اور وہاں جو بھی فرقہ اقلیت میں ہو، اس کی پوری حفاظت کر سکیں اور ضرورت پیش آنے پر جان کی بازی بھی لگا سکیں (محض تقریروں، اپیلوں اور اخباری بیانات سے اس سلسلے میں کچھ نہیں ہوتا)۔

آہ میکش اکبرآبادی

میکش اکبرآبادی بھی گزشتہ دنوں چل بسے۔ شعر و ادب کے کلاسیکی ورثہ اور زبان و بیان کی صحت مند روایات سے بھرپور استفادہ کر کے انھوں نے اردو ادب میں جو گرانقدر اضافہ کیا، وہ ناقابل فراموش ہے۔ زبان و بیان کی جو پختگی اور اثر آفرینی ان کے یہاں ملتی ہے، وہ اب کمیاب ہوتی جا رہی ہے۔ روایات کی پاسداری کے ساتھ ان کے یہاں اسلوب کی تازگی بھی ملتی ہے۔ مثلاً ان کا یہ شعر کتنا نیا لگتا ہے ؎

اس کی آنکھیں، اس کی آنکھیں کیسی ہیں میں کیا بتلاؤں
ٹھہریے! مجھ کو سوچنے دیجیے، اس کی آنکھیں اس کی آنکھیں

ایڈیٹر

رام لعل
شانتی نکیتن
ڈی۔ ۲۲۹۔ اندرا نگر
لکھنؤ

مسکرایئے کہ آپ لکھنؤ میں ہیں

آپ لکھنؤ میں کہیں سے بھی وارد ہوں، ریل سے، ہوائی جہاز سے یا بس وغیرہ سے، آپ کے چہرے پر مسکراہٹ ہونی چاہیئے۔ لکھنؤ بھی آپ کا اسی خوش دلی سے خیر مقدم کر رہا ہوگا، اور ان لمحوں میں پہلے آپ، پہلے آپ کے روایتی تکلفات سے پوُرے طور پر آزاد ہوگا، اور آپ کے ہونٹ کھلنے سے پہلے خود مسکرا رہا ہوگا۔

آیئے پہلے لکھنؤ کے ماضی بعید پر نظر ڈالیں۔ اس ماضی پر جو اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اس کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے ہمیں تصور سے بھی کام لینا پڑے گا۔

دُنیا کے بیشتر خطّے ایسے ہیں جہاں سے غنیم کی فوجیں خاک اُڑاتی ہوئی بار ہا گزری ہیں۔ بھلے ہی وہاں قیام کبھی نہ کیا ہو۔ دھرتی کا وسیع و عریض سینہ ہزاروں گھوڑوں کی ٹاپوں اور لاکھوں پیدل چلنے والوں کے قدموں کی دھمک کو اپنے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جذب کر چکا ہے لیکن تاریخ کے اوراق جب کبھی اس کے اوپر پھڑپھڑاتے ہیں تو وہ اپنے سارے راز اگل دیتا ہے۔

لکھنؤ کی سرزمین کو بھی کتنی فوجیں بار ہا روندتی ہوئی آگے بڑھ گئی ہوں گی۔ دریائے گومتی کے دونوں کناروں پر بسا ہوا یہ علاقہ اس معاملے میں خوش قسمت واقع ہوا ہے کہ اس کی زرخیزی، آب و ہوا اور محلِ وقوع کے پیش نظر بے شمار قوموں اور قبیلوں نے کبھی اس پر عارضی پڑاؤ ڈالا، کبھی یہاں مستقل طور پر بس جانے کے بارے میں سنجیدگی سے فیصلہ کر لیا۔

زمانۂ قدیم کی وہ تاریخ، جو ابھی غیر مرقوم ہے، لیکن بعض روایات کی وجہ سے قابلِ اعتماد بھی معلوم ہوتی ہے، ہمیں باور کراتی ہے کہ لکھنؤ کے اطراف بھی موہن جوداڑو اور ہڑپّہ کی شان دار تہذیب کا حصّہ تھے، اور اسے برصغیر کے ماضی کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رکھنا ہوگا۔ پندرہ بیس برس اُدھر اُناؤ (لکھنؤ و کان پور کا درمیانی ضلع) میں محکمۂ آثار قدیمہ کے تحت کھدائی کا کام شروع ہوا تو نیچے سے پکّی و روغنی مٹی کے ایسے برتنوں کے ٹکڑے دستیاب ہوئے جو اس سے بہت پہلے موہن جوداڑو اور ہڑپّہ میں بھی مل چکے تھے۔

لکھنؤ ہمیشہ سے سلطنت اودھ کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ ۱۷۷۵ء میں نواب آصف الدولہ نے فیض آباد چھوڑ کر اسی کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا اور یہ تب ہی اودھ اور پھر اتر پردیش کا صوبائی صدر مقام بنا رہا ہے لیکن اس کے عہد جدید میں داخل ہونے سے پہلے ذرا روایات کی وہ سرگوشیاں بھی سُن لیں جو ہمارے ذہن میں تاریخ انسانی کی نقل و حرکت فتوحات، شکستوں اور بار بار بدلنے والی طرزِ بود و باش کی ایک متحرک کر دینے والی تصویر بناتی ہیں۔

یہاں کبھی سورج ونشی راجپوت حکمراں تھے جو خود کو سورج دیوتا کی اولاد تصوّر کرتے تھے۔ یہ وہی آریہ اقوام کے لوگ تھے جو آج سے تقریباً تین چار ہزار سال پہلے وسط ایشیا سے اکھڑ کر ایک صدی سے زائد عرصہ تک قطب شمالی کے یورپی علاقوں اور ایران و افغانستان اور شمالی ہندستان کے وسیع مرغزاروں میں ہجرت در ہجرت

کہتے رہے تھے۔ قریباً بارہ سو سال قبل مسیح اودھ کے اس علاقے کا نام کوشلا تھا اور یہاں اسی نام کی ایک قوم آباد تھی۔ ہندوؤں کے قدیم شاستروں میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ منوؐ نے سب سے پہلے اس علاقے کو بسایا تھا۔

بقول ڈاکٹر صفدر مصنف "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" نواب آصف الدولہ نے ۱۱۸۹ھ (مطابق ۱۷۷۵ء) میں وارث سلطنت ہو کر اپنا دربار لکھنؤ منتقل کر دیا جس کی وجہ سے شرفا، تجار، علما و فضلا، صناع اور دیگر اہلِ کمال فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے جس سے فیض آباد کی عظمت و شکوہ کو گہن لگنے لگا اور لکھنؤ کے تمدن و تہذیب کا عروج ہوا۔"

جس شہر کے تہذیب و تمدن اور تاریخی حالات کے بارے میں درجنوں کتابیں لکھی جا چکی ہوں اس کا حال ایک مختصر سے مضمون میں سمیٹ دینا بہت مشکل کام ہے۔ اس سے متعلق زمانہ قدیم کی روایات کو چھوڑ دیا جائے اور اس کے ذکر کو انگریزوں کی آمد اور اودھ کے حکمرانوں کے عروج و زوال تک کی محض فہرست سازی تک محدود کر دیا جائے تو یہاں کے حکمرانوں کی ایک اجمالی تصویر اس طرح تیار ہو جاتی ہے :-

۱. نواب سعادت خاں برہان الملک (سلطنت اودھ کا بانی، اصل نام سید محمد امین، سابق وطن نیشاپور (ایران) خاندانی سلسلہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام سے ملا ہوا ہے)۔
۲. مرزا مقیم ابو المنصور بہادر صفدر جنگ
۳. جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ بہادر
۴. مرزا امانی نواب آصف الدولہ بہادر
۵. یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں
۶. نواب غازی الدین حیدر
۷. نصیر الدین حیدر شاہ
۸. فریدوں بخت رفیع الدین محمد مہدی عرف منّا جان
۹. محمد علی شاہ
۱۰. امجد علی شاہ
۱۱. واجد علی شاہ عرف جانِ عالم (تخلص اختر، پیا)

اودھ و لکھنؤ پر شخصی حکمرانی و تسلّط کا سلسلہ جو ۱۵۰۱ء سے شروع ہوا تھا وہ یہاں کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ لکھنؤ میں اس جنگ کے آثار ریزیڈنسی (بیلی گارد) کی پرانی عمارت کی صورت میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ واجد علی شاہ لکھنؤ کے ہر دلعزیز آخری بادشاہ تھے۔ جن کے نام کے ساتھ رقص و سرود اور منظوم ڈراموں (اندر سبھا، راس لیلا وغیرہ) کی ایک شاندار روایت وابستہ ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد انھیں معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا تھا۔ جہاں انھوں نے مٹیا برج میں جلاوطنی کے عالم میں لگ بھگ تیس سال گزارے۔ اور ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف ہندستانیوں کی جنگِ آزادی کے تین بڑے مرکز بن گئے تھے۔ بقول پنڈت سندر لال :

"اس جنگ میں بہادری اور قربانی کی نگاہ سے لکھنؤ کا درجہ دہلی سے کہیں اونچا رہا۔ دہلی کے زوال کے چھ مہینے بعد تک اودھ اور لکھنؤ میں آزادی کا جھنڈا لہراتا رہا۔"

لیکن اس جنگ میں لکھنؤ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ انگریز کا تسلط اور اقتدار حد درجہ بڑھ گیا تھا۔ انھوں نے اس بارونق شہر کو ویران کر دیا۔ باغ اجاڑ دیے اور کوٹھیاں مسمار و منہدم کر دیں اور مشرقی تمدن پامال ہو گیا۔

لکھنؤ کی نشوونما میں کئی حکمرانوں کا ہاتھ رہا ہے۔ اکبر کے عہد میں شیخ عبدالرحیم جون پوری نے جو اودھ کا صوبہ دار تھا، یہاں کی عمارتوں میں رد و بدل کرا کے اپنی پانچ بیویوں کے لیے پنج محل بنوایا تھا جو بعد میں صفدر جنگ کے عہد میں مچھی بھون کے نام سے موسوم ہوا۔ شہزادہ سلیم نے مرزا منڈی باغ کی بنیاد رکھی۔ ۱۵۷۴ء میں اودھ کے صوبیدار جواہر خان کے نائب قاسم محمود بلگرامی نے محمود نگر اور شاہ گنج محلے بسائے۔ چوک کی داہنی طرف اکبری دروازہ بنوایا شاہ جہاں کے عہد میں اودھ کے صوبیدار سلطان علی شاہ کے

دو بیٹوں فاضل اور منصور نے چوک کے مغرب میں فاضل نگر اور منصور نگر محلے آباد کیے۔ اس طرح اس شہر میں تاریخ کے ہر موڑ پر نئے نئے محلوں اور نئی نئی عمارتوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے اپنا شہرہ آفاق امام باڑہ، دولت خانہ، ریزیڈنسی اور عیش باغ کی عمارتیں بنوائیں۔ بی بی پور اور جھنہٹ کی کوٹھیاں تعمیر کروائیں۔

شاہ زمن غازی الدین حیدر نے دو محلے حیدر آباد اور بادشاہ نگر آباد کیے۔ اس کے علاوہ مقبرہ سعادت علی خاں، مبارک منزل، شاہ منزل، چھتر منزل، ولایتی باغ اور نجف اشرف (شاہ نجف) وغیرہ کی عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ آب پاشی کی غرض سے ایک نہر بھی بنوائی جو غازی الدین حیدر کینال کے نام سے مشہور ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سخت گرمی کے موسم میں ہندوؤں کو گنگا اشنان کرنے کے لیے کان پور جانا پڑتا تھا جو گنگا کے کنارے آباد ہے غازی الدین حیدر نے چاہا کہ گنگا کے متبرک پانی کو ایک نہر کی صورت میں کان پور سے لکھنؤ تک لے آیا جائے جو بعد میں اسی شہر کے دریائے گومتی سے جا کر مل جائے۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اس نہر میں اب شہر کا گندہ پانی بہتا ہے۔

نصیر الدین بادشاہ نے وکٹوریہ اسٹریٹ پر، جو اب تلسی داس مارگ کہلاتی ہے، اسپتال اور چوک بازار میں یونانی شفاخانہ قائم کیا تھا، اور دو محلے گنیش گنج اور چاند گنج بھی آباد کیے تھے۔

امجد علی شاہ نے حضرت گنج آباد کیا اور کان پور تک کنکروں کی ایک پختہ سڑک بنوائی۔ گومتی پر لوہے کا پل بھی انہی کی یادگار ہے۔ اس کے وزیر امین الدولہ نے امین آباد بسایا تھا۔

واجد علی شاہ نے قیصر باغ، عالم باغ اور سکندر باغ کی عالی شان عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے بعض عمارتوں کے نام و نشان تک مٹ چکے ہیں یا ان میں پہلی سی آب و تاب نہیں رہی۔

لکھنؤ کا رقبہ اب ۹۶ مربع میل ہے جسے ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنے زمانے میں چھتیس مربع میل لکھا تھا، اور کہا تھا کہ لکھنؤ چونسٹھ دیہاتوں کی زمینوں پر آباد ہے۔ بہر حال لکھنؤ آج بھی اتر پردیش میں رام پور کے بعد سب سے چھوٹا ضلع ہے۔ اور اپنی تہذیبی شہرت و عظمت کے لحاظ سے صرف صوبہ اتر پردیش ہی میں نہیں بلکہ ملک کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اہل لکھنؤ پر ہندو ثقافت سے کہیں زیادہ مسلم ثقافت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

ممتاز مورخ و دانش ور ڈاکٹر تارا چند نے تو اپنی ایک تصنیف میں پورے ہندستان پر اسلامی تہذیب کے واضح اثرات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ لکھنؤ کے حکمرانوں نے دیگر فنون کے علاوہ شعر و ادب کی خاص طور پر سرپرستی کی، جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ رہنے سہنے، لباس اور کھانے پینے کے معاملات میں بے حد نفاست پسند ہونے کے علاوہ شعر و ادب کے دلدادہ اور شعر فہمی میں مثالی حیثیت کے مالک بن گئے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک وقت ایسا تھا کہ یہاں کے پنواڑی تک شعر کہتے تھے اور ہر شخص چاہے وہ ایک مصرع تک موزوں نہ کر سکتا ہو لیکن خود کو باذوق ظاہر کرنے کے لیے اپنے نام کے ساتھ ایک عدد تخلص ضرور ٹانک لیتا تھا۔ اس شہر نے علم و ادب کے میدان میں کئی دور دیکھے ہیں۔ عروج اور زوال دونوں کے۔ اس شہر کی شعری و ادبی روایات جرأت، مصحفی، سید انشا، قتیل، رنگین، وزیر، صبا، رند، گویا، رشک، دیا شنکر نسیم، مرزا رسوا، برج نرائن چکبست، اسیر، نواب مرزا شوق، میر انیس، مرزا دبیر، یگانہ چنگیزی، ثاقب، آرزو، سراج، مولانا افقر موہانی، جوش ملیح آبادی، عبدالباری آسی، مرزا مچھو بیگ، رتن ناتھ سرشار، مجاز، سجاد ظہیر، آل احمد سرور، اختر علی تلہری، علی عباس حسینی، نواب جعفر علی خاں اثر، سید نواب افسر، سید احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، نہال رضوی، سالک لکھنوی، فضل نقوی، ماہر لکھنوی، نیاز فتحپوری، مرزا جعفر حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، علی جواد زیدی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی رضیہ سجاد ظہیر اور شوکت تھانوی وغیرہ بے شمار معروف ناموں سے وابستہ ہیں۔

ان سطور کے راقم نے بھی آزادی کے بعد لاہور سے آکر اسی شہر کو اپنا مستقل مسکن بنالیا ہے اور یہاں کی متعدد ادبی محفلوں میں شرکت کی اور اُن سے بے اندازہ فیض اٹھایا ہے، اور بے شمار افسانے لکھے اور کئی تصانیف پیش کی ہیں۔ راقم سطور کے ساتھ جو اہلِ قلم لکھنؤ میں رہ کر اُردو ادب کے جدید دور میں ممتاز و معروف ہوئے ان میں شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، سلام مچھلی شہری (مرحوم)، ڈاکٹر آغا سہیل، باقر مہدی، احمد جمال پاشا (مرحوم)، عابد سہیل قیصر تمکین، اقبال مجید، قمر رئیس، قاضی عبدالستار، وارث کرمانی، حسن عابد، رتن سنگھ، بشیشر پردیپ، شہنشاہ مرزا (مرحوم) مسیح الحسن رضوی، منظر سلیم، ابصار عبدالعلی، کرشن بہاری نور، تصور حسین زیدی، اعزاز نقوی، انیس اشفاق، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر صبیحہ انور، عائشہ صدیقی، احمد ابراہیم علوی، انیس انصاری، والی آسی، عرفان صدیقی، شمس فرخ آبادی، بشیر فاروقی، شاہ نواز قریشی، ذکی کاکوروی عرفان عباسی، عمر انصاری، سلمان عباسی، ساحر لکھنوی، بانو داراب وفا، حیات وارثی، محمد اسحاق صدیقی، وقار ناصری، ڈاکٹر محمود الحسن رضوی، رباب رشیدی، اختر یزدان محسن، ملک زادہ منظور احمد، یاد دہلوی، رشید قریشی، رئیس انصاری، ملک زادہ جاوید اور سہیل کاکوروی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہ سب نئے لکھنؤ کی ادبی روایات کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

یہاں ہزل گوئی کی بھی ایک روایت رہی ہے جس میں چرکین، عاشور علی خاں، جان صاحب وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ کنگھی چوٹی کی شاعری نے لکھنؤ کو کافی بدنام کر دیا تھا، لیکن فکر و نظر کے میدان میں زندہ دلی اور شوخ طبعی نے بھی اپنے جوہر خوب خوب دکھائے۔ ریختی کے سلسلے میں یہ دو شعر بے ساختہ یاد آگئے ؎

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی
کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

ذرا گھر سے رنگیں کی تحقیق کرلو
یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

اسی شہر کے ساتھ ادبی معرکوں کی بھی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ جس کا ذکر طوالت کے خوف سے نہیں کرسکتا۔ علم و ادب کی شمع آج بھی روشن ہے۔ یہاں کے موجودہ عہد کے بعض ادیب و شاعر برصغیر میں نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔

یہاں کی کانفرنسیں، یہاں کے سیمنار اور مشاعرے عالمی شہرت کے حامل بن گئے ہیں۔ سیمناروں میں جدیدیت، اردو افسانہ، داستان اور ناول میں فرق، اُردو الفاظ کے علاقائی تلفظ کے اختلافات اور اردو غزل کے علاوہ کل ہند غیر مسلم اُردو مصنفین کی دو تاریخ ساز کانفرنسیں، اُردو، ہندی ادب ایوارڈ کمیٹی، اُردو اکاڈمی اور بعض دوسری ادبی انجمنوں کے زیرِ اہتمام جوش، مولانا آزاد، فیض، فراق، یگانہ، اُردو صحافت اُردو ڈرامہ وغیرہ کے موضوعات پر ہوئے سیمینار قابلِ ذکر ہیں۔ ان سمیناروں اور مشاعروں میں جو بالخصوص ہندی اُردو ادب ایوارڈ کمیٹی نے منعقد کرائے ہندستانی دانش وروں کے علاوہ بیرون سے بھی جن میں پاکستان، سوویت روس، انگلینڈ، امریکہ، کناڈا، ڈنمارک، سویڈن، فرانس وغیرہ شامل ہیں کئی اہم شاعر اور ادیب شامل ہوئے۔ چونکہ حکومت ہند کی پالیسی میں ہند و پاک کے درمیان سیاسی تناؤ کم کرنے اور دونوں ممالک کے تہذیبی روابط کو فروغ دینا شامل رہا ہے اس لیے پاکستان کے دانش وروں کی شمولیت نے فضا کو خوش گوار بنانے میں ایک اہم کردار نبھایا ہے۔ چناں چہ اردو اکادمی، انجمن ترقی پسند مصنفین اور ہندی اُردو ادب ایوارڈ کمیٹی نے احمد فراز، جمیل الدین عالی، جمیل جالبی، انتظار حسین، محمد علی صدیقی، زاہدہ حنا، آغا سہیل، پروین فنا سیّد، افتخار عارف، نصر ملک، سلیم کوثر، کوثر نیازی وغیرہ کئی اور دانش وروں کو وقتاً فوقتاً مدعو کیا۔

نوابوں اور شاہوں کے عہد میں لکھنؤ اپنی چکن کی صنعت اور بعض مشغلوں میں پورے شباب پر تھا جس پر بے شمار مضامین اور کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ طرح طرح کے لذیذ کھانوں میں، جن میں شیر مال، باقر خوانی، نان، جلیبی، پراٹھے، ملیدہ، دودھ کی پوریاں، پلاؤ، بریانی، شامی کباب وغیرہ شامل ہیں۔ مرد باورچی تو مشہور تھے ہی، بعض گھروں کی بیگمات بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں تھیں۔ لکھنؤ اب بھی ان

کھانوں کے لیے مشہور ہے لیکن اب مغربی کھانے بھی بڑے بڑے ہوٹلوں میں بکتے ہیں۔

لکھنؤ اپنے قدیم لباسوں مثلاً نیمہ، انگرکھا، چکن، اچکن، شیروانی، پگڑی، چوگوشیہ ٹوپی، پنج گوشیہ ٹوپی، دوپلی ٹوپی، نکے دار ٹوپی، جرنیلی ٹوپی، عالم پسند ٹوپی، ترکی ٹوپی وغیرہ کے لیے بھی بہت مشہور تھا، لیکن اب شیروانی اور کشتی نما ٹوپی ہی باقی رہ گئی ہے۔ وہ بھی قدیم وضع کے لوگوں میں۔ ورنہ عام طور پر مغربی لباس رائج ہے یا پھر دھوتی، پاجامہ، کرتا اور جواہر کٹ واسکٹ اور بند گلے کے ہاف کوٹ۔

صراحیوں اور جھجریوں کی جگہ فرج اور واٹر کولر لے چکے ہیں۔

یہاں کے ذاکرین، حدیث خواں، مرثیہ خواں، سوز خواں وغیرہ بھی بہت مشہور تھے۔ عہد جدید میں کلب عابد (مرحوم)، کلب صادق علی ناصر سعید (آغا روحی)، پروفیسر شبیہ الحسن، مولانا حمید الحسن، سید کلب جواد، ابن حسن نونہروی (مرحوم) علی نقی (نقن صاحب مرحوم) سید خورشید حسن رضوی، مہذب لکھنوی (مرحوم) اور منجو صاحب (مرحوم) وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ محرم کے ایام میں یہاں تعزیہ داری، مرثیہ خوانی، سوز خوانی اب بھی پرانے اور نئے شہر میں گلی گلی، محلے محلے ہوتی ہے۔

علم حکمت کے میدان میں بھی یہاں بے شمار نامی گرامی حکیم گزرے ہیں۔ مثلاً حکیم مسیح الدولہ، حکیم شفاء الدولہ، حکیم مرزا محمد علی، حکیم سید محمد مرتعش، حکیم مرزا کوچک، حکیم بنّا، حکیم مرزا محمد جعفر، حکیم محمد یعقوب، حکیم خواجہ شمس الدین، حکیم زینت، حکیم لسوڑا وغیرہ۔ اب بھی پرانے لکھنؤ کی سڑکوں پر نئے حکیموں اور طبیبوں کے ناموں کے بورڈ دیکھے جا سکتے ہیں لیکن اب نرسنگ ہوم وغیرہ بڑی تعداد میں قائم ہو چکے ہیں۔

لکھنؤ عرصۂ دراز سے علوم دینیہ کا بھی مرکز رہا ہے۔ یہاں فقہ، عقائد، منطق، علوم عقلیہ، طبعیات والٰہیات اور علوم ریاضی میں اقلیدس وغیرہ کی تعلیم دی جاتی رہی ہے، اس میں علمائے فرنگی محل کو خاص ناموری حاصل تھی۔ ادب، شاعری اور عروض عربی کو علمائے شیعہ و مجتہدین نے اپنایا۔ اس وقت بھی یہاں ندوۃ العلماء، سلطان المدارس، جامعہ ناظمیہ اور مدرسۃ الواعظین کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور یہاں نہ صرف ہندستان بلکہ افریقی ممالک سے بھی طلبا، تعلیم حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ جدید تعلیم گاہوں میں لکھنؤ یونیورسٹی، اسپورٹس کالج، اسلامیہ کالج، شیعہ کالج، کرسچین کالج، تعلقدار کالج، کرامت حسین گرلز کالج، جے نرائن کالج، لا مارٹینیر کالج، آئی۔ٹی کالج، لال باغ کالج، مہیلا ودیالیہ، ناری شکشا نکیتن وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ انگریزی اسکولوں کی تعداد پیش کرنا بہت مشکل ہے اس لیے کہ ایسے مڈل و پرائمری اسکول ہر محلے اور ہر نئی کالونی میں سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

بڑے اسپتالوں میں میڈیکل کالج، بلرامپور اسپتال، سنجے گاندھی میڈیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کوئن میری اسپتال، ڈفرن اسپتال، سول اسپتال، وویکانند اسپتال، آیورویدک اسپتال اور طبیہ کالج کے علاوہ یہاں دماغی امراض کے علاج کے لیے "نور منزل" بہت مشہور ہے۔ چھتر منزل میں ساہنی سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور اس کے سامنے ایک نو منزلہ عمارت میں زہروں پر ریسرچ کرنے کے لیے بھی ایک انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ اور ایک اسپتال ہڈیاں جوڑنے اور مصنوعی اعضا لگانے کے لیے بھی قائم کیا جا چکا ہے۔

تفریح و سیر سپاٹے کے لیے عجائب گھر و چڑیا گھر ایک ہی احاطے میں قائم ہیں۔ ان کے علاوہ بچوں و بڑوں کے لیے ہاتھی پارک، بدھا پارک، نیبو پارک اور وکٹوریہ پارک کے علاوہ کئی نئے پارک بنائے گئے ہیں۔ گومتی کے کنارے کنارے کئی جگہ ایسے پارک بنائے گئے ہیں جہاں پرانے اور نئے شہر میں رہنے والے صبح و شام ہوا خوری کے لیے نکل جاتے ہیں۔ ڈالی گنج پل کے سامنے ایک نیا سورج کنڈ پارک بھی بنا ہے۔ اندرا نگر کے مشرق میں ککریل نالے کے کنارے مگرمچھ کی افزائش نسل کے لیے ایک پکنک اسپاٹ ہے جہاں چھٹی کے روز سینکڑوں لوگ پہونچ جاتے ہیں۔ وہیں فریدی نگر گاؤں میں خوشبوؤں پر ریسرچ کرنے کے لیے بھی ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کر دیا گیا ہے۔ سکندر باغ کے علاقے میں نیشنل بوٹانیکل ریسرچ سنٹر ایک مدت سے قائم ہے۔

لکھنؤ کی بڑی و چھوٹی لائبریریوں میں امیر الدولہ لائبریری،

آچاریہ نریندر دیو لائبریری، ٹیگور لائبریری، رفاہ عام کلب لائبریری، برٹش کونسل لائبریری، گنگا پرشاد ورما میموریل لائبریری سوچنا کیندر (محکمۂ اطلاعات) لائبریری اور اردو اکاڈمی کی مرکزی لائبریری وغیرہ شامل ہیں۔

کلاسیکی موسیقی و رقص کی تربیت دینے کے لیے یہاں ایک بھات کھنڈے میوزک کالج اور ڈرامے سے متعلق ایک سنگیت ناٹک اکاڈمی بھی قائم ہے۔ موسیقی اور رقص کے ساتھ لکھنؤ کی ان طوائفوں کا ذکر بھی ضروری ہو جاتا ہے جن کے گھنگروؤں کی جھنکار اور طبلوں کی تھاپ سے کبھی پرانے لکھنؤ کے گلی کوچے گونجتے تھے اور ان کوٹھوں کی سرپرستی رؤسائے لکھنؤ کیا کرتے تھے۔

موسیقی کی بڑی بڑی محفلوں میں طوت، وینا، ستار، سرود، سارنگی، شہنائی اور دلربا کی جو شیریں دھنیں گونجتی تھیں انھیں سننے کے لیے پرانے لوگوں کے کان ترستے ہیں۔ نئی نسل کے لوگ راگ درباری، اساوری، کافی، راگ یمن، کلیان، بھوپالی، بھیم پلاسی، باگیشوری اور پیلو وغیرہ کا شعور نہیں رکھتے، وہ تو محمد رفیع، کشور کمار اور لتا منگیشکر کے فلمی گانوں پر جان دیتے ہیں۔

لکھنؤ کے بارے میں مطبوعہ تاریخی کتابوں میں منصرم والی گوہر جان زہرہ اور مشتری، چونے والی حیدر اور بدر منیر کا خاصا ذکر موجود ہے۔ یہیں کی ایک طوائف امراؤ جان ادا کے بارے میں اسی عنوان سے مرزا محمد ہادی رسوا نے ایک مشہور عالم ناول لکھا تھا جو اردو ادب کی تاریخ میں پہلا ناول قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات ابھی تک تصدیق طلب ہے کہ امراؤ جان کا واقعی کوئی وجود تھا یا نہیں۔ آزادی کے بعد رفتہ رفتہ اس پیشے میں زوال آیا اور حکومت نے بھی کئی پابندیاں عائد کر دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ کوٹھے بالکل ختم ہو چکے ہیں، صرف ان کے افسانے رہ گئے ہیں۔ واجد علی شاہ کی سرپرستی میں ہونے والے برج اور متھرا کے رہس اور تلوار کی دھار پر ناچنے والے کتھک کے اہیرن کا لکا اور بندادین اب بھولی ہوئی داستانیں ہیں۔ اگرچہ انہی کے خاندان کے نامور برجو مہاراج کے درشن کبھی کبھی ٹیلی ویژن پر ہو جاتے ہیں۔ باکمال رقاصوں کے علاوہ نقالوں، بھانڈوں، ڈومنیوں وغیرہ کا زمانہ بھی لد گیا۔ ٹھمری کی مشہور گلوکارہ بیگم اختر کا بھی اب انتقال ہو چکا ہے۔

لکھنؤ اب ایک جدید شہر ہے۔ اگر پوری طرح جدید نہیں ہوا تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے کھنڈروں میں پیدا ہو رہا ہے اور اپنے ساتھ نئی نئی کئی منزلہ عمارتیں لے کر ابھر رہا ہے۔ اس سلسلے میں بجلی بورڈ کا چوبیس منزلہ شکتی بھون، جواہر بھون، اولڈ کونسلر ریزیڈنس اور کئی نئے تجارتی مرکزوں کے نام لیے جا سکتے ہیں جن میں سے کئی تعمیر ہو چکے ہیں اور کئی زیر تعمیر ہیں۔ لکھنؤ اب نئی کالونیوں کا شہر ہے۔ اس کے چاروں طرف بے شمار نئی کالونیاں بنائی جا چکی ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی کالونی اندرا نگر ہے اور اس سے بھی بڑی ایک کالونی گومتی نگر کے نام سے بنائی جا رہی ہے۔ سروجنی نگر، کرشنا نگر، سنگار نگر، چندر نگر، مہانگر، راجہ جی پورم، علی گنج اسکیم اور نرالا نگر وغیرہ کے علاوہ بھی نہ جانے کتنی سرکاری وغیر سرکاری بستیاں بن چکی ہیں، جو گزشتہ بیس برسوں میں کتنے کھیتوں اور باغات کو نگل گئی ہیں۔

یہاں کے مشہور ہوٹلوں میں تیرہ منزلہ کلارکس اودھ، کارلٹن ہوٹل گومتی ٹورسٹ سنٹر اور کوہ نور خاصے مشہور ہیں۔ پرانے بازاروں میں چوک، مولوی گنج، امین آباد، لاٹوش روڈ اور حضرت گنج اب بھی مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اب ہر کالونی میں ایک بازار بھی ہے۔

سینما گھروں کی تعداد بائیس سے زیادہ ہے۔ رویندرالیہ (ٹیگور کے نام سے موسوم) ایک اچھا مرکز ہے جہاں ڈرامے اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اور پرانے و نئے ہال بھی بنائے جا چکے ہیں کھیل کود کے لیے ایک سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم گومتی کے کنارے بنایا گیا ہے جس کے اندر ایک تیراکی کا تالاب بھی ہے۔ شہر کے باہر سیتاپور روڈ پر ایک نیا اسپورٹس کالج کھولا گیا ہے جس کے میدان پر ہاکی کے انٹرنیشنل مقابلے ہو چکے ہیں۔

لکھنؤ میں سواری کے لیے تانگے اور یکے اب خال خال نظر آتے ہیں۔ پرائیوٹ ٹیکسیاں اور آٹو رکشا بھی ہیں۔ اور عام رکشہ بھی بکثرت ہیں جنھیں آدمی چلاتے ہیں۔ انھیں اس لیے نہیں بند کیا جا سکا کہ ان کی ایک یونین ہے جس پر سیاسی جماعتوں کا قبضہ ہے۔ لیکن آٹھ

سواریاں لے جانے والی آٹو ٹمپو یہاں بہت مقبول ہے جو بہت سستے میں دور دور کی کالونیوں میں پہونچا دیتی ہے۔

یہاں سے ریل گاڑیاں اور بسیں ہر سمت کو جاتی ہیں۔ پورا صوبہ دہلی، ہریانہ، پنجاب، بہار، بنگال اور مدھیہ پردیش سے جڑا ہوا ہے۔ دہلی، کلکتہ، بمبئی وغیرہ جانے کے لیے ہوائی سروس بھی دستیاب ہے، جس کے لیے اموسی کا ہوائی اڈہ موجود ہے۔

عطریات (خس، کیوڑہ، چنبیلی وغیرہ) اور چکن سازی کے لیے لکھنؤ کی اب بھی بڑی شہرت ہے۔ چینی کے برتنوں کے لیے چنہٹ میں ایک فیکٹری لگی ہوئی ہے۔ مٹی کے کھلونے صرف دیوالی کے موقع پر نظر آتے ہیں۔ پیتل اور تانبے کے برتنوں کی جگہ اب اسٹین لس اسٹیل کے برتنوں نے لے لی ہے۔

لکھنؤ کا ریڈیو اسٹیشن آزادی سے پہلے سے قائم ہے جہاں بطور اسکرپٹ رائٹر کرشن چندر، شوکت تھانوی، مہندر ناتھ، رفیع پیر، محمد حسن، سلام مچھلی شہری، احتشام حسین، آل احمد سرور، رضیہ سجاد ظہیر اور نیر مسعود وغیرہ بے شمار مشہور اردو ادیب یا تو ملازم رہے یا آزاد قلم سے خدمت کرتے رہے ہیں۔ دیگر فنون کے علاوہ اردو ڈرامے کے میدان میں بھی اس اسٹیشن نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ دیگر موضوعات پر اب بھی مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔

لکھنؤ میں ٹیلی ویژن کی آمد ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ تب سے اس کے اردو پروگراموں میں "اودھ پنچ" کے عنوان سے اردو ادب کے موضوعات پر ہر ہفتے مباحثے ہوتے ہیں جن میں لکھنؤ کے علاوہ علی گڑھ، الہ آباد کانپور وغیرہ کے ممتاز اہلِ قلم کو شرکت کے لیے مدعو کیا جاتا رہا ہے اور اب ایک اور ہفتہ وار پروگرام اردو ہی کے سلسلے میں "آئینہ" کے عنوان سے شروع کیا گیا ہے۔ ہندی ادب کے سلسلے میں ایک ہفتہ وار پروگرام سرسوتی کے نام سے پیش کیا جاتا ہے جس میں کبھی کبھی اردو کے ادیبوں کو بھی شریک کر لیا جاتا ہے۔

آخر میں دو تین چیزوں کا ذکر ضروری ہوگا، یہاں کی سیاست اور اخبارات کا — جس صوبے نے آزادی کی جدوجہد میں ایک خاص کردار نبھایا ہو اور جس نے ملک کو وزیرِ اعظم دیئے ہوں — (پنڈت جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری، اندرا گاندھی، چودھری چرن سنگھ، راجیو گاندھی، وشوناتھ پرتاپ سنگھ اور چندر شیکھر) — اور جہاں سے ہر صوبے سے زیادہ تعداد میں یعنی پچاسی ممبران پارلیمنٹ کی نشستیں ہوں، وہاں سیاست کا بازار ہر وقت کیوں نہیں گرم رہتا ہوگا۔ شہر بھر کی دیواروں پر سیاسی نعرے ہر وقت لکھے ہوئے نظر آتے ہیں اور کونسل ہاؤس کی طرف انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے جانے کا ہر پارٹی اور ہر یونین کو حق حاصل ہے لیکن انھیں تشدد سے روکنے کے لیے پولیس بھی لاٹھیاں اور ڈنڈے لیے بڑی تعداد میں موجود رہتی ہے۔

لکھنؤ سے متعدد اخبارات عرصہ دراز سے نکل رہے ہیں۔ بعض اپنا کردار نبھا کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے، منشی سجاد حسین اور مرزا مچھو بیگ کا 'اودھ پنچ'، پنڈت تربھون ناتھ ہجر اور رتن ناتھ سرشار کا اودھ اخبار کے علاوہ رسائل میں محشر، دل گداز، جہاں نما، نگار، کتاب وغیرہ کے بعد نیا دور، معلم اردو، آزاد جرنل (انگریزی) اور اردو کے روزناموں میں قومی آواز، اور عزائم اب بھی پابندی سے نکل رہے ہیں۔ انگریزی میں پائنیر، نیشنل ہیرالڈ، ٹائمز آف انڈیا، نادرن انڈیا پتریکا شائع ہوتے ہیں۔ ہندی میں سوتنتر بھارت، دینک جاگرن، نوبھارت ٹائمز، نوجیون، امرت پربھات اور پہلی دن (شام کا اخبار) شائع ہوتے ہیں۔ لکھنؤ میں اخبارات کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مذکورہ اخبارات کے علاوہ دہلی سے ہندوستان ٹائمز، انڈین ایکسپریس اور اسٹیٹس مین وغیرہ کی بھی ہزاروں کاپیاں یہاں روزانہ آجاتی ہیں۔

لکھنؤ والوں کے لیے سیاست اور اخبار بینی کے علاوہ دلچسپی کی کوئی اور چیز ہے تو وہ مشاعرے ہیں جو برابر (ایام عزا کو چھوڑ کر) جگہ جگہ منعقد ہوتے رہتے ہیں اور ان میں ہند و پاک کے علاوہ انگلینڈ اور امریکہ سے بھی شاعر بلائے جاتے ہیں اور شعری نشستیں تو پرانے لکھنؤ کے گلی کوچوں میں بکثرت جمتی ہیں جہاں صرف شاعر ہی ایک دوسرے کو اپنا کلام سُناتے ہیں اور داد دے کر اور داد وصول کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔ اب ان کی محفلیں ربع صدی پہلے کی طرح امین آباد کے ہوٹلوں میں نہیں جمتیں اس لئے کہ وہاں سائن بورڈ لگا دیئے گئے ہیں —

"یہاں شاعروں کا زیادہ دیر تک بیٹھنا ممنوع ہے" —

ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے لیے اب بھی حسبِ سابق ایک ہی جائے امان ہے، جسے اولڈ انڈیا کافی ہاؤس کہتے ہیں، اور یہ حضرت گنج کے جنوبی سرے پر الہ آباد بنک کے عین سامنے واقع ہے۔ یہاں کافی کا ایک پیالہ طلب کر کے وہ دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور لمبی لمبی بحثیں کرتے ہیں اور کبھی تھکتے نہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اُردو، ہندی اور انگریزی کے نامور اہلِ قلم اور صحافی اور سینیر و جونیر سیاست داں بلا ناغہ آیا کرتے تھے — سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر آل احمد سرور، سید احتشام حسین آنند نرائن ملا، اسرار الحق مجاز، سلام مچھلی شہری، یش پال اور بھگوتی چرن ورما وغیرہ — سُنا ہے، دو ایک بار پنڈت جواہر لال نہرو بھی آئے تھے، لیکن یہ آزادی سے بہت پہلے کی بات ہے۔ یہ "گنہگار آنکھیں" بھی کئی وزرائے اعلا اور دیگر وزرار کو مقامی صحافیوں سے قریب تر ہونے کے لیے اس کافی ہاؤس میں دیکھ چکی ہیں۔ لیکن ان کی اچانک آمد پر کافی ہاؤس میں کسی قسم کی ہلچل نہیں پیدا ہوئی۔ بلکہ لوگ اپنی اپنی میزوں پر اسی شان اور اطمینان سے بیٹھے باتیں کرتے رہے اور مسکراتے رہے۔ ہائی برو لوگوں اور دانش وروں کی یہی پہچان ہوتی ہے۔ چاہیں تو آپ بھی اسی انداز سے ان لوگوں کے پاس کوئی خالی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ سکتے ہیں اور جب تک بحث کا سرا ہاتھ نہ آ جائے ان کی طرف دیکھ دیکھ کر بس مسکراتے ہی رہیے۔ اگر آپ کے بٹوے میں پان ہوں تو کیا کہنا! اس کی جھلک دیکھتے ہی وہ خود آپ کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

"آداب عرض ہے"۔

"کب تشریف لائے —؟"

"مزاجِ گرامی!؟"۔

□□



اوپیندر ناتھ اشک

۵۔ خسرو باغ روڈ
الہ آباد

غزل

شہرِ آشوب چل کے دیکھ ذرا
گھر سے باہر نکل کے دیکھ ذرا

ابنِ آدم ہے خود فریب بہت
دل میں پہلو بدل کے دیکھ ذرا

آن بھی ہے آنسوؤں کا غم پیارے
میرے قالب میں ڈھل کے دیکھ ذرا

دل سُلگتے ہیں بن دُھواں کیسے؟
غم کے ماروں میں چل کے دیکھ ذرا

موت کے روبرو جو ہونا ہے
زندگی کو سنبھل کے دیکھ ذرا

زخم ہیں اور تیر و نشتر بھی
شعر میری غزل کے دیکھ ذرا

موم ہو جائیں گے عدو تیرے
اشکؔ تو بھی پگھل کے دیکھ ذرا

ڈاکٹر سید عبدالباری
شعبۂ اردو
گنپت سہائے پوسٹ گریجویٹ کالج
سلطان پور

نوابینِ اودھ کی ادبی سرپرستی

سلطنت اودھ کے بانی امین الدولہ سعادت خاں برہان الملک کا خاندانی سلسلہ ایران کے شاہان صفویہ سے تھا، جو اپنی ادب نوازی اور فضل وکمال کی قدر دانی کے لیے مشہور تھے۔ علم دوستی اور ادب نوازی کی یہ روایت لے کر برہان الملک نے اودھ میں قدم رکھا اور ان کے خاندان میں یہ روایت بقول علامہ شبلی نعمانی، آخر تک برقرار رہی اور صاحبانِ علم وفن کی یہاں ہمیشہ پذیرائی ہوئی۔

شجاع الدولہ نے جب فیض آباد شہر کو آباد کیا اور بکسر کی شکست کے بعد ۱۸۶۳ء میں یہاں مستقل قیام کا فیصلہ کیا تو یہاں تہذیب و ثقافت کی ایک نئی انجمن آراستہ ہوگئی۔ لوگ جوق درجوق اودھ کی شہرت سُن کر دہلی واطراف دہلی سے رخت سفر باندھ کر فیض آباد کی طرف چل پڑے۔ اس نئی بزم طرب کے رنگ و نور سے اودھ کی فضا جگمگا اٹھی۔ ان مہاجر شعراء کا صد فی صد انحصار دربار پر تھا۔ دربار بھی اپنی رفع الوقتی اور تفریح طبع کے لیے ان کو اپنے سے قریب رکھنا چاہتا تھا۔ دربار کی اس سرپرستی کے جہاں یہ اثرات ہوئے کہ اردو ادب کے مختلف اصناف کو خاص فروغ حاصل ہوا اور زبان کو تراش خراش کے بعد بے حد سڈول، پرشکوہ اور رواں دواں بنا دیا گیا، وہیں ہمارے بہت سے شعراء اس درباری سرپرستی کی وجہ سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہ کرسکے اور بعض تو تملق و مدح سرائی اور درباری جوڑ توڑ کی نذر ہوگئے۔

دربار اس زمانے میں سب سے مضبوط ادارہ تھا اور معاشرے کی تمام سرگرمیوں کا محور تھا۔ درباری سرپرستی کسی شخص کے وقار میں بے حد اضافہ کی موجب ہوجاتی تھی۔ چنانچہ اودھ میں جب نوابین نے ہمارے شعراء کو نوازا تو معاشرے میں بھی ان کا وقار و اعتبار بڑھ گیا۔ گھر گھر غزلخواں، مرثیہ خواں اور قصیدہ خواں پیدا ہوئے اور جسے دیکھو شعروشاعری اور داستان طرازی کے میدان میں اتر آیا ــــ بقول نورالحسن ہاشمی ــــ "ہر صاحب کمال لکھنؤ پہونچ کر اپنے فن کی داد پا رہا تھا"ــ اور مولانا عبدالسلام مصنف شعرالہند کے الفاظ میں اس دور میں شاعری لازمۂ امارت بن گئی تھی اور تقریباً ہر امیر کے دربار میں شاعری کا ایک مخصوص صیغہ قائم ہوگیا تھا جو شعراء کی معاش اور قدردانی کا اصل ذریعہ تھا۔ کم وبیش یہی کیفیت ملک کی دوسری ریاستوں کے درباروں کی بھی تھی جیسا کہ قائم فرماتے ہیں ؎

مانوں گا شاعری کو میں قائم تبھی تری
سرسبز یہ غزل جو ہوئی آپ کے حضور

اودھ میں ملک کی دیگر ریاستوں اور درباروں کے مقابلے میں جود وسخا اور داد و دہش کا اور ہی عالم تھا۔ یہاں سیاسی طور پر امن و سکون تھا اور ترک مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں وغیرہ کے حملوں سے محفوظ تھے۔ انگریزوں سے دوستی کا معاہدہ ہوجانے کی وجہ سے یہ ریاست اور زیادہ مطمئن و محفوظ ہوگئی تھی۔ اس صورت حال میں کہ عیش وراحت کے جملہ اسباب مہیا تھے یہاں خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں:

"ہر شخص یک گونہ بے خودی کے عالم میں مست و خراب تھا۔ باغوں کے جلسے، انسانوں کے میلے، حسینوں

کے جمگھٹے، شعر و شراب و شباب کی رنگینیاں، رقص و سرود کی محفلیں۔ غرض ایک ہنگامہ نشاط و طرب برپا تھا اور خوب دل کھول کر دادِ عیش دی جا رہی تھی۔"

شجاع الدولہ کی بیگم جو بہو بیگم کے نام سے مشہور ہیں دہلی کی ایک معتدر شخصیت کی بیٹی تھیں اس لیے فیض آباد میں ان کی موجودگی نے دہلی کے اہل فضل و کمال کے لیے یہاں سخاوت کا دروازہ وا کر دیا۔ دہلی سے بڑی تعداد میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین شعراء اور اہل ہنر اپنے اپنے فن اور ہنر کی داد پانے کے لیے اور دہلی کے کربناک ماحول سے نجات حاصل کرنے کے لیے چل پڑے۔ شعراء کی امداد اور ان کو اگر وہ دیگر فنون سے واقف ہیں تو مختلف سرکاری محکموں میں باعزت منصب کی فراہمی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور ۱۷۶۳ء سے ۱۷۷۵ء تک شجاع الدولہ کے دورِ حکومت میں فیض آباد شعر و ادب کا ایک بہت بڑا مرکز بنا رہا جس کے سامنے دلی و عظیم آباد بھی ہیچ تھے پھر ان کے صاحبزادے آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا تو فیض آباد کے علاوہ ایک اور انجمن اس سے بھی زیادہ پرشکوہ اور اس سے بھی زیادہ بارونق آراستہ ہو گئی۔

پھر یکے بعد دیگرے سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر نصیر الدین حیدر، احمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور پھر واجد علی شاہ نے لکھنؤ کے دربار کی مسند کی رونق بڑھائی۔ ان سب میں شجاع الدولہ اور آصف الدولہ سعادت علی خاں کے بعد شعراء و اہل قلم کی سرپرستی میں واجد علی شاہ کا رتبہ بڑھا ہوا ہے جو اگرچہ بہت سے دیگر مشاغل میں بھی گرفتار تھے اور سیاسی طور پر نہایت غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار تھے لیکن فنونِ لطیفہ پر جان چھڑکنے والا اور شعر و شاعری کے لیے سب کچھ لٹا دینے والا ان سے بڑھ کر کوئی اور شخص نہ تھا۔

جب شجاع الدولہ کے فیض آباد اور آصف الدولہ کے لکھنؤ میں دہلی کے دو ادبی و شعری ستون سوداؔ و میرؔ آ پہنچے تو پھر دیگر چھوٹے بڑے شعراء کا کہنا ہی کیا۔ مرزا علی لطف "تذکرہ گلشنِ ہند" میں لکھتے ہیں کہ:

"سوداؔ ساٹھ سال کی عمر دہلی میں گزار کر وہاں کے ناگفتہ بہ حالات سے مجبور ہو کر لکھنؤ وارد ہوئے۔ نواب آصف الدولہ نے ان کی عزت افزائی کی اور قدردانی کا پورا حق ادا کر دیا اور چھ ہزار روپیہ ماہوار کی جاگیر مقرر کر دی۔ سوداؔ نے متعدد قصیدے آصف الدولہ کی شان میں تحریر کیے۔ نہایت اطمینان و سکون کی زندگی بسر کی اور یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔"

اسی طرح میر تقی میرؔ نے بھی عہدِ آصف الدولہ میں دلی کی گلیوں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں کو خیرباد کہہ دیا اور لکھنؤ کی طرف رُخ کیا جو اس وقت امن و عافیت کا گہوارہ تھا۔ آصف الدولہ بہادر نے میرؔ کی تنک مزاجی کے باوجود، جس کے قصے محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں بیان کیے ہیں، انھیں خوب خوب نوازا اور ان کی مددِ معاشی میں کمی نہ کی۔ آصف الدولہ کے ساتھ وہ ایک شکار میں بھی شریک ہوئے۔ شروع میں وہ لکھنؤ کے ماحول کی رنگینی سے وحشت زدہ تھے لیکن یہاں آرام کے لمحے میسر آئے تو اسی پُورب کی سرزمین کے شکرگزار بھی ہوئے اور یوں سخن سرا ہوئے ؎

لکھنؤ دلی سے بھی بہتر ہے
کہ کسی دل کی لاگ ایدھر ہے

یا

بسنتی قبا پر تری مر گیا
کفن میرؔ کو دیجیے زعفرانی

شجاع الدولہ کے فیض آباد کو رونق بخشنے والوں میں میر انیسؔ کے آباواجداد بھی تھے۔ میر ضاحک اپنے بیٹے میر حسنؔ کے ساتھ دلی سے رشتہ توڑ کر فیض آباد آئے اور اس خاندان نے اُردو شعر و شاعری کی وہ خدمت انجام دی جس سے اُردو ادب کبھی ان کے بارِ احسان سے سبک دوش نہیں ہو سکتا۔ میر حسنؔ نے شجاع الدولہ کی نذر کرنے کے لیے اپنی مشہورِ زمانہ مثنوی سحرالبیان لکھنی شروع کی جو اودھ کی تہذیب اور معاشرے کا دلکش مرقع ہے۔ یہ مثنوی عہدِ آصف الدولہ میں مکمل ہو سکی اور میر حسنؔ نے ان کے دربار میں حاضر ہو کر انھیں پیش کیا اور انعام و اکرام حاصل کیا۔ میر حسنؔ کو فیض آباد میں نواب سالار جنگ بہادر اور مرزا نوازش

علی خاں بہادر کی سرکار سے خاصی امداد حاصل ہوئی۔ میر حسن نے بہو بیگم کی سرکار میں اردو محاورات پر کچھ کام کیا اور بیگم صاحبہ نے ان کو اپنی نوازشوں سے بہرہ مند ہونے کا موقع عطا فرمایا۔

میر، سودا اور میر حسن ہی نہیں دہلی کے بلند مرتبہ صوفی و درویش اور اُردو کے ممتاز شاعر خواجہ میر درد کے داماد میر کلو دہلی کو خیرباد کہہ کر شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد تشریف لائے اور آرام و راحت کی زندگی یہاں بسر کی اور خود خواجہ میر درد کے صاحبزادے الم نے بھی فیض آباد آ کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔

مرزا اکبر علی مقبل فیض آباد آ کر نواب مختار الدولہ کے داروغہ ہوئے۔ نواب کے انتقال پر بہو بیگم کے وکیل ہوئے۔ اوسط درجہ کے شاعر تھے۔ وہ نواب محمد ناظر داراب خاں کی عنایتوں سے بھی بہرہ مند تھے۔ مرزا امیر علی جون پوری اپنی تصنیف "تذکرہ نگارانِ اُردو" میں لکھتے ہیں کہ داراب خاں نے مرزا اکبر علی خاں کو اپنی زندگی میں تین لاکھ روپے دیے جس سے اطمینان کی زندگی بسر کی۔

مرزا کلب حسین خاں نادر اور ان کے والد مرزا محمد تقی خاں بھی فیض آباد کے دربار سے فیض یاب ہوئے۔ نادر کی پرورش و پرداخت بہ لحاظ حفظ مراتب شاہی حاکم وقت میر سید رستم علی نے کی۔ میر ضیاء الدین ضیاؔ بھی جو ہمعصر سوداؔ تھے، دہلی سے لکھنؤ آئے اور نوابین کی فیض بخشیوں سے بہرہ مند ہوئے۔

اودھی لال، سنت سکھ رائے کے فرزند تھے اور شجاع الدولہ کے عہد میں ان کا دربار سے گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے نوابین اودھ کے پروانہ جات کا مجموعہ منصور المکتوبات ۱۲۰۱ھ میں مرتب کیا۔ مشہور مورخ ڈاکٹر آشیر وادی لال نے اس تالیف کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

قطب الدین باطن نے اپنے تذکرہ "گلستانِ بے خزاں" میں لالہ جسونت سنگھ پروانہ کا ذکر کیا ہے جو وزیر الممالک شجاع الدولہ کے معزز امرا میں سے تھے ان کی بے پناہ عنایتوں سے فیض یاب ہوئے۔ بدیع الزماں مخلص بھی شجاع الدولہ کے ملازمین میں تھے۔ اور میر مرتضیٰ کی نواب بہادر کافی عزت کرتے تھے۔ محمد علی خاں مرزا آلائی شاعری کرتے تھے اور شجاع الدولہ کے یہاں ایک عہدہ پر مامور تھے۔ میاں فخر الدین خلف ماہر کو سوداؔ کی سفارش پر شجاع الدولہ کے یہاں سے ساٹھ روپے ماہوار ملنے لگے۔

میر عطا حسین تحسین جنھوں نے مشہور اُردو داستان نوطرز مرصع مکمل کی، نواب صفدر جنگ کے درباری تھے۔ نواب محمد تقی خاں بہادر ترقی خود شاعری کرتے تھے اور بہتوں کی معاش ان سے وابستہ تھی۔

مشہور سخنور جعفر علی حسرت بھی شجاع الدولہ کی دریادلی کی خبر سن کر فیض آباد آئے اور ان کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا اور بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان کا کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ پھر لکھنؤ آکر یہیں کے ہو رہے۔ ان کا مشہور شعر ایک مشکل زمین میں ملاحظہ ہو ؎

شیخ و سجادہ و اسلام و حرم چاروں ایک
عاشق و بُت کدہ و کفر و صنم چاروں ایک

احمد علی احمدؔ نے بادشاہ اودھ کے حکم سے قصۂ گل و صنوبر نظم کیا۔ یہ فیض آباد کے رہنے والے تھے اور درباری مراعات سے بہرہ مند تھے۔

احسن علی احسنؔ سرکار شجاع الدولہ میں عہدۂ میر منشی پر مامور تھے۔ ۱۸۰۰ء میں نواب حسن رضا خاں کی سرکار میں زمرۂ شعراء میں منسلک ہوئے۔ نواب آصف الدولہ کے یہاں بھی شاعری کے شعبہ میں ملازم تھے اور ظریفانہ شعر کہتے تھے۔

راجہ جسونت سنگھ پروانہ شجاع الدولہ کے خاص نائبوں میں تھے پھر آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آکر قیام کیا۔ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے اور فارسی و اُردو میں اچھے شعر کہتے تھے۔ میر وجاہت علی وحشت بھی شجاع الدولہ کے درباریوں میں تھے اور اسپرنگر کے بقول انھوں نے ایک کامیاب بارہ ماسہ لکھا۔

مشہور اُردو شاعر اور نثر نگار انشاء اللہ خاں انشا کے والد میر ماشاء اللہ خاں مصدرؔ نے بھی اپنے خاندان کے ساتھ فیض آباد کا رُخ کیا اور شجاع الدولہ کے ملازم ہو گئے۔ لکھنؤ میں ان کے صاحبزادے انشاؔ نے زبردست عروج حاصل کیا اور نواب سعادت علی خاں کے مصاحبینِ خاص میں داخل ہو گئے اور ایک مدت تک نہایت آن بان کی زندگی بسر کی۔ طرح طرح کے ادبی معرکے سر کیے، جس کی چاہی پگڑی اُچھال دی اور جسے چاہا اوجِ ثریا تک پہونچا دیا۔ ہر صنفِ سخن خصوصاً قصیدہ، غزل

ریختی وغیرہ میں اپنی دھاک بٹھادی ۔ ان کی مشہور داستان " رانی کیتکی کی کہانی " اُردو نثر میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے ۔ " دریائے لطافت " کے ذریعہ انھوں نے اپنے تنقیدی شعور کے تابناک نقوش چھوڑے ۔ آخری عمر میں دربار سے تعلق قطع ہوگیا تو جاتے جاتے یہ پیام دے گئے ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

گدا علی بیگ بسمل فیض آبادی شجاع الدولہ کی فوج میں ملازم تھے ۔ ان کا " دیمک نامہ " مشہور ہے جس میں دیمک کے عذاب کا ذکر کیا ہے ؎

دیکھے دست بقچے کی اگر صورت
تو نظر آئے خاک کی مورت

مرزا احسن علی احسن کے بارے میں میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ قصیدہ و غزل خوب لکھتے تھے اور شاعری کے وسیلے سے سرکار نواب شجاع الدولہ سے سرفراز تھے ۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

خاکِ چمن میں کس کی ملی آرزوئے دل
جوں غنچہ یاں کھلے ہے تو آئے ہے بھر کے دل

میر علی صبر بہو خانم صاحبہ کے متوسلین میں تھے اور ان کی عنایت سے آرام کی زندگی بسر کرتے تھے ۔

گھاسی رام خوش دل نے دلی سے شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد آکر صرافی کے پیشے میں فروغ حاصل کیا اور شاعری کے وسیلہ سے نواب تک رسائی حاصل کی ۔

میر مظہر علی راز فیض آباد میں نواب مرزا علی خاں بہادر کی بارگاہ سے متوسل تھے ۔ میر حیدر علی حیراں کے بارے میں تذکرۂ گلشن ہند میں مرقوم ہے کہ وہ رائے سروپ سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے اور نواب آصف الدولہ کی فوج سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور سو سواروں کا رسالہ رکھنے کی ان کو اجازت ملی ۔ مع رسالہ تنخواہ لیتے اور دادِ عیش دیتے رہے ۔

میر ولایت علی خاں اصلح بھی شجاع الدولہ کے ملازمین میں تھے مرزا احسن اللہ احسن آصف الدولہ کی سرکار میں زمرۂ شعرا میں شامل تھے اور باضابطہ صیغۂ شاعری سے ان کو امداد ملتی تھی ۔ انشا کے مشہور ہمعصر جرأت لکھنوی کی نواب محبت خاں اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے کفالت ہوئی اور لکھنؤ کی فضا کو شعر و شاعری سے معمور کرنے میں ان کی غزل اور ریختی نے اہم کردار ادا کیا ۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس عہد کے تین ممتاز شعرا مصحفی ، ناسخ اور آتش نے دربار سے کوئی خاص تعلق نہ رکھا اور خودداری و قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے ۔

ریاست اودھ کے آخری دور میں واجد علی شاہ کی بزم شعر و شاعری آراستہ ہوئی اور اپنی مختصر مدتِ حکومت میں جو انتشار کی زد میں تھی ، انھوں نے بھی حتی الامکان شعرا و قلم کاروں کی قدر دانی کا ثبوت دیا ۔ بے شمار شعرا کو ان کے دربار سے امداد حاصل ہوئی اور لکھنؤ کے گلی کوچے شعر و شاعری سے گونج اٹھے ۔

غرض ہندستان کی تاریخ میں نوابین اودھ اس اعتبار سے منفرد و ممتاز درجہ رکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی علم دوستی و ادب نوازی کی خاندانی روایات کو ، ہمیشہ قائم رکھا اور ان کے فیض سے اردو ادب نے بے پناہ ترقی کی ۔

□□

ندا فاضلی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۳۲ کا بقیہ

نظم ، غزل ، گیت اور دوہوں پر انھیں یکساں قدرت ہے ۔ گیتوں کو انھوں نے ایک نیا موڑ دیا ہے ۔ ہلکے پھلکے رومانی گیتوں سے آگے بڑھ کر انھیں عصرِ حاضر کی حسیت سے روشناس کرایا ہے ۔ ادھر انھوں نے بہت اچھے دوہے کہے ہیں ۔ ان کی شاعری میں میر و غالب اور سودا و آتش کے ساتھ میرا ، کبیر اور تلسی داس کی شعری روایتیں مل کر ایک خوبصورت روپ اختیار کرتی ہیں جو ان کی شاعری کا شناس نامہ ہے ۔ اپنے عصر کے تلخ اور سنگین حقائق کا اظہار انھیں جدید شاعروں میں ایک ممتاز و منفرد مقام عطا کرتا ہے ۔ ان کی شاعری ایک ذہین قاری کے دل و دماغ کو مہمیز کرتی ہے اور اس کے جمالیاتی ذوق کی آبیاری کرتی ہے ۔

ڈاکٹر اختر بستوی
شعبۂ اردو
گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور

غزل

ہر بدلتے جگ میں بہتر زندگی ملتی رہی
ہاں مگر ہمراہ اس کے، بے گھری ملتی رہی[1]

یوں تو خوشیوں سے رہا ہے دُور اکثر آدمی
ڈھونڈنے والوں کو لیکن ہر خوشی ملتی رہی

ظلمتیں خلوت کدوں میں پائی ہیں اُس وقت بھی
آنگنوں میں جب کہ چھٹکی چاندنی ملتی رہی

کس نے سمجھی ہے اذیت اُن کے ذہنوں کی بھلا
اپنے ہی گھر میں جنھیں اپنی کمی ملتی رہی

کوئی بھی ہو دَور، مجھ جیسوں کو اے اختر سدا
اک سزا کے رُوپ میں دانشوری ملتی رہی

[1] یہ مطلع میں نے انتظار حسین کے ناول "تذکرہ" سے متاثر ہو کر کہا ہے۔
(ا۔ ب)

نامی انصاری
۱۳۴/۱ اے، نواب صاحب کا احاطہ
سول لائنز، کانپور

غزل

رنگِ وحشت کم نہیں زخمِ تماشا کم نہیں
زندہ رہنے کے لئے آشوبِ دُنیا کم نہیں

عاشقی کے سائے گر بیکار ہی ثابت ہوئے
ناخنِ تدبیر سے زلفِ چلیپا کم نہیں

دیکھنا چاہیں تو ساحل پر نئے منظر بہت
ڈوبنا چاہیں تو کوئی موجِ دریا کم نہیں

لَوٹ کر واپس نہیں آئے پرندے آج بھی
حرص کے صیدِ زبوں کو بالِ عنقا کم نہیں

وقت کی رفتار کو ناپے ہے عقلِ نارسا
ذرّۂ ناچیز بھی ہنگامہ آرا کم نہیں

بال و پَر کے آزمانے کو فضائیں ہیں بہت
آسماں کا دشتِ لامحدود ایسا کم نہیں

زیرِ پا مجھ کو کئی ٹوٹے ہوئے خنجر ملے
شہرِ ناپُرساں میں بھی میرے شناسا کم نہیں

کس کے ہونٹوں پر سنورتی ہے کہاں مرتی ہے پھر
لوگ کہتے ہیں کہ میخانے میں صہبا کم نہیں

اس جہانِ خیر و شر سے بدگماں کیوں ہو جیے
بازوئے قاتل سے نامی دستِ عیسا کم نہیں

ڈاکٹر آصف زمانی
ریڈر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ

بیسویں صدی کے ہندستان میں

فارسی تحقیق کے عناصرِ اربعہ

حقائق کی تلاش و جستجو کا دوسرا نام تحقیق ہے۔ تحقیق علم و فن کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے۔ ایمان داری، بے تعصبی، ذہانت و قابلیت، صبر و استقلال، وسیع مطالعہ اور ژرف نگاہی اس کے اہم اجزا ہیں۔ لیکن "ذوقِ طلب" تلاش و جستجو کا بنیادی عنصر ہے یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو دانہ چینی کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ ابوطالب کلیم ہمدانی نے اسی بات کی ترجمانی یوں کی ہے ؎

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ می‌چیدم من آن روزی کہ خرمن داشتم

ہندستان کے فارسی ادبیات میں بیسویں صدی سے پہلے تحقیق کی کوئی باقاعدہ اور منظم صورت نظر نہیں آتی۔ ہاں ارادی یا غیر ارادی طور پر اس کی ابتدائی شکل ہمیں فارسی تذکروں، فرہنگوں، خطوط و انشا، ملفوظات اور شرح و حواشی وغیرہ میں البتہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندستان میں فارسی ادبیات کی تحقیق کا کام بیسویں صدی میں زیادہ مستحکم، اصولی اور سائنٹفک طریقے پر انجام پایا۔

بیسویں صدی میں محققین کی خاصی تعداد دیکھنے کو ملتی ہے جنھوں نے مختلف نوعیت کے تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں، ان میں مولانا محمد حسین آزاد [1]، خواجہ الطاف حسین حالی [2] مولانا شبلی نعمانی [3]، پروفیسر محمد عبدالغنی [4]، ڈاکٹر محمد اسحاق، پروفیسر محمد شفیع [5] پروفیسر محمد اقبال (اورینٹل کالج لاہور) شیخ محمد اکرام الحق [6] پروفیسر زبیر احمد صدیقی [7] عبدالرزاق کانپوری [8] پروفیسر مسعود حسن رضوی [9] پروفیسر ہادی حسن، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، پروفیسر حیدر میرزا [10] پروفیسر نجیب اشرف ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمان [11] پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر سید حسن، پروفیسر امیر حسن عابدی اور پروفیسر نورالحسن انصاری [12] وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

میں نے اپنے مقالہ میں محققین کی اس فہرست میں سے چار ایسے محققین کا انتخاب کیا ہے جو تحقیق کے کسی نہ کسی خاص میدان کے شہسوار ہیں۔ وہ ہیں مولانا شبلی نعمانی، پروفیسر حافظ محمود شیرانی، پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر امیر حسن عابدی۔

فارسی ادبیات کی باقاعدہ تحقیق و نقد کا اولین نقش شبلی نعمانی کی "شعر العجم" ہے۔ شعر العجم سے قبل باضابطہ اور منظم طور پر ہمیں تحقیق و نقد کا کوئی دوسرا اہم کارنامہ نظر نہیں آتا، اس لیے شبلی کا نام "بانیٔ نقد و تحقیق" کے اعتبار سے اہم ہے اور "بنیان گذارِ نقد و تحقیق" کا تاج انھیں کے سر کی زینت ہے۔

مولانا شبلی نے ۱۹۰۷ء میں "شعر العجم" کی پہلی جلد تصنیف کی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اس کی چار جلدیں اور سامنے آئیں اس میں شک نہیں کہ شبلی نے انتہائی تلاش و تفحص اور عرق ریزی کے

بعد بالتفصیل پہلی بار نہ صرف فارسی کے شعری عناصر کی تحقیقی و تنقیدی بحث دنیائے فارسی کے سامنے پیش کی بلکہ تحقیق کے اس ابتدائی دور میں جبکہ آج کل کی طرح آسانیاں بھی فراہم نہ تھیں محدود ماٰخذ کے باوجود رودکی سے لے کر ابو طالب کلیم ہمدانی تک فارسی کے ممتاز شعراء و ادباء کا باعتبار ادوار، تاریخ وار ایک ایسا منظم اور مبسوط مواد پیش کیا جو بلاشبہ آج بھی ہمارے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بدون تردید تحقیق و تنقید کو سمت و رفتار عطا کرنے میں "شعر العجم" کا مرتبہ اپنی جگہ مسلم ہے۔

بعد کی تحقیق نے شبلی کے اس تحقیقی و تنقیدی کام سے کسی حد تک بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ ان معترضین میں حافظ محمود شیرانی کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے "تنقید شعر العجم" لکھ کر شعر العجم کی تاریخی و تنقیدی فروگزاشتوں کی جانب پہلی بار اہل نظر کی توجہ مبذول کرائی۔ تنقید شعر العجم کی پہلی قسط اکتوبر ۱۹۲۲ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد اس بحث نے اس موضوع پر اظہار خیال کا دروازہ کھول دیا اور اس سلسلے میں مولانا عبدالحلیم شرر، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبداللطیف اعظمی، ماہر القادری، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی (بنگلادیش) اور پروفیسر نذیر احمد وغیرہ کی نگارشات سامنے آئیں جس میں اس موضوع کی تائید و تردید میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا۔ جواب الجواب کے اس سلسلے میں اگرچہ کوئی حتمی اور فیصلہ کن رائے قائم نہیں کی گئی تاہم مولانا شبلی کے ساتھ یہ اختلافی نظریے بہ لحاظ تحقیق فالِ نیک ثابت ہوئے۔ اس لیے کہ اس بحث سے شعر العجم کے مرتبہ میں تو کوئی کمی واقع نہیں ہوئی البتہ ان اختلافات اور ان غلطیوں کی نشان دہی کی روشنی میں "شعر العجم" کی بہر حال ایک ایسی صاف ستھری اور تحقیق شدہ شکل ضرور نکھر کر سامنے آ گئی جس کی افادیت پہلے سے زیادہ مسلم ہے۔

ادبی تحقیق میں استشہاد کو کافی دخل ہے۔ شہادتیں دو طرح کی ہوتی ہیں اول "خارجی شہادت" دوم "داخلی شہادت"۔ خارجی شہادتوں میں تاریخیں، تذکرے، ادبی تحریریں، سیاحت نامے، خطوط اور ڈائریاں وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ داخلی شہادتوں میں شاعر یا مصنف کے کارناموں میں زبان و بیان الفاظ و محاورات اور فقروں کی ساخت وغیرہ سے کسی خاص عہد کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی شہادتیں خارجی شہادتوں کے مقابلے میں زیادہ مفید اور معتبر مانی جاتی ہیں۔ یہ ایک طرح کا کتابی پوسٹ مارٹم ہے، جس میں ایک ایک لفظ، ایک ایک محاورے ایک ایک جملے پر دقت کے ساتھ نظر کرنی ہوتی ہے اور پھر اس طریقہ کار سے کلام کی آمیزش اور ملاوٹ کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ گویا داخلی شہادت ایک ایسا آلہ ہے جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا جا سکتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی اس سلسلے میں اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا ایوان داخلی شہادتوں پر قائم ہے۔ انھوں نے اس بنیاد پر بعض چونکا دینے والے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ تنقید شعر العجم اور فردوسی اور شاہنامہ سے متعلق ان کی تحقیق خالص داخلی شہادتوں پر منحصر ہے۔

تنقید شعر العجم میں رودکی سے لے کر نظامی تک یوں تو بقول شیرانی جہاں جہاں شبلی کے طاقت ور قلم نے لغزشیں کی ہیں۔ داخلی شواہد کی روشنی میں انھوں نے ان کی اصلاح کی حتی الامکان کوشش کی ہے لیکن انوری اور عطار سے متعلق ان کی تفصیلی بحث خاص طور پر داخلی شہادتوں سے پُر بار ہے۔ داخلی شواہد کی روشنی میں انوری سے متعلق سات آٹھ قصائد کے الحاقی ہونے کی نشان دہی اور ساتھ ہی سعید نفیسی کے اس قول کی تردید بھی کہ یہ قصائد سید سراج الدین سگزی (قرن ہفتم) سے متعلق نہ ہو کر سلطان شمس الدین التمش (۶۰۷-۶۳۳ھ) اور اس کے فرزند رکن الدین فیروز شاہ کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک قدیم ہندستانی شاعر تاج ریزہ نامی کی یادگار ہیں نیز فرید الدین عطار سے منسوب کتابوں کی صحیح بازیافت جیسی مثالیں ان کی ژرف بینی پر دال ہیں۔

"فردوسی اور شاہنامہ" سے متعلق ان کی تمام تر تحقیق داخلی شواہد کی مرہون منت ہے۔ داستان "بیژن و منیژہ" میں الف اشباع کی کثرت استعمال کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کرنا کہ یہ داستان شاہنامہ سے قبل کی سب سے پہلی داستان ہے جسے اس نے اپنی اہلیہ کی فرمائش پر نظم

گیا، داخلی شہادت کی اعلا مثال ہے۔ شاہنامہ کی تکمیل کے پینتیس سالہ مدت کے نشیب و فراز کو اشعار کی رو سے فردوسی کی سرخوشی و اضمحلال کو بنیاد بنا کر اشعار کو پہچاننا اور اسی بنیاد پر شاہنامہ کی داستانوں کو ادوار کے لحاظ سے "زمانۂ طوس" اور "زمانۂ غزنی" کے عنوانات کے تحت تقسیم کرنا بھی داخلی شواہد ہی کی مثالیں ہیں۔ شاہنامہ سے متعلق صدیوں پرانے اس تصور کو کہ شاہنامہ سلطان محمود غزنوی کی خواہش پر کسی صلے یا معاوضے کی امید پر نظم کیا گیا، رد کرنا اور اسے فردوسی کے جذبہ حب الوطنی کا باعث قرار دینا بھی داخلی شہادتوں پر ہی مبنی ہے۔ ہجو سلطان محمود سے متعلق نظامی عروضی سمرقندی اور دیباچۂ قدیم کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے شاہنامہ کے اشعار کی روشنی میں، محمود کی ناراضگی کی اصل وجہ اختلاف مذہب نہ قرار دینا نیز فردوسی سے منسوب ہجو کو سراسر بہتان ثابت کرنا نیز ہجویہ اشعار کی کثرت کو الحاقی ثابت کرنے میں انھوں نے داخلی شہادتوں کو بنیاد بنایا ہے۔

مثنوی "یوسف زلیخا" کو فردوسی سے منسوب کرنے کی روایت کے سلسلے میں مغربی مستشرقین کے عقیدوں کو باطل قرار دیتے ہوئے مثنوی میں مستعمل الفاظ و کنایات و محاورات و اسمار و زبان کی مثالیں دے کر ثابت کرنا بھی داخلی شواہد کی مثال ہے۔ داخلی شہادت کی بنیاد پر ان کا ایک چونکا دینے والا کارنامہ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب فارسی دیوان کی نشاندہی ہے۔ دیوان میں مستعمل مخصوص زبان و الفاظ کی تکرار کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اس کا قائل کوئی واعظ رہا ہوگا اور پھر واعظین کی صف سے اس واعظ کو ڈھونڈ نکالنا نیز اس کے دوسرے آثار مثلاً "معراج النبوت" سے ثابت کر دینا کہ مذکورہ دیوان خواجہ معین الدین چشتیؒ کا نہیں بلکہ سلطان ابوالغازی حسین کے عہد کے ایک زبردست فاضل، مولانا معین الدین ابن مولانا شرف الدین حاجی محمد الفراہی سے وابستہ ہے۔ مولانا کی وسعت مطالعہ، ان کی اعلا استعداد و صلاحیت اور ژرف بینی کی عمدہ ترین مثال ہے۔ اسی طرح املا کی بنیاد پر مثنوی "عروۃ الوثقیٰ" کے متعلق اس خیال کو رد کرنا کہ یہ مثنوی شہاب مہرہ "استادِ خسرو" کی تصنیف ہے اور یہ ثابت کرنا کہ ہندوستان کے ایک نامعلوم شاعر شہابی کی یادگار ہے داخلی شہادت کی بین مثال ہے۔

غرض پروفیسر شیرانی نے مضبوط داخلی شہادتوں کی بنیاد پر مفروضات کے بڑے بڑے بت توڑے ہیں۔ تحقیق کے میدان میں ان کی یہ "بت شکنی" اور جسارت بلاشبہ قابل تحسین ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی کو تحقیق کے اس میدان کا سرخیل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ادبی تحقیق کے سلسلے میں صحتِ متن کا مسئلہ ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے اس کام کو ہم "متنی تحقیق" کہہ سکتے ہیں۔ متنی تحقیق کے سلسلے میں ایک محقق کو چند بنیادی امور کو ذہن میں رکھنا ضروری ہوتا ہے تبھی وہ "متنی تحقیق" کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے مثلاً متن کی حقیقت، ترتیب متن اور کتابت متن کی تاریخی اہمیت حاشیہ نگاری، اصلاحی حواشی مع تقابلی حواشی اور تعلیقات متن وغیرہ۔ فرہنگ و دواوین، تذکروں اور خطوط و انشا کے نثری شہ پاروں کی صحت کے وقت متنی تحقیق بروئے کار لائی جاتی ہے۔

متنی تحقیق بڑی صبر آزما چیز ہے اور شاید جادۂ تحقیق کی دشوار گزار منزل اس راستے سے گزرنا سہل الحصول طبیعتوں کا کام نہیں۔ اس شاہراہ سے تو کچھ وہی لوگ گزر سکتے ہیں "سخت کوشی" جن کا مذہب اور "کوہ کندی" جن کا ایمان ہو۔ اس دشوار گزار منزل کو جس شخص نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ وہ معتبر نام ہے پروفیسر نذیر احمد کا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی میں صدہا مختلف تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے۔ لیکن متنی تحقیق کے سلسلے میں ان کی عرق ریزی اور دقت نگاہی کا مقابل کوئی دوسرا نہیں۔ تلفظ، لہجے، املا اور الفاظ کی صحت پر آپ نے بیسیوں مضامین لکھ کر بار بار ذہنوں کو اس طرف متوجہ کیا ہے جس میں "غالب اور ذال فارسی" "دساتیر پر ایک نظر" جیسے مضامین انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

تحریری فروگزاشتوں اور قلمی لغزشوں کے سلسلہ میں ان کا خیال ہے کہ کسی بھی تحریر کے لکھتے وقت غلطیوں کا احتمال موجود رہتا ہے اور نقل کرتے وقت اس کا احتمال اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس عنوان

پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے "پارسائی"، ریائی، روشنائی کی ردیف میں کہی ہوئی عراقی کی غزل کے ایک مصرعہ

بشرارۂ قلندر بزن از جہیفہ مائی

کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے فرمایا کہ "بشرارۂ" دراصل "پسرارۂ" کی تحریف زدہ شکل ہے جو قلم کی زد میں آکر کسی وقت "بشرارۂ" میں تبدیل ہوگیا اور عرصہ تک اسی طرح پڑھا اور پڑھایا جاتا رہا۔

"متنی تحقیق" کے سلسلے میں ان کی چند گراں مایہ کتب اس طرح ہیں :

(۱) مکاتیب سنائی[۱۵]

یہ تقابلی تحقیق کا بہترین نمونہ ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے مکاتیب سنائی کے پانچ معتبر نسخوں کی مدد سے ان کے اختلافات کو درست کرنے کے بعد ایک صحیح اور معتبر متن تیار کیا ہے۔ اس میں مستعمل آیات قرآنی و احادیث نبوی کو قرآن و حدیث کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کے بعد اسے پاورقی میں دیا گیا ہے۔ فقرات و محاورات، اقوال اور ضرب الامثال وغیرہ کی، دیوان اور حدیقۂ سنائی کی روشنی میں تصحیح کی گئی ہے نیز عربی اشعار کو شعراء کے دواوین سے مقابلہ کر کے صحت کے ساتھ پاورقی میں دکھایا گیا ہے۔

(۲) دیوانِ حافظ

پروفیسر نذیر احمد کا دوسرا قابلِ ذکر کام دیوانِ حافظ کے صحیح اور معتبر متن کی ترتیب ہے۔ دیوانِ حافظ کا پہلا ایڈیشن ۱۷۹۱ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ایران، مصر و ترکی سے اس کے متعدد نسخے شائع ہوئے لیکن ان اشاعتوں کے باوجود دیوانِ حافظ کا کوئی ایسا نسخہ شائع نہ ہو سکا جو معتبر ترین کہا جا سکے۔ البتہ اسی درمیان ۸۲۷ھ کے کتابت شدہ نسخے کو، جو حافظ کی وفات کے تقریباً ۳۵ سال بعد ترتیب دیا گیا تھا، بنیاد بنا کر عبدالرحیم خلخالی نے ۱۹۲۷ء میں ایران سے شائع کیا۔ اسی نسخے کو ڈاکٹر قاسم غنی اور علامہ قزوینی نے اپنے نسخہ کی اساس بنایا۔ پروفیسر نذیر احمد نے ۸۲۴ھ کے کتابت شدہ نسخے کو جو سید ہاشم علی سبزپوش (گورکھپور) کے کتب خانے میں موجود تھا یعنی جو قدامت کے لحاظ سے نسخۂ خلخالی سے بھی تین سال قدیم تھا۔ ڈاکٹر محمد رضا جلالی نائینی کی ہمکاری میں تہران سے شائع کرا دیا۔ اب تک کی تحقیق کی رو سے اس نسخے کا شمار معتبر ترین نسخوں میں کیا جا سکتا ہے۔ نسخے کے متن میں شرح و حواشی موجود نہیں ہیں۔ لیکن اس نسخے میں "مقدمہ جامع" موجود ہے جو اب تک مختلف نسخوں میں "گلُ اندام" کے نام سے منسوب رہا ہے۔ اس مقدمہ پر مبسوط حواشی پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن گل اندام کا نام مقدمہ میں حذف ہے۔ محققین کو اس نام کے الحاقی ہونے کا شبہ ہے۔ اس کے الحاقی ہونے کے سلسلے میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ چوں کہ گیارہ قدیم ترین نسخوں میں سے سات نسخوں میں یہ نام نہیں ملتا اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ یہ نام الحاقی اور فرضی ہے۔

(۳) انتقادی متن

پروفیسر نذیر احمد نے کچھ معتبر ترین ہندستانی فرہنگوں کے بھی انتقادی متن تیار کیے ہیں۔ فرہنگ نویسی کا معاملہ ذہانت کے ساتھ ساتھ فرہنگوں اور ادبی متون کے بے پناہ مطالعہ کا متقاضی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد یہاں بھی بے حد سلامت روی سے گزرے ہیں۔ انھوں نے جن فرہنگوں کے انتقادی متن تیار کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(الف) فرہنگ قواس

تالیف فخرالدین مبارک شاہ قواس غزنوی (۶۹۵ھ)۔ یہ علاء الدین خلجی (۶۹۵ - ۷۱۵ھ) کے عہد کا ادیب اور شاعر ہے۔ فارسی کی قدیم ترین فرہنگ لغت فرس اسدی طوسی (وفات ۴۶۵ھ) ہے۔ فرہنگ قواس کا نمبر قدامت میں دوسرا ہے۔ اس میں پانچ بخش ہیں۔ اس لیے اسے "پنج بخشی" بھی کہتے ہیں، اس کا ایک ہی (ناقص) نسخہ دریافت ہو سکا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کی رو سے پروفیسر نذیر احمد نے اس کا انتقادی متن

تیار کیا ہے یہ فرہنگ بنگاہ ترجمہ و نشر کتب تہران سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔

(ب) دستور الافاضل

تالیف سعد رفیع، المعروف بہ حاجب خیرات دہلوی (۷۴۳ھ) محمد تغلق کی یادگار ہے۔ اس کا شمار بھی ہندوستان کی قدیم ترین فارسی فرہنگوں میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک ہی ناقص نسخہ معلوم ہو سکا ہے۔ جس کی رو سے پروفیسر نذیر احمد نے اس نسخہ کی ترتیب و تصحیح کی اور ادارے سے ۱۹۵۱ء میں شائع کرایا۔

(ج) فرہنگ زفان گویا

اس کا شمار بھی فارسی کی قدیم ترین فرہنگوں میں ہوتا ہے۔ اس فرہنگ کا پورا نام "زفان گویا و جہان پویا" ہے۔ اس کا مؤلف بدر ابراہیم ہے۔ پوری کتاب میں سات بخش اور ایک خاتمہ ہے سات بخش کی مناسبت سے اسے "ہفت بخش" بھی کہتے ہیں کتاب خانہ خدابخش بانکی پور پٹنہ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔

(د) نقد قاطع برہان

بقول پروفیسر نذیر احمد "نقد قاطع برہان" غالب کی مشہور تصنیف "قاطع" کے بعض مندرجات کو تحقیق کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش ہے۔

پروفیسر نذیر احمد نے فارسی کی قدیم فرہنگوں مثلاً فرہنگ قواس، دستور الافاضل، زفان گویا، بحر الفضائل وغیرہ کی روشنی میں پہلی بار اختلافی مسائل پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے ثابت کیا ہے کہ برہان قاطع (مرتبہ محمد حسین تبریزی) کے سلسلے میں مرزا غالب کے اکثر اعتراضات درست نہیں ہیں۔ انھوں نے دساتیر کی جعلی حقیقت کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے، جس کی طرف بقول پروفیسر نذیر احمد غالب کی نظر نہیں تھی۔ اس کے دوسرے حصے میں خیال پانچ ضمیمہ جات نے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے جس سے واقفیت کے بغیر جناب پروفیسر نذیر احمد فرہنگ نگاری کے اصول کی شناخت ممکن نہیں یہ ضمیمہ جات اس طرح ہیں: دساتیر پر ایک نظر، برہان قاطع، غالب اور صاحب برہان قاطع میں اتحاد نظر، غالب اور زوال فارسی، ملے تعریفات

اور لغات فارسی۔ یہ کتاب ۱۹۸۵ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

ان فرہنگوں کے انتقادی متون کے علاوہ فرہنگ ناموں سے متعلق آپ نے متعدد مضامین بھی تحریر کیے ہیں جو انتہائی وقیع ہیں۔ مثلاً:—

"بحر الفضائل" (تالیف ۸۳۷ھ) مطبوعہ مجلہ معارف ۱۹۶۷ء

"تحفۃ السعادۃ" (تالیف ۹۱۶ھ) مطبوعہ مجلہ "علوم اسلامیہ" علی گڑھ

"فرہنگ شیر خانی" (تالیف دسویں صدی ہجری) مطبوعہ مجلہ غالب نئی دہلی ۱۹۸۳ء

"فرہنگ قواس کا ایک جعلی نسخہ جو بابل میں" وغیرہ وغیرہ

متنی تحقیق کے سلسلے میں آپ کی کاوشیں برابر جاری ہیں۔ "دیوان مہندس" اور ترجمہ "اعجاز خسروی" و ترجمہ "بادشاہ نامہ" پر بعض دانشمندوں کی ہمکاری سے کام ہو رہا ہے۔

ہندوستان کی علمی و ادبی فضا پر فارسی زبان تقریباً آٹھ سو سال تک چھائی رہی۔ اس طویل عرصہ میں پھیلے ہوئے انمول ادب پاروں کی جانب متعدد دوسرے چند غیر معمولی ذہین اور وطن دوست ہستیاں ہی مائل ہوئی ہیں۔ ان میں پروفیسر امیر حسن عابدی کا نام سر فہرست ہے۔

پروفیسر امیر حسن عابدی بیسویں صدی کے ان محققین میں سے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے بیش قیمت لمحات ہندوستانی فارسی ادب کے بحر زخار کی شناوری میں صرف کیے ہیں۔ وہ قدرت کی طرف سے ایک تجسس بھرا دل لے کر آئے ہیں۔ انھیں ہندوستانی فارسی ادبیات کے خزانے سے انمول موتیوں کو ڈھونڈھ نکالنے کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ اس سلسلے میں فارسی کے مشہور شعراء کے غیر مطبوعہ کلام کی تلاش و جستجو اور اشاعت کی طرف رجحان زیادہ غالب رہا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، ترکی اور پاکستان کے اہم کتب خانے آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ وہاں بھی آپ عموماً ان کتابوں کی تلاش میں زیادہ سرگرداں رہے ہیں جو ہندوستان سے تعلق رکھتی ہوں۔ اس بات کی شہادت میں خود ان کا قول ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

"مجھے ترکی کے سفر اور وہاں کے کتب خانوں میں مطالعے کے دوران برابر یہی خیال رہا کہ ایسی نادر اور گمنام

کتابوں اور قلمی نسخوں کا پتہ لگایا جائے جو ہندستان اور ہندستانی تہذیب سے متعلق ہوں"۔ [۱۹]

یہی وجہ ہے کہ آپ کی تالیفات میں ان کتابوں کا حصہ زیادہ ہے جو ہندستان سے متعلق ہوں، مثلاً

(۱) وکرم اروشی

کالی داس کے اس ڈرامہ کا ترجمہ جرمنی اور انگریزی میں ہو چکا ہے۔ مرحوم مولوی محمد عزیز مرزا نے کالی داس کے بعد اس کے حالاتِ زندگی اور اس ڈرامہ کی مبسوط شرح کے ساتھ اردو زبان میں اس کا ترجمہ کیا تھا جو ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ پروفیسر عابدی نے سنسکرت کے دوسرے منابع نیز اردو و انگریزی کے ترجموں سے استفادہ کرتے ہوئے تمام اشتباہات کو دور کرنے کے بعد اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کا دیباچہ آقای محمد تقی مقتدری (مستشار فرہنگی سفارت کبرای ایران در ہند) کا لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نئی دہلی سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔

(۲) پنچاکیانہ

آداب سلاطین اور رسم آئینِ ملوک سے متعلق دشنو سشرما کی سنسکرت میں لکھی ہوئی کتاب "پنچ تنتر" ہے جس کا نوشیروان عادل کے زمانے میں برزویہ طبیب نے پہلوی میں ترجمہ کیا تھا، جو عہد عباسی میں "کلیلہ و دمنہ" کے نام سے عربی میں منتقل ہوئی۔ رودکی نے اسے پہلی بار فارسی شعر کا قالب عطا کیا (یہ ترجمہ پہلوی ترجمہ کی طرح مفقود سمجھا جاتا ہے)۔ اکبر کے زمانے میں دسویں صدی ہجری کے نصف آخر میں اس کا ترجمہ ابوالفضل نے "عیار دانش" کے نام سے کیا۔ اسی صدی کے آخر میں مصطفیٰ خالقداد عباسی نے جو سنسکرت زبان کے بھی ماہر تھے نیز سنسکرت کی دوسری کتابوں کا ترجمہ کر چکے تھے، اسے "پنچاکیانہ" کے نام سے اصل سنسکرت متن سے فارسی میں منتقل کیا جو گیارھویں صدی کے آغاز میں مکمل ہوا۔ اس کا ایک واحد نسخہ دہلی میوزیم میں موجود تھا۔ پروفیسر عابدی نے ڈاکٹر تاراچند کی ہم کاری سے ایک عالمانہ اور تحقیقی مقدمہ کے ساتھ اسے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۷۳ء میں شائع کرایا (اس پر محمد رضا امیر تیمور سفیر کبیر ایران در ہند دہلی کا تحریر کردہ دیباچہ بھی شامل ہے)

(۳) گلزار حال یا طلوع قمر معرفت

شری کرشن مشرا کا تمثیلی ڈرامہ (بہ شکل مثنوی) بنام "پربودھ چندر اودے" جو بہ لحاظ موضوع بدی پر نیکی کی فتح سے متعلق ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سنسکرت میں لکھا گیا۔ اسے دارا شکوہ پسر شاہجہاں کے حکم سے اس کے منشی بنوالی لال (یا بنواری لال) پسر ہیرامن نے ۱۰۶۳ء میں "گلزار حال" کے نام سے فارسی نثر کا قالب عطا کیا۔ اس میں یہ نقص تھا کہ بعض سنسکرت ابیات کا ترجمہ نہیں کیا گیا تھا۔ نیز بعض جملے اور فقرے بھی حذف کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ پروفیسر عابدی نے ڈاکٹر تاراچند کی ہمکاری سے اس کا ترجمہ اور سنسکرت کے اصل متن سے موازنہ کے بعد اس کو ایک مبسوط مقدمہ ضمیمہ اور فرہنگ لغات سنسکرت و ہندی کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کرایا۔

(۴) جوگ وششٹ

ہندستان کی ایک مقدس کتاب ہے جس میں ہندستان اور کابل کے راجہ کی داستان ہے۔ وششٹ جی، رام چندر جی کو یہ داستان سناتے ہوئے نصیحت کرتے ہیں کہ جس طرح یہ دونوں راجہ معرفت حاصل کرنے کے بعد بھی سلطنت کے امور انجام دیتے رہے، اسی طرح آپ بھی معرفت حاصل کریں۔ لیکن ساتھ ہی راج کاج بھی سنبھالیں۔

(۵) داستان پدماوت

تصحیح و ترتیب فارسی (مطبوعہ بنیاد فرہنگ ایران ۱۹۷۲ء)

(۶) مثنویات خالق کشمیری

مطبوعہ جموں و کشمیر اکاڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لنگویجز (۱۹۶۴ء)

(۷) ضمیمہ تغلق نامۂ امیر خسرو

اس کی ترتیب و تصحیح ڈاکٹر مقبول احمد مرحوم کی ہمکاری سے کی گئی ہے (مطبوعہ انڈو پرشین سوسائٹی دہلی ۱۹۷۵ء)

ان تالیفات کے علاوہ انھوں نے سو سے زائد تحقیقی مقالات قلم بند کیے جن میں سے بیشتر ہندستان کے شعرا و ادبا، اور یہاں کی تہذیب و تمدن سے متعلق ہیں۔ ہندستانی داستانوں اور ہندوؤں کی مقدس

کتابوں کے فارسی تراجم۔ فارسی کتب کے ہندستانی زبانوں میں تراجم وغیرہ پر آپ نے اپنے مقالات میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ہندستان کے نادر قلمی نسخوں کا تعارف نیز ہندستان کے غیر معروف و گم نام فارسی شعرا کا تعارف بھی آپ کی دل چسپی کا موضوع رہا ہے۔ مثلاً شاہجہانی دور کا شاعر سعد اللہ مساعی، پنڈت زندہ رام موبد کشمیری جلیس المشتاق (تالیف ۸۷۰ھ م ۱۴۶۶ء) وغیرہ پر کیا گیا کام تحقیقی لحاظ سے لائق ستائش ہے۔

بحیثیت مجموعی، مولانا شبلی، پروفیسر شیرانی، پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر عابدی بلاشبہ تحقیق کے وہ عناصر اربعہ ہیں جن کی کاوشوں پر بیسویں صدی کے ہندستان کی فارسی تحقیق کا ایوان قائم ہے۔

حواشی:

۱؎ تحقیقی کتب، سخندان فارس اور نگارستان فارس

۲؎ حیات سعدی، تصحیح متن مقدمہ سفر نامہ ناصر خسرو

۳؎ شعر العجم

۴؎ ہندستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب۔ تاریخ زبان و ادب فارسی در عہد گورکانیان (بزبان انگریزی)

۵؎ ترتیب و تنظیم تذکرہ میخانہ (عبدالنبی فخر الزمانی)، تصحیح مثنوی "وامق و عذرا" (عنصری بلخی) وغیرہ

۶؎ "شعر العجم فی الہند"

۷؎ مصحح تاریخ نامہ ہرات

۸؎ مؤلف ترجمہ سفر نامہ ناصر خسرو

۹؎ فیض میر ترتیب و تصحیح با مقدمہ و ترجمہ اردو (چاپ ۱۹۲۹ء)

۱۰؎ امیر خسرو؛ احوال و آثار

۱۱؎ بزم تیموریہ، بزم مملوکیہ، بزم صوفیہ

۱۲؎ فارسی ادب بعہد اورنگ زیب، امیر خسرو: احوال و آثار، فارسی کی دل کش داستانیں، مآثر محمود شاہی از شہاب حکیم، تحفۃ الہند از میرزا خان وغیرہ۔

۱۳؎ الف اشباع بقول شیرانی داستان بیژن و منیژہ میں ۲۷ بار استعمال ہوا ہے۔ باقی کل شاہنامہ میں اس کا استعمال صرف ۱۵ بار ہوا ہے

۱۴؎ اصلاحی حواشی کی ایک خاصی طویل فہرست پروفیسر شیرانی نے تذکرہ مجموعہ نغز کے دیباچے میں پیش کی ہے۔

۱۵؎ چاپ اول ۱۹۶۰ء علی گڑھ۔ چاپ دوم ۶۲۔ ۱۹۶۱ء افغانستان

۱۶؎ پروفیسر سید حسن (پٹنہ) نے "فارسی کی ایک قدیم فرہنگ زفان گویا" کے عنوان سے ایک مقالہ قلم بند کیا ہے جس میں انھوں نے خدا بخش کے مخطوطہ کا تعارف کرایا ہے۔ یہ مضمون ان کے مجموعہ مقالات "سلک گلک" میں شامل ہے۔

۱۷؎ "پیش گفتار"۔ نقد قاطع برہان۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۷۴ء

۱۸؎ اسی عنوان سے قاضی عبدالودود کا مقالہ مطبوعہ مجلہ "آجکل" دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ بعد میں یہ "گنجینۂ غالب" میں بھی شامل کر لیا گیا قاضی صاحب نے "حافظ اور ذال فارسی" کے عنوان سے بھی ایک مقالہ لکھا تھا جو ماہنامہ "نقوش" لاہور کے اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۶ء کے خاص شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۹؎ مقالہ جلیس المشتاق، "ہندستانی فارسی ادب" مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی۔ ناشر انڈو پرشین سوسائٹی دہلی ۱۹۸۴ء ص ۱۹۲

۲۰؎ جرمنی مفکر Bollensen نے ۱۸۱۴ء میں اس کا ترجمہ جرمنی میں اور ویلسن نے ۱۸۲۷ء میں اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ جرمنی مفکر Rueckart نے ۱۸۴۴ء میں اس کے کچھ حصوں کو جرمنی میں پیش کیا۔

□□

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ
لکھنؤ

یادوں کے اُس پار

بہت دنوں سے ملے نہیں ہو
کہاں ہو کیسے ہو زندگی کس اُدھیڑ بُن میں گزر رہی ہے
یہاں تو یہ حال ہے کہ جیسے نہ وہ ہواؤں میں گرم ٹھنڈک
نہ اب وہ معنی ہیں موسموں کے
اُداس آنکھیں بھٹکتی رہتی ہیں پیچھے ماضی کے منظروں میں
تمہاری دیوار پر چنبیلی کی وہ گھنی بیل
اب بھی چڑھنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہے کہ تھک گئی وہ؟
وہ جس کی کوپل نمک سے آمیز کرکے چکھتے تھے تم بھی ہم بھی
وہ پیڑ املی کا پچھلی بارش میں بجلی گرنے سے ڈھا چکا راکھ ہو کر
وہ بوڑھے سیمر کے پاس والا پرانا چھوٹا سا گول مندر
وہ جس میں ساون کی بھیگی رُت میں
حسین جھانکی سجائی جاتی تھی کرشن جی کی
وہ آس جس کا کہ سال بھر انتظار کرتے تھے تم بھی ہم بھی
وہاں نہ سیمر کا پیڑ ہے وہ نہ سوچ میں ڈوبا کوئی مندر
وہاں تو اب ایک کارخانے کی کالی چمنی کا نیلا پیلا
دھواں فضاؤں کو ڈس رہا ہے !!

■■

قمر ادیب
۱۴۰۔ ادریس گنج
ہردوئی

لفظوں کا جال

میں نرم لفظوں کا جال
کاغذ پہ بن رہا ہوں
نظر سے اوجھل

ہتھیلیوں کے اُداس پیالے میں
کوئی چہرہ
نُمو کی تکمیل کر رہا ہے

□□

نفی

یہ ہم نہیں ہیں
یہ تم نہیں ہو
دلوں کی بینائیاں گنوا کر
چمکتے پانی میں دیکھتی ہیں
ہماری آنکھیں
کمال اپنا
تمہاری آنکھیں
جمال اپنا

□□

رشید امکان
۶۶/۹ - توپ خانہ روڈ
اجین (ایم۔پی)

ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری اُمِّ ہانی
مقبول لاری منزل۔ نزد سٹی اسٹیشن
لکھنؤ

رمیش چندر شوق مرزاپوری
۱۴/۳۵ جواہر لال نہرو روڈ
الٰہ آباد

غزلیں

سامنے نقطۂ نظر رکھا
اور پسِ پشت اپنا گھر رکھا

ہر عمارت کو سربلندی دی
سنگِ بنیاد معتبر رکھا

اُس نے نیزوں کی آبیاری کی
میں نے نیزوں پہ اپنا سر رکھا

دشمنوں میں اسے فضیلت دی
دوستوں میں عزیز تر رکھا

پاؤں اپنے کبھی نہ پھیلائے
ہر ضرورت کو مختصر رکھا

کوکب سب افلاک میں گُم
صوفی رُوحِ پاک میں گُم

کھنڈر ہوئی ہر اونچی حویلی
پھر بھی اونچی ناک میں گُم

سوادِ لہو میں عشق مگن ہے
جیسے رفوگر چاک میں گُم

شعلہ اُٹھتے سب نے دیکھا
راکھ ہوئے تو خاک میں گُم

یوں گردش میں ہانی ہے
ظرفِ سفال چاک میں گُم

کچھ فسوں سازیاں بیان کرو
اس نظر کا کوئی فسانہ کہو

مری بربادیوں کو کچھ نہ کہو
دوستو! اور کوئی بات کرو

ہیں فضائیں گھٹی گھٹی سی آج
کوئے جاناں کی اے ہواؤ! چلو

بدگماں کر دیا تمہیں جس نے
مجھ کو وہ بات بھول جانے دو

بے حسی موت کی نشانی ہے
دلِ ہستی میں درد بن کے اُٹھو

آج ہے کل یہاں رہے نہ رہے
در پہ اک بے نوا کو رہنے دو

چاہتا ہوں بیانِ شوق کروں
اور وہ راز آشکار نہ ہو

انور خان
۳۸/۲۲ بی۔ قمرالدین اسٹریٹ
ممبئی ۸

اچھی نہیں ہے شہر کے رستوں کی دوستی

(ندا فاضلی کی شاعری میں شہر)

انتظار حسین نے اپنے روزانہ کالم میں ایک بار لکھا تھا،

"اس شہر کا شاعر وداع ہوتے درختوں کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔"

پچھلے برس اسی مال پر انارکلی جانے والی سڑک کے موڑ پر کھڑا بزرگ درخت کارپوریشن کی زد میں آیا تھا تو میں نے اس کا ذکر بیرسٹر افسانہ نگار سے کیا۔ بیرسٹر موصوف نے کہا" تم ناسٹیلجیا میں مبتلا ہو۔ اپنی بستی کے املی کے پیڑوں کا نوحہ کرتے کرتے لاہور کے درختوں کے بارے میں جذباتی ہونے لگے۔ مگر یہ کوئی قصبہ نہیں ہے۔ یہ نیا شہر ہے اور ہم بیسویں صدی میں رہتے ہیں۔"

املی کا پیڑ مجھے ندا فاضلی کی یاد دلاتا ہے۔ ندا فاضلی خود نوشت "دیواروں کے بیچ" میں اپنے گھر کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

" صبح کے دھندلکوں سے گوالیار کا ایک محلہ دھیمے دھیمے ابھر رہا ہے۔ نئی سڑک، بڑے دالان اور آنگن۔ اور کئی کشادہ کمروں کا ایک اونچی دیواروں کا پرانا گھر۔ اس گھر میں دائیں بائیں کئی دروازے ہیں۔ سامنے املی کا درخت ہے جس میں بارہ مہینے کھٹے کتارے جھولتے ہیں۔ ان کو پوری دوپہر محلے کے بچے مل کر مار مار کر گراتے ہیں ان کتاروں کی چھینا جھپٹی میں ہر روز کئی چھوٹی بڑی لڑائیاں ہوتیں۔ ان لڑائیوں میں کبھی کبھی عورتیں بھی شامل ہو جاتیں۔

اسی املی کے پیڑ کا ایک بڑا بھائی اور بھی ہے۔ گھر کے بائیں دروازے کے سامنے نیلے چوڑے پیٹ اور کئی موٹے بھاری ہاتھوں والا نیم کا درخت ......

یہ دونوں عمر کے لحاظ سے بزرگ ہیں۔ ان کی عمروں کا اب کوئی اس محلے میں نہیں ہے۔"

درخت ہماری تہذیب کا یا تیسری دنیا کی تہذیبوں کا مرکزی علامیہ ہیں۔ کوفی اونور کی نظم کیتھیڈرل ملاحظہ ہو:

On this dirty patch
a tree once stood
shedding incense on the infant corn :
its boughs stretched across heaven
brightened by the last fires of a tribe
They sent surveyors and builders
who cut that tree
planting in its place
A huge senseless cathedral of doom

(Kofi Awoonnor)

بہرحال خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔ دنیا پہلی ہو، دوسری ہو یا تیسری، سارے ہی ممالک موڈرنائزیشن کے زیر اثر ہیں کہ معاشیات، جدید ٹیکنالوجی کے تقاضوں سے بچنا اب ناممکن ہو چکا ہے۔ بڑے

شہر نئی میگلوپولیٹن ثقافت کے مظہر ہیں اور کسی دیوزاد مقناطیس کی طرح انسانوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ شہر جہاں انسان اپنی پہچان اپنا حسب نسب، نام پتہ، حتیٰ کہ کبھی کبھی اپنی انسانیت تک کھو بیٹھتے ہیں۔ بس ایک نمبر، مشین کا ایک پُرزہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ بقول ہاروے کاکس (Harvey cox) کالج کا ایک لڑکا بھی جانتا ہے کہ آج کا جدید انسان محض ایک بے چہرہ صفر ہے۔ ایک عدد یا آئی بی ایم کارڈ میں چھوٹے چھوٹے سوراخوں کا ایک سلسلہ جو ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کے بنجر ویرانے (waste land) میں اپنی شناخت تلاش کر رہا ہے۔ کافکا، کیرکے گارڈ، ریلکے سبھی نے شہروں کی بے شخصیت زندگی سے پیدا ہونے والے روحانی (metaphysical) خوف کا ذکر کیا ہے۔ اب تیسری دنیا بھی اس عذاب کا شکار ہو چلی ہے۔ بمبئی۔ کلکتہ۔ کراچی۔ ڈھاکہ، سنگاپور، کولمبو، ہانگ کانگ سب اسی جدید کاری کا شکار ہیں جو ایک ناگزیر ضرورت بن چکی ہے۔

اکثر جدید مہانگروں میں گاؤں اور بیسویں صدی کے انتہائی ترقی یافتہ صنعتی معاشرے کے لوگ پہلو بہ پہلو سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ بھابھا ایٹمک انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے والے سائنس دانوں کی کالونی کے پیچھے ممکن ہے دربھنگہ سے آئے لوگوں کی جھونپڑیاں ہوں۔ کام، بہتر حالات، آسائشوں، سہولتوں اور سنہری زندگی کا سحر انسانوں کو شہروں کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ امیدیں پوری نہیں ہوتیں، لیکن جادو باقی رہتا ہے۔ بقول پیٹر برجر Peter Berger ایک چھوٹے سے گاؤں میں کوکاکولا کا اشتہار بھی گاؤں کی صدیوں کی روایتی شناخت اور قدروں میں دراڑ ڈال سکتا ہے۔ لاشعور پر میڈیا اور اشتہاروں کے زیر اثر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ بہتر زندگی تو بس شہروں میں ہے معمولی سا بال پوائنٹ پن یا کلائی پر بندھی گھڑی بھی اس نئی ثقافت کے پیغامبر ہو سکتے ہیں۔ اب گاؤں کے بچے بھی ماؤں سے میگی (فوری غذا) کی ضد کرتے ہیں۔

ایک حساس، ذہین انسان جب چھوٹے سے قصبے سے بمبئی یا کلکتہ جیسے شہر میں پہونچتا تو ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ اردو شاعری میں شہر کی ہیبت ناکی اور غیر انسانی رویے کا ذکر کوئی نیا نہیں ——

اختر الایمان، سردار جعفری، جاں نثار اختر، باقر مہدی، عزیز قیسی، عمیق حنفی، شہاب جعفری اور دوسرے کئی شعراء کے یہاں اس کا ذکر مل جائے گا۔ شہری مزاج، مجلسی اخلاق اور شہری قدروں اور رویوں پر البتہ بہت کم نظمیں، غزلیں ملیں گی۔ شاید چند مثالیں اختر الایمان، باقر مہدی یا بلراج کومل کے یہاں مل جائیں گی۔ ندا فاضلی کا یہ خاص موضوع ہے۔

ندا فاضلی ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرتضیٰ حسین (دُعا ڈبائیوی) علی گڑھ کے پاس ایک چھوٹے سے قصبے ڈبائی کے رہنے والے تھے۔ والدہ جمیل فاطمہ دلی کی تھیں۔ ماہنامہ عصمت اور رہنمائے تعلیم میں ان کی غزلیں مخفی تخلص کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ ندا فاضلی کا بچپن گوالیار میں گزرا جہاں ان کے والد ملازم تھے۔ شاعری کا چسکا لڑکپن میں پڑ گیا۔ لکھتے ہیں:

"گھر کا ماحول اور والد کے ساتھ شعری نشستوں میں شرکت نے ندا فاضلی میں بھی ادبی ذوق پیدا کر دیا ہے سمجھ بوجھ کیا خاک ہے ہاں چھوٹی سی عمر میں وزن میں مصرع جوڑنے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔ نصاب کی کتابوں سے زیادہ قافیوں کی تلاش میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ یادداشت اچھی ہے۔ داغ، نوح اور اپنے والد کے بہت سے شعر یاد ہو گئے ہیں، انھیں کو الٹ پھیر کر شعر بنا لیتے ہیں..... گوالیار میں آئے دن نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ اچھا خاصا ادبی ماحول ہے۔ اساتذہ میں ضیار عباس، حکیم احمد، کپتان تاباں، نارائن پرشاد مہر..... غنی گوالیاری، ریاض جیوری، دُعا ڈبائیوی ہیں۔ جاں نثار اختر حال ہی میں تعلیم مکمل کر کے آئے ہیں اور وکٹوریہ کالج میں لکچرر منتخب ہو گئے ہیں۔ ان کی شراب نوشی کی طرح ان کا عشق بھی مشہور ہے۔ یہ عشق بھی غیر روایتی ہے۔ ایک شادی شدہ خاتون کو موضوع سخن بنائے ہوئے ہیں..... جاں نثار کی نئی شاعری اور شاعرانہ زندگی نے ان کے اردگرد نوجوان شاعروں کا حلقہ پیدا کر دیا ہے۔"

داغ، نوح ناروی، دعا ڈبائیوی اور جاں نثار اختر کی رومانی ری نے ندا کو شعر کہنا تو سکھا دیا، لیکن خود اپنا لہجہ انھوں نے پایا میر، سورداس، میرا اور ہندی کے نئے شعرا سے۔ اس کی وجہ انھوں نے اس طرح بیان کی ہے:

"بی۔ اے کے پہلے سال میں ندا کو مجبوراً اردو کے بدلے ہندی لینی پڑتی ہے۔ اس کا خالی وقت لائبریری میں گزرتا ہے۔ لائبریری میں بھی ان کتابوں کے ساتھ جن کا تعلق شاعری سے ہے، یہ شاعری کی کتابیں داغ، ان کے معاصرین اور ان کے شاگردوں تک محدود ہیں۔ زبان کے چٹخارے کے ساتھ سیدھی شوخ باتیں اچھی لگتی ہیں...... یہ شعر سننے سنانے میں بہت لطف دیتے ہیں مگر ان کی اجتماعی لے انفرادی جذبوں کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ اس کا احساس ندا کو کالج کی ایک لڑکی مس ٹنڈن کو دیکھ کر ہوتا ہے۔"

اردو غزل میں محبوب سے گفتگو کا ایک شائستہ، مہذب اور تربیت یافتہ لہجہ ہے، گفتگو چاہے عورت سے ہو یا خدا سے شعریہ جذبات، عشقیہ مراحل، رویے اپنی تمامتر نزاکتوں کے ساتھ، ریکیوں کے ساتھ صدیوں سے شاعر بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب عوام ان جذبوں، رویوں اور بیان کرنے کے انداز اور لب ولہجہ سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ ان میں نیاپن محسوس نہیں ہوتا۔ ہمارے نوجوان اور بزرگ شاعر البتہ مسلسل کوشش کرتے رہے ہیں کہ غم محبوب اور غم روزگار اپنی تمامتر بدلی ہوئی کیفیت کے ساتھ شاعری میں آسکیں۔ اس کے لیے انھوں نے غزل کی زبان، اس کے لب ولہجہ کو بھی بدلنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ کام روز بروز مسلسل شکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ ندا فاضلی نے غزل کی وہ لفظیات جو روایت کا حصہ بن چکی ہیں، لی ہی نہیں، اس لیے وہ اس منزل سے آسانی کے ساتھ گزرے۔ نوجوانی کی ترنگیں، آوارہ مزاجی، بدلتے موڈ اور بے فکری کے ساتھ خالص ہندستانی امیجری، فارسی تراکیب سے گریز، قصبات کی فضا اور گھریلو نیم روحانی موضوعات نے زبان و موضوع دونوں سطح پر ندا کو دوسرے اردو شاعروں سے بالکل مختلف کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ بقول فضیل جعفری اپنے پہلے مجموعے کی اشاعت سے قبل ہی انھیں ایک اہم شاعر تسلیم کر لیا گیا۔ ندا کی شاعری میں گلی کوچوں، قصبوں یا صبح و شام کے بیان سے ذہن میں تصویر بنتی ہے وہ واضح طور پر یہ احساس دلاتی ہے کہ یہ کسی ہندستانی گاؤں، شہر یا قصبے کی ہی ہو سکتی ہے:

شور کرتا ہوا
چھت پر گرا مانجھے کا سرا
ننھے پیروں سے
لپٹنے لگی خاموش گلی

شام ہونے کو ہے
پیلی دھوپ
چھجے سے اتر کر
اون کے گولے سی بستر پر پڑی ہے

رنگ میں ڈوبی دشائیں
پتیوں میں سرسراتی اپسرائیں
تم نہیں ہو

صبح کی دھوپ
ڈھلی شام کا روپ
فاختاؤں کی طرح سوچ میں ڈوبے تالاب

میر انیس پر اپنے ایک مضمون میں سلیم احمد نے لکھا ہے کہ:

"میر انیس کے انسان کو ہم اردو شاعری میں پہلی بار اس کے خاندانی رشتوں میں دیکھتے ہیں یہ رشتے عملی زندگی میں جو کچھ بھی ہوں لیکن میر انیس کے سوا کسی اور شاعر نے انھیں اتنے احترام، اتنی محبت، اتنے دکھ کے ساتھ نہیں دیکھا کہ وہ تخلیق کا موضوع بنتے

جدید تنقید میں سماجی انسان کا بہت شور مچا ہوا ہے مگر اُردو میں کسی شاعر نے سماجی انسان پیش کیا ہے تو میر انیس نے۔ یہاں انسان اپنے بنیادی ماحول میں ہے باپ، بیٹا، بھائی، چچا، بھتیجا، ماموں، بھانجے، ماں، بیٹی، ساس، بہو، نند بھاوج، شوہر بیوی، دوست احباب....... یہ رشتے تجریدی اور سوچے سمجھے نہیں ہیں۔ میر انیس نے انھیں ذہن سے پیدا نہیں کیا ہے نہ جذبات سے۔ یہ تو میر انیس کی روح میں موجود ہیں۔"

ندا فاضلی کی شاعری میں خاندانی رشتے ہندستانی مزاج کی پوری رنگینی اور عصری انتشار کے اظہار کے ساتھ آتے ہیں، مگر اور رشتوں کے تصور کو آج کے کسی شاعر نے شاید ہی اس قدر شدت سے محسوس کیا ہو جس قدر ندا نے ہے

رخصت ہوتے وقت
اس نے کچھ نہیں کہا
لیکن ایرپورٹ پر اٹیچی کھولتے ہوئے
میں نے دیکھا
میرے کپڑوں کے نیچے
اس نے
اپنے دونوں بچوں کی تصویر چھپادی ہے
تعجب ہے
چھوٹی بہن ہوکر بھی
اس نے مجھے ماں کی طرح دُعا دی ہے

(رخصت ہوتے وقت)

میری ماں
ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے
اِدھر اُدھر سے مٹی لاکر
گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے
بے چاری کتنی ڈرتی ہے
میری ماں کتنی بھولی ہے
برسوں کی سیلی دیواریں
چھوٹے موٹے پیوندوں سے
آخر کب تک رُک پائیں گی
جب کوئی بادل
گرجے گا
ہر ہر کرتی ڈھے جائیں گی

(کچی دیواریں)

مہندی لگے ہاتھوں میں توے کی کالونچ
آنکھوں کے ہرن قید میں گھبراتے ہیں
رِستے ہوئے چھتے پہ نظر پڑتے ہی
چولی کے کئی ٹانکے اُدھڑ جاتے ہیں

میراجی ان نظموں کو پڑھتے تو یقیناً جھوم اُٹھتے۔ یہ نظمیں اساطیر اور تاریخ کو مس کیے بغیر ہماری معاشرتی زندگی کے ایسے رُخ پیش کرتی ہیں جو صدیوں سے ہماری زندگی کا خاصہ رہے ہیں جن سے ہماری سانسوں کا رشتہ ہے۔ مگر یہ تصویر ٹھہری ہوئی نہیں۔ آج یہ خاندانی ادارے جس قدر تناؤ اور دباؤ کا شکار ہیں۔ اس کا پورا احساس ندا فاضلی کو ہے اور اس کا پورا اظہار ان کی شاعری میں ہمیں ملتا ہے۔

کچے بخیوں کی طرح رشتے اُدھڑ جاتے ہیں
لوگ ملتے ہیں مگر مل کے بچھڑ جاتے ہیں

نہ جانے کون سے لمحے کی بد دعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

چراغ جلتے ہی بینائی بجھنے لگتی ہے
خود اپنے گھر میں ہی گھر کا نشاں نہیں ملتا

گھریلو رشتے، گھر آنگن، ہندستانی مزاج و موسم کا عکس ندا کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں مگر اس سے بھی اہم عنصر جو انھیں اپنے

نوع کے دوسرے شاعروں سے الگ کر دیتا ہے وہ ہے ان کی شاعری میں آج کے عہد کے انسان کی ذہنی کشمکش کا بھرپور اظہار۔ شاید وہ بھی اور بہت سے شاعروں کی طرح اپنے بنائے ہوئے دائروں میں محصور ہو جاتے مگر بمبئی شہر کی ہنگامہ خیز، پرآشوب زندگی نے انھیں ایک بڑے تجربے سے دوچار کیا۔ یہی سبب کہ رومانی نظموں سے اب وہ انسان کو درپیش ذہنی اور روحانی مسائل پر آ گئے۔ اپنے عہد کی حشر سامانی کو انھوں نے محسوس بھی کیا اور اس کا اظہار بھی کیا۔ اس تجربے نے انھیں اپنے معاصر شاعروں سے بھی مختلف کر دیا۔

ندا فاضلی کی شاعری آج کے ناقابلِ برداشت عہد میں ایک ذہین انسان کی اپنے پورے حواس و ادراک کے ساتھ زیست کرنے کی کوشش ہے۔ وہ منیر نیازی کی طرح فطرت کے اسرار کا شیدائی نہیں نہ وہ ناصر کاظمی کی طرح ماضی کے بسیروں میں جینے کا قائل ہے۔ بڑے شہروں کے مسائل، بے چہرگی، تنہائی کا احساس، مجلسی اخلاق اور ریاکاریاں، منافقتیں، سماجی تحفظات ـــ ان سب سے گھبرا کر وہ کوئی خیالی دنیا نہیں بساتا ؎

تمھاری شکایت بجا ہے
مگر تم سے پہلے بھی
دنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے
یہی کل بھی ہوگی
تمھیں بھی اسی اینٹ پتھر کی دنیا میں
پل پل بکھرنا ہے
جینا ہے
مرنا ہے

یہ مسلسل مکالمہ، جینے کی یہ کوشش آج کی شہری مجلسی زندگی کے تلخ حقائق سے ہمارا سامنا کرواتی ہے۔ ہم اس شاعری سے خود کو بہت قریب پاتے ہیں۔ یہی اس کی مقبولیت کا راز بھی ہے، اور اس کی انفرادیت کی پہچان بھی ؎

بچے کپڑے، ہلکا خلوص، پختہ مکان
ہر ایک جرم میں عزت حفاظتیں مانگے

شائستہ محفلوں کی فضاؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم

کسی سے خوش ہے، کسی سے خفا خفا سا ہے
وہ شہر میں ابھی شاید نیا نیا سا ہے

اوروں جیسے ہو کر بھی ہم باعزت ہیں بستی میں
کچھ لوگوں کا سیدھا پن ہے کچھ اپنی عیاری ہے

دنیا نہ جیت پاؤ تو ہارو نہ آپ کو
تھوڑی بہت تو ذہن میں ناراضگی رہے

بڑے شہروں کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے، اسے سمجھنا آسان نہیں پرانی اخلاقیات سے مہانگروں کی زندگی کو ناپنا غلط ہوگا۔ ہاروے کوکس (Harvey Cox) نے اپنی کتاب سیکولر سٹی (Secular city) میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ پادریوں نے فلک بوس عمارتوں والے ایک علاقے میں سروے کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسے علاقوں میں چونکہ لوگوں کے اپنے پڑوسیوں سے تعلقات کم یا برائے نام ہوتے ہیں، کوشش کی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہو سکیں۔ انھیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ لوگ خود ہی ایک دوسرے سے قریبی تعلقات قائم کرنے کے خواہش مند نہیں تھے۔ پہلے تو وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ یہ ایک مریضانہ صورت حال ہے۔ لیکن غور کرنے پر انھیں سمجھ میں آیا کہ شہروں میں بچاؤ کی خاطر یہ ہنر بھی لازمی ہے۔ شہر کے لوگ تعلقات بنانے میں خاصے محتاط ہوتے ہیں اور اپنی ضروریات اور مشاغل کے تحت ہی دوستیاں بناتے ہیں۔ اس کے لیے پڑوس میں رہنا ضروری نہیں اس طرح اپنے وقت اور توانائی کو اپنے حسبِ منشا صرف کرتے ہیں۔ شہر میں سینکڑوں آدمیوں سے ملنا ہوتا ہے بینک کلرک، کیشیر، دودھ لانے والا، صفائی کرنے والا۔ شہری آدمی کیشیر کو کیشیر کی حیثیت سے ہی جانتا ہے جبکہ گاؤں یا قصبے کا آدمی لوگوں کو ہمیشہ ان کے نام سے

پہچانتا ہے۔ شہر کا آدمی ہر شخص سے قریبی تعلقات قائم نہیں کر سکتا۔ قریبی تعلقات محض چند مخصوص لوگوں سے ہی ہوتے ہیں جن سے وہ ہم آہنگی محسوس کرتا ہے۔ ایک چھوٹے شہر یا قصبے میں لوگ ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہیں اور مزید جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ بڑے شہر کا آدمی پرائیوٹ اور پبلک امور میں فرق قائم رکھتا ہے۔ وہ دوسروں کے مسائل میں ٹانگ نہیں اڑاتا ہے، نہ دوسروں کی مداخلت پسند کرتا ہے۔ یہ آزادی اسے اپنے طور پر جینے کا موقع فراہم کرتی ہے بقول جین جیکبس (Jane Jacobs) شہر ایسے لوگوں سے بھرے پڑے ہیں، جن سے ایک حد تک رابطہ مفید یا دلچسپ ہے اور آپ کو اچھا لگتا ہے لیکن آپ انہیں اپنے بالوں میں پسند نہیں کرتے نہ وہ آپ کو اپنے بالوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ہر شخص سے ملنے جلنے لگیں تو زندگی آپ کے لیے وبال ہو جائے۔ شہری زندگی کا یہ رُخ جو باہر سے آئے ہوئے آدمی کو عجیب سا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ لوگ اسے دوہری زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں۔ اچھے بُرے دونوں پہلوؤں سے ندا کی شاعری میں نظر آتا ہے ؎

ملنے جلنے کا سلیقہ ہے ضروری ورنہ
آدمی چند ملاقاتوں میں مر جاتا ہے

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا کئی بار دیکھنا

وہ آدمی تھا کتنا بھلا کتنا پُر خلوص
اس سے بھی آج لیجیے ملاقات ہو گئی

تمام شہر میں ایسا نہیں خلوص نہ ہو
جہاں امید ہو اس کی وہاں نہیں ملتا

ضروری کیا ہے ہر اک محفل میں بیٹھیں
تکلف کی رواداری سے بچیے

اچھی نہیں ہے شہر کے رستوں کی دوستی
آنگن میں پھیل جائے نہ بازار دیکھنا

مل جُل کے بیٹھنے کی روایت نہیں رہی
راوی کے پاس کوئی حکایت نہیں رہی

ندا فاضلی کی شاعری میں ایک لفظ بار بار آیا ہے — سفر۔ اصرار اس بات پر ہے کہ ؎

اپنی تلاش، اپنی نظر، اپنا تجربہ
رستہ ہو چاہے صاف، بھٹک جانا چاہیے

ظاہر ہے یہ سفر ذہنی ہے، تصوراتی ہے ؎

کہاں ہر ایک کو آتی ہے راس بربادی
نئے سفر کی مسافت ذہانتیں مانگے

جن میں کھو جانے کا خدشہ تھا بہت
ہم نہ کھو پائے وہ میلے کھو گئے

ہر اک سفر کو ہے محفوظ راستوں کی تلاش
حفاظتوں کی روایت بدل سکو تو چلو

کیا اس سفر کی کوئی منزل بھی ہے؟ ؎

نکل آئے کدھر منزل کی دھن میں
یہاں تو راستہ ہی راستہ ہے

دو چار گام راہ کو ہموار دیکھنا
پھر ہر قدم پر اک نئی دیوار دیکھنا

یہ سوچ، یہ سفر ندا فاضلی کو کہاں لایا ہے ؎

یہ زندگی جو آج تمہارے
بدن کی چھوٹی بڑی نسوں میں مچل رہی ہے
تمہارے پیروں سے چل رہی ہے
تمہاری آواز میں

گلے سے نکل رہی ہے
تمھارے لفظوں میں ڈھل رہی ہے
یہ زندگی جانے کتنی صدیوں سے
یونہی چہرے بدل رہی ہے۔
بدلتے چہروں
بدلتے جسموں میں
چلتا پھرتا یہ شرارہ
جو اس گھڑی نام ہے تمھارا
اسی سے ساری چہل پہل ہے
اسی سے روشن ہے ہر نظارہ
ستارے توڑو
کہ گھر بساؤ
قلم اٹھاؤ
کہ سر جھکاؤ
تمھاری آنکھوں کی روشنی تک ہے کھیل سارا
یہ کھیل ہوگا نہیں دوبارہ

اس انکشاف میں کوئی بہت ندرت نہیں۔ ندرت بس اس انکشاف میں ہے کہ ندا کا اصرار ہے کہ چھوٹی بڑی ہر سچائی تک خود اپنے تجربے سے پہنچنا چاہیے۔ کتابی سچائی تو بس کتابی ہوتی ہے۔ انسان کے ظاہر و باطن میں اس سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ اتنی بڑی مذہبی، علمی اور فلسفیانہ کتابیں پڑھ کر بھی کورے کیوں رہتے؟

مشکل یہ ہے کہ آج ہماری سوچ ہمیں دور تک نہیں لے جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم دائروں میں سفر کر رہے ہوں۔ باطن کا سفر اکثر نرگسیت کی تاریک بھول بھلیوں میں پھنسا دیتا ہے۔ اور یہی علم بھی نہیں ہوتا۔ آج تحلیل نفسی ایک فیشن بن چکا ہے۔ بقول شخصے ہر امیر آدمی کا آج ایک سائیکو انالسٹ ہے۔ گزشتہ تیس برسوں سے اعترافی نظمیں (confessional Poems) زیادہ لکھی جا رہی ہیں۔ کرسٹوفر لیش کے خیال میں اعترافی فارم ایک ایمان دار ادیب کے لیے ہمارے عہد کے روحانی افلاس کا دہشت ناک بیان ہوتا ہے لیکن ایک سہل پسند ادیب کے لیے لبادۂ فرار۔ بے حیائی کا مظاہرہ بن جاتا ہے، خصوصاً فکشن میں جو افشا کے بجائے بہت کچھ چھپا جاتا ہے۔

نرگسیت آج کے دور کا خاص روگ ہے۔ تحلیل نفسی کے ماہرین کا کہنا ہے کہ آج جو مریض ان کے پاس آ رہے ہیں انھیں ہسٹریا، بار بار ہاتھ دھونا ایسی شکایتیں ہیں۔ یہ لوگ نرگسیت کا شکار ہیں، اپنی زندگی میں خالی پن محسوس کرتے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی کا فقدان ہے۔ لوگوں سے قریبی تعلقات نہیں قائم کر پاتے۔ نرگسیت کے شکار لوگ اس لیے تحلیل نفسی کے ماہرین کی نظروں میں آجاتے ہیں کہ یہ لوگ گورنمنٹ اداروں، بزنس کارپوریشنوں اور بعض تحریکات میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

ناولسٹ اور ڈرامہ نگار آج خود اپنی تخلیقات کے مصنوعی ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ بہت سے ادیب اپنی یادداشت کے تجزیے کے بجائے اعترافات کو زیادہ آسان سمجھتے ہیں۔ اس سے قاری کے تجسس کو کہ وہ مشہور لوگوں کے ذاتی معاملات اور نجی زندگی کے متعلق جانے، تسکین ملتی ہے۔ نارمن میلر اور ان کے مقلدین کی تحریروں میں جو مصنف کی اپنی خواہشات اور امنگوں کے تنقیدی تجزیے سے شروع ہوتی ہیں، اس بات کا اعتراف ہوتا ہے کہ وہ بہ طور ادبی شخصیت کے لافانی ہونے کا خواہش مند ہے۔ یہ تحریریں خود کلامی پر ختم ہوتی ہیں جو ان کے اپنے مشہور شخص celebrity ہونے کے بارے میں ہوتی ہے۔

ایک بار پبلک کی توجہ مل جائے تو ادیب کو سچے اعترافات کی نیا مارکیٹ مل جاتی ہے۔ ایریکا جونگ نے جنس پر مردوں کی طرح غیر جذباتی انداز میں لکھ کر مقبولیت حاصل کی اور اگلا ہی ناول ایک ایسی نوجوان عورت پر لکھ ڈالا جو ایک ناول لکھ کر مشہور ہو گئی ہے۔

ندا کی شاعری میں اس قسم کی نرگسیت نہیں ملتی لیکن ان کا شعری مواد اور لہجہ بار بار اس خطرے سے دوچار کرتا ہے۔ خود تنقیدی اور سہل پسندی کے بیچ ایک مہین خط ہے جس کا ہمیشہ خیال رکھنا مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ کبیر، سورداس، غالب اور ایسے دوسرے کئی شاعر ذہن کو ایک نوع کی آزاد خیالی سے روشناس کرواتے ہیں اور محدود فکر

کے دائروں سے رہائی حاصل کرنے میں مدد کرتے ہیں، لیکن آج کی اشیا پرستی کے دور میں زندگی کو زیادہ معنی خیز بنانا آسان نہیں۔ صوفی اور بھکتی شعرا بھی ایک حد سے آگے اس معاملے میں مددگار ثابت نہیں ہوتے۔ آج کا انسان ہر بات کا تجزیہ کرنا چاہتا ہے، اسے عقلی سطح پر پرکھنا چاہتا ہے، اس کے بعد ہی وہ کسی بات کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے جبکہ زندگی بڑی پراسرار شے ہے۔ ہر تجزیہ ادھورا اور نامکمل ثابت ہوتا ہے اور انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ سمندر سے وہ چلو بھر ہی لے پایا ہے دوسری طرح اشیا سے زیادہ سے زیادہ لگاؤ اس کی زندگی کو کوئی معنی نہیں دے پاتا۔ بلکہ انسانوں کو بھی وہ اشیا کی طرح استعمال کرنے لگتا ہے اور انسانوں سے بامعنی اور جان دار تعلقات کے بغیر زندگی اپنے مفاہیم کھو دیتی ہے۔ آج کا انسان دوسرے انسان سے معنی خیز اور بے حد قریبی تعلق قائم نہیں کرتا، وہ ایک فاصلہ باقی رکھتا ہے اور جب اس فاصلے کو کم ہوتے دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے چاہے وہ تعلق دوستی کا ہو یا کسی عورت سے عشق یا لگاؤ کا ہو۔ دیوانگی میں بھی وہ اپنے ہوش و حواس باقی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ وابستگی (commitment) سے گھبراتا ہے۔ کسی عورت سے بھی وہ عشق کرتا ہے تو تعلق کی سطح اس قسم کی رکھتا ہے کہ کسی بھی وقت الگ ہو سکے۔ وابستگی اور قربت Intimacy کے بغیر زندگی زیادہ دل چسپ اور معنی خیز نہیں ہوتی۔ اور ایک خلا، ایک تشنگی سی محسوس ہوتی ہے جسے انسان مسلسل اشتہاری غذاؤں، فلموں، دواؤں اور موسیقی، جنس اور ٹی۔وی۔ پروگراموں کے مسلسل ہیجان سے پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن نہ خلا بھرتا ہے نہ تشنگی دُور ہوتی ہے۔ بار بار وہ بورڈم کا شکار ہو جاتا ہے۔

چار چھ دن میں
میری آنکھوں نے
پی لیا اس کے پورے چہرے کو
وہ بھی ممکن ہے میرے چہرے کو
اپنی آنکھوں سے پی چکا ہوگا
وہ بھی بے چہرہ
میں بھی بے چہرہ

صرف آنکھوں کے خول باقی ہیں
جن کے اندر دھنسی ہوئی آنکھیں
بس یونہی چند بار دیکھیں گی
اور پھر رفتہ رفتہ
کچھ دن میں
یہ بھی اک دوسرے کو پی لیں گی

——— (گھستے ہوئے رشتے)

یہ ایک دوسرے کو پی لینے کا المیہ آج کی کنزیومر سوسائٹی کا المیہ ہے جہاں دوستی، محبت، وفاداری ہر چیز ایک بے جان شے کی طرح استعمال ہوتی ہے اور اغراض کا شکار ہو جاتی ہے ؎

محبت میں وفاداری سے بچیے
جہاں تک ہو اداکاری سے بچیے
ہر اک صورت بھلی لگتی ہے کچھ دن
لہو کی شعبدہ کاری سے بچیے

صوفی یا یوگی انسانوں سے کنارہ کش ہو کر خدا تک پہونچنے کی کوشش کرتے تھے۔ آج کا انسان محض مجرد سوچ کے ذریعہ منزل پا لینا چاہتا ہے اسلیے زندگی اس کے لیے بس سرابوں کا سفر ہے ؎

زندگی جاگی ہوئی آنکھوں کا رنگین فریب
جو بھی گزرا وہ سرابوں کے سفر سے گزرا

ندا فاضلی کا یہ سفر انھیں اس نتیجے تک تو لے آیا۔ لیکن فطری بے اطمینانی اب انھیں مسٹی سی زم (Mysticism) کی طرف لے آئی ہے۔ فطرت سے قریب ہونے، کائنات سے جڑ جانے کی خواہش کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے منبع کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ ان کا دائرہ مکمل ہوا یا اب وہ بھکتی شعرا کو پہلے سے بہتر سمجھ پا رہے ہیں اور آج کی پیچیدہ زندگی میں اس کی معنویت کو پہلے سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ آج کا انسان جو موناڈ (monads) کی مانند الگ تھلگ محسوس کرتا ہے اس تضاد کو کیسے دور کر پائے گا؟

ندا فاضلی کے یہاں مسلسل سفر کا احساس ہوتا ہے، جب انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ ٹھہر سے گئے ہیں تو وہ پھر نئی منزلوں کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

عامر ریاض
۶۴-۱۰ ایم ایم آئی جی
اسٹیٹ بنک کالونی
سیتاپور روڈ اسکیم سیکٹر اے
لکھنؤ

بکھرنے سے پہلے

یہ نرم نرم لحافوں سی شبنمی راتیں
لرزتے چاند ستاروں کی ان کہی باتیں
سبک خرام ہواؤں کی سحر آہٹ سی
یہ جگنوؤں کی درختوں پہ جھلملاہٹ سی
کلی کلی سے نئی خوشبوئیں چراتی ہوئی
صبا چمن سے گزرتی ہے گنگناتی ہوئی
مہکتے پھول کھلے چاندنی میں دھوئے ہوئے
قریب و دور مناظر ہیں جیسے سوئے ہوئے
وہ سرخوشی ہے نگاہوں میں خواب روشن ہیں
فصیلِ دل پہ کئی ماہتاب روشن ہیں
زمیں کے حسن کی تاروں میں بات ہوتی ہے
لٹیں بکھیرے ہوئے کائنات سوتی ہے
مگر فضاؤں پہ بوجھل سکوت طاری ہے
کنارِ عرش سے کیسا دھواں سا جاری ہے
یہ ہولناک ہیولے کہاں سے آتے ہیں
افق پہ کیسی سیاہی کے ابر چھاتے ہیں
یہ کیسا شور اٹھا سرپھری ہواؤں میں
یہ کس نے ڈھانپ دیا چاند کو گھٹاؤں میں
یہ رفتہ رفتہ اندھیروں میں ڈوبتے تارے
جبینِ سحر کے آثار مٹ گئے سارے
ہوا کی زد پہ کھلا ضبطِ غم کا دروازہ
بکھر نہ جائے کتابِ نفس کا شیرازہ
میں اس سے پہلے اسے زینتِ قلم کر لوں
کہ داستانِ شکستِ ضیا رقم کر لوں
کبھی جو ظلمتِ شب کا خمار اترے گا
اسی افق سے نیا آفتاب نکلے گا
کرن کرن پہ عیاں ہوگا یہ بکھرتے ہوئے
کہ ہم سے پہلے اندھیروں سے جنگ کرتے ہوئے
چراغ کتنے بجھے روشنی پہ مرتے ہوئے

نیّر تلہری
نت گنج۔ قصبہ تلہر
شاہجہاں پور

ایک آواز

وہ ایک آواز
جس نے صحرا کو
گلِ بداماں بنا دیا تھا
پکارتی ہے
وہ آج اپنے ہی بھائیوں کو
بلا رہی ہے
کہ آؤ دیکھو
تمہاری نااتفاقیوں کے
سبب سے یہ دن بھی آ گیا ہے
کہ میرا سینہ
لہولہو ہے!

طنز و مزاح

اچھی صحت بھی کیا بری شے ہے

اظہر مسعود
معرفت یوپی اُردو اکیڈمی
قیصر باغ ۔ لکھنؤ

جب عمر کی پچاس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی میری صحت میں خزاں کے آثار نظر نہیں آئے تو بیگم کو سخت تشویش لاحق ہوئی اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب انھوں نے کچھ اس قسم کے سوالات مجھ سے کرنا شروع کیے :

" دن بھر کام کر کے آ رہے ہو، کتنے تھک گئے ہوگے ؟"

" ساری رات سونے کے باوجود صبح کتنی سستی محسوس ہوتی ہوگی ۔ ؟"

" میں جانتی ہوں ۔ ناشتے میں چار انڈے، پچاس گرام مکھن، آدھا لیٹر دودھ تم عادتاً استعمال کرتے ہو، بھوک کیا لگتی ہوگی، ہے نا ؟"

" بچوں کے ساتھ کرکٹ، بیڈمنٹن کھیل لیتے ہو ۔۔۔ کبھی کبھی ریس بھی لگا لیتے ہو اور جیتنے بھی تمھیں ہو ۔ ؟ یہ سب بچوں کی خاطر ۔۔ تمھارے ہاتھ پیر ہی جانتے ہوں گے ؟"

ان سارے سوالوں کا جواب نفی میں پاکر بیگم متوحش ہو جاتیں ۔ حتیٰ کہ اب صحت مندی کے اس احساس کو وہ میری از کار رفتگی پر محمول سمجھنے لگی ہیں ۔ ایک دن ان سے نہیں رہا گیا ۔۔۔ میں دفتر سے اسی وقت آیا تھا ۔ کپڑے تبدیل کرنے کو سوچا ہی تھا کہ غسل خانے سے آواز آئی ۔

" یہ آپ ہیں ۔ ؟"

میں نے جواب دیا ۔ " ہاں "

بولیں : " کپڑے نہ بدلیے گا، میں نکل رہی ہوں "

میں نے کہا : " میں بالکل ٹھیک ہوں ۔۔ کپڑے تبدیل کرنے میں مجھے ذرا بھی زحمت نہیں ہوگی ! "

وہ بولیں " ارے بھئی ڈاکٹر کانگڑای کے یہاں نہیں چلنا ہے ؟"

میں نے کہا " کیوں بابا ۔۔ کس کے پینچ ڈھیلے ہوگئے ہیں "

" کمال ہے ! رات ہی کی بات بھول گئے ؟"

" بالکل نہیں ۔۔ اچھی طرح یاد ہے ۔۔ تم نے آدھی رات کو جگا کر منّی کے یونیفارم پر مجھ سے استری کرائی تھی ۔"

" وہ بات نہیں ۔"

" تو پھر چھٹکے کو پیشاب کرانے والی بات ؟"

" وہ بھی نہیں ۔۔۔ ڈاکٹر کانگڑای والی بات ۔"

" او، ہاں ۔۔ تم نے بتایا تھا کہ بہت مشہور ڈاکٹر ہیں ۔۔۔ دماغی امراض کے علاج کی ڈگری لینے ٹمبکٹو گئے تھے ۔۔ اور یہ بھی یاد آیا کہ میں نے کہا تھا کہ اپنا ملک چھوڑ کر یہ ڈگری لینے جو ٹمبکٹو جائے سب سے پہلے اس کو خود اپنا علاج کرنا چاہیے ۔"

" ہاں، ہاں وہی ! "

" اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ کسی کو اپنا دیوالہ نکلوانا ہو تو ڈاکٹر کانگڑای کو دکھائے ۔"

" انھیں کے یہاں چلنا ہے ۔" میری ان سنی کرتے ہوئے بولیں ۔

" مگر کیوں ؟"

" تمھیں دکھانے ! "

"ہائیں، ہائیں!" میں نے کہا۔ "تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ مجھے کیا ہوا ہے۔؟"

"مجھے کیا ہوا ہے؟ مجھے کیا ہوا ہے؟" بیگم جھلّا کر بولیں میں تو عاجز آگئی ہوں اس سوال سے — پچھلے سال میں نے ہا مکمل چیک اَپ کرالو، تو تم نے یہی سوال کرکے میری بات ٹال ا — چھ مہینے پہلے پیشاب پاخانہ ٹسٹ کرانے کو کہا تو بھی سُنی ن سُنی کردی — تین مہینے سے کہہ رہی ہوں کہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر مکمل آرام کرڈالو اور تم ہو کہ مُرغے کی وہی ایک ٹانگ — مجھے کیا ہوا ہے 'مجھے کیا ہوا ہے؟"

غسل خانے کا دروازہ آنِ واحد میں کیمرے کے شٹر کی طرح ُلا اور بیگم بالوں کو جھٹکتی، پیروں کو پٹکتی باہر نکل کر بولیں:

"میں بتائے دیتی ہوں — اگر آج بھی تم نے وہی سوال کیا ،چھا نہیں ہوگا۔!"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے"۔ میں نے بیگم کے بالوں سے ـنے والی بے ہنگام بارش سے خود کو بچاتے ہوئے کہا۔ آج ا وہ سوال نہیں کروں گا بلکہ نہایت سیدھے سادے انداز میں ُوں گا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے"۔

میرے اس وار سے دفاع کی کوئی فوری ترکیب بیگم کے ذہن میں نہیں آئی تو اپنے غصّے پر مسکراہٹ کا لیپ لگاتے ہوئے ـنے لگیں:

"آخر تم سمجھتے کیوں نہیں — تمھارے چیک اَپ کرانے سے ِ کتنا فائدہ ہوگا — کبھی یہ بھی سوچا تم نے۔؟"

"بہت سوچا، مگر آج تک میرے دل سے اس سوال کا کوئی ِافی جواب نہیں ملا"۔

"وہ مل بھی نہیں سکتا"۔ بیگم نے چائے کا پانی چولھے پر چڑھاتے ُے نرمی سے کہا۔ "تم مرد لوگ عورتوں کو خودغرض سمجھتے ہو نا! ی لیے ہماری ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھتے ہو۔"

"تمھیں بتاؤں"۔ میں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے ہا۔ "جب میں ہر طرح سے اپنے آپ کو فِٹ محسوس کرتا ہوں تو ڈاکٹر کے یہاں جاکر خواہ مخواہ وقت اور پیسہ کیوں برباد کروں؟"

"خیر چھوڑو — تمھیں یاد ہے کہ پرسوں آدھی رات تک تم نے مجھے لکچر دیا تھا کہ جو دکھائی دیتا ہے وہ دراصل ہے نہیں اور جو ہے وہ، ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔؟" بیگم نے ٹائی کو دوبارہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یاد ہے"۔ میں نے جوتے کی ڈوری کھولتے ہوئے جواب دیا — "اور یہ بھی یاد ہے کہ تمھارے خراٹوں کی بدولت میری بات ادھوری ہی رہ گئی تھی"۔

میں نے آخری جملہ طنزیہ لہجے میں ادا کیا تھا مگر سابق کی طرح اس جملے کی بھی وہی دُرگت ہوئی جو پہلے سے ہوتی چلی آئی تھی — مجھے اس بات کی حسرت تھی کہ کبھی تو بیگم میرے طنز کی کڑواہٹ کا احساس کریں۔

"تمھیں اپنی صحت ٹھیک معلوم ہوتی ہے؟" بیگم نے جوتے کی ڈوری باندھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں — بالکل ٹھیک۔!" میں نے جواب دیا۔

"تو بس اپنے ہی قول کے مطابق فیصلہ کرلو۔ جو نظر آتا ہے وہ دراصل ہے نہیں اور جو ہے وہ نظر نہیں آرہا ہے"۔ بیگم نے چائے سے زیادہ اپنی مسکراہٹ میں شکر گھولتے ہوئے کہا۔

میں اپنے آپ کو قربانی کے اس بکرے کی طرح محسوس کررہا تھا جس کے ہاتھ میں چھری دے کر کہا جائے کہ لے بیٹا، پھیر لے اپنی گردن پر۔

"بیگم! ڈاکٹر کا نگڑی کی فیس کا بار میری تنخواہ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں تو برداشت نہیں کرسکتی۔ یہ آخری ہفتہ — آخر بھئی — کوئی حد ہوتی ہے — یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے — اچھا پہلی آجانے دو — دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ سنا ہے ڈاکٹر کا نگڑی ادھار بھی نہیں کرتا — اچھا تو — خیر میں نہیں جاؤں گا — ناک تھوڑی کٹانا ہے وہاں جاکر"۔ اس دفعہ بیگم نے کچھ ایسا وار کیا تھا کہ کوئی صورت اسے خالی دینے کی نہیں پڑ رہی تھی۔

"لو یہ چائے پی لو — بسکٹ بھی لوگے؟ مگر نہیں۔

ڈاکٹر کے یہاں خالی پیٹ چلنا ہی مناسب رہے گا۔" بیگم نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کے نیچے سے بسکٹوں کی پلیٹ سرکاتے ہوئے کہا۔ "اور رہی بات فیس کی، تو وہ میں ادا کر دوں گی۔" اتنا کہہ کر انھوں نے پرس نکالا اور ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سو سو کے کئی نوٹ میز پر بکھیر دیئے۔ اور اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا وہ بولیں:

"منّی نے STUPID کا انگریزی مترادف پوچھا تھا اس کے لیے ڈکشنری کھولنا پڑی تھی ۔۔۔!"

انگریزی میڈیم میں تعلیم دلانے کا سب سے بُرا پہلو میرے سامنے تھا۔ میں نے جھلا کر کہا:

"آخر مُنّی کو انگریزی میڈیم سے پڑھوانے کی کیا ضرورت تھی ۔۔۔؟"

بیگم اس سوال کی شانِ نزول سے اچھی طرح واقف تھیں اس لیے انھوں نے جواب دے کر فضول وقت برباد کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

ڈاکٹر کانگڑی اپنے بارے میں نہایت اچھی رائے رکھتے تھے مجھ سے دو چار رسمی سے سوالات کرنے کے بعد انھوں نے اپنے خاندان کا بڑی شرح و بسط کے ساتھ تذکرہ کیا اور اپنے ساتھ اپنے اجداد کی حیات کے ایسے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جنھیں شرفا ر عام حالات میں تاریکی ہی میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ جب ہم ڈاکٹر کانگڑی کے یہاں سے اُٹھے تو ان کی نہایت ذاتی قسم کی نفسیات کے علاوہ ان کے باپ دادا یہاں تک کہ پردادا (جن کا نام انھیں یاد نہیں تھا) تک کی نفسیات کے بارے میں معلومات سے لبریز تھے۔

سارا دن دفتر میں کام کرنے کی تھکن، خالی پیٹ، اوپر سے ڈاکٹر کانگڑی کی بسیط و عریض گفتگو ۔۔۔ گھر پہونچ کر جوتا تک اتارنے کا جی نہیں چاہا۔ یونہی چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ میرا ڈھلا ہوا منکا دیکھ کر بیگم لپک کر آئیں اور لہک کر پوچھا:

"کیسی طبیعت ہے؟"

"کچھ نہ پوچھو ۔۔۔ سر پھٹا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"کچھ کھانے کو لاؤں؟" انھوں نے سوال کیا۔

"نا بابا ۔۔۔ بھوک ووک کچھ نہیں لگ رہی ہے ۔۔۔ بس ایک تکیہ دے دو تو میں سو جاؤں۔"

"ارے ۔۔۔ تم کو تو بخار بھی ہے!!" میرا ماتھا چھو کر مارے خوشی کے وہ چیخ پڑیں۔ "دیکھا ۔۔۔ میں نہ کہتی تھی ۔۔۔ ڈاکٹر کانگڑی کو دکھا لو، بہت فائدہ ہوگا۔!!!"

□□

اقبال انصاری

۵۳/۱۴/۱۱۔ نیا گاؤں ویسٹ
امین آباد لکھنؤ

غزل

الجھن گھٹن، ہراس کو دل سے نکال کے
دیکھیں گے ایک روز سمندر کھنگال کے

روٹی کے چند ٹکڑوں کو پانے کے واسطے
بچّے دکھا رہے ہیں تماشے کمال کے

جو تلخیٔ حیات سے واقف نہیں ہوئے
وہ کیا جواب دیں گے ہمارے سوال کے

نیلام ہو رہی ہیں اب اُس کی حویلیاں
دیکھے نہیں تھے جس نے کبھی دن زوال کے

اقبالؔ ایسے دور میں کس کی تلاش ہے
ملتے نہیں ہیں لوگ یہاں اک خیال کے

غزلیں

حباب ہاشمی
معرفت ڈپارٹمنٹل اگزامینیشنز اتر پردیش
الہ آباد

وہی ہے مالکِ کُل وہ جزا سزا دیگا
یہاں فقیر ہیں سب کوئی کس کو کیا دیگا

اَزل سے لے کے اَبد تک بڑی مسافت ہے
صعوبتوں میں بھلا کوئی ساتھ کیا دیگا

ہمارے نام سے اُس کو عجیب نسبت ہے
کبھی زمیں پہ لکھے گا، کبھی مٹا دیگا

ہمارا عزم ہی ہم کو عصائے موسیٰ ہے
جو چل پڑے ہیں تو دریا بھی راستہ دیگا

یہ اور بات وہ مجھ سے بہت گریزاں ہے
پہ جب ملے گا محبت کا واسطہ دیگا

حبابؔ لوحِ جہاں پر ہمارا نام بھی ہے
وہ کیسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیگا

ڈاکٹر سجاد سید
سی ۲- گل مہر ایونیو، جامعہ نگر - اوکھلا
نئی دہلی

جب طائرِ خیال کو شہپر نہیں ملا
میرے تصوّرات کو پیکر نہیں ملا

یوں تو ہزار ناقد و ناصح ملے مگر
کوئی مجھے ضمیر سے بہتر نہیں ملا

وہ بھی اُچھالتا مرے سر کی طرف ضرور
شاید اسے ابھی کوئی پتھر نہیں ملا

تھی مصلحت اسی میں مگر پھر بھی وہ فقیر
اربابِ وقت سے کبھی جھک کر نہیں ملا

میں اس کے پاس تھا وہ مجھے ڈھونڈتا رہا
وہ میرے پاس بھی مجھے اکثر نہیں ملا

کچھ حسرتوں کو دل میں لیے جا رہا ہوں میں
ہر آرزو کو حسنِ مقدّر نہیں ملا

عشرت صدّیقی فیض آبادی
ممتاز ڈگری کالج،
لکھنؤ

لوگ اب عشق کے اس دَور میں آئے ہوں گے
آہٹیں غم کی جہاں دَرد کے سائے ہوں گے

ہم نے ہر خواب کو اک تلخ حقیقت سمجھا
لوگ تو خوابوں کو آنکھوں میں سجائے ہوں گے

کوئی بھی ریت کی دیوار بنا سکتا ہے
یوں محل تم نے بھی سو بار بنائے ہوں گے

ہم وہ شاعر ہیں جو بیتی ہے وہی لکھا ہے
ہم نے ہر ساز پہ نغمات سُنائے ہوں گے

اس کو لے ڈوبا انھیں شمعوں کے بجھنے کا دھُواں
جس نے ہر شام نئے دیپ جلائے ہوں گے

اس کو ساحل ہی سے ٹکرانا ہے اک دن عشرتؔ
لوگ جس کشتی کو طوفاں سے بچائے ہوں گے

افسانہ

شاہد مسیح الزماں

فراموش

اس کہانی کے سارے کردار فرضی ہیں۔ میں، میرا بیٹا میری بیوی ـــــ یہ بڑے سے کچے صحن والا میرا بوسیدہ مکان، یہ ٹوٹا دروازہ، یہ کونے میں بندھی لاغر سیاہ بکری ـــ سب فرضی ہیں۔ اصل کیا ہے مجھے یاد نہیں۔ کیوں کہ میں ایک بہت بوڑھا آدمی ہوں میری یادداشت اب جواب دے چکی ہے۔ میرا گزارہ کیسے ہوتا ہے مجھے یہ بھی پتہ نہیں۔ مجھے سانس لیتے کتنے سال گزر گئے، مجھے اندازہ نہیں۔ میں کبھی جوان تھا۔ ذہن پر بہت زور دینے پر بھی مجھے کوئی واقعہ اب یاد نہیں آتا جس سے مجھے اپنے کبھی جوان ہونے کا احساس ہو۔ بچپن کہاں بیتا۔ میرے والد کون تھے، کیسے تھے میری ماں کیسی تھیں، مجھے کچھ یاد نہیں۔ ماضی کی یادوں میں بس ایک لمحہ رہ رہ کر اُبھرتا ہے۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ، بالکل بے جان ایک جھٹکا، پھر کئی جھٹکے۔ پورا ڈھانچہ ہل گیا اور پھر زمین پر ایک بڑا سا سُرخ پھول بن گیا۔ جو دھیرے دھیرے ایک طرف لمبا ہوتا گیا۔ میں خوش ہوکر تالی بجانے لگا۔ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور پھر رونے کے شور سے ایکدم سہم گیا۔ اتنا کر رو بھی نہیں سکا ـــ بس، اتنا ہی۔ اور کچھ نہیں۔ وہ کمزور لاغر جسم کس کا تھا میرے باپ کا، دادا کا، نانا کا یا کسی پڑوسی کا۔ اس کہانی کے سارے کردار فرضی ہیں۔ میں بھی ـــــ

بس یہ واقعہ سچا ہے۔ اس لیے کہ صدیوں سے جسم ڈھانچے ہو رہے ہیں۔ نئے جسموں کو جگہ دینے کے لیے جب تک کہ یہ بھی ڈھانچہ نہ ہو جائیں۔ سورج نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے۔ مجھے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ روشنی اور اندھیرے میں کوئی فرق نہیں لگتا۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ بس اپنے ماضی سے بھاگ آیا ہوں ـــ میری زندگی کا یہی سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

میرا باپ اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کی عقل جواب دے چکی ہے۔ کبھی کبھی کیا، اکثر وہ مجھے نہیں پہچانتا۔ رات میں جب میں کسی کام سے اٹھتا ہوں تو مجھے میری بہن کے ہی نام سے پکارتا ہے۔ وہ بہن جو میری پیدائش سے پندرہ سال پہلے اس بڑے صحن کے جنوبی کونے میں بنے کنویں میں گر گئی تھی۔

ماں نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ مگر لوگوں سے سنا ہے کہ وہ اس وقت کوئی ساڑھے تین یا چار سال کی تھی۔ میں نے تو وہ کنواں بھی نہیں دیکھا۔ بس صحن کے جنوبی کونے میں ایک چبوترا ہی دیکھ رہا ہوں۔ جب سے ہوش سنبھالا۔ میرے باپ کی یہ حالت ہمیشہ سے نہیں تھی۔ وہ بہت سمجھدار، بہت سوجھ بوجھ کا مگر خاموش طبیعت کا حامل تھا۔ قصبے کے سبھی لوگ اس سے معاملات میں مشورہ کرنے آتے تھے اور اسے عزت دیتے تھے۔ مگر اس وقت بھی جب میں کسی کام سے رات میں اٹھتا تو مجھے وہ میری اس بہن ہی کے نام سے پکارتا اور کہتا۔

"دیکھو کنویں کی طرف مت جانا"

میرا باپ بہت غریب ہے۔ ہمارے گھر میں انسان کی بنیادی ضروریات کی بھی چیزیں نہیں ہیں۔ صرف دو عدد پلنگ جن کی بُنائی عرصہ پہلے اپنی مدّت ختم کر چکی ہے مگر پھر بھی کسی نہ کسی صورت سے جوڑ گانٹھ کر استعمال کے قابل رکھی گئی ہے۔ برتنوں کے نام پر بھی معمولی

دعات کے بدرنگ ٹوٹے ہوئے ٹیڑھے، بدشکل برتن بچے ہیں۔ میری کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ جب کوئی کام لگ گیا پیسے مل گئے۔ مستقل روزگار کا تصوّر ہی نہ کر سکا۔

میری ماں زیادہ تر خاموش رہتی ہے۔ پڑوس کے لوگ میری ماں کی بہت عزت کرتے ہیں اور اس کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ کس طرح، یہ میں نے جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ لیکن اکثر انھیں نئے کپڑوں میں دیکھتا ہوں جو میں نے نہیں بنوائے۔ لیکن میرے ماں باپ کی یہ حالت ہمیشہ نہیں تھی۔ لوگ بتاتے ہیں کہ ان کا بہت اچھا کاروبار تھا جو میرے دادا سے انھیں ملا تھا۔ جائداد تھی، عزت تھی، سرداروں میں شمار تھا۔ یہ میں نے سنا ہی ہے دوسروں کی زبانی، میرے باپ کو تو کچھ بھی یاد نہیں، اور میری ماں زیادہ تر خاموش رہتی ہے۔ سنا ہے کہ قریبی دوستوں نے ان کا اعتماد حاصل کر کے حالات کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور شدید دھوکا دیا۔ ان میں کچھ بہت قریبی عزیز بھی تھے سنی جوئی باتوں سے میں جھنجھلا جاتا اور غصّے میں بے تکی باتیں کرنے لگتا۔ غصّہ شاید اپنی کم ہمتی پر زیادہ آتا، جو دوسروں پر اترتا۔ وہ بھی بس ماں کے سامنے۔

"نہیں بیٹے! کسی کو الزام مت دو۔ عزّت دینے والا، ذلّت دینے والا ایک ہی ہے۔ یہ باتیں مت سوچو۔"

"مگر ماں۔"

"نہیں بیٹے! بس جو ہے اسے قبول کرو۔"

اور اس طرح مجھے کبھی کچھ بھی نہ معلوم ہو سکا۔ سوا اس کے کہ کچھ قریبی دوستوں اور چند عزیزوں نے دھوکا دیا۔

کافی روز پہلے ایک دن اچانک میرے باپ نے بہکی باتیں شروع کر دیں۔

"مگر یہ تو ایک دستور سا چلا آرہا ہے۔ دھوکا تو اپنے اعتماد والوں سے ہی ہوتا ہے۔ غیروں کو اتنی فرصت کہاں۔ وہ اپنے اپنوں کو دھوکا دینے میں لگے رہتے ہیں۔ یہ دھوکا تو ہمارا خاندانی وصف بن چکا ہے۔"

میں نے سوچا کہ شاید آج صحیح حالات کا علم ہو جائے۔ مگر وہ پھر بہک گئے، اور نہ معلوم کہاں کی بات کرنے لگے۔

"ابھی کتنے روز کی بات ہے جس کی عزّت اور دوستی کی قسم کھانے ایک آواز ہو کر اٹھارہ ہزار دھن حرکت میں آئے ہوں، جیسے اپنی نجات کا ذریعہ بنانے کا تہیہ کیا ہو۔ آج کتنے پہر گزرے، جو وہ سڑکوں اور سنسان گلیوں میں، ایک شب کی پناہ کے لیے مارا مارا گھوم رہا ہے۔ یہ دوستوں کی بستی آج اجنبی ویرانہ کیسے ہو گئی۔ اور جب سر کے ساتھ پتھر کے زخموں سے چور بدن بلندی سے گرا تو ان اٹھارہ دونا چھتیس ہزار ہاتھوں میں سے کسی ہاتھ میں اتنی قوت نہ بچی کہ خون آلودہ مٹی کو زمین کے دامن میں حرکت دے سکے۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو انسانیت کو حیوانیت سے نجات دلانے کا دعوا رکھتے ہیں۔ اتنے شکستہ ارادے۔ میں یہاں خود نہیں آیا۔ مجھے تم نے اور تم نے اور تم نے بار بار بلایا۔ مجھ سے دارالامارہ میں قیام کرنے کی پیش کش کی۔ مگر میں تمھاری دوستی کے سہارے آیا تھا۔ مجھے امیروں سے کیا کام۔ اور آج انھیں امیروں کے ہاتھوں بک گئے۔ میں تمھارے اعتماد پر تھا۔ شکر ہے کہ تم نے اس اعتماد کو مجروح کر کے روایت کو قائم رکھا۔"

اور میں اکتا کر اٹھ گیا۔ آج پہلی بار میرا باپ اتنا بول رہا ہے میں نے سوچا کہ شاید اس کی بڑبڑاہٹ سے مجھے واقعات کا علم ہو سکے۔ مگر وہ تو نہ معلوم کیا اڑا رہا ہے، جس کا نہ سر ہے نہ پیر۔

میرا بیٹا کتنا دبلا اور کمزور ہو گیا ہے۔ چہرے پر جھرّیاں، بال بھی کتنے کم رہ گئے ہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ کتنا جی چاہتا ہے گھر میں بہو آئے مگر یہ بھی کوئی گھر ہے۔ بوسیدہ اینٹوں کا گرتا ہوا ڈھانچہ۔ پچھلے سال ادھر والان کی چھت اتار دی کہ گر نہ جائے۔ پچھواڑے کی کوٹھری کے بس آثار رہ گئے ہیں۔ یہ تو اپنے حواس ہی کھو چکے ہیں۔ ان کی بھی کیا خطا ہے۔ وقت کے امتحان کچھ زیادہ سخت ہو گئے۔ زندہ ہیں یہی عجیب لگتا ہے۔

کتنی پیاری، نازک سی گڑیا تھی۔ گول گول معصوم آنکھیں، چھوٹے چھوٹے ہونٹ۔ ہاتھ اتنے نازک اور نرم کہ لگتا تھا کہ چھونے سے ٹوٹ جائیں گے۔ الجھے الجھے سیاہ بالوں کے گچھّے — یہ کہتے تھے انھیں

سلجھاؤ مت۔ یونہی جھبری جھبری اچھی لگتی ہے۔

پہلے تو انھیں اپنے کاروبار سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی، نہ کمانے کا وقت نہ مجھ سے بات کرنے کا وقت۔ پر اب دن میں کتنے چکر لگا ڈالتے ہیں۔ آتے ہی اس کو نگاہیں تلاش کرنے لگتی ہیں۔ گھر پر ایک لمحہ بھی اسے نظر سے دور نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر جب اسے موذی بیماری نے گھیرا تو کاروبار ہی کیا اپنے وجود کا ہی ہوش نہ رہا۔ کھانا پینا سونا سب غائب۔ دن رات علاج، دُعائیں، رونا، توبہ کرنا۔ چھتیس گھنٹے تک پلک سے پلک نہ لگی۔ چہرے پر دیوانگی کے آثار چھا گئے بس بیٹھے صورت دیکھ رہے ہیں اور صحت یاب ہونے کے بعد تو لگتا تھا کہ اس کے پیروں کی گرد دامن میں سمیٹ لیں گے۔ اور اسے بھی تو ان کے بنا چین نہ تھا۔ اتنی فرمائشیں، اتنے نخرے، مگر اس کی کوئی بات زیادہ نہیں تھی، کوئی فرمائش بے تکی نہیں تھی۔ غلط موسموں میں غلط پھلوں کی فرمائش۔ خود پریشان ہیں، لوگ پریشان ہیں۔ بے موسم کا پھل ڈھونڈنے میں۔

"آپ اسے بالکل تباہ کر رہے ہیں۔ آخر کس گھر میں گزارا ہو پائے گا ان نخروں کے ساتھ۔"

اور یہ ہنستے ہنستے اک دم سنجیدہ ہو جاتے جیسے اس کی جدائی کا تصوّر نہ کر پا رہے ہوں۔ کاروبار دھیرے دھیرے بہت معتبر ساتھیوں کے حوالے ہوتا گیا۔ جن میں کچھ قریبی عزیز بھی تھے۔ یہ گڑیاں کھیلتے رہے گھوڑا بنے سارے گھر میں بھاگتے رہے۔ جھولا جھلاتے رہے۔ خود جھولتے رہے۔ ہر روز نئے کھلونے، نئے کھیل اور کاروبار اِن معتبر دوستوں اور عزیزوں کے حوالے کر کے مطمئن رہے۔ بہت پرانا ساتھ تھا۔ بچپن سے ہی ایک دوسرے کے اچھے بُرے میں شریک رہے کبھی غیر ہونے کا تصور ہی نہ ہو سکا۔ سب کی سب چیزیں، مسائل الجھنیں، خوشیاں — سب مشترک تھیں۔ اب جو آتا ایک نیا کھلونا لیے ہوئے۔ بیٹی کی خیریت دریافت کرتا اور چلتے وقت کاروبار میں کچھ گھاٹے کے امکان کا اشارہ کر دیتا۔

"مگر یار فکر مت کرنا — ہم دیکھ رہے ہیں — سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

شام کا جھٹپٹا۔ ایک کہرام برپا ہے۔ پچاسوں چہرے۔ سیکڑوں آوازیں۔ "ارے روشنی ادھر کرو۔"

"دیکھو وہ نیلا نیلا کپڑا دکھائی دے رہا ہے۔ شاید فراک ہے۔"

"ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو۔ صبر سے کام لو۔ پیچھے ہٹو۔"

"جلدی سے رسّی نیچے ڈالو۔ ارے وہ ملاح کا لڑکا کہاں رہ گیا وہ کنویں میں اُتر لیتا ہے۔"

"لو وہ اُتر گیا۔ خدا پر بھروسہ رکھو بھائی۔"

میں تو آج بھی چپ تھی۔ اس طرف دیکھ بھی نہ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لوں اور یہاں سے بھاگ جاؤں۔ میری نظریں، بہت احتیاط سے پلنگ پر لٹائی گئی پلاسٹک کی گڑیا پر تھیں، جس کے کپڑے ابھی کچھ دیر پہلے بدل کر، ایک ننھی سی رضائی سے ڈھانک کر سلا دیا گیا تھا کہ جب تک ہم نہ آئیں لیٹی رہنا نہیں تو پٹائی ہوگی مجھے پتہ تھا کہ اب یہ گڑیا کبھی نہ اٹھ پائے گی۔ نہ ہی اس کے کپڑے دوبارہ بدلے جائیں گے۔

"کتنی بدمعاش ہو گئی ہے، اتنی جلدی کپڑے گندے کر دیے۔"

— "لاؤ بھئی میں اس کے کپڑے بدلے دیتا ہوں۔ آپ تو اس کی امی ہیں نا، یہ ابھی بچہ ہی تو ہے" — اور دونوں ہنستے کھیلتے گڑیا کے سنگار میں لگ گئے۔

اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ میرے والد کون تھے۔ میری ماں کیسی تھیں، میرا گزارہ کیسے ہوتا ہے۔ مجھے سانس لیتے کتنے سال بیت گئے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ میرے سامنے یہ پلاسٹک کی گڑیا کیوں رکھی ہے۔ بہت دنوں سے میں کسی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس گڑیا کا یہاں کیا کام۔ کس نے رکھی ہے۔ مگر پھر بھول جاتا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں احساس ہوتا ہے کہ یہاں کی ہر چیز فرضی ہے۔ میں، میری بیوی، میرا بیٹا — بس — یہ گڑیا حقیقت ہے۔

□□

غزلیں

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید
شعبۂ فارسی، اردو و عربی
پنجابی یونیورسٹی۔ پٹیالہ

اپنا سایہ بھی معتبر کب تھا
وہ اندھیروں میں ہمسفر کب تھا

خوف تھا یہ کہ حادثہ ہوگا
راستہ ورنہ پُرخطر کب تھا

اس کے سائے سے فیض کیا پاتے
رہگزاروں کا وہ شجر کب تھا

یہ بھی تہذیبِ نو کی برکت ہے
بے ہُنر تجھ سا باہُنر کب تھا

کہنے والا ہی سو گیا ورنہ
میرا افسانہ مختصر کب تھا

میرے اندر بھی ایک شیطاں ہے
وہ فرشتہ بھی راہ پر کب تھا

عمر جس میں گزار دی جاوید
وہ پرایا تھا اپنا گھر کب تھا

غیور جعفری
پرانا بھوئی پورہ۔ کامپٹی،
ناگ پور

درازِ صورتِ دستِ سوال تو بھی ہوا
دُعائیں دے کے مجھے پائمال تو بھی ہوا

کہا تھا کس نے کہ آ دشتِ آگہی کی طرف
نہیں کسی کی تو میری مثال تو بھی ہوا

خموشیوں کے تو مطلب ہزار تھے لیکن
جواب دے دے سراپا سوال تو بھی ہوا

کہاں سے آ گیا بیٹھے بٹھائے رم کرنا
شکارگاہِ سخن میں غزال تو بھی ہوا

کسی نے مجھ کو بتایا تو خوش ہوا میں بھی
سُنا ہے سُن کے مرا دُکھ نہال تو بھی ہوا

اگر یہ حال ہے بے برگ و بے نوائی کا
سمجھ لے اب کی رُتوں میں نڈھال تو بھی ہوا

نہ کوئی چاہ نہ کوئی خلش نہ خمیازہ
اُداس سُن کے فرشتوں کا حال تو بھی ہوا

افضل صدیقی منگلوری
گوشوارہ۔ ستی اسٹریٹ
روڑکی

یہ میں نے کب کہا دولت کہ مال دے مجھ کو
گدا ہوں صدقۂ حسن و جمال دے مجھ کو

تو میرے ظرف کا پہلے کچھ امتحاں لے لے
پھر اس کے بعد کمال و زوال دے مجھ کو

گزشتہ برسوں میں بس تو نے غم ہی بخشے ہیں
کوئی خوشی بھی ذرا اب کے سال دے مجھ کو

پلا کے دیکھ لے ساقی اگر بہک جاؤں!
تو میکدے سے اسی دم نکال دے مجھ کو

دُعائیں مانگ تو افضل کہ اے مرے اللہ
حسد کی قید سے باہر نکال دے مجھ کو

افسانہ

عذرا پروین
پتہ: عبدالعزیز روڈ
لکھنؤ

گلہری اور کوّا

گلہری اور کوّے کی کہانی کا پہلا حصّہ تو آپ کورس کی کتابوں میں بچپن میں پڑھ ہی چکے ہوں گے، آگے ان دونوں پر کیا بیتی؟ آیئے اس کہانی سے جان لیں۔ ——— (ع پ)

..... پھر یوں ہوا کہ جب کوّے کا سارا اناج بارش میں بہہ گیا تو کچھ دن اس نے کاؤں کاؤں بھی کی اور اُداس بھی بہت رہا۔ مگر آخر کب تک اور کہاں تک !؟

وہ بھی آخر ذات کا کوّا ہی تھا نا! سدا کا چالاک، بہت سیانا۔ رہ رہ کے بھوکے پیٹ گیت گاکر دل بہلانے کی کوشش کر کے ہار گیا تو اسے گلہری کے اناج کے ذخیروں کے سہانے خواب اور کبھی پانی میں بہتا ہوا اپنا اناج خواب پریشاں بن کر ستانے لگا۔

آخر سیانے کوّے نے ایک ہی مہرے سے علاجِ غمِ دوراں و غمِ جاناں کرنے کی ٹھان لی۔ سیانے کوّے نے مختلف ذرائع سے معلومات اکٹھا کر کے اطمینان کر لیا کہ گلہری میں نغمہ پرست کوّے کی معشوقہ بننے کی جملہ صفات موجود ہیں۔ بس پھر کیا تھا وہ دل وجان سے اس پر عاشق ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

مگر وہ کم بخت کافی نغمہ پروف ثابت ہوئی۔

شاید یہ کوّے کے پچھلے موسم کے گیت کی کارفرمائی تھی جس نے اسے بے حس کر دیا۔

وہ گیت آج بھی اس کے کانوں میں گونجتا رہتا تھا۔

تو چل میں آتا ہوں

چپڑی روٹی کھاتا ہوں

ٹھنڈا پانی پیتا ہوں

ہری ڈال پہ بیٹھا ہوں .....

جب گلہری کے محبت شکن رویّوں سے کوّا مایوس ہو گیا تو پتہ لگاتا ہوا وہ گلہری کے بوڑھے کثیر العیال باپ کی قدمبوسی کو پہنچا۔

کوّے کی آمد! بیٹی کا تنہا تنہا کھیتوں پر جانا، سخت محنت۔ عزّت دار اور خوددار باپ کو کوّا اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن کی طرح لگا۔ چھان پھٹک کی تو پتہ چلا کہ وہ ایک عالی شان موروثی نیم کا مالک بھی ہے۔ بوڑھے باپ نے بیٹی کی خوش نصیبی پر ناز کرتے ہوئے دھوم دھام سے اسے کوّے کے ساتھ بیاہ دیا۔

معصوم، فرمانبردار گلہری نے نیم پر آکر گھر اور کوّے کو سنبھال لینے کی کوشش اس حوصلے سے کی کہ شرافت و محبت میں بڑی قوتیں پنہاں ہیں۔

مگر بہت جلد گلہری کی تمام خوش فہمیاں نیم کے درخت سے خود گلہری ہی کی طرح نیچے گرا کر بنجر کھیتوں میں محصور کر دی گئیں۔

اس کی زرّیں عمر، سنہرے خواب ان کھیتوں میں جوت دیئے گئے جہاں اناج کے ساتھ ساتھ خودداری، انانیت اور پھر اس کا آخری لازمی پھل تنہائیوں کے روپ میں اُگتا تھا۔

نہ دوبارہ نیم پر پہنچنے کی اسے فرصت ملی نہ کوّے کی رفاقت۔
کوّے کو نیم سے اُترنا پسند نہ تھا اور گلہری کو نیم پر آنے کی فرصت نہیں تھی۔!

شادی کے چند ہی دنوں بعد اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس کا سہاگ بس یہی واحد نغمہ ہے ؎

تو چل میں آتا ہوں ....

چپڑی روٹی کھاتا ہوں ...

کھیتوں میں جان کھپاتے کھپاتے وہ نہ جانے کیا سے کیا ہوگئی تھی۔!

جنگلوں جنگلوں بھٹکنا آسان تو نہ تھا۔

جنگلوں میں بھٹکتے اور جنگلیوں سے نپٹتے نپٹتے اس کی وضع قطع ایسی ہوگئی کہ اس نے ندی میں نہارنا، جھانکنا جو کبھی اس کا مشغلہ ہوا کرتا تھا، قطعی چھوڑ دیا تھا کہ نہ اب وہ خوش رنگ گلہری تھی، نہ جسم پر وہ قیمتی چمک دار بال!

یونہی بچتے بچاتے وہ جانے کیا کیا کھوتی پاتی، بُچی دُم اور چھترا بدن لیے، تھکی مری کھیتوں سے لوٹتی تو منہ چڑاتے گھر کے کونے میں پڑی رہنا چاہتی تھی بس! مگر دو ننھی ننھی گلہریاں، ماں کی اس بدہیئت وضع قطع پر بھی اس کی ضرورت محسوس کرتی تھیں اور اس سے چمٹی رہتی تھیں ورنہ اب انتظار کی جوت بجھنے کے بعد وہاں کیا رہ گیا تھا محض ایک مزدور! ایک ماں کا ڈھانچہ جسے گلہری نہیں کہا جا سکتا تھا مگر ممتا نے اسے زندہ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ وہ کھیتوں کھیتوں جنگلوں جنگلوں بھٹکتے بھٹکتے ہر آہٹ ہر آواز پر ٹھٹکتے ٹھٹکتے، سہمتے سہمتے تھک بھی گئی تھی۔

بسنت کا موسم تھا۔ گلہری کے تمام بسنتی خواب اس کے خوبصورت بالوں کے ساتھ ہی اس سے بچھڑ چکے تھے۔ گلہری چپ چاپ ننھی منّی گلہریوں کو آپس میں لڑتے اور پھر ملتے دیکھ رہی تھی۔ خاموش، بے بس اور تنہا۔!

کوّے کا گیت ابھی بھی سیسہ بن کر کانوں میں اُتر رہا تھا۔
اچانک گلہری نے محسوس کیا کہ کوّے کی آواز دھیمی پڑتی جا رہی ہے اور کچھ شور سا قریب آتا جا رہا ہے اور پھر اس نے اپنے بچپن کی بہت سی بچھڑی ہوئی سہیلیوں اور اپنے گاؤں کے بہت سے لوگوں کو اپنے گرد پایا۔ وہ سبھی شور مچا رہی تھیں اور گلہری کو اپنے ساتھ لے جانے کی ضد کر رہی تھیں۔

"چلو نا! دریا پار جو بزرگ کا مزار ہے وہاں جو بھی دُعا مانگو وہ قبول ہوتی ہے۔"

چلو۔ چل کر کچھ دعا مانگ لو۔ راستہ بھی اچھا کٹے گا باتوں میں۔"

"چلو نا! کتنے دنوں بعد ملے ہیں۔"

"بہت دنوں سے تیری مزے دار باتیں نہیں سُنی ہیں۔ کتنا ہنساتی تھی سب کو۔ چل نا۔!"

اصرار! تکرار! ضد!!

وہ چونکی۔ "میں ہنساتی تھی۔؟ — میں!؟"

"اسی کا حساب اب برابر کر رہی ہوں۔ سود بیاج سمیت —!"

وہ ہنس پڑی۔

"تم پاگل ہوگئی ہو! اس قید سے نکلو۔ چلو۔ دیکھو کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔ چلو اُٹھو۔!"

سب گلہریاں لپٹ گئیں تو چار و ناچار وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

راستہ طویل تھا۔ جنگل گھنا۔ رات ہونے لگی۔ منزل ابھی دُور تھی۔ اس لیے سب نے بسیرا کرنا ہی مناسب سمجھا۔

سبھی سہیلیاں اپنے اپنے جوڑوں کے ساتھ اِدھر اُدھر ستانے لگیں۔ بچے تھک کر سونے لگے۔ سُورج ڈُوب رہا تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے اور اُداسیاں اس کی ذات کے تمام بند دروازوں کو کھول کر باہر نکلنے لگیں اور ماحول کی شہ پا کر اس پر گرفت مضبوط کرنے لگیں۔

بسیرا کرتے پنچھی شور مچاتے سر سے گزرتے جا رہے تھے۔ ان ہی اجنبی آوازوں میں وہ محو ہونا چاہتی تھی کہ ایک جانی پہچانی آواز، جانا پہچانا گیت، ماحول کی سرد اُداسی کو گرمی بخشنے لگا۔

آواز قریب آئی اور پھر گلہری حیرتوں کے سمندر میں غوطہ لگاتے دیکھتی رہ گئی۔ یہ آنے والا کوئی اور نہیں — اس کے بچوں کا نکمّا باپ اور

اس کا آوارہ شوہر تھا!

یا خدا!! جو دُعا وہ مزار پر مانگنے چلی تھی وہ تو مانگنے سے پہلے ہی پُوری ہوگئی تھی!!

اسے کوّے کی رفاقت چاہیے تھی، ہم سفری چاہیے تھی نا۔ اور کبھی بھی نیم کے نشے سے: چونکنے والے کوّے کو اس نشے سے چونکانا چاہتی تھی ـــ

کیا یہ سب کچھ بُزرگ کے مزار پر جانے کے ارادے کا کرشمہ تھا؟

گلہری سوچتی رہ گئی۔ وہ اب بھی گا رہا تھا۔ آج اس کا گانا گلہری کو بہت اچھا لگا۔ پہلی بار۔ آخر اس سے برداشت نہ ہوا اور وہ گنگناتے کوّے کو نہارتے نہارتے بے اختیار اپنی ننھی منی بیٹیوں کی پیشانیاں چومنے لگی کہ شاید انھیں کے مقدر نے اسے اس کا سہاگ لوٹا دیا ہو۔

پھر کچھ اور خیال آیا۔ آج وہ برسوں بعد دریا تک بھاگ کے گئی۔ اور گھوم گھوم کر دریا کے پانی میں اِترا اِترا کر اپنا عکس دیکھنے لگی۔ مگر دریا میں تو کوئی بدخلقت سی شے اس کو منھ چڑھا رہی تھی۔

"نہیں! نہیں!!" وہ خود سے بھی خوف کھا کر بھاگتی ہوئی پھر کوّے کے پاس چلی آئی۔

گنگناتا کوّا اس کی سرگرمیوں کو بھی دیکھتا رہا۔ پھر رقت آمیز انداز میں پکارنے لگا:

"جانم!"

"جانم!"

کیا؟ـــ کیا ـــ؟" سرشار گلہری کے ذہن سے وہ کڑوا سچ پل بھر کے لیے بسر گیا جو ابھی ندی نے اسے سُنایا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں زندگی بوجھ سے خوبصورت خواب میں بدل گئی۔

اور پھر کوّے نے اس سے بہت کچھ کہا، بہت کچھ اس سے سُنا بھی۔ آخر میں وہ حرفِ تمنا زبان پر لے آیا:

جانم! میں نے زندگی میں دو چیزوں سے عشق کیا تھا۔ نیم کی شوکت اور نغموں کی لذّت! اور تمھارے وجود کی برکت نے مجھے اپنے عشق کو شدتوں کے ساتھ نبھا دینے میں مدد دی۔ میں تمھارا شکر گزار رہوں گا۔ کیوں کہ عشق کا بے فکری سے بڑا گہرا تعلق ہے اور یہ بے فکری تم نے ہی مجھے فراہم کی۔ تم عظیم ہو! بہت عظیم!

اب دیکھو۔ میری زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ نوجوان تو ہوں نہیں دو بیٹیاں ہیں، پرایا دھن! سوچتا ہوں کہ میرے بعد اس موروثی نیم کو کون رونق بخشے گا؟

ایک جانشین کی، ایک ننھے کوّے کی گھر میں بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ محض ایک چراغ کے بغیر نیم پر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اندھیرا اندھیرا سا لگتا ہے۔

آؤ! آج ہم تم مل کر مزار شریف پر بابا سے اپنا ولی عہد مانگیں! اگر میں اسے اپنے نغموں کا امین اور نیم کا پاسبان بنا سکا تو چین سے مر سکوں گا۔

گلہری برگشتہ ہوکر بول پڑی ـ "پھر وہ بھی میری جیسی کوئی گلہری ڈھونڈے گا عشق بگھارے گا، نغمے سُنائے گا۔؟ نہیں ـــ نہیں ـــ قطعی نہیں ـــ اب ہماری جانشینی اچھی طرح سے یہی دونوں گلہریاں ہی کرلیں گی۔ ابھی تو ہمیں مل جُل کر ان محرومیوں کا ازالہ کرنا ہے اور ان کے وجود اور کردار کے ادھورے پن کی تکمیل بھی کرنی ہے ـــ رہی میں ـــ میں تو تنہا تنہا زندگی سے بہت تھک چکی ہوں۔ مجھ میں اب صبر کی قوت اور تاب نہیں رہ گئی ہے۔"

کوّا گلہری کا صاف جواب سُن کر سناٹے میں آگیا ـــ "پتہ نہیں کون منحوس کہتا ہے کہ گلہری کی ذات بڑی معصوم ہوتی ہے۔ یہ تو مجھ سے بھی بڑی مکّار نکلی"۔!

کوّا ہارا نہیں۔ اور گلہری کو عظمتوں، رفعتوں کے روشن میناروں پر بٹھا بٹھا کر اس کے مزید استعمال کے پلان کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لیے لفظوں کے جال پھینکتا رہا ـــ مگر گلہری کے تجربوں کی تیز دھار نے ہر جال کو آسانی سے کاٹ دیا۔

ناکام، تھکی اور بیزار گلہری اس آخری ٹھوکر سے مایوس ہوکر بالکل ہی خود غرض اور ضدی ہوگئی تھی شاید۔

اچانک ہی گلہری کی سرد مہری سے مشتعل ہوکر کوّا رنگ بدلنے لگا۔ محبوب سے آقا بنتے دیر نہ لگی ـ

"بدچلن ـ سرکش ـ ضدی ـ آوارہ گلہری ـ!! (باقی صفحہ ۹۴ پر)

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر
کتاب کے دو نسخے
آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "آبر احسنی اور اصلاح سخن"

مرتبین: پروفیسر عنوان چشتی۔ نعیم الدین رضوی
قیمت: سو روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

"آبر احسنی اور اصلاحِ سخن" سات ابواب پر مشتمل ہے اس کتاب کی خاص خاص باتیں درج ذیل ہیں :۔

"استناد" کے تحت جن اربابِ قلم کی نگارشات شائع کی گئیں ہیں ان میں مسعود حسین، ظہیر احمد صدیقی، قمر رئیس، صدیق الرحمٰن قدوائی، خلیق انجم، شمیم حنفی، مظفر حنفی، تنویر احمد علوی، مخمور سعیدی، نور الحسن نقوی، شعیب اعظمی، طلحہ رضوی برق اور ناز قادری وغیرہ شامل ہیں ان حضرات نے سحابِ سخن آبر احسنی گنوری کے گرد رنگ و نور کا ہالہ قائم کیا ہے۔ اور اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے کہ فن اصلاحِ سخن اردو زبان و ادب کے ارتقا میں مؤثر اور فیض رساں ذریعہ ثابت ہوا ہے، اسلئے عہد حاضر میں یہ عمل حسنہ زیادہ ضروری ہے۔

اب کتاب کے زرکار دائرے پر نظر کیجئے ـــ

(۱) میری اصلاحیں حصہ اول و دوم کا تعارف نعیم الدین رضوی نے پیش کیا ہے، اور تنقیدی جائزے بالترتیب تنویر چشتی اور محمد شتاق شارق کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ انور مینائی نے حصہ دوم کی مدد سے ابر احسنی کے شعور فن کو اجاگر کیا ہے۔ ان افراد نے محنتِ مطالعہ، لگن اور علم و تنقید کے جلو میں اپنے مضامین کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔

(۲) سیفی پریمی، عنوان چشتی اور کیلاش چندر ناز کے کلام پر اصلاح و توجیہ کے نمونے پیش کیے ہیں :

(۳) "اصلاح الاصلاح" تلخیص و تجزیہ صغیر احسنی نے رقم فرمایا ہے۔ "دستور الاصلاح" سیماب اکبر آبادی اور "اصلاح الاصلاح" ابرار احسنی گنوری کے منہاج و مقصد، موقف اور میر تقی میر سے فانی بدایونی تک ۲۴ اشعار کے سلسلے میں ادبی و فنی اور تنقیدی نکات اہل زبان کے لیے مشعل ہدایت ہیں۔

(۴) "آبر احسنی کا نظریۂ فن" عنوان چشتی نے اپنے مفصل اور فکر رسا مضمون کو عروضی، فنی اور لسانی حقائق کی جلوہ گاہ بنا دیا ہے۔ یہ حاصلِ کلام اور حاصلِ بحث ہے جس میں حریفی سوالوں کے جواب بھی ہیں اور چند تنقیدی سوال بھی جن پر صاحبانِ فکر و نظر کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اس تصنیف میں جذبۂ عقیدت مندی کے ساتھ یہ احساس بھی شامل ہے کہ آبر احسنی گنوری سے مراد وہ فرد ہے جس نے زندگی میں اپنے کردار کو ادبی و فنی اصول و ضوابط سے IDENTIFY کرنے کی بار آور کوشش کی تھی نیز اپنے مستند اکابرین کی میراث علم و فن اور تجزیاتی نکات کو نئی نسل تک پہنچا دیا۔ اصل میں یہ کتاب اسی اٹوٹ رشتہ کی پیش کش ہے۔

کتاب کے آخر میں سوانحی اشارے درج ہیں۔ عنوان چشتی اور نعیم الدین رضوی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتاب کے سرورق پر مولانا آبر احسنی گنوری کی تصویر، عقب و اندرون سرورق پر سات اربابِ نگارش اور مرتبین کی تصویریں چھپی ہیں۔

ـــــــــــــ ڈاکٹر سیفی پریمی

نام کتاب: "مزاج" (شعری مجموعہ)

شاعر: وسیم بریلوی قیمت: پچاس روپئے
ملنے کا پتہ: ایم حسین ہاشمی واٹسن چیرمین نگر مہاپالیکا گڑھا بریلی

مزاج وسیم بریلوی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے مگر میرے لیے ان کی شاعری (خاص طور پر غزل) کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کی یہ ساعتِ اول ہے، اور یہ پوری طرح ان کے حسنِ کلام سے شادابیت کا اکتساب

کررہی ہے، حالاں کہ میں نے اکثر و بیشتر مشاعروں میں ان کی غزلیں سنی تھیں اور ایک خاص قسم کی قوسِ قزحی پھوار اپنے دل پر گرتی ہوئی محسوس کی تھی، لیکن آج جب کہ "مزاج" میرے ہاتھ میں ہے اور میں اس کے مطالعے کی ساعتِ اوّل سے سرشار ہوں اور یہ ساعت مجھے ایک ایسے قافلے کے گزرنے کی خبر دے رہی ہے جو نشاط و نور میں بھیگی ہوئی فضاؤں کا امانت دار ہے۔ میں یہ کوشش کر رہا ہوں کہ چند سطور تبصرے کے طور پر اپنے مقدور کے مطابق قلم بند کروں۔

چنانچہ ان ستارہ خیز غزلوں کے مطالعے کے دوران میں شگفتہ الفاظ میں معانی کی تہ داریوں کے ایک جہانِ ہوش رُبا کا احساس کرتا ہوں اس طرح کہ جیسے عصرِ رواں کے زندہ متحرک لمحے میرے سامنے قطار در قطار آئینے لے کر ایستادہ ہوں اور مجھے ان عکسوں کا نظارہ کرا رہے ہوں جن کی رگ و پے میں شاعر کی فکر جاوداں کے رنگ لہو بن کر رواں دواں ہیں۔

"مزاج" ۲، صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۵۳ غزلیں اور ۵۷ متفرق اشعار ہیں۔ ایک نظم بھی ہے جو کتاب کے آخر میں شاعر کی تصویر کے نیچے تحریر ہے۔ لیکن اس نظم کا تاثر اس قدر گہرا ہے کہ یہ احساس مسلسل چبھتا رہتا ہے کہ آخر وسیم نے مزید نظمیں کیوں نہیں لکھیں اور اگر لکھیں تو اس کتاب میں شامل کیوں نہیں کیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی خوبصورت نظم کے خالق سے یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ اس نے مزید نظمیں نہیں لکھی ہوں گی ؎

یہ عارض ترے
جیسے بوسیدہ قبریں
یہ عارض ترے
بوسہ گاہِ حوادث
جو شاداب ہوتے
تو اوراقِ دوراں
ہزاروں فسانوں سے محروم رہتے

اس نظم میں انسانی زندگی کی صباحت، لطافت، شکستگی اور بوسیدگی کی ایک عظیم تاریخ بیان کی گئی ہے۔ چند الفاظ پر مشتمل یہ مختصر نظم بے انتہا تاثر کی حامل ہے۔ عارض کو جس خوبصورتی سے بوسہ گاہ حوادث کہا گیا ہے وہ شاعر کی فکر کے بے حد و بے سمت جہانوں کا سُراغ دیتا ہے

مزاج کی غزلوں سے یہ تاثر قطعی نہیں ابھرتا کہ وہ صرف مشاعروں کی فضا تک محدود ہیں بلکہ ان کے لفظی نظام میں معانی کی ایک بے کراں اور بسیط دُنیا ہے ؎

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

دُور تک ہاتھ میں کوئی پتھر نہ تھا
پھر بھی ہم جانے کیوں سر بچاتے رہے

میں تجھ سے ملتا ہوں تفصیل میں نہیں جاتا
مری طرف سے ترے دل میں جانے کیا نکلے

بہت قریب ہوئے جا رہے ہو سوچو تو
کہ اتنی قربتیں جسموں سے کب سنبھلتی ہیں

کہیں بھی جائے مری ہم سفر ہی لگتی ہے
وہ راہ جس میں کوئی نقشِ پا نہیں ہوتا

مزاج کے مطالعے سے یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ اس میں شامل اشعار میں معانی کی اس قدر جہتیں ہیں کہ ان کا احاطہ چند سطور میں مشکل ہے، چنانچہ صاحبانِ فکر و نظر کو اس سمت توجہ دینی چاہیے کہ وسیم کے کلام کی تمام تر جہتوں کو انکشاف کی فضا مل سکے۔ نازک سبک سی اس شعری کتاب کا ٹائٹل جاوید اشرف نے بنایا ہے۔ جو بہت دلکش ہے رنگوں کا امتزاج گہری سنجیدگی کا پتہ دیتا ہے اور شاعر کی فکری وسعتوں کا غماز بھی ہے کتاب کے شروع میں چند صفحات ایسے بھی ہیں جن پر رسمِ تحریر خود شاعر کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے جس میں قدرے تفصیل سے اہم باتیں کہی گئی ہیں جو اس کتاب کی تفہیم میں بہت معاون ہیں۔

——— عشرت ظفر

ہمارے نام گلوں کے مراسلات جن

۱۰۸ صفحات پر مشتمل ماہ اگست ستمبر ۱۹۹۰ء کا شمارہ "قومی ہم آہنگی کے نام" پڑھا تو دل و دماغ میں روشنی پھیل گئی۔

جناب بشمبر ناتھ پانڈے صاحب کا مضمون بڑی بے باکی اور حقیقت پسندی کا آئینہ دار ہے۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت کا انکشاف کرتا ہے جس پر سے پردہ اٹھنا ہی چاہیے

حاجی بیگم صاحبہ، خاکسار تحریک، شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات، فکر انگیز اور معلوماتی مضامین ہیں۔ الگ الگ تعریف کے لیے تو کافی صفحات درکار ہوں گے۔ اس لیے مختصراً سب کو میری مبارکباد۔

—— جہاں آرا سلیم
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

میں نے نیا دور کا "قومی ہم آہنگی" نمبر دیکھا۔ پسند آیا۔ ایک تو آپ نے قومی ایکتا، یا قومی یک جہتی کی جگہ قومی ہم آہنگی کا عنوان منتخب کیا، دوسرے اس میں بعض کام کی تخلیقات شائع کیں، اس لیے مجھے یہ ادا پسند آئی۔

—— عنوان چشتی
نئی دہلی

آپ کی ادارت میں نیا دور نے نئی جہتیں اور سمتیں دریافت کی ہیں اور مواد و معیار کی حیثیت سے اس میں واضح تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ یہ آپ کی ذہانت و صلاحیت اور محنت و کاوش کا ثمرہ ہے۔

—— فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن

اکتوبر ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں مقالات میں "تذکرہ میر حسن کا تحقیقی جائزہ" اور "سرسید کا تصور تعلیم" اپنی جگہ خوب ہیں۔ لیکن وجاہت علی سندیلوی کے مقالے "اردو کے ہم آواز حروف" سے کلی طور پر اتفاق کرنا ممکن نہیں ہے۔

اتنی سی بات اردو زبان کا ہر قاری جانتا ہے کہ زبانوں کی بقا کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ عوام کے ساتھ اس کا رابطہ قائم رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام اسے اچھی طرح بولتے اور سمجھتے ہوں۔ لیکن سہل نگاری کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ الفاظ کی ہیئت ہی تبدیل کردی جائے۔

موصوف آگے چل کر اپنے دعوے کی دلیل میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، آل احمد سرور اور مسعود حسین خاں کے اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ لیکن موضوع کی تہ تک نہیں پہونچتے۔ اگر ان کی وہاں تک رسائی ہو جاتی تو ایک قابل ذکر بات تھی۔ مثلاً ایک اقتباس —— (جو اس مضمون کا ہی ایک حصہ ہے) پیش کرتا ہوں۔

"یقین جانیے گا کہ جب میں نے پہلے پہل "جافر ہسن" صاحب کا نام پڑھا تھا تو مجھے صرف اس نام کے املے سے ہی ایسی کراہیت محسوس ہوئی تھی کہ میں نے ان کے مضمون کو تضیع اوقات سمجھ کر پڑھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ نہیں عرض کر سکتا کہ خود مجھے کیسی وحشت محسوس ہوگی جب میں اپنے والد بزرگوار عشرت علی صاحب مرحوم کا نام "اِشرت الی ساہب مرہوم" لکھا دیکھوں گا —— لیکن جانتا ہوں کہ یہ صرف عادت

کی وجہ سے ہوگا۔ مانوس سے نامانوس کی طرف بڑھنے کی فطری ہچکچاہٹ کی وجہ سے ہوگا اور بس۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی تاریخ ساز اقدام کیے گئے ہیں تو ایک نسل کو اپنے آگے آنے والی نسل کے لیے قربانی پیش کرنا پڑتی ہے۔ میرے لیے اپنے جذباتی تنفر اور نفسیاتی اجنبیت کو اس خیال سے برداشت کرنا آسان ہو جائے گا کہ کل میرے اس ایثار کی وجہ سے میرے پوتوں اور نواسیوں کے لیے اُردو پڑھنا اور لکھنا زیادہ آسان ہو جائے گا"۔ صفحہ ۲۲-۲۳

یہاں موصوف سے پہلی غلطی تو یہ سرزد ہو جاتی ہے کہ انسانی ناموں میں حروف کی تبدیلی کو انھوں نے بطور کراہیت دیکھا، لیکن اپنے پوتوں اور نواسیوں کے اُردو پڑھنے اور لکھنے کی آسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے قبول بھی کرلیا۔ ساتھ ہی اپنے والد بزرگوار کے نام کے حروفِ ہجی کو بدل کر نمونہ بھی پیش کر دیا ہے۔ کل ان کی یہی نسل اپنے اجداد کو پہچاننے سے انکار کر دے گی اور تاویل یہ پیش کرے گی کہ ہمارے دادا پردادا یا نانا پرنانا کا نام تو فلاں ہے مگر حروف تہجی کی تبدیلی کی وجہ سے یہ کوئی دوسرے شخص بھی ہو سکتے ہیں چوں کہ ان کی تحریر میں موجودہ تحریر کی یکسانیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اگر کچھ عرصہ تک یہی رویہ باقی رہا تو نہ صرف نئی نسل اپنے اسلاف کی ادبی کاوشوں کو بھلا بیٹھے گی بلکہ "بے جڑ کے پودے" کے مانند ہو کر رہ جائے گی۔

اُردو کے مایہ ناز شاعروں میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ اور علامہ اقبالؔ کے علاوہ بے شمار غزل گو، نظم گو اور مثنوی نگار شعرا کے کلام کو پڑھنے اور پڑھ کر سمجھنے والوں کی قلت پیدا ہو جائے گی۔ وجہ صرف یہ ہوگی کہ ان کے طرز تحریر اور جدید طرز میں نمایاں فرق واضح ہو چکا ہوگا۔ میرؔ کا یہ کہنا کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" بھی غیر مستند ہو جائے گا۔ غالبؔ کے "گنجینۂ معنی کا طلسم" بھی اپنی معنویت کھو دے گا اور علامہ اقبالؔ کی "خودی" "کھودی" میں تبدیل ہو جائے گی۔

عبدالناصر
احمد گنج ساہنہ، بیگو سرائے (بہار)

گلہری اور کوا ۔۔۔۔ صفحہ ۴۴ کا بقیہ

میں تو تجھے سدا سے ہی جانتا تھا۔ تجھے مجھ سے بیکار ہی شکایت ہے۔ تجھے کیا نہیں ملا زندگی میں ۔ اتنی آزادیاں ۔ کھیتوں کھیتوں جنگلوں جنگلوں ماری ماری پھرتی رہی ۔ کیا کیا کرتی رہی۔ کیا میں نہیں جانتا؛ ـــ مگر نیم اور نغموں کے عشق نے مجھے اندھا کر دیا تھا اور میں تیری ذات سے ملنے والے نغمے کو ہی بہت جانتا رہا، اور تجھے اس سزا کو نہ پہنچا سکا جس کی تو اصل میں مستحق تھی ۔

آج یہ آخری موقع تجھ کو اور دے رہا ہوں ۔ بول چلتی ہے؟ یا دے دوں طلاق ؟

آج تک گلہری اپنی ایک "ہاں" کو جان دے کر بھی نبھانے میں لگی رہی تھی ـــ مگر آج!

آج وہ اپنی "نہیں" کو ہی جان دے کر نبھانے پر تُل گئی تھی!

تشدد پر اُترا ہوا کوا اسے زبردستی گھسیٹ کر لے جانا چاہتا تھا۔ مگر زندگی بھر کے دکھوں سے ملی ہوئی مضبوطی اور سخت جانی کام آ گئی۔

زخمی گلہری، دل کے ساتھ جسم سے بھی ٹوٹی پھوٹی گلہری ـــ روتی بلکتی، بچیوں کو لے کر لوٹ گئی۔ مگر کوّے کو ایسے نخروں کی پروا بھی کب تھی؟ وہ تنہا ہی مزار پر جانے کو تیار ہو گیا۔

آخر کئی دنوں بعد جب کوا اپنی دُعاؤں کو مقبول کر کے گھر لوٹا تو غضب ناک بارش اور گرج چمک نے اس کا استقبال کیا۔

آج کی طوفانی بارش ایک بار پھر اس کے اناج کے ذخیروں کو اپنے ریلوں میں بہائے لیے چلی جا رہی تھی۔ کوئی بادشوں سے لڑنے والا تھا اور نہ مقابلہ کرنے والا۔

نیم پر پہنچا تو، جس ڈال پر وہ جلوہ افروز ہوا کرتا تھا، اُسی پر گلہری کا الوداعیہ پیغام ایک پرزے پر ٹنگا ہوا تھا ـــ

"تم مجھے شاید کبھی طلاق نہ دیتے، میں خود تمھیں چھوڑ کر جا رہی ہوں ـــ ہمیشہ کے لیے۔"

تنہا کوا آج بھی اپنی مقبول دُعا کو لیے اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا ہے۔ اور عالیشان نیم کی ہری ڈال پر گونجتا نغمہ آج بھی کسی بیوقوف

نیا دور

جلد ۴۶ | نمبر ۳

جون ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر
شاہ نواز قریشی
ٹیلیفون: ـــــــ ۲۳۴۱۰۸

پبلشر
شیلیش کرشن
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

انتظامی و ادارتی معاونین
محمد الیاس خاں۔ نجیب انصاری

مطبوعہ
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ
شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش
فی شمارہ ـــــ ایک روپیہ
سالانہ ـــــ دس روپے

عنوانات

اپنی بات

آج کے عہد میں جبکہ تعلیم عام ہو چکی ہے اور دبے کچلے، مظلوم اور پس ماندہ طبقوں کے لوگوں کو بھی تعلیم و تربیت کی سہولتوں سے مستفید ہونے اور آگے بڑھنے کے مساوی مواقع حاصل ہیں، یہ کہنا کہ ادب کا عوام سے کوئی رشتہ ہو ہی نہیں سکتا اور ادب عوام کے لیے ہوتا ہی نہیں ہے۔ پس ماندہ اور جاگیردارانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔

ایک زمانہ تھا جب صرف بادشاہوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے عوام کو تعلیم و تربیت سے مستفید ہونے کی کوئی سہولت مہیا نہیں تھی لیکن جمہوریت نے جب اس سیاسی اور سماجی نظام کی جگہ لی تو تعلیم کے دروازے بھی سب کے لیے کھل گئے اور خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے طبقوں کے لوگ بھی تعلیم و تربیت کی برکتوں سے مستفید ہونے لگے چنانچہ سائنس، انجینئرنگ ٹیکنالوجی، میڈیکل سائنس اور علم و فن کے دوسرے میدانوں میں بھی آج سبھی طبقوں کے لوگ سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

لیکن دانش وروں اور ناقدین کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو شعر و ادب سے عوام کے کسی تعلق اور رشتے کا قائل نہیں ہے۔ اس سلسلے میں نظریاتی سطح پر جو صورت حال ہے وہ مبہم بھی ہے مثلاً جب عوامی ادب کی بات ہوتی ہے تو یہ سمجھا (اور سمجھایا بھی) جاتا ہے کہ اب سارا نظام بدلنے کی بات کی جائے گی، انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا جائے گا اور "بڑھے چلو۔ بڑھے چلو" والی شاعری ہوگی۔ جبکہ عوامی ادب کے ذکر سے ان باتوں کا کوئی (لازمی) تعلق نہیں ہے۔ عوامی ادب سے حقیقتاً وہ ادب عبارت ہے جس میں عوام کے جذبات ان کی امنگوں، تمناؤں اور ان کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہو اور جسے عام لوگ دل چسپی اور شوق سے پڑھتے بھی ہوں۔ اس معیار سے دیکھا جائے تو پریم چند، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض، مجاز، مخدوم محی الدین نیز ساحر لدھیانوی ایسے ادیب اور شاعر تھے جنھیں عوامی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان قلم کاروں اور فنکاروں نے عوامی جذبات، تمناؤں اور عوامی مسائل کی بھرپور تصویر کشی کی اور ان کے یہاں ترسیل کا کوئی مسئلہ بھی نہیں ملتا اسی لیے عام لوگ (جو تنقیدی اور نظریاتی مباحث بالکل نہیں سمجھ پاتے) انھیں دل چسپی اور شوق سے پڑھتے ہیں چنانچہ ان فن کاروں کو زبردست عوامی مقبولیت بھی ملی (فیض اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کو تو ایک ہجوم آٹوگراف لینے کے لیے گھیر لیتا تھا)۔

لیکن جب ادب میں علامتی اور تجریدی اظہار کا دور شروع ہوا تو ادب کا رشتہ عوام اور عام قاری سے منقطع ہونے لگا جس کا نظریاتی جواز بھی پیش کیا گیا اور اسی نوعیت کی تخلیقات کو اعلا ادب قرار دیا گیا جو کسی کی سمجھ میں نہ آسکیں۔ ابہام کو ادب کیلئے لازمی قرار دیا گیا۔ اس طرح ادب عوام سے اور عوام ادب سے دور ہوتے چلے گئے۔ عوام کے لیے، عام قاری کے لیے ہمارے نظریہ ساز دانشوروں اور فلسفہ طراز ناقدین کا رویہ تحقیر آمیز ہوگا اس طرح ادب کو ایکبار پھر (شاہوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے لیے نہ سہی) محض اعلا تعلیم یافتہ لوگوں، دانش وروں اور صرف لکھنے والوں تک محدود کرنے کی کوشش کی گئی۔ بنیادی طور سے یہ وہی پس ماندہ اور جاگیردارانہ ذہنیت ہے جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی کارفرما ہے۔

شین قاف

فضا ابنِ فیضی
جمال پورہ۔ مئوناتھ بھنجن

غزل

آئینہ ٹوٹا شباہت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے
زندگی بھی اسی صورت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

کچھ نہ کام آئی نگہداریِ صاحب نظراں
اہلِ نرگس کی بصیرت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

سایہ گیروں کا پیالہ بھی ہے خالی خالی
دھوپ جب نکلی تمازت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

آدمی اپنے مسائل کو سمیٹے کتنا ؟
ہاتھ پھیلے تو ضرورت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

کتنی دیواریں اک آنگن میں اٹھالیں ہم نے
باپ دادا کی وراثت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

تجھ کو یہ دکھ کہ مرا فرد ہے بکھرا بکھرا
مجھ کو یہ دکھ کہ جماعت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

اے ہوا اور کہیں ڈھونڈ ٹھکانا اپنا
تھی جو خوشبو کی تجارت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

سر چھپانے سے تو سر پھوڑنا آساں ٹھہرا
ایستادہ ہیں ستوں، چھت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

کیا دروبست ہے اے ذہن پریشانی فروش
ساری مربوط عبارت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

خشت بندی، مرے الفاظ کہاں تک کرتے
خود معانی کی عمارت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

تھی نئی فکر میں کب تیشگی اتنی پھر بھی
تیری اور میری روایت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے

غالبؔ اسلوب فضاؔ تھا کسی تیشے جیسا
"میرؔ لہجے کی سلاست ہوئی ٹکڑے ٹکڑے"

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
۱۱ - اشفاق اللہ مارگ لکھنؤ

امیر خسرو کی ہندی شاعری

ایک تعارف

امیر خسرو سوسائٹی امریکہ (AKSA) نے شکاگو میں پانچ روزہ بین الاقوامی کانفرنس (۲۹ مئی ۱۹۸۶ء تا ۲ جون ۱۹۸۶ء) منعقد کی تھی جس میں امریکہ کے علاوہ ہندوستان پاکستان، بنگلہ دیش، ایران، افغانستان، انگلینڈ، جرمنی اور دیگر ممالک کے دانش وروں نے شرکت کی تھی، اس میں نو اجلاس ہوئے تھے اور امیر خسرو کی ادبی، ثقافتی، سماجی اور مذہبی خدمات پر مقالے پڑھے گئے تھے۔ مصنف نے تیسرے اجلاس میں امیر خسرو کی حیات اور ان کی ہندی کویتا پر مقالہ بھی پڑھا تھا جس پر ان کو نور خسرو ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

ادارہ

حضرت امیر خسرو کا شمار، شعر و ادب، مذہب و تصوف، نغمہ و سرود کی باکمال ہستیوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ علم و معرفت اور انسانیت و روحانیت کے پیکر جمیل تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں وہ ....

"عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار، شعر و ادب کے دیوان اس کی عظمت کے گواہ، خانقاہیں اور سجادے اس کے مرتبۂ روحانی سے آگاہ، اچھے اچھے شیخ اس کا دم بھرتے ہیں، معرفت و طریقت کے خرقہ پوش کلمہ اسی کے نام کا پڑھتے ہیں۔"

اختراع و ایجاد ان کی فطرت تھی۔ زبان و بیان ہو یا نغمہ و سرود، سب ان کی جدت پسند طبیعت سے مستفید و متاثر۔ ان کے شیریں نغمے لوگوں کے دلوں کو مسرور و مسحور کرتے ہیں۔ ان کی شاعری گنجینۂ معانی کا طلسم، ان کے ہندی بول پریم اور دلکشی کا سرچشمہ، ان کی شخصیت اور شاعری ہشت پہل نگینہ ہے۔ وہ ایسے نابغۂ روزگار تھے جن کا ثانی آج تک خاکِ ہند پیدا نہ کر سکی۔ ان کا علمی و ادبی اور روحانی فیض صدیوں سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔

خسرو کے کمالِ فن کا اعجاز، اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسی بولی کی تشکیل اور توسیع کی طرف توجہ کی، جس کا وجود اور چلن نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس سے ان کی لسانی بصیرت اور ژرف نگاہی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہی بولی اردو ہندی کے نام سے مشہور ہوئی، امیر خسرو کو اس پر ناز تھا ؎

چو من طوطیِ ہندم از راست پرسی
زمن ہندوی پرس تا نغز گویم

امیر خسرو کو بہت سی زبانوں اور بولیوں پر دسترس تھا۔ ترکی اور فارسی تو خیر ان کو ورثے میں ملی تھیں، لیکن ہندی بھی ان کو مادری زبان کی طرح عزیز تھی۔ اس کے علاوہ عربی اور سنسکرت پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔ دہلی اور اس کے گرد و نواح کی بولیوں — کھڑی بولی (اردو۔ہندی)، برج بھاشا اور اودھی بھی وہ جانتے تھے۔

ایک ماہر لسانیات کی طرح خسرو نے ہندستان میں رائج تمام زبانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندستان کی عظمت کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ اس ملک میں جتنی زیادہ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اتنی دنیا کے کسی خطے میں نہیں، ہر زبان کی خوبی اور معیار کا بھی اشارہ کیا ہے۔ خاص طور پر ــــ سندی، لاہوری، کشمیری سمندری، تلنگی، گوجر، معبری، گوری، بنگالی، اودھ (اودھی)، دہلی (دہلوی) و پیرامنش اندر ہمہ حد (دہلی اور اس کے گرد و نواح کی زبان) ــــ ہندستان کی ان تمام زبانوں کو وہ ہندوی تسلیم کرتے ہیں ؎

این ہمہ ہندوی ست ز ایام کہن
عامہ بکار است بہر گونہ سخن
ہند ہمیں قاعدہ دارد سخن
ہندوی بود است در ایام کہن

ہندوی یعنی ہندستان کی تمام زبانوں کے متعلق انھیں معلومات ہونے کا دعوا ہے ؎

من بہ زباں ہائے کساں بیشترے
کردہ ام از طبع شناسا گرے

زبانوں کے جاننے کے لئے وہ ہمیشہ جستجو کرتے رہتے تھے ؎

دانم و دریافتہ نہ گفتہ ہم
جستجوئے روشن شدہ زاں بیش و کم

ہندستان میں 'ہندوی' ہی کو یہ مرتبہ حاصل تھا کہ وہ فارسی کے ہم پایہ تھی اور تیغ ہندی سے زیادہ بُرّاں۔

خضر خاں دول رانی میں فرماتے ہیں کہ

نہ لفظ ہندوی است از فارسی کم

اور اعجاز خسروی میں ہندی کو " از تیغ ہندی بُرّاں تر است" تسلیم کیا ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خسرو کے عہد میں "ہندوی" کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا تھا اور خسرو پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندستانی زبانوں یا بولیوں کا جائزہ لیا۔

امیر خسرو کے کلام کے مطالعے سے یہ نہیں ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ہندوی میں ہندستان کی تمام زبانوں یا بولیوں کا استعمال کیا ہے ان کی شاعری کھڑی بولی، برج بھاشا اور اودھی پر مشتمل ہے۔ مقدمہ زبان اُردو میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے خسرو کی زبان کی تقسیم اس طرح کی ہے:-

۱. ٹھیٹھ کھڑی بولی
۲. کھڑی بولی اور برج بھاشا ملی ہوئی
۳. خالص برج بھاشا

ان بولیوں کی انھوں نے مثالیں بھی دی ہیں۔

ٹھیٹھ کھڑی بولی ؎

ایک تھال موتیوں سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے
موتی اس سے ایک نہ گرے

ــــــ (بن بوجھ پہیلیاں)

خالص برج بھاشا ؎

سو بھا سدا بڑھاون ہارا   آنکھوں تے چھن ہوت نہ نیارا
آئے پھر میرے من رنجن   اے سکھی ساجن؟ ناسکھی انجن

ــــــ (کہہ مکرانیاں)

کھڑی بولی اور برج بھاشا ملی ؎

ایک گنی نے یہ گن کینا   ہریل پنجرے میں دے دینا
دیکھو جادوگر کا حال   ڈالے ہرا نکالے لال

ــــــ (بن بوجھ پہیلیاں)

خسرو کے زمانے میں کھڑی بولی کا نام نہیں تھا اس کو دہلی یعنی دہلوی کہا ہے، جو دلی کی بولی تھی اور اودھی کو اودھ لکھا ہے جو اودھ کی بولی تھی۔ اپنی شاعری میں انھوں نے انھیں دونوں زبانوں کا استعمال زیادہ کیا ہے۔ اسی میں برج بھاشا بھی شامل ہے۔

لسانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خسرو کے عہد میں ہندی کی یہ بولیاں ملی جلی تھیں اور پورے طور پر الگ

الگ نہیں ہو سکی تھیں خسرو نے 'دہلی و پیرامن او' کا استعمال زیادہ کیا ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کی نظر میں خسرو کی ——

"پہیلیاں، مکرنیاں اور کہہ مکرنیاں وغیرہ عام
طور پر کھڑی بولی یا پھر کھڑی اور برج ملی ہوئی زبان میں
لکھی گئی ہیں۔" (ص ۱۴۸) لیکن ان کے گیت عام طور سے
معیاری برج بھاشا میں ہیں" (ص ۱۴۹)

آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ خسرو کی زبان دہلی میں، ایک
سے زیادہ بولیوں کا محاورہ، لسانی ارتقاء کی جولانگاہ
میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔" ص ۲۶۵

بھولاناتھ تیواری نے "امیر خسرو اور ان کا ہندی ساہتیہ" میں لکھا ہے، کہ:

"خلط ملط ہونے کے باوجود یہ بہت واضح ہے کہ
پہیلیوں، مکریوں اور دوسخنوں کی زبان کھڑی بولی
ہے۔ خالق باری میں بھی ہندی کے جو روپ (شکل)
ہیں ان میں کھڑی بولی کا عنصر شامل ہے۔ جیسے کہیے
تو جان، رہیا (رہا کی پرانی شکل) بیٹھ رہی، آؤ رے
اور رات جو گئی وغیرہ۔ اس کے برخلاف گیتوں،
قوالیوں اور دوہوں کی زبان کی خاص بنیاد اودھی یا پوربی
ہے۔ دونوں کی مثالیں بھی دی ہیں۔"

کھڑی بولی کی مثال وہی ہے جو مسعود حسین خاں نے ٹھیٹھ کھڑی بولی میں دی ہے۔ مسعود صاحب نے اودھی کے بجائے برج بھاشا لکھا ہے انھوں نے خسرو کے گیتوں کو معیاری برج بھاشا میں بتایا ہے۔ کیا پوربی، اودھی اور معیاری برج بھاشا ایک ہی زبان یا بولی کے دو نام ہیں —؟

پوربی اودھی کی مثال:

چھاپ تلک سب چھینی رے، تو سے نینا ملا کے
پریم بھٹی کا مدوا پلا کے،
متواری کر دینی رے، مو سے نینا ملا کے

یوں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان کی سبھی (پوری) شاعری کی ہندی میں کئی ہندی بولیاں ملی ہوئی ہیں۔ لیکن کہیں کھڑی بولی اور کہیں پوربی کا غلبہ ہے۔

خالق باری قدیم کھڑی بولی میں ہے لیکن کہیں کہیں اس میں برج بھاشا اور کہیں پوربی کے الفاظ بھی ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں امیر خسرو کی زبان اور شاعری کے متعلق فرمایا ہے۔

"امیر خسرو نے کہ جن کی طبیعت اختراع میں
اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی، ملک سخن میں برج
بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی کا
کھولا۔"

آزاد کا جادو نگار قلم 'ملک سخن' کی زبانوں کی وضاحت نہیں کرتا کہ اس میں کون کون سی زبانیں رائج تھیں اور برج بھاشا کی ترکیب کس زبان سے ہوئی۔ بظاہر ان کا بھی مطمح نظر یہ ہے کہ دلّی اور اس کے قرب و جوار کی بولیوں میں برج بھاشا کی ترکیب سے انشا پردازی کا طلسم خانہ، خسرو نے تیار کیا۔ آزاد نے خالق باری 'پہیلیوں، مکرنی' دوسخنے اور گیتوں کا بھی ذکر بڑے دل چسپ انداز میں کیا ہے۔

خالق باری، جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے، کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی اس میں فارسی کی بحروں نے اول اثر کیا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جو اب متروک ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی پہیلیاں عجیب و غریب لطافتوں سے ادا کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقہ میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔ مکرنی، انمل، دوسخنے وغیرہ ان کے آئینہ کا جوہر ہے۔ خسرو کے گیتوں کی مقبولیت اور موسیقیت کا سبب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"واہ کیا زبانیں تھیں کہ جو کچھ ان سے نکل گیا
عالم کو بھایا، گویا زمانے کے دل پر نقش ہو گیا۔ بنانے
والوں نے ہزاروں گیت بنائے اور گانے والوں نے گائے

آج یاد ہوئے کل بھول گئے۔ چھ سو برس گزرنے
یہ آج تک ہیں اور ویا ہی رنگ دیے جاتے ہیں
اس حُسنِ قبول کو خداداد نہ کہیے تو کیا کہیے "۔

(آبِ حیات)

خسرو کی ہندی شاعری کے متعلق تین قسم کی رائیں ہیں اور تینوں رائیں کسی نہ کسی حد تک صحیح ہیں، کیونکہ ہر رائے دلائل کے ساتھ ثابت کی گئی ہے۔

پہلی رائے یہ ہے کہ خسرو نے جتنا فارسی میں لکھا اتنا ہی ہندی میں، فرنچ مستشرق گارساں دتاسی نے ہفت اقلیم کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"خسرو نے خود کہا ہے کہ میرے چھندوں کی تعداد
۵ لاکھ سے کم، چار لاکھ سے زیادہ ہے۔"

تذکرۂ عزا ... میں ادھری لکھتے ہیں کہ خسرو کا ہندی کلام فارسی سے کم نہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ انھوں نے ہندی میں زیادہ نہیں لکھا کیونکہ وہ اپنی ہندی شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے نہ اس کو انھوں نے محفوظ رکھا۔

تیسری رائے یہ ہے کہ خسرو کی دستیاب موجودہ شاعری میں بھی سب کچھ خسرو کا نہیں ہے۔ اس میں ایسی زبان شامل ہے جو ان کے زمانے میں ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے لسانی تجزیہ کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ:

"خسرو کے ہندی کلام کی زبان عالمگیر کے عہد سے قبل کی اُردو نہیں۔ اس لیے امیر کے کلام کو قدامت کی سند بخشتے وقت ذرا احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کم سے کم اس سے ہرگز ہرگز اس عہد کی زبان کے متعلق کلیات نہیں بنائے جا سکتے۔"

(مقدمہ صـ ۱۵۰-۱۵۱)

اُردو ہندی کے تمام ماہرین لسانیات اور ماہرِ ادب اور محققین نے خسرو کو صاحبِ دیوان ہندی شاعر تسلیم کیا ہے۔ محقق کلام خسرو ڈاکٹر

وحید مرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"خسرو نے ہندی شاعری میں طبع آزمائی ضرور کی اور اس لحاظ سے کہ انھوں نے عام زبان یا کھڑی بولی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کا شمار ہندی اور ایک حد تک اُردو شاعری کے سب سے پہلے دور میں کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ ماننا ذرا مشکل ہے کہ ان کے ہندی کلام کا حصہ فارسی کلام سے بہت زیادہ تھا جو ہندی کلام اس وقت خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ ضرور مستند ہے اور قابلِ اعتماد ہے لیکن کچھ حصہ ایسا ضرور ہے جو یقیناً فرضی اور مصنوعی ہے۔ اس لیے نہ تو آنکھیں بند کرکے یہ مان سکتے ہیں کہ وہ تمام پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، ڈھکوسلے وغیرہ جو جواہرِ خسروی میں درج ہیں، خسرو کی تصنیف ہیں اور نہ ایک سرے سے ان سب کو جعلی فرض کرلینے کی کوئی معقول وجہ ہوسکتی ہے۔۔۔ خسرو تمام عمر دہلی میں رہے اور دہلی میں ان کا جو کلام زبانِ خاص و عام رہا ہے اس میں تصرف اور تحریف کا ہونا ممکن ہے لیکن اس کا یکسر باطل اور بے بنیاد ہونا ممکن نہیں۔"

(امیر خسرو صـ ۲۲۹-۲۳۰)

پروفیسر مسعود حسین خاں جیسے ماہر لسانیات نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ:

"حضرت امیر خسرو اُردو ہندی کے مسلّمہ طور پر پہلے شاعر مانے جاتے ہیں۔ خسرو کے صاحبِ دیوان ہندی شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ فارسی، ترکی اور عربی کے ساتھ ہندی زبان کے بھی ماہر تھے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔"

(مقدمہ تاریخ زبان اُردو صـ ۱۴۴)

خسرو کی ہندی شاعری کے بارے میں اختلاف، یا اس میں آمیزش اور ان کے نام سے اضافے ہونے کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کی ہندی شاعری کا کوئی مخطوطہ ایسا دستیاب نہیں ہوا ہے جس سے

یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا کہ یہ خسرو کی ہندی شاعری ہے۔ خسرو نے اس کے لکھنے اور محفوظ رکھنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ دیباچۂ غرۃ الکمال میں اپنی ہندی شاعری کے متعلق انھوں نے یہ لکھا ہے کہ وہ ہندی شاعری لکھ کر تقسیم کر دیا کرتے تھے:

"چند نظم ہندوی نذر دوستاں کردہ شد"

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ہندی شاعری عوام کے لیے لکھتے تھے اور ان کے احساسات، جذبات اور رجحانات کا خیال رکھتے ہوئے اس کو زیادہ سے زیادہ دل چسپ انداز میں لکھتے تھے۔ پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، گیت، نسبتیں، دوسخنے، قوالیاں، منڈھا وغیرہ سب میں ان ہی باتوں کا خیال اور رجحان معلوم ہوتا ہے۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عوام میں ان کے ذریعہ سے نئی زبان ہندی کے الفاظ زیادہ سے زیادہ استعمال ہونے لگے اور مقبول ہوتے گئے۔ تحریری طور پر محفوظ نہ رکھنے کی صورت میں نقصان یہ ہوا کہ بہت کچھ ضائع ہو گیا، اور جو کچھ لوگوں کو زبانی یاد رہا اس میں وقتاً فوقتاً تحریف و ترمیم اور اضافہ ہوتا گیا اور خسرو کے نام سے منسوب ہوتا رہا۔ اسی لیے اس میں ایسے الفاظ یا ایسی چیزوں کے نام شامل ہوتے گئے جو لسانی، سماجی اور تاریخی اعتبار سے خسرو یا ان کے عہد کے نہیں ہو سکتے۔ خسرو کی ہندی شاعری کا جو کچھ سرمایہ اصلی یا اضافی موجود ہے وہ سب علم سینہ کی بدولت ہے۔ عوام نے اس کو محفوظ رکھا۔ اس وقت عوامی ادب کی تدوین پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔

ڈاکٹر صفدر آہ نے خسرو کے ہندی کلام کو تدوین نہ کرنے کا سبب اس عہد کے پست ذہنیت ماحول کا ہونا بتایا ہے۔ ان کے نزدیک ــــــ

"اس معاملے میں قصور اس عہد کے پست ذہنیت ماحول کا ہے جس میں کسبی زبانوں کو تو عزت تھی اور مادری زبانیں ہیچ اور بے وقعت سمجھی جاتی تھیں ... ادبی صحبتوں اور درباروں پر فارسی چھائی ہوئی تھی اور شعر سننے سنانے کا کام اسی زبان میں ہوتا تھا اس صورت میں خسرو کا فارسی کلام تو محفوظ ہو سکتا تھا لیکن ان کا ہندی کلام کون جمع کرتا۔"

ــــــ امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر ص۱۸

خسرو کی ہندی شاعری کا جو کچھ سرمایہ موجود ہے وہ سب علم سینہ کی بدولت ہے۔ عوام نے اس کو محفوظ رکھا۔ تحریری طور پر، ان کے ایک دوہے کو ملا وجہی نے 'سب رس' میں پیش کیا ہے۔ یہی سب سے قدیم اور پہلی سند ہے۔ دوہا یہ ہے ؎

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
مج جلتی جنم گئی تیرے لیکھن باؤ

دوسری سند میر تقی میر کی ہے۔ انھوں نے تذکرہ نکات الشعرا میں خسرو کا یہ ریختہ نقل کیا ہے ؎

زرگر پسرے چو ماہ پارا
کچھ گھڑیے، سنواریئے پکارا
نقد دل من گرفت و شکست
پھر کچھ نہ گھڑا، نہ سنوارا

ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے خسرو کے ہندی شاعر ہونے کا ثبوت، خود خسرو کے کلام سے دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک خسرو کے ہندی شاعر ہونے کا تعلق ہے۔ ان کے اپنے فارسی کلام میں ایسی متعدد شہادتیں موجود ہیں، جن کے دیکھنے کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں باقی رہتی۔

دیباچۂ غرۃ الکمال میں یہ شعر فارسی اور ہندی دونوں بھاشاؤں کا ہو سکتا ہے۔

آری آری ہمہ پیاری آری
ماری ماری برہ کی ماری آری"

اس رباعی میں بھی ہندی الفاظ کا استعمال بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے ؎

رفتم بہ تماشائے کنارے جوئے
دیدم بہ لبِ آب زنے ہندوئے
گفتم صنما! بہائے زلفت چہ بود
فریاد بر آورد کہ دُر دُر موئے

ڈر ڈر موئے ہندی اور فارسی دونوں ہے

خسرو کے کلام کی تلاش جاری ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کو خسرو کی ہندوی کا ایک قدیم نسخہ ملا ہے۔ جس کو موصوف نے ایڈٹ کیا ہے۔ خسرو کی ساتویں صدی تقریبات میں بھی کچھ کلام ملا تھا۔ اب تک جو کلام فراہم ہوسکا ہے وہ سب میں نے "امیر خسرو اور ان کی ہندی کویتا" میں جو امیر خسرو سوسائٹی امریکہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے، شامل کرلیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ خالق باری ۔ ۱۹۴ اشعار

۲۔ ضمیمہ خالق باری ۳۴ اشعار

(اس میں کم و بیش ہندی، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے الفاظ بالترتیب یہ ہیں: ۵۳۷ - ۲۵۹ - ۵۰۷ - ۶ = ۱۳۶۹)

۳۔ بوجھ پہیلیاں ۲۹ ہیں

۴۔ بن بوجھ پہیلیاں ۱۱۳ ہیں

۵۔ کہہ مکرنیاں ۸۰

۶۔ دو سخنے ۲۱

۷۔ دو سخنے (فارسی، اردو، ہندی) ۱۲

۸۔ نسبتیں ۲۲

۹۔ غزلیں: ا۔ فارسی، ہندی، اُردو غزل ۱

ب۔ دو غزلیں ۲

۱۰۔ دوہے ۱۲

۱۱۔ خسرو کے گیت: بسنت، ساون، بابل وغیرہ } ۱۴

۱۲۔ قوالی ۶

۱۳۔ ڈھکوسلے ۷

۱۴۔ متفرق چھند ۲

ان میں "کھیر پکائی جتن سے"، شامل نہیں ہے اور نہ "تو ڈھنک رے ڈھنیے اپنی ڈھن"۔

عوامی ادب کی مقبولیت میں خسرو ہی کا جواب نہیں۔ اس کی مثال کسی زبان کے ادب میں مشکل سے ملے گی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے "ڈسکوری آف انڈیا" میں بالکل صحیح لکھا ہے:

"... انھوں نے عام بول چال کی ہندی میں جو گیت لکھے وہ نہ صرف ان کی زندگی میں مقبول ہوئے بلکہ ایسی مثال نہیں ہے کہ جو گیت چھ سو برس پہلے لکھے گئے وہ اب تک مقبول ہیں اور وہ کسی ترمیم کے بغیر اب تک عوام میں گائے جاتے ہیں۔"

نہرو جی کی اس تحریر سے یہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ خسرو کے گیتوں میں کسی ترمیم و اضافے کے قائل نہیں ہیں۔ مگر علم لسان کے نقطۂ نظر سے گیتوں میں بھی وقتاً فوقتاً ترمیم و اضافہ ہوتا رہا، اور خسرو کے سوزِ عشق اور صداقت جذبات کا یہ اعجاز ہے کہ ان کے گیتوں میں شامل ہوکر، ان الفاظ کو بھی حیاتِ ابدی نصیب ہوگئی۔ سچ ہے خسرو نے اپنے خونِ جگر سے اپنے فن میں ایسا دل آویز اعجاز پیدا کیا کہ ساری دنیا اس کی گرویدہ ہوتی گئی۔

خسرو کی ہندی شاعری، درد داغ، سوز و ساز، جستجو و آرزو کا مرقع ہے جو ہمیشہ دلوں کو بھاتی اور گرماتی اور تڑپاتی رہے گی ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

□□

چادر ۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۴۱ کا بقیہ

اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ چیخ چیخ کر گھر والوں کو جھنجھوڑ دے۔

"میرے بزرگو! میرے ساتھیو! ہر گھڑی چادروں کا خطرناک کھیل بند کرو۔ ذرا سی بات میں اسے گہرا رنگ دینا چھوڑ دو۔ گھر سے بازار تک لاکر اس کا تقدس برباد نہ کرو۔ اسے گھر کے اندر سنجو کر رکھو۔ یہ گھر کی چیز ہے۔ بازار میں لانے کی چیز نہیں۔

وقت بھی ہمیں تباہی سے آگاہ کر رہا ہے۔

کاش! ہم سنجیدہ ہو جائیں!!

□□

پروفیسر عابد پشاوری
شعبۂ اردو۔ جموں یونیورسٹی
جموں

اردو دوہے

پیسہ ہی ہے صیرفی پیسہ ہی میزان
پھل سے تلتا ہر شجر، پیسے سے انسان

بہت پرانا قول ہے نہیں سانچ کو آنچ
آج آنچ ہی آنچ ہے جانچ سکے تو جانچ

چاہے کتنی دھاک ہو چاہے کیسی ساکھ
نور سے روشن خاک ہے، نور نہیں تو راکھ

خود غرضی کے دور میں عابد کہے پکار
بے غرضی کے جرم سے بے غرضو! ہشیار

زیور پہلے روز کا یہ دوہری زنجیر
ظلم سرشتِ آدمی مظلومی تقدیر

وقت مچھیرا ہر طرف پھینکے گردش جال
دل دریا میں جب پھنسے بھولے اپنی چال

زنداں بے دیوار ہے، قیدی بے زنجیر
مفر نہیں بے سر دیے جرم نہ کچھ تقصیر

یا جذبے بے تھاہ ہیں یا جذبے بے راہ
خستہ شکستہ کشتیاں، طوفانوں کی چاہ

ہم بھی کوئی درخت ہیں اور وہ بھی پھلدار
جو بھی بیٹھے سائے میں جائے پتھر مار

سنگِ مرمر کا بدن جس سے پھوٹی شعاعیں
اک پتھر کی آب سے آئینے شرمائیں

نفس پرستی پاپ ہے نفس کشی بھی پاپ
مجھ کو کہنا ہے یہی باقی سوچیں آپ

پیراہن کے عکس سے چہرہ کندن رنگ
پلک اوٹ میں ہرنیاں سہمے سمٹے انگ

جب تک چڑھے نہ آنکھ میں تب تک خاک کمال
جیسے کیچڑ میں دبا کیچڑ ہی ہے لعل

سیرت سب بدصورتی صورت حسن تمام
الٹے الٹے آدمی، الٹے الٹے کام

بھرے سمندر دیکھیے گم گمبھیر خاموش
بے تہ اتھلی ندیاں جھاگ جھکولے جوش

من میلا کیوں کیجیے کرے جو کوئی گھات
جس کا جتنا ظرف ہے اسکی اتنی بات

آنکھیں بھی کشکول ہیں دانا کے نزدیک
دنیا بھر کے حسن کی بے مانگے لیں بھیک

جھلس گیا سایہ سبھی بچے ہیں صرف درخت
عابد اپنے دور کی دھوپ ہے کتنی سخت

زنداں خانہ زندگی مفر نہ جائے فرار
جس رخ آنکھ اٹھایئے نظر پڑے دیوار

قائم دائم زندگی، فکرِ مفر فضول
ہر فصلِ گل میں کھلیں اسی شاخ پر پھول

عابد صاحب چھوڑیئے کوشش کا اپدیش
وقت سے ملے نہ پیشتر بخت سے ملے نہ بیش

تنگ نہیں داماں بھی دل بھی نہیں ہے تنگ
یہ خالی، محروم وہ مولا تیرے رنگ

سب سورج کے رنگ ہیں سرخ سفید سیاہ
انگڑائی اک وقت کی وہی چور وہی شاہ

□□

وجاہت علی سندیلوی
سندیلہ۔ ہردوئی

پطرس بخاری کا فن

پروفیسر احمد شاہ بخاری نے پطرس کے قلمی نام سے ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان جو مزاحیہ خاکے اور انشائیے مختلف ادبی رسالوں میں شائع کرائے تھے ان کا مجموعہ "پطرس کے مضامین" کے نام سے پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا گیارہ مضامین کے اس مختصر سے مجموعے نے جو صرف ۱۵۰ چھوٹے سائز کے صفحات پر مشتمل تھا، چھپتے ہی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ ان مضامین کی اشاعت کے بعد بھی پطرس نے کچھ مزاحیہ مضامین لکھے تھے جیسے "بچے"۔ "اخبار میں ضرورت" اور "اب وتب" وغیرہ۔ مگر ان کو مجموعے میں شامل مضامین جیسی شہرت نصیب نہیں ہوئی اور وہ مجموعے کے بعد کے ایڈیشنوں میں شامل بھی نہیں کیے گئے۔ نیاز مندان لاہور کے نمائشی نام سے پطرس نے چند طنزیہ، جوابی تنقیدیں بھی لکھیں۔ ان میں غضب کی دراکی، برجستگی اور زور بیان پایا جاتا ہے۔ لیکن پطرس کی ادبی شہرت اور عظمت کی حقیقی بنیاد انھیں گیارہ مضامین پر قائم ہے جو ان کے پہلے اور آخری مجموعے میں شامل ہیں۔

اکثر و بیشتر تنقید نگاروں نے جن میں پروفیسر آل احمد سرور بھی شریک ہیں، پطرس کے بہت قلیل ادبی سرمایے کی بنا پر انھیں کسی بڑے ادبی منصب کا حقدار نہیں سمجھا ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اس سلسلے میں بڑی دوٹوک بات کہی تھی۔:

"پطرس اردو کے ظریفانہ ادب میں واحد شخصیت ہیں جنھوں نے ٹائپ کیرکٹروں اور تصویروں پر طنز کی نیت سے ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین لکھے اور انگریزی ادب کی مہذب شوخی کو اردو سے روشناس کیا۔ وہ مغرب کی طرف سے اٹھے ہوئے ابر کا ایک ٹکڑا تھے کہ برستے گزر گئے۔ بوندیں سب کو ملیں، پانی کسی کو نہیں۔ اتنے بڑے عالم اور مرد دانا صرف چند شوخ مضامین پر قناعت کرکے اتنا بڑا نام کمانے والے وہ تنہا اہل قلم ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی نہ ہوتی تو اپنے تھوڑے سے کام پر اتنا بڑا نام نہ پاتے۔"

مضامین پطرس کے انتخاب کے دیباچے ۱۹۸۴ء میں خود راقم السطور نے لکھا تھا:۔

"مزاح نگاری میں پطرس کی ۱۹۲۸ء کے بعد کم سخنی یا بے سخنی یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتی ہے کہ مزاح نگاری ان کا صرف شوق تھا فن نہیں۔ وہ اس کے لیے کوئی ریاض کرنے یا مشقت اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے ــــ انھوں نے ایک نو وارد کے جوش وجذبے میں اپنی پہلی ہی جست میں جن بلندیوں کو چھو لیا تھا ان کو دوبارہ باوجود کوشش وہ پھر نہیں چھو سکتے تھے۔ یہی بہت غنیمت ہے کہ انھوں نے اپنی حاصل کی ہوئی شہرت اور عزت کو بسیار نویسی پر قربان نہیں کیا۔"

یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے کسی کام کے بارے میں اس کی توقع سے کہیں زیادہ داد مل جاتی ہے

اکثر بہت Self conscious ہو جانے سے اس کے لیے پہلے کی طرح کام کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش میں اس کی ظرافت اور بے ساختگی مجروح ہو جاتی ہے۔

ان گیارہ مضامین میں بھی جنھوں نے پطرس کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں ایک ممتاز جگہ دلوائی ہے بعض مضامین جیسے 'میں ایک میاں ہوں'، 'انجام بخیر' ــــــــ اور 'سینما کا عشق'، وغیرہ کو قدرِ اول کی تخلیقات نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ پطرس کے مضامین کو ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں صحیفہ کہا جا سکتا ہے۔ اردو کی کتابوں کا خواہ کتنی ہی دقت نظری سے انتخاب کیا جائے دیوانِ غالب ہی کی طرح پطرس کے مضامین کا اس میں شامل کیا جانا ناگزیر ہوگا اور یہ بھی ایک دل چسپ لیکن داد طلب حسنِ اتفاق ہے کہ دونوں ہی مقابلتاً اردو کی مختصر ترین تصانیف میں سے ہیں۔

بعض اوقات کوئی بات خود اتنی اہم اور غیر معمولی نہیں ہوتی جتنی کہ اس کو اس کے عہد کا تاریخی سیاق و سباق بنا دیتا ہے۔ پطرس کے مضامین کو کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی۔ پطرس کے ورود سے قبل اردو ادب میں جس طنز و مزاح کا سکہ چلتا تھا وہ عموماً صحافتی قسم کا یعنی ہنگامی حالات سے متعلق ہوتا تھا اور بیشتر اصلاح تنقید یا تنقیص کے جذبوں سے بوجھل ہوتا تھا۔ عموماً بگڑے رئیسوں شیخی خوروں یا الٹی سیدھی حرکتیں کرنے والے مضحک کرداروں کو تختۂ مشق بنایا جاتا۔ اچھے مضاحیہ شہ پارے اس وقت بھی تخلیق کیے جاتے لیکن عموماً اہلِ قلم حضرات بقول شخصے گلگلوں میں زیادہ گڑ ڈالنے کے عادی تھے اور ہمارے اس نوع کے ادب کا جھکاؤ سنجیدہ مزاح اور پُرلطف برجستگی سے زیادہ پھکڑپن اور فقرے بازی کی جانب تھا۔ اس وقت ذہانت آمیز مزاح کے بجائے عوام عموماً اس ظرافت کو پسند کرتے جس کا اختتام قہقہوں پر ہوتا۔ ایسے دور میں پطرس کے ہلکے پھلکے لیکن تازگی اور شگفتگی سے بھرپور نوجوانی کے کھلنڈرے پن سے متعلق ایک نئے انداز کے خاکے منظرِ عام پر آئے تو ان کی دھوم مچ گئی اور خصوصاً نئے تعلیم یافتہ طبقے میں وہ بہت مقبول ہوئے۔ اردو ادب میں مزاح برائے مزاح کا یہ تجربہ نہ صرف غیر معمولی طور سے کامیاب ثابت ہوا بلکہ اس نے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔

پطرس کو انگریزی ادبیات میں بڑا شغف تھا۔ وہ نہ صرف انگریزی ادب کے پروفیسر تھے بلکہ بذات خود اس کے ایک بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ انگریزی طنز و مزاح دنیا کی دوسری زبانوں کے فکاہیہ ادب سے مقابلتاً زیادہ وقیع، بلیغ اور تربیت یافتہ سمجھا جاتا ہے۔ پطرس نے اس کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کے انداز اور اسالیب ان کے ذہن میں پوری طرح رچے بسے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے مزاح کی اساس شوخی، ذہانت اور خوش طبعی پر رکھی ہے۔ وہ کسی دوسرے کا حلیہ بگاڑ کر یا اس کی حماقتیں بیان کر کے اسے مذاق اور تمسخر کا نشانہ نہیں بناتے ہیں بلکہ اپنے آپ 'واحد متکلم' پر بیتے ہوئے پُرلطف تجربات اور واقعات کو اس درجہ سادگی اور پرکاری سے بیان کرتے ہیں جیسے ایک طرح سے ان پر ہنسنے ہنسانے سے منع کر رہے ہوں لیکن قاری ان کی اس ادا پر بے اختیار لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔

پطرس کے مضامین کے موضوعات میں سوائے دو تین کے کوئی خاص جدت یا ندرت نہیں ہے لیکن پطرس کے فن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے صرف اپنے لطفِ بیان سے معمولی کو غیر معمولی بنا دیا ہے۔ وہ بیشتر اپنے مضمون کی بنیاد مضحک واقعات پر رکھتے ہیں اور خود اپنے آپ کو ان کا نشانہ بناتے ہیں۔ "کتے" اور "لاہور کا جغرافیہ" ان کے لاجواب انشائیوں میں سے ہیں۔ آخر الذکر میں ایک بہت تیکھا جملہ ملاحظہ ہو:

"جہاں بجلی، پانی، بھاپ کا بڑا اہتمال لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔"

پطرس کے طنز میں بھی کیسی لطافت اور حلاوت ہے۔ بلا شبہ پطرس نے اردو ظرافت کو ایک نئے طرز اور آہنگ سے روشناس کرایا، اس کے آفاق کو وسعت بخشی اور اس کی جہات میں اضافہ کیا۔ درحقیقت وہ اس شاہراہ میں صرف ایک سنگِ میل کی نہیں بلکہ ایک ایسے

(باقی ص۱۶ پر)

غزلیں

عنوان چشتی

بی ۱۱۱، جامعہ نگر
نئی دہلی

شعور کی آنکھ جب کھلی تو عذاب دیکھے
ہر ایک چہرے پہ سو طرح کے نقاب دیکھے

جو اپنی آنکھوں سے میرے تابندہ خواب دیکھے
وہ اپنے فکر و نظر میں اک انقلاب دیکھے

بغور کوئی جوان کا طرزِ خطاب دیکھے
سوال کے آئینے میں عکسِ جواب دیکھے

درود پڑھنے سلام کرنے میں عمر گزری
"کتاب چہرہ" ورق ورق انتخاب دیکھے

وہی سمجھتا ہے زندگی کی حقیقتوں کو
ہر اک سمندر کی تہ میں جس نے سراب دیکھے

تری تمنا، ترا تصور، تری تجلی
یہ وارداتِ دلِ حزیں ہے کہ خواب دیکھے

شجاع خاور

۱، پارک لین،
نئی دہلی

سب جو کرتے ہیں اب وہی کیجے
یعنی چپ چاپ زندگی کیجے

چارہ گر کچھ نہیں بتائے گا
درد کہتا ہے جو وہی کیجے

اب تو حالت یہاں تک آ پہنچی
اس کے بندوں کی بندگی کیجے

آئے دن خامشی نہیں اچھی
یہ تماشا کبھی کبھی کیجے

مر کے بھی دیکھا جائے دو اک دن
کب تک ایسے ہی زندگی کیجے

سامعین اٹھ کے جا رہے ہیں شجاعؔ
رائج الوقت شاعری کیجے

عارف لکھنوی

داغ دہلوی یا ....؟

ایک متنازعہ غیر مطبوعہ خط

ماہنامہ "ماہِ نو" (کراچی) کے ایک شمارے میں، جس میں یہ تحریر نہیں ہے کہ جنوری ۱۹۸۷ء کا شمارہ ہے یا فروری ۱۹۸۷ء کا۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کا ایک تحقیقی مضمون "داغ دہلوی کا ایک غیر مطبوعہ خط" شائع ہوا تھا جس میں فاضل مضمون نگار نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنی تحقیقی کاوش کو اجاگر کرنے کی سعی فرمائی ہے لیکن اس میں کافی حد تک قیاس کے سہارے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چونکہ قیاس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی اور نہ اسے معتبر ٹھہرایا جاسکتا ہے اس لیے یہ گفتگو کچھ اور وضاحت چاہتی ہے تاکہ حقائق کی نشان دہی ہو سکے۔

یہ خط داغ دہلوی کا نہیں ہے۔

(۱) سب سے پہلے کسی بھی خط کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ خط لکھنے والا کون ہے اس کا طرز تحریر ہوتا ہے۔ داغ کی تحریر بہت پختہ تھی، جبکہ اس خط کی تحریر بہت اکھڑی ہوئی ہے۔

(۲) نواب کلب علی خاں والیِ رامپور کا انتقال ۱۸۸۷ء میں ہوا، جس کے کچھ عرصہ بعد داغ کو رامپور ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا وہ پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء سے جولائی ۱۸۸۹ء تک حیدرآباد دکن میں رہے۔ لیکن حضور نظام تک رسائی نہ ہو سکی۔ دوسری مرتبہ ۲۹ مارچ ۱۸۹۰ء کو داغ حیدرآباد آئے اور مستقل یہاں رہائش پذیر ہو گئے۔ حضور نظام تک رسائی ہوئی اور خوب نوازے گئے۔ تفصیل فاضل مضمون نگار لکھ چکے ہیں۔ داغ کے دوسری مرتبہ حیدرآباد آنے کے بعد آخر دم تک وہ کبھی مفلس نہیں رہے۔ بہت خوش حالی کی زندگی بسر کی۔ اس لیے یہ خط داغ کے دوسری مرتبہ حیدرآباد میں مستقل قیام کے زمانے کا نہیں ہو سکتا۔

(۳) داغ کے پہلی مرتبہ حیدرآباد آنے اور تقریباً سوا سال قیام کرنے کے دوران صرف قیاس سے کہا جا سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ "جلوۂ داغ" کے مؤلف علی حسن مارہروی نے داغ کی علالت کا ذکر کیا ہے لیکن تفصیل نہیں لکھی۔ یہ بات ۱۸۹۵ء کی ہے۔ اس لیے یہ قیاس کر لینا کہ وہ گر پڑے تھے اور چوٹ لگنے کی صورت میں یہ خط لکھا گیا، مصدقہ قرار نہیں دیا جا سکتا اس طرح تو یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ گٹھیا کے مرض کی شدت ہو گئی ہو کیونکہ داغ کی عمر ۱۸۹۵ء میں ۶۴ سال تھی اور یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ آخر عمر میں ان کے دونوں گھٹنوں میں گٹھیا کا درد مستقل رہتا تھا اور وہ اونی پٹیاں باندھے رہتے تھے۔

(۴) زیر بحث خط کی تحریر یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ "خرچ کو بہت جلد ....." کے آگے بھی تحریر ہے ...." روانہ کرو ۔ نادان"

(۵) یہ خط امراؤ مرزا نادان کا ہے جو داغ دہلوی کے بھتیجے تھے جیسا کہ خط کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے۔ "نادان" امراؤ مرزا نادان آغا شاغل دہلوی کے صاحبزادے تھے آغا شاغل داغ دہلوی کے بھائی تھے، سگے بھائی نہیں بلکہ داغ کی والدہ کے پہلے شوہر کے لڑکے تھے۔

(۶) امراؤ مرزا نادان ایک خوش فکر شاعر تھے اور داغ کے ساتھ حیدر آباد میں رہتے تھے۔ داغ کے انتقال ۱۹۰۵ء کے بعد کم و بیش تیرہ چودہ سال زندہ رہے۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان انتقال ہوا۔ انھوں نے شادی نہیں کی۔ شراب بہت پیتے تھے۔ داغ کے انتقال کے بعد نادان بہت تنگ دست ہو گئے۔ نہ کوئی ٹھکانہ رہائش کا نہ کوئی آمدنی کی سبیل رہی۔ ایسے وقت میں داغ کے دو شاگردوں نے ان کو سہارا دیا اور نادان کے تمام اخراجات برداشت کیے اور ان دونوں جگہوں پر ان کے قیام و طعام کا بندوبست ہو گیا۔ ان میں ایک نواب عزیز یار جنگ اور دوسرے نواب میر حسن علی خاں تھے۔ ان دونوں شاگردوں کو داغ سے بہت قربت تھی۔

(۷) تمکین کاظمی کا ایک مضمون ہے "حیدر آباد دکن کی چند شخصیتیں" اس میں نواب عزیز یار جنگ سے متعلق حالات میں ایک واقعہ تحریر ہے۔ عزیز یار جنگ نواب شرف جنگ کے فرزند تھے۔ حیدر آباد دکن کے قدیم شرفا میں ان کا خاندان بہت ممتاز تھا۔ داغ کے شاگرد رشید تھے۔ دو دیوان ایک واسوخت شائع ہو چکے ہیں۔ اچھے شعرا میں شمار تھا۔ داغ دہلوی نے جب ترپ بازار میں رہائش اختیار کی تو نواب عزیز یار جنگ ان کے بہت قریب ہو گئے زیادہ وقت داغ کی صحبت میں گزارتے تھے اور ان کے دیگر شاگردوں سے بھی بہت مانوس تھے۔ داغ کے بھتیجے امراؤ مرزا نادان، داغ کے انتقال کے بعد بہت پریشانی میں گھر گئے تو عزیز یار جنگ انھیں اپنے گھر لے آئے اور ان کے تمام اخراجات برداشت کرتے رہے۔

نادان کو مے نوشی کی عادت تھی، ان کا یومیہ مقرر کر دیا گیا تھا تاکہ ایک مقدار سے زیادہ نہ پی سکیں۔ ایک دن عزیز سے یومیہ وصول کر کے ترپ بازار کے نکڑ پر مے خانے سے پی اور نشہ کی حالت میں باہر نکلے ہی تھے کہ ایک تانگے سے ٹکرا گئے۔ بہت چوٹ آئی۔ چلنے سے معذور ہو گئے۔ لوگوں نے پہونچ کر اٹھایا تو فی البدیہہ یہ شعر سنایا ہے

ضعف سے کوچۂ جاناں میں گرا
میں نے ٹھوکر بھی کہاں کھائی ہے

ایسی حالت میں نادان نے زیر بحث خط لکھا تھا۔

(۸) امراؤ مرزا نادان نے یہ خط داغ کے دوسرے شاگرد جن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں، نواب میر حسن علی خاں کو لکھا تھا۔ نادان کی رہائش دونوں جگہوں پر تھی اور دونوں حضرات یعنی نواب عزیز یار جنگ اور نواب میر حسن علی خاں ان کے ساتھ برابر سلوک کرتے رہتے تھے۔ نواب میر حسن علی خاں کے پوتے، نواب میر یاسین علی خاں سے میری ملاقات ہوئی تھی ان کا مستقل قیام لندن میں ہے انھوں نے تصدیق کی کہ نادان کا یہ خط انڈیا آفس لائبریری لندن میں انھوں نے محفوظ کرا دیا ہے۔ یہ ایک ایسا ثبوت ہے جس کے بعد اب کسی بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔

(۹) خط کی عبارت پر غور کیا جائے تو دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں، ایک انداز تحریر۔ جس کو خط لکھا گیا ہے اسے مخاطب کس طرح کیا گیا ہے۔ داغ حضور نظام کو اس طرح نہیں لکھ سکتے۔ "خرچ کو جلد روانہ کرو" یہ طرز تحریر تہذیبی اقدار کے خلاف ہے۔ کسی مربی یا سرپرست کو، خصوصیت سے نظام دکن کو اس طرح لکھنا ناممکن ہے۔ ان سطور سے "تحکم" کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ داغ کا "تصدق" لفظ تصدق

جو عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں صدقہ دینا، طفیل، بدولت وغیرہ، اس سطر کو اگر یوں پڑھیں "داغ کے طفیل خرچہ جلد بہت جلد روانہ کرو"۔ "داغ کی بدولت خرچ جلد بہت جلد روانہ کرو"۔ کسی شخص کا صدقہ دوسرے کو دیا جاتا ہے، اپنا صدقہ خود نہیں لیا جاتا۔

(۱۱) ایک خیال اور کیا جا سکتا ہے کہ پہلی مرتبہ جب داغ حیدرآباد آئے اور تقریباً سوا سال یہاں رسمی انتظار میں قیام کیا لیکن حضور نظام تک باریابی نہ ہو سکی تو واپس چلے گئے۔ بے شک اس عرصہ میں وہ ضرور مالی اعتبار سے پریشان رہے لیکن اس وقت نظام دکن کو روپیہ کی طلبی کا خط لکھنا کہاں ممکن ہے جبکہ ان کے دربار میں باریابی ہی نہ ہو سکی۔

ان تمام تشریحات کے بعد خصوصیت سے نواب میر حسن علی خاں کے پوتے نواب میر یاسین علی خاں کے بیان کی روشنی میں کہ ناداں نے زیر بحث خط ان کے دادا کو لکھا تھا، جسے اب انھوں نے انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ کر دیا ہے، یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ روپیہ کی طلبی کا خط ناداں کا ہے۔

امراؤ مرزا ناداں اچھے شاعر تھے لیکن وارفتہ مزاجی میں عمر گزری۔ غزلیں کہہ کر تمام پرچے ایک تکیہ میں بھر کر جمع کرتے رہے انتقال کے بعد وہ تمام کلام عزیز یار جنگ کے پاس تھا، اب شاید ان کے افراد خاندان کے پاس محفوظ ہو۔ دیوان شائع نہیں ہوا۔

جب اتنا تذکرہ ہوا ہے تو امراؤ مرزا ناداں کے دو شعر اور پیش کرتا ہوں ؎

نمازِ عشق پڑھنی ہے مجھے طوبیٰ کے سائے میں
اٹھا لے جاؤں گا سجدے زمینِ کوئے جاناں سے

کیا بتاؤں کس پریشانی میں ہوں
سر سے جو اونچا ہے اس پانی میں ہوں

□□

پطرس بخاری

صفحہ ۱۲ کا بقیہ

روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے آج بھی روشنی اور گرمی حاصل کی جاتی ہے۔

مشتے از خروارے کے طور پر پطرس کے مضامین پر خود پطرس کے دیباچے کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

"اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے ——
ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں —— آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کا کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لیں۔"

□□

اپنے معاونین سے:

* ارسال شدہ تخلیقات کی اشاعت کے لیے عجلت نہ کریں کیونکہ تخلیقات کی بڑی تعداد پہلے ہی اشاعت کی منتظر ہے۔
* نثری یا شعری تخلیقات کی اصل کاپی ہی روانہ کریں کاربن یا فوٹو کاپی قابل قبول نہ ہوگی۔
* ارسال کردہ تخلیق کی نقل اپنے پاس ضرور محفوظ کر لیں۔

—— ایڈیٹر

مہدی پرتاپگڑھی
معرفت ایگزیکیوٹیو انجینئر
اریگیشن ڈویژن۔ پرتاپ گڑھ

ادراک

مقید ہو تم اپنے مسلک کے
اس دائرے میں
جہاں فہم و ادراک کی روشنی کا گزر
بھی نہیں ہے
تمہیں کیا خبر ہے کہ چاند اور سورج کی کرنیں
کسی فرد یا ذات تک ہو کے محدود رہتی نہیں ہیں
کوئی ان کا مذہب نہیں ہے
نسیم سحر کے ہوں پرکیف و گل بیز جھونکے
کہ ہو ننھے بچوں کے ہونٹوں پہ اُگتی ہوئی مسکراہٹ
کسی ماں کے چہرے پہ ممتا کی پاکیزگی
اور شفاف پانی کی لہروں
کا مذہب نہیں ہے
حقائق سے آنکھیں ملاؤ
کبھی ننگی سچائیوں کا بھی ادراک پیدا کرو
اپنے دل میں
حقیقی مسرت کا ہوگا گزر ذہن میں جب
تو کھل جائیں گے در نئی زندگی کے

ڈاکٹر سعید عارفی
قانون گوپورہ۔ بہرائچ

غزل

ستم گر کی طرفداری غلط ہے
اب اتنی بھی روا داری غلط ہے

کھلے دل سے ملاؤ ہاتھ صاحب
بناوٹ اور عیاری غلط ہے

پرکھنا ہے تو پرکھو ہم کو لیکن
تعصب کی عملداری غلط ہے

جو رُت بدلے گی خود ہی گل کھلیں گے
کسی کے خوں سے گلکاری غلط ہے

نہ لکھنا زندگی سے جو الگ ہو!
غزل میں ایسی فنکاری غلط ہے

جو دل بولے وہی کہیے زباں سے
تصنع اور اداکاری غلط ہے

نظر آئیں فقط کانٹے ہی کانٹے
سعید ایسی شجرکاری غلط ہے

سید احتشام حسین ٹانڈوی
محلہ میران پورہ، ٹانڈہ
فیض آباد

اختر الایمان کی شاعری میں "پیکر"

اردو شاعری کا ذکر آتے ہی عام قاری کا ذہن غزل ہی کی طرف جاتا ہے۔ بے شک اسے غزل کی مقبولیت کہا جا سکتا ہے۔ اس مقبولیت کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں انسان کے عاشقانہ جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے دوسرے یہ کہ انتہائی ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہوئے بات دو ہی مصرعوں میں مکمل کر دی جاتی ہے تیسرے یہ کہ اس میں تصورات کے حسین پیکر تراشے جاتے ہیں برخلاف اس کے نظم میں موضوع سے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے اور اکثر خشک موضوعات اور تلخ حقائق کو سپرد قلم کیا جاتا ہے۔ سبھی مصرعے ایک دوسرے سے زنجیر کی شکل میں مربوط ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بھی مصرعہ بیچ سے نکال لیا جائے تو نظم کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور شاعر کا مافی الضمیر واضح نہیں ہو پاتا۔

یہی وجہ ہے کہ عام قاری نظم اتنی دلچسپی سے نہیں پڑھتا جتنی دلچسپی سے غزل پڑھتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ زندگی کے تلخ حقائق سے فرار اختیار کر کے صرف ہوائی قلعے بنائے جائیں اور لب و رخسار سے کھیل کر زندگی کا بوجھ کسی طرح اتار دیا جائے۔ یہ نظریہ عوامی تو ہو سکتا ہے مگر خواص اس سے ہر عہد میں منحرف رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس دن آدمی کو یہ احساس ہوا تھا کہ وہ ننگا ہے اس کی شعوری زندگی کا پہلا دن تھا۔ اہل علم اور صاحبانِ عقل و فہم نے زندگی کے تلخ حقائق سے کبھی بھی چشم پوشی نہیں کی ہے بلکہ انھیں محسوسات کی نظروں سے دیکھا ہے۔

اختر الایمان کی شاعری تصورات کے برعکس تاثرات اور محسوسات کی شاعری ہے۔ اپنی ذات کے اظہار کے لیے انھوں نے کچھ مخصوص پیکروں اور علامتوں کا انتخاب کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو استعاروں سے مزین کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام قاری کو کبھی کبھی ان کے اشعار کو سمجھنے اور اس کی تہ تک پہونچنے میں دقت بھی محسوس ہوتی ہے اور جس کا انھوں نے اکثر اعتراف بھی کیا ہے مگر یہ ابہام "الحاد" کی حد تک نہیں پہونچتا بلکہ کچھ دیر غور کرنے کے بعد جب مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے تو قاری ایک جاں گاہ لذت میں گم ہو جاتا ہے۔

بقول اختر الایمان اگر کوئی پوچھے شاعری کیا ہے تو اس کا کوئی ایک تسلی بخش جواب نہیں ہے۔ سمجھنے اور سمجھانے کے لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا مرکب ہے جو ذہن کے دار العمل میں تیار ہوتا ہے اور اس کے اجزا میں زندگی کی جمالیاتی قدریں بھی شامل ہیں۔ سماجی، معاشی اور اخلاقی قدروں کی اتھل پتھل بھی رات دن پیش آنے والے حالات کا محاکمہ اور محاسبہ بھی اور خوش گوار و ناخوش گوار تصورات کی ترویج و تنقید بھی۔ مختصر یہ کہ جتنی بڑی اور لامتناہی زندگی ہے اتنی ہی بڑی چیز شاعری ہے۔

اس قول کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اختر الایمان نے ہر شعبۂ حیات میں دخیل و شریک ہونے کی خواہش کو ہی شاعری کا پیکر عطا کیا ہے وہ نہ ماضی کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور نہ روایات کا مذاق اڑاتے ہیں اور نہ جلد بازی میں کسی نظریے کے حامی بن کر بھیڑ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ انھیں نہ رومان اور جمالیات سے نفرت ہے اور نہ سماجی و معاشی مسائل کی حقیقت سے انکار ہے۔ وہ ہر لمحہ اور ہر لحظہ اپنی زندگی کا محاسبہ

بھی بڑی ایمان داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ انھیں ناخوش گوار حالات سے سمجھوتا کرنا بھی آتا ہے مگر سماج کی کمزور روایات کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی عادت نہیں کسی نئے نظریے کی تائید میں وہ اپنے پیشروؤں کا مذاق بھی نہیں اڑاتے ان کے ان تمام نیک اعمال، اعلیٰ افکار اور وسیع المشربی نے ان کی شاعری کے کینوس کو اتنا بڑا بنا دیا ہے کہ رومان، اشتراکیت اور احتجاج شاعری کے تین عظیم دھارے مل کر بحرِ بیکراں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

گھاس پھوس کے جھونپڑے سے نکل کر کسی طرح شہر کے یتیم خانہ تک پہونچنے والا شاعر یقیناً زندگی میں کیسی کیسی صعوبتیں اٹھا کر، کتنے تلخ تجربات سے گزرا ہوگا، اس کا اندازہ ان کی ایک نظم کے اس بند سے لگایا جاسکتا ہے۔ دنیا نے اس پر کتنے مظالم ڈھائے ہوں گے، کتنے لوگوں نے اسے حقیر نظروں سے دیکھا ہوگا۔ نہ جانے کتنوں کے سامنے اس کی گردن جھکی رہی ہوگی۔ کتنے صاحبانِ دولت نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا ہوگا۔ نہ جانے اس کے ساتھ کھیلنے والے کتنے لڑکوں نے اس کی مزاج پرسی کے بجائے اس کی مفلسی اور تہی دامانی کا مذاق اڑایا ہوگا۔ نہ جانے اس کے اپنوں نے اس کے ساتھ کیا کیا سلوک کیا ہوگا۔ اگر کسی سنجیدہ بچے نے عید کے دن بھی اس کے پھٹے پرانے کپڑے پہننے کا سبب اپنے والدین سے جاننا چاہا ہوگا تو انھوں نے بات کو کاٹ دیا ہوگا۔ نہ جانے کتنے اعزا و اقربا نے اس پر دستِ عاطفت پھیرنے کو معیوب سمجھا ہوگا۔ زبردست ٹھوکریں کھانے کے بعد ہی کوئی شخص اس طرح کا نظریہ قائم کرنے پر مجبور ہوا ہوگا ؎

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں
ایسے انسانوں سے پتھر کے صنم اچھے ہیں
ان کے قدموں پہ مچلتا ہو دمکتا ہوا خوں
اور وہ میری محبت پہ کبھی ہنس نہ سکیں
میں بھی بے رنگ نگاہوں کی شکایت کروں

مذکورہ بالا اشعار پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سماجی نابرابری ناانصافی اور غلط نظامِ تقسیم نے اوائل عمری ہی میں اخترالایمان میں احساس و جذبات کی سطح پر حالات کے خلاف نبرد آزمائی کی تحریک کا آغاز کر دیا تھا، اور منافقانہ سماج و رواج کے خلاف ان کے قلب و ذہن میں جدوجہد کی تخم ریزی کر کے انھیں ایک مخصوص طرزِ فکر کا حامل بنا دیا تھا۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہی یتیم، محروم اور بے کس اخترالایمان اپنی بار بار خاکستر ہو کر جگہ بدلتی ہوئی جھونپڑی سے نکل کر یتیم خانے اور یتیم خانے سے نکل کر اپنی تلخ و ترش یادِ ماضی اور عجیب و غریب تجربات ماضی و حال سے جب دنیا کے میلے میں قدم رکھتا ہے اور اپنی نظم "یادیں" کے مطابق ماضی کا ایک صفحہ پلٹتا ہے تو اسے کم عمری میں اپنے والد کے انتقال کے بعد تنہا ہو جانے کی یاد آتی ہے اور میلے کے تعلق سے بڑے اثر انگیز پیرایے میں کہتا ہے ؎

شہرِ تمنا کے مرکز میں لگا ہوا ہے میلہ سا
کھیل کھلونوں کا ہر سُو ہے اک رنگیں گلزار کھلا
وہ اک بالک جس کو گھر سے ایک درہم بھی نہیں ملا
میلے کی سج دھج میں کھو کر باپ کی انگلی چھوڑ گیا
ہوش آیا تو خود کو تنہا پا کے بہت حیران ہوا،
بھیڑ میں راہ ملی نہیں گھر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

مولہ بالا بند میں میلے کا کم سے کم الفاظ میں بچپن کی خواہشات اور تمناؤں کے مطابق مکمل اہتمام اور انواع و اقسام کے کھلونوں اور رنگ برنگی اشیا میں اس بالک کا، جسے گھر سے ایک درہم بھی نہیں ملا تھا، اس قدر محو ہو جانا کہ باپ کی انگلی چھوڑ کر میلے کی بھیڑ میں کھو کر تنہا رہ جانے کا اسے اس وقت احساس تک نہیں ہوتا۔ مزید براں اس کی معصومیت کا عالم یہ ہے کہ کسی چیز کو خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوئے بھی کھلونوں کی کشش اس پر حد درجہ طاری ہو جاتی ہے۔ یہ اخترالایمان کی فطرت نگاری اور فن کارانہ صلاحیت کا لوہا منوانے کے لیے کافی ہے اور ظاہر ہے کہ ہوش میں آنے (محویت ٹوٹنے) کے بعد اس کا حیرت ہونا لازمی ہے۔ نظم کے دوسرے بند میں وہی بالک دیکھتا ہے کہ دنیا کا میلہ جوں کا توں لگا ہوا ہے لیکن وہ بالک اب بالکل بچہ اور معصوم نہیں رہ گیا ہے کہ اس کی نظر کھلونوں کی چمک دمک سے الجھ کر رہ جائے

وہ بالک ہے آج بھی حیراں میلہ جوں کا توں ہے لگا
حیراں ہے بازار میں چپ چپ کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت کہیں نجابت کہیں محبت کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہ مفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

جو پہلے بند میں گھر سے خالی ہاتھ باپ کی انگلی تھامے میلے گیا تھا اور عمر کے تقاضے کے مطابق رنگ برنگے کھلونے دیکھ کر خوش ہو بیٹھا تھا، اب سنِ شعور کو پہنچ چکا ہے اور ہر چیز کا، ہر بات کا بغور جائزہ لے رہا ہے۔ دیکھتا ہے کہ اس کے جیسے نادار لوگ من پسند اشیاء کو حاصل کرنے کے لیے وہ ساری چیزیں فروخت کر رہے ہیں جنھیں بچائے رکھنے کے لیے وہ محرومیوں کو گلے لگائے در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ سخت تذبذب و تشکیک کا شکار ہو جاتا ہے کہ اپنے آدرشوں اور اصولوں کو گلے لگائے در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہے یا انھیں فروخت کر کے آرام اور آسائش خرید لے۔ اس وقت اختر الایمان اس بالک یعنی اپنے ضمیر کو وہیں چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں اور اپنی مرضی کی زندگی جینے کی لالچ میں حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں لیکن اس کے لیے انھیں کس کرب و اذیت سے گزرنا پڑتا ہے اپنے افکار و نظریات کا کس طرح گلا گھونٹنا پڑتا ہے اور ضمیر کے کیسے کیسے کچوکے سہنے پڑتے ہیں اس کا ذکر انھوں نے بڑے ہی موثر انداز میں اپنی نظم "یادیں" کے اگلے دو بندوں میں کیا ہے لیکن یہاں اس کی تفصیل غیر ضروری ہے کیونکہ زیر نظر مضمون میں میں اختر الایمان کی شاہکار نظم "ایک لڑکا" کا جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ نظم "ایک لڑکا" کا لڑکا دراصل وہی لڑکا ہے جو دنیا کے میلے میں اصولوں، آدرشوں، محبت و عقیدت کو بکتے دیکھ کر تشکیک اور تذبذب کا شکار ہو کر ٹھٹک جاتا ہے اور اختر الایمان اس سے پیچھا چھڑا کر حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ نتیجۃً اختر الایمان میں اتنی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں کہ زندگی کے ہر موڑ پر جب وہ لڑکا سامنے آتا ہے تو انھیں دیکھ کر بڑے تعجب سے سوال کرتا ہے کیا اختر الایمان تم ہی ہو؟ کیوں کہ وہ جس اختر الایمان کو جانتا ہے وہ تو ایسا نہیں تھا۔

بہر حال آمدم بر سر مطلب جناب اختر الایمان کی اس نظم کا ایک لڑکا آموں کے باغوں، کھیتوں کی منڈیروں، جھیلوں کے پانی، بستی کی گلیوں، بیسھریاں کسنوں کی رنگ رلیوں میں محو رم، جھٹپٹے کے وقت راتوں کے اندھیروں میں، کبھی میلوں میں، کبھی شوخی راہوں میں تتلیوں کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے کبھی ننھے پرندوں کو ان کے گھونسلوں سے پکڑتے ہوئے، کبھی جلتی ریت پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے، کبھی برفیلی ہواؤں میں ٹھٹھرتے ہوئے، کبھی بستیوں اور مدرسوں سے گریز کر کے خانقاہوں کی طرف رخ کرتے ہوئے، کبھی ہم عمر حسینوں کی مسرت آفریں محبت میں دل گنواتے ہوئے کبھی بیچاں بگولوں کی طرح، کبھی چشم خوں بستہ کی مانند کبھی جیسے ہواؤں کے تیرتے خوابوں میں بادل کی طرح اڑتے ہوئے پرندوں کی مانند شاخوں میں چھپ کر جھولتے ہوئے تند چشموں کے پانی کی طرح ایک آوارہ منش، آزاد، سیلانی لڑکا نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ بلائے جان میرا ہمزاد ہے۔ جو ہر جگہ اور ہر وقت اور ہر قدم پر سائے کی طرح یوں میرا پیچھا کرتا ہے جیسے میں کوئی مفرور ملزم ہوں اور استعجابیہ لہجے میں مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو۔؟ اور پھر نظم کے دوسرے بند میں خدائے عز و جل کی قادریت، حاکمیت اور اس کی بخششوں اور نعمتوں کے ذکر و اقرار کے ساتھ یک بیک بڑے ہی خوبصورت انداز سے گریز کرتے ہوئے کہتے ہیں ؂

اسی نے خسروی دی ہے لیموں کو مجھے نکبت
اسی نے یادہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تونگر ہرزہ کاروں کو کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

نظم کے پہلے بند میں اوائل عمری کی دلچسپی کے تمام مقامات کا ترتیب اور تواتر کے ساتھ تذکرہ صرف حسنِ بیان کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ وہ مقامات ہیں جہاں یہ لڑکا ؍ جسے اختر الایمان اپنا ہمزاد

قرار دیتے ہیں) پہلے بھی ان کے ساتھ رہا ہے لیکن کل اور آج کے اختر الایمان کے عادات و خصائل حرکات و سکنات میں اتنی تبدیلی ہو چکی ہے کہ اسے حیرت کے ساتھ پوچھنا پڑتا ہے کیا اختر الایمان تم ہی ہو؟ اور شاید اختر الایمان اس نظم کے سہارے کہنا بھی یہی چاہتے ہیں کہ اصول اور آدرش ہی انسانی کردار کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ان سے فرار اور انحراف سے انسان کی پوری شخصیت ہی بدل کر رہ جاتی ہے۔ اتنی بڑی بات جتنے تھوڑے الفاظ اور جس موثر پیرایہ اور مدلل انداز میں اختر الایمان نے کہہ دی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ نظم کا پہلا بند واضح ہونے کے ساتھ ہی بات بھی مکمل ہو چکی ہے لیکن میلوں ٹھیلوں کی سیر اور تتلیوں کے پیچھے بھاگ دوڑ جو کہ بچپن کے مشاغل ہیں اور وہ ہمزاد ہی کیا جو کہیں سے ساتھ چھوڑ دے لہٰذا نظم کے دوسرے بند میں بالغ نظر اور باشعور ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے خدائے عز و جل کی حمد میں مشغول نظر آتے ہیں لیکن اپنی جس نکبت اور فلاکت سے نجات پانے کے لیے اپنے اصولوں اور آدرشوں سے انحراف کیا تھا، جب وہ آج بھی اپنے گلے کا ہار پاتے ہیں تو ان کے تلخ کام ہو جاتے ہیں کہ سطحی طور پر سوچنے والے اسے "شکوہ" کا نام دے سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں انھوں نے مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی خودداری اور اپنے اصولوں کو قربان کر دینے والے انسان کے خیالات کی جیسی کامیاب عکاسی کی ہے اگر اسے معراج فکر و فن قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا اور یہ کہ طنز کا نشانہ بھی خود کو بنایا ہے۔ مثلاً استاد ذوق پر طنز کرتے ہوئے مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ظاہر ہے کہ مرزا غالب نہ کبھی شاہ کے مصاحب رہے نہ اس حیثیت میں رہ کر اترائے۔ البتہ ذوق استادِ شاہ بھی تھے اور اس تعلق سے انھیں احساس تفاخر بھی تھا۔

لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ اختر الایمان اپنے نظریات اور خیالات کا اظہار کر رہے ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اس سے حالات کے دباؤ میں آ کر اپنے آدرشوں اور اصولوں سے منحرف ہو کر اپنی خودداری کو قربان کر دینے والے کردار کے خیالات کا اظہار مقصود ہے اس کی وضاحت نظم کے اختتام پر ہو گئی ہے تو آیئے بات ایک بار پھر وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے یہ شوشہ نکل آیا تھا۔ نظم کے اس دوسرے بند میں اختر الایمان نے قصیدے کی تکنیک استعمال کر کے بہت ہی خوبصورت بنا دیا ہے۔ جس طرح قصیدے میں آغاز بہاریہ تشبیب سے ہوتا ہے پھر شاعر گریز کرتا ہوا ساقی نامے سے ممدوح کی مدح تک آتا ہے اسی طرح اختر الایمان حمد باری تعالیٰ اس کی تمام نعمتوں، بخششوں اس کی حاکمیت و قادریت کے اقرار کے ساتھ کسی نہایت صابر و شاکر اور اطاعت گزار بندے کی طرح کرتے کرتے یک بیک بات سے بات نکال کر بڑی خوبصورتی سے گریز کر کے حمد کو شکوہ میں تبدیل کرتے ہوئے برنہ کاروں اور لئیموں کو تونگری اور خسروی بخشنے اور اپنی نکبت اور دریوزہ گری کا ذمہ دار قادرِ مطلق کو ٹھہراتے ہوئے اپنے ہاتھ پسارنے کا جواز پیدا کرتے ہوئے پہلے کے خوددار اختر الایمان کو موجودہ دریوزہ گر اختر الایمان کے روپ میں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ فرد کا پھر سوال کر سکے کہ کیا اختر الایمان تم ہی ہو؟

نظم کا تیسرا بند معاشرے میں غلط نظامِ تقسیم کے تعلق سے یہ کہتے ہوئے شروع کرتے ہیں ؎

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضے میں
جز اک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں پھر بھی مگر مجھ کو
خروشِ عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ہے

دوسرے مصرعے میں "پھر بھی" اور "مگر" ایک دوسرے کے مترادف ہیں اور بہ لحاظ صرف و نحو غلط اور بہ اعتبار فنِ شاعری دونوں میں سے ایک حشو محض ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نظم کی تکنیک اور مقصد کی طرف ساری توجہ مرکوز ہونے کی وجہ سے استغراق اور روانی میں زبان کے اس پہلو کی طرف خیال ہی نہ گیا ہو۔ بالفرض محال اگر یہ سہو ہے بھی تو اسے اس نظم کے خوش کن اور خوبصورت "لڑکے" کے عارض گلگوں پر نظر کا کالا ٹیکہ سمجھ لیجئے۔ آیئے اب ذرا دیکھتے ہیں کہ نظم کے اس تیسرے بند کے تیسرے مصرعے میں خروشِ عمر کے اتمام

تک جس کو اٹھانے کی بات کہی گئی ہے وہ بار کون سا ہے۔

عناصر نشتر ہو جانے نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے

معلوم ہوا کہ بات اب نہایت ہی حساس نکتے تک آ پہونچی ہے یعنی "ذکر شاعر" جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ؎

جب کوئی حادثہ کون و مکاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دل شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

یہ تو ہوئی شاعر کی فطری صفت، لیکن یہ شدت احساس شاعر ہی میں نہیں دوسروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ البتہ شاعر کو اپنے الفاظ میں ڈھال دینے یعنی قادر الکلامی اور موزونیت کا سلیقہ بھی فطری طور پر ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ احساسات کو الفاظ کی صورت میں پیش کرتا ہے لیکن اختر الایمان اس کے لیے نوائے صبح ہو یا نالۂ شب "کچھ بھی گانا ہے" کہتے ہیں۔ اس کے بعد کے آخری ۳ مصرعے ملاحظہ ہوں تاکہ بات اور کھل کر واضح ہو جائے ؎

غرض گرداں ہوں باد صبح گاہی کی طرح لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو

غرضیکہ ان تمام سرگردانیوں اور پریشانیوں سے گھبرا کر زندگی میں تھوڑا سا اُجالا لانے کے لیے جب تاریکیوں کا دامن تھامتے ہیں (حالات سے سمجھوتہ کرتے ہیں) تو یقیناً اصول پرست اختر الایمان کو جاننے والے لڑکے (ضمیر) کا ٹوکنا بھی لازمی ہو جاتا ہے اور اختر الایمان کا جھلا کے یہ کہنا بھی، جو انھوں نے نظم کے اختتامی بند میں کہا ہے ؎

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج اندوہ پرور اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ہے وہ
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاک عالم پھونک ڈالے گا

خود احتسابی (نظم) مکمل ہو چکی۔ اختر الایمان یہ اعتراف بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ اصول پرست اور خوددار اختر الایمان، وہ مضطرب اندوہ پرور اور آشفتہ مزاج کب کا مر چکا ہے وہ خود ہی فریبوں کا کفن دے کر اسے اس کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آئے ہیں۔ وہ شعلہ جو خاشاک عالم کو جلا ڈالنے کا عزم رکھتا تھا کب کا سرد ہو چکا ہے ؎

یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں

اور یہ سچ بھی ہے کہ اتنے کاری زخموں کے باوجود اگر اس لڑکے (اختر الایمان کے ضمیر) میں خود احتسابی کی سکت باقی ہے تو اس کی موت کی خبر غلط ہے وہ یقیناً زندہ ہے۔

□□

فرح رحمن
۱۵۳ ۔ قندھاری لین لکھنؤ

غزل

ڈھونڈھا تھا وہ نادان تھی میں خود کی بھٹکائی ہوئی
پھر اتفاقاً مجھ سے اک پیاری سی دانائی ہوئی

وہ ساتھ رہتا ہے مرے لیکن مجھے اُلجھن بھی ہے
وہ سخت باغی جھوٹ سے، میں سچ سے گھبرائی ہوئی

بیباک اس کی ہر ادا وہ آگیا تھا سامنے
جاگی تھی میں اپنے حسیں سپنوں سے شرمائی ہوئی

ہر غم مسرت بن گیا دل کہہ کے ہلکا ہو گیا
اس سے لپٹ کر رو دیے کیا غم جو رُسوائی ہوئی

ہم دو دلوں کے درمیاں دُنیا نے کچھ ایسا کیا
پُر عزم آنکھوں میں بھی تھی اک بے بسی چھائی ہوئی

تصویرِ گلشن بن کے وہ دل میں مرے آیا فرح
تھی گلستاں کی ہر کلی مستی میں لہرائی ہوئی

خالد حسین خاں
شعبۂ اردو، میرٹھ یونیورسٹی
میرٹھ

شہیدِ وطن
اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی

انسانی سیرت و کردار کا بہ نظرِ غائر مطالعہ ایک مستحسن اور کار آمد مشغلہ ہے۔ ہمارے پیش رو بزرگوں نے اپنے فقید المثال اور شاندار کارناموں کی روشن شمعوں سے حیاتِ انسانی کی گزرگاہوں کو جس طرح تابناک اور منوّر کیا ہے، ان کے بارے میں تفصیلی معلومات کی فراہمی اور ان معلومات کو خود اپنے اعمال و افکار اور اقوال کی اساس بنانا ہر ذی شعور اور دانش مند قوم کا فریضہ ہے۔ اس خیال کی وضاحت اور تائید مشہور مفکر تھامس کارلائل نے یوں کی ہے:-

"جو لوگ اپنے بزرگوں کے کارناموں کو فخر و مباہات کے ساتھ نہیں دیکھتے وہ گویا یہ طے کر چکے ہیں کہ وہ خود بھی کبھی عظیم المرتبت نہیں بنیں گے۔"

مذکورہ قول کی روشنی میں جب ہم اپنے وطنِ عزیز پر، جس کو شاہجہاں پور کے ایک ممتاز نقاد، پروفیسر قمر رئیس نے ویران بستی سے تعبیر کیا ہے، نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہاں ہر مکتبِ فکر کے نمائندہ مصنفین، مفکرین، سیاسی قائدین، ادیب و شاعر اور سب سے بڑھ کر حریت پسندوں کا ایک جگمگاتا قافلہ نظر آتا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ شاہجہاں پور جو لکھنؤ کے بعد ادبی، تہذیبی، سیاسی اور انقلابی گہما گہمی کا عہدِ قدیم سے ایک اہم مرکز رہا ہے اس کے باوصف اس کی گوناگوں صفات سے نہ صرف اہلِ شہر بلکہ ہندستانی عوام بھی نابلد ہیں۔

ارضِ شاہ جہاں پور کے مردم خیز خطہ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یہاں ایک جانب اگر بزرگانِ دین، اولیائے کاملین، صوفیاء، شعراء، ادباء اور علماء پیدا ہوئے تو دوسری جانب ہندستان کی جنگِ آزادی میں نمایاں حیثیت و عالمگیر شہرت رکھنے والوں نے بھی یہاں جنم لے کر اس شہر کو عزت و توقیر بخشی۔۔!

اس ضمن میں شہیدِ وطن اشفاق اللہ خاں کا نام نامی سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے شاہ جہاں پور کے ایک زمیندار گھرانے میں ۲۲ / اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء کو آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد کا نام شفیق اللہ خاں تھا۔ یہ محلہ ایمن زئی جلال نگر کے صاحبِ ثروت رئیس اور شہر کے ایک باعزت زمیندار خاندان کے سربراہ تھے۔

اشفاق اللہ خاں کی ابتدائی تعلیم، ان کی آبائی حویلی میں مروجہ دستور کے مطابق ہوئی۔ خاندانِ شرفاء کی مانند انھوں نے مذہبی تعلیم، جو اردو، فارسی اور قرآن کریم پر مشتمل تھی، اپنے گھر کی چار دیواری میں حاصل کی۔ بعدہٗ شہر کے قدیم ادارے "مشن ہائی اسکول" میں ان کو داخل کر دیا گیا۔ اس اسکول میں شہر کے ایک معروف سیاسی اور جوشیلے انقلابی نوجوان پنڈت رام پرشاد بسمل بھی زیرِ تعلیم تھے۔ ان کے زیرِ اثر نوخیز اشفاق اللہ خاں بھی سیاسی معاملات میں ان کے نہ صرف ہم خیال بنے بلکہ گہرے دوست بھی ہو گئے۔ دونوں ہمہ وقت ساتھ ساتھ رہنے لگے۔

مادرِ ہند کی تابناک جبیں سے داغِ غلامی مٹانے میں جہاں لاتعداد نوجوان سرگرمِ عمل تھے وہیں نوخیز اشفاق اللہ خاں کا بھی ان حالات سے

شاعری میں فطری تھا۔ ان کے قلب و ذہن میں آزادیٔ وطن کا خیال بتدریج شدت اختیار کرتا گیا۔ اور وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے ان کے جذبات میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ رام پرشاد بسمل کی رہنمائی میں ایک انقلابی گروہ فرنگیوں کے خلاف سرگرم ہو گیا۔ اس گروہ میں نوجوان اشفاق اللہ خاں کی حیثیت بہت نمایاں اور ممتاز تھی۔ اس انقلابی گروہ کے سامنے روپیہ کی فراہمی کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ کیونکہ فرنگیوں کے خلاف کوئی بھی غیر معمولی قدم مالی وسائل کے بغیر ناممکن تھا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے انقلابی گروہ کی ایک ہنگامی میٹنگ پنڈت رام پرشاد بسمل کی صدارت میں منعقد ہوئی اور اتفاق رائے سے تمام ممبران نے طے کیا کہ حکومت کی کاٹ خود حکومت ہی کے خزانے سے کی جائے۔ اتفاق سے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے جلد ہی ایک موقع بھی قدرت نے فراہم کر دیا۔

۱۹۲۵ء میں پنڈت رام پرشاد بسمل کی سربراہی میں "کاکوری اسٹیشن" پر ریل روک کر حکومت کا خزانہ لوٹ لیا گیا۔ اس واقعہ نے ہندوستان بھر میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ انگریزی سرکار اس حادثہ سے بوکھلا اٹھی اور اپنی ہتک و بے عزتی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ اس کیس کے فعال اور نوجوان انقلابی ممبروں کی تلاش کا کام جنگی پیمانے پر شروع ہو گیا۔ اشفاق اللہ خاں دہلی کے ایک مکان سے گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کے بعد مشہور زمانہ "کاکوری کیس" دو سال تک چلتا رہا۔ حکومت کی جانب سے وعدہ معاف گواہ بن جانے کی صورت میں بری ہو جانے کا فریب بھی دیا گیا۔ مگر تاریخ ہند شاہد ہے کہ اس جیالے، حریت پسند پٹھان نوجوان، اشفاق اللہ خاں نے اس غلامانہ بے عزتی اور ہتک کو کسی طور پر قبول نہ کیا۔

اس طرح شاہجہاں پور کے ایک معزز اور با اثر زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ کو انگریزی حکومت نے ۱۸ دسمبر ۱۹۲۷ء کو فیض آباد سنٹرل جیل میں تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ شیر دل، بے باک اور مرد مجاہد اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی نے اس تاریکی اور دائمی موت کو ہنستے ہوئے مندرجہ ذیل شعر گنگنا کر لبیک کہا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

تنگ آ کر ہم بھی ان کے ظلم سے بے داد سے
چل دیے خلد عدم زندان فیض آباد سے

شہید وطن اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی کی شخصیت کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی اور شاعری میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ ان کے اشعار ان کے قلبی جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ موصوف اوائل عمری سے ہی مادر وطن کی غلامی سے بہت دل برداشتہ تھے، اس جذبہ میں اور شدت "مشن ہائی اسکول" میں داخلہ کے بعد پیدا ہو گئی۔ پنڈت رام پرشاد بسمل (شاہجہاں پوری) کے زیر اثر اس آگ نے شعلۂ جوالہ کا روپ لے لیا۔ ان کے رگ و پے میں مادر ہند کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس والہانہ جوش و خروش اور جذبہ کی ترجمانی کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری کے وسیلہ سے شروع کیا۔ اس طرح اشعار کی پھوار ان کے دل و دماغ کی حدت کو کم کرنے کے ساتھ ہی سکون و طمانیت کا ذریعہ بھی ثابت ہوئیں۔ وہ اپنے دل کے پھپھولے، اپنی شاعری کے وسیلے سے پھوڑنے لگے۔ ان کی دلی کیفیت کی غمازی ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی ہوتی ہے۔

موت سے ویر کو ہم نے نہیں ڈرتے دیکھا
تختۂ موت پہ بھی کھیل ہی کرتے دیکھا
بزدلوں کو ہی سدا موت سے ڈرتے دیکھا
گو کہ سو بار انھیں روز ہی مرتے دیکھا

وطن ہمیشہ رہے شاد کام اور آزاد
ہمارا کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے

خموش حسرت خموش حسرت اگر ہے جذبہ وطن کا دل میں
سزا کو پہنچیں گے اپنی جنک جو آج ہم کو پھنسا رہے ہیں

تنہائی غربت سے مایوس نہ ہو حسرت
کب تک نہ خبر لیں گے یاران وطن میری

(باقی ص ۲۷ پر)

شکیل صدّیقی
مرتضیٰ حسین روڈ
لکھنؤ

ہماری فلمیں اور قومی مسائل

فلم ایک ایسا آرٹ ہے جو مختلف فنونِ لطیفہ کا مجموعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آرٹ ہمارا رہنما بھی ہوتا ہے اور ناقد بھی۔ آرٹ ہمیں راستہ ہی نہیں دکھاتا بلکہ ہمارے عمل اور رویّوں پر تنقید بھی کرتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آرٹ انسانی زندگی اور حالات کا آئینہ ہی نہیں ہوتا بلکہ حالات اور زندگی کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔

دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح فلم نے بھی اپنی یہ ذمہ داری نباہنے کی اپنے طور پر مسلسل کوششیں کی ہیں۔ ہماری فلموں کا رشتہ ابتدا ہی سے انسانی زندگی سے رہا ہے۔ دورِ جدید میں آرٹ سینما کے تعلق سے یہ رشتہ مزید مستحکم ہوا۔ لیکن کمرشیل سینما کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی زندگی سے فلموں کا رشتہ ٹوٹنے کی منزل تک جا پہونچا۔ ہمارے ملک میں فلم سازی کا آغاز ہی قومی جذبے اور نظریے کے تحت ہوا۔ آزادی، اتحاد اور سماجی برائیوں کے خلاف بیداری نیز انسان دوستی ہماری فلموں کے ابتدائی دور کے اہم موضوعات تھے۔ سنگھ ناد، سیر ندھی، راج پوتنی، مہاتما، سیوا سدن، ہنٹر والی، مزدور، ترانہ، اپنا گھر، کرسمس اور اچھوت کنیا جیسی فلمیں بنا کر اس اہم قومی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی گئی۔

وی شانتا رام کی فلم "مہاتما" اور ہمانشو رائے کی فلم "اچھوت کنیا" میں ذات پات سے متعلق مسئلے کو گہری انسان دوستی کے جذبے کے ساتھ اٹھایا گیا تھا۔ "سیوا سدن" عورتوں کے مسائل پر بنائی گئی تھی جو پریم چند کے ناول پر مبنی تھی۔ "اپنا گھر" میں غلامی اور زمینداروں کے ظلم کے خلاف غصّے کا اظہار تھا۔

ملک کی آزادی کے بعد ہماری فلموں نے نئی کروٹ لی اور ہندستانی سینما کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ ملک تو آزاد ہو گیا تھا لیکن متعدد مسائل سے دوچار تھا۔ بھوک، غریبی، بے روزگاری، ناخواندگی، لسانی اور نسلی تفرقے، فرقہ وارانہ منافرت، عورتوں پر مظالم، چھوٹی کہی جانے والی ذات کے لوگوں پر جبر، کسانوں کی بدحالی، مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ، کالا بازاری، منافع خوری، گاؤں سے شہر کی طرف بھاگتے لوگ، بے گھری کا المیہ، اقدار کی شکست و ریخت، فٹ پاتھ پر خالی پیٹ سوتے بچے، جرائم کی دنیا آباد کرنے والے بچے اور کوٹھریوں میں جسم فروشی پر مجبور ان کی مائیں، سیاسی اقدار کا زوال اور مذہب کے نام پر فریب اور بھولے بھالے عوام کا استحصال۔ مختصر یہ کہ نہ صرف حکومت کے لیے بلکہ ہندستانی آرٹ کے لیے بھی یہ مسائل ایک چیلنج کی طرح موجود تھے۔

ان مسائل میں شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ہو جسے ہماری فلموں نے اپنا موضوع نہ بنایا ہو۔ دراصل بامقصد سینما کا مطلب ہی تھا قومی مسائل سے آنکھ ملانا۔

مسائل کی عکاسی فلم ساز اور ہدایت کار کے ارادے کی پختگی، مقصد کی ایمان داری، فنی صلاحیت اور بصیرت پر منحصر تھی اسی لیے قومی مسائل پر مبنی فلموں میں سے اگر کچھ فنی لحاظ سے بہت کامیاب اور یادگار فلمیں ہیں تو کچھ مسائل کو صرف جذباتی سطح پر ہی پیش کر سکیں۔ بعض ایسی فلمیں بھی وجود میں آئیں جن میں نہ جذبہ تھا نہ فن

دراصل مسئلے کے بارے میں پوری آگہی اور فنی تقاضوں کو پورا کیے بنا اچھی فلم نہیں بنائی جا سکتی۔

دیوکی بوس، وی شانتا رام، بمل رائے، محبوب، شیورام کارنت، خواجہ احمد عباس، بی آر چوپڑا، ضیا سرحدی، گرودت، ستیہ جیت رے، مرنال سین، رتوک گھٹک، گوتم گھوش، شیام بینیگل، ستھیو، اروندن، اڈور گوپالا کرشنن، مظفر علی، اپلیندو چکرورتی، کیتن مہتا، سعید مرزا اور میرا نائر ہندستانی سینا کے چند ایسے اہم نام ہیں جنھوں نے قومی مسائل کو اپنی زندگی اور فن کا مسئلہ سمجھا۔ اسے اسی طور پر قبول کیا اور اپنی فلموں میں پیش کیا۔

بلاشبہ ان میں سے چند نے بعد میں راہِ فرار اختیار کرلی۔ اور تجارتی مفاد ان کی فلمی زندگی کا مقصد بن گیا۔ اس سے بامقصد سینا کو کچھ نقصان ضرور پہونچا لیکن اس کا وجود بہر حال برقرار رہا۔ ہمارے ملک میں عورتوں کے مسائل پر سب سے زیادہ فلمیں بنائی گئیں اور وہ مقبول بھی ہوئیں۔ عورتوں کے ساتھ ناانصافی اور ان پر مظالم، ان کی پس ماندگی، ناخواندگی اور زندگی کی جدوجہد میں ان کی حصہ داری کو تسلیم نہ کرنا اور ان کے رول کو محدود کرنا یقینی طور پر اہم مسائل ہیں اور ان کی طرف فلم سازوں کا دھیان جانا ہی چاہیے تھا۔ اس ضمن میں سجاتا، درانڈیا، سندھیا، استری، عورت، پیاسا، بندنی، سوداگر، ان پڑھ، چکر، بھومیکا، چیتنا، بازار، آکروش، منڈی اور سلام بابے جیسی فلمیں قابلِ ذکر ہیں۔

کئی فلموں میں طوائف کی دکھ بھری زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ چکر جیسی فلم کو ہم جھونپڑ پٹی کی زندگی کا آئینہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ سجاتا اچھوت مانی جانے والی عورت کے درد کی آئینہ دار ہے۔ جاگرتی، دھرتی کے لال، بوٹ پالش، معصوم، سن آف انڈیا اور سلام بابے کو بھی اگر اس میں شامل کرلیں تو بچوں کے مسائل پر بھی کئی فلمیں بنی ہیں۔ لیکن ایک اچھی اور مکمل فلم کا انتظار بچوں کو اب بھی ہے۔

نوجوانوں کی بے روزگاری اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل پر جتنی اچھی فلمیں ملیالم اور بنگلہ زبانوں میں بنیں۔ ہندی میں اتنی اچھی فلمیں نہیں بن سکیں۔

ذات پات کی تفریق کے پیچیدہ اور خطرناک مسئلے پر بھی ذہنوں کو بیدار کرنے والی فلم ابھی بننا باقی ہے۔ لیکن بمل رائے کی سجاتا کے علاوہ تیل مالش، بوٹ پالش، ایک ہتی تین راہیں، بدلیا اور منتھن جیسی فلموں نے اس مسئلے کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ آرٹ سینا سے وابستہ فلم سازوں کی اس مسئلے پر بننے والی فلمیں احتجاج کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ قومی مسائل سے وابستہ فلموں کی روایت میں اسے ہم ایک اہم اضافہ کہہ سکتے ہیں۔

فرقہ پرستی کا مسئلہ بھی اس انتظار میں ہے کہ کوئی گہری نظر اور صاف ستھرے ذہن والا ہدایت کار اس کی طرف توجہ کرے اور دھرم پتر، سات ہندستانی اور گرم ہوا کی شان دار روایت کو آگے بڑھائے۔ ناانصافی ہوگی اگر اس سلسلے میں سعید مرزا کی فلم 'سلیم لنگڑے پر مت رو' کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ اس فلم میں انھوں نے بھرپور فنی صلاحیتوں اور نظریہ کی پختگی کو بروئے کار لاکر اپنی تخلیق کو شاہ کار بنا دیا ہے۔ یہ فلم حالات کا تجزیہ بھی ہے اور ایک انتباہ بھی۔

دیوکی بوس کی 'اپنا گھر' کے بعد ضیا سرحدی کی 'فٹ پاتھ' اور 'ہم لوگ'، راج کپور کی 'جاگتے رہو' اور خواجہ احمد عباس، وی شانتا رام اور کچھ دیگر فلم سازوں کی چند فلموں کے نام بھی اس سلسلے میں لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس روایت کو صحیح معنوں میں بمل رائے کی فلم دو بیگھہ زمین نے آگے بڑھایا۔

کسانوں کی بدحالی اور ان کا استحصال ایک بڑا قومی مسئلہ ہے۔ محبوب نے ان مسائل پر جذباتی انداز میں کئی فلمیں بنائیں۔ لیکن مدر انڈیا بنا کر تو انھوں نے کسانوں کی جدوجہد کو نئی راہ دکھائی۔ یہ فرار سے انکار اور زمین سے پیار کرنے کی راہ تھی۔

شیام بینیگل، ستھیو، بدھ دیو داس گپتا، گوتم گھوش نے بھی گاؤں کی زندگی اور مسائل پر حقیقت سے قریب تر گہرا اثر چھوڑنے اور یاد رہ جانے والی فلمیں بنائیں جن سے فلم کے فن کو نئی بلندیاں ملیں۔ راجستھان کے گاؤں میں پانی کی شدید قلت کو خواجہ احمد عباس نے 'دو بوند پانی' کا موضوع بنایا ہے۔ خواجہ احمد عباس کی فلمیں

عام طور پر مسائل سے ذہن اور جذبہ دونوں کی وابستگی کی بہترین مثالیں ہیں۔

پریم چند کے شاہکار ناول "گئودان" پر فلم بنا کر کسانوں کی زندگی اور ان کی جد و جہد کو سینما کے پردے پر لانے کی کوشش تو ضرور کی گئی لیکن قابل افسوس امر یہ ہے کہ ہندستان میں کسانوں اور مزدوروں کی تحریکوں پر ابھی تک کوئی قابل ذکر فلم نہیں بنی۔

سیاسی اقدار کے زوال کو سینما کے کیمرہ نے ہر ممکن فنی مہارت کے ساتھ اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کئی شاہکار فلمیں وجود میں آئیں۔ مثال کے طور پر "قصہ کرسی کا"۔ "اردھ ستیہ"۔ "نیو دہلی ٹائمز"۔ "پرتیگھات"۔ "پارٹی"۔ "کل یگ"۔ "پرتی بندھ" اور آج کا ایم ایل اے وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

سماجی اقدار کی شکست و ریخت پر بھی اچھی فلمیں بنائی گئی ہیں۔

اگر لال فیتہ شاہی بھی ایک قومی مسئلہ ہے تو اس مقام پر انسان کی زبردست بے بسی اور لاچاری کے پُراثر مناظر فلم "آگھات" اور "موہن جوشی حاضر ہوں" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

بڑے شہروں میں ایک طرف اونچی عمارتوں کا سلسلہ ہے اور دور تک پھیلے ہوئے مکانوں کے جنگل ہیں تو دوسری طرف ان کے سائے میں بے گھری کے مسائل بھی موجود ہیں۔ سر چھپانے کے لیے چھت نہ ہونے کا درد ہے۔ "شہر اور سپنا"، "بمبئی رات کی بانہوں میں" اور چند دوسری فلموں میں اس مسئلے کی طرف اشارے ضرور ملتے ہیں لیکن کوئی مکمل فلم شاید اس موضوع پر ابھی نہیں بنی ہے۔

فلم "اسپرش" میں معذور لوگوں کے المیہ اور مسائل کی خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ فلم "کوشش" میں گونگے اور بہرے لوگوں کے جذبات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔

ثقافتی اور تمدنی ٹکراؤ کو کئی فلموں کا موضوع بنایا گیا لیکن ان میں سے اکثر فلمیں سطحی ثابت ہوئیں۔ ملک میں ثقافتی اور تمدنی ہم آہنگی اور یکجہتی پر فلم بنانے کا خطرہ کسی نے مول نہیں لیا۔

"پیغام"، "سنگم"، "نمک حرام" اور "کل یگ" کو ہم دوردرشن کی فلم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ایک ایسی فلم جس میں پوری صنعتی زندگی بول اٹھے ابھی بننا باقی ہے۔

□□

اشفاق اللہ خاں ——— صفحہ ۲۲ کا بقیہ

وہ جرم آرزو پہ جس قدر چاہیں سزا دے لیں
مجھے خود خواہش تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری

جنون حبِ وطن کا مزہ شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

پھانسی کے پھندے کو ہنستے ہوئے گلے لگانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے فولاد کا جگر چاہیے۔ اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی سے فیض آباد سنٹرل جیل میں جلاد نے جب ان کی آخری آرزو اور وصیت دریافت کی تو ان کا جواب سُنیے، جس کی نظیر تاریخ ہند میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ انھوں نے اپنی آخری خواہش کا اظہار اس طرح کیا تھا ؂

کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی خاک وطن کفن میں

اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی حب الوطنی کے ساتھ ہی خلوص و محبت اور وفاداری کو بھی اہم سمجھتے تھے۔ کلاسیکی مزاج کے اس شعر کو دیکھیے جس میں زبان کی صفائی، سادگی اور سلاست کا خوبصورت امتزاج ہے ؂

کیا کریں تم سے شکایت کیا کریں تم سے گلہ
ہم وفا کے واسطے ہیں تم جفا کے واسطے

□□

مسرور حسین سرور
۲۸۹/۱، ہاتھی خانہ
فتح گڑھ

خوشبو والے پھول

اس نے خط میں لکھا ہے
میں نے منزل پالی ہے
وقت نے سارے زخموں پر
خود ہی مرہم رکھا ہے
میرے سونے آنگن میں
خوشبو والے پھول کھلے
ان پھولوں نے جینے کا اک طرز دیا ہے
اس نے یہ بھی لکھا ہے
تم نے سرابوں سے اکتا کر
کوئی تو ساحل ڈھونڈا ہوگا
آج نہایت خوش ہوں میں
میرا ماضی اور مستقبل
دونوں ہی روشن ہیں اب
لیکن حیرت ہوتی ہے
ایسے حسیں خط کی سیاہی
جگہ جگہ پر پھیلی کیوں ہے

ڈاکٹر محمد شعیب
معرفت قریشی جنرل اسٹور
نخاس چوک گورکھ پور

غزل

اس قدر اب کے ہوا مجھ پہ اثر پانی کا!
ایک عالم ہے مری آنکھ میں حیرانی کا

تو تو آئینہ ہے کر صاف ذرا گردِ ملال
دیکھ دھندلا گیا چہرہ بھی ترے ثانی کا

اک ترا اسم منور ہے مرے دل میں ابھی
پھر گلہ کیسے کروں بے سر و سامانی کا

مجھ پہ مائل نہ ہوا میری انا بھی ٹوٹی
فائدہ کچھ نہ ہوا سلسلہ جنبانی کا

رمز الفاظ سے واقف ہی نہیں اہلِ سخن
شوق ویسے تو سبھی کو ہے غزل خوانی کا

وقار طاہر
۹۹/۳۳۳ اے، نالہ روڈ
چمن گنج، کان پور

پیش دستی

اے تتلی آؤ
تمھیں چھو کر انگلیوں کو رنگین کر لیں
لمس کی اک نئی لذت
نیا احساس سمو لیں
مشامِ جاں کو معطر کر لیں
خشک لمحات کو بھگو لیں
اور پھر؟
پھر تمھیں چھوڑ دیں
کہ اتنا ہی کافی ہے
کیوں کہ وقت
بہت کم ہے۔

غزلیں

زینت تسنیم
محلہ تارین۔ نشاط لائبریری
شاہ جہاں پور

ہر خوشی یہاں اب تو رنج سے عبارت ہے
کیسے ابنِ آدم ہیں کیسی آدمیت ہے

دوری ہے نہ قربت ہے پھر بھی ان سے نسبت ہے
خواب دیکھنا شاید آج کی ضرورت ہے

کیوں اداس ہوتے ہو یہ فضا بھی بدلے گی
شام کا دھندلکا ہی صبح کی ضمانت ہے

......

تم جفا کے خوگر ہو ہم وفا کے پیکر ہیں
وہ تمہاری فطرت ہے یہ ہماری عادت ہے

اس بدلتے موسم میں ربط کے تقاضوں کو
کون پورا کرتا ہے کس کو اتنی فرصت ہے

آئینے جھلستے ہیں نفرتوں کی گرمی سے
پیار کے چراغوں کی زندگی کو حاجت ہے

ذہن سے کھرچ ڈالے سب نقوش ماضی کے
زینت اب زمانے کو ہم سے کیوں شکایت ہے

فاطمہ وصیتہ جمعی
۳۷۔ ساتویں گلی، نشاط گنج لکھنؤ

رنگ مرے چہرے کا اُڑا تھا
وہ بھی چُپ سا دیکھ رہا تھا

اپنی کتابِ دل پر میں نے
"پہلے تیرا نام لکھا تھا"

سُورج کو نیزے پہ چڑھا کر
تیرہ شبی نے دم توڑا تھا

لوگ گلی میں دیکھ رہے تھے
کس کے گھر کا دیا بجھا تھا

بڑھ کے پُورے شہر پہ چھایا
بازاروں میں شور اٹھا تھا

شکیب رضوی سیتاپوری
کرائسٹ چرچ کالج
کان پور

مرکزِ چشم ہے اب لعل و گہر کا سودا
ننگِ بازار ہوا دیدۂ تر کا سودا

صاحبِ سر کو خبر ہی نہیں ہونے پاتی
اور ہو جاتا ہے بازار میں سر کا سودا

جب کھلا یہ کہ ہے سُورج بھی ضیا کا محتاج
رات کے ہاتھوں کیا ہم نے سحر کا سودا

اب میسر ہے نہ صحرا نہ بیاباں کوئی
لے کے جائے گا کہاں مجھ کو یہ سر کا سودا

میر جی کر کے گئے چھوڑ کے بازار شکیب
پھیر کر لے چلو اب تم بھی ہُنر کا سودا

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی رُدولوی
گورنمنٹ جوبلی کالج
لکھنؤ

سروش طباطبائی: محقق اور شاعر

سروش طباطبائی کا نام سید محمد عسکری تھا۔ والد سید محمد شفیع طباطبائی تھے۔ سروش کی ولادت ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں ۶ر مئی ۱۹۶۶ء کو انتقال کیا۔

آپ حسنی الحسینی سید تھے۔ آپ کے بزرگ اعلیٰ ایران سے ہندستان آئے اور کچھ مقامات پر قیام کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے پھر یہیں کے ہو رہے۔ سروش کے بزرگ اعلیٰ سید محمد حسین طباطبائی تھے جنھوں نے تفسیر قرآن تین جلدوں میں لکھ کر ایک معرکۃ الآرا کام انجام دیا۔

سروش کے والد سید محمد شفیع کی والدہ جناب اثر لکھنوی کی حقیقی پھوپھی تھیں اور سید محمد شفیع، آثر لکھنوی کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اس رشتے سے سروش، اثر کے صرف شاگرد ہی نہیں بلکہ بھتیجے بھی تھے۔

سروش کے دو بھائی مرحوم ہو چکے ہیں، اور دو بھائی ایک بہن موجود ہیں۔ بھائیوں میں سب سے بڑے سید محمد احسن طباطبائی تھے۔ ان کا شمار خوش گو شاعروں میں تھا۔ اثر لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے اثر کی عدم موجودگی میں صفی لکھنوی کو اپنی غزلیں دکھلاتے تھے۔ چھ بچے آپ کی یادگار ہیں۔ سروش کے دوسرے بھائی سید محمد باقر باقر طباطبائی ہیں۔ کان پور کے معروف شاعروں میں ہیں۔ آپ کا کلام ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ سروش کے تیسرے بھائی سید محمد علی طباطبائی ہیں جو اثر لکھنوی کے داماد بھی ہیں۔ ان کے ساتھ اختری بیگم منسوب ہوئیں۔ محمد علی پاکستانی فوج میں بریگیڈیر تھے، اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ سروش کے بھائیوں میں سب سے چھوٹے سید محمد حسین طباطبائی تھے۔ لندن میں مقیم تھے۔ وہیں ایک حادثہ میں ان کا انتقال ہو گیا سروش کی اکلوتی بہن سائرہ رضا ہیں جو اپنے شوہر کے ساتھ کراچی میں رہتی ہیں۔

تعلیم

اردو، عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق گھر ہی پر حاصل کی۔ گورنمنٹ حسین آباد انٹر کالج لکھنؤ سے ہائی اسکول پاس کیا۔ جوبلی کالج سے انٹر اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی، اے پاس کیا جوبلی کالج میں علی عباس حسینی، اختر علی تلہری اور افسر میرٹھی آپ کے اساتذہ میں تھے۔ افسر میرٹھی نے ایک بار اردو نظم کے پرچے میں سروش کو پچاس میں پچاس نمبر دیے اور توصیفی نوٹ بھی لکھا۔

شادی

بی، اے پاس کرنے کے فوراً بعد باپ نے شادی کر دی جس سے سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ ان کی شادی مرزا عاشق حسین ساکن مشک گنج لکھنؤ کی دختر محمودہ بیگم کے ساتھ ہوئی۔ مرزا عاشق حسین رہنے والے تو فرخ آباد کے تھے مگر لکھنؤ میں مستقل طور پر رہنے لگے تھے۔

اولاد: ایک بیٹا سید محمود عسکری طباطبائی اور دو بیٹیاں رضیہ سلطانہ

سب سے بڑی اور صفیہ سلطانہ سب سے چھوٹی ہیں۔ محمود عسکری بمبئی میں انٹرنل ڈیکوریشن کا کاروبار کرتے ہیں ان کی بیوی نسرین اور صرف ایک بیٹی ثمرین محمود ہے۔ رضیہ کے شوہر پاکستان میں ہیں انھیں کے ساتھ رضیہ اور ان کے تینوں بچے ہیں۔ صفیہ سلطانہ جدہ میں ہیں جہاں ان کے شوہر ایئر سروس میں انجینئر ہیں، ان کا ایک بیٹا امریکہ میں زیر تعلیم ہے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی جدہ میں زیر تعلیم ہیں۔

ملازمت

سات سال تک لکھنؤ میونسپل کارپوریشن میں اکاؤنٹس آفیسر رہے۔ اس کے بعد گورنمنٹ لوکل فنڈ اکاؤنٹس میں آڈٹ آفیسر ہو گئے۔ ترقی کر کے سینیئر آڈٹ آفیسر ہو گئے تھے کہ پیغامِ اجل آگیا۔ قلبی دورہ پڑا۔ بلرام پور اسپتال لکھنؤ میں داخل کیے گئے مگر وقتِ موعود آ چکا تھا۔ پانچ اور چھ مئی ۱۹۶۶ء کی درمیانی شب میں تقریباً ایک بجے طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

فرائضِ منصبی ادا کرنے کے بعد جو وقت ملتا تھا اس میں ادبی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہتی تھی۔

انگریزی اور قومی دونوں قسم کے لباس مرغوب تھے۔ بڑے جامہ زیب تھے۔ ہر لباس میں وجیہ لگتے تھے۔ مرغن غذائیں بہت پسند تھیں۔ آم کا بے حد شوق تھا۔

لمبائی کی طرف مائل میانہ قد، گٹھا ہوا سڈول جسم، کھلتا ہوا صاف رنگ، گول چہرہ، متوازن ناک، کان اور آنکھ۔ آپ کا شمار خوبصورتوں میں تھا۔

ہر دلعزیز، شگفتہ مزاج، خلیق، مہذب اور ملنسار تھے۔ جو ایک بار مل لیتا تھا بار بار ملنے کی تمنا کرتا تھا۔

دائرۂ احباب وسیع تھا۔ حبیب احمد صدیقی آئی اے ایس، صدیق حسن آئی سی ایس، جوش ملیح آبادی، سالک لکھنوی، حافظ محمد ابراہیم (ایک مشہور و معروف سیاسی اور قومی شخصیت جو عہدۂ وزارت پر بھی فائز رہی)، ڈاکٹر ناصر علی انجم انگریزی پروفیسر مقیم کلکتہ جنھوں نے سروش کی نظم "تاج محل" کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ مصباح الدین صاحب ایگزیکیوٹیو آفیسر لکھنؤ نگر مہاپالیکا وغیرہ سروش کے جگری دوست تھے۔

قومی اور سماجی خدمات

لکھنؤ میں کچھ راستوں اور سڑکوں پر بجلی کے کھمبے لگوائے جن سے نہ صرف سڑکیں منور ہوئیں بلکہ بہت سے گھروں میں بھی بجلی پہنچی۔ بیت العسکرین کڑہ ابوتراب خاں نخاس سے ملحق خان علامہ تفضل حسین خاں صاحب وزیر اعظم نواب آصف الدولہ کی بارہ دری کے کھنڈرات کو اپنی کوششوں سے بچوں کے لیے پارک بنوا دیا۔ حسین آباد ٹرسٹ کی انکوائری کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔

جائداد اور ریاست

لکھنؤ کے محلہ نخاس میں کڑہ ابوتراب خاں بہت مشہور ہے اسی میں سروش کا بہت بڑا محل نما گھر ہے۔ ایک وقت تھا جب اس محل میں بہت بڑا پھاٹک لگا ہوا تھا۔ اس محل میں اب مختلف افراد کے گھر بنے ہوئے ہیں، اس کی حیثیت ایک چھوٹے سے احاطے کی ہو گئی ہے۔ لکھنؤ کے تالکٹورہ میں اور کان پور میں آپ کی موروثی جائداد ہے۔

ادبی خدمات

نثر نگاری

شاعر ہونے کے علاوہ سروش مضمون نگار اور افسانہ نویس بھی تھے لیکن انھیں شہرت صرف شاعر کی حیثیت سے ہی نصیب ہوئی۔ آپ نے ایک مضمون میں اپنے ہی خاندان کے ایک بزرگ ناصر علی کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کا مقابلہ فارسی کی دوسری مثنویوں سے کیا ہے اور ناصر علی کی مثنوی کو ثبوت اور دلائل کے ساتھ افضل ثابت کیا ہے۔ یہ مضمون "آجکل" دہلی کے کسی شمارے میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ ایک مضمون حبیب احمد صدیقی پر بھی لکھا جو نیا دور لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے۔

سروش نے مضامین کے علاوہ افسانے بھی لکھے ہیں۔ ایک افسانہ "لہو کی بھیک" بہت مشہور ہوا جو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے بھی نشر ہو چکا ہے۔ اس افسانے پر قومی انعام بھی دیا گیا۔

شاعری:- سروش کا مزاج لڑکپن سے شاعرانہ تھا۔

وطنیّت افزائیاں بھی ان کی شعری صلاحیتوں پر جلا کرتی رہی تھیں۔ ان کے شعری سرمایے میں غزلیں، قصیدے، نوحے سلام، رباعیاں، قطعات، نظمیں، سہرے وغیرہ شامل ہیں۔ بہت زود گو تھے۔ فی البدیہہ خوب کہتے تھے۔ حافظہ بھی غضب کا تھا۔ سارا کا سارا کلام لوحِ دماغ پر محفوظ تھا۔

نظم

سرورش کو نظم نگاری میں جوش ملیح آبادی کا سا سلیقہ ودیعت ہوا تھا۔ لفظوں کا انتخاب، ان کا دروبست اور ان کا ترنم مل جل کر عجب کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ سرورش کو نظم نگاری میں بھی مہارت حاصل تھی جس سے ان کی نظموں میں چار چاند لگ جاتے تھے۔

ان کی نظموں میں زبان کی شیرینی کے ساتھ معنی آفرینی اور خیال کی گہرائی ملتی ہے۔ مثلاً نظم "صبحِ بنارس" میں کہتے ہیں ؎

صبح ہائے مشاطۂ قدرت کا زریں شاہکار
دخترِ لیلائے شب اور نور کی سرمایہ دار
آسماں کی زیب و زینت چاند تاروں کا نکھار
عشرتِ نظارہ ہے ہر رنگ میں تیری بہار
یوں تو ہر حصے پہ گیتی کے غضب ڈھاتی ہے تو
پر بنارس میں پہنچ کر حشر بن جاتی ہے تو

یہاں پر سرورش نے اس نکتہ کو واضح کر دیا ہے کہ صبح چاہے جس جگہ کی ہو بہت اچھی لگتی ہے پھر صبحِ بنارس کیوں مشہور ہے۔

موضوع کے لحاظ سے بحروں کو منتخب کرنا بھی ایک اہم کام ہے سرورش اس میں بھی اپنی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ صبحِ بنارس میں انھوں نے بحرِ رمل مثمن محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) کا انتخاب کیا اور اس کی شکل مسدس کی رکھی جس سے پوری نظم انتہائی تاثیر انگیز ہو گئی ہے۔

صبحِ بنارس کے بعد نعرۂ جنگ دیکھیے تو فضا بالکل برعکس نظر آتی ہے۔ نعرۂ جنگ میں جوش و خروش، ولولہ، امنگ، عزم صمیم، آگے بڑھنے کی ترغیب اور عمل پیہم کی ایک دنیا آباد دکھائی دیتی ہے۔ اس کے لیے سرورش نے بحرِ مثمن مقبوض (مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن) کو اپنایا اور اس کے لیے مسمط کی شکل زیادہ موزوں سمجھی۔ نعرۂ جنگ کے کچھ نمونے درج کیے جاتے ہیں ؎

فدائیانِ ہم وطن، مجاہدانِ کم سخن، بہادرانِ تیغ زن، دلاورانِ صف شکن
بہ کوہ و وادی و دمن، بڑھے چلو بڑھے چلو، بہادرو بڑھے چلو
وہ بے پناہ چال ہو، نسیم پائمال ہو، عروج پر کمال ہو، کمال بے زوال ہو
ہوا بندھے چمن چمن، بڑھے چلو بڑھے چلو، بہادرو بڑھے چلو

پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک قافلہ رواں ہے اس نظم کا انداز اقبال کے نغمۂ حدی سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔

یہ نظم سرورش نے اگست ۱۹۴۱ء میں بمقام ا۱۱د کہی تھی۔ اقتدارِ فرنگ کے عہد میں ایسی پرجوش نظم لکھنا اور محبانِ وطن کو آزادی کے لیے للکارنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرورش بے خوف محبِ وطن تھے، اور مادرِ ہند کو گوروں کے خونی پنجوں سے آزاد کرانے کے لیے بے چین تھے۔

قصیدہ

سرورش کے قصیدے زیادہ تر مدحیہ ہیں۔ عزیز، محشر اور صفی کے قصیدوں سے مختلف ہیں۔ سرورش کے قصیدوں کو ہم مدحیہ نظم بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان میں برجستگی اور بے تکلفی کو مدح گستری کا زیور بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ان کی ترتیب میں عناصرِ اربعہ کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔

رباعی

اصنافِ سخن میں رباعی بہت نازک صنف ہے۔ اس کے لیے بحرِ ہزج کے چوبیس ارکان مقرر ہیں جو دائرۂ اخرب اور دائرۂ اخرم میں برابر سے تقسیم ہیں۔ مثلاً دائرۂ اخرب کے بارہ رکنوں میں سے ایک رکن مفعول مفاعیلن مفعول فعول ہے اور دائرہ اخرم کے بارہ رکنوں میں سے ایک رکن "مفعولن مفعولن مفعولن فاع" ہے۔ لوگوں نے عام طور سے رباعی کے وزن کو آسان بنانے کے لیے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کا ایک وزن ہر رباعی کے لیے مشہور کر دیا ہے۔

رباعی کے چوبیس ارکان میں سے صرف ایک رکن کے ہم وزن
اگر ان مقررہ اوزان سے رُباعی الگ ہوئی تو رباعی قطعہ
ورت اختیار کر لے گی۔ مقررہ اوزان اور ان کی تعداد نے
کو ایک مشکل فن بنا دیا ہے
سَروش نے اس پُرخار وادی کو بڑی کامیابی سے طے کیا ہے

ں

سَروش نے غزلوں میں اپنے جذبات کی ترجمانی بڑی کامیابی
ساتھ کی ہے۔ الفاظ و خیالات غزلوں کے شایانِ شان ہیں۔
ں جان دار ہیں اور بندشیں بہت مضبوط۔ ان کی غزلیں صرف
و عشق کی فضا تک محدود نہیں ہیں۔ مثلاً قوتِ متخیلہ کے
تشبیہ کی ندرت دیکھیے ؎

یہ داغ دل ترے رخ کا جواب ہو نہ سکا
چراغ لاکھ جلا آفتاب ہو نہ سکا
ہزار بار زمانے نے کروٹیں بدلیں
مری وفا میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا

نے چھوٹی بحروں میں بڑی حسین غزلیں کہی ہیں ؎

دل پہ ایک ترم چوٹ کھائی ہے
نگہِ ناز کی دُہائی ہے
درد و لذت میں امتیاز نہیں
ابھی آغازِ آشنائی ہے
ٹھہر اے اشتیاقِ دید ٹھہر
حسن بیتابِ خودنمائی ہے

انہ اور عارفانہ اشعار بھی غزلوں میں موجود ہیں، مثلاً ؎

ہم کہاں منزلِ حبیب کہاں
اک کشش تھی جو کھینچ لائی ہے
نگاہ دے کے مجھے کیوں عذاب میں ڈالا
جہاں میں جب کوئی ذرہ بھی بے نقاب نہیں
تو آفتاب میں پرتو تو آئینہ میں عکس
ترا جواب تو میں ہوں مرا جواب نہیں

سَروش کو یہ مذاقِ سخنوری بخشا!
نگاہِ دوست ترے لطف کا جواب نہیں

جوشؔ اور اقبالؔ نظم کے شاعر تھے اور نظم کو دونوں نے اپنے اپنے انداز میں کمال تک پہونچا دیا۔ مگر سَروش نظم اور غزل دونوں اصناف پر برابر کی قدرت رکھتے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ سَروش کو غزل گوئی زیادہ مرغوب تھی یا نظم نگاری۔

ذیل میں سَروش کی غزلوں کے کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین سَروش کی غزل گوئی کے متعلق خود بھی کوئی رائے قائم کر سکیں ؎

بجھا دی خنجروں کی تشنگی خونِ رگِ دل سے
دعاؤں سے جفاؤں کو پشیماں کر دیا ہم نے

ترے غم کے تصدق اب مسرت ہی مسرت ہے
محبت فاتحِ غم ہائے عالم ہوتی جاتی ہے

نکھر جاتا ہے جتنا شعورِ ذہنِ انسانی
حقیقت اور مبہم اور مبہم ہوتی جاتی ہے

جب پھول چبھے دل میں تب خار کو کیا کہیے
مرہم نے کیا زخمی تلوار کو کیا کہیے

زباں کو کاٹ ڈالیں ہونٹ سی لیں
خوشی آہ بن جائے تو کیا ہو

مصیبت ہو تو کوئی صبر کر لے
خوشی غم بن کے تڑپائے تو کیا ہو

نہ طلب رکھ بہار رنگ و بو سے
چمن تخلیق کر اپنے لہو سے

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

بنگلہ افسانہ

سمریش بسو
ترجمہ: شوکت عظیم
معرفت مغربی بنگال اُردو اکیڈمی
17۔ ڈاکٹر سندری موہن ایونیو
کلکتہ

آداب

رات کی خاموشی کا سینہ چیر کر ملٹری کی گشتی گاڑی وکٹوریہ پارک سے ہوکر گزری۔

شہر میں کرفیو نافذ تھا۔ زبردست فرقہ وارانہ فساد برپا تھا لاٹھی، چھری، ریوالور اور دیگر مہلک ہتھیاروں سے لیس دو فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ ہر طرف چور اچکوں کی ٹولیاں سرگرم عمل تھیں۔ خوفناک اندھیری رات جیسے ان کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ قریہ قریہ جل رہا تھا۔ خوف زدہ عورتوں اور بچوں کی آواز ماحول کو مزید خوف ناک بنا رہی تھی۔ اس پر ملٹری کی گشتی گاڑی نے فضا کو اور بھی دہشت ناک بنا دیا تھا۔ اندھا دھند فائرنگ کے ذریعہ لا اینڈ آرڈر کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو پانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

دونوں طرف سے دو پتلی گلیاں آکر یہیں ختم ہوئی تھیں اور ایک ڈسٹ بین دونوں گلیوں کے درمیان الٹا پڑا تھا۔ اسی کی اوٹ سے گلی سے ایک آدمی رکھائی پڑا۔ سر اٹھانے کی ہمت نہیں تھی اس لیے وہ بے حس و حرکت کچھ دیر یونہی پڑا رہا اور دور سے آنے والی چیخ پکار کو توجہ سے سننے لگا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ "اللہ اکبر" اور "بندے ماترم" کے فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے تھے اچانک ڈسٹ بین میں حرکت ہوئی۔ خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سانسوں پر قابو پاتے ہوئے وہ درپیش آنے والے واقعے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ لمحے یونہی گزرے اور پھر ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

شاید کوئی کتا ہے۔ کتے کو بھگانے کے لیے اس نے ڈسٹ بین کو پرے ڈھکیل دیا۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر دوبارہ ڈسٹ بین میں حرکت ہوئی۔ خوف کے ساتھ اسے بے چینی بھی اٹھنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس نے سر اٹھایا۔ اُدھر سے بھی اسی کی طرح ایک سر اُبھرا۔ وہ بھی کسی انسان کا سر تھا۔ ڈسٹ بین کے دونوں کناروں پر دو انسان کھڑے تھے۔ دونوں خاموش اور بے حس و حرکت تھے۔ ان کی پرسکوت آنکھوں میں خوف اور تجسس کے سائے لہرانے لگے۔ دل کی دھڑکن تیز ہوئی کوئی کسی پر اعتماد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو قاتل سمجھ رہے تھے اور اپنے اوپر ایک دوسرے کی طرف سے حملے کے منتظر تھے مگر کسی بھی طرف سے کوئی حملہ نہیں ہوا۔ پھر دونوں کے ذہن میں ایک ہی سوال ابھرا۔

ہندو یا مسلمان۔؟

اس سوال کا جواب ملنے کے بعد ہی حملے کا امکان ہے۔ اس لیے کسی میں مذہب کے بارے میں جاننے کی ہمت نہیں ہوئی۔ جان کے خوف سے دونوں بھاگ بھی نہیں پا رہے تھے۔ دیر تک ان حالات سے دوچار رہنے کے بعد جب دونوں اوب گئے تو بالآخر ایک نے دوسرے سے سوال کیا۔

"تم ہندو ہو یا مسلمان؟"

"پہلے تم بتاؤ۔" دوسرے آدمی نے کہا۔ دونوں اپنی شناخت

بتانے سے گریزاں تھے۔ شک وشبہ کی ملی جلی کیفیت انھیں اس اقدام سے باز رکھ رہی تھی۔ پہلا سوال گول ہوگیا۔ دوسرا سوال ابھرا ـــــــ

"گھر کہاں ہے تمھارا؟"

"بوڑھی گنگا کے اس پار۔ سوبائی ڈیہہ میں۔ اور تمھارا؟"

"چاساڑھ۔ نرائن گنج کے نزدیک۔ کیا کام کرتے ہو؟"

"ناؤ چلتی ہے میری، ناؤ کا مانجھی ہوں۔ اور تم؟"

"نارائن گنج کے کاٹن مل میں مزدور ہوں۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ مٹمگی روشنی میں دونوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنا چاہتے تھے اور لباس سے ایک دوسرے کے مذہب کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن تاریکی اور ڈسٹ بین کی اوٹ کی وجہ سے ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ اچانک نزدیک ہی ـــ کہیں سے شور وغل کی آواز ابھری "اللہ اکبر" اور "وندے ماترم" کے نعرے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ مزدور اور مانجھی دونوں خوف سے کانپ اٹھے۔

"کہیں قریب ہی سے یہ آوازیں آ رہی ہیں ـ!" مزدور نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں چلو، یہاں سے بھاگ چلیں۔" مانجھی نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

مزدور نے مداخلت کی۔ "نہیں نہیں۔ یہاں سے اٹھنا نہیں۔ جان دینی ہے کیا؟"

مانجھی خوف سے پھر کانپ اٹھا۔ اس آدمی کے دل میں یقیناً چور ہے۔ اس نے مزدور کی طرف غور سے دیکھا۔ مزدور بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی اس نے کہا۔ "بیٹھے رہو۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

مانجھی کا شک اور بھی شدید ہوگیا۔ اس کا مطلب ہے یہ اسے جانے نہیں دے گا۔ اس نے کہا "کیوں؟"

"کیوں؟ اس کیوں کا کیا جواب دوں؟ جان پیاری نہیں ہے کیا تم کو؟"

مانجھی کو مزدور کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔ اچھے برے خیالات سے اس کا دل دہل اٹھا۔ اس نے جذباتی ہوکر کہا ـــ "نہیں جاؤں تو کیا اندھیری گلی میں پڑا رہوں۔"

مانجھی کی ضد دیکھ کر مزدور بھی مشکوک ہوگیا۔ "کیا مطلب ہے تمھارا؟ تمھارے ارادے نیک نہیں لگتے۔ کس مذہب کے آدمی ہو یہ بھی نہیں بتایا۔ کہیں مجھے مارنے کے لیے کسی کو بلا تو نہ لاؤ گے؟"

"کیسی بے تکی باتیں کرتے ہو۔" اس پریشانی میں بھی مانجھی تقریباً چیخ پڑا۔

"ٹھیک ہی کہ رہا ہوں بھائی، بیٹھو۔ انسان کے دل میں کیا ہے کسے پتہ؟" مزدور کی آواز میں پتہ نہیں کیا جادو تھا۔ مانجھی سن کر بے چین ہوگیا۔ اس نے کہا۔ "تم چلے گئے تو میں اکیلا کیسے رہوں گا؟"

شور وغل دور ہوتا چلا گیا۔ پھر موت کی سی خاموشی چھا گئی تھی۔ اندھیری گلی میں دونوں ڈسٹ بین کے دو کناروں پر اپنی ماں، بہن، بیوی، بچوں کو درپیش خطرے کے خیال سے پریشان تھے۔ کیا ہم لوگ زندہ ان تک پہنچ سکیں گے؟ یا وہی لوگ اب تک زندہ بچے رہے ہوں گے۔ اچانک فساد شروع ہوگیا تھا۔ ہاٹ بازار اور شاہراہوں پر زندگی کا کاروبار کتنا اچھا چل رہا تھا کہ اچانک قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ اس طرح انسان بے رحم کیوں ہو جاتا ہے ـــ؟

مزدور نے لمبی سانس لی۔ مانجھی بھی ساکت سا تھا۔

"بیڑی پیو گے؟" مزدور نے جیب سے بیڑی نکال کر مانجھی کی طرف بڑھائی۔ مانجھی نے حسب معمول بیڑی لے کر دو ایک بار اس پر اپنی انگلیوں کا دباؤ ڈالا۔ پھر ہونٹوں میں دبا لیا۔ مل مزدور نے دیا سلائی جلانے کی کوشش کی۔ اسے پسینے میں قمیص کے بھیگ جانے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ دیا سلائی نم ہوگئی تھی۔ کئی بار تیلی کو دیا سلائی کے مسالے پر گھسنے سے نیلگوں روشنی ابھری اور بس۔ تنگ آکر اس نے بارود بھری تیلی پرے پھینک دی۔

"سالی بھیگ کر برباد ہوگئی ہے۔" اس نے دوبارہ تیلی نکالی۔ مانجھی بے صبری سے مزدور کی طرف بڑھا۔ "ارے جلے گی، جلے گی

مجھے دو۔ میں جلاتا ہوں۔" مزدور کے ہاتھوں سے اس نے دیا سلائی تقریباً چھین لی۔ دو تین بار تیلی کو گھسنے کے بعد وہ آگ جلانے میں کامیاب ہوگیا۔ "سبحان اللہ! لو، لو... سلگاؤ جلدی۔"

سوتا مزدور چونک پڑا۔ ہونٹوں کے درمیان دبی ہوئی بیڑی نیچے گر پڑی۔ یعنی تم.....؟

ہوا کی تیز لہر نے تیلی کو بجھا دیا۔ تاریکی میں دونوں کی آنکھوں میں تجسس کے سائے لہرانے لگے۔ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد مانجھی نے کہا۔ "ہاں میں مسلمان ہوں۔ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا مگر"...... مزدور نے ڈرتے ڈرتے مانجھی کی بغل میں دبی ہوئی گٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس گٹھری میں کیا ہے۔؟"

"بیوی بچوں کے لیے کپڑے ہیں۔ بچوں کے لیے قمیص اور بیوی کے لیے ساڑی۔ کل ہمارے یہاں عید کا تہوار ہے نا۔!"

"اور تو کچھ نہیں ہے نا..." مزدور نے متذبذب ہو کر پوچھا۔

"جھوٹ تھوڑے ہی بول رہا ہوں۔ یقین نہ ہو تو خود ہی دیکھ لو۔" مانجھی نے گٹھری کو مزدور کی طرف بڑھا دیا۔

"ارے نہیں نہیں بھائی اور کیا دیکھنا ہے۔ دراصل زمانہ اتنا خراب ہے کہ اب کسی پر یقین نہیں آتا۔ تمھیں بتاؤ....."

"بالکل سچ کہتے ہو بھائی۔ تم نے بھی تو کچھ چھپا کر نہیں رکھا ہے۔؟!"

"بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں۔ میرے پاس ایک سوئی بھی نہیں ہے۔ خیر و عافیت سے بال بچوں تک پہونچ جاؤں، یہی سب سے بڑی خواہش ہے۔" مزدور نے کپڑوں کی تلاشی دیتے ہوئے کہا۔

دونوں قریب ہی بیٹھ گئے اور بیڑی سلگا کر کچھ دیر تک بیڑی کے کش لیتے رہے۔

"اچھا....." مانجھی مہر سکوت توڑتے ہوئے یوں گویا ہوا جیسے وہ مزدور کا قریبی رشتہ دار ہے۔ "اچھا... مجھے یہ بتاؤ کہ اچانک یہ قتل و غارت گری کیوں شروع ہوگئی؟"

مزدور کو اخباروں میں دلچسپی تھی۔ اس نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ "دوست! تمھاری جماعت والوں ہی نے تو شروع کیا ہے یہ سب پتہ نہیں کس انقلاب کے نام پر۔"

مانجھی نے جزبز ہوتے ہوئے کہا۔ "میں یہ سب نہیں سننا چاہتا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس خون خرابے سے کیا ہونے والا ہے۔ تمھارے دو آدمی مارے جائیں گے، ہمارے بھی دو آدمی مریں گے۔ اس سے ملک کا کیا بھلا ہوگا۔؟"

"ارے بابا میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ ہوگا بھی کیا۔ ہوگا یہ ٹھینگا۔" اس نے اپنے ہاتھ کا انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔ تم مارے جاؤ گے۔ میں مارا جاؤں گا اور ہمارے بال بچے در در بھیک مانگتے پھریں گے۔ ارے ابھی پچھلے فساد میں فسادیوں نے میرے بہنوئی کو ہلاک کر دیا۔ بہن بیوہ ہوگئی اور اس کے بال بچے میرے گلے آ پڑے۔ ارے اب کچھ نہیں ہوگا۔ لیڈران اونچی اونچی بلڈنگوں میں پاؤں پر پاؤں پسارے صرف حکم جاری کرتے ہیں اور مرنا ہمیں پڑتا ہے۔ انسان نہیں جیسے ہم کتوں کی اولادیں بن کر رہ گئے ہیں۔ ورنہ اس طرح ایک دوسرے کو کیوں بھنبھوڑتے؟"

بے نتیجہ غصے میں، مانجھی نے اپنے گھٹنوں پہ دبا دے ڈالا۔ "ہاں ٹھیک کہا تم نے، ہماری بات کون سوچتا ہے۔ اب جو یہ فساد شروع ہوگیا ہے تو ناؤ واپس بھی مل سکتی ہے یا نہیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا ممکن ہے گھاٹ پر فسادیوں نے ناؤ کو ڈبو دیا ہو۔ زمیندار روپ بابو کے نائب ہر مہینے میری ہی ناؤ سے کچہری جایا کرتے ہیں۔ بابو کا ہاتھ جیسے حاتم کا ہاتھ ہے۔ پانچ روپے ناؤ کا کرایہ ملتا ہے۔ انعام کے پانچ روپے الگ سے ملتے ہیں۔ کل ملا کر دس روپے۔ اس سے ہمیں پورے مہینے کا کھانے کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔"

مزدور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ایک ساتھ بھاری بوٹوں کی آواز لگی۔ یہ آواز شاہراہ سے گلی میں داخل ہونے لگی تھی۔ مشکوک نگاہوں سے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کیا کیا جائے؟" مانجھی نے جلدی سے گٹھری کو بغل میں داب لیا۔

"چلو بھاگ چلتے ہیں، مگر جائیں گے کہاں؟ شہر کے راہ

ہے بھی تو اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔" مزدور نے تشویش کا اظہار کیا۔
مانجھی نے کہا۔ "چلو کہیں بھی چلتے ہیں۔ جھوٹ موٹ پولیس
ں مار نہیں کھانی ہے۔ ان حرام زادوں کا اعتبار نہیں ہے۔"
"ہاں ٹھیک کہتے ہو تم۔ کہاں چلو گے بتاؤ۔ دیکھو وہ آپہنچے ہیں۔"
"چلو اس طرف۔" مانجھی نے گلی سے دائیں جانب والے
استے کا رُخ کیا۔ "چلو تیز چلو، کسی طرح بادام تلہ گھاٹ تک پہونچ
ے تو ۔۔۔ پھر خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

دونوں نے سر جھکا کر سڑک کو پار کیا، اور تیز سانس لیتے ہوئے
ڑنے لگے اور بالآخر کسی طرح پڑا ٹولی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔
یران، سنسان راستہ بجلی کی روشنی میں بڑا عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔
نوں نے ایک بار مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کہیں کوئی پیچھے سے وار تو نہیں
نے جا رہا ہے۔ دیر کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ راستے کے دونوں طرف
ھانک کر دونوں مغرب کی جانب دوڑنے لگے۔ کچھ آگے بڑھ کر ان کے
نوں میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک
ہسوار ان کے پیچھے آرہا تھا۔ غور و فکر کا وقت نہیں تھا۔ دونوں نے
ئیں جانب کی گلی میں پناہ لی۔ کچھ ہی دیر میں ایک انگریز شہسوار
تھ میں ریوالور لیے ان کے دل کی دھڑکن کو بڑھاتے ہوئے سامنے
سے گزرا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئی تو دونوں
ہستہ آہستہ باہر نکلے۔

"کنارے کنارے چلو۔" مزدور نے کہا
راستے کے کنارے دونوں تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔
"ٹھہرو!" مانجھی نے آہستہ سے آواز دی۔
"کیا ہوا؟" مزدور چونک کر ٹھہر گیا۔
"یہاں آؤ۔" مزدور کا ہاتھ پکڑ کر مانجھی ایک پان بیڑی کی
ند دوکان کی اوٹ میں لے گیا۔ "اس طرف دیکھو۔"
مانجھی کے اشارے پر مزدور نے سامنے دیکھا کہ تقریباً سو گز
کے فاصلے پر ایک مکان میں روشنی نظر آرہی تھی۔ مکان سے متصل برآمدے
میں دس بارہ سپاہی بُت کی طرح کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ایک
نگریز افسر کھڑا تھا اور پائپ کے دھوئیں میں ہاتھ اور منہ کو حرکت دیتے ہوئے

پتہ نہیں کیا بک رہا تھا۔ برآمدے کے نیچے گھوڑے کی زین پکڑے ایک
سپاہی کھڑا تھا۔ بپھرا ہوا چنچل گھوڑا زمین پر اپنے پاؤں پٹخ رہا تھا۔
مانجھی نے کہا: "یہ اسلام پور پھانڑی[1] ہے اور کچھ آگے جا کر
پھانڑی کے نزدیک سے دائیں جانب جو گلی جاتی ہے وہی گلی بادام تلہ
گھاٹ تک پہنچتی ہے۔"

مزدور کا چہرہ خوف سے سیاہ ہو گیا۔ "اب کیا ہوگا۔؟"
اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں تم ٹھہرو۔ گھاٹ جا کر تمھیں کوئی فائدہ
نہ ہوگا۔" مانجھی نے مزدور کو سمجھانا چاہا۔ "یہ ہندوؤں کا علاقہ ہے اور
اسلام پور مسلمانوں کا۔ کل صبح اٹھ کر گھر چلے جانا۔"
"اور تم؟"
"میں جا رہا ہوں۔" مانجھی کی آواز تجسس اور خوف سے رندھ
گئی۔ "میں یہاں نہیں رک سکتا بھائی! آج آٹھ دن ہو گئے۔ گھر
سے باہر ہوں۔ گھر کی کوئی خبر نہیں۔ کیا ہوا کیا نہیں ہوا۔ یہ تو اللہ ہی
جانتا ہے۔ کسی طرح گلی تک پہنچ جاؤں بس۔ ناؤ نہ بھی ملی تو بوڑھی
گنگا تیر کر پار کر لوں گا۔"
"ارے نہیں نہیں میاں۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔" جذبات میں
مزدور نے مانجھی کا گریبان پکڑ لیا۔ "کیسے جاؤ گے تم؟"
شدّتِ جذبات سے مانجھی کی آواز بھی بھرا گئی "مجھے مت
روکو میرے بھائی۔ مجھے جانے دو! تم نہیں سمجھ سکتے۔ کل عید
ہے۔ بال بچوں نے چاند دیکھا ہوگا۔ کتنی امیدیں ہوں گی انھیں۔ کل
نئے کپڑے پہنیں گے۔ ابّو جان کی گود میں بیٹھیں گے۔ مجھے اپنی
بیگم کی آنکھیں آنسو سے لبریز نظر آرہی ہیں۔ میں نہیں رک سکتا
بھائی۔ میں نہیں رک سکتا۔ بال بچوں کے لیے دل بہت گھبرا
رہا ہے۔"
مانجھی کی آواز رندھ گئی۔ مزدور کا بھی دل بھر آیا۔ گریبان
انگلیوں کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ "اگر انھوں نے تمھیں پکڑ لیا ۔۔۔؟"
اس نے رندھی ہوئی آواز میں اپنا شک ظاہر کیا۔

---

[1] پولیس چوکی

"تمھیں نہیں پکڑ سکیں گے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں اور ہاں سنو! یہاں سے اٹھنا نہیں، چلتا ہوں بھائی آج کی اس رات کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ قسمت نے یاوری کی تو تم سے پھر ملاقات ہوگی۔ آداب!"

"میں بھی تمھیں نہیں بھول سکوں گا۔ میرے بھائی! آداب!!"

مانجھی دبے قدموں سے بادام تلہ گھاٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

مزدور متجسس اور مشتبہ انداز میں بُت بنا کھڑا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی اور زبان سے دُعا نکل رہی تھی:-

"بھگوان! مانجھی کی حفاظت کرنا، اسے ہر خطرے سے بچانا۔"

وہ چُپ چاپ سانس روکے کھڑا تھا۔ اتنی دیر ہوگئی، شاید مانجھی گھاٹ تک پہنچ گیا ہوگا۔ اب اس کے بچوں کی امیدیں بر آئیں گی۔ کل صبح یہ لوگ نئے کپڑے پہنیں گے کتنی خوشی ہوگی انھیں نئے کپڑے پہن کر۔ مزدور نے ایک لمبی سانس لی۔ میاں کی محبت پاکر بیوی خوشی سے پھولے نہیں سمائے گی اور کہے گی۔ موت کے منھ سے بچ کر آگئے ہو! مزدور زیرِ لب مسکرایا اور مانجھی اس وقت کیا کرے گا۔ مانجھی .....

"ہالٹ ..."

مزدور کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ سپاہی ادھر ہی دوڑے آرہے تھے۔ شاید چیختے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"وہ دیکھو ڈاکو بھاگا جا رہا ہے۔"

مزدور نے گردن اونچی کرکے دیکھا۔ پولیس افسر ہاتھوں میں ریوالور لیے راستے پر نکل آیا تھا۔ گلی میں پھیلے ہوئے سناٹے کو چیرتے ہوئے افسر کے ہاتھوں میں دبے ہوئے آتشیں اسلحہ نے دوبار آگ اگلی "دھائیں ..... دھائیں"۔

تشویش میں مبتلا مزدور نے دانتوں سے اپنی انگلی کاٹ لی۔ افسر اچھل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور گلی میں داخل ہوگیا۔ مزدور کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں مانجھی کے خون سے رنگے ہوئے اس کے بال بچوں کے کپڑے متحرک ہونے لگے۔ مانجھی چیخ رہا تھا

"اب نہیں بچ سکوں گا بھائی۔ اب گھر بھی نہیں پہنچ سکوں گا۔ دشمنوں نے مجھے بال بچوں تک نہیں پہنچنے دیا۔ عید کے دن میں اپنے بیوی بچوں کے آنسوؤں میں تیرتا ہوا نظر آؤں گا۔"

□□

سروش طباطبائی .... صفحہ ۳۳ کا بقیہ

تمام درد ہو دل اور نظر گلہ نہ کرے
کسی غریب پہ یوں آ بنے خدا نہ کرے

سروش کتنا حسیں ہے یہ مسلکِ حافظ
گناہ لاکھ کرے، ایک دل بُرا نہ کرے

مرے قصے پہ دنیا کروٹیں لے گی ابھی کیا ہے
کہ یہ تمہید ہے جو داستاں معلوم ہوتی ہے

جو ذرا سی بھی غرض عشق میں شامل ہو جائے
زندگی بھر کی وفا جرم میں شامل ہو جائے

میرے اللہ محبت میں یہی ہوتا ہے!
دل کبھی درد بنے درد کبھی دل ہو جائے

یہ فروغِ آگہی ہے وہ کمالِ بیخودی ہے
تجھے کھو کے یاد رکھنا، تجھے پا کے بھول جانا

کہ وقت آخر بھی وہ نہیں آئے
ہاتھ ملتی ہوئی حیات گئی

□□

ایس، ایم، عباس
مانی کلاں، جون پور

چادر

وہ کافی دیر سے بالکل چپ چاپ کھڑا ہے۔
شام کا سماں ہے اور گھر کے آنگن میں ایک الاؤ سلگ رہا ہے۔

عرصہ ہوا آنگن میں الگاؤ کی ایک لکیر پڑ گئی تھی اور اسی منحوس گھڑی میں یہ الاؤ جل اٹھا تھا۔ تب سے یہ الاؤ سلگ رہا ہے۔ سلگتا جا رہا ہے اور آگے .... تب وہ ایک دم کانپ جاتا ہے۔

اس نے آنگن کے اس الاؤ میں اپنا بہت کچھ جلتے دیکھا ہے۔ وہ دیکھ چکا ہے کتنی ہی جلتی ہوئی عمارتیں، جھلسی ہوئی کالونیاں سنسان، ویران بازار، خون میں رنگی ہوئی سڑکیں۔

اس کے نازک دل پر نہ جانے کیسے کیسے زخم لگے ہیں۔ کتنی خوشیاں بکھر چکی ہیں۔ کتنے ارمان دم توڑ گئے ہیں۔ کتنا خون دل پانی ہو کر بہہ چکا ہے۔ کیا کوئی تمناؤں کے ان زخموں کا حساب لگا سکتا ہے۔؟

وہ سر جھکائے سوچنے لگتا ہے۔
اور آئندہ نسلیں؟
"کیا ان کے معصوم خواب بھی یوں ہی بکھرتے رہیں گے؟"

اچانک، کوئی جیسے اسے جھنجھوڑ دیتا ہے اور وہ تڑپ اٹھتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ وقت کے مینار پر کھڑے ہو کر چیخ چیخ کر کہہ دے ـــ

"گھر والو! اب تو سائے دیوار کے پیچھے تک آ پہنچے ہیں۔ ہر وقت کی آگ سے پورا گھر تپنے لگا ہے۔ اب آؤ اس الاؤ کو جلدی سے بجھا دیں ورنہ ہماری ساری نشانیاں جل جائیں گی اور ہم سب خاک ہو جائیں گے۔

آسمان کی چھاؤں تلے، سورج کی کرنوں کے درمیان سبھی اپنے ہیں۔

خدا ان سے خوش ہوتا ہے جو اس کے بندوں سے خوش ہو کر ملتے ہیں۔

گھر کے بزرگوں نے محبت کا یہی پیغام دیا تھا۔ مقدس کتابوں نے یہی سبق پڑھایا تھا۔

یوں، اس کا گھر ایک بڑی نمائش گاہ رہا ہے۔

اس کے گھر میں دور دراز سے طرح طرح کے لوگ آئے، بسے، پلے، بڑھے اور پھر اسی کے گھر کے ایک فرد ہو کر رہ گئے ـــ ہر آنے والا اپنا کچھ نہ کچھ سامان بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ اپنی بولی اپنی زبان، اپنا ادب، اپنی تہذیب اور رہن سہن کا اپنا مخصوص طریقہ جیسے شہر کی دیواروں پر بے شمار پوسٹر ایک ساتھ چپک جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میرے گھر آنگن میں طرح طرح کے لوگ دکھائی پڑتے۔ بھانت بھانت کی سبھیتائیں، سنسکرتی، بولی، زبان ملتی ـــ مختلف انداز کے رسم و رواج ملتے اور ہر آدمی ایک الگ انداز کی چادر بھی لپیٹے نظر آتا۔

آنگن میں صبح و شام کا سماں بھی عجیب ہوتا — کہیں رام کی اوپاسنا ہوتی، کہیں گیتا کا پاٹھ ہوتا۔ کہیں رحیم کو ماتھا ٹیکا جاتا، قرآن کی تلاوت ہوتی۔ کہیں گرو گرنتھ صاحب پڑھا جاتا، تو کہیں مقدس بائبل۔ جس کا جو جی چاہتا سنتا اور پڑھتا اور جس رنگ کی چادر چاہتا اوڑھ لیتا۔ لیکن یہ الگ الگ چادریں، ان کے مختلف رنگ الگاؤ کی نشانی نہیں تھے۔ سبھی ایک دوسرے کی چادر کا احترام کرتے۔ اس لیے کہ ہر چادر سے امن و اتحاد، خلوص، محبت کی خوشبو پھوٹتی تھی۔ سب میں پیار کا رنگ سب سے اوپر جھلکتا تھا۔ الگ الگ رنگ کی چادر اوڑھنے والے جب ایک ساتھ مل کر گھر میں میلے اور تیوہار مناتے تو گھر میں گنگا جمنی فضا سی پیدا ہو جاتی۔ آنگن مہک جاتا تھا۔

گھر والوں نے اپنی اپنی چادروں کے مطابق اپنے میلے اور تیوہار بھی قائم کر لیے۔ ہولی، عید، دیوالی، شب برات، کرسمس، بیساکھی، درگا پوجا، دسہرہ اور بقرعید۔ لیکن سبھی تیوہار اور میلے آپسی میل، ملاپ اور سب کی خوشیوں کے سامان تھے۔

اس انیکتا میں ایک ہی رہسیہ تھا اور وہ یہ کہ گھر کی آتما ایک ہے اور یہی رہسیہ لیے ہوئے صدیوں تک یہ گھر آنگن ایک سدا بہار گلشن بنا رہا تھا۔

اتہاس ساکھی ہے کہ سارے گھر والے اتنا مل جل کر رہتے کہ کسی دوی کا نشان، کسی الگاؤ کا شائبہ تک نہیں ملتا تھا۔ بس شادی بیاہ، مرنے جینے کے موقع پر، یا پھر میلے اور تیوہاروں پر لوگ اپنی چادر اوڑھ لیتے اور اس کا مخصوص رنگ اس کی شناخت کرا دیتا۔ لیکن چادر کی شناخت سے کسی میلے کی عظمت یا اس کی اہمیت اور افادیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ عید ہو یا شب برات، ہولی ہو یا دیوالی۔ سارا گھر یوں مل جل کر مناتا کہ یہ پتہ ہی نہ چلتا کہ کون سا تیوہار کس رنگ کی چادر اوڑھنے والوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہی میل ملاپ، پریم اور بھائی چارہ، ہمدردی اور اپنا پن گھر کی خوش حالی اور ترقی کا سامان تھا اور یہ گھر آنگن پڑوس میں ایک مثالی گھر آنگن بن گیا تھا۔ تب نہ کسی ماتھا ٹیکنے والے کا کسی گھنٹہ بجانے والے کے ساتھ کوئی جھگڑا تھا اور نہ کسی پوتر استھان کے بارے میں کوئی بھید بھاؤ۔

اور ہوتا بھی کیوں؟ گھر والوں کا یہ اٹل وشواس تھا کہ سبھی پوتر استھان اس گھر کی مقدس نشانیاں، ہماری پاکیزہ وراثتیں اور امانتیں ہیں۔ ہمارا گھر بھی قابلِ احترام ہے اور اس کی یہ نشانیاں بھی مقدس ہیں۔

پیار کے ماحول میں، محبت کی فضا میں، ترقی اور خوش حالی کا کارواں بڑھتا رہا اور یہ خوبصورت گھر، جنت نشان بن گیا۔

وہ اکثر سوچتا رہتا ہے کہ کہاں گئے وہ دن۔ جب اس کا پورا گھر کشمیر کی وادیوں کی طرح سرسبز و شاداب تھا۔ جب ہر وقت آنگن میں محبت کے پھول کھلتے۔ خوشیوں کی پھوار پڑتی تھی!

لیکن جیسے موسم بدل گیا ہو۔

گھر کی فضا بدلی اور بدلتی ہی چلی گئی۔ قربتیں، دوریوں میں بدل گئیں۔ یگانے جیسے بیگانے ہو گئے۔ ہر سمت کھائیاں، ہر طرف دیواریں، حدیں اور سرحدیں نظر آنے لگیں۔

اب گھر والوں کی چادروں کا رنگ گاڑھا ہو گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اب چادروں پر تیز اور گہرا رنگ چڑھ جاتا۔ حالانکہ گھر والوں نے قدم قدم پر کھائیاں اور سرحدیں بنانے، بات بات میں چادر پر گہرا رنگ چڑھا لینے کے بڑے بھیانک انجام دیکھے ہیں۔ کتنی بستیاں اجڑیں کالونیاں جھلسیں، سڑکیں اور بازار خون میں ڈوب گئے۔

اور اب تو بات یہاں تک پہونچی ہے کہ ہر گھڑی چادر رنگ لینے کا جنون، دہشت، اُگرواد، آتنک واد کی نشانی بن گیا ہے اور چادر خود ڈر کی بات بن گئی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جب کسی مخصوص چادر کے اوڑھنے والے بڑے اہتمام کے ساتھ کسی اُتسو، میلے، تیوہار کی تیاری کرنے لگتے ہیں تو دوسرے رنگ کی چادر اوڑھنے والے لوگ جیسے ڈر جاتے ہیں اور بجائے قریب آنے کے اتنی دور کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے کوئی چھوت کا روگ پھیل رہا ہے جو نجانے کب لگ جائے۔

میلوں اور تیوہاروں کے موقعوں پر بھاری تیاریاں ہوتی

ہیں۔ بتیاں گاڑی جاتی ہیں، گیٹ سجائے جاتے ہیں، گلدستے لٹکائے جاتے ہیں۔ جھالریں لٹکتی ہیں، قمقمے جگمگاتے ہیں۔ مائیک پر طرح طرح کی دُھنیں بجتی ہیں۔ لیکن یہ سارے کام جیسے یونہی سے ہوں، جیسے ان میں خوشی کا کوئی سامان نہ ہو۔ باہر روشنی رہتے ہوئے بھی جیسے دل میں اندھیرے ہوں۔ خوشیوں کے سامان رہتے ہوئے بھی عورت، مرد، بوڑھے بچے سبھی اتنے خاموش ایسے بجھے بجھے رہتے ہیں جیسے کب کوئی زلزلہ آجائے اور ساری سجاوٹ بناوٹ دھڑام سے ڈھیر ہو جائے۔

دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ میلے، تیوہار گزر جانے کے بعد گھر والے یوں اطمینان کی سانس لیتے ہیں جیسے وہ کسی حادثے کی زد سے بچ گئے ہوں۔

شک وشبہ، وسوسہ، بے یقینی اور نفرت کی آگ بھڑکاتے والی افواہیں گھر کی فضا میں کڑوا کسیلا دھواں پھیلاتی رہتی ہیں۔

اب تو اس ماحول میں گھر والوں کا دم گھٹا جاتا ہے۔ بچوں کی بھولی بھالی مسکراہٹوں میں بھی جیسے زہر سا گھل گیا ہے۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا سوچ رہا ہے۔

اس کے گھر والوں کو کیا ہو گیا ہے؟

ہر وقت کے ہنگاموں میں اسکے گھر کا بہت کچھ لٹ چکا ہے اس کا بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ اور بکھر چکا ہے۔

اس کے سامنے زمانے کے خدوخال ابھر آتے ہیں۔ رنگ برنگی چادریں تو گھر والوں نے ہمیشہ ہی اوڑھی تھیں۔ لیکن یہ گھر کے لیے کبھی مسئلہ تو نہیں بنی تھیں۔ کبھی ایک چادر اوڑھنے والے دوسری چادر والے کو نقصان تو نہیں پہونچاتے تھے۔ ہمارے پورو ج جو کم پڑھے لکھے اور ہماری نگاہ میں جاہل اور گنوار تھے وہ شاید یہ بات سمجھتے تھے کہ چادر کے نام پر کبھی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ اس جھگڑے میں چادر کا تو کچھ نہیں بگڑتا، مگر انسان مر جاتا ہے، ضمیر مُردہ ہو جاتا ہے۔ نفرت پھیلتی ہے اور انسانیت تباہ ہوتی ہے۔ اسی لیے شاید ہمارے بزرگ اپنی اپنی چادر کو بہت سنجو کر اوڑھتے اور اسے گھر سے بازار تک نہیں لاتے تھے۔

ہم جو زیادہ پڑھے لکھے، زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور اپنی تہذیب و ترقی پر ہمیں فخر ہے، ایک ذرا سی بات پر اپنی چادر پر گہرا رنگ چڑھا کر گلیوں، کوچوں، سڑکوں، بازاروں میں نکل آتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے جیتی جاگتی بستیوں کو شمشان بنا دیتے ہیں۔

اس کے سامنے کیسے کیسے مناظر ہیں ــــ

جھلسے ہوئے در و دیوار

گری پڑی عمارتیں

سنسان، ویران راہیں

خاک و خون میں غلطاں بے جان چہرے

روتے بلکتے یتیم بچے، اجڑی مانگیں، سُونی کلائیاں

نڈھال، افسردہ اور فاقہ کش مزدور

بند فیکٹریاں اور کارخانے۔

صرف چادر کے نام پر وہ کتنے دکھ اور جھیلے گا؟ آگے ....

اور آگے ؟؟ ــــ آسمان دُور، زمین سخت ــــ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے اندھیرے اتر جاتے ہیں۔ اس کے دل کا درد اب ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔

وہ کہاں جائے۔ کیا کرے۔ اس کی چادر اس کے شانوں پر بوجھ ہے اور اس کے اندر جھنجھلاہٹ سی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے وہ اب اپنی چادر اتار کر پھینک دے، اور ایسی جگہ چھپا دے کہ آئندہ نسلوں پر اس کا سایہ بھی نہ پڑنے پائے۔

اس کے دل میں ایک درد مسلسل کروٹیں لے رہا ہے اور وہ ہر وقت کی گھٹن، کرب و اضطراب، ڈر، خوف اور ہراس سے نجات پا لینے کو مضطرب ہے۔

اس کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ غور کرتا ہے ـــ

جس طرح ہمارے بزرگوں نے چادریں اوڑھی تھیں، ہم بھی اسی طرح سنجو کر اوڑھتے تو اپنی چادر سے بیزار نہ ہوتے۔ اس کا استعمال وقتِ ضرورت ہی کرتے۔ ہر وقت نہیں تو ہمارے شانوں پر یہ بار نہ بنتی ہم اسے کسی مفاد کی تکمیل کا سامان نہ بناتے تو اس کا تقدس مجروح نہ ہوتا۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

طنز و مزاح

محمد نور بخش
اے ۔ ۴/۱۲ ۔ او سی آر کامپلیکس
ودھان سبھا مارگ لکھنؤ

خریدنا ٹی وی سیٹ کا

ٹی وی خریدنا بھی ایک فن ہے۔ جو لوگ اس فن سے واقف ہیں انھیں اچھے ٹی، وی مل جاتے ہیں۔ جو اس فن سے واقف نہیں ہیں، نہ تو انھیں اچھا ٹی۔ وی ہی مل پاتا ہے نہ ہی ان کے ٹی۔ وی کی مرمت اچھی ہو پاتی ہے۔ ہم تو اس سلسلے میں بالکل ہی جاہل تھے، بلکہ آج بھی ہیں۔ نہ تو ہمیں پہلے ہی اچھا ٹی۔ وی مل پایا تھا اور نہ ہی اب ہمارے پاس اچھا ٹی۔ وی ہے۔ ہم تو بہتر حال یہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ٹی۔ وی کے دوکان دار کا کہنا ہے کہ ہمیں اس نے بہت اچھا ٹی۔ وی دیا ہے۔

پہلے جب ہمیں بلیک اینڈ وہائٹ سٹ خریدنا تھا اس وقت تو ہم جانتے بھی نہیں تھے کہ ٹی۔ وی۔ کتنے قسم کے ہوتے ہیں اور کیوں۔ کہیں سالڈ اسٹیٹ کا ذکر تھا اور کہیں آئی۔ سی سیٹوں کی بہتری کا شور۔ اور ہم پریشان کہ آخر ٹی۔ وی خریدیں تو کیسے۔ کوئی جان پہچان بھی نہیں تھی۔ دوکان دار نے کوئی ایسا ویسا سیٹ پکڑا دیا تو برسوں رونا ہوگا۔

ادھر ٹی۔ وی اور اخبارات میں روز نئے نئے اشتہار دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ دنیا میں اگر رہنا ہے تو آج ہی ٹی۔ وی خرید لو .... ورنہ .... لوگ نہ جانے کیا سوچیں گے۔ دوسرے ہر اشتہار سے یہی جانکاری ملتی تھی کہ بس دنیا کا سب سے اچھا ٹی۔ وی یہی ہے۔

خیر۔ خدا خدا کرکے وہ دن بھی آیا، جب ہمیں بھی ٹی۔ وی خریدنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دماغ کو تھوڑا تیزی کے ساتھ دوڑانا شروع کر دیا۔ آنکھیں اور کان۔ کھلے رکھنے شروع کر دیئے۔ ہاتھ پیروں کو ذرا زیادہ ہلانا ڈلانا شروع کر دیا۔ ٹی۔ وی جو خریدنا تھا۔ دوستوں سے رائے لی۔ ٹی۔ وی مرمت کرنے والوں کو چائے پلائی۔ دو چار دوکانیں بھی دیکھ آئے .... کچھ دنوں بعد ہم نے محسوس کیا کہ اب ہم ٹی۔ وی خرید سکتے ہیں۔ بس فوراً چل پڑے بازار کی طرف۔

پہلی دوکان میں جتنے سٹ وہ رکھے تھا، سب دکھا دیے۔

اسی نے بتایا کہ سارے ہی سٹ ایک سے ایک شاندار ہیں ہم چکرائے ہوئے تھے ... ہر سٹ میں ایک ہی جیسی تصویر تھی جبکہ دوکان دار کے حساب سے نہ جانے کتنے قسم کے فرق تھے ان میں۔ لیکن اس کے حساب سے سب کی تصویریں ایک دوسرے سے بہتر تھیں۔

دوسرے دوکان دار نے بتایا کہ ہم جس کمپنی کے سٹ ابھی دیکھ کر آ رہے ہیں جاپان سے اس کا ٹھیکہ ہی ختم ہو چکا ہے۔ وہ تو بچے ہوئے سٹ ہی بیچ رہے ہیں۔ اپنی دوکان کے سیٹوں کی تعریف کرتے ہوئے اس نے ہمیں سمجھایا کہ ہم اس پر بھروسہ کرکے سٹ لے جائیں۔ کوئی خرابی نہیں نکلے گی۔ اگر نکل گئی تو سٹ واپس۔

"اچھا تو کون سا سٹ ٹھیک رہے گا؟"

"کوئی سا بھی لے لیجیے۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔"

پھر وہی بات —— ہر سٹ کا بس ڈیزائن الگ تھا۔ ہمیں پوری دوکان میں رکھے ہوئے درجنوں سیٹوں میں کسی کی تصویر میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا، اور وہ تھا کہ نہ جانے کیا کیا قصیدے پڑھتا چلا جا رہا تھا۔ خیر صاحب زیادہ اپنے کو پریشان کرنے کے بجائے ہم نے ایک سٹ پسند کر ہی لیا۔ وہ بولا —— "ہمیں معلوم تھا کہ آپ یہی

ٹ لیں گے؟

"کیوں بھئی کیوں؟ اور کیسے معلوم ہوا آپ کو۔؟!"

"بس معلوم ہوگیا۔ آخر ہم بھی تو دن بھر ٹی۔ وی ہی دیکھتے
،۔ ارے آپ کی پسند تو بس..... مان گئے ۔ جانتے ہیں فلاں
نا اور فلاں سب کے پاس یہی سیٹ ہے ۔ اور میں نے ہی
یے ہیں انھیں ۔ سوچیے ایسی شان دار ہے آپ کی پسند۔"

ہم ہی ہی ۔ ہی ہی کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔
ٹی۔ وی آگیا گھر پر ۔

دوکان کا آدمی آیا ۔ ٹی۔ وی فٹ کر گیا ۔ وہ بھی ویسی
تعریفیں جھونکتا رہا، جو ہم نے اس کی دوکان پر سنی تھیں ۔ کہ یہ
۔ وی خرید کر بہت ہی عقلمندی کا کام کیا ہے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو شاید مجھ
سے زیادہ بے وقوف کوئی نہ ہوتا۔ ٹی وی کیا لگ گیا ۔ جیسے دنیا
گئی ۔ شروع سے آخر تک پروگرام دیکھے جانے لگے۔

جیسے جیسے رنگین ٹی۔ وی دُنیا ئے ٹی۔ وی کے ناظرین
اپنے رنگ بکھیرنے لگا ہمیں اپنا بلیک اینڈ وہائٹ سیٹ عجیب
نگ اور باسی نظر آنے لگا۔ سوچا۔ اب اگر کلر ٹی۔ وی نہ لیا
نیا کو کیا منہ دکھا ئیں گے۔ بیوی بچے سب نے ۔ اس
ح ستانا شروع کر دیا کہ جیسے کلر ٹی۔ وی نہ آیا تو سمجھو ہم اس دنیا
ہ جی ہی نہیں رہے ہیں۔ یعنی ٹی۔ وی نہ ہوا زندگی دینے والی جڑی بوٹی
لیا۔

خیر صاحب۔ ایک بار پھر ہاتھ پیر، دماغ، کان اور آنکھ اور جیب
و مانجھ کر صاف کیے ... اس بار باقاعدہ ایک نوٹ بک بنائی۔
بار اور ٹی۔ وی کے اشتہاروں سے مختلف ٹی۔ وی۔ سیٹوں کی
میل، قیمت، دوکان کا پتہ نوٹ کیا۔ پھر ایک دن ایک بازار
سرے دن دوسرا بازار، تیسرے دن تیسرا بازار کھنگال ڈالا۔
ری معلومات کو نوٹ بک کے حوالے کیا۔

اب بیٹھے یہ دیکھنے کہ کون سا ٹی۔ وی خریدا جائے۔ فلاں
وی میں یہ ہے تو وہ نہیں۔ فلاں میں وہ ہے تو یہ نہیں۔ جس میں
ور وہ دونوں ہیں اس کی قیمت اپنی حد کے باہر ہو رہی تھی ۔

خیر، حد کی قیمت والے سارے سیٹ یکجا کیے ۔ ان میں سے کون بہتر
ہے یہ اندازہ لگا کر پہونچے دوکان پر ۔ معلوم ہوا کہ حد والی قیمت کے سیٹ
پرانے پڑ چکے ہیں۔ آؤٹ آف ڈیٹ ہو رہے ہیں۔ لیٹسٹ ہی خریدیے۔
گھر واپس آگئے۔

پھر نوٹ بک نکالی۔ پھر وہی پورا سبق ۔ تھوڑی بہت
پیسوں کی کھینچ تان کی۔ اپنی حد کو بڑھایا، اور پھر پہونچے ۔ معلوم
ہوا کہ اب جو سب سے نیا سیٹ آیا ہے وہ چوکور اسکرین والا ہے
اسے نہ لیا تو آگے بہت مشکل ہوگی۔ یعنی ابھی جیسے بہت آسانی
تھی۔ خدا خدا کر کے اپنا بلیک اینڈ وہائٹ سیٹ بیچ کر لے ہی ڈالا
کلر ٹی۔ وی ۔ پھر وہی تعریفیں .... پھر وہی ہمارے عقل مند ہونے
کا ثبوت ۔ پھر وہی اور پھر وہی ۔!

دوسرے ہی دن ٹی۔ وی نے آن ہونے سے انکار کر دیا ۔
خوف اور بڑھ گیا۔ کہیں دھوکا تو نہیں کھا گئے ہم۔ دوکان دار کو اطلاع
دی۔ کمپنی سے آدمی آیا ۔ دو ہی منٹ میں سیٹ اسی طرح
چلنے لگا جیسے بگڑا گھوڑا ٹھیک ہونے کے بعد چلتا ہے۔ ہم نے
اس سے سیکڑوں قسم کے سوالات کر ڈالے۔ اپنا خوف ظاہر کر دیا۔

"بھائی صاحب! سیٹ اچھا تو ہے نا ۔ کہیں .... ؟
"ارے آپ فکر نہ کریں ۔ ہم جو ہیں ۔"
"آپ کی کمپنی تو اچھی ہے نا ... ؟"

وہ بیچارہ کافی دیر سے ہمارے سوالوں کا حملہ جھیلتے رہنے کے بعد
شاید کچھ جھنجھلا گیا تھا۔ بس پھٹ پڑنے کے سے انداز میں بولا:

"جناب ایک بات آپ سمجھ لیں ۔ ٹی۔ وی سب ایک جیسے
ہوتے ہیں۔ بس کمپنیاں اپنے اپنے حساب سے انھیں سجا بنا کر
ان کی قیمتوں میں فرق کرتی رہتی ہیں ۔ دو چار رینج ہیں.... ہر ایک رینج
میں ایک ہی قسم کے ٹی۔ وی ہوتے ہیں۔ آپ ہماری کمپنی کا سیٹ
نہ لے کر دوسری کمپنی کا لیتے تو بھی یہی خرابی ہو سکتی تھی ۔ اور اس کمپنی کا
آدمی بھی آپ کو اس وقت یہاں کھڑے ہو کر یہی بات سمجھا رہا ہوتا۔ سمجھے!"
اور ہم سوچ رہے تھے تو پھر اتنا شور کیوں ہو رہا ہے۔
فلاں بہتر۔ فلاں اس سے بہتر ۔ اور فلاں سب سے بہتر اور پھر ہم نے

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب: "آئینہ احساس"

شاعر: شارق میرٹھی   قیمت: انیس۱۹ روپے

ملنے کا پتہ: محمد مشتاق شارق۔ ۵۶۔ کوٹلہ، میرٹھ

بادہ و جام، حرفِ شوق اور الہاماتِ سرمد کے بعد "آئینہ احساس" جناب شارق میرٹھی کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ نثر میں موصوف کی پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آئینہ احساس بنیادی طور پر غزلوں کا سرمایہ ہے۔ لیکن اس میں ایک نظم "مسجد قرطبہ کی واپسی" بھی شامل ہے۔ پیش لفظ میں شارق صاحب کہتے ہیں کہ: "سرسید کا گریبان میرے یہاں آئینہ احساس کی صورت میں رونما ہے"۔

یہ مجموعہ آپ بیتی کا عکاس بھی ہے اور جگ بیتی کا ترجمان بھی۔ غزل کے بارے میں ان کے خیالات ایک نظم نما غزل کے چند اشعار سے مترشح ہیں ؎

جہانِ شوق کے ہر رخ کا آئینہ ہے غزل
کہیں لہو ہے کہیں سرخیِ حنا ہے غزل
ہر ایک شعر ہے قرنوں کی زندگی کا عکس
جنم جنم کے خیالوں کا ارتقا ہے غزل
بنی ہے لفظ و معانی کی ایک قوس قزح
کہیں ہے دھوپ کا پیکر، کہیں گھٹا ہے غزل
تمام شبنم دانش، تمام شعلۂ شوق:
کہ فکر و جذبہ کا رنگین ماجرا ہے غزل

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں ہم شاعر کے سمت و رخ کا تعین بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ مجموعہ شارق میرٹھی کی مشق و مزاولت کا آئینہ دار ہے۔ ہر طرح کے مضامین کو شعر کے خوبصورت پیکر میں ڈھالنے کا ہنر بھی انھیں اچھی طرح آتا ہے۔ غزل جس رمزیت کی متقاضی ہے۔ شاعر اس سے بخوبی واقف ہے ان کے اشعار قدم قدم پر دعوت غور و فکر دیتے ہیں، جنھیں پڑھ کر بے ساختہ واہ وا نکل جاتی ہے۔ پہلی غزل سے ہی شارق میرٹھی کا مسلک واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ دو شعر آپ بھی دیکھیے ؎

تاریک ہو مگر کبھی تاریک تر نہ ہو
یارب کسی کی شامِ الم بے سحر نہ ہو
شارق مری دعا ہے کہ گلشن میں برگِ گل!
شبنم سے خوب تر ہو مگر خوں میں تر نہ ہو

اپنی بات کو زیادہ طول نہ دے کر میں کہیں کہیں سے کچھ شعر پیش کر رہا ہوں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مجموعہ میں شامل سبھی غزلیں دامنِ شوق کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور ہر غزل "مرصع" کی تعریف میں آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ 'آئینہ احساس' کی اہمیت کو محسوس کیا جائے گا اور اربابِ ذوق اسے آنکھوں سے بھی لگائیں گے اور دل سے بھی۔

کیوں اہلِ خرد راہ کے کانٹوں کو ہٹاتے
یہ کام تو دل والوں کے کرنے کیلئے تھے
افسوس کہ تزئین و نمائش میں ہوئے صرف
وہ رنگ جو کردار میں بھرنے کیلئے تھے

اسی سے آج بھی ملتا ہے ہم کو سوزِ حیات
وہ زندگی جو کڑی دھوپ میں گزار آئے

پیشانی تو رکھ دیتے اس شوخ کے قدموں پر
کچھ اہلِ خودی بھی تھے ہم درد کے ماروں میں

آشیانوں کا مقدر معلوم   جب فضائیں ہوں شرر بار بہت

کس کس کا یہاں لٹتے ہوئے گھر نہیں دیکھا
اب کس سے کہیں کون سا منظر نہیں دیکھا

آج کے دور کی تقدیر یہی ہے شاید
زندگی ٹوٹ کے خوابوں میں بکھر جاتی ہے

——— رباب رشیدی

نام کتاب : "لکھنؤ کے اُمّی شعراء"
مؤلف : حیدر حسین فضا لکھنوی   قیمت : چالیس روپئے
ملنے کا پتہ : فرخ پبلی کیشنز۔ ۱۶، اشرف منزل، محمد عمر گوکل مارگ بمبئی ۹

"لکھنؤ کے اُمی شعراء" حیدر حسین فضا لکھنوی کی ایک قابلِ ذکر تالیف ہے۔ جس میں موصوف نے لکھنؤ کے ۶۸ بے پڑھے لکھے شعراء میں سے بعض کے صرف حالات اور بعض کے حالات مع نمونۂ کلام پیش کیے ہیں۔ تقریظ پروفیسر سید شبیہ الحسن نے اور پیش لفظ پروفیسر سید مجاہد حسینی نے لکھا ہے۔

فاضل مؤلف نے زیرِ نظر تالیف میں صحت حالات کا کتنا خیال رکھا ہے، یہ بات کتاب کے حواشی اور آخر میں دی ہوئی فہرست کتابیات سے ظاہر ہے۔ انھوں نے امّی شعراء کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ایک دو نہیں بلکہ ۵۴ کتابوں کا دقت نظر سے مطالعہ بھی کیا ہے۔ فضا لکھنوی نے شعراء کے حالات لکھنے میں لطفِ زبان اور کیف بیان کا خاص لحاظ رکھا ہے، جس سے ان کی خاکہ نگاری بڑی جان دار، پرکشش اور انفرادی محسوس ہوتی ہے۔ جن ان پڑھ شعرائے لکھنؤ کو انھوں نے اپنی اس تالیف میں شامل کیا ہے، ان میں قدیم شاعروں میں ننھو صاحب شفیق کا "دیوان عطیۂ الٰہی" اور فضل اللہ فضل کا "دیوانِ فضل" صاحبانِ علم کے لیے مرکزِ فکر و نظر ہے، اسی دور میں چھنگا صاحب حسین بھی مشہور و معروف مرثیہ گو گزرے ہیں۔ مرزا ہادی حسین نشتر بھی غضب کے شعر کہتے تھے۔ کاظم حسین گردوں، نور عالم نور غزل گو اور سید نثار حسین نرگل قابلِ ذکر ہزل گو شعرا تھے۔ موجودہ شعرا میں تاجدار احمد تاج کا "معیارِ سخن" اور حفیظ سلمانی کا "آئینہ خانہ" بھی قابلِ قدر ادبی مجموعے ہیں۔ محمد اصغر جمال، شیخ ہادی رضا ہادی اور سید فضل حسین افضل بھی مشاعروں اور محافل میں دادِ سخن خوب پاتے ہیں۔

نمونۂ کلام : ننھو صاحب شفیق ؎

صبحِ پیری آگئی اب خواب سے چونکو شفیق
ختم ہے شامِ جوانی آنکھ تو کھولو شفیق

فضل اللہ فضل ؎

غافل نہ ہو اے فضل ذرا ہوش میں آؤ
دیوانوں کو کر دیتی ہے ہشیار محبت

چھنگا صاحب حسین ؎

اوس پڑنے سے ہے بھیگی ہوئی صحرا کی زمیں
طائروں کو بھی برودت سے کہیں چین نہیں

انقلاب ایسا نہ آیا ہے تہِ چرخِ بریں
بلبلیں بیٹھی ہیں لالے کی انگیٹھی کے قریں

بال و پر اوس سے بھیگے ہوں تو راحت کیسی
آتشِ گل میں برودت ہے حرارت کیسی

کاظم حسین گردوں ؎

تذکرہ تھا یہ مری چاک گریبانی کا
کیا ہوا آپ نے کیوں اپنا گریباں دیکھا

نور عالم نور ؎

باتیں در و دیوار سے کرتے ہو اکیلے
سب دیکھنے والے تمھیں دیوانہ کہیں گے

سید نثار حسین نرگل ؎

سیاہ برقعوں کی بس اب بہار باقی ہے
نہ ڈولی ہے نہ کوئی اب کہار باقی ہے

تاجدار احمد تاج : ؎

اب اپنے آپ کو پہچان بھی نہیں سکتے
بدل گیا ہے زمانہ بدل گئے ہم لوگ

حفیظ سلمانی ؎

روٹھا ہر ایک لطف تری دوستی کے ساتھ
اب صرف تلخیاں ہیں مری زندگی کے ساتھ

محمد اصغر جمال ؎

پروردگار اس کا نہیں غم خوشی نہ دے
تو ہین زندگی جو ہو وہ زندگی نہ دے

شیخ ہادی رضا ہادی ؎

ان سے نظریں ملیں دل کے ٹکڑے ہوئے
کتنا ہائے غضب کا تھا صمصام بہر

سید افضل حسین افضل ؎

ہماری خستہ لباسی پہ گل بھی ہنستے ہیں
خزاں نما چمنِ زیست کی بہار ہیں ہم

ان اشعار کو پڑھ کر کیا یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ یہ ان پڑھ شعراء کا کلام ہے۔ یہاں مشتے نمونہ از خروارے چند شعراء کے شعر پیش کیے گئے ورنہ "لکھنؤ کے اتی شعراء" کا رنگ شروع سے آخر تک چوکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حیدر حسین رضا لکھنوی کا یہ ادبی کارنامہ تاریخِ ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر مصطفےٰ فطرت ______

نام کتاب :۔ میر منصب علی ہنر : حیات اور شاعری
مرتب : علی مہدی ایڈوکیٹ　　قیمت : تیس روپئے
ملنے کا پتہ : دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

میر منصب علی ہنر اپنے عہد (۱۸۴۰ء تا ۱۹۰۴ء) کے ایک مسلم الثبوت استاد تھے۔ علی مہدی ایڈوکیٹ نے نہ صرف ان کی حیات کے گم شدہ اوراق یکجا کیے بلکہ ان کی ساری زندگی کے اصل خدوخال ادب کے اس آئینے میں من وعن آشکارا کیے جسے ہم تحقیق کہتے ہیں۔ محقق کے لیے جو شرط متعین ہے علی مہدی کی تحقیق اس کا ایک بہتر نمونہ ہے۔ ہنر کی حیات و ممات سے لے کر ان کی شاعری تک جو کچھ بھی انھوں نے تحریر کیا ہے اس کو ہر طرح اور ہر ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اُردو ادب میں عموماً محقق سہل پسندی کا شکار ہیں۔ وہ جو آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں یا قاضی عبدالودود کی طرح تحقیق کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ علی مہدی کی یہ تحقیق بھی تشنہ ہو اور اس سے آگے بھی کچھ بات بنتی ہو۔ پھر بھی علی مہدی نے ہنر کے لیے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی بات تھوپنے کی کوشش نہیں کی بلکہ شواہد کے ساتھ جو لکھنا تھا اسے لکھ دیا۔

ہنر نے اُردو، فارسی نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا ہے۔ تاریخ لکھنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ رباعی، قصیدہ اور غزل سے لے کر نعت و منقبت تک ہر صنفِ سخن سے ان کا کلام روشن ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎ (رباعی)

کیا پوچھتے ہو، ہجر میں تم حالتِ دل
ہوں درد کے اظہار پر کیوں کر مائل
دل کرتا ہے منع لب یہ کہتے ہیں کہو
گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

غزل کے چند اشعار دیکھیے ؎

ڈالا ہے آپ نے جو ہنر کو عذاب میں
یہ تو بتائیے کہ ملے گا ثواب کیا

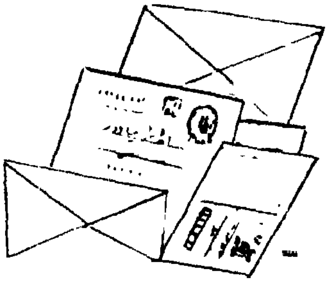
میں نے پوچھا کہ کہو غیر سے وعدہ ٹھہرا
آ کے غصے میں کہا اس نے کہ ٹھہرا ٹھہرا

سطریں یہ موج کی نہیں دریا پہ دیکھیے
مضموں لکھے ہوئے ہیں مرے اضطراب کے

علی مہدی ایڈوکیٹ نے اپنی اس کتاب میں کلیات کا انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ انھوں نے غالباً ضخامت کے خوف سے ایسا کیا ہے اگر وہ الگ سے میر منصب علی ہنر کا کلیات بھی شائع کرا دیں تو بہتر ہو۔ اس سے ہنر کی شاعری کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مختصر یہ کہ یہ کتاب ہنر کی حیات اور شاعری پر جو روشنی ڈالتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب میر منصب علی ہنر سندیلوی کے موضوع پر جو بھی قلم اٹھائے گا وہ علی مہدی کی اس قابلِ قدر کتاب کو نظر انداز نہیں کرے گا کیونکہ ہنر سندیلوی پر اس سے پہلے اور اس سے بہتر کوئی کاوش نہیں ملتی۔

______ وقار ناصری



ہمارے نام.....



نیادور اب اپنی معیاری، تہذیبی، اخلاقی و ادبی تخلیق کے لیے ہندستان کے تمام اُردو رسالوں سے اتنی کم قیمت پر بھی بے حد اونچائی پر دکھائی دے رہا ہے ۔

——— سیما صغیر
علی گڑھ

نیادور کے شمارے فروری ۱۹۹۱ء تک مل گئے۔ تمام شمارے ہر اعتبار سے اچھے ہیں۔ مسرت ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ رسالہ خوب سے خوب تر معیار حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔

——— عبدالقوی دسنوی
بھوپال

نیادور کے دو شمارے (نومبر اور دسمبر ۱۹۹۰ء) ایک ساتھ ملے نئی ترتیب و تزئین سے دل خوش ہوا۔ علیم صاحب پر منظر سلیم کا مضمون بہت پسند آیا۔ دو بار پڑھ چکا ہوں پھر بھی تشنگی باقی ہے ۔ ڈاکٹر عبدالعلیم (مرحوم) میرے بھی کرم فرما تھے۔ جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے علی گڑھ جا کر میں ان سے کئی بار ملا۔ ان کا ایک انٹرویو بھی لیا جو ہما میں "خالد ہندی" کے قلمی نام سے شائع ہوا۔ کوئی مضمون ایسا بھی شائع کیجیے جو ان کی علی گڑھ اور دہلی کی زندگی کا احاطہ کر سکے ۔

——— پروانہ ردولوی
نئی دہلی

دسمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں آپ نے جس بات کی طرف توجہ دلائی ہے، کاش ہم لکھنے والے قلم کے تخریبی استعمال کی کاٹ حسن و خوبی کے ساتھ اسی شد و مد سے کرنے میں لگ جائیں ۔

علیم صاحب پر مضمون بہت پسند آیا۔ غزلیں سب کی سب معیاری ہیں اور آپ کی انتخابی صلاحیت پر دال ہیں ۔

——— عبدالصمد تپش
بیگوسرائے (بہار)

نیادور کا اکتوبر ۱۹۹۰ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ اتنا اچھا پرچہ نکال رہے ہیں جو واقعی قابلِ ستائش ہے ۔

جناب وجاہت علی سندیلوی صاحب کا مضمون "اُردو کے ہم آواز حروف" پڑھا۔ سچ مچ یہ وقت کی آواز ہے اور اُردو کی ترقی و بقا کے لیے ان کی تجاویز نہ صرف قابلِ غور ہیں بلکہ قابلِ عمل بھی ۔

میں یہاں کروکشیتر (ہریانہ) میں اردو کی مفت تعلیم دے رہا ہوں۔ جس کے لیے وکلا، ڈاکٹر، پروفیسر غرضیکہ ہر طبقہ کے صاحبان کلاسوں میں آتے رہے ہیں۔ پڑھاتے ہوئے جب ہم آواز حروف کے استعمال کا سوال آتا تھا یعنی کس جگہ کون سا حرف استعمال ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے، تو اس کا جواب نہ تو کسی گرامر میں ہے اور نہ کسی عالم کے پاس بس صرف یہی جواب ہے کہ چونکہ یہ الفاظ عربی یا فارسی کے ہیں اور ان زبانوں میں ایسے ہی لکھے جاتے ہیں جس سے نئے پڑھنے والوں کی تسلی نہیں ہوتی۔ اپنے خیالات کو مفصل طور پر پیش کرنے کے لیے تو علاحدہ مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہاں صرف یہ عرض کر دوں گا کہ نئے اُردو پڑھنے والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ غیر ضروری حروف

اردو سے فوراً ہٹا دینے چاہئیں۔ اردو کے سبھی خواہ علماء اس پر سنجیدگی سے غور کریں۔

——— دوست بھاردواج

اردو مرکز۔ کروکشیتر (ہریانہ)

بعض زبانوں میں صرف قوتِ نظر و حفظ کی مدد سے دسترس حاصل ہو جاتی ہے مثلاً ہندی وغیرہ اور بعض زبانوں کے لیے قوتِ عقلیہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے مثلاً عربی وغیرہ۔

اردو چونکہ ایک مخلوط زبان ہے اس لیے اپنی تعلیم میں جزوی طور پر قوتِ عقلیہ کی محتاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اس کی تعلیم میں پریشانی پیش آ رہی ہے، جس کے ازالہ کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حروفِ تہجی کو تو اپنی شکل میں برقرار رکھا جائے تاکہ اردو کا ماضی سے بھی رشتہ باقی رہے اور حال کے لیے یہ کیا جائے کہ عربی و فارسی زبان کے جو الفاظ اس میں شامل ہیں اس کے مترادف ہندی کے الفاظ کو داخل کر لیا جائے اور عربی فارسی کے الفاظ کو کلیتاً ترک کر دیا جائے اس سے زبان کے سیکھنے میں بڑی حد تک سہولت ہو جائے گی، اور ہم آواز حروف کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

——— محمد زاہد بیگ

شاہ جہاں پور

نیا دور (اکتوبر ۱۹۹۰ء) کی "اپنی بات" قابلِ مطالعہ ہے۔ آپ نے بجا تحریر کیا ہے کہ "یہ فسطائی اور ملک دشمن عناصر اب اپنی ناپاک سرگرمیوں کو آخری حدوں تک پہنچانے پر کمربستہ نظر آ رہے ہیں۔" رضوانہ سیف عابدین کا مضمون "گاندھی جی — روشنیوں کی تاریخ کا ایک باب" اچھا مضمون ہے۔ اس مضمون میں گاندھی جی کو مختلف زاویوں سے دکھایا گیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "تذکرہ میر حسن کا تحقیقی جائزہ" ایک معلوماتی مضمون ہے۔"

——— افضال عاقل

۲۴ پرگنہ۔ (مغربی بنگال)

نیا دور ہمیشہ ایک باوقار جریدہ مانا گیا ہے۔ لیکن جب سے آپ نے نظامِ ادارت سنبھالا ہے، اس کا صوری اور معنوی حسن قابلِ رشک ہو گیا ہے۔ مضامین، نثر و نظم کا انتخاب اور ان کی ترتیب آپ کے اعلیٰ اور معیاری ادارتی ذوق کی دلیل ہے۔

——— ڈاکٹر تسخیر فہمی

لکھنؤ

ماہ نومبر کا نیا دور نظر ہوا۔

مواد و معیار ہر لحاظ سے قابلِ تحسین۔ آپ حضرات کی کاوشیں اور دیدہ ریزی ہر صفحے سے جھلکتی ہے۔ مضامین کا حصہ نہایت کارآمد ہے خصوصاً "اردو کہانی میں انشائیہ نگاری"، "مکاتیب غالب مرتبہ مولانا عرشی ایک جائزہ"، "ماچس لکھنوی"، "بدایوں کا علمی ادبی ماحول" بہت پسند آئے۔ افسانوں میں "بارش اور آنسو" نیر مسعود نے خوش اسلوبی سے ترجمہ کیا ہے۔ "اپنی بات" اور "رقم کرتے رہیں گے" تو خاص چیزیں ہیں۔

ڈاکٹر محبوب راہی کی نظم "ہم ایک رہیں گے" اور اظہر عنایتی کی غزل معنی خیز ہے۔

——— دلشاد لاری

کان پور

نومبر کے شمارہ میں آپ کی "اپنی بات" درحقیقت ہر امن پسند شہری کے دل کی بات ہے۔ اس وقت سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ مفاد پرست لوگوں نے "مذہب" کو سیاسی نعرہ بنا لیا ہے حالانکہ ان کو مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

——— فاخر عمری مدراسی

مدراس

نومبر/دسمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے خوب ہیں۔ ایک بات ضرور کہوں گا کہ جناب ملک زادہ منظور احمد سے ایک انٹرویو میں جہاں آرا سلیم نے انصاف نہیں کیا کیونکہ انھوں نے حقیقت سے آنکھیں نہیں ملائیں یا ڈاکٹر ملک زادہ نے وہ جواب نہیں دیے جو درست تھے۔ ہمارے مشاعروں میں پروگرام بنانے والوں اور شاعر کا انتخاب کرنے والوں میں گروہ بندی کنبہ پروری زیادہ ہے۔ ڈاکٹر ملک زادہ نے دبی زبان سے اعتراف تو کیا ہے لیکن اس بدعت کے خلاف

نیا دور

جلد ۴۶ | نمبر ۴

جولائی سنہ ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر
شاہ نواز قریشی

ٹیلیفون: ۲۴۷۱۰۸

پبلشر
انل سروپ
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

انتظامی و ادارتی معاونین
محمد الیاس خاں ۔ نجیب انصاری

مطبوعہ
یونائٹیڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

فی شمارہ: ایک روپیہ
زرسالانہ: دس روپیے

ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن بیورو انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ادیب کی سماجی ذمہ داری پر زور دینے کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہوتا کہ سماج میں کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے، تشدّد اور تصادم کا ماحول ہو یا فرقہ وارانہ فساد ہو جائے تو ادیب کو فوراً قلم لے کر دوڑ پڑنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ادیب یہ مسائل حل نہیں کر سکتے۔ تشدّد، تصادم اور فساد کو روک نہیں سکتے۔ لیکن ایسا ماحول پیدا کرنے میں، جس میں تشدّد، تصادم اور فساد کے لیے کوئی جگہ نہ ہو، ادیب ایک رول ضرور ادا کر سکتے ہیں۔ ادیب اور فن کار اپنے قلم اور فن کے ذریعہ ذہنی تربیت میں معاون ہو سکتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ انداز فکر میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ سماجی ذمہ داری پر زور دینے کا یہ مطلب بھی نہیں ہوتا کہ ادب کے ذریعے پروپیگنڈہ یا نعرے بازی کی جائے۔ جمالیاتی اور فنی قدروں کے پورے التزام کے ساتھ بھی سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے بڑا پختہ شعور بالغ نظری اور فنی مہارت ضروری ہے۔

مان لیجیے کوئی ایسا افسانہ یا ناول شائع ہوتا ہے جس میں ایک فرقے کے کچھ افراد کو دوسرے فرقے پر ظلم ڈھاتے دکھایا گیا ہو — اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہو کہ ظالم افراد جس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ (پورا فرقہ) بڑا ظالم ہے۔ اس افسانے یا ناول کی زبان اور اسلوب بہت خوبصورت اور موثر ہو اور اس کی تکنیک بھی بالکل نئی ہو، تو کیا محض اس بنا پر اس افسانے یا ناول کو ایک عظیم فن پارہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ سماج پر اس فن پارے کا کیا اثر پڑے گا، اسے نظر انداز کرتے ہوئے محض زبان و بیان اور اسلوب کی بنا پر کیا اُسے شاہ کار مان لیا جائے گا؟ یہیں سماجی ذمے داری کا سوال اٹھتا ہے۔ لیکن ہماری (جدید) ساختیاتی اور اسلوبیاتی تنقید اس سوال پر توجہ نہیں دیتی کیونکہ وہ موضوع سے بحث نہیں کرتی۔ محض زبان و بیان اور اسلوب کی بنیاد پر ہی فن پاروں کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے، جو حقیقتاً سماجی ذمہ داری سے آنکھ چرانے کے مترادف ہے۔

رفتگان

گزشتہ دنوں اُردو شعر و ادب سے تعلق رکھنے والی چار شخصیتیں ہمیں داغ مفارقت دے گئیں۔ ان میں ——— سیّد ظفر عبّاس فضل نقوی کلاسیکی رنگ و آہنگ کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے، جن کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد آج بھی برصغیر میں موجود ہے۔

○ مشہور افسانہ نگار بیر راجا ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔ ان کے افسانوں میں سماجی ذمّے داری کا احساس بہت نمایاں ہے۔

○ معروف شاعر سیّد حیات وارثی کی شخصیت ہندی اور اُردو کا سنگم تھی۔ وہ "ہندی اُردو سنگم" نامی تنظیم کے بانی بھی تھے۔

○ آغا محمّد حیدر میکش لکھنوی ایک ماہر مزاحیہ کالم نویس بھی تھے۔ آپ روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ سے بھی وابستہ رہے۔ اُردو کے ساتھ آپ انگریزی میں بھی لکھتے تھے۔

ادارۂ نیا دور ان شخصیات کے سانحۂ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

○

——— شین قاف

اترپردیش کے نئے وزیر اعلا

شری کلیان سنگھ

شری کلیان سنگھ کی پیدائش ۵ جنوری ۱۹۳۲ء کو ضلع علی گڑھ کی تحصیل اترولی کے ایک چھوٹے سے گاؤں مڑھولی میں ایک معمولی کسان خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد چودھری تیج پال سنگھ ایک سادہ، وسیع النظر اور محنتی انسان تھے۔

شری کلیان سنگھ بچپن ہی سے نہایت ہونہار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی خوش اخلاقی اور فرض شناسی کی وجہ سے گاؤں کے سبھی لوگوں میں مقبول رہے۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ زرعی کاموں میں بھی دل چسپی لیتے تھے۔ اسی درمیان ۱۹۵۲ء میں رام وتی دیوی سے ان کی شادی ہوئی۔

انھوں نے دھرم سماج ڈگری کالج علی گڑھ میں اعلا تعلیم حاصل کی۔ آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایل۔ٹی کی ڈگری امتیازی طور پر حاصل کرنے کے بعد وہ درس و تدریس کے کام سے وابستہ ہوگئے۔

شری سنگھ ۱۹۶۲ء میں مشہور سیاسی مفکر پنڈت دین دیال اپادھیائے کے خیالات سے متاثر ہوکر سیاست میں داخل ہوئے۔ وہ اب تک سات مرتبہ ممبر اسمبلی منتخب ہوچکے ہیں۔ پارلی مانی امور کے ماہر ہونے کے ساتھ ہی وہ ایک اچھے مقرر بھی ہیں۔ سب سے پہلے وہ ۱۹۶۷ء میں اترولی اسمبلی حلقہ سے منتخب ہوئے۔ اس کے بعد وہ ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۴ء میں دوبارہ اسی حلقہ سے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں ایمرجنسی کے بعد وہ پھر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ء ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۱ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے اسمبلی کے لیے پھر منتخب ہوئے۔

شری سنگھ ۱۹۷۷ء میں حکومت اترپردیش میں وزیر صحت مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر فائز ہوکر انھوں نے اپنی ایمان داری انتظامی صلاحیت اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں انھوں نے تمام ریاست میں شہرت پائی۔ وزرائے صحت پر مشتمل مرکزی حکومت کے اس وفد میں وہ بھی شامل تھے جس نے تھائی لینڈ اور سنگاپور کا دورہ کیا تھا۔

کسانوں مزدوروں اور ریاست کے عوامی مسائل کے حل پر زور دینے کی پاداش میں وہ سات بار جیل گئے۔ ایمرجنسی میں تو انھوں نے ۲۰ ماہ تک سخت قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

شری سنگھ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۹ء تک دوبار اترپردیش بھارتیہ جنتا پارٹی کے ریاستی صدر رہے اور انھوں نے اس عہدے پر عدیم المثال تنظیمی صلاحیت اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ریاستی صدر منتخب ہوجانے کے بعد انھوں نے پہلی بار بھارتیہ جنتا پارٹی کو "چلو گاؤں کی جانب" کا نعرہ دیا اور خود ریاست گیر دورے کر کے گاؤں کے غریب کسانوں میں اپنے حقوق کے تئیں بیداری پیدا کی اور انھیں منظم کیا۔

ان کی سربراہی میں اپریل ۱۹۸۷ء میں ریاست کے پانچ لاکھ کسانوں کی بے مثال تاریخی ریلی کا انعقاد راجدھانی لکھنؤ میں کیا گیا۔ شری کلیان سنگھ کا نظریہ ہے کہ کسان اٹھے گا تو گاؤں اٹھے گا اور گاؤں اٹھے گا تو ملک اٹھے گا۔

سال ۱۹۸۶ء میں جموں و کشمیر میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی قومی عاملہ کے جلسے میں کسانوں کے حقوق کا محضر تیار کرنے کی ذمہ داری شری کلیان سنگھ کے سپرد کی گئی۔

شری سنگھ نے جنوری ۱۹۸۷ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے قومی اجلاس وجے واڑہ میں کسانوں کے حقوق پر مشتمل ایک دستاویز پیش کی جسے کھلی بحث کے بعد پارٹی نے منظور کرلیا۔

شری کلیان سنگھ کا سوانحی پس منظر دیہی رہا ہے۔ غریب کسانوں اور دیہی عوام کی دشواریوں اور ان کے دکھ درد کا انھیں پورا احساس ہے اور ان کے مفادات کے تحفظ کو وہ اولین ترجیح دیتے ہیں نیز ان کی دشواریوں اور مسائل کے حل کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔

۲۰ جون ۱۹۸۵ء کو بھوپال میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنی قومی عاملہ کے جلسے میں بھاجپا کی ریزرویشن پالیسی کا مسودہ تیار کرنے کی ذمہ داری شری کلیان سنگھ کے سپرد کی تھی جس کی تکمیل انھوں نے بڑی تندہی کے ساتھ کی اور تین نکاتی متوازن پالیسی بناکر ریزرویشن کے لیے ایک ہمہ جہت پالیسی وضع کی۔

سال ۱۹۸۹ء میں اسمبلی میں وہ بھاجپا قانون ساز پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے اور اس عہدہ پر فائز رہ کر انھوں نے غیر منصفانہ پالیسیوں نیز ریاست کے کسانوں، مزدوروں اور بنکروں کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کے خلاف مسلسل آواز اٹھائی۔

اترپردیش اسمبلی انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد شری سنگھ ۲۲ جون ۱۹۹۱ء کو بھاجپا قانون ساز پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے اور ۲۴ جون ۱۹۹۱ء کو وہ ریاست کے وزیر اعلا کے عہدے پر فائز ہوئے۔

شری کلیان سنگھ ایک اچھے مقرر ہیں ادب، علمی سرگرمیوں اور مطالعہ سے انھیں خصوصی دلچسپی ہے زراعت سے انھیں گہرا لگاؤ ہے۔

□□

جاری کردہ: اطلاعات بیورو محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

رباب رشیدی
۶۵، ترین
شاہ جہاں پور

درد کے رشتے

میرا احساس لطافت میں جو شبنم کی طرح
میرا احساس جو پھولوں کی قبا پہنے ہے
میرا احساس جو شامل ہے جہاں کے غم میں
میرا احساس جو تنہا بھی ہے تنہا بھی نہیں
کیفیت میری ہے اس شعرِ مظفر[1] جیسی
"غیر کے غم کا بھی اب دل پہ اثر ہوتا ہے
کوئی روتا ہے تو دامن مرا تر ہوتا ہے"
کارواں کتنے خیالوں کے ہیں میرے ہمراہ
اجنبی راستے بھی دیکھے ہوئے لگتے ہیں

سارے چہروں کو میں پہچان رہا ہوں جیسے
چہرے جذبات کو تحریر کیا کرتے ہیں
کبھی دھندلے، کبھی مبہم، کبھی واضح جذبے
کھلتے جاتے ہیں مرے دل پہ کتابیں بن کر
یہ کتابیں مری تنہائی کو کم کرتی ہیں
ڈھونڈھتا رہتا ہوں اکثر انھیں تحریروں میں
وقت کے بدلے ہوئے رُخ نئے عنوانوں سے

بستیوں میں کبھی صحرا نظر آتا ہے مجھے
اور صحرا میں کبھی ایک جہانِ آباد
کبھی تعمیر کبھی حسرتِ تعمیر کا خواب
کبھی اک شعلہ لپکتا ہوا حسن خانوں پر

آدمیت کے تقاضوں کو کچلتے جملے
کبھی پاگل سا بنا جاتی ہیں کچھ تحریریں
مگر اک ایسی حقیقت بھی ہے ان سب سے پرے
جس کا ادراک ذرا دیر سے ہو پاتا ہے
چہروں پہ ایک سا رہتا نہیں ٹھہراؤ بھی
وقت کے ساتھ ہی جذبے بھی بدل جاتے ہیں
حرفِ آخر نہیں چہرے سے کسی کو پڑھنا
کچھ تجسس ہے تو پھر روح کے اندر جھانکیں
اور اس کے لیے پاس آنا ضروری ہے بہت
درد کے رشتوں کو پڑھ کر نہیں سمجھا جاتا
وہ برتنے ہی پہ محسوس ہوا کرتے ہیں
تشنگی آج بھی اک رابطہ بن سکتی ہے

نفرتوں کا جو یہاں زہر گھلا ہے اب کے
دشمنی کا جو یہ ماحول نظر آتا ہے
ایسا ماحول کبھی اپنے تصور میں نہ تھا
زندگی زخموں کے احساس سے بوجھل بوجھل
کانپتا، سہما سمٹتا ہوا فردا کا خیال
باہمی فاصلے یوں بڑھتے چلے جائیں گے
کاش ہم نے کبھی اس باب میں سوچا ہوتا
سچ تو یہ ہے کہ وہ پہلے سے روابط نہ رہے
پھر وہی سلسلے جڑ جائیں تو کچھ بات بنے
ہم کہ اس کے لیے میدانِ عمل میں آئیں
اب اپیلوں سے کوئی کام نہیں چل سکتا
اب نہ جلسوں میں چمک ہے نہ سیمناروں میں
اب اثر کھو چکے یہ لفظ و بیاں کے جوہر
غمگساری کی فضا پھر سے بنائی جائے
دورِ خوش رنگ کی تخلیق ابھی ممکن ہے
بس کہ ہم لوگ قریب اور قریب آ جائیں

---

[1] مظفر شاہ جہاں پوری

وامق جونپوری
لال کوٹھی، کج گاؤں
ضلع جونپور

غزل

کون ہو صاحب کچھ تو بولو در تک دیکھ کے پلٹ جاتے ہو
در تک میرے پہنچے ہی تم دُور کہیں ہٹ جاتے ہو

تم میرے ہمراز نہیں کیا، چھُپ کر ملنا یاد نہیں کیا
تم وہ نہیں ہو کیا جو مجھ کو تنہا پاکے لپٹ جاتے ہو

پاگل پن کا ہوں وہ بھنور جو تم کو سمو لے اپنے میں
تم ایسے سیاب صفت کائی کی طرح پھٹ جاتے ہو

صحرا جنت بن جاتا ہے جب تم ہوتے ہو ہمراہ
بستی جنگل لگتی ہے جب تم مجھ سے کٹ جاتے ہو

کیا کیا خواب دکھاتے ہو تم تصویریں بن جاتے ہو تم
دُنیا بھر کا چکر دے کر اک نقطے میں سِمٹ جاتے ہو

یار بھی ہو اور دُشمن بھی تم کیف بھی ہو اور غم بھی تم
سرحد پر قدآور کتنے گھر آکر گھٹ جاتے ہو

گھر سے باہر تم اور وامق توام لگتے ہو لیکن
واپس گھر آتے ہی کیا ہو جاتا ہے بٹ جاتے ہو

ڈاکٹر مظفر حنفی
پروفیسر اقبالیات، کلکتہ یونیورسٹی
کلکتہ - ۲۰

دوہے

ایک نشیمن پھر جلے چاہے ماتم ہوئے
گھور اندھیرا رات کا تھوڑا تو کم ہوئے

لپکا لپکا جائے ہے اک راہی انجان
رہزن ہوں گے گھات میں رستہ ہے سنسان

دیکھ نہ پائے ٹھیک سے کھو بیٹھے اوسان
ان سے ملنے کا ہمیں کتنا تھا ارمان

ان کے غم سے مانگ لو کچھ کرنوں کی بھیک
بات بہت باریک ہے رات بڑی تاریک

جو میرے ہر شعر پر کرتے تھے تنقید
کرتے ہیں وہ لوگ ہی اب میری تقلید

آجاتی ہے پھول کی، مٹی میں بُو باس
ہم تو تیرے پاس بھی آکر ہوئے اُداس

لذت ہی کچھ اور ہے 'محنت کرکے کھائیں
وہ بیچارے کیا کریں، بِن مانگے پا جائیں

پھر جانے کب رات ہو کب یاد آئیں آپ
جی کرتا ہے اور کچھ پڑے رہیں چپ چاپ

ایک ہاتھ میں پھول ہے، ایک ہاتھ میں تیر
آج مظفر کھینچیے ساجن کی تصویر

غلام رضوی گردش
سیدواڑہ۔ محمد آباد گوہنہ
اعظم گڑھ

مولوی صاحب یا نازش پرتاپگڈھی

۱۵؍ اکتوبر ۱۹۶۴ء ——— سہ پہر کے وقت ایک پرانی، زنگ خوردہ بالکل کھٹارا سائیکل بڑی تیزی سے چلاتے ہوئے موصوف اسٹیشن پہنچے۔ کینٹین کے باہر اسے کھڑی کر کے جھٹ پٹ تالا بند کیا، نہایت سرعت سے پلیٹ فارم نمبر ۱ کے وھیلر بک اسٹال کی طرف لپکے اور اسے فٹافٹ کھول دیا۔ پھر کپڑے کا ٹکڑا اٹھا کر کتابوں کو جھٹکا لگایا۔ رسائل اور اخبارات قرینے سے سجا کر سامنے رکھ دیئے اور ایک اسٹول کھینچ کر بائیں کونے میں کچھ اس طرح بیٹھ گئے جیسے سارا کام ختم ہو گیا ؎

ہے واقعہ کہ جگر ہوں کوئی نہ جوش ہوں میں
پلیٹ فارم پہ ادبی کتب فروش ہوں میں

عوام و شعر کے مابین سلسلہ ہوں میں
سمجھ سکو تو کہوں ایک قافلہ ہوں میں

" قافلہ " بھی ایسا جسے اپنے گرد و پیش کا احساس نہیں اور یہ صرف اس لیے کہ اب جناب نے چپکے سے کرتے کی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر ہاتھ میں لے لیا جس پر لکھا ہے " سلام اے نہرو " ——— ادھر پلیٹ فارم پر گاڑیاں ہیں کہ آ رہی ہیں جا رہی ہیں، کبھی سیٹی بج رہی ہے، کبھی ہری جھنڈی دکھائی جا رہی ہے۔ " چائے گرم " " سموسے گرم " کی آوازوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ شور و غل ایسا کہ اللہ کی پناہ! ریل پیل، دھکم دھکا، لپاڈگی، دھینگا مشتی، ہٹو بچو ——— مگر ادھر جناب ہیں کہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے، کاغذ اور قلم پکڑے، گردن جھکائے، استغراق کے عالم میں ——— نزولِ شعر جو ہو رہا ہے۔ " سلام اے نہرو " جو چل رہی ہے ——— اب پلیٹ فارم پر کچھ بھی ہو جائے، قیامت ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے ——— سلام پھیر کر ہی دم لیں گے۔ !

یہ بھی اچھی رہی، اسٹال پر بلا وجہ کوئی نہ کھڑا ہو، جی ہاں! اور وہ بھی وھیلر بک اسٹال پر! نہ کوئی اخبار چھوئے نہ رسالہ، بس مال لے، پیسے چکتا کرے اور چلتا بنے۔ اگر یوں ہی ورق گردانی شروع کر دی تو سمجھئے خیریت نہیں ہے۔ اگر مصرعے کے بعد مصرع ڈھلتا رہا تو شاید بخشش ہو جائے لیکن اگر قافیہ تنگ ہو گیا اور سوئی پھنس گئی تو تھوڑی دیر تو برداشت کریں گے ورنہ پھر اچھل کر ایسا جھپٹا ماریں گے کہ سامنے والے کی سٹی گم!

" لینا ہے ؟ " رسالہ پر ہاتھ مارتے ہوئے غرّا کر پوچھیں گے۔ سامنے والا دم بخود، ایک دم بھونچکا!

" نہیں لینا ہے ؟ ..... نہیں لینا ہو تو رکھ دیجئے! " بس رسالہ چھین کر رکھتے ہوئے ساری ترتیب از سر نو یوں درست

کریں گے جیسے سارا نظام درہم برہم ہوگیا ہو۔!

"اتنا گرم کیوں ہوتے ہو مولوی صاحب؟"

مولوی صاحب خاموشی سے نگاہیں نیچی کیے اپنا کام کرتے رہیں گے۔ ماحول کو مکدر دیکھ کر وہ تو رفوچکر ہو ہی جائے گا۔ آس پاس کھڑے ہوئے دو چار آدمی بھی بھوٹ لیں گے۔

جو ناآشنا ہیں ان کے لیے تو وہ "مولوی صاحب" ہیں جو باہوش اور ذی علم ہیں، ان کے لیے نازش پرتاپ گڑھی ہیں

نہایت غم ہے مجھ کو اپنی محفل کی تباہی کا
گلہ بے حد ہے ارباب وطن کی کم نگاہی کا

دعا کرتا ہوں میں بار الٰہی! استقامت دے
مجھے اعلان حق کرنے کی جرأت دے جسارت دے

ہوا یوں کہ ۱۹۶۴ء میں تلک ڈگری کالج پرتاپ گڑھ میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا۔ ایک دو مہینے تو آسانی سے جھیل لے گیا، پھر تنہائیاں ڈسنے لگیں اور ایک دن بیٹھے بٹھائے نازش سے ملنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس لیے نہیں کہ میں ان کی شاعری سے متاثر تھا بلکہ یہ سوچ کر کہ کچھ نہیں تو لطف صحبت ہی رہے گا۔ بس پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ اور چل پڑا منزل مقصود کی طرف ــــ ستم یہ کہ نہ تو سڑک کا نام معلوم نہ محلے کا، اور نہ گھر کا نمبر وغیرہ۔ بس جس راہرو سے پوچھا اس نے خضر و مسیحا بن کر رہنمائی کی۔ میں نے سوچا، جناب عالی دنیائے ادب کے علاوہ اپنے شہر میں بھی خاصے مشہور ہو چکے ہیں ؎

ہر ایک شخص مجھے اپنے ساتھ رکھتا ہے
ہر اک بزرگ مرے سر پہ ہاتھ رکھتا ہے
جو مجھ سے چھوٹے ہیں وہ احترام کرتے ہیں
مجھے بھی اپنا سمجھ کر سلام کرتے ہیں

نام سنتے ہی فوراً باہر تشریف لائے۔ غالباً مکان کی اوپری منزل سے نزول اجلال ہوا تھا، مصافحے کے بعد ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ جھنوی چہرہ، بدن پر سفید کرتا پاجامہ پاؤں میں سیاہ چپل اور غضب کا پھرتیلا جسم! چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کچھ عجیب قسم کا تاثر تھا۔ مظلومیت، غم خوردگی اور بے بسی کے آثار تھے۔ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے موصوف گھنٹوں سے رو رہے تھے اور ابھی میرا نام سنتے ہی جھٹ آنسو پونچھ کر باہر نکل آئے ہوں۔ خشخشی داڑھی اور سر کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں سفیدی کی چھوٹ بہت نمایاں ہو چلی تھی۔ کشادہ پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ یہ احساس بھی غالب رہا کہ جیسے خالق کائنات نے اس پیکر خاکی کے خمیر میں خاک کا کم اور آگ، پانی، ہوا کا زیادہ استعمال کیا ہے ــــ میں نے مکمل تعارف کرایا اور اپنی تقرری کے بارے میں آگاہ کیا۔

"قیام کہاں ہے؟" آواز میں کچھ ایسی بھرّاہٹ تھی جو مسلسل روتے روتے گلا رندھ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

"فی الحال تو منیجر اُپادھیائے صاحب کے ساتھ ہی۔ لیکن اگر کوئی مناسب گھر مل گیا تو منتقل ہو جاؤں گا۔!"

"کالج تو ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی ہے۔ شام کو تشریف لائیے 'بک اسٹال پر' پھر اور باتیں ہوں گی۔"

حسب ارشاد حاضر ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ کاغذ کا ٹکڑا اور قلم ہاتھ میں ہے۔ نگاہ پڑتے ہی بس ایک منٹ کے لیے اٹھے اور کینٹین میں چائے کا آرڈر دے کر کرسی کھینچ لائے اور بغل میں بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں تو شعر و تخیل کی دنیا آباد ہے اب اور باتیں کیا خاک ہوں گی؟ یہاں تو ریل (REEL) ہی دوسری چل رہی ہے۔ طائر لاہوتی کہیں بلند فضاؤں میں پرواز کر رہا ہے۔

خیال فرمایئے۔ شام کے پانچ سے رات کے دس بج گئے۔ میں یوں ہی خاموش و ساکت بیٹھا رہا۔ اور غالب کو یاد کر کے دل کو تسلی دیتا رہا ؎

دل مت گنوا خبر نہ سہی، سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

بیچ میں جو خریدار آتے انھیں جھٹ پٹ نمٹا کر موصوف پھر اپنے کام میں منہمک۔ میرا خیال آتا تو چونک کر ایک آدھ سوال پوچھ بیٹھتے۔

"تو یہاں آپ کا جی لگ گیا؟"

"جی ہاں!"

"چائے اور ۔ ؟"

"جی نہیں ۔ !"

پھر کاغذ بدل جاتا اور قلم چلتا رہتا ۔ میں نے ایک اُچٹتی سی نگاہ کاغذات پر ڈالی ۔ عنوان تھا "نہرو کا پیام جاوداں — نہرو جینتی سے متعلق ایک منظومہ" اور پھر دل میں کہا "شاباش!"

لیجیے ۔ پھر چونک اُٹھے ۔ "لکھنؤ جانا ہوتا ہے؟"

"جی ہاں! تقریباً ہر مہینے۔"

"وہاں اب کون ہے؟"

"والدین۔"

اور پھر اپنی دُنیا میں کھو گئے ۔ کاغذ بدل گیا ۔ میں نے چپکے سے جھانک کر دیکھا ۔ لکھا تھا ۔ "کردار ۔ یزداں، اہرمن روحِ نہرو — وقت — ۱۴ نومبر ۔ جواہر جینتی کی تقریب — مقام — فضائے بسیط!" اور پھر دل میں کہا "میاں! فضائے بسیط ہے ۔ دم سادھے بیٹھے رہو ۔ کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں۔"!

دس بجنے کو آئے تو ایسا لگا کہ جیسے کسی خوابِ گراں سے چونک اٹھے ہوں ۔ کھٹ پٹ، کھٹ پٹ اسٹال بند اور کرسی کھینچ کر کینٹین کے اندر ۔ پھر وہیں دو چائے منگوائی اور بہت اطمینان سے روبرو بیٹھ کر میرے چہرے کا بغور جائزہ لیا ۔ شاید تجاہلِ عارفانہ کا احساس رہا ہو اس لیے اب حضور والا ہمہ تن گوش ہیں ۔ میری سنتے گئے، اپنی کہتے گئے —

"میری شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی اور دو برسوں کے بعد ہی میں غزل اور رومان کے دھندلکوں سے نکل کر تلخ حقیقتوں کی دنیا میں پہنچ گیا۔"

"یہ دنیا اس وقت حصولِ آزادی سے عبارت تھی؟"

"جی ہاں ۔ حصولِ آزادی ایک ایسی چیز تھی جس کا خواب میں بچپن ہی سے دیکھنے لگا تھا ۔ مگر نہ جانے کیوں عملی سیاست میں کبھی خاطر خواہ حصّہ نہیں لے سکا۔"

"۱۹۴۲ء میں بھی؟"

"۱۹۴۲ء کی ہندستان چھوڑو تحریک میں چند دنوں کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرگرمِ عمل رہا اور بس ..... یہ الگ بات ہے کہ اس وقت کوئی نمایاں شخصیت نہ ہونے کی وجہ سے میں انگریزی سامراج کے قہر و غضب سے محفوظ رہا۔"

"آخر نظریۂ حیات کچھ تو رہا ہی ہوگا ۔ ؟" میں نے مزید استفسار کیا ۔

"اوائل عمر ہی سے میں ذہنی اعتبار سے اس گروہ سے منسلک رہا ہوں جسے اس دور میں قوم پرست مسلمان کہا جاتا تھا اپنی قوم کو مسلسل اکساتے رہنے کے ساتھ ہی ساتھ میں دو قومی نظریے اور تقسیمِ وطن کی تجویز کی مخالفت بھی پورے شد و مد کے ساتھ کرتا رہا ... یہی وجہ تھی کہ حصولِ آزادی کے بعد ہجرت کے وقت میں اس قافلے میں شامل نہ ہوا جو میرے بڑے چھوٹے بھائیوں، بہنوں اور ضعیف والدہ پر مشتمل تھا۔"!

"اس قافلے نے کب ہجرت کی؟"

"۱۹۵۰ء میں ...... اور میں یہیں اپنے وطن کی خاک پر اکیلا اور تنہا، ایڑیاں رگڑنے میں مصروف ہوگیا ...... اس یقین کے ساتھ کہ پانی یہیں سے نکلے گا .... اور میں ہمیشہ یہی دعا کرتا آیا ہوں کہ جب تک جیوں وطن میں رہوں، اور مروں تو اپنے بزرگوں کی پائینتی سوؤں ۔ !"

"تو کیا آپ حالاتِ حاضرہ سے مطمئن ہیں؟" میں نے لقمہ دیا ۔

"جی نہیں ... حصولِ آزادی کے بعد ملک میں پھیل جانے والی بدعنوانیاں، بے راہ رویاں، گھناؤنی گروہ بندیاں اور زہریلی فرقہ پرستیاں میری فکر و نظر کا مرکز اور میرے لیے موضوعاتِ سخن ٹھہریں جن کی بیخ کنی کے لیے قلمی جنگ کرنا میں اپنے فرائض زندگی میں شامل سمجھتا ہوں ۔"

"لیکن ..... !"

"لیکن ملحوظ خاطر رہے ..." انھوں نے میری بات کاٹ کر بیان جاری رکھا "میں نے اپنی نجی اور ادبی دونوں ہی زندگیوں کو ہمیشہ پارٹی ڈسپلن کے قیود سے آزاد رکھا ہے ..... اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ میری قومی اور وطنی شاعری کاسۂ گدائی، اور 'سامانِ تجارت' نہ بن سکی ..... مجھے ہمیشہ یقین رہا ہے کہ اپنے وطن کے عظیم ماضی ہی کے ملبے سے ہم اپنے لیے شعور کا جامِ جم حاصل کر سکتے ہیں۔!"

"تو گویا آپ کی یہ حب الوطنی مذہب کے مترادف ہے۔؟"

"جی نہیں ... میرا یہ عقیدہ میرے مذہب سے ہرگز متصادم نہیں ہوتا اور یہ ہر قسم کی مصلحت پسندی اور ابن الوقتی سے پاک صاف ہے!"

اچانک وقت کا احساس ہوا، گیارہ بج چکے تھے، ایک جھٹکے سے اٹھے، چائے کے پیسے دے کر اسٹیشن سے باہر آئے — اپنی پرانی زنگ خوردہ اور کھٹارا سائیکل کا تالا کھولا اور اب جناب مصر ہیں کہ اس پر بیٹھیے۔

میں نے لاکھ سمجھایا — "رکشا کر لیتا ہوں، چلا جاؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں" — لیکن صاحب۔ اصیل مرغ کی ایک ٹانگ — "ہاں ہاں۔ آیئے آیئے، بیٹھئے بیٹھئے" — جیسے دل میں قسم کھالی ہو کہ مجھے اپنی کھٹارا سائیکل پر بٹھا کر ہی دم لیں گے — اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ بچاؤ کے سارے ہتھیار پھینک دوں۔

پھر آدھی رات کو وہی کھٹارا سائیکل پرتاپ گڑھ کی سڑکوں پر یوں فراٹے بھر رہی تھی کہ آج کی "ماروتی" کی رفتار اس کے سامنے ہیچ! — ویسے نازش اگر زندہ ہوتے تو اب تک "ماروتی" کی شان میں بھی کم از کم ایک نظم ضرور کہہ چکے ہوتے — صرف اس لیے کہ یہ ان کے عظیم ہندستان کی تخلیق ہے۔

کالج کے منیجر اپادھیائے صاحب کے گھر پہنچا کر رخصت ہوئے — "شام کو آجایا کیجیے، دل بہل جائے گا۔"

"بہتر۔ خدا حافظ۔!" میں ان کے بے پناہ خلوص، اپنائیت اور جذبہ کی صداقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور رات گئے بہت دیر تک سوچتا رہا — "کتنا نیک انسان ہے! کیسا شریف النفس!"

پھر ہر شام کو وھیلر بک اسٹال پر حاضری دینا میرا اخلاقی فرض بن گیا۔ نگاہ ملتے ہی ہمیشہ یہی تاثر قائم ہوتا جیسے موصوف بہت دیر سے رو رہے تھے اور ابھی مجھے دیکھتے ہی آنسو پونچھ لیے ہیں۔ اب میں قدرے تاخیر سے جاتا، صرف یہ سوچ کر شاید مصروف ہوں۔ لیکن ہمیشہ انھیں مصروف ہی پاتا — کبھی دیکھیے تو شعر کا نزول ہو رہا ہے کبھی نظم صاف کی جا رہی ہے۔ کبھی ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری ہے — بیچ بیچ میں "دھندا" بھی ہوتا رہتا۔ اکثر نافہم خریداروں سے جھک جھک بھی ہوتی رہتی — ایسے خریدار جو انھیں صرف "مولوی صاحب" سمجھتے تھے، نازش پرتاپ گڑھی نہیں!

روزانہ وہی منظر دیکھنے میں آتا — پلیٹ فارم پر گاڑیاں ہیں کہ آرہی ہیں، جا رہی ہیں۔ کبھی سیٹی بج رہی ہے۔ کبھی ہری جھنڈی دکھائی جا رہی ہے — "چائے گرم، سموسے گرم" کی آوازوں سے کان کے پردے پھٹے جا رہے ہیں۔ وہی ریل پیل۔ دھکم دھکا۔ لپا ڈگی، دھینگا مشتی، ہٹو بچو — لیکن ادھر جناب عالی شہپرِ فکر کے سہارے انجانی فضاؤں میں پرواز کر رہے ہیں ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

دھیرے دھیرے میں ریلوے اسٹیشن کے اس منظر سے مانوس ہو گیا جس سے کبھی وحشت ہوتی تھی۔

اسٹال بند کرنے کے بعد کینٹین میں نشست ضروری تھی۔ سنجیدہ باتوں کے علاوہ نجی زندگی کے بارے میں بھی نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے —

"پروفیسر سید احتشام حسین .... الٰہ آباد سے لکھنؤ جا رہے ہوں ..... یا لکھنؤ سے الٰہ آباد واپس آرہے ہوں ... اسٹال پر آکر خیریت ضرور دریافت کریں گے ..... خواہ دو منٹ کے لیے ہی سہی۔ لیکن آئیں گے ضرور!"

ایک دن بیٹھے بٹھائے مجھے دُور کی سوجھی۔ سوچا اب ذرا گہرے پانیوں میں اُتر کر گفتگو ہو ـــــ

"کچھ ناقدین قومی شاعری کو تیسرے درجے کی چیز سمجھتے ہیں!" میں نے اچانک دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"قومی اور وطنی شاعری تیسرے درجہ کی شاعری ہے یا تیسرے درجہ کی شاعری نہیں ہے۔ اصرار و انکار کی یہ لفظی جنگ میں اُن حضرات کے لیے چھوڑتا ہوں جنھیں خدا نے فرصت بھی دے رکھی ہے اور فراغت بھی"! انھوں نے مشتعل ہوئے بغیر بڑے ہی پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے کچھ حضرات اس قسم کی شاعری کو محض صحافت اور پروپیگنڈہ سے تعبیر کرتے ہیں!"

"میری شاعری کو محض صحافت اور پروپیگنڈہ بتایا جائے گا تو میں ہرگز برا نہ مانوں گا ...... میں سمجھتا ہوں کہ حفاظتِ زندگی صحافت نہیں ہے، فن ہے ....!"

"وہ تو ہے ...... لیکن اب اس کو کیا کیجیے گا ... کہ کچھ حضرات آپ کو شاعر نہیں بلکہ ڈھنڈورچی کہتے ہیں!"

"میں شاعر نہیں ڈھنڈورچی ہی سہی۔ ویسے محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ اور میں اپنے ذہن و قلم کی تمام تر توانائی کے ساتھ مدّت سے حالتِ جنگ میں ہوں۔"

"آپ پر بسیار نویسی کا بھی الزام ہے؟"

"جی ہاں ..... میں انتہائی بسیار نویس ہوں لیکن اگر کوئی میری کسی غلطی کی طرف اشارہ کرے گا تو میں اس سے الجھنے کے بجائے اس کا شکر گزار ہوں گا۔"!

"میں کہنا چاہتا ہوں ..... ایسی شاعری میں دوامی ادب کے نقوش جلوہ گر نہیں ہوتے؟"

"میری نظموں میں دوامی ادب کے نقوش ہوں یا نہ ہوں، اس خلوص، محبّت اور عقیدت کے جذبات ضرور نمایاں ہیں جو اپنی قوم اور اپنے ملک کے لیے میرے دل میں ہمیشہ موجزن رہے ہیں۔"

نشست ختم ہونے تک ان کا لہجہ سپاٹ اور یکساں رہا۔ ہاں آواز میں کچھ ایسی بھراہٹ ضرور تھی جو مسلسل روتے روتے گلا رندھ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

لیجیے۔ پھر بعد اصرار اپنی کھٹارا سائیکل پر بٹھایا جو آدھی رات کو پرتاپ گڑھ کی سڑکوں پر یہ جا اور وہ جا ـــــ اور یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک چلتا رہا۔

اُردو ہو یا ہندی، "زبان" کے بارے میں نازش کے نظریات نہایت صاف اور واضح تھے ؎

نہ دفتروں، نہ کہیں فائلوں میں ڈھلتی ہے
زبان دھرتی کے سینے سے لگ کے چلتی ہے
زباں اُبلتی ہے آنگن سے قہقہوں کی طرح
زبان کھلتی ہے کھیتوں میں بالیوں کی طرح
زبان تنتی ہے چوپال میں جواں کی طرح
زبان بنتی ہے بیٹھک میں داستاں کی طرح
زباں عوام سے ہو دُور تو ابھاگن ہے
سنو، پیا جسے چاہے وہی سہاگن ہے
مری زبان کا گر حوصلہ سلامت ہے
تو پھر نہ خدشہ ہے کوئی، نہ کوئی آفت ہے
نہ ہول آتا ہے مجھ کو، نہ دب کے رہتا ہوں
میں انقلابات خود اپنی زباں میں کہتا ہوں

۱۹۶۵ء میں، میں نے کالج کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اور پھر پرتاپ گڑھ کی صحبتیں قصّۂ پارینہ بن گئیں۔

دو چار سال بیت گئے ـــ

"کچھ سنا آپ نے؟ نازش پاگل ہو گئے!" ایک دن لکھنؤ میں کسی نے مجھ سے کہا۔ میرے چہرے پر ایک بڑا سوالیہ نشان تھا۔

"جی ہاں! نازش پاگل ہو گئے اور انھیں پاگل خانے پہنچا دیا گیا۔!"

لیکن ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک دن اچانک مقبرۂ عالیہ (گولہ گنج لکھنؤ) کی پشت پر ملاقات ہو گئی۔ مجھے دیکھتے ہی

رکشا رکوا دیا۔

"پہچانا آپ نے ؟" میں نے پوچھا۔

"آپ رضوی صاحب ہیں نا!" نازش جھٹ بول پڑے۔ پھر مجھے خاموش دیکھ کر ارشاد ہوا:۔

"میں یہیں ٹھہرا ہوں ..... یاد کے یہاں .... کل صبح آیئے ..... ایک مدت ہو گئی۔ کسی بہانے مل بیٹھیں!"

"یاد سے مراد ہے شاہجہاں بانو یاد دہلوی ؟" میں نے استفسار کیا۔

"جی ہاں .... اس کی بے لوث اور بے انتہا خدمت .... چھوٹی بہن نہ ہونے کی کمی کو پورا کرتی رہی ہے!"

دوسرے دن صبح حسبِ وعدہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا بڑے ہی خلوص اور تپاک سے ملے۔ اور میرے ہر سوال کا نہایت مناسب اور نپا تلا جواب دیتے رہے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ انھوں نے خود کچھ نہیں دریافت کیا جیسے سب کچھ بھول گئے ہوں۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد میں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی اور بات "خدا حافظ" پر ختم ہو گئی۔!

دو چار سال اور بیت گئے ——

پھر ایک دن یہ منحوس خبر سنی کہ نازش مر گئے —!

میری کتابِ زندگی کا ایک سنہرا ورق جل گیا تھا۔!

میں نے سوچا۔ وھیلر بک اسٹال کے "مولوی صاحب" مر گئے۔ ان کی کھٹارا سائیکل اب شاید کسی کباڑی کی دوکان میں پہنچ گئی ہو یا اس کے کل پرزے نکال کر گلا دیئے گئے ہوں — لیکن نازش پرتاپ گڑھی تو زندہ ہے —— وہ نازش جس نے ہندستان کی عظمت رفتہ کو اپنے فن سے جلا بخشی ہے ؎

نقوش ایلورا کے پتھروں پر کہ چشم گیتی میں خواب جیسے
قطب کی یہ لاٹ، عزم آدم کی صورت کا نیا جیسے
یہ تاج، انساں کی حسن کاری اُلٹ رہی ہو نقاب جیسے
یہ جامع مسجد کا حسنِ سادہ، دعا کوئی مستجاب جیسے

سنہرے مندر کے آب و گِل میں مہک رہا ہے گلاب گویا
ہوا ہے تحلیل اس عمارت میں قدسیوں کا شباب گویا

میں نے سوچا نازش پرتاپ گڑھی زندہ ہے۔ وہ نازش جس نے خوبصورت تشبیہوں کے سہارے اگر ایک طرف نگارِ دلی اور عروسِ لکھنؤ کی بلائیں لی ہیں تو دوسری طرف ارضِ دکن کے پٹھاروں اور زلفِ بنگال کے حسن پر بھی قربان ہوا ہے ؎

اڑی ہے سنگم سے جب بھی خوشبو تو آبروئے ختن گئی ہے
ہنسی ہے جب رات مالوے کی تو روشنی دل میں چھن گئی ہے
پٹھارِ ارضِ دکن کے ہیں یا نگاہِ محبوب — تن گئی ہے
کوئی اماوس کی رات لہرا کے زلفِ بنگال بن گئی ہے

نگارِ دلی کی یہ سجاوٹ، کتھاکلی کا ہو روپ جیسے
یہ لکھنؤ کی حسین شامیں، گلابی جاڑے کی دھوپ جیسے

* *

ملک زادہ جاوید

غزل

دلدل میں جب پاؤں دھنسیں گے
کوئی سہارا ڈھونڈھ ہی لیں گے

سر پر جب بھی دھوپ پڑے گی
دلی سے لکھنؤ چلیں گے

مت پوچھو ان اخباروں کو
اچھے دنوں کو یاد کریں گے

جب تک ہے یہ لہر خزاں کی
شاخ سے پتے گرتے رہیں گے

اوس کی بوندیں گھاس پہ ہوں گی
صبح کو ننگے پاؤں چلیں گے

■ ■

پرشان سُردواری
۱۹۵ - حوض رانی ، مالویہ نگر
نئی دہلی

اُردو کے مزاحیہ صحافت کے موجد

منشی سجّاد حسین

مزاحیہ اُردو صحافت کے موجد منشی محمد سجاد حسین کا تعلق اودھ کے ایک خوش حال خاندان سے تھا آپ کے والد منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ انھوں نے پنشن ملنے کے بعد ایک مدت تک ریاست حیدرآباد دکن میں بہ طور سول جج خدمات انجام دیں۔ منشی سجاد حسین کی صحیح تاریخ ولادت مجھے معلوم نہیں ہو سکی مگر ۱۸۵۶ء کا سنِ ولادت ہے۔ آپ کاکوری میں پیدا ہوئے جو آج بھی اودھ کا ایک ادبی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم وہیں نواب فدا حسین کی نگرانی میں حاصل کی پھر اس زمانہ کے روشن خیال خاندانوں کے بچوں ہی کی طرح آپ کی بھی انگلش تعلیم شروع ہو گئی۔ ۱۸۷۳ء میں آپ نے انٹرنس پاس کر لیا۔ کیننگ کالج میں داخل ہوئے مگر ایف اے کا امتحان نہ پاس کر سکے، فکرِ معاش دامن گیر ہو گئی۔ سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے فیض آباد آ گئے اور فوج میں اُردو پڑھانے پر مامور ہو گئے۔

غیر ملکی انگریز حکومت سے نفرت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ فوج کی ملازمت کے دوران کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اس نفرت میں اضافہ ہوا۔ چونکہ قومی مسائل پر غور و فکر کی عادت تھی اور ذہنی طور پر آپ انگریزوں کی غلامی کو قبول نہ کر سکتے تھے اس لیے ملازمت کو لات ماری اور لکھنؤ واپس آ گئے۔ لکھنؤ آنے کے بعد ۱۸۷۷ء میں آپ نے اودھ پنچ جاری کیا۔ اس ہفتہ وار اخبار کا پہلا شمارہ ۱۶ر جنوری ۱۸۷۷ء کو شائع ہوا۔ اودھ پنچ اس لحاظ سے منفرد اخبار تھا کہ اس کی پالیسی کا خاص عنصر حبّ الوطنی تھا۔ اگرچہ یہ پرچہ ظریفانہ طرزِ صحافت کا موجد تھا مگر اس نے روزِ اول ہی سے عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی اور انگریزوں کی سامراجی پالیسیوں اور اقدامات کے خلاف زوردار قلمی محاذ قائم کیا۔ اودھ پنچ نے تمام عصری مسائل کے سلسلے میں قوم پرستانہ موقف اختیار کیا۔ الحاقِ اودھ، انکم ٹیکس، البرٹ بل پولیس کی زیادتیوں اور انگریزی حکومت کے بہی خواہوں کے خلاف اودھ پنچ کا جہاد بالقلم، جہاد بالسیف سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔ الحاقِ اودھ کی مخالفت کو تو انھوں نے اپنا ایمان بنا رکھا تھا اور اپنی ہزل تحریروں کے ذریعہ انھوں نے اس کی مخالفت کا سلسلہ برقرار رکھا۔

ان کی ان تحریروں کے ذریعہ چاہے کوئی اور فائدہ نہ ہوا ہو مگر اتنا ضرور ہوا کہ انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ، زیادتیوں، ہندوستان دشمنی اور معاہدہ شکنی کے خلاف عوامی جذبات کا دھارا متعین ہو گیا۔ افسوس آج ان کی انگریز دشمنی اور حب الوطنی کا اعتراف کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

منشی سجاد حسین نے دو اہم کام انجام دیئے۔ اول تو انھوں نے انگریزوں کے خلاف جذباتِ حریت کو ہوا دی، دوسرے اُردو صحافت کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ اس لیے ان کی خدمات کا اعتراف ضرور ہونا چاہیے چاہے یہ ڈاک ٹکٹ کی شکل میں ہو یا لکھنؤ کی کسی

کشا رکوادیا۔

"پہچانا آپ نے ؟" میں نے پوچھا۔

"آپ رضوی صاحب ہیں نا !" نازش جھٹ بول پڑے۔

پھر مجھے خاموش دیکھ کر ارشاد ہوا :۔

"میں یہیں ٹھہرا ہوں ۔۔۔۔ یاد کے یہاں ۔۔۔۔ کل صبح آیئے ۔۔۔۔ ایک مدت ہوگئی ۔ کسی بہانے مل بیٹھیں !"

"یاد سے مراد ہے شاہجہاں بانو یاد دہلوی ؟" میں نے استفسار کیا۔

"جی ہاں ۔۔۔۔ اس کی بے لوث اور بے انتہا خدمت ۔۔۔۔ چھوٹی بہن نہ ہونے کی کمی کو پورا کرتی رہی ہے !"

دوسرے دن صبح حسبِ وعدہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا بڑے ہی خلوص اور تپاک سے ملے۔ اور میرے ہر سوال کا نہایت مناسب اور نپا تلا جواب دیتے رہے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ انھوں نے خود کچھ نہیں دریافت کیا جیسے سب کچھ بھول گئے ہوں ۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد میں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی اور بات "خدا حافظ" پر ختم ہوگئی ۔ !

دو چار سال اور بیت گئے ـــــ

پھر ایک دن یہ منحوس خبر سنی کہ نازش مر گئے ـــ !

میری کتابِ زندگی کا ایک سنہرا ورق جل گیا تھا ۔ !

میں نے سوچا ۔ وھیلر ٹک اسٹال کے "مولوی صاحب" مر گئے ۔ ان کی کھٹارا سائیکل اب شاید کسی کباڑی کی دوکان میں پہنچ گئی ہو یا اس کے کل پرزے نکال کر گلا دیئے گئے ہوں ـــ لیکن نازش پرتاپ گڑھی تو زندہ ہے ـــــــ وہ نازش جس نے ہندستان کی عظمت رفتہ کو اپنے فن سے جلا بخشی ہے ؎

نقوشِ ایلورا کے پتھروں پر کہ چشمِ گیتی میں خواب جیسے
قطب کی یہ لاٹ ، عزم آدم کی صورت کا مینا جیسے
یہ تاج ، انساں کی حسن کاری اُلٹ رہی ہو نقاب جیسے
یہ جامع مسجد کا حسنِ سادہ ، دعا کوئی مستجاب جیسے

سنہرے مندر کے آب و گِل میں مہک رہا ہے گلاب گویا
ہوا ہے تحلیل اس عمارت میں قدسیوں کا شباب گویا

میں نے سوچا نازش پرتاپ گڑھی زندہ ہے ۔ وہ نازش جس نے خوبصورت تشبیہوں کے سہارے اگر ایک طرف نگارِ دلی اور عروسِ لکھنؤ کی بلائیں لی ہیں تو دوسری طرف ارضِ دکن کے پٹھاروں اور زلفِ بنگال کے حسن پر بھی قربان ہوا ہے ؎

اڑی ہے سنگم سے جب بھی خوشبو تو آبروئے ختن گئی ہے
ہنسی سہے جب رات تاروں کی تو روشنی دل میں چھن گئی ہے
پٹھار ارضِ دکن کے ہیں یا نگاہِ محبوب ـــ تن گئی ہے
کوئی اماوس کی رات لہرا کے زلفِ بنگال بن گئی ہے

نگارِ دلی کی یہ سجاوٹ ، کہ تھا کلی کا ہو روپ جیسے
یہ لکھنؤ کی حسین شامیں ، گلابی جاڑے کی دھوپ جیسے

**

ملک زادہ جاوید

غزل

دلدل میں جب پاؤں دھنسیں گے
کوئی سہارا ڈھونڈھ ہی لیں گے

سر پر جب بھی دھوپ پڑے گی
دلی سے لکھنؤ چلیں گے

مت پوچھو ان اخباروں کو
اچھے دنوں کو یاد کریں گے

جب تک ہے یہ لہر خزاں کی
شاخ سے پتے گرتے رہیں گے

اوس کی بوندیں گھاس پہ ہوں گی
صبح کو ننگے پاؤں چلیں گے

■■

پرشانت رُدولوی
۱۶۵ - حوض رانی، مالویہ نگر
نئی دہلی

اُردو کی مزاحیہ صحافت کے موجد

منشی سجّاد حسین

مزاحیہ اُردو صحافت کے موجد منشی محمد سجاد حسین کا تعلق اودھ کے ایک خوش حال خاندان سے تھا۔ آپ کے والد منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ انھوں نے پنشن ملنے کے بعد ایک مدت تک ریاست حیدر آباد دکن میں بہ طور سول جج خدمات انجام دیں۔ منشی سجاد حسین کی صحیح تاریخ ولادت مجھے معلوم نہیں ہو سکی مگر ۱۸۵۶ء کا سنِ ولادت ہے۔ آپ کاکوری میں پیدا ہوئے جو آج بھی اودھ کا ایک ادبی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم وہیں نواب فدا حسین کی نگرانی میں حاصل کی پھر اس زمانہ کے روشن خیال خاندانوں کے بچّوں ہی کی طرح آپ کی بھی اسکولی تعلیم شروع ہو گئی۔ ۱۸۷۳ء میں آپ نے انٹرنس پاس کر لیا۔ کیننگ کالج میں داخل ہوئے مگر ایف اے کا امتحان نہ پاس کر سکے، فکرِ معاش دامن گیر ہو گئی۔ سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے فیض آباد آ گئے اور فوج میں اُردو پڑھانے پر مامور ہو گئے۔

غیر ملکی انگریز حکومت سے نفرت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ فوج کی ملازمت کے دوران کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اس نفرت میں اضافہ ہوا۔ چونکہ قومی مسائل پر غور و فکر کی عادت تھی اور ذہنی طور پر آپ انگریزوں کی غلامی کو قبول نہ کر سکے تھے اس لیے ملازمت کو لات ماری اور لکھنؤ واپس آ گئے۔ لکھنؤ آنے کے بعد ۱۸۷۷ء میں آپ نے اودھ پنچ جاری کیا۔ اس ہفتہ وار اخبار کا پہلا شمارہ ۱۶ر جنوری ۱۸۷۷ء کو شائع ہوا۔ اودھ پنچ اس لحاظ سے منفرد اخبار تھا کہ اس کی پالیسی کا خاص عنصر حبّ الوطنی تھا۔ اگرچہ یہ پرچہ ظریفانہ طرزِ صحافت کا موجد تھا مگر اس نے روزِ اول ہی سے عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی اور انگریزوں کی سامراجی پالیسیوں اور اقدامات کے خلاف زوردار قلمی محاذ قائم کیا۔ اودھ پنچ نے تمام عصری مسائل کے سلسلے میں قوم پرستانہ موقف اختیار کیا۔ الحاقِ اودھ، انکم ٹیکس، البرٹ بل، پولیس کی زیادتیوں اور انگریزی حکومت کے بہی خواہوں کے خلاف اودھ پنچ کا جہاد بالقلم، جہاد بالسیف سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔ الحاقِ اودھ کی مخالفت کو تو انھوں نے اپنا ایمان بنا رکھا تھا اور اپنی مدلل تحریروں کے ذریعہ انھوں نے اس کی مخالفت کا سلسلہ برقرار رکھا۔

ان کی ان تحریروں کے ذریعہ چاہے کوئی اور فائدہ نہ ہوا ہو مگر اتنا ضرور ہوا کہ انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ، عیاریوں، ہندستان دشمنی اور معاہدہ شکنی کے خلاف عوامی جذبات کا دھارا متعین ہو گیا۔ افسوس آج ان کی انگریز دشمنی اور حب الوطنی کا اعتراف کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

منشی سجاد حسین نے دو اہم کام انجام دیے۔ اول تو انھوں نے انگریزوں کے خلاف جذباتِ حرّیت کو ہوا دی، دوسرے اُردو صحافت کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ اس لیے ان کی خدمات کا اعتراف ضرور ہونا چاہیے چاہے یہ ڈاک ٹکٹ کی شکل میں ہو یا لکھنؤ کی کسی

ٹرک کے نام کی شکل میں۔

منشی سجاد حسین ایک دوراندیش صحافی تھے۔ انھیں سیاسی اور سماجی کروٹوں کا پورا پورا اندازہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ انگریز کم از کم ان کی زندگی میں تو ہندستان کو آزاد نہ کریں گے لیکن انھوں نے ایک بے غرض حریت پسند کی حیثیت سے انگریزوں کے اقدامات کے خلاف اپنا قلمی جہاد جاری رکھا اور اہل ہند کی ذہنی تربیت کرتے رہے۔ چودھری محمد علی ردولوی کی زندگی میں ان کی ذاتی لائبریری میں اودھ پنچ کی فائلیں میں نے دیکھی ہیں۔ وہ تھے تو تعلقدار، مگر ان کی سوچ کا انداز بھی وہی تھا جو منشی سجاد حسین کا تھا۔ اودھ پنچ میں ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے زندگی کے آخری ایام میں ان پر بھی فالج کا حملہ ہوا تھا۔ چلنے پھرنے سے معذور تھے مگر گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را۔ کے مصداق وہ ہم تشنگان علم سے کھُل کر باتیں کرتے تھے۔ ٹیکس کے خلاف اودھ پنچ کی یہ نظم میں نے چودھری محمد علی ردولوی ہی سے سنی تھی اور اپنی ڈائری میں نوٹ کرلی تھی ؎

کہتے ہیں جسے ٹیکس وہ ہے قہر الٰہی!
دیکھیں ہمیں کب ہوتی ہے اب اس سے رہائی
روتی ہی نہیں صبح سے تا شام یہ تنہا!
اس حال میں ہو ٹیکس کی کس طرح سمائی
کانٹا سا کھٹکتا ہے، یہ آنکھوں میں ہماری
نشتر سا چبھا دل میں، ہو جانوں پہ بن آئی
کونسل سے چلا ٹیکس، ادھر چرخ سے ہیضہ
دونوں نے پہنچتے ہی عجب دھوم مچائی

اودھ پنچ مذہبی رواداری میں یقین رکھتا تھا۔ اور وہ غالباً پہلا دیسی اخبار تھا جس نے سُود خوروں کی حرکتوں کا بھی پردہ فاش کیا۔ ہندستانیوں میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ شمس العلماء، سر، خان بہادر، رائے بہادر اور خان صاحب قسم کے لوگوں کی خوب خبر لی۔ اس کے علاوہ اس اخبار نے جو ادبی معرکے سر کیے ان کی مثال بھی اس زمانے میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اس اخبار نے نہ محمد حسین آزاد کو بخشا نہ الطاف حسین حالی کو (دونوں شمس العلماء تھے) منشی نول کشور اور ان کے اودھ اخبار کو بھی اودھ پنچ نے بارہا آڑے ہاتھوں لیا۔ اگرچہ منشی سجاد حسین انگریزی زبان کے مخالف نہ تھے لیکن انگریزوں کی تقلید، انگریزی لباس، انگریزی تہذیب اور طرز زندگی کا مذاق اڑانے میں اودھ پنچ ہمیشہ پیش پیش رہا۔ اس سلسلے میں ۲۰ نومبر ۱۸۷۷ء کے اودھ پنچ میں مطبوعہ ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

پوشش خوش ہے کوٹ اور پتلون
ہندی پہناوا ہے جہالت کا
طوف لندن کا جو ہے کر آیا
نہیں قائل وہ ہوتا جنت کا

انگریزوں نے ہندستان کے عوام کو کچلنے کے لیے پولیس کو بے پناہ اختیارات دیے تھے۔ دراصل انگریزوں کی پولیس فورس عوام کی دشمن فورس تھی۔ انگریز پولیس کی عوام دشمنی کا نقشہ ۲ اکتوبر ۱۸۷۷ء کے اودھ پنچ کے شمارے میں یہ نظم پیش کرتی ہے۔

عاجزوں کو خوں رُلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
صاف شہدوں کو بچانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
لاکھ واویلا کرے خلقت، یہ شنوائی نہ ہو
اعتبار اپنا جمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
مُدعی ملزم بنے، بن جائے ملزم مُدّعی!
لار کا پڑھنا اور پڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
کون کرسکتا ہے چٹ یوں مال خلقت بے دھڑک
ایسی حکمت یہ بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

اس نظم میں بالواسطہ طور پر نہایت خوبصورت انداز میں پولیس مظالم اور اُس دور کے نظام کی ناانصافیوں کی تصویر پیش کی گئی ہے۔

انیسویں صدی تک اُردو غزل کا شوق ایک عجیب الخلقت چیز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو غزل زوال پذیر معاشرے کی عکاس بن کر رہ گئی تھی خاص طور سے لکھنؤ میں اُردو غزل خیالی اور افسانوی

دنیاؤں کی سیر کرانے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ حالانکہ ہر طرف غربت و افلاس نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ایک تہذیب مٹ رہی تھی اور دوسری تہذیب جنم لے رہی تھی۔ انگریزوں نے ہندستانیوں کی آزادی ہی سلب نہیں کی تھی بلکہ ان کے جذبہ حریت کو بھی کچل کر رکھ دیا تھا لیکن اُردو شعراء "رگِ گُل سے بلبل کے پر باندھنے" میں مصروف تھے۔ اس صورت حال کو اودھ پنچ کیسے برداشت کر سکتا تھا چونکہ شاعری، معاشرے کی اصلاح کا ایک طاقت ور وسیلہ بھی ہے چنانچہ ۳۰ نومبر ۱۸۸۰ء کے شمارے میں اُردو شاعری کے اس مضحکہ خیز رجحان پر بھرپور طنز کی صورت میں اودھ پنچ میں یہ معرکۃ الآرا نظم شائع ہوئی ؂

کلائی مچھلیاں ہیں دانت موتی پنجہ مرجاں ہے
بتوں کا جسمِ خاکی ہے کہ تعمیرِ بحرِ عمّاں ہے
دھواں گیسو ہیں، لب ہیں آگ اور شعلے دو آنکھیں ہیں
رُخِ محبوب ہے یہ شاعرو! یا روئے شیطاں ہے
نگہ میں ہجر، غصے میں قیامت، چال میں آفت
تمہارا یار کیا اہلِ سخن غولِ بیاباں ہے
مژہ نشتر ہے، گیسوئے پیچاں تازیانے ہیں
بتوں کا حسنِ دل کش یا کوئی یہ اسپ جولاں ہے
صدا میں بلبل، بیمار اور باتوں میں ہو مینا
کہو للہ یہ معشوق انساں ہے کہ حیواں ہے
زنخداں چاہ ہے خط کشت کا کل ہے رسن اسکی
یہ معشوقوں کے اعضا ہیں کہ اسبابِ دہقاں ہے
ہیں مژگاں تیر منہ سوفاز ہے ابرو ہیں تلواریں
یہ طفلِ نازنین یا جدِّ سہراب و نریماں ہیں

اس طرح کی طنزیہ غزلوں اور نظموں نے اس دور کے اردو شاعروں کی کافی اصلاح کی۔ مقبول حسین ظریف لکھنوی نے بھی اسی طرح کی کئی نظمیں اور غزلیں کہی تھیں اور طنز و مزاح کے میدان میں انھوں نے اس رنگ کو اختیار کر کے کافی شہرت و مقبولیت حاصل کی تھی۔

منشی سجاد حسین مرحوم صاحب طرز نثر نگار، ہزل گو شاعر، محبِ وطن، مصلح اور سیاست داں تھے ____

" ان میں عجیب و غریب خوبیاں تھیں۔ خلیق و ذہین و فہیم ہونے کے علاوہ زندہ دلی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ تکلیف کے زمانے میں بھی کسی نے ان کے چہرے پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی و مایوسی نہیں دیکھی۔ بیماری کے زمانے میں اگر کوئی مزاج پرسی کرتا تو کہتے زندگی کا عارضہ ہے اور اپنی تکلیفوں کو اس طرح بیان کرتے کہ ہنسی آجاتی دوا دارو سے مایوس ہو چکے تھے مگر کہتے تھے کہ یہ سلسلہ اس لیے جاری کر رکھا ہے کہ باضابطہ موت ہو۔ بلا علاج مرنے کو بے ضابطہ کہتے تھے۔ اس زندہ دلی کے ساتھ تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دُور رہتے تھے۔ دُنیا کے ناہموار اور بے تکے پہلو اُن کی نگاہوں میں بُری طرح کھٹکتے تھے۔" [۱]

۱۹۰۱ء میں ان پر پہلی بار فالج کا حملہ ہوا۔ چند ماہ بعد حالت میں کچھ سُدھار ہوا۔ دوسری بار ۱۹۰۴ء میں پھر فالج کا حملہ ہوا صحت برباد ہوگئی۔ ۱۹۱۲ء میں اودھ پنچ بند ہوگیا۔ اودھ پنچ کا بند ہونا گویا ان کی بے ضابطہ موت تھی۔ بالآخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء کو ان کی باضابطہ موت بھی ہوگئی اور اردو کے دامن کو طنز و مزاح کے سچے موتیوں سے بھرنے والے ایک عظیم قلم کار سے اُردو دنیا ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔

□□

---

۱ مضامینِ چکبست سے۔

شہیر رسول
۵۵۰ لے، کچہری روڈ
نزد چاپیکا بازار، علی گڑھ

غزل

مرا درد اُن سے سوا رہے، مری جاں میں جتنے شگاف ہیں
اُدھر آنکھ اٹھا کے نہ دیکھیے، انھیں سات خوں بھی معاف ہیں

کئی نام مجھ میں سمائے تھے کئی شہر میں نے بسائے تھے
کئی نام میرے حریف ہیں، کئی شہر میرے خلاف ہیں

مرے حرفِ دل سے نہ راہ کر مگر اس طرف تو نگاہ کر
کہ یہ آنکھیں طالبِ دید ہیں کہ یہ پاؤں وقفِ طواف ہیں

وہ حلیفِ اہلِ زبان کے، وہ شریکِ وصفِ بیان کے
ہیں نثار جن پہ فصاحتیں کئی "شین" ہیں کئی "قاف" ہیں

وہ گئے دنوں کے معاملے، انھیں کیسے دل سے جدا کریں
مرے شہر آج بھی سرخ ہیں ترے ہاتھ آج بھی صاف ہیں

عشرت ظفر
سائیکل مارکیٹ، لا ا پالی کرانگ
کانپور

قطعات

بے مایہ و بے زر ہیں گداگر کی طرح
تاریک ہیں مفلس کے مقدر کی طرح
ایجاد کرو اور کوئی طرزِ کلام
الفاظ تو بے جان ہیں پتھر کی طرح

نغموں کے تراشیدہ صنم بھی لے جاؤ
یہ کیفیتِ بادہ و سم بھی لے جاؤ
اے ذہن کو تاریک بنانے والو
لے جاؤ مرے لوح و قلم بھی لے جاؤ

یارو! غمِ دنیا نہ کرو زہر پیو
مت تلخیٔ صہبا سے ڈرو زہر پیو
تاریخ کے ماتھے پہ چمکنے کے لیے
ہم رتبہ سقراط بنو زہر پیو

ٹپکے ہوئے آنسو کے سوا کچھ بھی نہ تھا
سہمے ہوئے آہو کے سوا کچھ بھی نہ تھا
قربت کا وہ اک لمحۂ رنگیں عشرت
اڑتی ہوئی خوشبو کے سوا کچھ بھی نہ تھا

کل رات گئے جب کہ فضائیں تھیں اداس
ہر سمت فروزاں تھے چراغِ احساس
تاریخ جو ماضی کی اٹھا کر دیکھی
ہر حرف تھا پہنے ہوئے زخموں کا لباس

ڈاکٹر مہ ناز انور
۱۲۷ - ڈی، سیکٹر ۱۲، پشپ وہار
نئی دہلی

گئو دان میں علاقائی شناخت

پریم چند نے جس وقت لکھنا شروع کیا اس وقت نذیر احمد، سرشار، شرر اور مرزا رسوا کا بول بالا تھا۔ پریم چند نے اپنے پیش رو ادیبوں کی تخلیقات کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو سمجھا اور قلم اٹھاتے وقت اس بات کا خیال رکھا کہ ان کی تخلیقات ہندستانی سماج کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے مفید ثابت ہوں۔

پریم چند پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کے ادبی سفر کے آغاز کی داستان، نواب رائے سے لے کر پریم چند تک کا قصہ ـــــ پہلے مجموعہ "سوزِ وطن" کے ضبط کیے جانے کا واقعہ بار بار دہرایا گیا ہے ـــــ افسانہ نگار پریم چند اور ناول نگار پریم چند ـــــ اسی طرح ہندی ادب میں پریم چند اور اردو ادب میں پریم چند کی خدمات کا جائزہ بھی ہر بڑے نقاد نے لیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو پریم چند کے مطالعہ میں ان گنت زاویوں سے تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے اور اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور اس وقت ان کا آخری ناول "گئو دان" ہمارے سامنے ہے جسے ان کے فن کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے اور اس کے مرکزی کردار "ہوری" کو ایک لافانی کردار کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کا قصہ مختصراً بتاتے ہوئے ہم اس ناول میں علاقائی شناخت پر تفصیل سے بات کریں گے۔

یوں تو پریم چند کی تمام تخلیقات کا محور کسان کی بدحالی، جاگیرداروں اور زمینداروں کی زیادتی رہی ہے مگر "گئو دان" میں یہ تمام باتیں اتنی فن کاری کے ساتھ پیش کی گئی ہیں کہ ناول پڑھنے کے بعد کافی دنوں تک ہوری کی زندگی، اس کا سماج، اس کی محرومیاں، اس کے ساتھ کی جانے والی زیادتیاں دل و دماغ پر اس طرح چھائی رہتی ہیں کہ جیسے یہ سب ہمارے سامنے کی باتیں ہیں۔ مختصر یہ کہ ہوری اور دھنیا شمالی ہندستان کے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ دوسرے تمام کردار جن کا تعلق ہوری کی زندگی سے ہے، اپنی اپنی جگہ اہم بھی ہیں اور پُر اثر بھی ـــــ ہوری کے پاس بہت معمولی زمین ہے جس سے اس کی ضرورتیں کبھی پوری نہیں ہو پاتیں اور اس کے سر پر ہمیشہ قرض کا بار رہتا ہے۔ اپنے دروازے پر گائے بندھی دیکھنا اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے ـــــ چوں کہ ہوری ایک انسان ہے اور مکر و فریب اور خوشامد انسانی سرشت میں داخل ہے۔ چنانچہ بھولا اہیر کو اس کی دوسری شادی کرا دینے کا لالچ دے کر ہوری اس کی گائے ہتھیا لیتا ہے ـــــ اس کا بھائی ہیرا حسد کی وجہ سے موقع پا کر ایک روز گائے کو زہر دے دیتا ہے۔ گائے لانے کے چکر میں ہوری کے لڑکے گوبر سے بھولا کی لڑکی جھنیا کے تعلقات بڑھ جاتے ہیں۔ گوبر جھنیا کو تو گھر لے آتا ہے مگر باپ کے ڈر سے خود شہر چلا جاتا ہے۔ اس طرح ہوری کی ذمہ داریاں کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتی ہیں۔ جھنیا کو گھر میں رکھنے کے جرم میں اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ فصل کی ساری پیداوار اسی جرمانے میں چلی جاتی ہے۔ بھولا اپنی بےعزتی کا بدلہ لینے کے لیے ہوری کا بیل لے جاتا ہے۔ اس طرح ہوری کی زندگی میں مسائل بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ گوبر شہر سے روپیہ کما کر جب گاؤں واپس آتا ہے تو جیسے ایک بار ہوری کے ویرانے میں بہار

آجاتی ہے۔ لیکن یہ بہار وقتی اور لمحاتی ثابت ہوتی ہے کیونکہ شہری زندگی میں گوبر کے بدلے ہوئے خیالات اب گاؤں والوں اور گھر والوں سے میل نہیں کھاپاتے اور وہ پھر واپس چلا جاتا ہے۔

گوبر کی بہنیں روپا اور سونا جوان ہو جاتی ہیں۔ ادھر اُدھر سے قرض لے کر سونا کا بیاہ بھی ہو جاتا ہے۔ قرض کے بار اور مسلسل ناکامیوں نے ہوری کی کمر اور جھکا دی۔ کھیتی کرنے کے لیے اس کے پاس بیل نہیں ہوتے اس لیے مجبوراً وہ مزدوری پر آمادہ ہوتا ہے۔ ساہوکار اس کی آخری پونجی تین بیگھہ زمین پر بھی قبضہ کرنا چاہتا ہے لیکن ہوری اسے جی جان سے بچانا چاہتا ہے جس کے لیے اپنی چھوٹی عمر کی معصوم بیٹی روپا کو ایک عمر رسیدہ کے ہاتھوں ۲۰۰ روپیے کے عوض بیچ دیتا ہے۔ اور اس طرح باپ دادا کی نشانی بچ جاتی ہے۔ لیکن محنت مزدوری اور فاقوں کی وجہ سے وہ زندگی کو اور محفوظ نہیں رکھ سکا اور ایک شدید گرم دوپہر کو لو کی تپش میں اس کا ناتواں جسم ہمیشہ کے لیے جھلس جاتا ہے۔

ناول گئودان میں یہ قصہ اپنی تمام تر جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس سر زمین پر انسان سانس لیتا ہے، جو حادثات اور واقعات اس پر گزرتے ہیں اس کا ذمہ دار پورا سماج ہوتا ہے۔ سماج میں مختلف طبقے زندگی گزارتے ہیں۔ ان طبقوں میں باہمی کشمکش بھی ہمیشہ جاری رہتی ہے جس کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ سماج کے رسم و رواج اور رہن سہن کے طریقے اس میں بنائے گئے۔ برادری کے اصول اور ان اصولوں میں جکڑے ہوئی ناول کے کرداروں کی زندگی ایک مخصوص علاقے سے تعلق رکھتی ہے اور اس علاقے کا تعارف ناول میں اس طرح ہوتا ہے:-

"سمری اور بیلاری دونوں صوبۂ اودھ کے گاؤں
ہیں، ضلع کا نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہوری
بیلاری میں رہتا ہے اور رائے صاحب اگرپال سنگھ
سمری میں، دونوں گاؤں میں صرف پانچ میل کا فاصلہ ہے۔"

گاؤں کے اس تعارف کے بعد ہی رائے صاحب اور ہوری کے تعلقات ان کے رشتے، طبقاتی فرق۔ یہ تمام باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ ہوری کا ہمیشہ رائے صاحب کی جی حضوری کرتا ہے۔ ان کے یہاں حاضری اور سلامی کو اپنی زندگی کی بقا سمجھتا ہے۔ اسی لیے تو اپنی بیوی دھنیا کے منع کرنے پر کہتا ہے:

"اسی سلامی کی برکت ہے کہ دروازے پر
جھونپڑی بنائی اور کسی نے کچھ نہ کہا۔ گھورو نے دروازے
پر کھونٹا گاڑا تھا اس پر کارندے نے دو روپیہ
تاوان لے لیا تھا۔"

پریم چند نے شمالی ہندستان کی ہی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اتر پردیش کے گاؤں خصوصیت کے ساتھ ان کی تحریروں کا مرکز و محور رہے ہیں۔

ہر علاقہ اپنی مقامی خصوصیات کی بنا پر انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہر جگہ کے اپنے رسم و رواج ہوتے ہیں، اپنے آداب ہوتے ہیں اپنی تہذیب ہوتی ہے اور ایک خاص طرح سے زندگی گزارنے کا طریقہ ہوتا ہے، یہ باتیں ناول نگار عمداً بیان نہیں کرتا بلکہ غیر شعوری طور پر ناول کے کرداروں کی زندگی میں اس طرح پیوست ہو جاتی ہیں کہ مجموعی تاثر کی صورت میں علاقائی عنصر اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ بہترین ناول وہی کہلاتا ہے جہاں زندگی اپنی زمین سے اس طرح جڑی ہو کہ ہم ناول کے کرداروں کی زندگی کے آتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اس زمین کی بو باس کو بھی محسوس کریں۔

کسی بھی ناول کو خصوصیت کا درجہ دینے میں علاقائی عناصر کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ پریم چند کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ادبی سفر میں شمالی ہندستان سے باہر نہیں نکلتے۔

"گئودان" میں مقامی رنگ دیکھنے کے لیے سب سے پہلے ہماری نگاہ اس کے سماج پر جاتی ہے جہاں جاگیردارانہ نظام حاوی تھا۔ اس کے علاوہ زمیندار، ساہوکار اور دھرم کے دوسرے ٹھیکیدار اپنے اپنے انداز سے کمزور طبقے کا استحصال کر رہے تھے۔ ہوری اس کمزور طبقے کا نمائندہ کردار ہے۔ اب ذرا اس ناول کے اس قصے پر ایک نظر ڈالیے جب جھنیا گوبر کے گھر بھاگ آتی ہے۔ یہ عمل سماج کی نظروں میں ایک ناقابل معافی جرم تھا۔

یہ بات پنچایت تک پہنچی ہے۔ پنچایت جو اس علاقے کی عدالتِ عالیہ ہے، اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ پنچایت نے فیصلہ کیا کہ سو روپیہ جرمانہ اور تین من غلّے کا تاوان دیا جائے۔ دھنیا نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا مگر ہوری اسے سمجھانے لگا:۔

"تو کیوں بولتی ہے دھنیا۔ پنچ میں پرمیشور رہتے ہیں ان کا جو فیصلہ ہوگا وہی میرے سر آنکھوں پر۔ اگر بھگوان کی یہی مرضی ہے کہ ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائیں تو ہمارا کیا بس۔"

یہ بے بسی، یہ مجبوری سارے ناول میں پھیلی ہے اور ہر ہر جگہ پر سماج اور برادری کی علاقائی بندشیں حاوی ہیں۔ یہ رسم و رواج، یہ ذات برادری ہوری کی ہتھکڑی اور بیڑیاں ہیں جس سے اس کے آزاد ہونے کی امید بھی نہیں ہے۔

برادری کا خوف بھوت کی طرح ہوری کے سر پر سوار ہو کر کوڑے لگا رہا تھا۔ برادری سے الگ رہ کر جینے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شادی، بیاہ، مونڈن، چھیدن، مرنا جینا سب کچھ برادری کے ہاتھ میں ہے۔ برادری اس کی زندگی میں پیڑ کی طرح جڑ جمائے ہوئے تھی اور اس کے رگ و ریشے میں پیوست تھی۔

پریم چند نے کرداروں کی زندگی کے ساتھ ساتھ ایسے بہت سے رسم و رواج کا بیان کیا ہے جن پر خاص علاقائی اثر ہے۔ مہمان کی خاطر کرنا، کسی کے آنے پر فوراً کھاٹ پیش کرنا، شربت پانی کا انتظام کرنا، حقّہ حاضر کرنا۔ یہ وہ تہذیبی رسمیں ہیں جو آج بھی اتر پردیش کے گاؤں میں زندہ اور رواج ہیں۔

خاطر مدارات کے علاوہ مذہبی عقیدے بھی علاقائی شناخت کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ دھنش یگیہ کے سلسلے میں جو دھوم دھام دکھائی گئی ہے، جن رسم و رواج کا سہارا لیا گیا ہے وہ ایک مخصوص علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دراصل یہ جشن دسہرہ کی ایک کڑی ہے اور اس کے بعد ہولی کے تیوہار کا خصوصی بیان ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا تیوہار ہے جو ہندوستان کے کونے کونے میں مخصوص انداز سے منایا جاتا ہے۔ اس ایک تیوہار پر ہر جگہ علاقائی اثرات کی چھاپ ملتی ہے۔ اس علاقے کے بارے میں خود مصنف کا بیان ہے:

"دیہاتوں میں سال کے چھ مہینے کسی نہ کسی جشن میں ڈھول مجیرے بجتے ہی رہتے ہیں۔ ہولی کے ایک ماہ قبل سے ایک ماہ بعد تک پھاگ ہوتا رہتا ہے۔ اساڑھ لگتے ہی آلھا شروع ہو جاتا ہے اور ساون بھادوں میں کجلیاں ہوتی ہیں۔ کجلیوں کے بعد رامائن شروع ہو جاتی ہے"——

"یوں تو ہولی میں گانے بجانے کا خاص مقام نوکھے رام کی چوپال تھی۔ وہیں بھنگ چھنتی تھی وہیں رنگ اڑتا تھا۔ وہیں ناچ ہوتا تھا۔"

اس طرح پریم چند نے دسہرہ اور ہولی میں علاقائی رنگ بھر دیا ہے جس سے سارے ہندوستان میں منائے جانے والے یہ تیوہار اس علاقے کی شناخت بن گئے ہیں۔

گئودان میں ایک مکمل زندگی ہے جس کا لمحہ لمحہ قاری کے لئے پانچ سو نوے صفحات کے اندر محصور کر دیا گیا ہے۔ ہوری ایک زندہ اور امر کردار ہے جس کی جہدِ مسلسل میں کہیں بھی ہمت ہار کر بیٹھنے کا موقعہ نہیں آیا۔ زندگی نے کیسے کیسے تلخ جام اسے دیئے مگر اس نے اپنے چہرے کا رنگ نہ بدلنے دیا۔ وہ حالات کے تھپیڑوں سے تلملا جاتا، ٹوٹ جاتا مگر وقتی طور پر، کیونکہ ہنستی گاتی زندگی اس کے سامنے پھر رقص کرنے لگتی۔ کبھی وہ اپنی بیوی سے چھیڑ چھاڑ میں جوانی کی باتیں دہرانے لگتا اور کبھی دلاری سے عشق کے قصّے دہرانے لگتا——

زندگی میں لاکھ کلفتیں ہوں لیکن اگر مایوسی کا سایہ قریب نہ آئے تو زندگی کی جاذبیت برقرار رہتی ہے اور تھک ہار کر بیٹھ رہنے کے بجائے آخری سانسوں تک زندگی سے لڑنے کا حوصلہ باقی رہتا ہے —— اور اس حوصلے کی صداقت کا نام ہے ہوری —— اس کی زندگی کی پوری داستان پڑھ لینے کے بعد ایک علاقہ، وہاں کے سماج اور اس سماج کے رسم و رواج، اس کے تہذیب و تمدن۔ ان سب سے ہم اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں۔

□□

غزل

سید احمد سحر
خلیل غربی، شاہجہاں پور

رہے ہیں جن کی عنایت پہ کاربند بہت
انھیں سے پہنچا ہے اکثر ہمیں گزند بہت

بھرو نہ جادۂ ارماں میں یوں زقند بہت
قدم قدم پہ ہیں یاں دفن ارجمند بہت

کیا تھا ہم نے جسے پیش آبگینۂ دل
شکست و ریخت میں نکلا سلیقہ مند بہت

ابھی تو رہرو غم شامِ انتظار ہی ہے
دیارِ صبح تک آئیں گے زہرخند بہت

شجر وہ پھولے ہوئے نذرِ گردشِ دوراں
چمن میں تھے قد و قامت میں جو بلند بہت

قیود توڑ دیں سب آج پائے وحشت نے
کسی کے شہر کی گلیاں تھیں ہم پہ بند بہت

شبِ فراق کی محشر خرامیوں کی ہے دین
سحر بدن کا چٹکتا ہے بند بند بہت

قاسم شبیر نقوی نصیرآبادی
[illegible] نصیرآباد، رائے بریلی

سوز ہے دل کے آس پاس بہت
کیوں نہ ہر فکر ہو اُداس بہت

آپ رہتے ہیں دُور دُور مگر
حدِ احساس میں ہیں پاس بہت

خشک ذرّے تو ضبط کرتے ہیں
جو ہیں دریا انھیں ہے پیاس بہت

اصلِ رُوداد کا پتہ نہ چلا
فتنہ گر تھے مرے قیاس بہت

پہلے انساں اُداس ہوتے تھے
اب ہے انسانیت اُداس بہت

پیکرِ آدمی کا فخر جو تھا
چاک ہے اَب وہی لباس بہت

تلخ تر ہے مزاج دنیا کا
پھر بھی صورت پہ ہے مٹھاس بہت

تیری فرقت میں کیا ہوا مت پوچھ
مضمحل ہو گئے حواس بہت

خوب ضرب المثل تھی یہ قاسم
آئی محرومی مجھ کو راس بہت

کربِ خود کلامی

سلمیٰ شاہین
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی
دہلی

یاد کے صحرا میں آہوں کی صدائے بازگشت
ہر طرف مایوسیوں کی آہنی دیوار سے
کس طرح ٹکرا رہی تھی ....
خامشی میں پھر یکایک شور برپا ہو گیا
اس زمیں سے آسماں تک
آسماں سے لامکاں تک
شورِ ماتم ہو گیا
دل مسلسل غم ہوا
شعلہ بنا
بھڑکا کیا
کب تک اس طرح کے ماحول میں زندہ رہوں !؟
کیا کروں ؟ کیسے جیوں ؟
چھوڑ دوں یہ سلسلہ
پھر کوئی نقشِ خیالی کھینچ کر
رنگ اس میں ڈال دوں ؟
میں بھی اوروں کی طرح ؟
بھول جاؤں سب کے سب گزرے ہوئے
وہ حادثات
رات دن دیکھا کروں
میں بھی کوئی خواب سا۔ !؟

□□

صاحب علی خاں
[illegible] ٹی، آر، ایم ہال
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

لکھنؤ میں

اردو گلدستوں کی روایت

انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اردو اخبارات اور جرائد کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی زمانے میں اردو کے گلدستے بھی جاری ہوئے۔ ملک کے مختلف شہروں مثلاً دہلی، آگرہ، لکھنؤ، رام پور، میرٹھ اور حیدرآباد سے گلدستوں کی باقاعدہ اشاعت شروع ہوئی لیکن گہوارۂ علم و ادب لکھنؤ نے گلدستوں کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ مرکز شعر و ادب لکھنؤ کی شامیں اکثر طرحی مشاعروں اور ادبی محفلوں سے عبارت ہوتی تھیں۔ ان نشستوں میں سخن شناس حضرات شریک ہوتے تھے شعراء متعین طرح میں طبع آزمائی کرتے اور حاضرین سے داد تحسین وصول کرتے تھے۔ ان مشاعروں کی روداد اور شعراء کے کلام کے انتخاب کی اشاعت کے لیے ایک رسالے کی ضرورت محسوس کی گئی اور نتیجۃً "گلدستے" منظر عام پر آئے۔ گلدستوں کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جو لوگ مشاعروں میں شریک نہیں ہو پاتے وہ بھی شعراء کے کلام سے محظوظ ہو سکیں۔

لکھنؤ سے تقریباً ڈیڑھ درجن گلدستے جاری ہوئے جنھوں نے نہ صرف معیار شعر و سخن عام کیا بلکہ ادبی ذوق کی تربیت بھی کی۔ لکھنؤ سے سب سے پہلا گلدستہ "گلدستۂ شعراء" شائع ہوا مگر سب سے زیادہ مقبولیت گلدستۂ "پیام یار" کو حاصل ہوئی جو جون ۱۸۸۳ء میں منشی نثار حسین نثار کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ لکھنؤ کا دوسرا گلدستہ "گلدستۂ سخن" تھا جو ۱۸۷۶ء میں منشی لالہ رام سہائے تمنا کی ادارت میں نکلا۔ اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں ڈاکٹر محمد یوسف کی ادارت میں "ریاض الاشعار" جاری ہوا۔ پھر اس کے بعد تو لکھنؤ میں اردو گلدستوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

"پیام عاشق" مدیر تصور حسین خاں ۱۸۸۳ء
"فیض سخن" مدیر مرزا عباس حسین ہوش ۱۸۸۳ء
"رعنا" " منشی عاشق حسین عاشق ۱۸۸۳ء
"تحفۂ عشاق" " محمد معصوم محشر ۱۸۸۴ء
"مرقع نگار" " عاشق حسین عاشق ۱۸۸۴ء
"دامن گلچیں" " منشی شیخ واجد علی بسمل ۱۸۸۵ء
"خنجر عشق" منشی درگا پرشاد ۱۸۸۵ء
"نغمۂ بہار" مہتمم یعقوب علی خاں نصرت ۱۸۸۶ء
"بہار ہند" مدیر مرزا مجھو بیگ عاشق ۱۸۸۷ء
"گلچیں" " وسیم خیرآبادی ۱۸۹۱ء
"انتخاب" " سید محمد مصطفےٰ خورشید ۱۸۹۳ء
اور "خدنگ نظر" " نوبت رائے نظر ۱۸۹۶ء میں

منظر عام پر آئے۔ ان کے علاوہ مرزا ہادی عزیز کی ادارت میں "معیار" (۱۹۰۷ء)، ابوالکمال لطف کی ادارت میں "منظر" (۱۹۱۸ء) اور دیگر گلدستے بھی جاری ہوئے۔

مذکورہ گلدستوں میں کچھ ایسے تھے جو ایک مدت تک شائع ہوتے رہے اور کچھ ایسے بھی تھے کہ نکلے اور بند ہو گئے۔ کچھ معیاری تھے اور کچھ غیر معیاری۔ معیاری گلدستوں میں "پیام یار"۔ "انتخاب"۔ "دامن گلچیں" اور

یحییٰ" وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ہر چند کہ لکھنؤ کے گلدستوں میں ستۂ شعراء کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ مگر زمانی اعتبار سے دو کا یہ تیسرا گلدستہ ہے۔ اُردو میں سب سے پہلا گلدستہ لِ رعنا" ۱۸۴۵ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد معیار الشعراء" ۱۸۴۸ء میں آگرہ سے نکلا گلدستوں کے اجرا کا یادی مقصد اردو زبان و ادب کو فروغ دینا تھا۔ گو کہ اردو گلدستوں ی ابتدا دہلی سے ہوئی، مگر گلدستوں کی روایت لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ ہاں سے بیک وقت کئی کئی معیاری گلدستے نکلے۔ ان میں سے چند کا ختصر تعارف درج ذیل ہے :۔

گلدستۂ شعراء

یہ لکھنؤ کا پہلا اُردو گلدستہ تھا جو ۲۴ دسمبر ۱۸۵۹ء کو منظرِ عام پر آیا۔ ابتدا میں یہ مطبع اودھ گزٹ محلہ گولہ گنج میاں جرأت کے امباڑے سے شیخ قادر بخش کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا تھا۔ مگر اس پریس کی گولہ گنج سے حسین گنج منتقلی کے بعد گلدستہ بھی وہیں سے طبع ہونے لگا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۶۰ء کے شمارہ کی پرنٹ لائن سے معلوم ہوتا ہے کہ گلدستۂ شعراء کے ابتدائی انیس شمارے شیخ قادر بخش کے زیرِ اہتمام شائع ہوئے لیکن بیسویں شمارے سے گلدستہ کے مہتمم منشی گنگا پرشاد ہو گئے۔ گلدستہ کی ضخامت کبھی سولہ اور کبھی بیس صفحات ہوتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی صفحات کی تعداد ۱۶ سے بھی کم ہو جاتی تھی۔ عام طور پر گلدستہ کی ضخامت ۱۶ سے ۲۰ صفحات پر محیط ہوتی تھی۔

گلدستۂ شعراء ایک ماہ میں دو بار طبع ہوتا تھا اور اس کی قیمت پانچ روپے پیشگی تھی۔ اس میں عموماً طرحی مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلیں شائع کی جاتی تھیں تاہم گاہے گاہے استاد شعراء کی غیر طرحی غزلیں بھی شائع کی جاتی تھیں جس کا مقصد گلدستے کا معیار بڑھانا تھا یکم جنوری ۱۸۶۰ء کے شمارے میں انتظام الدولہ راجہ محمد یوسف علی خاں عزیز اور نواب احمد حسن خاں جوش کی ایک غیر طرحی غزل شائع ہوئی ہے۔

مذکورہ گلدستے میں عام طور سے لکھنؤ کے شعراء ہی کا کلام چھپتا تھا اور لکھنؤ سے باہر کے شعراء کی نمائندگی بہت کم ہوتی تھی۔ "گلدستۂ شعراء" کی جلد ۱ اور شمارہ نمبر ۱۵ کے مطالعہ سے اس کے سبب کا انکشاف ہوتا ہے اس میں عموماً نواب حیدر علی خاں کی بارہ دری (واقع محلہ رستم نگر متصل درگاہ حضرت عباسؑ) میں منعقد ہونے والے طرحی مشاعروں کی غزلیں شائع ہوتی تھی۔ یہ مشاعرے پندرہ روزہ ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان مشاعروں میں دور دراز کے شعراء کی شرکت ممکن نہیں ہو پاتی تھی۔ لہٰذا ان کی غزلیں بھی شامل اشاعت نہیں ہوتی تھیں۔ گلدستہ میں ہر شاعر کی مکمل غزل طبع نہیں ہو پاتی تھی بلکہ صرف وہی غزل پوری چھپتی تھی جو اچھی ہوتی تھی مزید براں جو شعر حاصلِ مشاعرہ ہوتا تھا وہ گلدستے کی زینت بنتا تھا۔ گلدستۂ ہٰذا میں جن شاعروں کا کلام تواتر کے ساتھ چھپتا تھا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :۔

تدبیر الدولہ آسیر لکھنوی، نواب احمد حسن خاں جوش، آغا حجو شرف، سید احسان حسین خاں افسوس، حامد حسین خاں حامد، سید یوسف علی خاں عزیز، کشور لال شعور، نواب اشرف علی خاں اوج، میر یار علی جان، امیر مینائی، عبدالکریم حنا، نواب مرزا حسین خاں فراق، اکبر حسین خاں شان، سید میر محمد حسین جرار، مرزا آغا حیدر افسوس، خواجہ مصطفےٰ فروغ، مرزا آغا زیب ضامن علی ضامن، سید حسن لطافت، شیخ امجد علی نعیم، وارث علی صبیح، مظفر علی ہنر، منشی جواہر سنگھ جوہر، وارث علی خاں فہم، پنڈت پرتھی ناتھ گوہر، میر وزیر علی نور، احمد حسین صولت، سید جعفر حسین الیاس شیخ امیر اللہ تسلیم لکھنوی، امداد حسین تمنا، منشی بھاؤ لال مہجور، فضل حسین وحشت، لالہ چند سہائے نہال، یوسف خاں یوسف، سرفراز علی خاں وحید، لالہ لال سنگھ وصفت، میر مراد علی نغز، کاظم حسین سرور اور شیخ قادر وغیرہ۔

"گلدستۂ شعراء" اپنے دور کے معروف اور غیر معروف لکھنوی شعراء کے کلام کی ایک اہم اور معتبر ادبی دستاویز ہے جس کی وساطت سے شعراء کی غزلوں کے زمانۂ تخلیق کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ یہ گلدستہ ایسے غیر معروف شاعروں کی نشان دہی بھی کرتا ہے جن کے ذکر سے اُردو کی ادبی تاریخ تو کیا، تذکرے بھی خالی ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ "گلدستۂ شعراء" نے اپنے عہد کے بہت سے غیر معروف شاعروں کے کلام کو گم ہونے سے بچا لیا۔ اس اعتبار سے یہ گلدستہ ادبی تحقیق اور تاریخ کے ایک اہم

اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

گلدستۂ پیامِ یار

یہ ماہانہ گلدستہ چوک لکھنؤ سے جون ۱۸۸۴ء میں جاری ہوا تھا اس کے مالک و مدیر منشی نثار حسین نثار تھے، اور نثار کی وفات کے بعد گلدستہ نثار مرحوم کے بیٹے اکبر حسین اکبر کی ادارت میں شائع ہونے لگا تھا۔ پیامِ یار مئی ۱۸۸۴ء تک مطبع منشی گنگا پرشاد ورما برادران واقع امین آباد لکھنؤ سے طبع ہوتا تھا، اس کے بعد مطبع منشی محمد علی حسین لکھنؤ واقع گولہ گنج سے شائع ہونے لگا اور یہ سلسلہ دسمبر ۱۸۸۵ء تک جاری رہا۔ جنوری ۱۸۸۶ء کا شمارہ مطبع انوار محمدی لکھنؤ ———— اور اس کے بعد کے چار شمارے نامی گرامی پریس لکھنؤ سے چھپے۔ منشی نثار حسین نے مئی ۱۸۸۶ء میں اپنا ذاتی پریس "قومی پریس" لکھنؤ چوک میں قائم کر لیا تو "پیامِ یار" اسی پریس سے چھپنے لگا اور آخر تک یہیں سے چھپتا رہا۔

"پیامِ یار" کی کتابت و طباعت اس زمانے کے لحاظ سے بہت عمدہ ہوتی تھی۔ ۱۴×۲۱/۲ سائز کے عموماً بیس صفحات پر مشتمل یہ گلدستہ ہر انگریزی مہینے کی آخری تاریخ کو طبع ہوتا تھا، صفحات گھٹتے اور بڑھتے رہتے تھے۔ اس کا سرورق بڑا خوبصورت اور دیدہ زیب ہوتا تھا۔ سرورق پر اُردو اور انگریزی دونوں میں جلی حروف میں پیامِ یار درج ہوتا تھا اور اس کے نیچے یہ شعر رقم ہوتا تھا ؎

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کے
اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

اس شعر کے نیچے مرتب گلدستہ اور پریس کا نام جلی حروف میں درج ہوتا تھا اور اسی ورق پر "ضروری گزارش" اور کبھی "ضروری باتیں" کے عنوان سے گلدستہ کے اصول و ضوابط درج ہوتے تھے، جس کی تلخیص اس طرح کی جا سکتی ہے۔ پیامِ یار ہر انگریزی مہینے کی آخر تاریخوں میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے دو حصے (نثر اور نظم) ہیں۔ نظم کے حصے میں معیاری شعراء کے منتخب طرحی کلام کے علاوہ غیر طرحی غزلیں، نظمیں اور قطعات بھی چھپتے تھے۔ نثر میں ناول کے علاوہ ادبی، تاریخی اور اخلاقی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ دونوں حصّوں کی قیمت عام لوگوں سے عہ سالانہ مع محصول ڈاک اور رؤسا و والیانِ ملک سے لے ہر سالانہ مع محصول ڈاک مقرر تھی۔ سہ ماہی یا ششماہی چندہ کا رواج نہیں تھا۔ خریدار اور غیر خریدار سب کا منتخب کلام شائع ہوتا تھا۔ اشعار کے انتخاب کے لیے ایک کمیٹی مقرر تھی۔ غیر طرحی کلام فی شعر ۲ آنہ اجرت دینے پر درج ہوتا تھا۔ اشتہار دو ایک مرتبہ کے لیے بذریعہ تحریر فیصلہ کیا جاتا تھا۔

مذکورہ اصول و ضوابط پر گلدستہ بحسن و خوبی عمل پیرا رہا۔ جنوری ۱۹۰۹ء میں مدیر نثار حسین نثار سخت علیل ہو گئے اور وہ تین مہینے کی علالت کے بعد ۴ر اپریل ۱۹۰۹ء کو وفات پا گئے۔ مدیر کے انتقال کے باعث گلدستہ جنوری ۱۹۰۹ء سے جولائی ۱۹۰۹ء تک بند رہا۔ اس کے بعد منشی نثار حسین نثار کے بیٹے اکبر حسین اکبر نے پیامِ یار کی ادارت سنبھالی۔ یہ گلدستہ کا عبوری دور تھا۔ تاہم اکبر حسین نے معیار کو بلند کرنے کا عزم کیا اور زمانے کے رجحان کے مطابق اس میں پہلے سے زیادہ نیچرل نظمیں اور ادبی معلوماتی علمی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح پیامِ یار نے ایک نئی روایت کا آغاز کیا۔ اس نوعی تبدیلی کا عام طور پر خیر مقدم کیا گیا اور قارئین کی تعداد میں بھی قابل لحاظ اضافہ ہوا۔

اکبر حسین اکبر کی ادارت میں گلدستہ تین سال تک نکلتا رہا۔ اسی اثنا میں گلدستہ ایک بار پھر بحران کا شکار ہو گیا اور دسمبر ۱۹۱۲ء کے بعد سات سال کے لمبے عرصے تک بند رہا۔ مدیر کی محنت شاقہ کے بعد گلدستہ کی اشاعت کا سلسلہ جنوری ۱۹۲۰ء سے دوبارہ شروع ہوا۔ یہ گلدستہ کا تیسرا اور آخری دور تھا۔ گلدستہ ایک سال تک برابر پابندی سے شائع ہوتا رہا اور قارئین کے ادبی ذوق کی آبیاری کرتا رہا۔ پیامِ یار بیحد مقبول گلدستہ تھا اور قارئین شدت سے اس کے منتظر رہتے لیکن یہ بہار چند روزہ ہی ثابت ہوئی اور دسمبر ۱۹۲۰ء کے بعد پیامِ یار کا کوئی شمارہ شائع نہ ہو سکا۔ ہر چند کہ یہ گلدستہ نشیب و فراز سے دوچار ہوتا رہا مگر مدیر نے معیار پر سمجھوتہ نہیں کیا۔

پیامِ یار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں منتخب اشعار ہی شائع کیے جاتے تھے۔ اس اصول کی پابندی اس سختی سے کی جاتی تھی کہ اساتذہ کا بھی لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ بعض دیگر پرچوں میں

اساتذۂ فن کی مکمل غزل چھپ جاتی تھی مگر پیام یار میں ان کے چند ہی اشعار شاملِ اشاعت ہوپاتے تھے۔ بہت سے شعراء کا تو صرف ایک شعر ہی منتخب ہوتا تھا۔ اشعار کے انتخاب کے لیے ایک باقاعدہ کمیٹی تھی جو ریاض خیرآبادی اور عشرت لکھنوی وغیرہ پر مشتمل تھی۔ درحقیقت پیام یار کی یہ خوش نصیبی تھی کہ ریاض خیرآبادی عبدالحلیم شرر، خواجہ عشرت لکھنوی اور جلیل مانک پوری جیسے بلندپایہ شعراء اس کے مشیر و معاون تھے۔ اس کے علاوہ پیام یار کو روزِ اول ہی سے اپنے دور کے تمام اہم شعراء اور ادباء کا قلمی تعاون بھی حاصل رہا۔ داغ دہلوی، امیر مینائی، جلال لکھنوی، ریاض خیرآبادی اکبر الہ آبادی، تسلیم لکھنوی، مضطر خیرآبادی، وسیم خیرآبادی اور یاس لکھنوی وغیرہ کا کلام پابندی سے شائع ہوتا تھا۔ مولانا شرر کے ناول پیام یار میں چھپتے تھے۔ خواجہ عشرت لکھنوی کے صرفی و نحوی مضامین اور نیچرل نظمیں پیام یار کی زینت بنتی تھیں۔ اس گلدستے کے توسط سے بہت سے گمنام شاعر و ادیب منظرِ عام پر آئے۔ ورنہ ان کے افکار و خیالات سے اردو دنیا محروم ہی رہتی۔ اردو کی ادبی تاریخ و تحقیق میں پیام یار کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

گلچیں

یہ شعر و سخن کا ماہانہ گلدستہ تھا جو ۱۸۸۶ء میں نخاس لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ سید محمد عسکری وسیم خیرآبادی اس کے مہتمم و مالک تھے۔ جون ۱۹۰۹ء کے شمارہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گلچیں کی کتابت و طباعت عمدہ تھی۔ سرورق کبھی سادہ اور کبھی گل بوٹوں سے مزین ہوتا تھا۔ سرورق کی پیشانی پر "نمبر رجسٹرڈ اے ۳۵۱" درج رہتا تھا اس کے بعد محراب کی شکل میں فارسی کا یہ شعر کبھی درج ہوتا تھا اور کبھی نہیں ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار گلچیں بہار تو ز دامانِ گلہ دارد

پھر محراب کے نیچے اردو کا ایک شعر لکھا ہوتا تھا ؎

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول
پھول میں نے کچھ چنے ہیں ان کے دامن کے لیے

اس شعر کے بعد گلدستہ کا ٹائٹل "گلچیں" جلی حروف میں لکھا ہوتا تھا اور ٹائٹل کی داہنی طرف شمارہ نمبر اور بائیں طرف جلد نمبر ہوتا تھا اس کے نیچے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوتی تھی جس سے گلدستہ کے اصول و ضوابط معلوم ہوتے ہیں:—

"یہ رسالہ دو جزء تک مع حصہ نثر لکھنؤ محلہ نخاس سے شائع ہوتا ہے۔ کلام کے اعتبار سے اس کی وقعت بہت زیادہ ہے۔ عام قیمت دو روپیہ، والیانِ ملک سے قیمت دس روپیہ سالانہ، روساء و امراء سے پانچ روپیہ سالانہ۔ مربیانِ گلچیں جس شرح سے ماہوار قیمت عطا فرمائیں گے وہ ان کے نام کے ساتھ درج رہا کرے گی۔ مگر رقم اعانت ایک روپیہ ماہوار سے کم نہ ہو۔ اجرت اشتہار فی صفحہ بیس روپیہ۔ نمونہ کا پرچہ تین آنے وصول ہونے پر روانہ ہوگا۔"

اس کے بعد دائرے کی آدھی شکل میں "امیر المطابع لکھنؤ نخاس چوک سے باہتمام محمد عسکری وسیم چھپ کر شائع ہوا" لکھا ہوتا تھا۔ گٹ اپ کی نوعیت میں اکثر تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ کبھی مندرج شعر اور ٹائٹل کی ترتیب میں فرق ہوتا اور کبھی گٹ اپ بالکل سادہ ہوتا۔ اسی طرح کبھی پھول پتیوں اور پنکھڑیوں سے مزین ہوتا۔ کبھی کبھی ان پتیوں اور پنکھڑیوں کی شکل بھی مختلف ہوتی تھی۔

جس طرح گلدستے کے گٹ اپ میں کبھی یکسانیت نہیں رہتی اسی طرح "گلچیں" کی ضخامت بھی یکساں نہیں رہی۔ یہ گلدستہ کبھی ۱۶ صفحات تو کبھی ۲۸ اور ۳۳ صفحات اور کبھی ۴۲ صفحات پر طبع ہوتا تھا۔ لیکن عام طور سے ۱۶ صفحات سے کم اور ۴۲ صفحات سے زیادہ ضخامت نہیں ہوتی تھی۔ ۱۹۰۸ء تا ۱۹۰۹ء کے پرچوں میں گلدستۂ ہٰذا کے مربیوں اور سرپرستوں کے مندرجہ ذیل نام دیکھنے کو ملتے ہیں:

"علی محمد خاں صاحب بہادر محمود آباد، چودھری سید التفات رسول صاحب تعلقدار سندیلہ، مولوی سبحان اللہ خاں صاحب رئیس اعظم گورکھپور، راجہ نوشاد علی خاں صاحب بہادر تعلقدار جہانگیر آباد، منشی پراگ نرائن صاحب

مالک نول کشور پریس لکھنؤ، بابو ہری کرشن عرف کھن کھن صاحب مہاجن لکھنؤ۔ منشی نظام احمد صاحب رئیس اعظم خیر آباد، منشی محمد اراغ صاحب منصرم عدالتِ دیوانی دیوریا ضلع گورکھپور"۔

مذکورہ فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ گلچیں کو ایک طرف تو معروف شخصیتوں کی سرپرستی حاصل تھی اور دوسری طرف اسے شعراء و ادبا کا قلمی تعاون بھی حاصل تھا۔ اس گلدستہ میں پابندی سے شائع ہونے والے شعراء امیر مینائی، جلال لکھنوی، ریاض خیر آبادی، جلیل مانک پوری، نوح ناروی، یاس لکھنوی، فصاحت لکھنوی، منشی بال کرشن قمر لکھنوی، موسوی عابد علی کوثر خیر آبادی، سید محمد عسکری وسیم مہتمم "گلچیں"۔ سید افضل علی خاں افضل، حاجی تجمل حسین تجمل، منشی بھگوتی پرشاد شائق، شیخ مصاحب علی مصاحب، حکیم سید محمد آصف آصف لکھنوی، صفدر علی خاں عرف پیارے صاحب اثر، محبوب حسن حبیب اور سید عبدالحکیم سیف وغیرہ شامل تھے۔

اردو گلدستوں کے مزاج کے مطابق "گلچیں" بھی دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ نظم اور دوسرا نثر کے لئے مخصوص تھا نظم کے حصے میں منتخب طرحی اور غیر طرحی کلام شائع ہوتا تھا۔ اس میں بلند پایہ شاعروں کے پہلو بہ پہلو نومشق اور نوخیز شعراء کے معیاری کلام کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔ نثر کے حصے میں "انجمن اصلاحِ سخن لکھنؤ" کی کارکردگی کی روداد اور مضامین چھپتے تھے۔ انجمن کے سکریٹری خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی تھے۔ انجمن کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کو فروغ و ترقی دینا تھا۔ اس گلدستے میں اُردو زبان کے متعلق مضامین ہوتے تھے اور صرف و نحو پر بھی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔

گلچیں کے اجراء کا مقصد اُردو زبان و ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ لوگوں میں شعر و سخن کا مذاق پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ گلدستہ نے نوخیز شعراء کی غزلیں شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے علاوہ وہ حضرات جو شعر موزوں کرنا تو جانتے تھے مگر آدابِ فن سے زیادہ واقف نہیں تھے "گلچیں" کی وساطت سے فن شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس طرح اُردو شعر و ادب کی جو خدمات مذکورہ گلدستہ نے انجام دیں ان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

انتخاب

"انتخاب" شعر و سخن کا ایک پندرہ روزہ گلدستہ تھا جو سید محمد مصطفیٰ خورشید کی ادارت میں جنوری ۱۸۹۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ گلدستہ ابتداء سے دسمبر ۱۸۹۷ء تک سید یعقوب علی آہ کے زیر اہتمام مجتبائی پریس چوک لکھنؤ میں چھپا اور پھر یکم جنوری ۱۸۹۸ء سے ان ہی کے زیر اہتمام قومی پریس چوک لکھنؤ میں چھپنے لگا۔ یہ ۱۳×۲۱ سائز کے سولہ صفحات پر مشتمل ہر انگریزی مہینے کی آخری تاریخ کو طبع ہوتا تھا اور سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔

۱۸۹۸ء کے پرچوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب کی کتابت اور طباعت عمدہ ہوتی تھی۔ سرورق پھول پتیوں سے مزین ہوتا تھا اور اسی ورق کی پیشانی پر یہ عبارت درج ہوتا تھا:

" اصول و ضوابط دیکھ لیجیے جس کی پابندی خریداروں کو قانوناً لازمی ہوگی"۔

اس کے نیچے انگریزی اور اُردو کے جلی حروف میں گلدستے کا ٹائٹل "انتخاب" لکھا رہتا تھا۔ اور ٹائٹل کے دونوں طرف دو شیروں کی تصویر بنی ہوتی تھی اور پھر حسب دستور یہ شعر رقم ہوتا تھا۔

کہیں تیرِ ادا سے دل نہ ہو جائے ہدف دیکھو
کلیجا تھام لو پہلے تو پھر میری طرف دیکھو

شعر کے نیچے مرتب اور منیجر کا نام درج ہوتا تھا اور اس کے بعد "قومی پریس لکھنؤ میں چھپا" لکھا ہوتا تھا۔ پھر گلدستے کے اغراض و مقاصد درج کیے جاتے تھے۔ نظم و نثر کے دو حصوں پر مشتمل گلدستہ مذکور کے متعلق یہ لکھا جاتا تھا کہ "انتخاب" ۱۸۹۳ء سے ہر انگریزی مہینے کی آخری تاریخ میں شائع ہوتا ہے جس میں اعلیٰ درجہ کی نظم و نثر ملتی ہے۔ قیمت عام پیشگی ہر حصہ کی (عہ) اور دونوں کی (عہ) سالانہ مع محصول ڈاک ہے۔ بالعد المضاعف لے ہر دینے والے معاون اور اس سے زیادہ دینے والے مربی کہلائیں گے"۔

اشاعت کلام میں خریدار اور غیر خریدار کی کوئی قید نہیں ہوتی تھی البتہ معیاری کلام اولین شرط تھی۔ انتخاب اشعار کے لیے ایک کمیٹی مقرر تھی جو جناب خورشید کی نگرانی میں اشعار منتخب کرتی تھی۔ غیر طرحی کلام کی اشاعت کے لیے فی شعر دو آنہ اجرت مقرر تھی، اور اشتہار کے لیے فی سطر دو آنہ دینا پڑتی تھی۔

"انتخاب" "پیام یار" کا ہم عصر اور حریف گلدستہ تھا جو مقبول عوام اور خواص تھا۔ انتخاب کے حصۂ نظم میں طرحی اور غیر طرحی کلام چھپتا تھا۔ کبھی کبھی نیچرل نظمیں اور قطعات وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے جبکہ حصۂ نثر میں قسط وار ناول شائع ہوتے تھے۔ ایڈیٹر انتخاب کے دو ناول "سلطان" اور "راز" گلدستے کی زینت بنے۔ ناول "سلطان" گلدستے میں ۱۸۹۵ء اور ۱۸۹۶ء میں قسط وار شائع ہوا۔ اس ناول میں بعض معاشرتی رسوم کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا۔ ناول "سلطان" میں خلاف مرضی شادی کے نقصانات کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ مدیر کا دوسرا ناول "راز" بھی اسی گلدستے میں ۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۸ء کے درمیان شائع ہوا۔ اس میں بھاؤ جھنکو جی میرٹھ کی شاہ قابل سے لڑائی کا ذکر ہے جو ایک تاریخی اور خاص ہندستان کا مشہور واقعہ ہے۔ یہ دونوں ناول لکھنؤ کی بول چال کی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

ملک کے نامور شعرا مثلاً داغ دہلوی، امیر مینائی، جلال لکھنوی، ریاض خیرآبادی، تسلیم لکھنوی اور نوح ناروی کا کلام اس گلدستے کی زینت بنتا تھا۔ اس کے علاوہ احسان علی خاں احسان، سید مہدی حسن مہدی، سید محمد مہدی کمال، سید آل احمد طرب، ذاکر حسین یاس لکھنوی، سید عابد حسن فصاحت، حاجی تجمل حسین تجمل، میر سید حسین سلیم، محمد شفیع شاکر، اصغر علی اسیر، خواجہ معین الدین چشتی سلام، یعقوب عیسے آہ مینجر "انتخاب"، سید محمد مصطفےٰ خورشید مالک "انتخاب" اور ایس، ایم، ٹی انتک وغیرہ کا کلام اکثر شائع ہوتا تھا۔

"انتخاب" اپنے زمانے کا ایک بے نظیر گلدستہ تھا۔ اس میں منتخب اشعار ہی شائع کیے جاتے تھے اور انتخاب اس قدر سخت ہوتا تھا کہ بہت سے مقتدر شعرا کے چند ہی اشعار شائع ہوتے تھے۔ مدیر "انتخاب" نے جہاں ایک طرف بلند پایہ شعرا کے کلام سے گلدستہ کا معیار بلند کیا وہیں دوسری طرف نومشق اور نوآموز شعرا کی معیاری تخلیقات کو بھی گلدستے کی زینت بناکر انھیں اہل ذوق سے روشناس کرایا۔ مدیر نے اپنے گلدستے کے دامن کو سطحی تخلیقات سے آلودہ نہیں کیا۔

درحقیقت "انتخاب" معنوی اور صوری دونوں لحاظ سے مقبول عام تھا اور اس کی مقبولیت صرف ہندستان تک محدود نہیں تھی بلکہ بیرون ملک میں بھی اہل ذوق اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ برما، بغداد، لندن اور قسطنطنیہ وغیرہ میں یہ گلدستہ پڑھا جاتا تھا۔ دراصل انتخاب کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت تھی۔ چنانچہ اس نے شعر و سخن کے مذاق کو عام کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انیسویں صدی کے تمام معروف و غیر معروف شعرا کے حالات اور ان کے کلام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس گلدستہ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

خدنگ نظر

نوبت رائے نظر کی ادارت میں یہ ماہنامہ ستمبر ۱۸۹۶ء میں آصفی پریس نوازگنج لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ شمارہ ۱۸۹۶ء کے سرورق کی پیشانی پر "بندگان عالی متعالی حضور پرنور اعلیٰ ہز ہائی نیس نظام گورنمنٹ نواب میر محبوب علی خاں بہادر" درج ہے۔ اس کے نیچے انگریزی کے بڑے حروف میں کے۔ این لکھا ہے۔ کے، این کے نیچے بیضوی دائرے کے درمیانی حصے میں جلی حروف میں "خدنگ نظر" درج ہے۔ پھر اس کے بعد یہ شعر حسب دستور تحریر ہوتا ہے ؎

نازوں ہیں اگر نگہ فتنہ گر سے آپ
بہلائیں دل کو سیر خدنگ نظر سے آپ

اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

"خادم الشعرا نوبت رائے نظر مالک و مہتمم "خدنگ نظر" و نواب سید عسکری مرزا خاں صاحب بلیغ و منشی کھنولال تائب سرفرازی یافتہ حضور نظام دام اقبالہ"

پھر اس کے نیچے داہنی طرف ۱۵ ستمبر اور بائیں جانب ۱۸۹۶ء لکھا ہے اور سرورق پر سب سے نیچے جلی حروف میں مطبع کے بارے میں لکھا ہے "مطبع اصح المطابع میں چھپ کر آصفی پریس سے شائع ہوا"

"خدنگ نظر" کے مندرجہ اصول وضوابط کے مطابق مع ضمیمہ ہر انگریزی مہینے کی شروع تاریخوں میں شائع ہوتا ہے اور اس کی ضخامت ۴۴ صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ سالانہ چندہ دو روپیہ ہے مگر پانچ روپیہ دینے والوں کے نام مربیانِ گلدستہ لکھے جاتے ہیں اور جو حضرات دس روپیہ چندہ عنایت کرتے ان کے نام ایک جدول میں مع شکریہ کے شائع کیے جاتے تھے۔ نمونہ کا پرچہ تین آنے وصول ہونے پر بھیجا جاتا ہے۔ اشعار کی اشاعت کے سلسلے میں خریدار اور غیر خریدار میں تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ انتخابِ اشعار کے لیے ایک ادارتی کمیٹی تھی جو منصفانہ طور پر کام انجام دیتی تھی۔ گلدستے میں شعراء کے ناموں کی ترتیب حروفِ تہجی کے لحاظ سے کی جاتی تھی اور گیارہ اشعار سے زیادہ ایک شاعر کا کلام شائع نہیں کیا جاتا تھا ـــــ غیر طرحی کلام کے لیے دو آنہ فی شعر اجرت لی جاتی تھی اور دو آنہ فی سطر اشتہارات کی شرح تھی۔

۱۹۰۰ء کے بعد "خدنگ نظر" میں قابلِ لحاظ تبدیلیاں آئیں۔ اب یہ گلدستہ ہر انگریزی مہینے کی آخری تاریخ کو شائع ہونے لگا اور اس کو تین حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔ پہلے حصے میں علمی، تاریخی، ادبی اور اخلاقی مضامین اور نیچرل نظمیں دوسرے حصے میں طرحی کلام اور نامور شعراء کا غیر طرحی کلام شائع ہوتا تھا اور تیسرا حصہ مسٹر رینالڈس کے ناولوں کے ترجمے کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ ہر حصہ ۱۶ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور مکمل گلدستہ ۴۸ صفحات پر محیط ہوتا تھا۔ گلدستہ کی ضخامت کی وجہ سے قیمت میں بھی اضافہ کیا گیا۔ سالانہ چندہ تین روپیہ اور چار آنہ محصول ڈاک مقرر کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ گلدستہ کے ابتدائی پرچوں میں جو شعر سرورق پر شائع ہوتا تھا اسے بھی تبدیل کیا گیا اور اکثر پرچوں میں شعر بدل بدل کر لکھا ہوا ملتا ہے۔ مارچ ۱۹۰۲ء کے شمارے میں یہ شعر درج ہے ؎

بصد ادب بحضور نظامِ گردوں فر
امیدوارِ نگاہِ کرم خدنگِ نظر

دیگر معاصر گلدستوں کی طرح خدنگِ نظر کو بھی ابتدا ہی سے بلند پایہ شاعروں اور ادیبوں کا قلمی تعاون حاصل تھا۔ داغ دہلوی، امیر مینائی، ریاض خیرآبادی، جلال لکھنوی، جلیل مانک پوری اور چکبست جیسے نامور شاعروں نے اپنے کلام سے گلدستے کا معیار بلند کیا۔ منشی نادر علی خاں نادر کاکوروی نے اپنی نیچرل نظموں سے گلدستے کی عظمت کو نکھارا۔ "خدنگ نظر" کو مقبولِ عوام اور خواص بنانے میں ادیبوں نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ شرر اس کے لیے مستقل قلمی معاون تھے "خدنگ نظر" اپنے دور کا ایک اہم ادبی گلدستہ تھا، جس میں پابندی سے شائع ہونے والے شعراء میں حکیم مہدی حسن احسن، محمد حسن خاں اثر، سید انور حسین آرزو، مرزا اصغر علی خاں اصغر، نواب احمد علی خاں ثروت، سید محمد کاظم جاوید، شیخ علی حزین حزیں، سید عباس حسن فصاحت، محمد مہدی حسن ماہر، کاظم حسن محشر مہتمم گلدستہ ہٰذا اور سید ذاکر حسین یاس لکھنوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

تخلیقات کے انتخاب میں مذکورہ گلدستہ معیار کا خاص لحاظ رکھتا تھا اور معیاری اشعار ہی اس میں شائع ہوتے تھے۔ مارچ ۱۹۰۲ء کے پرچے میں طرحی اور غیر طرحی کلام کے علاوہ دو مضمون ایک "بدھ کا مہامندر" اور دوسرا "امریکہ کے مشہور شاعر لانگ فیلو کے مختصر حالاتِ زندگی" چھپے ہیں۔ اور ناول "شامِ جوانی" کی ایک قسط بھی شائع ہوئی ہے جس میں لکھنؤ کی بامحاورہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نادر علی خاں نادر کاکوروی کی ایک نظم "صبح و شام" بھی گلدستے کی زینت بنی، جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

کتنا خوش آئند ہے چاکِ گریبانِ سحر
جس میں آتا ہے کسی نوخیز کا جوبن نظر
ابھرے ابھرے سینے سے جوشِ جوانی ہے عیاں
وہ پہاڑوں کی نوکیلی اونچی اونچی چوٹیاں
ایک کالے اور لانبے بال والا سر لقا
باندھتا ہے رات بھر کا صبح کو جوڑا کھلا
تیرگیٔ شب میں تھی جو رات بھر سونی پڑی
صبح ہوتے از سرِ نو پھر وہ محفل جم گئی
پھر وہی بزمِ تماشا اور وہی سامانِ عیش

پھر وہی عشرت وہی یاس اور وہی ارمانِ عیش
دل لیے جاتا ہے چھینے پھر تب ترسا کوئی
پھر طبیعت ڈھونڈھتی ہے صورتِ زیبا کوئی
فکرِ راحت، فکرِ صحت، فکرِ دُنیا فکرِ دیں
ایک دورے میں فلک اور ایک سختی میں زمیں
یوں ہوتے اور گزرتے رہتے ہیں صبح و شام
ایک دن آخر صدی ہوجاتی ہے پوری تمام
جس کو سب انجام کہتے ہیں وہ اک آغاز ہے
موت کہتے ہیں جسے وہ سربسر اک راز ہے

"خدنگ نظر" کے اجرا کا مقصد اردو زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کو جِلا دینا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں "خدنگِ نظر" اچانک بند ہوگیا اور پھر دوبارہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔

اُردو گلدستوں کے اجراء سے قبل اُردو شاعری کا سلسلہ دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور کلکتہ جیسے مرکزی شہروں تک محدود تھا۔ مگر گلدستوں نے شعر و سخن کو ملک گیر بنایا اور چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بہت سے شعر موزوں کرنے والے پیدا کیے۔ جب ہم گلدستوں کی ورق گردانی کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے معروف شعراء داغ دہلوی، امیر مینائی، اکبر الہ آبادی، جلال لکھنوی، ریاض خیرآبادی، نوح ناروی، تسلیم لکھنوی اور جلیل مانک پوری وغیرہ کی مقبولیت میں گلدستوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ ان گلدستوں نے نہ صرف شعراء کے کلام سے لوگوں کو روشناس کرایا بلکہ شعراء کو عوام میں متعارف بھی کرایا۔ مزید براں نوآموز اور معمولی شعراء کی حوصلہ افزائی بھی کی اور اہلِ ذوق سے روشناس بھی کرایا۔ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ گلدستوں کے توسط سے بہت سے گمنام شاعر و ادیب منظرِ عام پر آئے۔

گلدستوں نے شرحِ چندہ کے سلسلے میں درجے مقرر کیے تھے۔ پہلا درجہ والیانِ ملک کا، دوسرا درجہ تعلقداران اور رؤسا کا اور تیسرا درجہ عام لوگوں کا تھا۔ چنانچہ "پیامِ یار" عام لوگوں سے عہ سالانہ مع محصول ڈاک اور رؤسا و والیانِ ملک سے للعہ سالانہ مع محصول ڈاک مقرر کر رکھا تھا۔ اسی طرح "گلچیں" کی عام قیمت دو روپیہ تھی مگر رؤسا و امراء سے پانچ روپیہ اور والیانِ ملک سے دس روپیہ سالانہ چندہ لیا جاتا تھا۔ پیامِ یار اور گلچیں ہی پر موقوف نہیں بلکہ تمام گلدستوں میں شرحِ چندہ کی درجہ بندی ملتی ہے۔ یہ درجے اس لیے مقرر کیے گئے تھے کہ گلدستوں کی زندگی کا دار و مدار بڑی حد تک چندے پر تھا اور عام آدمی کے لیے گلدستے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

لکھنؤ کے گلدستوں کا مزاج تقریباً یکساں تھا۔ عام طور سے ہر گلدستے کے دو حصے ہوتے تھے۔ ایک نظم اور دوسرا نثر کا۔ اس کے علاوہ گلدستوں کے اصول و ضوابط اور اغراض و مقاصد میں بھی بڑی حد تک یکسانیت ملتی ہے۔ شعراء تقریباً وہی ہیں جو ہر گلدستے میں شائع ہوتے تھے۔ مثلاً داغ دہلوی، امیر مینائی، جلال لکھنوی، اکبر الہ آبادی، ریاض خیرآبادی، جلیل مانک پوری، تسلیم لکھنوی، اسیر لکھنوی، یاس لکھنوی، ہنر غازی پوری، فصاحت لکھنوی، وسیم خیرآبادی اور مضطر خیرآبادی وغیرہ۔ گلدستوں کے سائز اور ضخامت میں بھی کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا ہے۔ ان کا سرورق عام طور سے پھول پتیوں سے مزین ہوتا تھا۔ اردو گلدستوں کا نام اُردو کے علاوہ انگریزی کے بڑے حروف میں بھی لکھا جاتا تھا۔

گلدستوں کے اصول و ضوابط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شاعروں کو گلدستوں میں اپنا کلام چھپوانے پر معاوضہ ملنا تو درکنار خود اپنے پاس سے رقم ادا کرنا پڑتی تھی۔ "پیامِ یار" "انتخاب" اور "خدنگ نظر" میں غیر طرحی کلام شائع کرنے کے لیے دو آنہ فی شعر اُجرت لی جاتی تھی۔ اسی طرح تمام گلدستوں میں شعر کی اشاعت کے لیے اُجرت مقرر تھی۔

لکھنؤ کے اردو گلدستوں کی روایت میں انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اسی دہائی میں گلدستوں کی تعداد اشاعت میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔

(باقی ص ۴۴ پر)

غزلیں

شاہجہاں بانو یاد دہلوی
گولا گنج، لکھنؤ

عقل و دل کو ملا جلا رکھیے
ضابطے میں بھی رابطہ رکھیے

دوسرا شہر دوسرے ساتھی
دل بھی سینے میں دوسرا رکھیے

بند کر لیجے سب در آنکھوں کے
ذہن اپنا مگر کھلا رکھیے

اتنے پتھر نہ پھینکیے صاحب
واپسی کا تو راستہ رکھیے

کچھ بھی جینے کی آرزو ہو اگر
جان دینے کا حوصلہ رکھیے

دن سدا ایک سے نہیں رہتے
رات آئے گی کچھ بچا رکھیے

دشمنوں کا حال دل میں ہے
دوستوں کا حساب کیا رکھیے

جو ہمارے ہوئے نہ اپنے یاد
ایسے لوگوں کو یاد کیا رکھیے

شمس فرخ آبادی
محمود نگر، بکولہ گنج، لکھنؤ

آغازِ غزل نامِ زلیخا سے کیا جائے
مقطعے میں تخلص کسی یوسف کا دیا جائے

بہتر غمِ ہستی سے کہ اک غم ہی دیا جائے
ایفا نہ کیا جائے تو وعدہ نہ کیا جائے

آؤ تمہیں سرشاریِ رندانہ سکھا دیں
یہ نشہ فقط دیکھ کے آنکھوں سے پیا جائے

خم ہو سرِ تسلیم وہاں جاں کی اماں کو
ابرو کے اشارے سے جہاں کام لیا جائے

تھم جائے جو کچھ دیر تماشائے جنوں تو
دامن بھی سیا جائے گریباں بھی سیا جائے

پھر حشر میں دنیا کی سزائیں بھی گنا نا
جب شمس تجھے عشق کا الزام دیا جائے

نجمہ عزیز مرادآبادی
قادیان اسٹریٹ، رسولی کرتپور
بجنور

بربادیوں پہ شاد ہوں یہ سب کمال اس کا ہے
نادم ہے وہ نہ جانے کیوں، ذاتی سوال اس کا ہے

بدنام ہوں جگہ جگہ، نہیں مری کوئی خطا
ہوں مطمئن کہ اس طرح رتبہ بحال اس کا ہے

ہر اک چمن دھواں دھواں، بہار کا سماں کہاں
ہر ایک سمت دور تک قہر و جلال اس کا ہے

رعنائیاں، ملاحتیں، یہ رونقیں، حلاوتیں
نظر نظر یہ جنتیں، حسن و جمال اس کا ہے

ذکرِ جفا پہ دم بخود، حالت کی اپنے شدھ نہ بدھ
ایسے میں بھی مگر مجھے ہے تو خیال اس کا ہے

سوغات درد کی لیے پھرتے ہیں ہم لٹے لٹے
سنتے ہیں نجمہ آج کل ایسا ہی حال اس کا ہے

ظفر محمود
۱۳۹۔ مرزا واڑی
اجین - ۴۵۶۰۰۶

قدیم ہندستانی حالات کا چشم دید گواہ
عبقری سیاح ابوریحان البیرونی

آج سے تقریباً ایک ہزار اٹھارہ سال قبل یعنی ۹۷۳ء میں وسط ایشیا کے علاقے "خیوا" میں جسے اب ہم "خوارزم" کے نام سے جانتے ہیں، ایک ایسے بچے نے جنم لیا تھا جس کے والدین اسے عالم طفلی میں ہی بے یار و مددگار چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اس یتیم بچے کی پرورش ایک ہمدرد و غریب سائس نے اپنے گھوڑے کے اصطبل میں کی جہاں وہ خود بھی رہتا تھا۔ اس اصطبل کے قریب علم ریاضی اور ہیئت کے ایک نامور استاد رہتے تھے جن کے پاس امیروں کے بچے علم ریاضی پڑھنے آتے تھے۔ ایک دن ایک رئیس زادے کو ایک سوال سمجھا کر جب اس سے حل کرنے کو کہا تو شاگرد نے غلط جواب دے دیا۔ وہاں دور کھڑا ہوا وہ بچہ بھی سوال سن چکا تھا اور اس کے حل کرنے کا طریقہ بھی اس کی سمجھ میں آ چکا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اس کا صحیح حل زبانی بتا دیا اور اس کے ساتھ ہی طریقے کی وضاحت بھی کر دی۔ جسے سن کر استاد حیرت میں پڑ گئے۔ انھوں نے جب غور سے بچے کی بات سننے کے لیے اس کی طرف دیکھا تو انھیں اس کی آنکھوں میں اس ذہانت کی چمک بھی نظر آ گئی جس سے علم و فن کی راہیں منور ہو سکتی تھیں۔ استاد نے بچے کے حالات معلوم کر کے اپنے پاس رکھ لیا، اور ابوریحان نام رکھا۔ اب اس کی تعلیم و تربیت قرینے سے اس مشفق استاد کی نگرانی میں ہونے لگی۔ ابوریحان نے مروجہ درسی کتب نہ صرف پوری توجہ و انہماک سے پڑھیں بلکہ اپنی خداداد صلاحیت کے ساتھ غور و فکر کے علاوہ تجربات بھی کرتا ہوا آگے بڑھا بہت جلد ہی اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس کی علمی قابلیت کا شہرہ حکومت تک پہونچا تو بادشاہ نے اس کی قدر دانی کی اور اسے منصب وزارت سے نوازا۔ بادشاہ اس سے اتنا خوش اور متاثر ہوا کہ اس نے اپنی اکلوتی بیٹی سے اس کی شادی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور طریقہ حکمرانی سکھانے شروع کیے۔

ابوریحان بہت رحم دل انسان تھا۔ بادشاہ نے اس کے اس جذبے کو ختم کرنے کے لیے ایک باغی کے دو بچوں کو شاہراہ عام پر قتل کرنے کے فیصلہ کا ابوریحان سے دربار خاص میں اعلان کرنے کو کہا۔ مگر جب ابوریحان فیصلہ سنانے لگا تو اس نے ان معصوم بچوں کی طرف دیکھتے ہی شاہی فرمان کے آخری حصے میں بچوں کو رہا کرنے کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری اور اس نے فوراً اس کو معزول کر کے شہر بدر کر دیا۔

ابوریحان وہاں سے چند کتابیں ساتھ لے کر نامعلوم منزل کی سمت جان بچا کر روانہ ہوا۔ تلاش معاش میں ملکوں ملکوں بھٹکتا ہوا وہ محمود غزنوی کے دربار تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب

ہوگیا۔ محمود غزنوی کی سرپرستی ملنے پر اس نے مختلف علوم پر اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات پر مبنی کتابیں لکھیں جن میں زمین کا گول ہونا ستاروں کی گردش سے زمین پر پڑنے والے اثرات، ان کی رفتار سے زمین کے فاصلے اور سمتیں، اس میں چھپی ہوئی معدنیات کا پتہ لگانے جیسے اہم موضوعات شامل رہے ہیں۔ غزنوی کے دربار میں ابوریحان کو "البیرونی" کے نام سے جاتا تھا۔

محمود غزنوی کے ساتھ "البیرونی" ہندستان بھی آیا۔ یہاں اس کے قیام کا زمانہ تیرہ سے چالیس سال تک بتایا جاتا ہے۔ ہندستان کے حالات جاننے کے لیے البیرونی نے پورے ملک کا سفر کیا۔ یہاں کی زبان سنسکرت سیکھی۔ اس کو یہاں کافی دشواریوں کا سامنا رہا۔ اس زمانے میں یہاں کے لوگ بہت زیادہ خود پسند تھے اس دور کا ادب بھی وہ اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے اور دوسروں کو سنانے سے بھی گریز کرتے تھے۔ ابوریحان البیرونی نے نہایت صبر و استقامت سے کمال انکساری کے ساتھ ہندستان کے عالموں کے دل میں جگہ بنا کر یہاں کے لوگوں کے مذہب کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ اس نے لکھا ہے کہ:

"ہندوؤں کا خدا کے بارے میں خیال ہے کہ وہ واحد ہے، ابدی ہے نہ تو اس کا آغاز ہے اور نہ اختتام ہوگا۔ وہ قادرِ مطلق ہے اور عالم الغیب ہے تمام کائنات کا خالق ہے اور پرورش کرنے والا ہے۔"

البیرونی نے ہندوؤں کے مذہب اور ان کی رسومات کا بھی گہرا مشاہدہ کیا۔ یہاں کے سماجی حالات، ذات پات کے نظام ان کے رہن سہن اور طبقاتی روابط کا جائزہ لیا۔ علم نجوم، جیوتش، طب اور سائنس کا مطالعہ کیا۔ یہاں کی زمین، ستاروں کی گردش، ان کے حجم کے علاوہ سورج اور چاند گرہن، نجوم میں کام آنے والے آلات۔ عرض البلد اور طول البلد کو پوری توجہ سے سمجھا اور ان تمام امور پر اپنی کتاب میں واضح طور پر لکھا بھی ہے۔ اس نے جو کچھ معلومات حاصل کیں اس پر اپنے مشاہدے کے ساتھ جو کچھ لکھا ہے وہ سب کچھ دورِ جدید کی سائنس کے معیار پر بھی کھرا اترتا ہے۔

البیرونی نے ایک ہزار سال سے زیادہ قدیم حالات پر بہت معلوماتی اور دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ کچھ قصے کہانیاں بھی یہاں کی سنائی ہیں۔ علم کیمیا کی ترقی کا ایک قصہ وسط ہند کے تاریخی شہر دھار کا بھی بیان کیا ہے جو بے حد دلچسپ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"راجہ دھار کے دربار میں ایک قد آدم چاندی کا مجسمہ رکھا ہوا تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ ایک ماہر علم کیمیا (سائنس داں) راجہ کے دربار میں آیا اور اس نے راجہ سے کہا کہ میں نے انسان کو لافانی بنا دینے کا فن حاصل کر لیا ہے اور آپ کو لافانی بنا سکتا ہوں راجہ کو اس نے بتایا کہ میں نے کچھ سفوف تیار کیے ہیں اگر آپ حکم دیں تو میں ان کے ذریعہ آپ کو امر بنا دوں۔ راجہ رضامند ہوگیا۔ تب اس ماہر کیمیا نے ایک بڑا کڑھاؤ تیل کا گرم کرایا اور راجہ کو اس میں کودنے کو کہا۔ کھولتے ہوئے تیل میں کودنے پر راجہ بھلا کب تیار ہو سکتا تھا۔ وہ جز بز ہوا۔ سائنس داں نے ناچار اس تجربے کو دکھانے کے لیے خود کو اس کے لئے پیش کر دیا۔ اور وہ سفوف جو یکے بعد دیگرے اس اُبلتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈالنے تھے، راجہ کو ترکیب سمجھا کر حوالے کر دیئے اور خود اس کھولتے ہوئے تیل میں کود گیا۔ راجہ نے اس کے بتائے ہوئے طریقے پر سفوف ڈالنے شروع کر دیئے۔ ہر مرتبہ اس اُبلتے ہوئے تیل میں وہ سائنس داں ہیئت بدلنے لگا۔ جب آخری سفوف رہ گیا تب راجہ کے دل میں خیال آیا کہ اگر واقعی یہ شخص حیاتِ ابدی حاصل کر لے گا تو میری حکومت پر بھی اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے آخری سفوف نہ ڈالا، اور جب تیل ٹھنڈا ہوا تو اس ماہر کیمیا سائنسداں کا یہ چاندی کا مجسمہ اس کڑھاؤ میں پڑا ہوا تھا۔"

اس زمانے کی اسی طرح کی اور بھی کہانیاں البیرونی نے اپنے تاریخی سفرنامے "کتاب الہند" میں بیان کی ہیں۔ اس نے ہمارے ملک کی تہذیب،

(باقی صـ۳۹ پر)

غزلیں

انور جلال پوری

جلال پور فیض آباد

میں ہر بے جان حرف و لفظ کو گویا بناتا ہوں
کہ اپنے فن سے پتھر کو بھی آئینہ بناتا ہوں

مری فطرت کسی کا بھی تعاون لے نہیں سکتی
عمارت اپنے غم خانے کی میں تنہا بناتا ہوں

نہ جانے کیوں ادھوری ہی مجھے تصویر جچتی ہے
میں کاغذ ہاتھ میں لیکر فقط چہرہ بناتا ہوں

مری خواہش کا کوئی گھر خدا معلوم کب ہوگا
ابھی تو ذہن کے پردے پہ بس نقشہ بناتا ہوں

میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں سدا اخلاق کا پارس
اسی پتھر سے مٹی چھو کے میں سونا بناتا ہوں

کمال جائسی

کرنیل گنج ...ان پور

خبر یہ عام ہے استاد نکتہ دانوں میں
غزل کرائے کی ملتی ہے کارخانوں میں

حسد کی آگ میں جن کی زبان جھلسی ہے
انھیں بھی ناز ہے ہم بھی ہیں خوش بیانوں میں

جو اپنے شانے پہ سر دوسروں کا رکھتے ہیں
انھیں کا نام نہ آئے گا داستانوں میں

لہو سے شعروں کی تخلیق کر رہے ہیں ابھی
ہمارا نام ملے گا کئی زمانوں میں

ٹھہر گیا تھا میں اک اجنبی نگر میں کمال
حسین چہرے ملے مجھ کو میزبانوں میں

حق کانپوری

۱۳۱/۱۷ بیگم پوروہ
کانپور

دیکھ کر ان کے التفات کے رخ
ہم بدلتے رہے حیات کے رخ

زندگی آ گئی ہے ایسی جگہ
دیکھتے رہ گئے حادثات کے رخ

گردشِ وقت ہوش میں آ جا
اور ہیں کچھ مری حیات کے رخ

عمر بھر رہ کے ان کی محفل میں
ہم نہ سمجھے تکلّفات کے رخ

آپ حالات دیکھ کر اے حق
موڑیئے اب تو خواہشات کے رخ

ش۔ م۔ راجندر
۶۸۔ چترو ہار
دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

افسانہ

یادوں کا بیوپاری

شیخ جمال الدین کی بازار ستاراں میں زردوزی اور اس سے متعلقہ سامان کی سب سے بڑی دکان تھی۔ ان کے یہاں ہر قسم کے پارچے پر سنہری یا سفید گوٹے، زردوزی اور بیل بوٹے کاڑھنے کا کام ہوتا تھا اور دکان پر ہر وقت بڑی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ان کی دکان کی ایک خصوصیت ایمان داری اور واجب دام تھے اور بازار کا بھاؤ ان کی دکان سے مقرر ہوتا تھا۔ شیخ جمال الدین خود اعلا پائے کے ہنرمند تھے اور اپنے ہاتھ سے بھی کڑھائی وغیرہ کرتے تھے اگرچہ ان کی دکان میں آٹھ دس کاریگر ملازم تھے۔ یہ فن شیخ جمال الدین کو ورثے میں اپنے والد سے ملا تھا۔

شیخ جمال الدین اپنے والد مرحوم کی طرح نہایت شریف النفس آدمی تھے اور شرافت، حلیمی اور بردباری ان کی گھٹی میں تھی۔ عمر صرف پینتیس سال کی تھی مگر دکان اور کاروبار کی سب ذمہ داریوں کو والد کی وفات کے بعد بخوبی سنبھال لیا تھا۔ سرخ و سفید چہرہ، درمیانہ قد گول فربہ جسم اور پان خوردہ مسکراتے لب۔ سر پر بال بہت ہی کم تھے اس لیے چہرہ زیادہ گول اور معصوم نظر آتا تھا۔ گاہکوں سے بہت ہی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور بھیڑ کے باوجود جب تک لوگ چاہتے، وہ انھیں نئے نئے ڈیزائن دکھلاتے رہتے اور ساتھ ساتھ اپنی صلاح بھی دیتے رہتے۔ کئی دفعہ گاہک ایک ایک گھنٹہ دیکھنے میں لگا دیتے اور بغیر کچھ خریدے یا کام دیے لوٹ جاتے۔ مگر شیخ جمال الدین کے ماتھے پر شکن بھی نہ پڑتی اور وہ حسب معمول مسکرا کر کہتے "کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ کی اپنی دکان ہے۔ پھر بھی تشریف لائیے۔"

ایک روز میں ایک دوست کے ہمراہ ان کی دکان پر گیا تو وہاں ایک سکھ کاریگر کو دیکھ کر حیران ہوا۔ جب میرے دوست سامان خرید چکے تو میں نے اس کا ذکر ان سے بھی کر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ شیخ جمال الدین کی دکان میں اس قسم کی تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔ اس سکھ کے علاوہ دو بہت پرانے ہندو کاریگر بھی ہیں۔ یہی روش ان کے والد اور ان سے پہلے ان کے دادا کی تھی۔

شیخ جمال الدین کا ایک شوق یہ بھی تھا کہ وہ اپنے فن کے نمونوں کو چھوٹے چھوٹے پارچوں پر کاڑھ کر ان ٹکڑوں کو اپنے دوستوں عزیزوں اور مستقل گاہکوں کو تحفے کے طور پر پیش کرتے رہتے تھے۔ ان پارچہ جات پر مکمل کام وہ خود کرتے تھے اور انھیں اپنے پاس ہی ایک لکڑی کے صندوق میں رکھتے جاتے تھے کسی کو کوئی پارچہ پیش کرنا ہوتا تو اس میں سے نکال کر دے دیتے تھے۔ گاہک ان کے اس حسنِ سلوک سے اور بھی متاثر ہوتا۔ یہ پارچہ جات دیوار کے لیے عمدہ سجاوٹ کے ٹکڑے بھی تھے۔

شیخ جمال الدین اگرچہ دکان کے واحد مالک تھے مگر اس کی تمام آمدنی پر وہ صرف اپنا ہی حق نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی دکان کے ہر ملازم کو بڑی معقول تنخواہ ملتی تھی اور سال کے آخر میں بھی وہ اس کی تنخواہ کے مطابق دکان کے حقیقی منافع کا ایک حصہ بھی دیتے تھے اپنے والد کی وفات کے بعد انھوں نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ وہ دکان کے منافع میں سے صرف اتنے ہی روپئے لیں گے جو ان کے گھر چلانے

اور دکان کے لیے سامان خریدنے اور ملازمین کو تنخواہیں وغیرہ دینے کے لیے ضروری ہوں گے اور باقی رقم سماج کی فلاح اور بہبود کے کاموں میں خرچ کریں گے۔ ان کا سماج کا بڑا صحیح تصور تھا اور اس میں کسی قسم کے تعصب اور تفرقے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ ان دو برسوں میں سماجی بہتری کے جن کاموں کے لیے انھوں نے روپیہ خرچ کیا تھا وہ ایسے تھے کہ سب ہی کو پسند آئے اور لوگ پیار سے انھیں جمال بھائی کہنے لگے۔ ان میں سے ایک کام غریب اور ہوشیار لڑکوں کو ان کی تعلیم کے لیے بلا تفریق مذہب و ملت ماہانہ وظیفے دینا تھا۔

شیخ جمال الدین کی دکان پر اگرچہ میں ایک دو مرتبہ کسی کے ہمراہ جا چکا تھا مگر خود ان کے یہاں سے کوئی چیز خریدنے یا کام کروانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ عموماً یہ خریداری بیوی اکیلی ضرورت اور موقع کے مطابق کرلیتی تھی۔ مگر ایک روز میری بیوی کو اپنی چھوٹی بہن کے لئے ان کی دکان سے کافی سامان خریدنا تھا اور چونکہ اس روز میری چھٹی بھی تھی۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اگرچہ شادیوں کا موسم تھا اور دکان پر غیر معمولی بھیڑ تھی۔ شیخ جمال الدین نے مجھے دیکھ کر اشارے سے اپنے پاس بلا لیا اور خود ہمیں سارے ڈیزائن اور تیار شدہ اسٹاک دکھائے اور انھیں پسند کرنے میں ہماری رہنمائی کی۔ اگرچہ میں آج ان کی دکان پر ایک گاہک کی حیثیت سے گیا تھا مگر بات چیت کے دوران انھیں کچھ قریب سے دیکھنے اور ان کی شخصیت میں جھانکنے کا موقع ملا ایک مخلص انسان کے طور پر انھوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ مجھے یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ ایک با اصول بیوپاری تھے اور ان کی دکان پر گاہک کے ساتھ کسی قسم کا دھوکا نہیں ہوتا تھا،

پھر ایک ایسی بات ہوئی کہ میں ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو گیا میں ہملٹن روڈ پر ایک بڑی فرم میں کسی سے ملنے گیا تھا اس فرم کا دفتر دوسری منزل پر تھا اور اس بلڈنگ میں لفٹ نہیں تھی سیڑھیوں پر میں نے ایک نوجوان کو نیچے اترتے دیکھا۔ وہ اپاہج تھا اور اپنی بیساکھیوں کو کچھ سنبھال کر اور کچھ استعمال کر کے بڑی مشکل سے اتر رہا تھا اور شاید اس سے بھی زیادہ مشکل سے اوپر چڑھا ہوگا۔ میں نے اوپر جانے کے بجائے پہلے اسے سہارا دے کر سیڑھیوں سے اترنے میں مدد دی۔ نیچے پہونچ کر میں نے اس سے اس کے بارے میں کچھ سوال کر ڈالے۔ اس کا نام سیوارام تھا اور وہ ایک میٹرک پاس لڑکا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے ریل کے ایک حادثے میں کٹ گئی تھیں۔ اس کا باپ نہیں تھا اور اس کے کندھوں پر اس کی بیوہ ماں اور نوجوان بہن کا بوجھ تھا۔ وہ غازی آباد کے پاس ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور پچھلے ایک سال سے ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر کہیں بھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جس دفتر میں جاتا اپنی معذوری کے سبب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ وہ کوئی دستکاری اور کام سیکھنے کے لیے بھی تیار تھا بشرطیکہ کام سیکھنے کے دوران اسے کچھ پیسے دیئے جائیں تاکہ اس کا تھوڑا بہت گزارہ ہو سکے۔ میں نے اس نوجوان کا پتہ نوٹ کرلیا اور اپنا پتہ اسے دے دیا۔ اور اسے کبھی گھر پر آکر ملنے کو کہا۔
وہ مجھ سے گھر پر کئی دفعہ آکر ملا۔ مگر باوجود کوشش کے میں اس کے لیے کچھ نہیں کرسکا تھا۔

میرے ایک دوست پروفیسر رام سنگھ کی لڑکی کی شادی تھی اور انھیں شیخ جمال الدین کی دکان سے بہت سامان خریدنا تھا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی تھی۔ پروفیسر صاحب شیخ جمال الدین کے پرانے گاہک بھی تھے اور دکان کا ہر آدمی انھیں جانتا تھا۔ جب ہم سامان خرید چکے اور چلنے لگے تو شیخ صاحب نے اپنے لکڑی کے صندوق میں سے دو خوش نما مزین پارچہ جات نکالے' جن پر بہت ہی عمدہ کام بنا ہوا تھا اور ایک پروفیسر صاحب کی طرف اور ایک میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔
"میں نے ان دونوں پر خود کام بنایا ہے۔ آج آپ دونوں اکٹھے میری دکان پر آئے تو مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ میری طرف سے یہ حقیر تحفہ قبول فرمایئے۔"

پروفیسر رام سنگھ بولے:
"آپ کا شکریہ۔ مگر یہ قیمتی پارچہ جات معلوم ہوتے ہیں اور مجھے لینے میں صرف اس لیے ہچکچاہٹ ہو رہی ہے کیونکہ آپ گاہکوں سے بہت کم منافع لیتے ہیں اور شاید ہمارا ان پر کوئی حق نہیں ہوتا۔"

شیخ جمال الدین مسکرا کر بولے ۔

" میں یہ تحفے منافع میں ہی سے تقسیم کرتا ہوں ۔ آپ کا ان پر پورا حق ہے کیونکہ آپ بھی اس دکان کے گاہک ہیں ۔ پھر ان پارچوں میں میرا فن مضمر ہے ۔ میں تو یادیں بانٹنا چاہتا ہوں ۔ اس دنیا میں ہم شیریں یادوں کے سوا اور کیا چھوڑ سکتے ہیں ۔"

شیخ جمال الدین کے اس فقرے نے میرے دل کو چھو لیا اور دفعتاً مجھے سیوا رام یاد آ گیا ۔ میں نے کہا ۔

" آپ صحیح فرما رہے ہیں ۔ واقعی شیریں یادیں اور نیک کام ہی وہ اثاثہ ہیں جو ہم پیچھے چھوڑ سکتے ہیں ۔ میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ۔"

" فرمایئے ۔" انھوں نے مسکرا کر پوچھا ۔

" کیا آپ اپنا فن یا یہ کام ایک اپاہج نوجوان کو سکھا کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دے سکتے ہیں ۔؟ اس کا نام سیوا رام ہے اور وہ میٹرک پاس ہے مگر بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہے ۔ اس کے کندھوں پر بیوہ ماں اور نوجوان بہن کا بوجھ ہے اگر کام سیکھنے کے دوران بھی آپ اسے کچھ تنخواہ دے سکیں تو وہ احسان مند رہے گا ۔"

شیخ جمال الدین اسے کام سکھانے اور ملازم رکھنے پر فوراً رضا مند ہو گئے اور دکان کا کارڈ دیتے ہوئے مجھ سے بولے :

" آپ اس کارڈ کی پشت پر اپنا نام لکھ کر جب چاہیں سیوا رام کو میرے پاس بھیج دیں ۔ میں اسے فوراً رکھ لوں گا اور چند دنوں میں ہی میں ان سب کے رہنے کا انتظام بھی دکان کے پاس ہی کر دوں گا ۔ وہ اگر محنت اور دیانت داری سے کام کرے گا تو انشاءاللہ پیسے کا محتاج تو نہیں رہے گا ۔ خدا بڑا رحیم اور کارساز ہے ۔"

سیوا رام کے دیئے ہوئے پتے پر آدمی بھیج کر میں نے سیوا رام کو بلوا لیا اور وہ دکان کا کارڈ مجھ سے لے کر شیخ جمال الدین کی دکان پر پہونچ گیا اور اسی شام کو مجھے آ کر بتایا کہ اسے دکان پر رکھ لیا گیا تھا اور صرف تین مہینے یعنی کام سیکھنے کے دوران اسے تین سو روپے ملیں گے اور تین مہینے کے بعد تنخواہ چھ سو روپے ماہوار ہو جائے گی جو بعد میں اور بھی بڑھ سکتی تھی ۔ میں نے اسی وقت شیخ جمال الدین کے نام شکریے اور احسان مندی کا ایک رقعہ لکھ کر سیوا رام کو دے دیا کہ انھیں دے دینا ۔

کوئی دو مہینے بعد سیوا رام پھر میرے پاس آیا ۔ وہ صاف اجلے کپڑوں میں ملبوس تھا اور اس کے چہرے پر رونق اور خود اعتمادی کی جھلک تھی ۔ وہ میرے سامنے بڑے عجز اور انکسار کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا ۔ میں نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھایا تو وہ بولا ۔

" بابوجی ! میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں چکا سکتا ۔ آپ نے تو میری زندگی بنا دی ۔ شیخ صاحب نے دکان کے پاس ہی گلی میں سو روپے مہینے کرایے کا ایک مکان بھی دلوا دیا اور جب تک میری پوری تنخواہ نہیں ہو جاتی ، اس کا کرایہ بھی وہی دیں گے ۔ وہ فرشتہ ہیں فرشتہ ۔ میں بھی دل و جان سے محنت کر رہا ہوں ۔"

میں نے سیوا رام کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔

" سیوا رام ! میں نے تیرے لیے کچھ نہیں کیا ۔ وہ اوپر والا ہی کارساز ہے اور وہی وسیلے پیدا کر دیتا ہے ۔ اسی کا شکر ادا کر ۔"

سیوا رام کچھ سمجھا ، کچھ نہیں سمجھا ۔ مگر وہ جب تک بیٹھا رہا ، میری نظروں کے سامنے شیخ جمال الدین کا گول ، زرد چہرہ گھومتا رہا ۔ وہ ایک کامیاب اور دیانت دار بیوپاری تو تھے ہی مگر ایک رحم دل انسان بھی تھے اور یقیناً خدا ترس تھے ۔

شیخ جمال الدین جیسے انسانوں سے ہی اس اندھیری دنیا میں روشنی تھی ۔!!

□□

افسانہ

قائد حسین کوثر
۸۸/۴۹۰ چمن گنج، کانپور

رشی

ڈاکٹر محمد شعیب اگو (کھیئوں) کی نذر

وہ اس آبادی میں کب آیا تھا کسی کو صحیح طور پر کچھ پتہ نہ تھا اس کے نام سے کوئی بھی واقف نہ تھا، البتہ اس کا لباس اس کے نام کا متبادل بن چکا تھا۔ اس کے میلے کچیلے کپڑوں اور بدن سے پھوٹنے والی بدبو اس کی شخصیت کا جزو بن چکی تھی۔ اب اس کی واحد پہچان یہی تھی۔ سر اور داڑھی کے بے ترتیب بالوں کے درمیان چھپا چہرہ کبھی ضرور جاذب نظر رہا ہوگا مگر اب تو اس کی کنپٹی اور گردن پر میل کی موٹی موٹی تہیں جم چکی تھیں۔

ویسے، سب بستی والے اپنے بزرگوں سے یہ سنتے آئے تھے کہ جب پہلے پہل وہ یہاں آیا تھا تو اس کے جسم پر بے داغ سفید کپڑے موجود تھے۔ وہ بہت صاف ستھرا اور کلین شیو تھا مگر آتے جاتے موسموں کے ساتھ اس کا لباس اور وہ خود میلا ہوتا چلا گیا۔ دھیرے دھیرے اس کے جسم اور لباس پر میل کی پرتیں جمنا شروع ہو گئیں اور پھر اس کے پاس آنے والوں کو ایک ناگوار سی باس کا احساس ہونے لگا۔ لوگوں نے متعدد بار اس سے غسل کرنے اور لباس تبدیل کرنے کی عاجزانہ درخواست بھی کی مگر ایسی ہر درخواست کو وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ٹالتا رہا۔ تنگ آکر لوگوں نے اس سے ایسی باتیں کرنا چھوڑ دیں اور اس کے میلے کچیلے کپڑوں اور ناگوار بدبو کے ساتھ اسے برداشت کرتے رہے وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ اس سے ملنا اور اس کے گندے لباس کو دیکھنا ان کی مجبوری تھی۔

لاکھ کوششوں کے باوجود کوئی یہ نہیں جان سکا کہ آخر اس کی ضروریات کیا ہیں اور انھیں کون پوری کرتا ہے۔ دوسروں کی ضرورتوں کے بارے میں از خود معلوم کرنے کے لیے وہ کن ذرائع کا استعمال کرتا ہے اور کیونکر رات کے اندھیرے میں ضرورت مندوں کے دروازوں پر دستک دے کر ان کی پریشانیاں دور کر دیتا ہے عرصۂ دراز تک لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کی چہ می گوئیاں کرتے رہے۔ کچھ سرپھروں نے اپنی راتیں خراب کر کے خاموشی سے اس کا تعاقب بھی کیا مگر ساری تگ و دو فضول ثابت ہوئی۔

آخرکار ــــــ ایک وقت ایسا بھی آیا جب بستی والوں نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا کہ وہ کہاں سے آیا تھا، اس کا ماضی کیا ہے اس کا کبھی کوئی اصلی یا نقلی نام بھی رہا ہے۔ ان سب کی ضروریات کی خبر اسے کس طرح ہو جاتی ہے اور کن ذرائع سے وہ سب کچھ فراہم کر دیتا ہے جس کی انھیں حاجت ہوتی ہے۔ ان سب کے نزدیک ایسے سوالات اب بے معنی ہو چکے تھے اور ان کا جواب اس کا میلا کچیلا لباس اور وہ بدبو تھی جو اس کی شخصیت کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔

اسی طرح موسم تبدیل ہوتے گئے اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب بستی والوں نے اپنے میلے کچیلے، بدبودار محسن کے سلوک اور اپنے رویوں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ بستی کے باشندے ایک دوسرے سے یہ پوچھنے لگے کہ آخر اپنے محسن کے سلوک کے عوض

ہم سب نے اب تک اس کے ساتھ کیا کیا۔ ؟ وہ ہم سب کا کرم فرما ہے لہٰذا ہم سب کا یہ اخلاقی اور سماجی فرض بنتا ہے کہ ہم بھی اس کے ساتھ کوئی بہتر سلوک کریں ورنہ بستی والے بے ضمیر کہلائیں گے۔

چنانچہ ــــ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے بستی والوں نے ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا جس کی صدارت بستی کے سب سے معمر اور ذی حیثیت شخص کو سونپی گئی۔ مختلف الخیال مقررین اور عمائدین نے بہ یک زبان اس کی مہربانیوں اور کرم فرمائیوں کے گن گائے۔ اور بعض بہت بڑے بڑے ناموں نے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کہ انھیں قعر مذلت سے نکالنے اور موجودہ منصب تک پہونچانے والا وہی ہے ــــ لہٰذا ہم سب کو اس کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرنے میں اب ایک پل کی بھی دیر نہیں کرنا چاہیے۔

جلسہ میں متعدد تجاویز پیش کی گئیں جن پر تفصیلی مباحثہ بھی ہوا اور بالآخر ایک ایک کر کے وہ سب تجویزیں مسترد ہوتی گئیں مگر ایک تجویز ایسی بھی آئی جس پر سب لوگ متفق ہو گئے۔ تجویز میں کہا گیا تھا کہ ہم سب اس کے ساتھ بہترین سلوک یہی کر سکتے ہیں کہ اسے نہلا دھلا کر، عطریات مل کر صاف ستھرے کپڑے پہنا دیں تاکہ اسے چیکٹ ملبوس اور غلیظ بدبو سے نجات مل سکے۔

بات چوں کہ بے حد معقول اور دل کو چھو لینے والی تھی لہٰذا جلسہ گاہ کے ہر گوشے سے "اتفاق ہے۔ اتفاق ہے"۔ کی صدائیں بلند ہونے لگیں مگر معاملہ یہاں آکر الجھ گیا کہ اسے کس رنگ کا ملبوس پہنایا جائے۔ مختلف رنگوں کے طرفداروں نے اپنی اپنی پسند کے رنگ کے حق میں اور دوسروں کے تجویز کردہ مگر اپنے لیے ناپسندیدہ رنگ کی مخالفت میں زوردار دلیلیں دیں اور جلسہ دیکھتے ہی دیکھتے گرماگرمی کا شکار ہو گیا۔ اسی درمیان کچھ مصلحت پسندوں نے تمام رنگوں پر مشتمل ایک رنگدار ملبوس تیار کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہو گیا کہ کون سا رنگ ملبوس کے اوپری حصہ میں رہے گا اور کون سا نچلے حصے میں۔ اس شورش کے دوران صدر جلسہ کو یہ احساس ستانے لگا کہ ان کا یہ بامقصد اور عظیم اجتماع افراتفری کا شکار ہو جائے گا اور آپسی چپقلش ایک نیک مقصد کو لے ڈوبے گی۔ لوگ دھیرے دھیرے جلسہ گاہ سے کھسکنے لگے تب ہی صدر محترم نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ سب لوگ اپنی اپنی ضد چھوڑ دیں اور اس کے لیے بے داغ سفید ملبوس تیار کرنے پر اتفاق کر لیں کیوں کہ وہ سب اپنے بزرگوں سے یہ سنتے آئے ہیں کہ جب وہ پہلی مرتبہ ہمارے درمیان آیا تھا تو اس کے جسم پر ویسا ہی ملبوس تھا جو اب گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ نہایت چیکٹ اور بدبو کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ صدر محترم کی اس معقولیت پسندی کو ہر ایک نے بہ نظر تحسین دیکھتے ہوئے تائید میں ہاتھ اٹھا دیے۔

"مگر ....." صدر محترم نے رک رک کر کہا۔ "وہ .... آسانی کے ساتھ ..... غسل کرنے اور .... لباس تبدیل کرنے پر ...... راضی نہ ہوگا۔"

"پھر ــ ؟" بہت سی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

"ہم سب" صدر محترم نے پورے مجمع کی طرف ہاتھ اٹھایا ــ "زبردستی اسے دبوچ لیں گے اور جس طرح بھی ممکن ہو اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنا دیں گے۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔" بہت سی جوش بھری آوازیں پھر ابھریں۔

"حضرات!" صدر محترم کے لہجے میں خوشی جھلک رہی تھی ــ "آئندہ ہفتہ کی تعطیل کو ہم سب مل کر یہ کام انجام دیں گے تاکہ ہمارا نام تاریخ کے صفحات پر سنہری حروف میں درج ہو جائے۔"

مجمع خوشی سے تالیاں بجانے لگا ــ تب ہی صدر محترم نے دیکھا کہ ایک نوجوان جلسہ گاہ سے اٹھ کر ڈائس پر آگیا اور وحشت زدہ نظروں سے انھیں گھور رہا ہے۔

"کیوں صاحبزادے ــ ؟" صدر محترم نے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے پوچھا ــ "آپ بھی متفق ہیں ہم سب کی تجویز سے ؟"

"کیا آپ کی تجویز سے متفق ہونا ضروری ہے۔ ؟" اس کے لہجہ میں تیزی تھی۔

"آپ متفق ہو جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔" صدر جلسہ کے لہجہ میں زبردستی جھلک رہی تھی۔

"معاف کیجئے گا" نوجوان نے بُرا سا منہ بنایا۔ "میں آپ لوگوں کی تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتا"۔

"کیا اس نے تمہارے ساتھ کوئی سلوک ...."؟

"نہیں۔ وہ میرا بھی محسن ہے"۔

"تو پھر...؟" صدر محترم غصّے سے کانپنے لگے۔

"ہمیں بھی اس کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے"۔ نوجوان کے لہجے میں اطمینان تھا۔

"ہم سب نے اسی لیے فیصلہ کیا ہے ...."

"آپ کا فیصلہ مناسب نہیں ہے"۔

"تو کیا آپ بتا سکتے ہیں صاحبزادے"۔ صدر محترم نے لفظوں کو چبانا شروع کر دیا۔ "اس کے ساتھ۔ اس سے بہتر کوئی اور سلوک بھی ہو سکتا ہے"؟

"کیوں نہیں۔!"

"وہ کیا... اور... کیسے؟" صدر محترم کے لہجے میں طنز تھا۔

"وہ جس طرح جینا چاہتا ہے اُسے اسی طرح جینے دیں"۔ نوجوان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یعنی اسے غلاظت کی پوٹ بنا رہنے دیں"۔ صدر کو یکایک طیش آ گیا۔ "اس کے چیکٹ بدن پر منڈھے ہوئے کپڑے جوں کے توں موجود رہنے دیں۔ اس کے ملبوس سے پھوٹنے والی گندی بدبُو دور کرنے کی کوئی کوشش نہ کریں جو کچھ عرصے بعد ہمارے لیے ناقابل برداشت ہونے والی ہے"۔

"وثوق صد احترام بزرگ"۔ نوجوان نے سمجھانے کے انداز میں کہا "یہ بھی تو سوچیے کہ اس کے احسان اور سلوک کے عوض اس کا گندہ بدن، میلے کچیلے کپڑے اور ناگوار بساندہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ مناسب ہوگا کہ ہم اس سے ایک مخصوص فاصلہ رکھتے ہوئے ہی میل ملاپ بنائے رکھیں تو کیا حرج ہے؟ وہ کسی سے زبردستی مصافحہ یا معانقہ تو کرتا نہیں...."

لمحہ بھر کے لیے جلسہ گاہ میں سناٹا چھا گیا اور صدر محترم بھی لاجواب نظر آنے لگے۔

"آخر"... نوجوان نے بیان جاری رکھا۔ "آخر اس کے میلے کچیلے کپڑوں، چیکٹ بدن اور اس سے پھوٹنے والی بدبو سے ہمیں کیا نقصان پہونچتا ہے"۔

متوحش نوجوان کی دلیلوں نے سب کو لاجواب کر دیا تھا اور صدر محترم بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔

"تو پھر....؟" وہ چیخ پڑا۔ "ہم اس کی آزادی کیوں ہڑپ کرنا چاہتے ہیں؟ اس کی مرضی کے مطابق اسے جینے سے روکنے کا ہمیں کیا حق پہونچتا ہے؟"

"گویا ہم سب احمق اور گھامڑ ہیں۔؟" صدر محترم نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال ٹھونک دیا۔ "ہم سب کا متفقہ فیصلہ غلط ہے..؟"

"جی ہاں!!" نوجوان کے لہجہ میں تیزی برقرار تھی۔ "اگر اس کی آزادی ہماری آزادیوں میں مانع اور مخل نہیں ہے تو اسے اس کی تمامتر آزادیوں کے ساتھ زندہ رہنے دیجئے۔ یہی اس کے حق میں بہترین سلوک ہو سکتا ہے"۔

"آپ بقراط اعظم ہیں"۔ بزرگ صدر جلسہ نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ "آپ کی اکیلی رائے کے آگے ہم سب اپنا فیصلہ بدل دیں"؟

"نہیں نہیں"۔ مجمع سے مختلف آوازیں اُبھرنے لگیں۔

"یہ نہیں ہو سکتا"۔

"ہم اسے ضرور نہلائیں گے"۔

"اس کے بدن کا میل چھڑائیں گے"۔

"اس کو عطر لگائیں گے"۔

"اس کے بالوں کو شیمپو سے دھوئیں گے"۔

"اسے بے داغ نیا لباس پہنائیں گے"۔

"ہم احسان فراموش نہیں ہیں"۔

"ہم سب اس کے حسنِ سلوک کے قرض دار ہیں"۔

"ہم اپنے محسن کے ساتھ بہترین سلوک ضرور کریں گے"۔

وہ متوحش نوجوان یہ سب سنتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

" آپ مالک و مختار ہیں جو چاہے کیجیے۔ مگر میں آپ سب سے یہی درخواست کروں گا کہ اس غریب الدیار کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ ہو سکتا ہے کہ جسے آپ بہترین سلوک کا عنوان دے رہے ہیں وہ اس کے حق میں ظلم ثابت ہو۔"

" تمہارا دماغ چل گیا ہے"۔ بزرگ صدر جلسہ نے اپنے سر اور کانوں کے درمیان شہادت کی انگلی سے ہوا میں دائرہ بنایا۔ "بہت زیادہ پڑھ لکھ کر تم کسی کام کے نہیں رہ گئے ہو۔ جاؤ ـــــ اپنا علاج کراؤ۔"

٥

اور پھر ـــــــ

ہفتہ کی تعطیل کو علی الصبح بستی والوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

ان کے ہاتھوں میں اعلیٰ قسم کے جراثیم کش خوشبودار صابن، شیمپو کی بوتلیں، عطر کی شیشیاں اور تولیے تھے۔ بزرگ صدر محترم فاتحانہ شان کے ساتھ ہینگر میں پریس کیا ہوا سفید بے داغ نیا سوٹ لیے کھڑے تھے اور دفور خوشی سے ان کے دانت نکلے پڑ رہے تھے اس کے بدن کا میل چھڑانے کے لیے متعدد بالٹیوں میں نیم گرم پانی وافر مقدار میں موجود تھا۔ اس کو غسل دینے کا منظر دیکھنے کے لیے بستی کا ہر فرد موجود تھا۔ ہر شخص اپنے کرم فرما کو صاف ستھرا کرنے کا عمل دیکھنے اور کسی نہ کسی طور پر اس میں شریک ہونے کا شدید خواہش مند تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہٹے کٹے نوجوانوں نے اسے جکڑ لیا ـــ وہ بیچارگی کے عالم میں چیخنے اور ہاتھ پیر مارنے لگا۔ اور کسی نہ کسی طور پر مدافعت کرنے لگا۔ اضطراری طور پر اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں جو تھوڑی دیر بعد گریہ وزاری میں بدل گئیں مگر بستی والوں پر جنون طاری ہو چکا تھا۔ انھوں نے چاروں طرف سے اس کے میلے کچیلے اور بدبودار ملبوس کو کھینچنا شروع کر دیا اور تماش بین نعرے لگا لگا کر ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔

" ٹھیک ہے ..... زور لگا کے ..... پیر جما کے ....."

بستی والے چیختے اور نعرے لگاتے رہے۔ دوسری طرف کپڑے کھینچنے والوں کا جنون بڑھتا گیا۔ کچھ دیر بعد کان پڑی آواز کا سننا مشکل ہو گیا جس میں اس غریب کی آواز معدوم ہو کر رہ گئی۔ اب ان سب پر کھسیاہٹ کا دورہ پڑ چکا تھا کیونکہ ان کی لاکھ کوششوں اور کھینچا تانی کے بعد بھی اس کے چیکٹ بدن سے چپکا ہوا ملبوس اتارنا کارِ محال ثابت ہو رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ مجمع کا شور، نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے نعروں کی تکرار اور ان سب کا جنون نقطۂ عروج پر پہونچ گیا اور وہ سب اس بے دم کے جسم سے اس کا ملبوس اتارنے کے لیے پلے پڑ رہے تھے۔

نہ جانے اس کھینچا تانی میں کتنا وقت گزر گیا اور پھر اچانک ـــــ ایک بھیانک اور دل خراش طویل چیخ اس شور قیامت پر غالب آگئی اور پھر چاروں طرف موت کا مہیب سناٹا چھا گیا۔

جب ان کے حواس بحال ہوئے اور انھیں ہوش آیا تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں اور کپڑوں پر تازہ خون کے داغ ہیں اور ان کے ہاتھوں میں ان کے محسن کے میلے کچیلے کپڑوں کے ساتھ ہی اس کی کھال کی دھجیاں اور بدن کے ریشے جھول رہے ہیں۔ وہ سب مونقوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

نہ جانے کب تک وہ ایک دوسرے کو یونہی دیکھتے رہے۔ جب ان کے سوچنے سمجھنے کی قوت واپس آئی تو انھوں نے دیکھا کہ وہ متوحش نوجوان، جس نے ان سب کی تجویز سے متفق ہونے سے انکار کر دیا تھا، صدر محترم کے ہاتھ سے کپڑے جھپٹ کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ہوا ان کی پہونچ سے بہت دور جا چکا ہے۔

☐☐

البیرونی

تمدن، ادب، مذہب، علم و فن، جغرافیائی حالات، موسم، ندیوں، دریاؤں اور پہاڑوں کے متعلق بھی بہت اہم معلومات مہیا کی ہیں۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہماری تاریخ کا نہایت اہم باب ہے اور ایک عرب دانشور سیاح کی چشم دید گواہی ہے۔

البیرونی نے مختلف موضوعات پر تقریباً ایک سو پچاس کتابیں لکھی ہیں اور اس کی یہ کتابیں تمام عالم انسانیت کی ترقی کی بنیادی اساس کہلاتی ہیں۔

افسانہ

خالد جاوید
۱۳۵ (نیو ۵۸۵) صوفی ٹولہ
اولڈ سٹی، بریلی

تابوت سے باہر

بس یہیں سے وہ سڑک سیدھے کالج کو جاتی تھی ۔ وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا، پھر دوا کی شیشی کو کوٹ کی جیب میں ٹھونس لیا۔ ڈاکٹر کے نسخے کو سنبھال کر اندرونی جیب میں رکھا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ پانچ سال پہلے وہ روز اسی سڑک سے پیدل چل کر کالج جایا کرتا تھا۔ آدھی مسافت طے کرنے کے بعد پنواڑی کی ایک دکان پڑتی تھی جہاں سے وہ ایک سگریٹ خریدا کرتا تھا اور پھر یہ سگریٹ کالج کے گیٹ پر ہی ختم ہوتی تھی۔ دکان تو وہ اب بھی ہوگی۔ اس نے سوچا اور اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اس نے دیکھا دکان موجود تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر وہاں پہنچ گیا۔

"ایک پناما"۔ اس نے چار آنے بڑھاتے ہوئے کہا

لیکن یہ پانچ سال پہلے والا پنواڑی نہیں تھا۔ یہ تو کوئی نوعمر لڑکا تھا۔ وہ سگریٹ تلاش کرنے لگا۔

"لو بابوجی"۔

سگریٹ لے کر اس نے جلتی ہوئی رسی سے اسے سلگایا اور آگے بڑھ گیا۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ سگریٹ کا کش لے سکتا۔ سوچا کھانسی کا دورہ اگر یہیں پڑ گیا تو؟ اس نے آس پاس دیکھا کہرا اور گہرا ہوگیا تھا اور سڑک پر بہت کم راہ گیر چل رہے تھے۔ آج اتوار تھا۔ کالج کی چھٹی تھی۔ جبکہ یہ سڑک صرف طالب علموں سے بھری رہتی تھی۔ سگریٹ انگلیوں میں سلگتا رہا۔ وہ چلتا رہا۔ پانچ منٹ لگاتار چلنے کے بعد اسے ٹھٹھک کر رک جانا پڑا۔ سامنے وہ نہر کی پلیا دکھائی دے رہی تھی جس پر بیٹھ کر وہ اکثر نظمیں لکھا کرتا تھا۔ یہاں سے کالج کی وہ بلند و بالا سرخ عمارت بھی صاف نظر آتی تھی۔ آگے جانے سے کیا فائدہ۔؟ اس نے سوچا اور دھیرے سے پلیا پر پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پانی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ اسے نہریں ہمیشہ اچھی لگا کرتی تھیں۔ ایک دن اسی جگہ عذرا نے ہنس کر پوچھا تھا

"سچ بتاؤ جاوی! کیا تمھیں نہریں، ندیوں اور سمندروں سے زیادہ اچھی لگتی ہیں؟"

"ہاں! مجھے نہریں سب سے اچھی لگتی ہیں"۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیوں۔؟" اس بار عذرا نے سنجیدہ ہوکر سوال کیا تھا۔

"یہ بالکل سیدھی ہوتی ہیں۔ اتنی سیدھی کہ ناک کی سیدھ میں دیکھتے چلے جاؤ ایک لکیر کی طرح اور جو چیز ایک لکیر کی طرح سیدھی دکھائی دے وہ بالکل سچی ہوتی ہے۔ ایک جیومیٹریکل Geometrical حقیقت"۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا تھا۔

عذرا نے چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ پھر وہ اچانک تن کر کھڑی ہوگئی ــــ

"میری طرف دیکھو جاوی"ــــ اس نے سرگوشی کی۔

اس نے عذرا کی طرف دیکھا۔ دودھیا شلوار سوٹ میں وہ لمبی سی لڑکی اسے ایک نہر کی طرح دکھائی دی۔ جو زمین سے آسمان تک

بھتی جارہی تھی۔

"ہاں، تم بھی سچّائی ہو عذرا!" اسے قبول کرنا پڑا تھا۔

"کل کالج آؤ گے؟" عذرا نے جھک کر اس کے گھونگھر لے بالوں کو چوم لیا۔

"آؤں گا۔"

"آئی اے ایس' کے امتحان کب سے شروع ہو رہے ہیں؟"

"نومبر کے آخر میں۔"

"اس بار تو ہر حال میں تم کامیاب ہو گے۔!"

"دیکھو۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔؟"

"نہیں، تم کامیاب ہو گے۔ تم دو مہینے کے لیے نظمیں وغیرہ لکھنا بند کر دو۔ پوری طرح سے آئی اے ایس کی تیاری کرو۔"

اس نے غور سے عذرا کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک پل کے لئے وہ اسے بالکل اجنبی نظر آئی۔ اس اجنبیت سے تنگ آ کر اس نے عذرا کے چہرے سے نگاہیں ہٹالیں۔

"سُنو! کل شاذیہ ملی تھی۔ بتا رہی تھی کہ پاپا تم سے ناراض ہیں۔ تم گھر پر کچھ شاعروں کو بلانے لگے ہو جو رات گئے تک تمھارا وقت برباد کرتے ہیں۔"

"ہوں۔" اس نے سگریٹ پانی میں پھینک دی۔

"دیکھو جاوی! پاپا کا خیال رکھا کرو۔ وہ تمھیں کتنا چاہتے ہیں۔ اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ عام طور سے باپ اپنی بیٹی کو بہت چاہتا ہے مگر تمھارے پاپا شاذیہ سے زیادہ تمھیں چاہتے ہیں۔ وہ بتا رہی تھی کہ تمھیں ٹھیک سے سونا بھی نہیں آتا۔ تم رات کو بڑے بے ڈھنگے پن سے لیٹتے ہو۔ ایک معصوم بچے کی طرح اور پاپا آدھی رات میں اٹھ اٹھ کر تمھیں چادر اڑھاتے ہیں۔ تمھارا تکیہ ٹھیک کرتے ہیں۔"!

وہ کچھ نہ بولا۔

"ہائے عذرا!" کسی نے پکارا۔

"ہائے رشمی!... اچھا جاوی میں چلتی ہوں۔ رشمی آگئی۔ کل کالج آؤ گے نا؟" اس نے بے خیالی سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عذرا اسے دیکھ کر مسکرائی اور وہاں سے چل دی۔

"یہی جگہ تو تھی نا۔" اس نے سوچا۔ اسی جگہ وہ تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ایک نہر کی طرح۔ اسے اپنے سینے میں کچھ پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ اور پھر وہ شدت سے کھانسنے لگا۔

اس نے کوٹ کی جیب سے ایک گولی نکال کر منہ میں ڈال لی۔ تھوڑی دیر میں سکون آگیا۔ آسمان پر ابر آگیا تھا۔ اس نے سوچا ٹھنڈ بڑھ رہی ہے اس لیے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ۔ مگر وہ اتنی جلدی گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ابھی تو شام کے چار ہی بجے تھے۔ اسے ایک کپ گرم چائے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسے خیال آیا آگے چل کر بائیں طرف گلی میں ایک چھوٹا سا کیفے ہے۔ وہ پلیا سے اٹھا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

کیفے وہیں تھا جہاں ہوا کرتا تھا ــــ وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ایک میز کے سامنے بیٹھ گیا ــــ میز گندی تھی اس لیے اسے مانوس لگی ــــ لڑکا آ کر کھڑا ہو گیا اور پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا۔

"ایک کپ چائے"۔ اس نے لڑکے کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

کاؤنٹر پر ایک گنجے سر والا ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا تھا۔ پانچ سال پہلے اس آدمی کے بال سیاہ اور گھنے ہوا کرتے تھے۔ اسے یاد آیا۔ ندیم نے کس طرح ایک بار اس کے بالوں کو پکڑ کر کاؤنٹر سے اٹھا لیا تھا ــــ وہ الیکشن کا ہنگامہ تھا اور طالب علم کیفے اور ریستورانوں میں یہی سب کرتے پھر رہے تھے۔ وہ اس کا آئی۔ اے۔ ایس کا آخری سال تھا۔ انیل بھی اس کے ساتھ تیاری کر رہا تھا۔ دونوں چائے پینے کے لیے اکثر اسی کیفے میں بیٹھا کرتے تھے اور بہت جوش سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ اس کے ذہن میں ایک منظر نے سر ابھارا۔

"تم مانو یا نہ مانو۔ سارا مسئلہ اقدار کا ہے۔" انیل کہتا۔

"کیسا مسئلہ اور کیسی اقدار۔ میں اقدار کو objective نہیں مانتا۔"

"اوہ۔ فلسفے کے آدمی ہو کر بھی اتنا بڑا Paradox۔"

انیل طنزیہ کہتا۔
"Paradox بھی اضافی خیال ہے" وہ سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے غرایا۔
"سول سروس کے امتحان میں کیوں بیٹھ رہے ہو؟"
وہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ صرف سگریٹ کا دھواں اڑاتا رہا۔
"جادی! ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر تم دوسروں کی Ambitions کے چکر میں پڑ کر اپنی قدرتی صلاحیتوں کا گلا کیوں گھونٹ رہے ہو۔ میرے خیال میں تمہیں کسی کالج میں فلسفہ یا ادب پر لکچر دینا چاہیے۔"
وہ دھیرے سے مسکرایا۔ سگریٹ سلگانے کے لیے جھکا اور ایک لمبا کش لے کر بولا،
"میری سمت دیکھو۔ جہاں میں کھڑا ہوں۔"
نہ بادل کا چھتنار مجھ پر کبھی غروب رو پتیاں پھینکتا ہے۔
نہ جنگل کی کالی ردا ہی مجھے ڈھانپتی ہے
مرے چاروں جانب ہر ایک چیز مٹیالی رنگت میں کھوئی ہوئی ہے۔"
"آہ! یار جادی۔ کیا غضب کی بات کہی ہے۔ یہ لائن —
"میرے چاروں جانب ہر اک چیز مٹیالی رنگت میں کھوئی ہوئی ہے —
یار تمہاری ہم عصر اردو شاعری بھی کبھی کبھی بڑے پتے کی بات کہہ جاتی ہے۔ لیکن یہ سب تو Resemblance کا کھیل ہے"۔
"انیل میں سمجھ گیا جو تم کہنا چاہتے ہو مگر اس سے کیا وہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اقدار Objective نہیں ہیں"۔
"نہیں۔ بالکل نہیں"۔ انیل ہار تو مان ہی نہیں سکتا تھا۔ "اقدار Subjective ہی ہیں ورنہ تم اس وقت کے سناٹے کے جواب میں یہی اشعار کیوں سناتے"۔
"کیسا سناٹا۔؟" اس نے لاپروائی سے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا تھا۔
انیل دیر تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر اپنے مخصوص پر قولنے والے انداز میں اٹھتا ہوا بولا۔ "آؤ چلیں"۔

"دیکھو بات تو مٹیالی رنگت کو Perceive کرنے کی ہے اشیاء اپنے آپ میں کچھ بھی نہیں ہیں"۔ اس نے انیل کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
"Bloody idealistic"۔ انیل غرایا تھا۔
میز پر چائے کا گلاس پٹخنے کی آواز آئی۔ وہ چونک پڑا۔ لڑکا چائے رکھ کر جا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی اس کو ابکائی سی محسوس ہوئی۔ معدہ کا السر (Ulcer) اکثر چائے قبول کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔ اس نے مایوسی سے گلاس میز پر رکھ دیا۔
جیب میں کوئی سگریٹ بھی نہیں تھی۔ نہ چائے۔ نہ سگریٹ اور نہ کوئی Intellectual گفتگو کرنے کے لیے۔ پھر اس ریستوران میں بیٹھنے سے کیا فائدہ۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ سامنے دوسری میزوں پر بیٹھے لوگوں میں سے کسی کو پکڑے اور اسے آرٹ فلم کے بارے میں سمجھانے لگے۔ اس صورت حال پر اسے خود ہی شرمندہ سی ہنسی آ گئی —
"کوئی فائدہ نہیں"۔ وہ بڑبڑایا اور میز چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کاؤنٹر پر جا کر اس نے چائے کے پیسے ادا کیے۔ پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا ریستوران سے باہر آ گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی — اس نے کوئی پروا نہیں کی اور چلنے لگا۔ سر جھکائے ہوئے وہ اپنے جوتوں کی طرف دیکھتا جا رہا تھا اور پھر پتہ نہیں اسے کیا خیال آیا کہ وہ رک گیا۔ سڑک پر لگے ٹیلی فون کے کھمبے کا سہارا لے کر اس نے اپنا دایاں پیر اٹھا کر جوتے کی ایڑی کا جائزہ لیا۔ پھر بایاں پیر اٹھا کر جوتے کی ایڑی کو غور سے دیکھا۔ ایڑی نہیں گھسی تھی۔
"بالکل ٹھیک اور سپاٹ"۔ اس نے سوچا۔
اسے یاد آیا — معید اس سے کہتا تھا۔
"دیکھو یار بے کار ہے۔ تمہارا وزن زیادہ ہے اس لیے تمہارے جوتے کی ایڑی گھس جاتی ہے۔ تم مضبوط سے مضبوط ایڑی والا جوتا پہن کر دیکھ لو۔ پندرہ دن میں اس کی ایڑی گھس جائے گی کیوں کہ تم بھاری ہونے کی وجہ سے ایک پیر پر زور دے کر چلتے ہو"

اسے معید کی بات میں سچائی نظر آتی۔ لیکن کوشش کر کے بھی وہ خود کو slim نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ تو چھ سال پہلے کی داستان ہے۔ اب تو وہ صرف ایک بیمار آدمی ہے اور slim کی حدود سے آگے نکل چکا ہے۔ اس نے سوچا پھر اس کا دل چاہا کہ کہیں سے معید آ جائے اور وہ اسے اپنے بائیں پیر کے جوتے کی ایڑی دکھائے اور فاتحانہ انداز میں مسکرائے۔

ٹیلی فون کے کھمبے سے کوئی بھیگا ہوا پرندہ اپنے پر پھڑپھڑاتا ہوا اڑ گیا۔ اس نے پیر دوبارہ زمین پر رکھ دیا اور چلنا شروع کر دیا

"اب جوتے کی ایڑی کبھی نہیں گھس سکتی۔" وہ بڑبڑایا ـــــ سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ کانپ کر رہ گیا۔

بادل اور پھواروں سے بھری شام بڑی تیزی سے ماحول پر چھاتی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اسے یہ شام بے حد بری اور ہولناک سی محسوس ہوئی۔ اسے لگا جیسے آسمان پر کوئی دیو ہیکل پرندہ اپنا ہیبت ناک سایہ زمین پر چھوڑتا ہوا آسمان کی بیکراں وسعتوں میں گم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی چال آپ ہی آپ تیز ہو گئی اسے یاد آیا کہ کل صبح چھ بجے اسے ہائی اسکول کے دو لڑکوں کو ٹیوشن پڑھانے جانا ہے۔

"انیل صاحب، میں کالج میں فلسفہ تو نہیں پڑھا سکا مگر یہ کیا کم ہے کہ ہائی اسکول کے ان دو لڑکوں کو گھر پر سود در سود کے سوال حل کروانے جا رہا ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ مگر رکا نہیں چلتا ہی رہا۔ اسے کچھ ایسا بھی لگ رہا تھا جیسے اس کے گردے میں ہلکی سی چمک ہوئی ہو۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس کے گردے میں پتھری تھی اور اکثر پیشاب کے ساتھ خون آتا تھا۔ وقت کے ٹیلوں کے پیچھے سے ایک منظر نے سر ابھارا ـــــ متواتر ایک ماہ گردے کی تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد جب اسے کچھ آرام ہوا تھا تو وہ زیادہ تر اپنے بستر پر لیٹے کر کتابیں پڑھتا رہتا تھا ـــــ شارق، جس نے اس زمانے میں شاعری شروع کی تھی اس کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ اسے یاد ہے کہ کمرہ میں داخل ہوتے ہی شارق نے اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی تھی۔

"پاگل ہو گئے ہو۔ "کینسر وارڈ" پڑھ رہے ہو؟ یہ کتاب تو بھلے چنگوں کو بیمار کر دیتی ہے اور تم بیماری کی حالت میں اسے پڑھ رہے ہو"!!

اسے ہنسی آ گئی ـــــ "یار شارق! میں اسے پہلی بار نہیں پڑھ رہا ہوں۔"

"اسی لیے ..... اور خطرناک ہے"۔ شارق نے سگریٹ سلگایا۔

"نہیں۔ یقین کرو۔ اسے پڑھ کر میں نے کبھی بوجھل پن نہیں محسوس کیا بلکہ خود کو ہلکا پھلکا اور تر و تازہ ہی محسوس کیا ہے۔ بالکل ایسا ہی لگتا ہے جیسے میں نے "ابن صفی" کا کوئی ناول ختم کیا ہو۔"

"تم تو اذیت پسند ہو گئے ہو جاوی"۔ شارق نے بھاری آواز میں کہا تھا ـــ

"چھوڑو یہ قصہ ..... یہ بتاؤ کوئی تازہ غزل کہی یا نہیں"۔

"تمہیں کیا مطلب؟ تم تو غزل کے نام سے چڑ جاتے ہو"۔

"بھئی مسئلہ Integration کا ہے یہ کمی غزل کو بونا کر دیتی ہے ..... نہیں۔ میں صرف اپنا نقطۂ نظر بیان کر رہا ہوں.... .... نہیں نہیں سگریٹ بھی نہیں لوں گا۔ ہومیوپیتھک علاج کرا رہا ہوں"۔ اس نے شارق کو سگریٹ کے لیے منع کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اچھا تو مسئلہ Integration کا ہے"۔ شارق غرایا ـــ

"میں کہتا ہوں مسئلہ بدبو کا ہے۔ روگوجن کی محبوبہ نتاشیا کی لاش بند کمرے میں سڑ رہی ہے۔ روگوجن کو بدبو کی فکر ہے۔ پرنس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں"۔

"دوستوفسکی کا "ایڈیٹ" پڑھ کر آ رہے ہو؟" اس نے ہنس کر پوچھا ـــ

"نہیں۔ تمہارے Integration کے سوال کے جواب میں ایک مسئلہ پیش کیا ہے"۔

"ہو سکتا ہے شارق تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور میں بھی روگوجن کی طرح complex میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مگر سڑتی ہوئی لاش بھی ایک اکائی ہے"!

شارق نے ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا ـــ

"اور ایک بات اور بتاؤ شارق۔ تمھیں کبھی پیشاب میں خون آیا ہے یا بواسیر ہوئی ہے؟"

"نہیں۔!" شارق نے کہا۔

"بس۔ اسی لیے تو ..... اسی لیے تو"..... وہ بے چینی سے اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے رگڑتے ہوئے بولا۔

"کیا اسی لیے تو۔؟" شارق نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ تخلیق کسی وقتی جذبے کے تحت ہی عمل میں آتی ہے۔ کم از کم میرا خیال یہی ہے۔ تو میرا کہنا ہے کہ اپنے اندر کا خون اس طرح گندی نالیوں میں بہتے دیکھ کر تم بھی غزل نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ ایک عجیب قسم کی دہشت ہوتی ہے اور دہشت میں کبھی غزل نہیں کہی جا سکتی۔"

شارق اسے اس طرح دیکھ رہا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ پھر دونوں ساتھ ساتھ ہنسنے لگے۔

پھوار اب رک گئی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ گرد سے میں چمک بھی نہیں محسوس کر رہا تھا۔ پھر اس کا دل چاہا کہ کسی تعلیم یافتہ راہ گیر کا ہاتھ پکڑ کر سڑک کے کنارے لے جائے اور اسے بتائے کہ وہ غزلوں کے بجائے نظمیں کیوں پسند کرتا تھا۔

لیکن اب یہ بالکل بے معنی ہے۔ بالکل بے معنی ـــــ اس نے سوچا۔

"چلوں۔ واپس چلوں"۔ اس نے دھیرے سے خود سے کہا اور گھر کی سمت چلنے لگا۔ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں اسے اپنی پرچھائیں بے حد گھناؤنی اور حقیر سی محسوس ہوئی۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ اب تک اپنے بھوت کے ساتھ بھٹک رہا تھا۔

"تم اپنے بھوت کے لیے ایک تابوت کیوں نہیں بنوا لیتے؟"

اس نے خود سے سوال کیا۔ پھر اس نے سوچا اب اسے اس خیال پر ہنسی آئے گی۔ لیکن جب ہنسی نہیں آ سکی تو اس نے زبردستی منہ پھاڑنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک فلک شگاف قہقہہ لگائے مگر بار بار کوشش کرنے پر بھی وہ کامیاب نہ ہو سکا اور تب پہلی بار اسے اس حقیقت کا علم ہوا کہ وہ تو بے حد اداس ہے۔ دراصل بے حد اداس۔ اس نے شکست خوردہ انداز میں سر جھکایا۔ دوا کی شیشی کو کوٹ کی جیب میں ٹٹول کر دیکھا اور بوجھل قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔

□□

اردو گلدستوں کی روایت صـ ۲۸ کا بقیہ

لکھنؤ کے تمام گلدستوں نے شعر و سخن کے ذوق کو عام کرنے میں ہر ممکن کوششیں کیں۔ ان گلدستوں نے دور دراز کے علاقوں میں بھی شعر و شاعری کا چرچا عام کیا۔ اس کے علاوہ جن علاقوں میں اردو کا چلن کم تھا وہاں بھی زبان کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ بلاشبہ گلدستوں نے اردو شعر و ادب کی زبردست خدمات انجام دیں۔

لکھنؤ کے سبھی گلدستے انیسویں صدی کے تمام معروف و غیر معروف شعرا کے کلام کے انتخاب کے تعلق سے ایک اہم ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی مدد سے ہم اپنے متعدد شعرا کے شاگردوں کے سلسلے بھی مرتب کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ گلدستے بہت سے ایسے غیر معروف شاعروں سے بھی ہمیں روشناس کراتے ہیں، جن کا اردو ادب کی تاریخ تو در کنار تذکروں میں بھی ذکر نہیں ہے۔ گویا یہ گلدستے ایسی ادبی دستاویز ہیں جنھوں نے ہمارے سیکڑوں شاعروں کے نام اور کلام کو گمنامی سے بچایا۔ بلاشبہ یہ تمام گلدستے ادبی تحقیق، تاریخ اور تنقید کے طالب علموں کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: **الہاماتِ سرمد**

مترجم: محمد مشتاق شارق — قیمت: ۲۰/ روپے

ملنے کا پتہ: محمد مشتاق شارق۔ ۵۶۔ کوٹلہ۔ میرٹھ

شارق صاحب اُردو کے کہنہ مشق شاعر اور ادیب ہیں۔ "الہاماتِ سرمد" ان کی طباعی کا ایک نیا نمونہ ہے۔ جس میں انھوں نے سرمد کی ۱۱۴ رُباعیوں کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ شعر کا شعر میں ترجمہ مشکل ہوتا ہے، مگر شارق صاحب نے اس مشکل کو آسان بنا دیا ہے۔ جو لوگ فارسی سے ناواقف ہیں وہ بھی ان رباعیات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

ترجمہ سلیس و شگفتہ اور شعریت لیے ہوئے ہے اور بڑی حد تک سرمد کے مفہوم کو ادا کر دیتا ہے۔ لیکن اگر ترجمہ میں فارسی متن سے مطابقت کا اور لحاظ رکھا گیا ہوتا تو ترجمہ کے استناد و اعتماد میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ موجودہ شکل میں اسے آزاد ترجمہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

سرمد کے حالات بھی بہت تشنہ ہیں۔ ان کے کلام پر بھی مفصل تبصرے کی ضرورت تھی۔ تعجب ہے کہ مترجم کے مآخذ میں مولانا آزاد کا سرمد پر مشہور مضمون شامل نہیں جس سے وہ بہت کام لے سکتے تھے۔ کیا اچھا ہو کہ شارق صاحب سرمد کی باقی رُباعیوں کا ترجمہ بھی کر دیں تاکہ سرمد کے خیالات مکمل شکل میں ہمارے سامنے آجائیں۔ شارق صاحب کی یہ کوشش مجموعی طور پر لائقِ تحسین ہے اور وہ قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے فارسی ادب کے ایک شاہکار کو اُردو میں منتقل کر دیا۔

——— شمس تبریز خاں

نام کتاب: **"پرتولتی خلائیں"**

شاعر: مخمور سلطان پوری — قیمت: دس روپے

ملنے کا پتہ: دولت بھون۔ سلطان پور

فرانس میں جنمی نثری نظم آج عالمی ادب کا حصہ بن چکی ہے۔ اُردو میں اس کی آمد بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی۔ اور ۱۹۷۴ء تک آتے آتے نثری نظم نے اردو میں بھی اپنا ایک مقام اور حلقہ بنا لیا۔

آج بہت سے مقبول و معروف شعراء "بودلیر" کی اس روایت کو تھامے آگے بڑھ رہے ہیں اور Speech Rhythm میں نظمیں کہہ رہے ہیں۔

"پرتولتی خلائیں" بھی اسی تجربے کی ایک کڑی ہے جس میں مخمور سلطان پوری نے کبھی منظر میں رہ کر اور کبھی منظر سے ہٹ کر انتہائی خلوص اور سادگی کے ساتھ موسم موسم جذبات کی کاشت کی ہے:۔

"مرے وجود سے
خالی
کوئی مقام نہیں
مرا وجود کہاں ہے
مجھے نہیں معلوم
تجھے تلاش ہے میری
یہ جانتا ہوں میں
مجھے تلاش ہے تیری
یہ جانتا ہوں میں
مگر جو ہو سکے تو
بس مجھے یہ بتلا دے
تری تلاش میں
"میں"
کھو گیا
تو کیا ہو گا؟

"مجھے یہ ڈر ہے کہ اک دن یہ حادثہ ہوگا"

نثر اور نثری نظم میں جو بنیادی فرق ہے وہ اس کے آہنگ کا ہے۔ نثر کا قد اس کے معنی کی سطح سے بلند نہیں ہوتا، لیکن نثری نظم ماورائے حدود لفظ و معنی ہوتی ہے۔ اس میزان پر بھی اگر دیکھا جائے تو محور صاحب کی اکثر نظمیں کھری اترتی ہیں ؎

برف، شبنم
حباب، ابر بہار
اشک، دریا
خلیج، آب رواں
ایک ہی شے ہزار ہا شکلیں
ماہیت ایک لاکھ افسانے
پردہ در پردہ پردۂ من و تو
راز ہی راز وحدت و کثرت

لیکن ان کا یہ کھرا لہجہ بھی اس قدر شیریں اور شفاف ہے کہ کہیں بھی گنجلک معنی و مفہوم کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ نثری نظم کو ایک شعری پیکر دینے کی کوشش میں کہیں کہیں محور صاحب کے یہاں آزاد نظم کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو نثری نظم کے مسلک میں شرک سمجھی جاتی ہے لیکن محور صاحب کے یہاں کسی باغیانہ روش یا کرخت پن نے راہ نہیں پائی ہے اس لیے وہ اپنی جگہ کامیاب ہیں۔ اس مجموعے میں شامل نظموں کو اگر عنوانات دے دیئے جاتے تو یہ اور بھی حسین ہو جاتا۔ مجموعی طور پر یہ ایک خوبصورت کاوش کہی جا سکتی ہے۔

——— قمر قدیر ارم

نام کتاب: "لہجے کے چراغ"
شاعر: عروج زیدی قیمت: ۹ روپے
ملنے کا پتہ: عرفان زیدی۔ محلہ کٹ کوئیاں۔ رام پور (یوپی)

عروج زیدی مرحوم محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ کلام کی پختگی سے کہنہ مشقی کا اظہار ہوتا ہے۔ احساسات جب الفاظ میں ڈھلتے ہیں تبھی اشعار ہوتے ہیں۔ عروج زیدی مرحوم شعری اظہار پر پوری قدرت رکھتے تھے۔

شاعر کا خلوص اور فکری وسعت اس کے اشعار کو عظمت بخشتے ہیں۔ تاثیر، جمالیاتی اور عصری حسیت کے امتزاج سے شعری پیکر حسین تر ہو جاتا ہے۔ عروج زیدی کی نگاہوں سے عصر حاضر کا اخلاقی زوال۔ مفاد پرستی کی کش مکش، مادہ پرستی، کساد بازاری، ماحول کی سہمی مایوسی، معاشرتی ابتذال، سیاسی انتشار، دولت کی نامنصفانہ تقسیم جیسے مصائب کیسے بچ سکتے تھے۔ عصری حسیت جب سنگسار ہوتی ہے تو اپنی صوفی منشی کا اظہار نہایت جرأت سے کرتے ہیں ؎

دل ابھی ٹوٹا نہیں ہے بے رخی کے باوجود
سنگ باری میں یہ شیشہ آج تک محفوظ ہے

لفظ "بے رخی" نے رنگ تغزل کو اور بھی نکھار دیا ہے۔

لفظ تغزل اپنے اندر جو مختلف اوصاف رکھتا ہے عروج زیدی صاحب کی شاعری ان کی پوری نمائندگی کرتی ہے ؎

تکلیفِ التفات گریزاں کبھی کبھی
یوں بھی ہوئی ہے پرسشِ پنہاں کبھی کبھی

یہ کہوں گا، یوں کہوں گا وقت پر مہرِ سکوت
ان کے آگے حافظے نے بارہا دھوکا دیا

عروج زیدی جب فکر کی گہرائی میں اترتے ہیں تو انھیں قطرے میں سمندر اور ذرے میں بیاباں نظر آتا ہے۔ جب ان کے قلب کی دھڑکنوں پر طہارت کا صیقل ہوتا ہے تبھی ایسے اشعار وجود میں آتے ہیں ؎

آئینہ ہو گیا ہر مسئلۂ غیب و شہود
یہ خلاصہ ہے تیری انجمن آرائی کا

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا سے جدا کیا چیز ہے
آپ کا پیغامِ بے حرف و صدا کیا چیز ہے

——— اسلم واحدی

نام کتاب: عاصم گونڈوی: ایک صحافی ایک شاعر

مصنف: ڈاکٹر سعید گورکھپوری   قیمت /۲۵ روپے

ملنے کا پتہ: پندرہ روزہ تاجور، گورکھپور

عاصم گونڈوی عرصے سے صحافت کے میدان میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔ اپنے پرخلوص افکار و خیالات کو عوام تک پہونچا کر ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے نیک کام میں مصروف ہیں۔

اُردو کی یہ بڑی خوبی ہے کہ باوجود ناساز گار ماحول اور حالات کے جگہ جگہ مخلص لوگ اپنے طور پر زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنا سب کچھ لٹا کر بھی اپنے مشن میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ کسی صلہ انعام اور تحسین سے ہمیشہ بے نیاز رہتے ہیں۔ عاصم گونڈوی بھی اسی طرح کے محبان اردو میں شامل ہیں اور اپنے پندرہ روزہ تاجور کے ذریعہ زبان وادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر سعید گورکھپوری نے عاصم صاحب کی خدمات کو اُجاگر کرنے کے لیے اس مختصر سے کتابچے کی تخلیق کی ہے جو قابل ستائش ہے کہ اس سے خلوص سے کام کرنے والوں کا جذبۂ خدمت بڑھتا ہے اور مخلصین کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

——— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: "بن گیت" (ترجمہ)

مترجم: احسن شفیق   قیمت: چالیس روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ارباب ادب ۱/۵ اے کاویز گھاٹ روڈ، شیب پور، ہوڑہ

سنتھالی لوک گیتوں پر مشتمل یہ مجموعہ دراصل شو بھیندو شیکھر بھٹاچاریہ کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے۔ ان گیتوں کو یکجا کرنے کے بعد پہلے انھوں نے رومن حروف میں منتقل کیا اور پھر انگریزی زبان میں ترجمہ کیا، بعد ازاں تپن بندو پادھیا نے ان گیتوں کو بنگلہ کے چند مقتدر شاعروں سے ترجمہ کرا کے "سنتھالی کبیتا" کے نام سے شائع کرایا۔ اس طرح "بن گیت" کو ترجمہ در ترجمہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

گیتوں کا یہ منظوم ترجمہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انوکھا اور دلچسپ تجربہ ہے۔ ان سنتھالی گیتوں کا بنگلہ کے شاعروں نے چونکہ منظوم ترجمہ کیا ہے، لہٰذا احسن شفیق نے بھی اس کا منظوم اردو ترجمہ پیش کر کے اُردو کے ادبی ذخیرے میں ایک طرح سے اضافہ کیا ہے۔

"بن گیت" کے مترجم احسن شفیق نے بنگلہ کے متعدد شعراء کی مشہور نظموں کو ترجمے کے لیے منتخب کیا ہے۔ انھوں نے سنتھالی زبان کے مختلف قسم کے گیتوں کا ترجمہ کر کے اپنی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ کتاب کے ایک جانب سنتھالی زبان کا گیت درج ہے اور دوسری جانب اس کا اُردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں شامل چند گیتوں کا اُردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:-

(۱) اے لڑکی
تو گاؤں کے ساتھی سے پریم کرتی ہے
اسی خاطر
اپنے ساجن کے گھر نہیں جاتی
کیا سمجھتی ہے تیرے ساتھی یاد رکھیں گے
یاد رکھیں گے تجھ کو آئندہ بھی
اپنی اپنی راہ لگ جائیں گے
تیرا پریم سبھی لوگ بھول جائیں گے

(۲)
پہاڑوں پہ سال کے درختوں پر
کونپلیں نکل آئیں
نئے پتوں کے گچھوں میں
درخت بھلے لگتے ہیں
گھر دوار آنگن سب کچھ ہو پھر بھی
جب تک نہ گھر میں بہو آئے
گھر کے بھاگ کہاں کھلتے ہیں

"بن گیت" میں شامل شو بھیندو شیکھر بھٹاچاریہ کا مضمون نیز شانتی رنجن بھٹاچاریہ اور تپن بندو پادھیا کے مقدمے سنتھالی زبان و ادب کے تعلق سے بڑی افادیت کے حامل ہیں۔

——— سیّد طیب کوکب

نیا دور

جلد ۴۶ | نمبر ۵

اگست ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر

سیّد امجد حسین

ٹیلیفون : ــــــــ ۲۴۳۶۷۶

پبلشر

انل سروپ

(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش)

انتظامی و ادارتی معاونین

محمد الیاس خاں ۔ نجیب انصاری

مطبوعہ

یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش

فی شمارہ : ـــــ ایک روپیہ

زر سالانہ : ـــــ دس روپئے

ترسیل زر کا پتہ

سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ

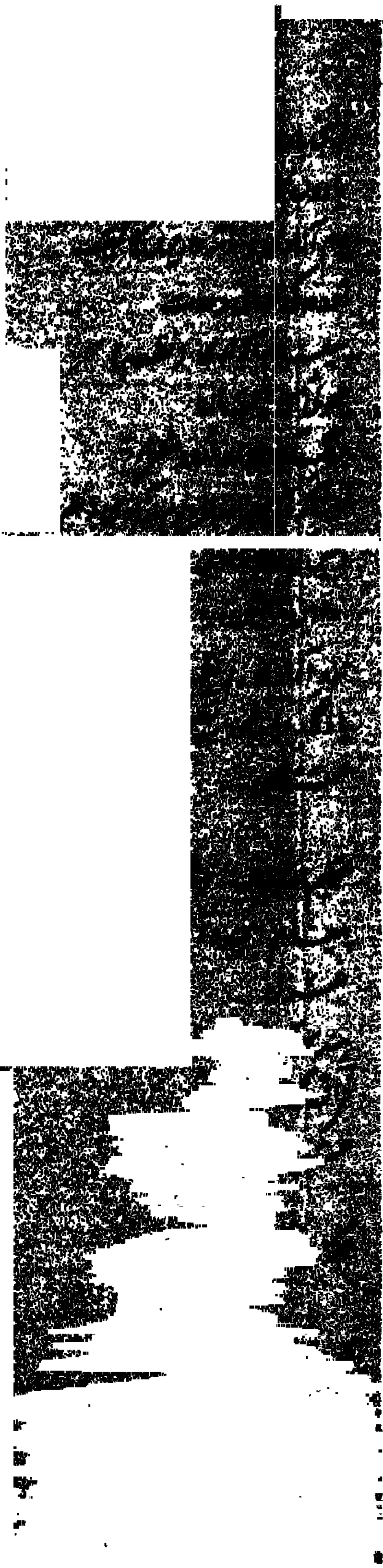
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی، لکھنؤ

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش اُن سے بہر حال متفق ہو



نیا دور

جلد ۴۶ نمبر ۵

اگست سنہ ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر

سیّد امجد حسین

ٹیلیفون: ـــــــ ۲۴۳۶۷۶

پبلشر

انل سروپ

(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

انتظامی و ادارتی معاونین

محمد الیاس خاں ۔ نجیب انصاری

مطبوعہ

یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

فی شمارہ ـــــ ایک روپیہ

زر سالانہ ـــــ دس روپے

اُردو ایک ایسی زبان ہے جس کی بنیاد ہی رواداری محبت اور یکجہتی پر قائم ہے۔ ہندستان میں جنم لینے والی اس زبان نے ساری دُنیا کو کچھ اس طرح متاثر کیا ہے کہ آپ کسی ملک میں چلے جایئے اُردو کے چاہنے والے مل جائیں گے۔ اس زبان نے ہندستان کی آزادی کی جنگ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ پوری طرح روشن ہے۔ اس کے ادب نے دُنیا کی ہر اہم تحریک کو اپنے اندر جذب کیا اور فکری سطح پر بھی ادب کو مالا مال کیا ہے۔

اُردو نے شمال سے لے کر جنوب تک اپنی لطافت اور شیرینی سے ہر ایک کا دل موہ لیا اور اپنی اہمیت کو ثابت کیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہندستانیت کا سچا احساس اور حبّ الوطنی کا شعور اس کے ادب کی ہر صنف میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اُردو نے نہ صرف ہندستانیت کے تصوّر کو عام کیا ہے بلکہ متقدمین سے لے کر دورِ حاضر تک کے شعرا اور ادیبوں نے اس تصوّر کو غیر معمولی وسعت بخشی۔

مادرِ وطن کی آزادی کی چوالیسویں سالگرہ کے موقع پر ہم سب کا فریضہ ہے کہ ہم ملک میں ایسے رُجحانات پیدا کریں جس میں ہندستانیت پوری طرح جلوہ گر ہو، اور ایسے رجحانات کو پروان چڑھائیں جن میں وطن پرستی اور اس کی عظمت کا سچا احساس ہو۔

آج ملک ایک سخت اور نازک دور سے گزر رہا ہے ایسے رجحانات کو ہوا دی جا رہی ہے جو آپس میں نفاق پیدا کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف اقتصادی کشمکش اور معاشی انتشار سارے معاشرے میں بے چینی اور ہیجان کی کیفیت پیدا کرتا جا رہا ہے۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہر طبقہ، ہر مذہب و ملت اور ہر علاقے کے عوام متحدہ طور پر ملک و قوم کی ترقی کے لیے آگے بڑھیں۔ اس کے لیے عزم و استقلال اور جد و جہد کی سخت ضرورت ہے۔ اس وقت ملک کو جن مسائل اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کو دُور کرنا ہم آپ سب کا فرض ہے۔ یومِ آزادی کے اس مبارک موقع پر ہمیں اپنے رہنماؤں کی عظیم قربانیوں کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے جسے مشعلِ راہ بنا کر ہم ملک و قوم کی ترقی کے لیے نئے جذبات پیدا کر سکتے ہیں۔

آیئے آج ہم سب اس بات کا عہد کریں کہ ملک کے سامنے درپیش سارے مسائل کو حل کرنے کے لیے سب مل کر پوری قوت سے آگے بڑھیں گے۔

ہندستان کی قدیم تہذیبی اور معاشرتی روایات بہت عظیم رہی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اس کا مستقبل بھی اپنی تمام عظمت کے ساتھ روشن اور تابناک رہے گا۔

ایڈیٹر ——————

یادوں کا سویرا

عمر انصاری
۲۰ امین آباد پارک لکھنؤ

آبِ رفتہ کا کوئی باندھ ہے ٹوٹا شاید
جام یادوں کی گلابی کا ہے چھلکا شاید

جھومتا جیسے کہ نکلے کوئی میخانے سے
چل کے خود دَور میں آنے لگے پیمانے سے

آمد آمد جو سُنی دور کی آوازوں کی
کنڈیاں کھُلنے لگیں ذہن کے دروازوں کی

دل پہ کس کس کی نہ تھی یوں بھی کرم فرمائی
آج کی صبح نے تو اور قیامت ڈھائی

موج در موج خیال آنے لگے جانے لگے
چہرے ہی چہرے ہر اک سمت نظر آنے لگے

چہرے ہاں چہرے مصیبت زدہ انسانوں کے
ہندوؤں کے، نہ سکھوں کے، نہ مسلمانوں کے

وقت ابھی ہم کو جہاں سے تھا اُٹھا کر لایا
پھر وہیں جا کے تصور ہمیں پہنچا آیا

دل کچھ اس طرح سے کرتا ہوا فریاد آیا
اپنا اک گزرا ہوا دَور ہمیں یاد آیا

ہم تھے آپ اپنے میں جب دفن خزینوں کی طرح
زندگانی تھی اُترتے ہوئے زینوں کی طرح

مسکراتے ہوئے چہرے تھے نہ پنپتے آنگن
ہم تھے اور دار و رسن، دار و رسن، دار و رسن

زندگی یوں بھی گزاری ہے چمن میں برسوں
اجنبی بن کے رہے اپنے وطن میں برسوں

تھا حدِ فکر و نظر سے بھی کچھ اونچا بادل
دیکھنے کو بھی ترستے تھے برستا بادل

ہاتھ آتا نہ تھا عنواں کوئی جینے کے لئے
فصلیں بوتے تھے فقط خون پسینے کے لئے

زخم ہنس دیتے تھے، جب پھول کوئی کھلتا تھا
بڑی مشکل سے کوئی ہونٹ کہیں ہلتا تھا

ہم مگر کچھ بھی سہی، اپنی خبر رکھتے تھے
اپنی شاموں کو بھی ہم رنگِ سحر رکھتے تھے

ہم تھے میخانوں کے باہر کہ تھے میخانوں میں
رنگ بھرتے ہی رہے زیست کے افسانوں میں

جھومتے جب بھی اٹھا کے پرستار چلے
یوں چلے، جیسے کہ چلتی ہوئی تلوار چلے

دیکھ کر روئے سحر، دل نہ ہو کیوں کر تازہ
مَل کے آئی ہے شہیدوں کے لہو کا غازہ

جب زمانے میں تھا ہر سمت اندھیرا چھایا
اُٹھو یارو! انہیں یادوں کا سویرا آیا

حسن واصف عثمانی
حیدر مرزا روڈ (قبر اموں بھانجہ)
لکھنؤ

یوم آزادی: ذمّہ داریوں کا نقیب

یوم آزادی مسرت کے لمحوں کا دن ہے اور آزادی کا احساس بہت اطمینان بخش بھی۔ لیکن آزادی کے ایک لفظ کی تاریخ پر غور و فکر یوم آزادی کی مسرتوں کو دوبالا کر سکتا ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس مسرت کو ذمّہ داری کے احساس سے ملا کر آزادی کے درست اور سود مند استعمال کا سبق دے سکے۔ رسمی مسرت سے آزادی کی نعمت کا حق ادا نہیں ہو سکتا، نہ زندگی کی تعمیر ممکن ہے۔

آزادی کے جس لفظ نے قومی آزادی کی تحریک کو جنم دیا وہ اپنے حقیقی اور مجازی معنوں میں تین صدیوں سے زیادہ پرانا نہیں ہے۔ فرانس کے دانش ور جان جاک روسو نے اپنی کتاب معاہدہ عمرانی کی ابتدا ہی اس تاریخی جملے سے کی تھی کہ

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ
زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے"۔

روسو کے اس جملے نے انسانی ذہن میں جو آگ لگائی، وہ انقلابِ فرانس کی شکل میں سامنے آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انقلابِ فرانس ہی نے آزادی کے لفظ کے حقیقی اور مجازی معنوں میں بھی انقلاب برپا کر دیا۔

روسو نے اپنی کتاب میں ایسے آزاد انسانوں کے بہتر سماج کا خواب دیکھا تھا جن پر بادشاہت یا کلیسا کے استبداد کا سیاہ سایہ نہ ہو، اور وہ اپنے عقل و شعور کی روشنی میں آزادی، مساوات اور خوش حال سماج کی تعمیر کر سکیں۔ روسو سے پہلے آزادی کا لفظ ایسی اہمیت نہیں رکھتا تھا کہ اس کے ذریعے سماجی سیاسی اور معاشی زندگی کو سمجھا جا سکے۔ روسو نے اس لفظ کو ایک ایسی شاہ کلید بنا دیا جس سے ہر خزانے کے بند قفل کھولے جا سکتے ہوں —!

روسو سے صدیوں پہلے یونان میں افلاطون نے بہتر سماجی زندگی کی خاطر انسانوں کی ایک درجہ بندی کی تھی۔ ان کے حقوق اور ذمّہ داریاں متعین کی تھیں۔ افلاطون کی کتاب "جمہوریت" بھی روسو کی کتاب معاہدۂ عمرانی کی طرح سماجی اداروں کی تشکیل سے بحث کرتی ہے لیکن روسو نے افلاطون سے بہت آگے بڑھ کر یہ سوال اٹھایا تھا کہ: ———

"انسان تو دراصل آزاد پیدا ہوا ہے
اور اس کی آزادی ہی اس کا فطری حق
ہے۔ پھر وہ ہر جگہ پابہ زنجیر کیوں
نظر آ رہا ہے؟"

افلاطون کے سامنے یونان کی شہری ریاستوں کی مثال تھی وہ ان میں کسی قدر بہتری چاہتا تھا، لیکن روسو نے، اویں صدی کی مغربی دنیا میں بادشاہت، کلیسا اور ان کے ماتحت سماجی اداروں کو یکسر مسترد کر کے انسان کی آزادی کا سوال اٹھایا تھا۔ اس طرح روسو افلاطون سے بہت آگے، بہت بلند اور بہت بامعنی نظر آتا ہے۔

انسان کی آزادی، اس کے بنیادی حقوق اور ان کے اقدام

پر اصرار کی جو تحریک روسو کے قلم اور انقلاب فرانس کی آگ سے اٹھی وہ بادشاہت، کلیسا اور عام انسانوں پر برتری کا دعوا رکھنے والے ہر سماجی یا سیاسی ادارے کے مفاد کے خلاف ہے۔

گزشتہ تین صدیوں کی کہانی میں یہ ٹکراؤ برابر اور طرح طرح کے رنگ روپ میں نظر آتا ہے۔ بے قید سرمایہ داری ہو یا دوسرے ملکوں پر حکمرانی کا حق جتا دینے والا سامراج ـــ دونوں ہی آزادی کی شدت سے نفی کرتے رہے ہیں۔ بے قید سرمایہ داری نے انسان کو محض مزدور اور محنت کش بنا کر اس سے معاشی آزادی چھین لینے کی مسلسل جدوجہد کی اور سامراج نے قوموں اور ملکوں کو غلام بنا کر ان کے معاشی استحصال کی روایت قائم کی۔ بے قید سرمایہ داری اور سامراج دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ یہ فرد یا افراد کے کسی قومی، لسانی اور نسلی گروہ کی آزادی کا انکار کرتے تھے۔ تین صدیوں تک دنیا کی تاریخ اور اس کی بدترین خونریز جنگوں، استبداد اور استحصال کا یہ سلسلہ آزادی کے ایک لفظ، اس کے حقیقی اور مجازی معنی کو مزید روشن اور واضح کرتا رہا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ تین صدیوں کی اس کہانی میں جیت ہمیشہ آزادی کی نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی میں بے قید سرمایہ داری اور سامراج دونوں کو آخر کار اپنی ہار مان لینا پڑی۔ روس کے بالشویک انقلاب اور ہندستان کی تحریک آزادی کی کامیابی کی اہمیت یہی ہے کہ انھوں نے سرمایہ داری اور سامراج کے از کار رفتہ ہونے کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ فرد یا افراد کے کسی گروہ کو آزادی سے محروم کرنے والی سرمایہ داری یا سامراج دونوں کا کوئی اخلاقی جواز نہیں۔

بیسویں صدی میں جب انقلاب فرانس اور بالشویک انقلاب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا تو ان کے وہی پہلو قابل اعتراض پائے گئے جو فرد یا افراد کے کسی گروہ کی آزادی کی نفی کرتے تھے۔ اس لحاظ سے ہماری یہ بیسویں صدی حقیقی معنوں میں آزادی کی صدی ہے۔ انسانی حقوق کو آج جو تقدس حاصل ہے وہ گزشتہ تین صدیوں کی شدید کشمکش میں آزادی کے تصور کی جیت کا نتیجہ ہے۔

آزادی کے ایک لفظ کی اس داستان کا ایک پہلو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ افلاطون کی جمہوریت سے لے کر روسو کے معاہدۂ عمرانی تک اور پھر اس کے بعد آزادی کی ہر ذہنی و فکری تحریک نے اس پر زور دیا تھا اور یہ آزادی کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور ان کو پورا کرنے کا پہلو ہے۔ آزادی کبھی بے قید اور لامحدود نہیں ہوتی۔ ایک فرد کو انفرادی آزادی اس لیے ملنی چاہیے کہ یہ اس کا انسانی حق ہے لیکن کسی فرد کو کسی دوسرے کے انسانی حق کو پامال کرنے یا اس میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ روسو کے معاہدۂ عمرانی کا مفہوم یہی ہے کہ انسان اپنی انفرادی آزادی کو اجتماعی مفاد سے ہم آہنگ رکھے اور دونوں میں ٹکراؤ کی کوئی صورت نہ پیدا ہونے دے۔ ایک انگریز سیاست داں نے اس کی بڑی دل چسپ مثال میں کہا تھا کہ:

"آپ کو اپنے ہاتھ پھیلانے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ آپ اپنے ہاتھ دائیں بائیں یا آگے پیچھے جدھر چاہیں پھیلا سکتے ہیں لیکن جناب! آپ کی یہ آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک کی نوک شروع ہوتی ہے۔"

آزادی کی بنیاد آزادیوں کے احترام پر ہے۔ یہ آزادیاں افراد کی ہوں یا قوموں، ملکوں یا انسانی گروہوں کی، ہر حال میں ان کا احترام کرنا ہوگا۔ آزادی کے تصور کا یہ پہلو نہ صرف ساری دنیا کے انسانوں کو ایک کنبہ بناتا ہے بلکہ ایک ایسے عالمی نظام کا تقاضا بھی کرتا ہے جس میں دنیا کے تمام ملکوں قوموں اور انسانی گروہوں کے مفاد کو مساوات حاصل ہو۔ اسی طرح آزادی کے تصور کا یہ پہلو کسی ایک ملک مثلاً ہندستان کے آزاد شہریوں کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ وہ اس لیے آزاد ہیں کہ اپنے ملک کے تمام شہریوں کے مفادات کو اپنے مفاد اور ان کے انسانی حقوق کو اپنے انسانی حقوق کی طرح احترام کا درجہ دیں۔ ملک کی بہتری اور تعمیر کے لیے وہ ان سب قربانیوں میں برابر کے

(باقی ص ۴۸ پر)

ڈاکٹر سید محمود الحسن
شعبۂ اردو
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

اودھ کی لسانی وحدت

ہندستان کے لسانی ارتقاء کی جدید منزل اور یہاں کی مقامی بولیوں کے پس منظر تک پہونچنے کے لیے آریوں کی آمد اور آریائی زبانوں کے اس سلسلے کا مطالعہ ضروری ہے جس کے اثرات تین چار ہزار سال قبل سے ملنے لگتے ہیں۔ انھیں کے ذریعے غیر معمولی صوتی اور لسانی تغیرات رونما ہوئے اور اسی سے موجودہ زبانوں کی ابتدا اور ارتقاء کو آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔

ابھی تک اس بات کی قطعی اور یقینی تحقیق نہیں ہو سکی ہے کہ آریہ قوم ہندستان میں کب اور کہاں سے آئی۔ لیکن زیادہ تر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ خانہ بدوش لوگ تھے جو دنیا کے مختلف خطوں میں پھیل گئے۔ کسی منظم شکل میں کہیں مقیم نہیں ہوئے بلکہ تلاش معاش کے سلسلے میں جو مناسب جگہ مل سکی وہیں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو کر آباد ہو گئے۔ ہندستان ایک زرخیز ملک تھا یہاں آباد ہونے کی تمام آسانیاں موجود تھیں، اس لیے ان کی بڑی تعداد آگئی۔ بعض قدیم مذہبی کتابوں میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ آریہ لوگ تبت سے آئے۔ لیکن زیادہ تر علماء اس بات پر متفق ہیں کہ آریوں کا اصل وطن وسط ایشیا تھا۔ یہ لوگ جنوب مغربی روس کے علاقے سے چل کر عراق، ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے ہندستان پہنچے یورپ میں ان کی زبان "ہند یورپی" تھی۔ ایران کے قیام کے زمانے میں اسے "ہند ایرانی" کہا گیا۔ اور جب آریہ لوگ اپنی زبان بولتے ہوئے ہندستان آگئے تو اسے "ہند آریائی" کا نام دیا گیا۔

اسی لیے ڈاکٹر سنتی کمار چٹر جی نے لکھا ہے کہ :

"ہند یورپی زبان اور تمدن کا گہوارہ یوریشیا کے وہ میدان ہیں جن کا سلسلہ ایک طرف پولینڈ اور جرمنی سے ملتا ہے دوسری طرف کوہ یورال کے جنوب میں وسط ایشیا کے الطائی اور تھان شین پہاڑوں سے۔"

یہ بھی ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ آریہ لوگ ہندستان میں کب داخل ہوئے۔ ایران سے ان قبیلوں کے ہندستان کی طرف بڑھنے کی رفتار بہت سست تھی جو کئی نسلوں پر مشتمل ہے۔ غالباً ان کا ایک ایک گروہ کچھ دنوں تک ایک جگہ قیام کرنے کے بعد آگے بڑھ جاتا ہوگا۔ خود ان کو بھی یہ اندازہ نہ ہوگا کہ وہ کسی دوسرے ملک میں داخل ہو گئے۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ پہلا گروہ تقریباً پندرہ سو سال قبل مسیح ہندستان میں داخل ہوا ہوگا۔ آریوں کے مقابلے میں ہندستان کے قدیم بسنے والے ٹھہر نہ سکے اور عام طور سے شمالی ہند کے میدان خالی کر کے جنوب چلے گئے۔ لیکن نہ تو سبھوں کا جانا ممکن تھا اور نہ آریہ فاتحوں کے لیے مفید۔ اس لیے ان میں نسلی اختلاط اور لسانی اثرات شامل ہوتے گئے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں ایک طرح کے مشترک عناصر وجود میں آگئے۔ دور قدیم کی ویدک سنسکرت اور پالی زبانوں کو مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی کے زیر اثر اردو، ہندی، بنگالی، مرہٹی، پنجابی اور ہندستان کی دوسری جدید زبانوں کا وجود ہوا۔ اور اسی منزل سے عام زبانوں کا رواج شروع ہوا۔ جسے پراکرت کا نام دیا گیا۔ البتہ کچھ

عرصہ تک سنسکرت اور پراکرت ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ لیکن عوام میں پراکرتوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا اور اسی کی مختلف شکلوں میں جدید لسانی سلسلوں کی بنیادیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

یہاں یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ ماہر لسانیات نے ہند آریائی زبانوں کو قدیم، وسطی اور جدید تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ۱۵۰۰ قبل مسیح سے پانچ سو سال قبل مسیح تک مانا جاتا ہے جس میں ویدی اور سنسکرت زبانوں کا رواج زیادہ تھا اور ہندستان کی قدیم ترین کتاب "رگ وید" اسی عہد کی زبان سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن علمی زبان کے باوجود عوام کی بولی اس سے مختلف تھی اور گوتم بدھ نے اسی عام زبان کو ذریعہ اشاعت بنایا تھا۔

دوسرے دور کو چھ سو سال قبل مسیح سے ایک ہزار عیسوی تک کی مدت میں تقسیم کیا گیا ہے، اور اسی دور میں ماگدھی، اردھ ماگدھی اور شورسینی پراکرتوں کا رواج زیادہ بڑھ گیا تھا اور ایک ہزار عیسوی کے بعد اس منزل کا آغاز ہوا جب مختلف تہذیبوں کے اختلاط سے جدید زبانیں اپنی امتیازی خصوصیات کے ساتھ وجود میں آگئیں ہو سکتا ہے کہ دور جدید میں قدم رکھنے سے پہلے "اپ بھرنش" کی شکل میں سنسکرت اور علمی زبان اپنے معیار سے گر کر پراکرتوں سے زیادہ قریب ہو گئی ہوں۔ اور بول چال کی زبانیں دریا کے ایک تیز رو دھارے کی طرح ساحلوں کو توڑتی اور اپنے ساتھ خس و خاشاک لیتی ہوئی بہتی رہی ہوں۔ لیکن یہی دھارا پراکرتوں کو عبور کرتا ہوا جدید آریائی زبانوں تک پہونچ گیا۔ یعنی اپ بھرنش ارتقاء کی ایسی بنیاد تھی جس سے بہت سی زبانوں کا دھارا پھوٹ کر ادب کے وسیع و عریض دریا کی شکل میں موجیں مارنے لگا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ تغیرات خود بخود واقع ہو گئے تھے بلکہ تاریخی مذہبی اور معاشرتی اسباب نے ایسی ناگزیر صورت پیدا کر دی تھی کہ مختلف علاقوں کی زبانوں کا کینڈا الگ الگ شکل اختیار کرتا رہا۔ چنانچہ پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں:

"ہندستان، جس کے دروازے آنے والوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہے، تہذیبی یا لسانی یکسانیت کیونکر برقرار رکھ سکتا تھا۔ لیکن یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ مختلف قسم کے تہذیبی عناصر کے باوجود ہندستانی کلچر میں ایک مخصوص قسم کی وحدت نظر آتی ہے۔"

دراصل جدید ہند آریائی زبانوں کی تشکیل کا زمانہ سیاسی لحاظ سے سخت الٹ پھیر کا دور تھا اور ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی کا یہ خیال صحیح ہے کہ اگر مسلمانوں نے ہندستان میں فتوحات حاصل نہ کی ہوتیں تو بھی جدید ہند آریائی زبانیں وجود میں آتیں لیکن انھیں جو باوقار ادبی حیثیت حاصل ہو گئی اس میں ضرور دیر ہوتی" کیونکہ ان کے جلو میں ایک نیا تمدن اور ایک نئی زبان آ رہی تھی۔ انھوں نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندستان کی نئی زبانوں کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا۔"

اس طرح ہندستان کی زبانوں کو علاقائی حیثیت سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

شمال مغربی۔ جنوب مغربی۔ وسطی۔ مشرقی اور جنوبی

ان مختلف حصوں میں بہت سی بولیوں کے دھارے بہہ رہے تھے۔ لیکن ان میں ایک طرح کا علاقائی اشتراک ضرور موجود تھا۔ انھیں مختلف علاقوں میں مشرقی ہندی کی شاخ سے جو بولیاں وجود میں آئیں انھیں میں ایک اودھی بھی ہے، جو بعض جدید زبانوں میں ضم ہو جانے کے باوجود اپنے قدیم ادبی سرمایے کی وجہ سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس کے نام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض "اودھ" ہی تک محدود ہوگی۔ لیکن یہ قدیم دور کے پورے کوشل راج میں پھیلی ہوئی تھی، جو ایک طرف مغرب میں ہردوئی تک اور دوسری طرف اودھ سے باہر کے فتح پور، الہ آباد، جون پور اور مرزا پور اضلاع کے بعض حصوں میں رائج ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مشرقی ہندی ہی کے علاقے میں قنوجی، بندیلی، بھوجپوری اور چھتیس گڑھی بولیوں سے گھری ہوئی تھی۔ اور ان میں اتنی گہری مماثلت تھی کہ امتیاز مشکل ہے بلکہ ان سب کا مروجہ نام اودھی ہی پڑ گیا۔

دوسری طرف مغربی ہندی کے سلسلے کی برج بھاشا اور کھڑی بولی کا علاقہ بھی اس سے بہت قریب تھا جس سے بعض جگہ الفاظ جملوں کی ساخت اور ادبی خصوصیات میں یکسانیت نظر آجاتی ہے البتہ لہجہ اور آوازوں کا اختلاف ان کے امتیازی فرق کو قائم رکھتا ہے جو اودھ کے مغربی وسطی اور مشرقی حصوں میں صوتی لحاظ سے ایک دوسرے سے اختلاف نظر آتا ہے اور اسی فرق کے پیش نظر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اودھی کے مغربی علاقے میں کھیری، سیتاپور، لکھنؤ، اناؤ، فتحپور کو۔ وسطی میں بہرائچ، بارہ بنکی، رائے بریلی کو۔ اور مشرقی میں سلطان پور، فیض آباد، گونڈہ، پرتاپ گڑھ، الٰہ آباد، مرزاپور اور جون پور اضلاع کی تقسیم کر کے اس زبان کے باریک فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ گروہ بندی محض بول چال تک نظر آسکتی ہے۔ ادبی حیثیت سے اودھ کا پورا علاقہ بلکہ اس کے قرب جوار کے بعض حصے بھی ایک ہی رشتے میں پروئے ہوئے ہیں، جو ابتدائی دور سے آج تک اپنی روایات پر پوری طرح قائم ہیں۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، گیارھویں اور بارھویں صدی کے بعد ہی مختلف اپ بھرنشوں سے الگ الگ زبانوں کا ڈھانچہ تیار ہوا چنانچہ اودھی کا تشکیلی دور بھی یہی ہے۔ لیکن چودھویں صدی سے پہلے اس کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ سب سے پہلے امیر خسرو نے اپنی مثنوی "نوسپہر" میں (۱۳۱۶ء م۔ ۷۱۸ھ) اودھی کا تذکرہ ایک زبان کی حیثیت سے کیا ہے۔ وہ ہندوستان کی سبھی زبانوں کو "ہندوی" قرار دیتے ہیں اور مختلف علاقوں کی بولیوں کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے خیالات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اودھ کے علاقے کی زبان کو چودھویں صدی سے ہی اودھی کا نام دیا جا چکا تھا اور اسی زمانے سے اس زبان میں ادبی تخلیقات کا سلسلہ ملنے لگتا ہے۔ ہندی اور اودھی تاریخ کے ماہرین کے خیال میں ملا داؤد کی نظم "چندائن" (یا چندارت) اودھی کی پہلی تخلیق کہی جا سکتی ہے جو فیروز شاہ تغلق کے عہد (۱۳۷۰ء) میں لکھی گئی۔

ملا داؤد رائے بریلی ضلع کے ڈلمؤ قصبے کے رہنے والے تھے اور ایسے مدرسے میں تعلیم دیتے تھے جسے فیروز شاہ نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے قائم کیا تھا۔ یہ نظم بہ ظاہر ایک عشقیہ مثنوی ہے، جس میں لورک نامی عاشق اور اس کی محبوبہ چاندہ کے دلی جذبات کو پیش کیا گیا ہے لیکن اس کا ایک سرا تصوف کی اس منزل سے بھی مل جاتا ہے جس میں عشق حقیقی ہی سب کچھ ہے۔ مشہور مورخ البیرونی نے "منتخب التواریخ" میں لکھا ہے کہ یہ نظم مقبول عام تھی۔ یہاں تک مشہور صوفی مخدوم شیخ تقی الدین جب منبر پر اس نظم کے اقتباسات سناتے تھے تو بڑا گہرا اثر پڑتا تھا۔

اودھی زبان سے تعلق رکھنے والی اس نظم کو دہلی میں بھی مقبولیت حاصل تھی اور اودھ میں بھی اور بعد میں صوفی اور رام بھگتی کے شعرا کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کی ابتدائی منزل اسی نظم کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی زبان جسے البیرونی نے "ہندوی" کا نام دیا ہے اس میں اودھی کے ساتھ برج بھاشا اور کھڑی بولی کے عناصر بھی شامل ہوں لیکن اودھی کے ابتدائی نقوش یہاں سے ابھرنے ضرور لگتے ہیں اور یہی مختلف بولیوں کے امتزاج و اشتراک نے اسے ایک انفرادی حیثیت بخش دی ہے۔ ☐☐

یوم آزادی .... ص۵ کا بقیہ

شریک ہوں جو پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل حل کرنے کی خاطر ہندستان کے ہر شہری کو دینا پڑیں گی۔ ہندستانی جمہوریت اس وقت اسی مرحلے سے گزر رہی ہے۔ ہندستان کو اتنے بڑے معاشی اور مالیاتی بحران کا سامنا ہے جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس صورت حال میں کوئی فرد، کوئی سیاسی پارٹی یا کوئی واحد سیاسی رہنما مسائل کے حل کا راستہ نہیں نکال سکتا۔ کیونکہ سیاسی اور معاشی آزادی کی سلامتی کا دارومدار اس معاہدہ عمرانی پر ہے جس کے تحت آزادی کے حق کو حاصل کر لینے والے افراد اپنی ذات اور اپنے سماج کے تمام افراد کی خاطر آزادی کا وہ محصول ادا کریں جو ذمہ داریوں کو پورا کر کے ہی ادا کر سکتے ہیں۔

یوم آزادی کی رسمی مسرت کے پہلو بہ پہلو فرض، قربانی اور دوسروں کی آزادیوں کا احترام ضروری ہے۔

نیاز جیراجپوری
عالم میڈیکل ہال۔ پہاڑپور
اعظم گڑھ

پیغامِ آزادی

مبارک ہو ہمیں یہ جشنِ آزادی وطن والو
مبارک ہو ہمیں بارش یہ خوشیوں کی وطن والو
خوشی کے گیت گاتی ہیں ہوائیں بھی وطن والو
فضائیں آج ہیں رنگین سی کتنی وطن والو

نظر جس سمت بھی جائے خوشی کے پھول کھل جائیں
چلو ہم ایک ہو جائیں گلے کچھ ایسے مل جائیں

دلوں میں داغ ہیں جو بغض و نفرت کے مٹا ڈالیں
جڑیں فرقہ پرستی کی چلو ہم تم ہلا ڈالیں
جُدا جو ہم کو کرتی ہیں وہ دیواریں گرا ڈالیں
دلوں کے درمیاں جو فاصلے ہیں وہ مٹا ڈالیں

وطن اپنا ہے سبھی اپنے تو پھر ہو غیر کیوں کوئی
ہمیں جب ساتھ رہنا ہے تو پھر ہو بیر کیوں کوئی

چلو ہم آج مل جل کر خوشی کے گیت گاتے ہیں
چلو پچھلے دنوں کی ساری باتیں بھول جاتے ہیں
چلو ہم جشنِ آزادی کی خوشیاں یوں مناتے ہیں
چلو اک دوسرے کو آج ہم اپنا بناتے ہیں

چلو کھالیں قسم ہم آج کے دن یہ حلف لے لیں
نہیں ہم سوکھنے دیں گے کبھی یک جہتی کی بیلیں

محبت ہے اگر ممکن تو نفرت کیوں کرے کوئی
اگر تعریف ہے ممکن شکایت کیوں کرے کوئی
دلوں میں کیوں رکھے نفرت عداوت کیوں کرے کوئی
ملیں جب پھول تو کانٹوں کی حسرت کیوں کرے کوئی

وطن اپنا وہ گلشن ہے جسے یہ فخر ہے حاصل
بہت سے پھول ہیں اس میں سبھی ہیں پیار کے قابل

لگائیں آگ جو فرقہ پرستی کی انھیں ڈھونڈیں
بنائیں نرک جو اس دیس کی دھرتی انھیں ڈھونڈیں
کریں پیدا ہمارے درمیاں دوری انھیں ڈھونڈیں
وطن میں ہیں اگر اپنے کچھ ایسے بھی انھیں ڈھونڈیں

کسی دشمن کو ہم اس دیس میں رہنے نہیں دیں گے
وطن میں خون کی ہم ندیاں بہنے نہیں دیں گے

دلوں میں عزم یہ لے کر منائیں جشنِ آزادی
نہ ہونے دیں گے اپنے دیس میں ہم کوئی بربادی
ہمارے دل میں رقصاں ہوگی یہ خوشیوں کی شہزادی
نظر آئے گی سندر سورگ سے ہر ایک آبادی

وطن کی اور بھی ہم کو بڑھا کر شان چلنا ہے
دلوں میں آج سے لے کر یہی ارمان چلنا ہے

ہمارے ذہن و دل سے بغض و نفرت سب نکل جائے
محبت، دوستی، اخلاص ذہن و دل بدل جائے
زمینِ خشک پہ جیسے کوئی چشمہ اُبل جائے
اندھیری رات میں جیسے کوئی سورج نکل جائے

نہیں مشکل، اگر ہم چاہیں ایسا ہو ہی جائے گا
جہاں کے آئینے میں دیس اپنا مسکرائے گا

وطن کے پاسباں ہیں ہم وطن کی آبرو ہم ہیں
اگر خوش حال ہے اپنا وطن تو سرخرو ہم ہیں
وطن اپنا ہے گلشن اور اسکے رنگ و بو ہم ہیں
نیازؔ اب ایک ہو جانے کی کرتے آرزو ہم ہیں

اگر ہم ایک ہو جائیں وطن خوش حال ہو جائے
اگر ہم نیک ہو جائیں وطن خوش حال ہو جائے

اوپیندر ناتھ اشک
۵۔ خسرو باغ روڈ
الٰہ آباد

چھوٹی سی پہچان

۱۹۴۵ء کی بات ہے 'فلمستان' کے بلاوے پر میں بمبئی چلا گیا۔ کلیر روڈ پر اردو کے مشہور افسانہ نگار منٹو کے یہاں ٹھہرا۔ فلمستان کا اسٹوڈیو گورے گاؤں میں تھا۔ کلیر روڈ کو سینڈ ہرسٹ روڈ اسٹیشن لگتا تھا اور گورے گاؤں وہاں سے دس بارہ اسٹیشن آگے تھا۔ پورا ڈیڑھ گھنٹہ صبح اور ڈیڑھ گھنٹہ شام ـــــ تین گھنٹے برباد ہو جاتے تھے۔ منٹو نے اصرار کیا کہ میں اس کے یہاں یا کلیر روڈ پر کہیں اس کے قریب رہوں، لیکن مجھے اتنا وقت نواحی گاڑیوں کے سفر میں برباد کرنا منظور نہ تھا۔ میں شروع ہی سے چوبیس گھنٹے کا ادیب رہا ہوں، اور اگر زندگی کا ساتھ نباہنے کے لیے شروع کی زندگی میں ملازمت کرنی پڑی ہے تو میں نے ہمیشہ کوشش یہی کی ہے کہ ملازمت کے اوقات سے جو بھی وقت بچے اسے اپنے لکھنے پڑھنے میں لگاؤں۔ اس لیے میں نے کمپنی کے کنٹرولر آف پروڈکشنز (فلمی دنیا کے مشہور پروڈیوسر) ششدھر مکرجی سے اصرار کیا کہ مجھے اسٹوڈیو کے پاس ہی مکان دلا دیا جائے۔ یوں کہوں کہ میں نے معاہدہ کی ایک ضروری شرط یہ بھی رکھی کہ اسٹوڈیو کے قریب ہی مکان ملے گا تو میں کام کروں گا، ورنہ فوجی اخبار کی اپنی ملازمت پر واپس چلا جاؤں گا۔

'فلمستان' کے بیشتر ملازم ہی نہیں، چار میں سے تین ڈائرکٹر بھی کچھ سال پہلے تک 'بامبے ٹاکیز' میں کام کرتے تھے۔ مالکوں میں نااتفاقی کے باوجود ملازم آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ فلمستان کے بہت سے کام کرنے والے گورے گاؤں سے ایک اسٹیشن آگے ملاڈ میں مقیم تھے۔ جہاں بامبے ٹاکیز کا اسٹوڈیو تھا۔ جب میں نے مکان کے بغیر کام کرنے سے انکار کر دیا تو مکرجی نے کمپنی کے اسسٹنٹ کیمرہ مین مارشل برگینزا کے ساتھ مجھے بامبے ٹاکیز کے پروسسنگ ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے والے کیشو بھائی کے پاس بھیجا، جن کا ایک بڑا سا بنگلہ ملاڈ میں تھا اور بنگلے کے پیچھے دو منزلہ کوارٹر تھے۔

ان دنوں بھگوتی بابو (ہندی کے مشہور ناول نگار بھگوتی چرن ورما) اور ہندی کے مشہور اور ہر دلعزیز گیت کار نریندر شرما وہیں 'بامبے ٹاکیز' میں ملازم تھے۔ اس وقت تک اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں لکھتے ہوئے مجھے ایک دہائی گزر چکی تھی اور میں ہندی کے ادبی حلقوں میں بھی خاصا مشہور ہو گیا تھا۔ 'بامبے ٹاکیز' میں گیا تو کیشو بھائی سے مل کر نریندر شرما سے ملنے چلا گیا۔ نریندر دوستوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ انھوں نے سب سے میرا تعارف کرایا اور اپنے دوستوں کے نام بھی مجھے بتائے لیکن ایسی سرسری ملاقاتوں میں کسی کا نام کہاں یاد رہتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی کوئی نام اپنی خصوصیت کے باعث یاد بھی رہ جاتا ہے اور نریندر شرما کے دوستوں میں مجھے ایک نام یاد رہ گیا: ـــــ مسٹر چونڈیا ـــــ نام تو نہیں، شاید سرنیم! پورا نام نریندر نے بتایا بھی نہیں، نہ میں نے پوچھا۔ بامبے ٹاکیز میں وہ اسی نام سے یاد کیے جاتے تھے۔

مسٹر چونڈیا نہ ادیب تھے، نہ شاعر، نہ ڈرامہ نگار۔ و

بلسمبے ٹاکیز کے آرٹ یا پراپرٹی ڈپارٹمنٹ میں کسی اعلا عہدے پر فائز تھے۔ ان کے نام اور ان کی دھندلی سی صورت کے علاوہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ لیکن نریندر شرما کے کمرے کی وہ سرسری سی ملاقات ——— وہ چھوٹی سی پہچان وقت پڑنے پر اتنے کام آئے گی، میری زندگی بچانے میں مدد و معاون ثابت ہوگی، اس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

مجھے کیشو بھائی کا مکان مل گیا۔ درحقیقت ان کے بنگلے میں کوئی پورشن خالی نہیں تھا۔ اس کے سب حصے کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ مکرجی کے زور دینے پر کیشو بھائی نے مجھے بنگلے کا وہ بالائی حصہ دے دیا، جس میں وہ خود اپنے بڑے بھائی اور بہن کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ تو مالی کی کوٹھری میں اٹھ گئے اور مالی نے کھلے آسمان کے نیچے بستر بچھالیا۔ بعد میں انھوں نے مالی کی کوٹھری کو بھی پکے کمرے میں تبدیل کر لیا اور مالی کے لیے کچھ دور بھینس کے چھپّر کے ساتھ شیڈ بنوا دیا۔

کیشو بھائی کا بنگلہ ملاڈ اسٹیشن سے بالکل قریب تھا۔ کسی زمانے میں وہ ویران پڑا رہتا تھا اور ان لوگوں پر خاصہ قرض چڑھا ہوا تھا لیکن اب بنگلے میں نوکروں کے کوارٹر تک دو منزلہ بن گئے تھے اور ان میں کرائے دار رہتے تھے۔ ایک کمرہ تک خالی نہ تھا۔ اسی بنگلے کے پیچھے ایک حصہ میں اداکارہ مدھوبالا اپنے والد خان صاحب اور اپنی چھوٹی بڑی چھ بہنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ مجھے جو پورشن ملا، اس میں ایک بڑا اور ایک چھوٹا — دو کمرے تھے۔ کسی زمانے میں اس کا کرایہ صرف پندرہ روپئے تھا، لیکن مجھے سو روپئے مہینہ دینا پڑا...... مسٹر چوڑ ڈیا اسی سڑک پر کچھ آگے رہتے تھے کبھی سڑک پر آ جاتے، کبھی گاڑی کے ڈبے میں یا کبھی کسی فلمی پارٹی میں ان سے ملاقات اور علیک سلیک ہو جاتی۔ ہمارا تعلق اس سے زیادہ بڑھ کر کبھی دوستی میں تبدیل نہیں ہوا، نہ کبھی وہ ہمارے گھر آئے، نہ کبھی میں ان کے یہاں گیا اور دو سال گزر گئے۔

———

نومبر ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ میں فلمستان چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میری بیوی کچھ سامان لے کر لاہور چلی گئی تھی اور میں 'اپٹا' (انڈین پیپلز تھیٹرز ایسوسی ایشن) کے لیے اپنا ایک بابی ڈرامہ "طوفان سے پہلے" تیار کرا رہا تھا۔ میں نے وہ ڈرامہ بنے بھائی کے اصرار پر فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف لکھا تھا اور اس کا ہندی ترجمہ سجاد ظہیر مرحوم کے دیباچے کے ساتھ پیپلز پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوا تھا۔ بیوی کی غیر حاضری میں وقت سے گھر پہونچنے کی ویسی قید نہیں تھی۔ میں اسٹوڈیو سے سیدھا سینڈہرسٹ روڈ اور وہاں سے اوپیرا ہاؤس پہونچتا جس کے سامنے دیودھر ہال میں ہر روز ڈرامے کی ریہرسل ہوتی تھی۔ کھانا کبھی وہیں کسی ریستوراں میں کھا لیتا، کبھی نہیں کھاتا۔ اکثر دیر ہو جاتی اور کئی بار تو آخری گاڑی سے واپس آتا۔ ایک دن بے موسم کی بارش ہو جانے سے میں بھیگ گیا۔ اس پر گاڑی کی تیز ہوا.... سردی کھا گیا۔ معمولی بخار سمجھ کر حکیم کی دوا کرتا رہا، لیکن جب ساتھ میں درد قولنج بھی شروع ہو گیا اور ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا اور کمزوری خوفناک حد تک بڑھ گئی تو میں نے بیوی کو تار دے دیا۔

مجھے اس قدر نقاہت ہو گئی تھی کہ ذرا چلنے اور کچھ کام کرنے سے حرارت ہو جاتی تھی۔ پھر سردی کے باوجود رات کو پسینے سے میرے کپڑے تر ہو جاتے اور بسا اوقات دو دو تین تین بار مجھے کپڑے تبدیل کرنے پڑتے۔ مجھے خیال گزرا کہ ہو نہ ہو، مجھے ٹی۔بی ہو گئی ہے۔ اپنی بھابی اور پھر اپنی پہلی بیوی کو میں اس مرض کا شکار بنتے دیکھ چکا تھا اور مجھے اس کی پہچان تھی۔

———

میری بیوی آئی تو میں نے اپنے شک کا اظہار اس سے کر دیا۔ معمولی عورت ہوتی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ لیکن میری بیوی عام عورت نہیں ہے۔ مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہے۔ اس نے کہا "اول تو آپ کو یوں ہی وہم ہے، لیکن اگر آپ کا وہم صحیح بھی نکلا تو گھبرانے کی کیا بات ہے، علاج کر لیا جائے گا۔"

انھیں دنوں، جب ہم خاصے پریشان تھے اور طے نہیں

رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ایک دن حکیم کے یہاں جاتے ہوئے (اُن دنوں بمبئی کے ایک مشہور حکیم پر میرا اعتقاد تھا) چورڈیا صاحب گاڑی کے ڈبے میں مل گئے۔

"آپ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔" انھوں نے اچانک کہا۔

میں نے اپنی بیماری کا ذکر کیا اور اپنا شک بھی ظاہر کر دیا۔

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟" چورڈیا صاحب نے مجھے حوصلہ بندھاتے ہوئے کہا۔ "ٹی۔ بی تو آج کل نزلہ زکام جیسی ہوگئی ہے آپ پہلے اپنی بیماری کی اچھی طرح تشخیص کرا لیجیے۔ آپ کا خدشہ صحیح نکلا تو بھی خوف کی کوئی بات نہیں۔ آپ کو ہم پنچ گنی بھجوا دیں گے ابھی ہمارے چکرورتی صاحب (راجشری پکچرز کے ڈائرکٹر آدیہ چکرورتی) ایک دم صحت یاب ہوکر لوٹے ہیں۔"

میں نے انھیں بتایا کہ دو سال بمبئی میں رہنے کے باوجود میں یہاں کسی اچھے ڈاکٹر کو نہیں جانتا اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے دکھاؤں"؟

"آپ ہی ہمیں کسی اچھے ڈاکٹر کا نام بتائیں۔" بیوی نے التجا کی۔

"آپ پیشہ ور ڈاکٹروں کے چکر میں نہ پڑیے۔" چورڈیا صاحب بولے "کے۔ ای۔ ایم اسپتال میں بھرتی ہو جائیے اور پوری طرح سے اپنا معائنہ کرائیے۔ بمبئی میں ہر بیماری کے ایکسپرٹ ہیں۔ بیماری کا پتہ چل جائے تو پھر علاج کرانے میں دقت نہیں ہوتی۔"

اور میری بیوی نے (جو باطن میں بہت پریشان تھی، مگر بظاہر متانت کا بھرم بنائے تھی) کہا کہ وہ تو مجھے اسی دن بھرتی کرا دے مگر اس نے سُنا ہے کہ وہاں بھرتی کرانے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔

"آپ فکر نہ کیجیے۔" چورڈیا صاحب نے تسلی دی۔ "میرے ایک دوست وہاں ڈاکٹر ہیں۔ میں اُن کی جی کو بھرتی کرا دوں گا۔"

چورڈیا صاحب کو باندرا اُترنا تھا۔ میری بیوی نے انھیں ایک بار پھر یاد دلایا کہ وہ بھول نہ جائیں اور انھوں نے گاڑی سے اُترتے اُترتے کہا کہ ہو سکا تو وہ شام ہی کو ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر آئیں گے"......

چورڈیا صاحب چلے گئے، تو میری بیوی مجھے اسپتال میں داخل ہوکر پوری طرح معائنہ کرانے کے فوائد سمجھانے لگی۔ میں نے چڑ کر کہا۔

"جانچ کرانے کی ضرورت نہیں، میں جانتا ہوں کہ مجھے دِق ہے۔"

لیکن میری بیوی بغیر معائنہ کرائے میری بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ دراصل وہ دل ہی دل میں چاہ رہی تھی کہ میری بات سچ نہ ہو، کوئی معمولی سی بیماری نکل آئے اور وہ مجھے ڈانٹ سکے کہ میں بیکار ہی گھبرا جاتا ہوں۔ "ٹی۔ بی ہے تو ٹی۔ بی کا علاج کریں گے"۔ اس نے کہا۔ "لیکن جانچ آپ کرا لیجیے۔ چورڈیا صاحب سب انتظام کر دیں گے"۔

"چورڈیا صاحب سب انتظام کر دیں گے" ــــ میں نے ہلکی سی تلخی اور طنز سے اس کی بات دُہرا دی۔ مجھے بمبئی کی فلمی دُنیا اور اس کے وعدوں کی اصلیت معلوم تھی۔ سامنا ہونے پر بڑے سے بڑا وعدہ کر لینا اور پیٹھ موڑتے ہی بھول جانا فلم والوں کے لیے روزمرّہ کی بات تھی۔ "چورڈیا صاحب انتظام کر دیں گے" ــــ میں دل ہی دل میں بیوی کی سادہ لوحی پر ہنسا اور میں نے کہا۔

"چورڈیا صاحب کا چکر چھوڑو۔ تم ان فلمی دُنیا والوں کو نہیں جانتیں۔ کرشن یا عباس سے کسی ٹی۔ بی کے ڈاکٹر کا پتہ کرو اور مجھے وہیں لے چلو۔"

لیکن چورڈیا صاحب اسی شام اپنے ڈاکٹر دوست کے ساتھ آگئے۔ انھوں نے دوست کا تعارف کرایا۔ "ڈاکٹر یو۔ کے سیٹھ۔" لمبے تگڑے نوجوان، خوبصورت اور ہنس مکھ ــــ سال بھر پہلے انھوں نے ایم۔ بی۔ بی ایس کیا تھا اور اب کے۔ ای۔ ایم اسپتال میں ٹریننگ لے رہے تھے۔

ڈاکٹر سیٹھ نے میرا معائنہ کیا اور میری بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ گھبرائیں نہیں، صبح اسپتال چلے آئیں۔ میں انھیں داخل کرا دوں گا۔" چلتے چلتے انھوں نے سمجھایا کہ اسپتال میں بیڈ خالی نہیں ہے۔ اگر ڈیوٹی پر کا ڈاکٹر کہے کہ آپ کو فرش پر سونا پڑے گا تو آپ انکار نہ کیجیے گا۔ آپ داخل بھر ہو جائیں، پھر ایک آدھ دن بعد آپ کو بستر مل جائے گا۔"

اور دوسرے دن شام کو چورڈیا صاحب ہمارے ساتھ اسپتال جاکر

(باقی ص ۲۷ پر)

ڈاکٹر کبیر الدین خاں وارثی
جگدیش پور۔ بھوجپور (بہار)

جنگ آزادی اور اُردو شعراء

جب کبھی ہندستان کی آزادی کے بارے میں ہم غور کرتے ہیں تو اُردو شعراء آزادی کی ہر منزل پر اسی جوش و خروش کے ساتھ رہنمایان قوم کے شانہ بشانہ نظر آتے ہیں جس طرح دوسری زبانوں کے قلم کار بلکہ اس سلسلے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آزادی کی جنگ میں حصّہ لینے والے اُردو کے بہت سے قلم کار صفِ اوّل کے لیڈروں میں بھی شمار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً بال گنگا دھر تلک کے بعد مولانا حسرت موہانی دوسرے شخص ہیں جن کو انگریزوں نے سیاسی نقطہ نظر سے خطرناک تصور کیا اور انھیں جیل بھیج دیا۔ مولانا حسرت موہانی کے علاوہ ہندستان کے صفِ اوّل کے قومی رہنماؤں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، علامہ اقبال اور بہت سے دوسرے اعلا پایہ کے اُردو شعراء اور ادبا بھی شامل ہیں اس طرح جنگ آزادی کی جدوجہد جب اپنے ابتدائی دور میں تھی تو غالب کا یہ قطعہ کس قدر معنی خیز تھا ؎

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

اس سے نہ صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ غالب کے دل میں انگریزوں کے خلاف کس قدر غم و غصہ موجزن تھا بلکہ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو شعراء صرف دہلی کی تباہی و بربادی کا رونا نہیں روئے بلکہ ان کی آواز میں احتجاج کی لے کا اضافہ بھی ہوگیا یہی وہ زمانہ تھا جب انگریز فوج شہر کے گوشہ گوشہ میں ظلم وستم ڈھا رہی تھی اور سرِ عام پھانسیاں دی جا رہی تھیں۔ ہر طرف خوف و دہشت کا منظر عام تھا۔ یہاں تک کہ لوگ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان حالات کا بیان داغ دہلوی نے بھی اپنے ایک شعر میں کیا ہے ؎

مقام امن جو ڈھونڈھا تو رہ بھی نہ ملی
وہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

اور پھر حالی جیسے شاعر کے لب و لہجہ میں بھی تلخی و تندی جھلکنے لگی۔ جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
لکھے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
جس کو زخموں کے حوادث سے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانہ ہرگز

جب اُردو شاعر اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو قید کرکے رنگون لے جایا جا رہا تھا۔ اس وقت ان کو خاک وطن سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کا بے حد قلق تھا، جیسا کہ ان کے اس شعر سے واضح ہوتا ہے ؎

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

یہی نہیں، اودھ کے نواب واجد علی شاہ اختر کو گرفتار کر کے مٹیا برج کلکتہ لے جایا گیا۔ اس موقع کا ان کا یہ شعر کتنا درد انگیز تھا۔ ملاحظہ ہو ؎

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

جیسے جیسے آزادی کی جدوجہد میں اضافہ ہوتا گیا اردو شعرا کا قافلہ بھی اپنی تباہیوں اور بربادیوں کی داستان سمیٹے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ ان میں کچھ شعرائے کرام تو عملی طور پر تحریک آزادی میں شامل ہوئے اور قید خانوں کی مصیبتیں برداشت کیں۔ دوسرے شعرا نے حب الوطنی اور آزادی کے جذبے سے سرشار اپنی نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ جنگ آزادی میں جو شعرائے کرام اپنے قلم کے ساتھ شامل ہوئے ان میں رام پرشاد بسمل، مولانا حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، اختر شیرانی، احمق پھپھوندوی، درگا سہائے سرور جہان آبادی، گوپی ناتھ امن، مولانا محمد علی جوہر، جمیل مظہری، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، ظفر علی خاں اور فراق گورکھپوری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بھگت سنگھ کے ایک ساتھی رام پرشاد بسمل تھے جو اردو کے مشہور شاعر بھی تھے۔ ان کو انگریزوں نے پھانسی دے دی تھی ان کی زبان سے نکلا ہوا یہ شعر آج بھی ہر وطن دوست کی زبان پر موجود ہے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ان شعرا کے علاوہ اردو کے بہت سے شعرا ایسے بھی تھے جنھوں نے عملی طور پر تو جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا لیکن اپنی شاعری سے آزادی کی تحریک کو تیز کیا۔ یہ بات ضرور ہے کہ یہ شعرا مجاہدین آزادی کی صف میں کھڑے نہیں ہوئے لیکن بہ حیثیت قومی شاعر کے ان کی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا مثلاً پنڈت برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، احسان دانش، حفیظ جالندھری، آنند نرائن ملا، ساغر نظامی، جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، کیفی اعظمی وغیرہ۔

آزادی کی تحریک کے دوران اردو شعرا کو قید خانوں سے بھی سابقہ پڑا۔ لیکن اس سے ان کے دل و دماغ پر منفی اثر نہیں ہوا اور نہ ان کے ارادے میں کوئی کمی آئی بلکہ قومی شاعری کا سلسلہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ قید خانوں میں شعر و سخن کا بازار گرم رہتا تھا اور وہاں پڑھی جانے والی نظمیں اور غزلیں زیادہ تر حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات اور احساسات سے لبریز ہوا کرتی تھیں۔

آزادی کی جدوجہد کے دوران جو اہم واقعات پیش آئے، اردو شعرا نے ان کے متعلق بے شمار نظمیں لکھیں۔ مثلاً حسرت موہانی نے چکی کی مشقت کا ذکر غزل میں کر دیا ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مجاہدین آزادی کی گرفتاری پر برج نرائن چکبست نے "فریاد قوم" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ جلیان والا باغ میں جب آزادی کے دیوانوں پر گولی چلائی گئی تو اس واقعہ کا بیان تلوک چند محروم نے اپنی نظم "شکوۂ صیاد" اور ظفر علی خاں نے اپنی نظم "مارشل لا" میں کیا۔ سائمن کمیشن کے خلاف گاندھی جی کے نعرہ پر تو لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ برٹش سرکار نے لوگوں پر لاٹھی چارج کرایا۔ اس سلسلے میں نہرو جی کی گرفتاری بھی ہوئی۔ اس حادثے کو محترمہ نوشابہ خاتون نے اپنی نظم "پولیس لاٹھی چارج" میں اور ظفر علی خاں نے اپنی نظم "سائمن کا مقاطعہ" میں بیان کیا۔

انقلابی شاعروں میں ایک اہم نام علی سردار جعفری کا بھی ہے وہ خود تو جدوجہد آزادی میں شریک تھے ہی۔ انھوں نے آزادی کی لڑائی میں شامل ہونے کے لئے کسانوں اور مزدوروں کو بھی للکارا ؎

اٹھو ہند کے باغبانو! اٹھو
اٹھو انقلابی جوانو! اٹھو
کسانوں اٹھو کامگارو! اٹھو
نئی زندگی کے شرارو! اٹھو

غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

(باقی ص ۳۹ پر)

ناوک حمزہ پوری
ڈاکخانہ شیر گھاٹی
ضلع گیا

خوشا کہ آیا پھر امسال یوم آزادی

خوشا کہ آیا پھر امسال یومِ آزادی
خوشا کہ آج مناتی ہے قوم آزادی

خوشی سے چشم براہ آج پھر ہے فرشِ زمیں
ہے سر بلند مسرّت سے آج عرشِ بریں

نسیمِ صبح پھر اٹھلا کے آج چلتی ہے
کرن افق پہ خوشی کے گلال ملتی ہے

نثار ذرّہٗ ہندوستاں ہیں لعلِ ختن
پھر آج ہوگئی جنّت نظیر ارضِ وطن

اُچھل رہے ہیں دلوں میں خوشی کے فوّارے
ہیں جنّتِ دل و دیدہ تمام نظّارے

تمام لوگ ہیں مستِ خمارِ آزادی
اُمنڈ پڑی ہے خوشی میں تمام آبادی

مسرّتوں کے خزانے زمیں اُگلتی ہے
نئی اُمنگ دلِ قوم میں مچلتی ہے

پھر آج نعرۂ جے ہند گونج اُٹھا ہے
پھر آج پرچمِ قومی فلک کو چھوتا ہے

گھڑی یہ عیش کی اللہ جاوداں کر دے
ہمیں تو یک دل و یک جان و یک زباں کر دے

مہدی پرتاپ گڑھی
معرفت ایگزیکیوٹو انجینئر
اریگیشن ڈویژن
پرتاپ گڑھ

دیش کی خاطر مٹادیں اپنے سارے بھید بھاؤ

آیئے مل جل کے برپا جشنِ آزادی کریں
زندگی کی نعمتوں سے دامنِ ہستی بھریں

کتنی ہی قربانیوں کے بعد آزادی ملی
کتنی ہی ناکامیوں کے بعد سرشاری ملی

ایک ہی آہنگ پر اٹھے تھے جب پیر و جواں
لے کے انگڑائی اٹھا پھر اک نیا ہندوستاں

ہندو مسلم سکھ عیسائی چلے جو مل کے ساتھ
اپنی آزادی کی کشتی آ گئی ساحل کے ساتھ

جہدِ آزادی سے زنجیرِ غلامی کٹ گئی
آفتابِ تازہ ابھرا، تیرگی جاتی رہی

کتنے ہی در باز تعمیر و ترقی کے ہوئے
خاک منصوبے یہاں فرقہ پرستی کے ہوئے

دوستی، مہر و مروّت ہیں روایاتِ کہن
ان کے باعث آج بھی قائم ہے حسنِ انجمن

فرض ہے ہم پر کہ ہم ایسی نگہداری کریں
سر کسی تخریب کا اٹھے تو اس کو کاٹ دیں

اپنی آزادی کی نعمت کی حفاظت کے لیے
شرط ہشیاری ہے مستقبل کی راحت کے لیے

مختلف انواع کے پھولوں سے ہے حسنِ چمن
مختلف قوموں کا گہوارہ ہے یہ میرا وطن

ہے یہی کثرت میں وحدت اپنی آزادی کی دین
ہے یہی پاسِ محبت اپنی آزادی کی دین

آؤ مل جل کر بڑھائیں اپنی دنیا کا وقار
شمعِ آزادی پہ ہم بھی جان دیں پروانہ وار

جشنِ آزادی منائیں اور کریں اک عہد آؤ
دیش کی خاطر مٹادیں اپنے سارے بھید بھاؤ

عابد سہیل
۲۲۔ ایس۔ پی۔ جرنلسٹ کالونی
سیکٹر ڈسی، علی گنج۔ لکھنؤ

(یک بابی ڈرامہ)

راہیں، سمتیں، راستے

(ہلکی ہلکی اداس موسیقی)

سجیلی: "بولونا۔ منجو آپا تم مجھ سے پندرہ بیس سال ہی تو بڑی ہوگی۔ اس عمر میں چہرے پر یہ جھرّیاں، بالوں میں سفید لٹیں، ہونٹوں پر پپڑیاں۔ یہ سب کیا ہے، کیوں ہے؟ بولونا آپا، بولونا۔ تم چپ کیوں ہو؟ یہ موم کا دل ہی تو ہے تیرا جس نے تیری یہ حالت بنادی ہے۔ تیرا دل موم کا نہ ہوتا تو یا تو بغاوت کردیتی ــ یا"ــــ

منجو: "بغاوت! کیا کہہ رہی ہے سجیلی۔ بغاوت؟!"

سجیلی: "ہاں بغاوت، بغاوت ایسے ہی حالات سے کی جاتی ہے۔"

(قدموں کی آہٹ)

دونوں: بابا آگئے۔

(قدموں کی آہٹ قریب آتی ہے)

بابا: (بھاری، غصّہ سے بھری ہوئی آواز) "کیسی بغاوت! کون بغاوت کررہا ہے؟"

سجیلی: "بابا۔ وہ صبح صبح اخبار والا......"

منجو: "کتنی زور زور سے آواز لگا رہا تھا سڑک پر..."

دونوں: "بہت زور زور سے آواز لگا رہا تھا۔"

سجیلی: "اخبار والا آواز لگا رہا تھا کہ (جیسے کچھ سوچ رہی ہو) وہ ــ بھلا سا نام تھا۔ وہاں بغاوت ہوگئی ہے۔ تم نے نہیں سنا بابا۔؟"

بابا: "صرف پاگل بغاوت کرتے ہیں۔ جو بغاوت کرتے ہیں ان کا سر کچل دیا جاتا ہے، ان کی گردن مروڑ دی جاتی ہے، ان کا گلا دبا دیا جاتا ہے۔"

سجیلی: (بیحد ڈری ہوئی آواز) "ہاں بابا۔"

بابا: "تیری ماں نے بھی بغاوت کی تھی۔ مجھ سے بغاوت۔ انجام دیکھ لیا۔ تڑپ تڑپ کے مرگئی۔ بے موت ماری گئی۔"

سجیلی: "ہاں بابا۔ بے موت ماری گئی۔"

منجو: "تجھے کیا معلوم سجیلی۔ تو تو اس وقت ایک سال کی تھی۔ کیا ہاں ہاں لگائے ہے۔ لیکن بابا! تم تو ماں کو اسپتال لے گئے تھے۔ تم تو کہتے تھے ماں کو مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ ان کا بہت علاج کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی لیکن وہ بچ نہ سکیں۔ ان کا انتقال ہوگیا۔"

بابا: "ہاں وہ بیمار تھی بےچاری، کتنا علاج کرایا لیکن وہ بچ نہ سکی ــ وہ تو میرے منہ سے نکل گیا تھا غصّے کی جھونک میں۔ یہ سالا غصّہ چیز ہی ایسی ہوتا ہے۔ سدھ بدھ نہیں رہتی۔"

(چند لمحوں کی خاموشی کے بعد)

"کھانا کھالیا تم لوگوں نے؟" (آواز میں نرمی)

دونوں: "ہاں بابا۔"

بابا: "جاؤ۔ سوجاؤ۔"

(دوسرا منظر)

بابا:۔ "دیکھ سجیلی۔ گھر سے باہر قدم نہ نکالنا ــــ آج تیرا ہونے والا سسر بھی آرہا ہے۔ بڑی موٹی مرغی پھانسی ہے میں نے۔"

سجیلی: "بابا!"

بابا:۔ "اسی لیے تو دعوت دی ہے، زوردار دعوت، دارو کی دعوت۔ ہوں! (ہنستا ہے) دارو اور پھر زوردار ناچ۔ شیشے میں نہ اُتارلوں تو میرا نام نہیں۔ اب تم لوگ جاؤ، سو جاؤ۔"

(نیا منظر)

سجیلی: "تو آج میرا ہونے والا سسر آرہا ہے۔ کیسا شریف اور باعزت آدمی ہے کہ دارو اور ناچ گانے کی محفل سے شیشے میں اُتارا جاسکتا ہے۔"

منجو:۔ "تو اپنے سسر کے بارے میں سوچ رہی ہے اور میں ماں کے بارے میں۔ وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ (سسکیاں) اُس نے تڑپ تڑپ کے جان دی اس کا سر کچل دیا گیا۔"

سجیلی:۔ "لیکن آپا! بابا تو کہہ رہے تھے کہ یہ بات نشے کی جھونک میں ان کے منہ سے نکل گئی۔"

منجو:۔ "سجیلی! نشے کی جھونک میں غلط بات منہ سے نہیں نکلا کرتی۔ نشے میں دل کی گندگی ابھر آتی ہے ــ وہ بات جسے دبا دبا کر، چھپا چھپا کر دل کی کوٹھری میں بند کردیا جاتا ہے، وہ ہونٹوں پر آجاتی ہے۔

(آواز سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی کی یادوں میں کھو گئی ہے۔)

ــــ ایسی ہی ایک رات تھی۔ ہم ان دنوں میرٹھ میں تھے۔ کئی دنوں سے بابا منہ پھلائے ہوئے تھے۔ ماں کہتی تھی تم باہر کیا کچھ نہیں کرتے پھرے۔ نہ میں نے کبھی روکا، نہ اب روکتی ہوں ــ لیکن اپنے گھر میں یہ نہ ہونے دوں گی۔ سیانی لڑکی گھر میں ہے، وہ کیا سوچے گی۔ میں اس وقت دس گیارہ برس کی تھی۔ لیکن بابا کو نہ ماننا تھا نہ مانے۔ چھت پر دری چاندنی بچھادی گئی کہ سورج ڈوبتے ہی لوگ آنا شروع ہوگئے" ــــ

سجیلی: "آپا!"

منجو:۔ "پھر چھمی جان، جن کا ان دنوں بہت چرچا تھا، آئیں اور ان کے آتے ہی ــ ناچ اور خوب شوروغل شروع ہوگیا۔"

سجیلی: "جلدی بتاؤ آپا! جلدی بتاؤ، پھر کیا ہوا؟"

منجو: "امی پلنگ پر پڑی روتی رہیں۔ پھر انھیں جانے کیا سوجھی کہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

(پس منظر میں ناچ گانے کی آواز)

اور، اور وہ چھت پر پہنچ گئیں" ــــ

(فلیش بیک)

ماں: "میں کہتی ہوں یہ سب میرے گھر میں نہیں ہوگا ــــ نکل جاؤ تم سب یہاں سے۔"

بابا: "تو یہاں بھی آگئی ــ تیری اتنی ہمت بڑھ گئی۔ چلی جا اندر، گھر میں۔۔"

ماں:۔ "نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی۔ کہہ دیا۔ جو کچھ کرنا ہو کرلو۔!"

بابا: (نہایت غصّہ کے عالم میں) "جو کچھ کرنا ہو کرلو۔ جاتی ہے یا دھکے دے کر نکالوں" ــ؟

ماں: "خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔ نیچ! نکل جاؤ تم سب لوگ یہاں سے۔"

بابا:۔ "چلی جا۔ محفل کا رنگ خراب نہ کر۔"

ماں:۔ (طنزاً) "محفل کا رنگ خراب نہ کروں ــــ نکل جاؤ تم سب یہاں سے"

بابا:۔ "چل نکل یہاں سے"۔!

ماں: "محفل خراب نہ کروں ــ یہ کہتے تمہیں شرم نہیں آتی۔ سیانی بیٹی گھر میں بیٹھی ہے۔ اور ابا جان اسی گھر کی چھت پر رنڈی

پکار رہے ہیں۔" (روتی ہے)

بابا: "پھر لگی پکھر دینے۔"

(بابا بیوی کو مارتا ہے۔ سسکیاں۔ پس منظر سے موسیقی کی آواز اُبھرتی ہے۔ کبھی سسکیاں اور کبھی موسیقی۔)

منجو: (روتے ہوئے) "اس وقت میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ سجیلی! ماں کو مار ڈالا (دونوں رونے لگتی ہیں) قتل کر دیا۔

(نیا منظر)

سجیلی (جماہی لیتی ہے۔ سو کر اٹھی ہے) "آپا! اٹھو صبح ہو گئی۔ سورج نکل آیا۔"

منجو: "صبح ہو گئی، کہاں صبح ہو گئی؟ صبح کبھی نہیں ہو گی سجیلی! کبھی نہیں۔" (پھر کچھ سوچتی ہے) "اور ہاں سجیلی تجھے کیا ہوا تھا۔ تو نے ایک زوردار چیخ ماری تھی۔"

سجیلی: "میں نے۔ میں نے؟ (جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو) ہاں یاد آیا آپا۔ میں نے ایک بہت ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔

منجو: "بھیانک خواب۔ کیا خواب؟"

سجیلی: "ایک پتلا سا راستہ ہے اور اس پر ایسی پھسلن ہے کہ پیر جمانا مشکل ہو رہا ہے۔ دونوں طرف گھاٹیاں ہیں۔ گہری، خوفناک، موت کی گھاٹیاں۔ چند قدم پیچھے ایک خوفناک اژدھا پھنکار رہا ہے، تیز طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں۔ میرے قدم ڈگمگاتے ہیں لیکن میں خود کو سنبھال لیتی ہوں۔"

منجو، "سجیلی!"

سجیلی، "ہاں آپا میں خود کو سنبھال لیتی ہوں۔ ایک دم سامنے جو نظر پڑتی ہے تو ایک آدمی بڑا سا گنڈا سا لیے کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ بے حد بھیانک ہے۔ بھورے بھورے بال، گہری کالی بھویں، بڑی بڑی مونچھیں، یہ موٹی گردن اور پان سے پیلے دانت آپا۔"

منجو:- سجیلی: تجھے خوب اچھی طرح یاد ہے اس آدمی کا چہرہ۔ جانتی ہے، جانتی ہے تو کس کا حلیہ بیان کر رہی ہے۔ یہ تو، یہ تو بابا کا حلیہ ہے!"

سجیلی: "بابا کا۔ اپنے بابا کا۔؟"

(آواز دھیرے دھیرے تحلیل ہو جاتی ہے اور ایک بھاری آواز ساتھ ساتھ اُبھرتی ہے)

بابا:- "منجو! منجو بیٹی۔ اب سو بھی چکو۔"

سجیلی: بابا ہم لوگ جاگ رہے ہیں۔"

بابا:- "تو اٹھو۔ دیکھو صبح ہو گئی۔ ناشتہ واشتہ نہیں ملے گا کیا روز تو صبح ہی صبح چائے مل جاتی تھی۔"

منجو: "ابھی لائی بابا، ابھی لائی۔ اصل میں ہم نے سوچا....

بابا: "کیا سوچا؟"

منجو: "ہم نے سوچا کہ آپ ابھی سو رہے ہوں گے۔"

سجیلی: "ہاں بابا۔ ہم لوگ تو بہت پہلے....."

بابا:- "کیوں ایسا سوچا تم نے کہ ہم سو رہے...

سجیلی: "وہ آپ رات کو دیر سے نا... (کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہے) بس ہم لوگ باتیں ہی کرتے رہے۔ بالکل بھول ہی گئے۔ بس ابھی چائے لائے۔"

منجو:- "ہاں بابا۔ ہم لوگ ابھی چائے لائے۔ بس دو منٹ میں۔"

بابا:- "ہاں ہاں بیٹی۔ بس جلدی سے لے آؤ۔"

(منجو اور سجیلی کے جانے اور کچن میں کھٹ پٹ کی آوازیں)

بابا:- "بغاوت، بغاوت۔ بغاوت جو ملکوں میں ہوتی ہے وہ اس گھر میں ہونے جا رہی ہے۔ کل کی چھوکریاں، مجھ سے بغاوت کریں گی۔ کچل کے رکھ دوں گا دونوں کو ان ہاتھوں سے۔ گردن مروڑ دوں گا تو اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ جائے گی۔

(بابا کی آواز ایک دم دھیمی ہو جاتی ہے جیسے وہ خود سے باتیں کر رہا ہو)

"لیکن میرا کیا ہو گا۔ بچ بھی گیا تو میرے ہاتھ پیر ہی کٹ جائیں گے

پھر میں کیا کروں گا۔؟ نہیں نہیں ۔ ٹیڑھی انگلی سے
گھی نہیں نکلے گا ۔ پیار کی مار مارنا پڑے گی ۔

(قدموں کی آواز)

(ہنستا ہے) " بنالائی جائے ۔ ارے منجو تو اتنی جلدی
پراٹھے بھی بنا لائی ۔ بھوک بھی لگ رہی تھی مجھے — یہ
تو نے بہت اچھا کیا ۔

منجو: (خوشی ظاہر کرتے ہوئے) "کھائیے بابا ۔"

بابا: (ہنستے ہوئے) جس کی ایسی فرمانبردار بیٹیاں ہوں اسے کاہے
کا غم ! (مصنوعی ہنسی ہنستا ہے) اب تو میری سجیلی بٹیا
کی شادی ہو جائے گی ۔ اس کے ہاتھ پیلے کر دوں گا ۔"

منجو: " بابا ! وہ آئے تھے ؟ "

بابا: " آیا کیوں نہیں تھا ۔ اور اتنی بڑی محفل میں نے کس
کے لیے سجائی تھی ۔ مُنی جان کا وہ مجرا کرایا تھا کہ شیشے
میں اُتار لیا ۔"

منجو: بات پکی ہو گئی نا ؟ "

بابا: " بات پکی ہونے میں رہ ہی کیا گیا تھا ۔ وہ تو پہلے ہی سے تھی ۔
اپنے بیٹے کی بڑی ڈینگیں مارتا تھا ۔ میں نے سارا کچا چٹھا
کھول دیا تو لگا گھگھیانے ۔ کہتا تھا لڑکا بڑا شریف ہے ۔
ہونھ ! میرے آدمیوں نے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم
کر لیا تھا ۔ کن کن لوگوں سے دوستی ہے ، کن کن ہوٹلوں میں
اُٹھتا بیٹھتا ہے ۔ کن کن اڈوں پر جمگھٹ ہوتا ہے —
میں نے تو یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ کن کن کوٹھوں کے چکر لگائے
جاتے ہیں ۔ ایک ایک کر کے سارے پردے اٹھا دیے
تو آسمان سے زمین پر آ گیا ۔ بڑا شریف بنتا تھا ۔"

منجو: " یہ تو بابا بالکل ایسا ہی آدمی ہے جس کی تمھیں تلاش تھی ۔"

بابا: " اور کیا بیٹی ! ہم لوگوں کو شریف آدمی کہاں ملے گا !
اور شرافت کا ہمیں کرنا بھی کیا ہے ؟ میں نے کہہ دیا کہ
میرے پاس شادی کرنے کے لیے ایک پیسہ نہیں —
بولا ۔ میری عزت کا سوال ہے ۔ ساری برادری کہے گی بہو
خالی ہاتھ آئی ہے ۔ آخر بڑی مشکل سے دس ہزار پر راضی
ہوا ۔ ! "

منجو: " دس ہزار ! "

بابا: (ہنستا ہے) " دس ہزار دے ہی مرا ۔ آسامی موٹا ہے نا ۔
ہوں ہوں (ہنسی) لیکن پلّے درجہ کا کنجوس ، خبیس ۔ میں نے
بھی سوچا کیا یاد کرے گا بچّو ۔ چلا ہے اپنے شریف ،
طوائفوں کے کوٹھوں کے چکر لگانے والے بیٹے کی شادی
میری بیٹی سے کرنے ۔ اور وہ بھی اسے شریف ظاہر کر کے ۔
سجیلی نے ذرا بھی عقل سے کام لیا تو وارے نیارے ہو
جائیں گے ، وارے نیارے ۔ !!

منجو: " بابا ۔ ! "

بابا: تو بھی ذرا سجیلی کو خوب اچھی طرح سمجھا دینا ۔ پہلا پہلا معاملہ
ہے ۔ تیری طرح کہیں اصلی گھڑی وہ ہی چھوڑ نہ آئے ۔ اب
میں چلوں ۔ روپے لے آؤں ۔ پورے دس ہزار (ہنستا ہے)
پورے دس ہزار ...."

(دس ہزار — دس ہزار — آواز دُور ہوتے ہوتے
غائب ہو جاتی ہے)

منجو: " بابا گئے ہیں اپنی لڑکی کی قیمت وصول کرنے اور مجھ سے کہہ
گئے ہیں ۔ سجیلی کو سب کچھ سمجھا دینا کہ اُس گھر کی چمک دمک
دیکھ کر اپنا اصلی کام بھول نہ جائے (سسکی لیتی ہے)

سجیلی: " میں نے سب کچھ سُن لیا ہے آپا ۔ میں تمھیں مایوس
نہیں کروں گی ۔ میں خود کو مایوس نہیں کروں گی ۔ وقت تو
آنے دو ۔"

(نیا منظر)

بابا: سالا ہے بڑا کنجوس ۔ لاکھوں روپے تجوری میں پڑے
ہیں لیکن دس ہزار نکالنے میں دانتوں پسینے آ گئے ۔ ایک ایک
نوٹ بار بار گن رہا تھا ۔ ٹُک ٹُک کے دیکھ رہا تھا کہ کوئی نوٹ
غلطی سے زیادہ نہ چلا جائے (آواز بلند کر کے) منجو ! "

منجو: " ہاں بابا ۔ ! "

بابا: "سجیلی کہاں ہے؟"

منجو: "باورچی خانے میں۔ بلاؤں؟"

بابا: (ہنستے ہوئے) "ہاں۔"

منجو: "سجیلی! او سجیلی! بابا بلا رہے ہیں۔"

سجیلی: "جی بابا!"

بابا: "یہ لے ___ یہ لے نوٹوں کی گڈیاں۔ یہ گن لے ایک، دو، یہ تین، یہ چار اور یہ ___ سنبھال کے رکھ اور یہ لے باقی سب۔ دس گڈیاں۔ پورے دس ہزار، اور اپنے خوب اچھے اچھے کپڑے اور زیور بنوا لے۔

(سجیلی دھیمے سے ہنستی ہے)

سجیلی: "اب میں جاؤں؟"

بابا: "تو چلی کہاں۔ (ہنستا ہے) شرما جاتی ہے۔ جیسے ہی میں نے شادی کی بات کی، اپنے کمرے کی طرف چلی گئی (ہنستا ہے، پھر کسی قدر پریشانی سے کہتا ہے) لیکن کام نہ بگاڑ دے۔ منجو۔ سُن رہی ہے نا۔"؟

منجو: "ہاں بابا۔"

بابا: "تو اسے سب کچھ سمجھا دینا۔ ایسا نہ ہو وہاں دل لگا بیٹھے اور ہم لوگ ___ اسے بتا دے گی نا! سب کچھ سمجھا دے گی نا!"

منجو: "ہاں بابا کہہ تو دیا سب کچھ، اونچ نیچ سب سمجھا دوں گی۔ کتنی بار کہوں۔"

بابا: "ارے تو تو بُرا مان گئی۔ میں نے یوں ہی کہا تھا کہ کہیں تو بھول نہ جائے۔ خیر اچھا اب تم لوگ تیار ہو جاؤ۔ کپڑے زیور آج خرید لو، باقی چیزیں بعد میں آ جائیں گی۔ اس لیکن منجو بیٹی ہاتھ روک کے خرچ کرنا۔ جتنے زیادہ روپے بچ جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔ آخر ہم ہی دونوں کے کام آئیں گے لیکن اس بات کا سجیلی کو اندازہ نہ ہو۔ اب جیسے کوئی قیمتی چیز اسے پسند آ جائے تو تجھے پسند نہ آئے سمجھی۔ ہزار عیب نکالنا، اور سستی چیز ہو تو ایسے لوٹ پوٹ ہو جانا کہ سجیلی انکار ہی نہ کر سکے۔ ہیں، شاباش۔ بس جلدی سے تیار ہو جا اور سجیلی سے بھی تیار ہونے کو کہہ دے۔ بس چل۔"

منجو: "بس ابھی تیار ہوئی، چٹکی بجاتے۔ (آواز دیتی ہے) سجیلی! ارے او سجیلی۔ کیا پہلے ہی سے تیار ہو رہی ہے۔ میں جاتی ہوں نہانے۔"

(ہلکی موسیقی جس میں خوشی اور غم کی آمیزش ہے)

منجو: "اچھا بابا ہم لوگ جا رہے ہیں۔"

بابا: "ہاں ہاں جاؤ۔ لیکن ذرا جلدی آنا۔ بہت دیر نہ کرنا۔"

(ہلکی موسیقی طوفان کے شور میں ڈوب جاتی ہے)

بابا: "میں نے دونوں کو اپنی بیٹیوں کی طرح پالا ہے۔ لیکن ان کو معلوم نہیں کہ وہ سگی بہنیں نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی کوئی نہیں۔ سجیلی کو بھی میں نے بیٹی کی طرح پالا ہے لیکن وہ میری بیٹی نہیں ہے۔ وہ کس کی بیٹی ہے؟ (طنزیہ ہنسی ہنستا ہے) وہ بدقسمتی کی بیٹی ہے ___ لیکن آج اس کے ساتھ قسمت کا وہی چکر چلاتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟ رمضانی! تو تو کہتا تھا کہ میرا دل پتھر کا بنا ہے، وہ پگھل نہیں سکتا۔ پھر تو کیوں رو رہا ہے؟ کیوں رو رہا ہے رے؟"

(غمگین موسیقی)

"لیکن اس کے علاوہ میرے سامنے راستہ ہی کون سا تھا؟ جن لوگوں نے میرے باپ کو قتل کیا تھا، انھوں نے سوچا تھا کہ اس چوتھے درجے میں پڑھنے والے لڑکے پر کیا بیتے گی؟ ان میں سے کسی کی آنکھ میں آنسو آئے تھے ___؟ پھر میں کیا کرتا؟ برسوں اِدھر اُدھر پھرتا رہا ___ پھر ایک دن ....

(فلیش بیک)

آواز: "خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے چھوڑ دو۔"

بابا: "تم نے میرے باپ کو معاف کیا تھا؟ میرے سامنے اپنی زندگی کی بھیک مانگتے تمھیں شرم نہیں آتی۔ اس پر جو بیتی

ہوگی وہ میں جانتا ہوں، لیکن تم نے معاف کرنے کے بجائے
چھرا اس کے سینے میں اُتار دیا تھا۔"

آواز: "خدا کے لئے!"

بابا: "جا معاف کیا۔ تیری آنکھوں میں مجھے رحم کی وہی التجا نظر آرہی ہے جو تو نے میرے باپ کی آنکھوں میں دیکھی ہوگی۔"

(ہلکی غم ناک موسیقی)

بابا: "لیکن زندگی کی بھیک مانگتی آنکھوں نے میرے پیٹ کی آگ نہ بجھائی۔ چاقو تو میں نے پھینک دیا لیکن بلیڈ ——— آخر اسی بلیڈ نے مجھے جیل پہنچا دیا ——— جیل سے چھوٹ کر آنے کے بعد میں نے اچھی زندگی گزارنے کی کوشش کی۔ لیکن بھیک کرتے رمضانی نے، جیل کی سزا کاٹتے ہوئے رمضانی نے، میرا پیچھا نہیں چھوڑا (آواز بھرّا جاتی ہے) بیوی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ میں کیا کرتا؟ میں کیا کرتا کیسے زندہ رہتا، کیسے زندہ رہتا۔؟"

غمناک موسیقی آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے
اور دھیرے دھیرے طربیہ موسیقی ابھرتی ہے)

(نیا منظر)

جوہری: "آیئے آیئے بیگم صاحبہ۔ کہیئے کیا دکھلائیں۔ تشریف رکھئے۔

منجو: "مجھے کانوں کے بُندے، ایک نتھ اور کان اور ناک کی کیلیں گلے کا ہار اور ——— اور جھمکا دکھلایئے۔"

جوہری: "ہاں ہاں۔ ایک ایک چیز دکھلاتا ہوں۔"

(الماری کھولنے اور ڈبے نکالنے کی آواز)

"یہ دیکھئے۔ کیا شاندار جھمکے ہیں۔ موتی دیکھئے، ان کی چمک ———"

منجو: "اس کی قیمت کیا ہے؟"

جوہری: "ارے لے لیجئے بیگم صاحبہ۔ یہی کوئی سات سو کا ہوگا۔"

منجو: سات سو!"

جوہری: "چیز بھی تو دیکھئے بیگم صاحبہ، کتنی شاندار چیز ہے۔"

منجو: "لیکن ہم تو ذرا ہلکی چیز خریدنی ہے۔"

جوہری: "ہاں ہاں بیگم صاحبہ۔ آج کل بھاری زیوروں کو کوئی پسند ہی نہیں کرتا۔ ہلکے زیوروں میں جو نزاکت ہوتی ہے۔ بھاری زیور اس کا کیا مقابلہ کریں گے۔ ارے، اے راجندر! ذرا وہ ڈبہ اُٹھانا وہ سامنے الماری سے۔"

(جوتوں کی آواز)

جوہری: "آیئے آیئے تشریف لایئے۔ کیا دکھاؤں جناب؟"

خریدار: مجھے ایک ہار چاہیئے گلے کا ہار، ذرا اچھا سا، خوب قیمتی ہار۔ بھاری۔ لیکن ذرا جلدی سے۔"

جوہری: "تشریف رکھئے، تشریف رکھئے۔ ارے راجندر! وہ سیف کے پیچھے والی الماری سے، وہ جو کل ڈبہ رکھا تھا نا اسے نکال لاؤ ——— بیگم صاحبہ، یہ لیجئے۔ ذرا اس کی نزاکت تو دیکھئے۔ ایک دو تین اور چار۔ جب تک آپ دونوں پسند کریں، میں ذرا صاحب کو ہار دکھادوں۔"
——— "یہ دیکھئے۔ خوب بھاری ہے نا۔"

خریدار: "ہوں۔ لگتا تو خوبصورت ہے۔"

جوہری: "صاحب ایسا ہار آپ کو، بازار بھر میں نہیں ملے گا۔"

خریدار: "ہاں، ہاں!"

سجیلی: "آپا! یہ جھمکا ہلکا بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ اس کی قیمت بس سوا دو سو ہے۔"

منجو: "ہوں۔ پسند ہے تم کو۔؟"

سجیلی: "آپا، آپا! یہ آدمی تم کو کیسی نظروں سے دیکھ رہا ہے!"

منجو: "مجھے۔!"

سجیلی: "ہاں تمہیں! دیکھو تو ذرا اُدھر۔"

منجو: "کہیں بھی نہیں۔ وہ تو ہار دیکھ رہا ہے۔"

جوہری: "ہاں بیگم صاحبہ۔ آپ نے جھمکا پسند کیا کوئی ——— اور دوسرا زیور۔؟"

منجو: "ہاں بھائی، یہ دو کیلیں، یہ ہار، یہ بُندے اور ——— اور بس ابھی تو یہی۔"

جوھری: "اچھا۔ پیک کرائے دیتا ہوں۔"
خریدار: "منجو!" (حیرت سے)

(ہلکی غمناک موسیقی)

منجو: "شوکت!"
خریدار: "منجو! میں نے تمھیں ڈھونڈھ ہی نکالا۔ میں نے تمھیں ڈھونڈھ ہی نکالا منجو۔"
منجو: "شوکت! تم سُن سکو گے میری کہانی۔" (رونے لگتی ہے)
شوکت: "میں نے تمھیں کہاں کہاں ڈھونڈا۔!"

(منجو کی سسکیاں)

"کہاں کہاں نہیں مارا مارا پھرا۔ لیکن تمہارا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ (جذباتی لہجہ میں) منجو!"
منجو: شوکت ـــــ شوکت میں مجبور تھی۔ ایک طرف تم تھے اور دوسری طرف بابا۔ ایک جانب تمھاری محبت تھی اور دوسری جانب بابا کی محبت۔ اور ڈر (رونے لگتی ہے) میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اتنے میں فیصلے کی گھڑی آ پہونچی۔

(غمناک موسیقی)

ایک گٹھری میں گھر کے سارے روپے، زیور اور دوسری میں اپنے سارے کپڑے پہلے ہی باندھ لیے تھے۔ جب دوسری بار موٹر کے ہارن کی آواز آئی تو میں نے اپنی رضیہ کو پیار کیا۔ وہ کسمسائی۔ پھر دھیرے سے میں نے اپنی پیاری بچی کو تھپک کر سُلا دیا ـــــ

(روتے روتے ہچکی بندھ جاتی ہے)

اور پھر میں دبے پاؤں وہاں سے چلی۔ مجھے ایک دم خیال آیا کہ بابا خالی ہاتھ دیکھیں گے تو مار ہی ڈالیں گے۔ واپس لوٹی اور خوب اچھی طرح سے اطمینان کر کے، وہ گٹھری جس میں صرف کپڑے تھے، اُٹھائی اور زینے سے اتر گئی۔"
سجیلی: شوکت بھائی! آپ کو یاد کر کے آپا اب تک روتی ہیں ـــ بیٹھے بیٹھے جیسے اک دم کہیں کھو جاتی ہیں۔"
شوکت: "اُف اُف۔!"

سجیلی: "جیسے نہ کچھ دیکھ رہی ہیں، نہ کچھ سُن رہی ہیں۔"

(غمناک موسیقی)

شوکت: "بیٹی کی یاد نہیں آئی تمھیں؟"
منجو: "بیٹی۔ میری رضیہ۔ میری بیٹی۔ میرے جیتے جی بے ماں کی بچی ـــ (سسکیاں) ـــ میں نے سوچا تھا کیسے بچ پائے گی۔ کتنے دن دُکھ جھیل پائے گی۔
شوکت: "منجو۔ تم واپس کیوں نہ آگئیں ـــ؟"
منجو: "بہت دنوں تک تو مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کہاں ہوں، کس شہر میں ہوں ـــ جب موٹر والے نے اپنا حصہ مانگا اور بابا کو پتہ چلا کہ گٹھری میں صرف کپڑے ہیں تو غصے کے مارے ان کا بُرا حال ہو گیا۔ مجھے گندی گندی گالیاں دیں اور اس سے بھی دل نہ بھرا تو مارا۔ جب مار سے بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو لوہے کی سلاخ انگیٹھی میں تپا کر میری بانہہ داغ دی ـــــ یہ دیکھو ـــــ"
شوکت: "کتنا لمبا نشان ہے منجو۔" (غم میں ڈوبی ہوئی آواز)
منجو: "شوکت ـــ شوکت۔ تم میری ساری کہانی سنو گے تو اپنی قسمت پر فخر کرو گے کہ ایسی عورت سے چھٹکارا ملا۔ مجھ سے نفرت بھی کرو گے ـــ ممکن ہے کہ تم میرے منہ پر تھوک کے چلے جاؤ، ایک بار بھی پلٹ کے نہ دیکھو، ایک بار بھی میرا خیال دل میں نہ لاؤ ـــ"
شوکت: "منجو۔!"
منجو: "ہاں شوکت! تمھارے یہاں سے آنے کے چار چھ مہینے بعد میں دوسری راہ پر لگا دی گئی ـــ اس کے بعد، کئی مرد میری زندگی میں آئے، شوہر کے رُوپ میں ـــ لیکن پھر میں نے کوئی غلطی نہیں کی، کسی مرد کو اپنے دل میں جگہ نہ دی اپنی بغل میں لیٹے کسی مرد کی طرف پلٹ کے بھی نہیں دیکھا زیور اور کپڑوں کی گٹھری پہچاننے میں کبھی بھول نہیں کی، نہ تو دھوکے سے، نہ جان کر۔ کسی مرد کو مہینوں اس کے ساتھ سونے کے باوجود، اپنا شوہر نہیں سمجھا ـــ اب بولو۔ یہ ہے

میرا اصلی روپ۔ (روتی ہے) ۔ یہ ہے میرا اصلی روپ۔ شوکت! یہ ہے میرا اصلی روپ! اب تو تم مجھ سے نفرت ــــــــ"

شوکت: "منجو۔! اب میں ان آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ اب میں تمھیں کہیں نہ جانے دوں گا ــــ یہ ہار جو میں نے خریدا ہے تمھاری رضیہ کے لیے ہے۔"

منجو: "رضیہ کے لیے۔ میری بیٹی کے لیے!

شوکت: "منجو یہ ہار نہیں، تمھاری کشش مجھے یہاں کھینچ کر لائی تھی اسی مہینے رضیہ کی شادی ہے نا منجو۔"

(ہلکی موسیقی)

منجو: "میری رضیہ کی شادی!"

شوکت: "کیا اس موقع پر تم اپنی بیٹی کے پاس موجود نہ ہوگی۔؟ تمھیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ چلوگی نا!"

منجو: "شوکت!"

سجیلی: "آپا! میں بھی ساتھ چلوں گی۔ بابا کے گھر نہیں جاؤں گی۔"

منجو: "ہاں! (ہنستی ہے۔ ایسی ہنسی جس میں غم بھی شامل ہے) ہاں سجیلی! میں تجھے وہاں جانے بھی نہ دوں گی۔"

سجیلی: "آپا! میں کہتی تھی نا ــ صبح ضرور ہوگی ــــ صبح ضرور ہوگی۔ !!"

(طربناک موسیقی دھیرے دھیرے المیہ موسیقی میں مل جاتی ہے اور پھر طربناک موسیقی حاوی ہو جاتی ہے)۔

□□

جعفر عسکری
ممتاز محل کمپاؤنڈ
گولہ گنج۔
لکھنؤ

نذرِ آزادی

اے آزادی! اے آزادی!
تری حرمت جان سے پیاری ہے
اے آزادی! اے آزادی!
مرے دل میں تری سرشاری ہے

کہنے کو وطن آزاد ہے اب
لیکن یہ وطن ناشاد ہے کیوں؟
ہر ویرانہ آباد ہے اب
لیکن یہ چمن برباد ہے کیوں؟

تری چاہ میں کتنا خون بہا
ترے نام پہ کتنے جاں سے گئے
ترے جانبازوں کا کیا کہنا
جاں دے کے بھی نہ میداں سے گئے

تری زلف کے جو ہوئے زندانی
ہر قید سے وہ آزاد ہوئے
تری رہ میں جو دے گئے قربانی
لافانی وہ سب افراد ہوئے

جاں دینے کا یارہ اب ہے کسے
اے میرے وطن! اے میرے وطن
وہ تیرے دلاور کہاں گئے
رہتے تھے جو باندھے سر سے کفن

بس آج انھیں کو یاد کریں
ترے عشق میں جو مصلوب ہوئے
آج ان کے نام پہ جام بھریں
ترے شوق میں جو معتوب ہوئے

طفیل احمد انصاری
مفتی محلہ۔ جون پور

یادگارِ داغ : متین مچھلی شہری

جون پور شہر کا مغربی خطہ۔ مچھلی شہر عرصۂ دراز تک علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ سید عبدالرزاق شاکر تلمیذ غالب۔ ہادی، شہیر، موسیٰ، متین، سرورش اور سلام مچھلی شہری جیسے باکمال اور نامور شعراء اسی خاک کے لعل و گہر تھے۔ اپنے فکر و فن سے ان شعرائے کرام نے اردو شعر و ادب کی وسعتوں میں اضافہ کیا ہے۔ ابوالعلم مولوی محمد متین الدین متین مچھلی شہری حضرت داغ کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں جنھیں "یادگار داغ" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ جانشینِ داغ نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی تحریر کرتے ہیں :

"یہ مسمیٰ (متین) میرے حقیقی برادر کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھ سے عمر میں کم ہے مگر کمال و صفات میں زیادہ۔ استاد بھائی ہونے کی صورت میں بھی ان کو یہ تفوق ہے کہ مجھ سے پہلے کے شاگرد ہیں اور حضرت استاد مرحوم و مغفور کے عزیز ترین شاگردوں میں سے ایک ہیں"۔ [1]

متین مچھلی شہری کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ خیال کی بلندی، زبان کی سلاست، روانی اور شوخی محاورے اور روزمرہ کا حسن ان کے کلام کی خاص خوبیاں ہیں۔ یہ تمام خصوصیات انھیں داغ جیسے استادِ کامل سے عطا ہوئی تھیں۔ اس کا اظہار متین نے خود بھی کیا ہے ؎

متین استاد کو سننا ہو جس کو مجھ کو سن جائے
وہی رنگِ بیاں میرا، وہی طرزِ بیاں میری

زبانِ داغ سے کیف و حظ اٹھانے کے لیے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جس میں زبان کی سلاست اور اندازِ بیان کی شوخی نمایاں ہے جو رنگِ داغ کا خاص وصف ہے ؎

کوستے ہیں وہ میری تصویر کو
شاید اس میں جان ڈالی جائے گی

خیر غلط اقرارِ محبت، اچھا وعدہ نباہ کا جھوٹ
دل کا لینا بھول گئے کیا، وہ بھی تم کو یاد نہیں

مسجد میں متین آج نظر آتے ہیں شاید
مستی میں چلے آئے ہیں میخانہ سمجھ کر

توبہ نہ مجھ سے نبھ سکی، میں نے تو لیکے پی ہی لی
اس نے یہ کہہ کے پیش کی، زہر نہیں شراب ہے

اس زہرِ ناب کو حضرت داغ نے ایک خوبصورت شعری پیکر عطا کیا ہے۔ شعر میں حسن و دلکشی کے ساتھ ہی کتنا حسرت و یاس اور استعجاب پنہاں ہے ؎

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

جناب سعدی جعفری، جو متین مچھلی شہری کے تلمیذ رشید اور عزیز بھی ہیں انھوں نے ایک سو اشعار کا مجموعہ "متین کے نشتر شعر" سن ۱۹۴۱ء میں



اتر پردیش منتری کلیان سنگھ ۱۲ جولائی ۱۹۹۱ء کو تلک ہال میں تاجروں اور افسروں کی میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے

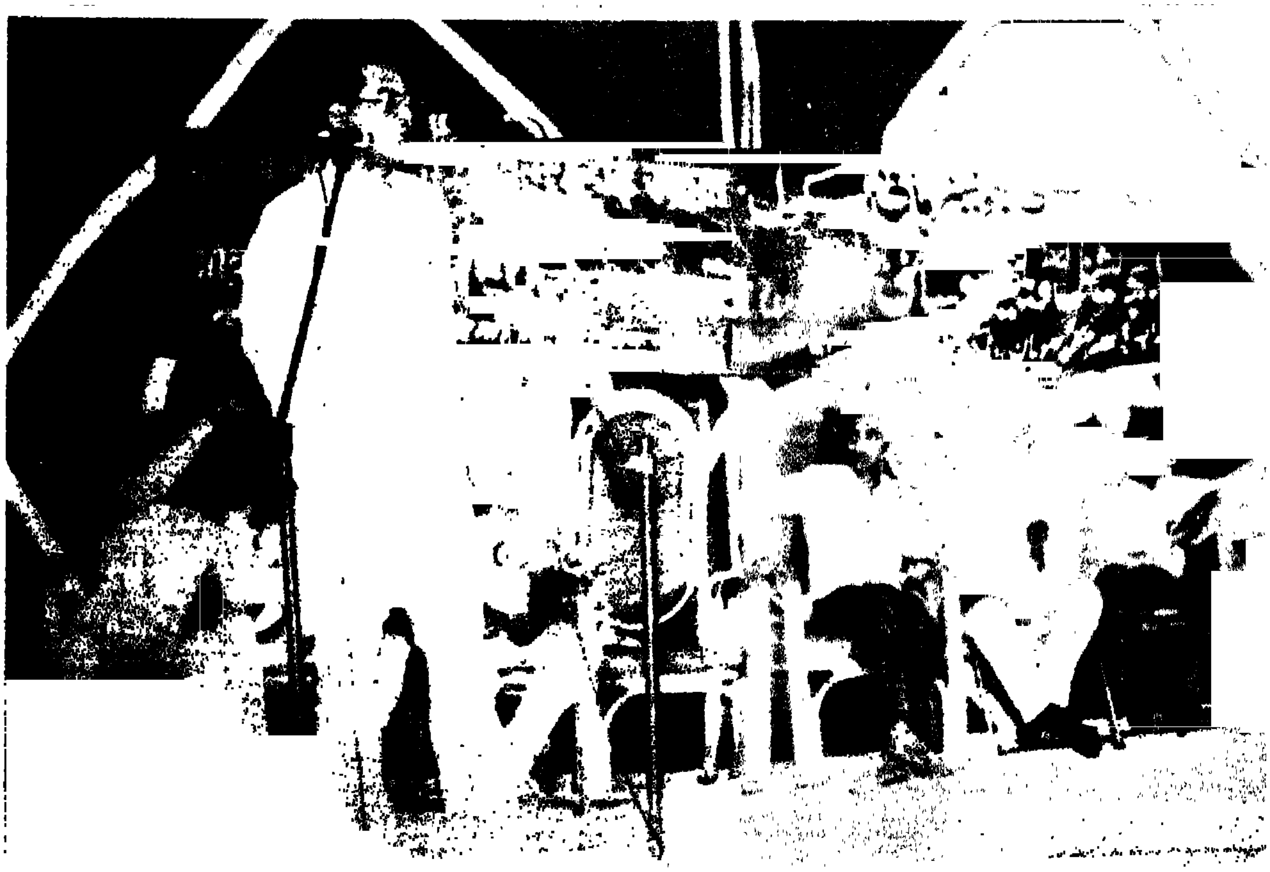
منتری کلیان سنگھ ۲۱ جولائی ۱۹۹۱ء کو یوجنا بھون لکھنؤ میں سینیر پولیس افسروں کی میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے





وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ ۲۰ر جولائی ۱۹۹۱ء کو علی گڑھ میں کثیر مقصدی اسپورٹس ہال کا افتتاح کرتے ہوئے

وزیر مدرسہ اور مسلم اوقاف شری اعزاز رضوی، ثاقب ہائیر سکنڈری اسکول، راجرجی پورم لکھنؤ میں
۲۹ر جولائی ۱۹۹۱ء کو 'ایک رنگا رنگ شام ۔ ایکتا کے نام' کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے









سپیکر ودھان سبھا شری
ی کرشن سریواستو کے ہاتھوں
ممبران اسمبلی کے لیے
پروگرام کے افتتاح
منظر

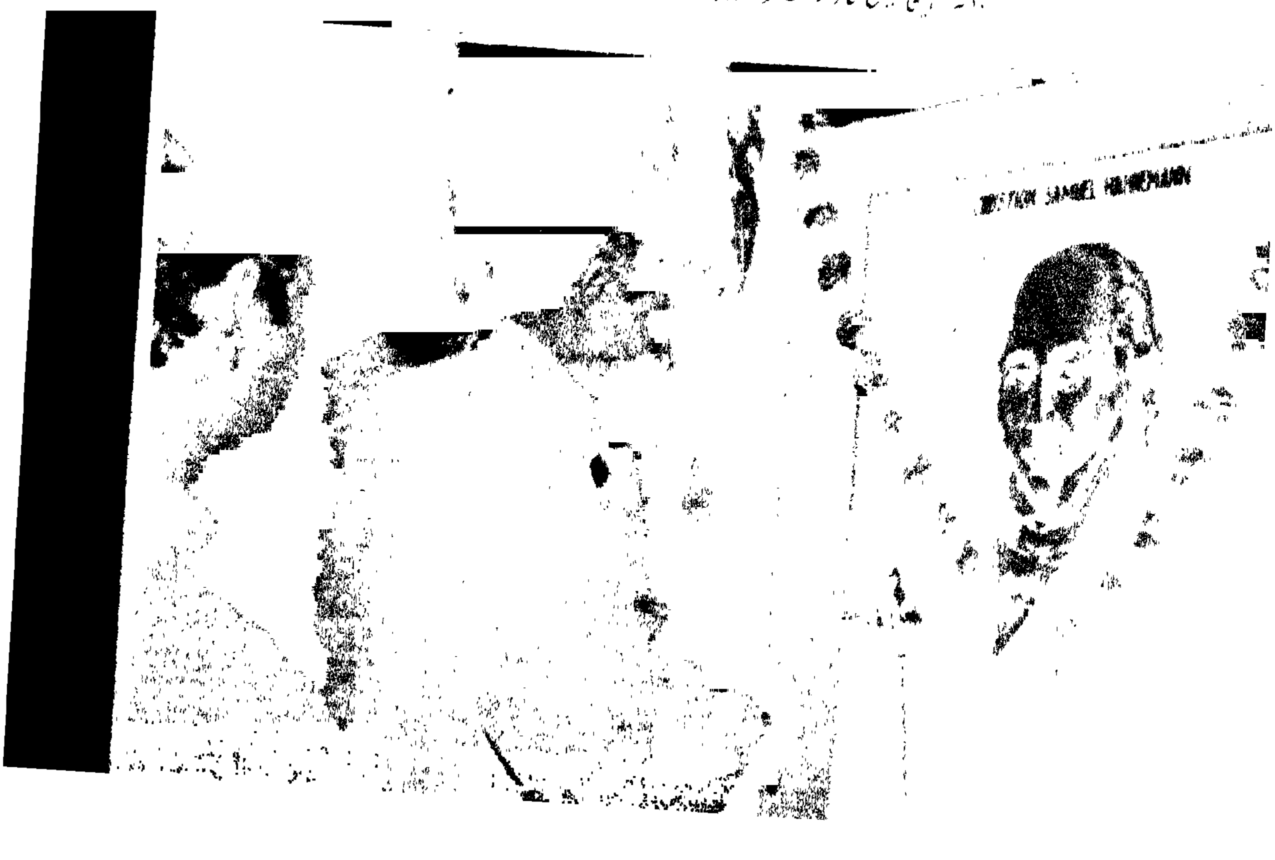






سیاحت اور کھیل کود کے وزیر شری کیدار سنگھ بونیا، لکھنؤ میں یووک منگل دلوں کے
ثقافتی مقابلوں کے سنگی کو انعام تقسیم کرتے ہوئے

وزیر سیاحت برائے تعمیرات عامہ شری رام کمار ورما ۱۰ اپریل کو [illegible] پرشاد ہال میں منعقدہ
ڈاکٹر ہینی مین فاؤنڈیشن ڈے پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے



اسرار کریمی پریس الٰہ آباد سے طبع کرا کے ارباب علم و ادب کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس مختصر سے انتخاب کی تقریظ نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی نے لکھی تھی۔ نواب موصوف نے اپنے خلوص و محبت کا بے پایاں اظہار فرماتے ہوئے اس تقریظ کا عنوان "سبحۂ صد دانہ" رکھا تھا۔ رنگ داغ کے عنوان سے ان اشعار کا انتخاب سعدی جعفری نے خود اپنی پسند سے کیا ہے۔ اس انتخاب کا اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اکثر اشعار میں برجستگی، شوخی اور تیور کا فقدان نظر آتا ہے جو داغ کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

ایک دور میں امیر و داغ کا رنگ بہت زیادہ مقبول ہوا تھا لوگ ان کی شاعری کے قائل تھے، نیز ان کے اسالیب کو ہی کمالِ فن سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے شعراء نے ان کی پیروی کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ داغ کے رنگ کو فروغ دینے میں جو کمال حفیظ جون پوری کو حاصل ہوا وہ اردو کے کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس ضمن میں مشہور نقاد مجنوں گورکھپوری کی رائے ملاحظہ ہو:

"امیر کے جس شاگرد کے کلام میں داغ کا اصلی رنگ آپ سے آپ جھلک اٹھا ہے وہ حفیظ جون پوری ہیں۔ لیکن جو شخص سب سے زیادہ داغ کا مقابلہ کرنے پر کمربستہ رہتا ہے وہ ریاض خیرآبادی ہیں۔"

متین مچھلی شہری بھی جادۂ داغ کے باکمال شہسوار ہیں۔ آپ کے کلام میں سلاست و روانی، زبان کی صفائی، تیکھا پن، معاملہ بندی کی چاشنی اور محاوروں کا خوبصورت استعمال شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے محاوروں کے خوبصورت اور برجستہ استعمال سے زبان میں وسعت اور بلاغت کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ متین نے جہاں معاملات عشق کو شعری پیکر عطا کیا ہے اس میں نہ تو سوقیانہ پن ہے اور نہ رکاکت بلکہ ایک طرح کی وضعداری پنہاں ہے ؎

چوری، اس پر یہ سینہ زوری
آنکھیں نہ چراؤ دل چرا کر

ہم میرے ہوش سے شاید پہلے کی یہ باتیں ہیں
دل کب آیا جان گئی کب، بالکل مجھ کو یاد نہیں

وہ اپنا شوق پنہاں اور اندازِ حیا ان کا
مگر پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اقرار ہو جانا

متین مچھلی شہری کے اشعار میں خارجی رنگ و جمال نمایاں ہے لیکن داخلی سوز و گداز سے بھی ان کا کلام یکسر عاری نہیں ہے۔ بیشتر اشعار میں خستگی اور تاثیر کی شان موجود ہے جس سے اشعار کی دلکشی میں اضافہ ہوا ہے ؎

آنکھوں میں آنسو بھی نہیں اب آہ نہیں فریاد نہیں
محو ہوں تیری یاد میں ایسا، گویا تو بھی یاد نہیں

اے یاس! آس توڑ نہ عاشق غریب کی
رہنے دے حسرتیں دلِ امیدوار میں

بولے کہ نہ بولے تیری تصویر
اپنی تو اسی سے گفتگو ہے

اے رحمتِ حق گرم ہے خورشیدِ قیامت
ہے شرم تیرے ہاتھ میرے دامنِ تر کی

ربِ غفور کس لیے میخانہ بند ہو
جب تک ترے کرم سے درِ توبہ باز ہے

حسن و عشق کے محدود موضوعات کے علاوہ تصوف بھی اردو شعراء کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔ اردو ادب کے تقریباً سبھی شعراء کرام نے حسبِ توفیق تصوف کے مضامین سے اپنی شاعری کو زینت بخشی ہے۔ متین مچھلی شہری ایک مذہبی اور علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے بھی ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ کی جھلک صاف نظر آتی ہے ؎

ہر دو مکین ہر مکاں، ساکنِ لامکاں نہیں دیکھیے تو کہیں نہیں ڈھونڈیے تو کہاں نہیں

مذہب و مسلک مرا ہے راہِ تسلیم و رضا
کب ہے دل کو امتیازِ کعبہ و بُت خانہ آج

فقیروں کے پھٹے کپڑوں پہ کیوں ہنستا ہے اے منعم
ابھی ہے زینتِ ہستی کو تیری خود دھجّیاں ہونا

وہ خود نما حقیقتِ حُسنِ مجاز ہے
خود آئینہ ہے خود ہی وہ آئینہ ساز ہے

جس نے کیا جمالِ حقیقت کو منکشف
وہ اے متینؔ جلوۂ حُسنِ مجاز ہے

متینؔ کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اثر و تاثیر اور کیف و سُرور کے ساتھ ہی زندگی کے مختلف مسائل سے آشنا بھی کرتے ہیں اور اسے برتنے کا سلیقہ بھی عطا کرتے ہیں ؎

کاٹ دے ہنس بول کر دن زیست کے
آدمی کو چاہیئے بے غم رہے

مزہ جینے کا کچھ بے عشق حاصل ہو نہیں سکتا
اگر پہلو میں دل ہے، دل میں تو ارمان پیدا کر

فی الحقیقت متینؔ مچھلی شہری تلامذۂ داغؔ میں اپنا ایک مخصوص اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے کلام میں خیالات کی بلند پردازی کے ساتھ ہی زبان کی خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اسلوب سادہ، سلیس اور شیریں ہے۔ آپ کا شمار اُردو کے اساتذہ میں ہوتا ہے ؎

فیض ہے یہ بلبلِ ہندوستاں کا اے متینؔ
مجھ کو کامل داغؔ سے استادِ کامل نے کیا

متینؔ کو داغؔ سے خاص محبت و عقیدت تھی۔ استاد کو بھی اپنے اس عزیز ترین شاگرد پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری تحریر فرماتے ہیں:۔

" مولانا متینؔ داغؔ مرحوم کے ان مایۂ ناز تلامذہ میں سے ہیں جن پر ان کے استاد کو ہمیشہ ناز تھا اور بارہا اپنی تحریروں میں اور اپنے ہم عصر تلامذہ سے اس کا تذکرہ فرماتے تھے۔" ۳۵

یہی وجہ ہے کہ اربابِ شعر و ادب میں آپ "یادگارِ داغؔ" کے نام سے مشہور ہوئے۔ حفیظؔ جون پوری کے مرثیۂ داغ سے بھی استاد سے آپ کے دلی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے ؎

مچا ہے محفلِ شعر و سخن میں اک کہرام
عروسِ فکر کے ماتم سے حشر برپا ہے
ضیاؔ، خیالؔ، مبارکؔ، نسیمؔ ہیں دل تنگ
متینؔ اور وجاہتؔ کو سخت صدمہ ہے
ریاضؔ و آہؔ و جلیلؔ و وسیمؔ و اخترؔ کو!
یہ چُپ لگی ہے کہ رونا ہے اب نہ ہنسنا ہے
شفقؔ کو، برہمؔ و کوثرؔ کو جاہؔ و مضطرؔ کو
جو دیکھیے تو قلق شکل سے ہویدا ہے ۵۵

آخر میں یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ شعرائے متوسطین میں متینؔ مچھلی شہری کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اردو زبان کے رموز و نکات، فن و عروض کی مہارت کے ساتھ ہی آپ کی علمی و ادبی شخصیت بھی بلند تھی۔ اردو ادب کی ترویج و ترقی میں بھی آپ کی خدمات لائقِ تحسین ہیں۔ زبان و ادب کا اعلا ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے آپ محفلِ مشاعرہ منعقد کرتے رہتے تھے جس میں ہندستان کے مشہور و معروف شعرا شرکت کرنا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں جناب نوحؔ ناروی نے اپنے خلوص و محبت کا نذرانہ ایک قطعہ میں یوں پیش کیا تھا ؎

مدتوں سے آرزومندِ درِ احباب تھا
یہ سفر سازِ تمنا کے لیے مضراب تھا
نوحؔ کو تم نے سکوں بخشا بلا کر اے متینؔ
شوقِ مچھلی شہر میں وہ ماہیِ بے آب تھا

نوحؔ ناروی کے اس خوبصورت اور جذباتی اشعار سے بھی ہم عصر شعرا میں متینؔ کی قدر و منزلت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

متینؔ مچھلی شہری کے تلامذہ کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ سعدیؔ

جعفری ، واصف اور ہوش مچھلی شہری آپ کے مشہور تلامذہ میں ہیں۔ گرو پرشاد لال سریواستو ہوش مچھلی شہری صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ان کا دیوان یوپی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔

ہوش مچھلی شہری اپنے استاد محترم کو یوں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

مرے استاد مولانا متین کو
کیا اللہ نے جنت نشین جب
نظر لطف و کرم کی کر کے مجھ پر
سروش استاد نے اپنا لیا تب

افسوس! اردو کے اس باکمال شاعر نے ۲ ستمبر ۱۹۶۲ء کو اپنے وطن مچھلی شہر میں وفات پائی۔ آپ کے ارشد تلمیذ سعدی جعفری نے تاریخ وفات کہی ؎

دو ستمبر کی شب تاریک میں وہ باکمال
ہوگیا واصل بحق ہم سب کو گریاں چھوڑ کر
دی صدا یہ ہاتفِ غیبی نے لکھ تاریخ سعد
مردِ اکمل چل بسا ہستی کا ساماں چھوڑ کر

حواشی

۱؎ متین کے سو شعر ص۴۲
۲؎ نکاتِ مجنوں ص۱۶۲
۳؎ متین کے سو شعر ص۸
۴؎ دیوانِ حفیظ۔ خمخانۂ دل ص۲۰۱

چھوٹی سی پہچان ...... ص۱۲ کا بقیہ

مجھے داخل کرا آئے۔ میں بائیس دن اسپتال میں رہا۔ مجھے ٹی۔ بی ہی نکلی۔ فرق صرف اتنا رہا کہ میں سمجھتا تھا کہ مجھے آنتوں میں تکلیف ہے جبکہ نقص میرے دائیں پھیپھڑے میں نکلا۔

تب چوراڈیا صاحب نے مجھے پنچ گنی کے بیل ایر سینے ٹوریم میں داخل ہونے کی صلاح دی۔ کیسے اس سینے ٹوریم میں سیٹ مل سکتی ہے اس کا بھی راستہ بتایا۔

چوراڈیا صاحب ہی کے مشورے سے میں بمبئی کے مشہور ٹی۔بی معالج ڈاکٹر ای۔ بلیموریا کے دواخانے میں گیا۔ اے۔پی[۱] کی پہلی سوئی میں نے وہیں لی اور انھیں کی سفارش پر اس سینے ٹوریم میں داخل ہو پایا۔ میں چھ ماہ سینے ٹوریم میں اور سال بھر پنچ گنی میں باہر رہ کر علاج کراتا رہا۔ اس دوران تقسیم ملک کا طوفان بغیر ہمیں جسمانی گزند پہونچائے گزر گیا۔ فلمی زندگی میں جو اثاثہ جمع کیا تھا وہ ختم ہو گیا تو یوپی کی پہلی قومی سرکار نے ہندی کے مشہور شاعر نرالا کے ساتھ مجھے بھی پانچ ہزار روپے کا وظیفہ عطا کیا اور میں الہ آباد آکر بس گیا۔

اور یوں چوراڈیا صاحب سے وہ چھوٹی سی پہچان اس آڑے وقت میرے کام آئی ــــــ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر ان سے وہ چھوٹی سی پہچان نہ ہوتی تو نہ جانے میری بیماری کتنی بڑھ جاتی۔ تب کیا ہوتا؟ ان دنوں تو آج کی طرح اس بیماری کا کوئی تیر بہدف علاج بھی نہ تھا اور بیماری مہلک سمجھی جاتی تھی ــــ آج یہ سوچتے ہی میری روح کانپ جاتی ہے ــ

کچھ ہی دن پہلے ٹی۔ وی کے پردے پر میری ایک دن کی زندگی پر مبنی دستاویزی فلم دیکھنے کے بعد بمبئی سے ڈاکٹر سیٹھ کا خط ملا ہے جس سے معلوم ہوا ہے کہ چوراڈیا صاحب دمے کی بیماری سے صاحبِ فراش ہیں اور تیرہ چودہ گھنٹے آکسیجن پر رہتے ہیں۔ یہ پڑھ کر ان سے وہ چھوٹی سی پہچان میری یاد کے پردے پر کوند گئی ہے۔ خود گزشتہ بیس برسوں سے اس مرض کو جھیل رہا ہوں۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ خدایا! اس نیک شخص کو اس قدر تکلیف نہ پہونچا۔ اگر شفائے کامل عطا نہیں کر سکتا تو اس قدر تکلیف بھی نہ دے۔

□□

۱؎ اے۔پی۔ ایک بڑی سوئی سے پھیپھڑے کے باہر بلورا میں ہوا بھر کر اسے دبا دیا جاتا ہے۔ اسے اے۔پی کہتے ہیں۔

غزلیں

ڈاکٹر لطف الرحمٰن
شعبۂ اردو
بھاگل پور یونیورسٹی۔ بھاگلپور

اس ریاضت کا اسے اتنا صلہ دے یارب
میرے دشمن کو مری عمر لگا دے یارب

میں خلاؤں میں بہت دور صدا دے آیا
میرے سینے میں کوئی شور اٹھا دے یارب

تو نگہ دار ہے ابھری ہوئی آوازوں کا
بند ہونٹوں کو بھی اظہار و ادا دے یارب

عمر گزری مری آنکھوں کو نہ رونا آیا
ان سفینوں کو بھی اب سیلِ نوا دے یارب

میں بھی خاموش رہا ظلم کی سرتابی پر
اس خموشی کی مجھے کوئی سزا دے یارب

اب ہر اک شخص کے چہرے پہ اذیت پھیلی
اب ہر اک شخص کی بگڑی کو بنا دے یارب

□□

عبدالمتین نیاز
۳۰۔ صوفیہ ہاؤس، موتیا پارک
بھوپال

غم بن گیا مزاج، خوشی ہو، خوشی سے کیا
عادی ہوں ظلمتوں کا مجھے روشنی سے کیا

زخموں کے پھول، درد کی لذت، سرورِ غم
لے جائیں گے ہم، اور تمہاری گلی سے کیا

کرنا ہے قتل کر دو، تمہارے تو بس میں ہیں
پڑتا ہے فرق تم کو ہماری کمی سے کیا

تنہائیاں، یہ پاؤں کے چھالے، یہ تشنگی
پائو گے دشتِ عشق میں آوارگی سے کیا

ہم تو نگاہ رکھتے ہیں اس کے سلوک پر
دنیا ترے کرم سے، تری بے رخی سے کیا

برباد کرنے آیا ہے کر جائے گا نیازؔ
اس موسمِ خزاں کو گلوں کی ہنسی سے کیا

□□

[illegible] شمیم
[illegible]
[illegible]

غموں کا بارِ گراں جو اٹھا رہا ہوں میں
خود اپنی تاب و تواں آزما رہا ہوں میں

ہوں کربِ زیست کا تحویل دار صدیوں سے
ہر اعتبار سے جانِ وفا رہا ہوں میں

لبوں پہ حرفِ شکایت سوال آنکھوں میں
دیارِ شعلہ و شبنم سے آ رہا ہوں میں

اب ایک ایک قدم احتیاط سے رکھو
کہ گوشوارۂ سفر کا بنا رہا ہوں میں

میرے جنوں کی روش پہ ہے [illegible]
شمیم اس لیے دامن [illegible] رہا ہوں میں

□□

ڈرامہ

زین الدین حیدر
مولانا محمد علی میموریل اسکول کیمپس
بیکن گنج۔ کان پور

عظیم اللہ خاں

عظیم اللہ خاں ایک عظیم محبِ وطن تھے جنھوں نے نانا راؤ کے ساتھ رہ کر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا نقشہ تیار کیا اور ہندستان کے راجوں، مہاراجوں، نوابین اور مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے رابطہ قائم کر کے انگریزوں کے خلاف ہندستان کی جنگ آزادی کا طریقۂ کار مرتب کیا۔
گو کہ ہندستان کی جنگِ آزادی کے مورخین نے ان کا نام سُنہرے حرفوں میں لکھنا تو درکنار نمایاں طور پر ان کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ مگر اہل نظر اور قدر شناس حضرات کے دلوں پر عظیم اللہ خاں کی شخصیت اور قربانیوں کے انمٹ نقوش آج بھی موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگِ آزادی کے بانی سورماؤں کی تاریخ عظیم اللہ خاں کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔

(ز۔ ح)

افرادِ تمثیل

- عظیم اللہ خاں (لڑکا)
- عظیم اللہ خاں (جوان)
- نانا راؤ پیشوا
- انگریز مشنری (عیسائیت کا مبلغ)
- مسٹر اسمتھ
- والدہ عظیم اللہ خاں
- انگریز مشنری کی بیوی
- انگریز مشنری کی بیٹی (عظیم اللہ خاں کی ہم عمر)
- مسز اسمتھ
- نانا راؤ کے درباری امراء
- مقامات: کان پور۔ بٹھور
- وقت: ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء تک کا درمیانی زمانہ

منظرِ اوّل

کان پور کی ایک سڑک کے کنارے ماں اور بیٹا چادر اوڑھے لیٹے ہیں اور سونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بیٹا: اماں! بھوک لگی ہے۔

ماں: (بیٹے کو سینے سے لپٹاتے ہوئے) میرے لال! میں کیا کروں میرے اللہ مجھے موت دے دے۔

بیٹا: اماں! بہت بھوک لگی ہے

ماں: (اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، بیٹے کو پہلو میں دباتے ہوئے) ہائے اللہ! میرے مالک! میں گنہ گار ہو سکتی ہوں، اس معصوم بچے نے کیا خطا کی ہے؟

(اسی وقت وہاں سے ایک انگریز مشنری کا گزر ہوتا ہے۔ وہ رک جاتا ہے)

انگریز مشنری: کیا ہے بی بی؟ کیا تکلیف ہے ——؟ کیا بات ہے۔؟

ماں: صاحب! — کچھ نہیں صاحب — کچھ نہیں —— کوئی بات نہیں۔

بیٹا: اماں! بہت بھوک لگی ہے۔

مشنری: بی بی —! بچّہ بھوکا ہے کیا؟

ماں: ہاں صاحب! — کیا کروں؟

مشنری: بی بی! آپ کون ہیں؟ کہاں رہتی ہیں؟ یہاں سڑک کے کنارے کیوں پڑی ہیں؟

ماں: صاحب! ہم لوگ سنبھل کے رہنے والے ہیں۔ میرے شوہر مقیم اللہ خاں کان پور تلاش معاش میں آئے اور فوج میں ملازم ہو گئے۔ میری بدنصیبی کہ تھوڑے ہی دنوں بعد ہم کو داغ مفارقت دے گئے۔ میں اس دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ صرف یہی ایک سہارا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد یہیں نیل والی گلی میں ایک بزرگ بابا شاہ محمد صاحب جو میرے باپ کی طرح تھے، انھوں نے میری سرپرستی فرمائی۔ مگر میں وہ بدنصیب ہوں کہ جس سایہ میں پناہ لیتی ہوں وہ سایہ ہی اٹھ جاتا ہے۔ کیسا انصاف ہے اللہ کا۔ کیا امتحان لینے کے لیے صرف میں ہی رہ گئی ہوں — کچھ دنوں بعد بابا بھی چل بسے۔ اب میں بے یار و مددگار — در در کی خاک چھان رہی ہوں کہ کوئی ملازمت مل جائے — کوئی بطور خادمہ رکھ لے۔ یا میرے بیٹے کو ہی کوئی کام اسکے لائق دے دے تو دو وقت کی روٹی کا سہارا ہو جائے۔

مشنری: (جیب سے کچھ پیسے نکال کر دینا چاہتا ہے) بی بی یہ پیسے رکھ لو، اپنے اور بچّے کے لیے روٹی لے لینا۔

ماں: صاحب! یہ رقم میں یوں نہیں لوں گی۔ اگر آپ میری مدد ہی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے یا میرے بیٹے کو کوئی ملازمت دے دیجئے اور یہ رقم جو آپ دے رہے ہیں، تنخواہ سے کاٹ لیجئے گا — ہم بھیک نہیں لیں گے۔

مشنری: اسے بھیک نہ سمجھو بی بی۔ یہ صرف تمھاری مدد ہے۔ خدا اور اس کے بیٹے کا حکم ہے کہ ضرورت مندوں کی مدد کرو۔ دنیا میں جو بھی خدا کے بندے موجود ہیں، ان کا آپس میں ایک رشتہ ہے۔ کوئی غیر نہیں ہے سب اپنے ہیں۔ خدا اور خدا کے بیٹے کا کرم سب پر ہے۔ انسان کو خدا نے تمام مخلوقات میں افضل بنایا ہے۔ ہر انسان کو دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیئے۔ مدد کرنی چاہیے۔ انسان کا اپنا کچھ نہیں ہے سب خدا کی امانت ہے — کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا — نہ ہی دے سکتا ہے — صرف وہی ایک دینے والا ہے۔ بی بی تم اس کو بھیک نہ کہو۔ یہ خدا کی طرف سے ہے جس نے مجھے تمھارے پاس بھیجا اور یہ اسی کی دی ہوئی چیز ہے جو میرے وسیلے سے تم تک پہونچ رہی ہے۔

ماں: نہیں صاحب — یہ سب درست ہے۔ وہی سب کو دینے والا ہے۔ وہی غنی ہے اور وہی رازق ہے۔ مگر میں یہ پیسہ صرف اس شرط پر قبول کر سکتی ہوں جب آپ ہم لوگوں سے کوئی خدمت لیں۔ بغیر محنت و خدمت کے یہ رقم میں ہرگز قبول نہ کروں گی.....

بیٹا: اماں! بہت زور کی بھوک لگی ہے — بھوک برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ پیاس بھی لگی ہے — اماں روٹی نہیں تو پانی ہی پلا دو — اماں بہت پیاس لگی ہے۔

ماں: (بیٹے کو سینے سے لپٹا کر) ابھی چلتی ہوں بیٹا — دیکھتی ہوں کہاں پانی ملتا ہے۔

مشنری: بی بی اٹھو — میرے ساتھ میرے بنگلے چلو۔ ہم تم کو کھانا پانی سب دیں گے۔ وہاں میری بیوی ہے بیٹی ہے۔ وہ تم سے مل کر خوش ہوں گی — ہم تم کو اپنے یہاں ملازمت دیں گے — کچھ مت سوچو — اٹھو — میرے ساتھ چلو ——

ماں: کہاں —؟ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟ — کہاں چلنا پڑے گا؟

مشنری: بی بی۔ میرا گھر کرنیل گنج میں ہے — چلو کچھ مت سوچو تم میری بہن ہو۔ بنگلے میں میری بیوی اور بیٹی ہیں۔ تم ان کے

پاس رہنا۔

ماں: (اُٹھتے ہوئے اور چادر لپیٹتے ہوئے)۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے معبود! یقیناً تیرے ہزار ہاتھ ہیں ـــــ تو ہی غریبوں اور بے کسوں کا والی و مددگار ہے۔

[ماں بیٹے انگریز مشنری کے ساتھ روانہ ہو جاتے ہیں]

(پردہ گرتا ہے)

منظر دوم

راوی:- انگریز مشنری جو ایک نیک طینت اور خدا ترس انسان تھا۔ ماں بیٹے کو اپنے بنگلے لے گیا۔ اس کی بیوی نے عظیم اللہ خاں کی ماں کو بہت ڈھارس بندھائی اور بہت اخلاق و بے حد محبت سے پیش آئی۔ بی بی گھر کے کام کاج میں دوسرے ملازموں کا ہاتھ بٹاتی اور بیٹا عظیم اللہ خاں سودا سلف لاتا اور باہر کے کام کاج دیکھتا۔ انگریز مشنری اور اس کی بیوی اور بیٹی عظیم اللہ خاں کو ملازم نہیں سمجھتے تھے، ان سے عزت سے پیش آتے اور ہمدردانہ سلوک کرتے۔ انگریز مشنری نے عظیم اللہ خاں کی تعلیم و تربیت کا بھی معقول انتظام کیا۔ انگریزی، اُردو اور فرانسیسی زبانوں کی تعلیم دلوائی۔ عظیم اللہ خاں انگریزی اس روانی کے ساتھ بولنے لگا جیسے یہ اس کی مادری زبان ہو۔ چونکہ انگریز مشنری کے کوئی بیٹا نہیں تھا اسلئے وہ اس کو بیٹے کی طرح مانتا۔ گھر کے سبھی لوگ اس سے بے حد پیار کرتے تھے۔ اسے بالکل اپنا بیٹا سمجھتے ـــ وہ شکل و صورت، قد و قامت اور رنگ روپ سے بے حد حسین و جمیل تھا۔ رنگ اتنا گورا تھا کہ لوگوں کو اس کے انگریز ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ انگریز مشنری شام کو اسے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھاتا۔ بڑے پیار سے دیر تک گفتگو کرتا رہتا۔ انگلینڈ کی باتیں، لندن کی تعریف، انگریزوں کی توصیف اور عیسائی مذہب کی اچھی اچھی باتیں، انجیل مقدس کی نصیحت آموز کہانیاں سناتا۔۔۔۔

(پردہ اُٹھتا ہے)

[انگریز مشنری کے بنگلے کا ڈرائنگ روم۔ انگریز مشنری اس کی بیوی، بیٹی، عظیم اللہ خاں کی والدہ، عظیم اللہ خاں ایک انگریز مرد اور اس کی بیوی بیٹھے ہیں۔]

مشنری: (دوسرے انگریز سے مخاطب ہوکر) مسٹر اسمتھ! اس لڑکے کو آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ بہت شریف اور نیک لڑکا ہے۔ اس کا نام عظیم اللہ خاں ہے، یہ بی بی اس کی مدر ہے۔ ہم کو خدا اور اس کے بیٹے نے اپنے فضل و کرم سے ان سے ملا دیا۔

مسٹر اسمتھ: بڑی مسرت ہوئی ان سے مل کر۔ میں اس دن آپ سے ملنے آیا تھا، اور آپ باہر گئے ہوئے تھے تو یہ بیٹا ملا تھا۔ یہ انگلش ایسے بولتا ہے جیسے کوئی برٹش۔ مجھے بہت حیرت ہوئی تھی اور خوشی بھی۔

مشنری کی بیٹی: عظیم اللہ خاں میرے ساتھ پڑھتا ہے۔ ممی اس کو اور ہم کو انگریزی اور فرانسیسی پڑھاتی ہیں۔ اور مولوی صاحب اُردو پڑھاتے ہیں۔

مشنری کی بیوی: اور یہ کیوں نہیں بولتی کہ یہ تم سے زیادہ ذہین ہے اور اس میں گریسپ (Grasp) کرنے کی صلاحیت تم سے زیادہ ہے۔

مسز اسمتھ: دیکھنے میں بھی اسمارٹ اور ہینڈسم (Handsome) ہے بڑا اچھا بیٹا ہے۔

مشنری: (سب سے مخاطب ہوکر) کھانے میں تھوڑی دیر ہے، تب تک کچھ بائبل کی باتیں ہو جائیں ـــــ ہاں تو عظیم اللہ خاں کل ہم لوگوں نے جہاں چھوڑا تھا، اس سے آگے پڑھو۔

عظیم اللہ خاں: (میز سے کتاب اٹھا کر کھولتا ہے اور پڑھتا ہے)

"اے خداوند!
اپنے بندوں پر رحم فرما
اپنی شفقت سے ہم کو آسودہ کر
تاکہ ہم عمر بھر خوش و خرم رہیں

جتنے دن تو نے ہم کو دکھ دیا
اور جتنے دن ہم مصیبت میں رہے، اتنی ہی خوشی ہم کو
عنایت کر ....
وہ میرا خدا ہے جس پر میرا توکل ہے۔
میں خداوند کے بارے میں کہوں گا کہ وہ میری پناہ گاہ
ہے ...."

مشنری: بس کرو عظیم اللہ خاں۔ خدا کے بیٹے نے خدا کے پیغام کو، جو ہمارے لیے سراسر ہدایت ہے، ہم تک پہنچایا وہی نجات کی راہ ہے ......

....

میرا بیٹا عظیم اللہ خاں یسوع مسیح کی تعلیمات سے بہت متاثر ہے۔ مگر بی بی کا خیال کچھ اور ہے۔ ہم بی بی کو بتا چکے ہیں کہ اگر عظیم اللہ خاں عیسائی مذہب اختیار کرلے تو ہم اپنی بیٹی سے اس کی شادی کردیں گے، انگلینڈ بھیج دیں گے وہاں لندن میں میری بہت بڑی پراپرٹی ہے، سب اسی کا ہو جائے گا۔ وہاں بہت عزت اور آرام کی زندگی گزارے گا مگر بی بی کی سمجھ میں نہیں آتا —— وہ صرف —— وہی مرنے کی ایک ٹانگ —— اپنا اسلام، اپنا دین نہیں چھوڑیں گے۔ اپنا ہندستان جنت نشان نہیں چھوڑیں گے —— ہم تو سمجھا کر ہار گئے ....

مسٹر اسمتھ: (عظیم اللہ خاں کی ماں سے مخاطب ہو کر) میڈم خان! آپ کو ایسا اچھا موقع مل رہا ہے۔ صاحب آپ کے لڑکے پر اتنا مہربان ہے۔ اپنی ساری پراپرٹی دے رہا ہے۔ آپ کا لڑکا عزت و آرام کی زندگی گزارے گا اور آپ بھی عیش کریں گی۔ عیسائی مذہب دُنیا کا سب سے اچھا مذہب ہے۔ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جو عیسائی مذہب قبول کر لیتا ہے اس پر خدا اور خدا کے بیٹے کا کرم اور انعام نازل ہوتا ہے۔ اس کا دین اور دنیا دونوں سنور جاتا ہے۔

بی بی: (والدہ عظیم اللہ خاں) —— ہرگز نہیں —— ہم اور ہمارا بیٹا اپنا مذہب اسلام کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ ہم سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں —— ہم پھر سڑکوں پر جا سکتے ہیں مگر اپنا دین نہیں چھوڑیں گے —— ہم کو در بدر کی ٹھوکریں کھانا منظور ہے مگر اپنا مذہب چھوڑ کر بنگلوں میں عیش و آرام کرنا منظور نہیں —— !!

مشنری کی بیوی: اگر آپ کو یہ منظور نہیں —— اور سڑکوں پر مارا مارا پھرنا منظور ہے —— بھوکوں مرنا منظور ہے —— ہر طرح کا ذلت اٹھانا منظور ہے تو آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔

بی بی: عظیم اللہ۔ بیٹے اٹھو، چلو یہاں سے۔ یہاں میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ اللہ کی زمین تنگ نہیں۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی انتظام ہو ہی جائے گا۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اور اگر نصیب میں در بدر کی ٹھوکریں کھانا ہی لکھا ہے تو اسے کون ٹال سکتا ہے۔ ہمارے لیے اسلام ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ ہم اسے ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے —— اور ہمارا ہندستان ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اس پر ہزار انگلینڈ اور دس ہزار لندن قربان کر دیں گے

(ماں بیٹے اٹھ کر چلنے لگتے ہیں)

عظیم اللہ خاں: گڈ نائٹ

بی بی: خدا حافظ۔

مشنری کی بیوی: تُف! —— نالی کا کیڑا نالی ہی میں رہے گا۔

(پردہ گرتا ہے)

منظر سوم

راوی: عظیم اللہ خاں انگریز مشنری کے یہاں سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد بھی کان پور ہی میں مقیم رہا۔ مشنری کے یہاں قیام کے دوران عظیم اللہ خاں کا آنا جانا کان پور کی مقتدر انگریز ہستیوں کے یہاں تھا اور لوگ اس کی شخصیت، ایمان داری اور ذہانت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انھیں میں سے ایک انگریز کے توسط سے مسٹر پاٹن سے ملاقات ہوئی جو کان پور

چھاؤنی میں ایک اسکول چلاتا تھا جس میں کئی زبانوں اور مختلف علوم کے بہت اچھے ٹیچر موجود تھے۔ اس کے اسکول میں عظیم اللہ خاں کا داخلہ ہو گیا اور انگریزی، فارسی، عربی اور فرانسیسی زبانوں میں دست گاہ حاصل کی اور وہیں ٹیچر ہو گیا۔ اس وقت تک اس کی ذہانت، علمیت اور زبان دانی کا شہرہ عام ہو چکا تھا اور یہاں کی مقتدر ہستیوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ اس کی شہرت سن کر بٹھور کے نانا راؤ پیشوا نے اپنے انگریز اتالیق مسٹر ٹاڈ کو کان پور بھیج کر عظیم اللہ خاں کو بلوایا۔ عظیم اللہ خاں سے گفتگو کے بعد نانا راؤ اتنا متاثر ہوا کہ پھر عظیم اللہ خان کو کان پور واپس نہیں آنے دیا اور اب عظیم اللہ خاں نانا راؤ کا رفیق، مشیر خاص اور دست راست بن کر بٹھور میں قیام پذیر ہو گیا۔

(پردہ اُٹھتا ہے)

بٹھور میں نانا راؤ کا محل، دیوان خانہ میں نانا راؤ اور اس کے معتمد امراء رونق افروز ہیں۔ عظیم اللہ خاں جان محفل بنا ہوا ہے۔

نانا راؤ: عظیم اللہ خاں! یہ بات آپ سے چھپی نہیں ہے، کہ انگریزوں نے ہم ہندستانیوں کے ساتھ جو ظلم و زیادتی کی ہے اس کی مثال دُنیا میں نہیں مل سکتی۔ پیشوا کے کے ساتھ انگریزوں نے جو دھوکے بازی کی وہ بھی کسی سے چھپی نہیں ہے۔ پیشوا نے مجھے گود لیا مگر لارڈ ڈلہوزی نے اس میں رخنہ اندازی کی اور اس گود نشینی کو ماننے سے انکار کر دیا۔

عظیم اللہ خاں: مجھے معلوم ہے کہ ڈلہوزی کے کالے قانون سے آپ ہی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی ہے بلکہ ناگپور، ستارہ اور جھانسی کو بھی ہڑپنے کی ناپاک سازش کی گئی۔

نانا راؤ: انگریزوں کی پالیسی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا حکومت حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کے فریب، جھوٹ، مکر اور ظلم و استبداد کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔؟

عظیم اللہ خاں: نانا صاحب! انگریزوں کے کردار اور ان کی زبان کا کوئی بھروسہ نہیں۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کتنا نیچے گر سکتے ہیں اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ایک درباری: مجھے تو یہ دونوں انگریز کمشنر جو ہم پر مسلط کیے گئے ہیں اور روزانہ سلام کے لیے حاضر ہوتے ہیں، ان کی تقرری پر بھی یہ شک گزرتا ہے کہ ان کا قیام یہاں سوائے مخبری اور منٹ منٹ کی رپورٹ حاصل کرنے اور اپنے افسران بالا کے لئے جاسوسی کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔

نانا راؤ: بھائی میں بھی اسے خوب سمجھتا ہوں مگر کیا کروں۔ ہماری حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں۔ ہماری آزادی سلب کر لی گئی ہے۔ ہم اپنی مرضی سے ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔

عظیم اللہ خاں: پھر بھی یہ تعجب کی بات ہے کہ آپ کے دل میں انگریز حکام کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ آپ آئے دن انکی دعوت کرتے رہتے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات اور تحفے تحائف پر اچھی خاصی رقم صرف کرتے ہیں۔

نانا راؤ: میرے بھائی! جسے آپ نرم گوشہ کہتے ہیں وہ بھی میری مجبوری ہے یہ سب مصلحتاً کرنا پڑتا ہے کہ کوئی نئی سازش نہ کریں، کوئی نیا فتنہ نہ برپا کریں۔

دوسرا درباری: مگر سرکار۔ ہم تو نہیں دیکھتے کہ اس خاطر مدارات میل ملاپ کا کوئی بہتر نتیجہ برآمد ہو۔ سانپ کے بچے کو دُودھ پلا کر پالنا ہرگز اس بات کی ضمانت نہیں کہ اس کے کاٹنے سے کوئی محفوظ رہے۔ جن کی فطرت کمینی ہوتی ہے اور جبلت میں جھوٹ، فریب، مکاری اور خود غرضی ہو اور جن کا وطیرہ محسن کشی ہو، وہ اپنی عادت سے کبھی باز نہیں آ سکتے اور اپنے حصولِ مقصد کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔

عظیم اللہ خاں: آپ کی بات صد فی صد درست ہے، لارڈ ڈلہوزی کے آئے دن کے فرامین اور حکم نامے، آپ کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک فرنگی ذہن کی کمینگی کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

نانا راؤ: عظیم اللہ خان! ہم آپ سے ایک انتہائی اہم مشورہ کرنا چاہتے ہیں اور آپ کی ذہانت، دانش مندی، سُوجھ بوجھ اور دُور اندیشی پر یقین کرتے ہوئے اس بات کے خواہاں ہیں کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ ہم اپنے حصولِ خطاب و پنشن کے لیے کیا اقدامات کریں بلکہ اس سے بھی اہم یہ کہ ہم کیا تدابیر کریں کہ ان فرنگی سانپ کے بچّوں کو بھارت بھومی سے نکال باہر کریں۔

عظیم اللہ خاں: نانا صاحب! میرے نزدیک خطاب کی واپسی اور پنشن حاصل کرنا ہی مقصد نہیں ہونا چاہیے بلکہ اہم ترین اور اوّلین مقصد ان فرنگیوں کو ہندستان سے باہر نکال دینا ہی ہونا چاہیے۔ ہاں خطاب کی واپسی اور پنشن کے حصول کو اس مقصد کے حاصل کرنے کا ایک بہانہ اور ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

نانا راؤ: درست ہے عظیم اللہ خاں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نکالنا کہ میں خطاب اور پنشن کا بھوکا ہوں ہرگز نہیں۔ مقدم اور اہم ترین چیز تو ان کو دیش سے نکال دینا ہی ہے۔

عظیم اللہ خاں: نانا صاحب! اس سلسلے میں میرے خیال سے پہلا قدم تو یہ اٹھانا چاہیے کہ ایک میمورنڈم کورٹ آف ڈائرکٹرس ایسٹ انڈیا کمپنی لندن کو روانہ کیا جائے۔ حالانکہ میری چھٹی حس بول رہی ہے کہ ڈلہوزی اس پر اپنی رپورٹ ہمارے خلاف دے گا اور ہماری بات ہمارے منھ پر ماردی جائے گی ــــ اگر ایسا ہوا تو دوسرا قدم ہمارا یہ ہوگا کہ آپ اگر مجھے انگلینڈ روانہ کرنے کے لیے راضی ہو جائیں گے تو وہاں جاکر میں حالات کا جائزہ لوں گا اور آگے کے لئے طریقہ کار مرتب کروں گا۔

نانا راؤ: مگر اس میں بڑا وقت لگے گا۔

عظیم اللہ خاں: دیر آید درست آید۔ کہتے ہیں جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔

نانا راؤ: عظیم اللہ خاں۔ ہم نے آپ سے مشورہ طلبی صرف مشورہ برائے مشورہ کے لیے نہیں کی ہے بلکہ اس پر عمل کرنے کی غرض سے کی ہے۔ آپ جیسا کہہ رہے ہیں اس کی تیاری کریں۔ ہم کو آپ کا مشورہ صد فیصد قبول ہے۔

عظیم اللہ خاں: نانا صاحب! مگر آخر میں یہ بات بھی بتا دوں کہ صرف لکھا پڑھی اور لندن کی آمد و رفت سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ یہ ساری باتیں میں معاملات کو الجھانے کے لیے کرنا چاہتا ہوں ورنہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم کو یہ مقصد لے کر چلنا ہے کہ ہم فرنگیوں کو ہندستان سے باہر کر دیں، چاہے جس قیمت پر بھی ہو اور اس کے لیے ہمیں ایک لمبی لڑائی لڑنی ہوگی ــــ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں اپنے مقصد کو حاصل نہ کر پائیں لیکن انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ کر ہم ایک بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے اور مادرِ وطن کا ایک بھاری قرض چکا دیں گے ــــ اب ہم تنگ آچکے ہیں اور ــــ تنگ آمد بہ جنگ آمد!

نانا راؤ: عظیم اللہ خان بھگوان کے بھروسے پر ہم طرح کی لڑائی کے لیے تیار ہیں۔ آپ طریقہ کار مرتب کیجیے

عظیم اللہ خاں: ہم ہندستان کی ریاستوں سے اس سلسلے میں رازدارانہ طور پر خط و کتابت کریں گے اور ہمیں یقین ہے کہ سب کے سب لوگ اس بات سے متفق ہوں گے۔ کیونکہ فریبی اور بے ایمان فرنگیوں نے کسی کو بھی بخشا نہیں ہے۔

نانا راؤ: آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے معلوم ہوا ہے کہ ستارہ کے حکمراں کے وکیل جو لندن مہاراجہ ستارہ کی طرف سے بات کرنے گئے تھے انھیں ناکامی ہوئی ہے۔ پہلے تو انگریزوں نے انھیں دلاسا دیا پھر مکر گئے۔ مہاراجہ ستارہ بہت ناراض ہیں اور انگریزوں سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہیں۔

عظیم اللہ خاں: ہم کو بھی ابھی سے اس جنگ کی تیاری کرنی چاہیے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں جنگ کا نقشہ اور اس کا پلان تیار کر لینا چاہیے ــــ ہم کو یہ کام بہت منظم

طریقے سے کرنا ہوگا۔ ناناصاحب! اس میں صرف امراء راجوں مہاراجوں اور نوابوں سے ہی مدد نہیں لینی ہوگی بلکہ غریب عوام اور ان پڑھ دیہاتیوں سے بھی تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ ہمیں ان کو انگریزوں کی بدکرداری، بے ایمانی، فریب، مکاری اور ہندستان کو ہڑپنے کی سازش سے واقف کرانا ہوگا ـــــ آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا ہوگا، اور اس جنگ میں ان کا کیا رول ہوگا یہ بتانا ہوگا۔

نانا راؤ: عظیم اللہ خاں! یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ کمپنی کی فوجیں بھی ہیں اور ان کی تعداد اچھی خاصی ہے وہ ہمارے پلان کو ملیامیٹ کرسکتی ہیں۔ ہمارے عوام کو کچل سکتی ہیں...

عظیم اللہ خاں: ناناصاحب! یہ بات بھی ذہن میں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کمپنی کی فوج میں ہندستانیوں کی تعداد بھی خاصی ہے ان کو انگریزوں کے خلاف ورغلانے اور بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے رجمنٹ کے مولویوں اور پنڈتوں سے رابطہ قائم کرنا ہوگا ـــــ ان سے کام لینا ہوگا۔ وہ ہمارے مقصد کے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ فوج کے قلیوں، مزدوروں اور دوسرے کارکنوں سے بھی کام لینا ہوگا۔

نانا راؤ: آپ کے ذہن میں جو پلان ہے وہ یقیناً قابل داد ہے۔ اس سے آپ کی ذہانت، دوراندیشی اور جذبۂ حب الوطنی کا پتہ چلتا ہے اور ہم یقیناً کامیاب ہوں گے۔

عظیم اللہ خاں: ناناصاحب! جس کے دل میں وطن سے محبت کا جذبہ نہ ہو وہ انسان نہیں جانور ہے بلکہ اسے جانور کہنا جانور کی توہین ہے ـــــ ہاں تو اس سلسلے میں ہمیں شہنشاہ ہندستان بہادر شاہ ظفر سے بھی رابطہ قائم کرنا ہوگا۔

ایک درباری: خان صاحب! شہنشاہ اب شہنشاہ کہاں رہ گئے ہیں ان کی حکومت تو سمٹ سمٹا کر لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ ہماری کیا مدد کرسکتے ہیں۔؟

عظیم اللہ خاں: میرے بھائی! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ اس بے دست و پا شہنشاہ کی اندرونی قوت سے باخبر نہیں ہیں ـــــ آج بھی وہ اتنا طاقت ور ہے کہ ہندستان کے عوام کے دلوں پر حکومت کرتا ہے اور اس کی قیادت میں ہندو مسلمان حکمران تو کیا عام رعایا تک جان قربان کر دینے سے دریغ نہ کرے گی۔ یہ فرنگی اگر اس کی جان کے دشمن ہیں تو اس کی رگوں میں بھی مغلوں اور راجپوتوں کا خون موجزن ہے۔ اگر وہ انتقام پر آمادہ ہوگیا تو ہم لوگ اس کی قیادت و رہبری میں انگریزوں کی بنیاد کھود کر پھینک دیں گے۔ ان کا ہندستان میں رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ ہندستان پر حکومت کرنے کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔

نانا راؤ: بہت اچھا ـــ عظیم اللہ خاں! بھگوان تمہیں سوچنے سمجھنے کی اور شکتی دے۔ تمہاری دوراندیشی اور وطن پرستی کے ہم قائل ہوگئے۔

عظیم اللہ خاں: اگر خدا نے ہماری مدد کی اور ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگئے تو ہم ایک ایسی سیکولر اور فیڈرل حکومت کی تشکیل کریں گے جس میں ہندستان کے ہندو مسلم، راجے مہاراجے، نوابین اور عوام کے نمائندے شامل ہوں گے۔ ہر مذہب کی عزت کی جائے گی۔ ہر شخص کو پوری مذہبی آزادی ہوگی۔ سب برابر کے مرتبہ، سلوک، عزت اور انعام کے مستحق ہوں گے۔

نانا راؤ: عظیم اللہ خاں! ہم آپ کے پلان سے سو فیصدی متفق ہیں اور بھگوان کے بھروسہ پر ہر طرح کی لڑائی لڑنے کو تیار ہیں۔ ہم آپ کی اور آپ کے مشوروں کی قدر کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ ہم کسی بھی قیمت پر اپنے وعدے سے نہیں پھریں گے۔ آپ کے مشوروں پر عمل کریں گے۔ آپ طریقۂ کار مرتب کیجیے ہم آپ کے ساتھ ہیں ـــــ بھگوان ہمارے ساتھ ہے۔

(سارے درباری ہم آواز ہو کر نعرہ زن ہوتے ہیں) ـــــ

نانا راؤ پیشوا زندہ باد۔ نانا راؤ پیشوا زندہ باد! بھگوان ہمارے ساتھ ہے۔ خدا ہماری مدد کرے۔ (پردہ گرتا ہے)

مجاہسی
[illegible]

پیغام امن و آشتی

تیری عظمت پہ میں قربان آمرے ہندستاں
تیرے سر کا تاج ہیں یہ پربتوں کی چوٹیاں
تیرے پیاسوں کیلئے ہیں ندیاں تیری رواں
سرزمیں تیری بنی کشمیر سے جنت نشاں
ساحل بنگال آئینہ ہے تیرے حُسن کا
وادی اپھال گنجینہ ہے تیرے حُسن کا

ہندو مسلم سکھ عیسائی کی نرالی شان ہے
اِسی دیوار کے مانند ہر انسان ہے
جان کہتے ہیں جسے وہ آن پر قربان ہے
جانتے ہیں جاننے والے یہ ہندستان ہے
صلح کل مسلک کا ہے پیغام امن و آشتی
اپنے مشرب میں نہیں جائز کسی سے دشمنی

گوتم و نانک کی دھرتی کو بنائیں گے دُلہن
اس کے ہر ذرے سے پھوٹے گی محبت کی کرن
دیکھے گی دُنیا ہمارے حوصلوں کا بانکپن
جب تلک زندہ ہیں ہم جیسے فدایان وطن
کر چکے ہیں عزم ہم بدلیں گے عنوان حیات
نور سے معمور کردیں گے یہ بزم کائنات

اپنی عزت پر نہ کوئی حرف آنے پائے گا
دیش پر اپنے مسرت کوش بادل چھائے گا
رک نہیں سکتا ہے دیش آگے ہی بڑھتا جائے گا
پرچم قومی، ترنگا ہر طرف لہرائے گا
یہ ترقی کا زمانہ یہ فضائے خوش گوار
یوں چمن اندر چمن ہے یوں بہار اندر بہار

جو تمیں بیدار ہیں جاگے ہوئے ہیں گامیلے
آج ہم کرسکیں دیں گے جب نہ ماضی میں دیے
جو چمک ہے چھاننے سے کسی کے چھُپ سکے
گل بہا تھا جو شہیدان وطن کے جسم سے
آج تک وہ خون تازہ دامن قاتل میں ہے
کیا ہوں ٹھنڈے حوصلے جب تک حرارت دل میں ہے

ہم کسی گھر کے کسی دیوار کے عاشق نہیں
ہم کسی گل کے کسی گلزار کے عاشق نہیں
ہم کسی در کے کسی دربار کے عاشق نہیں
ہم کسی سر کے کسی سردار کے عاشق نہیں
صرف حب ملک و ملت جذبۂ کامل میں ہے
عشق ہندستان اے آجد ہمارے دل میں ہے

[illegible]
عقب [illegible]

غزل

آدمی صورت حالات سے ڈر جاتا ہے
ورنہ طوفان تو آتا ہے گزر جاتا ہے

لوٹ لیتے ہیں خود اس کے ہی اثاثے اسکو
وہ مسافر کہ جو رستے میں ٹھہر جاتا ہے

سارے دن بانٹ کے دنیا کو اجالے اپنے
شام کو تھک کے خورشید اُتر جاتا ہے

لذت زخم وفا کیا ہے یہ ہم جانتے ہیں
ہم کو وہ زخم نہ دو تم کہ جو بھر جاتا ہے

ان دنوں وہ کسی الجھن سے پریشاں تو نہیں
بار بار آج یہ کیوں ذہن اُدھر جاتا ہے

دل کے رشتے جہاں کمزور ہوا کرتے ہیں
ایسی تعلیم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے

ایک بھی پھل کسی اک شاخ شجر سے نہ گرا
پھینکتا ہوں میں جو پتھر وہ کدھر جاتا ہے

کیسی دہشت ہے [illegible] کہ ہر شام تبشیر
ایک سناٹا سا ہر سمت بکھر جاتا ہے

ڈاکٹر خورشید عالم
۹۴/۶ - سمیع ہاؤس ۔ مالویہ روڈ
دیوریا

ہندی کہانی کا آغاز و ارتقاء

ہندی کی پہلی طبع زاد کہانی کون سی ہے ؟ اس بارے میں ناقدین میں اتفاق رائے نہیں ہے ۔ رسالہ ' سرسوتی ' میں مطبوعہ کہانیوں میں سے اچاریہ شکل اور ڈاکٹر کرشن لال ' اندومتی ' (کشوری لال گوسوامی سنہ ۱۹۰۱ء) کو ، لکشمی نرائن لال "گیارہ ورش کا سمئے" (رام چندر شکل سنہ ۱۹۰۳ء) کو اور رائے کرشن داس " مودلائی والا " (بنگ مہیلا سنہ ۱۹۰۷ء) کو ہندی کی اولین طبع زاد کہانی مانتے ہیں ۔ اس دور میں ' سرسوتی ' میں مطبوعہ دیگر کہانیوں میں بھی نئی کہانی کے نقوش ملتے ہیں " پنڈت ینڈتانی " (گرجادت باجپئی سنہ ۱۹۰۳ء) " گل بہار " (کشوری لال گوسوامی سنہ ۱۹۰۷ء) " اپنا دی کی آتم کہانی " (یشودا نندن اکھوری سنہ ۱۹۰۴ء) " راکھی بند بھائی " (ورندادن لال ورما سنہ ۱۹۰۹ء) " رکشا بندھن " بشمبھر ناتھ شرما کوشک ' کی پہلی کہانی سنہ ۱۹۱۳ء) اور " اس نے کہا تھا " (چندر دھر شرما گلیری سنہ ۱۹۱۵ء) وغیرہ ایسی ہی کہانیاں ہیں ۔

' سرسوتی ' کے علاوہ اس وقت جے شنکر پرساد کی ادارت میں شائع ہونے والے " اندو " رسالے نے بھی ہندی کہانی کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا ۔ اس میں پرساد کی کہانی " گرام " (۱۹۱۱ء) اور راجہ رادھیکا رمن سنگھ کی مشہور کہانی ' کانوں میں کنگنا " (۱۹۱۳ء) میں شائع ہوئی ۔ اس دور کے مشہور مزاح نگار جے ' پی سریواستوا نے کہانی لکھنا اسی ' اندو ' سے شروع کیا ۔ سنہ ۱۹۰۰ء یعنی ' سرسوتی ' کے ساتھ ہی گوپال رام گہمری ' کے " جاسوس " نام کے پرچے کا بھی آغاز ہوا ، اور اس میں گہمری جی نے خود جاسوسی ، جبر و ظلم کے متعلق ناولوں کے علاوہ کہانیاں بھی لکھیں جن میں " بھیانک چوری " اور " جمنا کا خون " جیسی کہانیوں کی دھوم مچی ۔

اس دور کی کہانیوں پر آدرش واد کا کافی گہرا اثر معلوم پڑتا ہے Resurrection کی ذہنیت اپنے لازوال روایتی تہذیب کے اندر ان سماجی رشتوں کی کھوج میں صاف دکھائی دیتی ہے جو پریم ، بھائی چارہ ، انسان دوستی جیسے جذبات پر مبنی ہوتی ہے ۔ کہانیاں شعریت سے بھرپور ہوتی ہیں جس کی وجہ سے کہانی کار ایک آدرش کردار کی تخلیق میں تخیلات کا استعمال بلا جھجک کرتا ہے ۔ کہانیوں میں کہانی پن ، کردار اور مقصد کے آپسی رشتے کافی مضبوط ہوتے ہیں ۔ اس لئے کہانی حقیقی زندگی سے دور اور اتفاق پر زیادہ مبنی ہوتی ہے ۔

اس دور کی مشہور کہانی " اس نے کہا تھا " اپنے فریم کے اندر نہ ہوکر اتفاقی لگتی ہے ۔ پھر بھی کہانی فنی اعتبار سے ہندی کی مشہور کہانیوں میں سرفہرست رکھی جاتی ہے ۔ آچاریہ رام چندر شکل نے اس کہانی میں ایثار و قربانی سے پر محبت کی خاموش زبان اور حادثات کی دل کھول کر تعریف کی ہے ۔

۱۹۱۶ء میں پریم چند کی مشہور کہانی " پنچ پرمیشور " شائع ہوئی تو تخلیقی عمل ، زندگی کے نظریے اور طرز تحریر میں وقت کے فرق کا احساس ہوا ۔ شاعری کا چھایا واد کال اور سیاست کا گاندھی وادی یگ ہی ہندی کہانی میں پریم چند یگ کے نام سے مشہور ہے اور دونوں کے داخلی و خارجی پہلوؤں کو روشن کرتا ہے ۔ موٹے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر گاندھی واد کو پریم چند نے تو چھایاواد کو پرساد نے فنی اعتبار بخشا ۔ یہ ادیب اس دور کی سماجی چیتنا اور ذاتی چیتنا کے دو کنارے

ہیں۔ چنڈی پرساد ہردیش، رائے کرشن داس، ونود شنکر بیاس اور پانڈے بیچن شرما "اگر" نے پرساد کا گہرا اثر قبول کیا ہے تو گووند بلبھ پنت، بھگوتی پرساد باجپئی، سدرشن، چترسین شاستری، کملاکانت ورما، راجہ رادھیکا رمن سنگھ اور ورنداون لال ورما وغیرہ پریم چند کی روایت سے متاثر نظر آتے ہیں۔

پریم چند کی "آتما رام"، "عیدگاہ"، "پوس کی رات"، "دو بیلوں کی کتھا" "رام لیلا" اور "مکتی مارگ" وغیرہ کہانیوں میں اس وقت کے ملکی حالات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ حب الوطنی، گرام سدھار، آزادیٔ نسواں، سماج سدھار، ستیہ گرہ اور استحصال وغیرہ ان کہانیوں کے موضوع ہیں۔ لیکن پریم چند کے آخری زمانے کی کہانی "کفن" میں اس روایت سے انحراف کیا گیا ہے۔ یہ وہی دور ہے جب ترقی پسند مصنفین کی ہندوستان میں پہلی کانفرنس میں پریم چند نے شرکت کی تھی۔ اسی زمانے میں ہندی کہانی میں ترقی پسندی یا مارکسی نظریات کی عکاسی کا آغاز ہوا، اور راہل سانکرتیاین، یش پال اور بھگوتی شرن اپادھیائے وغیرہ نے اس میں تعاون کیا۔

پریم چند کے بعد کا دور ہندی کہانی کے عروج کا دور ہے۔ گاندھی، مارکس اور فرائڈ کے ملے جلے اثرات کے نتیجے میں اس وقت ہندی کہانی نئی روش سے آگاہ ہوئی۔ اس دور میں شاعری کی طرح کہانی میں بھی چھوٹے چھوٹے تجربے ہوئے۔ "دوز"، "پتھار کا دھیرج"، "گنگوین" اور "تاج محل کی چھایا میں" وغیرہ کہانیاں کافی مقبول ہوئیں۔ زندگی کے گہرے مشاہدے اور اس کی داخلی خوبصورتی کا نفسیاتی جائزہ ان کہانیوں کی خوبی ہے۔ جینندر کی کہانی "جاہوی"، "تت ست"، "نیلم دیش کی رام کنیا"، "رتن پربھا" اور "وگیان" وغیرہ کہانیوں میں گاندھی ازم کی صاف جھلک ملتی ہے۔ ایلا چند جوشی، امرت رائے، امرت لال ناگر، بھگوتی چرن ورما، اوپیندر ناتھ اشک، وشنو پربھاکر، سدرشن اور چندرگپت ودیالنکار وغیرہ نے اس دور میں ہندی کہانی کے خزانے کو اپنی تخلیقات سے مالامال کیا۔

ہندی کہانی میں ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کے ۱۵ سال تخلیق اور تنقید دونوں ہی میدانوں میں گہری ہلچل کے سال رہے ہیں۔ اس ہلچل کا نام نئی کہانی کی تحریک تھا اور نئی کا مطلب صرف پرانی کے مقابلے میں نئی نہیں تھا۔ نئے پن کو جدیدیت کے علم و شعور کے ساتھ جوڑ کر اس وصف کو زندگی کے لیے ایک نئے نظریے کا سمندر سمجھا گیا ہے۔ یہ نظریہ ایک طرف روایت سے جڑے ہوئے کھوکھلے آدرشوں کو اور دوسری طرف تخیل کی کارفرمائیوں سے تخلیق کردہ حسن کو جھٹلاتا ہے۔ اس کی بنیاد حقیقت نگاری ہے۔ دراصل یہی نظریہ اس رجحان کے قلم کاروں کی کہانیوں کو ایک ہی دھاگے میں باندھتا اور نئی قوت عطا کرتا ہے۔

آزادی کے فوراً بعد کے سال کئی اعتبار سے شکست و ریخت کے سال ثابت ہوئے۔ صنعتوں کے قیام و توسیع کے دوررس نتائج نے سماجی زندگی میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔ ان میں مشترکہ کنبے کا ٹوٹنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی وغیرہ کے وجوہ سے فرد پر برادری اور کنبے کے تئیں فرائض اور ذمہ داریوں کے دباؤ کا خاتمہ، بڑے شہروں کی تہذیب کا طلوع، معاشی طبقوں کے درمیان فرق میں اضافہ، فرد کی تنہائی، اجنبیت وغیرہ شامل ہیں۔ موٹے طور پر نئی کہانی کی تحریک کے یہی موضوعات تھے

تقریباً سبھی اہم کہانی کاروں نے ایک یا ایک سے زیادہ کہانیاں ایسی تحریر کیں جن میں کنبے میں رفتہ رفتہ غیر متعلق اور غیر ضروری ہوتے ہوئے سربراہ کی ناگفتہ بہ تصویر ہے۔ بھیشم ساہنی (چیف کی دعوت) راجندر یادو (تلوار۔ پنج ہزاری۔ برادری باہر) منوہر شیام جوشی (ایک دُرلبھ ویکتیو) کملیشور (دیوا کی ماں۔ کس کے لیے؟۔ دنیا بہت بڑی ہے) مارکنڈے (ہنسا جائی اکیلا، گرا کے بابا) شانی (گندے جل کا رشتہ) منو بھنڈاری (اکیلی) موہن راکیش (آدرز) وغیرہ سبھی نے حقیقت کے اس پہلو کی عکاسی کی ہے۔ تشنہ آرزوؤں کے زخم، اپنی انا کے ٹکراؤ میں خود ٹوٹنا اور دوسروں کو توڑنا وغیرہ ان کہانیوں کی بنیادی آواز ہے۔ اس ضمن میں بے ساختہ یاد آنے والی کہانیوں میں 'تیسری قسم' (پھنیشور ناتھ رینو)، 'ایک اور زندگی'۔ 'فولاد کا آکاش' (موہن راکیش)، 'اندھیرے میں۔ لوورز۔ انتر' (نرمل ورما)، 'یہی سچ ہے'۔ 'تیسرا آدمی' (منو بھنڈاری)، 'راجہ نر بنسیا۔ نیلی جھیل۔ جو لکھا نہیں جاتا' (کملیشور)، 'ایک کمزور لڑکی کی کہانی۔ ٹوٹنا۔ چھوٹے چھوٹے تاج محل'،

پُرانے نالے پر نیا فلیٹ (راجندر یادو)' ساوتری نمبر دو (دھرم ویر بھارتی) وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

نئی کہانیوں کے کردار اس نسل کے کردار ہیں جو اپنے جانے پہچانے، چھوٹے شہروں، قصبوں میں کنبے، برادری کا تحفظ چھوڑ کر پہلی بار بڑے شہروں میں آئے ہیں اور اپنی چھوٹی موٹی خوشیوں اور دکھوں کے قصباتی احساس پر بڑے شہر کا حملہ محسوس کر کے یا تو سہمتے، سمٹتے، اکیلے اور اجنبی بن کر رہ جاتے ہیں یا ماضی کے سابقہ احول کے لیے چڑچڑے اور اُداس ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ سے اور اپنے ارد گرد کے احول سے نبرد آزما، ان تنہا، مایوس یا چڑچڑے اور اداس کرداروں میں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ "ڈپٹی کلکٹری"۔ "زندگی اور جونک" (امرکانت)' ملبے کا مالک۔ پانچویں مالے کا فلیٹ (موہن راکیش) دلی میں ایک موت۔ کھوئی ہوئی دشائیں (کملیشور)، ستمبر کی ایک شام (نرمل ورما)' گل کی بنّو (دھرم ویر بھارتی)' اکیلی لڑکی (منو بھنڈاری)' نفو (شیو پرشاد سنگھ)' بادلوں کے گھیرے (کرشنا سوبتی)' بے ساختہ یاد آنے والی کہانیاں ہیں جو حالات اور دلی کیفیات کا ایک وسیع و عریض منظر نامہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

۱۹۵۰ء سے شروع ہونے والی نئی کہانی کی تحریک کے ختم ہونے کے بعد ہندی کہانی میں تقریباً ۱۹۷۰ء تک کا درمیانی عرصہ بے رجحان' بے تحریک اور نراج کا دور مانا جاتا ہے۔ غیر کہانی، شعور کی کہانی، فکری کہانی، متوازی کہانی وغیرہ جیسے متعدد رجحانات نے از خود جنم لیا اور وقتی تعریفوں اور وقتی مسیحاؤں سمیت زدی بننے والے رسائل و جرائد کے سیاہ، گرد آلود پُرانے اوراق میں دفن ہو گئے ان کی بربادی، شکستگی اور بے حسی کے اجزاء شاید خود ان کے اندر موجود تھے۔ اس نراجی اور انفرادی 'ہیرو ازم' کی کشا کش سے الجھے وقت میں بھی جو کہانیاں، آج تک زندہ رہ پائیں' یقیناً ان کہانیوں پر ان نام نہاد رجحانات کا سب سے کم اثر تھا، یا شاید قطعی کوئی اثر نہیں تھا۔!!

□□

جنگِ آزادی اور اُردو شعراء

ص۱۴ کا بقیہ

اُردو کے عظیم شاعر فیض احمد فیضؔ نے آزادی کے مجاہدوں کی سرفروشانہ کوششوں کو اپنی بیشتر نظموں میں پیش کیا ہے۔

الغرض اُردو کے شعراء بھی آزادی کے دیوانوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھتے گئے۔ آخرکار وہ دن بھی آگیا کہ ہندستانی عوام نے ایک طویل دور غلامی کے بعد آزادی کی منزل حاصل کی۔ ایسی خوشگوار فضا میں اُردو کے شعرا نے بھی فتح کے پرچم لہراتے ہوئے کامیابی کے گیت گائے۔ جوشؔ ملیح آبادی نے آزادی کا استقبال کرتے ہوئے کہا ؎

اُٹھو وہ صبح کا غرفہ کھلا زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ دیکھو پو پھٹی، غنچے کھلے پہلی کرن پھوٹی

اقبال سہیلؔ نے صبحِ آزادی کا خیر مقدم اس طرح کیا ؎

اب دورِ مسرت آنے دو قومی پرچم لہرانے دو
جاتی ہے غلامی جانے دو صدیوں کا دلدّر جاتا ہے
ہم کو تو بسر کرنا ہے یہیں جینا ہے یہیں مرنا ہے یہیں
اٹھو یہ چمن شاداب کرو وہ غاصب خود سر جاتا ہے

تلوک چند محرومؔ یوم آزادی کی خوشیاں مناتے ہوئے لوگوں کو اس طرح تنبیہ و ہدایت کرتے ہیں کہ تمام لوگ ملک و قوم کی حفاظت کے لیے ہمیشہ تیار رہیں۔ کیونکہ یہ مرحلہ جنگِ آزادی سے بھی زیادہ اہم اور سنگین ہے ؎

اربابِ وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل
ہاں جشن منالو کہ ہے موقع اسی قابل
ہونا نہ کہیں جوشِ طرب میں کبھی غافل
تخریب تو آسان تھی تعمیر ہے مشکل
ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

□□

ڈاکٹر غلام حسین
مسلم مسافر خانہ، اسٹیشن روڈ
گورکھپور

فراق کی غزل گوئی

سرآمدِ روزگار شاعر، فراق گورکھپوری کا شمار صفِ اوّل کے متغزلین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف غزل کی آبرو کو برقرار رکھا بلکہ اس کے وقار اور نکھار میں اضافہ کیا۔ فراق کے یہاں نہ تو روایت سے بغاوت ہی ہے اور نہ ہی روایت پر اکتفا بلکہ روایت اور جدت کی آمیزش سے انھوں نے اپنی غزل کے خمیر کی تعمیر کی ہے۔ ان کی غزل میں جمالیاتی حس کی نیرنگی، رومانی انداز کی سحر طرازی اور عصری آگہی کی روح جلوہ گر ہے ساتھ ہی ساتھ فراق کی غزل میں جذبات کی شدت، شعور کی وسعت، احساس کی لطافت و نزاکت اور حسنِ اظہار کی ندرت وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جو فراق کی غزل کو دیگر شعراء سے ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔

فراق نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا اصل میدان غزل ہے اور وہ اسی صنفِ سخن کے مردِ میداں ہیں۔ غزل میں فراق کا لب و لہجہ اور اندازِ فکر ان کے ہمعصر شعراء سے جُدا ہے۔ وہ جس طرح زندگی کو دور سے پہچان لیا کرتے ہیں اسی طرح بہت دور سے ان کی آواز بھی پہچان لی جاتی ہے۔ وہ غزل کے رموز و نکات، مزاج و صفات اور نشیب و فراز سے آشنا ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ جمالیات، کائنات اور نفسیات پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ اسی لیے ان کی غزل فقط قافیہ پیمائی اور لفظوں کے ہیر پھیر کا گُر نہیں بلکہ دورِ حاضر کے ایک حساس انسان کے دل کی آواز ہے۔ ان کی آواز میر و غالب کی آوازِ بازگشت یا بازیافت نہیں بلکہ خود ان کی اپنی آواز ہے جسے مزید بلندی عطا کرنے کے لیے وہ آفاقی ادب کا سہارا بھی لیتے ہیں اور اس میں ہندستانی تہذیب و تمدن کو سمونے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش میں وہ کامیاب و کامران ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہی ان کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

جب ہم فراق کی غزل کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ان کا محبوب موضوع حسن و عشق ہے۔ عشق کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں فراق کی رومانی نظر نہ پہنچی ہو۔ فراق کے یہاں عشق، عشق ہے وہ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کے جھمیلے میں نہیں پڑتے ان کے نزدیک عشق قابلِ احترام اور مقدس عمل ہے — چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں
عشق توفیق ہے گناہ نہیں

فراق نے اپنی غزل میں حسن و عشق کے رموز و نکات اور انسانی جذبات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ ان کا محبوب ارضی ہے، فرضی نہیں ان کے محبوب کا انسان ہونا ہی ان کے لیے کافی ہے ؎

ہم تیرے حور و پری ہونے سے مسرور نہیں
ہمیں درکار ہے انسان کا انساں ہونا

یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی نُور کا پُتلا نہ کوئی زہرہ جبیں

فراق محبوب کی پیکر تراشی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اس ضمن کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پلکیں ہند السائی زلفیں نرم سیج پر بکھری ہوئی
ہونٹوں پہ اک موجِ تبسم سو رہو یا جاگو ہو

یوں تو جمال دل فریب   شام نہیں سحر نہیں
زلف کی ابتری تو دیکھ   رخ کی شگفتگی تو دیکھ

فراق کا معشوق اپنی تمام تر رعنائی اور برنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس کی شخصیت میں ہندستانی اساطیر کی بھرپور چھاپ ہے۔ فراق لکھنؤ کے روایتی اندازِ بیان سے متاثر تھے۔ اسی لیے ان کے یہاں خارجیت ہے جسے ان کی جمالیاتی حس کی شدت نے تلذذ سے قریب کر دیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور فرائڈ کے تحلیل نفسی کے فلسفے نے اسے اور جلا بخشی مگر حزن وملال اور ہذیانی کیفیت ان کی عشقیہ شاعری میں نہیں ہے بلکہ رجائیت کا عنصر نمایاں ہے۔ فراق نے عشق و محبت کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو اجاگر کر کے عشقیہ جذبے کو معتدل اور متوازن بنا دیا ہے۔ اس ضمن کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

کیا جام ہے فراق محبت کا جام بھی
آبِ حیات بھی ہے، اجل کا پیام بھی

اے محبت تو اک عذاب سہی   زندگی بے ترے جہنم ہے

یہ کہہ کر میں کرتا ہوں عرضِ تمنا   نگاہِ محبت کے دھوکے نہ کھانا

ہر سعی و ہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے
تعمیر زندگی کے سمجھ کچھ محرکات

فضا تبسم صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

فراق کے یہاں جذبات میں اتنی شدت ہے کہ کبھی کبھی تو "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" والی بات صادق آتی ہے۔ کیوں کہ ان کے یہاں تنہائی کس کاوِ کاوِ سخت جانی کی محرومی نہیں ہے اور نہ ہی ہجر میں شام کو صبح کرنے کی شدت و اضطراب ہے بلکہ وہ ہجر کے خوگر معلوم ہوتے ہیں اور ہجر ہی کو اپنا ہمدم و مونس بنا لیتے ہیں ۔

طبیعت اپنی جب گھبراتی ہے سنسان راتوں میں
تو ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

اب دورِ آسماں ہے نہ دَورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

کٹی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

کبھی کبھی وہ اتنے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی یادوں کا تسلسل بھی ٹوٹ جاتا ہے ۔

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

فراق کے یہاں وصال کی تڑپ کم ہے بلکہ محبوب کی یاد ہی ان کا اصل ہے اور محبوب کی رہگزر باعثِ تسلی و تشفی ہے ۔

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے!
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

یہ زندگی کے کڑے کوس، یاد آتا ہے
تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

فراق ایک محبِ وطن شاعر ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے ملک کی آزادی اور ترقی کے لیے کام کیا ہے۔ وہ فرسودہ نظامِ حیات کی تبدیلی اور انقلاب کے خواہاں تھے۔ پہلے ہی ان کی طبیعت حسرت کی طبیعت کی طرح طرفہ تماشا نہ ہوا اور انھوں نے فیض کی طرح خونِ دل میں انگلیاں

نہ ڈھونڈ رہی ہوں۔ پھر بھی انقلابی اشعار ان کے یہاں کسی نہ کسی رُوپ میں مل ہی جاتے ہیں ؎

زندگی کروٹیں بدلتی ہے
تھرتھراتا ہے نظمِ ماضی و حال

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دُنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

حب الوطنی سے متعلق بعض اشعار یہ ہیں ؎

کرو کچھ ستر زمینِ ہند کی بات
سنا ہے خاک اس کی کیمیا ہے

ارضِ جنت کے بھی بس میں نہیں جس کا دینا
ہند کی خاک نے وہ سوزِ وطن مجھ کو دیا

ان کی غزلوں میں فلسفیانہ، حکیمانہ اور عزم و حوصلہ بخشنے والے اشعار بھی مل جاتے ہیں ؎

وہ تو کوئی خوشی نہیں جس میں
درد کی چاشنی نہیں ملتی

جب چل پڑے فراق تو منزل کی فکر کیا
جو کچھ دکھائے دور فلک دیکھتے چلو

فراق کی شاعری میں ہندستانی عورت اپنے لباس اور سنگار میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ بندی اور چوڑی، خوش قسمتی اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ سہاگ کی بھی علامت ہے۔ چوڑی کا ذکر اپنے ایک شعر میں اس طرح کرتے ہیں ؎

چوڑیاں بجتی ہیں دل میں مرحبا بزمِ خیال
کھلتے جاتے ہیں نگاہوں میں حسینوں کے گلاب

فراق کی غزل میں تشبیہات، استعارات اور تلمیحات میں بھی ہندستانی عناصر کی کارفرمائی ہے ؎

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی ۔۔۔ کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

فراق گورکھپوری اُردو زبان کے پرستار ہی نہیں بلکہ اس کی توسیع و اشاعت کے سلسلے میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے جہاں اُردو شاعری کے موضوعات اور خیالات میں تنوع پیدا کیا ہے وہیں زبان کو بھی نئی راہیں دکھائی ہیں اور تشبیہات و استعارات اور لفظیات میں خوش گوار اضافہ کیا ہے۔

فراق ایک وسیع النظر شاعر تھے۔ اُردو اور انگریزی شعر و ادب کے علاوہ فارسی، ہندی اور سنسکرت کے ادب پر بھی ان کی نظر تھی اس سے انھوں نے اپنی فن کارانہ صلاحیتوں سے اکتسابِ فیض کر کے اُردو شعر و ادب کو مالا مال کیا۔ وہ شعر و ادب کے کیمیاگر ہی نہیں بلکہ جوہری بھی ہیں اور شعر و ادب کے ادنیٰ و اعلیٰ سے واقف بھی مگر بسیار گوئی کی وجہ سے ان کی شاعری بھی بعض لوگوں کے نزدیک کبھی کبھی

پستش بہ غایت پست و بلندش بہ غایت بلند

کا مصداق بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ فنی اور تکنیکی خامیوں کے اعتراضات بھی ان پر عائد کیے گئے ہیں۔ پھر بھی فراق کا نام بیسویں صدی کے نمائندہ شاعروں میں بڑے احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

□□

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

فارسی کہانی

لکڑی کا گھوڑا

احترام ملکیان
ترجمہ: ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی
خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ
لکھنؤ

گھر میں بہت شور و شغف تھا۔ بہت سے احباب اور پڑوسی جمع تھے۔ علی نے پریشانی کے عالم میں ہر طرف نگاہ ڈالی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ ماں رو رہی ہے، بڑی ماں کو بھی اس نے روتے دیکھ لیا تھا۔ پڑوسی دوائیں بنا کر لا رہے تھے اور ان دونوں کو دے رہے تھے۔ علی اِدھر گیا پھر اُدھر گیا اور لوگوں کے چہروں پر نظریں دوڑاتا رہا تاکہ کوئی ایسا ملے جو اسے بتائے کہ کیا ہوا ہے۔ وہ خود سے بولا ——

"اگر بابا ہوتے تو مجھ سے بولتے۔ بابا کو ہمیشہ میری فکر لگی رہتی تھی۔ اے کاش وہ واپس آجائیں۔"

جب وہ دروازے کے قریب سے گزرا تو اس نے دو افراد کو آپس میں باتیں کرتے سنا ——

"بے چارے کو خون کی کمی ہو گئی ہے"...

علی تب بھی کچھ نہیں سمجھا۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔ اس کی ماں نے اسے دیکھا اور اپنے سینے سے چمٹا کر اس کے سر اور چہرے کا بوسہ لیا۔ علی نے چاہا کہ وہ پوچھے کیا ہوا ہے۔ ماں کی آنکھوں میں دکھ دیکھ کر اس نے کچھ نہیں پوچھا۔ ان کے ہاتھوں سے رہا ہو کر وہ صحن میں چلا گیا جہاں تمام بچے جمع تھے۔ پڑوسی بچے باغیچے اور اس کے قرب و جوار میں کھیل رہے تھے۔ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ بڑوں کو ان سے کوئی کام نہیں تھا۔ علی نے چاہا کہ وہ بھی کھیلے مگر اس کا دل اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ وہ دوبارہ کمرے میں چلا گیا۔

لوگوں نے اس کی جانب دیکھا۔ زیادہ تر افراد افسوس کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے ——

"بیچارے اس بچے نے کیا گناہ کیا... تو تم خود اپنی نگاہوں سے دیکھو...!"

علی میں صبر و سکون کی طاقت نہیں رہی۔ وہ باورچی خانے میں گیا بڑی ماں کو پکڑ کر کھینچا ——

"خدارا! کچھ تو کہو۔ تم کیوں رو رہی ہو؟"

بڑی ماں بیٹھ گئیں اور انھوں نے علی کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ حائل کرتے ہوئے کہا ——

"میرے بچے! پریشان مت ہو۔ کچھ نہیں ہوا۔"

علی نے کہا — "شاید میرے باپ پر کوئی مصیبت آگئی ہے۔"

بڑی ماں پھر رونے لگیں۔ علی نے دوبارہ اصرار کیا۔

بڑی ماں نے روتے ہوئے بالآخر آہستہ سے کہا — "وہ زخمی ہو گیا ہے۔"

علی نے خود کو بڑی ماں کے ہاتھوں سے کھینچا اور صحن میں چلا گیا ایک کنارے لکڑی کا گھوڑا کھڑا تھا جسے اس کے باپ نے تیار کیا تھا اس نے گھوڑے کے سر اور منھ پر ہاتھ پھیرا اور خود سے بولا ——

"میرا باپ زخمی ہو گیا ہے۔ یقیناً اسے خون کی ضرورت ہے۔"

علی کو یاد آیا کہ جب اس کا باپ فوج میں جا رہا تھا تو اس نے پوچھا تھا کہ وہ کیوں جا رہا ہے تو باپ نے کہا تھا ——

"میں جا رہا ہوں تاکہ زخمیوں کی دیکھ بھال کر سکوں اور ان کی

مرہم پٹی کروں۔"

علی نے خود سے سوال کیا۔" اب اس وقت میرے باپ کی دیکھ بھال کون کر رہا ہوگا؟ ـــــ کون اسے خون دے گا۔؟"

اسے یاد آیا کہ روزانہ میدان میں اس جانب پارک میں چادر لگا کر لوگوں سے خون لیا جاتا تھا۔ علی نے باغیچے میں نگاہ ڈالی اور دوبارہ گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

" اے میرے لکڑی کے گھوڑے! میں بابا کو خون دینے جا رہا ہوں بہت جلد واپس آؤں گا۔ خدا حافظ!"

علی نے ایک نظر کمرے کے اندر ڈالی۔ لوگ اس کی ماں کو پکڑے ہوئے تھے اور وہ اب بھی رو رہی تھی۔ علی گھر سے نکل پڑا۔ لوگ اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ میدان سے اس طرف پارک میں چلا گیا۔

گھر میں ابھی بھیڑ جمع تھی۔ سورج بیچ آسمان میں پہونچ گیا تھا اور اس کی کرنیں پورے گھر میں پھیل گئی تھیں۔ اہلِ خانہ نے حسبِ دستور اب تک دسترخوان نہیں لگایا تھا اور نہ ہی ناشتہ کیا تھا۔ علی بھی نہیں آیا تھا جو شرارت کرتا۔ ہر چیز الٹ پلٹ گئی تھی۔ گھر میں پڑوس کی عورتیں بھری ہوئی تھیں۔ مرد جا چکے تھے۔ لکڑی کا گھوڑا صحن میں ایک کنارے درختوں کے سائے میں اپنے مالک کا منتظر تھا۔ ماں صحن میں آئی۔ اس نے باغیچے میں دور تک نگاہ دوڑائی۔ پیچھے کوئی شخص ٹہل رہا تھا۔ صحن بالکل خالی تھا۔ اس کے گلے سے بڑی مشکل سے آواز نکلی ـــــ

" علی!۔ علی جان!"

تلاوت قرآن مجید کی آواز مسجد سے سنائی دے رہی تھی۔ ماں وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں لکڑی کے گھوڑے پر تھیں جو ہمیشہ سے زیادہ تنہا نظر آ رہا تھا اور ماں کی طرح کسی کا منتظر تھا۔ ماں دوبارہ کمرے میں چلی گئی۔ علی کے بارے میں سب سے دریافت کیا۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ علی کہاں ہے۔ پڑوس کے بچوں سے پوچھا گیا لیکن کوئی بھی علی کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔ ماں نے سوچا کہ شوہر کے ساتھ بیٹے کا غم بھی اسے برداشت کرنا پڑے گا۔

گھر رفتہ رفتہ خالی ہو رہا تھا۔ ماں کی آنکھیں دروازے پر جھک کر رہ گئی تھیں۔ گھڑی نے تین بجائے۔ ایک آواز آئی اور اس کے بعد اس کے شوہر کے جیسے لباس میں ایک شخص داخل ہوا جو علی کو گود میں لیے ہوئے تھا۔ آنے والے نے کہا ـــــ

" بہن معاف کرنا۔ تمہارے بیٹے کو لایا ہوں۔ وہ خون دینے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں باپ کو بھیجنے کے لیے خون دینا چاہتا ہوں۔ اس نے بہت ضد کی کہ اس کا خون لے لیا جائے۔ وہ بہت رویا بھی۔ مجھے معاف کرنا۔"

علی میدان سے گھر تک اپنے باپ کے مانند شخص کے کندھے پر آتے ہوئے سو گیا تھا۔ ماں نے اسے لے لیا۔ جب وہ شخص چلا گیا تو ماں اپنے بیٹے کے ساتھ اس کے باپ کے مطالعہ کے کمرے میں چلی گئی۔ علی آنکھیں ملتے ہوئے نیند سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے خود کو ماں کی گود میں دیکھا۔ اپنی ماں کی آنکھوں میں آنسو محسوس کیے۔ اپنے ہاتھوں سے ماں کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو پونچھے اور دھیمی آواز میں بولا ـــــ

" ان لوگوں نے باپ کے لیے میرا خون نہیں بھیجا ـــــ میں بہت رویا۔!"

ماں نے بیٹے کو اپنے سینے سے چپٹاتے ہوئے کہا " میں بھی اے میرے لال بہت رو چکی ہوں۔ اب نہیں روؤں گی۔ جب تو میرے سامنے ہے ـــــ میرا مستقبل ـــــ تیرا باپ بھی یہی کہا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ تیری دیکھ بھال میں کروں گا۔ تیرا باپ کہتا تھا کہ وہ واپس آئے گا اور ہم تنہا نہیں رہیں گے ـــــ ہاں بیٹے! وہ واپس آئے گا۔"

کانوں میں قرآن مجید کی ہمیشہ سے زیادہ دل نشین آواز پہونچ رہی تھی ماں کی نگاہیں کھڑکی سے باہر جم گئی تھیں۔ علی اس وقت ماں کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو صاف کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا ـــــ

" آبا کب واپس آئیں گے؟"

ماں نے دل کی گہرائی سے جواب دیا۔ میرے بیٹے! دیکھو تمہارا باپ آیا ہے۔ وہاں ہے...."

علی کی معصوم نگاہیں لوگوں کی بھیڑ میں اپنے باپ کے پیکر کو تلاش کرتی ہوئی لوگوں کی انگلیوں سے گزرنے والی سورج کی کرنوں سے پیوستہ ہو رہی

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "تلوک چند محروم"

مرتب: رام لال نابھوی قیمت: ۵/- روپے

ملنے کا پتہ: ساہتیہ اکاڈمی، مندر مارگ۔ نئی دہلی

ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی نے "ہندستانی ادب کے معمار" کے نام سے تعارفی کتابوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ اسی کی ایک کڑی زیر نظر کتاب "تلوک چند محروم" ہے، جسے رام لال نابھوی نے مرتب کیا ہے۔

۹۶، صفحات کی اس کتاب میں واقعتاً دریا کو کوزے میں بند کرنے کی سعی مشکور نظر آتی ہے، اس لیے کہ اس میں نہ صرف تلوک چند محروم کی نجی زندگی کے حالات و کوائف کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے بلکہ ان کی شاعرانہ اور ادبی خدمات پر بھی خیال انگیز تبصرہ کیا گیا ہے۔

محروم اپنے زمانے کے ذی مرتبت اور معتبر شاعر تھے جن کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف ڈاکٹر اقبال، جوش اور نیاز فتحپوری جیسے اکابرین ادب نے کیا ہے۔ محروم ایک بے حد محب وطن شاعر تھے اس لیے ان کی شاعری زیادہ تر ملکی اور وطنی موضوعات پر مشتمل ہے مگر جب وہ غزل کہتے ہیں تو زندگی و سرشاری اور حسن و عشق کے مضامین اس خوبی سے باندھتے ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ محروم پنجاب کے ایک ایسے خطے میں رہتے تھے جو اجاڑ اور ویران تھا اور جہاں مسلسل آندھیاں چلتی رہتی تھیں۔ اس علاقے میں شاعری کی نرم ہواؤں کا گزر تک دشوار تھا مگر محروم نے خود اپنی کوششوں سے زبان و بیان میں اتنا درک حاصل کر لیا کہ ان کا شمار اساتذۂ فن میں ہونے لگا۔ انھوں نے چکبست کی شاعرانہ خوبیوں کی تعریف میں جو شعر کہا تھا وہ خود ان کی شاعری پر بھی پوری طرح چسپاں ہوتا ہے ؎

ہر ایک شعر ہے صدق و صفا کا آئینہ
ہر ایک لفظ ہے حسنِ ادا کا آئینہ

اپنی بیٹی ودیا دیوی کی غیر فطری موت پر انھوں نے جو مرثیہ لکھا تھا اس کا صرف ایک شعر ہی پورے مرثیے کی بلاغت کا جواز بن جاتا ہے ؎

کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی
اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

زیر نظر کتاب میں رام لال نابھوی نے محروم کی زندگی اور شاعری کے ہر گوشے پر اس زاویے سے روشنی ڈالی ہے کہ سارے نقوش از خود روشن ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر "کلام کے آئینے میں" عنوان کے تحت رام لال نابھوی نے مختلف اصنافِ سخن میں محروم کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے اور اس میں غزل، نظم، مرثیے، نوحے، رباعی اور بچوں کی نظموں پر ایسے جامع انداز میں ان کی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں کہ اس سے محروم کی شاعری کی ساری صفات بہ یک نظر سامنے آجاتی ہیں اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی افادیت ہے۔

رام لال نابھوی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:——

"محروم کا سیاسی اور سماجی شعور ان کی طالب علمی کے زمانے ہی میں بیدار ہو چکا تھا۔ انھیں شاعری سے فطری لگاؤ تھا، اور وہ کثرت سے مطالعہ کرتے تھے۔ شاعری میں انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ محض درسی کتابیں ان کے لیے شمع ہدایت ثابت ہوئیں اور طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کا کلام مخزن لاہور اور زمانہ کانپور میں شائع ہونے لگا تھا۔"

شاعری میں کسی کا شاگرد نہ ہونے کے باوجود محض اپنی فطری صلاحیتوں اور مشق و مزاولت کی بنا پر وہ ایک معتبر شاعر کی حیثیت سے اردو کے ادبی افق پر ابھرے اور نصف صدی سے زیادہ ایک روشن ستارے کی طرح چمکتے رہے۔ رام لال نابھوی نے بڑی سلیقے سے یہ کتاب مرتب کی ہے اور اسی سلیقے سے ساہتیہ اکاڈمی نے اس کو زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔

—— نامی انصاری

نام کتاب: "سنبھل کے چند اکابر علماء و مجاہدینِ آزادی"
مصنف: ڈاکٹر سعادت علی صدیقی   قیمت ۴۰/ روپے
ملنے کے پتے: (۱) گوشۂ شجاعت سندیلوی، عاشق پبلک لائبریری۔ سنبھل
(۲) اُردو نگر۔ اشفاق اللہ روڈ۔ امین آباد لکھنؤ

سنبھل حالانکہ کبھی علم و ادب یا تہذیب و تمدن کا گہوارہ نہیں رہا۔ مگر یہ ایک باعظمت اور تاریخی بستی ہے۔ بہت سے مستند اور معتبر مورخین نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ علم و ادب کا گہوارہ نہ ہونے کے باوجود، سرزمین سنبھل بے شمار علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی شخصیتوں کا مسکن رہی ہے ان بے شمار شخصیات میں سے چند حضرات کے تذکرہ اور تعارف پر مشتمل ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی تصنیف "سنبھل کے چند اکابر علماء و مجاہدین آزادی" ہمارے پیش نظر ہے، جس میں بارہ اکابر علماء اور گیارہ سرگرم مجاہدین آزادی کے سوانح اور ان کی علمی و سیاسی خدمات کا بیان ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم و ادب کا گہوارہ نہ رہنے کے باوجود کیسے کیسے گنجہائے گراں مایہ سنبھل کی زرخیز سرزمین میں مدفون ہیں۔ ان اکابر کی زندگی آج بھی نمونۂ حیات ہے تنہا شیخ تاج الدین سنبھلی کا نام ہزاروں اکابرین پر بھاری ہے۔

مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے عصرِ حاضر کے اکابرین سنبھل کی فہرست بھی کتاب کے آخر میں فراہم کی گئی ہے جو خاصی مفید اور معلوماتی ہے۔ "گزارش احوال واقعی" کے تحت سعادت صدیقی صاحب نے سنبھل کی تاریخی، علمی، ادبی، سیاسی اور جغرافیائی حیثیت پر مختلف حوالوں کے ساتھ تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

اکابرین کے تذکرہ میں ترتیب زمانی کا خیال رکھا جاتا تو بہتر تھا۔ مصنف نے خود بھی اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے کتاب کو از سرِ نو ترتیب دے کر دوبارہ شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کتابت و طباعت پر توجہ کرنا بھی ضروری ہے۔

مجموعی طور پر کتاب مفید، معلوماتی، قابلِ قدر اور لائق مطالعہ ہے

———— ڈاکٹر تسنیم فہمی

نام کتاب: "لہو لہو سائے" (شعری مجموعہ)
شاعر: ڈاکٹر اختر عبدالرشید   قیمت ۳۰/ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

ڈاکٹر اختر عبدالرشید ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے اس شعری مجموعے "لہو لہو سائے" کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بادۂ سخن نے زیادہ تر غزلوں کے پیمانوں کو ہی لبریز کیا ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں روایتی اندازِ فکر ملتا ہے مگر رفتہ رفتہ ان کے کلام نے بھی نئی اقدار کے اثرات کو قبول کر لیا۔ پچھلے دو دہائی کے ان کے کلام میں جدیدیت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

ان کے کلام میں حزن و یاس مسلط ہے مگر ناامیدی کے پردے میں رجائیت بھی جلوہ گر نظر آتی ہے ؎

تمنا کی کوئی منزل نہ پائی اسلئے روئے
مسرّت کی ہر اک ساعت گنوائی اسلئے روئے
کلی ناواقفِ انجام تھی اپنے تبسم سے
وہ جب صحنِ چمن میں مسکرائی اسلئے روئے
ہجوم یاس میں ہر سانس پر تم کو پکارا ہے
نہ تم آئے نہ ہم کو نیند آئی اسلئے روئے

ڈاکٹر رشید کے کلام میں زبان کا لطف بھی ہے اور بیان کی ندرت بھی سہل ممتنع کے یہ شعر دیکھیں ؎

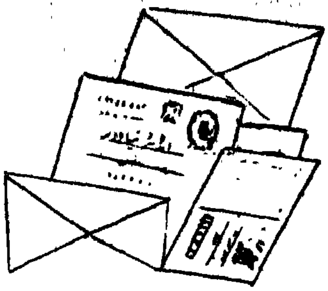
درد کو دل بنا دیجئے   اک ذرا مسکرا دیجئے
دوستوں سے امیدِ کرم   دشمنوں کو دُعا دیجئے

کھل گیا رازِ دل دوستو
کیا ملا سازِ دل چھیڑ کر

ڈاکٹر رشید کا ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیں جو اس دور میں زندگی کرنے کا ہنر سکھاتا ہے ؎

اپنے ہونٹوں پہ کچھ الفاظ کا جادو رکھو
بات کرتے ہو تو کچھ بات کا پہلو رکھو
سر اٹھاؤ گے تو سر کاٹ دیا جائے گا
زندہ رہنا ہے تو جذبات پہ قابو رکھو

اس مجموعہ کی کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے۔ اپنی جملہ خوبیوں کے ساتھ یہ کتاب لائقِ مطالعہ ہے۔ ———— راجندر بہادر موج



ہمارے نام.....

آپ نے 'اپنی بات' کے عنوان سے جو اداریہ تحریر فرمایا ہے، جناب محمود سعیدی نے بیسویں صدی کے سالنامے میں 'اردو شاعری اور افسانہ زوال پذیر ہے' کے عنوان سے ایسا ہی کچھ تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اردو قاری کہیں کھو گیا ہے جو لکھنے والے ہیں وہی پڑھنے والے" قاری کے کھو جانے کے وہ دو اسباب بیان کرتے ہیں۔ ——

(۱) اردو تعلیم کا فقدان (۲) جدید ذرائع ابلاغ یعنی ٹی۔ وی' لیکن آپ نے نہ صرف مرض کی تشخیص کی بلکہ اس کا علاج بھی بتادیا بہ قول آپ کے ادب تخلیق کرنے والے ایک فرقہ نے خود کو عوامی رشتوں سے الگ تھلگ کرلیا ہے۔ علامت اور جدیدیت کے نام پر ادب کو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں اور دانشوروں تک محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تو پھر انجام جو ہوگا وہ ظاہر ہے۔

—— مسرور حسین سرور
فتح گڑھ

نیا دور کا یہ سنورا اور نکھرا ہوا روپ دیکھ کر خوشی تو ہوئی ہی، تاہم مزید خوشی اس بات سے ہوئی کہ اب اس کی اشاعت بھی کافی حد تک وقت پر آرہی ہے۔ بلا شبہ یہ کام انجام دینے میں آپ کی لگن و محنت، اردو ادب سے دل چسپی' اور اس سے بڑھ کر وہ بے پناہ کوششیں ہیں جو آپ نے اس سلسلے میں فرمائیں۔ آپ کی کوششیں لائق تحسین ہیں۔

—— ایوب ظفر
ہردوئی

آپ کی ادارت کی داد' اربابِ سخن نے بہ طرز احسن دی ہے نیا دور کے بدلے ہوئے بلند معیار کے ثناخوانوں میں مجھے بھی شامل سمجھیں۔ بے شک یہ جریدہ اب ہر اعتبار سے قابلِ تحسین ہے۔ آپ کی ادبی سرگرمیوں کے لئے مبارک باد۔

—— ڈاکٹر متین نیازی
کان پور

گٹ اَپ سے لے کر مضامین تک آپ کی لطافتِ ذوق اور حسنِ انتخاب کے آئینہ دار ہیں۔ آپ کی ادارت میں نیا دور کا معیار جتنا بلند ہوا ہے اور ادبی اعتبار سے اس کی افادیت میں جو اضافہ ہوا ہے' اس کے لیے آپ بجا طور پر داد اور تحسین کے مستحق ہیں۔

—— جوہر صدیقی
وارانسی

نیا دور آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا ہندستان کا واحد معیاری ماہنامہ ہے جو دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کے طلبار اور ادیبوں کے لئے رہنمائی کا کام انجام دیتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

—— محمد طاہر رزّاقی
سنبھل

نیا دور موجودہ دور میں اردو زبان کا سب سے خوبصورت رسالہ ہے بہترین کاغذ پر صاف ستھری کتابت، معتبر مضامین کا یکجا ہو جانا بھی یقیناً لائق صد ستائش ہے۔

—— حکیم منظور قریشی
اجین (مدھیہ پردیش)

نیادور

جلد ۴۶ | نمبر ٦

ستمبر ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
ٹیلیفون : ۲۴۳۶۷۶

معاونین :
○ ۔ نجیب انصاری
○ ۔ محمد الیاس خاں
ٹیلیفون ۲۴۷۱۰۸

پبلشر
انل سروپ
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

فی شمارہ : ـــــ ایک روپیہ
زر سالانہ : ـــــ دس روپے

ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاش پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیادور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

زیر سرپرستی
ڈائرکٹر انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
یوپی، لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

حقائق سے آنکھیں چرانا اور مسلمات سے رُوگردانی کرنا اہلِ حق کا شیوہ نہیں ہے۔ اگر طائرانہ نگاہ سے بھی نئی ریاستی حکومت کے قلیل المدّت اقدامات کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ وزیرِ اعلا جناب کلیان سنگھ کی حکومت نیک نیتی اور پُرخلوص جذبہ کے ساتھ عوام کی خدمت کرنا اپنا نصب العین سمجھتی ہے۔ قیامِ حکومت کے آغاز میں اقلیتی فرقوں کے عوام کے دلوں میں یہ وسوسے اور اندیشے کروٹ لے رہے تھے کہ نہ معلوم اب ہمارے تعلیمی اور مذہبی اداروں اور عبادت گاہوں کا کیا حشر ہوگا۔ لیکن حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی ایسی موثر اور خوش آئند سیاسی پالیسی اختیار کی کہ اب ان لوگوں کی مکروہ چالیں اور حوصلے ٹوٹنے لگے، جو فرقہ پرستی اور تنگ نظری کی آڑ لے کر انتشار اور بدنظمی پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے، اور خطرناک افواہیں اُڑا رہے تھے۔

ہندوستان کو زمانۂ قدیم سے یہ شرف حاصل رہا ہے کہ وہ دیگر ممالک کے مقابلے میں قومی ہم آہنگی اور بھائی چارے کے جذبے کو مقدم سمجھتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ لوگ ہمارے نظامِ آئین پر رشک کرتے ہیں کہ یہاں کے اقلیتی فرقوں کے افراد بھی صدر، گورنر اور وزرائے اعلا کے جلیل القدر عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں ہمیں اپنی اس عظیم روایت پر فخر ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ آئندہ بھی یہ احساس تیز سے تیز تر ہوتا رہے گا۔

اُتر پردیش کی سرکار نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کئی منصوبوں کا اہتمام کیا ہے۔ ترقی کے یہ مواقع تب ہی پروان چڑھ سکتے ہیں جب ہمارے پردیش میں امن و امان اور خوش گوار فضا قائم ہو۔ اسلئے ضروری ہے کہ ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ لوگ حکومت کے ساتھ تعاون کریں، اگر اس سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی برتی گئی تو ہماری ترقی میں ایک طرح کی رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔

آج سے تقریباً ۳۱ سال قبل ۹ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء کو اردو غزل کے مقبول شاعر جگر مرادآبادی یہ کہہ کر ہم سے رخصت ہو گئے تھے کہ

ع مُدّتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

ادارہ نیا دور انھیں اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

ایڈیٹر

اکبر حیدری کشمیری
معرفت راج پارک ویو ہوٹل۔ امین آباد لکھنؤ

"پروانہ" اور اقبال

ابھی کچھ دن ہوئے کہ مجھے غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کا کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں پرانے اردو رسائل کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ان میں ماہنامہ "پروانہ" قابلِ ذکر ہے۔ یہ رسالہ نادر و نایاب ہے، اور اس کا حوالہ میری نظر سے کہیں نہیں گزرا ہے۔ اس کا معیار بلند ہے۔ یہ مجدد السنۂ مشرقیہ احمد حسن شوکت میرٹھی کی ادارت میں میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ ایڈیٹر شوکت میرٹھی کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ وہ ایک باکمال اور صائب الرائے صحافی، مسلم الثبوت شاعر، اعلا پایہ کے تنقید نگار اور روشن خیال مصلح تھے۔ تعلیم یافتہ اور کھلے ذہن کے مالک تھے۔ ادب سے گہری وابستگی اور فنِ شعر پر محاکمانہ نظر رکھتے تھے، سرسید کے حامیوں میں تھے۔ انھوں نے بیدل، ظہیر فارابی، متبنی اور غالب کے دیوان اردو کی شرحیں لکھی تھیں۔

شوکت میرٹھی "پروانہ" کے علاوہ اردو کے دو ہفتہ وار اخبار "شحنۂ ہند" اور "طوطی ہند" کے بھی ایڈیٹر اور مالک تھے۔ پروانہ کے ساتھ یہ اخبار بھی میرٹھ میں ہی چھپتے تھے۔ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے بے نظیر کتب خانہ (مطبوعات) میں اردو کے متعدد پرانے اخبار محفوظ ہیں۔ ان میں "اودھ پنچ" لکھنؤ (سالِ اجرا ۱۸۷۷ء)، "سفیرِ ہند" (۱۸۸۰ء) "البنچ" پٹنہ (۱۸۸۵ء)، "دکن پنچ" (۱۸۸۵ء) اور "الوقت" گورکھپور (۱۸۹۲ء) قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سبھی اخبار میری نظر سے گزرے ہیں اور کام کی چیزیں ہیں۔ "الوقت" مطبوعہ ۳ اگست (۱۸۹۲ء) صہ ۸ میں شوکت میرٹھی کا وہ تبصرہ نقل ہوا تھا، جو انھوں نے اپنے اخبار شحنۂ ہند بابت ۲۴ جولائی ۱۸۹۲ء میں شائع کیا تھا، تبصرہ میں ان کے معیار صحافت پر روشنی پڑتی ہے اس لیے اس کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:—

"...... اس کا ایڈیٹر (مولوی محمد سعید زار) انیسویں صدی کی ضرورتوں سے واقف اور تعلیم یافتہ ہے۔ طرزِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے قومی اور ملکی اغراض کو اپنے ذاتی اغراض پر ترجیح دی ہے۔ چکنے کاغذ پر نہایت عمدہ ترتیب اور اسلوب سے شائع ہوتا ہے۔ موجودہ معاملات پر بحث کرتا ہے۔ ایڈیٹوریل نوٹ، لیڈنگ آرٹیکل، مراسلات، منقولات، واقعات، قانونی امور، انتخاب گورنمنٹ گزٹ، اشتہارات، ٹھیک اپنے اپنے محل اور موقع پر ہیں۔ بیشک ہندوستان کو ایسے ہی اخبارات کی ضرورت ہے۔ طرزِ تحریر سے شائستہ اور مہذب ہے مرنج و مرنجان پر عمل ہے۔ ہمعصرانہ نفاق، تعلّی اور حسد سے پاک ہے —— ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ہم عصر کامیاب ہو اور گورکھپور کے مقامی اخباروں میں کشمکش اور نفاق نہ ہو جیسا کہ عام اخباروں کا شعار ہے۔"

(۱) طوطی ہند

یہ اخبار نادر و نایاب ہے، جن لوگوں نے اردو صحافت پر کام کیا ہے

انھوں نے اپنی تصانیف میں اس کا کہیں حوالہ نہیں دیا ہے۔ جناب عبدالسلام خورشید کی کتاب "صحافت پاکستان و ہند میں" بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اختر الدولہ کی کتاب میں لکھا ہے کہ:-

"طوطی ہند کو اُردو کے مشہور و معروف شاعر سید مرتضیٰ بیان و یزدانی نے منشی ولایت علی خاں مختار عام و مالک مطبع المطابع حدیقہ علوم کے اہتمام سے ۱۸۸۱ء میں جاری کیا تھا۔ اس اخبار میں برجستہ مضامین، عمدہ آرٹیکل، سود مند لیکچر، فصیح و بلیغ اسپیچ، علوم و فنون کی باتیں، قومی اور ملکی پرچے اور راجہ انجمن علمی کمیٹیں صورت رقم پائی جاتی تھیں"۔

اختر الدولہ نے اختر شاہنشاہی پہلی مرتبہ جون ۱۸۸۸ء میں شائع کی تھی، بہت ممکن ہے کہ اس کے بعد یہ اخبار احمد شوکت کی ملکیت میں آیا ہو۔

(۲) شحنۂ ہند

اختر الدولہ کے بیان کے مطابق یہ اخبار احمد حسن شوکت کی ادارت میں میرٹھ سے ۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو جاری ہوا تھا۔ اس کے لوازمات درج ذیل ہیں:-

" دیسی زبان کی انشا پردازی کی اصلاح کرے گا اور بتائے گا کہ مہذب اور فصیح و بلند انشا پردازی اس کو کہتے ہیں۔

پولیٹیکل معاملات اور سوشل امور پر آزادانہ مگر خیر خواہی کے ساتھ نکتہ چینی کرے گا۔ مدبرانہ و مصلحانہ و شاعرانہ و عالمانہ و فاضلانہ غرضیکہ ہر قسم کے خیالات شائع کرے گا۔ مذہبی تعصب کو پاس پھٹکنے نہ دے گا۔ گورنمنٹ اور رعایا اور تمام مذاہب ہندوستان کا یکساں خیر خواہ ہوگا۔

ہندوستانی ریاستوں کی اصلاح کرے گا اور بتائے گا کہ موجودہ زمانے میں کیا کرنا چاہیے۔ اقوام ہندوستان میں عموماً اہل اسلام میں خصوصاً اتفاق پیدا کرنے اور نیشنلٹی کے قائم کرنے میں ساعی ہوگا۔

دیسی اخبارات پر بالالتزام ہمیشہ ریویو لکھا کرے گا فن ایڈیٹری اور وقائع نگاری کے اصول بتائے گا اور دیسی اخبارات جو کچھ غلطیاں کریں گے یا کر رہے ہیں ان پر تنبیہ کرے گا۔" ۴۵

شوکت میرٹھی نے میرٹھ میں ایک مشاعرہ قائم کیا تھا۔ اس کا نام "مشاعرہ نوچندی" تھا۔ مشاعرہ ہر مہینے منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس میں جو شعراء حصہ لیتے تھے ان میں اکثر و بیشتر شوکت کے شاگرد ہوتے تھے۔ "پروانہ" کے بعض شماروں میں ان کے نام بھی شائع ہوئے ہیں جن میں سے چند خاص نام یہ ہیں:-

پیارے لال شاکر میرٹھی، قادر بخش شاد، سید امیر علی ولا، محمد شبیت جودت، محمد شفیع ناصر، امیر حسن سہارن پوری۔

(۳) پروانہ

یہ رسالہ ستمبر ۱۸۹۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد جن رسالوں کا اجرا ہوا تھا اور جو ہماری نظر سے گزرے ہیں ان میں سے ذیل کے پرچے قابل غور ہیں:-

نام	مقام	سال اجراء	ایڈیٹر
۱. مخزن الفواید	حیدرآباد	ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء	نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی
۲. دلگداز	لکھنؤ	جنوری ۱۸۸۷ء	شرر لکھنوی
۳. حسن	حیدرآباد	۱۸۸۷ء	نواب عماد نواز جنگ تخلص حسن
۴. مرقع عالم	ہردوئی	۱۸۹۰ء	حکیم محمد علی خاں
۵. ادیب	فیروزآباد	۱۸۹۶ء	سید اکبر علی
۶. خدنگ نظر	لکھنؤ	ستمبر ۱۸۹۷ء	نوبت رائے نظر
۷. اُردوئے معلی	دہلی	نومبر ۱۸۹۷ء	احمد شفیع نیّر مرقع عالم پریس ہردوئی
۸. مخزن	لاہور	اپریل ۱۹۰۱ء	شیخ عبدالقادر

پروانہ متنوع مضامین اور متانت و سنجیدگی کے اعتبار سے متذکرہ بالا رسالوں کی برابر کی ٹکر کا تھا۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ تنقیدی نظریات، سخن فہمی، لہجے کی گرمی اور اصلاحی شعور میں اسے سب پرچوں پر فوقیت حاصل تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ اتنا اہم اور سنجیدہ پرچہ گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا۔ یہ ہر ماہ پابندی کے ساتھ نکلتا تھا اس کے قواعد و ضوابط دیگر رسالوں کے مقابلے میں نسبتاً سخت تھے ہر شمارے کے دوسرے صفحے پر "ضوابط پروانہ" یوں درج رہتے تھے:

"ہر انگریزی مہینے میں ۳۲ صفحات کے حجم سے لیکر ۴۴ صفحات تک شائع ہوتا ہے۔ ایشیائی شاعری کی اصلاح اس کا پہلا فرض ہے ..... پروانہ فی حد ذاتہٖ ایک مستقل کتاب ہے اور یہ عام قاعدہ ہے کہ کوئی کتاب نمونہ میں مفت نہیں بھیجی جاتی۔

اعلیٰ درجے کی ایشیائی نظم خواہ سوشل ہو خواہ پولیٹکل، مشکوری کے ساتھ طبع ہوگی بلکہ حسب تجویز کمیٹی پروانہ انعام بھی علیٰ قدر مراتب دیا جائے گا۔ اس سے یہ مقصد ہے کہ نئی روشنی والے جو ایشیائی شاعری کے سائنس سے ناواقف ہیں اور اس وجہ سے اس کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ان کی راہ میں ایسی مشعل توفیق رکھی جائے کہ آنکھیں کھل جائیں اور ان کو دکھایا جائے کہ انیسویں صدی جس کو اپنی ہر قسم کی ترقی پر ناز ہے، ایشیائی شاعری کا نمونہ دکھائے تو سہی۔

مجدد السنۂ مشرقیہ ابوادریس احمد حسن شوکت مدیر پروانہ و شحنۂ ہند میرٹھ۔"

پروانہ ۲۳×۱۵ سنٹی میٹر کے سائز میں ۲۵ سطر فی صفحہ چکنے کاغذ اور عمدہ کتابت میں ایڈیٹر کے ذاتی پریس "شوکت المطابع" میرٹھ سے چھپتا تھا اور اس کے پڑھنے والے ہندستان کے طول و عرض میں تھے۔ سری نگر کشمیر بھی جایا کرتا تھا۔ اس میں اور لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر نذیر احمد، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، سید محمود، پیارے لال شاکر، سید امجد علی اشہری اور مدیر مجدد السنۂ مشرقیہ احمد حسن شوکت کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ یہ نہیں دریافت ہو سکا کہ پروانہ کب تک جاری رہا تھا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی میں تقریباً ایک سال کے شمارے ہیں۔ ان میں سے بعض کی تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

پروانہ ماہ جنوری و فروری ۱۹۰۲ء جلد ۶ نمبر ۴-۵

ص۱ اور ص۲ سرورق اور ضوابط پروانہ،

ص۳ اور ص۴ میں سید امجد علی اشہری (متوفی ۱۹۱۰ء) کی دو نظمیں "خوشامد" اور "زیور" کے عنوان سے ہیں۔ دونوں کے مطلع بالترتیب درج کیے جاتے ہیں ؎

(۱) خوشامد بھی عجب تاثیر میں اپنی ہے لاثانی
ہزاروں رنگ کی موجد ہزاروں طرح کی بانی (۲۵ شعر)

(۲) ایک لڑکی نے یہ پوچھا اپنی اماں جان سے
آپ زیور کی کریں تعریف مجھ نادان سے (۱۱ شعر)

ص۵ اور ص۶ مخمس بر قصیدہ امام حضرت زین العابدینؑ از مولوی حکیم حافظ احمد امین سکندر پوری ۱۱ بند۔ مخمس کے آخر میں ایڈیٹر صاحب کا یہ نوٹ قابل ذکر ہے :-

"یہ قصیدہ یقیناً حضرت امام زین العابدینؑ کا نہیں۔ اس میں جابجا اسقام ہیں اور ایک بے ربط کلام ہے۔ جیسا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا دیوان اور جیسا کہ ظہیر فاریابی کا دیوان جو مطبع نول کشور میں چھپے ہیں۔ ایسا لچر کلام نہ خواجہ صاحب کا ہو سکتا ہے اور نہ ظہیر فاریابی کا۔ لوگوں نے ٹکے سیدھے کرنے کی جانب سے گھڑ دیا۔ ہندوستان کے اہل مطابع میں چشم بصیرت کہاں کہ کھرے اور کھوٹے کو پرکھیں۔"

ص۷ اور ص۸ میں سید محمود تخلص محمودؔ کی ایک نظم، ۳۰ شعر میں ہے۔ اس کا عنوان "حالتِ قوم" ہے۔

ص۹ تا ص۱۲ میں فارسی اور اردو غزلیں ہیں۔ ص۱۳ میں "مسٹر پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی شاگرد مجدد الوقت (احمد حسن شوکت) از شادی وال ضلع گجرات" کی ایک غزل ہے۔

صد۱۶ تا صد۲۴ "مرقع حل کلام شعرا ر بنکات تبدیل" ان صفحوں میں تبدیل عظیم آبادی کے مشکل اشعار کی آسان شرح لکھی گئی ہے۔

صد۲۴ اور صد۲۵ میں ۵۴ شعر کی ایک نظم بعنوان "ضعف اور ناتوانی" درج ہے۔ شاعر کا نام نہیں لکھا گیا ہے۔

صد۲۶ کے آخر میں طرحی غزلوں کا اعلان کیا گیا ہے

مارچ ؎ سیمیں تنوں پہ خاک چلے مفلسی کا زور

اپریل ؎ اک کلی ہے وہ بھی مرجھائی ہوئی

مئی ؎ شیشہ جب صہبا کا ٹوٹا صورتِ ساغر ہوا

اس کے بعد "اعلان" کے تحت ذیل کی عبارت ہے:

" مندرجہ بالا دو طرح اس لیے خلاف قاعدہ بے ترتیب ردیف ہیں کہ یہی دونوں طرحیں ہجوم نوچندی میرٹھ کے مشاعرے کے لئے تجویز کی گئی ہیں جو سالانہ مجدد الوقت کے خیمہ گاہ پر ہوتا ہے اور اب کی شروع اپریل ۱۹۰۲ء میں ہوگا اگر کوئی صاحب آخر مارچ تک غزلیں بھیجیں گے پڑھوادی جائیں گی اور فارسی کی طرح بابت مشاعرہ یہ ہوئی ؎

بکف داماں اوند نباید مگر دست گریباں را

پروانہ ۱۵ مارچ ۱۹۰۲ء جلد ۶ نمبر ۶

اس شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی وہ نایاب نظم بعنوان "اسلام" درج ہے جو انھوں نے مدراس تعلیمی کانفرنس میں پڑھی تھی۔ اس میں ۱۵ شعر ہیں۔ چند شعر یہ ہیں ؎

الله الله کیا غضب ہے انقلاب روزگار
یعنی وہ اسلام جو تھا منبع عز و وقار
دادریغا! اب رہی اسلام ہے جس کے خواص
ہیں عوام الناس کی نظروں میں بے توقیر و خوار
یا ہمارے نیک و بد میں ہم کو مدخل کچھ نہیں
جو ہوا جو ہوگا سب کا ہے مقدر پر مدار

پروانہ بابت ۱۵ مئی ۱۹۰۲ء نمبر ۵ جلد ۶

صد۳ کسی لکھنوی شاعر نے داغ دہلوی کے کلام پر اعتراض کیا تھا ایڈیٹر پروانہ نے اس کو للکارا کہ اس کی کیا مجال ہے کہ وہ داغ پر اعتراض کر سکے۔ "خبردار آئندہ چونچ کھولی تو ہم سے برا کوئی نہیں۔" ایڈیٹر صاحب جب چاہتے ہیں تو داغ کا دفاع کرتے ہیں اور جب چاہتے ہیں تو خود ان کو تختۂ مشق بناتے ہیں۔

صد۴ تا صد۸ میں جلیل مانک پوری کی مشہور غزل پر "ریویو" کے تحت سخت الفاظ میں تنقید کی گئی ہے۔ یہ غزل حیدرآباد کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔ ایڈیٹر صاحب تمہید میں لکھتے ہیں :-

" حضرت جلیل کے کلام پر ہم پہلے بھی ریویو کر چکے ہیں۔ اُردو کے معمولی شاعر ہیں اور وہ بھی صرف غزل میں۔ حضرت امیر (امیر مینائی) کے کلام میں جو شگفتگی ہے وہ ان کو چھو بھی نہیں گئی۔ ہمارے خیال میں حضرت امیر کی جانشینی کے قابل اگر کوئی ہے تو ریاض ہے۔ ان کا کلام شوخی، معاملہ، مذاق، رندی الغرض ہر پہلو کو لیے ہوئے ہے اور بایں ہمہ صاف اور شگفتہ ہے۔"

جلیل ؎ جو سن ہے کم تو وہ کچھ واقف عتاب نہیں
دمِ سحر ہے ابھی گرم آفتاب نہیں

ایڈیٹر ؎ مصرعہ اولیٰ بہت کاوش اور فکر سے لکھا گیا ہے۔ یعنی پہلے کچھ اور لکھا پھر بدلا۔ تاہم الجھن نہ گئی۔ یوں فرمایئے ؎

" وہ کم سنی کے سبب واقفِ عتاب نہیں"

جلیل ؎ نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

ایڈیٹر: واہ جناب واہ! خلاف سنتِ شعراء۔ نگاہ اور چہرہ دونوں کو زمین دوز کر دیا۔ ترقی اور تفضیل کی پہیلی کا بھی اتا پتا نہیں، پھر کیا برق اور آفتاب کے دیکھنے کی کسی کو تاب ہے شاید اسے ہو جو تاب لاکر آنکھیں ملاتا پھرے۔ اصلاح ملاحظہ ہو:

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے تو کیوں دیکھنے کی تاب نہیں

شوکت میرٹھی نے جلیل مانک پوری کی غزل کے ۱۵ شعر درج کیے ہیں۔ ہم نے بہ سبب طوالت صرف چند شعر پیش کیے ہیں۔ جو شعر ایڈیٹر صاحب کو اچھا لگا تھا اس کی انھوں نے تعریف کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے ؎

بتوں سے پردہ اُٹھانے کی بحث کیا کرتے
کھلی دلیل ہے کعبہ بھی بے نقاب نہیں

پروانہ بابت ماہ جون ۱۹۰۲ء نمبر ۹ جلد ۶

اس شمارہ کی خاص بات یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب نے میرزا داغ دہلوی کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا دیا۔

ص۱ سے ص۱۲ تک داغ کے دیوان "گلزارِ داغ" کی پہلی غزل پر" ریویو کیا۔ ذیل میں چند شعر کی تنقید پیش کی جاتی ہے :۔

داغ ؎ عدو لے سامری فن دیکھے اعجاز رقم میرا
عصائے موسوی ہے حمدِ خالق میں قلم میرا

ایڈیٹر: کیوں جناب! یہ عدو لے میں "یے" کیسی ہے؟ لفظ تو "عدو" ہے۔ پھر "دیکھے" کی تقطیع میں یے گرتی ہے جو آپ جیسے شانِ کہنہ شاعر پچّے پان کو شعرا کی بھری محفل میں سُرخرو نہیں کرسکتی۔ کوئی نو آموز کہہ سکتا ہے کہ "یے" نہیں بلکہ "اعجاز" کا الف جو اڑا گرتا ہے۔ پھر دوسرے میں عصائے موسوی" صحیح ہے یا عصار موسیٰ۔ صحیح مذاق سے فرمایئے کہ علیل سے اصلاح ملاحظہ ہو ؎

عدو سامری فن دیکھ اعجاز رقم میرا
کہ ہے ثعبانِ موسیٰ حمدِ خالق میں قلم میرا

داغ ؎ برنگ بوئے گل ہے ہر نفس یاد الٰہی میں
قیامت تک بھرے گی دم نسیم صبحدم میرا

ایڈیٹر: ماشاءاللہ خوب شعر ہے۔ مگر ایک آنچ کی کسر ہے۔ یادِ الٰہی میں آپ کی ہر سانس ہے مگر نسیم صبحدم خود آپ کا دم بھرے گی۔ بلاغت کی یہ شان نہیں۔ خدا کرے آپ یہ نکتہ سمجھیں۔

مصرعۂ اولیٰ یوں بنا لیجئے ؎

برنگ بوئے گل ہوں ہر نفس یادِ الٰہی میں

دیکھئے اب دونوں مصرعوں میں مطابقت ہوگئی۔ یعنی میں خود ہر دم یاد الٰہی میں مصروف ہوں تو نسیم صبحدم کیوں میرا دم نہ بھرے ورنہ جب سانس مصروف ذکر اللہ ہے تو نسیم سانس ہی کا دم بھرے گی نہ کہ آپ کا۔ آپ نہتے پُھلا کر دم اور نسیمِ صبحدم کو کیوں ہوا بتاتے ہیں ۔۔۔

داغ ؎ الٰہی نقش ہو کلمہ رسول اللہ کا دل پہ یہ
چلے کونین میں نام محمدؐ سے درم میرا

ایڈیٹر:۔ درم کے واسطے سکہ کی ضرورت ہے۔ پھر نام محمدؐ اور کلمہ رسول اللہ دونوں ایک ہیں۔ دوسرا مصرعہ یوں بنا لیجئے ۔

ع یہ سکہ ہے چلے کونین میں اس سے درم میرا

غزل پر تنقید کرنے کے بعد ایڈیٹر نے اسی زمین میں اپنی غزل کے ۱۱ شعر درج کیے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ :

" یہ نہ سمجھئے کہ مجدد (ایڈیٹر) اصلاح ہی کرتا ہے ذیل میں تازہ بہ تازہ ڈال کے ٹوٹے اشعار بھی اسی زمین میں ملاحظہ فرمایئے ۔"

یہاں ہم صرف دو شعر نقل کرتے ہیں ؎

مطلع گزر جب سے ہوا ہے جانبِ کوئے صنم میرا
قدم لیتا ہے رہ رہ کر ہر اک نقشِ قدم میرا

مقطع یہ کشتوں کے گلے پر رک کے کیوں چلتی ہے اے شوکت
زبانِ تیغ کھینچوں گا اگر باقی ہے دم میرا

پروانہ بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۲ء نمبر ۱۲ جلد ۶

ص۱ ص۱۲ اس شمارے میں ایڈیٹر صاحب نے پھر اپنے تنقیدی مزاج کا مظاہرہ " ریویو پر ریویو" لکھ کر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے اودھ پنچ لکھنؤ کے لکھنے والوں کو موردِ الزام ٹھہرایا کہ وہ کلام داغ پر بے جا اعتراضات کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

" ہم لکھ چکے ہیں کہ داغ جیسے پُرانے شاعر ماہر استاد شاہ دکن کے کلام پر قلم اصلاح اٹھانا صرف مجدد (ایڈیٹر) کا کام ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں پنچوں کو تو دل لگی سے غرض

ہے ۔ وہ کیوں چونکنے لگے ؎

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے انھیں
ورنہ یاں بے رونقی دودِ چراغِ کشتہ ہے

اودھ پنچ کے نامہ نگار اور نواد رسہو کتابت کو بھی غریب داغ ہی کے سر منڈھتے ہیں"۔

اس کے بعد ایڈیٹر صاحب نے داغ کے ۵ شعر کو حق بجانب قرار دیکر داغ کا دفاع کیا۔

اسی شمارے میں ص۲۱ سے ص۲۵ تک اقبال کی ایک طویل نظم "طبعزاد شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے" کے تحت درج ہے۔ کسی ماہر اقبالیات نے اس نظم کی اشاعت کے سلسلے میں پروانہ کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ یہ اس کی نایابی کی بڑی دلیل ہے۔ مجھے اس نظم کی برسوں سے تلاش تھی۔ مثل ہے کہ جوئندہ یابندہ۔ اس نظم کے ملنے سے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ میں نے مضمون کا نام "پروانہ اور اقبال" قرار دیا۔

پروفیسر گیان چند جین نے اپنی کتاب "ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال" کے ص۱۵۹ میں اس نظم کو بشیر ڈار مرحوم کی کتاب نوادرِ اقبال ص۱۲۸ کے حوالے سے شامل کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ:

"اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سترھویں سالانہ اجلاس میں ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء بروز اتوار دوسرے اجلاس میں یہ نظم پڑھی۔ جلسے کی صدارت میاں نظام الدین سب جج راولپنڈی نے کی۔ جلسہ اسلامیہ کالج میں منعقد ہوا۔ نظم کے اختتام پر صدر نے کہا،

"شیخ صاحب کی تعریف جس قدر کی جائے کم ہے آپ پنجاب کے ملک الشعراء ہیں"۔

اس نظم سے سامعین اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کی کاپیاں دس دس روپے میں خرید لیں"۔

جین صاحب مزید یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نظم کا عنوان "زبانِ حال" بھی تھا۔

یہ نظم "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو" کے عنوان سے اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور میں پڑھی تھی۔ خدا جانے کہ یہ نظم مخزن لاہور میں کیوں شائع نہیں ہو سکی۔ ذیل میں ہم اس نظم کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں۔ خاص طور سے وہ اشعار درج کیے جاتے ہیں جن کے متون میں اختلاف ہے۔ اختلاف کی نشان دہی حواشی میں کرتے ہیں۔ حواشی میں "ج" سے مراد پروفیسر گیان چند جین کی کتاب "ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال" ہے۔

طبعزاد شیخ محمدؐ اقبال صاحب ایم اے

ہم سخن ہونے کو ہے معمار سے تعمیر آج
آئینے کو ہے سکندر سے سرِ تقریر آج

نقش نے نقاش کو اپنا مخاطب کر لیا
شوخیٔ[۲] تحریر سے گویا ہوئی تصویر آج

گرمیٔ صیاد[۳] کی آتش گزاری دیکھنا
شمع کے اشکوں میں ہے لپٹی ہوئی تنویر آج

آہ میں یارب[۵] یہ کیا اندازِ معشوقانہ تھا
جوشِ لذت میں فدا ہو ہو گئی تاثیر آج

صبر[۶] را از منزلِ دل پا بجولاں کردہ ام
گیسوئے مقصود را آخر پریشاں کردہ ام

آج ہم حالِ دلِ درد آشنا کہنے کو ہیں
اس بھری محفل میں اپنا ماجرا کہنے کو ہیں

ہر نفس پیچیدہ ہے مانندِ دودِ شمعِ طور
داستانِ دلکشِ مہر و وفا کہنے کو ہیں

دیکھیے محفل میں تڑپاتا ہے کس کو کس کو یہ شور[۷]
مرثیہ اپنے دلِ گم گشتہ کا کہنے کو ہیں

خود بخود منہ سے نکل جانا بھی اچھا ہے مگر
دم تو لے آخر تجھے اے مدعا کہنے کو ہیں

باز اعجازِ مسیحا را ہویدا کردہ ام
پیکرے را با زبانِ خامہ گویا کردہ ام

ابر بن کر تم جو اس گلشن پہ[۸] گوہر بار ہو
بخت سبزے کا مثالِ دیدۂ بیدار ہو
میں صدف تم ابرِ نیساں میں گلستاں تم بہار
مزرعِ نوخیز میں تم ابرِ دریا بار ہو
میں نتیجہ اک حدیثِ اُمّیِ یثرب کا ہوں
تم اسی اُمّی کی اُمّت کے علم بردار ہو
دیکھ لے ذوقِ خریداری یہ موقع ہے کہیں
حُسنِ یوسف سے نہ خالی مصر کا بازار ہو

یوسف ایں علم من و پنجاب کنعانِ من است
از طلوعِ صبحِ حکمت چاک دامانِ من است

مُجھ میں وہ جادُو کہ روتوں کو ہنسا سکتا ہوں میں
قوم کے بگڑے ہوؤں کو پھر بنا سکتا ہوں میں
طیرِ حکمت باغِ دنیا میں ہوں اے صیاد میں
دام تو سونے کا بنوائے تو آ سکتا ہوں میں
طوسی و رازی و سینا و ظہیر و الغزل
آہ وہ دل کش مرقع پھر دکھا سکتا ہوں میں
آزما کر تم ذرا دیکھو مرے اعجاز کو
ڈھونڈھتی ہیں جس کو آنکھیں وہ دکھا سکتا ہوں میں
کارواں سمجھے اگر خضرِ رہِ عزت مجھے
منزلِ مقصود کا رستہ دکھا سکتا ہوں میں

از خمِ حکمت بروں کردم شرابِ ناب را
ہاں مبارک سرزمینِ خطۂ پنجاب را

بن گیا ہے دستِ سائل دامنِ گلزار کیا
باغ پر چھایا ہوا ہے ابرِ گوہر بار کیا
جس نے جا چھونا ہو دامانِ ثریا کو کبھی
ایک دو اینٹوں سے اُٹھ سکتی ہے وہ دیوار کیا
مجھ سے وابستہ نہیں کیا آبروئے پنجاب کی
تیر کی صُورت نہیں ہیں طعنۂ اغیار کیا
آرزو یہ دل کا بھی کہنا کوئی دُشوار ہے
کام خاموشی سے تجھ کو طالبِ اظہار کیا

گوش را جویائے آواز غریباں کردہ
شانہ را مائل بہ گیسوئے پریشاں کردہ

کیوں نہ دیوانے ہوں لب سوزِ نہاں کے واسطے
ڈھونڈھ کر محفل نکالی داستاں کے واسطے
جس نے پایا اپنی محنت سے زمانے میں فروغ
ہے وہی اخترِ جبینِ کہکشاں کے واسطے
باغباں کا ڈر کہیں خطرہ کہیں صیاد کا
مشکلیں ہوتی ہیں سو اک آشیاں کے واسطے
یہ تو پوشیدہ ہے سب بے آرامیِ محنت میں کچھ
جا رہا ہے تو کہاں آرامِ جاں کے واسطے

روشن از نورِ مہِ حکمت شبستانِ من است
کاں دُرِ گم گشتۂ مومن بدامانِ من است

ہاں رگِ ہمت کو اپنی جوش میں لائے کوئی
عشقِ اخواں کا اثر دنیا کو دکھلائے کوئی
مدعا کو یہ سکھایا شورشِ فریاد نے
خود بخود میری طرح منہ سے نکل جائے کوئی
کہہ گئی ذوقِ کرم کو غنچۂ حسنِ طلب
ہاتھ سے عاشق کا دل بن کر نکل جائے کوئی
اک چھوٹا دریا رواں ہونے کو ہے پنجاب میں
ابر کی صورت اُٹھے اُٹھ کر برس جائے کوئی
تاک میں بیٹھی ہوئی ہے شوخیِ دستِ طلب
دیکھئے اس بزم سے بچ کر کہاں جائے کوئی
جوشِ ہمدردی میں پنہاں دولتِ ایمان ہے
نقشۂ خیر القروں آنکھوں کو دکھلائے کوئی

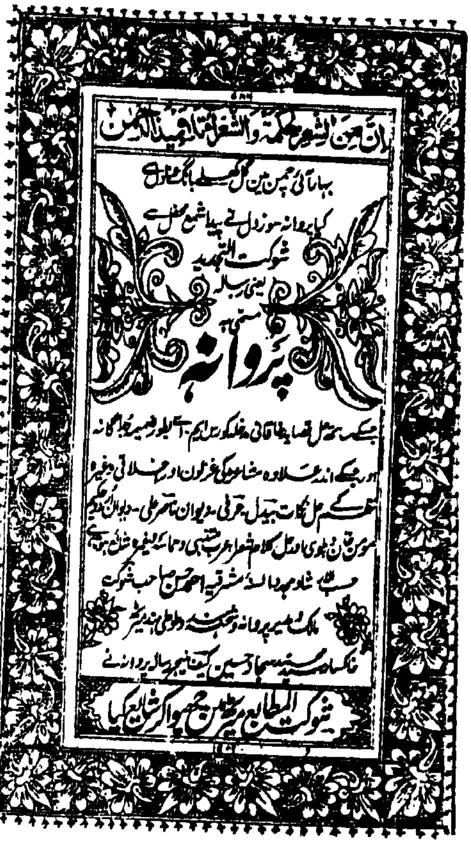
فکرِ دیں کے ساتھ رکھنا فکرِ دُنیا بھی ضرور
ہیں بہت دُشمن کہیں دھوکا نہ دے جائے کوئی

خویش را اسلم[۲۸] همے گویند و با ما کار نیست
رشتۂ تسبیح شان جز رشتۂ زنّار نیست

علم کا معشوق[۲۹] رونق بخشِ کاشانہ تو ہو
انجمن اپنی مثالِ بزمِ جانانہ تو ہو
پھر سماں بندھ جائے گا غرناطہ و بغداد کا
پھر ذرا بھولا[۳۰] ہوا تازہ وہ افسانہ تو ہو
یادگارِ فاتحانِ ہند و اندلس کے ہو[۳۱] تم
شانِ شاہانہ نہ ہو پیری امیرانہ تو ہو
پائمالی[۳۲] ہے جہاں میں ترکِ حکمت کی سزا
اس چمن سے مثلِ سبزہ کوئی بیگانہ تو ہو
وہ غنی ہے علم کی دولت بھی کرتا ہے عطا
ہاں مگر بھلی[۳۳] روش تیری گدایانہ تو ہو

اے کہ حرفِ اطلبوا لوکان بالصین[۳۴] گفتہ
گوہرِ حکمت بتارِ جانِ اُمت سفتہ

اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردہ
سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہ
اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو
خاکِ یثرب را تجلی گاہِ عرفاں کردہ
اے کہ ہم نامِ خدا[۳۵] بابِ دیارِ علم تو
اُمتے بودی و حکمت را نمایاں کردہ
بے عمل را لطفِ تو لاتقنطوا[۳۶] آموز گشت
بسکہ وا بر ہر کسے بابِ دبستاں کردہ
ہاں دُعا کُن بہرِ ما رے مایۂ ایمانِ ما
پر شود از گوہرِ حکمت سبد دامانِ ما



حواشی

۱ے اختر شاہنشاہی ص۱۷۱۔ یہ کتاب صحافت کی اہم تاریخ ہے جو اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف آنریری سکریٹری انجمن علمی و مالک اخبار اختر ہند و اختر پریس نے $\frac{18 \times 22}{8}$ سائز میں ۲۹۸ صفحوں میں پہلی مرتبہ جون ۱۸۸۸ء میں شائع کی تھی۔ اس میں ہر اخبار اور ہر گلدستہ اور ہر مطبع کے بارے میں اطلاعات فراہم کی گئیں جن کی تعداد ۱۵۱۸ ہے۔

۲ے اختر شناسی ص۱۵۹

۳ے ج۔ شوخی　　۴ے ج۔ فریاد　　۵ے ج۔ وہ

۶ے پروانہ ندارد　　۷ے پروانہ میں 'کو' زیادہ ہے۔

۸ے ج۔ یہ

۹ے ج ـ یوسفِ علم استم و پنجاب کنعانِ من است
از دمیدِ صبحِ حکمت، چاک دامانِ من است

(باقی ص ۲۰ پر)

ڈاکٹر اختر بستوی
شعبۂ اردو
گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

"زندگی سے زندگی کی طرف"

نازش پرتاب گڑھی کا طویل منظومیہ

نازش پرتاب گڑھی ایک ایسے مقصدی شاعر ہیں جنہوں نے ہمیشہ وقت کے اہم تقاضوں کو اپنے سامنے رکھا اور فنِ شاعری کو ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا۔ ہندستان کی غلامی کے دور میں انھوں نے انگریزی سامراج کے خلاف عوامی جذبات کو بھڑکانے کے لیے تند و تیز نظمیں لکھیں اور آزادی کے بعد اتحاد و یک جہتی، تعمیر و تنظیم اور اخوت و مساوات کے موضوعات پر مسلسل اشعار کہہ کر اہلِ وطن کے فکر و عمل کو صحیح سمتوں میں موڑنے کی کوشش کی۔

نازش صاحب کی شاعری کے عظیم اور لافانی نمونوں میں ان کا طویل منظومیہ "زندگی سے زندگی کی طرف" ایک نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ یہ ان کی زندگی ہی میں ایک علاحدہ کتابچے کی صورت میں شائع ہو کر شائقینِ ادب تک پہنچ چکا تھا۔ موصوف کا یہ منظومیہ ان کی ایک ایسی ناقابلِ فراموش تخلیق ہے جسے نہ اردو شاعری کا کوئی نقاد نظر انداز کر سکتا ہے نہ اردو ادب کا کوئی مورخ۔

"زندگی سے زندگی کی طرف" کا موضوع بظاہر اگست ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑو تحریک" (Qoit India Movement) ہے کیونکہ کتابچے کے تیسرے صفحہ پر جلی حروف میں یہ عبارت درج ہے:

"اگست ۱۹۴۲ء کی تحریکِ آزادی سے متعلق ایک تخیلی منظومیہ"

سید احتشام حسین کے خیال میں بھی اس منظومیے کا موضوع یہی ہے۔ وہ اس کے "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں:

"مجھے یقین ہے کہ ہماری جنگِ آزادی کے ایک اہم موڑ کے متعلق نازش صاحب کی یہ طویل اور خوبصورت نظم مقبول ہوگی۔"

اس میں شک نہیں کہ اس منظومیے کا تانا بانا مذکورہ بالا تحریک کی تفصیلات ہی سے بنا گیا ہے لیکن اس کے باوجود میری دانست میں اس کا اصلی موضوع ۴۲ء کی تحریک کے بجائے تاریخِ انسانی کا وہ اہم ترین درس ہے جسے نازش صاحب نے مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے ؎

لاکھ تخریب ہو تعمیر نہیں رک سکتی
زندگی وقت کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی

جب بھی انسان نے پستی سے ابھرنا چاہا
جب کبھی گیسوئے ہستی نے سنورنا چاہا
اس گھڑی موت کے پیاروں کو جلال آیا ہے
کالے قانون کے سینے میں ابال آیا ہے

لیکن انسان اُبھرتا ہی چلا جاتا ہے
ہر طرف نور بکھرتا ہی چلا جاتا ہے

اور تاریخ کے اسی "درس" کی وضاحت کے لیے انھوں نے ہندستان چھوڑدو تحریک کو ایک نظیر (INSTANCE) کے طور پر پیش کیا ہے۔
مندرجہ بالا اشعار کے فوراً ہی بعد ہمیں یہ اشعار ملتے ہیں ؎

کون سا قطرۂ غم موجۂ طوفاں نہ ہوا
لیکن انسان مصائب سے ہراساں نہ ہوا
اپنے رستے میں بھی یہ دھوپ کڑی آئی تھی
ہندوالوں پہ بھی اک ایسی گھڑی آئی تھی

اور پھر اسی "گھڑی" کی تفصیل سے منظومیے کا پورا خاکہ تیار کیا گیا ہے۔

نازش پرتاپ گڑھی کے اس طویل منظومیے میں بہت سے کردار ہیں جن کی فہرست ص ۱۱ پر دی ہوئی ہے، لیکن ان میں سے بیشتر کردار غیر مرئی (Abstract) ہیں۔ مثلاً "تاریخ"، "وقت" اور "سختیٔ شب" وغیرہ۔ ایک کردار "شاعر" کا بھی ہے مگر اسے نازش صاحب نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کا کوئی مرئی ہیولیٰ (Concrete Image) ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ یہ کردار بھی دیگر تمام کرداروں کی طرح ایمائی اور تمثیلی نظر آتا ہے۔ صرف ایک ہی کردار ایسا ہے جسے ہم مروجہ اصولوں کے مطابق ڈرامائی کردار کہہ سکتے ہیں، اور وہ ہے "بوڑھا دادا"۔ لیکن یہ جیتا جاگتا کردار بھی "ماضی کی صحت مند روایات" کی علامت (Symbol) ہے۔

منظومیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ گاؤں کی چوپال میں "بوڑھا دادا" سلگتے ہوئے حقے کا سہارا لے کر "جوان چہروں" کو مخاطب کرتے ہوئے پہلے انھیں تمہیدی طور پر تاریخ کے اسی "درس" سے آگاہ کرتا ہے جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں اور "ہندوالوں" پر گزری ہوئی ایک سخت گھڑی کی داستان بیان کرنے کے لیے ہندستان کے دورِ غلامی کا پس منظر پیش کرتا ہے جس میں ہر طرف "ظلمت کا غبار" بکھرا ہوا ہے اور "انسان گردِ آلام سے اٹا" ہے۔ "خونِ جمہور" پیالوں میں بکتا ہے اور "زیست ڈھلکے ہوئے آنسو کے سوا کچھ بھی نہیں" ہے۔ اس مایوس کن پس منظر سے "شہیدوں کی آواز" اُبھرتی ہے ؎

کل کی ہے بات کہ دشمن سے بچانے کے لیے
برق کی زد پہ رکھا اپنا نشیمن ہم نے
دستِ گلچیں جو بڑھا توڑنے کوئی غنچہ
پیش کردی اسے خود اپنی ہی گردن ہم نے

مگر ؎

ہم کو قربانی و ایثار کا بدلا یہ ملا
اب بھی ہیں دار پہ پھیلی ہوئی بانہیں اپنی
دوستو! ہم وطنو! کوئی تو کروٹ بدلو
تک رہی ہیں تمھیں بے نور نگاہیں اپنی

اور پھر شہیدوں کی آواز اہلِ وطن کو غیرت دلاتی ہوئی سوال کرتی ہے ؎

کتنی شمشیروں کو خون اپنا پلانا ہے ابھی
کتنے غم اور ہیں باقی جنھیں سہنا ہوگا
دوستو! ہم وطنو! تم ہی بتاؤ کہ ہمیں
کتنی دیر اور ابھی دار پہ رہنا ہوگا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "لہریں بیدار ہو جاتی ہیں" اور ان فضاؤں میں جہاں کبھی "خاموشی چھائی" تھی "صدائے وقت" یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے ؎

رات کے پاس کہاں بادۂ جاں بخش کا جام
ساتھیو! ہم نفسو! جاگ اٹھو۔ تم پہ سلام

تاریخ کے ہر دور میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جبر و تشدد کے نظام سے نبرد آزما ہونے کا خیال سب سے پہلے اہلِ شعور کے ذہنوں میں سر اٹھاتا ہے اور پھر ان کے توسط سے عوام کے دل و دماغ تک پہنچتا ہے —— نازش صاحب کے طویل منظومیے "زندگی سے زندگی کی طرف" میں بھی ہمیں یہی طریقِ عمل (Process) ملتا ہے۔ "صدائے وقت" سن کر سب سے پہلے "شاعر سوچتا ہے" ؎

جس کو بھیجا تھا کبھی بادِ صبا نے پیغام
آج خلوت سے وہ بازار تک آپہنچا ہے

سوچتا یہ ہوں کہ میں عشق لڑاؤں کیونکر
زندگی آج حدِ دار تک آ پہنچی ہے

فکر کی اس منزل تک پہنچ کر شاعر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اب "بات" کو "پازیب" سے "تلوار کی جھنکار تک" پہنچا دینا چاہیئے۔ چنانچہ وہ "اعلان" کرتا ہے ۔

رہبرو! راہ گرو! اپنے قدم تیز کرو
ساتھیو! ہم سخنو! اور قلم تیز کرو

خاک اور خون کا طوفان نہ بڑھنے پائے
اب کوئی ظلم بھی پروان نہ چڑھنے پائے

یہ اعلان سُن کر "سختیٔ شب جاگ اٹھتی ہے" اور غضبناک ہو کر کہتی ہے ۔

تم قلم کاروں نے لکھا ہے حکومت کے خلاف
اور یہ جرم کیا جائے گا ہرگز نہ معاف

مگر شاعر اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر جواب دیتا ہے کہ میرا قلم "ظلم اور جبر کا حامی" اور "منکرِ تحریکِ عوامی" کبھی نہیں ہوا جب "زیست عرصۂ دار تک آجاتی ہے" اور "رات" "اپنے کو دہراتی ہے" تو میں "نظموں کی قندیل جلا دیتا ہوں" اور "قلم چھوڑ کے تلوار اٹھا لیتا ہوں" ــــ یہ بے باکانہ جواب "سختیٔ شب" کے اشتعال میں اضافہ کر دیتا ہے اور اس کی طرف سے حکم ہوتا ہے :۔

ضبط ہوتی ہے ہر اک نظم بنامِ قانون

لیکن اس حکم سے شاعر کے حوصلے پست نہیں ہوتے بلکہ وہ کہتا ہے ۔

آدمی بھی ہے مری نظم اسے ضبط کرو
زندگی بھی ہے مری نظم اسے ضبط کرو

ضبط ہو کر بھی کوئی گیت نہیں مر سکتا
کوئی سورج کو نظر بند نہیں کر سکتا

اس کے بعد "ہنگامۂ دار و گیر" اٹھتا ہے۔ مگر اس ہنگامے سے بھی شاعر ہراساں نہیں ہوتا بلکہ اس کے ہونٹوں سے یہ جرأت مندانہ اشعار نکلتے ہیں ۔

ان گنت نغموں کی لے جس میں ہو وہ ساز ہوں میں
یعنی اک فرد نہیں قوم کی آواز ہوں میں
اور یہ آواز کسی سے بھی دبائی نہ گئی
یہ وہ قوت ہے جو طاقت سے مٹائی نہ گئی

میری حق گوئی جو مٹی میں ملا دی بھی گئی
میری آواز اگر آج دبا دی بھی گئی
تختۂ دار پہ سب جان بکف بولے گا
خون سے میرے کھلے گا جو چمن بولے گا

شاعر کا یہ پیمبرانہ کلام حرف بہ حرف سچ ثابت ہوتا ہے اور "طوفان انگڑائی لیتا ہے" اہلِ شعور کے غور و فکر کے بعد عوام سوچنا شروع کرتے ہیں ۔

اپنے دکھ درد کے اور اپنی مصیبت کے خلاف
ہم اب آواز اٹھائیں گے حکومت کے خلاف

پھر "عوامی للکار" سنائی دیتی ہے ۔

ختم ہر سلسلۂ جور و ستم کر ڈالو
اٹھو گل چینوں کے ہاتھوں کو قلم کر ڈالو

اس للکار کے ساتھ "لوگ" جمع ہوتے جاتے ہیں اور "علم" بلند ہوتے ہیں "بازو" لہراتے ہیں اور "قدم" بڑھتے جاتے ہیں۔ اسی "انگڑائی لیتے ہوئے طوفان" میں "ہندوستان چھوڑ دو" کا وہ عہد آفریں نعرہ بلند ہوتا ہے جس نے وطن عزیز کی قسمت بدل ڈالی تھی۔ (۹ اگست ۱۹۴۲ء کو یہ نعرہ مہاتما گاندھی نے دیا تھا جس کا حوالہ کتابچے کے صفحہ ۳ پر ذیلی حاشیے میں دیا گیا ہے) اس نعرے کو نازش پرتاپ گڑھی شاعرانہ زبان میں یوں بیان کرتے ہیں ۔

ظلمتو! نور کے دھارے سے نہ ٹکراؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

اسی نعرے کی روشنی میں "ذہن و نظر کا فانوس" جگمگاتا جاتا ہے اور

"سڑکوں" پر "جلوس" بڑھتا جاتا ہے۔ "سختیِ بڑھتی" ٹوکتی بھی ہے
اور روکتی بھی ہے لیکن "طوفان بڑھتا" رہتا ہے اور رفتہ رفتہ
ایک تحریک کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

قوموں کی زندگی میں وہ منزل بڑی دشوار گزار ہوتی ہے جب تاریخ کے کسی فیصلہ کن موڑ پر عوام جبر و تشدد کے نظام کے خلاف صف آرار ہوجاتے ہیں اس وقت مختلف قسم کے وسوسے ابھرنے لگتے ہیں کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ظلم کی طاقت سے ٹکرانے میں تشدد سے کام لینا پڑے گا جو انسانیت کے لیے مہلک ہے اور کبھی یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اپنے ہی جیسے انسانوں سے جنگ کرنا درست ہے؟ ان وسوسوں کو نازش صاحب نے "اوہام" کا نام دیا ہے۔
ان کے منظومیہ "زندگی سے زندگی کی طرف" میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب وقت کی آواز عوام کو اس بات پر آمادہ کرلیتی ہے کہ ؎

بڑھ چلو روند کے کانٹے جو ملیں راہوں میں
لوٹ لو ان کو جو دُبکے ہیں کمیں گاہوں میں

تو "وہم" کہتا ہے ؎

یہ اہنسا کی جنم بھوم، یہ گوتم کی زمیں
اس کو بدنام کرے داغِ تشدد نہ کہیں

لیکن صالح "ذہن" فوراً سمجھاتا ہے ؎

کسی اعلانِ صداقت کو تشدد نہ کہو
وقت کی سخت ضرورت کو تشدد نہ کہو

ظلم کا راج مٹانے کو تشدد نہ کہو
قوم کی آن بچانے کو تشدد نہ کہو

"وہم" انقلاب کی راہ میں ایک اور روڑا اٹکانا چاہتا ہے ؎

لیکن انسان کو انسان سے نفرت کیسی
اپنے ہم جنسوں سے اس درجہ عداوت کیسی

مگر "ذہن" یہ جواب دے کر اس روڑے کو بھی ہٹا دیتا ہے ؎

نہ کسی قوم نہ انسان سے لڑنا ہے ہمیں
صرف اندھیارے کے طوفان سے لڑنا ہے ہمیں

اس کے بعد "وہم" کچھ اور شبہات کا اظہار کرکے "طوفان" کو بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ مستقبل کا مورخ اس بغاوت کو حماقت قرار دے گا اور کبھی یہ خوف دلاتا ہے کہ ملک کے سر پر "تخریب کا الزام" آجائے گا لیکن عوام "ظلمات کو انوار بنانے کے لیے" بر سرِ پیکار رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور پوری شدت سے یہ نعرہ دُہراتے ہیں ۔

غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

"کالا قانون" اسے اپنی "تذلیل" سمجھتا ہے اور "زعمِ حکومت کی رگِ ظلم کا خون" کھول اٹھتا ہے۔ گولیاں چلنے لگتی ہیں، انسانوں کے جسم گرنے لگتے ہیں، اور وقت کی آنکھیں مزدوروں، عورتوں، جوانوں، بچوں اور طالب علموں کے قتلِ عام کا ایک انتہائی بھیانک منظر دیکھتی ہیں۔
نازش صاحب نے بہت ہی تفصیل کے ساتھ اس ہولناک منظر کی عکاسی کی ہے۔ گولیوں سے مرنے والے پانچ افراد کے خاکے اتنے موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ پہلا خاکہ ایک "کڑیل جوان" کی شہادت کا ہے جس کا سینہ کسی شوخ کی الفت کا امین تھا۔ دوسرا نقشہ ایک "نرم و جواں سی عورت" کی موت کا ہے جس میں "تخلیقِ بشر کی قوت" پوشیدہ تھی۔ تیسرا عکس خاک اور خون میں لتھڑے ہوئے ایک ننھے سے بچے کا ہے جو کسی باپ کی لاٹھی، کسی بہن کا پیار اور کسی آنگن کا چاند تھا۔ چوتھی تصویر ایک مزدور کی لاش ہے جس کے ماتھے پر "محنت کا جمال" اور ہاتھوں پر "مشقت کا جلال" تھا۔ اور پانچویں شبیہہ دس بارہ برس کے ایک طالب علم کی جواں مرگی کی ہے جو مستقبل کا گوتم و رام، آزاد و نہرو اور ٹیگور و اقبال تھا۔ موت کی یہ گرم بازاری دیکھ کر "بے یقیں" کانپ اٹھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ؎

جہل کی زلف کھلی ہے تو بکھر جائے گی
موت کو ڈھیل ملی ہے تو اُبھر جائے گی
زندگی کا کوئی سامان نہ پیدا ہوگا
جانور ہوں گے، اب انسان نہ پیدا ہوگا

مگر "یقین" کہتا ہے کہ ؎

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

پروفیسر نظیر صدیقی
(اسلام آباد، پاکستان)

نشور واحدی کی شاعری

زمانے کی غلط بخشیوں کا شکوہ ہر دور میں رہا ہے اور رہے گا۔ شہرت عزت، اہمیت اور مقبولیت کے معاملے میں زمانہ یا تو غلط قسم کی فیاضی کا ثبوت دیتا ہے یا غلط قسم کی بخالت کا۔ نتیجۃً کچھ لوگوں کو ان کے حق سے بہت زیادہ مل جاتا ہے اور کچھ لوگ اپنے حق سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ عہد حاضر کے اُردو شاعروں میں جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کی طرح نشور واحدی بھی آخرالذکر قسم کے محروموں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

ان تینوں میں سب سے کم شہرت اجتبیٰ رضوی کی رہی ہے لیکن ان میں گمنام کوئی بھی نہیں۔ تینوں کے قدردانوں اور مداحوں میں ممتاز اور معتبر قسم کے سخن شناسوں کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ نام و نمود کے شوق سے بے نیازی کے باوجود تینوں شعراء کی تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

نشور کی زندگی میں ان کے کلام کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے تھے جن میں سے بعض انتخابِ کلام پر مشتمل ہیں۔ وہ ہندستان اور پاکستان کے مقبول شاعروں میں سے تھے۔ فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی۔ اور۔ آل احمد سرور جیسے اربابِ قلم نے ان کی شاعری کے بارے میں بڑے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باوجود حق یہ ہے کہ ان کا حق ادا نہیں ہو سکا ہے۔ انھیں ابھی تک اُردو ادب کی وہ تنقیدی توجہ نہیں مل سکی ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اُردو تنقید زندوں کی طرف عموماً ملتفت نہیں ہوتی اور مرحومین کی طرف بھی تاخیر سے ملتفت ہوتی ہے۔

نشور شاعری میں اپنا کام کر چکے اور اس دنیا سے جا چکے۔ اگر تنقید ان کی زندگی میں اپنے کچھ فرائض ادا کرتی تو انھیں ان کی تخلیقی کاوشوں کا کچھ صلہ مل جاتا۔ اگر اب بھی ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو سنجیدہ مطالعے کا موضوع بنایا جا سکے تو یہ کام ان کی کارکردگی کا بعد از مرگ صلہ ہو سکتا ہے۔

نشور واحدی کی شاعری کے معاملے میں غور طلب سوالات وہی ہیں جو ہر شاعر کے معاملے میں ہوتے ہیں، یعنی اگر ان کی شاعری ایک منفرد آواز کی حیثیت رکھتی ہے تو اس کی انفرادیت کیا ہے؟ اگر ان کی شاعری، اُردو شاعری میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے تو اس اضافے کی نوعیت کیا ہے اور اس اضافے کی قدر و قیمت کیا ہے؟ انفرادیت کی تعریف (Definiton) اور قدر و قیمت کا تعین دونوں ہی بڑے نازک اور مشکل کام ہیں۔ ایک مدت کی بحث و تمحیص کے بعد یہ دونوں کام انجام پاتے ہیں لیکن انجام کی توقع تو جبھی پیدا ہوگی کہ کہیں سے اس کام کا آغاز تو ہو۔

نشور کا پہلا مجموعۂ کلام "صہبائے ہند" ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ "شورِ نشور" ۱۹۴۲ء میں اور تیسرا مجموعہ "آتش و نم" ۱۹۴۶ء میں۔ میں نے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان پہلی مرتبہ نشور واحدی کا نام سنا، اور وہ بھی اس طرح کہ گورکھپور میں، جہاں میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا، میرے کالج کے ایک ساتھی اپنی مترنم آواز میں بعض جدید شاعروں کے شعر گنگناتے رہتے تھے، نشور کا جو شعر وہ گنگناتے وہ یہ تھا ـــ

نشور آلودۂ عصیاں سہی پھر کون باقی ہے؟
یہ باتیں راز کی ہیں قبلۂ عالم بھی پیتے ہیں

یہ تو خیر ایک اتفاق تھا کہ میں نے نشور کا سب سے پہلے جو شعر سُنا اس کا تعلق خمریات سے تھا، لیکن بہت بعد میں پہلا تاثر یہ پیدا ہوا کہ ان کی شاعری کا آغاز شراب و شباب کے مضامین سے ہوا۔ ممکن ہے کہ ان مضامین سے طبعی مناسبت کے علاوہ شاعری کے اس میدان میں جگر کی مقبولیت بھی، ان موضوعات کی طرف مائل کرنے میں معاون ثابت ہوئی ہو۔ یوں تو شراب و شباب اُردو غزل کے نہایت پُرانے اور پسندیدہ موضوعات میں سے ہیں۔ لیکن بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی تک یہ موضوعات بڑی حد تک اپنی پرانی دل کشی کھو چکے تھے۔ جدید غزل کے وہ چار نمائندے جو حسرت، فانی، اصغر اور جگر کے نام سے جانے جاتے تھے ان میں لے دے کے صرف جگر کے یہاں یہ دونوں موضوعات بنیادی موضوعات کے طور پر رہ گئے تھے۔ باقی شعراء کے یہاں ان کی حیثیت ضمنی موضوعات کی رہ گئی تھی۔ لیکن جب ہم شراب و شباب سے متعلق نشور کی غزلیں یا اشعار پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں جگر کے علاوہ ان دو موضوعات کا ایک اور اہم شاعر بھی موجود ہے جس کی شاعری ان موضوعات کے اعتبار سے نہ صرف جگر سے مختلف ہے بلکہ اُردو کے ان تمام شاعروں سے بھی مختلف ہے جنھوں نے شراب و شباب کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا ہے۔

اگر کوئی شخص شراب و شباب کو اُردو غزل کے روایتی موضوعات کہہ کر شراب و شباب کی شاعری کو یکسر ناقابلِ توجہ قرار دینا چاہے تو اسے اس رویے سے روکا نہیں جا سکتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو یہ موضوعات اتنے بے حقیقت ہیں نہ یہ رویہ کچھ زیادہ حقیقت پسندانہ۔ شباب انسانی زندگی کا حسین ترین حصہ ہوتا ہے اور شراب، شباب کی ایک لذیذ ترین کمزوری۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں ان موضوعات پر شاعری کی گئی ہے اور غالباً آئندہ بھی کی جائے گی، خواہ ذہنی طور پر انسان کتنا ہی بالغ اور سنجیدہ کیوں نہ ہو جائے۔

نشور واحدی کے معاملے میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ شراب و شباب کی شاعری میں کسی ریاض خیرآبادی اور کسی جگر مرادآبادی سے مختلف ہیں یا نہیں، اور ان سے ہٹ کر انھوں نے ان موضوعات کا حق ادا کیا ہے یا نہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ شراب و شباب کی شاعری میں نشور کا رنگ اُردو کے دوسرے شاعروں سے قطعاً مختلف ہے اور اس رنگ کے حسن و لطف میں جو انفرادیت ہے وہ آسانی سے محسوس تو کی جا سکتی ہے لیکن آسانی سے بیان نہیں کی جا سکتی۔ ان موضوعات پر نشور کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے ؂

کبھی سنتے ہیں عقل و ہوش کی اور کم بھی پیتے ہیں
کبھی ساقی کی نظریں دیکھ کر پیہم بھی پیتے ہیں
خزاں کی فصل ہو روزے کے ایّام مبارک ہوں
طبیعت لہر پر آئی تو بے موسم بھی پیتے ہیں
کہاں تم دوستوں کے سامنے بھی پی نہیں سکتے
کہاں ہم رُوبروئے ناصحِ برہم بھی پیتے ہیں

کہاں کی توبہ، کیسا اِتقّا عہدِ جوانی میں
اگر سمجھو تو آؤ تم بھی چکھو، ہم بھی پیتے ہیں
نشور آلودۂ عصیاں سہی پھر کون باقی ہے
یہ باتیں راز کی ہیں قبلۂ عالم بھی پیتے ہیں

دیا ساقی نے اوّل روز وہ پیمانہ مستی میں
کہ میں ناآشنائی کر ہوا دیوانہ مستی میں
کوئی کہتا ہے مسجد ہے کوئی کہتا ہے باہر جا
الٰہی! کیا میں بھولا ہوں رہِ میخانہ مستی میں
نشہ تھا مجھ کو اور یاروں نے چاہا چھین لیں بوتل
مگر کام آگئی کچھ جرأتِ رندانہ مستی میں

نظر آتا ہے مجھ کو بوریا بھی تختِ طاؤسی
گدا رکھتا ہے گویا سطوتِ شاہانہ مستی میں
خبر کیا تھی کہ واعظ ہے یہی سمجھا کہ ساقی ہے
اُٹھا اور اُٹھ کے جا لپٹا میں بیتابانہ مستی میں

قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا ہے کہیں جا کر
نشور اس وقت ہوں کچھ ہوش سے بیگانہ مستی میں

جب کبھی شغلِ بادہ ہوتا ہے
ایک عالم زیادہ ہوتا ہے

ایک مستِ شباب باقی ہے
چلتی پھرتی شراب باقی ہے
خانۂ خام و بگوشۂ صحرا
یار و عہدِ شباب باقی ہے

حسن جو چودھویں برس آ کے شباب سے ملا
جیسے کہ نغمۂ لطیف کیفِ شراب سے ملا
مدرسۂ تصورات غزلِ شراب شوق کو
مجھ کو کہ میں ہوں مردِ علم، کچھ نہ کتاب سے ملا
راز ہے کچھ گریز میں، بات ہے کچھ بچاؤ میں
ان کے شباب کا پتہ ان کے حجاب سے ملا

بہ خرامِ ناز پہ مٹ گیا وہ شبابِ عمر پہ مر گیا
جو جوانیوں سے گزر گیا وہ قیامتوں سے گزر گیا
یہ زمیں بھی تھی یہ فلک بھی تھا مگر اک شباب کی تھی کمی
تری زلف تا بہ کمر گئی تو جہانِ حسن سنور گیا

اُردو غزل میں شراب و شباب سے متعلق نہایت خوبصورت اشعار کہے گئے ہیں۔ نشور کے یہ اور اس طرح کے دوسرے اشعار اسی گراں قدر سرمائے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان موضوعات پر نشور کی شاعری اُردو کے کسی اور شاعر سے متاثر معلوم نہیں ہوتی یہی وہ مقام ہے جہاں نشور کا کوئی راز دار یا سوانح نگار بتا سکتا تھا کہ ان کے مخصوص و محبوب موضوعات سے ان کے تعلق کی نوعیت کیا تھی لیکن ان کا کوئی راز دار یا سوانح نگار ہے کہاں جو بتائے۔ ان دونوں کی عدم موجودگی میں اندازے کی بنا پر زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی خوبصورت، پُر کیف، دل اور رُوح کو چھونے والی شاعری ذات سے اُبھرتی ہے نہ کہ روایات سے۔

اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو نشور کے یہ اشعار ان کی ابتدائی شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کے اس ابتدائی دور میں ایک منفرد شاعر کو اُبھرتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس اُبھرنے والے شاعر کے آئندہ خد و خال کیا ہوں گے اس کا بھی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ نشور کی ابتدائی شاعری نے جو وعدے کیے تھے اگرچہ وہ بہت بڑے وعدے نہ تھے لیکن وہ خوش اسلوبی کے ساتھ پُورے ضرور ہوئے۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ تمام عمر شراب و شباب کی شاعری پر قناعت کرنے والے شاعر نہ تھے، ان کی شاعرانہ حساسیت زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے روگردانی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جس قدر شباب و جمال کے معاملے میں سریع الحس تھے اسی قدر انھیں زندگی کے دکھ درد کے معاملے میں بھی حساس ہونا تھا۔ اس طرح زبان و بیان کی جس مہارت کا ثبوت وہ ابتدائی شاعری میں دے رہے تھے اسے اور بھی نکھرنا تھا۔ لفظوں کی جو موسیقی ان کی ابتدائی شاعری میں سنائی دیتی ہے اسے آگے چل کر معنی کی موسیقی میں بدل جانا تھا۔ شگفتہ زمینوں کا انتخاب اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ انتخاب کی جگہ ایجاد سے بھی کام لیں گے۔ یہ ساری خوش گوار تبدیلیاں ان کے ذہنی ارتقا، اور شعری نشو و نما پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کی شاعری حسرت، فانی، اصغر اور جگر جیسے شاعروں کے سائے میں پروان چڑھے اور یگانہ اور فراق جیسے شاعروں کے بڑھتے پھیلتے اثرات کے دوران پختگی کے مرحلے طے کرنے کے باوجود ان شعراء کے مضامین و موضوعات، ان کے اسلوب اور ان کے لب و لہجہ سے اپنی دُوری برقرار رکھتی نظر آتی ہے۔ مثلاً نشور کے یہ اشعار پڑھتے وقت سوچیے کہ آپ کو اُردو کے دوسرے کون سے شعراء یاد آتے ہیں ؎

پیراہنِ رنگیں ہے شعلہ سا نکلتا ہے
معصوم ہے کیا جانے دامن کہیں جلتا ہے

ہے شام ابھی کیا ہے بہکی ہوئی باتیں ہیں
کچھ رات ڈھلے ساقی میخانہ سنبھلتا ہے
عنوانِ ترقی ہے یہ تیرہ فضائی بھی
کچھ گرد بھی اُٹھتی ہے جب قافلہ چلتا ہے
اک سحر شبستاں ہے یہ فنِ جہاں رانی
دُنیا ہے کہ سوتی ہے جادو ہے کہ چلتا ہے
افلاس کے آنسو سے طوفاں بھی لرزتے ہیں
شعلوں کا جگر گویا شبنم سے دہلتا ہے

شاید کہ نظر پہنچے تیری غمِ انساں تک
اے صبحِ چمن پرور چل شامِ غریباں تک

ہزار شمع فروزاں ہو روشنی کے لئے
نظر نہیں تو اندھیرا ہے آدمی کے لئے

تسخیرِ جہاں اکثر تہذیبِ جنوں میں ہے
عالم شکنی چاہے کر خود شکنی پہلے

سرشارِ جوانی کا عالم شانوں پہ لٹیں حلقوں والی
جیسے کہ چڑھے ساون میں اٹھے بھادوں کی گھٹا کالی کالی

کتنے بادل بھٹک گئے اور کتنی برکھا سوکھ گئی
دُنیا ہے وہ ریت کا رستہ ساون بھادوں پیاسا جائے

ہر ذرۂ خاکی کو کرن ہم نے بنایا
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا
تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

ہو لئے ہم زندگی کے ساتھ ساتھ
یہ نہیں پوچھا کہاں سے آئی ہے

وہ زندہ ہے جو بہے موجِ وقت کی رَو میں
وہ زندہ تر ہے جو طوفاں میں تیرنا جانے
انجامِ وفا یہ ہے جس نے بھی محبت میں
مرنے کی دُعا مانگی جینے کی سزا پائی

سلیقہ جن کو ہوتا ہے غمِ دوراں میں جینے کا
وہ یوں شیشے کو ہر پتھر سے ٹکرایا نہیں کرتے

مرا دل نہ تھا الم آشنا کہ تری ادا پہ نظر پڑی
وہ نہ جانے کون سا وقت تھا کہ بنائے خونِ جگر پڑی
جسے چاہے مالکِ رنگ و بُو اسے بے رُخی میں نواز دے
میں اِدھر تھا منتظرِ کرم، وہ نگاہِ ناز اُدھر پڑی
تجھے کیا ہوئی ہے قدرِ ملال کی تو ہے نارسیدۂ زندگی
جو بہت پھرے ہیں گلی گلی تو جبیں پہ گردِ سفر پڑی
جو حُدودِ صبح میں رُک گیا، اُسے اتفاقِ سحر کہو
میں وہی مسافرِ شام ہوں مرے راستے میں سحر پڑی
جو ورودِ اہلِ سخن ہوا، تو ہجومِ شام اُدھر بڑھا
وہ غزل نشورؔ کی ہو گئی، نئی محفلوں میں خبر پڑی

نشورؔ واحدی کے یہ اشعار اور اس طرح کے اشعار نہ صرف واضح انفرادیت کے حامل ہیں بلکہ ان کی انفرادیت نہایت دلآویز بھی ہے۔ ان کے اشعار پر دوسروں کے اشعار کی چھوٹ پڑتی نظر نہیں آتی نشورؔ نے اپنے کو دوسروں سے صرف مختلف ہونا کبھی کافی نہیں سمجھا، اپنے آپ کو دلکش بنانا بھی ضروری سمجھا۔ ان کی رنگین بیانی اور نغمہ سامانی غالباً اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ شاعری صرف رنگین بیانی اور نغمہ سامانی کا نام نہیں لیکن اگر کسی کی شاعری میں یہ دو عناصر بھی شامل ہو جائیں تو شاعری بڑی حد تک حسین بن جاتی ہے اور لذیذ بھی۔

نشور کی شاعری ان دو خوبصورت عناصر سے تو مالامال ہے ہی وہ مضامین و موضوعات کے اعتبار سے بھی تہی دامن یا کم مایہ نہیں ہے وہ نہ صرف کہنے کا فن جانتے ہیں بلکہ ان کے پاس کہنے کی باتیں بھی ہیں وہ بڑے لطیف احساسات اور حسین مشاہدات کے مالک ہیں، ان کے احساسات شاعرانہ اور مشاہدات بصیرت مندانہ ہیں۔ وہ اپنے آپ کو شاعر فطرت کہتے ہیں جو کسی موضوع کا پابند نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے لیے بھی اتنا ضروری ہے کہ وہ واقعات زندگی سے بالکل بے نیاز بھی نہ ہو ؎

نہیں ہے شاعرِ فطرت پہ کوئی قید نشور
مگر کبھی تو نظر سوئے واقعات کرے

اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ نشور رندِ مشرب رہے ہوں یا نہ رہے ہوں، رندمزاج ضرور تھے مگر اپنی رندمزاجی کے باوجود انھوں نے زندگی کو صرف سرمستی اور سرشاری سے عبارت نہیں جانا۔ وہ صرف مسرت اور لذت کے جویا نہ تھے، رنج و غم کا عرفان بھی رکھتے تھے۔ مسرت زندگی کی سب سے بڑی آرزو سہی لیکن غم زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے وہ غم کے طلب گار نہ سہی لیکن غم کے طرف دار ضرور تھے ؎

جسے غم سے کچھ ملا ہے وہی ہم نفس ہے میرا
جو شکستہ ساز دل ہو تو سُنو مرا ترنم

نشور کی شاعری کے ترنم سے وہی لوگ زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو غمِ حیات سے شناسائی رکھتے ہیں وہ فانی کی طرح غم پرست نہ تھے لیکن غم شناس ضرور تھے۔ غم شناس ہونے کے معنی صرف ذاتی طور پر غم دیدہ ہونے کے نہیں بلکہ ان غموں کی پہچان رکھنے کے ہیں جو نوعِ انسان کا مقدر ہیں۔ مثلاً ان غموں میں ایک غم انسان کی عصری تنہائی ہے جس کا خوبصورت اظہار نشور کے اس شعر میں ملتا ہے ؎

زندگی ایک ہجوم گزراں ہے لیکن
آدمی اپنی جگہ عالمِ صد تنہائی

یا انسانی صورتِ حال (Human Prepicament) کا ایک المناک پہلو یہ ہے کہ پانے سے زیادہ کھونا اور جیتنے سے زیادہ ہارنا انسان کا مقدر ہے۔

نشور کہتے ہیں ؎

بتاؤں کیا تجھے حاصل فریبِ زندگانی کو
جو پایا تھا وہ کھو آئے جو جیتا تھا وہ ہار آئے

ان کی شاعری میں انسانی زندگی کے بعض تمدنی غموں کا اظہار بھی بڑے سلیقے سے ہوا ہے۔ مثلاً ؎

نئی دُنیا مجسّم دل کشی معلوم ہوتی ہے
مگر اس حسن میں دل کی کمی معلوم ہوتی ہے

محفلِ دُنیا میں کیوں بے رونق پاتا ہوں میں
زندگی خالی ہے اور دُنیا بھری پاتا ہوں میں

میں نے برسوں پہلے اپنے ایک مضمون میں نشور پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ" وہ زندگی کی تابناکیوں کو دیکھتے وقت اس کی تاریکیوں کو فراموش نہیں کرتے۔ زندگی کی انجمن آرائیوں کا نظارہ کرتے وقت آدمی کی عصری تنہائی سے غافل نہیں ہو پاتے۔ فطرت کے حسین مناظر دیکھتے وقت انسان کے دکھ کو بھول نہیں پاتے۔ ان کی بصیرت آبادی میں چھپے ہوئے ویرانے، فتح میں ملی ہوئی شکست اور تہذیب کے عروج میں انسانی اقدار کے زوال کو دیکھنے سے باز نہیں آتی"۔

میں نے اسی مضمون میں نشور کے متعلق یہ بھی لکھا تھا کہ :—

"ان کی متعدد زمینوں پر ان کے ممتاز معاصرین نے غزلیں کہی ہیں۔ ان کی غزلیں اپنے اندر دھیمی موسیقی رکھتی ہیں جس میں ایک قسم کی غمناکی پائی جاتی ہے، وہ اپنی غزلوں میں انسانی صورتِ حال پر تنقید کر رہے ہوں یا انسان کو کسی قسم کی تلقین، لیکن تغزل کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

ان کی شاعری میں کسی قسم کی خشونت اور رعونت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی آواز دردناک نہیں لیکن دردمندانہ ضرور ہے۔ انھوں نے تشبیہاتی اشعار کہنے میں بھی خاص مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی بعض غزلیں شروع سے آخر تک تشبیہاتی ہیں اور اپنے لطف و لذت کے اعتبار سے بالکل منفرد ہیں۔ انکی

تشبیہات کی انفرادیت ہندستانی ماحول، موسم اور مناظر
سے ماخوذ ہونے میں پوشیدہ ہے۔"

ں احمد سرور نے نشور کے مجموعۂ کلام "فروغِ جام" (۱۹۵۹ء) کے
یش لفظ میں لکھا تھا کہ :

" نشور واحدی پورب دیس کے رہنے والے ہیں۔ ان کے
زاج میں پورب کے دیہات کی معصومیت ہے۔ ان کی آنکھوں
یں وہ اُداسی ہے جو شہروں کی تاجرانہ زندگی کے ہر رُخ کو دیکھ
تی ہے۔"

پورب دیس سے مُراد یو۔پی کا مشرقی حصہ ہے جو لسانی
ور تہذیبی اعتبار سے پسماندہ علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان
لاقوں سے صوبۂ بہار کی جغرافیائی سرحدیں بھی ملی ہوئی ہیں۔ ان علاقوں
کی لسانی اور تہذیبی کمتری اپنی جگہ، لیکن ان علاقوں میں بعض ایسی
ہستیاں بھی ہیں جو شعر وادب میں رنگ لائی ہیں اگر نشور واحدی،
جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی ان علاقوں کے نہ ہوتے تو دیسے
شاعر بھی نہ ہوتے جیسے کہ وہ ہوئے۔

نشور واحدی خاصے پُرگو شاعر تھے، ان کے کلام کے کئی
مجموعوں میں غزلوں کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی ہیں۔ نظموں میں رومانی
انقلابی اور قومی ہر سطح کی نظمیں ہیں۔ انھوں نے کچھ آزاد نظمیں بھی لکھیں
لیکن نظموں میں انھیں ایک نظم کی حد تک بھی ویسی کامیابی حاصل
نہ ہو سکی جیسی مثال کے طور پر جمیل مظہری یا مجاز وغیرہ کو حاصل ہوئی۔
جمیل مظہری اپنی نظم "ڈرو خدا سے ڈرو" اور مجاز اپنی نظم "آوارہ"
کے سہارے زندہ رہ سکتے ہیں لیکن نشور کے پاس ایسی کوئی نظم
نہیں ہے۔ البتہ ان کے یہاں بعض نظموں کے ٹکڑے ذہن سے پیوست
ہو کر رہ جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ان کی غزلیں یقیناً انھیں زندہ رکھیں گی، چونکہ ان کی شاعری
خیال و بیان کی تہ داریوں سے خالی نہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات
کی ہے کہ ان کی غزلوں کی طرف بار بار لوٹنا چاہیے تاکہ خیال و بیان کے
نئے گوشے دریافت ہوتے رہیں۔

□□

پروانہ اور اقبال (حواشی) ص۱ کا بقیہ

۱۰ ج۔ مصرعۂ اولیٰ کا قافیہ "بنا" غلط ہے۔ انھوں نے مصرع
یوں لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔
مجھ میں وہ جادو ہے رُوحوں کو بنا سکتا ہوں میں

۱۱ ج۔ بنوا لے

۱۲ فارسی کا مشہور شاعر فردوسی طوسی، طوسی سے فارسی کا مشہور
فلاسفر نصیر الدین طوسی بھی ہو سکتا ہے۔

۱۳ امام رازی

۱۴ مشہور عالم حکیم ابو علی سینا

۱۵ فارسی کے مشہور شاعر

۱۶ امام محمد غزالی ۱۷ ج۔ ڈھونڈتی ۱۸ ج۔ ہمّت

۱۹ یہ خیر نال پنجابی گل (محاورہ) ہے۔ (ایڈیٹر) ج میں مصرع
یوں ہے ؎ ہاں جیسے چھونا ہو دامانِ ثریّا کو کبھی

۲۰ ج ؎ آرزو ہے دل کو بھی کہنا کوئی دشوار ہے
کام خاموشی سے تجھ کو اے لبِ اظہار کیا

۲۱ پروانہ۔ یا سہو کاتب

۲۲ ج۔ نکل آئے ۲۳ ج۔ شوخی

۲۴ پروانہ۔ ندارد ۲۵ ج۔ شوخی

۲۶ ج میں یہ شعر "ہاں رگِ ہمّت کو اپنی ۔۔۔۔ الخ کے بعد ہے۔

۲۷ ج۔ کھا ۲۸ ج۔ ہمی ۲۹ ج۔ محبوب

۳۰ پروانہ۔ پھولا، سہو کتابت

۳۱ ج۔ ہو تھیں ۳۲ ج۔ پائمالی ۳۳ ج۔ پہلے

۳۴ ج۔ یو کانَ بالسّین غلط ہے۔ صحیح "بالصین" ہے۔ صین
چین کو کہتے ہیں۔

۳۵ حضرت علیؑ کی طرف اشارہ ہے۔ علی اللہ کے ناموں میں سے ایک ہے
مثلاً یا علیُّ یا عظیمُ۔

۳۶ علیؑ کی تعریف میں مشہور حدیثِ رسولؐ ہے۔ اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ
وَ عَلِیٌّ بَابُہَا یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازہ ہیں۔

محمد مصباح اللہ
اے ۲۵/۲۶ آغا حسن لین۔ پلاوارم۔ مدراس

شاطر مدراسی کی شاعری

"اعجازِ عشق" کے آئینے میں

ایک وقت وہ بھی تھا کہ جنوبی ہندستان کے علاقۂ مدراس میں ارکاٹ اسلامی تہذیب و تمدن و ثقافت اور علوم و فنون کا مرکز تھا ارکاٹ میں جنگ کے خاتمے کے بعد نوابینِ ارکاٹ نے اپنا دربار شہر مدراس کے "امیر محل" میں قائم کرکے اپنی بود و باش وہیں اختیار کرلی ۔

انیسویں صدی کے آغاز ہی سے شہر مدراس میں فارسی عربی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی ترویج، توسیع اور اشاعت میں نوابینِ ارکاٹ کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ خاندانِ والاجاہ کے دربار میں حاکموں کی سرپرستی و نگرانی میں اُردو زبان لاڈلی بیٹی کی طرح ناز و نعم سے پروان چڑھ رہی تھی ۔ اس خاندان کے اکثر و بیشتر افراد شاعر تھے۔ زبان و ادب سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ مردوں کے علاوہ پردہ نشین خواتین بھی شعر و شاعری کا پاکیزہ ذوق رکھتی تھیں، اور ان میں سے بعض تعلیم یافتہ عورتیں اعلا پائے کی شاعرہ تھیں۔ اُردو زبان کو فروغ دینے کی خاطر درباری مشاعروں کا انعقاد وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا تھا۔ مشاعرہ کی روداد اور کلام کی اشاعت گلدستہ کی شکل میں ہوا کرتی تھی جس کے مطالعہ سے اُردو داں طبقہ مستفید ہوا کرتا تھا۔

اسی خاندان والاجاہی کے ایک مایہ ناز سپوت شاطر مدراسی نے فنِ شاعری میں کمال پیدا کیا اور اپنے دور میں کافی شہرت حاصل کی۔ آپ کا حقیقی نام عبدالرحمن خاں تھا اور شاطر تخلص۔

شاطر کی پیدائش ۱۸۷۷ء میں شہر مدراس میں ہوئی۔ مسلمانوں کے دستور کے مطابق آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر قرآن مجید و فقہ سے ہوئی۔ فارسی اور اُردو کی ابتدائی کتابیں ختم کرنے کے بعد جدید علوم کی تحصیل کی خاطر آپ کو اسکول میں داخل کرایا گیا آپ نے انگریزی کے علاوہ دیگر مروجہ علوم سیکھے۔ مدراس یونیورسٹی کے ممتاز گریجویٹ ہونے کا شرف حاصل کیا۔ آپ نے اپنے تعلیمی دور میں مشرقی و مغربی علوم و فنون کا عمیق مطالعہ کیا ۔ چنانچہ ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "اعجازِ عشق" کے اوراق شاہد ہیں کہ وہ قدیم و جدید علوم و فنون، مذہبی تصورات و عقائد، مسائل و تصوف فلسفہ اور اس کی ماہیت، مفکرین کے نظریات، دیگر اقوام کے آداب زندگی و خیالات، سائنسی مسائل وغیرہ سے بخوبی واقف تھے اور ان سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

گو کہ شاطر کا مولد مدراس تھا۔ انھوں نے دو چار سال ریاست حیدرآباد (دکن) میں بسر کیے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۴، ۲۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہاں اس وقت فصیح الملک داغ دہلوی، مستند تاریخ داں عبدالحلیم شرر لکھنوی اور مولانا گرامی وغیرہ علمی مجلسوں کے رُوحِ رواں تھے۔ ان کی شاعری اور ان کی زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت کا چرچا تھا۔ ہندستان بھر میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔ حیدرآباد کے دوران قیام میں شاطر کو وہاں کی بزم سخن اور محفل علمی میں شرکت

کرنے کے وافر مواقع ملے۔ ان اساتذۂ باکمال کی صحبت سے فیض یاب ہوتے ہوئے انھوں نے اپنے ذوقِ ادب اور مذاقِ سخن کو سرشار کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔

شاطر شہر مدراس میں حکومتِ برطانیہ کے دارالترجمہ میں مترجم اعلا یعنی چیف ٹرانسلیٹر کے منصب پر فائز تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں نواب صاحب ارکاٹ (مقیم امیر محل) کے سکریٹری اور مشیرِ خاص ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ سرکاری احکام، فرامین و اعلانات وغیرہ کا بامحاورہ ترجمہ اس خوبی سے کیا کرتے تھے کہ ماخذ کی عبارت کا مفہوم اور مطلب بعینہٖ ادا ہوجاتا تھا اور ترجمہ میں کمی بیشی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ شاطر نے جہاں اپنے منصبی فرائض اور ذمہ داریوں کو بحسن خوبی ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں برتی وہیں زبان و ادب کی شان دار ترویج و اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ چنانچہ ان کی بے لوث اور گرانقدر خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی علمی قابلیت اور اعلا صلاحیت کے اعتراف میں برٹش گورنمنٹ نے انھیں شمس العلماء کا خطاب دیا اور قوم نے ان کی بے مثال زبان دانی کے پیشِ نظر ان کو "لسان الحکماء" کے لقب سے نوازا۔

شاطر فطری شاعر تھے، شاعری کے رموز سے بخوبی واقف تھے ان کا کلام حکیمانہ اور فلسفیانہ اشعار کا وہ دل کش مرقع ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے شاعری کی صرف چند خاص اصناف، قطعات، رباعیات اور قصائد ہی میں طبع آزمائی کی ہے دیگر اصناف میں جو کچھ کہا ہے اس کا شمار آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

"اعجازِ عشق" شاطر مدراسی کی واحد یادگار ہے۔ انھوں نے کم کہا ہے مگر جو کچھ اور جتنا کہا ہے وہ معیاری ہے۔ ان کی شاعری کی خصوصیات کا ذکر سید سلیمان ندوی مرحوم نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

"(شاطر) جدید سائنس اور فلسفہ
کے مسائل کو اسلامی الٰہیات سے
تطبیق دیتے تھے۔ زبان سخت تھی
اور مشکل الفاظ کے استعمال سے ان
کو پرہیز نہ تھا"۔ [1]

تصنیف "اعجازِ عشق" سنہ ۱۹۰۴ء میں پہلی بار منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی تو اس کی اشاعت سے اقلیمِ سخن میں دھوم مچ گئی۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کا خیال ہے کہ:

"اعجازِ عشق ایک طویل رائیہ قصیدہ ہے جس میں
جدید و قدیم فلسفیانہ مسائل سے الٰہیات اسلامیہ
کی تفسیر و تشریح کی گئی ہے"۔ [2]

پروفیسر محبوب پاشا محبوب [3] مدراسی اس لاجواب مجموعۂ کلام کے بارے میں فرماتے ہیں:-

"شاطر مدراسی نے اپنی زندگی بھر کے
مطالعے کا نچوڑ دنیا کے سامنے رکھ دیا
ہے"۔ [4]

اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاطر مدراسی مرحوم نے اپنے گہرے مشاہدات اور ٹھوس تجربات کو اپنے عمیق مطالعے کی روشنی میں زندگی کے حقائق و رموز فلسفہ و سائنس اور اسلامی الٰہیات کے ساتھ ہم آہنگ کرکے اپنے لطیف خیالات کی ترجمانی نہایت کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ اس لحاظ سے "اعجازِ عشق" غالباً اپنے طرز کی پہلی تصنیف ہے۔

جب یہ شعری مجموعہ منظرِ عام پر آیا تو برصغیر ہند کے چپّے چپّے میں اس کی غیر معمولی صفات کے تذکرے اور چرچے ہونے لگے۔ اس نظم کا دل کش، انوکھا اور دل آویز انداز اربابِ بصیرت کو اس قدر پسند آیا کہ اس عہد کے اکثر و بیشتر سخن فہم اکابر دانش وروں نے شاطر مدراسی کو خراجِ تحسین سے نوازا۔ ان کے علاوہ جن مقتدر ادیبوں اور مشاہیر شاعروں نے اس تصنیف کی جی کھول کر توصیف و تحسین کی تھی اور صاحبِ کتاب کی پرخلوص ستائش کی تھی ان میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الٰہ آبادی، پروفیسر عبدالغفور شہباز، شاد عظیم آبادی، جلال لکھنوی، سید سلیمان ندوی، علامہ

اقبال، مولوی ذکاء اللہ، نواب عماد الملک، امجد علی اشہر، نظم طباطبائی، مولانا گرامی اور مولانا شبلی نعمانی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی آراء بھی اس گوہر آبدار کی شہرت کو چار چاند لگانے کے لئے کافی ہیں۔

شاطر مدراسی نے اپنی اس طویل نظم میں جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا جا چکا ہے، مختلف علوم و فنون کے مسائل فلسفیوں کے تصورات و نظریات، حیات و ممات کے مسائل، سائنس دانوں کے نظریات اور سائنسی کلیات و ضوابط، مسائل تصوف اور اخلاقیات وغیرہ کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور رموزِ زندگی کے فلسفیانہ نکات کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اپنے خیالات کی توضیح کی خاطر انھوں نے صنعت تلمیح کا سہارا بجا بجا لیا ہے اور تلمیحات کی روشنی میں بے شمار مسائل اور امور بیان کیے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی کے قریب رہنے والوں میں ایک شاطر مدراسی بھی تھے جن سے مولانا کو محبت حاصل تھی۔ "اعجازِ عشق" کی اشاعت کے وقت مولانا شبلی نے ایک مختصر تقریظ میں اس قصیدہ کے بصیرت افروز نکات کو سراہتے ہوئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اس جامع و مانع تقریظ کی عبارت کا مختصر اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے اس کے مطالعہ سے "اعجازِ عشق" کی عظمت، اس کے روشن پہلوؤں اور اس کے بلند معیار کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے:-

"آپ (شاطر مدراسی) کا قصیدہ میں نے دیکھا اس سے پہلے آپ کی مختلف نظمیں نظر افروز ہوئی تھیں میں مدت سے آپ کی قادر الکلامی اور خوش فکری کا معترف ہوں۔ آپ کے کلام میں فلسفیانہ خیالات جس خوبی اور برجستگی سے ادا ہوتے ہیں اس کی مثالیں اردو میں کم ملتی ہیں۔" ش

شاعر خوش نوا، تاجدار "تاریخ اسلام" علامہ شبلی نعمانی کے نقل بالا ارشاد کی روشنی میں اعجازِ عشق کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بے محل اٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلقِ لیل و نہار

عشق کی اعجاز نمائیوں اور حسن کی دلربائیوں کی توضیح مختلف زاویوں سے بے شمار اشعار میں کی گئی ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

عشق کا شعلہ جب اٹھا راکھ ہو کر رہ گئے
کیا ہوا پردے اگر تھے بیچ میں ستر ہزار

ہم دبے جاتے تھے کچلے جاتے تھے اللہ رے بوجھ
عشق چلانے لگا بارِ امانت کو اتار

عشق ہے حسن آفریں یا حسن ہے عشق آفریں
آئینے کو بھی خبر اس کی نہیں ہے زینہار

دونوں عالم میں ہے حسن و عشق ہی کا غلغلہ
عقل کہتے ہیں جسے دونوں کی ہے خدمت گزار

گرمیٔ ہنگامہ دنیا و دیں ہے تجھ سے عشق
سب ترے ذرے ہیں تو ہے آفتابِ نوربار

بات میری مانو میں ہوں رازدارِ حسن و عشق
دونوں عالم کے حقائق ہیں مجھی پر آشکار

اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق ارشاد ہے ؎

ہے وہی ظاہر وہی باطن، وہی سب پر محیط
انفس و آفاق سے ہیں اس کے آیات آشکار

عشق کہیئے، نور کہیئے یا اسے کہیئے وجود!
ذات کو تیری کریں کس لفظ سے تعبیر یار

وحدت و کثرت کے بارے میں یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

ہیں خطِ توام کے صفحے دو، مگر مضمون ایک
عبد و رب گر جمع ہوں ہو جائے وحدت آشکار

انسان کے وجود و فنا کے متعلق ارشاد ہے ؎

کون ہیں، آئے کہاں سے کس طرف جاتے ہیں ہم
کیجئے اس راز کو اے موجِ بُوں کر آشکار

خیر و شر کا فلسفہ ملاحظہ فرمائیں ؎

گو بظاہر شر نظر آتا ہے باطن میں ہے خیر
حکمتِ حق رکھ چکی ہے، خیر کا شر پر مدار

جب فرشتوں نے کہا سفاک و مفسد ہے بشر
حق نے فرمایا کہ شر ہے خیر کا آئینہ دار

فنا اور بقا کے بارے میں لکھا ہے ؎

جو فنا کو مانتا ہے اس کو ملتی ہے بقا
ہو اگر اس کو یقینِ ہستیِ پروردگار

فلسفہ اور سائنس کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، ملاحظہ ہو ؎

فلسفہ کو اپنے لایعنی دلائل پر ہے ناز
سینس کو ہے اپنے حسّی تجربوں پر افتخار

سائنسی مسائل کی توضیح ان اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے ؎

شیشۂ عکاس کو جو شے نظر آتی نہیں
سینس کے نزدیک ہے اس کا توہم پر مدار

آدمی مانا غلط بیں ہے مگر ہے حسن بیں!
شیشۂ عکاس لاکھوں اس کی آنکھوں پر نثار

روشنی کیا چیز ہے گرمی ہے کیا شے مجھ سے سُن
یہ جنونِ عشقِ شاطرؔ، وہ جنونِ حسنِ یار

حیات و ممات کے بارے میں لکھا ہے ؎

انتظارِ مرگ میں آنے لگا ہے اب مزہ
ہم ہوں یا رب اور قیامت تک یہی ہو انتظار

زیست سے بیزار ہیں مرنے سے گھبراتا ہے دل
تیسرا عالم کہاں سے لائیں اے پروردگار!

شاعری کے تعلق سے جو کچھ کہا ہے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں ؎

نغمے شاعر کے پرِ پرواز ہیں دل کے لیے
وہ دکھاتا ہے جھلک حسنِ ازل کی بار بار

شاعری میں جان پڑ جاتی ہے اسکے فیض سے
بابِ جذب و علم پر کیونکر نہ ہوں شاعر نثار

درج ذیل اشعار کا مطالعہ بھی خالی از لطف نہ ہوگا ؎

شاید آتی ہے بلا کوئی الٰہی خیر ہو
ورنہ ہم سے بے سبب کیوں ہے زمانہ سازگار

دوست مرنے کی دُعا کرتے ہیں دشمن زیست کی
اے فلک دیکھا کبھی ایسا کسی کا حالِ زار

کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ مانگیں کیا دُعا
دل میں کچھ ہے لب پہ کچھ ہے ہم ہیں ڈانواڈول یار

ذیل کے اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ کون ہوگا جو ان اشعار کو سننے کے بعد کمالِ سخن کی داد نہ دے گا ؎

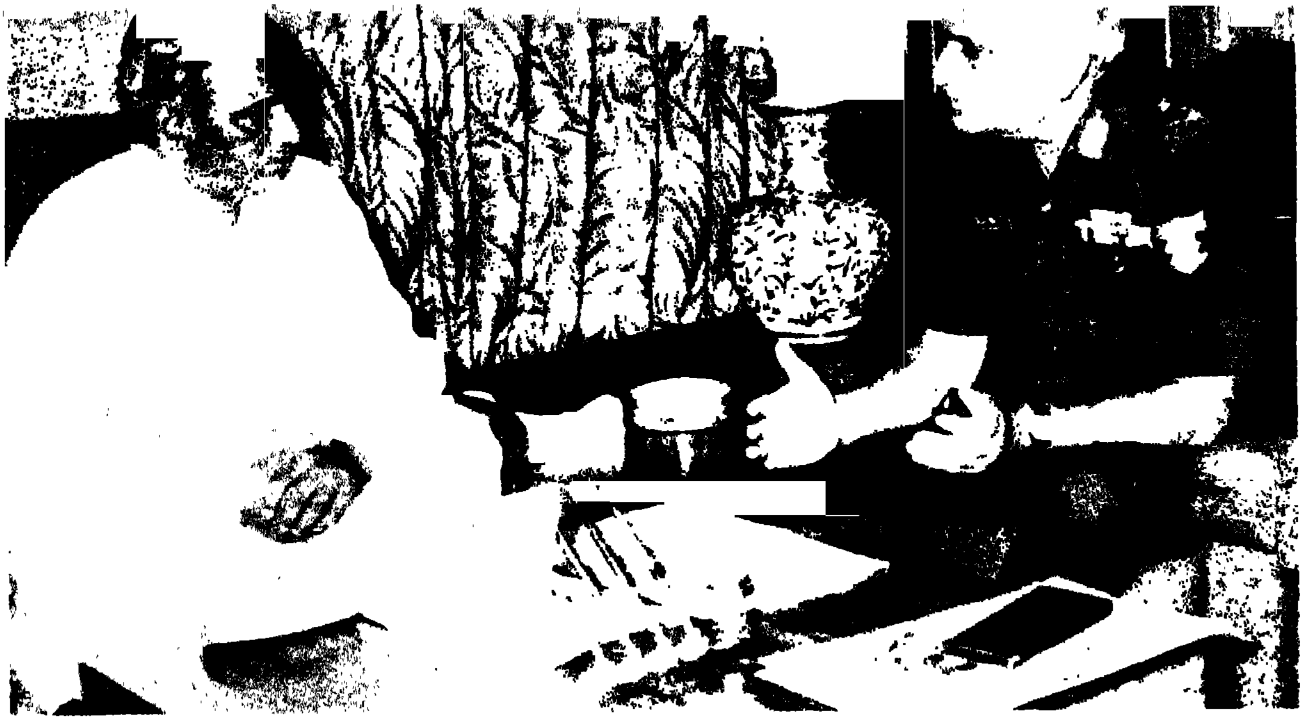
گورکن کے چھوٹے بچے مر رہے ہیں بھوک سے
کوئی مر جائے تو یہ بھی جی جائیں اے پروردگار

کچھ نہ کچھ کام آتے ہیں لاشے بھی حیوانات کے
خود غرض انساں کی میت دوشِ یاراں پہ ہے بار

جانِ جاں، روحِ رواں، ایمانِ ایماں عشق ہے
جی فدا، جاں اس پہ قرباں دین و دل اس پر نثار

نقلِ بالا اشعار کے مطالعہ سے قارئین کرام کو شاطرؔ مدراسی مرحوم کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ موصوف کا کلام بہ ظاہر مختصر ہے لیکن حقیقت میں مفہوم و مطلب اور شرح کے اعتبار سے

(باقی ص ۴۳ پر)



شری کلیان سنگھ ۱۶ اگست ۱۹۹۱ء کو لکھنؤ انیکسی میں لیفٹننٹ [illegible]
[illegible] فیسر کمانڈ ان چیف سنٹرل کمانڈ گفتگو کرتے ہوئے۔

[illegible] کلیان سنگھ ۲۴ اگست ۱۹۹۱ء کو اٹاوہ میں ایک جلسۂ عام [illegible]





پردیش شری بی ستیہ نرائن ریڈی کو، ۲۱؍اگست ۱۹۹۱ء کو راج بھون لکھنؤ میں ان
سال گرہ پر وزیر اعلا شری کلیان سنگھ مبارکباد دیتے ہوئے۔

شری کلیان سنگھ ۱۵؍اگست ۱۹۹۱ء کو ودھان بھون پر پرچم کشائی کے
جلسے کو خطاب کرتے ہوئے

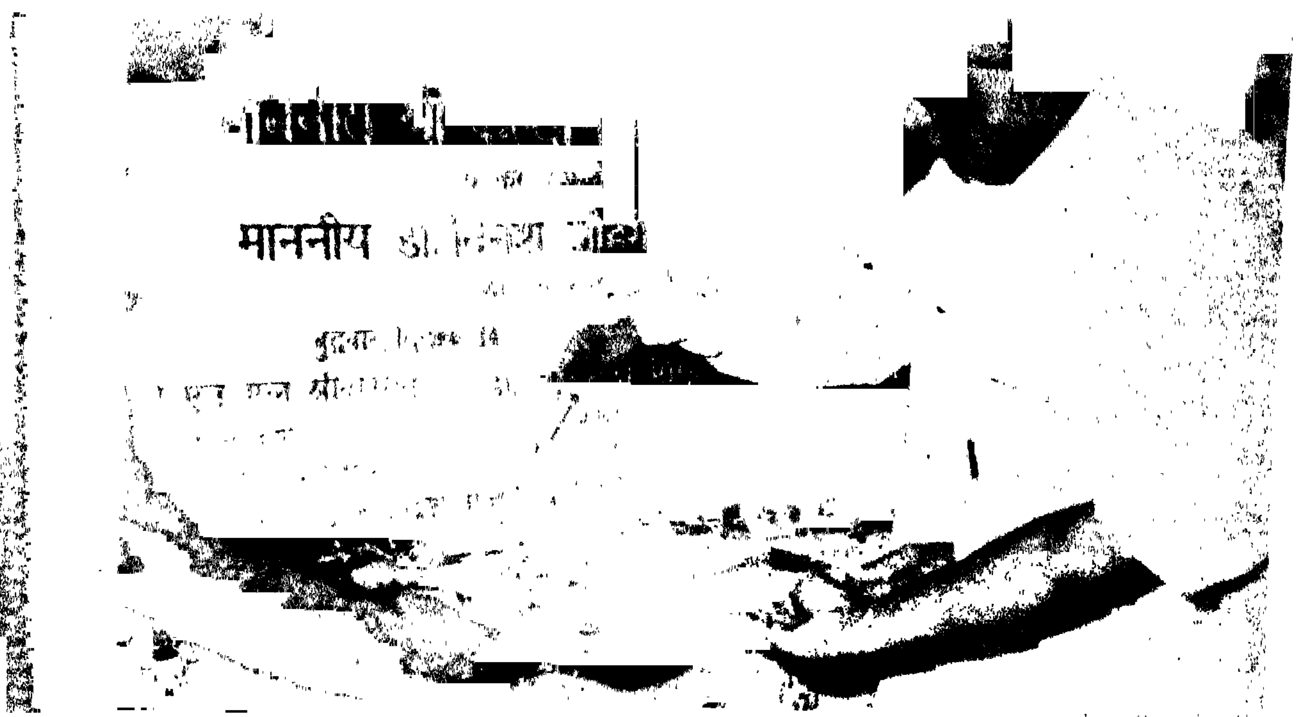




شری کلیان سنگھ ۲۵ اگست ۱۹۹۱ء کو لکھنؤ میں رکشا بندھن کے موقع پر راکھی بندھواتے ہوئے۔

شری بی ستیہ نرائن ریڈی کو، راج بھون میں ۲۰ اگست ۱۹۹۱ء کو ودھان سبھا کے [illegible] شری کیسری ناتھ ترپاٹھی گورنر کے خطبے پر ودھان سبھا میں پاس شدہ شکریہ کی تجویز پیش کرتے ہوئے۔





وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ، شیاما پرشاد مکھرجی اسپتال لکھنؤ کی جدید عمارت کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے۔

(دائیں سے بائیں) پروفیسر سید محمود الحسن صدر شعبۂ اردو، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر ... اوستھی وائس چانسلر اور پروفیسر سید شبیہ الحسن۔



تلاش

وہ ایک کرن، وہ ایک کرن
کھو آئے اسے کن راہوں میں ؟
اب پیکر پیکر، بدن بدن
کیا ڈھونڈھتے پھرتے ہو پگلے !

کیا ڈھونڈھتے ہو چتون چتون
پلکوں کے خنک سائے سائے
ہونٹوں کے ترنم زاروں میں
رنگوں کی مدھر جھنکاروں میں
کیا ڈھونڈھتے پھرتے ہو پگلے !

یہ رُوپ نگر ہے، رُوپ نگر
کیا روپ نگر میں پاؤ گے
ہر پیکرِ شبنم شعلہ ہے
چھوتے ہی جیسے جل جاؤ گے

کس واسطے اتنے گم سُم سے
تم دھیان لگائے بیٹھے ہو
یہ آرتی اپنی پلکوں پر
کیا ہے جو سجائے بیٹھے ہو
کیا ہے جو بُتوں کی چاہت میں
یوں جان گنوائے بیٹھے ہو
اک بُت ہے تمہارے اندر بھی
سوتا ہے اگر وہ چونک اُٹھا
تو ٹوٹ گریں گے چھن چھن چھن
سب شیش محل ارمانوں کے

چاہیں کہ کسی میں کھو جائیں
کھو جائیں کہ پھر ہم ڈھل جائیں
لیکن یہ ہمارا اپنا بدن
دیوار سا جیسے بن بن کر
خود بیچ میں آ ہی جاتا ہے

کیا کیجیے سعیِ ربطِ نہاں
ہر طرح اکارت جاتی ہے
کرنوں کے سفینے چکرا کر
گرداب میں گم ہو جاتے ہیں
ظلمات کے پھیلے ساگر کی
گہرائیوں میں سو جاتے ہیں
طوفاں ہیں کہ ہنستے رہتے ہیں
جیون ہے کہ بہتا رہتا ہے

وہ ایک کرن، وہ ایک کرن
کھو آئے اسے کن راہوں میں ؟
اب پیکر پیکر، بدن بدن
کیا ڈھونڈھتے پھرتے ہو پگلے !

عرفیؔ آفاقی
سی ۲-۱ ریلوے کالونی
بادشاہ نگر لکھنؤ

رُوح کے زخم

حادثے یوں تو ہوا کرتے ہیں
کتنے ہی زخم لگا کرتے ہیں
جن سے گھائل ہو پیکرِ احساس
ایسے خنجر بھی چلا کرتے ہیں

جسم کے زخم تو بھر جاتے ہیں
رُوح کے زخم ہرے رہتے ہیں
سُوکھ جاتی ہے چشمِ نم لیکن
دل پہ بادل سے گھرے رہتے ہیں

ہر و سے سرد ہوا جاڑے کی
اتنی تکلیف نہیں دیتی ہے
بے وفائی سے دوستوں کی نفیسؔ
جتنی تکلیف دل کو ہوتی ہے

ڈاکٹر معراج نفیس
شعبہ سماجیات
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

مجاز کی زندگی کا ایک اہم موڑ

اردو میں ایسے تو نہ جانے کتنے شاعر اور ادیب ہیں، جنھوں نے اپنی شاعری اور شخصیت دونوں کے حوالوں سے بحث و مباحثہ، تضاد اور تنازعات کے سلسلے اپنی زندگی میں بھی چھیڑ رکھے تھے اور موت کے بعد بھی یہ سلسلہ برقرار رہا۔ لیکن مجاز کی طرح شاید ہی کوئی ہو جو اتنے کم سرمایۂ حیات اور سرمایۂ شاعری کے باوجود اپنی شاعری اور اس سے زیادہ شخصیت کے لیے ایسے ایسے دلچسپ متضاد طربناک اور افسوسناک واقعات چھوڑے ہوں جن کا ذکر آج ان کی موت کے تقریباً ۳۶ سال گزر جانے کے باوجود کہیں دکھ کے ساتھ اور کہیں لطف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر ایک طرف ان کو محض لطیفہ گو اور بذلہ سنج، شرابی اور دیوانہ قسم کا انسان کہا گیا تو دوسری طرف انھیں اردو شاعری کا کیٹس اور صحیح معنوں میں ترقی پسند شاعر کہا گیا۔

مجاز ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں انتقال کر گئے محض چوالیس سال میں اتنی نیک نامی اور بدنامی اردو کے کسی شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ ان کی خوش نصیبی ہے اور بدنصیبی بھی۔ مجاز پر اب تک جتنا بھی لکھا گیا ہے اس میں ان کی شخصیت، بذلہ سنجی اور آوارگی و شراب نوشی پر زیادہ مضامین ہیں۔ ان کے ساتھ گزاری ہوئی شامیں، صحبتیں، لطیفے، مشاعرے اور ان سب کے درمیان گنگناتی، مسکراتی، لڑکھڑاتی، بہکتی مجاز کی شخصیت، اور آگے بڑھے تو ان سب کی روشنی میں ان کی شاعری ـــــ مجاز کے دوستوں، ہم جماعتوں ہم عصروں نے ان پر لکھا تو ہے لیکن یہ تجزیہ ذرا کم ہی ملتا ہے کہ ان کی حسن پرستی، بے راہ روی اور شراب نوشی کے عوامل کیا تھے، ان کا آغاز کہاں سے ہوا، کیا یہ محض حادثاتی طور پر تھا یا ان کی فطرت کا ایک اٹوٹ حصہ جو دن بدن حالات سے ٹکراتے، دکھ اٹھاتے اٹھاتے ان کی زندگی کا المیہ بن گیا۔

مجاز نے پہلے اور بعد میں لکھنؤ میں جو دن گزارے اس کا ذکر ملتا ہے۔ علی گڑھ اور دہلی کی صحبتوں کا بھی خوب خوب ذکر ملتا ہے لیکن انھوں نے طالب علمی کے جو دو انتہائی قیمتی برس آگرے میں گزارے اس کا ذکر نہیں کے برابر ملتا ہے۔ جبکہ آگرے کے دو سال ان کی زندگی کے بے حد اہم سال ہیں جہاں سے ان کی شاعری، بے راہ روی اور شاید شراب نوشی کی ابتدا ہوتی ہے۔ شاعری کے بارے میں احتشام حسین اپنے ایک مضمون "مجاز ـ فکر و فن" میں لکھتے ہیں ؎

"مجاز کی ابتدائی شاعری جسے مشقِ سخن کی منزلِ اولیں کہہ سکتے ہیں ہمارے سامنے نہیں ہے۔ معلوم نہیں انھیں لکھنؤ کے ماحول سے فن کے ایک مبہم سے تصور کے سوا اور کیا ملا۔ لکھنؤ میں وہ عمر کی اس منزل میں بھی نہیں پہنچے تھے جہاں گہری سوجھ بوجھ کی توقع کی جا سکے ـــ لیکن جب وہ آگرہ پہنچے تو وہاں انھیں ایک بہتر ادبی ماحول ملا جہاں اتفاق سے عصرِ جدید کے چند اچھے شعراء یک جا ہو گئے تھے مگر اس وقت فانی کا

جادو اُن پر چل گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں
لیکن شعوری ارتقار کے لحاظ سے وہ
فانی سے بہت مختلف تھے، اس لئے
فانی سے ان کا تعلق ذہنی نہیں،
فنی رہا۔"

مجاز نے رُدولی کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی، جہاں خوش حالی اور بےفکری تھی۔ والد سراج الحق پڑھے لکھے شریف اور مہذب انسان تھے لیکن مجاز کے چچا رنگین —— اور لاابالی طبیعت کے تھے جائداد کی ایک ایک پائی عیش وعشرت میں لُٹا دی۔ بہکے ہوئے انسان تھے۔ روایت ہے کہ اس خاندان کی ہر نسل میں ایک بہکا ہوا فرد ضرور ہوتا ہے۔ مجاز کی بہن حمیدہ سالم لکھتی ہیں:۔

"کبھی خاندانی جنّات دادا کسی کی دُلہن
اُڑا لائے تھے۔ ایک منجھلا لڑکا بار بار جاتا
اور کہتا "جنّات دادا دُلہن دکھاؤ۔" جنّات
دادا آخر کو جھنجھلا اُٹھے اور ایک کنکری
اٹھاکر پھینکی جو اس لڑکے کے ماتھے پر
لگی، اُس وقت سے اس خاندان کی ہر
نسل میں ایک دیوانہ پیدا ہونے لگا۔"

مجاز کی ماں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ تھیں تو اَن پڑھ لیکن تیز ذہن، شوقین مزاج اور تفریح پسند۔ مجاز کا بچپن لاڈ پیار میں گزرا مجاز سے قبل ایک لڑکے کی موت ہو چکی تھی چنانچہ فطری طور پر مجاز کا پیار دُلار زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ تلے اوپر کی بہنوں کے درمیان بچپن گزرا، ایک طرف بہنوں کو چھیڑنا، بہنوں کے ساتھ گڑیا کھیلنا، گڑیا کی چوٹی نوچنا وغیرہ ان کا محبوب مشغلہ تھا، تو دوسری طرف چچا کی رنگین طبیعت اور عیش بھرے واقعات تھے۔ غرضکہ ایسے پس منظر اور واقعات نے مجاز کی ایک خاص قسم کی نفسیات بنادی۔ حمیدہ سالم ان کی طبیعت اور مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

" باپ کی طرف سے نیک نیتی، کم سخنی
حقیقت پسندی اور طبیعت میں گہرائی پائی۔ ماں
کی طرف سے طبیعت میں حُسن پرستی، زود حِسی
اثر پذیری اور جذباتیت ملی۔"

مجاز پوری سنجیدگی اور نیک نیتی کے ساتھ حُسن کے شیدائی ہوتے چلے گئے۔ ان کے بچپن کے واقعات میں ان کے حُسن پرست اور قدرے شریر ہونے کے علاوہ اور کوئی آثار ایسے نہ تھے جس سے یہ اندازہ ہوسکے کہ آگے چل کر یہ شاعری بھی کریں گے اور انقلابی و ہنگامی قسم کے شاعر ثابت ہوں گے۔

مجاز ابتدائی تعلیم رُدولی سے حاصل کرکے اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے جہاں امین آباد ہائی اسکول سے انھوں نے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ جس زمانے میں مجاز نے یہ امتحان پاس کیا، انھیں دنوں ان کے والد جو لکھنؤ میں ڈپٹی رجسٹرار تھے۔ اسسٹنٹ رجسٹرار کی حیثیت سے ان کا تبادلہ آگرہ ہوگیا۔ چنانچہ اپنے گھر والوں کے ساتھ مجاز کو بھی آگرہ جانا پڑا جہاں انھوں نے ۱۹۲۹ء میں سینٹ جانس کالج میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا۔ ریاضی اور طبیعیات ان کے موضوعات تھے۔ مجاز آگرے میں دو سال رہے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء تک۔ محض دو سال۔ لیکن مجاز کی زندگی کے یہ دو سال بہت اہم ہیں جس نے ان کی زندگی پر بےحد اثر ڈالا، اور جہاں سے ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔

۱۹۲۹ء میں جب وہ ایف۔ ایس۔ سی میں داخل ہوئے تو معین احسن جذبی ان کے کلاس فیلو تھے ساتھ ہی آل احمد سرور بھی جو ان سے ایک سال سینیر تھے۔ اس سے زیادہ اہم تھا اس وقت کا آگرہ کا ماحول۔ اس وقت آگرہ آگرہ نہ تھا بلکہ اکبرآباد تھا جس کی بھرپور نمائندگی سیماب اکبرآبادی کر رہے تھے، ان کے علاوہ جو بزرگ تھے، ان میں مخمور اکبرآبادی، مانی جائسی، ال۔ احمد اکبرآبادی، نجم آفندی، دلگیر اکبرآبادی، اخضر اکبرآبادی تھے اور نوجوان شاعروں میں رعنا، صبا اور میکش اکبرآبادی تھے۔ فانی بدایونی اُدھر اُدھر بھٹک کر تلاش معاش میں آگرہ پہونچے تھے اور باقاعدہ وکالت کی غرض سے مستقل سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ سیماب کا اپنا ایک گروپ تھا۔ مخمور، مانی، فانی، میکش وغیرہ کا الگ۔ جوش، یگانہ، جگر وغیرہ بھی آگرہ کثرت سے

آتے جاتے۔ مولانا حامد حسن قادری کی زیرِ نگرانی انجمن اُردوئے معلیٰ سرگرم تھی جو ہر سال سینٹ جانس کالج میں شعری مقابلے اور مشاعرے کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ اسی زمانے میں مانی اور فانی نے مل کر "تسنیم" نام کا ایک رسالہ نکالا جس کے کئی شماروں نے بڑی دھوم مچائی۔ سیماب اور اختصر کی نوک جھونک اور ان کے شاگردوں کے مقابلے نے ایک ایک ماحول بنا رکھا تھا غرضیکہ نوجوان، شوخ مجاز نے جس وقت آگرے کی سرزمین پر قدم رکھا، آگرے کا شعری و ادبی ماحول پوری روایت ولوازمات کے ساتھ سرگرم تھا۔ جذبی و سرور کا ساتھ ملا میکش صاحب حامد حسن قادری تک رسائی ہوئی۔ بس شاعری کا شوق پیدا ہوگیا۔ اور طبیعت کا وہ شوق جواب تک پھولوں کے گلدستے اور اچھی صورتیں دیکھنے تک محدود تھا۔ تخلیقی راستے کی طرف گامزن ہوگیا۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ لیکن قیامت اس وقت ٹوٹی جب محض ایک سال کے بعد ہی مجاز کے والد کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا اور انھیں بدرجۂ مجبوری ہاسٹل میں تنہا رہنا پڑا۔ بس اس تنہائی نے غضب ڈھایا۔ دوسرے قسم کے ذوق وشوق نے سر اُٹھایا اور وہ ایک کراس روڈ پر آکر کھڑے ہوگئے ان کی ہمشیرہ لکھتی ہیں:

اس موڑ پر کچھ وقفہ حیران و پریشان ٹھٹھک کر رہ گئے۔ پڑھائی میں ابتری پیدا ہونی شروع ہوئی۔ زندگی کا نظام درہم برہم ہونے لگا۔ امتحان میں فیل ہوئے۔ خود بتاتے تھے کہ امتحان کی کاپیاں ساری چھوڑ آتے تھے۔ رات رات بھر شعر و شاعری کی محفلیں گرم کرتے رہتے تھے صبح کو پرچہ کیونکر حل ہوتا وہ بھی حساب کا، کیمسٹری کا۔"

چنانچہ وہ بے راہ روی اور جنسی کج روی جو بعد میں ان کی زندگی کا مقدر بن گئی۔ اس کی شروعات بھی آگرے سے ہوئی جہاں وہ تنہا تھے۔ ہمہ وقت والدین اور بہنوں کے درمیان رہنے والے ایک حسن پرست نوجوان کو پہلی بار تنہائی ملی وہ بھی ہاسٹل کی تنہائی۔ لڑکھڑا جانا عین فطری تھا۔ اسی زمانے میں انھیں ایک لڑکی سے عشق ہوگیا۔ کسی نے بتایا کہ اس کو رام کرنے کے لیے اُلو کا دل کھلاؤ۔ لہٰذا جاڑوں کی راتوں میں رات رات بھر غلیل لیے سڑکوں پر اُلو مارتے پھرتے۔ آخر ایک دن چار بجے صبح اُلو ہاتھ آگیا۔ اس کا دل نکال کر کیک میں رکھ کر اس لڑکی کو کھلایا مگر وہ پھر بھی مہربان نہ ہوئی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مولانا حامد حسن قادری جو شعبۂ اُردو کے سربراہ تھے ان کے دم سے انجمن اردوئے معلیٰ کافی سرگرم تھی۔ کالج میں اکثر مشاعرے ہوتے جس میں مجاز، جذبی اور سرور کی شرکت ہوا کرتی۔ ایک ایسے ہی مشاعرے میں، جس میں تینوں شریک تھے، کم عمر مجاز کو ان کی غزل پر باقاعدہ گولڈ میڈل ملا۔ غزل کا مطلع تھا ؎

یونہی بیٹھے رہو بس درد سے تم بے خبر ہوکر
جو کیوں چارہ گر تم، کیا کروگے چارہ گر ہوکر

پروفیسر آل احمد سرور اپنی تازہ ترین کتاب 'خواب باقی ہیں' میں لکھتے ہیں:

" جب میں سکنڈ ایئر میں آیا تو مجاز اور جذبی فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے۔ دونوں ہاسٹل میں رہتے تھے طالب علم تو دونوں یونہی سے تھے مگر ان کی شاعری اس وقت بھی کالج میں مقبول تھی ـــ ہم لوگ کبھی کبھی سینما دیکھنے جایا کرتے تھے ـــ پروفیسر حامد حسن قادری سے بھی خاصا ملنا جلنا تھا۔ اُردو ادب اور شاعری سے میری دل چسپی دیکھ کر انھوں نے کالج کی انجمن اُردوئے معلیٰ کا سکریٹری بنا دیا تھا۔ انجمن سال میں ایک بار مشاعرہ ضرور کرتی تھی، ایک مشاعرے کے لیے دعوت نامہ لے کر میں فانی کے پاس بھی گیا.... مانی جائسی، مخمور اکبر آبادی اور میکش اکبر آبادی کا بھی کلام اکثر سنتا رہتا تھا۔ میکش صاحب طلباء پر بہت عنایت کرتے تھے۔ میں ان کے یہاں اکثر جایا کرتا تھا۔ ان کے مکان کے سامنے طوائفیں رہتی تھیں اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کے یہاں بیٹھے ہوئے یا ان سے

باتیں کرتے ہوئے نظر اس طرف اُٹھ جاتی تھی
..... میں نے انجمن کے سالانہ مشاعرے
میں دوسرا انعام حاصل کیا تھا، پہلا مجاز کو
ملا تھا جبکہ ہم لوگوں کا خیال تھا کہ جذبی کو
ملے گا۔"

راقم الحروف نے درس و تدریس کی ابتدا سینٹ جانس کالج سے کی تین سال اس کالج سے وابستہ رہا۔ اس درمیان دو مشاعرے کیے دونوں مشاعروں میں جذبی کو زحمت دی۔ اور جذبی صاحب اپنی پرانی جذباتی وابستگی کی وجہ سے دونوں مشاعروں میں تشریف لائے اور جب تک رہے اپنے پرانے دنوں کو یاد کرتے رہے۔ وہ پرانے دن جو انھوں نے اس کالج میں مجاز کے ساتھ گزارے، کالج کی باتیں کم، مجاز کی زیادہ کرتے۔ اس درمیان انھوں نے میکش صاحب کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ ان کے یہاں حاضری دی۔ اپنی گفتگو میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہی مجاز کو میکش صاحب کے یہاں لے گئے۔ پہلی بار کب لے گئے اور کیا گفتگو رہی یہ تو انھیں یاد نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ تقریباً ہر روز شام کو بڑی عقیدت کے ساتھ میکش صاحب کے یہاں حاضری دیتے۔ مجاز کے یہاں یہ عقیدت نہ تھی۔ بس لطفِ صحبت کے لیے جاتے اور جب انھوں نے دیکھا کہ میکش صاحب کے مکان کے ارد گرد اربابِ نشاط کا بازار گرم ہے اور میکش صاحب کے یہاں حاضری دینے میں ؎

ہے بندگی کے ساتھ یہاں شوقِ دید بھی

کا لطف ہے تو ان کے اندر ایک خاص قسم کی خود بینی و خود آرائی کا جذبہ پیدا ہو چلا۔ چنانچہ مجاز کی آمد کے سلسلے میں ایک جگہ خود میکش صاحب لکھتے ہیں :-

" وہ شام کو ہوسٹل سے آتے ہوتے تو
آدھ گھنٹہ آئینے کے سامنے سنورتے رہتے
یوں تو شاید ہر آدمی کسی نہ کسی پہلو سے اپنے
آپ کو اچھا لگتا ہے اور جتنا اچھا لگتا ہے اس
سے زیادہ اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے۔
خصوصاً جب وہ کسی کی نظر میں
محبوب بننا چاہتا ہو۔ مجھے بالکل نہیں
معلوم کہ وہ کس کی نظر میں محبوب بننا
چاہتے تھے البتہ ایک روز ایسا ضرور
ہوا کہ وہ شام کو حسبِ معمول میرے
یہاں آئے اور ہم سب کی طرف پشت
کر کے ایک مکان کی طرف منھ کر کے بیٹھ
گئے۔ مجھے یہ بات بری معلوم ہوئی کیونکہ
اس وقت کچھ ایسے لوگ بیٹھے ہوئے تھے
جن کی میں عزت کرتا تھا اس لیے میں نے
مجاز کو تنبیہ کی اور خلافِ عادت سخت لہجے
میں تنبیہ کی مگر وہ بالکل خاموش رہے۔"

مجاز نے اس ڈانٹ کا برا نہیں مانا، وہ اپنے بزرگوں کا لحاظ و ادب بھی کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہی ہے کہ اس واقعے کے بعد بھی مجاز برابر میکش صاحب کے یہاں جاتے رہے پورے مؤدب و مہذب انداز میں اور میکش صاحب جوانؔ سے آٹھ نو سال بڑے تھے، بڑے بھائی کی سی شفقت سے پیش آتے تھے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، فانی ان دنوں آگرے میں قیام پذیر تھے اور میکش کے ہم مذاق اور ہم محلہ ہونے کی وجہ سے کثرت سے میکش صاحب کے یہاں آتے جاتے۔ فانی اس وقت تک پچاس کی عمر کو پہنچ رہے تھے اور استاد کا سا درجہ رکھتے تھے۔ میکش صاحب اُن سے بڑی عزت اور عقیدت سے ملتے تھے۔ انھیں ملاقاتوں و صحبتوں کے درمیان میکش صاحب کی وساطت سے جذبی اور مجاز کی ملاقات فانی سے ہوئی اور جب فانی کو پتہ چلا کہ یہ دونوں نوجوان بھی شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں تو وہ بھی کھلنے لگے ورنہ فانی بقول میکش بڑے ریزرو اور لیے دیے قسم کے انسان تھے۔ ان نوجوانوں سے ان کی دلچسپی شعر و شاعری کی اصلاح تک بڑھ گئی اور مجاز کی ابتدائی غزلوں پر فانی نے باقاعدہ اصلاح کی۔ یہ دونوں نوجوان بھی فانی جیسے شخص اور شاعر سے مل کر اس قدر متاثر اور مرعوب تھے کہ ابتداءً فانی کے مذاق و مزاج سے متاثر ہو کر جذبی نے اپنا تخلص ملال اور مجاز نے شہید رکھا

آگرے میں یہ لوگ ملال اور شہید ہی تھے۔ جذبی اور مجاز تو علی گڑھ میں ہوئے اور پھر یہیں ہو کر رہ گئے۔

۱۹۵۲ء میں جب مجاز پر جنون کا حملہ ہوا اور وہ رانچی بھیجے گئے تو اس زمانے میں وہ اکثر آگرے کے دنوں کو ہی یاد کرتے جس کی تفصیل پروفیسر محمد حسن نے "گل نغمہ" کے عنوان سے نقوش میں شائع کی۔ وہ لکھتے ہیں:-

"پہلی بار جب فانی سے اصلاح لینے گئے تو فانی میکش صاحب کے یہاں آگرے میں تھے۔ میکش صاحب کے مکان کے دونوں طرف طوائفیں رہتی تھیں اور بیچوں بیچ میکش صاحب کا مکان تھا۔ پہلی غزل انہوں نے ڈرتے ڈرتے سنائی۔ فانی نے میکش صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ میاں میکش اس لڑکے نے یہ غزل کہی ہے اس کے بعد ایک غزل پر ایک مصرعے کی اصلاح کی اور ایک شعر پر دو بار صاد بنا دیا۔ مجاز کا شعر یہ تھا

قتل کر کے وہ مستیاں ان کی
خونِ دل بھی شراب ہونا تھا

فانی نے پہلا مصرعہ بدل دیا

ہجر میں کیفِ اضطراب نہ پوچھ
خونِ دل بھی شراب ہونا تھا

مجاز نے ہر بار اسے بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا لونڈا پن دیکھیے۔ لکھنوی انداز کا شعر کہا تھا جس پر دو صاد بنا دیے تھے۔ وہ شعر یہ تھا

ان کے جلووں میں گھر گیا آخر
ذرّے کو آفتاب ہونا تھا

اس کے بعد تیسری بار اپنے زعم میں غالب سے بھی زیادہ اچھی غزل لکھ کر ان کے پاس لے گئے انھوں نے ایک نظر دیکھا اور کہا "کل آنا"۔ ہم سمجھے تھے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ دوسرے دن جو مطلع پڑھا

یوں مسکرائے رُخ سے اُٹھا کر نقاب کو
کچھ بجلیوں نے گھیر لیا آفتاب کو

کہنے لگے "مہمل شعر ہے۔ حضرت! آپ برسوں کی راہ ایک دن میں طے کرنا چاہتے ہیں۔" پھر کہا "تبسّم لب پر ہوتا ہے کہ چہرے کے چاروں طرف؟" اس غزل کی اصلاح کے بعد ہم کمرے میں جا کر ایک گھنٹہ کے قریب خوب روئے اور فانی پر سخت خفا ہوئے۔ ان کی غزل پر غزل لکھی۔ راہ میں ملے تو طنز سے انہیں خوب جھک جھک کر آداب عرض کیا۔ راستے سے گزر رہے تھے، مجاز کا مکان راہ میں تھا۔ سلام کیا تو وہیں رُک گئے۔ مجاز نے وہی غزل جو اُن کی غزل پر لکھی تھی، سُنائی۔ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ غزل ختم ہو گئی تو کہنے لگے اس غزل کو پھر پڑھنا۔ مجاز نے کہا۔ یہ گویا میرے لیے سب سے بڑی داد تحسین تھی۔ یہ غزل فانی کی غزل پر لکھی تھی اور "آہنگ" میں شامل ہے اس کا مطلع ہے

سینے میں ان کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں

آخری غزل جو مجاز نے فانی کو دکھائی اس پر فانی نے کہا۔ تمہاری غزلوں پر نشاط کا رنگ، میرا غم تمہاری جوانی اور نشاط کو روند ڈالے گا۔ اس لئے آئندہ مجھ سے اصلاح نہ لیا کرو صرف الفاظ اور ترکیبوں کا اشتباہ دُور کر لیا کرو ایک آدھ مصرعہ سُنا دیا کرو۔"

اس اقتباس کے آخری جملے بے حد معنی خیز ہیں جس میں ایک ذمّہ دار استاد شاعر کی ایمان داری ہی نہیں جھلکتی ہے ساتھ ہی مجاز کی فطری افتادِ طبع، میلان اور رجحان کی طرف بھرپور اشارہ ملتا ہے۔ مجاز فطری طور پر حسن و عشق اور امید و نشاط کے شاعر تھے اور فانی یاس و غم کے۔ انھوں نے فانی سے اصلاح ضرور لی، اثر نہیں۔ صحبت ضرور اختیار کی، فطرت نہیں، اس لیے کہ مجاز اپنے آپ میں ایک اوریجنل انسان اور فطری شاعر تھے۔ فانی کی اصلاح نے شاعرانہ گرامر وغیرہ

پر توجہ ضرور دلائی لیکن فکر و خیال کی سطح پر زیادہ اثر انداز نہ ہو سکی، شاید اسی لیے احتشام حسین نے یہ کہا کہ "فانی سے ان کا تعلق ذہنی نہیں فنی رہا"۔

فانی اور میکش کی معیاری صحبتوں میں معیاری و سنجیدہ گفتگو شعر و ادب کے رموز و نکات، علوئے تخیل، دقتِ نظر وغیرہ کی منزلوں سے وہ ضرور آشنا ہوئے۔ جذبی اور سرور کی دوستانہ صحبت نے رات رات بھر شعر و شاعری کا ماحول گرم رکھنے اور پورے آگرے میں شعری و ادبی ماحول نے انھیں شعر و شاعری، مشاعرے، مقابلے وغیرہ کے سخت امتحانات سے گزارا اور کامیابی سے گزارا۔ چنانچہ وہ شعر و شاعری کی طرف آزادانہ اور والہانہ انداز سے بڑھتے چلے گئے کوئی روک ٹوک نہ تھی اور بہ قول فراق شاعری جس آوارہ گردی اور بدچلنی کا مطالبہ کرتی ہے، مجاز کو سب میسر تھی۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمانے میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ عشقیہ اور رومانی زیادہ ہے۔ آہنگ میں شامل ابتدائی رومانی غزلیں آگرے میں ہی کہی گئیں۔ ان کی مشہور زمانہ غزل ہے ؎

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں
یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

اس زمانے میں فتحپور سیکری کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی اور بیحد پسند کی گئی۔ بقول آل احمد سرور اس زمانے میں اس شعر کا دوسرا مصرعہ یوں تھا ؎

یہ کس کو دیکھتا ہوں اور ہنس رہا ہوں میں

یہ سچ ہے کہ اس طرح کی شاعری بعد کے مجاز سے کم ہی ہم آہنگ ہو پاتی ہے لیکن یہ شاعری بھی اپنے آپ میں اتنی مضبوط اور جاندار ہے کہ بقول منظر سلیم:

"ان کی شاعری کی بنیادیں اتنی مستحکم تھیں کہ ان پر اونچی سے اونچی عمارت کھڑی کی جا سکتی تھی۔"

اور یہ عمارت کھڑی ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں جب وہ فیل ہو گئے تو ان کے والد نے ان کو علی گڑھ بلوا لیا اور جب مجاز آگرے سے علی گڑھ پہنچے تو یہاں ان کو ایک بالکل بدلی ہوئی دنیا ملی۔ سردار جعفری، سبط حسن، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری، جاں نثار اختر، اختر الایمان وغیرہ تو ملے ہی۔ ساتھ ہی سابقہ پڑا ہے فاشزم اور مارکسزم سے اشتراکیت سے اور تحریک آزادی سے۔ اس پورے ماحول سے جہاں ان کے فکر و خیال میں انقلابی تبدیلیاں آئیں وہیں ان کی بے راہ رویوں اور بے اعتدالیوں میں بھی اضافہ ہوا۔

یہ سچ ہے کہ علی گڑھ میں ان کا پانچ سال قیام رہا اور اس درمیان آگرے کے شہید اور علی گڑھ کے مجاز میں زمین آسمان کا فرق آ چکا تھا اور وہ اپنی دل نواز شخصیت اور دلکش شاعری کے ذریعے ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لیکن سچ یہ بھی ہے کہ اگر مجاز شاعر نہ ہوتے تو ان کی اپنی کوئی شخصیت ہوتی اور نہ ہی اس کی کوئی پہچان۔ اور یہ شاعر پہلی بار آگرے میں ہوئے۔ ان کی شاعری کا جنم اور پرورش و پرداخت سب کچھ آگرے میں ہوئی۔ صرف دو سال میں اس شاعر نے شعر و سخن کے ابتدائی اسباق سیکھ لیے اور اس میں اتنی سنجیدگی اور بالیدگی حاصل کر لی کہ علی گڑھ پہنچتے ہی نہ صرف وہ اپنے ہم عصروں میں گھل مل گیا بلکہ اپنے سینئرز کے لیے اکثر توجہ اور کبھی کبھی چشمک کا حصہ بن گیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ مجاز کی زندگی میں جذبی، سردار، اختر اور بعض دوسرے ساتھیوں نے مجاز کے ساتھ کئی دہائیاں گزاریں پتہ نہیں ان میں سے کس نے کس کا اثر لیا۔ مجاز کا اپنا رنگ اور اپنی ترنگ تھی کہ اس ترنگ میں وہ جوش جیسے عظیم المرتبت شاعروں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ جوش کے ایک نصیحت نامے کا جواب جس طرح مجاز نے "سینۂ انقلاب چھلنی ہے، شاعرِ انقلاب کیا جانے" کے طور پر ایسا دیا کہ مدتوں جوش کو خاموش رہنا پڑا۔ اسی مجاز نے دو سال کے مختصر وقفہ میں فانی اور میکش کی شخصیت اور صحبت کا اثر بہر حال قبول کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ۱۹۵۲ء کے عالم جنون میں وہ علی گڑھ اور دہلی کی صحبتوں کے بجائے آگرے کی صحبتوں کا ذکر اس طرح نہ کرتے۔ آگرے میں مجاز کا دو سالہ قیام کم از کم مجاز کے لئے ناقابلِ فراموش رہا جسے خود فراموشی میں غرق مجاز نے تاحیات یاد رکھا۔

□□

غزلیں

ختم مجھ پر ہے یہ منظر آخری
وار تیرا ہے ستم گر آخری

شہر نے اپنے نہ پہچانا مجھے
دیکھ کر پلٹا ہوں میں گھر آخری

آبرو میت کی جس سے رہ گئی
گھر کی تھی اس کے وہ چادر آخری

ابتدا راہوں کی پھر اس سے ہوئی
میں سمجھتا تھا جسے در آخری

کر چکے احباب اپنا حق ادا
پھینک مجھ پر تو بھی پتھر آخری

تشنگی کی آگ کو اب کیا کروں
پی چکا ہوں میں سمندر آخری

میکدے سے اٹھتے جاتے رند ہیں
ساقیا! اک دورِ ساغر آخری

وجاہت علی سندیلوی

نصرت منزل
سندیلہ

حلقۂ رنج و الم سے جو نکل جاتا ہے
دیکھتے دیکھتے انسان بدل جاتا ہے

دل بہر حال ہے دل، دل کی حقیقت ہے کیا
گرمیٔ حسن سے پتھر بھی پگھل جاتا ہے

کام لے جرأت و ہمت سے جو انسان تو پھر
سر پہ آیا ہوا طوفان بھی ٹل جاتا ہے

جب بھی بڑھتا ہے اندھیرا غمِ تنہائی کا
دیپ ماضی کے خیالات کا جل جاتا ہے

آدمی عزمِ مصمم کا سہارا لے کر
بحرِ ظلمات کی موجوں سے نکل جاتا ہے

بات کیا ہے کہ جب اس شہر میں ہوتا ہے گزر
دل میں سویا ہوا طوفان مچل جاتا ہے

یوں نہ معصوم کو نظروں سے گراؤ لوگو!
کھوٹا سکہ بھی تو بازار میں چل جاتا ہے

سید مظفر علی معصوم اعظمی

۱۲۳۔ شاہ گنج۔ الہ آباد

چمن میں چہرۂ گل پر کہاں نکھار کا رنگ
نہ جانے کیسا ہے اب کے برس بہار کا رنگ

ہر ایک رنگ یہاں جنتِ نگاہ سہی
مگر عزیز ہے مجھ کو خیالِ یار کا رنگ

چمن کو جس نے خود اپنے لہو سے سینچا ہے
اسی سے پوچھئے رعنائیِ بہار کا رنگ

ہمارے دم سے ہے قائم چمن کی رعنائی
ہمارے خون سے ملتا ہے لالہ زار کا رنگ

نہ پوچھ کیسے شبِ انتظار گزری ہے
یہ دیکھ کیا ہے مری چشمِ انتظار کا رنگ

وفا کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا
ہے سرخ آج بھی جوہر صلیب و دار کا رنگ

چندر پرکاش جوہر بجنوری

۶۔ ریتا بلڈنگ لیڈر روڈ
الہ آباد

افسانہ

ایم. کوٹھیاوی راہی
ایڈیٹر 'اشتراک وعمل'
قاسمی پور خورد
گورکھپور

ناآشنا

"ہیلو! مگر آپ کون ہیں"۔؟
"جی ایک کام ہے آپ سے۔"
"مگر ہیں کون آپ، کس سے بات کرنا چاہتی ہیں"۔؟
"آپ ہی سے۔"
"یعنی کس سے؟"
"کہہ جو دیا آپ ہی سے۔"
"بھئی کس آپ سے، کوئی ایکس وائی زیڈ؟"
"جو بھی ہوں آپ۔"
"خیر، کہیے۔"
"کیا۔؟"
"سمجھ میں نہیں آتا، کون ہے، کیا بات ہے، کس سے بات کرنی ہے۔"
"آپ ہی سے۔"
"تو کہیے نا۔"
"جو کہیے کہوں۔"
"کیا مذاق ہے، بارہ بجے رات کو۔"
"بارہ بجے رات کو؟ اجی صاحب یہ رات ہے!"
"اور کیا دن ہے"؟
"ہو سکتا ہے۔"
"آپ پاگل معلوم ہوتی ہیں۔"
"آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔؟"
"میں بھی پاگل — جو آپ کے منہ لگا ہوں"۔
"کیوں میرے منہ لگے ہیں؟"
"آپ ہی نے لگا رکھا ہے۔"
"میں نے"؟
"اور کیا میں نے —؟"
"چلیے مان گئی۔"
"تو فرمایئے۔"
"نہیں فرماتے۔"
"جہنم میں جایئے۔"
"ارے... رے .... اتنی جلدی۔"
"میں ریسیور رکھ رہا ہوں۔"
"رکھیے۔"
"یہ لیجیے۔"

"ہیلو!"
"خیریت سے تو ہیں آپ"؟
"کون ہو تم؟ پھر بارہ بجے رات کو۔"
"میری گھڑی بند ہے۔"
"اس شرارت سے فائدہ؟"
"آپ اسے شرارت سمجھتے ہیں۔"
"اور کیا سمجھوں"؟

"قافیے اور بھی ہیں۔"
"حماقت۔"
"اور بھی ہیں۔"
"خجالت۔"
"اور بھی ہیں۔"
"رذالت۔"
"اوں ہوں، اور بھی۔"
"حجامت"
"نو، نو، اور بھی .... اور بھی۔"
"خباثت۔"
"کہتے جایئے۔"
"شرافت، جہالت، حفاظت، نجابت، ظرافت، عمارت، تمازت، صحافت، لطافت۔ بس؟"
"نہیں نہیں، اور بھی، اور بھی ...."
"اب کوئی اور نہیں۔ تم ہی بتاؤ آگے۔"
"میں بتا سکتی تو آپ کو زحمت کیوں دیتی۔"
"شاعری کرتی ہو۔؟"
"جی۔"
"استاد بنانا چاہتی ہو؟"
"جی۔"
"شہر میں سیکڑوں اُلو ہیں، انہی کو آواز دو۔ اوکے۔"

"ہیلو۔"
"معاف کیجئے گا۔ ہفتوں بعد بول رہی ہوں۔"
"پھر آگئیں۔ وہی رات بارہ بجے۔؟"
"اب میری گھڑی بھی چلنے لگی ہے صاحب!"
"چلا کرے۔"
"اُکتا گئے۔؟"
"مہمان کیسا بھی ہو، مہمان ہوتا ہے، مجبوراً اخلاق سے پیش آنا پڑتا ہے۔"
"آپ کی خوش اخلاقی ہی نے تو میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔"
"میں جاننا چاہتا ہوں، کون ہو، کہاں ہو، نام کیا ہے، کیا چاہتی ہو۔؟"
"نام کوئی نہیں، ٹھکانا کوئی نہیں، مطلب کوئی نہیں۔"
"پھر اپنا اور میرا وقت کیوں خراب کرتی ہو۔؟"
"جی چاہتا ہے۔"
"مگر میرا جی نہیں چاہتا۔"
"کیوں نہیں چاہتا۔؟"
"تم کوئی چھلاوا، کوئی بھوت، کوئی جن، کوئی آسیب ہو شاید۔"
"ہو سکتا ہے۔"
"کوئی اور گھر کیوں نہیں دیکھتیں؟"
"آپ کا گھر پسند آگیا ہے۔"
"تو چلی کیوں نہیں آتیں؟"
"یہی پوچھنا چاہتی ہوں۔ آسکتی ہوں؟"
"ضرور۔"
"کب آؤں؟"
"جب جی میں آئے۔"
"ابھی۔؟"
"ہاں ابھی۔"
"یا کل پرسوں آؤں۔؟"
"کل پرسوں سہی۔"
"یا ایک مہینے بعد آؤں؟"
"ایک مہینے بعد سہی۔"
"سال بھر بعد کیوں نہیں؟"
"سال بھر بعد سہی۔"
"کبھی نہیں، کیوں نہیں۔؟"
"ٹھیک ہے کبھی مت آؤ..... پاگل بے وقوف۔"
"خفا ہو گئے نا۔؟"

"او، کے!"

"پھر آگئیں۔"

"میں آسیہ بول رہی ہوں۔"

"ارے آسیہ! معاف کرنا۔ اکثر بارہ بجے، ٹھیک اسی وقت کسی اجنبی خاتون کا فون آتا ہے اور پریشان کرتا ہے۔ میں سمجھا وہی شیطان کی خالہ ہوگی۔"

"آپ بھی خوب آدمی ہیں ثروت صاحب، کوئی کم بخت چھیڑتی ہوگی۔ خیر مجھے معلوم کرنا تھا کہ نازو لکھنؤ سے کب آئے گی۔"

"پتہ نہیں۔ کہہ گئی تھی جلد ہی آجاؤں گی۔"

"آپ سے اس کی دوستی برقرار ہے نا۔؟"

"دوستی اگر دوستی ہوتی ہے تو برقرار ہی رہتی ہے۔"

"تو کیا اس سے دوستی نہیں تھی۔؟"

"یہ اسی سے پوچھنا۔"

"اس وقت کچھ بجھے ہوئے سے لگ رہے ہیں آپ۔"

"نہیں تو۔"

"آپ کی آواز میں آنسو بول رہے ہیں ثروت صاحب!"

"نہیں تو۔"

"ثروت صاحب! نازو ایک مجبور لڑکی ہے۔ سنا ہے گھر والے شادی کی ضد کر رہے ہیں۔ مگر وہ دل سے آپ کو چاہتی ہے۔ آپ اس کے گھر والوں کو پیغام کیوں نہیں بھیجتے۔"

"بھیجا تھا۔"

"کیا جواب آیا۔؟"

"انکار۔"

"کیوں؟"

"یہ نازو سے پوچھو۔"

"پھر بھی۔"؟

"اس کی رائے معلوم کی گئی، اس نے میری جگہ کسی لکھنؤ والے کا نام دے دیا۔ شاید نکاح بھی ہوگیا —— وہ زہر ہے آسیہ زہر لڑکی نہیں۔"

"یہ کیا سن رہی ہوں۔"

"اچھا اب اجازت دو۔"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔"

"دنیا مجھے بھی حسین کہتی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو۔"

"نازنین کہتی ہے۔"

"یہ کیا کہنے لگیں تم؟"

"مہ جبین بھی کہتی ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔"؟

"کچھ سہیلیوں کا خیال ہے کہ میں نازو سے زیادہ پرکشش ہوں۔"

"آخر یہ کیا بک رہی ہو۔"!!

"میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔ آپ مجھے پسند ہیں۔ میں نازو سے پہلے آپ کو ملی تھی، مگر آپ نے مجھے کوئی خاص لفٹ نہیں دی تھی۔ پھر بھی میں آپ کو چاہتی رہی اب جبکہ نازو نے بے وفائی کی ہے، میں اظہار کر رہی ہوں۔ بے شرم، بے حیا کچھ بھی کہہ لیں، دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی ہوں۔"

"تم کل کسی وقت آجانا۔"

"کہاں۔؟"

"میرے فارم ہاؤس پر۔"

"آپ وہاں کب جائیں گے۔؟"

"صبح!"

"تو پھر میں آپ کو راستے میں مل جاؤں گی۔"

"نہیں، میرے ساتھ نہیں، تنہا آؤ۔"

"اچھا، ٹھیک ہے۔"

"او، کے!"

"ہیلو! ثروت بول رہا ہوں۔"

"اور میں وہی ....."

"اچھا تو آپ ہیں، کہو کیا کہنا ہے۔؟"

"کچھ نہیں"۔

"دیکھو! اگر تم نے اپنا نام، پتہ، نمبر نہیں بتایا تو میں ایکسچینج سے معلوم کر کے سزا دلاؤں گا۔ سمجھیں"۔

"جی۔ سمجھ گئی"۔

"بتاؤ"۔

"کیا بتاؤں۔؟"

"کیا نام ہے؟"

"نازو۔ آسیہ!"

"کیا بک رہی ہو۔؟!"

"کبھی لکھنؤ سے، کبھی کان پور سے بولا کرتی ہوں"۔

"تم کو معلوم ہو گیا ہوگا نازو لکھنؤ اور آسیہ کان پور کی ہے"۔

"اور اب وہ دونوں اسی گورکھ پور میں رہتی ہیں۔ دونوں کال گرلز ہیں۔ دونوں آپ کو اُلّو بنا رہی ہیں۔ آسیہ آپ کے فارم ہاؤس بھی پہونچنے لگی ہے۔ اور نازو کو آپ سمجھتے ہیں کسی لکھنؤ والے کو بیاہ دی گئی ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ آپ بڑے معصوم ہیں رئیسِ شہر صاحب!"

"مگر سنو تو سہی خاتون، سنو تو سہی"۔

"اب میرے پاس وقت بہت کم ہے"۔

"تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے ڈارلنگ!"

"ڈارلنگ۔؟!"

"ہاں ہاں مائی ڈارلنگ"۔

"میں کوئی کال گرل نہیں ہوں"۔

"میں کب کہتا ہوں"۔

"آپ اور آپ ایسے بہتیرے لوگ ایسی کال گرلز پر پیسہ پانی کی طرح بہایا کرتے ہیں، عشق کے چکر میں۔ مگر وہ عشق نہیں ہوتا، یا ہوتا بھی ہے تو یک طرفہ۔ جو چیز بازار میں سو دو سو میں دستیاب ہوتی ہے اسی چیز کو محبت کے نام پر ہزاروں لاکھوں میں خریدتے ہیں۔ بولئے کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ آپ نے نازو پر ہزاروں روپے برباد نہیں کیے۔ اور اب کیا آسیہ پر لاکھوں کے وارے نیارے نہیں کرنے جا رہے ہیں رئیسِ شہر صاحب!"

"مذاق مت اڑاؤ۔ مجھے بتاؤ یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا"۔

"جا کر دیکھ لو تمھاری آسیہ اس وقت ہوٹل گلستاں کے روم نمبر ایک سو بائیس میں کس کے ساتھ ہے۔ جا کر دیکھ لو نازو اس وقت ہوٹل میورہ کے روم نمبر ایک سو پانچ میں کس شخص کی آغوش میں ہے"۔

"تم کون ہو خاتون۔ تم کون ہو۔ خدا کے لیے جواب دو"۔

"تمھاری ایک غریب پجارن، جو اپنی ایک دولت مند شادی شدہ سہیلی کے بنگلے سے تم کو فون کیا کرتی ہے۔ اچھا۔ اب اجازت دو۔ پھر کبھی"۔

"مگر سنو تو سہی۔ سنو تو۔ میں تم سے..... میں تم سے ملنا چاہتا ہوں"۔

"مگر میں تم سے نہیں ملنا چاہتی"۔

"کیوں، کیوں؟ آخر کیسی پجارن ہو۔؟"

"پجارنیں اپنے دیوتاؤں کے درشن مرنے کے بعد ہی کرتی ہیں میرے اچھے دیوتا! خدا حافظ۔!!"

□□

اہلِ قلم حضرات نیا دور کو اپنی غیر مطبوعہ اور معیاری تخلیقات بغرضِ اشاعت روانہ کریں۔

تمام تخلیقات فل اسکیپ سائز کاغذ پر صاف اور خوش خط تحریر کریں نیز کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔

ارسال کردہ شعری اور نثری تخلیقات کی اصل کاپی ہی روانہ کریں اور نقل اپنے پاس ضرور محفوظ کر لیں۔

نیا دور میں شائع ہونے والی نثری اور شعری تخلیقات پر معقول معاوضہ پیش کیا جاتا ہے۔

——— ایڈیٹر

غزلیں

ابھی نِکلو نہ گھر سے تنگ آ کے
ابھی اچھّے نہیں تیور ہَوا کے

فلک سے میں چلا شبنم کی صُورت
زمیں نے رکھ دیا پتّھر بنا کے

مرے زخمی لبوں پر کچھ نہیں ہے
سوائے ایک لفظِ بے نوا کے

ہماری خامشی نے لاج رکھ لی
نہیں تو ہاتھ کٹ جاتے دُعا کے

بدن خوشبو کا لرزاں خوف سے ہے
ہوا کو رازِ دل اپنا سُنا کے

سروں کے دیپ ہیں نیزوں پہ روشن
میں کیسے دیکھوں منظر کربلا کے

تمہارے قتل کی خبریں چھپی ہیں
فراق اخبار تو دیکھو اُٹھا کے

فراق جلال پوری
محلہ قاضی پورہ ۔ پوسٹ جلال پور
فیض آباد

خود کو اُونچا اُٹھا رہے ہیں لوگ
چھوٹے قد کو بڑھا رہے ہیں لوگ

دُھوپ کی گرم برچھیاں سہہ کر
ہمیں جینا سکھا رہے ہیں لوگ

گھر کے آنگن کو بانٹنے کے لئے
ضد کی دیوار اُٹھا رہے ہیں لوگ

بادلوں سے یہ جا کے کہہ دینا
ریت کا گھر بنا رہے ہیں لوگ

لب پہ میرے کسی کا نام نہیں
پھر بھی آنکھیں چُرا رہے ہیں لوگ

کوئی صُورت نظر نہیں آتی
آئینہ کیوں دکھا رہے ہیں لوگ

زندگی ہے مگر پرائی سی ہے
بات لیکن بڑھا رہے ہیں لوگ

وحشتیں دل کی بڑھ گئیں اتنی
گھر میں جنگل اُگا رہے ہیں لوگ

ڈاکٹر سعید عارفی
قانون گو پورہ
بہرائچ

آندھیوں کے، ظلمتوں کے، مَوت کے محور میں تھا
پھر بھی کتنا حوصلہ اس باز کے شہپر میں تھا

آئینوں کی کرچیوں کا ڈھیر تھا بازار میں
اور سب کچھ دے کے لینے کا سودا سر میں تھا

میں تو کٹھ پُتلی تھا، سارے لوگ حیراں تھے مگر
جو مجھے دوڑا رہا تھا، خود پسِ منظر میں تھا

زرد آندھی زرد پتّے لے اُڑی تو کیا ہوا
ان کو جانا ہی تھا جن کا نام اُس دفتر میں تھا

پانیوں میں بھی کئی زندہ جسم جلتے تھے مگر
ایک آسیبِ خموشی جیسے بحر و بر میں تھا

میں نے خود گر کر سُنی ہے اپنے کانوں سے صدا
اک پیامِ عزمِ نو موجود ہر پتھر میں تھا

راشد جمال فاروقی
اے ۱۵۲۸، آر۔ ڈی۔ پی۔ ایل،
ویربھدر، (رشی کیش)
دھرہ دون

تحریر: حسین ابوالناجہ —— ترجمہ: منور حسین
نزد۔ پرکاش ہوٹل۔ پردل پور (گول گھر) گورکھپور

فلسطینی کہانی

کیا ہوا؟

وہ سیلاب کی طرح اندر داخل ہوا۔ وہ اسے خوف سے تک رہی تھی۔ اسے اس بات کا قیاس ہوگیا کہ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔ چوراہے پر گولیاں چل رہی تھیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

وہ اس کے پاس آکر غصّے سے چیخا۔ "وہ کہاں گیا؟"

"کون؟"

"دہشت پسند۔"

"دہشت پسند؟" وہ بُری طرح لرز رہی تھی۔

"تم نے اسے چھپایا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

"نہیں۔"

"تب وہ کہاں گیا؟"

"میں نہیں جانتی۔"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگا —— وہ فرش کی طرف تکنے لگی۔

"کیا تم اس سے خوف زدہ ہو؟" اس نے دریافت کیا۔

"کس سے؟"

"دہشت پسند سے؟"

"نہیں"!

"تب تم کیوں نہیں بتاتیں کہ وہ کہاں گیا؟"

"میں نے کسی کو نہیں دیکھا ہے۔"

"ہم تمھیں اس سے بچائیں گے" —— اس نے ہمّت افزائی کے انداز میں اسے دیکھا اور بولا۔ "ان سب سے۔"

"میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

اس نے کاندھا پکڑ کر اسے گھسیٹا اور زور سے بولا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو۔"

"میں قسم کھاتی ہوں۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔"

"وہ اسے گھورتا رہا اور بولا۔" "میں نے اس کو اسی طرف آتے دیکھا ہے۔"

اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے پریشانی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنا سر ذرا سا خم کر کے وہ بُدبُدایا۔ "اگر تم ہماری مدد کروگی تو نقصان میں نہیں رہوگی۔"

"میں قسم کھاتی ہوں۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

"تم نے کسی کو نہیں دیکھا، تو یہ لو۔"

اس کے چہرے پر لگنے زناٹے دار تھپڑ کی آواز کمرے میں گونج گئی۔ اس کی پشت دیوار سے ٹکرائی۔ وہ کراہنے لگی۔

"میں تمھیں جھوٹ نہ بولنے کے لئے تنبیہ کرتا ہوں۔ یا پھر..." وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اپنی گردن پر پھیر رہا تھا۔

اس کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہوگئی تھیں اور وہ بُری طرح لرز رہی تھی۔

"میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

وہ غصّے سے کانپتا ہوا چیخا۔ "تم نے کسی کو نہیں دیکھا!"
پھر غرّا کر بولا۔ "تمھارے منھ سے کچھ نہیں پھوٹتا۔ سوائے اس کے کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

"میں قسم کھاتی ہوں، میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

اس نے اسے کمرے میں دھکیل دیا۔ کپڑوں میں پیر اُلجھ جانے کی وجہ سے وہ لُڑھکتی چلی گئی۔ وہ خلا میں تک رہی تھی اور گہرے کرب کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ اس کی خواہش فوراً مر جانے کی ہو رہی تھی۔ اس کے رُخساروں پر نیم گرم آنسو تیر رہے تھے۔

اس نے دروازے کے پیچھے دیکھا ـــــ وہاں کوئی نہیں تھا
وہ اضطراری کیفیت میں بولا۔ "کھڑی ہو جاؤ۔"

وہ خاموشی سے بستر سے الگ کھڑی ہو گئی۔ بستر کو پلٹ کر اُس نے پیچھے دیکھا۔ جب وہ مطمئن ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ تو اس نے اشارہ کیا کہ وہ بستر کو صحیح جگہ پر پھر لگا دے۔ بلا کسی جھجک کے اس نے وہی کیا جو وہ چاہتا تھا۔

"تنہا ہو؟" اس نے دریافت کیا۔

"ہاں۔"

وہ باز کی طرح اس پر جھپٹا۔ اس کا بازو پکڑ کر وہ تیزی سے اسے جھنجھوڑ رہا تھا ـــــ

"تب اس کا مطلب ہے کہ تم جھوٹ بولتی رہی ہو۔"

"میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نے صرف سچ بولا ہے۔"

وہ اپنا ہاتھ جھٹکارتا ہوا بولا۔ "تم سمجھتی ہو کہ ہم نرے بیوقوف ہیں۔!"

"میں قسم کھاتی......"

"تم کس کے ساتھ رہتی ہو۔؟" اس نے دریافت کیا۔

وہ خاموش رہی۔ وہ کیا جواب دے سکتی تھی۔؟

لیکن وہ دریافت کر رہا تھا۔ "شادی ہو گئی۔؟"

وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"تمھارا خاوند کہاں ہے۔؟" اس نے دریافت کیا۔

"مجھے نہیں معلوم!"

"سچ!"

"مجھے کیا پتہ؟"

"کیسے ممکن ہے کہ تم نہیں جانتیں؟"

"میں نے اسے دیکھا تک نہیں ہے۔"

"کب سے؟"

"دو ماہ سے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ جنگ شروع ہونے کے دو ماہ قبل سے؟"

"تقریباً یہی۔"

اس نے قہقہہ لگایا ـــ "کیا تم جانتی ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے؟"

"نہیں..."

"اس کا مطلب ہے کہ وہ سپاہی تھا!"

وہ چیخی۔ "نہیں۔"

"اور جنگ کے بعد وہ دہشت پسند بن گیا۔"

"نہیں۔!"

وہ پھر اسے گھور رہا تھا۔

اسے اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا اور اس کے چہرے پر بڑبڑاہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اسے اپنے شوہر کی وہ مسکراہٹ یاد تھی ـــ وہ شام، جب وہ جا رہا تھا، وہ اسے تکتی رہی تھی۔

"مجھے تشدد اختیار کرنے پر مجبور نہ کرو۔"

"میں قسم کھاتی ہوں کہ مجھے جو کچھ معلوم تھا، میں تمھیں بتا چکی ہوں۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"مجھے پتہ نہیں ہے۔"

"وہ دہشت پسند ہے؟"

"نہیں۔"

"تمھیں کیسے معلوم کہ وہ ایسا نہیں ہے۔!"

وہ فرش کی طرف تکنے لگی ـــ جنگ ختم ہونے کے بعد بہت سے واپس آ گئے تھے، مگر وہ نہیں آیا تھا۔ لیکن وہ خود کو دلاسہ دیتی رہی تھی

کہ یہ لوگ آگئے ہیں، تو وہ بھی ضرور آئے گا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے پڑوسی کی بیوی اس سے ملاقات کرنے آئی تھی۔

پڑوسن آنکھ ملانے میں جھجک رہی تھی، اسی لیے اُس نے پوچھا تھا ——

"عابد کی ماں! معاملہ کیا ہے؟"

"خدا تمھیں صبر اور حوصلہ عطا فرمائے۔" پڑوسن نے غمگین ہو کر کہا تھا۔

"کیا۔۔؟" وہ فکرمند ہو کر چیخی —— پھر اس نے پاگلوں کی طرح پڑوسن کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا ——

"بولو۔ عبدالفتاح کو کچھ ہو تو نہیں گیا؟"

"خدا ہماری حفاظت کرے۔ وہ جنگ کے میدان میں بہادر کی موت مرا" —— پڑوسن نے دلاسا دیتے ہوئے کہا تھا۔

"عبدالفتاح گزر گیا؟"

بھرائی ہوئی آواز میں پڑوسن بولی —— "مگر خدا تمھیں فراموش نہیں کرے گا۔"

وہ بے ہوش سی ہو گئی تھی۔ موت! موت —— ! بھیانک چیخیں ہواؤں میں گونج رہی تھیں —— موت! —— اُلوؤں اور کوّوں کی کاؤں کاؤں سے غم اور کرب کی بازگشت آ رہی تھی —— موت!!

"اسے تمھارے بغیر چین نہیں تھا، اسی لئے وہ واپس آیا۔" اس نے طنز کیا۔

جب وہ کچھ نہیں بولی، تو اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن اس نے صحیح وقت کا انتخاب نہیں کیا۔"

اس نے اُلجھن کے ساتھ اسے دیکھا۔

"اچھا۔ وہ اپنے گھر آیا تھا؟"

"نہیں"۔! اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"اور تم نے اسے چھپایا ہے؟"

"نہیں۔!"

"ہم تم سے قبول کرانا جانتے ہیں۔"

"تم جو کرنا چاہو کر سکتے ہو۔" وہ گرجی۔

اس کا ہاتھ اس کے سر پر پڑا اور وہ فرش پر گر گئی —— اور بے ہوشی میں ڈوب گئی —— "میرے منھ میں کونپلوں کی بہار ہے اور ڈامر کھلتا ہے —— کالے کتے! منڈلانا بند کر! —— بدمعاش اُلو خاموش ہو جا!" —— وہ بغیر آواز کے کراہ رہی تھی۔

اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے کسی طرح طاقت لگا کر کہا ——

"ظالم! تیرے دن بھی پورے ہو جائیں گے!"

وہ اسے کھینچتے ہوئے بولا۔ "کھڑی ہو جا!"

اس نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا ہاتھ کافی مضبوط تھا۔ اسے وہ کسی پہاڑ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اسے باہر ڈھکیل دیا ——

"نکل باہر!"

"مجھے قتل کر دو۔" اس نے خود اعتمادی سے کہا

"قتل کرنا گناہ ہے۔" وہ ذرا نرمی سے بولا۔

"تمھارا خاوند کہاں ہے؟"

"میں کچھ نہیں کہوں گی۔"

اس نے لات مار کر اسے دھکا دیا۔

"تب تم اپنے گھر واپس جا سکتی ہو۔"

وہ اپنے گھر کی طرف مڑی۔ تب ہی اس نے دوڑنا شروع کیا۔ جیسے ہی وہ گھر کے دروازے کے قریب پہنچی، اس نے بندوق کی لبلبی دبا دی۔

ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا ——

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔"

"ہم نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔"

"میں نے دہشت پسند کو ہلاک کر دیا ہے۔" اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

□□

انشائیہ

ڈاکٹر جاوید وششٹ

وششٹ آشرم۔ نتھپور بلوچ۔ فریدآباد

ہری چُگ

ہمارا ایک ہم جماعت تھا — ہری کمار چُگ — چُگ اس کی سب کاسٹ تھی۔ ہم اُسے سمجھاتے کہ 'یہ چُگ' چہ معنی دارد۔؟ ہری کمار اچھا نام ہے۔ اس کے ساتھ چُگ جوڑ کر اسے بدنام مت کرو۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ایک سیدھا سادھا طالب علم تھا۔ آخر ہم نے اسے ہری کمار چُغد کہنا شروع کر دیا۔ وہ بڑا بھولا بھالا اور پیارا لڑکا تھا۔ اس نے سمجھا کہ اُردو والوں نے چُگ کو چغد بناکر عظیم الشان کر دیا ہے۔ وہ اس پر بہت خوش ہوا اور دیگر لوگ اسے "چُگد جی" کہنے لگے۔ وہ سُنتا تو پھول کر کپا ہو جاتا۔

ایک دن ہمارے ایک ساتھی نے اسے سمجھایا کہ چُغد کے معنی بھی جانتا ہے؟ اس نے جواب میں کہا کہ چُگ کا اُردو کرن' ہے۔ تو ہمارے ساتھی نے کہا کہ ابے چغد کے معنی ہیں اُلّو! اور یہ سب تجھے اُلّو بنا رہے ہیں۔ جب اسے یہ پتہ چلا تو بہت خفا ہوا اور چغد لکھنا بند کر دیا، اور پھر چُگ پر اُتر آیا۔

کچھ دنوں کے بعد ہم نے اس سے کہا کہ آج کل چھوٹے ناموں کا رواج ہے، ہری کمار چُگ بہت بڑا نام ہے' اسے مختصر کرو اور 'کمار' کو بیچ میں سے نکال دو، صرف ہری چُگ لکھو۔ تمہارا نام بھی آگیا اور سب کاسٹ بھی! وہ اس پر راضی ہو گیا اور اُس نے 'ہری چُگ' لکھنا بھی شروع کر دیا۔ اب وہ اسکول بھر میں 'ہری چُگ' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اُسے سبھی ہری چُگ کہنے لگے۔

ہمارے اُسی ساتھی نے پھر اسے سمجھایا — " ابے ہری چُگ سے تو ہری چُغد ہی اچھا تھا۔ معلوم ہے 'ہری چُگ' کِسے کہتے ہیں؟"

وہ پھر چونکا اور اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

ہمارے ساتھی نے کہا۔" کم بخت! یہ تو ہندی کا لفظ ہے' اسکے معنی نہیں آتے؟ ہری چُگ وہ شخص کہلاتا ہے جو کھانے پر بن بلائے آ دھمکے، دولت کا ساتھی، مان نہ مان میں تیرا مہمان، نیبو نچوڑ، طفیلی، مُفت خور—! ایسے گھٹیا آدمی کو ہری چُگ کہتے ہیں۔ اس سے تو چُغد ہزار درجے بہتر تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے تو نثر میں چُغد کی شان میں قصیدہ پڑھا تھا اور اسے تپسوی اور بزرگ مرتاض قرار دیا تھا۔ اچھا خاصا شریف آدمی' ہری کمار' ہری چگ ہو جائے تو یہ بہت شرمناک اور المناک ہے" — اس دن کے بعد وہ صرف ہری کمار رہ گیا۔ اس نے توبہ کر لی کہ وہ اب کبھی اپنے نام کے ساتھ چُگ نہیں لکھے گا۔ لیکن ہری کمار چُگ ہری چُگ کے زمرے میں نہیں آتا۔ یہ تو یار لوگوں نے اسے پہلے 'چُغد' اور پھر 'ہری چُگ' بنا دیا تھا۔

ایک مُدت کے بعد ہری کمار سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اب وہ ایک بینک میں اچھے عہدے پر ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک "خالص ہری چُگ" سے مل چکا ہے۔

میں نے پوچھا" خالص ہری چُگ۔؟ یہ کیا ہوتا ہے۔؟"

تو اس نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا جس کا خلاصہ اسی کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہے:۔

" ایک دن میں بینک سے گھر لوٹا تو وہاں ایک صاحب میرے منتظر تھے۔ وہ میرے لیے اجنبی تھے، انھوں نے میرا نام لیکر

پکارا اور کہا کہ آپ کے بڑے بھائی صاحب نے مجھے آپ کا پتہ دیا تھا تاکہ میں آپ کے یہاں چند روز قیام کرسکوں۔ وہ جلدی میں تھے، میں نے خط کے لیے کہا تو بولے کہ میرا نام لینا ہی کافی ہوگا۔ میرا نوکر بھائی صاحب لے گئے تھے۔ اسے یہ معلوم ہوا تو وہ بولا کہ مجھے کھانا پکانے کا آرٹ آتا ہے۔ آپ کھانے کی چنتا چھوڑ دیجئے اس نے شام جو کھانا بنایا تو واقعی مزا آگیا۔ دوسرے دن جب میں بنک پہنچا تو مجھے خیال آیا کہ ایک اجنبی کو گھر میں چھوڑ آیا۔ دیکھو شام کو گھر سلامت مل جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ گھر میں جھاڑو ہی لگا دے بہر حال میں شام کو گھر پہنچا تو اس نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اور اسے دن چائے پلاکر جی خوش کر دیا۔ چار دن خوب حلوے مانڈے رہے۔ لیکن چوتھے دن جب میں نے گھی کا ڈبہ دیکھا تو گھی پیندے میں لگ چکا تھا۔ اسی دن نوکر آگیا۔ اس نے بتایا کہ بھائی صاحب رات کی ٹرین سے آرہے ہیں۔ جب اس خالص ہری چگ' نے سنا تو وہ پان کھانے کے بہانے گھر سے ایسا گیا کہ پھر لوٹا ہی نہیں۔ سمجھے اب آپ وہ خالص ہری چگ تھا۔ اس نے گھر کی کسی چیز کو نہیں چھوا۔ بس کھانے کے نت نئے مینو تیار کرکے لذیذ تر چیزیں کھلاتا رہا اور کھاتا رہا۔

وہ غالباً اس لئے رفو چکر ہوگیا کہ کہیں اس کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اسے اتنا جھوٹ بولنا لازمی تھا ورنہ وہ میرے پاس ٹھہر ہی کیسے سکتا تھا۔ مگر ایک جھوٹ کے سہارے وہ ہری چگ بنا رہا۔ لیکن اس کے بعد چار دن تک وہ نہایت شرافت سے رہا، اور ایسے لذیذ کھانے کھلائے کہ من و سلویٰ کو مات کر دیا۔

"بھئی! آپ نے 'ہری چگ' کو خوب یاد رکھا"—— ہم نے ہری کمتار سے کہا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا:

"مجھ سے زیادہ کون یاد رکھ سکتا ہے۔ آپ لوگوں نے تو مجھے ہی ہری چگ بنا دیا تھا، حالانکہ میں ہری چگ ہرگز نہیں تھا۔"

میں نے پوچھا کہ آپ اپنے نام کے ساتھ چگ لکھتے ہیں۔؟ تو کہنے لگا کہ "آپ لوگوں نے اسکول ہی میں میرے چگ کو چگ لیا تھا، میں کہاں سے لکھتا۔"

شادی کی ایک دعوت میں ایک ہری چگ سے ملاقات ہوئی۔ اس کو نہ بیٹے والے نے مدعو کیا تھا اور نہ بیٹی والے نے۔ وہ تھا صحیح معنوں میں مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ وہ اتفاق سے میرے قریب ہی ٹیبل پر براجمان تھا اور بڑی نفاست سے ضیافت اڑا رہا تھا۔ اس کے طور طریق، لباس اور کھانے میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ وہ بہت جاذب نظر تھا، اسی لیے نوجوان لڑکیوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ میں نے بغور اس کے ہر انداز کا مشاہدہ کیا۔ اتفاق سے اس دعوت کے دو تین دن بعد ہی اس سے ایک دوست کے گھر ملاقات ہوگئی میں نے اس دعوت کا ذکر کیا تو وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میرے دوست نے اس ہری چگ کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا کہ وہ بہت بڑے گھرانے کا لڑکا ہے۔ بہت مہذب اور نفاست پسند ہے۔ مگر اسے جنون کی حد تک یہ شوق ہے کہ کسی بھی دعوت میں بغیر بلائے شریک ہو جائے۔ لیکن اس کے لئے وہ دو کام ضرور کرتا ہے کہ شادی کی دعوت میں دونوں فریقین کے کارڈ حاصل کرلیتا ہے اور دونوں پارٹیوں کے اہم نام یاد کرلیتا ہے۔ کارڈ اپنی جیب میں رکھتا ہے اور دندناتا ہوا پنڈال میں گھس جاتا ہے۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوتا کہ ایسا نفیس و تراشیدہ شخص ہری چگ ہوسکتا ہے۔

یہ "فنکار ہری چگ" ہے۔ اور اب تو اس کے پاس شادی کے اتنے کارڈ ڈاک سے آجاتے ہیں کہ اسے ان میں انتخاب کرنا پڑتا ہے میرے دوست نے یہ بھی بتایا کہ وہ اسے بھی کئی دعوتوں میں لے گیا تھا۔ اس کا یہ فارمولا ہے کہ اگر دعوت میں ایک کے بجائے دو ہوں تو زیادہ آسانی رہتی ہے۔ پھر کسی کو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا۔ اکیلا ہوتا ہے تو بہت جلد کسی نہ کسی سے رابطہ قائم کرلیتا ہے۔ اس میں وہ خواتین کو ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ تعریف و توصیف ان کی کمزوری ہے۔ وہ پہلے لباس کی تعریف کرے گا۔ کوئی خوبصورت شعر سنائے گا، برابر کھاتا رہے گا پھر دوسری لڑکی کی طرف متوجہ ہوجائے گا۔ باتیں وہ بہت لچھے دار کرتا ہے، مثلاً:

"ہلّو! آپ کے دانت ہیں کہ دُرِ شہوار، سلکِ گوہر ہیں"۔ بس اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ جائے گا۔ دوسری لڑکی سے کہے گا، آپ کی آنکھیں

ہ میرا ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اس کا یہ آرٹ ہے کہ وہ ہر لمحے کو تشنہ چھوڑ دیتا ہے۔ پھر اگلی ٹیبل پر پہنچ جائے گا، اور پھر ——

" ہلو! آپ کے ہونٹ کتنے حسین ہیں ہ
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے "

اس کے باوجود اس کا یہ کمال ہے کہ وہ کسی جھوکری کو منہ نہیں لگاتا۔ اس سلسلے میں اس کا انداز شلفئی ہوتا ہے ہ

سلفئی یار کس کے دم لگایا اور کھسکے

وہ ضیافت میں اپنی پسندیدہ چیزیں سیر ہوکر کھاتا ہے اور پھر چمپت ہوجاتا ہے۔

مگر دلّی میں ایک "ڈپلومیٹ ہری چگ" بھی ملتا ہے —— یہ ہری چگ غیر ملکی سفارت خانوں کی کاک ٹیل پارٹیوں میں ملتا ہے یہ بھی آدابِ محفل میں نہ صرف طاق ہوتا ہے بلکہ اس کے اظہار میں ایک دانشورانہ شان ہوتی ہے۔ وہ جس ملک کی ایمبیسی کی پارٹی میں شریک ہوتا ہے، اس ملک کے جغرافیہ کے علاوہ اس کے سیاسی ومعاشرتی، سماجی وادبی حالات وتحریکات سے باخبر ہوتا ہے اور ان پر بے تکلفی سے، جام در دست، اظہارِ خیال کرتا رہتا ہے۔ وہ ان غیر ملکی پارٹیوں میں ایسا رچ بس گیا ہے کہ جملہ سفارت خانوں کے اعلیٰ افسران وعہدیداران سے خصوصی تعلقات پیدا کرلیے ہیں کہ برابر اس کو ڈاک سے دعوت نامے موصول ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی ان ممالک کے قومی لباس میں بھی دیکھا گیا ہے۔ مگر سفارت خانوں کے یہ ہری چگ بہت خطرناک بھی ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ انہی کی معرفت سفارت خانے ملکی رموز سے آشنا ہوتے ہیں۔ ان ہری چگوں میں ہی وہ غدار چھپے رہتے ہیں جو بھانڈا پھوٹنے پر اخبار کی سرخیوں میں روسیاہ ہوتے ہیں۔ یہ شراب کے رسیا ہوتے ہیں۔

ہری چگ ایک ایسا پرندہ ہے جو دانہ تو چگ جاتا ہے، مگر زیرِ دام نہیں آتا۔ اگر وہ زیرِ دام آگیا تو وہ ہری چگ کے زمرے سے

(باقی صہ ۴۸)

شاطر مدراسی (صہ ۲۴ کا بقیہ)

بحرِ بیکراں ہے جسے "اعجازِ عشق" کے کوزہ میں سمودیا گیا ہے۔

تمل ناڈو کے یگانہ ممتاز فلسفی شاعر شاطر مدراسی نے اپریل ۱۹۴۳ء کو بمقام مدراس داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے ان کی وفات پر درج ذیل عبارت ماہنامہ معارف میں مرقوم کی تھی۔ اسی اقتباس پر اپنی اس تحریر کو ختم کر رہا ہوں:۔

" دکن میں مولانا شاطر جیسے اُردو کے حکیم شاعر کا وجود اس زبان کی عالمگیری کی دلیل ... تھی جس نے چالیس برس تک اہلِ دکن کو اپنی خوش نوائیوں سے مسرور ...... رکھا۔ افسوس کہ اس سرزمین دکن کا یہ بلبل شیریں نوا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔" ہ

حواشی

ہ کتاب "یادِ رفتگاں" (از سید سلیمان ندوی طبع دوم ۱۴۰۷ھ / ۱۹۸۶ء)
مضمون: شمس العلماء عبدالرحمن شاطر مرحوم صہ ۲۴۹
(ماہنامہ معارف جون ۱۹۴۳ء)

ہ ایضاً

ہ محبوب مدراسی (ولادت ۱۹۲۲ء) (فرزند خان بہادر سراج العلماء نواب تجمل حسین خان ایمان گوپاموی، ۱۲۷۷ھ تا ۱۳۴۰ھ۔ خانوادۂ والاجاہ کے ممتاز رکن) شعری مجموعہ "متاعِ محبوب"

ہ سالنامہ "فانوسِ خیال" ۱۹۶۱ء۔ مضمون "مدراس میں اردو شاعری: بہارِ رفتہ کی چند جھلکیاں۔ از محبوب پاشا محبوب مدراسی

ہ کتاب "یادِ رفتگاں" از سید سلیمان ندوی، طبع دوم ۱۹۸۶ء
مضمون: شمس العلماء عبدالرحمن شاطر مدراسی صہ ۲۵۰
(ماہنامہ معارف جون ۱۹۴۳ء)

ہ ایضاً

نقد وتبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "فرہنگِ رُوحِ نظیر"

مرتب: شریف احمد قریشی　　　قیمت: ساٹھ روپے

ملنے کے پتے (۱) دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ (۲) نصرت پبلشرز امین آباد لکھنؤ

شریف احمد قریشی نے انتہائی تحقیق و تفحص سے فرہنگ روحِ نظیر مُرتب کی ہے جو اپنے آپ میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔ کارنامہ بایں نقطہ نظر کہ ہمارے محققین وناقدین نے نظیر اکبر آبادی کو بڑی حد تک نظر انداز کیا ہے حالانکہ زبان کا بے تکلف اور بے محابا استعمال جو نظیر کے یہاں ہے کسی اُردو شاعر کے یہاں نہیں۔ نظیر نے ہم پر یہ احسان کیا ہے کہ وہ زبان جس تک ہماری رسائی نہ تھی اسے ہم تک پہنچایا یعنی خالص ہندستانی زبان اور دیسی بولی۔ ہم شریف قریشی کے اس لیے مرہون منت ہیں کہ انھوں نے صرف یہی نہیں کہ ان کے محاورات و مصطلحات کو یک جا کر کے ایک کتابی شکل دی بلکہ ان کے معانی و مطالب مع امثال ہمارے سامنے رکھے۔ اُردو کے نامور نقاد شمس الرحمان فاروقی نے اپنے مضمون — "نظیر اکبر آبادی کی کائنات" مطبوعہ شب خون دسمبر ۱۹۷۹ء میں نظیر کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں دلچسپ، اہم اور لائقِ مطالعہ شاعر بتایا ہے نیز ان کی زبان کے بارے میں یہ سطور تحریر کی ہیں: ——

"نظیر کے یہاں الفاظ کی کثرت ہے تنوع نہیں یعنی ان کے یہاں الفاظ نئی نئی شکلیں نہیں اختیار کرتے۔ نئے نئے معنی نہیں اوڑھتے، وہ فارسی کے ماہر ہیں اور "دیسی" یعنی ہندی اور بولی والے الفاظ پر بھی پورا تصرف رکھتے ہیں، لیکن وہ الفاظ کو محض جمع کر دیتے ہیں ان کو متحرک نہیں کرتے جدلیاتی نہیں بناتے، وہ فہرست سازی کے ذریعہ مرعوب کر دیتے ہیں لیکن فہرست محض فہرست رہ جاتی ہے۔"

فاروقی صاحب کی اس رائے کے باوجود اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ جو ذخیرہ الفاظ نظیر کی فکری تحویل میں ہے وہ صرف انھیں کے یہاں ہے اور پھر یہ کہ تمام الفاظ ان کے فکری ارتفاع کے مرہون منت ہیں کہ انھیں اشعار میں ایک مرصع ساز کی طرح جڑا کر منفرد آب وتاب دی گئی ہے ——

فرہنگ روح نظیر شریف احمد قریشی کی ایک اہم کتاب ہے ۴۶۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے شروع میں ہی ایک مبسوط پیش لفظ ہے جو خود شریف قریشی کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے اس پیش لفظ سے کتاب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ شروع کے اوراق میں ہی مختلف شعبہ ہائے حیات میں استعمال کئے جانے والے مختلف المزاج الفاظ کی ایک فہرست بھی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر ہر لفظ کے مزاج داں تھے اور اس کے استعمال پر بے نہایت دست رس رکھتے تھے۔

کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ اور کتابیات کا حصہ بھی ہے جو اس کتاب کی افادیت میں اور زیادہ اضافہ کرتا ہے۔

—— عشرت ظفر

نام کتاب: "پل دو پل کا شاعر"

مصنف: سید احتشام حسین ٹانڈوی　　　قیمت: ۲۵/- روپے

ملنے کے پتے: (۱) نصرت پبلشرز۔ امین آباد لکھنؤ

(۲) دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

سید احتشام حسین ٹانڈوی کی کتاب "تحفہ" کی بے مثال مقبولیت کے بعد "پل دو پل کا شاعر" اردو کے باذوق قارئین کی نذر ہے۔ ان دونوں ہی کتابوں میں فاضل مصنف نے ساحر لدھیانوی کا بحیثیت شاعر ایک اچھا اور مدلل تعارف پیش کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ساحر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز میں اجاگر کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں اس کی شاعرانہ عظمت اور فن کارانہ صلاحیت کے نقوش

جمع ہوجاتے ہیں۔

اس کتاب میں ساحر لدھیانوی کا تعارف پیش کرتے ہوئے سید احتشام حسین ٹانڈوی یوں رقمطراز ہیں:۔۔۔۔۔

"میخانۂ قدرت سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والی گراں تر حیات جاری و ساری کی اگرچہ ایک بوند ہی اس کا بھی حصہ تھی مگر یہی ایک بوند اس کے ظرفِ بلانوشی میں آکر بحرِ تلاطم کی صورت اختیار کر گئی۔ اس نے اسی ایک بوند کو ہزار آتشہ بنا کر اس کا کبھی نہ اترنے والا نشہ کائناتِ ادب پر طاری کر دیا۔ پل دو پل کی کہانی لکھتے لکھتے اس کے دل کی دھڑکنیں قلبِ زمانہ کی دھڑکنوں سے اس طرح ہم آہنگ ہوگئیں کہ اس کی آپ بیتی جگ بیتی بن گئی ہے اس کے احساس قلم نے تاج محل کی جو تصویر بنائی وہ شاہجہاں کے تاج محل سے کہیں زیادہ جاذبِ قلب و نگاہ ثابت ہوئی۔ اس کے قلم نے فلموں کو ایسے گیت دیئے جو ایرکنڈیشنڈ سینما ہال میں بیٹھے انسان کے دل و دماغ پر گرمی کی لو جیسی ہوا بن کر اثر انداز ہوئے۔ صحافت کے میدان میں اترا تو اس درجہ حقیقت نگاری کی کہ انگریز حکومت کو اس اخبار کو بند کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔"

"ساحر کی شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر" عنوان کے تحت ساحر کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کو جانے بغیر ان کی شاعری کو سمجھنا ایک مشکل ترین امر ہے۔ ساحر کے حساس دل میں غریبوں، مزدوروں، مظلوموں، مجبور و بے بس انسانوں کے لیے جو ہمدردی کا جذبہ انگڑائیاں لے رہا تھا اور ظلم و زیادتی کرنے والوں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جو لاوہ دہک رہا تھا اس کو بے حد متاثر کن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس پیش ہے۔

"چونکہ اپنے ساتھ کی گئی زیادتی اور حق تلفی کا کانٹا ساحر کے دل سے نہیں نکل سکا تھا اس لئے اس کی کھٹک نے ساحر کو پوری زندگی اس سیاسی جماعت کا ساتھ دینے پر مجبور کیا جس نے شہر کے ہر چوراہے پر نابرابری اور ناانصافی کے ترازو توڑنے کی قسم کھائی تھی۔ ساحر کی جگ بیتی اور آنکھوں بیتی نے اسے اشتراکیت کا حامی ہی نہیں بلکہ ایک سرگرم کارکن بھی بنا دیا اور مستقبل میں ظلم و زیادتی کرنے والوں کے خلاف ساحر نے اپنے قلم سے جو جہاد کیا وہ یقیناً تلوار سے جہاد کرنے سے کہیں زیادہ عظمت کا حامل ہے۔"

یہ کتاب ہندستان کی مختلف یونیورسیٹوں میں ساحر اور ترقی پسند ادب پر کام کرنے والوں کے لئے بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ چونکہ یہ کتاب کسی کمیٹی کے مالی تعاون کے بغیر شائع ہوئی ہے اس لیے پچیس روپئے اس کی قیمت بہت کم ہے۔

——— منیر احمد انصاری

نام کتاب: "تیشہ" (شعری مجموعہ)

شاعر: نواب احسن

ملنے کا پتہ: شمع بک اسٹال۔ گھنٹہ گھر چوک۔ الہ آباد

انجمن تہذیب نو۔ مالوی نگر۔ الہ آباد

نواب احسن کا پہلا مجموعۂ کلام "تیشہ" بڑی خوبصورت طباعت و کتابت اور دیدہ زیب گردپوش کے ساتھ منظر عام پر آیا۔

"تیشہ" کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نواب احسن شعر و ادب کا رجحان لے کر پیدا ہوئے جس کو ان کے ماحول نے مزید تقویت بخشی۔ وہ ایک خوش حال، متمول، زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ جہاں شعر و شاعری کا چرچا بچپن ہی سے ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ ان کے یہاں اردو کے مشاہیر شعراء کا اجتماع برابر رہتا، شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوا کرتیں، جنھوں نے ان کے ذوق و سخن گوئی کو اور جلا بخشی اور آج ان کا یہ شعری مجموعہ اس کا شاہد ہے کہ نواب احسن آج کی کساد بازاری اور نظم نگاری کے دور میں بھی غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے روحِ غزل کو ماضی کی روایات کے ساتھ حال کے تناظر میں ڈھالا

ہے۔ اُردو غزل کی طویل و عریض تاریخ شاہد ہے کہ غزل ہر زمانے میں مقبول ترین صنفِ شاعری رہی ہے۔ اس نے ہر دور اور ہر زمانے میں اپنی ہیئت کو برقرار رکھا ہے۔ فکر و اظہار کے نئے قرینے دریافت کیے ہیں اور نئے محاورے اور نئے الفاظ بھی فراہم کیے ہیں۔ غزل اپنی پوری خصوصیت کے ساتھ نواب احسن کے یہاں ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

بات آنے کی تھی نہیں آ رے   راہ میں کون مل گیا لکھیے

عجیب لوگ تھے احسن عجیب بستی تھی   ہر ایک جسم پہ کاغذ کے ہی لباس ملے

جب اُجالوں کا ہوا قتل کسی بستی میں
اپنی پرچھائیں کا ہم دیکھنے انجام چلے

نواب احسن نے غزل کی روایت اور تقدس کو پورے اہتمام سے برقرار رکھا ہے۔ ان کے بیان میں داخلی اور خارجی کیفیات کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اشعار تازگی و شگفتگی کی عمدہ مثال ہیں۔ وہ اظہارِ ذات اور صفات کو پیش کرنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ وہ غزل کی روایت کو جدید عصری تقاضوں سے بھی ہم آہنگ کیے ہوئے ہیں اور غزل کے گلاب کی پنکھڑی جیسے نازک فن کو رمز و ایما، اور ابہام و کنایہ کے طلسم کے پیکر میں بھی تراشے ہوئے ہیں ؎

ہم زیست کی تھکن کو مٹانے کے واسطے
کچھ دیر رک گئے جو کہیں چھاؤں پا گئے

بہا کے لے گیا سیلاب گاؤں کے منظر
گھروندے ریت نہیں پائے ہیں جاہ کے اب تک

"تیشہ" میں سیّد عاشور کاظمی کا پُر استدلال، بصیرت افروز تجزیاتی پیش لفظ اس کی شان اور آبرو میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس استدلالی انداز سے عاشور کاظمی نے پورے کلام کا تجزیہ کیا ہے وہ یقیناً ان کی علمی بصیرت کا علمبردار ہے۔

نواب احسن سماجی نظام کے اچانک درہم برہم ہونے سے بیحد متاثر ہوئے اور ہجرت، فارو اعزا اور نقلِ سکونت، ثقافت و تہذیب کی کٹھن منزلوں سے گزر رہے ہیں۔ بدلا ہوا معاشرہ اور بدلی ہوئی زندگی ان کے لئے دوسری دُنیا ہوگئی جس کے وہ عادی نہ تھے۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

مجھ کو پھر کوہ کنی کا وہی جذبہ دے دے
پالنے والے میرے ہاتھ میں تیشہ دے دے

کوہ کنی کا وہی پُرانا جذبہ جس سے آباؤ اجداد نے سماج اور معاشرہ میں سربلندی اور آبرو حاصل کی تھی، جو اب حالاتِ زمانہ کے ہاتھوں ہجرت کر گیا اس کو واپس لینے کی تمنا بڑے عزم و حوصلہ کے ساتھ ہے جس میں بیحد تڑپ ہے اسی لیے تو 'تیشہ' پالنے والے سے مانگ رہے ہیں تاکہ وہ اپنی ہجرت کردہ 'زمین' پھر بذریعہ "تیشہ" چھین سکیں ؎

چھین لوں گا یہ زمیں دیکھنا اک دن احسن
میں نہ مانگوں گا کسی سے میرا حصّہ دے دے

ان کے سارے اشعار ان کی 'آپ بیتی' ہیں جو 'جگ بیتی' معلوم ہوتے ہیں۔ یہی ان کی شاعرانہ کامیابی کی دلیل ہے ؎

اُڑا دیا ہے جو پیڑوں سے ان پرندوں کو
کہاں کریں گے بسیرا کبھی یہ سوچا ہے

ہم تو خزاں میں تند ہواؤں کے ساتھ تھے
دُنیا ہمیں بہاروں میں ہی ڈھونڈتی رہی

نواب احسن کی پوری زندگی نے جابرانہ قانون کی زد میں آکر ایک سانحہ ہوگئی جس کے سبب شجر کے زرد پتوں کی طرح ٹوٹ کر اذکار سے بکھر جانے کی صورت نمایاں ہونے سے وہ زندگی بھر رنج و الم کا شکار رہے اسی لیے ان کو زندگی کے غم اندوز پہلو کی ترجمانی کے لیے دُنیا کے سب سے عظیم سانحۂ کربلا کے استعارے کا سہارا لینا پڑا جس کے ذریعے وہ اپنے غم و الم، کرب اور بے چینی کا بہ آسانی اظہار کر سکے۔ اُردو غزل میں سانحۂ کربلا کے استعارہ کو برابر شاعروں نے استعمال کیا ہے لیکن نواب احسن کے یہاں

بطورِ خاص اپنایا گیا ہے ؎

پانی نہ مانگا کتنے سمندر ترس گئے
پیاسوں کا اعتماد تو خودداریوں میں ہے

آہِ سوزاں سے پگھل جائے گی زنجیرِ ستم
عزم دیکھا ہی نہیں تم نے ابھی مجبور کا

مجموعی حیثیت سے نواب احسن کا یہ مجموعہ بہت خوب ہے، جو ان کے روشن مستقبل کی نشان دہی کرتا ہے۔

—— سید ظفر حسین

نازش پرتاپ گڑھی —— صـ۱۴ کا بقیہ

زندگی میں ہے بڑا جوشِ نمو یاد رہے
رنگ لاتا ہے شہیدوں کا لہو یاد رہے

اس کے ساتھ ساتھ "صدائے مستقبل" یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے ؎

لاکھ تخریب ہو تعمیر نہیں رک سکتی
زندگی موت کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی

چنانچہ "وہ گرجتا ہوا طوفان" سینوں میں اور اُبلتا جاتا ہے۔ جسم گرتے جاتے ہیں، سسکتے جاتے ہیں لیکن "آگے ہی سرکتے" جاتے ہیں اور یہ نعرہ ہر سمت گونجتا ہی چلا جاتا ہے :۔

غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

انجام یہ ہوتا ہے کہ نور زادے "اندھیروں کا بھرم" توڑ دیتے ہیں۔ "روشنی رات کے پردوں سے ابھر آتی ہے" اور ملک میں "جشنِ جمہوریت" منایا جاتا ہے جس میں عوام کے لبوں سے یہ نغمہ پھوٹتا ہے ؎

آج ہم بستۂ زنجیرِ ستم ہیں آزاد
سُرخیٔ خونِ شہیدانِ وطن! زندہ باد

لیکن اسی "جشن" میں "شہیدوں کی آواز" یہ اہم پیغام بھی دیتی ہے ؎

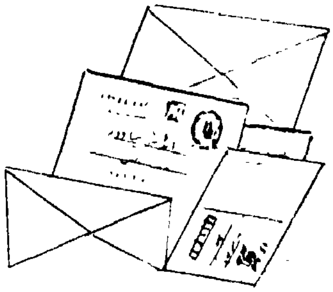
دوستو! ہوش میں آؤ کہ سفر ختم نہیں
تیرگی کم تو یقیناً ہے مگر ختم نہیں

اپنے سینوں میں ابھارے ہوئے جذباتِ عمل
اپنے ہاتھوں میں لیے اپنے سروں کی مشعل
ساتھیو! اور بھی اک بار بہم ہو کے بڑھو
ایک دل، ایک زباں، ایک قدم ہو کے بڑھو

اور پھر نازش صاحب کے منظومیہ کا اختتامیہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس طرح اس کا آغاز بوڑھے دادا کے بیان سے ہوا تھا اسی طرح بوڑھا دادا اپنے اس تبصرے کے ساتھ اس کا اختتام بھی کرتا ہے ؎

ان گنت انجم و مہتاب کا خوں ہوتا ہے
جب کہیں ملتی ہے ظلمات سے انساں کو نجات

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نازش پرتاپ گڑھی کا طویل منظومیہ "زندگی سے زندگی کی طرف" ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو تحریک سے متعلق ایک رزمیہ (Epic) فرود ہے۔ مگر شروع سے آخر تک ہر جگہ نازش صاحب نے اس موضوع کو کافی اُبھار کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی موت کے قدموں پر ہرگز جھک نہیں سکتی۔ اور تخریب چاہے کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، تعمیر کسی طرح بھی رک نہیں سکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی "کالے قانون کے سینے میں اُبال آیا ہے" اور "موت کے پیاروں" نے اپنے "جلال" سے انسان کی ازلی اور ابدی طاقت کو دبانا چاہا ہے تو اسے شکست ہوئی ہے اور انسان نے "سختیٔ شب" کو ختم کر کے فضاؤں میں نور بکھیر دیا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ "زندگی سے زندگی کی طرف" کا اصل موضوع یہی ہے جس کے لیے ہندوستان چھوڑو تحریک کو ایک نظیر (instance) کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اور موضوع کی اسی ہمہ گیریت کی بنا پر نازش پرتاپ گڑھی کا یہ منظومیہ ایک لافانی ادبی شاہکار قرار دیے جانے کے قابل ہے۔ □□



ہمارے نام.....

میں آپ کے نیا دور کا مطالعہ برابر کرتا رہتا ہوں۔ واقعی اس دور میں آپ اُردو زبان وادب کی بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ یقیناً قابلِ مبارکباد ہیں۔

——— محمد احمد رضا

غازی پور

مارچ، اپریل، مئی، جون ۱۹۹۱ء کے شمارے موصول ہوئے۔ بہت بہت شکریہ۔ امید ہے کہ اب نیا دور پابندی سے ملتا رہے گا۔ جولائی اور اگست کے شمارے جلد از جلد بھجوانے کا بندوبست کریں۔ ممنون ہوں گا۔

——— سکندر پروانہ

مدھوبنی

نیا دور کا ہر مہینے شدّت کے ساتھ انتظار رہتا ہے اس کے مطالعے کے بعد 'چشمِ ما روشن و دل ما شاد' والی کیفیت ہو جاتی ہے۔ کیا اچھا ہو اگر ہر شمارہ متعلقہ مہینے میں ہی موصول ہو جایا کرے۔

——— محمد حسن شاہد

سدھارتھ نگر

ماہنامہ نیا دور کا اس دور میں اس انداز سے پیش کرنا آپ کی اعلا ہمتی کی واضح دلیل ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی باقاعدگی کے ساتھ ساتھ آپ اس کے معیار کو بھی بلند سے بلند تر کیے جا رہے ہیں۔ پرچہ پہلے سے کافی بہتر اور معیاری ہو گیا ہے۔

——— سُلطان احمد ساحل

جمشید پور

نیا دور کا اگست ۱۹۹۱ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ لگتا ہے نیا دور کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے۔ 'اپنی بات' کے ذریعہ آپ نے جس نکتے کی جانب نشاندہی کی ہے وہ وقت کی ضرورت ہے۔ مشمولات تو بہر حال نیا دور کے معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تزئین اور حسن میں نمایاں اضافہ ہے۔

——— زبیر احمد فاروقی

کان پور

ہری چگ

صہ ۴۳ کا بقیہ

خارج ہو جاتا ہے۔

جب کبھی شہر میں کوئی بڑا آدمی مرتا ہے تو ہری چگوں کا جھلڑ وہاں اُترتا ہے، پُرسا دیتا ہے۔ اسی دوران میں وہ یہ جائزہ بھی لیتا ہے کہ مرنے والے کا کون سا لڑکا قابو میں آسکتا ہے۔ یاد کیجیے قصۂ چہار درویش کے پہلے درویش کی داستان۔ اس کے والد کی وفات کے بعد ہری چگوں نے اس پر یلغار کی تھی۔ مگر ان میں غیر ہری چگ بھی شامل تھے۔ ان میں کچھ چمچے بھی تھے جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا ہر بات پر نثار کرتے تھے۔ یہ چمچے امربیل کی طرح ہوتے ہیں، جو درخت پر اس وقت تک جمی رہتی ہے جب تک وہ سوکھ نہیں جاتا۔

اکثر ہری چگ ارتقائی منزلیں طے کر کے چمچہ بن جاتے ہیں۔ اور کبھی نئے نئے رُخ نکال لیتے ہیں۔ یہ اکلِ حلال کے قائل نہیں ہوتے۔ دوسرا کمائے اور یہ کھائیں۔ یہی ان کا نظریۂ حیات ہے۔

□□

نیا دور

جلد ۴۶ | نمبر ۷

اکتوبر ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر

سید امجد حسین

ٹیلیفون : ———— ۲۴۳۶۷۶

معاونین :

○ - نجیب انصاری
○ - محمد الیاس خاں

ٹیلیفون ———— ۲۴۷۱۰۸

پیشکش —
انل سروپ
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

— شائع کردہ —
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش

فی شمارہ : —— ایک روپیہ
زرِ سالانہ : —— دس روپیے

— ترسیلِ زر کا پتہ —
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

— خط و کتابت کا پتہ —
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

— بذریعہ رجسٹری —
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ یہاں پر مختلف زبانوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ رہتے ہیں۔ ہمیں ایسے ملک پر فخر کرنا چاہیے۔ ہندستان کی تاریخ میں ۲راکتوبر کا دن غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور یہ دن ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس دن ہندستان میں دو عظیم ہستیوں نے جنم لیا۔ ایک بابائے قوم مہاتما گاندھی اور دوسرے لال بہادر شاستری۔

مہاتما گاندھی کی پوری زندگی جدوجہد آزادی میں گزری۔ انھوں نے خود کو انسانی شرافت اور اعلا اصولوں کے لیے وقف کررکھا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جب وہ ہندستانی باشندوں کی حالتِ زار پر غور کرنے کے لیے جنوبی افریقہ گئے تو چکبست لکھنوی نے ایک نظم "فریادِ قوم" کے عنوان سے لکھی جس میں انھوں نے مہاتما گاندھی کو مخاطب کر کے کہا۔

وطن سے دُور ہیں ہم پر نگاہ کرلینا
اِدھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

گاندھی جی ایک بے خوف رہنما اور درویش صفت انسان تھے۔ انھوں نے ہندستان کو برطانوی سامراج کی غلامی سے نجات دلائی اور اپنی پوری زندگی جاگیردارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کرنے اور انسانیت کی بالادستی کے لیے کام کرنے میں گزاری۔ حصول آزادی کے بعد انھوں نے اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے جھونپڑی میں رہنا پسند کیا۔

گاندھی جی اپنے اعلا اصولوں پر ہمیشہ ثابت قدمی سے قائم رہے اور ہندستانی عوام کے لیے سچائی قربانی وفاداری اور عدم تشدد کی عملی مثالیں پیش کیں۔

آج گاندھی جی کو پورا ملک خراجِ عقیدت پیش کر رہا ہے۔ صحیح معنوں میں ان کو ہمارا خراجِ عقیدت یہ ہوگا کہ آنے والے دنوں میں یہ عزم کریں کہ ہم ہمیشہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ایک نئے ہندستان کی تعمیر کریں گے۔

اکتوبر ہی کے مہینے میں اُردو کے مشہور ادیب جن کو ناول نگاری کا بادشاہ کہا جاتا ہے منشی پریم چند کی بھی یاد منائی جاتی ہے۔ وہ زندگی بھر اپنے ناولوں کے توسط سے غریبوں مزدوروں اور کسانوں کی حمایت میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ ادارہ نیا دور انھیں بھی اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

کلیان سنگھ

(وزیر اعلیٰ اترپردیش)

پنڈت دین دیال اُپادھیائے

عظیم مُفکّر اور قوم پرست رہنما پنڈت دین دیال اُپادھیائے کا ہندستان کے سیاسی اُفق پر طلوع ایک اہم واقعہ تھا۔ وہ ملک کے عظیم الشان ماضی سے مستقبل کو جوڑنے والے فن کار تھے۔ انھوں نے قدیم ہندستانی فلسفۂ زندگی کی بنیاد پر ہم عصر نظام کے سلسلے میں غور کر کے اسے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے آراستہ کر کے عملی تشریح عطا کی۔ آج کے تناظر میں بھی ان کے خیالات اتنے ہی مفید نیز سماج اور ملک کے سامنے موجود مسائل کے حل کے لیے موزوں ہیں۔

اپنے معاشی، سماجی اور سیاسی نظریات سے پنڈت دین دیال اپادھیائے نے عوام الناس ہی نہیں بلکہ سیاسی رہنماؤں اور مفکروں کو بھی یکساں طور پر متاثر کیا۔ دل پسند رویّے، سادہ زندگی، عظیم خیالات اور فعالیت کے حامل پنڈت دین دیال اُپادھیائے نے اپنی ساری زندگی قومی مفادات کے بارے میں غور و فکر کرنے میں گزار دی۔ بھارتیہ جن سنگھ کے بانی ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور مفکر آچاریہ رگھو بیر کے انتقال کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو انھوں نے امید اور اعتماد کی شمع جلا کر پُر کیا۔ کشمیر کی تحریک ہو یا کسانوں، مزدوروں کا مورچہ۔ پنچسالہ منصوبہ ہو یا کوئی اور مشکل سماجی مسئلہ — پنڈت دین دیال جی نے سنجیدہ اور پُرمغز خیالات سے زندگی بھر ملک کی رہنمائی کی۔

اپنی پوری زندگی ملک کی خدمت کے لیے وقف کر دینے والے پنڈت دین دیال اُپادھیائے جی کا مقصد ملک کو سیاسی نقطۂ نظر سے مستحکم، سماجی نقطۂ نظر سے ترقی یافتہ اور اقتصادی نقطۂ نظر سے خوش حال بنانا تھا۔ نیک نیتی کے ساتھ قوم کی خدمت کرنے کی وجہ سے وہ ایک پارٹی کے ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے لئے قابلِ احترام تھے۔ ہندستانی تہذیب پر ان کا شدید اعتقاد اظہر من الشمس ہے۔ سیاسی میدان میں سرگرم عمل رہتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ بغض و حسد سے دُور رہے اور ملک کی نئی نسل کے سیاست دانوں کے لیے تحریک حاصل کرنے کا ذریعہ بنے۔ وہ ہمیشہ اصولی سیاست کے حامی رہے۔

سیاسی اور سماجی شعور کے ساتھ ساتھ اُپادھیائے جی کا ادبی شعور بھی کافی بلند تھا۔ فرصت کے لمحات میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے کی وجہ سے ان کی ادبی صلاحیتوں کا احساس ان کے قریبی ساتھیوں کو ہوا اور انھوں نے پنڈت دین دیال جی سے شہنشاہ چندرگپت کی سوانح لکھنے کی فرمائش کی۔ پنڈت جی نے صبح سے شام تک چنار میں ایک گھر کے اندر بیٹھ کر پوری کتاب لکھ ڈالی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ ملک کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور دین دیال جی ایک کامیاب ادیب کی حیثیت سے اُبھرے۔ انھوں نے صحافت کے ساتھ ادب کی تخلیق کا کام بھی کامیابی کے ساتھ کیا۔ "راشٹر دھرم" اور "پانچ جنیہ" جیسے مشہور اخباروں کی ادارت کی اور ۱۹۴۰ء میں راشٹر دھرم پرکاشن لمیٹڈ کی بنیاد رکھی۔ آگے چل کر پنڈت جی نے روزنامہ "سودیش" کی اشاعت بھی شروع کی۔

تقسیمِ ہند کے بعد ملک کے اقتصادی، سماجی، تعلیمی اور صنعتی میدانوں میں انحطاط کی وجہ سے نئی سیاسی قیادت کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر عظیم قوم پرست رہنما ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی قیادت میں اکھل بھارتیہ جن سنگھ کے قیام کا

عمل شروع ہونے پر پنڈت دین دیال اُپادھیائے نے ۲۱ ستمبر ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں ریاستی کانفرنس بلاکر پردیش جن سنگھ کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی قیادت میں ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو دلی میں اکھل بھارتیہ جن سنگھ کے قیام کے بعد دین دیال جی کی کوششوں سے ۱۹۵۲ء میں کان پور میں جن سنگھ کا پہلا کل ہند کنونشن منعقد کیا گیا۔

بے پناہ تنظیمی صلاحیتوں کے مالک ہونے کی وجہ سے پنڈت دین دیال جی کو کان پور کنونشن میں اکھل بھارتیہ جن سنگھ کے جنرل سکریٹری کا عہدہ سونپا گیا۔ انھوں نے اس ذمہ داری کو ۱۹۶۷ء میں کالی کٹ میں منعقدہ پارٹی کے کنونشن تک پورا کیا۔ پارٹی کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کرنے کے لیے پنڈت دین دیال اپادھیائے جی کو ۱۹۶۷ء کے آخر میں بھارتیہ جن سنگھ کا صدر منتخب کیا گیا۔

اس وقت کی حکومت نے ۱۹۴۸ء میں راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ پر پابندی لگانے کے ساتھ ہی اہم لیڈروں کی سرکوبی کے لیے کارروائی شروع کردی اور دین دیال جی کے سبھی اخبارات کی اشاعت بند کردی۔ اس وقت اپادھیائے جی نے اپنی دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے بند اخبارات کے بجائے دوسرے اخبارات کی اشاعت شروع کرکے اپنی بات قارئین تک پہنچائی۔ "پانچ جنیہ" بند ہونے پر انھوں نے "ہمالیہ" میگزین کی اشاعت شروع کی اور "ہمالیہ" پر پابندی لگنے پر "دیش بھگت" کی اشاعت شروع کردی۔

پنڈت دین دیال اپادھیائے ہندستانی ثقافت، اقتصادیات اور سیاسیات کے زبردست عالم تھے۔ ان موضوعات پر ان کے خیالات آج بھی اتنے ہی مفید اور ہندستانی تناظر کے مطابق ہیں۔ غریبوں کے لیے "انتودیہ" جیسے بہبودی پروگرام انھیں کے اقتصادی غور وفکر پر منحصر ہیں۔ اپنے اقتصادی نظریے کی وضاحت انھوں نے اس طرح کی ہے:

"اقتصادی منصوبوں اور اقتصادی ترقی کا پیمانہ سماج کے اوپری سطح کے افراد سے نہیں، سب سے نچلی سطح پر موجود افراد سے مقرر ہوگا۔ آج ملک میں ایسے کروڑوں انسان ہیں جنھیں انسان کا کوئی بھی حق حاصل نہیں ہے۔ حکومت کے قانون اور ضابطے، منصوبے اور پالیسیاں، انتظامیہ کا رویہ اور طریقہ کار ان کو اپنے دائرے میں لے کر نہیں چلتے بلکہ انھیں راستے کا پتھر ہی سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا نظریہ ہے کہ وہ میلے کچیلے ان پڑھ اور سیدھے سادے لوگ ہمارے لیے لائق پرستش ہیں۔ ہمیں ان کی پوجا کرنی ہے۔ یہ ہمارا سماجی اور انسانی مذہب ہے جس دن ان کو پکے اور خوبصورت مکان بنوا کر دیں گے، جس دن ہم ان کے بچوں اور عورتوں کو تعلیم اور فلسفۂ حیات کا علم دیں گے، جس دن ہم ان کے ہاتھ اور پیر کے زخموں کو بھر دیں گے اور جس دن ان کو صنعتوں اور دست کاریوں کی تعلیم دے کر ان کی آمدنی میں اضافہ کردیں گے اس دن ہمارا برادرانہ جذبہ ظاہر ہوگا۔ دیہاتوں میں جہاں وقت ساکت کھڑا ہے، جہاں ماں اور باپ اپنے بچوں کے مستقبل کو بنانے سے قاصر ہیں، وہاں جب تک اس امید اور انسانیت کا پیغام نہیں پہونچ پائے گا، تب تک ہم قوم کے شعور کو بیدار نہیں کرسکیں گے۔ ہماری عقیدت کا مرکز ہمارے لیے لائق پرستش' ہماری کوششوں کا آلہ اور ہماری کامیابیوں کا پیمانہ وہ انسان ہوگا جو آج حرف بہ حرف بے گھر، محروم اور مظلوم ہے"۔

دنیا بھر میں جاری آج کے سبھی سیاسی، سماجی اور اقتصادی "نامکمل ازموں" سے اوپر اُٹھ کر انھوں نے ایک بے مثال اور ہمہ جہت انسان دوستی کا عملی تصور دیا جس میں انسان کی ہمہ جہت ترقی پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ تحقیق کی کہ کیسے "نر" (عبد) سے "نارائن" (معبود) بننے کے مراحل طے کیے جا سکتے ہیں۔

پنڈت دین دیال اپادھیائے جی ملک کے اتحاد اور سالمیت کے تحفظ کے لیے پوری طرح وقف تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ہر لمحے کو سماج کی خدمت میں لگایا۔ انھوں نے حالات کے ہاتھوں مجبور ہوکر کبھی اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ بے خوف کردار، نرم گفتار لیکن

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

شعلے بنیں گے جو وہ شرر بانٹ رہا ہوں

میں فکر و معانی کے گہر بانٹ رہا ہوں
جنسِ ہنر و ذوقِ نظر بانٹ رہا ہوں

سوچا کہ سبھی ہمسفروں کو یہ بتا دوں
آجاؤ کہ میں زادِ سفر بانٹ رہا ہوں

جس رات کا انجام دکھائی نہیں دیتا
اُس رات میں انوارِ سحر بانٹ رہا ہوں

احباب میں کوئی بھی تہی دست نہ رہ جائے
اس طرح سے میں جنسِ ہنر بانٹ رہا ہوں

دیکھو تو بہت فرق ہے سنگ اور گہر میں
میں سنگ نہیں صرف گہر بانٹ رہا ہوں

گلزار میں جو بلبلِ نالاں سے ملا ہے
ہر بزم میں وہ دیدۂ تر بانٹ رہا ہوں

افکار کے اشجار پہ جو پختہ ہوئے ہیں
جذبات کے وہ خام ثمر بانٹ رہا ہوں

یارو! ادب و شعر کی ٹھٹھری ہوئی شب میں
شعلے جو بنیں گے وہ شرر بانٹ رہا ہوں

مجھ کو جو بزرگوں کی عنایت نے دیا ہے
اوروں میں وہی ذوقِ نظر بانٹ رہا ہوں

مجھ کو جو کبھی میر نے، غالب نے پلائی
میں آج اسی مے کا اثر بانٹ رہا ہوں

ورثے میں جو اقبال سے رومی سے ملا ہے
میں تم میں وہی خونِ جگر بانٹ رہا ہوں

کہتا ہوں پھر اک بار رفیقانِ سفر سے
آجاؤ کہ میں زادِ سفر بانٹ رہا ہوں

○

—— جگن ناتھ آزاد
اے ۲۵، گورنمنٹ کوارٹرز، گاندھی نگر
جموں توی

حسن واصف عثمانی
قبر ماموں بھانجہ۔ حیدر مرزا روڈ۔ لکھنؤ

گاندھی جی: سچائی کی تلاش کا سفر

ہندستان کی قریبی تاریخ میں اثر انگیزی کے لحاظ سے گاندھی جی کو پہلا مقام حاصل ہوا تو اس میں حیرت کی بات نہیں ہے لیکن حیرت کی بات یہ ضرور ہے کہ گاندھی جی کے بارے میں نہ ان کے عقیدت مندوں کا رویہ عقلی رہا نہ ان کے مخالفوں کا۔ ان کے عقیدت مند بے شمار تھے اور مخالف بھی کم نہیں تھے۔ دونوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں نے گاندھی جی کو صرف سیاست کی سطح پر دیکھا۔ ان کی پوری شخصیت کو قبول کرنے یا مسترد کرنے والے پہلے ہی ناپید تھے اور اب بھی ہیں۔ یہ المیہ اس لیے رونما ہوا کہ آزادی کی قومی تحریک میں گاندھی جی سب سے بڑے عوامی رہنما تھے۔ وہ کانگریس کے ممبر ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ سب تسلیم کرتے تھے کہ کانگریس آخر کار وہی کہتی اور کرتی ہے جس کو منظوری حاصل ہو اور جس کو گاندھی جی نے ہنسی خوشی، اپنے ذاتی فیصلے یا حالات کے دباؤ سے جبر و اکراہ کے ساتھ قبول کر لیا ہو۔ آخری صورت حال کی مثال ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے سانحے کے وقت پیش آئی تھی، جس پر گاندھی جی کا نہ دل تیار تھا اور نہ عقل۔

گاندھی جی سے انصاف کرنے کے لیے ان کو چند امتیازی خصوصیات کے ساتھ دیکھنا ہوگا جو ان کے وجود کا لازمی حصہ تھیں۔ ان کی پہلی خصوصیت ان کی غیر معمولی اخلاقی حس یا اخلاقی شعور تھا۔ مولانا آزاد نے گاندھی جی کی اس خصوصیت کو، بیک وقت کسی مسئلے کے دونوں پہلو دیکھ لینے کی حیرت انگیز صلاحیت کہا ہے۔ یہ بیک وقت کسی چیز یا کسی چیز کے منفی اور مثبت سفید اور سیاہ پہلو دیکھ لینے کی حیرت انگیز صلاحیت ان کے اخلاقی شعور کا نتیجہ تھی وہ صرف سیاست داں نہیں تھے کہ کامیابی کی عارضی پرچھائیوں کا تعاقب کرتے۔ کسی مقصد کے حصول کے لیے ان کے نزدیک ذریعہ یا وسیلہ بھی مقصد کی طرح پاکیزہ ہونا لازمی تھا۔ سیاست یا اقتدار کی سیاست میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن گاندھی جی کے پاس بے قید اور بے میل خالص سیاست کی گنجائش نہیں تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ ان کے وجدان کا سرچشمہ ان کی اپنی ذات میں تھا۔ گاندھی جی اکثر اس کا تذکرہ اپنی "اندرونی آواز" کے نام سے کرتے تھے۔

وجدان کے اس سرچشمے کو سمجھے بغیر گاندھی جی سے انصاف نہیں ہو سکتا اور نہ بھرپور شخصیت کو بھلا یا سمجھایا جا سکتا ہے۔ یہ وجدان ایک طرف ان کے سناتن دھرم یعنی زندگی کی پوری ہندو روایت پر ان کے بے لچک یقین کی وجہ سے تشکیل ہوا تھا تو دوسری طرف اس پر جدید مغربی لبرل ازم، روشن خیالی اور انسان دوستی کی روایت کا گہرا اثر تھا۔ بلاشبہ گاندھی جی ہندو دھرم کی زبان بولتے تھے۔ اسی کے استعارے اور کنائے استعمال کرتے تھے اور اسی کے تصورات کا پرچار کرتے تھے جو شردھا، بھگتی اور کرم یوگ کا مثلث بناتے ہیں لیکن ان کے الفاظ و تصورات میں بلا کی تازگی اور روح عصر سے ایسی ہم آہنگی بھی ملتی ہے جو مغربی لبرل ازم، روشن خیالی اور انسان دوستی سے ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔ وہ قدیم اور جدید دونوں تھے۔ اہنسا، ستیہ گرہ اور رام راج کی اصلاحوں کے پہلو بہ پہلو انھوں نے مساوات، رواداری اور دوسرے افراد کے احترام پر بھی برابر زور دیا۔

اخلاقی شعور کی بنیاد پر گاندھی جی نے بہت سے ایسے سیاسی قدم

اٹھائے یا فیصلے کیے، جن سے اتفاق نہیں کیا گیا اور جب کانگریس میں قیادت کی پہلی صف نے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تو اس میں خوشدلی نہیں تھی۔ یہ گاندھی جی کو پوری طرح نہ سمجھنے کا نتیجہ تھا۔

تشدد کے ایک بڑے واقعے کے بعد ستیہ گرہ بند کرنے کا اعلان ہو یا حالات کے جائزے کے بعد تحریک ملتوی کرنے کا فیصلہ۔ گاندھی جی کے اقدام اکثر فوری طور پر پسند نہیں کیے گئے۔ سبھاش چندر بوس کی تیز و تند طوفانی شخصیت اور بھگت سنگھ جیسے انقلابیوں کی سیاست سے گاندھی جی نے کوئی مفاہمت پسند نہیں کی کیونکہ وہ اخلاقی شعور کی کسوٹی پر مقصد ہی کو نہیں، بلکہ مقصد اور منزل تک پہونچنے کے وسائل اور ذرائع کو بھی پرکھتے تھے۔ یہ اجتماعی سیاست سے جُداگانہ اور ماورا ایک بے حد انفرادی سیاست تھی۔ جو بھیڑ بھاڑ کی آوازوں کو نظر انداز کر کے اپنی اندرونی آواز پر غور کرتی تھی۔

گاندھی جی نے مذہب کو ایک ذاتی تجربہ بنا کر سمجھا تھا۔ زندگی کے ہر مرحلے پر ان کا شخصی تجربہ ان کو سناتن دھرم کے راستے پر آگے بڑھاتا رہا۔ لیکن ان کے زندہ اور بیدار ذہن نے ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ غور و فکر اور نئی روشنی سے کبھی نہیں گھبرائے ان کے ذہن کا اندازہ ان کے طرزِ تحریر سے ہوتا ہے جو بے حد سادہ لیکن مربوط نثر کی بہترین مثال ہے۔ الجھے ہوئے خیالات یا پیچیدہ جملوں سے پرہیز ان کی نثر میں بڑی کاٹ پیدا کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہی الفاظ سادہ اور آسان زبان کی تخلیق کرتے ہیں مگر یہ زبان فکر و جذبے دونوں کا اظہار کرتی ہے۔

گاندھی جی کی نثر کا جوہر ان کی سیاسی تحریروں میں نہیں کھلتا بلکہ ان تحریروں میں کھلتا ہے جو سماجی اور انسانی مسائل کی چھان پھٹک کرتی ہیں اور دھرم اور اخلاقی زندگی کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں۔ گاندھی جی کی نثر کی بہترین مثال ان کی انگریزی میں لکھی جانے والی آپ بیتی ہے، جس کو خود انھوں نے "سچائی کی تلاش میں میری آزادانہ تلاش و تحقیق" قرار دیا تھا۔ اس کا اُردو میں ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے "تلاشِ حق" کے نام سے کیا تھا۔ اصل و ترجمہ دونوں مربوط منطق اور بلا کی رواں دواں نثر کا مقامی نمونہ ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے ایک ماہر تعمیر کا کام لیا گیا ہے۔ اینٹ پر اینٹ رکھ کر ایک سادہ لیکن دلکش اور بے حد متناسب عمارت بنائی گئی ہے۔ اینٹ پر اینٹ رکھنے اور ایک خیال کو دوسرے خیال سے مربوط کرنے اور ایک احساس کو ٹھیک ٹھیک دوسرے احساسات کی زنجیر پہنانے میں اس کتاب کی نثر حرفِ آخر ہے۔ یہ آپ بیتی بے تکلف لیکن سنجیدہ ہے اور سادگی کے ساتھ اس تاریخ اور فلسفہ کو بیان کرتی ہے جس نے موہن داس کرم چند گاندھی کو 'گاندھی جی' اور 'مہاتما گاندھی' بنایا تھا۔

آزادی کی تحریک میں بے شمار گم نام اور مشہور نام شامل رہے ہیں لیکن ان میں کوئی نہ ایسی نثر لکھ سکتا تھا اور نہ کسی نے لکھی۔ وجہ یہی ہے کہ یہ کام صرف گاندھی جی کر سکتے تھے۔ جن کی بھرپور شخصیت میں تاریخ اور فلسفہ کے تانے بانے مل کر ایک ہو گئے تھے اور جن کے اخلاقی شعور نے ان کے ہر قول و فعل کو کھلی دھوپ میں سب کے سامنے نمایاں کر دیا تھا۔

گاندھی جی، ان کی زندگی، ان کی نثر اور ان کی آپ بیتی سب ایک ہی حقیقت کے پرتو ہیں اور یہ سب تلاشِ حق کے ایک مسافر کی ایسی سرگزشت ہیں جو کبھی باسی نہیں ہوگی۔

□□

ایجنٹ حضرات کو

نیا دور بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جاتا ہے بعض ایجنٹ اکثر و بیشتر وی۔ پی۔ نہیں چھڑاتے۔ اس صورت میں محکمہ کو بڑا خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اسلئے ایجنٹ حضرات سے اپیل ہے کہ وہ وی۔ پی ضرور چھڑا لیا کریں۔ وی۔ پی نہ چھڑانے کی صورت میں ایجنسی ختم کی جا سکتی ہے۔ (ادارہ)

غزل

حدِ اختیار سے بڑھ گیا خلشِ حیات کا سلسلہ
ترے گیسوؤں کو بھی چھو نہ لے مرے غم کی رات کا سلسلہ

مری سادگی کا عروج تھا ترے عہدِ شوخی و ناز میں
کہ سکوں کی آڑ میں بھی رہا وہی سانحات کا سلسلہ

تری انجمن میں کوئی رہے تو کس اعتماد و امید پر
نہ عتاب و لطف کا واسطہ نہ تکلفات کا سلسلہ

تو بدل دے طرزِ نگاہ کو تو سراغِ منظرِ نو ملے
کہ لیے ہے لاکھوں تجلیاں ابھی حادثات کا سلسلہ

سفرِ شعاعِ جمال کی نہیں طور منزلِ آخری
مرے اجڑے گھر کے چراغ تک ہے تجلیات کا سلسلہ

وہ نظر ابھی نہیں آشنا خم و پیچ شرحِ نیاز سے
مری آہِ سرد نہ توڑ دے کہیں التفات کا سلسلہ

تو خدائے ظلمت و نور ہے تو ہوں میں بھی خالقِ آرزو
تری کائنات سے مل گیا مری کائنات کا سلسلہ

مجھے کیا بہشت کی ہو طلب کہ اداشناس مجاز ہوں
یہ مشاہدات کا مرحلہ وہ تصورات کا سلسلہ

مجھے کوثر اپنا شباب غم نہیں بھولتا کہ ہے سامنے
وہ ہجوم شوق کی ساحری وہ تخیلات کا سلسلہ

کوثر جائسی
۱۰۲/۹۵ کرنیل گنج۔ کان پور

ڈاکٹر مظفر حنفی
اقبال پروفیسر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ

تصوّر کے صنم خانے

یادش بخیر! سرسیّد احمد خاں نے ایک انشائیہ نما مضمون لکھا تھا۔ عنوان اس کا تھا "گزرا ہوا زمانہ" ایک سن رسیدہ شخص اپنے بچپن، لڑکپن، جوانی، ادھیڑ عمری اور بڑھاپے کے کوائف و حالات یاد کرتا ہے اور سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا ہے کہ اس نے عمرِ عزیز کے پچپن برس فضول تفریحات اور بے مصرف کاموں میں گنوا دیئے اسی ذہنی سفر کے دوران اس کی ملاقات نیکی کی دُلہن سے ہوتی ہے اور اس کا رنج دوگنا ہوجاتا ہے کہ اگر اس نے اپنی زندگی خلق خدا کی خدمت اور ملک و قوم کی اصلاح میں بسر کی ہوتی تو اسے نیکی کی دُلہن سے دائمی رفاقت نصیب ہوتی۔ انشائیے کے اختتام پر قاری کو ایک خوش گوار دھچکا سا لگتا ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل وہ بوڑھا نہیں ایک بچّہ ہے جس کی قوتِ متخیّلہ نے اسے آئندہ زندگی کا ایک ہولناک نقشہ دکھایا تھا اور اب وہ خوش ہے کہ زندگی کا صحیح مصرف اس کی سمجھ میں آچکا ہے۔

اس کہانی کا ہیرو اپنے حال سے تو خیر واقف ہے ہی کہ اسی میں سانس لے رہا ہے لیکن اس کے تصوّر نے جو صنم خانے آباد کر رکھے ہیں ان کا ہر ایک جھروکا کھلنے پر وہ حال سے مستقبل میں جا پہنچتا ہے اور وہاں سے اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتا ہے اور اسے تاریک پاتا ہے۔ پھر دوسرے جھروکے سے وہ مستقبل کے ایسے مناظر دیکھتا ہے جو صالح زندگی بسر کرنے پر اسے نصیب ہو سکتے ہیں۔ اس طرح دراصل سرسید احمد خاں کا ہیرو اپنے حافظے، اپنے مشاہدے اور اپنے تخیل کی مدد سے تصوّر کے صنم خانوں کی تشکیل کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آدمی اور جانور میں فرق ہی یہ ہے کہ اوّل الذکر تصوّر کے صنم خانے آباد کر سکتا ہے اور جانور اس سے محروم ہیں ــــ باور کیجیے کہ اگر ان میں یہ صلاحیت ہوتی تو آج وہ بھی آدمی کی طرح ارتقا کی منزلیں طے کر کے اس مقام پر پہونچ چکے ہوتے جس کا تصوّر ان کے اب و جد نے صدیوں پہلے کیا ہوتا۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یعنی جب تنہائی کا سامنا ہوا، سیدھے تصوّر کے صنم خانے میں پہونچے اور اپنی من چاہی انجمن سجالی۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ وہاں بھی پسند نہ آئی تو مومنؔ کی طرح سب سے دامن کش ہوکر صرف خیالِ محبوب سے ہم کلام ہوگئے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کچھ وضعدار عاشقوں کے نزدیک اس طرح محبوب کو زحمت دینا مناسب نہیں۔ چنانچہ وہ شادؔ عارفی کی طرح یہ وطیرہ اختیار کرتے ہیں کہ ؎

ـــ آتے ہی اپنے بستر پر
ہوتے ہیں ہم اُس کے گھر پر

کبھی کبھار جگرؔ کی مانند یہ تجربہ بھی ہوتا ہے ؎

ہائے کافر دل کی یہ کافر خیال آرائیاں
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

اور جی چاہا تو شاد مرحوم کی طرح بزمِ یار سے لوٹ کر بھی نہ لوٹے یعنی ؎

ذرا خاموش رہنے دے کہ ذہنی طور پر ہمدم
ابھی واپس نہیں آیا ہوں میں ان کے شبستاں سے

یا پھر گلکاری تصور کی بدولت ؎

زحمتِ ہجر میں اکثر اکثر
ہم کہیں اور نکا ہیں ہیں ہم پر
کس کو اعجازِ تصور کی خبر
حسنِ تخیل و تصور یکسر
تو مرے پاس، رہے ذوقِ نظر

ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ تصور کے صنم خانے محض معشوقوں کے خیالی پیکر سے آباد ہیں۔ ذرا اس کسان کو دیکھئے جو جون کی جھلستی دوپہر میں کنٹیلی جھاڑیوں کی شیرازہ بندی کرتے ہوئے جسم کو خون پسینے میں شرابور کر چکا ہے لیکن اس کے سامنے بھی تصور کا ایک صنم خانہ جگر جگر کر رہا ہے ؎

نظر کے سامنے ہریالیاں ہیں
بدن زخمی، پسینہ بہہ رہا ہے

اور یہ جو غدار مشینی شہر کی توے جیسی جلتی ہوئی کولتار کی سڑک پر برہنہ تن رکشہ کھینچنے والا ہے کچھ دن پہلے گاؤں میں ہل چلاتے ہوئے شہر جا کر کمائی کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا ؎

رکشا چلا رہا ہوں، ابھی کل کی بات ہے
کاندھے پہ ہل کا بوجھ تھا آنکھوں میں خوابِ شہر

چنانچہ تسلیم کرنا ہوگا کہ تصور کے صنم خانے بعض اوقات حقیقت کی گرمی سے پگھلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف رنگین خوابوں کی تعبیر اس بدنصیب رکشا والے کو ہولناک حالات سے دوچار کرتی ہے بلکہ شاعر کو بھی اس انداز میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے ؎

کچے پکے ارمانوں سے جگ مگ کرتی دنیا

اتنی ساری بندوقیں شمشیر پہ کیا کرتی ہیں

یہ ہماری مختلف زبانوں اور مختلف زمانوں کے شاعر اور داستان گو ہی تھے، جن میں سے کسی نے اپنے تصورات کی دنیا میں صنم خانے سجاتے ہوئے جمشید کے ہاتھوں میں جامِ جہاں نما تھما دیا کہ لے گھر بیٹھے دنیا بھر کا نظارہ کر۔ کسی نے پیر مرد کی مدد سے دنیا کے دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے شخص کی اپنے دوست سے باتیں کرا دیں۔ کسی نے اپنے کردار کو مچھلی کے پیٹ میں مہینوں زندہ رکھا۔ کسی نے ہوا میں شہر کو آباد کیا، کسی نے ارجن کو آندھی اور سیلاب لانے والے، آگ برسانے والے بانوں سے آراستہ کیا اور کرن کو ان کا توڑ سکھایا، کسی نے ملکۂ بہار کو آسمان پر ایسے ستارے اگانے کا جادو پڑھایا کہ جن سے پوری فضا بقعۂ نور بن جائے کسی نے کل کا گھوڑا اڑایا، تو کسی نے جادوئی قالین اور تختِ رواں کو ہم دوشِ صبا بنایا۔ کسی نے جنوں اور موکلوں کو انسان کا تابع کیا کہ ان کے احکام کی پابندی کریں، تو کوئی چاند کے سفر پر گیا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ تصور کے یہ صنم خانے اتنے وسیع اور ایسے لامحدود ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔

اب اگر حقیقت پسند سائنس دعویٰ کرے کہ وہ لوگوں کو گھر بیٹھے ٹیلی ویژن پر دنیا بھر کے مناظر دکھاتی ہے۔ ٹیلی فون کے ذریعے دور دراز کے لوگوں کو ایک دوسرے سے بات کرنے کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ آبدوز کشتی میں آدمی مہینوں سمندر کی تہ میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ خلا میں متعدد مصنوعی سیارے چھوڑے جا چکے ہیں۔ اسکڈ میزائل اگر ہزاروں میل دور سے اپنے نشانے پر آگ برسا سکتے ہیں تو پیٹریاٹ میزائل ان کا سدِ باب کر سکتے ہیں۔ لائٹ بم سے سیاہ ترین رات کو دور دور تک تابناک کیا جا سکتا ہے۔ مختلف سائز کے چھوٹے بڑے ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر وغیرہ روزمرہ کی چیزیں بن گئی ہیں طرح طرح کی مشینیں اور روبوٹ ہماری ایسی ایسی خدمتیں انجام دیتے ہیں جو جنوں اور موکلوں کے بس کی نہ تھیں۔ انسان نہ صرف چاند پر جا چکا ہے بلکہ دوسرے ستاروں پر بھی کمندیں پھینک رہا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے دعوے سائنس کو زیب دیتے ہیں لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کامرانیوں تک پہونچانے میں اور سمت نمائی کرنے میں تصور کے صنم خانے ہی پیش پیش رہے ہیں۔

(باقی صـ ۲۴ پر)

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
۱۱۔ اشفاق اللہ مارگ ۔ مین آباد ۔ لکھنؤ

محبِ وطن جگر مرادآبادی

جگر جس زبان کے شاعر ہیں، اس کے خمیر میں حب الوطنی شامل ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اُردو زبان کے شاعروں اور ادیبوں کی اکثریت اپنے نام یا تخلص کے ساتھ وطنی نسبت استعمال کرتی ہے اور یہ روایت یا دستور ہنوز قائم ہے۔ نفسیاتی جائزے سے بھی اُردو کے فن کاروں میں وطن کی محبت کا جذبہ فطری اور نمایاں ہے۔ جگر میں یہ جذبہ زیادہ شدّت اور وسعت کے ساتھ ہے۔ ہماری ادبی اور سیاسی تاریخ شاہد ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے جس شدّت و صداقت اور وسعت و جامعیت کے ساتھ حبّ وطن پر اپنے احساسات و خیالات کا اظہار کیا اور وطن کی اصلاح و فلاح اور تعمیر و ترقی میں حصہ لے کر اس کا وقار بڑھایا۔ اس کی مثال دوسری زبانوں میں خال خال ملے گی۔

ہمارے ادب میں ابتدا سے ہی حبّ وطن کے نغمات موجود رہے ہیں لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر سے ان میں وسعت پیدا ہوئی سرسیّد احمد خاں اور ان کے رفقائے کار کی کوششوں سے تعلیمی، سماجی سیاسی، معاشی جیسے مسائل بھی حبِ وطن میں بیان کیے جانے لگے۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے خصوصیت کے ساتھ حبِ وطن کے مقصد و مفہوم کی وضاحت کی۔ باہمی اتحاد، قومی یگانگت خدمتِ خلق، ہمدردی، رواداری پر اہلِ وطن کو عمل کرنے کی تلقین کی۔ ۱۸۷۴ء میں بزم مناظمہ لاہور میں قائم کرکے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں حب وطن پر دونوں نے اپنے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ مولانا آزاد نے سنگ و خشت کی دوستی یا اہل و عیال کی اُلفت کے بجائے حقیقی اور وسیع معنوں میں حب وطن کو پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک وطن کی محبت کا انحصار اس کی فلاح و بہبود، تعمیر و ترقی پر ہے جو بے لوث خدمت اور ایثار و قربانی کے بغیر ناممکن ہے۔ ہر فرد کو اپنے وطن کے لیے یہ کوشش کرنا چاہیے کہ ؎

شائستگی کے ساتھ رواجِ کمال ہو
علم و ہنر میں اپنا وطن بے مثال ہو
دولت کا ہو شگفتہ وطن میں چمن سدا
اور اس سے بہرہ یاب ہوں اہلِ وطن سدا
لبریز جوشِ حبِّ وطن سب کے جام ہوں
سرشارِ ذوق و شوق دلِ خاص و عام ہوں[1]

مولانا حالی نے سب سے زیادہ خدمتِ خلق، اتحاد اور ہمدردی و محبّت کو حبِّ وطن کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ اہلِ وطن کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
گر رہا چاہتے ہو عزّت سے
بھائیوں کو نکالو ذلّت سے
ان کی عزّت تمہاری عزّت ہے

ان کی ذلت تمہاری ذلت ہے

ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی ؎۲۱

انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے حبِ وطن کے جذبات میں زیادتی اور وسعت ہوتی گئی۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل میں سیاسی، سماجی تحریکوں کا زور ہوا۔ تحریک آزادی میں شدت وقوت آتی گئی۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو مولانا حسین احمد مدنی، مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی جیسے سیکڑوں حضرات سرگرم میدان عمل میں کود پڑے۔ چکبست کے بقول حبِ قومی نقش سلیمانی بن گیا۔ جگر جیسا حساس، دردمند اور بالغ نظر شاعر اپنے وطن کے حال زار اور حکومت کے مظالم سے متاثر کیسے نہ ہوتا وہ گلشن پرست ہی نہیں، اس کے کانٹوں سے بھی نباہ کرنے والے تھے ؎

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

جگر کی وطن پرستی میں ان کی سیرت و شخصیت، ہمدردی و محبت انسانیت و شرافت کا بڑا حصہ ہے۔ یوں تو وہ صرف غزل کے شاعر تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ خود مجسم غزل تھے۔ لیکن

"ان کی غزلیں بھی انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور محبت و اخلاق کے پاکیزہ تقاضوں کی ترجمان ہیں۔ انھیں قدرت کی طرف سے انسان دوستی، دردمندی، دل سوزی اور عام بندگان خدا کی غم خواری و غم گساری کی جو دولت ودیعت کی گئی تھی وہ ان کے کلام کے ذریعہ نہیں بلکہ براہ راست ان کی زندگی اور ذاتی کردار کی وساطت سے بھی عالم انسانی میں تقسیم ہوتی رہی۔" ؎۲۵

پروفیسر آل احمد سرور نے جگر کے تصوف اور ان کی سترقیت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

"سب سے زیادہ اہم ان کی مہذب رندی ہے۔ اسی رندی کی وجہ سے وہ اپنے دور کے اہم واقعات سے متاثر ہوتے ہیں اور بنگال، چھپرا، تقسیم ہند کے بعد ملک کے فسادات اور ہندوستان میں موجودہ حکومت کے قول و فعل میں تضاد سے کڑھتے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں کہ غزل کا شاعر ملک کے ان حالات سے متاثر ہوا ہے۔ ان کا یہ شعر یوں ہی نہیں ہے۔ ترقی کے وعدوں اور رفعت کی زندگی پر بڑا اچھا طنز ہے ؎

زمانہ گرم رفتارِ ترقی ہوتا جاتا ہے
مگر اک چشمِ شاعر ہے کہ پرنم ہوتی جاتی ہے

وہ اپنے وطن ہندوستان سے بڑی محبت کرتے تھے اور جب کبھی انھوں نے رہبروں کی بعض لغزشوں کا ذکر کیا ہے تو بڑے درد سے کیا ہے۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ دلوں کی جراحتوں کے چمن کھلے ہوئے ہیں تو فریاد کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ ملک میں تنگ نظری، منافقت، تعصب جہالت سے بیزار ہیں لیکن وہ بہاروں سے مایوس بھی نہیں ہیں ان کو یقین ہے ؎

یہی زمیں ترا مسکن، یہی ترا مدفن
اسی زمین سے تو مہر و ماہ پیدا کر ؎۲۶

لیکن زمین وطن سے مہر و ماہ پیدا کرنے کے لیے بڑے خلوص، بڑے ایثار اور بڑے عزم و استقلال کی ضرورت ہے ؎۲۷

"زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ ستیز" کا نصب العین ہونا چاہیے۔ جگر کہتے ہیں ؎

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

اور

زمانے پر قیامت بن کے چھا جا
بنا بیٹھا ہے طوفاں در قفس کیا

جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے
قدم قدم پہ وہ اک شمعِ راہ پیدا کر

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

جگر نے مہاتما گاندھی کے تعزیتی جلسہ (منعقدہ ۸ فروری ۱۹۴۸ء بمقام گونڈہ) کی صدارت کرتے ہوئے ان الفاظ میں بابائے قوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا تھا جن سے ان کے نظریۂ وطن پر روشنی پڑتی ہے:-

"حضرات! میرے لیے یہ امر اور بھی زیادہ المناک ہے کہ مجھے مہاتما گاندھی جیسی عظیم المرتبت، فقید المثال فدائے ملک وملت اور برگزیدہ ہستی کے جلسۂ تعزیت کا صدر منتخب کیا گیا .... اس پیکرِ انسانیت اور محسنِ ملک وقوم کی مسلسل اور متواتر قربانیوں اور جاں فشانیوں کا نتیجہ آزادی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے لیکن ابھی تک نعماتِ آزادی سے صحیح معنوں میں متمتع ہونے کے بجائے ہم بین الاقوامی نگاہ میں ذلیل وخوار بن کر رہ گئے۔ (اس کی وجہ ان کے خیال میں یہ ہے کہ) جو انقلاب پست وذلیل اور بیمار ذہنیتوں کے درمیان آتا ہے وہ عذاب صرف عذاب بن کر اور وہ آزادی جو اعلیٰ ترین، پاکیزہ ترین ذہنیتوں کو نصیب ہوتی ہے۔ رحمت ورافت بن کر ہم کنار ہوتی ہے۔ مہاتما گاندھی کی قربانی ہماری رہبری کرے گی، وہ ایک خاص مزاجِ قومی کے تحت پیکرِ خلوص وایثار، مجسمۂ محبت واہنسا تھے۔ ان کے مضبوط عزم واستقلال، ان کی صحتِ فکرونظر، ان کے صادق جذبۂ عمل نے ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا۔ مہاتما جی درحقیقت غیر محدود طور پر عالمِ انسانیت کی تکمیل اور اس کی فلاح وبہبود اور نجات کے متمنی تھے۔ ان کا مقصد نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام تر کائنات کو جنتِ ارضی بنا دینا تھا۔" ۵ے

گاندھی جی کے حادثۂ جانکاہ پر جگر نے بڑے کرب واضطراب اور غم سے کہا تھا ؎

یہ نغمۂ حیات ہے کہ ہے اجل ترانہ سنج!
یہ دردِ کائنات ہے کہ رقص میں ہے اہرمن

ہزار در ہزار ہیں اگرچہ رہبرانِ ملک
مگر وہ پیرِ نوجواں وہ ایک مردِ صف شکن

وہی مہاتما، وہی شہیدِ امن وآشتی
پریم جس کی زندگی خلوص جس کا پیرہن

وہی ستارے ہیں مگر کہاں وہ ماہتابِ ہند
وہی ہے انجمن مگر کہاں وہ صدرِ انجمن

بابائے قوم **مہاتما گاندھی** کی سیرت وشخصیت، ان کے فیوض وبرکات اور ان کے پیغام کے متعلق ایک اور نظم کے چند اشعار پیش ہیں ؎

گاندھی جی وہ ذاتِ مکرّم
گاندھی جی وہ خلقِ مجسّم

گاندھی جی وہ محسنِ اعظم
سوگ ہے جن کا عالم عالم

آنکھیں ان کے سوگ میں گریاں
سینے ان کے غم میں ویراں

ہندو ہو یا کوئی مسلماں
جس کو دیکھو حیراں حیراں

ان کا مذہب وحدانیت
ان کا عقیدہ رُوحانیت

ان کا مسلک انسانیت
ان کی فضا روحانیت

جنگِ آزادی کے رہبر
پریم اہنسا ان کا لشکر

ظاہر میں صرف ایک قلندر
باطن میں دارا و سکندر

عمر یوں ہی خدمت میں گزاری
لاغر جسم اور گٹھری بھاری
بھارت ماتا خود یہ پکاری
پریم کا داتا پریم پجاری
ہندو مسلم مل کر گائیں
گاندھی کا پیغام سنائیں
پھول محبت کے برسائیں
جنت اس دنیا کو بنائیں ۲۶

مہاتما گاندھی کی طرح جگر بھی دنیا بھر کے انسانوں کی فلاح و اصلاح چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ تمام دنیا کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے:

"میں کسی محدود وطن کے تصور کا حامی نہیں ہوں۔ میں ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک مصنوعی حد بندیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں"۔ ۲۷

اس کے باوجود وہ ہندستان ہی کو اپنا اصلی وطن سمجھتے رہے۔ ترکِ وطن کرنے والوں کو وہ "وطن حرام" کہتے تھے۔ انھوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ:

"مجھے پاکستان میں بہت کچھ دیا جا رہا تھا مگر میں نے وطن نہیں چھوڑا۔ میں نے "آتشِ گل" میں موجودہ نظام پر تنقید بھی کی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ تنقید کیوں کی؟ سوال یہ ہے کہ شاعر اپنے وطن کو کس مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر شاعر صادق ہے تو اپنے محسوسات کا اظہار ضرور کرے گا۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ خود شاعر کی زندگی کیا بتاتی ہے"۔ ۲۸

پاکستان میں ان سے فرمائش کی گئی کہ وہ اپنی نظم "بھاگ مسافر بھاگ" (جس میں سخت تنقید کی گئی تھی) سنائیں، تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ:

"وہ اپنوں کی شکایت اپنوں کے لیے تھی، اسے غیروں کے سامنے نہیں پڑھ سکتا"۔ ۲۹

یہ نظم "آتشِ گل" میں شامل ہے۔ جس پر ساہتیہ اکاڈمی نے انعام بھی دیا ہے۔ یہ نظم غالباً ۱۹۵۰ء میں کہی گئی تھی۔ یہ نظم گیت ہے جس میں ایک آزاد ملک و وطن کے ایک نووارد مسافر سے شاعر نے خطاب کیا ہے۔

جگر صاحب برطانوی حکومت کے جبر و استبداد کے خلاف بھی بڑی جرأت، بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ حکایاتِ خونچکاں لکھتے رہے۔ مقتلِ کان پور ہو یا قحطِ بنگال یا اور کوئی قیامت خیز حادثہ۔ جگر نے بڑی بے باکی سے حکومتِ وقت کے جبر و تشدد اور ظلم و ستم کو بیان کیا ہے۔ مقتلِ کان پور پر بڑے کرب و اضطراب کے ساتھ نظم لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

چشم کشا دجانبِ رزم گہ وطن نگر
مقتلِ کان پور بیں، لاشۂ بے کفن نگر

خونِ حیات سو بہ سو خاک سرشتہ مو بمو
حلق بریدہ کو بہ کو، بچہ و مرد و زن نگر

طفل و جوان و پیر را صف بہ صف بہم بہم
دستِ جدا ز ساعد و فرق جدا ز تن نگر

بچۂ شیر خوار را پیشِ نگاہِ مادرش
چاک ز سینہ تا کمر کشتہ و بے کفن نگر

ہائے ازیں گزندگاں وائے ازیں درندگاں
ہند و بہارِ ہند را بسمل و خستہ تن نگر

سفید فام مہذب نما وحشیوں کا ایک اور دلدوز کارنامہ بنگال میں "مصنوعی قحط" کا ہے جس میں ہزاروں لاکھوں انسان بھوکے رکھ کر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ پورا بنگال قبرستان بنا دیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں:-

"بنگال کے زرخیز صوبے میں روزانہ ہزاروں مرد، عورتیں، بچے فاقوں سے مر رہے تھے ان کی لاشوں سے بنگال کے بے شمار گاؤں کے کچے جھونپڑے

اور دیہات کی سڑکیں اور کھیت اٹے پڑے تھے۔"
پورا ملک اس شقاوت قلبی سے متاثر تھا۔ جگر نے بڑے موثر اور پُرسوز انداز میں "قحط بنگال" کا منظر پیش کیا ؎

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دُور مگر دیکھ رہا ہوں

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں

بچوں کا تڑپنا، وہ بلکنا وہ سسکنا!
ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں

بے مہری و بے دردی و افلاس و غلامی
ہے شامتِ اعمال جدھر دیکھ رہا ہوں

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

جگر کو یقین ہے کہ ظالم کا ظلم ہی اس کی موت ہے۔ یہ دنیا دارالمکافات ہے۔ ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں۔ ظلم اور ظالموں کا خاتمہ ہو کے رہے گا۔
جوش نے اس طرح ایسٹ انڈیا کے فرزندوں کو متنبہ کیا تھا ؎

وقت لکھے گا کہانی اک نئے مضمون کی!
جس کی سُرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

اور اس خون سے لکھی جانے والی سُرخی تمہارے خاتمے کا فرمان ہوگا۔
اور یاد رکھو ؏

موت ٹل سکتی ہے یہ فرمان ٹل سکتا نہیں

جگر بھی "قحطِ بنگال" میں ظالموں کے انجام اور ہندوستان کے روشن مستقبل کی بشارت دے رہے ہیں ؎

انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیاد کا لُٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

ارباب وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ
اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّرِ تاباں
ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں

بیداری و آزادی و اخلاص و محبت
اک خلد در آغوشِ نظر دیکھ رہا ہوں

جگر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے وقتی حادثات اور واقعات، خواہ وہ حکومت کے ظلم و تشدد پر مبنی ہوں یا رہنمایانِ قوم کی خود غرضی و مفاد پرستی پر، شعریت کے سانچے میں اس طرح ڈھالا کہ ان میں آفاقیت پیدا ہوگئی اور جن سے ہر دور میں ہمارے دل متاثر ہوتے رہیں گے۔ مہذب رندی اور سرمستی کے باوجود وہ "ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے" کو محسوس کرتے رہے۔ یہ زمانہ بھی بڑا پرآشوب تھا۔ 'ہندوستان چھوڑو' تحریک سے پورا ملک متاثر ہو رہا تھا۔ انگریزی حکومت کے نمک خوارانِ ازلی کی ریشہ دوانیاں بھی شباب پر تھیں۔ جگر سیاست سے واسطہ نہ رکھتے ہوئے بھی ان سے بے خبر نہیں تھے۔ انھوں نے ان گندم نما جو فروشوں کے اقوال و اعمال کا پردہ چاک کیا ؎

ہندوستاں میں خیر سے ان کی کمی نہیں
لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لیے ہوئے
ظاہر میں اک مجسمۂ امن و آشتی
باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لیے ہوئے
دیتے ہیں بات بات پہ انسانیت کا درس
دل میں ہزار دشنہ و نشتر لیے ہوئے

جگر غزل کے شاعر تھے۔ نظم ان کی جولانگاہ نہیں رہی ہے لیکن جس کرب، درد اور جرأت کے ساتھ نظم میں انھوں نے مادرِ وطن کی تعمیر و ترقی، فلاح و اصلاح کے لیے برٹش حکومت کے کارلیسوں، خود غرض اور مفاد پرستوں کی قلعی کھولی، وہ ان کی حب الوطنی کی روشن

مثال ہے۔ انھیں یقین کامل رہا کہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں گی اور وطن آزاد ہو کے رہے گا۔ تحریکِ آزادی بے پناہ مشکلوں، دقتوں اور رکاوٹوں کے باوجود کامیاب ہوگی ؎

نمودِ صبحِ کاذب ہی دلیلِ صبحِ صادق ہے
اُفق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

اور اسی لیے وہ ساقی سے طلب کر رہے ہیں کہ

بدہ جامِ مے ساقی کہ در جنّت نہ خواہی یافت
سوادِ ساحلِ گنگا و گلگشتِ چمن ساقی

جگر سے پہلے مولانا حالی نے بھی ۱۸۷۴ء میں اپنی نظم "حبِ وطن" میں کہا تھا ؎

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

اور اعجاز کاکوروی نے یادِ وطن میں یہ آرزو کی تھی ؎

ٹھوکریں کھاؤں پر وطن میں رہوں
کانٹے چُبھتا ہوا چمن میں رہوں

اسی طرح جگر نے غزلوں میں بھی حبِ وطن کے راگ گائے ہیں۔ انھوں نے دشمنانِ چمن سے بڑے فخر سے کہا ہے کہ ان کو اپنے چمن میں رہنے کا پورا پورا حق ہے۔ تمھارا جبر و تشدد اس حق سے مجھ کو محروم نہیں رکھ سکتا ؎

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں، مری ملکیت یہی چار پر

جگر کی حبّ الوطنی، وطن اور ابنائے وطن کی ہمہ جہت ترقی کا احاطہ کیے ہوئے ہے وہ اپنے چمن کو سرسبز و شاداب اور پُربہار بنانے کے لیے رہبرانِ وطن کو جہدِ مسلسل کی ترغیب دیتے ہیں ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں، موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن کی روٹھی بہار اب بھی

آج اس پہ عمل کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

حواشی

۱۔ مجموعہ نظمِ حالی
۲۔ مثنویاتِ حالی
۳۔ ۴۔ فروغِ اردو جگر نمبر ۱۱۲۔۱۱۱ و ص ۵۵۵-۵۶ (اقتباسات)
۵۔ نگارشاتِ جگر: مرتبہ محمد اسلام ص ۸۹-۸۴
۶۔ جگر مرادآبادی: حیات اور شاعری۔ محمد اسلام ص ۲۸۷-۲۸۶
۷۔ جامِ نو کراچی۔ جنوری ۱۹۶۱ء ص ۵۳
۸، ۹۔ جگر مرادآبادی۔ حیات اور شاعری ص ۱۷۱

غزل

یوں کبھی نہ سوچا تھا یہ بھی حادثہ ہوگا
اپنا بھائی ہی مجھ سے ایک دن جدا ہوگا

اب تو جنگلوں سے بھی خوشبوئیں نہیں آتیں
گو کہ ہر شجر اب بھی پہلے سا ہرا ہوگا

ہم جنوں کے ماروں کی عمر کٹ گئی لیکن
فکر کھائے جاتی ہے اس خرد کا کیا ہوگا

شہرِ امن میں راشد کیا کبھی یہ سوچا تھا
غم کی شاہراہوں سے تیرا رابطہ ہوگا

—— راشد صدیقی

ضیاء الدین اصلاحی
دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

اتر پردیش کی گنگا جمنی تہذیب اور اسلامی اثرات

اتر پردیش ہمارے وسیع و عریض ملک ہندستان کی سب سے بڑی اور اہم ریاست ہے۔ اس کا رقبہ اور آبادی دنیا کے کئی آزاد ملکوں سے زیادہ ہے۔ کشور ہند کا سب سے شاداب، پر رونق اور آباد علاقہ ہونے کی بنا پر یہ ریاست ہر قسم کی علمی، ادبی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ یہاں ہندستان کے قدیم باشندوں نے بھی اپنی تہذیب و ثقافت کی یادگاریں چھوڑی ہیں اور بعد میں آنے والے لوگوں نے بھی اپنی تمدنی نقش آرائیوں اور تہذیبی نفاستوں کے نقوش ثبت کئے ہیں۔

ہندستان کی طرح اترپردیش کی تہذیب و ثقافت میں بھی مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے دھارے آکر ملے ہیں۔ وادی سندھ اور گنگا کے اس علاقہ میں جہاں اتر پردیش واقع ہے۔ ہندستان کے قدیم باشندے دراویڈی آباد تھے لیکن جب آرین فاتح کی حیثیت سے یہاں داخل ہوئے تو انھوں نے دراویڈیوں کو جنوب کی جانب دھکیل دیا۔ اس طرح اترپردیش کی تہذیب و تمدن پر ان دونوں کی چھاپ پڑی۔ بودھ مت اور جین مذہب نے بھی اس کی تہذیب و تمدن کو رنگ و روغن دیا ہے اور سکندر اعظم کی فتوحات کے ساتھ جب یونانی تہذیب ہندستان میں آئی تو اس کی لہریں بھی اس ریاست سے ٹکرائیں، اس کے بعد مسلمان آئے تو انکی تہذیب و تمدن کے عناصر بھی اس تہذیب کا جزو ہو گئے۔ انگریزوں کے زمانے میں اس ملی جلی تہذیب کا رنگ اور چوکھا ہو گیا اور اس میں انگریزوں کی تہذیب و تمدن کے نقش و نگار بھی دکھائی دینے لگے۔

اس طرح صدیوں کے مسلسل عمل کے نتیجے میں اترپردیش کی تہذیب وجود میں آئی اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے یہ ایک نئے روپ میں جلوہ گر ہوئی جس کو فروغ دینے اور عروج بخشنے میں مغل فرمانرواؤں کا بڑا دخل رہا ہے۔ اکبر اور بعض دوسرے بادشاہوں کا دارالسلطنت اترپردیش ہی تھا، ان کی بدولت اس دلفریب گنگا جمنی تہذیب و تمدن کا جنم ہوا جس میں قدیم ہندستان کی عظمت و شوکت کے ساتھ ہی عجم کا حسن طبیعت اور عرب کا سوز دروں بھی شامل تھا۔ گنگا جمنا کے سنگم کی طرح اس گنگا جمنی تہذیب و تمدن کا سنگم بھی اترپردیش تھا جس کے جلووں سے نہ صرف اترپردیش بلکہ پورا ہندستان صدیوں تک جگمگاتا رہا اور جس کی روشنی سے آج بھی اس ریاست کے عوام کی زندگی کا ہر ہر شعبہ روشن ہے۔

اترپردیش ایک زرعی ریاست ہے جو ہر قسم کے غلے کی پیداوار کے لیے مشہور ہے لیکن تیموریوں کے قدم پڑتے ہی یہ گل و گلزار ہو گئی۔ انھوں نے ایران و خراسان سے پھل پھول لاکر اسے چمنستان بنا دیا۔ ولایت سے بھی میوے منگائے، خوش نما باغ اور آموں کی قلمیں لگوائیں، چمن بندی اور تختہ بندی کی، باغوں میں عمارتیں، حوض، جدول، خیابان اور آبشار بنوائے، اراضی کا بندوبست کیا، زمین کی پیمائش کی، اس کے مختلف درجات قائم کیے۔ قابل زراعت اور ناقابل زراعت زمینوں کی تفریق کی۔ مختلف قسم کی صنعتیں جاری کیں۔ اکبر نے آگرہ اور فتحپور سیکری میں کارخانے قائم کیے۔

مغلوں نے حیوانات کی نسلوں میں اضافہ بھی کیا اور جو جانور پہلے

سے یہاں آ جاتے تھے ان کی نسلوں کی ترقی و تربیت اور وسعت پر پوری توجہ دی، رفاہ عام کے گوناگوں کام انجام دیئے۔ سڑکیں، عمارتیں، شفاخانے، لنگرخانے، پُل، کنوئیں، نہریں اور سرائیں تعمیر کیں، ڈاک کا انتظام بہتر کیا، کھانے کی بے شمار عمدہ قسمیں اور ان کے لیے طرح طرح کے برتن اور مجلسوں کی آرائش و زیبائش کی متعدد چیزیں ایجاد کیں۔ تہواروں اور تقریبات کے موقع پر پرتکلف رسمیں رائج کیں، موسیقی، مصوری اور دیگر فنون لطیفہ کو ہر قسم کی ترقی بخشی۔ غرض تیموری سلاطین کی کوششوں سے ہندوستان خصوصاً اترپردیش کی تہذیب و تمدن میں چار چاند لگ گئے۔

اترپردیش میں مختلف مذاہب، مختلف زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کے اختلاط سے جو مشترکہ کلچر اور گنگا جمنی تہذیب و تمدن وجود میں آیا اس میں مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کا جوہر اور عطر شامل تھا اس لیے اس کے اثرات نہایت دور رس ہوئے اور آج بھی یہ اترپردیش کے عوام میں جاری و ساری ہیں۔

اترپردیش میں ہندو اور مسلمان کافی بڑی تعداد میں ہیں۔ ان کے مذاہب و عقائد مختلف اور جدا جدا ہیں لیکن انھوں نے ایک دوسرے کے تمدنی و تہذیبی اثرات اس طرح قبول کر لیے ہیں کہ اب ان کو جدا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ دونوں صدیوں سے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے آپس میں اس قدر گھل مل گئے کہ من و تو کا فرق مٹ گیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کے رسم و رواج، بود و باش کے طریقوں اور زبان وغیرہ کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ ان میں غیریت اور اجنبیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ لباس، پوشاک اور کھانے پینے میں ایک دوسرے کے اثر کو علاحدہ کرنا بہت دشوار ہے۔

مسلمان اگرچہ باہر سے آئے لیکن یہاں وہ انگریزوں کی طرح اجنبی بن کر نہیں رہے بلکہ اس سرزمین کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا، اور شادی بیاہ کر کے یہاں کے باشندوں میں گھل مل گئے۔ اترپردیش کے مسلمانوں کی بڑی تعداد ہندی الاصل ہے وہ یہیں پیدا ہوئے اور اسی خاک کا پیوند ہوئے، ان کے پرکھوں نے کسی زمانے میں اسلام قبول کر لیا اس لیے ان کا دین تو اسلام ہو گیا لیکن معاشرت، کلچر، تہذیب اور رہن سہن وہی رہا۔ اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ تہذیب و تمدن عورتوں کے ذریعے زیادہ پھیلتا ہے۔ اترپردیش میں جو مسلمان باہر سے آئے تھے ان میں سے بھی اکثر نے یہیں کی عورتوں سے شادیاں کیں جو پہلے ہندو تھیں، ان کے ذریعہ ہندوؤں کی تہذیب و معاشرت مسلم گھرانوں میں پہونچ گئی۔

اترپردیش کے مسلمانوں میں یہاں کے ہندوؤں کی تہذیب و معاشرت کس قدر رچ بس گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان میں بھی پیدائش کے موقع پر چھٹی، چلّا، سوہل، ٹوٹکے اور زچہ بچہ کے متعلق ساری ہندوانہ رسمیں رائج ہیں۔ شادی میں مانجھا، منڈوا، بارات، سہرا، بری، بدھاوا، ڈولہ، بابُل، چوتھی، چالا، نیگ اور جہیز وغیرہ مسلمانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ موت کے سلسلے میں تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسواں، ترماہی، چھماہی، برسی، مردہ کی ہر چیز سے چھوت، قبض روح کی جگہ چراغ جلانے وغیرہ کا رواج ہندو مسلمان دونوں میں ہے۔ مسلمانوں میں خوشی کی تقریبات کے سارے گانے ہندی ہیں۔ ہولی اور بسنت کے تیوہار اکثر مسلمان بھی مناتے ہیں۔ جن مردوں اور عورتوں میں مذاق کا رشتہ ہوتا ہے وہ ہولی کے موسم میں ایک دوسرے پر عبیر و گلال اڑاتے ہیں۔

اترپردیش کے اکثر مسلمان ہندوؤں کے تہواروں میں ان کے گھروں پر جاکر ان کو بدھائی دیتے ہیں، ان کی اکثر رسموں اور دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں، ان کے سکھ دکھ کے موقع پر بھی حاضری دے کر اپنائیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہندوؤں کے میلوں میں بھی جانا اکثر مسلمانوں کا مرغوب مشغلہ ہے۔

اترپردیش کے مسلمانوں کے عقائد میں بھی ہندوؤں کی تہذیب و تمدن کا اثر و نفوذ دیکھا جا سکتا ہے وہ ہندو جوگیوں، فقیروں اور سادھو سنتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ نذر و نیاز، فاتحہ، بھوت اور چڑیل کا تصور ان کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ تصوف میں یوگ اور ویدانت کی بہت سی شکلیں اور بزرگانِ دین کے عرسوں کے اکثر مروجہ طریقے غسل، گاگر، صندل، چراغاں، چادر اور قوالی سب ہندوؤں کے تمدن و تہذیب کا نتیجہ ہیں۔

دوسری طرف اس ریاست کے ہندوؤں پر مسلمانوں کی تہذیب و

تمدن کا اثر بھی پڑا۔ ان کے بعض فرقوں اور گروہوں میں مسلمانوں کے ذریعے توحید کا تصور آیا۔ معاشرت میں ستی کی رسم کا خاتمہ ہوا، اور عقد بیوگان کا رواج ہوا، لڑکیوں کی وراثت، طلاق، چھوت چھات سے نفرت اور مساوات وغیرہ دوسری بہت سی اصلاحات مسلمانوں ہی کے تہذیب و تمدن کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔

اترپردیش کے مختلف علاقوں میں ہندو عورتیں مسجدوں کے سامنے اس لیے قطار لگا کر کھڑی ہو جاتی ہیں کہ نمازیوں سے جھاڑ پھونک کرائیں۔ جمعرات کو قبروں اور مزاروں پر چراغ جلاتی ہیں، چڑھاوا چڑھاتی ہیں۔ درگاہوں پر جاکر منتیں مانگتی ہیں۔ بہرائچ میں سید سالار مسعود غازیؒ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر ہندو اور مسلمان دونوں یکساں عقیدت سے حاضر ہوتے ہیں اور نذر و نیاز کرتے ہیں، ریاست کے مختلف مقامات پر ہر سال سید سالار مسعود غازیؒ کا میلہ لگتا ہے، اس میں بھی مسلمانوں کی طرح ہندو بھی شوق و رغبت سے جاتے ہیں۔

عید، بقرعید کی مبارکباد دینے، خوشی کی تقریبات اور شادی و غمی کے موقع پر مسلمانوں کے یہاں ہندو پڑوسیوں اور دوستوں کا آنا بہت عام ہے۔

بہت ساری چیزوں میں اترپردیش کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت بالکل ایک جیسی ہو گئی ہے۔ مثلاً لباس اور پوشاک میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ کرتہ، پائجامہ، قمیص، شیروانی ہندستانی کوٹ، دو پلڑی یا کشتی نما ٹوپی، سلیم شاہی یا انگریزی جوتے، اسی طرح بہت سارے انگریزی لباس بلا امتیاز ہندو مسلمان شہری تعلیم یافتہ طبقہ استعمال کرتا ہے۔ دیہاتی مسلمان اور ہندوؤں کے لباس میں اور زیادہ یکسانیت ہے۔ دھوتی ہندو مسلمان دونوں پہنتے ہیں اور ساڑیاں ہندو عورتوں کی طرح مسلمان عورتیں بھی پہنتی ہیں۔ مسلم خواتین کا لباس شلوار اور جمپر ہندو عورتوں میں بھی رائج ہو گیا ہے۔

اترپردیش میں ہندو اور مسلمان دونوں کی روزانہ کی غذاؤں میں سبزیوں، ترکاریوں، دال، چپاتی، چاول، پوری، سہالی، اچار، چٹنی اور مٹھائیوں کی قسموں کا یکساں رواج ہے۔ چائے اور ناشتہ کے سامان بھی یکساں ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کے بعض طبقوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کو اب گوشت اور انڈے کے استعمال سے بھی پرہیز نہیں رہا۔ مسلمانوں کے جو پرتکلف کھانے ایرانی تھے، اب انھوں نے ہندستانی شکل و صورت اختیار کرلی ہے۔

کھانے پینے، رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے طریقے، گھروں میں استعمال ہونے والے برتن، مکانوں کے ساز و سامان اور طرز آرائش و زیبائش میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے یہاں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ دونوں کے اسباب و سامان کی ظاہری وضع قطع اور سج دھج میں کافی یکسانیت ہوتی ہے درختوں، پھلوں اور پھولوں کا بھی یہی حال ہے۔ مکانات بھی ایک جیسے ہوتے ہیں جو ملی جلی تہذیب و ثقافت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ مغلوں اور دوسرے مسلم فرمانرواؤں کے فن تعمیر میں ایرانی و ہندستانی صناعی کا دلکش امتزاج ہے جو ہند و مسلم کلچر اور تمدن کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ جون پور کی اکثر عمارتیں ابراہیم شاہ شرقی کے وقت میں تعمیر ہوئیں۔ ان کے دروازے اور دالانیں ایرانی طرز کے ہیں لیکن اندر کی گیلریاں اور کھمبے ہندو طرز کے ہیں۔

اترپردیش میں ہندو اور مسلمانوں کے اختلاط اور تہذیب و تمدن کے میل جول کا اثر ان کے علوم و ادبیات پر بھی پڑا۔ یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مذہب، علوم اور ادبیات سے گہری واقفیت ہے۔ مسلمانوں نے برج بھاشا میں شاعری کی اور عربی سے سنسکرت میں کتابوں کا ترجمہ کر کے اترپردیش کی تہذیب و تمدن کا وقار بڑھایا اکبری دور کا گل سرسبد عبدالرحیم خان خاناں ہندی شاعری میں بہت باکمال تھا۔ ابوالفضل، فیضی اور نقیب خاں سنسکرت اور ہندو فلسفہ و ادب کے ماہر تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے علوم ہندی و سنسکرت میں اور سنسکرت اور ہندی علوم کو عربی فارسی میں منتقل کیا۔

رحیم، تلسی داس کے ہم عصر ہندی شاعر تھے اور دونوں میں بڑی الفت و محبت تھی۔ کبیر ہندو رنگ میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ ہندو انھیں ہندو اور مسلمان انھیں مسلمان کہتے تھے۔ شیر شاہی عہد کے ملک محمد جائسی بھاشا کے اونچے درجہ کے شاعر تھے۔ ان کی مثنوی

پدماوت آج بھی مشہور ہے۔ یہاں اس کی تفصیل مقصود نہیں ورنہ اس قسم کی مثالیں اور بھی ہیں۔

یہ دل چسپی یکطرفہ نہ تھی۔ ہندوؤں میں بھی بالخصوص پنڈتوں اور کائستھوں نے مسلمانوں کے علوم وادبیات سیکھے، ان کے مذہب اور مذہبی علوم سے پوری واقفیت بہم پہونچائی اور فارسی زبان وادب میں بڑی مہارت حاصل کی۔

اترپردیش کے مشترکہ تمدن اور دلفریب گنگا جمنی تہذیب کی سب سے اہم اور دلکش یادگار اُردو زبان ہے۔ گو اس کے مولد ومنشا میں اختلاف ہے لیکن اس کو پروان چڑھانے میں اس ریاست کے دونوں فرقوں کی مشترکہ کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ اس کی زمین اور قواعد بھاشا کے ہیں مگر فارسی و عربی الفاظ کے گل بوٹے بھی اس میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ اترپردیش میں اُردو کے ہندو شعرا نے مسلمانوں کی اہم شخصیتوں اور مقدس افراد پر اور ان کے مذہبی موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ یہی حال مسلمان شاعروں کا بھی ہے انھوں نے ہندوؤں کی مایہ ناز ہستیوں کا ذکر عقیدت واحترام سے کیا ہے۔ بھیم وارجن کی شجاعت وبہادری کے نغمے گائے ہیں اور رام چندر جی کے بن باس اور دوسرے مذہبی امور پر موثر نظمیں کہی ہیں۔

اُردو شاعری، خصوصاً اترپردیش کی شاعری میں ہندو کلچر، ہندی تہذیب وثقافت، ہندوؤں کی معاشرت وتمدن، ان کے افکار وخیالات، آداب ورسوم اور اس ریاست کے قدرتی مناظر اور طبعی وجغرافیائی اثرات پوری طرح موجود ہیں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی خالص مذہبی نوعیت کی شاعری بھی ان سے خالی نہیں ہے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ اترپردیش جس عظیم الشان مشترکہ اور گنگا جمنی تہذیب وتمدن کا حامل رہا ہے، اس کے اثرات آج بھی یہاں کے تمام باشندوں میں موجود ہیں۔ اس تہذیب کو بنانے سنوارنے اور چمکانے میں اس ریاست کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے پورا حصہ لیا ہے اس وراثت کو باقی رکھنے اور آگے بڑھانے ہی سے یہاں کے مختلف فرقوں اور جماعتوں میں اتحاد و یک جہتی، میل ملاپ، اخوت، محبت اور رواداری اور بے تعصبی کی فضا قائم رہ سکتی ہے۔ □□

[illegible]

آسمانِ آزادی

پھر
وہ ایک مہر کا پیکر
وہ صورتِ مہتاب
وہ روشنی کا سمندر
وہ چاندنی کا تھا اک چشمۂ مسلسل بھی
نقیبِ نور تھا
اور نور کا پیمبر بھی
عجب مزاج تھا
اُس کا
عجیب فکر اُس کی
وہ چاہتا تھا کہ
یہ نور ایک مرکز پر
نہ منجمد ہو
نہ ساکت ہو اور نہ رُک پائے
وہ چاہتا تھا کہ
یہ نُور ایک حق کی طرح
بکھیر دے
قلوبِ انساں پر
کہ جس سے
گھور اندھیروں کا راج مٹ جائے

جاوید برقی
ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ (اُردو)
نشاط گنج۔ لکھنؤ

پریمی رومانی
معرفت شری ستیہ پال ڈوگرا۔ پریس موڑ، باغ باہو۔ جموں

ایک جائزہ

جوش ملیح آبادی کی غزل

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی
——— جوش ملیح آبادی

غزل اور اردو کا رشتہ جسم و جاں کا رشتہ ہے۔ اردو کے وسیع ادبی سرمائے میں غزل کی شان اور نزاکت آج بھی وہی ہے جو برسہا برس پہلے تھی۔ اس کی رسیلی آواز آج بھی دل کی وادیوں کو شاداب کرتی ہے۔ میر، غالب، ذوق، داغ، اقبال وغیرہ اس شادابی کی علامت ہیں، جنھوں نے غزل گوئی میں اپنے منفرد خیالات سے انقلاب برپا کیا۔ اقبال کے بعد اس کارواں میں اگر جوش کو بھی شامل کر لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جوش نے اپنی منفرد آواز سے اردو غزل کو ایک نیا رخ دیا۔ حالاں کہ وہ غزل کے مخالف تھے۔ لیکن سیماب کی طرح اردو کی غزلیہ شاعری سے دامن نہ بچا سکے۔ ڈاکٹر محمد حسن اپنے ایک مضمون "جوش ملیح آبادی ——— ایک عہد آفریں شخصیت" میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ———

"جوش ملیح آبادی بنیادی طور پر مفکر نہیں شاعر ہیں اور شاعر بھی نظم کے۔ زندگی بھر وہ غزل کے خلاف رہے۔ مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ غزل کا لہجہ ان کو روایتی نظر آیا اور اس سانچے میں رہ کر وہ تجربے کے مربوط بیان کے لیے تنگ معلوم ہوا اور مخصوص رموز و علائم کی بنا پر ذاتی کے بجائے روایتی انداز کے لیے زیادہ موزوں لگا"۔ [1]

جوش ملیح آبادی نے دستور زمانہ کے مطابق اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور اپنے انفرادی خیالات سے اس کے دامن میں نئے رنگ بھر دیئے۔ جوش ابتدا میں اقبال کے رنگ میں شعر کہنے لگے اور خطیبانہ شاعری سے اپنی روح کا درد انڈیلنے لگے۔ ابتدا میں انھوں نے اقبال کے انداز بیان کا چربہ اڑانے کی کوشش کی۔ [2] لیکن جلد ہی انھیں محسوس ہوا کہ انھیں اپنے مخصوص انداز میں بات کہنی چاہیئے۔

جوش نہ صرف ایک کامیاب نظم گو شاعر تھے بلکہ انھوں نے غزل کے وسیلے سے اردو شاعری کو ایک نئے موڑ پر کھڑا کر دیا۔ ان کی غزلوں میں وہی فکر و نظر کی گہرائی پائی جاتی ہے جو ان کی نظموں کا حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی غزلوں میں موضوعات کی یکسانیت اور تراکیب کا روایتی رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن کبھی یہ تراکیب کسی بھی حالت میں گراں نہیں گزرتیں۔

جوش کی شاعری میں حافظ شیرازی، میر تقی میر، غالب نظیر اکبر آبادی، انیس، مومن اور اقبال کی شاعری کا پرتو جلوہ گر ہوتا ہے۔ کہیں کہیں تو ان کی غزلیں حافظ کی بعض اچھی غزلوں کا منظوم ترجمہ معلوم ہوتی ہیں ؎

ع نہ جانے رات کو کیا مے کدے میں مشغلہ تھا
——— (جوش)

ع مے کدہ یارب سحر چہ مشغلہ بود ——— (حافظ)

ﮯ صبر کر اے دل کہ پھر وہ شاہِ خوباں آئے گا
پھر ترے پہلو میں یادِ فتنہ ساماں آئے گا (جوش)

ع یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور
(حافظ)

ﮯ ہزار بار کیا عہدِ ترکِ صہبا کا
مگر تبسّمِ ساقی خطا نہیں کرتا (جوش)

ع مگر تبسّمِ ساقی نمی کند تقصیر
(حافظ)

اس طرح جوش کی انفرادیت مجروح ہوگئی ہے۔ خیالات اور اندازِ بیان کی بات تو اور ہے۔ جوش نے پورے کے پورے مضامین ردیف و قافیہ کے ساتھ حافظ اور نظیری سے اخذ کیے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن اپنی کتاب میں جوش کے اس رویّے پر وضاحت سے روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں :-

> "غزلوں میں بھی جوش نے تازگیِ احساس کو برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر اس کوچے میں وہ اپنا منفرد رنگ پیدا نہ کر سکے۔ انھوں نے حافظ اور نظیری کی متعدد غزلوں کو اُردو میں اپنا لیا ہے۔ پوری پوری غزلوں کے مضامین، قافیہ اور ردیف کے ساتھ اپنا لیے ہیں۔" [۳]

لیکن اس کے باوجود جوش کی بعض غزلیں ایسی ہیں جو اپنی تازگی اور شادابی کے باعث انفرادی مقام کی حامل ہیں۔ یہ غزلیں اپنے نئے رنگ و روپ، کیف و سرمستی اور تازگی و توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ان غزلوں میں جہاں ایک طرف حیاتی محاکات کے عمدہ نمونے ملتے ہیں وہاں دوسری طرف مشاہدے کی صداقت اور موضوعات کا تنوع بھی جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ جوش روایتی شاعری کے پرستار ہی سہی لیکن پھر بھی انھوں نے چند ایسے نئے تجربے کیے ہیں جن سے اُردو غزل کا دامن وسیع ہوگیا ہے۔ اسی لیے نظم کے ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جوش غزل کے اچھے اور باوقار شاعر بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے درج ذیل اشعار پیش کیے جاتے ہیں ﮯ

چھلکا چمن میں جام کہ یہ رو بھی دیکھ لے
سبزے پہ اوس اوس پہ مے مے پہ چاندنی

اے حسن اگر عشق خریدار نہ ہوتا
یہ غلغلۂ گرمیِ بازار نہ ہوتا

خود اپنا ذوقِ اسیری ہے پاؤں کی زنجیر
حضور آپ کی زلفوں کے خم کی بات نہیں

دُنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا

پنہاں تھیں جس میں روح کی گہری خموشیاں
اس جنبشِ نظر کو غزل خواں بنا دیا

سخن فروشیاں نہ کر جہانِ حسن و عشق میں
کہ یاں ہر ایک خال میں ہیں لاکھ نکتہ دانیاں

جوش کی غزلیں اگرچہ ان کی نظموں سے الگ اور جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں لیکن پھر بھی ان میں نظموں کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہی فکری اور فنی رکھ رکھاؤ جس سے ان کی نظمیں قابلِ توجہ بن گئی ہیں، ان کی غزلوں میں بھی نظر آتا ہے۔ اسی لیے ان کے خیالات میں ربط پایا جاتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی غزلوں میں تہ در تہ معنویت، بلند پروازی، تاثیر وسعت اور ہمہ گیری نمایاں ہے۔ یہاں بھی وہ مختلف موضوعات کو اپنے انوکھے انداز میں برتنے کے قائل ہیں۔ اسی لیے ان کی اکثر غزلوں میں رنگینی اور رعنائی پائی جاتی ہے، حالانکہ بعض غزلوں میں تسلسل اور خیالات کی یک رنگی ملتی ہے اور نظم کا سا احساس ہوتا ہے لیکن اس کے

برعکس یہ اپنی شان دار نزاکت اور جُداگانہ کیفیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

جوش نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور بڑی اچھی اچھی غزلیں کہیں۔ جب ان کا شعور بالغ ہو گیا تو ان کی غزلوں میں بھی ایک نیا رنگ اور نیا بانکپن پیدا ہونے لگا۔ اگرچہ انھوں نے روایتی غزل سے انحراف کیا لیکن اس سے دامن نہ بچا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش نے اپنی غزلوں میں جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ انھوں نے مستعار لیا ہے۔ ان کی بیشتر غزلوں میں میر، غالب، حسرت اور فانی وغیرہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی انھوں نے اپنے رنگ اور لہجے سے کام لیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

جوش ملیح آبادی کی غزلوں میں ان کے سب سے پسندیدہ موضوع حسن و عشق کی چھاپ بھی ملتی ہے۔ یہ چھاپ ان کی نظموں میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن جہاں تک ان کی غزلوں کا تعلق ہے، وہ ان میں بھی اس موضوع کو ایک خاص اور انفرادی جگہ دیتے ہیں۔ جوش کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ محبوب کو مختلف پیرائے میں دیکھنے اور جانچنے کے قائل ہیں اور پھر وہ اپنے انوکھے انداز سے اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔ محبوب کے خدوخال کی تعریف کرنا جوش کی غزل گوئی کا ایک خاص جوہر ہے۔ انھوں نے محبوب کو اپنی شاعری میں ایک خاص جگہ دی ہے اور اسے نئے انداز اور نئے رنگ و آہنگ میں پیش کیا ہے۔ جوش کا محبوب کے تئیں عقیدت کا اظہار بڑا دلچسپ ہے۔ وہ حسن کے شیدائی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی عشق کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :-

" ان کی غزلیں قدیم غزلوں سے مختلف ضرور ہیں لیکن ان میں غزل کا مزاج ضرور ملتا ہے۔ عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی ان میں موجود ہے۔ لیکن ان کو جوش نے اپنے زاویے سے پیش کیا ہے "۔ ۲۵

ایک اور جگہ اپنی اسی کتاب میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:-

" جوش نے حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے غزل کی روایت سے کام لیا ہے لیکن اس سلسلے میں بعض نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ ان کے یہاں بعض نئی علامتیں بھی ملتی ہیں اور کچھ نئے اشارے بھی نظر آتے ہیں " ۲۶

بہر حال کچھ بھی ہو، جوش نے اُردو کی عشقیہ شاعری کو ایک نیا انداز بخشا۔ ان کے یہاں محبوب کی قد و قامت کا بھی خیال ہے۔ حسن کی نازبرداری اور عشق کی مزاج پرسی ان کا شیوۂ گفتار ہے۔ عشق کے تئیں جوش کے عقیدت و احترام کا اندازہ درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

اے حسن اگر عشق خریدار نہ ہوتا
یہ غلغلۂ گرمیٔ بازار نہ ہوتا

انگڑائیاں لیتا کوئی اے جوش دمِ صبح
خورشید سے پھر دست و گریباں نظر ہوتا

اے حسن داد دے کہ تمنائے عشق نے
تیری حیا کو عشوۂ ترکانہ کر دیا

ہزار بار کیا عہد اس نے مجھ سے وفا
جو ایک بار بھی وعدہ وفا نہیں کرتا

جوش کی شاعری میں عورت کا تصور ایک منفرد انداز اور علاحدہ پہچان رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں نہایت ہی دلنشیں پیرائے میں عورت کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ تعلیم نسواں کے مخالف نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عورت میں قوت اور فکر و نظر کی وہ گہرائی پیدا ہو جائے۔ خاتون مغرب کا حاصل ہے۔ جوش ہر زاویۂ نگاہ سے عورت کو جانچنے

پر کھنے کے قائل ہیں۔ اگرچہ عورت کے متعلق جوش کا تصوّر کم و بیش جاگیردارانہ ہے لیکن وہ اس کو حسن کی دیوی پکارنے کے قائل ہیں۔ اور اس کو حسن و عشق کا مجسمہ قرار دیتے ہیں۔ جوش نے بہت سی مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں جو بے شمار خوبیوں کی حامل ہیں۔

جوش ملیح آبادی کی غزلوں میں رنگین تشبیہات و استعارات کا استعمال بکثرت ملتا ہے اور یہ تشبیہات و استعارات ایک نئی صورت حال اختیار کرتے ہیں تو خیالات و معنی کا ایک وسیع سمندر سامنے آجاتا ہے۔ لیکن بعض جگہوں پر روایتی تشبیہات اپنے پورے شد و مد کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ جوش کی شاعری میں نئی اور پرانی تراکیب کا سنگم بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں طواف کعبہ، حسنِ مجاز، شمیم عنبرفشاں، گل بیز، گوہر بار، گلشن بکف، کاکل، شمع فروزاں تمنا وغیرہ جیسی تراکیب اپنے نئے مفہوم میں سامنے آتی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر تراکیب روایتی ہیں لیکن یہ بعض جگہوں پر نئی نئی گوشے سامنے لاتی ہیں۔

جوش ملیح آبادی الفاظ پر قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی اور عربی زبانوں پر بھی دسترس رکھتے ہیں اسی لیے ان کی شاعری میں ایک نیا امتزاج پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے یہاں لفظوں کا استعمال، تراکیب کی چستی اور آسان بندشیں ملتی ہیں۔ اگرچہ ان کی غزلوں میں فارسی اور عربی تراکیب کی بہتات ہے لیکن یہ غزلیں لائق مطالعہ ہیں۔

جوش، سخت، فارسی آمیز، سپاٹ اور کھردری زبان استعمال کرنے کے قائل ہیں جو بعض جگہوں پر ان کی غزلوں کے لیے موزوں نہیں لگتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اچھی اور معیاری غزلیں بھی زبان کے اس برتاؤ کا شکار ہوگئی ہیں۔

جوش ملیح آبادی واقعہ نگاری اور فضا سازی میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے اشعار حقیقت پر مبنی ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی بھی واقعہ کو غلط انداز میں بیان نہیں کیا ہے۔ انھوں نے جہاں اپنی غزلوں میں روایت کی پاسداری کا لحاظ رکھا ہے وہیں وہ جدیدیت کا احترام بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور یہی ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔

□□

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر محمد حسن : معاصر ادب کے پیش رو ص ۱۴

۲۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی : فکر و فن ص ۱۳۶

۳۔ ڈاکٹر محمد حسن : شناسا چہرے ص ۲۴

۴۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی : جدید شاعری ص ۱۶۶

۵۔ ایضاً ص ۱۶۶

تصوّر کے صنم خانے

ص ۱۰ کا بقیہ

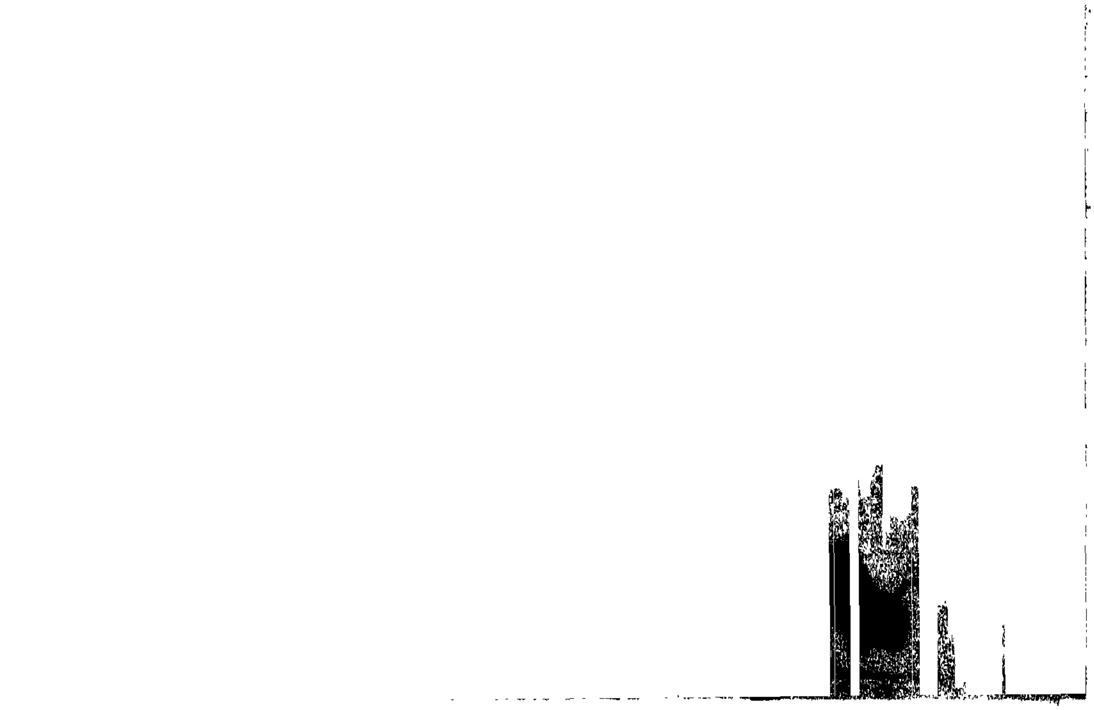
انسان نے تصوّر کے یہ صنم خانے اس لیے آباد کیے تھے کہ وہ گم شدہ بہشت، جہاں سے اس کا جدّ اعلیٰ زمین پر پھینک دیا گیا تھا اسی زمین پر بس جائے لیکن صورتِ حال مختلف نظر آتی ہے۔ بقول شاعر

تبسم سب کے ہونٹوں پر، محبت سب کے سینوں میں
مگر تعبیر الٹی ہے مرے رنگین خوابوں کی

سائنس کی اس درجہ ترقی کے باوجود متعدد بیماریوں کا علاج ممکن نہیں ہے۔ کروروں لوگ آج بھی بھوکے اور ننگے ہیں۔ ہمارے ارد گرد غموں سے چور دنیا ہے اور دکھ سے بسورتے ہوئے چہرے۔ دلوں میں کدورتیں کارفرما ہیں تو ذہن سازشیں بُن رہے ہیں۔ ہر طرف دہشت گردی کا زور اور قتال و جدال کا بازار گرم ہے۔ تعصب اور تنگ نظری کا دور دورہ ہے اور مذہب و اخلاق، تعلیم و تہذیب غرض ہر شعبۂ حیات پر خود غرضانہ سیاست کا غلبہ نظر آتا ہے۔ ان حالات کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنے تصورات میں وہ صنم خانے از سرِ نو آباد کریں جن میں تخریبی عناصر کی جگہ تخلیق اور تعمیر کی حکمرانی ہو اور جو انسان دوستی، خوش خلقی، کشادہ نظری اور حق پرستی، مساوات، خداترسی، ایثار پیشگی اور رحم دلی کی خدمات کو عام کرنے میں اہل دانش کی رہنمائی کر سکیں۔

اعلا شری کلیان سنگھ ۱۳ر ستمبر ۱۹۹۱ء کو ودھان بھون لکھنؤ میں "ہندی دیوس" کے موقع پر
ہوئے۔ اِس موقع پر شری اٹل بہاری باجپئی جی موجود تھے۔

وزیر اعلا شری کلیان سنگھ ۱۲ر ستمبر ۱۹۹۱ء کو لکھنؤ میں محکمۂ اطلاعات و رابطہ
کی خصوصی پبلسٹی مہم کے تحت گشتی پبلسٹی گاڑیوں کو جھنڈی دکھا [redacted]

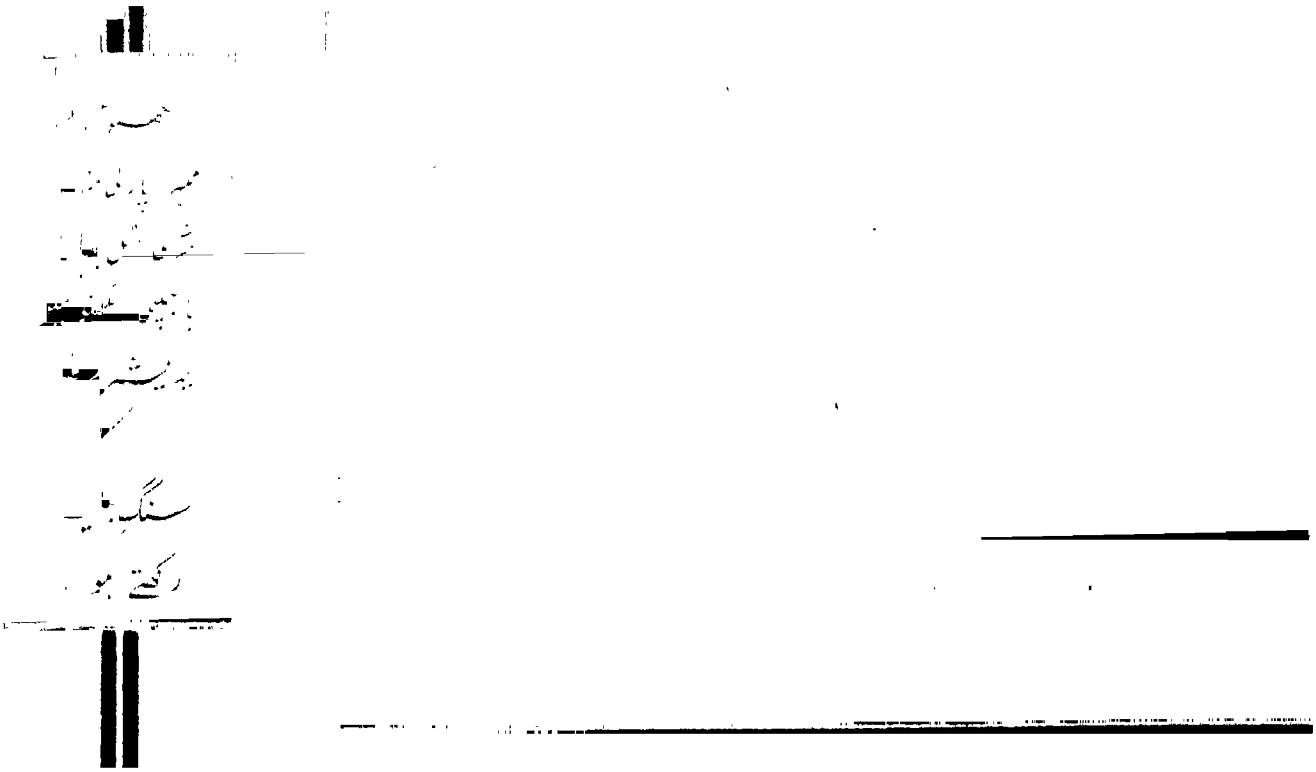


[illegible]

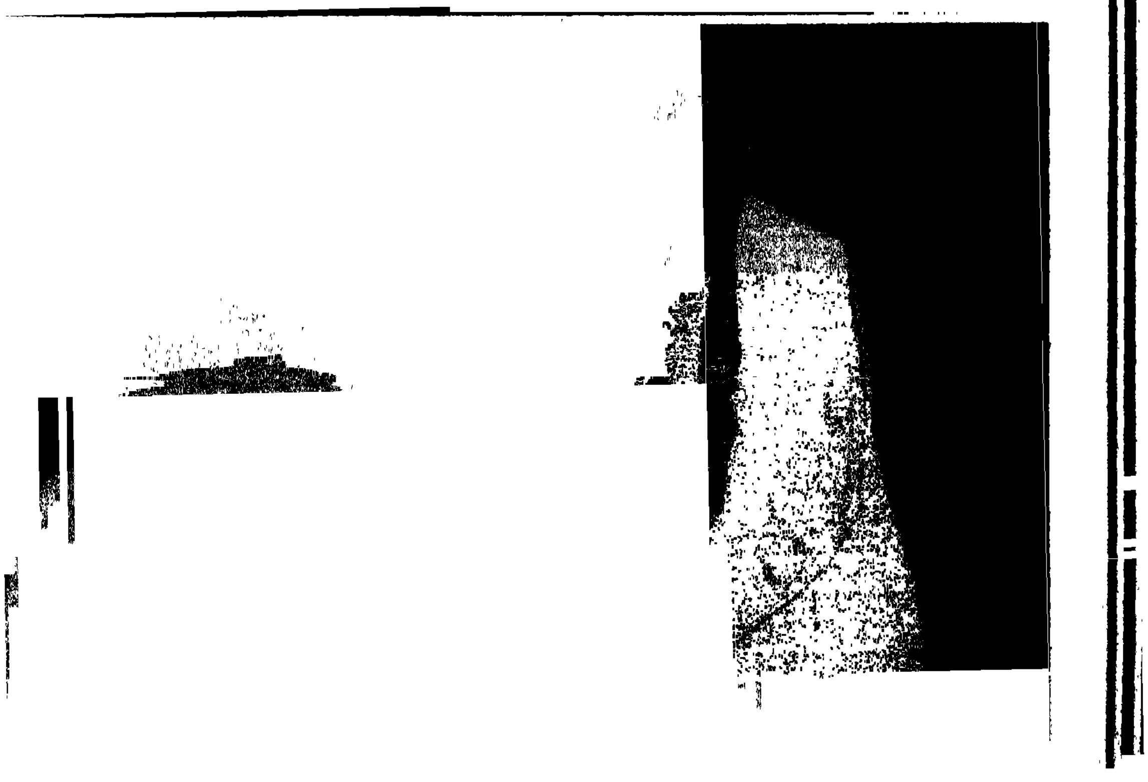




… او یونیسیف کے تعاون سے چلائی جانے والی خصوصی …
… تقسیم کرتے ہوئے۔



وزیر اعلا شری کلیان سنگھ ۱۴ر ستمبر ۱۹۹۱ء کو گنا سنستھان آڈیٹوریم لکھنؤ میں ڈاکٹر
کنور چندر پرکاش سنگھ کو 'بھارت بھارتی ایوارڈ' دیتے ہوئے۔



کاظم علی خاں
۴۱۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ

تحریکِ آزادیٔ ہند اور لکھنوی ادب

(۱)

اُردو زبان نے ہندستان میں اپنے ادبی ایوان کا جو عظیم الشان نگار خانہ تیار کیا ہے وہ ہندستانی زندگی کے رنگا رنگ نقش و نگار کا آئینہ دار ہے اور اس میں ہمیں ابار در ابار ایسے مرقعے بھی جلوہ گر نظر آتے ہیں جن میں کہیں تو ہندستانیوں پر انگریزوں کے ظلم و جور کی داستان بیان کی گئی ہے اور کہیں انگریزی حکومت کے جبر و استبداد کے خلاف ہندستانیوں نے تحریکِ آزادی کے تحت جو یادگار معرکہ آرائی کی تھی اس کے مختلف پہلوؤں یا مرحلوں کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ مجاہدینِ جنگِ آزادی کی بھرپور حمایت و تائید بھی کی گئی ہے۔ اُردو ادب میں جنگ آزادی کی خوں چکاں حکایات لکھنے کی روایت خاصی قدیم رہی ہے اور اردو کے شعراء و نثر نگار اگر بہ الفاظِ غالبؔ یہ دعویٰ کریں تو غلط نہ ہوگا ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے [۱]

ہندستانیوں نے حصولِ آزادی کے لیے انگریزوں سے جو معرکہ آرائی کی تھی اس میں مجاہدینِ آزادی کی ہم نوائی کرنے میں اُردو شاعری شروع ہی سے پیش پیش رہی ہے۔ اس کی اولین ادبی مستند مثال ہمیں میر حسنؔ کے تذکرہ شعرائے ہندی میں ملتی ہے اور اس کا تعلق سرزمینِ بنگال پر ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کی صبح کو ہونے والی اس جنگِ پلاسی سے ہے جس میں والیِ بنگال نواب سراج الدولہ کو خود اپنے ایک نمک فراموش درباری میر جعفر کی سازش کا شکار ہو کر انگریزوں کے ہاتھوں ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا تھا اور اس کے چند روز بعد ہی ۴ جولائی ۱۷۵۷ء کو فرنگیوں کے دلّال میر جعفر کے بیٹے میرن کے حکم پر سراج الدولہ قتل کیے گئے تھے [۲]

میر حسن کا بیان ہے کہ سراج الدولہ کی شہادت کی خبر جب عظیم آباد کے صوبے دار راجا رام نرائن موزوںؔ (شاگرد شیخ محمد علی حزیںؔ) کو ملی تو انھوں نے بہ گریہ و زاری فی البدیہہ یہ شعر کہا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری [۳]

فرنگیوں کے ہاتھوں تجارت کے پردے میں ہندستان کے معاشی استحصال پر مصحفیؔ نے یوں اظہارِ خیال کیا ہے ؎

ہندستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی [۴]

تاریخ شاہد ہے کہ اودھ کی سیاست میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی جو داخلت والیِ اودھ نواب شجاع الدولہ کے دورِ حکومت کے آخری زمانے (۱۷۶۵ء) سے ہونا شروع ہوئی تو پھر حکومتِ اودھ کو اس سے کبھی اپنی زندگی میں نجات نہ مل سکی۔ یہاں تک کہ فروری ۱۸۵۶ء میں اودھ کی حکومت نے سیاستِ فرنگ کی قربان گاہ پر دم ہی توڑ دیا۔

اس تاریخی پس منظر کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ تلخ حقیقت بہ خوبی واضح ہو جائے گی کہ شجاع الدولہ کی وفات (جنوری ۱۷۷۵ء)

کے بعد جب ان کے فرزند نواب آصف الدولہ نے جولائی ۱۷۷۵ء کے آس پاس اودھ کی راجدھانی کو فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو اس وقت تک اودھ میں فرنگی سیاست اپنے قدم جما چکی تھی۔ گویا اودھ کی نئی راجدھانی لکھنؤ اپنی تعمیر و تشکیل کے آغاز ہی سے انگریزوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنی رہی ہے۔ لکھنؤ کے ایک اہلِ قلم نے اس سیاسی صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"لکھنؤ کی سماجی تعمیر میں کوئی نیا نظریہ یا کوئی فلاحی نقطہ نظر یا کسی اہم ذاتی جد و جہد کا اتنا دخل نہیں تھا جتنا ہندستان کی مرکزی قوتوں کے انتشار کا، اسی لیے اودھ کی تہذیب کو استوار کرنے والے عناصر مثبت کے بجائے زیادہ تر منفی قسم کے رہے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کا تن آور درخت کھوکھلا ہو کر جڑیں چھوڑ چکا تھا جس کی وجہ سے آس پاس کے نوخیز پودوں کو غذا کھینچ کھینچ کر نشوونما پانے کا موقع مل گیا تھا جن زوال آفریں قوتوں نے مغلیہ سلطنت کو ایک ظرفِ گلی بنا دیا تھا وہ ان نوخیز پودوں کو باقاعدگی کے ساتھ پھولنے پھلنے کا موقع نہیں دے سکتی تھیں۔ ان چھوٹے چھوٹے پودوں کو کچھ عرصہ کے لیے بڑھنے اور پھیلنے کا موقع اس لیے دیا گیا تھا کہ یہ ہندستان کی وحدت کو ختم کرنے میں مدد دیں ورنہ ان سب کے لئے آخرکار آتشِ فرنگ کا ایندھن بننا مقدر ہو چکا تھا۔ ایک مسموم فضا ہندستان میں پھیل چکی تھی جس میں اودھ اور یہاں کی دوسری سلطنتوں کو سانس لینا تھی، یہاں جو کچھ فارغ البالی، اطمینان اور سکون تھا وہ سب مصنوعی اور سطحی ہونے کے ساتھ ساتھ عارضی اور وقتی تھا جس طرح کسی پھانسی پانے والے کی آخری خواہش بالعموم پوری کر دی جاتی ہے اسی طرح فرنگی صیادوں نے دار و رسن سے ہم آغوش ہونے والے چند زندانیوں کو اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وہ گومتی کے کنارے شامِ اودھ کے دھندلکوں میں عیشِ امروز کی تعب کشی سے اپنے دل کو بہلا لیں۔ یہ وقتی فارغ البالی اور شکم پری ایسی ہی تھی جیسے ذبح سے پہلے کسی جانور کو کھلا چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ کچھ کھا پی لے۔[۵۴]..."

والیانِ اودھ کو تختِ حکومت پر بٹھانا یا برطرف کر دینا انگریز ریزیڈنٹ کے اشارہ چشم و ابرو پر منحصر ہوتا تھا۔ والیانِ اودھ عہدِ آصفی سے عہدِ واجدی تک نام کے حکمراں ضرور نظر آتے ہیں لیکن پسِ پردہ اودھ میں فرنگی سیاست ہی کا عمل دخل رہتا ہے۔ اودھ کی سیاست میں انگریزوں کی اس تکلیف دہ مداخلت کی عبرت ناک داستان کا تفصیلی بیان ڈاکٹر اے۔ ایل۔ سریواستو اور ڈاکٹر صفی احمد کی "شجاع الدولہ" یا "برٹش ریزیڈنٹس اینڈ دا کورٹ آف اودھ" جیسی انگریزی کتابوں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔[۵۵] ان حالات میں اہلِ لکھنؤ کے دلوں میں فرنگی سیاست کے خلاف ردعمل کا پیدا ہونا فطری تھا اور شاہ کمال، جرأت، ناسخ جیسے شاعروں کے درج ذیل اشعار اسی ردعمل کے آئینہ دار ہیں۔ انگریزوں کی سیاسی بازی گری کا شکار ہونے والوں میں والی اودھ نواب وزیر علی خاں کا نام قابل ذکر ہے جو آصف الدولہ کی وفات (۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء) کے بعد اودھ کے حکمراں بن کر برٹش سامراج کے ہاتھوں صرف تین یا چار ماہ کے اندر معزول و مقید ہوئے تھے۔ اس واقعے کا حال شاہ کمال الدین کمال کے دیوان میں بخوبی بیان کیا گیا ہے[۵۶]

اودھ کے نظامِ حکومت میں فرنگیوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت پر قلندر بخش جرأت کی یہ رباعی ملاحظہ ہو ؎

سمجھے نہ امیر ان کو کوئی اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ (یہ) قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منھ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر[۵۸]

اسی سلسلے میں ناسخ لکھنوی کا یہ مطلع بھی قابل غور ہے ؎

دل ملک انگریز میں جینے سے تنگ ہے
رہنا بدن میں روح کو قیدِ فرنگ ہے[۵۹]

اودھ کے معاملات میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی مداخلت کا جو سلسلہ اکتوبر ۱۷۶۴ء کی جنگِ بکسر میں والی اودھ نواب شجاع الدولہ کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست کے بعد سے شروع ہوا وہ ۷ رفروری ۱۸۵۶ء کو اس وقت نقطۂ عروج پر پہنچا جب برٹش سامراج نے فرمانروائے اودھ واجد علی شاہ کو تختِ حکومت سے برطرف کر دیا۔ سلطانِ عالم واجد علی شاہ اختر اس نا انصافی کی تلافی کی غرض سے اپنا معاملہ کمپنی کے حکام اعلیٰ کے سامنے پیش کرنے ۱۳ رمارچ ۱۸۵۶ء کو لکھنؤ سے کلکتہ روانہ ہوئے[۲۸] اس سانحے پر واجد علی شاہ اختر لکھنوی کی گیارہ بند پر مشتمل جو نظم دستیاب ہوئی ہے اس کا یہ آخری بند ملاحظہ ہو ؂

سارے اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت
آگئے بس اب نہیں کہنے کی ہے مجھ کو فرصت
ہو نہ برباد مرے ملک کی یا رب خلقت
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

______ ("ہندوستاں ہمارا" دوسرا حصہ ص[۲۹])

واجد علی شاہ کے کلکتہ روانہ ہونے کے بعد انگریزوں کے دورِ اقتدار میں اہلِ لکھنؤ جس بے چینی اور بے اطمینانی سے دوچار تھے اس کی جھلکیاں ہمیں اس دور کے سحرِ سامری اور طلسم جیسے لکھنؤ کے اُردو اخباروں میں نظر آتی ہیں۔ اخبار سحر سامری لکھنؤ مورخہ ۱۵ ردسمبر ۱۸۵۶ء کا یہ تراشہ دیکھئے:۔

(الف) " اِن دنوں غلّے کی گرانی ہے گرانیِ خاطر کی ارزانی ہے اس قدر مہنگا اناج ہے، آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے، جورِ فاقہ سے اناقہ نہیں، بے معاشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا، جس نادان و دانا نے حالِ بربادی کو سُنا رو دیا۔ ایک تو معاش نہیں، جائے تلاش نہیں، دوسرے دفورِ غم سے گندمی رنگِ ہر بشر نیلا ہوا۔ گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا.... خونِ دل بجائے شراب ہے، لختِ جگر کباب ہے۔ بدحواسی کا سے زوالِ اعتدالِ مزاج ہوا۔ ہر غریب و مسکین روٹی کے ٹکڑے کو محتاج ہوا.... چکنی چپڑی باتوں سے تدبیر نہیں چلتی، بہت سر پٹکتے ہیں دال نہیں گلتی۔ حاکم اس طرف عنانِ توجہ (موڑتا) نہیں۔ بس کیا کریں کہ اکیلا چنا بھاڑ پھوڑتا نہیں۔" [۳۰]

اخبار طلسم لکھنؤ مورخہ ۱۶ رجنوری ۱۸۵۷ء کا یہ تراشہ بھی ملاحظہ ہو:

(ب) " جس دن سے سلطنت نہ رہی، شہر بگڑا، بچوں کی بن آئی۔ کسی میں حالت نہ رہی.... اسی اندھیر پر ایک مثل یاد آئی کہ اندھے کی جورو کا خدا رکھوالا ہے ..... اس نابینائی پر یہ حکومت اندھیر ہے، صاف اندھے کے ہاتھ میں بٹیر ہے ....[۳۱]

لکھنؤ کے مشہور اخبار سحرِ سامری مورخہ ۲۰ راپریل ۱۸۵۷ء (یعنی ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو شروع ہونے والی پہلی جنگ آزادی سے صرف بیس دن قبل) کی یہ دلچسپ سیاسی خبر بھی پڑھئے:

(د) " اخبار موروده لندن سے مُبرہن ہوا کہ لارڈ ڈلہوزی خیر خواہِ ہند، ترقی طلب سرکار کمپنی انگریز بہادر مبتلائے رنج و محن ہوا، یعنی پشتِ راہوار سے گر کر مانندِ تیمور لنگ ہوا، بے راہ چلنے سے دل تنگ ہوا۔ مہتمم گلشنِ نوبہار فرماتے ہیں کہ شاید دودِ آہِ دلِ درویشانِ ہند کا یہ اثر ہے، بمنزلہ زہرِ ہلاہل قندِ مکرر ہے۔ لیکن زہے نصیب کہ زیادہ عروج پایا، یعنی ان دنوں وزیرِ مہمات کا عہدہ ہاتھ آیا۔ خدا معلوم آئندہ کیا مرتبہ حاصل ہو... پیغامِ دل آزاری ہے کہ لارڈ ڈلہوزی کو (ہندوستان کا گورنر جنرل بننے کی) ہوس دوبارہ ہوئی، یہ تجویز آشکارہ ہوئی کہ خرمہرہ ہائے باقی ماندہ بنگالہ و ہند آکے پھر چھنے ہر ایک مال دار و تونگر محتاج ہو کر اپنا اپنا سر دُھنے۔ اس حسنِ نیت سے اربابِ پارلیمنٹ کے حضور میں سوال دیا..... اور انھوں نے نیک کرداری سمجھ کر منظور کیا، کس واسطے کہ ہندستان میں ابھی دو چار

ریاستیں باقی ہیں اور وہ (یعنی لارڈ ڈلہوزی) اس
شکار بازی میں نام ور مشاق ہیں۔ جس وقت ان ریاستوں
کا (ڈلہوزی کو) خیال آتا ہے ان کے دل میں ضبط
نہ ہونے سے سخت ملال آتا ہے .....“[۳۱]

انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل لکھنؤ کے اخبارات کے یہ تراشے ایسے دیواری نوشتوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے بین السطور سے ۱۸۵۷ء کا انقلاب صاف جھانکتا نظر آرہا ہے۔ یہ اخباری تراشے ثابت کر رہے ہیں کہ تحریک آزادیِ ہند کے مئی ۱۸۵۷ء میں باقاعدہ شروع ہونے سے قبل ہی لکھنؤ کی اُردو صحافت جنگِ آزادی کی ہم نوائی کرتی رہی ہے اور لکھنؤ کے اُردو اخبار انگریزی سرکار کے خلاف لکھ لکھ کر جنگ آزادی کی اس چنگاری کو ہوا دیتے رہے تھے، جس نے مئی ۱۸۵۷ء میں جنگل کی آگ کی طرح ہندستان کے مختلف حصّوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ہندستان میں یوں تو جنگِ آزادی کے باقاعدہ آغاز کی تاریخ ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء تسلیم کی جاتی ہے۔ جب میرٹھ کی انگریزی فوج کے ہندستانی سپاہیوں نے برٹش سرکار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا لیکن لکھنؤ میں جنگ آزادی کی غیر رسمی شروعات میرٹھ سے قبل ۳۰ راپریل ۱۸۵۷ء ہی سے ہوئی تھی جب موسیٰ باغ لکھنؤ میں مقیم برٹش فوج کی رجمنٹ نمبر ۷ کے ہندستانی سپاہیوں نے چربی لگے ناپاک کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کیا تھا مگر انگریز افسروں نے اس بغاوت پر قابو حاصل کرلیا تھا۔ اس ناپاک بغاوت کے ٹھیک ایک ماہ بعد ۳۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو کمپنی کی فوج کے دیسی سپاہیوں نے لکھنؤ کے شمال مغرب میں واقع ایک دیہی مقام منڈیاؤں کی چھاؤنی میں بھی بغاوت کی تھی جس پر قابو پانے میں انگریزوں کو قدرے دشواری ہوئی تھی۔ اس کے بعد باغیوں نے اگلا اہم معرکہ چنہٹ لکھنؤ کے اسماعیل گنج میں ۳۰ جون ۱۸۵۷ء کو سر کیا۔ جس میں سر ہنری لارنس کو شکستِ فاش برداشت کرنا پڑی تھی۔ باغیوں نے ۵ رجولائی ۱۸۵۷ء کو اودھ کے معزول فرماں روا سلطان عالم واجد علی شاہ کے ایک دس سالہ فرزند برجیس قدر کو لال بارہ دری لکھنؤ میں بادشاہ بنا کر حکومت کا انتظام برجیس قدر کی والدہ بیگم حضرت محل کے سپرد کردیا۔ باغیوں نے ۳۰ رجون ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی سے عنانِ حکومت چھیننے کے بعد لکھنؤ پر مہینوں تک اپنا قبضہ جاری رکھا تھا جو آخر کار ۲۲ رمارچ ۱۸۵۸ء کو باغیوں کی انگریزوں سے آخری شکست ہونے پر ختم ہوا تھا۔[۱۴]

لکھنؤ میں باغیوں کی معرکہ آرائیوں کے روحِ رواں مولوی احمد اللہ شاہ تھے۔ جو ۲ رذی قعدہ ۱۲۷۴ھ (از روئے تقویم مطابق سہ شنبہ ۱۵ رجون ۱۸۵۸ء) کو دوپہر کے وقت بہ مقامِ پوایاں (ضلع شاہ جہاں پور) قتل ہوئے تھے۔ مولوی احمد اللہ شاہ کی ان معرکہ آرائیوں کے تفصیلی حال میں فتح محمد تائب لکھنوی نے مثنوی "تواریخ احمدی" لکھی تھی جو ۱۲۸۰ھ میں تمام ہوئی تھی۔ دو ہزار پانچ سو اٹھائیس (۲۵۲۸) اشعار کی یہ طویل مثنوی لکھنوی ادب میں جنگ آزادی کی تاریخ کا ایک غیر معروف مگر اہم ماخذ ہے[۱۵] تائب لکھنوی کی یہ مثنوی اپنی تکمیل ۱۲۸۰ھ کے ۶۴ سال بعد مطبع تیغ بہادر لکھنؤ سے ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں پہلی بار شائع ہوئی تھی اور جنوری ۱۹۷۳ء میں اس کی دوسری اشاعت ہوچکی ہے۔

۱۸۵۸ء میں جب بغاوت کی ناکامی پر لکھنؤ میں برٹش سرکار نے دوبارہ اقتدار حاصل کیا تو نہ صرف باغیوں بلکہ عام شہریوں پر دار و گیر کے دروازے کھول دیے گئے۔ ظلم و ستم اور خوف و دہشت کا بازار گرم ہوگیا برٹش سرکار کے ہاتھوں لکھنؤ اور لکھنؤ کے باشندے جس تباہی اور بربادی سے دوچار ہوئے اس کا پُراثر بیان امان علی سحر لکھنوی نے یوں کیا ہے ؎

تمام ہند کی تھا جان لکھنؤ اپنا
ہمارا خسروِ جم جاہ جانِ عالم تھا
جہاں ہے قالبِ بے جاں کسی میں جان نہیں
فراق موت سے بدتر ہے اس مسیحا کا
مکان سیکڑوں سڑکوں نے کردیے مسمار
تمام شہر کا کچھ اور ہوگیا نقشا
کسی کا کُھد گیا پشتہ، کہیں گری دیوار
چبوترا کہیں غائب، کسی کا دروازا
جو کچھ خرید کو بازار تک گیا کوئی

وہاں سے پھر کے جو آیا تو گھر نہ پہچانا

————— شہر آشوب ص[۲۵۷]

جنگِ آزادی کی پاداش میں فرنگیوں کے ہاتھوں لکھنؤ کی بربادی کی دردناک داستان کا بیان لکھنؤ کے متعدد شاعروں نے کیا ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر جیسے لکھنؤ کے صفِ اوّل کے مرثیہ نگاروں کی یہ رُباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

میر انیس: —————

کیوں کر دلِ غم زدہ نہ فریاد کرے
جب ملک کو (یوں غنیم) برباد کرے
مانگو یہ دُعا کہ پھر خُدا وندِ کریم
اجڑی ہوئی مملکت کو آباد کرے [۱۶]

مرزا دبیر: —————

کس عہد میں تبدیل نہیں دَور ہوا
گر عدل گئے ظلم گئے جور ہوا
اللہ ہے وہی تو نہ مضطر ہو دبیر
کیا غم جو زمیں اور فلک اور ہوا [۱۷]

لکھنؤ کی بربادی پر منشی فدا علی عیشؔ لکھنوی نے اپنے ۴۲ بند کے مسدس "انقلابِ لکھنؤ" میں یوں اظہارِ غم کیا ہے ؎

لکھنؤ رشکِ دہِ روضۂ رضواں تھا کبھی
صاحبِ منزلت و قدر فراواں تھا کبھی
زینت و زیب دہ ملکِ سلیماں تھا کبھی
باغِ جنت کی روشِ تازہ گلستاں تھا کبھی
لوگ مشتاق تھے، دیدار کے دیوانے تھے
ہفت اقلیم میں اس شہر کے افسانے تھے

—————

اب تو مدت سے ہے یہ موردِ آفات وبلا
کون سا غم ہے کہ جس کا نہیں ہم کو شکوا
رہ گیا رنج، ہوا نامِ مسرت عنقا
جب ہو ناراض خدا کون سُنے حال اپنا

ساقیِ مرگ لیے موت کا جام آتا ہے
روز اک تازہ مصیبت کا پیام آتا ہے

————— (لکھنؤ اور جنگِ آزادی ص[۱۳۲] وبعد)

لکھنؤ میں جنگِ آزادی کی ناکامی پر انگریزوں کے عتاب سے بچنے کے لیے لوگ شہر چھوڑ کر مضافات کی جانب بھاگ گئے تھے، اس واقعے کو "بھگدڑ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے مشہور ریختی گو شاعر میر یار علی جانؔ صاحب نے اسی بھگدڑ کا ذکر یوں کیا ہے[۱۸]: ؎

اس انقلاب نے ہر ایک کو کیا محتاج
زمانہ ہو گیا بھگدڑ سے اے بُوا محتاج

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد یکم نومبر ۱۸۵۸ء سے ہندستان پر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ کوئین وکٹوریہ (ملکۂ انگلستان) کی حکومت کا دور دورہ ہوا تھا۔ شیخ فضل احمد کیفؔ لکھنوی (شاگردِ خواجہ آتشؔ و میر وزیر علی صباؔ لکھنوی) کا یہ شعر شاید اسی واقعے کی عکاسی کر رہا ہے ؎

دنیا کے ہیں مطیع ہم اہلِ جہاں تمام
عورت کی سلطنت ہے ہمارے دیار میں [۱۹]

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے موقع پر ۱۵ر جون ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے واجد علی شاہ کو ان کے مسکن مٹیا برج سے گرفتار کر کے فورٹ ولیم کلکتہ میں قید کر دیا جہاں وہ ۹ر جولائی ۱۸۵۹ء تک نظر بند رہے تھے[۲۰] واجد علی شاہ اخترؔ لکھنوی نے اپنی اس قیدِ فرنگ کا حال مثنوی حُزنِ اختری میں تفصیل سے بیان کیا ہے جس کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

تپک دل کی پھوڑے کی مانند ہے
گرفتارِ زنداں ترا رند ہے
سُنا حالِ دل اور قیدِ فرنگ
نہ اعلان قصہ میں کر تو درنگ
ہوا تک نہیں قید خانے میں آہ
ہوا بے گنہ قید، مَیں بادشاہ
یہ اخترؔ جو ہے خاکِ پائے جہاں

یہ شاہِ اودھ تھا کبھی اے جواں
مگر اب ہے محبوسِ اہلِ فرنگ
طبیعت سے جاتی رہی ہے اُمنگ
کہ برسوں مجھے قید میں ہو گئے
مرے بختِ بیدار سو سو گئے
ابھی تک رہائی کی صورت نہیں
وہ دولت نہیں ہے وہ ثروت نہیں
خدایا مجھے قید سے دے نجات
رہے پائے مردی قدم میں ثبات
الٰہی رہیں شاد یارانِ ہند
پھر آباد ہوویں جوانانِ ہند[۲۱]

لکھنؤ کے سرمایۂ شعر و سخن میں متعدد اور بھی ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں انقلاب ۱۸۵۷ء یا واجد علی شاہ کی قیدِ فرنگ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح کی نظموں میں محمد رضا خاں عاشق لکھنوی کی مثنوی "رشکِ ماہِ تمام" (زمانہ تخلیق ۱۲۷۵ھ تا ۱۲۷۶ھ) آغا حجو شرف لکھنوی (شاگرد خواجہ آتش) کی طویل مثنوی افسانۂ لکھنؤ یا خواجہ اسد قلق لکھنوی کا مسدس سفر آشوب جیسی چیزیں شامل ہیں۔[۲۲]

واجد علی شاہ اختر لکھنوی کے علاوہ لکھنؤ کے جن دوسرے شاعروں نے قیدِ فرنگ کے مصائب برداشت کیے تھے ان میں برق لکھنوی اور منیر شکوہ آبادی کے نام بھی شامل ہیں۔ فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق لکھنوی فنِ شاعری میں ناسخ کے شاگرد اور واجد علی شاہ اختر کے اُستاد تھے۔ برق لکھنوی نے اپنے شاگرد واجد علی شاہ اختر کے ساتھ فورٹ ولیم کلکتہ میں قیدِ فرنگ کی سختیاں جھیل کر ۲۸ صفر ۱۲۷۴ھ مطابق شنبہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو وفات پائی تھی۔ انتزاعِ حکومتِ اودھ کے بعد لکھنؤ کی بربادی پر برق لکھنوی کا ایک نہایت مؤثر و دردانگیز شہر آشوب زبانِ حال سے آج بھی انگریزوں کے مظالم کی داستان بیان کر رہا ہے۔[۲۳]

سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی لکھنؤ کے ان سربر آوردہ شاعروں میں تھے، جن کی شاعری کی آبیاری لکھنؤ کی ادبی فضاؤں میں ہوئی۔ منیر کو ناسخ، رشک اور مرزا دبیر جیسے لکھنؤ کے تین مشہور اُستادوں کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ اسی لیے منیر شکوہ آبادی کا کلام سرتاسر لکھنؤ کے شاعرانہ رنگ و آہنگ کا آئینہ دار قرار دیا جاتا ہے۔

منیر شکوہ آبادی (متولد ۹ ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۱۴ء متوفی ۴ رمضان ۱۲۹۷ھ مطابق ۹ اگست ۱۸۸۰ء) کے صحیفۂ حیات میں ہمیں ایک ایسا طویل باب بھی ملتا ہے جس سے انکشاف ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں نہ صرف حصّہ لیا تھا بلکہ انھیں قیدِ فرنگ سے دوچار ہونا پڑا تھا اور برٹش سرکار نے انھیں ایک قتل کے الزام میں ماخوذ کر کے ۱۸۶۰ء میں کالے پانی کی سزا بھی دی تھی۔ منیر نے جزائر انڈمان میں برسوں تک قید و بند کے مصائب برداشت کیے۔[۲۴] منیر کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی طویل داستان کا بیان اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں۔ منیر نے فرخ آباد کے متعدد مجاہدینِ آزادی مثلاً نواب سخاوت حسین خاں، نواب اقبال مند خاں نیز نواب غضنفر حسین خاں سعید فرخ آبادی کی شہادت پر کئی پُراثر قطعاتِ تاریخ کہے تھے۔[۲۵] کالے پانی کی سزا پانے پر منیر نے اپنے بارے میں یہ رُباعی کہی تھی ؎

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا
زہرِ غربت شکر فروشوں کو ملا
جب سختِ جگہ کھا کے لگی پیاس منیر
کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

(منیر شکوہ آبادی ص۴۲)

منیر نے اپنی ایک طویل غزل میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہندستانیوں کی ہزیمت کے بعد رونما ہونے والے پرآشوب دور کی تفصیلی عکاسی کی ہے۔[۲۶] انھوں نے جزائر انڈمان میں ۱۸۶۰ء سے جون ۱۸۶۵ء تک قیدِ فرنگ کے مصائب برداشت کیے تھے۔ ان کی نظم "فریادِ زندانی" ان کی اسی المناک دور کی آئینہ دار ہے۔[۲۷] (جاری ہے)

حواشی

۱؎ دیوان غالب : مطبع صدر مجلس لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۸۶ء ص۵۹

۲ رجوع کیجیے : (۱) قاموس المشاہیر (جلد اول) ، نظامی بدایونی —
نظامی پریس بدایوں طبع ۱۹۲۴ء ص ۲۸۴

(۲) انگریزی کتاب "ہسٹری آف ماڈرن انڈیا" : اے ایل سریواستو
آگرہ ۔ طبع ۱۹۶۹ء ص ۲۲-۲۳

۳ تذکرہ شعرائے ہندی : مؤلف میر حسن ۔ مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری
نظامی پریس لکھنؤ طبع اپریل ۱۹۷۰ء ص ۲۶۲

۴ بہ حوالۂ اُردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر : ڈاکٹر سید
مجاور حسین ۔ الہ آباد طبع دسمبر ۱۹۷۵ء ص ۲۰۷

۵ تنقید و تحلیل : سید شبیہ الحسن نونہروی ۔ ادارۂ فروغ اُردو
لکھنؤ طبع ۱۹۶۲ء ص ۱۰۸ تا ص ۱۰۹

۶ دیکھیے : (۱) شجاع الدولہ (جلد اوّل) ڈاکٹر آشیر بادی لال سریواستوا
درگا پرنٹنگ ورکس آگرہ طبع ۱۹۶۱ء ص ۱۹۹ تا ص ۲۵۹
(انگریزی کتاب)

(۲) شجاع الدولہ (جلد دوم) : ڈاکٹر آشیر بادی لال سریواستوا
شیوا آرٹ پرنٹرس آگرہ ۔ طبع ۱۹۷۴ء ۔ دیکھیے ابواب نمبر ۱ تا ۳ ، ۸ نیز ۹ (انگریزی کتاب)

(۳) انگریزی کتاب "برٹش ریزیڈنٹس ایٹ دی کورٹ آف
اودھ" ڈاکٹر صفی احمد ، سیو پرنٹنگ ہاؤس لکھنؤ طبع ۱۹۶۸ء

۷ ر۔ک : (۱) شہر آشوب : ڈاکٹر نعیم احمد ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی طبع اگست ۱۹۶۸ء

(۲) ہندوستاں ہمارا (دوسرا حصّہ) : مرتبہ جاں نثار اختر ۔
ہندستانی بک ٹرسٹ بمبئی طبع ستمبر ۱۹۷۴ء ص ۵۷ تا ص ۶۲

۸ اُردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر ص ۲۰۶

۹ انتخاب غزلیاتِ ناسخ :۔ مرتبہ کاظم علی خاں ۔ اُترپردیش اردو اکادمی
لکھنؤ طبع ۱۹۸۴ء ص ۱۵۰

۱۰ بحوالۂ مقالہ راقم الحروف " مطالعہ مثنویاتِ شرف " مشمولہ
دوماہی اکادمی لکھنؤ مئی جون ۱۹۸۳ء ص ۶۲

۱۱ بہ حوالۂ ہندستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) : محمد عتیق صدیقی
انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ طبع دسمبر ۱۹۵۷ء ص ۳۱۶

۱۲ ایضاً ص ۳۱۲

۱۳ بہ حوالۂ ہندستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) ص ۳۱۲ (لکھنؤ کے انیسویں صدی عیسوی کے قدیم اخبارات سے متعدد اور بھی ایسے ہی مفید مطلب تراشے پیش کیے جا سکتے ہیں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب اردو صحافت کی تاریخ : نادر علی خاں ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ طبع ۱۹۸۷ء باب ہشتم ص ۳۴۹ تا ص ۴۱۲)

۱۴ تفصیلات کے لیے دیکھیے : (۱) لکھنؤ اور جنگ آزادی ۔ ادبی اکیڈمی
لکھنؤ طبع ۱۹۵۷ء ص ۱۰۱ تا ص ۱۱۱

(۲) رسالہ فروغ اردو لکھنؤ (جنگ آزادی نمبر حصہ دوم) شمارہ
ستمبر ۱۹۵۷ء ص ۱۱۸ تا ص ۱۷۲

(۳) انگریزی کتاب " ایٹین ففٹی سیون " سریندر ناتھ سین
نئی دہلی طبع مارچ ۱۹۷۷ء ص ۱۷۲ تا ص ۲۴۵

۱۵ مراۃ احمدی (یعنی شرح مثنوی " تواریخ احمدی ") مصنفہ مولانا فتح محمد تائب لکھنوی ۔ شارح مولانا محمد ابرار حسین فاروقی گوپا مئوی ۔ نامی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۷۳ء ص ۱۳۳ تا ص ۳۱۱

۱۶ رباعیات میر انیس : مرتبہ سید محمد حسن بلگرامی ۔ اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ طبع ۱۹۷۹ء ص ۹۵ ۔ مقالہ میں ہم نے رُباعی کا دوسرا مصرعہ اپنی اصل شکل میں درج کیا ہے جو ہمیں ڈاکٹر نیر مسعود نے فراہم فرمائی ہے ۔ رباعیات انیس میں دوسرے مصرعے کی شکل یہ ہے ؎

" جب ملک کو چرخِ پیر برباد کرے "

۱۷ رباعیات دبیر : مرتبہ سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی نسیم بک ڈپو
لکھنؤ طبع جون ۱۹۶۳ء ص ۷۶

۱۸ تاریخ ریختی مع دیوانِ جان صاحب : مرتبہ سید محمد مبین نقوی ۔ مطبع
انوار احمدی الہ آباد ص ۲۴۶ نیز ص ۲۴۷

۱۹ آئینۂ ناظرین : شیخ فضل احمد کیف لکھنوی ۔ مطبع مصطفائی
لکھنؤ طبع ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) ص ۱۱۶

(باقی آئندہ)

□□

غزلیں

وار رئیسؔ اوچھا ہے تیرا ہر حملہ بیکار
کاری زخم تو دیتا ہے بس شبدوں کی تلوار

کیسے میں آزاد کراؤں خود کو خود سے یار
مجھ کو قید کیے بیٹھا ہے میرے جسم کا غار

میں تو راہی دھوپ سفر کا منزل مری سراب
کیا ڈھونڈوں میں پیڑ کا سایہ کیا دیکھوں دیوار

چند غلام اور چند مصاحب اور سکوں کا کھیل
کہاں رہے راجہ رجواڑے کہاں رہے دربار

کون اس عہد میں کہتا ہوگا یہ پیاری سی بات
میں تیری دنیا ہوں جانم! تو میرا سنسار

—— رئیس الدین رئیس
۱/۱۴۲۵، دہلی گیٹ
علی گڑھ

ہے شور دروں خانہ شفق رنگ زیادہ
اب کے سرِ آشفتہ سراں سنگ زیادہ

آواز پسِ پردۂ ہر تار ہے لرزاں
مضرابِ تنفّس شررِ آہنگ زیادہ

ہم پہلے تماشا گہِ عالم میں تھے حیراں
اب اہلِ تماشا ہی ملے دنگ زیادہ

کیا اتنی ہم آہنگیٔ رفتارِ زمانہ؟
بدلے نظر آتے ہیں ترے ڈھنگ زیادہ

ہم حلقۂ رخ مہریٔ یاراں میں رہے قید
آئینۂ رشتہ تھا ترے زنگ زیادہ

ہر لمحہ لرزتی رہیں سنگین فصیلیں
ہے تیز شر و خیر میں یہ جنگ زیادہ

—— انجم عرفانی
شعبۂ اردو۔ ایم ایل کے۔ کالج
بلرامپور۔ گونڈہ

جو اس نے کھینچ لیں میری نفس کی زنجیریں
میں لکھ سکا نہ خود اپنی غزل کی تفسیریں

خریدتا رہا میں خواب خواب جاگیریں
ہنسی اڑاتی رہیں ہر قدم پہ تعبیریں

لپکتے شعلوں کی تہذیب میں وہ یاد آئیں
گئے زمانے کی رنگین و سادہ تصویریں

جنوں کی سرحدیں ملتی نہیں خرد سے کہیں
جہت جہت سے ہے وہ محتاط اسکی تدبیریں

نہ اور دے مجھے رسوائیوں سے پُر لمحے
کہاں ہے وقت تو لوٹا دے میری توقیریں

دعا کو ہاتھ اٹھے بدرؔ تو اٹھے ہی رہیں
کبھی تو لوٹیں گی گم گشتہ اسکی تاثیریں

—— بدر نظیری
معروف گنج۔ بنیا پوکھر
گیا (بہار)

حُسینؔ ضامنؔ
سی۔ ایم۔ ایس۔ اے۔ آئی۔ آر۔ آر بنگر، نئی دہلی

ناصرؔ کاظمی : اُردو غزل کی منفرد آواز

اُردو غـزل کا ذکر کرتے وقت فارسی غزل کا ذکر کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اردو غـزل فارسی غزل کی مرہون منت ہے۔ ویسے تو فارسی میں سب سے پہلے رودکی نے غزل کہی جس کا ایک شعر ہے ؎

بوئے جوئے مولیان آید ہمی
یادِ یارِ مہربان آید ہمی

لیکن فارسی شاعری میں غزل کا عروج حافظ شیرازی کے زمانے میں ہوا۔ حافظ نے اپنی شاعری میں اپنے پورے عہد کو جس طرح برتا ہے وہ غزل کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ فارسی شاعری کی اس صنف کو جس وقت اُردو شاعری نے اپنایا تو اس وقت اس کے پاس نہ تو شاہنامۂ فردوسی جیسی کوئی شے تھی اور نہ ہی مولانا رومی کی مثنوی یا انوری اور خاقانی کے قصائد جیسی کوئی چیز۔ اُردو شاعری کے ذخیرے میں اس وقت چند مثنویاں تھیں جو اتنی بلند مرتبہ نہ تھیں لہٰذا فارسی شاعری کا یہ رویہ جب اُردو شاعری میں داخل ہوا اور اُردو غزل وجود میں آئی تو کافی مقبول ہوئی۔

غزل حالانکہ ذکرِ حُسن و عشق سے عبارت ہے مگر اُردو غزل کا کوئی بھی دور ایسا نہیں گزرا جس میں اس نے تشبیہ و استعارات میں اپنے زمانے کی روداد نہ سنائی ہو، اپنے گرد و پیش کے حالات کا محاسبہ نہ کیا ہو۔ میرؔ ہوں یا غالبؔ سبھی اپنے عہد کی داستان سناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ سلسلہ برابر چلتا چلا آیا اور برصغیرِ ہند کی تقسیم کے وقت اور اس کے بعد جن شعراء نے اپنی شاعری کی زبانی اپنے عہد اور سماج کے گرد و پیش کے حالات کی روداد سنائی ان میں ناصرؔ کاظمی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری کو نہ صرف نئی لفظیات سے روشناس کرایا بلکہ اسے ایک نیا انداز اور نیا طرزِ احساس بھی عطا کیا۔

ناصرؔ کے لب و لہجے اور اندازِ تخاطب سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے میرؔ کی روایت کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ میرؔ "آہ" کے شاعر ہیں لہٰذا ناصرؔ کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ عہدِ جدید کے میرؔ ہیں کیونکہ لب و لہجہ، آہنگ اور طرزِ احساس کے اعتبار سے دونوں شعراء میں کافی مماثلت ہے۔

میرؔ سے ناصرؔ کی دل چسپی بغیر وجہ کے نہ تھی۔ دونوں میں تجربہ اور طرزِ احساس کے ایسے مشترک عناصر ملتے ہیں کہ میرؔ سے ناصرؔ کا متاثر ہونا بہ آسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ کسی بھی شاعر یا ادیب کو سمجھنے کے لئے اس کے عہد یا معاشرتی حالات کا جاننا ضروری ہوتا ہے کیوں کہ شاعر ادیب کے گرد و پیش کے حالات اس کے کارناموں پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میرؔ کو سمجھنے کے لئے اگر ہم ان کے دور کے حالات کا محاکمہ کریں تو دیکھیں گے کہ وہ ایک پُرآشوب دور تھا۔ ایک پورا معاشرہ اور ایک پوری تہذیب روبہ زوال تھی۔ معاشرتی قدریں بکھر رہی تھیں اور ایک پورا عہد آخری سانسیں گن رہا تھا۔ میرؔ جیسے حساس شاعر کے لیے یہ پُرآشوب زمانہ بڑا جان لیوا تھا چنانچہ ان کی شاعری میں ان کے عہد کا آشوب ذہنی اور روحانی تجربہ کا حصہ بن کر سامنے آتا ہے اور میرؔ کے ذاتی رنج و الم بھی ایک ہمہ گیر رنج و الم کی شکل اختیار کر کے عظیم شاعری کو جنم دیتے ہیں ؎

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میرؔ
سرِ منصور ہی کا بار آیا

ناصر کاظمی کا رنج والم بھی ایسی ہی مماثلت رکھتا ہے۔ برِصغیر ہند کی تقسیم اور قیامِ پاکستان کے وقت ناصر جوان العمر تھے۔ پاکستان کا ایک نئے ملک کی حیثیت سے دُنیا کے نقشہ پر ابھرنا اور اس کے بعد فسادات، ہجرت، ایک پورے عہد کا خاتمہ اور ایک نئے عہد کا آغاز ایک نئے وطن اور ایک نئی سرزمین کا ظہور، اپنوں سے جُدائی، بیگانوں سے ملاقات، ناصر نے ہر چیز کا مشاہدہ کیا اور اسے محسوس کیا اور ان حادثات اور واقعات نے ناصر جیسے حساس شاعر کو بے انتہا متاثر کیا اور اس طرح ان کے عہد کے آشوب نے ان کی شاعری میں جگہ پائی اور انھیں ایک داخلی رنج وغم سے آشنا کر کے ان کی شاعری کو ایک نیا طرزِ احساس عطا کیا۔ خود کہتے ہیں ؎

عروج پر ہے مرا درد ان دنوں ناصر
مری غزل میں دھڑکتی ہے وقت کی آواز

ناصر کا تجربہ اگرچہ ان کی نسل کے دوسرے شعراء کے یہاں بھی ملتا ہے مگر ہجرت کے حوالے سے تجربے اور طرزِ احساس کی جو گہرائی ناصر کے یہاں نظر آتی ہے وہ دوسروں کے یہاں نہیں۔ ناصر کا بڑا کمال یہ ہے کہ اپنے پُرآشوب دور کو جس شدّت سے محسوس کیا اسے اسی شدّت سے اپنے تجربہ کا حصّہ بنا کر شاعری میں پیش کر دیا۔ نئی سرزمین اور نئے وطن میں آ کر نئے لوگوں سے ملنے کے بعد شاعر کے جذبات ذرا محسوس کیجیے ؎

کن بے دلوں میں پھینک دیا حادثات نے
آنکھوں میں جن کے نور نہ باتوں میں تازگی

میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

قیامِ پاکستان کے چند برسوں بعد ہی ملک میں مارشل لا نافذ ہو گیا اور پھر ایک زبردست آمرانہ دور کا آغاز ہوا۔ ایسے حالات میں جبکہ جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو اور بنیادی انسانی حقوق پر پابندی لگا دی گئی ہو، کھلے دل اور کھلے ذہن اور صاف گوئی سے بات کہنا بڑا مشکل تھا اور پھر ناصر جیسے حساس شاعر کے لیے تو اور بھی مشکل۔ مگر شاعر اپنے زمانے کے حالات کا محاسبہ کرنے سے باز نہ رہ سکا خواہ اشاروں اور کنایوں ہی میں کہی ہے ؎

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

بازار بند راستے سنسان بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

گلیوں میں اب تو شام سے پھرتے ہیں پہریدار
ہے کوئی کوئی شمع سو وہ بھی بجھی بجھی

پھول خوشبو سے جدا ہے اب کے
یارو یہ کیسی ہوا ہے اب کے

اُڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کے طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے

غزل کی سب سے بڑی اور اہم داخلی شہادت اس کا تغزل ہوتا ہے۔ اس انفرادی پہچان کی وجہ سے غزل دوسری اصنافِ ادب سے مختلف نظر آتی ہے اب یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ غزلیہ آہنگ عشق و محبّت کے ان لمحات سے پیدا ہوتا ہے جو کسی انسان پر طاری ہو جائیں تو دوسری تمام کیفیات سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غزل کے روایتی موضوعات سے مفر کسی طرح بھی ممکن نہیں کیونکہ یہ انسانی زندگی کے بنیادی خواب ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر عہد کا انسان ان خوابوں کو اپنے عہد کے پس منظر میں دیکھتا ہے۔ ناصر کی غزلیں بھی تغزل کے رنگ سے رنگی ہوئی ہیں مگر اس رنگِ تغزل میں ان کی رُوح کی تنہائی کا رنگ بھی ملا ہوا ہے جو ناصر کی انفرادیت ہے ؎

ترے خیال سے لَو دے اُٹھی ہے تنہائی
شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

میں سوتے سوتے کئی بار چونک چونک پڑا
تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی

ان اشعار میں ذرا یادوں کی کسک ملاحظہ ہو ؎

شبنم آلود پلک یاد آئی
گلِ عارض کی جھلک یاد آئی
کبھی زلفوں کی گھٹا نے گھیرا
کبھی آنکھوں کی چمک یاد آئی
پھر کوئی نغمہ گلوگیر ہوا
کوئی بے نام کسک یاد آئی

ناصر کا سب سے اہم شعری اور تخلیقی وصف یہ ہے کہ انھوں نے قیام پاکستان کے بعد جہاں ایک نئے طرز سخن کی طرح ڈالی وہاں اپنی کلاسیکی شعری روایات سے بھی رشتہ برقرار رکھا بلکہ کلاسیکی شعری روایات کے اجتماعی تجربے اور شعور کو ایک نئے طرز احساس کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ انھوں نے جس نئے طرز سخن اور نئے اسلوب بیان کی بنیاد رکھی اس سے نہ صرف ان کے ہم عصر شعراء متاثر ہوئے بلکہ ان کے بعد کی نسلوں کے شاعروں نے بھی استفادہ کیا اور ناصر کے تجربے کو آگے بڑھاتے ہوئے غزل کے نئے امکانات دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ناصر کے طرز سخن کی ندرت مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے ؎

گلی گلی مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل
مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میری حدوں سے دور نکل
یاد ہے اب تک تجھ سے بچھڑنے کی وہ اندھیری شام تجھے
تو خاموش کھڑا تھا لیکن باتیں کرتا تھا کاجل

مندرجہ بالا اشعار میں ذرا شاعر کے اچھوتے انداز پر غور کیجئے۔ "یاد" کو متشکل کرنا اور اسے اس راہ میں بچھا دینا جہاں سے معشوق کو گزرنا ہے، ناصر کا اپنا انوکھا انداز ہے اور غالباً اردو غزل میں "یاد" کے لئے سوچنے کا یہ انداز کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ مزید یہ کہ اس مصرعہ میں متعدد دیگر مواد بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مثلاً معشوق کا بچنا، بڑکنا اور "یاد" سے بچ کر نکل نہ سکنے کی مجبوری جس میں شاعر کو ایک لطف انگیز کیف بھی حاصل ہو رہا ہے۔

دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ نہایت ہی خوبصورت ہے۔ "تو خاموش کھڑا تھا" اور پھر "باتیں کرتا تھا کاجل" بڑا لطیف اور خوبصورت اظہار ہے۔ ذرا شاعر کی تصویر کشی پر غور کیجئے ـــــ معشوق بذات خود تو خاموش کھڑا ہے مگر اس کی خوبصورت آنکھوں سے جن میں کاجل لگا ہوا ہے، جدائی کے وقت آنسو نکل رہے ہیں۔ یہ آنسو جو بظاہر خاموش مگر دل کی کیفیت کے مظہر اور محرومی و حرماں نصیبی کے پیامبر بن کر آنکھوں سے نکل رہے ہیں یہ ساری کیفیات اور تصویریں سمٹ کر صرف ایک جملہ "باتیں کرتا تھا کاجل" میں آجاتی ہیں۔ یہ محسوسات اور تصویر عالمی شاعری کی ہو سکتی ہے مگر موقلم ناصر کاظمی کا خود اپنا ہے۔

ناصر کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بے بنیاد لگتی ہے کہ صرف سبک مضامین اور عشقیہ جذبات ہی غزل میں جگہ پا سکتے ہیں اور یہ کہ غزل سنگین تجربوں، المناک مشاہدوں، سفاک حقیقتوں، اجتماعی دکھ درد اور آشوب عصر کو بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ناصر کی غزل اس بات کا ثبوت ہے کہ غزل نہ صرف ان تمام تجربوں اور آشوبوں کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے بلکہ بعض صورتوں میں وہ نظم سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ ناصر کی غزل اس کے عہد کے الم کی جس تخلیقی اور فنی کمال کے ساتھ ترجمانی کرتی ہے اس سے غزل کے لامحدود امکانات اور وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ناصر کاظمی سر تا پا شاعر تھے۔ انھوں نے شاعری کو ہمیشہ ایک تخلیقی امانت سمجھا، اور اپنی تمام صلاحیتیں صرف شعری تجربہ پر صرف کیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ناصر صرف ۴۷ برس کی عمر ہی میں انتقال کر گئے۔

ناصر کا پہلا مجموعہ کلام "برگ نے" ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آیا اور دوسرا دیوان ان کی وفات کے بعد ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے میر تقی میر کا انتخاب کیا اور نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا بھی ایک عمدہ انتخاب کیا۔ کاش وہ زندہ ہوتے تو اردو شاعری کو اپنی خدمات سے مزید مالا مال کرتے۔

غزلیں

مانا کہ لاکھ غم ہیں مری زندگی کے ساتھ
پھر بھی ترے کرم ہیں مری زندگی کے ساتھ

مجھ کو کسی خوشی کی نہیں اب ہے جستجو
اتنے تمہارے غم ہیں مری زندگی کے ساتھ

پھر کیوں ہو فکر گردشِ حالات کی مجھے
جب آپ محرم ہیں مری زندگی کے ساتھ

اتنے تو زلفِ یار میں بھی پیچ و خم نہیں
جتنے کہ پیچ و خم ہیں مری زندگی کے ساتھ

اختر سکونِ قلب کی اُمید ہے فضول
جب غم قدم قدم ہیں مری زندگی کے ساتھ

—— سلیم اختر سیتاپوری
شیخ ا ے:
سیتاپور

دور جیسا بھی زندگی کا چلے
زور قسمت سے کیا کسی کا چلے

ہم نشینو! بہ نامِ خونِ جگر
آؤ اک دورِ مے کشی کا چلے

چند نعرے وہ کھوکھلے ہی سہی
کچھ پتہ تا کہ زندگی کا چلے

وہ جو اک اپنا دشمنِ جاں ہے
ذکر کچھ اس کی دوستی کا چلے

اجنبی آپ کو سمجھ لیں گے
چلیے کہنا اب آپ ہی کا چلے

—— افتخار احمد زیدی
نزولی ہاؤس
خیالی گنج لکھنؤ

جو آدمی کہ مقامِ بشر سے گر چکا
عجب نہیں کہ خود اپنی نظر سے گر چکا

خلوصِ دل ہو تو خود آ کے تیرے دامن میں
گُلِ مراد دعا کے اثر سے گر چکا

وہ نقش کیا جسے خط و خال مل نہ سکے
وہ خاک کیا جو کفِ کوزہ گر سے گر چکا

سہے گا وہ بھلا کیا وار بادِ صرصر کے
جو چوٹ کھا کے نسیمِ سحر سے گر چکا

یہ زندگی ہے کہ یارب کوئی شکستہ مکان
اِدھر سے آج گرے کل اُدھر سے گر چکا

جھکا کے سر ہی مکرّم ہواؤں میں نجمی
اٹھاؤں سر تو یہ دستار سر سے گر چکا

—— حنیف نجمی
مود ۱۰ - محلہ اپرودس
پوسٹ راگول ہمیرپور

اخلاق احمد
۲۰۔ ملاجی ٹولہ۔ وزیر گنج
لکھنؤ

افسانہ

گہرے اندھیرا

"آخر تم...... تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟"
خالد نے ایک بار پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں سب سمجھتی ہوں۔ مردوں کو جب پیچھا چھڑانا ہوتا ہے تو بہت سے بہانے نکل آتے ہیں۔" شبنم کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو رہا تھا۔

"تو کیا ان ساری باتوں کو ایک بہانا سمجھتی ہو۔؟ ٹھیک ہے۔ تو مجھے بھی اپنی صفائی میں اب کچھ نہیں کہنا ہے۔" خالد بھی ناراض ہوگیا۔

"تم کہہ ہی کیا سکتے ہو۔؟ پچھلے دو برسوں سے جب بھی میں نے شادی کی بات کہی وہ ہمیشہ اسی طرح کسی نہ کسی بات کو لیکر بیچ میں لٹک گئی۔۔ کیوں؟۔ میں پوچھتی ہوں آخر کس لیے؟"

"تم وجہ اچھی طرح جانتی ہو شبنم! مجھ سے سُن کر کیا کروگی۔؟"

"نہیں۔ میں تمھارے منھ سے سننا چاہتی ہوں۔ اگر ہمارے پیار میں کوئی کمی نہیں ہے تو پھر یہ رکاوٹ کیسی؟"

"یہ رکاوٹ تمھاری یا میری طرف سے نہیں ہے۔ شبنم تم جانتی ہو کہ رخسانہ کی وجہ سے میں تم سے شادی نہیں کر پا رہا ہوں۔"

"لیکن تم اس سے طلاق لے سکتے ہو۔ جس کے لیے پچھلے دو برسوں سے تم مجھ کو دلاسا دے رہے ہو۔"

"یہ صرف ایک دلاسہ نہیں شبنم۔ میں سچ مچ دل سے چاہتا ہوں کہ اس الجھن سے جلد چھٹکارا پالوں۔ لیکن رخسانہ کی ضد نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ لاکھ زور دینے پر بھی وہ عدالت میں جاکر بیان دینے یا طلاق لینے کو تیار نہیں ہے۔ پھر بھی کوئی راستہ نکلے گا ہی۔" اس نے سمجھانا چاہا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم رخسانہ کو منے کی وجہ سے چھوڑنا نہیں چاہتے۔" شبنم کا یہ جملہ تیر کی مانند خالد کے دل کو پار کر گیا۔

"تم کچھ بھی کہہ سکتی ہو شبنم۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔" خالد نے مایوس لہجے میں ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شبنم خالد کو مایوسی کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھ کر اپنے آپ کو روک نہ پاتی۔ پوری امید بندھانے کی کوشش کرتی۔ لیکن وہ تو آج جیسے کوئی فیصلہ کرنے کے ارادے سے ہی آئی تھی۔

"میں یہ سب نہیں جانتی۔ آخر سماج میں رہ کر میں بھی اپنے اس رشتے کو ایک نام دینا چاہتی ہوں۔ اس طرح بغیر کسی فیصلے کے میں کب تک تمھارے وعدوں کے سہارے جیتی رہوں گی۔؟"

"لیکن میں کتنا مجبور ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی تم آج...."

"..... مگر میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں اپنے والدین کو اور زیادہ نہیں روک سکتی۔ وہ میری شادی جلد سے جلد کر دینا چاہتے ہیں اور میں بھی اس طرح کی زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ آخر....."

"شبنم! ذرا میری بات تو سنو"۔

"رہنے دو۔ بات کو اور زیادہ طول دینا بے سُود ہے۔ اس سے حالات بدل تو نہیں جائیں گے۔ بہتر ہوگا کہ ہم پچھلی باتوں کو

بھلاکہ آئندہ ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔" یہ کہتے ہوئے شبنم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے میز پر سے اپنا پرس اُٹھایا اور اس سے پہلے کہ خالد اسے روک پاتا۔ وہ ہوٹل سے باہر نکل گئی۔

خالد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک یوں ہی چپ چاپ کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ سامنے رکھی کافی بہت پہلے ہی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ آخر میں بل ادا کر کے وہ ہوٹل سے باہر آگیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوں اور اس کے جسم میں جان نہ رہ گئی ہو۔

اسی طرح گھسیٹتے گھسیٹتے وہ اپنے آپ کو اس پارک تک لے آیا جہاں دفتر کا وقت ختم ہو جانے کے بعد شبنم کے ساتھ اس کی شام گزرا کرتی تھی۔ پارک کے کونے میں ایک پیڑ کے نیچے والی بنچ پر خالد بیٹھ گیا۔ اس کی عقل جواب دے چکی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کہاں لے جائے اپنے آپ کو۔

گھر..... ؟ صرف کہنے سے کوئی جگہ گھر نہیں بن جاتی — وہاں کا گھٹن بھرا ماحول اس کو جکڑنے لگتا تھا۔ اگر وہ منے کو ہاتھ بھی لگاتا تو وہ زہریلے تیروں کے الفاظ سے چھید دیا جاتا تھا خالد کی آنکھوں کے سامنے سویرے کا ماحول گھومنے لگا۔

"ہائے اللہ! نگوڑے نے پھر بستر گیلا کر دیا۔ پتہ نہیں کس کمبخت کی نظر لگی ہے۔ آج ہی مرچوں کی دھونی دوں گی۔" سویرے سویرے رخسانہ کی بڑبڑ شروع ہو گئی تھی۔

خالد اس بات کو ٹال دینا چاہتا تھا۔ لیکن رخسانہ نے غصے میں منے کو تڑاخ سے ایک چانٹا رسید کر دیا۔ منا زور زور سے رونے لگا۔ خالد اس ماحول سے بچنے کے لئے اکثر باہر چلا جاتا تھا۔ رخسانہ اس کی اس کمزوری سے واقف تھی اور اسے ایک ہتھیار کی طرح استعمال کرتی تھی۔

پچھلی رات دیر تک کتاب پڑھتے رہنے کی وجہ سے خالد کی آنکھ صبح دیر سے کھلی تھی۔ اس نے کروٹ بدل لی اور چپ چاپ لیٹا رہا۔ مہینوں کی خاموشی کو وہ ایک پل میں توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"روئے گا؟ اب تو منھ سے آواز تو نکال، دیکھنا پھر میں تجھے کیسے ٹھیک کرتی ہوں۔" رخسانہ اسے بے تحاشہ پیٹنے لگی تھی۔

منے کے رونے کی آواز سن کر خالد سے نہ رہا گیا وہ جلدی سے اٹھ کر اس کمرے میں چلا آیا۔ اس نے دیکھا کہ منے کا چہرہ تھپڑوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ منھ ناک اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر خالد آگے بڑھا اور منے کو کھینچ کر رخسانہ کی گرفت سے الگ کرنا چاہا۔

"ہٹ جاؤ۔ ہاتھ نہیں لگانا اسے، نہیں تو کہے دیتی ہوں ہاں۔"

.... رخسانہ نے اسے دھمکایا۔

"کیا کہے دیتی ہو؟ کیا کر لوگی تم — ؟" خالد کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے رخسانہ کو ایک طرف کھینچ کر منے کو اٹھا لیا۔ رخسانہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور منے کو اس کی گود سے چھیننے کے لیے جھپٹی۔

"چھوڑ دو اسے، میں کہے دیتی ہوں۔ چھوڑ دو۔"

"کیوں چھوڑ دوں؟"

"میں اسے بگڑنے نہیں دینا چاہتی۔"

"کیوں؟ کیا میں کوئی غنڈہ بدمعاش ہوں، جو میرا سایہ پڑتے ہی منا بگڑ جائے گا۔" خالد غصے سے بھر گیا۔

"یہ سب میں نہیں جانتی۔ بس تم اس کو چھوؤ گے نہیں کہہ دیا" رخسانہ منے کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

"ہوں۔ تو میں اسے ہاتھ لگا کر بگاڑ دوں گا اور تم روز سویرے مار مار کر اسے سدھارنا چاہتی ہو۔ کیوں؟ میں تمہاری عقل کی داد دیتا ہوں۔ لو پکڑو۔ لے جاؤ۔ روز روز مارنے سے اچھا ہے ایک ہی بار مار ڈالو اسے۔ خالد نے روتے اور سسکتے ہوئے منے کو رخسانہ کے حوالے کر دیا۔ رخسانہ اسے کھینچتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

خالد سمجھ گیا کہ یہ ہمیشہ کی طرح جھگڑے کا آغاز ہے۔ رخسانہ کو ہر روز خالد کو کھری کھوٹی سنانے کا موقع چاہیئے تھا۔ خالد کی کوئی بھی بھول اس کے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دیتی تھی۔ کچھ بھی کہنے پر رخسانہ رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی تھی اور اس کی تیز آواز کے شور سے پاس پڑوس کے تماش بینوں کی کھڑکیاں فوراً کھل جاتیں۔ ان تمام باتوں سے بچنے کے لئے آج بھی اس نے جلدی جلدی منھ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور بھوکا پیاسا

ہی گھر سے باہر نکل گیا۔

"ہاں ہاں ... بھاگو جاؤ۔ گھر میں دیدہ کہاں لگتا ہے۔ باہر دوستی یاری کم ہے کیا؟ مجھے ہی دکھ اٹھانے تھے ایسے مرد سے شادی کر کے ....." رخسانہ کی تیکھی آواز دور تک خالد کا پیچھا کرتی رہی۔

وہ نہ جانے کتنی دیر تک خالی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ دفتر کا گیٹ مین اس بات پر حیران تھا کہ آج بڑے بابو سب سے پہلے دفتر آ گئے۔ خالد اس طرف دھیان دیئے بغیر اندر آ کر کرسی پر بے بس سا بیٹھ گیا اور چائے کی ایک پیالی کے سہارے سارا دن دفتر میں فائیلوں میں سر کھپاتا رہا۔

بیچ بیچ میں جیسے اس کا دماغ کام کرنا بند کر دیتا۔ سامنے پڑی فائیلوں کے حروف گول گول ہوتے ہوئے صرف نقطے نظر آنے لگتے۔ وہ سوچتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلا جائے ـــــ وہ آدمی آخر کیسے جی سکتا ہے جسے خود اپنا وجود ایک بوجھ معلوم ہونے لگے ـــــ کب تک وہ رخسانہ کی تیز نشتر جیسی باتوں سے اپنے آپ کو لہولہان ہوتے دیکھتا رہے گا۔؟

خالد کے سامنے وہ دن گھوم رہے تھے جب وہ گاؤں کے ایک اسکول میں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ گاؤں کی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد شہر کی اعلیٰ تعلیم اور پھر اچھی نوکری حاصل کر کے وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اسے اپنی محنت اور لگن پر پورا بھروسہ تھا لیکن جب والدین نے بغیر اس کی مرضی کے رخسانہ سے شادی کر دینے کا فیصلہ سنایا تو وہ پریشان ہو اٹھا۔

ایک تو کم عمری میں شادی اس کے لیے ایک قید تھی۔ اور پھر رخسانہ جیسی گنوار اور جھگڑالو لڑکی سے وہ ہمیشہ کے لیے بندھنے کو قطعی تیار نہ تھا۔ رخسانہ کی بدزبانی سے سبھی واقف تھے لیکن والدین کا خیال تھا کہ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آخر بچپن میں دو گود کھیلتے بچوں کے والدین نے ایک دوسرے سے شادی کا جو وعدہ کر لیا تھا اسے بھی تو نبھانا تھا۔ اپنی بات سے پھر کر برادری میں منہ دکھانے کے لائق بھی تو نہ رہ جاتے۔

اس کی منت سماجت اور غصہ بھی کچھ اثر نہ ڈال سکے اور زیادہ کہنے سننے پر ماں نے زہر کھا کر جان دے دینے کی دھمکی دی۔ ابو اپنے بیٹے کی سرکشی اور نافرمانی سے دل برداشتہ تھے۔

خالد نے دیکھا کہ اب کوئی حل نہیں نکل رہا ہے تو اس نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ شادی کے بعد وہ رخسانہ کو لے کر شہر چلا گیا۔ اپنی نئی زندگی کی ابتدا میں ہی اسے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ والدین نے اپنی ضد کو پورا کرنے کے لیے اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا۔

رخسانہ کی دلچسپی کا دائرہ گھر کی مہری کہارن یا پھر پاس پڑوس کے کس گھر میں کیا پکا ہے۔ کس کی لڑکی کا کس کے لڑکے سے عشق چل رہا ہے وغیرہ وغیرہ، بے حد گھٹیا قسم کی باتوں تک محدود تھا۔ اور خالد کو ان باتوں سے چڑ تھی۔

شروع شروع میں اس نے بہت کوشش کی کہ رخسانہ کو اس کی محدود دنیا سے باہر لے آئے لیکن جب کبھی وہ اسے سیر و تفریح کیلئے لے گیا، رخسانہ کو اپنے پاس سے گزرنے والوں میں بھی ناک بھوں سکوڑنے کے لیے کچھ نہ کچھ مل ہی گیا۔ کتاب پڑھنے کا نام لینا بھی اس کے سامنے گناہ تھا۔

"یہ کتابیں پڑھنا اونچی ایڑی کی چپلیں پہننے والی فیشن پرست عورتوں کو زیب دیتا ہے مجھے دفتر تھوڑے ہی جانا ہے کہ کرسی پر بیٹھ کر کتاب پڑھوں گی۔" رخسانہ تیکھے انداز میں بھوں سکوڑتے ہوئے کہتی اور خالد کڑھ کر رہ جاتا۔

رخسانہ کو خالد کے یار دوستوں سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔

"نِٹھلّے کہیں کے۔ جب دیکھو تب ادھر منہ اٹھائے چلے آتے ہیں جیسے ان کے اپنے گھر میں جگہ ہی نہ ہو۔" خالد کے احتجاج پر اس کا الٹا ہی اثر ہوتا۔

خالد بغیر کچھ کہے سنے اپنے دوستوں سے دور رہنے لگا تھا رخسانہ کا رویہ دیکھ کر دوستوں نے بھی رخ موڑ لیا تھا۔ خالد کے لیے کہیں کوئی ایسا ٹھکانا نہیں رہ گیا تھا جہاں وہ دو گھڑی بیٹھ کر ہنس بول سکے۔ اب اس کے اور دوستوں کے بیچ کافی فاصلہ ہو گیا تھا۔

اپنی ذہنی پریشانیوں کی وجہ سے وہ گم سم رہنے لگا تھا۔ رخسانہ کو

اس کی اس کیفیت پر کسی جادو ٹونے کا اثر محسوس ہوتا۔ وہ پتہ نہیں کیا کیا پڑیا میں بندھوا کر لے آتی جو خالد کو اکثر اپنے تکیے کے یا چادر کے نیچے پڑی ملتی۔ اسے دیکھ کر وہ بوکھلا اٹھتا اور رخسانہ کے سامنے ہی پڑیا کو پرزے پرزے کرکے کھڑکی سے نیچے پھینک دیتا۔

"یہ سب تم کسے ٹھیک کرنے کے لیے کرتی ہو۔ مجھے! دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا؟ کچھ سوچے سمجھے بغیر ان جوتکلوں میں پڑی رہتی ہو۔ جانتی ہو تمہاری یہ حرکتیں مجھے زہر کے مانند لگتی ہیں"۔ خالد دانت پیس کر رہ جاتا۔ لیکن رخسانہ کو یہ غصہ بھی کسی شیطان کا کام لگتا۔ وہ خالد کے باہر جاتے ہی کسی اور تعویذ کے لیے نکل پڑتی۔

گھر میں ہر وقت جلنے والے لوبان کی بو سے خالد کا دماغ بوجھل ہو جاتا۔ لیکن اس کی سننے والا کوئی نہ تھا۔ رخسانہ پہلے سے جو کچھ پڑھ کر آئی تھی اس سے ذرہ برابر بھی اِدھر اُدھر ہونا نہیں چاہتی تھی۔

پچھلے آٹھ برسوں سے بیوی اور شوہر کے محض دکھاوے کے رشتے کے بوجھ کو لادے وہ تھک گیا تھا۔ اب وہ اس بوجھ کو اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ اس بارے میں جب اس نے اپنے ماں باپ کو لکھا تو انھوں نے بیٹے کی زندگی کا واسطہ دیا تھا۔

گھر میں ساس سسر کے آجانے پر رخسانہ جھکنے کے بجائے اور تن گئی تھی۔ "اگر وہ سوچتے ہیں کہ رخسانہ کو گھر سے نکال کر خود موج مستی کریں گے تو منہ دھو رکھیں۔ ہمارے بھیا کے ہوتے کوئی ہمیں گھر سے نکالنا تو درکنار ترچھی نگاہ سے بھی نہیں دیکھ سکتا"۔

سبھی جانتے تھے کہ رخسانہ کا بھائی گاؤں کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ کسی کو مارنا یا مروانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ قصبہ کے کئی اہم لوگوں سے اس کی سانٹھ گانٹھ تھی۔ اس لیے سب اس سے ڈرتے تھے۔ سانپ کے بل میں جان بوجھ کر بھلا کون ہاتھ ڈالے گا۔ ہار کر سب چپ سادھ گئے اور چراغ کی طرح اس کی زندگی جلتی رہی۔ انھیں حالات میں اس کی ملاقات شبنم سے ہوئی جو اس کے دفتر میں ٹائپسٹ کے عہدے پر کام کرنے آئی تھی۔ پہچان نے رفتہ رفتہ قربت اختیار کرلی۔ شبنم کا سنجیدہ چہرہ خالد کو تیز دھوپ میں گھنی چھاؤں کی طرح لگتا تھا اور جہاں اسے کافی سکون نصیب ہوتا تھا۔ یہاں وہ کھل کر سانس لے سکتا تھا۔

دونوں کے خیالات بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ خالد کو اگر مطالعے کا شوق تھا تو شبنم کو نئے نئے ڈرامے دیکھ کر تبصرہ کرنے کا۔ دفتر کا وقت ختم ہوتے ہی یا تو وہ دونوں پارک میں کچھ دیر بیٹھتے تھے یا پھر کسی تھیٹر میں پہونچ جاتے تھے۔

شبنم خالد کی پریشانیوں سے دکھی ہوتی تھی۔ وہ اس سے ہمدردی کرتی تو خالد کو ایسا محسوس ہوتا جیسے زندگی کی بہت سی مشکلیں حل ہوگئی ہوں دن بھر کی کڑواہٹ کو وہ انھیں پُرسکون لمحوں میں گزار دیتا۔ لیکن آج ——— آج اسے شبنم بھی کمزور اور بے بس سمجھ کر کسی مضبوط سہارے کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تھی۔

خالد کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک بار پھر اکیلے پن کے گھنے جنگلوں میں پھنس گیا ہو۔ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکتی جارہی تھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا جارہا تھا۔ اس نے خوف سے اپنے چہرے کو اپنے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں چھپالیا اور بے تحاشا چلّایا—

"مت جاؤ شبنم۔ مجھے یوں اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ"

جب خالد نے سر اٹھایا تو صبح کا سورج چاروں سمت روشنی پھیلا رہا تھا— مگر خالد کی زندگی کے گرد بہت گہرا اندھیرا—!!

□□

پنڈت دین دیال اُپادھیائے صہ ۲ کا بقیہ

نظریات کی پختگی سے مالامال پنڈت دین دیال نے اپنی مجاہدانہ زندگی میں ہمیشہ عمل کی بالادستی کو قائم کیا۔ انھوں نے شخصی آرام و آسائش کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ وہ صحیح معنوں میں کرم یوگی تھے۔ ایسے عظیم انسان کو میں احترام کے ساتھ یاد کرکے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ ان کی زندگی، آدرشوں اور اصولوں سے تحریک حاصل کرکے اور ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر ہم ہندستان کو ایک عظیم اور پروقار ملک بنانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

(ترجمہ: نجیب انصاری)

غزلیں

زندگی! تیرا مقدر لمحہ لمحہ سوچنا
اور وہ لمحہ قیامت جس میں اپنا سوچنا

نے مآلِ عاقبت، نے فکرِ دنیا سوچنا
رُوبرو اس کے کہاں کوئی تمنا سوچنا

کوششیں مثبت سہی لیکن نتیجہ گم رہی
فائدے کی جستجو پھر بھی خسارہ سوچنا

کیا قیامت ہے کہ ہم بدگمانی کے سبب
خار کو گل اور گل کو صرف دھوکا سوچنا

وضع کی تہذیب کیسی آج کے انسان نے
بھیڑ میں رہتے ہوئے خود کو اکیلا سوچنا

چاند، سُورج، پھول، خوشبو، آسماں، بادل، ہوا
مشغلہ اپنا ہے اب تیرا سراپا سوچنا

اکتفا کرنا نہ کچھ قطروں پہ شبنم کے ظفر
پیاس ہونٹوں پر سجاؤ تم، تو دریا سوچنا!

ظفر مُرادآبادی

۱۸۸۹، پہلی منزل، شوئی والان
نئی دہلی

غیر تو غیر ہیں اپنے بھی ستمگر نکلے
آستینوں میں چھپائے ہوئے خنجر نکلے

خاک میں مل گئے ٹپکے ہوئے اشکوں کی طرح
توڑ کر عہدِ وفا گھر سے جو باہر نکلے

آ گیا آ گیا خود اُن کو سنبھل کر چلنا
تیرے میخانۂ اُلفت سے جو پی کر نکلے

لاکھ کترے گئے پر، پھر بھی نہ وہ باز آئے
آرزوؤں کے پرندے بڑے خودسر نکلے

زندگی کے لیے لازم ہے حدوں میں رہنا
موت آجاتی ہے چیونٹی کو جہاں پر نکلے

ختم ہو جائے اندھیروں کی حکومت ہی گہر
ذرّے ذرّے سے اگر نور کا لشکر نکلے

گہر خیرآبادی

کالا پیادہ
خیرآباد

وہ کچھ اس طرح آئینے میں سمائے
کہ جیسے کوئی چاند میں جگمگائے

جو کہنا ہے کہیے مگر چپکے چپکے
کہ بیٹھے ہیں محفل میں اپنے پرائے

محبت میں شانِ محبت یہی ہے
کبھی حرفِ شکوہ زباں تک نہ آئے

نہ پوچھو شبِ ہجر کس طرح گزری
دیے حسرتوں کے جلائے بجھائے

ہمیشہ وہ مخمور سچ بولتا ہے
مجھے ڈر ہے اس کی زباں کٹ نہ جائے

مخمور کاکوروی

معرفت اترپردیش اردو اکادمی
قیصر باغ لکھنؤ

اترپردیش کا ترقیاتی منظر نامہ

(ادارہ)

اترپردیش میں غذائی اجناس، تیل اور دالھنوں کی قیمتیں کم ہوں گی

وزیر اعلا کا اعلان

اترپردیش میں گیہوں، چاول وغیرہ غذائی اجناس، تیل اور دالھنوں کی موجودہ قیمتیں ملک کے دیگر مقامات کی بہ نسبت کم رہیں گی. ان اشیائے ضروریہ کی قیمتیں بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، مغربی بنگال، گجرات، مہاراشٹرا اور تمل ناڈو میں مروجہ قیمتوں سے کم کی جائیں گی۔

ریاست کے بیوپاریوں کی جانب سے اترپردیش ادیوگ بیوپار پرتی ندھی منڈل کے صدر اور ممبر پارلیمنٹ شری شیام بہاری مشرا نے اس فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے ریاست کے وزیر اعلا شری کلیان سنگھ کو یقین دہانی کرائی کہ سبھی بیوپاری اس کے لیے پُرعزم ہیں۔

وزیر اعلا کی صدارت میں ودھان بھون لکھنؤ کے تلک ہال میں اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں کمی لانے اور بیوپاریوں کے مسائل حل کرنے پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے. بیوپاریوں اور صارفین کے نمائندوں کی ایک ریاستی سطح کی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا.

وزیر اعلانے ریاست میں صارفین کو راحت پہونچانے کی غرض سے اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں کمی لانے اور اس سلسلے میں بیوپاریوں کا فعال تعاون حاصل کرنے کے لیے وزیر غذا و رسد کی صدارت میں ایک ۳۵ رکنی اعلا سطحی کمیٹی کی تشکیل کا اعلان کیا ہے۔

یہ کمیٹی خاص طور سے مروجہ قیمتوں میں کمی لانے، بیوپاریوں کے مسائل حل کرنے اور بیوپاریوں سے متعلق ضوابط کو آسان ترین بنانے پر غور کرے گی.

وزیر اعلا نے کہاکہ اس اعلا سطحی کمیٹی میں وزیر غذا و رسد کے علاوہ وزیر مالیات، چیف سکریٹری، پرسنل سکریٹری مالیات، پرسنل سکریٹری زراعت، پرسنل سکریٹری ادارہ جاتی مالیات اور سکریٹری غذا کے علاوہ ادیوگ بیوپار پرتی ندھی منڈل کے ۱۴ ممبران نیز صارفین کے ۱۵ نمائندے شامل ہوں گے۔ سکریٹری غذا کمیٹی کے کنوینر ہوں گے۔

قیمتوں میں کمی لانے کی غرض سے کھلے بازار میں اشیائے ضروریہ کے نظام تقسیم کو بہتر بنانے اور تقسیم پر آنے والے اخراجات میں تخفیف کرنے کے سلسلے میں وزیر اعلا نے میٹنگ میں بعض اہم فیصلے کیئے ہیں. انھوں نے اعلان کیا ہے کہ ایک شہر یا منڈی کا ایک تھوک بیوپاری اسی شہر یا منڈی کے دوسرے بیوپاری کو خوردنی تیل بغیر کسی پابندی کے فروخت کر سکے گا.

وزیر اعلا نے یہ بھی اعلان کیا کہ جوار، باجرا، مکّا اور جو کے لئے علاحدہ لائسنس اور نہ ہی اس کے لیے اسٹاک کی کوئی حد مقرر کی جائے گی۔

اس کے علاوہ جوار، باجرا. مکّا، صابن، بلیڈ، لالٹین، ٹارچ، ماچس وغیرہ کی اشیاء کی بازار میں وافر فراہمی کے پیش نظر انھیں ضروری اشیاء ایکٹ سے مستثنیٰ کر دیا گیا. اسی طرح شکر اور کھانڈسار کے الگ الگ لائسنس دیئے جانے اور ان کے اسٹاک کے حدود بھی الگ کرنے کی منظوری دی گئی۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ دُکان یا گودام بدلنے کی صورت میں کسی

بیوپاری کو نیا لائسنس لینے کی ضرورت نہ ہوگی۔

اب لائسنس دینے کا اختیار علاقائی نائب غذائی کنٹرولر کو ہوگا جو ہم دن کے اندر اس کام کو انجام دے گا۔ اب لائسنس کی تجدید کے لیے صرف فیس جمع کرنا ہی کافی ہوگا بشرطیکہ ان کا لائسنس معطل نہ ہوا ہو۔

وزیر اعلا نے موجودہ مہنگائی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بیوپاریوں سے اپیل کی کہ وہ صارفین کو راحت دینے کے لیے ہر ممکن اقدام کریں اور یہ اقدام مثبت اور دیرپا ہوں۔ ●

بجلی کے نئے کنکشن ایک ماہ کے اندر

بجلی کے صارفین کو بجلی انتظامیہ سے بڑی شکایتیں رہی ہیں۔ سب سے عام شکایت تو یہ رہی ہے کہ بجلی حاصل کرنے کے لیے درخواست دینے پر محکمہ کی جانب سے جو کارروائی کی جاتی ہے اس میں بہت دیر ہوجاتی ہے اور صارفین کی رقم فضول جمع رہتی ہے اس سلسلے میں صارفین کی جانب سے مسلسل شکایتیں کی جاتی رہی ہیں لیکن ان پر سابقہ حکومتوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ اب موجودہ حکومت نے محکمہ بجلی کی کارکردگی کا از سر نو جائزہ لیا ہے۔ صارفین کی شکایتوں پر مسلسل غور کیا جارہا ہے۔

وزیر توانائی شری لال جی ٹنڈن متعلقہ افسران کے ساتھ برابر میٹنگیں کر رہے ہیں اور صارفین کی شکایتوں کو دور کرنے کے لیے غور و خوض کر رہے ہیں اس سلسلے میں وزیر موصوف نے گزشتہ دنوں ایک اہم ترین اعلان یہ کیا کہ جن لوگوں نے بجلی کے نئے کنکشن حاصل کرنے کے لیے رقم جمع کر رکھی ہے اور تین برس کی مدت گزر جانے کے بعد بھی انھیں کنکشن نہیں ملا ہے، انھیں ریاستی بجلی بورڈ جمع شدہ رقم پر سود ادا کرے گا۔

اس سلسلے میں وزیر موصوف کا یہ اعلان بھی انتہائی دل خوش کن ہے کہ نیا کنکشن دینے کے لیے میعاد مقرر کی جائے گی۔ اس کے تحت درخواست داخل ہونے کے ایک ماہ کے اندر درخواست دہندہ کو اسٹیمیٹ اور اسٹیمیٹ کی رقم جمع ہوجانے کے ایک ماہ کے اندر نیا کنکشن دے دیا جائے گا۔

وزیر توانائی نے ریاستی بجلی بورڈ کی کارکردگی کا بھی جائزہ لیا ہے اور اس کی کارکردگی میں مزید بہتری لانے پر زور دیا ہے۔ انھوں نے ریاستی بجلی بورڈ کے چیرمین کو ہدایت کی ہے کہ ۳۱ر اکتوبر تک ناجائز کنکشنوں کو باضابطہ بنایا جائے۔ بعد ازاں یکم نومبر سے ۳۰ر نومبر تک بجلی چوری کے خلاف بڑے پیمانے پر مہم چلائی جائے۔ اس مہم میں بجلی چوری کرنے اور کرانے والے دونوں یکساں سزا کے مستحق ہوں گے۔

وزیر موصوف نے صارفین کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر یہ اعلان بھی کیا ہے کہ اب ایک سو ہارس پاور تک کنکشنوں کی منظوری ضلع کی سطح پر ہی مل جایا کرے گی۔ اب ضرورت مند افراد کو لکھنؤ کی دوڑ نہیں لگانا پڑے گی۔

موجودہ حکومت کسانوں کی ضرورتوں کا بھی پورا خیال رکھے گی اور بجلی فراہمی کے سلسلے میں انھیں پوری آسانیاں مہیا کرائی جائیں گی۔ ●

پہاڑی علاقوں میں سیاحت کا فروغ

اترپردیش کے پہاڑی مقامات مسوری اور نینی تال میں سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر حکومت نے پوڑی، شیتلا کھیت، گوچر اور پتھورا گڑھ کو سیاحت کے نقطہ نظر سے فروغ دینے کی ایک اسکیم وضع کی ہے۔ ان مقامات کو ۱۹۹۲ء تک سیاحتی مرکز کی حیثیت سے فروغ دے دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں وزیر سیاحت شری ہرک سنگھ راوت نے مسوری میں افسران سے بھی تبادلۂ خیال کیا ہے۔

اڈی پانی کی حسن کاری اور مسوری میں آڈیٹوریم کی تعمیر بھی زیر غور ہے اور ان کے بارے میں جلد ہی فیصلہ کرلیا جائے گا۔ پہاڑی علاقوں کا فروغ اسی وقت ممکن ہے جب یہاں سیاحت کو بطور صنعت

فروغ دیا جائے اور بغیر علاحدہ اترانچل ریاست کے سیاحت کا برق رفتاری کے ساتھ فروغ بہت مشکل ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں بھی غور و خوض کیا جا رہا ہے۔

پہاڑی علاقوں میں سیاحت کو فروغ دے کر وہاں کے عوام کو روزگار فراہم کیا جا سکتا ہے۔ پہاڑی علاقوں سے نوجوانوں کے نقل مکانی کو روکنے کے لئے انھیں وہیں روزگار کی فراہمی بہت ضروری ہے۔ چنانچہ موجودہ سرکار یہ کوشش کر رہی ہے کہ پہاڑی علاقوں کی صنعتوں اور وہاں کے محکموں میں وہیں کے نوجوانوں کو روزگار دیا جائے ●

اضافہ کیا جائے نیز اوقاف کے تحفظ اور ترقی کو یقینی بنایا جائے۔ ریاست کے اوقاف کی بدحالی کا خاص سبب ناجائز قبضے اور اوقاف کے کرایہ داروں کا غیر منصفانہ رویہ ہے اگر اوقاف پر سے ناجائز قبضے ہٹ جائیں اور وقف کی مکانیت اور جائے وقوع کی مناسبت سے کرایہ ملنے لگے تو اوقاف کی آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو جائے۔ اس کے لئے ریاستی حکومت وقف جائیدادوں کو رینٹ کنٹرول سے مستثنیٰ کرنے کی کارروائی کر رہی ہے تاکہ اوقاف کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکے وقف ایکٹ میں ترمیم کرنے پر غور کیا جا رہا ہے اور اسے مزید موثر بنانے

اوقاف کے تحفظ اور اُن کی آمدنی میں اضافے کیلئے حکومت پُر عزم

نجیب انصاری

اتر پردیش میں وقف کی جائیدادوں کے تحفظ اور ان کے صحیح استعمال کی جانب ابھی تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری ریاست کے اوقاف بدحالی کا شکار ہیں، ان پر ناجائز قبضے ہیں، ان سے آمدنی برائے نام ہے، ان کے انتظامات میں بددیانتی ہے، متعدد مقدمے مختلف عدالتوں میں زیر سماعت ہیں۔ وقف کی جائیدادوں پر لوگ قبضہ مالکانہ کیے ہوئے ہیں اور انھیں نجی جائیداد سمجھ کر استعمال کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ ریاست بھر میں وقف کی جائیدادیں انتہائی کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔

موجودہ حکومت نے وقف کی جائیدادوں کے تحفظ، ان کی بہتر دیکھ بھال، صحیح استعمال، نیز ان کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی جانب بھرپور توجہ دی ہے۔ اس سلسلے میں وزیر اوقاف شری اعزاز رضوی صاحب وقف کے افسران کے ساتھ مسلسل میٹنگیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے افسران کو متعدد ہدایتیں بھی دی ہیں جن کی روشنی میں اوقاف کی بہتری کے کاموں میں تیزی لائی گئی ہے۔

حکومت نے اتر پردیش کے وقف ترقیاتی کارپوریشن کے کاموں کا از سر نو جائزہ لیا ہے اور اسے مزید فعال بنانے کا منصوبہ بنایا ہے تاکہ اس کے توسط سے اوقاف کی آمدنی میں

کے طریقوں کا مطالعہ کیا جا رہا ہے تاکہ وقف جائیدادوں پر سے ناجائز قبضے ہٹانے کے عمل کو اور آسان بنایا جا سکے۔

اوقاف کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی غرض سے وقف ترقیاتی کارپوریشن کو اور زیادہ فعال بنایا جا رہا ہے۔ کارپوریشن کے افسران سے کہا گیا ہے کہ اوقاف کی خالی زمینوں پر کارپوریشن کی جانب سے جو تعمیراتی کام کرایا جا رہا ہے اس کا دائرہ کار اور زیادہ وسیع کیا جائے۔ تعمیراتی کاموں میں جو رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں حکومت انھیں ہر قیمت پر دور کرے گی۔ اس سلسلے میں حکومت کے زیر غور ایک تجویز یہ ہے کہ شہروں کے ماسٹر پلان کے مطابق حکومت کی سطح پر ہی نقشہ پاس کرا کے متعلقہ بلدیاتی اداروں کو بھیجا جائے۔ اس سے وقف جائیدادوں پر تعمیرات سے متعلق رکاوٹیں خود بخود دور ہو جائیں گی اور تعمیرات کے دائرہ کار میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح اوقاف کی آمدنی بھی بڑھے گی اور وقف کارپوریشن کی مالی صورتِ حال بھی بہتر ہو جائے گی۔

وقف ترقیاتی کارپوریشن کی کارکردگی کو اور زیادہ بہتر بنانے کے لیے اس میں ایک نئے عہدے کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اس عہدے پر فائز افسران کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل ہوگا کہ وہ وقف جائیدادوں پر دکانیں تعمیر کرا کے اہل افراد کو دکانیں دلانے میں اعانت کریں۔ کارپوریشن

کی جانب سے ۲۰٫۶۵ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر شدہ ۱۴۷ دکانوں کا الاٹمنٹ کیا جا چکا ہے جس سے کارپوریشن کی آمدنی میں ۵٫۱۲ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت ۱۵۰ دکانیں زیر تعمیر ہیں۔

اوقاف کی جائیدادوں کے انتظامات میں بہتری لانے اور ان کے تئیں عوام میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے ریاستی حکومت آئندہ ۱۶ اور ۱۷ نومبر ۱۹۹۱ء کو گنا سنستھان لکھنؤ میں ایک سیمینار منعقد کرنے جا رہی ہے۔ اس سیمینار میں اوقاف کے تحفظ اور ان کی ترقی کے بارے میں کھل کر بحث ہوگی تاکہ واقف کی منشاء کی جانب عام شہریوں کی توجہ مبذول کرائی جا سکے کیونکہ واقف نے عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے نیک نیتی کے ساتھ اپنی گاڑھی کمائی سے بنائی ہوئی جائیداد وقف کی ہے۔

موجودہ حکومت ہر حال میں واقف کے جذبات کا احترام کرے گی اور اوقاف کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کی بہتر دیکھ بھال نیز ان کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے سبھی ضروری اقدامات کرے گی۔ ●

امداد یافتہ اسکولوں کے لئے چھ کروڑ روپے کی گرانٹ

حکومت اترپردیش نے امداد یافتہ اسکولوں کے لیے چھ کروڑ روپے کی گرانٹ منظور کی ہے۔ طلباء کو مناسب قیمت پر کتابیں اور کاپیاں مہیا کرانے کے لیے تقریباً ۱۲ کروڑ روپے کا مزید خرچ حکومت کو برداشت کرنا پڑے گا۔

حکومت تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے کوشاں ہے اور اساتذہ کو سماج میں باعزت مقام دلانے کی خواہش مند ہے۔ اساتذہ کے ساتھ ہی ہر طبقے کے طلباء کو بھی اپنی صلاحیتیں نکھارنے کے مواقع دینے کی جانب بھی حکومت خاص طور سے توجہ دے گی۔

حکومت محسوس کرتی ہے کہ غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کو ترقیاتی پروگراموں میں ترجیح دی جانی چاہیئے۔ ●

قومی چھوٹی بچت کے نشانے کو ہر حالت میں پورا کریں

اترپردیش کے وزیر اعلا شری کلیان سنگھ نے قومی چھوٹی بچت افسران کو ہدایت کی ہے کہ وہ ہر حالت میں مالیاتی سال رواں کے لئے مقررہ ۱۴۳۳ کروڑ روپئے خالص جمع کے نشانے کو مکمل کریں کیونکہ اس سے ریاست کی ترقی وابستہ ہے

وزیر اعلا نے یہاں سکریٹریٹ انیکسی میں قومی محکمہ چھوٹی بچت کے ضلعی اور منطقائی سطح کے افسران کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نشانے کو حاصل کرنے کے لیے جنگی پیمانے پر کوشش کی جانا چاہیئے جس میں ذرہ برابر بھی تساہلی نہیں برتی جائے۔

شری کلیان سنگھ نے کہا کہ اترپردیش کی وسعت اور آبادی کے پیش نظر قومی چھوٹی بچت کے لئے مقررہ نشانہ کو حاصل کر لینا ممکن ہے ضرورت صرف وسیع پیمانے پر رابطہ قائم کرنے اور چھوٹی بچت کے لیے لوگوں کو تحریک دینے کی ہے۔

وزیر اعلا نے ریاست کے مختلف اضلاع کے محکمہ چھوٹی بچت کے افسران اور ملازمین سے اپیل کی ہے کہ وہ ریاست کی ترقی کیلئے مالیاتی وسائل کو بروئے کار لانے میں اپنی ذمہ داری نبھائیں اور اس سطح پر بھی عوام کی خدمت کریں۔

وزیر اعلا نے اکتوبر میں گنا کسانوں کو ۹۶ کروڑ روپے کے گنے کی قیمت کے بقایاجات کی ادائیگی کا ذکر کرتے ہوئے چھوٹی بچت افسران سے کہا کہ اس موقع کا فائدہ اٹھائیں اور گنا کسانوں کو متوجہ کریں کہ وہ چھوٹی بچت کے طویل مدتی بچت میں کم سے کم رقم جمع کریں۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے وزیر مالیات شری راجیندر کمار گپت نے مالیاتی وسائل کو بروئے کار لانے پر زور دیا۔

●●

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : "حیاتِ شوق"

مصنف : ڈاکٹر سید محمود حیدر   قیمت : ۷۰/- روپے

ملنے کا پتہ : دانش محل ۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

نواب مرزا شوق، نظیر اکبرآبادی کی طرح عرصۂ دراز تک نظرانداز کئے جاتے رہے ۔ ان کے کلام کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا گیا ۔ کیونکہ وہ اپنے وقت کے مروجہ اخلاق و آداب کی حدود کو توڑ کر حقیقت نگاری کے جنون میں اس حد تک آگے چلے گئے تھے جہاں سے ابتذال کی سرحدیں شروع ہو جاتی تھیں ۔

اُردو کے ادیب سحر نگار و محقق بے مثال منشی امیر احمد علوی نے پہلے پہل موقر ماہنامہ "نگار" میں ایک بلند پایہ مقالہ لکھ کر صاحبانِ ذوق کو شوق سے دل چسپی لینے کی ترغیب دی ۔ انھوں نے مرزا شوق کی مثنویات میں کہیں کہیں حد سے بڑھی ہوئی بیباکی کو "چاند کا داغ" کہا اور یہ بات اتنی پسند کی گئی کہ برسوں تک امیر احمد علوی مرحوم کے اس جملے کو مہمیز کے طور سے استعمال کر کے ان کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کیا گیا ۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی شوق کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اس جملے کو بڑی توقیر سے تحریر کیا اس سے لوگ مرزا شوق کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے مجبور ہوئے تب لوگوں کو احساس ہوا کہ مرزا شوق نے اپنی مثنویات کے ذریعہ اُردو کی شاعری میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اور ان کی مثنویات کو نظرانداز کر کے ان کی جتنی بے توقیری نہیں کی گئی اس سے کہیں زیادہ زبان و ادب کا نقصان کیا گیا ہے ۔

یہ عہد حقیقتوں کو عریاں کرنے کا عہد ہے تو پھر جو حقیقتوں کو اس حد تک عریاں کر چکے ہیں کہ خود عریاں ہو گئے ہیں ان کو کیسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے ۔

نواب مرزا شوق کی مثنویات پر ادھر دلچسپی سے کام ہو رہا ہے ۔ تازہ ترین تحقیقی کوشش ڈاکٹر ایس ۔ ایم ۔ حیدر صاحب نے کی ہے ۔ انھوں نے شوق کی حیات اور شاعری کو کھنگال کر رکھ دیا ہے اور ایک قابلِ قدر کوشش کر کے نہ صرف ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کر لی ہے بلکہ بہت سی دلچسپ باتوں کو بڑے سلیقے سے یکجا کر دیا ہے اسی لئے ان کی یہ قابلِ قدر کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔

ڈاکٹر حیدر کی کوشش اس لیے بڑی قابلِ تحسین ہے کہ انھوں نے ڈھرے کی کارروائی نہیں کی اور نہ صرف بہت سے مستند ادیبوں اور تنقید نگاروں کے حوالے اکٹھا کر دیئے ہیں بلکہ مرزا شوق کے سلسلے میں جس نے جو کچھ بھی لکھا جہاں کہیں بھی انھیں جو کچھ ملا اسے اپنی تحقیقی کاوش کا جزو بنا دیا ہے ۔

ڈاکٹر حیدر کی تحریر و تحقیق اس لیے بھی قابلِ قدر ہو گئی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے ہیں انھوں نے جب کبھی مطالعے، موازنے اور مشاہدے کے مطابق کسی کو غلط پایا ہے بڑی شائستگی اور ادب سے اس کو بے نقاب کیا ہے ۔ یہ خوبی ہمارے مستند تنقید نگاروں میں بھی مفقود ہے، چہ جائیکہ تحقیق کے طالب علم میں ۔

زیر تبصرہ کتاب میں جہاں بہت کچھ ہے وہیں بہت کچھ غیر متعلق بھی ہے ۔ ترتیب میں جس چابک دستی کی ضرورت تھی اسے ڈاکٹر صاحب ملحوظ خاطر نہ رکھ سکے ورنہ اس کتاب کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہوتی ۔ ڈاکٹر حیدر کی رواں اور شستہ زبان، تحقیق میں تجسس کی جھلک اور تنقید میں بیباکی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اگر وہ تحقیق و تنقید میں اپنا انہماک باقی رکھ سکے تو اپنی شناخت ضرور بنا لیں گے ۔

——— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب : "پیش دستی" (طنز و مزاح)

مصنف : خان عزمی ردولوی   قیمت : دس روپے

ملنے کا پتہ : نسیم بک ڈپو ۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

علمی و ادبی حلقوں میں خان عزمی ردولوی کی ظرافت نگاری

محتاج تعارف نہیں۔ "قومی آواز" لکھنؤ کے مزاحیہ کالم "گلوریاں" میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے ایک "بٹادو" کے اشعار جو غالب یا کسی دوسرے شاعر کے اشعار کی تضمین ہوتے ہیں، ضرب المثل بن چکے ہیں۔ لطف و نشاط سے بھرپور خان عزمی کا کلام فکر و معنی، فہم و ادراک اور حقائق حیات سے خالی نہیں ہوتا ۔

بیگم نے چارپائی الٹ کر یہ دی صدا
"اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی"

بھوک نے کر دیا ایسا لاغر!
"ننگِ پیری ہے جوانی میری"

کہہ کے سچ بات گئی رن سے ہر غائب عزمی
کوئی دیکھ آئے کہیں جیل کے اندر تو نہیں

"پیش دستی" نظم و نثر دونوں اصناف پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بالا اشعار اسی مجموعے سے لیے گئے ہیں۔ ویسے تو خان عزمی کی شاعری بھی کچھ کم اہم نہیں ہے، لیکن میرے نزدیک اس مجموعہ کا حصہ نثر "نسبتاً زیادہ دقیع، معیاری اور دل چسپ ہے۔

مجموعے میں شامل بیشتر انشائیے جو مختلف عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں، اس بات کی تائید کریں گے کہ خان عزمی کی نظر مضحک پہلوؤں پر بہت جلد پڑتی ہے اور وہ عمیق نظروں سے ان کا جائزہ لیکر قارئین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

چودھری محمد علی ردولوی کی طرح خان عزمی اپنے پرلطف انشائیوں میں ادائے مطالب کے لیے کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن ہر جملہ بلکہ ہر لفظ معنی کی بارود سے بھرا ہوتا ہے اور خاص بات یہ کہ ان کا نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا۔ ملاحظہ فرمایئے، ایک اقتباس جو ان کے ایک انشائیے "الجھن" سے ماخوذ ہے:

"جو لوگ اپنے کو بہت لیے دیے رہتے ہیں ان کو تو بس سے سفر کا ارادہ ہی نہ کرنا چاہیے ..... ہو سکتا ہے کہ بڑھاپے میں بچپن کے کلاس روم کی بنچ پر کھڑے ہونے کی سزا کا لطف بھی اٹھانا پڑے۔ خواتین کے لیے محرم اور نامحرم کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا ہے حد یہ ہے کہ ان کا محرم تو اسٹینڈنگ کی لائن میں لگ جاتا ہے اور خود کو کسی نامحرم کی بغل میں جگہ ملتی ہے۔"

خان عزمی ردولوی کے طنز و مزاح کا ۶۷ صفحات کا یہ اہم مجموعہ پڑھنے والوں کے لیے انبساط، تبسم اور قہقہوں کا خوب سامان کرتا ہے۔ ساتھ ہی بہتر سماج کی تشکیل کا تصور بھی پیش کرتا ہے۔

بہ الفاظ پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی: ———

"ہم امید کرتے ہیں کہ ارباب فکر و نظر اس مجموعہ کا استقبال ایک ہاتھ سے نہیں بلکہ دونوں ہاتھوں سے کریں گے۔"

بہ قول عثمان غنی (ایڈیٹر قومی آواز): "اس مجموعہ کی اشاعت پر عزمی صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔ کیونکہ آج کے دور میں ہنسی بہت قیمتی ہے اور عزمی صاحب اس کو مفت تقسیم کر رہے ہیں۔"

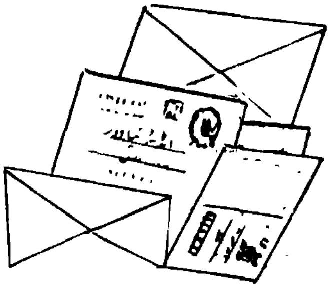
——— ڈاکٹر انور حسین خاں

نام: **"قواعدِ عربی"** (حصۂ اول)

مرتب: حکیم سید حبیب الرحمٰن قیمت: بیس روپے

ملنے کا پتہ: دہلی دواخانہ۔ طلاق محل، کان پور

کتاب کے اصل مصنف مرتب کے جد امجد صوفی الطاف حسین ہمیرپوری ہیں جنھوں نے بہت عرصہ پہلے اسے مرتب کیا تھا۔ کتاب قدیم طرز کی نحو کی کتابوں اور قواعد جیسی ہے۔ مصنف مرحوم نے کتاب کی ۵ فصلوں میں نحو کے تقریباً سبھی بنیادی اصول و ضوابط کا احاطہ کیا ہے اور ہر قاعدے کی مثالیں اور تمرینیں بھی دیتے گئے ہیں جن کے بغور مطالعے کے ذریعہ عربی نحو اور گرامر کے ضابطے سمجھے جا سکتے ہیں۔ مصنف کو نحوی مسائل پر عبور ہے مگر انداز بیان کسی قدر پیچیدہ ہے اور زبان بھی پرانی ہو چکی ہے اسلئے ضرورت ہے کہ آئندہ اڈیشن میں اسے عام فہم اور سلیس بنا دیا جائے۔ مشقوں اور مثالوں کی اتنی کثرت کی ضرورت نہیں ان میں تلخیص و ترتیب کی ضرورت ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ بھی سامنے ہو تو اس کے بارے میں مجموعی طور پر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔ بحالت موجودہ بھی کتاب استفادہ کرنے والوں کے لیے مفید و مددگار ہے۔ ——— شمس تبریز خاں



ہمارے نام.....

نیادور کے دو شمارے ایک ساتھ ملے۔ جولائی اور اگست ۱۹۹۱ء کے شمارے دیکھ کر آپ کی کارکردگی کا اندازہ ہوا۔ آپ ایک سرکاری افسر اور ایک معیاری پرچے کے مدیر کے طور پر کامیاب نظر آئے۔ اس حسنِ کارکردگی پر مبارکباد قبول فرمائیں۔
اترپردیش میں شعراء اور ادباء کی کمی نہیں۔ شعراء اترپردیش کا تذکرہ تو شائع ہو چکا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ نیادور کے صرف دو صفحات یوپی کے نثرنگاروں کے حالات وغیرہ کے لیے وقف کر دیں تاکہ مستقبل کے ریسرچ اسکالرز کے لئے رہنمائی کا فرض ادا ہو جائے۔

—————— عظیم اختر
نئی دہلی

اگست کا نیادور ملا۔ کبھی کہنے دیجیے کہ یہ شمارہ مجموعی طور پر بہت ہی اچھا لگا کتابت، طباعت، سرورق۔ کیا کہنے۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس میں شامل نثری تخلیقات اہم اور معیاری ہیں۔ آپ کی ادارت کا حسن نمایاں ہے۔ لگتا ہے آپ نے اس پر کافی محنت کی ہے۔ اس شمارے میں عابد سہیل صاحب کی ریڈیائی تخلیق خوب ہے ڈاکٹر سید محمود الحسن کا مضمون اچھا ہے۔ ان سے اور لکھوایئے۔

—————— ایم۔ کوٹھیاوی راہی
گورکھپور

نیادور اگست ۱۹۹۱ء کا تازہ بہ تازہ نو بہ نو شمارہ نظر نواز ہوا اس کا خوبصورت گٹ اپ جاذب نظر ہے۔ معنوی اور صوری اعتبار سے نیادور خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس شمارے کے مضامین بھی کافی اچھے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کی ادارت میں نیادور تحقیقی، تنقیدی اور معیاری مضامین کے اعتبار سے پروان چڑھے گا۔ کسی زمانے میں یہ پرچہ بہت معیاری ہوا کرتا تھا۔ اگر آپ محنت کریں، اب بھی وہی معیار قائم کیا جا سکتا ہے۔

—————— ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری
لکھنؤ

نیادور کے ایڈیٹر ہونے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ میں اور آپ ایک دوسرے سے متعارف نہیں لیکن زبان اور ادب کے رشتوں سے جو قربت ہے وہ کچھ کم نہیں۔ میں عرصۂ دراز سے شعر و ادب کے کوچے میں خاک اڑا رہا ہوں۔
امید ہے کہ آپ نیادور جیسے اہم رسالے کی ادارت ایسی عمدگی سے سنبھالیں گے کہ رسالہ کو نئی جہتیں ملیں گی۔

—————— ڈاکٹر اختر بستوی
گورکھپور

احقر کی جانب سے نیادور جیسے معیاری ادبی جریدے کی ادارت سنبھالنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔
اگست کا تازہ شمارہ دیکھا۔ یہ دیکھ کر ازحد خوشی ہوئی کہ اب آپ کے مؤقر جریدے کا معیار اور انداز کافی نکھر گیا ہے۔
اگر نیادور میں اطفال کے لیے ایک گوشہ اور صفحات کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

—————— سید حبیب الرحمٰن
کانپور

□□

عنوانات

اپنی بات

جب ہم چھوٹے سے تھے اور شعور کو نہیں پہنچے تھے تو بزرگ کہا کرتے تھے کہ ہمیشہ سچ بولنا، کسی کا دل نہ دکھانا۔ مگر اب ایسا زمانہ آیا ہے کہ انسان کی اعلا قدریں خاک میں ملتی نظر آ رہی ہیں۔ انسان کے جسم میں گویا شیطان حلول کر گیا ہے اور وہ تمام اخلاقی اور روحانی قوتوں کو پامال کرنے پر تلا ہوا ہے۔ دستِ ظلم کمزور اور بے بس بندگانِ خدا پر دراز کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ قانونِ قدرت کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ جب انسان نما وحشی درندہ اپنے ظلم کی حدوں سے تجاوز کرتا ہے تو خالقِ کائنات جو رحمان اور رحیم ہے، ظالم کو فسق و فجور اور قتل و غارت گری کے اسباب مہیا کرنے کے لیے مہلت دیتا ہے۔ پھر بھی جب اس کو اپنے گناہوں کا احساس نہیں ہوتا اور برائیوں پر برائیاں کرتا جاتا ہے تو اس میں خوف و ہراس اور عبرت پیدا کرنے کے لیے بستیوں کی بستیاں آنِ واحد میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے ــــ اس کی مثال حالیہ قیامت خیز زلزلے کی ہے جس نے چند لمحوں میں سیکڑوں بے گناہوں کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سُلا دیا ــــ ہم لوگوں کی تمام تر ہمدردیاں ان پس ماندگان کے ساتھ ہیں جنھوں نے اس آفتِ ناگہانی میں اپنے اعزا اور اقارب کے داغ اُٹھائے ہیں۔

ہمارے وزیرِ اعلا شری کلیان سنگھ کو اس بھیانک تباہی سے بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ وہ بہ نفسِ نفیس جنگی پیمانے پر مصیبت زدگان کے بچاؤ اور راحت کاری کے کاموں کا جائزہ لے رہے ہیں اور متاثرین کو ہر ممکن امداد پہنچا رہے ہیں۔

○

ہندستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں نومبر کے مہینے کی خاص اہمیت ہے۔ اس مہینے میں دو عظیم ہستیاں عالمِ وجود میں آئیں ایک پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد۔ یہ دونوں ہمارے ملک کے عظیم ترین رہنما تھے جنھوں نے پیار اور محبت سے عوام کے دلوں کو مسخر کیا تھا، دونوں رہنماؤں نے جیل کے اندر اور جیل کے باہر اپنی تحریروں اور تقریروں سے سامراجی حکومت کو متزلزل کیا۔

ہم لوگوں کو چاہیے کہ اپنے ذاتی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر نہرو اور آزاد ایسے بے لوث نڈر اور مخلص رہنماؤں کے نقشِ قدم پر چل کر بھارت کو دُنیا کے سامنے ایک مثالی اور فلاحی مملکت بنانے کی کوشش کریں۔

آئیے اور عہد کیجیے کہ ہم آئندہ سے اپنے ملک کو خوش حالی کی طرف لے جانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔ ہندستان ہمارا ہے۔ یہاں صدیوں سے ہر مذہب و ملت کے لوگ شیر و شکر ہو کر آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے آئے ہیں کوئی بھی مذہب کسی کی دل آزاری اور منافرت پھیلانے کی اجازت نہیں دیتا ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ایڈیٹر

سردار احمد (علیگ)
سیرھی والا گھر۔ کٹرہ شہاب خاں
اٹاوہ - ۲۰۶۰۰۱

مولانا ابوالکلام آزاد اور فنِ موسیقی

مولانا ابوالکلام آزاد، جن کو علم و دانش کا پیکر، حق و صداقت کا مفسر، جستجوؤں، آرزوؤں کا پیامبر اور دل شوریدہ و بے تابیٔ زمانہ کا مصور کہا گیا ہے، ایک نابغہ روزگار شخصیت اور ایک یگانۂ روزگار ہستی تھے جن کی تحریر و تقریر میں ایسے انسان کے دل کی ترجمانی ملتی ہے جو "عجم کا حسنِ طبیعت اور عرب کے سوز دروں" کی دولت سے مالامال ہو۔ اس ترجمانی کے بہت سے گوشے ہیں جن میں ایک گوشہ "موسیقی" بھی ہے۔

مسلمانانِ ہند کے تین عظیم دانش وروں (علامہ شبلی، مولانا آزاد علامہ اقبال) کا موسیقی سے شغف، رغبت اور تعلق دلچسپی سے خالی نہیں۔ ن۔ا۔ انصاری نے اس حقیقت کا صحیح تجزیہ کیا ہے کہ:

"سر سید کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں جو مفکر اور کارگر شخصیتیں اٹھی ہیں، شبلی، ابوالکلام اور اقبال کے نام ان کی صف اوّل میں آتے ہیں اور تینوں ہی نے موسیقی کا اعلیٰ درجے کا ذوق پایا تھا، اس کے نکتے سیکھے تھے، اسے روحانی نعمت جانا اور کبھی کفرانِ نعمت نہیں کیا تھا۔"

(اقبال کی تلاش: ن۔ا۔ انصاری صفحہ ۱۵)

علامہ شبلی نے تو عطیہ بیگم کے نام خطوط میں اس کی ترغیب دی ہے کہ "ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں۔ و انا اوّل العابدین۔"

(خطوطِ شبلی صفحہ ۱۵ خط نمبر ۲۲)

"تم کو خدا نے خوش آوازی عطا کی ہے اور نہایت موثر آواز ہے لیکن افسوس ہوا کہ تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں۔"

(خطوطِ شبلی صفحہ ۶ خط نمبر ۲۰)

مولانا ابوالکلام آزاد کا موسیقی سے "گہرا لگاؤ" اور اس کی بیاضت کی کہانی "غبارِ خاطر" کے آخری خط میں کھل کر سامنے آتی ہے جس کا تجزیاتی مطالعہ اس مقالہ کا مقصد ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سے قربت رکھنے والوں کی جو تحریریں موجود ہیں ان میں قاضی عبدالغفار کے قلم سے بھی درج ذیل اجمالی اشارے اہلِ علم کی نظروں سے گزر چکے ہیں کہ:

"مولانا آزاد اور حکیم اجمل خاں دونوں کی یہی حالت تھی کہ گویا ان کے وجودِ معنوی پر ایک بھاری نقاب پڑی ہوئی تھی۔ جب کبھی اس نقاب کا کوئی گوشہ اٹھ گیا یا انفرادیت کے اس خول میں کوئی رخنہ پڑ گیا جس کے اندر وہ چھپی بیٹھی رہا کرتی تھی تو باہر کی سنجیدہ اور خشک شخصیت سے مختلف ایک اور ہی تصویر نظر آتی یعنی ایک شاعر، مغنی، آرٹسٹ کی روح، سراپا شعر و موسیقی اور حدود درجہ ذکی الحس۔"

موسیقی کے شوق کے بارے میں خود مولانا ابوالکلام آزاد کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:-

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فنِ موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی

کر ۱۹۰۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہوچکا تھا اور طلبا کو پڑھانے میں مشغول تھا تو کتابوں کا شوق اکثر مجھے ایک کتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا جس نے ویلزلی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے دکان لے رکھی تھی ...... ایک دن اس نے فقیر اللہ سیف خاں کی "راگ درپن" کا ایک نہایت خوش خط اور مصور نسخہ مجھے دکھایا اور کہا کہ یہ کتاب فن موسیقی کی ہے۔ سیف خاں عالمگیری عہد کا ایک امیر تھا، اور ہندوستان کی موسیقی کے علم و عمل کا ماہر تھا اس نے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا جو "راگ درپن" کے نام سے مشہور ہوئی۔"

(غبار خاطر کا آخری خط بنام نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی علی گڑھ۔ مورخہ ۱۵ جون ۱۹۴۲ء)

مولانا آزاد کو "راگ درپن" کے مطالعہ کے دوران موسیقی کی مصطلحات اور مبادیات کو سمجھنے اور جاننے کے لیے کسی ماہر فن کی تلاش ہوئی اور اس سلسلے میں خیال میتا خاں کی طرف پہنچا جو مولانا کے والد بزرگوار کا عقیدت مند تھا اور جس کے عجز و نیاز اور صدق طلب سے مجبور ہو کر مولانا کے والد مرحوم نے اپنے حلقہ مریدین میں شامل کر لیا تھا، جس کے بعد اس نے کلکتہ کی طوائفوں کی اور ان کی نوچیوں کی معلمی سے توبہ کر لی تھی۔ اس کی بیعت کے تفصیلی ذکر کے بعد مولانا آزاد اپنے مذکورہ خط میں لکھتے ہیں:۔

"بہر حال میرا خیال اسی میتا خاں کی طرف گیا اور اس سے معاملہ کا ذکر کیا۔ پہلے تو اسے کچھ حیرانی سی ہوئی۔ لیکن پھر جب معاملہ پوری طرح سمجھ میں آگیا تو بہت خوش ہوا کہ مرشد زادہ کی نظر توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ یہ تجویز عمل میں لائی جائے تو کیسے لائی جائے؟ گھر میں جہاں دن رات مشکوٰۃ کے پڑھنے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ سارے گاما کی سبق آموزیوں کا موقعہ نہ تھا اور دوسری جگہ بالالتزام جانا اشکال سے خالی نہ تھا۔ بہر حال اس مشکل کا ایک حل نکال لیا گیا اور ایک راز دار مل گیا جس کے مکان میں نشست و برخاست کا انتظام ہو گیا۔"

مولانا نے "راز دار" کا راز نہیں کھولا ہے کیوں کہ انھیں معلوم ہے کہ وہ صرف مکتوب الیہ ہی سے مخاطب نہیں ہیں بلکہ ان کے خطوط کو اور لوگ بھی پڑھیں گے۔

مولانا آزاد نے میتا خاں سے سب سے پہلے ستار بجانا سیکھا اس کے بارے میں ان کے الفاظ اس طرح ہیں:۔

"موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجہ ستار پر ہوئی اور بہت جلد اس سے انگلیاں آشنا ہوگئیں۔ میری عمر سترہ برس سے زیادہ نہ ہوگی لیکن اس وقت بھی طبیعت کی افتاد یہی تھی کہ جس میدان میں قدم اٹھایئے پوری طرح اٹھایئے اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے ہی جایئے ...... جس کوچہ میں بھی قدم اٹھایا، اسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کیے تو وہ بھی پوری طرح کیے۔ گناہ کے کام کیے تو انھیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تو اس میں بھی سب سے آگے تھے۔ پارسائی کی راہ ملی تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔"

(غبار خاطر ص ۳۰۵)

مولانا نے اس خط میں آگے بتایا ہے کہ ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی۔ بین بجانا بھی سیکھ لیا۔ پھر یہ سلسلہ یک قلم متروک ہو گیا۔ اسی کے ساتھ مولانا آزاد موسیقی سیکھنے کی وجہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا کہ طبیعت اس کوچہ سے ناآشنا نہ رہے کیونکہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی ممارست کے حاصل نہیں ہو سکتی ...... موسیقی کا ذوق اور تاثر جو دل کے ایک ایک ریشے میں رچ بس گیا تھا دل سے

نکالا نہیں جا سکتا تھا اور آج تک نہیں نکلا۔"

(غبارِ خاطر ص۳۰۷)

— مولانا کے وجودِ معنوی پر بھاری نقاب پڑی ہونے کی بات قاضی عبدالغفار کے الفاظ میں اس مقالہ کی ابتدا میں کر چکا ہوں۔ اس سچائی کی جھلک خود مولانا آزاد کے قلم سے نکلے ہوئے آبدار موتیوں میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان میں حسن کا شدید احساس تھا۔ وہ زاہدِ خشک کبھی نہیں رہے۔ حسن آواز کا ہو یا چہرے کا، یا کوئی اور حسن — مولانا کے لیے جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش تھا۔ اور موسیقی ان کی زندگی کا سہارا، ان کی دماغی کاوشوں کا مداوا، ان کے جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج رہی۔ اس سلسلے میں مولانا اپنی اس مئے کہنہ کو خمِ دل سے باہر نکال کر ظاہر کر دینے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"حسن آواز میں ہو یا چہرے میں۔ تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن ہے۔ حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محرومِ ازلی پر جس کے بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو .... میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے ؎

روئے نکو معالجۂ عمرِ کوتہ ست
ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند

(غبارِ خاطر ص۳۰۰)

ارضِ حجاز کی مترنم صدائیں اور مولانا آزاد کا گوش برآواز رہنا، موسیقی کی لٹک اور مستی کے اثر کا آغاز ایامِ طفولیت میں ہی ہو چکا تھا جب مولانا آزاد حرم شریف کے باب السلام کے قریب ایک مکان میں اپنے والد ماجد کے ساتھ رہتے تھے اور "ترحیم" سنا کرتے تھے۔ خود فرماتے ہیں:-

"بچپن میں حجاز کی مترنم صداؤں سے کان آشنا ہو گئے تھے ...... اس زمانے میں حرم شریف کے ہر منارہ پر ایک مؤذن متعین ہوتا تھا اور ان سب کے اوپر شیخ المؤذنین ہوتا۔ اس زمانے میں شیخ المؤذنین شیخ حسن تھے اور بڑے ہی خوش آواز تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کی پچھلی پہر میں ان کی ترحیم کی نوائیں ایک سماں باندھ دیا کرتی تھیں۔ ہمارا مکان قدوہ میں باب السلام کے پاس تھا۔ کوٹھے کی کھڑکیوں سے میناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں اور صبح کی اذان تو اس طرح سنائی دیتی تھی جیسے چھت پر کوئی اذان دے رہا ہو۔ (ترحیم، صبح کی اذان سے پہلے مختلف کلمات ادعیہ ایک خاص لحن میں دہرائے جاتے ہیں اسے ترحیم کہتے ہیں۔ کم سے کم چار سو برس پہلے بھی یہ رسم جاری تھی کیونکہ ملا علی قاری اور صاحب الباعث نے اسے بھی بدع و محدثات میں سے شمار کیا تھا)۔"

(غبارِ خاطر ص۳۱۱)

اس کے بعد موسیقی سے لذت آشنائی کا دلچسپ سفر مولانا کی زندگی میں جاری رہا اور اپنے زمانۂ قیامِ عراق، مصر و شام مولانا نے عربی موسیقی، ایرانی موسیقی اور یونانی موسیقی کے پیچ و خم سمجھنے کی کامیاب کوشش کی۔ مصر میں مولانا آزاد، شیخ سلامہ کا حجازی کے کمالِ فن کی داد دینے قاہرہ کے اوپیرا ہاؤس بھی جاتے تھے۔ سلامہ عربی موسیقی کا ماہر تھا۔ اس سے بھی مولانا کی رسم و راہ رہی لیکن مصر میں مولانا آزاد جس نسوانی حسن سے بے حد متاثر تھے وہ پری چہرہ خوش آواز طاہرہ کا حسن تھا۔ اس مغنیہ کا ذکر مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:-

"وہ (طاہرہ) خود بھی بلائے جان تھی مگر اس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش و ایمان تھی میں نے اس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی

موسیقی کے کمالات سنئے :

(غبارِ خاطر ص ۳۱۳)

مصر کی ایک اور مشہور مغنیہ اُمِ کلثوم کی شیریں آواز کو داد دیتے ہوئے مولانا کا قلم یوں جنبش کرتا ہے :

" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے ام کلثوم کی آواز سُنی ہے وہ موجودہ عربی موسیقی کی دلآویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتا "

(غبارِ خاطر ص ۳۱۳)

مولانا آزاد اور فن موسیقی کا یہ اجمالی جائزہ نامکمل رہ جائے گا اگر میں لکھنؤ اور آگرہ میں مولانا کے اس ذوق کی تسکین کی دو باتیں نہ لکھتا چلوں مرزا احمد ہادی مرحوم لکھنؤ کی نادر روزگار شخصیت تھے جن سے کبھی مولانا نے زمانۂ قیام لکھنؤ میں اپنی معلومات موسیقی کی تکمیل کی تھی۔ مرزا مرحوم بقول مولانا آزاد، موسیقی میں کافی دخل رکھتے تھے اور علم و فن کی راہوں سے آشنا تھے اور آگرہ میں تاج، چاندنی، موسیقی اور مولانا کے ذوق و شوق کی جلوہ سامانیوں کا منظر خود مولانا کے جادو نگار قلم سے ملاحظہ فرمایئے :

" اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی، تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا۔ میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی، ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اسی میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں ۔

گدائے میکدہ ام، لیک وقتِ مستی بیں\
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی، اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات۔ چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے ڈھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اُٹھتا اور ہوا کی لہروں پہ بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے ۔

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنم\
کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا۔ چاند بڑھنے لگتا۔ یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ آ کر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے ۔

تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود می گویم\
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

(غبارِ خاطر ص ۳۰۹)

ہندستانی موسیقی، ہندستانی مسلمانوں کی موسیقی کیسے اور کب بنی، اس کی

تاریخی حقیقت بیان کرتے ہوئے مولانا آزاد رقمطراز ہیں۔

" سندھ کے نوآباد عرب ہندوستان کی موسیقی سے جو ان اطراف میں رائج ہوگی ضرور آشنا ہوئے ہوں گے۔ لیکن تاریخ میں سندھ کے عربی عہد کے حالات اتنے کم ملتے ہیں کہ جزم کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ چھٹی صدی ہجری سے شمالی ہند اور دکن کے نئے اسلامی دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا، ان سے ہم مسلمانوں کے ذوق اور اشتغال کے نتائج بہ آسانی نکال سکتے ہیں۔ اب ہندوستان کے علوم و فنون مسلمانوں کے لیے غیر ملکی نہیں رہے تھے بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔ اس لیے ممکن نہ تھا کہ ہندوستانی موسیقی کے علم و ذوق سے وہ تغافل برتتے۔ چنانچہ ساتویں صدی میں امیر خسرو جیسے مجتہد فن کا پیدا ہونا اس حقیقت حال کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ہندوستانی موسیقی ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ سازگری، ایمن اور خیال تو امیر خسرو کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کی آواز میں رس اور تار کے زخموں میں نغمہ ہے، دنیا ان کا نام نہیں بھول سکتی۔ مثنوی قران السعدین میں خود کہتے ہیں ؎

زمزمہ، سازگری "در" عراق
کردہ بہ گلبانگ عراق اتفاق

قول، ترانہ، سوہلہ ترگانہ کی ایسی عام چیزیں بن گئی ہیں کہ ہر گویے کی زبان پر ہیں۔ حالانکہ یہ سب اسی عہد کی اختراعات ہیں۔ کلاسیکل موسیقی ان سے آشنا نہ تھی۔

غالباً مسلمان بادشاہوں سے بھی پہلے مسلمان صوفیوں نے اس کی سرپرستی شروع کر دی تھی، ملتان، اجودھن، گور، اور دہلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور برکت و قبولیت کے لیے اپنا اپنا جوہر کمال پیش کرتے تھے۔ جہاں تک سلاطین ہند کا تعلق ہے خلجی اور تغلق کے درباروں میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدردانیوں کے واقعات موجود ہیں لیکن جس شاہی خاندان نے ہندوستانی موسیقی سے بہ حیثیت ایک فن کے خاص اعتنا کیا وہ غالباً جونپور کا شرقی خاندان تھا، چنانچہ اسی عہد میں خیال کی عام طور پر مقبول ہوا اور دھرپد کی جگہ اس سے اہل فن اعتنا کرنے لگے اسی عہد کے لگ بھگ دکن کے بہمنی اور نظام شاہی خاندانوں کا اور پھر بیجاپوری بادشاہوں کا ذوق و شوق نمایاں ہوتا ہے۔ چونکہ اس زمانے میں دکن اور مالوا کی سرزمین موسیقی کے علم و عمل کی تخت گاہ بن گئی تھی اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی اسے حاصل ہوجاتی۔ ابراہیم عادل شاہ تو بقول ظہوری کے اس اقلیم کا جگت گرو تھا، اور اس کے شوق موسیقی نے بیجاپور کے گھر گھر میں وجد و سماع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ ظہوری اس کی مدح میں کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

مروت کردہ شبہا بر تو سیر بام و در لازم
نمی باشد چراغے خانہ اے بے نوایاں را

مالوا، بنگال اور گجرات کے بادشاہوں کے ذاتی اشتغال و ذوق کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔ گور کے سلاطین ملکی زبان اور ملکی موسیقی دونوں کے سرپرست تھے چنانچہ بنگالی زبان کی قدیم شاعری نے تمام تر انہی کی سرپرستی میں نشوونما پائی۔ مالوا کے باز بہادر کو تو روپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بھی بنا دیا تھا اور موسیقی کا ماہر بھی

آج تک اہل اللہ کے گھروں سے اکثر کے دھروں کی
خوشبو محسوس کی جا سکتی ہیں۔

اکبر کی قدر شناسیوں سے اس فن کو جو عروج
ملا اس کا حال عام طور پر معلوم ہے۔ ابوالفضل نے
ان تمام باکمالوں کا ذکر کیا ہے جو فتح پور اور آگرہ میں
جمع ہو گئے تھے اور ان میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی
جہانگیر نے اپنی تزک میں جابجا ایسے اشارے کیے
ہیں جن سے اس کے ذاتی ذوق اور اشتغال کا ثبوت
ملتا ہے۔ اس کی حسن پرست طبیعت کا لازمی تقاضہ
یہی تھا کہ فنون لطیفہ کا قدرشناس ہو، چنانچہ شاعری
مصوری اور موسیقی تینوں کا دلدادہ اور اعلیٰ درجے
کا کمال شناس تھا۔ اس کے دربار میں جس درجہ کے
شاعر، مصور اور گویّے جمع ہو گئے تھے، پھر ہندوستان
کی تاریخ میں ہونے والے نہ تھے۔ اس کے دربار کے
ایک مصور نے انگلستان کے سفیر کو اپنا کمال دکھا کر
حیران کر دیا تھا۔ اس کے شاعرانہ ذوق کے لیے
اس کا یہ ایک شعر کفایت کرتا ہے ؎

از حسن عتاب رخ کو بیم بے تو یک نفس
یک دل شکستن تو بصد خون برابر ست

اسی عہد میں یہ بات ہوئی کہ موسیقی کا فن بھی فنون و دانش مندی
میں داخل ہو گیا اور اس کی تحصیل کے بغیر تحصیل علم اور تکمیل
تہذیب کا معاملہ ناقص سمجھا جانے لگا۔ امراء اور شرفاء کی اولاد کی تعلیم
و تربیت کے لیے جس طرح تمام فنون مدارس کی تحصیل کا اہتمام کیا
جاتا تھا۔ اسی طرح موسیقی کی تحصیل کا بھی اہتمام کیا جاتا۔"

(غبار خاطر ص ۳۲۰ - ۳۲۱)

مولانا آزاد نے موسیقی نوازی کے جواز میں اپنے تجربات اور
مشاہدات کے ساتھ اپنے کثرت مطالعہ اور قوت حافظہ کے قیمتی خزانوں کے
منہ کھول کر اس کے زر و جواہر بھی پوری فیاضی سے مذکورہ خط میں
لٹائے ہیں جو مولانا کے انداز فکر اور ان کے مزاج اور ان کی عالمانہ
شان کے مطابق ہے۔ اس بیش بہا خزانہ کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

" ایران اور توران سے جو فاضل و اشراف
آتے وہ ہندوستانی موسیقی کے فہم و مناسبت کی
ضرورت فوراً محسوس کر لیتے تھے اور چند سال بھی
گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مقام شناس بن جاتے
تھے۔ محمد قاسم فرشتہ صاحب تاریخ کا باپ مازندران
سے آکر احمد نگر میں مقیم ہوا تھا اور فرشتہ کی ولادت
مازندران کی تھی لیکن اسے ہندوستانی موسیقی سے
اس قدر شغف ہوا کہ اس موضوع پر ایک پوری کتاب
تصنیف کر دی .... علاء الملک تونی جو جلوس
شاہجہانی کے ساتویں سال ہندوستان آیا اور فاضل
خاں کے خطاب سے مخاطب ہوا اور پھر اورنگ زیب
کے عہد میں عہدہ وزارت پر فائز ہوا، ہندوستانی
موسیقی کا ایسا ماہر سمجھا جاتا تھا کہ وقت کے اساتذہ
اس سے استفادہ کرتے تھے۔

ملا عبدالقادر بدایونی جیسا متشرع اور متعصب
شخص بھی بین بجانے میں پوری مہارت رکھتا تھا اور
فیضی نے ضروری سمجھا تھا کہ اکبر کی خدمت میں اس کی
سفارش کرتے ہوئے اس مشاقی کا ذکر کر دے۔
علامہ سعد اللہ شاہجہانی جن کی فضیلت علمی اور ثقاہت
طبع کا تمام معاصر اعتراف کرتے ہیں، موسیقی اور
سنگیت کی ہر شاخ پر نظر رکھتے تھے اور ماہرانہ
رائے دے سکتے تھے۔ ان کے استاد ملا عبدالسلام
لاہوری تھے۔ ان کے حلقۂ درس کی عالمگیریوں
نے سمرقند اور بخارا تک کو مسخر کر لیا تھا، اور جب
شاہجہاں نے شہزادوں کی تعلیم کے لیے تمام علمائے
مملکت پر نظر ڈالی تھی تو نظر انتخاب نے ان کی تلاش
کی تھی۔ لیکن ان کے ذوق موسیقی کا یہ حال تھا
کہ جس طرح ہدایہ اور بزدوی کے مقامات حل کیا

کرتے تھے اسی طرح موسیقی کی مشکلات بھی حل کر دیا کرتے تھے۔ شیخ سعالی خاں جو ملا طاہر پٹنی محدث گجرات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب گجراتی کے پوتے تھے، ان کے حالات میں صاحب مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ موسیقی کے شیفتہ اور اس کی باریکیوں کے دقیقہ سنج تھے ملا شفیعائے یزدی مخاطب بہ دانش مند خاں کہ سرآمد علماء عصر تھا اور شاہجہاں کے دربار میں اس کا مباحثہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے معلوم و مشہور ہے ہندوستان آتے ہی ہندوستانی موسیقی میں ایسا باخبر ہو گیا کہ وقت کے باکمالان فن کو اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا۔ حکیم برنیر فرانسوی صاحب سفرنامہ ہند اسی دانش مند خاں کی سرکار میں ملازم تھا اور غالباً اسی کی صحبت کا یہ نتیجہ تھا کہ حکمائے فرنگ کا اسے ہم مشرب لکھا گیا ہے۔

شیخ علاء الدین جو اپنے عہد کے مشہور صوفی گزرے ہیں اور جن کی ایک غزل سماع کی مجلسوں میں بکثرت گائی جاتی ہے ؎

ندانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد

نشاط بادہ پرستاں بہ منتہیٰ برسید
ہنوز ساقی ما بادہ در سبو دارد

ان کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور آلات موسیقی کے غیر معمولی شائق تھے۔

شیخ جمالی صاحب سیر الاولیاء اور ان کے لڑکے شیخ گدائی، دونوں کا فن موسیقی میں توغل معلوم ہے۔ دور آخر میں مرزا مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد فن موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرض اصلاح پیش کرتے اور ان کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کو بھی اپنے کمال فن کی سند تصور کرتے۔

شیخ عبدالواحد بلگرامی شیر شاہی عہد کے ایک عالی قدر بزرگ تھے۔ سلوک و تصوف میں ان کی کتاب سنابل مشہور ہو چکی ہے۔ بدایونی ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی میں نقش آرائیاں کرتے تھے اور وجد و حال کی مجلسیں ان سے گرم ہوتی تھیں۔"

(غبار خاطر ص ۳۲۳-۳۲۴)

اورنگ زیب کے بارے میں مولانا آزاد کا خیال ہے کہ "وہ موسیقی کے فن سے بے خبر نہ تھا کیونکہ تمام شہزادوں کی طرح اس نے بھی اس کی تحصیل کی ہوگی البتہ آگے چل کر اس کی طبیعت کی افتاد نے دوسری راہ اختیار کی۔ گویوں نے موسیقی کا جنازہ نکالا تو اس نے کہا کہ اس طرح دفن کرنا کہ پھر قبر سے نہ اٹھ سکے۔" (غبار خاطر ص ۳۲۴)

غبار خاطر کے اسی خط میں اورنگ زیب کے ایام جوانی میں ان کی خالہ کی ایک خواص سے اورنگ زیب کے عشق کا تذکرہ بھی مولانا آزاد نے اپنے اسلوب نگارش کی دلآویزی کے ساتھ کیا ہے جو میرے موضوع سے الگ چیز ہے۔ مولانا آزاد کے جس مکتوب کی بنیاد پر یہ مقالہ ترتیب دیا گیا ہے اس کے آخری حصہ میں مولانا نے موسیقی کے صحیح اور غلط استعمال اور افراط و تفریط عمل پر اپنے منصب و مقام کو پہچانتے ہوئے بہت صحیح روشنی درج ذیل الفاظ میں ڈالی ہے:۔

"لکھنؤ کے علماء فرنگی محل میں سے بحر العلوم کی نسبت ان کے بعض معاصروں نے لکھا ہے کہ فن موسیقی میں ان کا رسوخ عام طور پر مسلم تھا۔

البتہ یہ ظاہر ہے کہ قوموں کے عروج و ترقی کے زمانے میں جو اشتغال تحسین فکر اور تہذیب طبع کا باعث ہوتا ہے وہی دور تنزل میں فکر کے لیے آفت اور طبیعت کے لیے مہلک بن جاتا ہے

ایک ہی چیز حسنِ استعمال اور اعتدالِ عمل سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے اور سوءِ استعمال اور افراط و تفریطِ عمل سے بداخلاقی اور صد عیبی کا دھبہ بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق تو اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا تو مجلس سماع و نشاط سے ان کی تھکن مٹاتا، اور پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں اسے دھکیل دھکیل کر پردہ سے باہر نہ کر دیتیں دیوان خانہ میں قدم نہیں رکھتا۔ صفدر جنگ جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا تو موسیقی کے باکمالوں کو باریاب کرتا۔ اسی کی نسل میں واجد علی شاہ کا یہ حال تھا کہ جب طبلہ بجاتے بجاتے تھک جاتا تو تازہ دم ہونے کے لیے اپنے وزیر علی نقی کو باریابی کا موقعہ دیتا موسیقی کا شوق دونوں کو تھا، مگر دونوں کی حالتوں میں جو فرق تھا وہ محتاجِ بیان نہیں ہے

سارت مشرقة وسرت مغرّب
شتّان بین مشرّق و مغرّب

عام خیال ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرماتِ شرعیہ میں داخل ہے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد جیسے پیکر حکمت نے جو فیصلہ کیا ہے وہ سنجیدگی کے ساتھ قابل غور ہے کہ۔

"اس بات کی عام طور پر شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرماتِ شرعیہ میں داخل ہے حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہائے سدِّ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا اور یہ تشدد بھی بابِ قضاء سے تھا نہ کہ باب تشریع سے۔ قضاء کا میدان نہایت وسیع ہے۔ ہر چیز جو سوءِ استعمال سے کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے قضاءً روکی جا سکتی ہے لیکن اس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ قل من حرّم زینة الله التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق"

(غبار خاطر ص ۳۳۷)

مجسم کا حسنِ طبیعت، عبقر کا سوز دروں رکھنے والی عظیم شخصیت مولانا آزاد اور موسیقی سے ان کا گہرا عشق انھیں کی عبارتوں اور اشارات کے حوالوں سے اس مقالہ میں پیش کرتے ہوئے ڈا۔ انصاری کے ان الفاظ پر اسے ختم کرتا ہوں جو میرے خیال میں مولانا آزاد پر ایک بہترین اور سچی رائے ہے کہ:

"وہ (مولانا آزاد) اپنی تمام شبانہ روز سرگرمیوں کے باوجود ایک گتھی تھے۔ ریشم کی لچھی تھے ہیرے پر لپٹی ہوئی۔ ہجوم عام میں دیکھتے اور مذاقِ عام سے بدکتے رہے عمر بھر"

(کتاب شناسی ص ۱۰)

■■

اعلان

۱۱ نومبر ۱۹۹۱ء سے نیا دور کی قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اب اس کی قیمت فی شمارہ تین روپے اور سالانہ قیمت تیس روپے ہوگی۔

لہٰذا ایجنٹ حضرات سے گزارش ہے کہ اب موجودہ قیمت پر جتنے شمارے درکار ہوں اسی حساب سے بقیہ رقم بطور ضمانت ارسال فرمائیں۔

ــــــــــ ادارہ

غزل

ابھی وہ فاصلہ بردار سالم ہے — دریچے کی طرف، دیوار سالم ہے
غنیمت ہے کہ اب بھی اس کے ہاتھوں میں — ہمارا تیشۂ انکار سالم ہے
میں زندہ ہوں، ابھی چاروں طرف میرے — حصارِ شعلۂ بسیار سالم ہے
اسی جانب ہمیں کرنا ہے اب ہجرت — ابھی وہ شہرِ خواب آثار سالم ہے
مرے صورت گرو! مایوس مت ہونا — طلسمِ شیشۂ و زنگار سالم ہے
جہاں رُسوا ہے، میری خاکساری بھی — بہت ہے، جو ترا پندار سالم ہے
میں اس کے گرد قائم دائرے سا ہوں — وہ نقطہ سا، پسِ اسرار سالم ہے
تھکن سے چُور ہوکر رہ گئے رستے — خدا کا شکر ہے رفتار سالم ہے
وہ پتھر کی طرح تھا، ٹوٹ کر بکھرا — مگر، اک آئینہ بردار سالم ہے
سمیٹو! معنی و الفاظ کے ٹکڑے — اُٹھاؤ! کاسۂ اظہار سالم ہے

اسی سے ہے مرا آہنگ وابستہ
سُلگتے ساز میں اک تار سالم ہے

فضا ابن فیضی
جمال پورہ - مئوناتھ بھنجن

نیّر مسعود
"ادبستان" دین دیال روڈ. لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

اودھ کی تہذیبی تاریخ کی جھلکیاں

پرانے ماخذوں سے

پرانے لکھنؤ میں کشمیری مسلمانوں کی رسمیں

(ماخذ "سوانح عمری" از خواجہ بہار الدین کشمیری. نوشتہ ۱۹۰۰ء)

عہدِ شاہی میں کشمیر کے بہت سے خاندان اور افراد لکھنؤ میں آکر بس گئے تھے. یہ "اہلِ خطہ" کہلاتے تھے. لکھنؤی تہذیب سے متاثر ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے رسوم درواج خصوصاً شادی غمی کی رسموں کو بھی برقرار رکھا تھا. ان رسموں کا مستند بیان خواجہ بہار الدین کشمیری کی خودنوشت "سوانح عمری" (مخطوطہ، مصنف کتاب خانہ مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ) میں ملتا ہے جو مع عنوانات و تمہید درج ذیل ہے :-

"لکھنؤ میں اہلِ خطہ"

۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۷ عیسوی میں جب میں لکھنؤ میں آیا تھا صرف دس برس کا عرصہ غدر اور انتزاع سلطنت کو ہوا تھا. ابھی شاہی بُو دماغوں میں بسی ہوئی تھی. لباس، وضع نشست و برخاست، آرائش و آسائش، معاشرت شاہی زمانے کے طریقے پر تھی. اگرچہ بربادی، خانہ ویرانی، غارت گری پورے طور سے ہو چکی تھی. تاہم شاہزادے اور رئیس اہل و شائق، ابھی پرانے خیال کے تھے. بقول کسے رسی جل گئی لیکن بل نہیں گیا.

اہلِ خطہ گو کہ تمام خراب اور برباد ہو چکے تھے اور کاروبار پشمینہ اور ملازمت شاہی ختم ہو چکی تھی، تاہم دماغ ویسے ہی تھے. لکھنؤ میں اہلِ خطہ خاندانی لحاظ سے چند محلوں کے نام سے مشہور رہتے: سرائے معالی خاں، احاطہ خانساماں، جوہری محلہ، چوک، کٹڑا ابو تراب خاں. ان محلوں کے حضرات کشمیری الاصل تھے... مگر مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کے پاس کوئی شجرہ یا نسب نامہ خاندانی نہیں ہے. اور بعض محلے ایسے ہیں کہ وہاں کوئی صاحب پرانے رشتے بھی نہیں جن سے کچھ دریافت ہوتا.

معاشرت باہمی

القصہ ان کی معاشرت کا طریقہ آپس میں کیا تھا اور کیونکر تھا آپس میں ان کے میل جول، معاشرت، مراسم برادرانہ محبت، الفت، نشست و برخاست، آمد و رفت، عزیزداری، قرابت، ہمدردی، اتفاق. یہ سب امور تھے جو انسانیت اور اخوت کے مقتضی تھے.

تقریبِ شادی

شادی بیاہ کی تقریبات میں جب انھیں مدعو کیا جاتا تھا تو اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا:

ایک فہرست اسم نویسی محلہ وار جس کے عنوان میں بعد حمد و ثنا کے تمہیداً ذکرِ گل و بلبل، باغ و بہار، سبزہ و لالہ زار، رقص (و) سرود،

ں وزنشاط کے) تلازمے کے ساتھ اظہار مسرت وخوشی کا ہوتا تھا
بسم تقریب کا یہ جلسہ یا محفل ہوتی تھی اس کا نام اور تاریخ اور وقت
استدعائے تشریف آوری کمال نیاز مندی کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس
ان کے آخر میں "المکلف" کے تحت صاحبِ محفل ہوا کرتا تھا.
ن صاحب اس مضمون کو نظم کرکے اس فہرست کے ساتھ تقسیم
تے تھے۔

یہ فہرست قبل تاریخِ دعوت ہر محلے میں بھیج دی جاتی تھی اور اطلاع
صاد اس کے نام پر کرایا جاتا تھا۔ گو کہ یہ طریقہ اب بھی جاری ہے
ں حگہ ـ اگر ہمیں ملک است و ہمیں روزگار

فل کا طریقہ

محفل کا طریقہ نشست و برخاست یہ تھا کہ صاحبِ محفل
ں محفل بیٹھتا تھا اور جو حضرات تشریف لایا کرتے تھے ان کو استقبال
ساتھ صدرِ مجلس تک پہنچا دیا کرتے تھے اور ہر محلے کے اصحاب
لبًا ایک ہی مقام پر بیٹھتے تھے۔ گانا ناچ شروع ہوتا تھا۔ جب
ب قریبًا داخل محفل ہو جاتے تھے، ان کو کھانے کے واسطے
یف دی جاتی۔ کھانا کھلانے کے واسطے دوسرا مکان ہوتا تھا.

انا کھلانے میں لحاظ

کھانا کھلانے میں اس امر کا لحاظ ضروری تھا کہ اول دوسے
ں چوک والے، اس کے بعد حاطہ، خانساماں، اس کے بعد کٹڑا،
ں کے بعد سرائے معالی خاں.

ے کی وجہ کیا تھی؟

اس کی کیا وجہ تھی؟ چوک والے اول وقت میں کھانا کھاتے
ے، خانساماں والے کچھ دیر کرکے نوش فرماتے تھے، کٹڑے والے
ہ دیر کرکے کھاتے تھے۔ سب سے آخر میں سرائے معالی خاں والے
ں کی وجہ یہ تھی کہ بعد بارہ بجے جب کہ دربارِ شاہی سے مرخص
تے تھے تب گھر پر آن کر کھانا کھاتے تھے۔ ان وجوہات کی قید سے
لحاظ سے ایک دستور ہو گیا تھا۔

ستر خوان

دستر خوان پر سوائے اہلِ برادری کے ان کے ساتھ کوئی نہیں
ہوتا تھا۔ کھانا ہر صاحب کے آگے، چاہے بچہ ہو، علاحدہ علاحدہ ہوا کرتا
تھا۔ ضرورت کی چیزوں کی نگرانی رہتی تھی۔ کھانے کے انتظامی لوگ
سب گھر کے یا اہلِ برادری ہوتے تھے۔ محفل میں بھی سوائے گھر کے یا اہلِ
برادری غیر کا دخل نہ تھا۔ خدمت گار لبِ فرش حقہ دے کر چلا جاتا تھا
بعد کھانے کے خدمت گار اپنے آقا کا کھانا اٹھا کر لے جاتا۔ بعد ہاتھ دھونے
کے پان دیا جاتا تھا۔

چائے نمکین

جب سب صاحب کھانا کھانے سے فارغ ہوتے تھے، قریب
تین بجے چائے نمکین کا دورہ ہوتا تھا۔ اس میں بھی اس بات کا لحاظ
ہوتا تھا کہ ایک جانب سے شروع ہو اور دوسری جانب تک ختم کر دی
جائے۔ تذکرۂ بالا کے لحاظوں میں اگر کسی قسم (کا) ردّ و بدل ہو جاتا تو
باعث برہمی اور ناراضی کا ہوتا تھا۔ اس محفل میں غیر بہت کم ہوتے تھے
اہلِ برادری کی تعداد قریب چار سو کے تھی۔ پانچ بجے صبح کو یہ جلسہ
شب کا بہ غرض رفع ضرورت اور نماز کے برخاست کر دیا جاتا، اور
سب حضرات اپنے اپنے مکانوں پر چلے جاتے تھے۔

برات

اگر برات کسی اور محلے میں جانے والی ہوتی تھی، یہ حضرات سب
قریب آٹھ بجے تشریف لاکر دولہا کو گھوڑے پر سوار کرکے بلا انتظار
جلوس ہمراہ دولہا کے سب ہوتے تھے۔

لطیفہ

اس مقام پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا جو کہ قابل لکھنے کے ہے۔
جناب مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہ العزیز سے کسی طالب علم
نے اس شعر نظامی علیہ الرحمہ کے اعتراضاً پوچھا کہ حضور سرورِ عالمؐ کی معراج
کے ذکر میں نظامی نے یہ کہا ہے ؎

بہ بار و پیش خضر و موسیٰ دواں
مسیحا چہ گویم بہ مرکب رواں

باوجود ایسے پیغمبران جلیل القدر کے ایسے الفاظ لکھنا سوئے ادبی
ہے۔ حضرت (نے) جواب دیا کہ او بے وقوف گدھے! اس میں کیا ہے؟
جب دولہا سوار ہوتا ہے، اس کے بھائی بند سب داہنے بائیں آگے

بیٹھے ہوتے تھے۔

(اگر) برات گھر میں رہے

اگر برات اسی گھر میں رہے تو اہلِ برادری آٹھ بجے کے بعد پھر اسی مکان پر، جہاں شب کو قیام کیا تھا، تشریف لاتے تھے اور پھر بزمِ نشاط، رقص و سرود شروع ہو جاتا تھا۔

محفلِ صبح

حقہ پان جاری رہتا تھا گیارہ بجے دن کو پھر چائے شیریں یعنی قہوہ، شیرمال کے ساتھ۔ بارہ بجے (کے) قریب پڑیاں، جن میں الائچی، چکنی ڈلی وغیرہ چیزیں بھری ہوتی تھیں، نہایت نفاست کے ساتھ مکلّف تقسیم ہوتی تھیں۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اب رخصت ہے مبارک باد ہو کے جلسہ ختم ہوتا تھا، اور اس کے مصارف، علاوہ ناچ کے دلہن والوں کے ذمّے رہتے تھے کیونکہ صبح کی محفل دلہن کے گھر ہونا چاہیے۔

یہ طریقہ، جو کہ بیان کیا گیا، تقریبات شادی کا تھا۔

تقسیم حصہ برادری

جب تقریب تقسیم حصہ (کذا) خواہ کھانا ہو، خواہ مٹھائی ہو، خواہ کھیر ہو، اہلِ برادری کے مکانوں پر بھیجا جاتا تھا، اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک فہرست محلہ وار اسم نویسی کی عنوان کے ساتھ جس میں نوعیتِ تقریب لکھی جاتی تھی، مگر اس میں بھی قواعد تھے، بچوں کا نام جن کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے، نہیں لکھا جاتا تھا لیکن اگر کوئی صاحب مر گئے اور ان کی بی بی زندہ ہیں تو ان کا نام بجائے شوہر کے لکھا جاتا تھا۔ مزدور کو مزدوری تقسیم کنندہ دیتا تھا۔ اور نکاح کے وقت جو شربت پلائی ہندستانیوں میں ہوا کرتی ہے، نہیں رواج تھا۔

غمی کی حالت میں

غمی کی حالت میں یہ دستور رکھا گیا تھا کہ ہر محلے میں جس طرح ممکن ہو، اطلاع کرا دی جائے۔ اطلاع ہونے پر سب حضرات اہلِ برادری نہایت ہمدردی کے ساتھ تجہیز و تکفین میں شریک ہو کے رخصت ہوتے تھے اور بعض صاحب تعزیت کو گھر تک پہونچا کے رخصت ہوتے تھے۔

سیوم

سیوم میں پھر شریک ہو کے ختم قرآن اور فاتحے میں شریک ہوتے تھے اور اظہارِ رنج و غم اور کلمات تسکین بخش ادا فرماتے تھے

شرکت مستورات

مستورات جن سے قرابت اور عزیزداری ہوتی تھی، شریک شادی اور غمی میں ہوتی تھیں۔

اب بھی ہے!

ان تمام باتوں کا خاکہ اب بھی ہے لیکن وہ شان، ہمدردی، محبت تمول اور وضعداری اور وہ کثرتِ احباب کہاں؟ اوّل سب مر گئے، اور جو حضرات ہیں وہ بہ وجہ انقلاب زمانہ کے کہاں ان مصارف کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ الّا ماشاءاللہ۔

(آرائش محفل)

مکانِ محفل کی آرائش اور نمائش، شیشہ آلات، چربی کی شمعیں، چاندی کے حقّے اور چاندی کے پیچوان اور فرش زمین کا، درمیان میں مردوں (کذا "مردنگوں؟") کی دو رویہ قطار، اس میں روشنی عیاں۔ علاوہ اس کے ہر ایک اہلِ برادری جو مقتدر تھے، ایک حقّہ، چاندی کا اولدان، خاصدان ہوتا تھا۔ جب محفل میں بیٹھ گئے آدمی نے حقّہ نکال دیا، خاصدان پیش کیا، اولدان سامنے رکھا۔

(پوشاک)

پوشاک جاڑے میں پشمینہ اور اونی ٹوپی، گرمی میں جامدانی کامدانی۔

تعدادِ برادری

تعداد برادری چار سو (تھی) اب سو بھی نہیں۔ اس زمانے میں ہر مہینے میں قریب قریب ایسے جلسے ہوا کرتے تھے، اب برسوں میں۔

تقریبات میں انتظام

ان تقریبات میں انتظام کل اپنے ہاتھوں سے یا اہلِ برادری خاندانی لوگوں کے ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ غیر کو دخل نہیں۔ یہاں کے رئیسوں اور شاہزادوں کو ان محفلوں کا حسن انتظام اور طریقۂ نشست و برخاست دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور نہایت معترف ہوتے تھے۔

فی الواقعہ ان حضرات نے تقریبات کشمیر اور لکھنؤ کا انتخاب کرکے ایک نیا حسین موزوں گلدستہ بنایا تھا، جس کی خوشبو لکھنؤ بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ رہے خدا کا نام۔ بس، والسلام"۔

عہدِ شاہی میں لکھنؤ کی کہاریاں اور مہریاں

(ماخذ ۱۔ "ہمجولی" حصہ اول، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی ۲۔ "فسانۂ عبرت" رجب علی بیگ سرور۔ ۳۔ "فسانۂ عجائب" رجب علی بیگ سرور)

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی اپنی کتاب "ہمجولی" میں بتلاتے ہیں: ——

"کہاری اور مہریوں میں بیّن تفاوت تھا۔ یعنی کہاریاں بادشاہی بوجھ اٹھاتی تھیں۔ ان کی وردی سبز ہوتی تھی، سبز مخمل کی تکیفیاں ان کے کندھوں پر رکھی جاتی تھیں۔ سبز گرنٹ کے نیم آستین کے شلوکے، سبز دوپٹے، سبز گرنٹ کے لہنگے، یہاں تک کہ پاؤں میں سبز جوتی ہوتی تھی۔

مہریاں بادشاہی محل کا کل کام انجام دیتی تھیں اور سواری کے وقت بادشاہ کے بوچے کے ساتھ مورچل، پنکھے، خاصدان، اُگالدان سورج مکھی، چنور، چتر لے کر چلتی تھیں"۔

"مہریوں کی پوشاک مختلف رنگوں کی ہوتی تھی۔ پچاس پچاس گز کے گلبدن کے لہنگے جن میں چھ چھ بالشت کی پٹھانے کی گرنٹ کی گوٹ ٹول کے نیفے، ریشمی ازاربند، ماتھے پر سونے کا چھپکا، سونے کی مچھلی کانوں میں جڑاؤ بالیاں، پاؤں میں چھڑے، ہاتھوں میں کنگن کڑے، زر دوزی جوتی۔ یہ گویا ان کی وردی تھی جو بادشاہ کی طرف سے ملتی تھی اور خاص سواری کے وقت ملتی تھی یا دربار میں جانے کے وقت پہن لیتی تھیں، ورنہ محل میں گھٹنے پائجامے پہن کر کام کرتی تھیں"۔ ۱۴ھ

(خواجہ عشرت یہ بھی بتاتے ہیں کہ نصیر الدین حیدر کی سواری میں دو سو کہاریاں تھیں جن کی افسر ڈلو کہاری تھی، اور دو سو مہریاں تھیں، ان کی افسر دھنیا مہری تھی جسے بادشاہ نے افضل النساء خانم کا خطاب دیا تھا۔ عملہ اسے "خانم صاحبہ" اور بیگمیں اور بادشاہ "خانم" کہتے تھے۔ ۱۵ھ

رجب علی بیگ سرور واجد علی شاہ کے ایک بیٹے کی برات کے جلوس کے بیان میں لکھتے ہیں:۔

"کئی سے کہاری، جوڑے مغرق بھاری پہنے، سر سے پاؤں تک مرصع جڑاؤ گہنے، اطلس و گلبدن کے لہنگے مسالا ٹکا، قیمت کے مہنگے، پُرزر کاشانی مخمل کی کرتیاں پیشانی پر سنہری، رُوپہلی مچھلیاں، ان کی چالاکیاں اور پھرتیاں کچھ سکھپال بہ صد ناز اٹھائے، کچھ خالی جلو میں ادھر اُدھر عقد پروین کی طرح گرد مراسم"۔ ۱۶ھ

فسانۂ عجائب میں شہزادہ جان عالم کی سواری کے بیان میں سرور لکھتے ہیں:۔

"ہزار یان سے کہاریاں.... زربفت و اطلس کے لہنگے، مسالا ٹکے، ململ کے دوپٹے باریک، ہفت گرگھرو کی کرتی انگیا، کاشانی مخمل کی کرتیاں کندھوں پر، کچھ سکھپال اٹھائے، باقی پرا جمائے ادھر اُدھر۔ جڑاؤ کڑے.. ہاتھوں میں پڑے، پاؤں میں سونے کے تین تین چھڑے کانوں میں سادی سادی بالیاں"۔ ۱۷ھ

پرانے لکھنؤ میں شوقین مزاجوں کی ہیئت اور سنجیدہ لوگوں کی وضع (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء)

(ماخذ: "افسانۂ نادرجہاں" طاہرہ بیگم)

پانچ سو صفحے کا یہ معاشرتی ناول طاہرہ بیگم الملقب بہ نواب فخر النساء نادرہ بیگم کے نام سے چھپا تھا۔ بہ قول مصنفہ اس ناول کو ان کے استاد مرزا محمد عباس حسین ہوش لکھنوی (مصنف ناول "ربط ضبط"، "مثنوی تغیر جنت") نے درست کیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کا کہنا تھا کہ یہ زیادہ تر ہوش ہی کی تحریر ہے۔ کتاب کے آخر میں ان لوگوں کی فہرست دی گئی ہے جنہوں نے اس کی تالیف وغیرہ میں مالی اعانت کی تھی۔ ان میں میر خورشید علی نفیس (فرزند میر انیس) بھی شامل ہیں جنہوں

لے دس رُکے چکا دیئے تھے۔

ناول کی ہیروئن اپنے شوقین مزاج مندوبی شہریار دولہا کا حلیہ اس طرح بیان کرتی ہے :-

"بنکے دار دو انگل کی دو پلڑی ٹوپی جو پوری مانگ کو بھی نہیں چھپا سکتی تھی۔ سلائی سے بنے ہوئے گھونگھر دار بال، جن میں ڈھیروں تیل پڑا ہوا، جامدانی کا چست انگرکھا، کوڑی پر چولی، باہر لوٹے کا رنگا ہوا کرتا، آنکھوں میں گہرا گہرا سرمہ، پاؤں کی ہونٹوں پر لالی، ریخوں میں مستی، ہاتھوں میں مہندی، دونوں چھنگلیوں میں دس بارہ انگوٹھیاں، ریشمی رومال، اودے گزرلے کا چوڑی دار گھٹنا، کام دار بوٹ، پیروں میں چھلے بازوؤں پر جوشن اور انڈیاں، دونوں کانوں میں عطر کا ڈوبی روئی، گلے میں کالے ریشم کی سیلی، کلّے ربابن میں خلال، بڑی بڑی مونچھیں، چھوٹی چھوٹی داڑھی ہے [۷]

اس ہیئت کے آدمی کے لیے ہیروئن نے "وضع دار" کا لفظ استعمال کیا ہے ("ایسے وضع دار کا سامنا اچھا نہیں ہے" [۸]) خود شہریار دولہا ایک موقعے پر اپنی غیرت مندی کے اظہار میں کہتا ہے :

"سارے کنبے میں بانکا مشہور ہوں" [۹]

سنجیدہ وضع

ہیروئن شہریار دولہا کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتی ہے اور اس کیلئے مندرجہ ذیل پوشاک تجویز کرتی ہے :

"چوگوشیہ ٹوپی، نیچی چولی کا انگرکھا، بر کے پائینچے کا پاجامہ سفید یا سرخ بوٹ، سفید کرتا، سفید رومال" اور یہ کہ اگر نیچی چولی کا انگرکھا پسند نہیں تو "اچکن پہنا کرو، چاہے پروے دار، چاہے سادی، مگر چولی نیچی ہو" [۱۰]

علاوہ بریں وہ شہریار دولہا کی مونچھیں بھی چھوٹی کراتی ہے۔ [۱۱]

۱۸۸۸ء میں لکھنؤ کی اشیاء صرف اور ان کی قیمتیں

(بحوالہ "اختر شاہنشاہی" اختر الدولہ)

یہ کمیاب کتاب دراصل اخباروں اور مطبعوں کا تذکرہ ہے۔ سرورق کے دعوے کے مطابق اس میں مفصل کیفیت مع تقریظ ہر ایک اخبارات اُردو و فارسی و عربی ہفت اقلیم کی بیان کی گئی "ہے۔ اس کتاب کے آخری صفحوں میں سے دو پر سید حسن شاہ موسوی (شہر لکھنؤ، محلہ یحییٰ گنج، مکان نمبر ۸۵) کی طرف سے ایک اشتہار [۱۲] شامل ہے جس میں کچھ اشیاء اور ان کی قیمتوں کا اندراج حسب ذیل ہے :

نام اشیاء مع وضع کام	طول	عرض	قیمت
۱۔ تھان کامدانی و سنہری بیل بوٹے دار سچے عمدہ	۱۰ گز	۱۴ گرہ	۱۵ روپے سے ۲۵ روپے تک [۱۳]
۲۔ تھان چکن، اور اس کے گل بوٹوں میں کامدانی کا کام	۱۰ گز	۱۴ گرہ	۵/ روپے سے ۱۰/ روپے تک
۳۔ تھان چکن، بیل بوٹے دار نہایت عمدہ	۱۰ گز	۱۴ گرہ	۴/ روپے سے ۵/ روپے تک
۴۔ تھان ململ، زنانہ باریک مثل آب رواں	۱۰ گز	۱۴ گرہ	۳/ روپے سے ۵/ روپے تک
۵۔ تھان شربتی، ساخت لکھنؤ	۱۰ گز	۱۴ گرہ	سوا دو روپے سے ۵/ روپے تک
۶۔ دوپٹے کامدانی کے، سنہری نہایت عمدہ زنانے	۳ گز	۱۰ گرہ	۵/ روپے سے ۱۰/ روپے تک
۷۔ دوپٹہ چکن، اور اس کے گل بوٹوں میں کامدانی	۳ گز	۱۰ گرہ	۲½ روپے سے ۵/ روپے تک
۸۔ دوپٹہ چکن، بیل بوٹے دار زنانہ و مردانہ	۳ گز	۱۰ گرہ	۱½ روپے سے ۴/ روپے تک
۹۔ کرتے چکن کے، بیل بوٹے دار سلے ہوئے تیار	۱۳ و ۱۴ گز	گھیر ایک گز (کذا)	۱۲ آنے سے ۲½ روپے تک
۱۰۔ عبا یعنی چغہ، سوتی و ریشمی چکن کے	معمولی	معمولی	۳ روپے سے ۵/ روپے تک
۱۱۔ صدری، سوتی و ریشمی	معمولی	معمولی	ایک روپیہ سے ۵/ روپے تک

م اشیاء مع وضع کام	طول	عرض	قیمت
. پائجامے، چھوٹے بڑے مہر کے (کذا "چھوٹی بڑی مہری"؟)	معمولی	معمولی	۱۲ر آنے سے ۱/ روپے تک
۱. کلاہ گول سوزنی، مع کام کلابتون	،،	،،	ایک روپیہ سے ۴/ روپے تک
۱. کلاہ زردوزی، مخملی سیاہ سبز	،،	،،	۷/ روپے سے ۱۰/ روپے تک
۱. کلاہ چکن، دوپلڑی و چوگوشیہ مُرّی و پیچی			۲ر آنے سے ۱½ روپے تک
. فرد رضائی، نین سُکھ جال دار بوٹے دار نہایت عمدہ			۲½ روپے سے ۹ روپے تک
. پلنگ پوش، جھاڑی دار نہایت عمدہ			۲½ روپے سے ۳½ روپے تک
. لحاف، نین سکھ و مارکین بیل دار نہایت عمدہ	،،	،،	،، ،،

۱. گولیاں تمباکو، خوشبودار نہایت عمدہ ورق دار فی تولہ ۸ر آنے
بلا ورق فی تولہ ۴ر آنے

. قوام فی تولہ ۳ر آنے

ان اشیاء کے علاوہ "سازِ قلم دان نیل دنداں، کنگھی زنانی و مردانی، شاخ کی نہایت عمدہ، کیلیں طلائی و انگشتری نقرئی بہت عمدہ ہر قسم کا سامان یعنی شادی وغیرہ کا کارخانے میں موجود ہے۔"

۱۸۹۶ء کی قیمتیں

(ماخذ: کتاب "شجرۃ النبیؐ" مولوی وزیر علی فتح پوری۔
شائع کردہ محمد عبداللہ صدیقی)

محمد عبداللہ صدیقی تاجر کتب، چوک لکھنؤ، کتابوں کے علاوہ کچھ اشیاء کی بھی تجارت کرتے تھے "شجرۃ النبیؐ" کے آخری صفحہ (۲۰) پر ایک اشتہار میں انھوں نے ان اشیاء کی ایک مختصر فہرست مع قیمتوں درج کی ہے ـــــ ذیل میں اس اشتہار کی نقل پیش کی گئی ہے:

"فہرست اشیاءِ ساختِ لکھنؤ"

یہ ایک مشہور دکان ہے جو عرصے سے صدہا بیوپاریوں کو اپنے کھرے مال اور واجبی قیمت سے نفع پہنچاتی ہے۔ اب عام خریداروں کی نفع رسانی کے لئے یہ فہرستِ مختصر مشتہر کی جاتی ہے کہ وہ اپنی فرمائشات طلب کر کے اس کی عمدگیِ مال اور کفایتِ قیمت کی قدردانی فرمائیں۔ ہر فرمائش بذریعہ (بذریعہ وی۔ پی) روانہ ہوگی ..... اور فہرست موجودہ دکان ۲ر (دو پیسے) کا ٹکٹ بھیجنے سے روانہ کی جاتی ہے اور جواب کے لیے جوابی کارڈ یا ۲ر کا ٹکٹ آنا چاہیئے ورنہ شکایتِ عدمِ تحریرِ جواب معاف۔

فہرست اسباب چکن و کامدانی وغیرہ

نام جنس مع وضع	قیمت
۱. تھان کامدانی، بیل بُوٹے دار، سنہری سچے	۱۵/ روپے سے ۳۰/ روپے تک
۲. تھان کامدانی، بوٹے دار، انگرکھوں دوپٹوں کیلئے	۵/ ،، ۲۰/ ،،
۳. تھان چکن، اس کے گل بوٹوں میں کامدانی کا پُربہار کام	۴/ ،، ۱۰/ ،،
۴. تھان چکن، بیل بوٹے دار، اعلیٰ درجے کے عریض و کم عریض	۳/ ،، ۱۵/ ،،
۵. تھان چکن، عمدہ وضع، بوٹے دار عریض و کم عریض	۳½/ ،، ۱۵/ ،،
۶. تھان شربتی، ساختِ لکھنؤ، باریک انگرکھوں کے لیے	۲/ ،، ۵/ ،،
۷. تھان ململ، مثلِ آبِ رواں، زنانہ دوپٹوں کے قابل	۳/ ،، ۷/ ،،
۸. تھان گلبدن و مشروع، ہر رنگ، ہر وضع نہایت عمدہ	۲/ ،، ۱۰/ ،،
۹. تھان بنارسی، مع بوٹی زری پٹی، ہر رنگ چارخانے دار	۶/ ،، ۴۱/ ،،
۱۰. پارچہ چکن، قابلِ تیاری ایک انگرکھے یا چکن کا، ہر قسم کا	۶/ ،، ۱۰/ ،،

نام جنس مع وضع	قیمت
۱۱. دوپٹا کامدانی، سادہ ورنگین ہر قسم کے عورات کے قابل	۳/ روپئے سے ۱۰/ روپئے
۱۲. دوپٹا چکن، جس کے گل بوٹوں میں نہایت پُر بہار کامدانی	۲ــ/۸ " ۱۰/ "
۱۳. دوپٹا چکن، بیل دار و بوٹے دار، نہایت عمدہ	۱ــ/۸ " ۵/ "
۱۴. ساری کامدانی، برائے عورات، سفید ورنگین بہت عمدہ	۶/ " ۱۰/ "
۱۵. ساری چکن، جس کے گل بوٹوں پر پُر بہار کامدانی، عمدہ	۲ــ/۸ " ۷/ "
۱۶. عبا یعنی چُغہ، خاص برائے ثقات واہلِ علم سوتی و ریشمی	۲/ " ۱۰/ "
۱۷. پائجامہ سوتی و ریشمی، غلتہ و تنگ مہری، ہر قسم کا، عمدہ	۱۲ آنے " ۲/ "
۱۸. کلاہ چوگوشیہ و دوپلڑی و گول، چکن ساخت لکھنؤ	۲ آنے " ۵/
۱۹. کُرتے چکن، بیل دار و بوٹے دار، سلے ہوئے تیار	۱۲ آنے " ۵/
۲۰. کلاہ سوتی و ریشمی و کلابتونی، گول، ساخت میرٹھ	۴ آنے " ۵/ "
۲۱. کلاہ مخمل، سیاہ و سبز و سُرخ، مندیل نما کارچوبی، سچا کام، ہر قسم و ہر وضع، نہایت عمدہ	۳/ روپئے " ۲۰/ "
۲۲. کلاہ کشتی نما، ساخت امروہا و دہلی و لکھنؤ ریشمی و کلابتونی و زردوزی، نہایت عمدہ	۱/ روپئے " ۱۰/ "

فہرست اسبابِ سرمائی ومتفرقات

۱. فرد رضائی مع استر و گوٹ گرنٹ بالکل تیار	۵/ روپئے سے ۸/ روپئے تک
۲. لحاف نین سکھ، بیل دار، گوٹ دار، تیار مع روئی وغیرہ، مختلف رنگ، مختلف وضع نہایت عمدہ	۶/ " ۸/ "
۳. فرد رضائی نین سکھ، بوٹے و جال دار، سفید و رنگین	۲/ روپئے سے ۴/ روپئے تک
۴. لحاف نین سکھ و مارکین، بیل بوٹے دار، نہایت خوش رنگ، بہت عمدہ وضع، قابلِ دید	۲/ " ۴/ "
۵. پلنگ پوش، جھاڑی دار و جال دار نہایت خوش رنگ	۲/ " ۴/ "
۶. کلاہ چوگوشیہ زربفت و کمخواب، شال بیل دار	۲/ " ۵/ "
۷. کلاہ چوگوشیہ مخمل، زری و اطلس و فلالین بوٹے دار	۴ آنے " ۲/ "
۸. الائچی مستی کی، نہایت عمدہ، ایک الائچی کھانے سے لب مستی دار ہو جاتے ہیں	فی صدی نو آنے
۹. کیل ناک کی طلائی، مرصع، ہر قسم	فی ۹ آنے، ۱۳ آنے، ۱۵ آنے ۲/ روپئے سے ۴/ روپئے تک
۱۰. ساز قلمدان، جالی دار کام کے نہایت عمدہ	۸ آنے سے ۱۴ آنے تک
۱۱. گچھا کیلوں کا، ملمع کیا ہوا مع زنجیر جس میں گلوریاں لگاتے ہیں	۶ آنے سے ۹ آنے تک
۱۲. کنگھی سینگ زنانہ و مردانہ ہر قسم و ہر وضع	ایک آنہ سے ۴ آنے تک
۱۳. انگوٹھی چھلّا، سادے کاری	۴ آنے سے ۱/ روپئے تک
۱۴. چکنی ڈلی دو رُخی	۳/ روپئے سیر سے ۶/ روپئے سیر تک
۱۵. (") یک رُخی	۲/ " " ۳/ "
۱۶. کنکر چکنی ڈلی کے	۱ــ/۸ " " ۳/ "
۱۷. حلوا سوہن	۱۲ آنے سیر سے ۳/ "

علاوہ اس کے ہر قسم کا مال عمدہ اور بکفایت مل سکتا ہے۔ کلاہ چکن و متفرق اشیا کا دلیو ۲/ روپے سے کم کا روانہ نہ ہوگا اس لیے کہ کم میں خرچ زیادہ ہوتا ہے۔

المشتہر: محمد عبد اللہ تاجر کتب، لکھنؤ چوک، و مالک مطبع مجتبائی، لکھنؤ ۱۳۱۲ھ

منحوس اعمال

(ماخذ: "رسالہ واجدیہ سلطانی" از واجد علی شاہ اختر ۱۸۵۴-۵۵ء)

واجد علی شاہ نے ۱۲۷۱ھ میں فارسی میں ایک کتاب لکھی تھی، اس میں ۲۷ باب تھے جنھیں افسر کا نام دیا گیا تھا۔ مرزا غالب نے اس کتاب کا

منظوم دیباچہ لکھا تھا جو ان کے فارسی کلیات میں نویں مثنوی کی حیثیت سے شامل ہے۔ مثنوی کے عنوان میں اس کتاب کا نام " بست و ہفت افسر" بتایا گیا ہے لیکن بادشاہ نے اس کتاب کو "مجموعۂ واجدیہ سلطانی" کے نام سے شائع کیا۔ پھر اس کتاب کا اُردو ترجمہ 'رسالۂ واجدیہ سلطانی' کے نام سے شائع کیا۔ کتب خانۂ مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ میں اس کا جو نسخہ موجود ہے اس پر ادیب مرحوم کے نوٹ کے مطابق یہ اُردو ترجمہ بھی خود بادشاہ کا کیا ہوا ہے۔ یہ کتاب ایک قسم کا کشکول ہے جس کا ہر افسر ایک الگ موضوع پر ہے اور ان موضوعات میں سورۂ یٰسین کی تاثیروں سے لے کر آتش بازی کے نسخے تک شامل ہیں۔ سترھواں افسر ان باتوں کے بیان میں ہے " جن کے کرنے سے محتاجی اور مصیبت ہوتی ہے"۔ یہ باتیں (قدرے اختصار کے ساتھ) حسب ذیل ہیں:

۱۔ جنوب کی طرف منھ کر کے کھانا کھانا
۲۔ دامن سے ہاتھ پونچھنا ۳۔ ایک ہاتھ سے پانی پینا
۴۔ ٹوٹے ہوئے برتن میں پانی پینا ۵۔ "ننگے ہو کے پیشاب کرنا"
۶۔ برہنہ سر بیت الخلا جانا ۷۔ رات کو جھاڑو دینا
۸۔ رات کو کھانے پینے کے برتن کھلے چھوڑنا
۹۔ شوہر کا نام لینا ۱۰۔ بیوی کا نام لینا
۱۱۔ ماں باپ کو نام لیکر پکارنا ۱۲۔ پانی کے بغیر کھانا کھانا
۱۳۔ اولاد کو بددُعا دینا ۱۴۔ کھڑے ہو کر پاجامہ پہننا
۱۵۔ بیٹھ کے پگڑی باندھنا ۱۶۔ "خشک کنگھی کرنا"
۱۷۔ ٹوٹی ہوئی کنگھی رکھنا ۱۸۔ قینچی سے سر کے بال کاٹنا
۱۹۔ چوکھٹ پر بیٹھنا ۲۰۔ لہسن اور پیاز کے چھلکے جلانا
۲۱۔ مکڑیوں کو گھر میں رہنے دینا ۲۲۔ جوؤں کو جیتا چھوڑ دینا
۲۳۔ پھٹا ہوا کپڑا پہنے پہنے سلوانا
۲۴۔ "جلدی سے باہر آنا" (غالباً کسی ملاقاتی کے آنے پر)
۲۵۔ صبح کے وقت سونا ۲۶۔ پاؤں پر پاؤں رکھ کے سونا"
۲۷۔ دانت سے ناخن کاٹنا
۲۸۔ خربوزے اور تربوز کے بیج دانت سے کھٹکنا

شاہی عملہ: چند نام

(ماخذ: "رسالۂ واجدیہ سلطانی")

۱۔ بکسری ۲۔ برج باسی ۳۔ ثابت خانی ۴۔ چوب دار
۵۔ سونٹے بردار ۶۔ محل دارنیاں ۷۔ ترکنیاں ۸۔ اردا بیگنیاں
۹۔ قلماقنیاں ۱۰۔ مخلانیاں ۱۱۔ کشمیرنیاں ۱۲۔ حبشنیں

کھانوں کی چند قسمیں

(ماخذ: رسالۂ واجدیہ سلطانی)

پُلاؤ:

پلاؤ۔ چُلاؤ۔ قورمہ پلاؤ۔ یخنی پلاؤ۔ حسینی پلاؤ انناس پلاؤ۔ مرصّع پلاؤ۔ مادھو پلاؤ۔ موتی پلاؤ۔ مُرغ پلاؤ کباب پلاؤ۔ گڑھل پلاؤ۔ بڑھل پلاؤ۔ کولا پلاؤ۔ زیر بریاں متنجن۔ مُزعفر۔ دم پُخت۔ دکت دپیچ۔ قبولی۔ نورمحلی تہولی۔ کھچڑی گلزار۔ خشکہ برنج۔

کباب

شامی کباب داراُئی کباب۔ حسینی کباب۔ نرگسی کباب۔ چاپکی بوٹی۔ تکّہ۔ کوفتہ۔ پنیردار۔ میاہ پُر۔ خطائی۔ پرسندہ۔ مچھلی کباب۔ نخود کباب۔ پنیر کباب۔ رنگین کباب آتشی۔

روٹیاں

شیرمال۔ باقرخانی۔ گاؤزبان۔ گاؤدیدہ۔ کلچہ۔ آبی۔ تنکی۔ خستہ۔ نان ہوا۔ کماج۔ روغنی۔ پراٹھا۔ چپاتی۔ اُزبکی۔

خاصے کے کھانے

دلما۔ زنی۔ یاقوتی۔ نمش۔ شیربرنج۔ گلتھی۔ فالودہ۔ شش رنگا۔ فالودہ خاص۔ خاگینہ۔ بورانی۔ رایتا۔ چٹنی۔ اچار۔ مُربّا۔

کپڑوں کے تھان[۱۳]

تاش ۔ تمامی ۔ اساوری ۔ کمخواب ۔ تافتہ گجراتی ۔
زربفت ۔ اطلس ۔ غلطا ۔ ساٹن ۔ مشجر ۔ گل بدن ۔
چیلام ۔ پھلام ۔ مشروع گجراتی ۔

جواہرات

لعل ۔ زمرد ۔ یاقوت ۔ الماس ۔ نیلم ۔ پکھراج ۔
زبرجد ۔ لاجورد ۔ یشب ۔ گیدک ۔ مرجان ۔ لہسنیا ۔
فیروزہ ۔ تامڑا ۔ عقیق ۔ لالڑی ۔ یمنی ۔ سلیمانی ۔ کٹیلا ۔
دوپلکا ۔ سنرا ۔

زیورات

(کانوں کے) بُندے ۔ بالیاں ۔ چودانیاں ۔ مُرکیاں جڑاؤ ۔
پچھیاں مرصع ۔ پتی طلائی ۔ لچھی موتیوں کی ۔ (گلے کے) دھکدھکی ۔
اد بسی ۔ چمپاکلی ۔ جگنو ۔ توڑا ۔ ست لڑا ۔ پنج لڑا ۔ چندن ہار ۔
نادعلی ۔ ہیکل ۔ (بازو کے) نورتن ۔ بجو بند ۔ جوشن ۔
تعویذ ۔ (کلائی کے) جہانگیریاں ۔ پہنچیاں ۔ پٹریاں ۔ علی بند ۔
توڑے ۔ کڑے ۔

خیموں کی قسمیں

دل بادل ۔ معراپک ۔ قلندری ۔ راوٹی ۔ سراپچی ۔
باتاقی ۔ چوترکے ۔ بے چوبے ۔ یک چوبے ۔ قزلباشی ۔
شامیانے ۔ نمگیرے ۔ بنگلے ۔ سہلے ۔ گورکھے ۔ پالین ۔ ڈیل ۔
صاحبت خانی ۔ دوری پلٹن ۔ چھولداری ۔

گھوڑے

عربی ۔ ترکی ۔ کیت ۔ لاکھوری ۔ سمند ۔ سیاہ زانو ۔
سبزا ۔ سُرخا ۔ بورتا ۔ شرغا ۔ نقرہ ۔ ابلق ۔ قلا ۔
تازیکا ۔ پھلواری ۔ چال ۔ مگسی ۔ ابرش ۔ مشکی ۔
خنگ ۔ سُرنگ ۔

پرندے

سُرخاب ۔ بلبل ۔ شاما ۔ سارو ۔ ممولا ۔ ہُدہُد ۔
کبوتر ۔ تیتر ۔ توتا ۔ مینا ۔ نیل کنٹھ ۔ چنڈول ۔ اگن ۔
ٹیٹری ۔ کوئل ۔ بٹیر ۔ بگلا ۔ شکرخورا ۔ پدّا ۔ لٹورا ۔ پودنا ۔
پھدکی ۔ سینہ باز ۔ لال ۔ چٹی ۔ ابلقا ۔ ہریوا ۔ لوا ۔
دہیڑ ۔ ہریل ۔ فاختہ ۔ ہزارداستان ۔ قمری ۔ دُولھا ۔
پنچھی ۔ کٹھ پھوڑا ۔ طوطی ۔ مُرغ ۔ بڑھئی ۔ کلچڑی ۔ بھگیلی ۔
قرنا ۔ ماہی خور ۔ گلدم ۔ کاکڑا ۔ چرکوا ۔ جل ککڑ ۔

خلعت کے اجزا

جیغہ ۔ کلغی ۔ سرپیچ مرصع ۔ مالائے مروارید ۔ سپر ۔
شمشیر ۔ فیل ۔ پالکی ۔ منصب ۔ جاگیر ۔

□□

حواشی

۱ اصل "پرانا رہا"

۲ صاد (ص) اس زمانے میں پسندیدگی اور منظوری کے نشان اور وصولی کی رسید کے طور پر بنایا جاتا تھا۔ (نیر مسعود)

۳ ۴ "ہمجولی" (حصہ اول) خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی ۔ طبع اول گیلانی پریس لاہور۔ ناشر ایس عبدالرشید اینڈ برادرس لاہور (مضمون افضل النساء ص۲۵-۲۴)

۵ "فسانۂ عبرت" رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ۔ کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۵۷ء ص۱۰

۶ "فسانۂ عجائب" رجب علی بیگ سرور ۔ مرتبہ رشید حسن خاں ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ۔ ۱۹۹۰ء ص۸۳-۱۸۲

۷ ۸ "افسانۂ نادرجہاں الموسم بہ اسم تاریخی عریضۂ طاہرہ (۱۳۰۵)" طاہرہ بیگم الملقب بہ نواب فخر النساء نادر بیگم ۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء حصہ دوم ص۴۳

۹ ۱۰ ایضاً ص۵ بعد

۱۱ سوانح عمری اخبارات حصہ اوّل اختر شاہنشاہی: اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی ۔ اختر پریس لکھنؤ ۱۸۸۸ء ص۹۶-۲۹۶

۱۲ ایک گز ۹۲ سنٹی میٹر کے قریب ، فی گز ۱۶ گرہ (فی گرہ ۲¼ انچ) ایک روپیہ میں ۱۶ آنے ، فی آنہ ۴ پیسے ، فی پیسہ ۳ پائی (۱۲ پائی)

(نیر مسعود)

سید علی رضا حسینی

۴۳/۹۶ کرنیل گنج، بجرنگی چوراہا، کان پور

زیب غوری کا آہنگِ فکر و فن

زیب غوری کے آہنگِ فکر و فن کو سمجھنے کے لیے "چاک" کے پیش لفظ پر نظر ڈالنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ بغیر اس کے پڑھے ہوئے نہ زیب کی شخصیت اور نہ اس کے مزاج اور نہ اس کے آہنگِ فکر و فن کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس پر بحث کی جا سکتی ہے۔ زیب کا اصرار ہے کہ اس کی اس مختصر نگاری کی تلافی اسی صورت سے ممکن ہے جبکہ اس کو اس پیش لفظ کے بین السطور میں دیکھا جائے، پڑھا جائے اور سمجھا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پیش لفظ خود زیب کی شخصیت کا بھی آئینہ ہے اور اس کے فکر و فن کا بھی۔ اس کا ذہنی سفر بڑا طویل بھی ہے اور پر پیچ بھی۔ لیکن تمام گزرگاہوں کے نشانات اس کے شعری سرمایے میں ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ اس طویل ذہنی سفر میں ایک بات جو رہ رہ کے کھٹکتی ہے وہ "ناآسودگی" کا احساس ہے۔ چاہے زیب زندگی کی وادیوں میں قدم رکھیں یا فکر و فن کی دنیا میں۔ یہ ناآسودگی کا احساس ہر جگہ چھایا ہوا ملے گا۔

حالات سے ناآسودگی اور ناشکیبائی زندگی کے لیے لعنت ہے کیونکہ اس سے جذباتیت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور جذباتیت تباہی کا آغاز ہے لیکن یہی ناآسودگی اور احساس ناشکیبائی فن کے لیے نعمت۔ اقبال نے پیامِ مشرق میں "حور و شاعر کے مکالمہ" میں اس کی بڑی خوبصورتی سے تصویر کشی کی ہے۔ حور کے سوال پر شاعر کا جواب فکر و فن کا بنیادی محور ہے۔ مکالمہ چاہے محیطِ فلک پر ہو یا سرارضِ منا پر۔ بہرحال دعوتِ فکر دیتا ہے۔

حور سوال کرتی ہے، نہ تو آپ میری طرف دیکھتے ہیں اور نہ آپ کو بادہ نوشی سے کوئی رغبت ہے۔ کیا رہ و رسمِ آشنائی سے آپ بالکل بیگانہ ہیں ؎

نہ بہ بادہ میل داری نہ بمن نظر کشائی
عجب ایں کہ تو نہ دانی رہ و رسمِ آشنائی

شاعر کا جواب علمیاتِ فن کی فکر انگیز داستان ہے ؎

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نہ سازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتے آں کہ نہایتے ندارد!
بہ نگاہِ ناشکیبے، بہ دلِ امیدوارے

شرر سے ستارہ اور ستارے سے آفتاب یعنی نگاہِ ناشکیبا اس چیز کو حاصل کرنا چاہتی ہے جس کی حدیں معین اور محدود نہیں۔ یہ جہانِ آرزو ایک جہانِ معنی ہے۔ کامیاب زندگی اور کامیاب عملیاتِ فن کا سرچشمہ تخلیقی قوتوں کے راز اسی نگاہِ ناشکیبا میں چھپے ہوئے ہیں۔ مجاہد راہ کی آسانیاں نہیں دیکھتا۔ اس کے لیے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں۔ تخلیقِ فن خود ایک مجاہدہ ہے۔ دشوار گزار منزلوں کو سر کر کے اپنی راہ الگ بنا لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک صاحبِ نظر ہی کا کام ہے ؎

راہ کے پتھر پانی لگنے لگے ۔ طے سفر کیا جب آسان لگنے لگے

یہی نگاہِ ناشکیبا اور ناآسودگی زیبؔ غوری کی شعری جمالیات کا مزاج ہے۔ اس کا منفرد لب و لہجہ جدید و قدیم کے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور نہ بند۔ مجھے تو کلیاتِ زیرِ تدوین کے منتخب اشعار سے لے کر "زرد زرخیز" اور "چاک" تک ہر جگہ ایک ہی رنگ نظر آیا۔ وہی منفرد لب و لہجہ جو نئے مجموعوں میں ملتا ہے، وہی اس کے قدیم مجموعوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مزاج تقلیدی نہیں بلکہ اجتہادی ہے۔

نت نئی تمثیلیں اور نادر تشبیہوں کی تلاش۔ اس کے زیرِ تدوین کلیات سے چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں ؎

فروغِ لالہ و گل سے دلوں کی پائمالی تک
تمناؤں پہ کیا گزری ہے جشنِ بے شگالی تک

ٹھکانہ ہے کوئی اے زیبؔ اپنی تیرہ بختی کا
عروجِ مہر کب پہونچا ہماری باکمالی تک

دو پہر غم کی خدا جانے ڈھلے یا نہ ڈھلے
کچھ حسیں خواب پڑے سہمے ہوئے پلکوں کے تلے

فرش زمیں پر پھیلی ہوئی ٹیک نہ پا کر بیل کہیں
رنگیں رنگیں پھولوں کا جیسے کوئی چشمہ ابل رہا ہے

جھیل کی ساکت لہروں پر ٹھہرے ہوئے نیل کمل کا ابھار
جیسے خموشی کے سینے سے کوئی نغمہ پھوٹ رہا ہے

تشنہ تشنہ، کم کم جلوۂ حسن بڑھا دیتا ہے کچھ اور
قوسِ قزح کی ایک لکیر سے جیسے اڑا جاتا ہے فلک

لالہ و گل کے جلووں کا رنگ نہیں ہے بہاروں میں
ننھے منے جگنو ایسے پھول بھی ہیں گلزاروں میں

ہزار رنگ فضائے حیات نے بدلے
طلوعِ اشک سے دل ڈوبنے کے منظر تک

دن تری یاد میں ڈھل جاتا ہے آنسو کی طرح
رات تڑپاتی ہے اک نشترِ پہلو کی طرح

جانے کس سوچ میں ڈوبا ہوا تنہا تنہا
دل کا عالم ہے کسی سروِ لبِ جو کی طرح

یہ اشعار نہ کسی تشریح کے محتاج ہیں اور نہ تبصرہ کے۔ تاہم چند جملے گراں بار خاطر نہ ہوں گے۔ ہیئت کی خوبصورتی، جذبہ کی تازگی، نادر تمثیلات و تشبیہات فکر و فن کی ہم آہنگی، موضوع کی ہیئت سے پیوستگی، تضاداتِ نظر۔ اپنی تیرہ بختی اور عروجِ مہر کی باکمالی، مصورانہ فن کاری، منظر نگاری۔ سمعی و بصری پیکروں کا لمس ؎

جھیل کی ساکت لہروں پر ٹھہرے ہوئے نیل کمل کا ابھار
جیسے خموشی کے سینے سے کوئی نغمہ پھوٹ رہا ہے

سادہ سادہ الفاظ کے تلازمات سے نغموں کی تخلیق۔ تشنہ تشنہ، کم کم جلوۂ حسن بڑھا دیتا ہے کچھ اور۔ قوسِ قزح کی ہلکی سی لکیر۔ مشاہدہ کی باریک بینی۔ ننھے منے جگنو ایسے پھول۔ کلیوں کا روپ سنگھار۔ جگنوؤں کی سی چمک دمک، کیا کچھ نہیں ان اشعار میں۔ لب و لہجے کی انفرادیت تو یہاں بھی ہے جو بقول زیبؔ اس کے ایامِ جاہلیت کا کلام ہے "یا قدیم شاعری کا سرمایہ ہیں"۔ ممکن ہے خود زیبؔ ہی کے الفاظ میں ——

"ہر دور کی شاعری میں چاہے وہ روایتی ہو ترقی پسندانہ ہو یا جدید، ہر نوع کی شاعری کی اپنی مخصوص لغت رہی ہے۔ زرد زرخیز کی اشاعت تک میں بھی ان پابندیوں کو بھگتتا رہا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ جب لفظ ہی شاعری کا وسیلہ ہیں تو پھر شاعری کے لئے ایک محدود و مخصوص لغت اپنا کر اپنے کو آزمائش میں کیوں ڈالوں۔ شاعر اگر تخلیقی سطح پر

لفظوں کو استعمال کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو پھر لفظوں کی حد بندی کیسی ؟ "

مجھے زیبؔ کے ان فرمودات سے انکار نہیں۔ لیکن یہ نکتہ بھی تو قابلِ غور ہے کہ " شاعر اگر تخلیقی سطح پر لفظوں کے استعمال کی قدرت رکھتا ہے " تو ایک مخصوص لغت کو بھی اپنے مزاج میں ڈھال سکتا ہے جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے منعکس ہوتا ہے۔

اسی سلسلے میں پیش لفظ کا ایک اقتباس اور دعوتِ نظر ہے تاکہ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کے توازن میں فرق محسوس نہ ہو:

" شاعری کے بارے میں ایک بات اور عرض کرنا ہے کہ ابتک کی شاعری کی جو تعریفیں کی جاتی رہی ہیں اس میں دراصل شاعر کی توصیف رہی ہیں۔ استعارہ علامت بصری پیکر، صوتی پیکر، فکر کی گہرائی اور پیچیدگی عصری حسیت، لفظوں کا تخلیقی استعمال، ابہام وغیرہ۔ غرضیکہ یہ جتنی بھی خوبیاں ہیں ان کا تعلق شاعر کے مزاج سے ہے اور شاعر کا مزاج جیسا ہوگا اس کی جھلک تو اس کے شعروں میں آئے گی "

زیبؔ کے سلسلے میں یہی بات تو مجھے بھی کہنا تھی۔ " شاعر کا مزاج جیسا ہوگا اس کی جھلک تو اس کے شعروں میں ہوگی " اور زیبؔ کا یہی مزاج تو ہے جو اس کے شعریاتی عمل اور فن کارانہ حسن میں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے اس میں ادوار کی قید کا سوال نہیں " قدیم سرمایہ " پر نظر کرتے ہوئے بھی زیبؔ کے قاری پر ایک انبساطی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو جدید کلام کے پڑھنے سے۔ اس سے بھی انقباضِ طبع نہیں ہوتا اور فنونِ لطیفہ کا ایک پہلو فرحت بخشی بھی تو ہے۔ یہ روایت پرستی کی وکالت نہیں، زندگی میں جمود کہاں ؟ قدیم و جدید کی تقسیم کیوں ؟ یہ الگ بات ہے کہ زیبؔ کے جدید کلام میں بھرپور تازگی ملتی ہے۔ اس کا انداز انوکھا اور انیلا ہے ہر دور میں۔ یہاں یہ رنگ ذرا نکھر گیا ہے یہاں ہوتی۔ بصری اور لمسی پیکروں کا عکس ہے۔ اشعار میں معنوی گہرائیاں اور گیرائیاں ہیں، لفظوں کی تہہ داریاں ہیں، ابہام کے ہلکے ہلکے پردے اور ایک حرفِ راز کی طرح بکھتا ہے نم اس کا دھیمی دھیمی لو، وہ غم

حیات ہو یا غمِ کائنات، ایک فضا ہے کہرے میں چھائی ہوئی ہے

ایک حرفِ راز دل پر آئینہ ہوتا ہوا
اک کہر چھائی ہوئی منظر بہ منظر اور میں

بڑی خوبصورت منظر کشی، بصری پیکر کی اہتزازی کیفیت اور معنویت کی تہیں۔ اسی جگہ فرزدق کا یہ قول سچا معلوم ہوتا ہے۔

اَلْاِبْہَامُ اَفْصَحُ مِنَ الصَّرَاحَۃِ

یعنی ابہام صراحت سے فصیح تر ہے۔ لیکن ابہام کے پردے اتنے دبیز نہ ہوں کہ نظریں وہاں تک پہونچ نہ سکیں اور وہ ترسیل کا المیہ بن کر سامنے آئے۔ اسی لیے زیبؔ نے اپنے پیش لفظ میں اس کی صراحت کر دی ہے :— " میں نے ابہام کے پردے بدل دیئے ہیں۔ اب وہ پہلے سے بھاری نہیں رہے، میں نے اب ایک پڑھے لکھے قاری کے وجود کو تسلیم کر لیا ہے "—

یہی بات ہے کہ اگر ابہام کا ہلکا سا پردہ پڑا ہو تو شعر پڑھتے وقت ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ کہر آلود فضا منظر بہ منظر پہلو بدلتی ہوئی دور تک چھائی ہوئی کیفیت۔ دل پہ حرفِ راز کا آئینہ ہونا۔ یہ کیف و سوز کی چھائی ہوئی بدلیاں اور " حرفِ راز " کی تہہ داریاں۔ گوشۂ خاطر کی ناآسودگیاں۔ ایک جہانِ معنی اس شعر میں پوشیدہ ہے۔ شاعر کی مقبولیت کا ایک راز یہ بھی تو ہے کہ اس کا شعر زباں زد ہو جائے۔ زیرِ نظر شعر کا حسن بھی یہی ہے اور زیبؔ کا یہ شعر اس کے ہر قاری کو یاد بھی ہے اور ازبر بھی۔ یہ میں مانتا ہوں کہ زیبؔ کے مزاج میں نہ یاسیت تھی اور نہ قنوطیت اس کا مزاج رجائی تھا ہے

لپکتے شعلوں میں گو راکھ ہو گئے اوراق
ہوا چلی تو دہکنے لگا سخن اس کا

لیکن مجھے غم کی مبہم اور مدھم آنچ پہ جو اس شعر یا زیبؔ کے اکثر اشعار میں ملتی ہے میرا اس نکتے پر اس لیے اصرار ہے کہ اگر اس کو زندگی میں کسی کمی کا احساس نہ ہوتا تو ایسے شاہکاروں کی تلاش نہ کرتا جو نفسِ مطمئن کے آئینہ دار ہیں۔ ایسے آئینے جن کا تصور ہی زندگی کو لطیف سے لطیف تر اور پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے۔ اس کا یہ شعر دیکھیں ہے

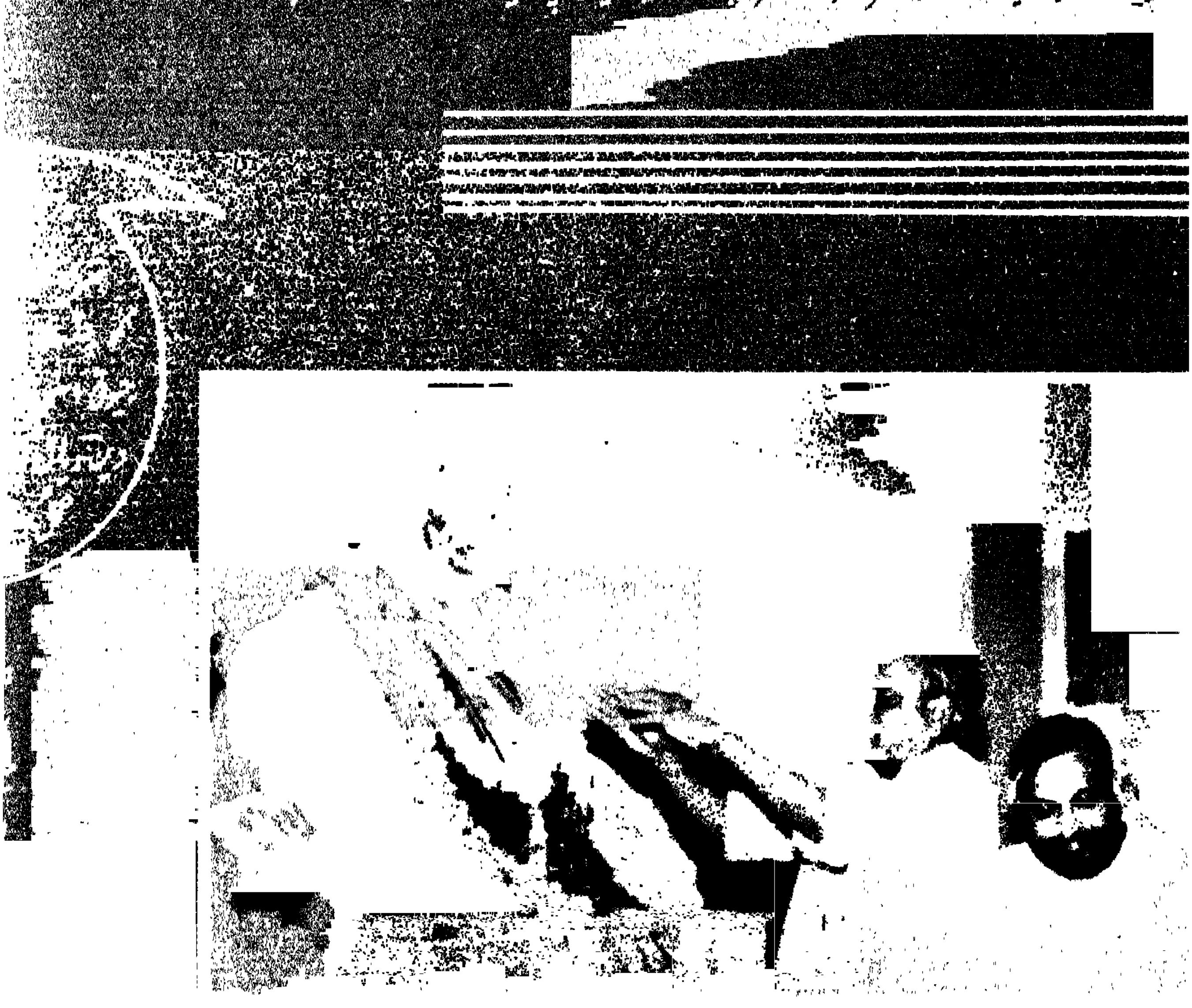
گورنر اترپردیش
شری بی. ستیہ نرائن ریڈی ۲ [illegible]
۱۹۹۱ء کو اندرا نگر [illegible]
"ساکیت" کے زیر اہتمام منعقد
عدم تشدد کے موقع پر [illegible]



وزیر غذا اور رسد شری
[illegible] رضوی کارلٹن ہوٹل لکھنؤ میں
[illegible] نومبر ۱۹۹۱ء کو [illegible] روزہ [illegible]
[illegible]
[illegible] میں وزیر تعمیرات عامہ شری
[illegible] سنگھ [illegible] بھی نظر آ رہے ہیں۔



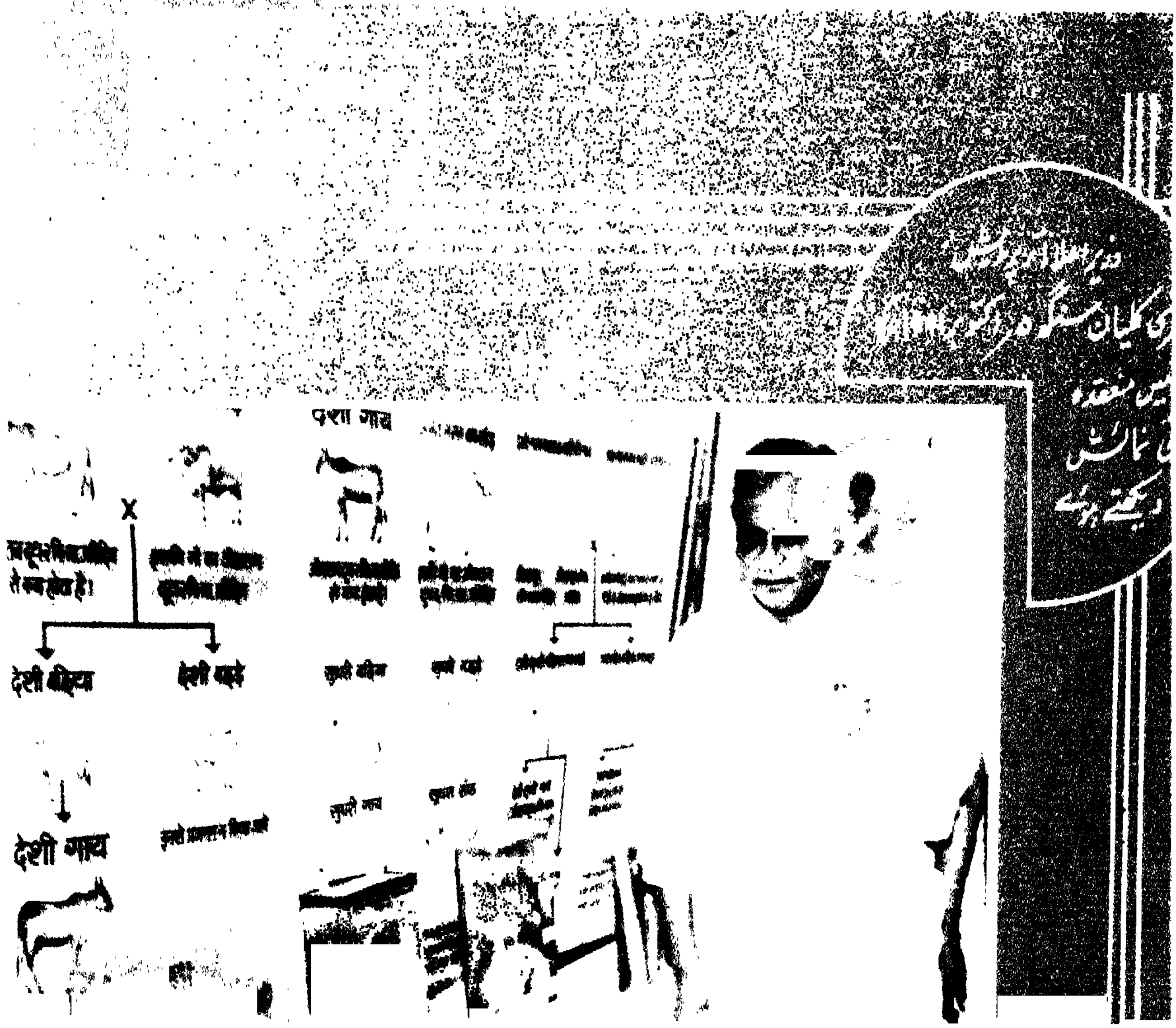
مہم اعلا منتری کلیان سنگھ ۵ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کو پنڈت دین دیال اُپادھیائے جینتی کے موقع پر منعقدہ جلسۂ عام کو




संघ
"یوجنا بھون"
اور
کو خطاب




भारतीय लोकतन्त्र


देशी गाय

کے کلام میں غم کی سرشاری ہی نے تو میر کو بیکراں بنا دیا تو پھر اس سے صرفِ نظر کیوں؟ ؎

دھواں دھواں ہے بہت دور شہر کا منظر
سلگ رہا ہوں پڑا ریگِ سرد پر میں بھی

کب تک بچا کے شعلۂ جاں کو رکھو گے زیبؔ
اک بار تو یہ شمع ہوا میں اچھالنا

بساطِ ارض کو یونہی پڑی چمکنے دے
غبارِ جاں کے لیے خیمہ ہوا نہ لگا

گھسیٹتے ہوئے خود کو پھرو گے زیبؔ کہاں
چلو کہ خاک کو دے آئیں یہ بدن اس کا

یہ اس کا بدن ایک دبیز پردہ ہے۔ ذرا اسے اٹھا کر دیکھیے۔ یہ انسانی جسم "اس کی" امانت ہے جس نے خاک کے پتلے میں جب روح پھونکی تو فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا۔ لیکن میں افسردہ فضا میں اس مضمون کو ختم نہیں کرنا چاہتا اس لیے چند اہتزازی اشعار ضیافتِ طبع کے لیے بغیر کسی تشریح کے پیش ہیں ؎

میں رنگ و نور کی بارش بھی رہا تھا جسے
غبارِ آب تھا وہ سرد آبشاروں کا
وہ زیبؔ تیرہ مکانوں کا جگمگا اٹھنا
بلند ہونا وہ فوارہ سا شراروں کا

دل کھل اٹھتا ہے کسی کی گفتگو کرتے ہوئے
دیکھنا سبزے کو بارش میں نمو کرتے ہوئے

ہو چکے گم سارے خد و خال، منظر اور میں
پھر ہوئے اک آسماں، ساحل، سمندر اور میں

کبھی کبھی تو مکمل بنا کوئی تصویر!
کہ زیبؔ کچھ تو رہے ذہنِ نارسا کے لیے

یہ ہے زیبؔ کا ہنر، اس کا فن، اس کا جمالیاتی شعور، اس کا اجتہادی مزاج۔ وہ اپنے کلام پر ہر جگہ چھایا ہوا ملے گا۔

کسی شاعر یا فن کار پر لکھتے وقت بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں خصوصاً زیبؔ غوری پر جسے اپنی پیکر تراشی اور فن کارانہ مصوری پر ناز بھی ہو۔ زیبؔ کی مصورانہ شاعری سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ زیبؔ کی مصوری اور شاعری۔ دو ہی جوہر تو ایسے ہیں کہ جس نے اس کی زندگی کو معنویت عطا کی ہے۔ لیکن اس کی اس مصورانہ فنکاری کا عمل شکستہ اور سالم تصویریں ہیں۔ میرے نزدیک شکستہ تصویریں وہ جن میں جذبہ کی شدت کم، فن کاری اور رنگ آمیزی زیادہ۔ اور سالم تصویریں وہ ہیں جن میں جذبے کی شدت بھی ہے اور فن کا حسن بھی۔ یہاں فن اور جذبہ کا توازن برقرار۔ مثلاً ؎

سب ہوئے مصلحتِ وقت کے اک روز شکار
رہ گئے ہم ہی زمانے کے مقابل تنہا
دل سے رخصت ہوئی ایک ایک تمنا لیکن
عشق بیٹھا ہے سجائے ہوئے محفل تنہا

شعلۂ یک نفس ہوں میں، جل مرے ساتھ تو بھی جل
ہے اسی پیچ و تاب تک زیبؔ ترا ثبات بھی

وہ چمکتی ہوئی موجیں ہیں کہاں
اس طرف بھی وہی صحرا ہی تو ہے

مرگ و ہستی میں بہت فرق ہے کیا
دفن کر دو اسے زندہ ہی تو ہے

سالم تصویروں کے اس ضمن میں زیبؔ کی ایک نظم "تنہائی" جو اس کے نگارخانۂ فن کا سب سے نادر نمونہ ہے۔ اس اکلوتی نظم اور قطعات اور رباعیات کے انتخاب نے زیبؔ کو میرے نزدیک ہمہ جہتی شاعر بنا دیا ورنہ مولانا حسرت موہانی کی طرح یک صنفے رہ جاتے۔ پوری کی پوری نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے جستہ جستہ اشعار پیش

کیے جاتے ہیں۔ آزاد نظم۔ خوبصورت۔ رواں دواں ؎

تنہائی

یہ خنک رات کسی گہرے سمندر کی مثال
سطح پر اس کے کوئی موج، نہ کوئی شورش
کس قدر درد چھپائے ہے مرے دل کی طرح
کوئی محرم نہیں جس کا کوئی دمساز نہیں

یہ خنک رات، کسی کوہ گراں کی صورت
جس کے دامن میں کوئی پھول کبھی کھل نہ سکا
یہ خنک رات مرے شانے پہ
اپنا سر ٹیکے ہوئے روتی ہے

یہ خنک رات چمکتی ہوئی ناگن کی طرح
اپنا پھن کاڑھے، مرے جسم پہ ڈالے ہوئے بل

اوس کی طرح پسینے کو مرے ماتھے سے
چاٹے جاتی ہے زباں سے اپنی
سرسراتی ہے مری روح میں اک ٹھنڈک سی
لمس ان زہر بھرے ہونٹوں کا قاتل ہی سہی
غم گساری کے لیے کوئی مرے پاس تو ہے۔

جذبہ۔ فن۔ استعارے۔ تشبیہات نادر اور انوکھی۔ علامات۔ کتنی سالم ہے یہ تصویر۔۔!! رہ گئیں شکستہ تصویریں، وہ اس کے دونوں مجموعوں میں بکھری ہوئی ملیں گی۔ صرف چند اشارے اور مثالیں کافی ہوں گی ؎

اک پیلی چمکیلی چڑیا کالی آنکھ نشیلی سی
بیٹھی ہے دریا کے کنارے میری طرح اکیلی سی
کم روشن اک خواب آئینہ اک بیلا مرجھایا سا
پس منظر کے سائے میں ایک ندی پتھریلی سی

اسی سلسلے کی ایک اور غزل ہے جس میں بامعنی اور مہمل الفاظ کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کوشش اردو ادب اور شعر و سخن کی دنیا میں ایک جرأت بھی ہے اور جدت بھی ہے اور افشا بھی۔ گرے پڑے الفاظ کو فن اور خاص طور سے غزل میں جو اپنے دامن پر لکھنؤ کی جامدانی کی طرح ایک ہلکا سا دھبہ بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں لیکن اس اعتراف کے بعد بھی احساس یہی باقی رہتا ہے کہ اس میں فن کاری زیادہ ہے اور جذبہ کم۔ یہ ایک تجربہ ہے اور تنہا تجربہ ہے۔ کاش زیب کے مجموعوں میں ایسی دو چار غزلیں اور ہوتیں تو پیکر تراشی کی طرح یہ بھی اس کا ہنر بن جاتا۔ اس غزل کے دو چار شعر ضیافت طبع کے لیے پیش ہیں ؎

مجھ ایسے واماندۂ جاں کو بستر و ستر کیا
پل دو پل کو موندلوں آنکھیں، ورنہ گھر ور کیا
میں بھی سر ٹکراتا پھرا ہوں دیواروں سے بہت
ڈھونڈ رہے ہو اس گنبد میں کوئی در ور کیا

آخر کلام میں کولرج کے ایک اقتباس پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں:

"Images however beautiful do not
themselves characterize the poet.
They become proofs of original
genius only, as far as they
are modified by a predominant passion."

ان اشعار میں جذبات کی وہ گرمی یا کولرج کا Predomi-nant Passion کہاں ہے۔؟

زیب غوری پر یہ تبصرہ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے گراں بار خاطر ہو لیکن اس سے زیب کی تخفیف مدنظر نہیں۔ میرے لیے ان اشعار میں ترسیل کا المیہ تو نظر نہیں آتا لیکن شدتِ جذبات کی کمی کی وجہ سے شعر و سخن کے پردے میں جمالیاتی تسکین کا سامان تو فراہم کر سکتے ہیں لیکن دل کو برما نہیں سکتے۔

مجھے "زرد زرخیز" سے لے کر "چاک" تک زیب غوری کے

اشعار میں ترسیل کا المیہ نظر نہیں آتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "زرد زرد خیز" میں ابہام کے پردے بھاری اور دبیز ہیں اور چاک میں آکر یہ پردے ہلکے ہی نہیں حریری بھی ہو گئے ہیں جن کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے۔ عجیب حسن ہے ابہام کے حریری پردوں میں ؎

کیا خواہشیں زمین کے نیچے دبی رہیں
غاروں سے کچھ مجسّمے نکلے وصال کے

بساطِ ارض کو یوں ہی پڑی چمکنے دے
غبارِ جاں کے لیے خیمہ ہوا نہ لگا

میں نے دیکھا تھا سہارے کے لیے چاروں طرف
کہ مرے پاس ہی اک ہاتھ بھنور سے نکلا

رکنا پڑتا ہے مجھ کو ہر موڑ پہ زیبؔ
جانے وقت کہاں پیچھے رہ جاتا ہے

خلا کی ساری وسعتیں سر کرنے والا
دل کا فاصلہ طے کرتا رہ جاتا ہے

کتنا خوبصورت اور کتنا نفسیاتی۔ ہمارا روزانہ کا تجربہ ہے! آخر میں دو اشعار پھر دُہرا دوں جنھیں پہلے نقل کر چکا ہوں جو میرے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ؎

رات میں نے ایک خرقہ پوش کو دیکھا ہے زیبؔ
اپنے چہرے کے اُجالے میں رفو کرتے ہوئے

ایک حرفِ راز دلبستہ آئینہ ہوتا ہوا
اک کہر چھائی ہوئی منظر پہ منظر اور میں

* حرفِ راز: ابہام، استعارہ۔ پہلوداریت، سلیس۔ قریب الفہم، صاف

سادہ۔ پھر بھی مبہم۔ شعر و سخن کی دنیا میں استعاراتی مبہم عمل جمالیاتی مرصّع سازی ہے۔ بقول اقبال ؎

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنّا جسے کہہ نہ سکیں رو بہ رو

■■

"دیکھا سوچا"

اونچے اونچے محل
سُونے سُونے سے دیوار و در
کِتنے کچّے مکانوں کو توڑا گیا؟
صاف ستھری سڑک
سہما سہما ہوا موٹروں کا سفر
کتنی پگڈنڈیوں کو بچھوڑا گیا؟
ایک سنّاٹا چھایا ہوا
اک جہاں سانس روکے ہوئے رات بھر
کتنے گیتوں کا لہجہ مروڑا گیا؟
بھیڑ تنہائی ہے
ایک دوجے سے سب بے خبر
راستہ کتنے پُرکھوں کا چھوڑا گیا؟

پھُوس کی جھونپڑی
سوندھی مٹّی کی بُو میں نہائے ہوئے
شیش محلوں کی عزّت چھپائے ہوئے
مسکراتی تو ہے
ٹیڑھی میڑھی ڈگر
کھیت کی مانگ من سے سجائے ہوئے
گیت سڑکوں کا دل سے لگائے ہوئے
گنگناتی تو ہے

●

پدم شری بیکل اُتساہی بلرامپوری
۱۹۔ا، مہادیو روڈ، نئی دہلی

ڈاکٹر علی باقر زیدی
معرفت اتر پردیش اردو اکادمی
قیصر باغ لکھنؤ

مظفر جون پوری: فکروفن کے آئینے میں

"تخیلِ مظفر نے تاراگردوں سے کوئی توڑا ہی نہیں"

اپنے بارے میں انکسار سے کام لینے والا یہ شاعر شیرازِ ہند کے نام سے موسوم شہر جون پور میں ۱۹۰۹ء میں ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوا۔ مظفر جون پوری کے والد مولوی عبدالکریم اور جد مولوی شہاب الدین کا شمار اپنے عہد کے مشہور اور ہر دلعزیز عالموں میں ہوتا تھا۔ گھر کا ماحول خالص دینی و مذہبی تھا۔ چنانچہ مظفر جونپوری نے بھی عربی، فارسی اور علوم مشرقیہ میں دست گاہ کامل حاصل کی اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد خوش نویسی اور فن خطاطی کی طرف مائل ہوئے اور اس دور کے مشہور و معروف خطاط مولوی سید محمد محسن شاگرد منشی شمس الدین (اعجاز رقم) کی شاگردی اختیار کی۔ کچھ ہی عرصہ میں مظفر جون پوری کا شمار ہندستان کے صفِ اول کے خوش نویسوں میں ہونے لگا۔

اپنے طبعی رجحان کے پیش نظر انھوں نے اس فن کو فروغ دینے کے لیے خطاطی کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کے فن کے نادر نمونے آج بھی طغروں اور کتبوں وغیرہ کی صورت میں عبادت گاہوں میں محفوظ ہیں علم و فن کی ۸۰ سال خدمت کرنے کے بعد ۳ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو یہ نیّرِ اعظم ہمیشہ کے لیے جون پور کی زمین میں روپوش ہو گیا

مظفر جون پوری عالمِ جوانی میں تلاشِ معاش میں بنارس چلے آئے۔ بنارس اس زمانے میں دینی علوم و مذہبی ادب کا مرکز تھا۔ مدرسہ ایمانیہ و جوادیہ کے نام سے دو مشہور عربی کالج قائم تھے، جن کے سربراہوں کا شمار ہندستان کے چنندہ عالموں میں ہوتا تھا ان کالجوں میں اکثر و بیشتر محفلوں اور مجلسوں کا انعقاد ہوا کرتا تھا جن میں ہندستان کے ممتاز ذاکرین و شعراء شرکت کرتے تھے۔ چنانچہ مظفر جونپوری کو جہاں ایک طرف علماء دین کی صحبت کا فیض حاصل ہوا، وہیں دوسری طرف شعری و ادبی ماحول ملا۔ جس نے ولائے مودّت کو دوآتشہ کر دیا۔ اب مظفر جون پوری ایک اعلا درجے کے خطاط ہی نہیں تھے بلکہ مشہور صحافی اور ادیب نیز شاعرِ اہلِ بیت کے نام سے مشہور ہو گئے۔ بنارس میں آزادی سے قبل نکلنے والے ہفتہ وار اخبار قائد اور آزادی کے بعد "ہندستان" کے وہ مدیر رہے۔ یہ دور مظفر جون پوری کے علمی و ادبی کارناموں کے شباب کا دور تھا۔ اخبار کی ادارتی ذمہ داری و شغل کتابت کے ساتھ ساتھ وہ مشق سخن بھی کرتے رہے اور مذہبی موضوعات پر کتابیں بھی لکھتے رہے۔ ان کے مضامین اسد۔ سرفراز اور الجواد میں اکثر شائع ہوتے رہتے تھے، جو اپنے دور کے مستند جریدے تھے۔ "تاریخ عزاداری جون پور" اور "عرب اسرائیل جنگ کا تجزیاتی مطالعہ" ان کی یادگار تصانیف ہیں۔

مظفر جون پوری ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ انھوں نے بے شمار قصائد، نوحے، سلام، نظمیں اور تاریخی قطعات لکھے ہیں اس کے علاوہ انھوں نے حدیثِ کسار کا منظوم ترجمہ بھی کیا جو کافی مقبول ہوا اور جس کے ہند و پاک میں کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے کلام کا ابھی بیشتر حصہ شائع نہیں ہوا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو زبان و

بیان پر قدرت حاصل تھی اور وہ اپنے دور کے ایک ممتاز شاعر تھے۔

ان کے قصائد کا انتخاب " قصائد مظفر " کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ انتخاب پچاس قصائد اور ایک نظم " اگر اپنا سکے لے ابن آدم دو جہاں اپنا " پر مشتمل ہے۔ ان قصائد میں کئی کئی مصرعے شامل ہیں اور اس طرح تیرہ ایسے قصائد ہیں جو علی الترتیب ۸۹، ۴۵، ۴۹، ۵۹، ۳۱، ۴۵، ۳۳، ۴۶، ۴۴ اور ۳۶ اشعار پر مشتمل ہیں۔ قصائد میں اتنے اشعار لکھنا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن فطری بات یہ ہے کہ ان میں ہر جگہ تسلسل، روانی، برجستگی اور جوش قائم رہتا ہے اور قاری کو کسی جگہ بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ مظفر جون پوری نے بعض سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قوافی میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اپنی قادر الکلامی اور روانیٔ طبع کی بدولت اس راہ میں بھی وہ کہیں میر انیس کے سالک نظر آتے ہیں تو کہیں جوش کے پیرو۔ مثال کے طور پر ان کا ایک قصیدہ " معراجِ شجاعت " ہے۔ اس قصیدے میں ۴۲ اشعار ہیں اور ہر شعر کا پہلا مصرع شجاعت کے لفظ سے شروع ہوتا ہے۔ ؎

شجاعت شانِ مومن جوشِ ایمانی کا مظہر ہے
شجاعت کا بحق مصرف رضائے ربِ اکبر ہے

اسی طرح ان کا ایک قصیدہ " عشق صادق " ہے۔ اس قصیدے میں ۳۵ اشعار ہیں جن میں مدح کو چھوڑ کر تشبیب کے چودہ اشعار ایسے ہیں جن کا ہر مصرع لفظ " عشق " سے شروع ہوتا ہے ؎

عشق ہی کے واسطے ہے حسنِ واجب کی نمود
عشق ہی کے واسطے ممکن کی ہے صورت گری

اس نوع کے قصائد کی اور بھی مثالیں ان کے کلام میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کا ایک اور قصیدہ " تلاشِ حسن " ہے جس کی ردیف " ٹھہرا " ہے اس مشکل ردیف و قوافی میں انھوں نے جس طرح ۴۲ اشعار قلم بند کئے ہیں وہ ان کی جودت طبع اور قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے ؎

تلاشِ حسن میں اپنا تصور جا بجا ٹھہرا
پرکھیں نظریں جو ذرہ پر تو وہ بھی کیمیا ٹھہرا

مندرجہ بالا اشعار سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مظفر جون پوری کو شاعری میں کتنا زبردست ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے مشکل ردیف و قوافی اور سنگلاخ زمینوں میں بھی جو اشعار لکھے ہیں وہ سہل ممتنع کا مزہ دیتے ہیں۔ ان کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ جس موضوع پر انھوں نے تیس تیس اور چالیس چالیس اشعار نظم کیے ہیں ان میں نہ تو کوئی شعر موضوع سے ہٹ کر ہے اور نہ ہی کہیں حشو و زوائد کی مثال ملتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں گہرے مطالعے اور فلسفیانہ خیالات کا عکس نظر آتا ہے اس طرح کی مثالیں ان کے قصیدے " ہم لوگ " ـ " بہترین عباد " اور " شاہکار حسینی " وغیرہ میں ملتی ہیں۔

مظفر جون پوری کے کلام میں صنائع و بدائع کا بہت خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ انھوں نے صنعت مراعات النظیر، حسنِ تعلیل، سہل ممتنع اور تکرار لفظی وغیرہ کا استعمال جس خلاقانہ انداز میں کیا ہے اسے ہم سادگی و پرکاری کا اعلیٰ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں ؎

وہ قیدِ مکاں سے بالا ہے پابندِ مکاں ہوتا ہی نہیں
دل کو بھی یوں تو نسبت ہے منسوب فقط کعبہ ہی نہیں

ہے حسن کا مصدر حسن کا مرکز حسن کا خالق حسنِ ازل
مخلوق ہیں اس کی عشق و جنوں تخلیق فقط لیلیٰ ہی نہیں

بے سایہ تھا جسمِ پیمبرؐ ہے بحث عبث اس نکتے پر
یہ امر تعجب خیز ہے کیوں انوار میں جب سایہ ہی نہیں

خاک میں سب مل گئیں گلزار کی رعنائیاں
اب تو ویرانی گلستاں کے گلے کا ہار ہے

مظفر جون پوری کے یہاں عربی الفاظ کا خوبصورت اور برمحل استعمال ملتا ہے اور اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس سے نہ تو سہل ممتنع میں فرق آتا ہے اور نہ ہی حسنِ معنی میں عیب۔ مثلاً ؎

بلا سبب نہیں اُس کا لقب لسان اللہ
ہے ان کے خطبوں میں اللہ کے خطاب کا رنگ

ارادہ قربانیِ پسر کا ازل سے مقصودِ زندگی کا
وہ سرِّ ذبحِ عظیم خود تھا ذبیح کے امتحاں سے پہلے

مظفر جون پوری کے قصائد قدیم راہ طریقت سے ہٹ کر جدید اسلوب اور آہنگ کے حامل نظر آتے ہیں ان کے کلام میں نہ تو مصنوعی آہنگ و بیان ملتا ہے اور نہ ہی غیر ضروری مبالغہ اور شکوہ الفاظ۔ اس کے برعکس روانی اور منظر کشی، سادگی اور پرکاری ملتی ہے۔ اپنے قصائد میں انھوں نے تسلسل بیان کا خاص طور پر خیال رکھا ہے مثال کے طور پر ان کا قصیدہ "مصدر تجلیات" کے چند اشعار درج ذیل ہیں جس میں انھوں نے تخلیق کائنات کی منظر کشی کی ہے اور کہیں بھی سلاست اور روانی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے ؎

وہی تھا جلوہ طراز ہستی حدودِ وہم و گماں سے پہلے
نمودِ صبحِ ازل سے پہلے وجودِ کون و مکاں سے پہلے

وہی تھا قائم وہی تھا قادر وہی تھا باطن وہی تھا ظاہر
وہی تھا غائب وہی تھا حاضر نہاں سے پہلے عیاں سے پہلے

وہی تھا راز و نیاز محفل وہی تھا سوز و گداز محفل
وہی تھا جلوہ طرازِ محفل نمودِ بزمِ جہاں سے پہلے

نہ مہرِ تاباں تھا نور افگن نہ اسکے پرتو سے ماہ روشن
تجلیوں کا وہی تھا مصدر نجوم اور کہکشاں سے پہلے

نہ کوئی ساحل نہ کوئی کشتی حبابِ دریا نہ موجِ دریا
وہی تھا اک قلزمِ حقیقت وجودِ بحرِ رواں سے پہلے

مظفر جون پوری کے قصائد میں ایک خوبی یہ بھی نظر آتی ہے کہ ان کا ہر قصیدہ کسی نہ کسی عنوان کے تحت ہے مثلاً "جلوۂ کنزِ مخفی" "ساحلِ بہار"۔ "ہم مجاہد ہیں"۔ "انعامِ قدرت"۔ "مزاجِ شجاعت" "نورِ رحمت"۔ "تلاشِ حسن"۔ "انسان"۔ "زندۂ جاوید" وغیرہ۔ ان قصائد میں انھوں نے تشبیب میں مروجہ بہاریہ اشعار یا ساقی نامے سے گریز کر کے انسانی موضوعات پر خیال انگیز اشعار قلم بند کیے ہیں مثلاً "انسان" کے عنوان کے تحت انھوں نے حضرت امام حسینؑ کی شان میں جو قصیدہ لکھا ہے، اس میں تشبیب کے اشعار میں تخلیق انسان کی غرض و غایت اور اس میں پوشیدہ خیر و شر کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

بنا ہے دردِ سرِ انسان فلسفی کے لیے
کہ راستی کے لیے ہے یہ یا کجی کے لیے
نہیں ہے مقصدِ تخلیق اس کا پوشیدہ
ہوئی ہے خلقتِ انسان بندگی کے لیے
معاشرے میں کثافت اسی کے باعث ہے
ازل سے آدمی مشہور ہے بدی کے لیے
نفاق و بغض و حسد اس کی ذات سے ظاہر
بہم ہے جنگ و جدل اپنی برتری کے لیے

مظفر جون پوری نے تشبیب کے اشعار میں صرف موضوعات پر روشنی نہیں ڈالی ہے بلکہ ان موضوعات کے اظہار میں ایک مفکر اور فلسفی کا ذہن بھی ملتا ہے مثلاً "تلاشِ حسن" میں اپنے فکر انگیز خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

تلاشِ حسن میں اپنا تصوّر جا بجا ٹھہرا
پڑیں نظریں جو ذرّے پر تو وہ بھی کیمیا ٹھہرا
وہ ذرّہ جس میں پنہاں ایک طوفانِ ہلاکت ہے
غلط ہاتھوں میں پڑ کر مظہرِ قہرِ خدا ٹھہرا
وہ ذرّہ جس کے باعث آج عالم میں کشاکش ہے
برائے امنِ عالم ایک دردِ لا دوا ٹھہرا

اگر امراضِ جسمانی میں قوت اسکی کام آئے
تو یہ سمجھو مریضوں کی شفا کا واسطہ ٹھہرا

اسی طرح "معراجِ شجاعت" میں وہ شجاعت کے موضوع پر ایک مفکر کی طرح اس کے سبھی عوامل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں ؎

شجاعت شانِ مومن جوشِ ایمانی کا مظہر ہے
شجاعت کا بھی مصرف رضائے ربِّ اکبر ہے

شجاعت کے لیے سیلِ حوادث لطف کا باعث
شجاعت کے لیے طوفاں بیک ساماں بیک سر ہے

شجاعت کام آئے بیکسوں کی دست گیری میں
شجاعت کا یہ مصرف طاعتِ خالق کا مظہر ہے

شجاعت وہ ہے جو قابو میں رکھے نفس کو اپنے
شجاعت یہ ملائک کی عبادت سے بھی بہتر ہے

شجاعت سے جو ہو تاریکیوں میں روشنی پیدا
شجاعت ایسے عالم کے لیے مہرِ منور ہے

مظفر جون پوری کے قصائد سے تشبیب کے جو اشعار مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ان میں موضوعات پر فکر انگیز اظہارِ خیال، سلاست روانی اور تسلسل پایا جاتا ہے ان اشعار کو اگر قصیدے سے الگ کر لیا جائے تو یہ بذاتِ خود معرکۃ الآرا نظمیں ہو سکتی ہیں۔ یہ وہ اہم اور ممتاز خصوصیت ہے جو مظفر جون پوری کو ان کے قد آور اور ہم عصر قصیدہ نگاروں سے ممیز کرتی ہے اور اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اس صنفِ شاعری میں جدید طرز ادا کی داغ بیل ڈالی تو بے جا نہ ہوگا۔

مظفر جون پوری کی نظر مسائلِ حیات و کائنات کے علاوہ سماجی مسائل پر بھی گہری تھی اور ان کا اپنا ایک نظریہ تھا مثلاً وہ انسان کو قوتِ عمل کا سرچشمہ مانتے ہیں۔ وہ قسمت کا گلہ کرنے کے بجائے انسان کو دعوتِ عمل دیتے ہیں اور یہاں وہ اقبال کے اس مردِ مومن کے مماثل نظر آتے ہیں جس کی ایک نگاہ سے تقدیریں بدل جایا کرتی ہیں۔

مظفر جون پوری سرمایہ داری کے بھی شدید مخالف نظر آتے ہیں ان کے سارے افکار و خیالات کی ترجمانی درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے ؎

ہم بدل سکتے ہیں بدلیں گے گلستاں کی روش
عزم کامل ہو تو پھر آسان ہر دشوار ہے

راہِ حق میں سرفروشی سرفرازی کا سبب
آرزوئے تختِ کیسی آرزوئے دار ہے

سخی جو ہو غنی در اصل اس کی ذات ہوتی ہے
جو ہو قاروں صفت ہم اس کو بے مایہ سمجھتے ہیں

کہیں ہے دولت کہیں فلاکت کہیں ہے شاہی کہیں ہے عسرت
بشکلِ فرعونیت امارت غریب کا سر کچل رہا ہے

مسئلہ جبر و اختیار اور تقدیر و تدبیر کے سلسلے میں بھی مظفر جون پوری کے واضح خیالات سنیئے ؎

جبر سے رشتہ نہیں انسان کی تقدیر کا
ہر بشر فاعل ہے خود تخریب اور تعمیر کا

عقل و دانش فہم اور ادراک کی قوت ملی
آدمی مختار ہے ہر نیک و بد تدبیر کا

اشرف المخلوق ہے انساں جو ہو انسانیت
ہو اگر حیوانیت پیکر ہے وہ تحقیر کا

اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں ہو انساں مبتلا
اور پھر روئے وہ رونا گردشِ تقدیر کا

منظفر ... پوری کے مجموعۂ قصائد میں ہمیں تین نظمیں "قیاس و ...ر"، "ہم لوگ" اور "ترغیبِ عمل" ملتی ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ ... یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ عالم اور فلسفے کا بغور مطالعہ ...ا۔ اس کے علاوہ روح اور مادہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود ... یا انسان واقعی تخلیقی قوتوں کا سرچشمہ ہے جیسے اہم موضوعات ... ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک اہلِ دانش کی نظر میں غور و فکر ... سبب بنے ہوئے ہیں ان پر بھی ان کے بصیرت افروز خیالات نظر ... ہیں۔ "قیاس اور شعور" میں وہ کہتے ہیں ؎

قیاسِ بے اساس سے یہ دل میں وسوسہ ہوا
قدیم کس طرح وہ ہے وہ کس طرح خدا ہوا
اگر وہ مادّہ نہیں تو آخرش وہ شئے ہے کیا
جو کچھ نہیں تو کیسے پھر وہ کیا ہے اور کیا ہوا

نظم "ہم لوگ" میں وہ انسانی تاریخ کی روشنی میں ماضی اور حال ... تضاد اور صنعتی دور کے مشینی انسان پر اس طرح رقمطراز ہیں ؎

گزشتہ عہد کی گویا ہیں داستاں ہم لوگ
خود اپنے ہاتھوں بنے گردِ کارواں ہم لوگ

مٹا رہا ہے کفِ پائے انقلاب جسے
ہیں رہ گزر پہ سرِ خاک وہ نشاں ہم لوگ

لبوں پہ آہ بھی اب اپنے آ نہیں سکتی
گیا وہ دور کہ فطرت کی تھے زباں ہم لوگ

...فر جون پوری کے یہاں خوبصورت تشبیہ اور استعارات کا بھی حسین ... استعمال ملتا ہے مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں ؎

بلندیوں پہ فلک کی کبھی تھے تابندہ
تھے آسمانِ مقدر پہ کہکشاں ہم لوگ

جل پری جیسے ہو مصروف نظر بازی میں
سر نکالے ہوئے پانی سے ہے اس طرح کنول

دل میں اب وہم یہ رہ رہ کے مدام آتا ہے
دیکھیں موت آتی ہے یا ان کا پیام آتا ہے

مظفر جون پوری کا کچھ کلام جو قصائدِ مظفر کی صورت میں منظرِ عام پر آیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مظفر جون پوری اپنے عہد کے ایک ممتاز شاعر تھے اور اردو شاعری میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔

□□

اودھ کی تہذیبی تاریخ (حواشی) صـ۲۰ کا بقیہ

۱۳ اشتہار کے آخر میں حسبِ ذیل نوٹ" کے ذریعہ تھانوں کے طول و عرض کی وضاحت کی گئی ہے :

" واضح ہو کہ عرض ہر تھان شربتی کا ۱۴ گرہ و طول ۹ گز ہوتا ہے اور تھان عریض جو کہ ولایتی ململ پر تیار ہوتے ہیں، ان کا عرض ایک گز سوا گز (۱۶ یا ۲۰ گرہ) ہوتا ہے اور طول ۹ گز ہوتا ہے۔ جس قسم کا صاحب فرمائش طلب کریں گے، روانہ ہوگا :

۱۴ "شجرۃ النبیؐ" مؤلفہ مولوی وزیر علی فتحپوری۔ مطبع مجتبائی لکھنؤ جمادی الاول ۱۳۱۴ھ (اکتوبر نومبر ۱۸۹۶ء)

۱۵ نمبر ۹ تا نمبر ۱۵ بھی رسالہ "واجدیہ سلطانی" سے ماخوذ ہیں۔ کتاب میں یائے معروف و مجہول کا فرق نہیں کیا گیا ہے اس لیے نقل میں کہیں یائے معروف کی جگہ مجہول یا مجہول کی جگہ معروف لکھ جانے کا امکان ہے۔ اس کے علاوہ بھی ممکن ہے کسی نام میں غلط خوانی ہو گئی ہو۔

(نیر مسعود)

جواب طلب امور کے لیے ٹکٹ لگا لفافہ روانہ فرمائیں۔
(ایڈیٹر)

وہ جس کا انتظار تھا

وہ جس کا انتظار تھا
شفق کو
بادلوں کو
رہگزر کو، آبشار کو
خزاں کی پتیوں کو
چاندنی کو
دھوپ کو، بہار کو
وہ جس کی آرزو تھی
ساعتوں کو
خامشی کو
ذہن کو، خیال کو
تصورِ محال کو
کھنکتی پیالیوں کو
کرسیوں کو
جام مے کو، شمع ناتمام کو
دوپہر کو، شام کو

○

وہ جس کی آہٹیں
ساعتوں کے کنج میں نہاں تھیں
جس کا عکس جلوہ ریز تھا
بصارتوں کی جھیل میں

○

وہ کیا فقط صبا کا سرمگیں خرام تھا
کہ شاخِ گل کا سایۂ خفیف تھا
کہ موج آب پر کرن کا مرتعش وجود تھا
جو ایک پل میں سامنے سے یوں گزر گیا
کہ وہ سبھی جو منتظر تھے
آنکھ ملتے رہ گئے

○

مگر وہ اس طرح گزر گیا
کہ یک بیک وہ انتظار کی بساط بھی
الٹ گئی
وہ کھیل ختم ہو گیا
اور اس کے بعد
آسمان سے زمیں، زمیں سے
آسمان تک
خلا ——
خلا ——
خلا —— خلا

○○

—— زاہدہ زیدی
۳۴-ایچ- آئی- جی
سرسید نگر- علی گڑھ

یہ عکس میرا

قائد حسین کوثر
۴۹۹/۸۸ - چمن گنج - کانپور

تم آئینے کی
شہادتوں پر
یقین کر لو
بس اس لیے کہ
معتبر ہے
یہ عکس میرا
جو رُوبرو ہے

مگر، مرے یار
یہ سچ نہیں ہے
یہ شخص مجھ سے
جُدا بہت ہے
کہ میرا باطن
کچھ اور ہی ہے
یہ آئینے کی ترجمانی ہے
کہ مجھ کو جیسا
وہ دیکھتا ہے
اسی کو بس وہ
دکھا رہا ہے
اگرچہ سب کچھ
وہ جانتا ہے
مجھے برابر بچا رہا ہے
وہ میری خاطر
ازل سے اب تک
بھی بنائی گواہیوں سے
دروغ گوئی کی منزلوں سے
گزر رہا ہے

○○

کاظم علی خاں
۲۰۱- وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ

تحریکِ آزادیٔ ہند اور لکھنوی ادب

— ۲ —

ہندوستان میں انگریزی سامراج کے خلاف آواز اٹھانے میں لکھنؤ کے مزاحیہ رسالے "اودھ پنچ" نے جو یادگار کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ تحریکِ آزادیٔ ہند کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولتے ہیں۔ اودھ پنچ سرزمین لکھنؤ سے یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو نکلا اور ۱۹۳۴ء تک جاری رہا تھا۔ درمیان میں یہ رسالہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک تین سال کے عرصے کے لیے عارضی طور پر بند بھی ہوگیا تھا۔ لیکن پھر ممتاز حسین عثمانی کی ادارت میں ۱۹۱۶ء سے یہ دوبارہ جاری ہوکر ۱۹۳۴ء تک زندہ رہا۔ اس طرح رسالہ "اودھ پنچ لکھنؤ" نے تقریباً ۵۵ سال تک تحریکِ آزادیٔ ہند کی بھرپور ہم نوائی کی تھی۔[۲۸] رسالہ اودھ پنچ لکھنؤ کے بانی اور مدیر اول منشی سجاد حسین (متولد ۱۸۵۶ء، متوفی ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء) قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے باشندے تھے۔ وہ ۱۸۸۷ء سے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوکر اپنی وفات تک اس جماعت سے وابستہ رہے تھے[۲۹] منشی سجاد حسین نے اپنے مزاحیہ رسالے اودھ پنچ لکھنؤ کے ذریعہ انڈین نیشنل کانگریس کے نظریات اور تحریک آزادی ہند کی حمایت کرنے میں جو یادگار کردار ادا کیا ہے وہ تاریخ آزادیٔ ہند میں سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

اودھ پنچ لکھنؤ نے نثر و نظم دونوں ہی کے ذریعے انگریزی سامراج پر طنز و ظرافت کے وار کرکے ہندوستان میں عوامی بیداری کی ایک لہر جاری کردی۔ معاونینِ اودھ پنچ میں اس دور کے متعدد اہم شعرا و نثر نگار شامل تھے۔ ان شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنی اخبار در اخبار قلمی کاوشوں سے تحریکِ آزادی ہند کو زبردست تقویت پہونچائی تھی۔ عہدِ حاضر کے صفِ اول کے مزاح نگار احمد جمال پاشا مرحوم نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

> "اودھ پنچ اور اس کے ظریفوں کی حب الوطنی، انگریز دشمنی، مغرب سے نفرت، کانگرس پرستی، غلامی کے خلاف جدوجہد اور آزادی کے لیے کوشش، ایک عظیم قومی کارنامہ ہے۔ اودھ پنچ کی تحریک ایک قومی تحریک تھی۔ اس کی داستان اپنی قوم کا ایک عظیم الشان رزمیہ ہے جسے ہمیشہ فخر کے ساتھ پیش کیا جاتا رہے گا۔"[۳۰]

معاونین اودھ پنچ لکھنؤ میں مشہور شاعر اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی نے اُردو ادب میں جو نام و مقام پایا ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے۔ اکبر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو موضع بارہ ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوئے[۳۱] اس لحاظ سے الٰہ آباد کو اکبر کا مولد ہونے کا شرف ضرور حاصل ہے۔ لیکن اکبر الٰہ آبادی کی ادبی تربیت بڑی حد تک لکھنؤ کی ادبی روایات کی رہینِ منت رہی ہے۔ فن شاعری میں اکبر کے استاد مولوی وحید الدین وحید تھے جو خواجہ آتش لکھنوی کے شاگرد محمد رشید کے شاگرد تھے۔ اس طرح اکبر الٰہ آبادی کا شاعری کا نسب نامہ خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی سے ہی ملتا ہے۔ اکبر اپنی مشق سخن کے تکوینی دور میں جس وضع قطع سے مشاعروں میں جاتے تھے وہ بڑی حد تک خواجہ آتش لکھنوی کی وضع قطع سے مشابہت رکھتی تھی۔[۳۲]

اکبر الہ آبادی کی غزلیہ شاعری اپنے ابتدائی دور میں عام طور پر لکھنؤ کے شاعرانہ رنگ و آہنگ کی صدائے بازگشت محسوس ہوتی ہے جس میں۔۔۔۔" انھوں نے غزل کے روایتی لب و لہجہ میں محبوب کا سراپا اس کے ناز و انداز (اور) ہجر و وصال کی کیفیتوں کو زبان اور محاورے کے چٹخارے کے ساتھ بیان کیا ہے۔[۷]"

اکبر کی یہ غزلیہ شاعری رعایتِ لفظی کے اس رجحان سے بھی معمور نظر آتی ہے جو لکھنوی شاعری کی پہچان رہا ہے۔ غزلیات اکبر میں ہمیں تصوف کے جلوے بھی ملتے ہیں جو ان کے استاذ الاساتذہ آتش لکھنوی کی شاعری کا نمایاں وصف تھا۔ غرض کہ اکبر الہ آبادی کی ابتدائی غزلیہ شاعری میں لکھنؤ کی ادبی روایات جاری و ساری رہی ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے ادبی سفر کی اگلی منزل جس میں انھوں نے طنز و مزاح کی وادی میں قدم رکھا اور اپنی شاعری میں قومی سیاسی نیز معاشرتی موضوعات کو داخل کیا، ۱۸۷۷ء کے آس پاس اس زمانے سے شروع ہوتی ہے جب وہ ۱۸۷۷ء سے اودھ پنچ لکھنؤ کے معاونین کی صف میں شامل ہوئے تھے۔ گویا اکبر الہ آبادی کی مزاحیہ شاعری جو ان کی ادبی شہرت کی اصل بنیاد ہے اس کو استوار کرنے میں بھی لکھنؤ کے مزاحیہ رسالے "اودھ پنچ" کا پورا پورا ہاتھ رہا ہے۔ اکبر کی نثر نگاری کی آبیاری میں بھی اودھ پنچ لکھنؤ کے اثرات جاری و ساری رہے ہیں۔

اکبر کی مزاحیہ شاعری کے بنیادی محرکات میں اودھ پنچ لکھنؤ کی اہمیت کا اعتراف کرنے والے اہل قلم میں طالب الہ آبادی، عبدالقادر سروری اور سید سلیمان ندوی کی ایسی ثقہ ادبی ہستیاں شامل ہیں[۸] ان حقائق کے پیش نظر کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ اکبر الہ آبادی کی قومی اور سیاسی موضوعات کی مزاحیہ شاعری جو اودھ پنچ لکھنؤ ہی کے زیر اثر شروع ہوئی تھی لکھنوی ادب ہی کے ایک یادگار اور سدا بہار توسیعی کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے اکبر نے ہندستانی ذہن کو مغرب کی مرعوبیت سے آزاد کر کے تحریک آزادی ہند کو جو زبردست تقویت پہونچائی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس مقالے کے محدود دامن میں کلام اکبر سے قومی شاعری کے انبار در انبار نمونے پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔

لکھنوی ادب میں قومی شاعری کے سربرآوردہ نقیبوں میں پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی (متولد ۱۹ جنوری ۱۸۸۲ء و متوفی ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء)[۹] کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ چکبست بھی اودھ پنچ لکھنؤ کے اہم معاونین میں تھے اور انھوں نے انیسویں صدی عیسوی سے ہی قومی شاعری شروع کر دی تھی۔ چکبست لکھنوی کی قومی شاعری کے نمونوں میں درج ذیل قابل ذکر نظمیں شامل ہیں:

(۱) حبِ قومی (۱۸۹۴ء) کلیاتِ چکبست (نظم) ص۹۵
(۲) لارڈ کرزن سے جھپٹ (۱۹۰۴ء) ص۱۳۹ تا ص۱۴۲
(۳) خاکِ ہند (۱۹۰۵ء) ص۱۵۲ تا ص۱۵۸
(۴) دردِ دل (۱۹۱۲ء) ص۱۸۲
(۵) گنگا پرشاد ورما (۱۹۱۲ء) ص۱۹۸
(۶) فریادِ قوم (۱۹۱۴ء) ص۲۰۸
(۷) قوم کے سورماؤں کی الوداع (۱۹۱۴ء) ص۲۱۹
(۸) گوپال کرشن گوکھلے (۱۹۱۵ء) ص۲۲۱
(۹) آوازۂ قوم (۱۹۱۶ء) ص۲۲۷
(۱۰) ہم ہوں گے، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا (۱۹۱۶ء) ص۲۳۲
(۱۱) ہمارا وطن، دل سے پیارا وطن (۱۹۱۶ء) ص۲۳۴
(۱۲) وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک (۱۹۱۶ء) ص۲۳۶
(۱۳) پھول مالا (۱۹۱۷ء) ص۲۵۸
(۱۴) مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیامِ وفا (۱۹۱۷ء) ص۲۶۶
(۱۵) وطن کا راگ (۱۹۱۷ء) ص۲۷۱
(۱۶) نالۂ درد (۱۹۱۸ء) ص۲۷۴
(۱۷) بال گنگا دھر تلک (۱۹۲۰ء) ص۲۸۵

چکبست نے اکتوبر ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ سے رسالہ صبحِ امید نکالا تھا جس میں قومی موضوعات پر نثر و نظم میں ایسا کارآمد مواد بھی ہوتا تھا جو تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوا، اس رسالے کے دستیاب شماروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اکتوبر ۱۹۱۸ء سے مارچ ۱۹۲۱ء تک جاری رہا تھا۔ صبحِ امید ۱۹۲۱ء میں بند ہوا تھا، مگر کس مہینے کو

ہماری ... تعلق تعلیقیت سے کچھ کہنا سردست ممکن نہیں۔ [۳۵]
حال ہی میں ایکسپریس جرنل پٹنہ (مشترکہ شمارہ ۱۰-۱۱ ۱۹۶۹ء) میں رسالہ صبح اُمید لکھنؤ کے منتخبات کو دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔

لکھنوی ادب میں قومی شاعری کی روایت کو جاری رکھنے میں منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی (متوفی ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء) نے بھی حصہ لیا تھا۔ وہ منشی شنکر دیال فرحت کے شاگرد تھے۔ عہد حاضر کے مشہور شاعر بشیشور پرشاد منور لکھنوی (متوفی ۲۴ مئی ۱۹۷۰ء) انھیں اُفق لکھنوی کے فرزند تھے۔ اُفق لکھنوی کی طویل نظم "سودیشی تحریک" ان کی قومی شاعری کے نمونوں میں شامل ہے [۳۷]

صفی لکھنوی (ولادت ۳ جنوری ۱۸۶۲ء وفات ۲۵ جون ۱۹۵۰ء) [۳۸] کا کلام بھی قومی شاعری کے نمونوں سے خالی نہیں۔ صفی لکھنوی نے اپنے مسلسل مسدس تحت جگر میں ہندستان کے مختلف شہروں کا ذکر کر کے حب وطن کے جذبے کو اُبھارا ہے [۳۹] کہیں تحریک آزادی ہند کے مجاہدوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے یا کہیں قومی یک جہتی کا درس دے کر اس فرقہ وارانہ منافرت کو دُور کرنے کی سعی کی ہے جو ہندستان میں فرنگی سیاست کی دین رہا ہے اور جسے تحریک آزادی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ کہنا غلط نہ ہوگا۔

قومی یک جہتی پر صفی کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

لفظ "ہم" میں جس طرح "ہ" "م" ہیں شیر و شکر
چاہیے ہندو مسلماں یوں ہی مل جل کر رہیں

قابل افسوس ہے وہ فرقہ وارانہ فساد
ملک میں جس سے لہو کی ندیاں ہر سو بہیں

صفی لکھنوی کے شاگرد مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی (زمانۂ حیات ۱۴ فروری ۱۸۸۲ء تا ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء) [۴۰] کے سرمایۂ سخن میں بھی بعض قومی نظمیں موجود ہیں جن میں بال گنگا دھر تلک، مہاتما گاندھی اور علی برادران کے ایسے مشہور قومی رہناؤں کی تعریف و توصیف کر کے تحریک آزادی کی حمایت کی گئی ہے [۴۱]

عزیز لکھنوی کے شاگردوں میں شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ جوش ملیح آبادی (ضلع لکھنؤ) میں پیدا ہوئے اور بیسویں صدی عیسوی میں انھوں نے اردو شاعری میں جو نام و مقام حاصل کیا وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ جوش ملیح آبادی کے ادبی آثار میں متعدد ایسی نظمیں شامل ہیں جن سے تحریک آزادیِ ہند کو تقویت ملی۔ جوش کی ان قومی نظموں میں بعض قابل ذکر منظومات یہ ہیں:

آثارِ انقلاب۔ شکست زنداں کا خواب۔ نعرۂ شباب۔ وفاداران ازلی کا پیغام شاہنشاہ ہندوستان کے نام۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب، خونی جھنڈا۔ لمحۂ آزادی۔ اللہ کرے۔ وطن، سائمن کمیشن۔ زوالِ جہاں بانی۔ نظام نو۔ وفاق نیز وزارتی وفد کا فریب [۴۲]

ان شعرار کے علاوہ سرزمین لکھنؤ سے وابستگی رکھنے والے متعدد اور بھی اُردو شاعروں نے قومی نظمیں لکھ کر تحریک آزادی کی ہم نوائی کی ہے جن میں درج ذیل نام یہ ہیں:

مرزا جعفر علی خاں اثر۔ آنند نرائن ملا، عمر انصاری، علی جواد زیدی (مقیم لکھنؤ)۔ محمد حسین محوی لکھنوی۔ سراج لکھنوی۔ آرزو لکھنوی۔ بشیشور پرشاد منور۔ اسرار الحق مجاز۔ غلام احمد فرقت کاکوروی (کاکوری ضلع لکھنؤ کے متوطن) [۴۳]

شاعری کے علاوہ صحافت کے میدان میں بھی لکھنؤ کے متعدد اہل قلم نے تحریک آزادی کی حمایت کی ہے جن میں منشی سجاد حسین کاکوروی (مدیر اودھ پنچ لکھنؤ)۔ ظفر الملک علوی (مدیر ماہنامہ الناظر لکھنؤ)، مولانا عبدالماجد دریابادی (مدیر صدق جدید لکھنؤ)، حیات اللہ انصاری (قومی آواز لکھنؤ) نیز انیس احمد عباسی (مدیر حقیقت لکھنؤ) جیسے صحافیوں کے نام قابل ذکر ہیں۔

(ختم)

حواشی

(سلسلے کے لیے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ء ملاحظہ فرمائیں)

۴۰ دیکھیے: (۱) (ہندی کتاب) واجد علی شاہ اودھ اور اودھ راج کا پتن ہری پور نا نند دریا سوچنا وبھاگ اتر پردیش لکھنؤ طبع جنوری ۱۹۵۷ء ص ۲۶۵ تا ص ۲۶۷

(۲) مثنوی حزن اختر، واجد علی شاہ اختر۔ مرتبہ امجد علی خاں واجد علی شاہ اکاڈمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۱ء ص ۲۹

(۳) انتخاب واجد علی شاہ اختر: مرتبہ کوکب قدر سجاد علی میرزا
اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۴ء ص۶

۲۱ مثنوی حزن اختر ص۱۵۸ تا ص۱۷۷۔ واجد علی شاہ اختر لکھنوی کی مذکورہ مثنوی کا نام عام طور سے حزن اختر مشہور ہے۔ لیکن اس کا صحیح نام "حزن اختری" بتایا گیا ہے جو نظر بظاہر اس مثنوی کا تاریخی نام ہے جس سے اس کا سال اختتام ۱۲۷۵ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کوکب قدر نے اس کا نام حزن اختری ہی تسلیم کیا ہے (دیکھیے: (۱) انتخاب واجد علی شاہ اختر ص۲۶۔ (۲) غزل — فن اور فن کار: مرتبہ پروفیسر ثریا حسین شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ طبع ۱۹۸۶ء ص۱۶۲ تا ص۱۶۳

۲۲ د۔ک: (۱) لکھنؤ اور جنگ آزادی ص۱۳۴ و ما بعد
(۲) مثنوی افسانۂ لکھنؤ۔ آغا حجو شرف لکھنوی (قلمی نسخہ) مکتوبہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ (مطابق جمعہ ۳۰ جنوری ۱۸۷۴ء) مخزونہ کتب خانۂ حسینیہ وقف سبطین آباد مٹیا برج کلکتہ۔
(۳) اردو میں قومی شاعری کے سو سال ص۲۶ (طبع دوم)

۲۳ د۔ک: لکھنؤ کے چند نامور شعراء (جلد اول): ڈاکٹر سید سلیمان حسین سرفراز قومی پریس لکھنؤ طبع دسمبر ۱۹۷۳ء ص۱۰۱ نیز ص۱۰۶ تا ص۱۱۲

۲۴ بہ حوالہ میر شکوہ آبادی، ڈاکٹر زہرا بیگم یاسین نسیم بکڈپو لکھنؤ طبع نومبر ۱۹۷۰ء باب اول ص۱۸ تا ص۹۵

۲۵ دیکھیے: (۱) ایضاً ص۱۶ (۲) ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء مولانا امداد صابری مکتبۂ شاہراہ دہلی طبع اکتوبر ۱۹۵۹ء ص۲۵۱ تا ص۲۵۲ (برائے احوال سعید فرخ آبادی)

۲۶ شہر آشوب ص۳۱۶ تا ص۳۲۴

۲۷ اردو میں قومی شاعری کے سو سال ص۱۰۳ تا ص۱۰۴ (لکھنؤ کے اس پرآشوب دور کی عبرت ناک داستان کے بیان میں لکھنؤ کے رجب علی بیگ سرور اور منشی فدا علی عیش جیسے نثر نگار بھی میر کے ہم زبان نظر آتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: لکھنؤ اور جنگ آزادی ص۱۱۵ تا ص۱۲۲ نیز ص۱۲۸ تا ص۱۳۲)

۲۸ بہ حوالہ معاونین اودھ پنچ: ڈاکٹر سید مصباح الحسن قیصر۔ نامی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۸۴ء ص۱ تا ص۱۲

۲۹ دیکھیے: (۱) اردو صحافت ظرافت اور منشی سجاد حسین: ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر لکھنؤ طبع ۱۹۷۸ء ص۱۰۵
(۲) اودھ پنچ کی ادبی خدمات: ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی۔ کرنول آندھرا پردیش طبع اگست ۱۹۸۲ء ص۱۰۶

۳۰ اردو کے چار مزاحیہ شاعر: مرتبہ احمد جمال پاشا۔ سرفراز پریس لکھنؤ طبع جون ۱۹۶۵ء ص۱

۳۱ دیکھیے: (۱) خم خانۂ جاوید (جلد اول) لالہ سری رام۔ مطبع نول کشور لاہور طبع ۱۹۰۸ء ص۳۸۱
(۲) اکبر الہ آبادی: طالب الہ آبادی۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد طبع اول ص۲۸ نیز ص۴۴
(۳) اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر صغرا مہدی۔ مکتبۂ جامعہ نئی دہلی طبع دسمبر ۱۹۸۱ء ص۵۴
(۴) معاونین اودھ پنچ ص۱۰۹

۳۲ اکبر الہ آبادی، طالب الہ آبادی ص۴ تا ص۴۱

۳۳ اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ ص۸۶ – ۸۷

۳۴ دیکھیے: (۱) اکبر الہ آبادی: طالب الہ آبادی ص۴۲
(۲) جدید اردو شاعری: عبدالقادر سروری۔ حیدرآباد دکن طبع ۱۹۳۹ء ص۱۹۹
(۳) اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ ص۹۲ تا ص۹۸

۳۵ د۔ک: (۱) کلیات چکبست (نظم) مرتبہ کالی داس گپتا رضا۔ ساکار پبلشرز بمبئی مطبوعہ ۱۹ جنوری ۱۹۸۱ء ص۹ تا ص۱۲
(۲) چکبست (حیات اور ادبی خدمات): ڈاکٹر افضال احمد سرفراز قومی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۷۵ء ص۱۵ نیز ص۴۳ تا ص۴۵
(۳) صبح وطن: چکبست لکھنوی۔ انڈین پریس الہ آباد طبع ۱۹۳۷ء ص۱ (طبع ثانی)

۳۶ بہ حوالہ انتخاب آتش و غالب۔ از پنڈت برج نرائن چکبست: مرتبہ کالی داس گپتا رضا بمبئی طبع مارچ ۱۹۸۰ء ص۷ تا ص۹

۲۷؎ دیکھئے (۱) خمخانۂ جاوید (جلد اول) ص۳۶۶
(۲) تذکرۂ معاصرین (حصہ اوّل) : مالک رام۔ دہلی طبع اپریل ۱۹۷۲ء ص۲۰۸ تا ص۲۰۹
(۳) اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت : ڈاکٹر رام آسرا راز۔ دہلی طبع دسمبر ۱۹۷۷ء ص۱۰۵ تا ص۱۰۶

۲۸؎ بہ حوالہ صفی لکھنوی۔ حیات اور کارنامے : ڈاکٹر مصطفےٰ فطرت لکھنؤ طبع ۱۹۸۶ء ص۱۵ نیز ص۳۸

۲۹؎ تحفت جگر: صفی لکھنوی نظامی پریس لکھنؤ طبع اوّل (سن اشاعت غالباً ۱۹۳۶ء)

۳۰؎ بہ حوالہ صفی لکھنوی۔ حیات اور کارنامے ص۱۸۶

۳۱؎ عزیز لکھنوی۔ حیات اور کارنامے : ڈاکٹر مسعود حسن رودولوی نظامی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۸۴ء ص۲۶ نیز ص۵۰

۳۲؎ ایضاً ص۱۹۶ تا ص۱۹۸

۳۳؎ جوش ملیح آبادی کی یہ تمام قومی نظمیں درج ذیل مصادر میں دیکھی جاسکتی ہیں:۔
(۱) اُردو میں قومی شاعری کے سو سال. طبع ۱۹۸۲ء ص۲۵۷ ص۲۵۸ ص۲۶۶ ص۲۹۶ ص۳۵۱
(۲) ضبط شدہ نظمیں، مرتبین خلیق انجم. و مجتبیٰ حسین. برقی آرٹ پریس دہلی طبع جون ۷۵ء ص۲۱ تا ص۲۲۶
(۳) ہندوستاں ہمارا (دوسرا حصّہ) : مرتبہ جاں نثار اختر ص۱۲۹، ص۱۷۷، ص۲۰۵ ص۲۲۸ نیز ص۳۰۹

۳۴؎ ان تمام شاعروں کی قومی نظمیں "اردو میں قومی شاعری کے سو سال"۔ "ہندوستاں ہمارا (حصّہ دوم) نیز ضبط شدہ نظمیں" جیسی کتابوں میں موجود ہیں۔ □□

تصحیح

"ہم نے اپنے مقالہ "پروانہ اور اقبال" مطبوعہ نیا دور کے شمارہ بابت ستمبر ۱۹۹۱ء کے ص۸ سطر ۱۶ میں غلطی سے عبدالغفار شکیل کے بدلے "بشیر فاروق مرحوم" لکھا ہے۔ قارئین حضرات نوٹ فرمالیں۔"

(اکبر حیدری)

عصمت چغتائی کا انتقال

اُردو کی ممتاز افسانہ نگار عصمت چغتائی کا ۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً اسّی سال تھی۔

عصمت چغتائی نے اس وقت لکھنا شروع کیا تھا جب شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی تخلیقات کا رسائل میں چھپنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے معاشرے سے بغاوت کی اور متعدد افسانے ناول اور ڈرامے لکھے۔ ان کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں انھوں نے اپنے افسانوں ناولوں اور ڈراموں کے توسط سے متوسط طبقے کی عورتوں، ان کی نفسیاتی الجھنوں اور محرومیوں کی عکاسی کی۔

ان کا افسانہ "لحاف" دنیائے اُردو میں بہت دنوں تک موضوعِ بحث رہا۔

عصمت چغتائی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد ایوارڈ سے نوازا گیا ان کے ناول اور کہانیوں کے تراجم ہندستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ روسی اور دیگر غیر ملکی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ادارہ "نیا دور" ان کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

غزلیں

سورج کی تمازت سے اماں مانگ رہا ہے
بارش کی دعا ابرِ رواں مانگ رہا ہے

اب آخری منزل میں ہے دلچسپ لڑائی
سلطان کنیزوں سے کماں مانگ رہا ہے

وہ کون تھا جو صلح پہ راضی ہی نہیں تھا
یہ کون ہے جو آج اماں مانگ رہا ہے

اب ایک ہی جھونکے کی ہیں مہمان طنابیں
بے کار مددِ خیمۂ جاں مانگ رہا ہے

ماحول سے تلخی کی مٹانے کو خجالت
پھولوں کی مہک مجھ سے دھواں مانگ رہا ہے

دنیا کے عجائب میں اضافے کا تصور
روز ایک نیا شاہ جہاں مانگ رہا ہے

اب قتل مجھے کرنے کو اظہر مرا دشمن
میرے ہی قبیلے سے جواں مانگ رہا ہے

○ —— اظہر عنایتی
پھر شیخ، رام پور

ہمارا عزمِ سفر بس ڈھلان بھر ہی تھا
وہ امتحان فقط امتحان بھر ہی تھا

ہماری پیاس تو دریا کی تہہ کو چھوتی ہے
ترے گلاس میں پانی نشان بھر ہی تھا

کھڑے ہیں اب کئی محلات مرے سائے میں
اگرچہ میرا تصور مکان بھر ہی تھا

کھٹک رہی ہیں مری آنکھ میں کئی آنکھیں
کسی کا وعدۂ فردا زبان بھر ہی تھا

مری نگاہ تو تنو آسماں سے اونچی ہے
مجسمہ تو ترا آسمان بھر ہی تھا

نظر کی آخری حد تک ہماری جانیں تھیں
تمہارے تیر کا رقبہ کمان بھر ہی تھا

مسافروں نے پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا
شجر کے سائے سے رشتہ تھکان بھر ہی تھا

رشید امکان —— ○
۳/۲، توپ خانہ روڈ۔ اجین (ایم پی)۔ ۴۵۶۰۰۱

روشنی کے پار

ہر طرف پھیلا ہوا ہے
رات کی آنکھوں کا کاجل
شہر کی سڑکوں پہ
برقی روشنی کے دائرے ہیں
فاصلے پر

کھولیوں میں کانپتی
مدھم چراغوں کی ہری لَو
تاڑ کے پیڑوں پہ لٹکی
ہانڈیوں کو کوستی ہے

○

بازگشت

زمستاں کے دن
جا رہے ہیں
ہوا رخصتِ برف باری پہ
نوحہ کناں ہے
جو شُٹ کہہ رہا ہے
چلو برف کی نرم چادر
ہٹا لیں
صنوبر کے ٹھنڈے درختوں کو
پھر سے گلے سے لگا لیں

○

کم مائیگی

ساحلی فضا
نیلے ہرے سمندر میں
نہا رہی ہے
بد مزہ نمک آمیز پانیوں میں
ہم کھڑے ہوئے ہیں
ریت پر
کنارے
ناریل کا پانی
لوگ پی رہے ہیں

○

قمر ادیب
۱۴- ادریس گنج، ہردوئی (یوپی)

غزلیں

نگاہوں میں گر ان کی صورت نہیں ہے
تو پھر زندگی کی ضرورت نہیں ہے
بس اہلِ محبت سمجھتے ہیں اس کو
غمِ عشق کی کوئی قیمت نہیں ہے
ابھی اور کچھ مشقِ بیداد کیجے
ابھی غم بقدرِ ضرورت نہیں ہے
سنے کون دنیا میں کس کا فسانہ
یہاں اپنے ہی غم سے فرصت نہیں ہے
یہ دنیا ہے پروین چلیے سنبھل کر
وہ گرتے ہیں جن کو بصیرت نہیں ہے

—— پروین مسعودی
معرفت تسنیم فاروقی۔ تلسی داس مارگ لکھنؤ

سڑک پر گھومتا کوئی نہیں ہے
کہ منظر دل رُبا کوئی نہیں ہے
عجب ہے زیست کا یہ تانا بانا
کہ اب اس میں مزا کوئی نہیں ہے
مرے حصے میں بھی خوشیاں عطا کر
مرا تیرے سوا کوئی نہیں ہے
کوئی تو مصلحت درپیش ہوگی
یوں ہی تو ہارتا کوئی نہیں ہے
زمانہ ہوگیا تنویر سید
غزل پڑھتے سُنا کوئی نہیں ہے

—— تنویر سید
۱۹۔ کولہن ٹولہ ۔ الہ آباد

مصیبتوں سے اگر خود کو ہار کر جانا
حیات بوجھ ہے اس کو اُتار کر جانا
تمھارے عکس سے یہ دل مرا جھلا جھل ہے
اس آئینے کو نہ ہرگز غبار کر جانا
کبھی نہ اپنے گریباں میں دیکھنا لیکن
ہمارا دامنِ جاں تار تار کر جانا
قرار کہتے ہیں کس کو سکون چیز ہے کیا
یہ راز خواہشوں کو ہم نے مار کر جانا
کسی حسین کو بھی نہ آج تک آیا
مرے بدن کی خزاں کو بہار کر جانا

—— عرفان عجمی
۱۱۱ محمد خیل گنج۔ کانپور

فکر کی بلندی کا رکھ کے پاس لکھنا ہے
اک کتابی چہرے کا اقتباس لکھنا ہے
آج کتنی مدت میں اپنے گھر کو لوٹا ہوں
اجنبی سے چہروں کو روشناس لکھنا ہے
جس نے کتنی صدیوں تک سربلندیاں دیکھیں
اب اسی مقدر میں التماس لکھنا ہے
زندگی کو جینے کا اب سلیقہ آیا ہے
مسکراتے چہروں کو اب اُداس لکھنا ہے
دیکھئے حسن اس میں ہو نہ جائے رُسوائی
اپنا اور اُن کا نام پاس پاس لکھنا ہے

—— حسن فتحپوری
برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال

اُترپردیش کا ترقیاتی منظر نامہ

ادارہ

"پھول والوں کی سیر" میلے میں اترپردیش کو پہلا انعام

صدر جمہوریہ ہند شری آر وینکٹ رمن نے مہرولی (دلی) میں منعقدہ "پھول والوں کی سیر" میلے میں اترپردیش کو عمدہ پنکھے اور ثقافتی گروپ کی جانب سے پیش کردہ قابلِ تعریف ثقافتی پروگرام کے لئے سال ۱۹۹۰ء کا انعام دیا، جسے محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ کے نمائندے، فلم نرمان ادھیکاری شری کیلاش نرائن سریواستو نے حاصل کیا۔ میلے کا انعقاد انجمن سیر گل فروشاں کی جانب سے ہر سال کیا جاتا ہے۔

موجودہ سال ۱۹۹۱ء کا انعام بھی اترپردیش کو دینا طے پایا ہے۔ یہ انعام آئندہ سال دیا جائے گا۔

دہلی میں منعقد ہونے والے اس پروگرام میں جب سے اترپردیش نے حصہ لینا شروع کیا ہے، عمدہ پنکھوں اور ثقافتی پروگراموں کے لیے اترپردیش کو برابر انعام ملتا رہا ہے۔

گورکھ پور میں انسفلائٹس کی جنگی پیمانے پر روک تھام

اترپردیش کے گورکھ پور منطقہ میں انسفلائٹس کے علاج اور روک تھام کے لیے جنگی پیمانے پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔ وزیر اعلا شری کلیان سنگھ کی ہدایت کے مطابق اس بیماری سے متاثرہ لوگوں کے مناسب علاج کے بندوبست کے لیے چیف سکریٹری نے منطقائی سطح پر کمشنروں کو اور ضلعوں میں ضلع مجسٹریٹوں کو بیماری کی روک تھام کے لیے چلائی جانے والی مہم کا رابطہ انچارج مقرر کیا ہے۔

لکھنؤ سے ماہرین کا ایک دستہ بھی گورکھ پور روانہ کر دیا گیا ہے۔ یہ دستہ گورکھ پور منطقہ کے اڈیشنل ڈائرکٹر (علاج و صحت) اور تمام چیف میڈیکل افسران کے توسط سے ضروری دواؤں کی تقسیم کا بندوبست کرے گا اور ڈاکٹر تعینات کرے گا۔ مریضوں کو گاؤں سے اسپتال تک لے جانے کے لیے موٹر گاڑیوں کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ متاثرہ اضلاع کے ضلع مجسٹریٹوں سے توقع کی گئی ہے کہ وہ دیہی سطح کے سبھی ملازمین و افسران کے توسط سے تیز بخار اور سر درد والے مریضوں کو قریب کے صحت مراکز تک لے جانے کا بندوبست کریں گے۔ یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ اس وبا سے متاثرہ افراد کے مفت علاج کا بندوبست کیا جائے۔

ضلع تحصیل اور منطقائی سطح پر جلد ہی کنٹرول روم قائم کیے جائیں گے تاکہ صدر مقام کو وبا سے متعلق صورت حال کی اطلاع روزانہ ملتی رہے۔ مریضوں کو مناسب علاج کی سہولت فراہم کرانے کے لیے فوری طور پر دس لاکھ کی مزید رقم بھی فراہم کرا دی گئی ہے۔

متاثرہ اضلاع میں ۵۵ مشینوں کے ذریعہ بی۔ ایچ۔ سی کا چھڑکاؤ کرایا جا رہا ہے۔ اس وبا کی مستقل روک تھام کے لیے دماغی بخار کی چار لاکھ خوراکیں فراہم کرائی گئی ہیں جن میں سے زیادہ تر کا استعمال متاثرہ علاقوں کے عوام کو ٹیکہ لگانے میں کیا جا چکا ہے۔

یاد رہے کہ یہ وبا سب سے پہلے ۱۹۷۸ء میں گورکھ پور میں پھیلی۔ اُس سال ۳۳۴۹ افراد بیمار ہوئے اور ۱۵۷۲ افراد کی جانیں گئی تھیں۔ ——

ـــے سال ۱۹۸۸ء کو چھوڑ کر تقریباً ہر سال یہ وبا پھیلی۔ اس سال
ر منطقے کے سبھی اضلاع اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور اب تک
۶ افراد اس کی زد میں آچکے ہیں اور ۲۲۸ افراد ہلاک ہوئے ہیں
پوریا، مہراج گنج اور گورکھ پور اضلاع اس وبا سے زیادہ متاثر
ہیں۔

ریاستی ملازمین کے لیے سستی اشیاء کے ۲۶ نئے ڈپو

ریاستی ملازمین کو روزمرّہ کے استعمال کی اشیاء سستی قیمت پر
ہا کرانے کے لیے اتر پردیش ریاستی ملازمین فلاحی کارپوریشن کی جانب سے
باقی سالِ رواں میں ۲۶ نئے ڈپو قائم کیے جا چکے ہیں۔

وزیر غذا و رسد شری اعزاز رضوی کے زیرِ صدارت بھون میں
اتر پردیش ریاستی ملازمین فلاحی کارپوریشن کی کارکردگی کا جائزہ لینے
کے دوران یہ اطلاع کارپوریشن کے ایگزیکیوٹو ڈائرکٹر شری آر۔ اے
ارشاد نے دی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ سالِ رواں میں کارپوریشن
کے ذریعہ ۳۲ء۲۸ کروڑ روپے کا بیوپار کیا جا چکا ہے۔

وزیر موصوف نے کارپوریشن کے افسران کو بتایا کہ کارپوریشن
کا خسارہ کی سی صورت حال نہیں ہونا چاہیے اور کفایت شعاری پر
اہم توجہ دی جانا چاہیے۔

قومی زندگی کے مختلف میدانوں میں خواتین بھی سرگرمِ عمل

"جس طرح قومی زندگی میں مرد اپنی ذمّہ داریاں نبھا رہے ہیں
اسی طرح خواتین بھی مختلف میدانوں میں اہم خدمت انجام دے رہی
ہیں"۔ ان خیالات کا اظہار وزیرِ ثانوی و تکنیکی تعلیم شری راج ناتھ سنگھ
نے یہاں کے۔ ڈی۔ سنگھ بابو اسپورٹس اسٹیڈیم میں ۲۰ ویں منطقائی
طالبات کھیل کود مقابلے کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔

انھوں نے کہا کہ ہندوستانی خواتین نے ہمیشہ حوصلہ مندی کا ثبوت دیا ہے۔
اگر خواتین کو ملک کی حفاظت کے لیے سرحد پر تعینات کر دیا جائے تو وہ
اس اہم کام کو بھی بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں۔

وزیر موصوف نے کہا کہ طالبات میں کھیل کود سے دلچسپی پیدا
کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے کئی اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں۔ ہر ضلع
کے ہائی اسکول اور ثانوی اسکولوں میں کھیل کود کا پورا بندوبست ہے
بھارت اسکاؤٹ گائڈ/گائڈ ادارے کی جانب سے بھی مختلف پروگرام
منعقد کیے جاتے ہیں۔

اس موقع پر مختلف اسکولوں کی طالبات نے پی۔ٹی کا مظاہرہ
کیا، کورس گائے اور دیگر رنگا رنگ پروگرام پیش کیے۔

پنچایت بھون کی تعمیر کے لیے ۶۷ لاکھ روپے منظور

حکومت اتر پردیش نے ریاست کی گاؤں سبھاؤں میں پنچایت
بھون کی تعمیر کے لیے ۶۷ لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے۔
ان کی تعمیر کے لیے آراضی گاؤں سبھاؤں کے توسط سے مفت فراہم
کرائی جائے گی اور ان کی تعمیر محکمہ پنچایت کی جانب سے مقررہ پیمانے کے
مطابق کرائی جائے گی۔ ہر پنچایت بھون کی لاگت ۸۰ ہزار روپے متعین
کی گئی ہے۔ اس میں سے ۴۵ ہزار روپے کا بندوبست محکمہ
پنچایت راج کی پنچایت بھون اسکیم سے، ۷ ہزار روپے جواہر روزگار اسکیم
سے اور ۲۸ ہزار روپے کا بندوبست گاؤں سبھا خود اپنے وسائل
سے کرے گی۔

ضروری اشیاء کی فراہمی جاری رکھنے کے لیے چھاپے

اتر پردیش میں ضروری اشیاء کی فراہمی جاری رکھنے اور
قیمتوں میں اضافے پر کنٹرول رکھنے، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی

ذخیرہ اندوزی کے خلاف چلائی جانے والی مہم کے تحت ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء کے پہلے ہفتے میں ۱۹۴۶ چھاپے مارے گئے اور ۴۴۲ افراد کو گرفتار کیا گیا اور ۱۷ تاجروں کے خلاف ایف. آئی. آر درج کرائی گئی۔

وزیر غذا اور رسد شری اعزاز رضوی نے بتایا کہ ان چھاپوں میں تقریباً ۱۲/۸۹ لاکھ روپیہ کی مالیت کی ضروری اشیا ضبط کی گئیں۔

وزیر موصوف نے یہ بھی بتایا کہ اس دوران سرکاری سستے غلے کی ۹۰ دکانوں کے لائسنس معطل اور ۵۸ دکانوں کے لائسنس مسترد کیے گئے۔

کاوال شہروں میں بسوں کے پیشگی ریزرویشن کی سہولت

اتر پردیش کے سڑک ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی ان بسوں کی مرمت کا کام جن کے شیشے ٹوٹے اور سیٹیں خراب حالت میں ہیں، اس پروگرام کے تحت اس مہینے کے آخر تک مکمل کیا جائے گا، جس سے سردی کے موسم میں مسافروں کو پریشانی نہ ہو۔

اتر پردیش کے وزیر نقل و حمل شری سیتہ پرکاش وکل نے بتایا کہ اس کے علاوہ نقل و حمل کارپوریشن کی جانب سے مسافروں کی سہولت کے لیے ریاست کے پانچ کاوال شہروں سے دہلی جانے والی بسوں میں پیشگی ریزرویشن کی سہولت مہیا کرائی جائے گی۔ یہ سہولت مسافروں کو بسوں کے چلنے کی تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے سے مہیا ہوگی۔

وزیر نقل و حمل نے کہا کہ ریزرویشن کی سہولت سے مسافروں کو نقل و حمل کارپوریشن کی بسوں میں سفر کرنے میں زیادہ سہولت ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ رفتہ رفتہ اس بند و بست کی توسیع دیگر ضلعائی صدر مقامات پر بھی کی جائے گی۔

ازاں اور فوری انصاف دلانے پر زور

عدلیہ سے متعلق افسران کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ غریب عوام انصاف پانے سے محروم نہ جائیں اور دولت مند افراد انصاف مزید نہ سکیں۔

ان خیالات کا اظہار وزیر انصاف شری اوم پرکاش سنگھ نے اتر پردیش نیایک سیوا سنگھ کے ۳۲ ویں کنونشن کے اختتامی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ لوگوں کو ارزاں اور فوری انصاف ملنا چاہیے۔

وزیر انصاف نے کہا کہ عدلیہ سے متعلق افسران اپنی شاندار روایت کو قائم رکھیں اور غریبوں کے تئیں اپنی ذمہ داری کو صحیح طور پر نبھائیں۔ انھوں نے افسران پر اس بات کے لیے زور دیا کہ وہ اپنے رویے میں تبدیلی لائیں اور نرم رخ اختیار کریں۔

انھوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ عدلیہ سے متعلق افسران کو اپنا موازنہ دیگر محکموں کے افسران سے نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ ان کے وقار کے خلاف ہوگا۔

موجودہ حکومت کسانوں کو پیداوار کی مناسب قیمت دلانے کیلئے پُرعزم

اتر پردیش کے وزیر سماجی بہبود مسٹر رماپتی شاستری نے کہا کہ ریاست کی موجودہ حکومت کسانوں کو ان کی پیداوار کی مناسب قیمت دلانے اور کسانوں کے لیے بیج، کھاد اور پانی بروقت مہیا کرانے کے لیے پُرعزم ہے۔

وزیر موصوف اچاریہ نریندر دیو زرعی و تکنیکی یونیورسٹی فیض آباد کی جانب سے منعقدہ کسان میلے کے موقع پر کسان سیمینار کو خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ کسان ملک کی معیشت کی بنیاد ہیں۔ اگر کسان خوش حال ہوگا تو عوام بھی خوش حال ہوں گے۔

وزیر موصوف نے زرعی سائنس دانوں سے کہا کہ وہ کسانوں کے لیے کھیتی کی نئی تکنیک ان کے کھیتوں تک پہونچائیں جن کو وہ بروئے کار لاکر اپنی پیداوار میں اضافہ کر سکیں۔ کسانوں کی ترقی اور بہبود کے لیے ریاستی حکومت کی جانب سے چلائی جانے والی مختلف اسکیموں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ نیائے پنچایت کی سطح پر

کسان سیوا کیندروں کا قیام سرکار کا تاریخی فیصلہ ہے ۔ انھوں نے کہا کہ کسان حکومت کی جانب سے مہیا کی جانے والی سہولتوں کا پورا پورا فائدہ اُٹھا کر ملک کی معیشت کو مستحکم بنانے میں موثر رول ادا کر سکتے ہیں ۔

اس موقع پر وزیر گنّا ترقی شری ہنومنت سنگھ نے اعلان کیا کہ ریاست کے گنّا کسانوں کی بقایا رقم کی ادائیگی کے لئے احکامات جاری کر دیئے گئے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ وسائل کی کمی کے باوجود زرعی میدان میں نئی تحقیق اور ترقی کے لیے پیسہ کی کمی نہیں ہونے دی جائے گی ۔

عدالتوں میں دو سال کے اندر ہندی نافذ ہو جائے گی

اترپردیش کی عدالتوں میں کام کاج میں آئندہ دو برسوں میں ہندی مکمل طور پر نافذ کر دی جائے گی ۔ یہ بات وزیر انصاف شری اوم پرکاش سنگھ نے اترپردیش نیایک سیوا سنگھ کے عہدیداروں کی ایک میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے کہی ۔

وزیر انصاف نے عدالتوں میں ہڑتال اور واک آؤٹ کی وجہ سے کام کے دنوں کے نقصان پر اظہار تشویش کیا ۔ انھوں نے عدالتوں میں کام کے دنوں کی تعداد بڑھانے کے لیے موثر طریقے اپنانے کی ضرورت پر زور دیا ۔

شری سنگھ نے سنگھ کے مطالبے پر سپر ٹائم اسکیل کے ضلع ججوں کی تعداد ویسی ہی رکھنے ، عدالتوں کی تعداد بڑھانے ، عدالتوں میں عدم تحفظ کے ماحول کو ختم کرنے اور سیول ججوں کی سبک دوشی کی عمر ساٹھ سال کرنے پر غور کرنے کی یقین دہانی کرائی ۔

سکریٹری انصاف شری کے ایل شرما نے عدلیہ خدمات کے لیے ریاست کے کل بجٹ کی رقم کے ایک فی صد کا مطالبہ کیا ۔

آگرہ میں بین ریاستی بس اسٹیشن

حکومت اترپردیش کی جانب سے آگرہ میں ایک مزید بس ڈپو اور بس اسٹیشن قائم کیا جا رہا ہے ۔ اسکیم کے پہلے مرحلے میں تقریباً ۲۵ء ۱ کروڑ روپئے کی لاگت سے ڈپو ورک شاپ اور بس اسٹیشن کی تعمیر کی جائے گی ۔

اس بس اسٹیشن سے بین ریاستی ، علاقائی اور ریاست کی طویل مسافت والی سڑکوں پر ۸۰ بسیں چلائی جائیں گی ۔ یہ بسیں آگرہ سے دہلی ، جے پور ، گوالیار ، کان پور نیز ریاست کے دیگر شہروں کے لیے ہوں گی ۔ جدید ترین سہولتوں سے آراستہ اس بین ریاستی بس اسٹیشن سے روزانہ تقریباً ۲۵ ہزار مسافر ۲۴ ہزار کیلو میٹر کا سفر کر سکیں گے جس کے نتیجے میں ریاستی سڑک نقل و حمل کارپوریشن کو یومیہ ۵۰ء ۱ لاکھ روپے کی آمدنی ہوگی ۔

پہاڑی علاقے کے بلدیاتی اداروں کے لیے ۳۰ لاکھ روپے کی خصوصی گرانٹ

حکومت اترپردیش نے پہاڑی علاقے کے بلدیاتی اداروں کے لئے روشنی کے بندوبست اور صفائی آلات کے واسطے موجودہ سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۳۰ لاکھ روپے کی خصوصی گرانٹ منظور کی ہے ۔

نگر پالیکا گوپیشور (چمولی) ، جوشی مٹھ ، نوٹیفائڈ ایریا کمیٹی ، بدری ناتھ ، نند پریاگ ، کرن پریاگ ، اگستیہ منی ، ٹہری ، اُکھی مٹھ ، اتروکاشی ، ہلدوانی ، گوپیشور ، نوٹیفائڈ ایریا ، دوار گھاٹ ، اوکھل ، ٹنک پور ، چمپاوت ، ڈی ڈی ہاٹ ، نوٹیفائڈ ایریا کمیٹی لوہا گھاٹ ، نگر پالیکا پوڑی ، شری نگر ، رودر پریاگ وغیرہ کو بالترتیب ۵۰ ہزار روپے منظور کیے گئے ہیں ۔

نگر پالیکا الموڑہ ، پتھورا گڑھ ، اترکاشی ، ہلدوانی ، ٹنک پور اور باجپور کو بالترتیب ایک ایک لاکھ روپے منظور کیے گئے ہیں ۔

متعلقہ بلدیاتی اداروں کو ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ روشنی کے بندوبست کو یقینی بنائیں اور صفائی آلات فوراً باضابطہ طور پر خرید لیں ۔ □□

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "اپنے سائے کے سوا"
(ایک سو ایک مختصر نظموں کا مجموعہ)

شاعر: ڈاکٹر اختر بستوی   قیمت: ۵/- روپئے

تقسیم کار: آواز پبلیکیشنز۔ ریتی کاپل۔ گورکھپور

"اپنے سائے کے سوا" مختصر نظموں کی ایک ایسی کتاب ہے جس کی ہر نظم اپنے آپ میں پوری طرح حسیت کو سمیٹے ہوئے ہے حالانکہ کوئی بھی نظم چھ یا آٹھ مصرعوں سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن ان مصرعوں میں استعمال ہونے والے الفاظ ان بسیط گہواروں کی طرح ہیں جو سال ہونے کے باوجود تمام نقش ہائے رنگ رنگ کو اپنے آئینہ خانوں میں محفوظ رکھتے ہیں انھیں اس طرح جھلا جھلاتے ہیں کہ وہ نیند کے روشن جہانوں میں جاکر بھی اپنے گردوپیش سے باخبر رہتے ہیں، عام طور پر خیال ہے کہ غزل کے دو مصرعے ایک عالم لامحدود کو سمیٹتے ہیں مگر ہندکے مشہور ناقد جناب کلیم الدین احمد کے اس خیال سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ بعض مقامات پر غزل کے دو مصرعے مفہوم ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں اس لیے کہ مرکزی خیال کو سمیٹنے کے لیے مزید مصرعوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

اختر بستوی چونکہ ایک کامیاب غزل گو بھی ہیں چنانچہ وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نظموں میں جن خیالات کو اسیر کیا ہے وہ دو مصرعوں میں اگر قید کیے جاتے تو تنگیٔ جا کے احساس سے بیمار بھی پڑسکتے تھے ؎

عمر بھر میں دہر کے صحرا میں سرگرداں رہا
جلوہ ہائے کائنات و زیست کا خواہاں رہا

روز و شب پھرتا رہا لے کر قلب ناصبور
پا سکا لیکن نہ اب تک ایک بھی جلوے کا نور

وائے ناکامی نہ میرا غنچۂ دل کھل سکا
اپنے سائے کے سوا کچھ بھی نہ مجھ کو مل سکا

اختر بستوی نے ان نظموں میں ردیف و قافیہ کا پوری طرح التزام رکھا ہے مترنم اور رواں بحور کا استعمال کیا ہے اور اس پر مستزاد الفاظ کا زیر و بم جو ایک خاص آہنگ کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس شعری مجموعے کے مطالعے کی منور ساعتوں سے گزرتے وقت یہ احساس برابر ابھرتا رہتا ہے کہ شاعر کے یہاں اگر وجدان کی سرشاری ہے تو علم کے وسیع ترافق کی ضوفشانی بھی، خاص طور پر جب الفاظ کے عمیق سمندروں میں شناوری کے عمل سے گزرتے وقت ان بے مثال گوہروں کے رنگوں کا تموج بساطِ چشم پر طلوع ہوتا ہے جو ابھی بطونِ صدف میں قید ہیں، ایسے صدف جنھیں گہرائیوں نے اپنی تحویل میں لے رکھا ہے۔ کیوں کہ یہی سیپیاں تو ان کا عظیم سرمایہ ہیں۔ لیکن رنگوں کی وہ ہنگامہ خیزیاں جو الفاظ کے سمندروں کی بے کراں تہوں میں اپنی شوخیوں کی خود ناظر ہیں، ان سے براہ راست نگاہیں ملانا اس وقت ممکن ہے جب ایک طویل و بسیط ہفت خواں کو طے کرلیا جائے۔

بادی النظر میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اختر بستوی نے ان مختصر نظموں میں معصوم و سادہ قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن ان کی رگوں میں تخلیقیت کی آتش خیزی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب تفہیم کی نگاہ ان کی تہوں سے لپٹتی ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہوتا ہے کہ اگر ذرا بھی لغزش ہوجائے تو سارا وجود اس کی گرفت میں آسکتا ہے لیکن اگر ہوشیاری سے کام لیا جائے تو یہی آگ ترسیل کی ٹھنڈک بھی برساتی ہے۔ اس طرح سب کچھ شاداب و سرسبز ہوجاتا ہے۔ ایک نظم "حقیقتِ مبہم" یوں ہے ؎

اک تکلم جس پہ ہوتا ہے گمانِ خامشی
اک تکلم جس سے کرتی ہے عداوت راگنی

ایک ذرہ جس میں ہیں صحرا کی ساری وسعتیں
ایک دریا جس سے رہ جاتا ہے کوزہ بھی تہی
اک اندھیرا جس سے ہوتی ہیں فروزاں مشعلیں
اک اُجالا جس سے بڑھتی ہے سیاہی اور بھی
ایک مبہم سی حقیقت ایک رازِ منکشف
سوچتا رہتا ہوں اکثر، کیا ہے آخر زندگی

'اپنے سائے کے سوا' میں شامل تمام ایک سو ایک نظمیں شاعر کی بلندیٔ فکر اور گہرے مطالعے کی غماز ہیں مگر ظلمت' انا' قربت اور دوری کربِ فطرت' ہمہ گیریت' ضربِ گل' تضاد اور تشہیر نام میں جو خروش ہے وہ اس سمندر کا سراغ دیتا ہے جو شاعر کے باطن میں موجزن ہے اور مسلسل اتھل پتھل جس کے مزاج کا حصّہ ہے۔

'اپنے سائے کے سوا' ایک خوبصورت کتاب ہے جس کا پیش لفظ اردو کے مشہور شاعر کیفی اعظمی نے لکھا ہے۔ ۱۱۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی کتابت و طباعت بہترین اور سرورق کی دلکشی اپنی مثال آپ ہے۔

——— عشرت ظفر

نام کتاب: "تنویرِ غزل" (شعری مجموعہ)
شاعر: اقبال بھارتی قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتہ: فدا منزل۔ اصالت پورہ۔ مُرادآباد

شہر جگر (مرادآباد) زمانۂ قدیم سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے یہاں ہر دور میں کاملینِ فن اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ ماضی قریب میں کیف مرادآبادی اور قمر مرادآبادی اعتبار کا درجہ رکھتے تھے آج بھی وہاں شعراء و ادباء خاصی تعداد میں اپنی ریاضتوں سے مقبول و معروف ہیں۔ اقبال بھارتی کا نام انھیں میں آتا ہے۔ ان کی کاوشوں کا گلدستہ "تنویرِ غزل" اپنی انفرادیت کا آئینہ دار ہے۔ ابر احسنی گنوری جیسے مستند استاد کے دامنِ فیض سے وابستگی نے اقبال بھارتی کو غزل کا رمز شناس بنا دیا ہے۔ روایات کی پاسداری اور زندگی کے مثبت رویّوں کو سلیقے سے برتنے میں موصوف درک رکھتے ہیں۔

یہ بہت خوبی کی بات ہے۔ اقبال بھارتی کی غزلیں دل و دماغ کا اچھا امتزاج ہیں۔ اگر کسی غزل میں دو شعر بھی "سخن شناس" کو متاثر کر جائیں تو میری نظر میں وہ شاعر کامیاب ہے۔ یہ مجموعہ کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی معیاری ہے۔ سرورق سادہ مگر دیدہ زیب ہے۔

امید ہے "تنویرِ غزل" کو اہلِ نظر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اب چند شعر نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں ؎

اس دورِ کشمکش میں عجب میرا حال ہے
خود اپنی زندگی کو سمجھنا محال ہے

سمجھ کر سنگ دل جس کو نگاہیں پھیر لیں میں نے
اگر قسمت اسی پتھر سے ٹکرائی تو کیا ہو گا

آنے سے پہلے ہو گئیں سب رونقیں تمام
میں ان کی بزمِ کیف میں شامل نہ ہو سکا

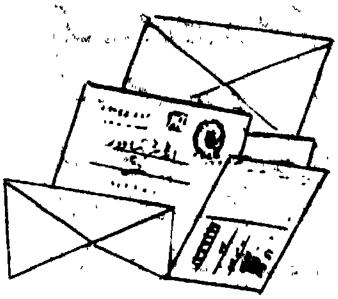
وہ بے نیاز ہو گئے ہم سے کچھ اس طرح
جیسے ہمارے دل میں اب ارماں نہیں رہے

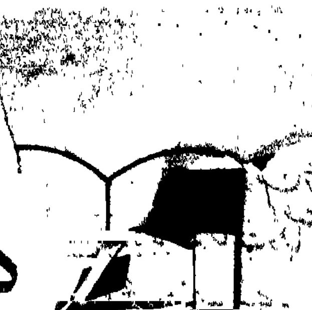
کون جانے محبّت کی مجبوریاں
غم اٹھانا پڑا مسکرانا پڑا

امّید ان سے توجہ کی نہیں ہے
دلِ مضطر کو سمجھانا پڑے گا

منظر مری نظر کو قیامت کا دے گیا
تھک کر کسی کا سایۂ دیوار دیکھنا

——— رباب رشیدی





ہمارے نام.....

برادرم اکبر حیدری صاحب نے آپ کے مدیر ہونے کی اطلاع سب سے پہلے دی تھی، بعد میں نیا دور کا آزادی نمبر بھی ملا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ میں وہ اوصاف موجود ہیں، جو ایک اچھے مدیر کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ جس سلیقے سے آپ نے اگست ۱۹۹۱ء کا شمارہ ترتیب دیا ہے، اس کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

——— ڈاکٹر فیروز احمد
جے پور

یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ آپ نیا دور کے ایڈیٹر ہوگئے ہیں، خدا مبارک کرے۔

نیا دور میرے پاس تو عرصہ دراز سے نہیں آرہا ہے اس لیے معلوم نہیں اس کا کیا حال ہے۔ بہت سے خریداروں کو بھی یہ شکایت رہی ہے۔ اس کی بروقت طباعت اور ترسیل کے انتظام پر توجہ دیجئے، یہ بہت ضروری ہے۔ خدا کرے آپ کے زمانہ ادارت میں سرکار آپ سے تعاون کرے تاکہ آپ دل جمعی سے اپنا کام کرسکیں۔

——— نورالحسن ہاشمی
لکھنؤ

جب سے نیا دور نکل رہا ہے مجھے کل دو ہی شمارے ملے ہیں۔ ایسے میں "حسب سابق قلمی تعاون جاری رکھنے" کا سوال تو نہیں اٹھتا، البتہ اس کی ابتدا کرنی ہے۔

عنایت کردہ شمارے بڑے جاندار اور وقیع ہیں۔ مجھے ہر چیز پسند آئی۔ انتخاب مضامین سے لے کر کتابت، طباعت تک آپ سب حسنِ ادارت اور خوش سلیقگی کے مظہر ہیں۔

——— رضا نقوی واہی
پٹنہ

نیا دور کی ادارت آپ نے سنبھال لی۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ امید ہے کہ آپ اس رسالے کو اپنی ذات کی پرچھائیوں سے نیا رنگ و آہنگ عطا کریں گے۔

——— پروفیسر عتیق احمد صدیقی
علی گڑھ

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی خدمت نہ کرسکوں گا۔ معافی چاہتا ہوں۔

ہندی رسالوں کے تقاضوں سے ہی مہلت نہیں ملتی اور ادھر حالت یہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ ضعف بھی بڑھتا جارہا ہے۔ اب اتنا کام بھی نہیں کرپاتا۔

——— امرت رائے
الٰہ آباد

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ یاد آوری کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ آپ کا محکمہ ہر ماہ رسالہ نیا دور پابندی سے نکال رہا ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ اگر یہ رسالہ آپ کی نوازش سے مجھے ملتا رہا تو میں آپ کے حکم کی تعمیل ضرور کروں گا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نیا دور کے ذریعے اردو کی خدمت کررہے ہیں۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے۔

——— ممنون حسن خاں
بھوپال

عنوانات

دسمبر ۱۹۹۱ء

مدیر
سید امجد حسین
ٹیلیفون : ۲۴۳۷۶۹

[illegible]
o-[illegible] انصاری
o-محمد الیاس خاں
ٹیلیفون ۲۴۲۱۰۸

پیشکش
انیل سروپ
(ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

فی شمارہ : تین روپے
زر سالانہ : تیس روپے

ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

اپنی بات

یہ سال بھی گویا چٹکی بجاتے ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ اسپ بے لگام کی طرح سرپٹ چال چل کر ہزاروں "پیاروں" کو روندڈالے گا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ کبھی پیچھے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ خدائے سخن میر تقی میر نے کیا خوب کہا ہے ؎

فلک نے ہمیں کر سرمہ بنایا
نظر میں اس کی ہیں، تو بھی نہ آیا

اسی طرح موت کے بھیانک ہاتھوں نے اس سال ہمارے مشہور اور باکمال شعراء کے یکے بعد دیگرے چراغِ زندگی گل کر دیے سال کے شروع میں جناب ظ۔ انصاری کا انتقال ہوگیا۔ وہ پروفیسر، ناقد اور ایک زبردست ادیب تھے۔
جناب میکش اکبر آبادی بھی ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے۔ اُن کے جانے سے اُردو شاعری کی ایک روایت کا خاتمہ ہوگیا جناب غلام قادر شہ زور کشمیری بھی چل بسے۔ وہ سیماب اکبر آبادی کے شاگرد اور کشمیر کے مایہ ناز شاعر تھے، مگر افسوس کہ ان کا سارا کلام اب بھی غیر مطبوعہ ہے۔ پھر آغا محمد حیدر مکیش لکھنوی کا انتقال ہوا، وہ ایک اچھے صحافی اور مزاحیہ شاعر تھے۔ اِسی سال باوقار اور قادر الکلام شاعر سید ظفر عباس فضل نقوی صاحب بھی ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے وہ پرانے رنگ کے مرثیہ گو اور تجربہ کار صحافی تھے۔ شعری بھوپالی بھی ہم سے جُدا ہو گئے۔ ان کا تعلق اس نسل سے تھا جو جگر، فانی، اصغر اور حسرت وغیرہ کے بعد شاعری کے میدان میں آئی تھی۔ ان کی ایک غزل بہت مقبول ہوئی، جس کا مطلع ہے ؎

اگر کچھ تھی تو بس یہ تھی تمنّا آخری اپنی
کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

شعری بھوپالی کے بعد خواجہ محمد ادریس کیف بھوپالی کا بھی انتقال ہوگیا۔ انھوں نے قرآن مجید کے ۲۸ پاروں کا منظوم ترجمہ کیا جو ایک یادگار کارنامہ ہے۔ ۷ ستمبر کو مشہور شاعر، ادیب اور صحافی سید عبدالقادر ٹونکی کا انتقال ہوگیا۔
۲۴ اکتوبر کو مشہور افسانہ اور ناول نگار عصمت چغتائی کا انتقال ہوگیا۔ مرحومہ ترقی پسند مصنفین کی صفِ اول میں شمار کی جاتی تھیں، ان کے متعدد ناول اور افسانے شائع ہو چکے ہیں جن میں "لحاف" اور "ٹیڑھی لکیر" بہت مشہور ہوئے۔ ان کے اٹھ جانے سے افسانوی ادب میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے اسے پُر کرنا مشکل ہے۔
۲۳ نومبر کو لکھنؤ کے مشہور صحافی اور ادیب جناب صباح الدین عمر صاحب بھی چل بسے۔ وہ ماہنامہ نیا دور کے طویل عرصہ تک ایڈیٹر بھی رہے۔
اسی طرح سال کے جاتے جاتے ہمارے بیچ سے ایسے شعراء، ادباء اور صحافی اُٹھ گئے جن کی کمی عرصے تک محسوس کی جائے گی۔ ان باکمال حضرات کو نیا دور اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

[illegible]

کلیان سنگھ

سچیوالیہ انیکسی
لکھنؤ

وزیر اعلا
اترپردیش

اپیل

اترپردیش کے پہاڑی علاقے میں زلزلے سے متاثر افراد کی امداد کے لئے ریاستی حکومت جنگی پیمانے پر کام کر رہی ہے۔ مصیبت کی اس گھڑی میں میں سماج کے ہر فرد، رضا کار تنظیموں اور سبھی اداروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ زلزلے سے متاثر افراد کی مدد کے لئے فراخ دلی کے ساتھ ہر قسم کا تعاون دینے کے لئے آگے آئیں اور اس کے لئے "وزیر اعلا امدادی فنڈ" میں اپنا زیادہ سے زیادہ تعاون دیں۔

رقم کراسڈ چیک / بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کے توسط سے درج ذیل پتے پر بھیجیں :——

(دستخط)
(کلیان سنگھ)
وزیر اعلا
اترپردیش

سکریٹری، وزیر اعلا
سچیوالیہ انیکسی
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

نامی انصاری
۱۲-۱۴ اے نواب صاحب کا احاطہ، سیول لائنز
کان پور

چاندنی بیگم — منظر اور پس منظر

"کارِ جہاں دراز ہے" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ظ. انصاری نے احمد علی (افسانہ نگار) کی زبان سے یہ ریمارک کیا تھا،

" اپنے وقت میں ہم نے تم نے بھی اپنے گھروں سے کردار چُنے۔ لیکن یہ کیا کہ دلّی کے جُھٹپٹے میں، گلی کوچوں اور میلوں میں، بازار کی مخلوق ہی نظر نہ آئے اور آئے بھی تو نوکر چاکر کی گیلری میں "

قرۃ العین حیدر کے تازہ ترین ناول "چاندنی بیگم" (مطبوعہ ۱۹۹۰ء) میں کسی حد تک گلی کوچوں کی مخلوق بھی نظر آتی ہے۔ نوکر چاکر کی گیلری والا قصّہ تو بہر حال موجود ہے۔ مگر اس میں جہاں تہاں کچھ ایسے کردار بھی ہیں جو طبقۂ عوام سے آئے ہیں۔ پیش منظر میں قرۃ العین حیدر کے وہی مخصوص کردار وِکّی، بوبی، پنکی، ڈِنکی، شیلی، ایمی، فیری وغیرہ موجود ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ بیلا رانی، ماسٹر امام بخش موگرا، گلاب چنبیلی بہار پھولپوری اور چاندنی بیگم بھی ہیں، جن کے نام پر اس ناول کا نام رکھا گیا ہے۔

تقسیم ہند کا عمل اور طبقۂ اشراف پر اس سے پیدا ہونے والے اثرات کی جزئیات نگاری قرۃ العین حیدر کا محبوب ترین موضوع ہے۔ "چاندنی بیگم" میں وہ چند قدم اور آگے بڑھی ہیں اور گزشتہ چالیس برسوں میں جو تہذیبی، معاشرتی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان کے خد و خال پر بھی انھوں نے اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔

یہ ناول ماجرا یا پلاٹ کا ناول نہیں ہے بلکہ کرداروں کا ناول ہے۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں مختلف النوع کرداروں اور زندگی کے تئیں ان کے رویوں کے انکشافات کا ناول ہے جس میں قرۃ العین حیدر کی فنی چابکدستی اور موضوع پر ان کی مضبوط گرفت، حسبِ دستور نمایاں ہے۔

"چاندنی بیگم" کا قصّہ تو نصف ناول سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ بیرسٹر اظہر علی، ان کے انٹلکچول بیٹے قنبر علی، اور سوشل ورکر بیوی، مِٹّو بیگم طبقۂ اشراف کی نمائندہ ہیں۔ قنبر علی اپنے تمام دانش ورانہ تصوّرات اور بائیں بازو کے خیالات کے باوجود کلاس کونشس، یعنی طبقاتی برتری کے احساس سے نجات نہیں حاصل کر پاتے۔ خود اپنی ذات سے اس رزم گاہِ خیر و شر میں ان کا جہاد یہ ہے کہ متر بری دیوی یا صفیہ سلطانہ سے شادی نہ کر کے وہ راتوں رات، ایک میراثی خاندان کی تعلیم یافتہ مگر ادنیٰ لوگوں کے بیچ پلی بڑھی خاتون بیلا رانی شوخ سے ڈرامائی انداز میں نکاح کر لیتے ہیں اور بطور مہر اپنی آبائی کوٹھی کا ہبہ نامہ اس کے نام کر دیتے ہیں مگر خود کو اس نئے سٹ اپ میں اڈجسٹ نہیں کر پاتے۔ اس دوران ان کے ننھیالی قصبے کے ایک متوسط گھرانے کی تعلیم یافتہ مگر غریب لڑکی، چاندنی بیگم حالات کے تھپیڑے میں بہتے ہوئے "ریڈ روز" کا کنارا پکڑ لیتی ہے۔ مگر تب ہی اچانک آتشزدگی میں سب کچھ جل کر راکھ ہو جاتا ہے ——— قنبر علی اور بیلا رانی کے ساتھ ساتھ اجنبی اور بے سہارا خاتون چاندنی بیگم بھی۔

اس کے بعد زمین، جائداد، کوٹھی، باغ کو ہتھیانے اور اس سلسلے میں مقدمے بازی کا شاخسانہ ہے۔ عدالت اور قانون۔ رشتے ناطے توڑنے اور جوڑنے کی شطرنجی چالوں لکھنؤ، بہرائچ، سیتاپور اور مختلف جانے اور انجانے مقامات، محرکات و معاملات کا مجموعہ ہے

جس پر ہر طرف سے تاریخ کی چھوٹ پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ضمناً وہ تمام مسائل بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں جو آج کے ہندستان، خصوصاً شمالی ہندستان کے مسائل ہیں مگر ان مسائل پر صرف سرسری ریمارکس ہیں۔
قرۃ العین حیدر نے نہ تو کسی مسئلے کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ نہ اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ یہ کہنا تو شاید درست نہ ہو کہ عصری، سماجی اور سیاسی مسائل سے قرۃ العین حیدر کی واقفیت سرسری ہے تاہم اس ناول سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ سماج کی ساخت پرداخت پر وہ تاریخی نقطۂ نظر سے تو خوب غور کر سکتی ہیں۔ مگر معاشرتی اور سیاسی مسائل کا سنجیدگی سے تجزیہ کرنے میں ان کی دلچسپی بہت کم ہے۔
اس سلسلے میں گزشتہ سال ہی کے دو ناولوں یعنی عبدالصمد کے "مہاتما گوتم؟ دو گز زمین" اور پیغام آفاقی کے ناول "مکان" کا ذکر کیا جا سکتا ہے جن میں عصری سماجی مسائل کا گہرا شعور ملتا ہے۔ البتہ ان مسائل کے بارے میں قرۃ العین حیدر کے کچھ سرسری مگر دلچسپ ریمارکس "چاندنی بیگم" میں اس طرح ہیں:-

"اب کچھ چیزیں سرکتی جا رہی تھیں۔ مثلاً اُردو کا رسم الخط، ترقی پسند تحریک اور خاندانوں کی سالمیت' خاندان اب ایسے ہو گئے تھے گویا ناک میں مرغی کا پَر آدھا اِدھر آدھا اُدھر۔"
(ص ۹)

"اچانک سین بدلا، تعلقہ داران و بیگمات مع کاروں' پالکیوں اور بگھیوں کے غائب۔ بہت جلد تانگے اور یکّے بھی معدوم ہو گئے۔ سائیکلوں اور رکشوں کا سیلاب امنڈ آیا۔"
(ص ۹)

"بیلا رانی نے اپنی والدہ کا کلام پیش کیا جو ان کے لیے دراصل بہار بھوپوری لکھتے تھے۔ یہی غزلیں وہ ترنم سے مشاعروں میں پیش کرتی تھیں اور جب سے ان کی قوالی پارٹی فیل ہوئی تھی، مشاعرے ہی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔"
(ص ۳۱)

"ڈوم۔ ڈھاڑی۔ میراثی۔ بھانڈ میں جس قدر تحقیر مضمر ہے۔ فوک سنگر، فوک آرٹسٹ۔ ایمیج ہی بدل جاتا ہے۔"
(ص ۴۴)

"ہندستان میں ہماری پیاری چہیتی زبان اُردو اب ایک انٹرٹینمنٹ انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ......"
(ص ۴۳)

"یہ (کمین، کم ذات لوگ) واقعی اپنی زنجیروں سے محبت کرتے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ آقا ہمیشہ آقا رہے۔ تم خواہ مخواہ ایک غیر طبقاتی نظام قائم کرنے کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہو۔"
(ص ۴۹)

یہ اور اسی قسم کے تمام دوسرے ریمارکس، قرۃ العین حیدر کی دانشورانہ فکرمندی کو تو ظاہر کرتے ہیں مگر "چاندنی بیگم" کے کینوس پر جو مناظر ابھرتے ہیں وہ آزادی کے بعد کی طبقاتی شکست و ریخت اور نئی راہوں کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مارنے ہی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی کوئی واضح سمت نہیں ہے۔ اگر ایک طرف طبقۂ اشراف کے بچے کچھے لوگ نئی صنعت کاری کے منصوبے بنا کر خود کو موجودہ سماج میں مستحکم کرنا چاہتے ہیں تو دوسری جانب بیلا رانی اور ان کا میراثی پریوار، قنبر علی کی کوٹھی اور باغ کو ہتھیانے کے لیے بے چین ہے۔ انھیں میں اردو شاعر بہار بھوپوری بھی ہیں جو گھر سے خالی ہاتھ نکلے تھے مگر بمبئی پہونچ کر اپنے دلکش ترنم اور دنیا سازی کے سہارے صاحب حیثیت بن گئے ہیں اور فارن کے مشاعروں میں بھی جانے لگے ہیں۔
کرداروں کے اس ماگھ میلے میں کوئی چیز بہت صاف نظر نہیں آتی۔ کون کیا کر رہا ہے۔ اس کے اندرون میں کیا ہے۔ اس کی سمت و رفتار کس طرف ہے۔ یہ سب باتیں آسانی سے ظاہر نہیں ہوتیں۔ چاندنی بیگم، اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ ایم اے، بی ایڈ، سماجی استحصال بلکہ حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی آخر میں قنبر علی کی

ٹھی میں جل کر سوختہ ہو جاتی ہیں۔ ان کا کردار، راشد الخیری کے دلوں کی مصیبت زدہ ہیروئنوں کا ماڈرن اڈیشن معلوم ہوتا ہے۔ ہن کی زندگی کے سکھ کی ایک ایک پنکھڑی ناول نگار نے چن چن کر الگ کرلی ہے۔ مگر کیوں؟ اس کا جواب ناول کے اندرون سے نہیں اُبھرتا۔

چاندنی بیگم نے ماچس کی تیلی جلائی جو رضائی پر گری۔ فوراً آگ بھڑک اٹھی اور بھرا پُرا گھر مع مکینوں کے جل کر بھسم ہوگیا۔ یہ سارا واقعہ ہر طور سے غیر فطری اور محال معلوم ہوتا ہے۔ ماچس کی جلتی ہوئی تیلی رضائی پر گر بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ رضائی کا متعلقہ حصہ اندر کی طرف سلگنے لگے گا۔ پوری رضائی بھسم سے جل نہیں جائے گی۔ پھر ایک کمرے میں آگ لگ جائے تو یہ محال ہے کہ دوسرے کمرے کے مکینوں کو اس کی خبر ہی نہ ہو اور وہ سب سوتے سوتے خاکستر ہو جائیں۔ عابد سہیل نے اپنے مقالے "افسانے کی تنقید" میں بڑے پتے کی بات کہی ہے:—

"ہر افسانے میں کچھ نہ کچھ (کام، واقعہ، ماجرا) ہوتا ضرور ہے اور جو کچھ ہوتا ہے۔ اس میں ایک قسم کی ناگزیریت بھی ہوتی ہے۔ یہی ناگزیریت ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے، ایک کردار کو دوسرے کردار سے ایک امکان کو دوسرے امکان سے اور ان میں سے ہر ایک کو، ایک دوسرے سے جوڑتی ہے، ہم آہنگ اور مربوط کرتی ہے اور انھیں جواز اور داخلی منطق فراہم کرتی ہے"۔ ۵

درجنوں ناولوں اور سیکڑوں افسانوں کی تخلیق کار قرۃ العین حیدر سے یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ وہ واقعے کی اندرونی منطق سے بے پروا گزر جائیں گی مگر چاندنی بیگم میں بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ ناول کے اسٹرکچر، ماجرے اور کردار پر حاوی ہیں اور ان کو اپنی ضرورت کے لحاظ سے چلانا چاہتی ہیں، اندرونی ناگزیریت کی پروا نہیں کرتیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ناول کے بیشتر کردار سائے کی طرح چلتے پھرتے ہیں، اور پھر شروع سے آخر تک نہ تو قصے کی اندرونی منطق سے وابستہ رہتے ہیں اور نہ ہی اپنے عمل یا ردعمل سے کوئی گہرا یا دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ خود چاندنی بیگم کا کردار بھی ایک مجہول (Passive) کردار ہے جو خود کو حالات کے تھپیڑوں کے سپرد کر کے نفس مطمئنہ حاصل کر لیتا ہے:

"وہ لحاف کو سر سے اوڑھ کر اس طرح بیٹھ گئیں جیسے چڑیا گھونسلے میں بیٹھ جاتی ہے۔ سکون، احساسِ تحفظ اطمینان، قناعت، تشکر"۔ (ص ۱۶۳)

چاندنی بیگم کے مقابلے میں کہیں زیادہ توانا اور جاندار کردار بیلا رانی شوخ یعنی مسز قنبر علی کا ہے جو مختلف النوع کرداروں کی ودھان سبھا میں حزب مخالف کے لیڈر کا کردار ادا کرتی ہے اور ستّا ہتھیانے کی کوشش میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتی۔ وہ ماسٹر امام بخش تو گرا بھاٹ کی دختر نیک اختر تھیں مگر اپنی حکمت عملی سے ایک دن قنبر علی کی بیگم اور ساری کوٹھی کی مالک بن بیٹھیں۔

"ہر دوسرے تیسرے روز باغ کے معاملے میں جھگڑا ہونے لگا۔ جواب میں وہ (قنبر علی) خاموش رہتے۔ بیلا ہتھ چھٹ بھی تھیں۔ گلاب اور چنبیلی (یعنی بھائی اور ماں) سے مار کھا کے چال کے بچوں کو پیٹتی پھرتی تھیں۔ اب وہ قنبر علی کی خاموشی سے تلملا کر ان کو مارنے لگیں۔ قنبر فوراً ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیتے اور سوچتے، مجھے اس صورتِ حال کا تجزیہ کرنا چاہیے ___ قنبر کے اس سرد ردعمل سے وہ اور آگ بگولہ ہوتیں اور ان کے تحمل کو ان کے کلاس اسنوبری اور سرپرستانہ رویے پر محمول کر کے ان کو مزید صلواتیں سناتیں"۔

(ص ۸۴)

بیلا رانی صرف ہتھ چھٹ ہی نہیں تھیں بلکہ سرد و گرم چشیدہ بھی تھیں اور دنیاوی معاملات کا خوب تجربہ رکھتی تھیں، اس لیے انھوں نے قنبر علی کی نفسیاتی کمزوریوں کو بہت جلد سمجھ لیا تھا۔ وہ اکثر ان سے کہا کرتی تھیں:۔

"اور یہ جو تم دوڑ دوڑ کے دلی جاتے ہو وجہ مجھے معلوم ہے۔ ہر شام تم روس یا ایسٹرن یورپ کی

کسی ایمبیسی میں پہونچ جاتے ہو اور وہاں شرابیں لنڈھاتے ہو۔ تمھارے بڑے توپ اور انقلابی شاعر لوگ بھی کہیں جاتے ہیں تو اپنے کم حیثیت پرستاروں کے بجائے کروڑ پتیوں کے گھروں پر ہی قیام کرتے ہیں بہار صاحب کے ساتھ شاعروں میں جا جا کے مجھے اس لٹریری دنیا کا بھی کچھ آئیڈیا ہو گیا ہے۔"

(صـ۸۳)

میرا خیال ہے کہ اس ناول کا سب سے فعال کردار یہی ہے کیونکہ یہ کردار حالات کے دھارے پر نہیں بہتا بلکہ دھارے کو اپنے موافق موڑنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے اور یہ آج کی سماجی صورت حال کے عین مطابق ہے جس میں ہر شخص اپنی جگہ بنانے یا اونچا اٹھنے کے لیے دوسروں کو کہنی مارنے یا دھکا دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ "جیو اور جینے دو" کا اصول اب صرف اردو کی ادبی کتابوں اور نظموں میں باقی رہ گیا ہے عملی زندگی میں اسے برتنے والے بس خال خال ہیں۔

زندگی میں کچھ کرنے اور کچھ بننے کی جو تڑپ بیلا رانی میں ہے وہ اس ناول کی کسی دوسری عورت میں نہیں ہے۔ تین کٹوری ہاؤس کی خوش شکل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ صفیہ سلطانہ عرف بینی، جن کا دایاں ہاتھ پولیو نے بیکار کر دیا تھا۔ زندگی سے اپنے طور پر جوجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کوٹھی میں سینٹ جونز کانوینٹ قائم کر کے خود کو مصروف رکھتی ہیں کیونکہ قنبر علی ان سے شادی کرنے سے انکار کر کے گئے تھے زندگی کے لیے ان کی ساری بے مصرف جدوجہد کا انجام یہ ہوا کہ:۔

" سیاہ ساری میں ملبوس، آنچل سے سر ڈھانپے سپید صورت والی ایک عورت، چینی کی مورت، چاندنی میں چمکتے چبوترے پر نمودار ہوئی۔ جھک کر ایک ڈھیلا اٹھایا، پلٹی، صفیہ سلطانہ کو نگاہ بھر کے دیکھا، آنکھیں چمکیں، چہرے پر سفید پاؤڈر ــــــ

"ارے ــــ"

صفیہ سلطانہ کے منہ سے بے اختیار نکلا "بیلا؟"

وہ فراٹے کے ساتھ چبوترے پر سے گزری اور باغ کے سنہرے دھندلکے میں غائب ہو گئی۔ تیز رفتار، جیسے بادِ صرصر، بگولہ۔ قدم رکھنے کا انداز عجیب۔ سر سر نکل گئی۔ صفیہ ہیبت زدہ رہ گئیں۔ گھگی بندھی، حلق میں کانٹے چبھے، لرزہ چڑھا، ٹھنڈے پسینے آئے۔ پنڈلیوں پر چیونٹیاں رینگیں۔ بہ مشکل ہمت کر کے دوبارہ پکارنا چاہا

"بیلا ــ!"

ان کی اندرونی آواز نے بہت ہی آہستہ سے جواب دیا:

"چاندنی بیگم!" (صـ۴۱)

اور اس طرح صفیہ سلطانہ دہشت زدہ ہو کر ختم ہو گئیں۔ مگر قرۃ العین حیدر کی اس بے مثل منظر نگاری کے باوجود یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس توہم کو پیش کر کے انھوں نے قاری کو کیا بتانا چاہا ہے۔ ریاست تین کٹوری کی وجہ تسمیہ بیان کرنے کے لئے بھی انھوں نے کچھ اسی قسم کی موہوم روایت کا سہارا لیا ہے:۔

" راجہ صاحب کے ایک پرکھے نے کیتھ کے جنگل میں کسی پا پیادہ، تشنہ کام گدڑی پوش کو تین کٹوری ستو پلایا تھا۔ وہ درویش ایک پوشیدہ ولی تھے خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چند روز بعد ہی ان کے پرکھے کو بادشاہ وقت نے جاگیر عطا کی جو ریاست تین کٹوری کہلائی۔" (صـ۱۱)

تاریخ اور اس کے فلسفے پر گہری نظر رکھنے والی مصنفہ جب عوام کی توہم پرستانہ روایات کی بازیافت کی کوشش کرتی ہیں تو ان کا یہ عمل قاری کو ایک عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار کر دیتا ہے جس کی توجیہ کرنا مشکل ہے۔ سوائے اس کے کہ اسے مصنفہ کے ذاتی مابعد الطبیعاتی رجحان کا نام دیا جائے۔

"چاندنی بیگم" میں سرزمین اودھ کا جو تہذیبی اور ثقافتی منظر نامہ پیش کیا گیا ہے وہی اس ناول کا سب سے اہم پہلو ہے۔ جاگیردارانہ تہذیب کے بچے کھچے اثرات، طبقۂ اشراف کے وکی، چکی، ڈنکی، سہرا، پچکے غازی میاں کا میلہ، بھانڈوں، میراثیوں اور کرتب بازوں کے کمالات جوگیوں کا ماتم، بنجاروں کے نوحے، زنانی مردانی مجلسیں، گھوسیوں کی بدھیہ،

بھوانی شنکر سوختہ کی پُرتکلف اُردو زبان، ہند و پاک کے بیچ خاندانوں کی تقسیم، رشتوں کی گیرائی اور کشیدگی ـــ یہی وہ ترکیبی عناصر ہیں جن سے اودھ کی ثقافت کے خدوخال ابھرتے ہیں اور ان سے قرۃ العین حیدر کی گہری شناسائی ہے :ـ

"شہر آم، خربوزوں اور جامنوں سے پٹ گیا تھا۔ اساڑھ بھی نکلا۔ کدم کی ڈال میں نیا تختہ ڈلوایا گیا، خوش قدم اور سونا کلی نے انتہائی مہارت کے ساتھ ململ کی چُنریاں رنگیں۔ بہار آرا بیگم رانی دُلہن، جس مہارت کے ساتھ وتّی، بنکی اور لڑکوں کے لیے کرُتوں کی آستینیں چنتی تھیں، اسی طرح وہ لہریا دوپٹے چُن کر ان کی کنڈلیاں بناتی گئیں اور یہ پروین اور فیروزہ کے لئے کسی آتے جاتے کے ہاتھ بھجوا دیں گے۔"

"امّی! وہ لوگ کاٹن تو پہنتی ہی نہیں۔ آپ جانے کیوں بھجواتی رہتی ہیں۔ پیور میسور سلک کو فیروزہ موم جامہ بتا رہی تھی۔" شہلا نے چڑھ کر کہا۔

"تم چُپ رہا کرو جی! یہ لین دین بھی ہماری زندگیوں تک ہی ہے۔ تم لوگوں کی اولاد تو بالکل ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوگی۔" (ص ۳۱۸ - ۳۱۷)

اودھ کی اندرونِ خانہ تہذیب سے قرۃ العین حیدر کی واقفیت بہت گہری ہے۔ "گردشِ رنگِ چمن" میں بھی انھوں نے اسی تہذیبی منظر نامے کو پیش کیا ہے۔ مگر اس کا کینوس زیادہ وسیع اور اس کے کردار ایک سے زیادہ جہتیں رکھتے ہیں۔ دونوں ناولوں کو ترتیب سے پڑھنے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گردشِ رنگِ چمن میں ان کے افکار و نظریات کے تانے بانے سے سُوت کی جو رنگین لچھیاں بچ گئی تھیں اسی سے انھوں نے "چاندنی بیگم" کی بُنت کی ہے۔ دونوں کا پس منظر تقریباً ایک جیسا ہے۔ پیش منظر میں جو نئے کردار سامنے آتے ہیں انھیں سے اس ناول کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اودھ کے کلچر اور تاریخ کا عارفانہ ادراک رکھتی ہیں ـــ وہ انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کو بھی خوب سمجھتی ہیں مگر ان رشتوں میں جنس ان کے نزدیک شجرِ ممنوعہ ہے اور یہ کمی وہ افراد کے نفسیاتی مطالعوں کے اظہار سے بخوبی پوری کر دیتی ہیں۔ یہی تکنیک انھوں نے بیلا رانی کے کردار میں آزمائی ہے۔ ان کے سارے نسوانی کرداروں پر جنسی جذبے کا سایہ تک نہیں پڑتا۔ یہ سب ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کی کاٹ کرتے گزر جاتے ہیں، مگر جذبات میں شرابور نہیں ہوتے۔ اسی لیے ان میں ایک خلا کا احساس ہوتا ہے جیسے یہ سب ایک فردوس گم شدہ کی تلاش میں بھاگے چلے جا رہے ہوں۔

قرۃ العین حیدر کا اسلوب بھی اب پہلے سے بہت بدل گیا ہے اب ان کی زبان گنجلک یا پیچیدہ نہیں رہی۔ انگریزی الفاظ و تراکیب کا استعمال بھی بہت کم ہو گیا ہے مگر زبان کو برتنے کا ان کا اپنا منفرد انداز ہے۔ کہیں کہیں وہ تلازمۂ خیال سے بھی کام لیتی ہیں۔ مگر اسے شعور کی رو نہیں کہا جا سکتا۔ اکثر فقروں کو وہ ادھورا چھوڑ دیتی ہیں زمانۂ حال میں مستقبل کے صیغے کا استعمال ان کی نثر کی ایک اور منفرد خصوصیت ہے۔ ان کی نثر کے تخلیقی عناصر ان کی تحریروں کو آب و تاب عطا کرتے ہیں اور ان کے تشخص کو اُجاگر کرتے ہیں۔

بہر حال مجھے یہ ماننے میں تامّل ہے کہ "چاندنی بیگم" قرۃ العین حیدر کا اتنا ہی بڑا کارنامہ ہے جتنا "آگ کا دریا"، "آخرِ شب کے ہم سفر" یا "گردشِ رنگِ چمن"۔ مگر جس طرح غزل کا ہر شعر بیت الغزل نہیں ہوتا، اسی طرح کسی مصنف کی ہر کتاب شاہکار نہیں ہو سکتی۔ "چاندنی بیگم" کا معاملہ بھی میرے خیال سے کچھ ایسا ہی ہے۔

حواشی:

لہ کتاب شناسی ـ از ڈاکٹر ظ۔ انصاری ص ۲۴۴
لہ کتاب نما دہلی۔ مارچ ۱۹۹۱ء ص ۴

غزل

بچھڑ کے تجھ سے نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں
عجیب طرح کے بس حادثے گزرتے ہیں

بڑا سکون ہے دن چین سے گزرتے ہیں
اب ہم کسی سے نہیں بس خدا سے ڈرتے ہیں

کچھ ایسے راستے جن کی نہیں کوئی منزل
ہمارا راستہ بس کاٹ کر گزرتے ہیں

کبھی نگاہ، کبھی پیرہن، ادائیں کبھی
کئی زبانوں میں اکثر وہ بات کرتے ہیں

زمین چھوڑ نہ پاؤں گا انتظار یہ ہے
وہ آسمان سے دھرتی پہ کب اترتے ہیں

یہ کس نے کھینچ دی سانسوں کی لکشمن ریکھا
کہ جسم جلتا ہے باہر جو پاؤں دھرتے ہیں

حیات دیتی ہے سانسیں بس اک مقام تلک
پھر اس کے بعد تو بس سانس سانس مرتے ہیں

کچھ آئینوں میں وہ خود کو سنوارتے ہیں مگر
کچھ آئینے بھی انھیں دیکھ کر سنورتے ہیں

یہ چاند تارے زمیں اور آفتاب تمام
طواف کرتے ہیں، کس کا طواف کرتے ہیں؟

کرشن بہاری نور
۶۰۔ غوث نگر
لکھنؤ

محمود زکی
۱۴۱۔ مرزا نعیم بیگ روڈ۔ اجین۔ ۴۵۶۰۰۶

ہندستان کی جلاوطن حکومت کے پہلے وزیر اعظم

مولانا برکت اللہ بھوپالی

لکھنؤ سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "سچ" کے ۲۹ جنوری تا ۵ فروری ۱۹۲۶ء کے شمارے میں اس کے مدیر مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک خصوصی نوٹ کے ساتھ مولانا برکت اللہ بھوپالی کا مضمون شائع کیا تھا۔ مولانا عبدالماجد لکھتے ہیں:

"مولانا برکت اللہ بھوپالی کے نام سے (جو حب وطن کے جرم میں سالہاسال سے جلاوطن ہیں) اب "سچ" کے ناظرین اچھی طرح واقف ہوگئے ہوں گے۔ "الصلاح" (جرمنی) کے تازہ ترین نمبر میں انھوں نے ایک مضمون اردو میں تحریر فرمایا ہے، جو بجنسہٖ درج ذیل کیا جاتا ہے ہر سنجیدہ مسلمان اس پر غور و توجہ کرے"۔

(ایڈیٹر "سچ")

مولانا برکت اللہ بھوپالی کے "ہندو، سکھ، مسلمان اتحاد" کے عنوان سے لکھے گئے طویل مضمون کا اختصار پیش ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان بذات خود ایک مختصر جہان ہے، جہاں ہر نسل کے لوگ اور ہر دین کے پیرو بستے ہیں۔ علم و ہنر حاصل کرنے کی قابلیت ہندستانیوں میں دنیا کی کسی قوم سے کم نہیں ہے۔ ہمت، شجاعت بھی ان میں موجود ہے۔ مگر گزشتہ دوسو سالوں سے جب سے برٹش حکومت نے وہاں اپنی دوغلی اقتصادی پالیسی چلاکر اس ملک کی معیشت کو تہس نہس کیا ہے اور اب جہاں کروڑوں لوگ بھوکے، ننگے، بے گھر بالکل کیڑوں مکوڑوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور ان میں اس غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی صلاحیت بھی مفقود کر دی گئی ہے .... ہندستان کے قومی اخبار ہندو، سکھ، مسلمان کے جھگڑوں سے بھرے رہتے ہیں۔ آزادی حاصل کرنے کے اصل مسئلے سے جو ملک کے ان تمام لوگوں کی حیات و ممات کا مسئلہ ہے، ان کو دلچسپی نہیں ہے"۔

اپنے مضمون میں وہ آگے زور دے کر توجہ دلاتے ہیں:

"ملک کے طلبا، اور محنت کش طبقہ آگے بڑھ کر باصلاحیت قیادت پیدا کرے۔ سرکاری ملازمتوں کے بجائے صنعت و زراعت کو فروغ دیا جائے۔ محنت کش عالمی برادری سے اپنے رشتے استوار کرکے منظم اقدام کیے جائیں۔ دنگے فساد کرا کے اہل وطن کے سر پھوڑنے سے بھوکوں کو روٹی، ننگوں کو کپڑے اور بے گھر لوگوں کو مکان نہیں مل سکتے ہیں۔ یہ دنگا فساد ملک کی غلامی کو مضبوط کرتے ہیں"۔

اس اقتباس کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ وطن عزیز کی آزادی کی تڑپ دل میں لیے ہوئے جلاوطنی کے عالم میں ہندستان کے اس سپوت نے ۱۹۲۶ء میں جو پیغام یہاں ارسال کیا تھا اس مجاہد آزادی

کی یاد تازہ کرکے ہم اس دور میں اس کے پیغام کی افادیت پر بھی غور کرسکیں۔ مولانا عبدالماجد نے لکھا تھا کہ "سچ" کے قارئین اس شخصیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی کی زندگی اور ان کے کارنامے ہماری تحریکِ آزادی کا بے حد اہم اور سنہرا باب ہیں جنھیں ہم بھلادیں تو یہ بڑی احسان فراموشی ہوگی۔ آیئے ان کی حیات اور کارناموں پر ایک نظر ڈالیں۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کے والد مولوی شجاعت اللہ صاحب سہسوان ضلع بدایوں سے انقلاب ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار ہوکر مع اپنی اہلیہ کے خانماں بربادی کے عالم میں بھوپال پہنچے تھے اور وہیں حکیم صادق علی صاحب کے مکان میں، جولائی ۱۸۵۹ء کو برکت اللہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور پھر مدرسہ سلیمانیہ میں حاصل کی۔ درسِ نظامی سے فارغ ہونے پر مدرسہ کی ملازمت مل گئی۔ مطالعہ کا بے پناہ شوق تھا۔ قاضی عبدالحق صاحب سے علومِ شرقیہ پڑھتے رہے۔ قرآن مجید چھ ماہ کی قلیل مدت میں بغیر کسی استاد کی مدد کے حفظ کرلیا۔ مذہبی کتب کے علاوہ انقلابی مصنفین کی کتابیں بھی زیرِ مطالعہ رہیں۔ شاہ ولی اللہ کی تصانیف سے کافی اثرات ان کی زندگی پر بھی مرتب ہوئے۔ اُردو، عربی، فارسی کے بعد انگریزی پڑھنے پر مائل ہوئے۔ بھوپال میں اسٹیشن ماسٹر قادر بخش ان سے عربی پڑھنا چاہتے تھے۔ مولانا نے ان سے انگریزی پڑھنے کی شرط پر رضامندی ظاہر کی اور جلد ہی اس زبان پر بھی دسترس حاصل کرلی۔

انھیں دنوں ممتاز دانشور، انقلابی مفکر جمال الدین افغانی بھوپال آئے۔ ان سے مولانا نے ملاقاتیں کیں اور کافی اکتسابِ فیض کیا۔ مولانا کے ذہن میں تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کی خواہش بیدار ہوئی۔ بہت جلد مولانا کو ان کے سیاسی خیالات کی بنا پر عوام میں مقبولیت ملنے لگی اور حکومت کی توجہ بھی ان کی باغیانہ سرگرمیوں پر مرکوز ہوگئی۔ نتیجے میں مولانا کو بھوپال سے اچانک ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ انھوں نے بھوپال کو خیرباد کہا۔ اس وقت ان کی عمر چوبیس سال کی تھی۔ تھوڑے عرصے بعد پتہ چلا کر مولانا جبل پور میں ایک مشن اسکول میں ملازمت کررہے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد ہی مولانا وہاں سے بمبئی چلے گئے اور اپنا نام بدل کر انگریزی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ کچھ عرصے بعد وہاں سے انگلستان جا پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات "مسلم انسٹی ٹیوٹ آف لیورپول" کے بانی شیخ الاسلام عبداللہ کوئلیم سے ہوئی اور وہ ان کے ادارے میں کام کرنے لگے۔ درس و تدریس کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ کے جریدے "دی کریسنٹ" اور ہفت روزہ "اسلامک ورلڈ" کے ادارتی شعبے سے وابستہ ہوکر صحافت کے میدان میں بھی اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیت کا مظاہرہ کرنے پر ان کی شخصیت کافی مقبول بنتی گئی۔ لیورپول یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا۔ علومِ شرقیہ سے اچھی واقفیت اور دینی بصیرت کے ساتھ زورِ خطابت نے انھیں کافی مشہور کردیا تھا۔ لندن میں منعقد ہونے والی "محفل میلاد" میں ان کی تقریریں سننے کے لیے اہلِ علم، دانشور اور ہندستانی عوام دور دور سے آتے تھے۔ بمبئی کے طیب جی، آدم جی، جعفر رحمت اللہ، قادر بھائی جیسی اہم ہستیاں بھی ان کے خطاب کو سننے کے لیے آتی رہتی تھیں۔ ان کی وطن دوستی، انسانیت نوازی اور انقلابی خیالات کا لوگوں پر بہت اثر ہوتا تھا۔ لندن میں مقیم رہ کر بھی تحریکِ آزادی کی راہیں ہموار کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ قوم پرست مجاہدینِ آزادی سے بھی وہاں ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ شری گوپال کرشن گوکھلے، شری شیاما جی اور کرشن ورما جیسے انقلابی رہنماؤں سے بھی وہ انگلستان ہی میں ملے تھے۔

لیورپول میں اسلامی تبلیغی مشن میں بھی انھوں نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ وہاں مولانا کی شخصیت بڑی اہمیت کی حامل بن چکی تھی اور انھیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں حکومت افغانستان کی جانب سے انسٹی ٹیوٹ کو مالی امداد دینے کی غرض سے شہزادہ نصراللہ خاں لیورپول آئے، وہیں مولانا سے ان کے تعلقات قائم ہوئے جو ۱۹۱۵ء میں جب افغانستان میں پہلی جلاوطن حکومت قائم ہوئی، بہت کام آئے۔ اس جلاوطن حکومت میں راجہ مہندر پرتاپ سنگھ (جو دہرہ دون ریاست کے حکمراں تھے اور تحریک

آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے ان کی ریاست کو انگریزوں نے ضبط کر لیا تھا۔ صدر بنائے گئے تھے اور وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی کو بنایا گیا تھا۔ انگلستان کے سابق وزیر اعظم جو ممتاز سیاسی شخصیت تصور کیے جاتے تھے مسٹر گلیڈ اسٹون نے ایک شر انگیز مہم ترکی کے خلیفہ اور شیخ الاسلام کے خلاف چلائی تھی جس کا مقصد ترکی کے مذہبی قائدین کو بدنام کرنا تھا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اس فتنہ کے خلاف پرزور احتجاج کیا اور اپنی مدلل تقریروں سے تحریک کو ناکام بنا دیا۔ مولانا نے انگریزوں کے ایک بڑے مجمع میں بتایا کہ ایک وقت تھا جب انگریزی حکومت نے ترکی کے خلیفہ اور شیخ الاسلام سے خوشامد کر کے ہندوستانی مسلمانوں کے نام فتوے حاصل کیے تھے جن کا مقصد تحریک آزادی ہند کو کمزور کرنا تھا اور اب احسان فراموشی کر کے ترکی کے خلیفہ اور شیخ الاسلام کے خلاف من گھڑت طریقے پر ہرزہ سرائی کی جارہی ہے۔

مولانا نے اپنی تقریروں میں ہندوستان کے عوام پر ۱۸۵۷ء سے اب تک کیے گئے انسانیت سوز مظالم کی داستانیں بھی سنائیں جن سے برطانوی عوام پہلی بار اپنی حکومت کی دوغلی پالیسی سے واقف ہوئے اور اس طرح سرکاری طور پر چلائی جانے والی مہم ناکام تو ہوگئی لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا کو انگلستان چھوڑنا پڑا اور فروری ۱۹۰۵ء میں مولانا امریکہ پہونچے۔ وہاں بھی انھوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی نیویارک سے مولانا نے حسرت موہانی کے نام ایک خط لکھا کہ:۔۔۔

"ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر جن خیالات کا آپ نے اظہار کیا ہے اور انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں کو شامل ہونے کا جو مشورہ دیا ہے وہ دونوں چیزیں میری نظر سے گزریں۔ اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہوکر جنگ آزادی کے میدان میں گیند اپنے ہندو بھائیوں سے آگے نکال لے جائیں تو درحقیقت یہ اسلام کی بھی اور بڑی خدمت کریں گے۔ علاحدہ رہ کر ان کی طاقت کم ہوگی"۔

مولانا کا یہ خط جب ہندوستان میں شائع ہوا تو شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ان سے رابطہ قائم کر کے انھیں تحریک انقلاب کے ایک وفد کی قیادت سونپ کر جاپان بھیجنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مولانا خود بھی امریکہ جیسے اس وقت کے نوآبادیاتی علاقے سے جانا چاہتے تھے کیونکہ وہاں سے برطانیہ کے خلاف کوئی مہم چلانا کافی دشوار تھا لہٰذا وہ جاپان جانے کے لیے فوراً رضامند ہوگئے اور ۱۹۰۵ء میں ہی امریکہ چھوڑ کر جاپان چلے گئے، وہاں بھی ان کا مشن جاری رہا۔

جاپان کے حالات کا جائزہ لے کر مولانا نے ایک مضمون لکھا جس میں جاپان کے مذہبی ہیرو "کونو" کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ جاپانی زبان میں اس مضمون کی اشاعت سے پورے جاپان میں مولانا کی دھوم مچ گئی۔ جاپان کے حکمراں کی جانب سے ان کو ملاقات کا دعوت نامہ ملا۔ اور انھیں ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ مولانا نے جاپان میں "اسلامک فریٹرنٹی" نامی جماعت قائم کر کے اس کا اخبار بھی جاری کیا۔ یہ اخبار ہندوستان، جاوہ، رنگون، برما، سنگاپور انڈوچائنا وغیرہ ممالک میں ہزاروں کی تعداد میں جاتا تھا۔ اسی اخبار کے ذریعہ مولانا نے برما اور جاوا کے ہندوستانی باشندوں کو بھی منظم ہوکر انگریز حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر اکسایا تھا۔

برطانوی حکومت نے اخبار پر پابندی لگا کر اپنے علاقوں میں اس کا داخلہ روک دیا۔ مگر مولانا نے نت نئے انداز اختیار کر کے اخبار کی چند کاپیاں انقلابی قائدین تک پہونچانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ انھوں نے جاپانی جوتوں کو اس اخبار کے تازہ شماروں میں لپیٹ کر انقلابیوں کو پارسل کرنے کا طریقہ بھی اپنایا۔ برطانوی حکومت نے جب اس طرح کے پارسلوں کو چیک کر لیا تو حکومت جاپان پر دباؤ ڈال کر مولانا کو یونیورسٹی کی ملازمت سے برطرف کرا دیا۔ مولانا اس وار کو سہہ کر بھی اپنی تحریک چلاتے رہے، تب انھیں ملک چھوڑنے پر مجبور کرا دیا۔

لیکن مولانا نے جو تحریک شروع کی تھی اسے ان کے رفقاء دوسرے ممالک میں بھی پھیلا چکے تھے۔ شنگھائی میں مجاہد آزادی متھرا سنگھ اور ہانگ کانگ میں انقلابی رہنما بھگوان سنگھ اس تحریک کے علمبردار

تھے۔ اس تحریک کو مالی تعاون امریکہ میں بسے ہوئے ہندستانی وطن پرست دیتے تھے۔ یہی تحریک آگے چل کر "غدر پارٹی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مولانا نے جس وقت اس تحریک کے ذریعے آزادیِ وطن کا انقلابی نعرہ بلند کیا تھا اس وقت تک یہاں کانگریس ہوم رول والا تصور بھی پیش نہیں کر سکی تھی۔

مولانا ۱۹۱۲ء میں جاپان سے فرانس پہونچے اور اپنی انقلابی سرگرمیاں وہاں بھی شروع کر دیں۔ اخبار "انقلاب" نکالا جو غدر پارٹی کا ترجمان بنا۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا پیرس سے افغانستان چلے گئے۔ وہیں کابل میں جلاوطن حکومت قائم کی گئی اور مولانا کو اس جلاوطن حکومت کے وزیر اعظم کے عہدے پر سرفراز کیا گیا۔ اس موقع پر شہزادہ نصر اللہ خاں کے ساتھ مولانا کے تعلقات بہت کام آئے۔ کیونکہ اب وہ افغانستان کے وزیر اعظم بن چکے تھے۔ لیکن ۱۹۱۷ء میں امیر حبیب اللہ صدر افغانستان نے برطانوی حکومت کے دباؤ میں آکر مولانا کو ملک بدر کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد جب امیر حبیب اللہ قتل کر دیئے گئے اور ان کی جگہ امیر امان اللہ صدر مملکت بنے تو انھوں نے مولانا برکت اللہ کو واپس بلالیا اور کابل ہی سے ایک وفد، جس میں جلاوطن حکومت کے صدر راجا مہیندر پرتاپ سنگھ، مولانا برکت اللہ بھوپالی (وزیر اعظم)، مولوی عبد الرب، شری دلیپ سنگھ گل اور مسٹر آچاریہ کے علاوہ مولانا کے سکریٹری ابراہیم صاحب شامل تھے، لینن سے ملاقات کی غرض سے ماسکو پہونچا۔

لینن کو وفد نے اپنے عوام کی جانب سے نیک خواہشات پیش کیں نیز ان سے افغانستان اور ہندستان کے عوام کی جدوجہد میں برطانیہ کے خلاف مدد کا وعدہ لیا۔ مولانا برکت اللہ اس وفد سے پہلے بھی ایک مرتبہ لینن سے مل کر ہندستانی عوام کی جانب سے انھیں صندل کی ایک چھڑی تحفے کے طور پر پیش کر چکے تھے جو ماسکو میں لینن کے یادگار میوزیم میں آج بھی موجود ہے۔

مولانا اپنی علالت کے سبب ۱۹۲۲ء میں برلن چلے گئے۔ وہاں اپنے علاج کے ساتھ ساتھ اپنی تحریک آزادی کا کام بھی کرتے رہے نیز وہیں سے ایک اخبار "الصلاح" بھی جاری کیا جو اردو میں چھپتا تھا اسی اخبار کا ایک اقتباس اس مضمون کی ابتداء میں مولانا عبد الماجد دریابادی کے "سچ" کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔

مولانا اپنی علالت کے باوجود ۱۹۲۷ء میں سان فرانسسکو چلے آئے جہاں غدر پارٹی کے دفتر یگانتر آشرم میں قیام کیا اور وہیں انھوں نے اپنی آخری خواہش کا اظہار ان لفظوں میں کیا:۔

"میں تمام زندگی پوری ایمان داری کے ساتھ اپنے وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتا رہا یہ میری زبردست خوش قسمتی تھی کہ میری یہ ناچیز زندگی میرے پیارے وطن کے کام آئی۔ آج اس زندگی سے رخصت ہوتے ہوئے جہاں مجھے یہ افسوس ہے کہ میری زندگی میں میری کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں وہاں مجھے اس بات کا بھی اطمینان ہے کہ میرے بعد میرے ملک کو آزاد کرانے کے لئے لاکھوں آدمی آج آگے بڑھ آئے ہیں جو سچے ہیں، بہادر ہیں اور جانباز ہیں۔ میں اطمینان کے ساتھ اپنے پیارے وطن کی قسمت ان کے ہاتھوں میں سونپ کر جا رہا ہوں؟"

ان نیک خواہشات کے ساتھ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۷ء کو بروز منگل ہندستان کا یہ عظیم مجاہد آزادی مولانا برکت اللہ بھوپالی، اپنے وطن سے دور اس جہان فانی سے رخصت ہوگیا۔

مولانا کے انتقال کے وقت راجا مہندر پرتاپ سنگھ وہاں موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم لوگوں نے، جو ان کی تجہیز و تکفین میں شریک تھے، ان کی لاش کو تابوت میں محفوظ کر کے "سیکرامنٹو" سے تقریباً پچھتر میل کے فاصلے پر واقع میرز ویل کے مقام پر یہ کہہ کر دفنا دیا تھا کہ:۔

"جب ہندستان آزاد ہو جائے گا تب تمہاری خاک اس سرزمین پر پہونچا دی جائے گی۔"

(باقی صـ۲۳ پر)

غزلیں

ترے لمسِ قدر شناس نے مجھے رکھا کتنا سنبھال کے
گئے وقت کا نہیں ایک پل بھی حساب میں مہ و سال کے

ابھی تو ہے رنگِ بساطِ جاں ابھی فصلِ ربط ہے درمیاں
نہ بجھی چمک تری یاد کی نہ مٹے نقوش وصال کے

میں ہوں اپنے حشر سے باخبر نہیں یہ سفر بھی مرا سفر
مجھے دی ہیں جھوٹی تسلیاں مرے دوست بھی ہیں کمال کے

نہ ہے مستقر نہ ہیں راستے نہ فضا کوئی نہ تو فاصلے
ہیں نمائشیں سب اڑان کی ہیں قصیدے سب پر و بال کے

میں تو اس کے ہاتھ کا کھیل ہوں مری اور کچھ نہیں حیثیت
کبھی پھینکے مجھ کو نشیب میں کبھی دیکھے اوپر اچھال کے

میں سراب اپنی نظر کا ہوں، میں ہوں اپنے ذہن کا واہمہ
یہ جو دست بستہ ہیں روبرو یہ گماشتے ہیں خیال کے

میں جدھر بھی جاؤں سنائی دے مجھے بازگشت نفس مری
نہ صدائے تیر و کماں کہیں، نہ فسانے دشت و غزال کے

کہیں برگِ گل مرے لفظ ہیں کہیں موجِ رنگ مرا بیاں
مری کشتِ فن کے نواح کو ملے جھونکے بادِ شمال کے

میں ابھی یہاں میں ابھی وہاں میں ہوں رمزؔ آبِ رواں دواں
مری فکر موسمِ تازہ تر مرے شعر پھل نئی ڈال کے

محمد احمد رمز

معرفت اشار ایند کمپنی ۵۰۹۳، بلی ماران
دہلی - ۱۱۰۰۰۶

پیامِ امن کے رقعے ہوا میں اڑتے ہیں
ابھی سفید پرندے گھٹا میں اڑتے ہیں

گلوں کے نام سے مشہور ہو گئی خوشبو!
شمیمِ یار کے قصے ہوا میں اڑتے ہیں

ہمارے شعروں کا ہم کو کوئی جواب تو دے
ترا خیال ہیں، حرف و صدا میں اڑتے ہیں

یہ شاخ شاخ ستارے، یہ بوند بوند چراغ
کسی کی یاد کے جگنو فضا میں اڑتے ہیں

ہماری غیرتِ پرواز ہے پروں پہ لکھی
لہولہان ہیں لیکن انا میں اڑتے ہیں

مجھے زمیں پہ اتارا گیا کرن کی طرح
مہ و نجوم مری گردِ پا میں اڑتے ہیں

ہمارے لفظوں کو پرواز کا شعور بھی ہے
بہت حقیر ہیں لیکن دعا میں اڑتے ہیں

کبھی جو چوم چکے ہیں قدم شہیدوں کے
وہ سرخ ذرے ابھی کربلا میں اڑتے ہیں

کھلی فضا کے یہ پنچھی غریب کیا جانیں!
یہ زندگی کے سفر کی سزا میں اڑتے ہیں

تسنیم فاروقی

تلسی داس مارگ، نزد اسپتال
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴

عابد سہیل
۲۲-ایس۔ پی۔ جرنلسٹ کالونی۔ سیکرٹری
علی گنج۔ لکھنؤ

ڈاکٹر عبد الحلیم ـ چند یادیں

جولائی ۱۹۴۸ء کی کوئی تاریخ۔

ضلع غازی پور کے موضع پہنیا سے دو بیل گاڑیوں پر دس بارہ افراد غازی پور جارہے ہیں کہ اُن دنوں ان دونوں مقامات کو ملانے کے لئے نہ پکی سڑک تھی، نہ بس سروس۔ اور ان گاڑیوں میں سوار ہیں ممی جان، یعنی ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم کی اہلیہ، ان کی بہن حمیدہ اور عائشہ۔ اور علیم صاحب کے سارے بچے ــــ انیسہ باجی، جمیلہ جو امریکا سے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اب علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ بایوکیمسٹری میں ریڈر ہیں، شمیمہ، وسیمہ، حمیدہ خالہ کے بچے اور میرا چھوٹا بھائی عمران اور چھوٹی بہن نجمہ اور ایک نرٹ کھٹ، شریر، ذرا ذرا سی بات پر رُوٹھ جانے والا خوبصورت سا پانچ چھ سال کا بچہ۔ ــحلیم! چنچل، شوخ، چپ بیٹھنا جانتا ہی نہیں۔ کبھی بڑی بہنوں کو گدگدا رہا ہے، کبھی چھوٹی بہنوں کو چٹکی کاٹ رہا ہے۔ ممی جان ڈانٹتی ہیں تو رونے لگتا ہے آنسوؤں سے اور پھر آپ ہی آپ ہنس دیتا ہے۔ جیسے یہ سب مذاق ہو۔ رونا بھی اور ہنسنا بھی اور پھر وہی شرارتیں، چہلیں، چھیڑخانی۔ ماں ڈانٹتی ہیں، خالائیں سمجھاتی ہیں۔ دو چار منٹ کے لیے خاموش ہوجاتا ہے اور پھر وہی سلسلہ۔

آخر مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ میں دونوں ہاتھوں سے اٹھاکر حلیم کو چلتی گاڑی سے اُتار دیتا ہوں ــ

"بہت اچھا کیا۔ یہی سزا ہے۔" ممی جان کہتی ہیں۔ گاڑی آگے بڑھ رہی ہے۔ حلیم اسی جگہ کھڑے زور زور سے رو رہے ہیں۔

میں گاڑی بان سے رفتار دھیمی کرنے کے لیے کہتا ہوں لیکن فاصلہ بہرحال بڑھتا جارہا ہے۔ اتنے میں حلیم یکایک گاڑی کی طرف دوڑنا شروع کردیتے ہیں۔ میں گاڑی رکوا دیتا ہوں اور حلیم کو اٹھاکر اپنی گود میں بٹھا لیتا ہوں اور آنسوؤں کے دو قطرے جو اس کی آنکھوں سے گرنے کے لیے بے چین ہورہے ہیں پونچھ دیتا ہوں۔ حلیم مجھے دیکھتا رہتا ہے، خاموشی سے۔ اور پھر میری گردن میں بانہیں ڈال کر مجھے پیار کرلیتا ہے۔

اس بچے نے وہ دن اور ۳۰ر اگست ۱۹۹۱ء کی رات تک، جب میں نے اسے، جو اب ڈاکٹر عبدالحلیم کے نام سے جانا جاتا ہے، آخری بار دیکھا، حفظِ مراتب اور محبت کا وہ رشتہ استوار رکھا دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھنا، دیکھتے ہی کھڑے ہوجانا اور اس وقت تک نہ بیٹھنا جب تک میں آنکھوں سے اشارہ نہ کردوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ پہلے سگریٹ اور اب سگار پیتے تھے لیکن میرے سامنے نہیں ــ اس آخری ملاقات کے وقت حلیم بے حد بیمار تھے لیکن مجھے بیماری کی شدت کا علم نہ تھا۔ میں انیس انصاری صاحب سے پنڈال میں بیٹھا بات چیت کر رہا تھا کہ اتنے میں ہم دونوں نے دیکھا کہ حلیم پنڈال میں داخل ہو رہے ہیں، وھیل چیئر پر۔ انیس انصاری صاحب نے جو کانپور میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہ چکے ہیں، مجھ سے پوچھا ــ

"حلیم صاحب، اس طرح کیوں ــ ؟"

"علیل ہیں۔" میں نے جواب دیا اور ہم دونوں اس جانب

ہو گئے، جہاں حلیم صاحب بیٹھے تھے۔ نوشہ کی مسند کے بالکل سامنے۔

انیس انصاری صاحب نے مزاج پرسی کی۔ اتنے میں حلیم کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں نے ان آنکھوں میں وہ تکلیف پڑھی جو مجھے دیکھ کر کھڑے نہ ہو پانے سے انھیں ہو رہی تھی۔ میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"پہلے ٹھیک ہو جاؤ جلدی سے۔ باقی باتیں بعد میں۔"

مسکرائے، بجھی بجھی سی مسکراہٹ۔

"ٹھیک ہو جاؤ گے، جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔" میں نے تسلّی دی۔

"ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف ہوئی۔" انھوں نے کہا۔ پھر کسی بیماری کا نام لیا۔ بات کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ خاموش ہو گئے پھر بولے ——

"ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس طرح کے لاکھوں مریضوں میں سے بس ایک مریض کی بیماری یہ شکل اختیار کرتی ہے۔"

"تم بھی تو لاکھوں میں ایک ہو۔"

مسکرائے — لیکن اس بار مسکراہٹ میں مایوسی کسی قدر کم تھی۔

اس دوران انیس انصاری صاحب ان سے ملاقات کر کے جا چکے تھے۔

میں نے کہا "انصاری صاحب شاید علی گڑھ یونیورسٹی کی پیداوار ہیں۔"

خوش ہوئے۔

"انھیں معلوم ہی نہیں کہ تم علیم صاحب کے بیٹے ہو۔"

"اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔" حلیم بے حد اعتماد سے بولے۔

اسی دوران بارات آ گئی۔ بھیڑ بھاڑ بڑھی اور میں پچھلی صف میں آ کر بیٹھ گیا۔

تقریب کے اختتام پر، رخصت ہوتے وقت، ایک بار پھر حلیم سے ملا۔ اس دوران شاید تکان کے سبب ان کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا تھا جسے وہ اپنی مسکراہٹ سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ نہ میں کچھ بولا نہ وہ۔ بس دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نہ انھیں معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، نہ مجھے۔

کچھ اور یادیں اس طرح ہیں: ——

حلیم شاید بی، اے کے طالب علم ہیں۔ جمعہ کا دن ہے۔ یونیورسٹی میں حسب معمول چھٹی ہو گئی ہے اور وہ ۳۔ یونیورسٹی روڈ کے بنگلہ میں اپنے کمرے سے نکل کر سامنے کے دالان سے ہوتے دوسرے کمرے میں جا رہے ہیں۔ اتنے میں حلیم صاحب کی نظر ان پر پڑتی ہے۔

"نماز پڑھنے نہیں گئے۔؟"

"جی جا رہا ہوں۔" حلیم منمنائے۔

"نماز پڑھنا ہے تو قاعدے سے پڑھو ورنہ نہ پڑھو۔"

حلیم خاموش کھڑے ہیں۔

"کھڑے کیا ہو۔؟"

"جی"۔ کہہ کر حلیم جلدی سے غسل خانے جاتے ہیں، وضو کرتے ہیں اور یونیورسٹی کی مسجد کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں۔

پھر چند برس بعد وہ امریکا چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے ڈاکٹریٹ کر کے واپس آتے ہیں۔ شادی ہوتی ہے — زربفت کی شیروانی میں دولھا نہیں شہزادے معلوم ہو رہے ہیں۔

دو تین سال بعد ان کی زندگی میں زہر گھلنا شروع ہو جاتا ہے جس کی شدت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن مجال ہے جو ان کے چہرے پر غم کے سائے کا بھی کسی کو احساس ہو سکے۔ ایک دن کئی برسوں بعد، میں پوچھتا ہوں۔

"ماموں صاحب کی اتنی بڑی لائبریری تھی۔ ساری کتابیں کیا ہوئیں؟"

"محفوظ ہیں!"

"مطالعہ کے وقت ماموں صاحب کتابوں پر حواشی لکھتے تھے۔ اکثر کئی کئی صفحات کے نوٹس تیار کر کے اسی کتاب میں رکھ دیتے تھے۔ میں ساری کتابیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے ان میں کچھ اہم کاغذات ملیں۔"

"آپ نے پہلے بھی کہا، فرمایا تھا۔" حلیم کہتے ہیں۔ "میں نے

ایک ایک کتاب دیکھ ڈالی۔ آپ کے کام کی کوئی چیز نہیں ملی۔"

میں جانتا ہوں کہ حلیم دروغ مصلحت آمیز سے کام لے رہے ہیں۔ اس کا سبب بھی جانتا ہوں کہ ایسا نہ کہنے سے کسی "دوسرے" کی شخصیت پر آنچ آتی ہے اور یہ انھیں کسی طرح گوارا نہیں۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ انھیں احساس بھی نہ ہو کہ مجھے حقیقت معلوم ہے۔ لیکن وہ مجھ سے آنکھیں چار نہیں کرتے اور چند لمحوں بعد گفتگو کا رُخ بدل دیتے ہیں۔

کئی سال بعد ایک دن آتے ہیں۔ امتحان میں بچوں کی کامیابی پر بے حد خوش ہیں۔ دونوں کو تقریباً ستر فی صدی نمبر ملے ہیں۔ ایک ایک تفصیل بتاتے ہیں۔ میں مبارک باد دیتا ہوں۔ اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ بیٹے نے رزلٹ کارڈ دکھانے کی کوشش کی تھی تو اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا گیا تھا اور انھوں نے تفصیلات اسکول جا کر معلوم کی تھیں۔ لیکن کسی قسم کا کرب یا تکلیف کا احساس ان کے چہرے پر نہیں۔ ہنس رہے ہیں۔ لطیفے سنا رہے ہیں۔ دوسروں کو اپنے بارے میں دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خود کو بھی۔ لیکن ان حالات میں کوئی خود کو بھی دھوکا نہ دے تو کیا کرے۔

حلیم کے کالج میں ایک سیمنار ہے۔ متعدد دوسرے ادیبوں کے علاوہ علی گڑھ سے قاضی عبدالستار اور دہلی سے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی آئے ہیں۔ حلیم کے اصرار پر میں بھی موجود ہوں۔ سیمنار کے بعد مہمانوں کے لئے کھانے کا بھی انتظام ہے لیکن ابھی تھوڑی دیر ہے ہم لوگ ہال سے باہر نکل کر میدان میں بکھر جاتے ہیں۔ کچھ طلبا بھی ہیں طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اتنے میں ایک کار آتی ہوئی نظر آتی ہے اور ہم لوگوں سے تھوڑے فاصلے پر آکر رک جاتی ہے۔ حلیم آگے بڑھتے ہیں اور کار نشینوں سے بات کرنے لگتے ہیں۔ اتفاق سے میں ٹہلتے ٹہلتے کار کے پاس سے گزرتا ہوں تو حلیم کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے،

"میں تو سب سے مستحق اُمیدوار ہی کا انتخاب کروں گا۔"

کھانے کے دوران بات چیت ہو رہی ہے۔ لطیفے بھی سنائے جا رہے ہیں۔ سیمنار میں پڑھے جانے والے پرچوں پر تبصرے ہو رہے ہیں۔ کار نشین میزبانوں کے چہروں پر تناؤ ہے۔ پھر ان میں سے ایک صاحب ٹوٹی پھوٹی اُردو میں مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔ قاضی صاحب کو ٹرین پکڑنی ہے۔ ظہیر صاحب کو شہر میں کچھ کام ہے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد حلیم کے کمرے میں صرف میں اور وہ رہ جاتے ہیں۔

"کیا بات تھی۔ تم اس قدر سخت لہجے میں کیوں بات کر رہے تھے؟"

"کہتے ہیں لکھنؤ سے بے حد زور پڑ رہا ہے کہ فلاں امیدوار کو لینا ہے۔ میں تو سب سے اچھے امیدوار کو لوں گا۔"

"اور اگر وہی سب سے بہتر امیدوار نکلا تو؟"

"تو سر آنکھوں پر۔ لیکن میں سب سے اچھے امیدوار کو ہی لوں گا۔"

ڈیڑھ دو ماہ بعد حلیم لکھنؤ آئے تو میں نے پوچھا

"کس کا انتخاب کیا؟"

"جو سب سے بہتر تھا۔"

"انھیں کو جن کے لیے زور ڈالا جا رہا تھا۔؟"

"وہ تو سب سے کمزور امیدوار ثابت ہوئے۔ صرف ایم اے اور وہ بھی سکنڈ ڈویژن۔"

چند ماہ بعد حلیم کو برخاست کر دیا گیا۔ پھر کسی نے مشورہ دیا کہ پہلے معطل کیا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ برخاست کرنے کے بعد طرح طرح کے الزامات لگا کر انھیں معطل کر دیا گیا۔ ایک طرف یہ سب کچھ اور دوسری طرف پرنسپل کا بنگلہ جس میں وہ پہلے ہی سے مقیم تھے ان کے نام الاٹ کر دیا گیا۔

کافی دنوں بعد میرے گھر آئے اور میرا کمرہ دیکھ کر بولے "اب آپ کا کمرہ کس قدر بے ترتیب ہو گیا ہے۔ بستر اور میز کرسیوں پر کتابیں نظر نہیں آ رہی ہیں۔ ساری چیزیں قرینے سے اپنی اپنی جگہوں پر رکھی ہیں۔!"

میں مسکرا دیا۔

پھر خود ہی بولے ۔ "آپ نے "ہنر کا" میں فرد جرم پڑھی تھی ؟"

میں انجان بن گیا۔

"یہ دیکھئے" انھوں نے جیب سے اخبار کا تراشہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں تو پہلے ہی سے پڑھ چکا تھا ۔ ادھر ادھر سے دیکھا اور تراشہ واپس لوٹا دیا۔

"جلد ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا ــــــ مقدمہ آخری اسٹیج میں ہے۔ بس بحث ہونی باقی ہے"۔

بحث ہوئی ۔ دو دن تک ۔ دونوں طرف کے وکیلوں نے اپنے اپنے ترکش کے آخری تیر تک خالی کر دیئے ۔ فیصلہ محفوظ رکھا گیا۔ تیسرے چوتھے روز ہائی کورٹ نے سارے الزامات بے بنیاد قرار دیتے ہوئے ڈیڑھ دو سال کی ساری تنخواہ اور اخراجات کے ساتھ فیصلہ ان کے حق میں کر دیا۔

سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی ۔ وہاں سے بھی حلیم سرفراز ہی لوٹے۔

حلیم کے مزاج ، بات چیت کے انداز پر نہ اس فیصلے کا کوئی اثر ہوا نہ پریشانی کے دنوں کا ۔ نہ اس اشتہار کا جس میں ان پر غبن کے الزامات لگائے گئے تھے ، اور نہ اس شخص کی بے حسی کا جس کو نہ ان کی برطرفی پر افسوس تھا نہ بحالی پر خوشی ۔

کالج کا نظم و نسق مثالی بن گیا ۔ کہا جاتا ہے کہ امتحانات کے دوران انھوں نے دس دس طلبا کو نقل کرتے ہوئے پکڑ کر باہر کر دیا۔ لیکن احتجاج کی ایک آواز بلند نہ ہوئی ۔ صاف ستھرا کالج ۔ کمروں کے درمیان کے میدان کے کناروں پر پھولوں کے پودے اور گملے ۔ نہ شور نہ ہنگامہ ۔

حلیم شہر کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے ۔ عالم فاضل نہ تھے ۔ لیکن اقبال کے کلام کے شیدائی تھے ۔ دوسرے شعراء کے بھی سیکڑوں اشعار یاد تھے ، جن سے اپنی تقریر کو وہ دلپذیر بنا دیتے تھے ۔ کم و بیش پونے چھ فٹ کا قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ ، دہرا بدن ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں اور خوش پوشش ۔ جہاں بیٹھتے شمعِ محفل بن جاتے۔

شامیں دوستوں کے ساتھ، جن کی تعداد صرف کان پور میں ہی بلا مبالغہ سیکڑوں میں تھی، گذرتیں ۔ ہمیشہ یار شاعر ہی رہتے کبھی بار خاطر نہ بنتے ۔ ایک جانب دوست داریاں اور انتظامی امور کی مصروفیات تھیں اور پرانے زخم بھرنے لگے تھے اور دوسری طرف کینسر چپکے چپکے اپنا جال جسم کے اندر بچھا رہا تھا ۔ اصل مرض کا پتہ اس وقت چلا جب ڈاکٹروں کے اندازے کے مطابق "موت کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے ۔ بس اس کی تعمیل کا وقت مقرر نہیں ، لیکن چالیس پینتالیس دن تو لگیں گے ہی ۔ بیحد تکلیف دہ ہوگی یہ مدت ۔"

بستر پر اٹھنا بیٹھنا تو دور کی بات، خود سے کروٹ لینا تک مشکل ہو گیا تھا ۔ انھیں احساس رہا ہو گا کہ اب وہ بار خاطر بنتے جا رہے ہیں اور زندگی کا یہ انداز جس میں بس سانسوں کی آمد و شد باقی تھی انھیں نہ بھایا اور انھوں نے ڈیڑھ دو مہینوں کو ایک ہفتہ میں سمیٹ لیا۔

۲۷ ستمبر بروز جمعہ دن کے تین بجے دل کا پہلا دورہ پڑا اور سات بجے دوسرا ۔ لیکن پوری طرح ہوش و حواس میں تھے ۔ آنکھیں کھول کر ایک ایک چہرے کے نقوش ذہن میں محفوظ کر لینے کی کوشش کی ۔ پھر الوداعی نظروں سے سب کو دیکھا اور ان بستیوں کی تلاش میں نکل پڑے جن کا نہ تو ان کو علم تھا اور نہ زندوں میں سے کسی کو پتہ ہے ۔

اس وقت تو ایسا لگتا ہے جیسے زندگی تھم سی گئی ہو، پر یہ دنیا بڑی ظالم ہے ۔ کچھ ہی دنوں میں سب کچھ معمول کے مطابق ہو جائے گا لیکن ان کے متعلقین اور دوست احباب کو جب بھی اس باغ و بہار شخصیت کی یاد آئے گی، وہ دل مسوس کر رہ جائیں گے ۔ اپنے جاننے والوں کی یادوں میں زندہ رہنے سے زیادہ اپنی موت کے بعد کوئی کر بھی کیا سکتا ہے ۔ حلیم نے زندگی کچھ اس طرح کی تھی کہ ان کی موت نے انھیں اپنے جاننے والوں کے دلوں میں اور بھی زندہ کر دیا ہے۔

نہ وہ کالج کبھی ان کو بھولے گا جس سے وہ متعلق تھے، نہ کالج کے طلبا اور نہ اساتذہ، نہ اُن کے دوست احباب ، نہ وہ جنھوں نے ان کی زندگی میں زہر گھولا نہ وہ جنھوں نے ان کے خلاف سازشوں کے جال بنے ۔ ان کے مخالفین بھی ماضی کے آئینے میں ان کے دل پر گرد کی تہ تلاش کرتے رہیں گے اور اسے صاف و شفاف پا کر ملول ہی ہوں گے، اپنی سعیِ رائیگاں پر ۔

□□

غزلیں

میں نے کب چاہا وفاؤں کا صلہ دے مجھ کو
تجھ کو یہ حق ہے محبت کی سزا دے مجھ کو

میں تجھے بھول سکوں یہ تو مرے بس میں نہیں
تو اگر بھولنا چاہے تو بھلا دے مجھ کو

دل پریشاں ہو تو مل جاتا ہے کچھ دل کو سکوں
میرؔ کی کوئی غزل کاش سنا دے مجھ کو

زندہ ہوں میں نے مگر زیست سے کیا پایا ہے
اب تو اللہ نہ جینے کی سزا دے مجھ کو

ایسا ماحول ہے نفرت کا کہ جینا مشکل
اے خدا اب تو محبت کی فضا دے مجھ کو

میری دنیا میں سحر آئی نہیں مدت سے
رات کتنی ہے ابھی کوئی بتا دے مجھ کو

دوستو! حال کی کچھ اپنے نہیں مجھ کو خبر
میں ہوں کس حال میں یہ کوئی بتا دے مجھ کو

ہوش میں رہ کے تو اب زیست ہے دشوار پیامؔ
ہے یہ بہتر کہ وہ دیوانہ بنا دے مجھ کو

——— پیامؔ فتحپوری

۹/۲۰ نگر مہاپالیکا کالونی
فہیم آباد، کانپور

ہمارے وقت کے چہرے بدل گئے یارو
غضب ہے خون کے رشتے بدل گئے یارو

ہمارے اپنے ہوئے غیر، غیر ہیں اپنے
محبتوں کے قرینے بدل گئے یارو

نشان جن پہ لگائے تھے جیتنے کیلئے
خبر بھی ہے وہی پتّے بدل گئے یارو

بڑا غرور تھا جن کو پرانے سکوں میں
کوئی بتائے وہ سکّے بدل گئے یارو

ہمارا عکس ہی قاتل ہمیں نظر آیا
دلوں کے جب سے عقیدے بدل گئے یارو

کہاں تلاش کرو گے نقوش پا اپنے
تمام شہر کے رستے بدل گئے یارو

کرے تو فوقؔ زمانے کا اب گلہ کس سے
جب اس کے اپنے ہی سارے بدل گئے یارو

——— ڈاکٹر فوقؔ کریمی علیگ

کریمی بلڈنگ، مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

نظر افروز شیشے کا بدن ہے
مگر وہ شوخ سب پر سنگ زن ہے

اُجالا جب سے رخصت ہو گیا ہے
اندھیرا انجمن در انجمن ہے

مرے خونِ جگر کی روشنی سے
منوّر محفلِ گنگ و جمن ہے

ٹھہر جائیں یہیں پر ہوش والے
اب آگے سرحدِ دار و رسن ہے

دیارِ غیر فردوسِ نظر ہے
مگر میرا وطن، میرا وطن ہے

سنہری دھوپ میں بیٹھا ہوا ہوں
روپہلی چاندنی سایہ فگن ہے

خرد مندوں کے زیرِ غور شاید
مری دیوانگی کا بانکپن ہے

ترا کردار رشکِ گلستاں ہے
معطّر زندگی کا پیرہن ہے

چراغوں کو نہ جانے کیا ہوا ہے
بہت کم روشنیِ انجمن ہے

وفا داروں سے بدظن ہے زمانہ
عجب اے رازؔ دنیا کا چلن ہے

——— شفیع اللہ خاں رازؔ اٹاوی

ایس۔ این۔ کالج
کٹرہ پُردل خاں۔ اٹاوہ
۲۰۶۰۰۱

ڈاکٹر سید علی حیدر
شعبۂ اردو۔ سی، ایم، پی، کالج - الہ آباد یونیورسٹی
الہ آباد

پروفیسر سید محمد عقیل شخص و عکس

زندگی انسانی رشتوں کے شعور کا نام ہے ۔ یہی رشتے درحقیقت شخصیت کے تعین میں معاون و مددگار ہوا کرتے ہیں اور اس کی شناخت اور پہچان بنتے ہیں اور انھیں رشتوں کے توسط سے کسی شخصیت کو پرکھا بھی جا سکتا ہے.

رشتوں کے سلسلے میں ایک پہلو تو فطری رشتوں کا ہوتا ہے جس میں کوئی مفر نہیں اور دوسرا اختیاری رشتہ ہوتا ہے میرے اور پروفیسر سید محمد عقیل کے درمیان دونوں ہی رشتے ہیں ۔ جب سے میرے شعور نے آنکھیں کھولیں اس وقت سے عقیل صاحب کی ذہانت کے پرچے سنے اور جب میرا بچپن کچھ اور آگے بڑھا تو اس وقت وہ ایک مثالی طالب علم ہو چکے تھے ۔ مگر اس مثالی طالب علم کے پس منظر میں کوئی ایسی زندگی نہیں تھی جہاں بچے چاندی کے چمچے سے دودھ پیتے ہیں اور گھر پر ابتدائی و ثانوی درجات کی پڑھائی کے لئے مولویوں اور ٹیوٹروں کی ایک فوج ہوا کرتی ہے یا بچے بڑا چمکیلا بستہ سائیکل یا ٹرائیکل میں لٹکا کر جیب میں پاکٹ منی کے نام پر کھنکھناتے پیسے لے کر اسکول جایا کرتے ہیں اس طرح کی زندگی الہ آباد میں کوئی نئی بات نہیں تھی ۔

چوتھی دہائی میں یہاں وہ طبقہ موجود تھا جو سرکاری حکام یا جاگیردارانہ نظام کا پروردہ تھا اور جس کے بچے اس انداز سے اسکول میں پڑھا کرتے تھے جس کی ہلکی سی جھلک پریم چند نے میدان عمل میں سلیم کے کردار میں پیش کی ہے ۔ مگر عقیل صاحب کی زندگی پھولوں کی سیج نہ تھی ، بلکہ ان کا بچپن سخت اور بے رحم حالات کا شکار رہا ۔ چند مہینوں کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا ۔ اور ان کی زندگی کا آغاز دو سوتیلے بھائیوں کی کہانی سے ہوا ۔ جس طرح تاریخ اسلام میں دو چچا گزرے ہیں ایک ابولہب جس نے آنحضرتؐ کو بے حد ایذا پہونچائی اور دوسرے حضرت ابوطالب کہ جن کے سایۂ عاطفت میں کارِ رسالت کا شان دار آغاز بھی ہوا اور شعب ابی طالب میں رہ کر حضرت ابوطالب نے شمعِ رسالت کو ہر طرح کے آفات و شر سے محفوظ رکھا ـــــ عقیل صاحب کے ساتھ بھی (بلاقصد تشبیہ) دو بڑے سوتیلے بھائی تھے ۔ ایک علی اصغر رضوی صاحب جنھوں نے اس طرح کا سلوک کیا کہ دوسرے سوتیلے بھائی علی صفدر صاحب اپنی چھوٹی بہنوں اور عقیل صاحب کے ہمراہ آبائی وطن ترک کرنے پر مجبور ہوئے ۔ ایدل پور کی زمین ان لوگوں پر تنگ ہو گئی ۔ علی صفدر صاحب نے جبل پور میں حالات سے مجبور ہو کر پانچ روپے ماہانہ کی ملازمت ریلوے میں کر لی اور وہیں ریلوے ملازمین کا ایک کوارٹر ان کا مسکن بنا ۔ لیکن خدا بھلا کرے گردش شام و سحر کا اور ستم ظریفیٔ چرخ کہن کا ، کہ وقت نے ان پریشان حال کو پھر ایدل پور پہونچا دیا ۔ گزرتے وقت کے ساتھ حالات کچھ بدلے اور بہتری ضرور آئی لیکن اسی حد تک کہ کراری مڈل اسکول میں عقیل رضوی کا داخلہ علی صفدر صاحب نے کرا دیا۔

دور حاضر میں تو ہر گھر کے قریب قریب سب ہی بچے اسکول جاتے ہیں مگر بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آخری دنوں میں جب جنگ چھڑ چکی تھی یہ حالات نہ تھے اور اس دور میں بچوں کا اسکول میں پڑھنا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی ۔ عقیل رضوی کا داخلہ کراری مڈل اسکول میں ہوا لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ اکثر بڑے لوگ عمر کے ابتدائی دنوں میں پڑھتے لکھتے نہیں ہیں مثلاً ٹیگور نے خود My Boyhood Days

میں اپنی شرارتوں کی نشان دہی کی ہے۔ عقیل رضوی بھی اپنے بچپن کے دنوں میں شرارتیں کرتے اور یہ شرارتیں درختوں کی شاخوں سے لے کر ندی اور تالاب کی لہروں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان شرارتوں کا پس منظر بھی تھا۔ داستانیں سن سن کر مزاج میں طلسم کُشا کی طرح کچھ کر گزرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ قصبوں میں اس زمانے میں رُوسا داستان گو رکھا کرتے تھے، حالانکہ تیسری دہائی تک اس کا رواج تقریباً ختم ہوگیا تھا مگر طلسم ہوش ربا کی جلدیں موجود تھیں۔ پڑھنے والے پڑھتے، سُنانے والے سُناتے۔ یہ ساری تفریحات اسکول سے غائب رہنے کا سبب بنتیں اور نتیجہ میں اسکول کی چار دیواری کی پابندیوں کو عقیل رضوی کی طبع آزاد خاطر میں نہ لاسکی۔ کہاں وسیع میدان، ہرے بھرے لہلہاتے کھیت، دل کش پگڈنڈیاں، چھلکتے ہوئے تالاب اور خوش آیند باغات اور کہاں اسکول اور اس کا کمرہ، کمرے میں ٹاٹ، ماسٹر صاحب کی قمچی!

اسی زمانے میں حسنِ اتفاق سے درگا دیوی ہائی اسکول منجھن پور میں قائم ہوا اور عقیل رضوی کا نام اس میں لکھا دیا گیا۔ نفسیاتی طور پر اس زمانے میں ہائی اسکول کے گرد ہائی کا ایک ہالہ تھا۔ مڈل اسکول والا مڈیچی ہوتا تھا۔ اس لیے ہائی اسکول میں پڑھنے والے کی نفسیات بدل جاتی تھیں۔ فرنیچر بھی اچھا ہوا کرتا تھا اور اساتذہ بھی ایسے ہوا کرتے تھے جو فکری اعتبار سے زیادہ وسعتِ نظر کے حامل ہوتے۔ یہاں پہونچنے کے بعد عقیل رضوی نے واقعی پڑھنا شروع کر دیا۔ اب ایک نئے زاویے سے اگر غور کیا جائے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کا درخت پر چڑھنا، گھومنا پھرنا کوئی عیب کی بات ہے۔ دراصل لاشعوری طور پر یہ سب آیندہ زندگی کی صفات کی طرف اشارہ ہے۔ اگر صحیح سمت مل جائے تو گھومنا پھرنا نئے جہانوں کی تلاش بن جاتا ہے اور درخت پر چڑھنا بلندیوں پر جانے کے عزم و حوصلے کی نشان دہی کرنے لگتا ہے۔

سید محمد عقیل رضوی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ درگا دیوی اسکول کے قدیم نام کے بھی پرستار ہوئے اور پھر الہ آباد آکر ماڈرن اسکول میں جدید طرز کے دلدادہ ہوئے۔ آج اگر ان کی ادبی شخصیت کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے یہاں درگا دیوی سے وابستہ اساطیری اور کلاسیکی ادب سے بھی دل چسپی ملے گی اور ماڈرن یعنی جدید نظریۂ ادب کی تنقیدی چاشنی بھی۔

ماڈرن اسکول الہ آباد میں آنے کے بعد ایدل پور گاؤں کے دیئے کی ٹمٹماہٹ، شہر کی جگمگاہٹ سے مرعوب نہ ہوسکی۔ شاید بچپن ہی سے انھیں اقبال کا یہ مصرعہ از بر ہوگیا تھا ع

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ

انھوں نے کوشش کی کہ اس روشنی کا ساتھ دے سکیں۔ ماڈرن اسکول کی ایک روایت رہی کہ وہاں کے طالبِ علم نہایت شرارتی بھی ہوتے اور پڑھنے لکھنے میں بہت تیز بھی۔ ماڈرن اسکول کے اساتذہ میں That's good۔ اور very good کہنے والے جوالا پرشاد مرخوش بھی تھے۔ مہاراج بہادر سریواستوا بھی اور اُردو فارسی کے استاد مولوی نورالحسن عرف مولوی منشی اور مولوی محمد علی قاصر (شاگرد نیاز الہ آبادی) تھے۔ یہ تمام اساتذہ منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ اور عموماً جو طلبا ہائی اسکول میں فرسٹ ڈویژن آتے تھے انھیں ایسے ہی ٹیوٹر ملا کرتے تھے۔ مگر عقیل رضوی کو اس طرح کی کوئی سہولت نہیں ملی۔ اس کے باوجود انھوں نے ہائی اسکول فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ماڈرن اسکول میں پہلی پوزیشن پائی اور جب کرسچین کالج میں انٹر میں داخلہ لیا تو وظیفہ بھی ملا۔

یہ پس منظر اس لیے بیان کیا گیا تاکہ ان عوامل کی نشان دہی کی جاسکے جنھوں نے عقیل رضوی کی شخصیت کی تعمیر میں حصہ لیا۔ دراصل چھوٹے چھوٹے نقطوں سے تصویر بنتی ہے۔ لوگ ان نقطوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اگر منشی جوالا پرشاد جیسا استاد عقیل کو نہ ملا ہوتا تو انھیں تاریخ سے دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی۔ اور اگر مولوی نورالحسن نہ ملے ہوتے تو انھیں شعر و شاعری سے دل چسپی نہ ہو پاتی۔ اس لیے کہ انھوں نے دریہ نہم میں ہی پہلی بار ترنم سے اشعار پڑھے تھے ع

فسادِ جنگ میں صلح کی بہار آئی

یہ ۱۹۴۵ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہیں سے ان کا مصطفےٰ زیدی کا ساتھ ہوا۔ مگر ماڈرن اسکول میں مصطفےٰ زیدی ان سے ایک سال آگے تھے، یہاں وہ عقیل رضوی کے ہم جماعت ہوئے۔ اس لیے کہ وہ ایک سال

انجینئرنگ کالج میں خراب کرکے تب ادھر آئے۔ کرسچین کالج میں دونوں کا ساتھ ہوا۔ عقیل رضوی کے پاس جو کچھ ہے وہ بغیر پیسا کھی کے ہے۔ انٹر بھی انھوں نے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شفیق اور قابل اساتذہ کی نظریں ان پر پڑنے لگیں۔ خاص کر مولانا انوار الحق نے ان کے ذوق ادب کو مہمیز کیا اور ان کے ادبی کارنامے منظوم و منثور شکلوں میں سامنے آنے لگے۔ اور عقیل یونیورسٹی مقامی سطح کے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ ان کا تخلص شبنم غبار رضوی تھا۔

یونیورسٹی آئے تو ڈاکٹر اعجاز حسین ان سے متعارف ہی تھے ڈاکٹر مسیح الزماں بھی ان کے بے حد قدرداں اور مدّاح ہوئے اور مسیح صاحب ہی کی بھرپور پذیرائی کے نتیجے میں دور طالب علمی میں ان کے مضامین کا مجموعہ "نئی فکریں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ کسی طالب علم کا صاحبِ کتاب ہونا بڑی بات ہے۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۲ء تک کا ہندستان بہت سے عناصر سے مرکب ہے۔ انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے والا یہ ملک مختلف سیاسی دھاروں کے تصادم سے واقعات و حادثات کو جنم دیتا ہوا آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ترقی پسند تحریک، کھدّر کا کرتا، ڈھیلی مہری کا پاجامہ، کالی کمانی کا موٹا چشمہ اور مستعد نعروں کی گونج اس دور کے ہر نوجوان کا مقدر تھا۔ صرف ظرف کی بات تھی۔ بہت سارے لوگوں کے لیے ترقی پسندی ایک طرح کی سیڑھی تھی۔ اور وہ لوگ یہ نعرے لگا کے ریڈیو، فوج اور بیوروکریسی کے اعلا عہدوں تک پہنچے۔ عقیل رضوی کو بھی پی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں بٹھایا جا رہا تھا۔ لیکن انھوں نے اُردو سے ایم۔ اے کیا۔ اس لیے کہ اُردو ہی کی وجہ سے انھیں سرسی وائی چنتامنی گولڈ میڈل ملا تھا۔ بی۔ اے اردو میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر، اور ایم۔ اے میں پوری فیکلٹی میں دوسری پوزیشن لانے پر بھی میڈل ملا۔

ایم۔ اے کرنے کے بعد دنیاوی اعتبار سے ان کا ایک رشتہ اور ہوا جسے شادی کہا جاتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ان کا رشتہ درگا دیوی اسکول ہی میں علم و ادب سے طے ہو گیا تھا۔ یہ رشتہ بڑا مضبوط تھا۔ اور تدریس میں آنے کے بعد تو یہ رشتہ اٹوٹ ہو گیا۔ وہ رشتہ آج بھی برقرار ہے اور یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد بھی برقرار رہے گا۔

عقیل رضوی کے علمی و ادبی اکتسابات کی داستان طویل ہے۔ اس کا محاکمہ کرنے کے لیے "سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے" انھوں نے غزلیں اور نظمیں لکھیں، سفرنامے لکھے۔ انگریزی سے ترجمے کیے لیکن ان کی پہچان دراصل تنقید سے ہے، جو ان کے علم کی وسعت اور وسیع مطالعے کی غماز ہی نہیں بلکہ شعور نقد و حسن اسلوب کا عمدہ نمونہ بھی ہے جس میں درگا دیوی کا رنگ بھی ہے اور ماڈرن اسکول کی آمیزش بھی۔ کلاسیکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج ان کا سب سے بڑا وصف ہے۔ تنقید کی دنیا میں ان کا کون سا نمبر ہے، اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تنقید کی دنیا میں ناقد کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے، وہ اپنے طریقہ کار اور اپنے نظریے سے کمیٹڈ ہوتا ہے۔ صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس نے اپنے نظریے سے کہاں تک انصاف کیا ہے۔ عقیل رضوی نے انصاف کیا ہے انھوں نے اپنے کو اپنے نظریات کے شیش محل میں اسیر نہیں کیا وہ ان چند لوگوں میں ہیں جو فارسی بھی جانتے ہیں انگریزی ادب پر بھی نظر رکھتے ہیں اور تاریخ سے بھی باخبر ہیں اور ان سب سے بڑھ کر ہماری روایات، تہذیب، اساطیر اور سماج کی لسانیات سے بھی آگاہ ہیں اور اسی لیے ان کا رشتہ اردو ادب سے استوار رہا۔ اسی لیے انھوں نے ادب کے ذریعہ زندگی کے شعور اور زندگی کے ذریعہ ادب کی تفہیم کی۔

اردو دنیا میں، پروفیسر سید محمد عقیل نے شاعری بھی کی، تحقیقی مقالہ بھی شائع کیا، جس پر الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ انگریزی سے ترجمے بھی شائع ہوئے، 'لندن اولندن' کے نام سے سفرنامہ بھی لکھا۔ لیکن ان کا اصل میدان تنقید ہے۔ تنقیدی نظریات در عملی تنقید پر ان کی یکے بعد دیگرے چار کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ عملی تنقید سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ ان کا فکری شعور ترقی پسندی کے سائے میں ارتقا پذیر ہوا۔ ان کے کرم فرما استاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین اپنے زمانے میں ترقی پسندوں کے سربراہ رہے۔ سید محمد عقیل کے ذہن و شعور کی ابتدائی پرورش ان کے زیر اثر

ہوئی۔ بعد میں پروفیسر سید احتشام حسین سے وہ بے حد متاثر ہوئے نتیجے میں ان کو ترقی پسند تحریک اور ادب دونوں سے ایسی دل چسپی ہوئی کہ وہ ترقی پسند ناقدوں کے اہم ستون میں شمار ہونے لگے۔ انھوں نے انگریزی ادب خاص کر مغربی تنقید کا گہرا مطالعہ کیا۔ مغربی ناقدوں میں لوکاچ اور آئی اے رچرڈس ان کے محبوب نقاد ہیں۔

اُردو کے نئے ترقی پسند تنقید نگاروں میں پروفیسر سید محمد عقیل کی اہمیت اپنی جگہ پر تسلیم شدہ ہے۔ وہ مارکسی نظریۂ فکر کے ناقدوں میں سے ہیں اور اس کو پورے کمٹ منٹ کے ساتھ برت رہے ہیں اور جدید تنقیدی رویے سے کھُل کر اختلاف کرنے میں گریز نہیں کرتے۔ ان کی مغربی ادب سے گہری واقفیت اور تاریخی بصیرت نے ان کے مارکسی نقطۂ نظر کو بروئے کار لانے میں بڑا سہارے کا کام کیا۔ ادبی محاسبے میں ان کے استدلال اور اس کی تفہیم کسی بھی ادب پارے کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

تنقید کی دنیا میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعۂ نئی لکیریں، تو ۱۹۵۲ء ہی میں منظرِ عام پر آگیا تھا مگر ان کے تنقیدی رویے کا صحیح اظہار پہلی بار ۱۹۷۶ء میں ان کی تنقیدی کتاب "تنقید اور عصری آگہی" سے ہوا جس میں پروفیسر محمد عقیل نے اپنا انتساب "تنقید کے چار یار" کے نام سے کیا ہے اور ان چار یاروں میں چوتھا نام خود محمد عقیل کا ہے جو ان کی تنقیدی بصیرت ہی نہیں بلکہ بہ حیثیت ناقد ان کی اہمیت کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اس کے بعد ان کی دوسری تنقیدی کتابیں سماجی تنقید اور تنقیدی عمل۔ انتقادیات۔ اردو غزل۔ تنقید نگاری کی دُنیا میں منظرِ عام پر آتی رہیں، جو اس بات کی مظہر ہیں کہ پروفیسر سید محمد عقیل ادبی محاسبوں میں کسی جانب داری کے قائل نہیں۔ وہ اپنے تیکھے انداز میں تلاش و جستجو کی عکس ریز کرنوں سے اپنا منصب ادا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں بلا کسی عبارت آرائی کے ادبی صداقتوں کی تلاش ہوتی ہے۔

پروفیسر سید محمد عقیل کا تحقیقی مقالہ "اُردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں" ۱۹۶۵ء میں پہلی بار شائع ہوا جو تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقیدی بصیرت کا ایک گراں بہا سرمایہ ہے اور اُردو مثنوی کے محاسبہ پر پروفیسر گیان چند، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر نجم الہدیٰ کے گراں بہا سرمایے سے پہلے منظرِ عام پر آنے والا اہم کارنامہ ہے۔ اس میں قریب قریب اردو کی تمام مثنویوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ تنقیدی تجزیہ بھی ہے۔

پروفیسر سید محمد عقیل ابھی تنقید نگاری کی دُنیا میں دورِ تعمیر سے گزر رہے ہیں اور اردو ادب کو ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

□□

مولانا برکت اللہ بھوپالی

صـ۱۳ کا بقیہ

انھوں نے آخری رسوم میں شرکت کرنے والوں کے نام بھی بتائے تھے جن میں مولوی رحمت علی، ڈاکٹر اورنگ شاہ، سردار پورن سنگھ، ڈاکٹر سید حسین، مسٹر گودارام جی، سردار نارائن سنگھ گرودواروں کے گرنتھی صاحبان اور بڑی تعداد میں ہندو مسلمان شامل تھے۔

مولانا برکت اللہ کے لیے جو تابوت بنایا گیا تھا، اس میں اُس وقت ڈیڑھ ہزار روپے کی لاگت آئی تھی۔ اس طرح اس شہید آزادی کو، جس نے اپنی اڑسٹھ سالہ زندگی میں سے چوالیس سال جلاوطنی کے عالم میں ہندستان سے باہر رہ کر جدوجہد کرتے ہوئے گزارے اور جو اپنی تحریک آزادی وطن کی خاطر لندن، لیورپول، برلن، نیویارک، ٹوکیو، ترکی، ہانگ کانگ، شنگھائی، بنکاک، سنگاپور، کولمبو، پیرس، واشنگٹن، اسٹوریہ، وانگ کودر، زیوریخ، ویانا، بخارسٹ، صوفیہ، قسطنطنیہ، کابل، ہرات، اسکو، لوزان، جنیوا اور بروسلز وغیرہ ملکوں کی خاک چھانتے ہوئے سان فرانسسکو میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوگیا، ہم اپنا خراجِ عقیدت بصد خلوص و احترام پیش کرتے ہیں۔

□□

بزمِ غزل

جلوہ گر آج ہے وہ مہرِ منوّر کی طرح
بخت اپنا بھی چمکتا ہے سکندر کی طرح

اس کی رفتار ہے بس موجۂ کوثر کی طرح
گفتگو میں ہے کھنک شیشہ و ساغر کی طرح

کس کو یارائے سخن ہے اسے ہم بھی دیکھیں
وہ مخاطب ہے مگر داورِ محشر کی طرح

کیا خبر لوگ کسے اپنا خدا کہہ دیں گے
لاکھ بُت ہم نے تراشے تو ہیں آزر کی طرح

کس پہ اس دورِ پُر آشوب میں تکیہ کیجے
راہزن بھی تو نظر آتے ہیں رہبر کی طرح

منزلِ فقر و فنا کیا ہے یہ ہم سے پوچھو
زندگی ہم نے گزاری ہے قلندر کی طرح

کتنے طوفان ہیں پنہاں کوئی دیکھے تو حباب
موجزن ہے دلِ شاعر بھی سمندر کی طرح

حباب ہاشمی
۳۸۸/۱۳۔ ای۔ کریلی،
گرو تیغ بہادر نگر
الہ آباد

آس باقی رہے انکار میں اقرار چلے
چُپ نہ رہ سلسلۂ شوخیٔ گفتار چلے

بربطِ عشق سے مرے پھر کوئی نغمہ پھوٹے
جس پہ بجتی ہوئی پازیب کی جھنکار چلے

وقت کا سحر تھا وہ لوگ خطاوار نہ تھے
سارے احباب مرے صورتِ اغیار چلے

دیکھنا ہے ترے آدابِ حیا کیا ہوں گے
چاند چھُپ کر جو تہِ ابرِ گہربار چلے

ذہن میں جب بھی تری یاد کا سایہ اُبھرا
برق تڑپی وہیں کوندے سرِ اشجار چلے

پھر وہ آوازِ سرِ شام بلاتی ہے مجھے
ماہ و انجم یہیں ٹھہرو کہ ہم اس پار چلے

زین الدین حیدر
مولانا محمد علی میموریل اسکول کیمپس
بیکن گنج
کان پور

غم کا دریا مجھے تنہا نہیں رہنے دیتا
یہ وہ دریا ہے جو صحرا نہیں رہنے دیتا

غم سے عرفان حقیقت کا ہوا کرتا ہے
درمیاں کوئی بھی پردا نہیں رہنے دیتا

ہر گھڑی کوئی تصوّر، کوئی غم، کوئی خیال
عشق انسان کو تنہا نہیں رہنے دیتا

خشک آنسو ہوئے پلکوں پہ گہر تک نہ تھے
سُود تو سُود ہے سودا نہیں رہنے دیتا

جو دکھاتا تھا کبھی عارض و گیسو کی بہار
اب مرے سامنے چہرا نہیں رہنے دیتا

عشق نے توڑا ہے کچھ ایسے حسینوں کا غرور
حُسن والوں کو بھی ویسا نہیں رہنے دیتا

سچ تو یہ ہے کہ محبت کے چراغوں کے طفیل
میرا سایہ مجھے تنہا نہیں رہنے دیتا

پیار میں کچھ نہیں ہستی کی حقیقت اے متین
عشق انسان کو اپنا نہیں رہنے دیتا

وحید متین
کوٹھی للو میاں بی بی
فتح پور



[illegible]

[illegible]

[illegible] کے پسماندگان [illegible]

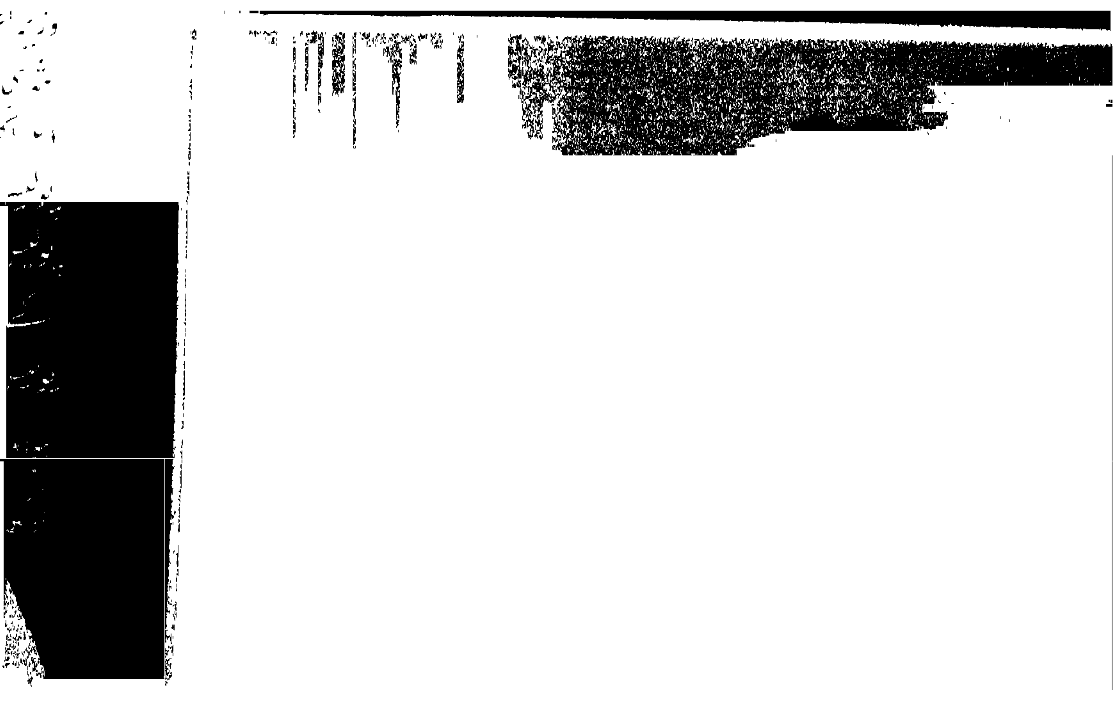
[illegible]

دیتے ہوئے ۔



اتر پردیش شری کلیان سنگھ ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو
مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ

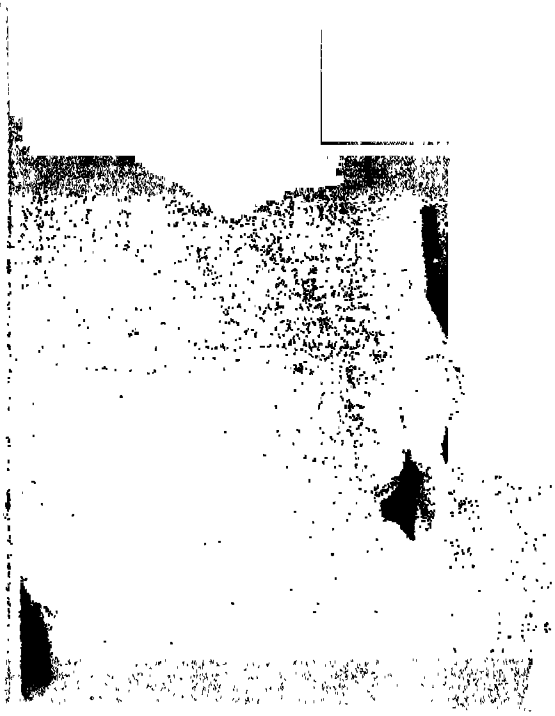
وزیر اعلیٰ اتر پردیش
شری کلیان
۲۸ اکتوبر ۱۹۹۱



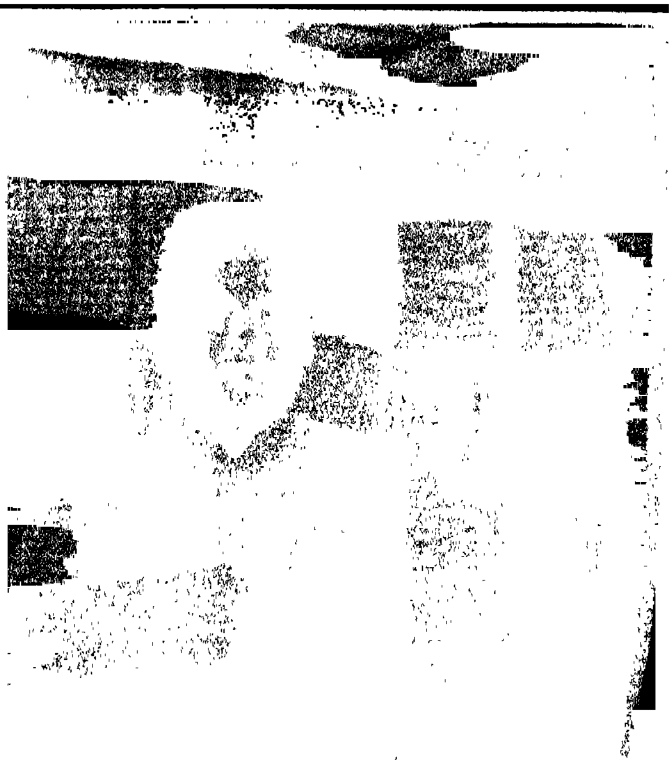


...ں میں رام کار سیوا سمیتی دیوس جلسہ کے موقع پر عوام کو خطاب کرتے ہوئے
دیکھے جا سکتے ہیں ۔

سری ...
... ہو ...
ایمی ...
کالن واس مار گے
ہندستان میں جب ...
سفارت خانہ کے
فرسٹ سکریٹری
ڈاکٹر کلاز جو ...
سے گفتگو
کرتے
ہوئے



... لکھنؤ میں ... نومبر ۱۹۹۱ء کو وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ کو
... شری پرکاش سنگھ ... کی امداد کے لیے چیک دیتے ہوئے



افسانہ

رام لعل
شانتی نکیتن۔ ڈی ۲۲۹۰
اندرا نگر۔ لکھنؤ

آنکھ میچی تو فاصلہ نہ رہا

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے سے ایک سال پہلے ۲۲ر نومبر کا دن میرے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس روز مجھے ہندستان چھوڑ کر کینیڈا چلے جانا تھا۔ سمندری جہاز سے سفر کرنے کے لئے میری خاطر ٹکٹ خریدا جاچکا تھا۔ جو ہمارے ایک افسر کے پاس تھا وہ پندرہ اپرنٹسوں کو وہاں مزید ٹریننگ کے لیے ساتھ لے کر جارہا تھا لیکن عین وقت پر مجھے معلوم ہوا کہ میرے سفر پر جانے سے متعلق سارے کاغذات گم ہوچکے ہیں۔ گزشتہ شب کو ہم نے فارن جانے کی خوشی میں ایک جشن منایا تھا۔ ہمارے عیسائی افسر کی ایک کزن مشہور ایکٹریس رمولا تھی جو کچھ عرصہ تک لاہور میں بننے والی فلموں میں کام کرتی رہی تھی، اب بمبئی میں تھی۔ اسی نے اپنے فلیٹ پر ہمارے افسر اور ہم لوگوں کو ایک الوداعی دعوت دی تھی۔ اپنے زمانے کی ایک مشہور اداکارہ کو قریب سے دیکھنے کی خوشی میں ہم سب باؤلے ہورہے تھے۔ وہاں جانے سے پہلے ایک ہوٹل میں ہم لوگوں نے کچھ شور شرابا بھی کرلیا تھا۔ اسی دوران میری پاکٹ سے میرے کاغذات کسی نے غائب کردیئے تھے۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

میرے مہربان افسر نے مجھے ہوائی جہاز سے لاہور کے لیے واپسی کا ٹکٹ دلاکر کہا تھا:

"اگر تم دو دن کے اندر ڈپلی کیٹ کاغذات تیار کرا سکو تو بمبئی آکر کسی بھی میرین لائن سے آجانا۔ تمھارا نام کینیڈا کی ورک شاپ میں پندرہ دن تک ویٹنگ لسٹ میں لکھا رہے گا۔"

میں نے ہمت ہار دی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اپنے ملک سے باہر جانے کا سنہرا موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ایرہوسٹس نے دوبارہ آکر کھانے اور چائے کے لیے پوچھا تھا۔ لیکن میں نے کچھ بھی لینے سے انکار کردیا تھا۔ ایرہوسٹس بہت ہی ہمدرد قسم کی لڑکی تھی۔ میری سیٹ اس کے کیبن کے قریب تھی جس میں وہ اور اس کی ایک اور ساتھی نے کھانے پینے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ان کے بیٹھنے کے لیے دو سیٹیں میرے سامنے لگی ہوئی تھیں۔

جس ایرہوسٹس نے بڑی ہمدردی سے میری مایوسی کے اسباب دریافت کیے تھے اس کا نام شیلا لارسن تھا۔ وہ بیحد خوبصورت اور اسمارٹ لڑکی تھی، جیسے کہ ایرہوسٹسوں کو ہونا چاہیے۔ بڑے فراٹے سے ہندستانی کانونٹ کے تلفظ کے ساتھ انگریزی بولتی تھی۔ جبکہ میں مغربی پنجاب کے ایک پسماندہ علاقے کا سیدھا سادا میٹرک پاس ہیڈ ولڑ کا تھا۔ تین چار سال تک لاہور میں رہ کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنا سیکھ گیا تھا۔ غلامی کے دور میں انگریزی بولنا باعث وقار سمجھا جاتا تھا۔

دو گھنٹوں کے سفر میں شیلا لارسن نے میرے اندر کے اضمحلال کو اس حد تک دور کردیا تھا کہ میں نے اس کے ساتھ چائے بھی پی تھی۔ اور دو سینڈوچ بھی کھالیے تھے۔ وہ نیومرولوجی کا کچھ علم رکھتی تھی۔ اس نے میری پیدائش کی تاریخوں اور ورک شاپ میں تقرری کے کچھ ہندسے جوڑ کر مجھے بتایا تھا:—

"تم فارن ضرور جاؤ گے۔"

اس نے اپنے بھی ہندسے جوڑ کر کہا تھا۔ میرے لیے

بھی مارک جانا یقینی معلوم ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی ۔ فی الحال تو میں ایر انڈیا کی گھریلو پروازوں میں رہتی ہوں ۔ اگر اس سردسس کی وجہ سے نہ جا سکی تو کوئی دوسرا بہانہ ضرور بن جائے گا۔

لاہور ہوائی اڈے پر اس نے مجھے گڈ بائی کہتے ہوئے ایک بار پھر بڑی دل نشین مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا: "ہم پھر ملیں گے ۔! مجھ پر یقین کرو۔"

کوئی بھی دیہاتی لڑکا جس نے ابھی دنیا نہ دیکھی ہو کسی لڑکی سے اپنے لیے ہمدردی کے دو بول سن کر دیوانگی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور لڑکی بھی ایسی ویسی نہیں، بے حد خوبصورت اور اعلا تعلیم یافتہ جو بالکل گوری میم جیسی لگتی ہو ۔ میں ایک مدت تک اس سے دوبارہ ملنے کے تصورات میں کھویا رہا ۔ اگرچہ یہ بالکل ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

اپنی زندگی کی ہماہمی میں کھو کر میں رفتہ رفتہ اسے بالکل بھول گیا۔ اگرچہ اس کی کہی ہوئی یہ بات بالکل سچ ثابت ہوئی تھی ۔ میں سات سمندر پار پہونچ ہی گیا تھا۔ گھر سے بھاگ کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ بمبئی سے ایک سمندری جہاز میں خرم پہونچا۔ وہاں سے بس کے ذریعہ تہران گیا، پھر ٹرین سے تبریز ۔ وہاں سے پھر ایک بس لی اور ترکی کی سرحد پر بزرگان جا کر اتر گیا ۔ میری منزل جرمنی تھی ۔ روم کے ایک شہر عرض سے پھر ٹرین میں سوار ہوا اور استنبول پہونچ گیا۔ وہاں سے ایک انٹرنیشنل ٹرین میونخ جا رہی تھی جو بلغاریہ، یوگوسلاویہ اور آسٹریا ہوتی ہوئی جرمنی میں داخل ہوئی ۔ گھر سے پانچ سو ڈالر ایکسچینج کرا کے چلا تھا۔ آدھے خرچ ہو چکے تھے ۔

میونخ میں میں نے شراب خانوں میں جا کر اخبار بیچے ۔ ایک دن پب میں بیٹھے ہوئے ایک بھلے آدمی نے مجھے اسٹوڈنٹ سمجھ کر میرے سارے اخبار خرید لیے ۔ وہاں عام طور پر فیس جمع کرنے کے لیے طلبا یہی کام کرتے تھے ۔ ایک روز میں قسمت آزمائی کے لیے ڈنمارک جا پہونچا۔ کوپن ہیگن میں کام مل سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے مجھے جرمنی لوٹ کر جانا پڑا ۔ وہاں سے جاب ویزا لے کر آنا ضروری تھا۔ بہرحال مجھے فریج بنانے والی ایک فیکٹری میں فریجوں کے دروازے فٹ کرنے کا کام مل گیا۔ ہر روز چالیس دروازے فٹ کرنے پڑتے تھے اور اس کے لیے مجھے اٹھارہ کرون فی گھنٹہ اجرت مل جاتی تھی ۔ اتنی آمدنی یقینی ہو جانے کے بعد میں نے ایک کمرے کا مکان کرائے پر لے لیا۔ ایک سال تک اتنا روپیہ بچالیا کہ میں تین کمرے والا ایک فلیٹ خرید نے کے قابل ہو گیا۔ اس میں سے ایک کمرہ کرائے پر بھی اٹھا دیا۔

جب فریج بنانے والی فیکٹری میں مزدوروں کی چھٹی کی گئی تو میں نے بے کاری سے بچنے کے لیے بسکٹ بنانے والی ایک فیکٹری میں بسکٹ پیک کرنے کی جاب لے لی ۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر فریج بنانے والی فیکٹری میں بلا لیا گیا۔

دو سال بعد میں نے کاریں بنانے والی ایک فیکٹری میں بطور اسپاٹ ویلڈر کام کیا۔ یہ کام پہلے سے سیکھا ہوا نہیں تھا لیکن میرے اندر ہر نیا کام جلدی سے سیکھ لینے کی خداداد صلاحیت موجود تھی ۔ تین سال کے بعد یہ فیکٹری بند کر دی گئی تو میں نے کچھ عرصہ بیکار رہ کر اپنی ایک چھوٹی سی دکان پر ودنٹرنگ فرومٹنگ کھول لی جہاں میں بیئر بیچا کرتا تھا۔ دو سال بعد میں نے ایک اسٹور کھول لیا۔ اس کے لیے میں نے ایک چھوٹی سی عمارت خرید لی ۔ اوپر رہائش اختیار کی، نیچے چاکلیٹ بیچنے کے لیے دو دکانیں اور کھول لیں ۔ وہ جو کہتے ہیں کہ خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے، بالکل صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ میرے پاس دولت پانی کی طرح بہتی چلی آ رہی تھی ۔ جس کام کو ہاتھ لگاتا تھا وہ سونا بن جاتی تھی ۔ اب میرے پاس کوپن ہیگن میں دو بڑے ہوٹل تھے ۔ ہر مہینے لاکھوں کرونر کی آمدنی ہو جاتی تھی ۔ وہاں کے گنے چنے متمول ترین ہندستانی نژاد لوگوں میں میرا شمار ہوتا تھا۔

میں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس قدر آسودگی کے تو کبھی خواب بھی نہیں دیکھے تھے ۔ میں نے وہیں رہ کر دو شادیاں کیں ۔ دونوں بیویاں وہیں کی تھیں ۔ خوبصورت اور جان چھڑکنے والی ۔ پہلی بیوی سے اس لیے طلاق ہو گئی تھی کہ ہیلگا ایک لمبے عرصے تک میرے ساتھ رہتے رہتے اکتا گئی تھی۔ میں نے اس کی خواہش کی قدر کی تھی ۔ طلاق ہو جانے کے بعد بھی وہ میری اچھی دوست ثابت ہوئی۔ ہیلگا ایک لمبے عرصے کے بعد اپنے دوسرے شوہر سے

طلاق لے کر واپس آئی تو میں نے اسے اپنے بزنس میں سکریٹری کی جاب دے دی تھی۔ وہ ابھی تک کام کر رہی ہے۔

میری دوسری بیوی انگرِیڈ میرے ایک پاکستانی دوست کی مطلقہ تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ اس کی اس لیے نہیں نبھ سکی کہ وہ اپنے بچوں کو لے کر راولپنڈی لوٹ جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے وطن سے باہر رہتے رہتے اُداس ہو گیا تھا۔ ہوم سِک! لیکن انگرِیڈ اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہو سکی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ آخر ایک روز ہماری شادی ہو گئی۔ لیکن اس نے ایک شرط رکھی تھی کہ میں کبھی ہندوستان واپس نہیں جاؤں گا اور ہم بچے بھی پیدا نہیں کریں گے۔ وہ پہلے ہی دو بچوں سے محروم ہو چکی تھی۔ اب اس کے بعد کوئی اور صدمہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے مجھے کسی دوسرے ماں باپ کا بچہ گود لینے کی بھی کبھی اجازت نہیں دی۔ میں سمجھتا تھا کہ دوسرے والدین کی اولاد کے بارے میں ہم زیادہ جذباتی نہیں ہو سکیں گے۔ اس کی پرورش کریں گے، پڑھائیں گے لکھائیں گے۔ اور جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے گا تو اسے آزاد چھوڑ دیں گے۔ وہ چاہے گا تو اسے بزنس میں پارٹنر بنا لیں گے، ورنہ وہ جو بھی پیشہ اختیار کرنا چاہے گا اس کے لیے ہم رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ لیکن چونکہ انگرِیڈ نے شروع ہی سے گود لینے کی تجویز مسترد کر دی تھی اس لیے میرے دل میں ایک گانٹھ سی پڑ گئی تھی۔ اگرچہ میں نے اپنے اندر کے دکھ کا اظہار اس کے سامنے کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن میں دل ہی دل میں ایک بچے کے لیے ترس رہا تھا اور انگرِیڈ کو چھوڑنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

اب میری عمر ستر سے تجاوز کر گئی تھی۔ دنیا کے کئی ملکوں میں گھوم چکا تھا۔ گھوم گھام کر پھر ڈنمارک لوٹ آیا تھا۔ کیونکہ میرا مرکز وہی تھا۔ انگرِیڈ بھی اکثر میرے ساتھ رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اکیلی بھی چلی جاتی تھی، اسے کئی ملک پسند تھے۔ لیکن وہ کسی بھی دوسرے ملک سے محبت کرتے ہوئے ڈرتی تھی۔ کہتی تھی اس میں تمہیں چھوڑنے کا خطرہ پیش آ سکتا ہے جو میں اٹھانا نہیں چاہتی۔ اُسے میرا ہندوستان جانا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنے سابق وطن کی طرف بار بار جانے سے پُرانی محبت جاگ اُٹھنے کا امکان ہے۔ اس سلسلے میں وہ پہلے ہی اپنے پاکستانی شوہر کا تجربہ کر چکی تھی۔

میں بیس برس کی عمر میں ہندوستان سے چلا آیا تھا۔ تب ملک تقسیم نہیں ہوا تھا۔ کئی برس کے بعد ہوا۔ لاکھوں لوگ ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک چلے گئے۔ مجھے اپنے والدین کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں گئے۔ آزادی سے پہلے ہم لوگ پنڈ دادن خان میں رہتے تھے۔ میں جب بھی ہندوستان گیا انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اخبارات میں اشتہار بھی دیئے مگر کوئی سُراغ نہیں ملا۔ پنڈ دادن خان چھوٹی سی بستی تھی۔ وہاں ہندوؤں کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔ جتنے لوگ تھے، ان سے میں اُس وقت بھی واقف نہیں تھا کیونکہ میں بہت چھوٹا تھا۔ اب تو ان کے بارے میں جاننا ناممکن تھا۔ میرے چار بھائی بہن تھے۔ ان کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اب کہاں ہوں گے۔!!

میں ایک ایسا بدقسمت شخص ہوں جو نہ صرف اپنے خاندان سے بلکہ اپنے دیس سے بھی کٹ چکا ہے۔ بظاہر وہ بے حد کامیاب اور آسودہ ہے لیکن وہ ہر وقت اندر ہی اندر خود کو ٹوٹتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی بیوی کے ساتھ نباہ کر رہا ہے جسے وہ اپنے خیالات میں شریک کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنے کے ارادے ہی سے اس کا خوف بڑھ جاتا ہے کہ اس سے دور ہو جائے گی۔

ہندوستان کی حکومت نے اپنی اقتصادی مشکلات پر قابو پانے کے لیے غیر ملکوں میں بسے ہندوستانی نژاد لوگوں کو اپنے سابق وطن میں سرمایہ لگانے کی دعوت دی تھی۔ میں اسی بہانے سے اپنے ملک کی سیاحت پر چلا گیا تھا۔ مجھے ہریانہ یا اترپردیش میں ایک دو کروڑ روپے لگا کر کولڈ ڈرنکس کی ایک فیکٹری لگانے کا صنعتی لائسنس مل سکتا تھا۔ لیکن ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

واپسی پر اسی جہاز میں میرے ڈو ہمسفر سویڈن کے میاں بیوی تھے۔ ان کی اور میری سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ڈیوڈ لیف ایک ریٹائرڈ

ڈپلومیٹ تھا۔ ہندستان سمیت کئی ایشیائی ملکوں میں سفارتی عہدوں پر رہ چکا تھا۔ اس کی بیوی ہندستانی پارسی تھی جو عرصہ دراز سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اسی کی خواہش پر وہ اسے بمبئی اور پونے لے گیا تھا اسے اس کا سابق وطن دکھانے کے لیے۔ بمبئی اس کی جائے پیدائش تھی اور پونے کے ایک کانونٹ میں اس نے تعلیم پائی تھی۔ لیکن اب اس کے ماضی کے وہ سارے نقوش دھندلے پڑ گئے تھے یا بالکل معدوم ہو چکے تھے، جن کے ساتھ وہ اب بھی ایک جذباتی رشتہ محسوس کرتی تھی۔

"بمبئی کا نقشہ تو بالکل بدل گیا ہے۔ پرانی عمارتوں کی جگہ ملٹی اسٹوریڈ بلڈنگیں ابھر آئی ہیں۔ ٹریفک بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اوہ گاڈ! پونے میں ایک بھی پرانی ٹیچر نہیں ملی۔ میرے ساتھ کی پڑھی ہوئی کوئی لڑکی تک نہیں۔ سب کی سب کھپ گئیں ـــــ دنیا ہی بدل گئی ہے!"

وہ خود اب اسّی کے پیٹے میں تھی۔ اسے کون زندہ ملتا؟ لیکن وہ بہت اداس ہو کر لوٹ رہی تھی۔ ہمیں ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ دونوں میاں بیوی کا رویہ بے حد دوستانہ تھا۔ خصوصاً سیاسی مدبر لیف کی بیوی کا، جو اپنی ڈھلی ہوئی عمر میں بھی بے حد خوش شکل تھی۔ بڑھاپے کی بھی اپنی ایک دل کشی ہوتی ہے لیکن اس کا جسم پھول گیا تھا۔ اس کے دونوں گھٹنے آرتھرائیٹس کی وجہ سے اسے بہت تکلیف دے رہے تھے۔ اس نے ٹانگوں پر بھاری اونی پٹیاں لپیٹ رکھی تھیں۔ اور اسی درد کی وجہ سے وہ بار بار کراہ اٹھتی تھی۔

"یہ میرا آخری سفر ہے۔ اب میں انڈیا کبھی نہیں آسکوں گی۔ ہائے! کتنا پیارا ملک تھا میرا۔ بہت یاد آتا تھا۔"

ایک ایئر ہوسٹس نے اسے تکیہ اور کمبل لاکر دیا تو مسز لیف نے اسے کچھ دیر کے لیے روک لیا ـــ بولی:

"میں بھی کبھی ایئر ہوسٹس تھی۔ تمھیں اپنے فوٹو دکھاؤں؟ یہ پچاس سال پہلے کے ہیں۔"

اس نے اپنے پرس میں سے پولی تھین میں لپٹے ہوئے دو فوٹو نکال کر اسے دکھائے، جن میں وہ ایئر انڈیا کے جہاز کے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے بھی ذرا سر اٹھا کر اس کے فوٹو دیکھنا چاہے تو اس نے ایک خاص نسوانی فخر کے ساتھ دونوں فوٹو میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ـــ

"لو، تم بھی دیکھو۔ میں تب کیسی تھی اور اب۔؟" وہ اپنے فربہ جسم کو دیکھ کر زور سے ہنس پڑی۔

وہ وہی تھی! ـــ نصف صدی پہلے کی شیلا لارسن ـــ!! جو مجھے بمبئی سے لاہور تک کی پرواز کے دوران ملی تھی اور اس نے مجھے وداع کرتے ہوئے کہا تھا ـــ "ہم پھر ملیں گے، مجھ پر یقین کرو۔"

میں اس قسم کے غیر متوقع واقعات پر کم ہی یقین رکھتا ہوں۔ اگرچہ میری تمام تر خوش حالی اتفاقات پر ہی منحصر رہی ہے۔ لیکن شیلا لارسن سے اس طرح اچانک مل جانے کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر کتنی دیر تک مسکراتا رہا۔ وہ بھی اپنی شخصیت کی تمام تر خوش گواری اپنی آنکھوں میں بھرے ہوئے مسکراتی رہی۔ اس کے سراپا میں اس کی بھرپور جوانی کے گم شدہ نقوش لمحہ بہ لمحہ اجاگر ہوتے چلے گئے۔ میں بہت خوش تھا لیکن وہ مجھے ابھی تک نہیں پہچان سکی تھی۔ شاید میں بھی بہت زیادہ بدل چکا تھا۔ ایک گنجے موٹے اور بوڑھے آدمی کو دیکھ کر کون سوچ سکتا تھا کہ وہ جوانی میں بہت ہی دل کش رہا ہوگا۔ پچاس برس پہلے کے ایک دیہاتی نوعمر لڑکے کی آنکھوں پر جو موٹے شیشوں والا چشمہ لگا ہوا تھا اس کی تیرت سے وہ صرف لطف اندوز ہی ہو سکتی تھی۔

"کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ یہ لڑکی میں ہو سکتی ہوں"؟

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا ـــ کر سکتا ہوں اور تمھیں یہ بھی یاد دلا سکتا ہوں کہ شیلا لارسن نام کی اسی لڑکی نے ایک بار بمبئی سے لاہور تک کی پرواز کے دوران مجھ سے کہا تھا ـــ ہم پھر ملیں گے مجھ پر یقین کرو ـــ لیکن مجھے کبھی یقین نہیں آیا تھا۔ یقین کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ میں تو اس کے لیے ہزاروں مسافروں میں سے ایک غیر اہم مسافر تھا۔ کسی بھی ایئر ہوسٹس کے لیے کوئی مسافر اہم نہیں ہوتا ـــ وہ اس کے لیے تب تک اہم ہوتا ہے جب تک وہ اس کا ہم سفر

ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ اسے ہوائی جہاز کے پیراپٹ پر کھڑے ہو کر الوداع کہہ دیتی ہے تو پھر وہ اس کے لیے کوئی نہیں رہ جاتا۔"

میں نے اسے یاد دلانے کے لیے یہ بھی بتایا کہ تم نے اپنی نیومرولوجی کی بدولت مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ میں کبھی نہ کبھی غیر ممالک کا سفر ضرور کروں گا۔ اور میں نے واقعی نہ صرف یہ کہ سفر کیا بلکہ ہمیشہ کے لیے اپنے ملک سے باہر ہی رہ گیا۔ پھر کبھی واپس نہ جا سکا۔ چند روز کے لیے گیا بھی تو جلد ہی واپس آگیا کیونکہ اب وہاں میرا کوئی بھی نہیں رہتا۔ کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا"!

یہ سن کر وہ آب دیدہ سی ہو گئی۔ کتنی ہی دیر تک میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ پھر بولی:-

"میرے اور تمہارے غم ایک سے ہیں۔ ہم دونوں اپنا اپنا ماضی کھو چکے ہیں۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ سچ مچ مجھے کچھ یاد نہیں ہے کہ تم سے پہلے کبھی ملی تھی۔ تم نے میری نیومرولوجی کے بارے میں کچھ کہا ہے میں تو محض شغل کے طور پر کبھی کبھی کسی کا ہاتھ دیکھ لیتی ہوں اور لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ تم ذرا پھر سے اپنی پیدائش اور زندگی کے اہم ترین واقعات کی تاریخیں بتاؤ تو میں اپنا حساب لگاؤں۔"

وہ کچھ دیر تک ہندسوں کو الٹ پلٹ کر بار بار لکھتی اور کاٹتی رہی۔

پھر بولی ـــــ

"تم اپنے ملک ضرور واپس جاؤ گے! ـــــ تمہاری مٹی وہیں گڑے گی"!!

مجھے ایسا لگا، وہ ایک بار پھر مجھے الوداع کہہ رہی ہے۔ لیکن پھر ملنے کی بات نہیں کہہ رہی ہے۔ صرف یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔!

□□

گمشدہ لمحوں کا پس منظر

یاد آتی ہیں اب بھی مجھ کو گاؤں کی وہ مہکی مہکی فضائیں
اور وہ سرد ہوائیں
وہ شاداب کھیتیاں جن کے کنارے کنارے
شبنم میں نہائی ہوئی پگڈنڈیاں سوتی تھیں
اور وہ کچے راستے جہاں دھول اڑاتے ہوئے کارواں گزرتے تھے
وہ صبح کی دھندلائی ہوئی کرنیں
وہ جانوروں کے جھنڈ
اور میرے آنگن میں کوّے کی بے ہنگام صدائیں
وہ نیم کا درخت، وہ آم کے باغیچے
جہاں ہم کرتے تھے شرارت ساتھیوں کے ساتھ
اور وہ تالاب جس کے پانی میں ہم ڈبکیاں لیتے تھے
وہ شام، وہ شفق کی لالی
اور چڑیوں کا چہچہانا
اور پھر تھوڑی دیر میں چاندنی کا ظہور
میں چھوڑ آیا سب کچھ
اور کچھ نشانات
میں نے لگایا تھا اپنے خیاباں میں ایک چھوٹا سا پودا
اور گھر کی منڈیر پر کچھ کبوتر بھی پال رکھے تھے
اب وہ پودا ایک سایہ دار درخت بن چکا ہے
لیکن کبوتروں کی صدائیں اب نہیں ملتیں

فروغ اختر
۹۹/۳/۴۴ - روئی والی گلی
نئی سڑک۔ کانپور

رام لعل نابھوی
دیوان اسٹریٹ۔ نابھہ (پنجاب)

اُفق لکھنوی کی یک قافیہ رامائن

قافیہ کے لغوی معنوی ہیں پیچھے چلنے والا یعنی ردیف سے پہلے کا لفظ یا حرف ۔ حکیم بوعلی سینا نے فرمایا ہے کہ جس شعر میں قافیہ نہیں، وہ شعر نہیں ۔ مضامین کتنے ہی عالی اور مطبوع کیوں نہ ہوں، طریق ابلاغ و اظہار کتنا ہی دل پذیر کیوں نہ ہو، اگر قافیہ موجود نہیں تو کلام کبھی شعر نہیں کہلائے گا۔

قافیے میں جو حروف ہوتے ہیں وہ مصرعوں کے الفاظ کا غنائی مزاج متعین کرتے ہیں ۔ بہ امتداد زمانہ منظومات میں یہ پابندی نہ رہی ۔

یہاں مولانا حالی کے خیالات کا اظہار ضروری ہے ۔ فرماتے ہیں:

"قافیہ بھی ہمارے ہاں شعر کے لیے ایسا ہی ضروری سمجھا گیا ہے، جیسے کہ وزن مگر درحقیقت وہ بھی نظم ہی کے لیے ضروری ہے ۔ نہ شعر کے لیے ۔ اساس میں لکھا ہے کہ یونانیوں کے ہاں قافیہ بھی (مثل وزن کے) ضروری نہ تھا ۔ اور حشوی نام کے ایک فارسی گو شاعر کا ذکر کیا ہے جس نے ایک کتاب میں اشعار غیر مقفیٰ جمع کیے ہیں ۔ یورپ میں بھی آج کل بلینک ورس یعنی غیر مقفیٰ نظم کا بہ نسبت مقفیٰ کے زیادہ رواج ہے اگرچہ قافیہ بھی وزن کی طرح شعر کا حسن بڑھا دیتا ہے جس سے اس کا سننا کانوں کو نہایت خوش گوار معلوم ہوتا ہے اور اس کے پڑھنے سے زبان زیادہ لذت پاتی ہے مگر قافیہ اور خاص کر ایسا جیسا کہ شعرائے عجم نے اس کو نہایت سخت قیدوں سے جکڑ بند کر دیا ہے اور پھر اس پر ردیف اضافہ فرمائی ہے ۔ شاعر کو بلاشبہ اس کے فرائض ادا کرنے سے باز رکھتا ہے "۔

اُردو میں منظوم اور منثور رامائنوں کی کمی نہیں ۔ یہاں تک کہ دو ایسی رامائنوں کا بھی پتہ چلتا ہے جو یک قافیہ ہیں ۔ سب سے پہلی یک قافیہ رامائن منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی کی ہے جو ۱۸۸۵ء میں لکھی گئی ۔ اسے پہلی مرتبہ خود مصنف نے شائع کیا تھا اور دوسری بار نومبر ۱۹۰۴ء میں نول کشور پریس سے شائع ہوئی تھی ۔

دوسری یک قافیہ رامائن حکیم وہمی حیدرآبادی کی ہے جو مارچ ۱۹۰۶ء میں حیدرآباد دکن میں شائع ہوئی ۔ یہ تلسی کی رامائن کا حرف بہ حرف اُردو میں منظوم ترجمہ ہے ۔

یہاں صرف اُفق لکھنوی کی یک قافیہ رامائن کا ذکر مقصود ہے ۔ اُفق کی یہ یک قافیہ رامائن گوسوامی تلسی داس اور مہرشی والمیکی کی رامائن کے چیدہ چیدہ مروارید کی ایک مختصر لڑی ہے ۔ ردیف اور قافیہ کی پابندی، الفاظ کی شستگی، بندش محاورہ اور حسین شاعری کا ایک مجموعہ ہے ۔ اُفق نظم شروع کرتے ہیں ؎

لب سیا، رگھبر دہن، دنداں بھرت، لچھمن زباں
شترہن جی نطق کو آواز کُش حسنِ بیاں

قدرتِ کامل دکھاتے ہیں انھیں کے ہفت رنگ
ہفت کشور، ہفت قلزم، ہفت خط ہفت آسماں

بندگی ان کی جو کی دنیا میں روشن دل ہوئے
ذرہ، برق، انجم، قمر، سیارے، سورج کہکشاں

سات چیزیں آدمی پاتا ہے ان کے دھیان سے
زندگی، عیش، امن، آسائش، طرب، فرحت، اماں

ہیں جو رامائن کے مشہور زمانہ سات کانڈ
سات پردے ہیں وہ چشم انس و جاں کے بے گماں
بس بس اب خاموش اے لب کلک اُفق
مدح کران کی بھلا یہ تجھ میں گویائی کہاں

احساس کی شدت، جذبے کی صداقت، بھرپور عقیدت، شعور کی گہرائی، فکر کی گیرائی، واقعہ کی تصویرکشی، ترتیب و تدوین میں افق لکھنوی کو کمال حاصل ہے۔

شری رام چندر جی کے سراپا میں دہن، ہونٹ، دانت، زبان گلا، بازو، انگلی، ہاتھ، کلائی، انگوٹھا، ناخن، سینہ، پشت، شکم، کمر، پاؤں کا بیان ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مرحبا صد مرحبا شاباش اے فکرِ بلند
آفریں صد آفریں اے تیزیِ طبعِ رواں
واہ کس انداز سے لکھا سراپا کیوں نہ ہو
کیسی خوبی سے دکھائے جوہرِ حسنِ بیاں
ذکرِ اعضا میں نئی لیلائیں کی ہیں منضبط
ایک مصرعے میں بیاں کی داستاں کی داستاں
کیا عجب خوش ہو جو بڑھ کر اس کو ہر نازک خیال
کیا تعجب صاد فرمائیں جو اس پہ قدرداں
ڈر یہ ہے لیکن کہیں شاید نہ مضموں آفریں
اس میں حسنِ نظم کی معجز نمائی ہے کہاں
استعارہ کی نہ کچھ خوبی نہ تشبیہوں کے لطف
پھر بھلا زورِ طبیعت کا ہو کیوں کر امتحاں
ہے مناسب پھر نئے سر سے دکھاؤں سحرِ طبع
پھر کرے معجز نمائی خامۂ معجز بیاں

ان اشعار سے ان کے قلم کی روانی بخوبی ظاہر ہے۔ افق کے زورِ قلم کا یہ حال ہے کہ اگر ایک بار رام چندر جی کا سراپا واقعات کی روشنی میں بیان کرتے ہیں تو دوبارہ تشبیہات اور استعارات میں۔ افق لکھنوی چندہ قوافی، زبان و محاورہ کی صحت، طرزِ بیان کی جدت و موزونی، لب و لہجہ کے لوچ، لطافت خیال، قوت استدلال سے مضمون میں ندرت و جدت اور تائید و دل زیبی پیدا کر دیتے ہیں۔

ایک واقعہ کی تصویرکشی کی ہے۔ شری رام چندر جی اپنے بھائی لکشمن کے ساتھ جنک پوری میں باغ کی سیر کو جاتے ہیں۔ اُدھر سے سیتا جی گوری جی کے مندر میں پوجا کے لیے جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی سہیلیاں ہیں۔ رام سیتا کو اچانک دیکھتے ہیں، سیتا کی نظر رام پر پڑتی ہے۔ اس واقعہ کا بیان دیکھئے ؎

رام و لچھمن جی نے بشوامتر کے چومے قدم
پھول لینے کو ہوئے رونق فزائے بوستاں
ڈبڈبائے دیدۂ نرگس میں آنسو پریم کے
مور چھل جھلنے لگے طاؤسِ باغِ بے خزاں
دیکھ کر دیدار پر کرماں بھری خوشبوئے گل
سایہ بن بن کر گرے قدموں پہ نخلِ بوستاں
باغ میں تھی اک سری گوری کی مورت جلوہ گر
دافعِ حاجاتِ عالم، جرم بخشِ عاصیاں
کشورِ متھلا نگر میں یہ تھا دستورِ قدیم
عورتیں شادی سے پہلے سر جھکاتی تھیں یہاں

کیف و سرور، بے خودی اور وارفتگی کا یہ عالم ہے کہ پڑھتے وقت ایک نشہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ افق خاتمہ اس طرح کرتے ہیں ؎

ملک داری میں ہوئے مشغول راجہ رام چندر
عدل سے رہنے لگی ساری رعایا شادماں
آفتابِ نفع سے روشن کیا ماہِ خرد
قیمتی کی اشرفیِ سود سے جیبِ زماں
اے کلیدِ فکر قفلِ شعر گوئی بند کر
اے چراغِ شاعری کب تک رہے گا گل فشاں
اے عروسِ ناطقہ اب منھ پہ آنچل چھوڑ دے
اے عقابِ آرزو کب تک ہوائے آسماں

(باقی ص۴۴ پر)

چبھن

تجھ کو معلوم ہے
بچھڑے ہوئے محبوب مرے ؟
چوڑیاں
لایا تھا جو تو، بڑی چاہت سے کبھی
سرخ، نارنجی ہری اور گلابی چوڑی
بیچ میں جن کے چمکتی تھیں سنہری بانکیں
اپنے ہاتھوں سے مرے ہاتھ میں پہنائی تھیں
خوبصورت سی کھنک سُن کے بڑے پیار سے تو
مسکراتے ہوئے آنکھوں میں میری جھانکا تھا
میرے محبوب، مری جان، مرے ہم راہی
آج وہ چوڑیاں ہاتھوں میں نہیں ہیں میرے !
ہاتھ خالی ہیں مرے
سونی گلی کی مانند!
وہ گلی۔ جس میں نہ اب تیرے قدم آئیں گے
میرے محبوب مری جان تجھے کیا معلوم
موند کے آنکھوں کو سویا تھا، نہ تھی تجھ کو خبر
چوڑیاں تونے جو پہنائی تھیں ہاتھوں میں مرے
توڑ کر پھینک دیں لوگوں نے میرے دل کی طرح !
کرچیں .....
چبھتی ہیں تو
آنکھوں سے لہو بہتا ہے۔

عطیہ پروین
۸۱۸۔ اندرون قلعہ
رائے بریلی

تلخ حقیقت

تمھارے آنے سے
سوچا تھا
معجزہ ہوگا
مگر تم آئے تو کچھ بھی نہیں ہوا کہ ابھی
گھٹن دماغ کی ویسی ہے جیسے پہلے تھی
جگر کے درد میں تِل بھر کمی نہیں آئی
وصال تک نہ ہوا لب سے مسکراہٹ کا
نہ اشک آنکھ میں آئے
نہ لفظ ہونٹوں پر

تمھارے آنے سے کچھ بھی نہیں جو ہونا تھا
تو کیوں نگاہ نے چُوما تمھاری راہوں کو
تو دل نے کس لیے شدّت سے انتظار کیا
دماغ کس لیے اُلجھا رہا خیالوں سے

اب آئے ہو تو بہت شکریہ ہے آنے کا
مگر جو غمزہ و ناز و ادا ہوں پیش نظر
دل و نگاہ کو معشوقیت کی حسرت ہو
تو یہ خیال رہے اب میں وہ نہیں کہ جو تھا
جنوں پسندی مرے دل میں اب نہیں باقی

ڈاکٹر نریش
شعبۂ جدید ادب
پنجاب یونیورسٹی
چنڈی گڑھ

شمیمہ رضوی
شعبۂ اردو۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

ہندستانی دیہات کے افلاس کی کہانی کفن کی زبانی

ہمارا ہندستان گاؤں میں بستا ہے اور گاؤں پریم چند کے اوراق میں بستا ہے۔ پریم چند کے ناول ہوں یا افسانے ہندستان کی دیہی زندگی ان کے یہاں شدت سے حاوی ہے۔ وہ پہلے اور آخری ادیب ہیں، جن کے یہاں دیہات کی نفسیاتی، تہذیبی اور اقتصادی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ بے نقاب ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب ایک طرف ہندستان پر انگریزی حکومت کا تسلط تھا تو دوسری جانب جاگیردارانہ نظام حاوی تھا۔ بیشتر آبادی گاؤں میں بستی تھی غیر ملکیوں کی نظر میں جن کی کوئی وقعت نہ تھی۔ زمین کی ساری ملکیت زمیندار کی تھی۔ مہاجن و ساہوکار کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ان حالات میں پریم چند نے ہندستان کے ایک گاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ مفلسی، بھوک، قبیح رسومات، ذات پات کی تفریق، پس ماندگی اور ناخواندگی کے ماحول میں سانس لیتے ہوئے ان کا بچپن شعور کی چوکھٹ تک پہونچا۔ اس ماحول میں جینے والے حساس فن کار کے ہاتھ میں قلم آیا تو گاؤں کا سارا درد قطرے قطرے ہو کر کاغذ پر ٹپک گیا۔ چونکہ انھوں نے مرض میں مبتلا ہو کر اس کی اذیت اٹھائی تھی، لہٰذا وہ جب اس مرض کا بیان کرتے ہیں تو وہ حقیقت کی منھ بولتی تصویریں بن جاتا ہے۔

پریم چند نے ۱۹۰۲ء میں لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۳۶ء تک جاری رہا۔ گویا پریم چند کی تحریر کی مدت کم و بیش چونتیس برس پر محیط ہے۔ اس مدت میں انھوں نے ناول اور ڈرامے کے علاوہ تقریباً تین سو افسانے لکھے جن میں پہلا افسانہ "عشق دنیا اور حب وطن" (جو ماہ اپریل کے "زمانہ" کان پور میں شائع ہوا) اور آخری افسانہ "کفن" ہے (جو ان کی موت کے بعد "جامعہ" میں دسمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا)

پریم چند کے کچھ افسانوں کو چھوڑ کر ان کے بیشتر افسانے دیہی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کے عکاس ہیں۔ مثلاً افسانہ "معصوم بچہ" میں نام نہاد مذہب کی نمائندگی کرنے والے اس پنڈت کی تصویر ہے جو عوام کی اندھی عقیدت کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ "انصاف کی پولیس" میں ان سرکاری نمائندوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو حالات سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ "خون سفید" میں انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کسان خالقِ رزق ہوتے ہوئے بھی بھوک اور مفلسی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ افسانہ "نجات" میں برسہا برس سے قرض، لگان اور بیگار کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے کسانوں کی عکاسی کی گئی ہے۔

بریجنوں کی زندگی کے تلخ حقائق کی داستان اور ان کے استحصال کی کہانی "دودھ کی قیمت" میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ افسانہ "پنچایت" میں انھوں نے گاؤں کی پنچایت کی اہمیت کو بتلایا ہے۔ ہندو سماج کی عورتوں کے تعلق سے بے شمار دکھیوں کی داستانیں "بدنصیب ماں"۔ "بازیافت" اور "کسم" میں پیش کی گئی ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے افسانوں میں انھوں نے گاؤں کے مسائل

اور اس وقت کے سماج کی دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھی ہے۔

ان کے ابتدائی افسانے فنی نقطۂ نظر سے قدرے کمزور ہیں۔ لیکن دیہی زندگی کے تعلق سے جو افسانے لکھے گئے وہ رفتہ رفتہ زمین سے آسمان کی بلندیوں تک اُٹھتے چلے گئے ــــ بقول جوگیندر پال:

"میدانوں سے پہاڑوں کا سلسلہ دھیرے دھیرے
اونچا ہوتا ہوا نظر آتے تو دور دراز کی چوٹیوں تک انسانی
بود و باش کا تصور فطری معلوم ہوتا ہے۔ پریم چند بھی
ایک ایسا ہی پہاڑی سلسلہ ہے جو آہستہ آہستہ بلند
ہوتا چلا جاتا ہے اور اپنے ساتھ آسمانوں کی جانب
بستیاں بساتا جاتا ہے"[۱]

اور بستیوں کا یہ سلسلہ "کفن" پر جاکر ختم ہو جاتا ہے، شاید اس لیے کہ اس نے آسمانوں کی بلندیوں کو جا چھوا تھا۔

کفن کی کہانی کا مرکزی نکتہ کمزور طبقے کا وہ استحصال ہے جو جاگیردارانہ نظام میں سالہا سال تک قائم رہا۔ یہ وہ طبقہ تھا جس کے لیے جینے کی ہر راہ مسدود تھی۔ جو انسان کے روپ میں حیوانوں سے بدتر تھا۔ یہ سماج کا ایسا ناپاک انگ سمجھا جاتا تھا جس کو تن ڈھانپنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی ملنا تو درکنار حلق تر کرنے کے لئے پانی کے دو قطرے بھی دور سے ٹپکائے جاتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ برتن ان سے جا چھوئے اور ناپاک ہو جائے۔ اس طبقے کو پریم چند نے اپنے افسانے "کفن" میں مرکزی کردار دے کر بقول خواجہ احمد عباس "دیہاتی سماج کی نہایت بھیانک مگر سچی تصویر کشی کی ہے۔"[۲]

"کفن" کی کہانی ہندستان کے ایک روایتی گاؤں سے ابھرتی ہے ــــ رات کے سناٹے میں ایک جھونپڑے میں ایک جوان عورت "بدھیا" دردِ زہ سے تڑپ رہی ہے۔ جس کی صرف چیخوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ باہر دروازے پر اس کا کام چور شوہر مادھو اور اس کا ساٹھ سالہ سسر گھیسو الاؤ کے نزدیک بیٹھے چرائے ہوئے گرم گرم بھنے آلو بے فکری سے کھا رہے ہیں۔ آلو کھا کر عورت کی طرف دھیان دیئے بغیر دونوں وہیں سو جاتے ہیں۔ صبح مادھو جھونپڑی میں داخل ہوتا ہے تو بدھیا کو مرا ہوا پاتا ہے۔ دونوں باپ بیٹے اس کا کریا کرم کرنے کے لئے گاؤں والوں سے اپنی آپ بیتی بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور پانچ روپے کی معقول رقم وصول کر لیتے ہیں۔ پھر بجائے بدھیا کے کفن دفن کا انتظام کرنے کے، شراب خانے میں جاکر دل کھول کر پیتے ہیں اور لذیذ کھانوں سے پیٹ بھر کر بدمست ہو کر پڑ رہتے ہیں۔

"کفن" پریم چند کا اگرچہ بہت چھوٹا افسانہ ہے لیکن ان کے تمام افسانوں پر بھاری ہے۔ بلاشبہ اسے ان کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ یہ پریم چند کا ایسا افسانہ ہے جس میں گاؤں کا پس منظر، اپنی تمام تر کثافت کے ساتھ منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ غربت، افلاس، بھوک، جہالت، سماج کے توہمات، طبقہ وارانہ تقسیم کے اثرات، انسانی بے بسی، عورت کی پس ماندگی اور اس کی بے وقعتی، نفسیاتی کش مکش، غرض کون سی چیز ہے جو اس چھوٹے سے افسانے میں موجود نہیں۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جسے ایک ضخیم ناول میں بھی سمیٹنا مشکل تھا لیکن پریم چند نے اپنے افسانے کے ایک مختصر سے کینوس پر اس طرح اجاگر کیا ہے کہ مکمل افسانہ ایک اکائی بن گیا ہے۔

افسانے کی پوری فضا بڑی سوگوار ہے، شعوری طور پر افسانہ طنزیہ نہ ہوتے ہوئے بھی اس وقت کے پورے معاشرے پر ایک گہرا طنز ہے۔ خاص طور سے ان لوگوں پر جو اس طبقے کی خستہ حالی کے اصل ذمہ دار ہیں۔ افسانے کے مکالمے تلخ نفسیاتی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ افسانے کے دیگر جزئیات کو ملا کر افسانہ نگار نے قاری کو ایک بھیانک حقیقت کا احساس کرایا ہے۔

"کفن" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا پس منظر ایک تمثیلی استعاراتی اور علامتی انداز میں ابھارا گیا ہے۔ مثال کے طور پر بجھا ہوا الاؤ، مٹتے ہوئے سماجی نظام کی علامت ہے۔ دردِ زہ میں تڑپتی تنہا عورت، عورت کی تمام تر کسمپرسی اور بے چارگی کی علامت ہے۔ بچہ کی پیدائش کا اشارہ آنے والی نسل تک کو اس زخمی سماج سے چھٹکارہ نہ ملنے کی علامت ہے۔ بدھیا کی موت کے بعد کہانی کی سست رفتاری

کا خطرہ تھا لیکن یہی وہ جگہ ہے جہاں پریم چند نے اپنی فنی چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہاں پہونچ کر کہانی تیزی سے کلائمکس کی طرف بڑھتی ہے اور جب قاری کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مادھو اور گھیسو نے کفن کے لیے مانگے ہوئے پیسوں سے شراب پی ہے اور اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش "لذیذ کھانوں" سے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی ہے تو قاری کے ذہن کو ایک دھچکا سا لگتا ہے اور اس میں ان کرداروں سے نفرت کے بجائے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے۔ پریم چند کے قلم کی کامیابی کا یہی راز ہے کہ ان کے برُے سے برُے کردار سے بھی قاری کو نفرت نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ اسے ان کی بشری کمزوری سمجھ کر سمجھوتا کر بیٹھتا ہے۔

یہ ہمارا بڑا المیہ ہے کہ ہم نے کچھ ایسے اخلاقی اصول بنا رکھے ہیں کہ جن سے ہمیں کچھ حاصل ہونے کا نہیں۔ پریم چند نے ایسے خود ساختہ اخلاقی اصولوں کا مذاق اُڑایا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے کوئی لمبا چوڑا لکچر نہیں دیا ہے بلکہ اسے گھیسو کے منھ سے صرف دو جملوں میں ادا کیا ہے:

"کپھن لگانے سے کیا ملتا ــ؟ آخر جل ہی
تو جاتا ــ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔" [۵]

یا کھانے کا بچا ہوا سامان بھکاری کو دیتے ہوئے مادھو کہتا ہے:

"لے جا۔ کھوب کھا اور آسیرباد دے۔ جس کی
کمائی ہے وہ تو مر گئی مگر تیرا آسیرباد اسے
جرور پہونچے گا۔ روئیں روئیں سے آسیرباد دے
بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔" [۶]

"کفن" کے متعلق اُردو کے بیشتر ناقدین نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے اسے نہ صرف پریم چند بلکہ اُردو کی بہترین کہانیوں میں شمار کیا ہے۔ یہاں میں ان میں سے صرف شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے خیالات پیش کرنا چاہوں گی۔ کیونکہ وہ ایسے نقاد ہیں جو مشکل ہی سے عظمتوں کا لوہا مانتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"میں کفن کو بے تکلف دُنیا کے افسانوں کے سامنے رکھ سکتا ہوں۔ یہ افسانہ (اور بہت سے پہلوؤں کے علاوہ) Black Humour کا شاہکار نمونہ ہے اور اُردو افسانے میں ایک نئے اسلوب کا آغاز کرتا ہے۔" [۷]

بلاشبہ "کفن" پریم چند کے افسانوں میں کامیاب ترین افسانہ ہے جو بہ لحاظ فن، تکنیک، کلائمکس، کردار، زبان و بیان، عمیق مشاہدے اور اعلا تفکر کا نچوڑ ہے۔ میں تو یہ کہوں گی کہ اگر انھوں نے اتنے سارے ناول، افسانے، ڈرامے اور مضامین نہ بھی لکھے ہوتے اور اپنی تمام زندگی میں صرف "کفن" ہی تخلیق کرتے تو اس میں شک نہیں کہ صرف یہی ایک افسانہ ان کو حیاتِ دوام بخشنے کے لیے کافی ہوتا۔

حواشی

[۱] بنارس ضلع کے مضافات میں لمہی نام کا ایک گاؤں ہے جہاں منشی عجائب لال (پوسٹ ماسٹر) کے متوسط کائستھ گھرانے میں آنندہ دیوی کے بطن سے ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو دھنپت رائے (پریم چند) کا جنم ہوا ان کا سن وفات ۱۹۳۶ء ہے۔

[۲] پریم چند کے افسانوں کی تعداد کے سلسلے میں محققین کی رائیں جداگانہ ہیں۔ ڈاکٹر جعفر رضا نے "پریم چند ــ فن اور تعمیرِ فن" میں پریم چند کے افسانوں کی مجموعی تعداد ۳۰۳ بیان کی ہے۔ شیلیش زیدی نے ماہنامہ "آجکل" کے پریم چند نمبر میں جو تفصیل دی ہے۔ اس کے مطابق پریم چند کی کل کہانیاں ۲۸۸ قرار پاتی ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنی نے اپنے تحقیقی مقالہ "پریم چند کی کہانیوں کا سانکھیکیہ درگی کرن" میں ان کے افسانوں کی تعداد ۲۹۸ بتائی ہے۔

[۳] "پریم چند کی کہانیاں" مرتب جوگندر پال۔ ترقی اُردو بیورو ۱۹۸۳ء ص

[۴] پریم چند ــ قومی یک جہتی کا علمبردار "امکان" بمبئی جنوری تا مارچ ۱۹۸۰ء

[۵] پریم چند کی کہانیاں ــ جوگندر پال ترقی اُردو بیورو۔ نئی دہلی ص ۲۲۶

[۶] " " " " ص ۲۲۸

[۷] پریم چند کے اسلوب کا ایک پہلو۔ "امکان" بمبئی ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۱۶۵

□□

غزلیں

کس زعم میں ہے تجھ کو بہاروں پہ اعتماد
اپنی نظر پہ ہے کہ نظاروں پہ اعتماد

کتنی سمٹ گئی ہے یہ دُنیا مگر مجھے
اب تک ہے تیری راہ گزاروں پہ اعتماد

تیراک تو نہیں ہوں میں بہہ جاؤں گا مگر
اتنا تو خیر مجھ کو ہے دھاروں پہ اعتماد

اپنی طرف تو تھے مگر اپنے لیے نہ تھے
کرنا پڑا کچھ ایسے اشاروں پہ اعتماد

ہیجان اگر رہے گا سلامت اسی طرح
مجھ کو رہے گا اپنے قراروں پہ اعتماد

طوفان پر بھی تو نے بھروسہ کیا کبھی
ہوتا تو ہے سبھی کو کناروں پہ اعتماد

وہ رات زہر اگلتی رہی صبح تک شمیم
جس شام کر لیا ہے ستاروں پہ اعتماد

شمیم عثمانی

ہیرامن اسٹریٹ
کانپور

ہنسا کرو کہ اُداسی بھلی نہیں ہوتی
بجھے دیے کی کوئی زندگی نہیں ہوتی

ہم اہلِ درد کی قسمت میں تیرا ہاتھ کہاں
ہر ایک شاخ گلوں سے لدی نہیں ہوتی

ہوا کی دوستی جلتے ہوئے چراغوں سے
جو ہو بھی جائے تو سنجیدگی نہیں ہوتی

کسی خیال میں ہم دونوں کھوئے رہتے ہیں
کبھی کبھی تو کوئی بات ہی نہیں ہوتی

یہ کیسے دن ہیں کہ جو لوگ ہیں عزیز بہت
اب ان سے مل کے بھی دل کو خوشی نہیں ہوتی

جہاں خلوص دلوں میں ہوا نہیں کرتا
وہاں حیات میں بھی دلکشی نہیں ہوتی

کھلا یہ راز بنائے تھے بام و در ہم نے
جو گھر بنا نے تو یہ بے گھری نہیں ہوتی

خدا سے مانگیے جو کچھ بھی مانگنا ہو بشیر
کہ جس سے مانگ کے شرمندگی نہیں ہوتی

بشیر فاروقی

۵۱۵ ۔ مرزا منڈی لین، عقب راگنی ہوٹل لکھنؤ

آئینۂ شعور و نظر بیچتا نہیں
میں یہ متاعِ خون جگر بیچتا نہیں

جوہر شناس ہوں تو ملے حوصلہ بھی کچھ
اندھوں کے ہاتھ لعل و گہر بیچتا نہیں

گلشن پرست ہوں مجھے کانٹے بھی ہیں عزیز
برگِ گلاب و شاخِ شجر بیچتا نہیں

ہوں دہر میں وقارِ محبت کا پاسدار
ناموسِ التفاتِ نظر بیچتا نہیں

ہر چند ہوں مصائب و آلام کا ہدف
رکھتا ہوں جو دُعا میں اثر بیچتا نہیں

پیشہ مرا یہی، یہی لفظوں کا کاروبار
سرمایۂ خیال مگر بیچتا نہیں

کہتا ہوں شعر حرمتِ فن کے لیے حزیں
میں پردۂ سخن میں ہنر بیچتا نہیں

حزیں

[illegible]

ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی
حیدر منزل، ۵۰۔۴۸، نیو مفتی گنج، لکھنؤ

مفتی محمد عبّاس کی اُردو شاعری

سرزمینِ اودھ کے باکمال اور ذی علم افراد کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس میں تیرھویں صدی ہجری کے مفتی سید محمد عباس کا شمار عربی اور فارسی کے جیّد علما میں ہوتا ہے۔ ان کی ولادت آخر ربیع الاول ۱۲۲۴ھ م ۸ ارمارچ ۱۸۰۹ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔[1] ان کے والد سید علی اکبر، جدِ امجد سید محمد جعفر اور جدِّ اعلیٰ سید نعمت اللہ جزائری تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظمؑ سے ملتا ہے۔[2]

مفتی محمد عباس نے فارسی کی تعلیم اپنے والد سے، فقہ، اصولِ کلام اور حدیث وغیرہ کی تعلیم سید العلماء مولانا سید حسین صاحب سے اور معقولات کی تعلیم فرنگی محل کے مولوی عبد القدوس اور مولوی عبد القوی صاحبان سے حاصل کر کے بہت جلد اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔[3] سلطان العلماء مولانا سید محمد نے مفتی محمد عباس کو مفتیٔ لکھنؤ نامزد کیا۔[4] ۱۲۵۸ھ میں محمد علی شاہ نے ان کی علمی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے مناسب وظیفہ مقرر کیا۔[5] پھر امجد علی شاہ نے ۱۲۶۱ھ میں "تاج العلماء افتخار الفضلاء" کے لقب سے نوازا۔[6]

مفتی محمد عباس نے ہی منصفوں کے لئے ایک دستور تحریر کیا جو اودھ کے تمام قاضیوں کو بھیجا گیا۔[7] مفتی صاحب کو امجد علی شاہ کے عہد میں محکمۂ وزارت کا مفتی قرار دیا گیا اور بعد میں واجد علی شاہ اختر کے زمانۂ سلطنت میں بھی وہ محکمۂ وزارت کے مفتی رہے۔ سلطان عالم واجد علی شاہ اختر مفتی محمد عباس سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ مفتی محمد عباس کی اس تحریر سے ہوتا ہے جو سلطان عالم کے انتقال پر لکھی تھی:

"مجھ فقیر کی تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ ایک دن میرے سر پر چھتری لگا کر خادموں کی طرح نشیمن سے مسجد تک میرے پیچھے پیچھے پیدل گئے۔"[8]

مفتی صاحب کی مرزا اسد اللہ خاں غالب سے علمی و ادبی موضوعات پر مراسلت ہوا کرتی تھی۔ مفتی صاحب کے میر انیس اور مرزا دبیر سے بھی گہرے تعلقات تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میر انیس مفتی محمد عباس سے مشورۂ سخن بھی کرتے تھے۔ کسی نے مفتی صاحب سے پوچھا کہ میر انیس اور مرزا دبیر میں افضل کون ہے؟ تو مفتی صاحب نے کہا:

"میر کا کلام شیریں اور فصیح، مرزا کا کلام دقیق اور ملیح ہے اور یہ اختلافِ ذوق و لذت کوئی محلِ ترجیح نہیں۔ کوئی میٹھا پسند کرتا ہے کوئی نمکین۔ اپنے مواقع اور مصالح پر دونوں پسند کیے جاتے ہیں۔"[9]

مفتی محمد عباس فارسی اور عربی کے ایک عظیم محقق و مصنف تھے۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے ان کی سوانح عمری بنام "تجلیات" میں ۱۶۲ کتب کی فہرست دی ہے جس میں روائح القرآن، منابر الاسلام، شریعت غرّا، شعلۂ جوالہ اور طلب العلم جیسی عربی کتب اور مثنوی بیت الحزن، مثنوی من و سلویٰ اور گوہر شاہوار جیسی فارسی کتابیں شامل ہیں۔

مفتی محمد عباس نے فلسفہ، ہیئت، ریاضی، معقولات، طب ...

قرأت، ادب، تفسیر، حدیث، علم کلام، فقہ، تاریخ، معانی و بیان لغت و عروض میں پوری طرح دسترس رکھتے تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ شاعری میں ان کا تخلص سید تھا۔

انھوں نے عربی اور فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے، جس میں متعدد غزلیات، رباعیات۔ قطعات، تاریخ اور پہیلیوں کے ساتھ ساتھ ایک ۵۶، اشعار پر مشتمل مذہبی مثنوی "بنیادِ اعتقاد" بھی ہے یہ مثنوی مفتی محمد عباس صاحب نے بارہ سال کی عمر میں تصنیف کی تھی، جس کے مطالعہ کے بعد ان کی ذہانت، قابلیت اور بلندی فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثنوی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ؎

بعد از سپاس و حمد خداوندِ کبریا
نعت و درود سید و سردارِ انبیا[٩]

تعریف و مدح حیدرِ کرّار کیجیے
وصف و ثنائے عترتِ اطہار کیجیے[١٠]

مفتی محمد عباس صاحب نے یہ مثنوی کیوں اور کس کے لیے لکھی، اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

جو کچھ ہوا ہے نظم بقصدِ ثواب ہر
اطفال اور نساء کے لیے یہ کتاب ہو[١١]

اس مثنوی کی تصنیف کے وقت ان کی عمر بہت کم تھی، اس کا ذکر بھی انھوں نے اپنی اس مثنوی میں کیا ہے ؎

تصنیف کم سنی میں کیا اس کتاب کو
یہ ہدیہ رذیہ دیا شیخ و شاب کو[١٢]

اور ساتھ ہی ساتھ اُردو زبان میں اپنی استعداد کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ؎

ماہرِ زبانِ ہند سے واللہ میں نہیں
ہندی کے روز مرہ سے آگاہ میں نہیں[١٣]

مفتی صاحب نے اسی مثنوی میں بعض جگہ اصلاحی پہلو بھی اختیار کیا ہے مثلاً:

لازم ہے گرچہ فکرِ تلاشِ معاش میں
لیکن بہت خراب نہ ہوئے تلاش میں

پیدا کرے حلال سے روزی عیال کی
وجہِ حرام سے نہ کرے فکر مال کی[١٤]

اور ؎

جو مسئلہ کہ پوچھے کوئی تجھ سے آن کر
گر ہوئے تجھ کو علم تو اس کا بیان کر

بے علم و اجتہاد کے فتویٰ روا نہیں
کہہ دے یہ صاف صاف کہ میں جانتا نہیں[١٥]

اسی مثنوی میں مفتی محمد عباس صاحب نے ایک جگہ شادی کا ذکر کرتے کرتے موت کا ذکر اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ جس سے شادی اور غم کے اثرات کا اندازہ لمحہ بھر میں محسوس ہونے لگتا ہے ؎

دیکھا بہت ہے آج تو شادی کی رات ہے
ہوتا ہے آج رنگ خوشی ہے برات ہے

ایک حور کو عروس بنا کر بٹھاتے ہیں۔
افشاں چُنتے ہیں کہیں زیور پہناتے ہیں

دولہا کے سر پہ طرہ و دستار دھرتے ہیں
محفل میں ہنستے بولتے ہیں عیش کرتے ہیں

مانند ہالہ گرد ہیں اس رشک ماہ کے
مہندی لگی ہے ہاتھوں میں کپڑے ہیں بیاہ کے

آئی خبر یہ اتنے میں نوشاہ مر گیا!
افسوس بیوہ رات کی بیاہی کو کر گیا

شادی کے گھر میں ہونے لگا ماتم غضب
نوبت کی جا پہ سینہ زنی کر رہے ہیں سب

ہنستا ہے دیکھ کر ملک الموت ان کا حال
یعنی کہ اپنے مرگ کا ان کو نہیں خیال

کرتے ہیں یہ تو لاشۂ داماد پر بُکا
وہ بھی کسی عزیز پہ اک روز رو چکا

ان پر بھی ایک روز کوئی اور روئے گا
اس کے لیے بھی نوحہ گر ایک اور ہوئے گا[١٦]

اس کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

ایک حال پر قرار نہیں ہے جہان کو
گردش ہمیشہ رہتی ہے اس آسمان کو

جو آج پہلوان ہے کل ناتوان ہے
ہے شب کو تندرست سحر نیم جان ہے[۱۳]

لیکن یہی مفتی محمد عباس جب غزل کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو کہتے ہیں

شہیدِ عشق ہوا میں تو کیا تعجب ہے
ترا مزار پہ آنا بڑا تعجب ہے
تپش ہے قلب میں اور آہِ سرد ہے لب پر
یہ گرمی اور یہ ٹھنڈی ہوا تعجب ہے
گزر ہوا کا بھی ہرگز نہیں ہے اس گل تک
پیام وصل کا کس نے دیا تعجب ہے
طلب وہ کرتے ہیں جاتے نہیں ہو تم سید
عجب ہے آپ ہے ان سے جدا تعجب ہے[۱۸]

اور جب کبھی بچوں کو پاس بٹھا کر پہیلیاں بوجھتے ہیں تو اس طرح ؎

عجب نازنیں ہے وہ پردہ نشیں
کہ دیکھی ہے پر شکل دیکھی نہیں
نہ اس کو بچو ہے نہ اس کی زباں
بتاتی ہے کیا کیا وہ رازِ نہاں
چلی جاتی ہے وہ ٹھہرتی نہیں
مگر پھر جہاں تھی وہیں کی وہیں[۱۹]
(اس کا مطلب 'نظر' ہے)

اک دوسری پہیلی ملاحظہ ہو ؎

نہ دکھ ہے نہ ایذا ہے روتی ہے کیوں
یہ گھل گھل کے جاں اپنی کھوتی ہے کیوں[۲۰]
(اس کا مطلب 'شمع' ہے)

علاوہ بریں مفتی محمد عباس صاحب لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں بھی طاق تھے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ باہر بیٹھے تھے کہ ایک ضعیف خادمہ بہو جان سے یہ کہتی ہوئی نکلی :۔

"میرے گھٹنوں کا دم نکلتا ہے"

فوراً مفتی صاحب نے کہا :

"ایسا مصرع بھی کم نکلتا ہے"[۲۱]

ان تمام باتوں کے ساتھ مفتی محمد عباس چونکہ حریت پسند اور انگریز دشمن تھے، اس لیے انگریزوں نے انھیں چین سے نہیں رہنے دیا۔ اور انھوں نے لکھنؤ چھوڑ کر کئی سال کان پور، بنارس، کلکتہ وغیرہ میں پناہ گزیں کی حیثیت سے گزارے، لیکن آخر عمر میں پھر لکھنؤ آ گئے اور ۲۵ رجب ۱۳۰۶ھ مطابق مارچ ۱۸۸۹ء میں انتقال کیا۔ امام باڑہ غفران مآب لکھنؤ میں تدفین ہوئی۔[۲۲]

حواشی :

۱ مطلع الانوار از سید مرتضیٰ حسین فاضل۔ خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر کراچی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء ص ۵۵۸

۲ تجلیات از مرزا محمد ہادی عزیز۔ نظامی پریس لکھنؤ ۱۳۴۴ھ ص ۲

۳ مطلع الانوار ص ۵۵۸ ۴ مطلع الانوار ص ۵۵۹

۵ تجلیات ص ۷۶ ۶ مطلع الانوار ص ۵۵۹

۷ مطلع الانوار ص ۵۵۹

۸ سلطانِ عالم واجد علی شاہ۔ از مسعود حسن رضوی ادیب۔ نیر اکیڈمی لکھنؤ ص ۶۹

۹ تجلیات ص ۱۹۱

۱۰ تا ۱۳ بنیادِ اعتقاد۔ از مفتی سید محمد عباس۔ مطبع احمدی ۱۲۸۲ھ ص ۲

۱۴ بنیادِ اعتقاد ص ۵ ۱۵ بنیادِ اعتقاد ص ۷

۱۶ " " ص ۴۵ ۱۷ " " ص ۶۶

۱۸ تجلیات ص ۳۵۸ ۱۹ تجلیات ص ۳۷۱

۲۰ " ص ۳۷۳ ۲۱ " ص ۳۹۳

۲۲ مطلع الانوار ص ۵۶۲

غزلیں

میں نہ تھا کچھ ایسا مجرم جتنا رسوا ہوگیا
میرے قد سے کتنا لمبا میرا سایا ہوگیا

چڑھتا سورج ڈھل گیا وہ آج تنہا ہوگیا
مجھ کو رسوا کرنے والا خود ہی رسوا ہوگیا

میری جانب سے نگاہیں جب سے تم نے پھیر لیں
میرے دل میں ترکِ دنیا کا ارادہ ہوگیا

ہوگیا حیراں وہ مجھ میں عکس اپنا دیکھ کر
مجھ پہ ہنسنے والا آخر خود تماشا ہوگیا

حالِ دل مجھ سے نہ پوچھو پڑھ لو چہرے کے خطوط
کیا بتاؤں پہلے کیا تھا اور اب کیا ہوگیا

دوستوں کی دوستی کا بھی نہیں باقی بھرم
اے گلشن آئینۂ امید دھندلا ہوگیا

— گلشن نیازی
شکور احمد شمسی ہومیوپیتھک اسپتال
میرہ بازار۔ کانپور

نہ تھی اڑان میں طاقت مگر گئے کیسے
حدودِ کون و مکاں سے گزر گئے کیسے

جو زندگی کی فصیلوں پہ رقص کرتے تھے
وہ گر کے اپنے ہی قدموں پہ مر گئے کیسے

اندھیرے شام کے جن کو کبھی نگل نہ سکے!
وہ اپنے گھر کے اجالوں سے ڈر گئے کیسے

جو اپنے پاؤں کسی حادثے میں کھو بیٹھیں
سوال یہ ہے کہ وہ اپنے گھر گئے کیسے

وفا کے خون سے سرمد کی گر نہ تھی تخلیق
تو پھر اٹھائے ہوئے اپنا سر گئے کیسے

جو متحد تھے سمندر کی ریت کی مانند
وہ مثلِ موجِ تلاطم بکھر گئے کیسے

پناہ ڈھونڈ رہے تھے خلا میں وہ کاوش
تو پھر زمین پہ آخر اتر گئے کیسے

— کاوش الہ آبادی
۲۳۰۔ دائرہ شاہ اجمل
الہ آباد

چھپاؤ گے کہاں تک راز دل تم پارسا بن کر
محبت خود نگاہوں میں جھلکتی ہے حیا بن کر

جو بھر لیتا ہے اپنا دامنِ دل غم کے پھولوں سے
مہکتا ہے اسی کا پیالہ گلزارِ وفا بن کر

میں سمجھوں گا کہ میرا خون دل اب کام آیا ہے
ترے ہاتھوں پہ جس دم رنگ لائیگا حنا بن کر

غمِ دنیا کی ظالم دھوپ جب مجھ کو ستاتی ہے
تمہاری یاد آجاتی ہے ساون کی گھٹا بن کر

ملی اپنوں سے نفرت اور بیگانوں سے ہمدردی
ہماری زندگی بھی رہ گئی ہے کیا سے کیا بن کر

مرا دل جب سے ہے سرشارِ غم ان کی محبت میں
مجھے انجم ملی ہے ہر خوشی اک حادثہ بن کر

— انجم فاروقی
محلہ کھنین پورہ
ہردوئی

نئی سرکار جنتا کے دُوار

اُتّر پردیش کا ترقیاتی منظر نامہ

ادارہ

دیہی ترقی میں بینکوں کا اہم رول

" دیہی ترقی کے سلسلے میں بینکوں کا اہم رول ہوتا ہے ۔ ریاست کی بہت بڑی رقم بینکوں کی معرفت مختلف کھاتوں میں جمع ہوتی ہے جس کا فائدہ ترقیاتی کاموں کے توسط سے کسانوں تک پہونچتا ہے اس لئے بینکوں کے کاموں اور ان کی توسیع پر خصوصی توجہ دی جانا چاہیے ۔"

ان خیالات کا اظہار وزیر مالیات و پارلیمانی امور شری راجندر کمار گپتا نے وجیا بینک امپلائز ایسوسی ایشن کی ریاستی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کیا ۔

انھوں نے کہا کہ ملک اور ریاست کی ترقی کے لیے بینکوں کو خصوصاً کمزور طبقوں کی فلاح اور صنعت کاری پر توجہ دے کر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہوگا ۔

انھوں نے بینک کے ملازمین اور محنت کشوں کو ان کی ملازمت سے متعلق ضابطوں میں سدھار اور ان کے مطالبات کے سلسلے میں اپنے تعاون کی یقین دہانی کرائی ۔

نئی ہلر مشین پر پانچ سال کے لئے

چاول لیوی میں چھوٹ

لائسنس شدہ تاجروں اور چاول ملوں پر لیوی لگا کر چاول کی خریداری کی جائے گی ۔ لیوی کی شرح گورکھ پور اور وارانسی منطقوں میں اور بہرائچ، گونڈہ، پرتاپ گڑھ، سلطان پور، فیض آباد اور الہ آباد اضلاع میں ۴۰ فیصد اور باقی حصوں میں ۶۰ فیصد ہوگی ۔

وزیر غذا و رسد شری اعزاز رضوی نے بتایا کہ موجودہ پالیسی کے مطابق لیوی چاول کی وصولی کا کام ریاستی حکومت کا محکمہ غذا انجام دے گا ۔

شری رضوی نے کہا کہ جو ہلر مالک اپنی ہلر مشین کی جدید کاری کرا لیتے ہیں ان سے پانچ سال تک لیوی نہیں لی جائے گی ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مشرقی علاقوں کے لیے ان اضلاع میں جہاں اس وقت ۴۰ فیصد کی شرح پر لیوی نافذ ہے وہاں اگر کوئی چاول مل یکم اکتوبر ۱۹۹۱ء کے بعد قائم ہوئی تو وہ آئندہ پانچ برسوں تک لیوی سے مستثنیٰ رہے گی ۔ مقررہ شرح سے اقسام کی بنیاد پر لیوی میں چاول لینے کے بعد تاجر / چاول ملیں اپنے ریلیز شیئر کا چاول ریلیز سرٹیفکیٹ کے مطابق کھلے بازار میں فروخت کر سکتے ہیں ۔

کاشت کاروں کو قرض کی سہولت

اب اکاؤنٹ پے ای چیک کے ذریعے

اتر پردیش امداد باہمی زرعی اور دیہی ترقیاتی بینک کی جانب سے مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم کے تحت منتخب کاشت کاروں کو قرض اب " اکاؤنٹ پے ای چیک " کے توسط سے دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے ۔

اتر پردیش کے وزیر امداد باہمی شری سدھیر کمار بالیان نے یہ اطلاع دی ہے ۔

شری بالیان نے کہا کہ بینک سے قرض لینے والے ایسے کاشت کاروں کو اب پوری آزادی ہوگی کہ وہ کسی بھی تو بیاسے ہوئے یا امداد باہمی

بینک کی شاخ میں اپنا بچت کھاتہ کھول کر اس میں چیک جمع کر دیں اور ضرورت کے مطابق رقم حاصل کر کے پمپ سیٹ اور دیگر زرعی آلات اپنے من پسند ڈیلر سے خرید لیں۔ انھوں نے بتایا کہ پابندی صرف یہ ہے کہ پمپ سیٹ آئی۔ ایس۔ آئی مارک ہونا چاہیے۔

وزیر امداد باہمی نے بتایا کہ اس بندوبست کے نفاذ سے اب اس طرح کی شکایتوں یا بدعنوانی کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے کہ کاشتکاروں کو قرض کی مکمل رقم نہیں ملتی یا انھیں کسی مخصوص ڈیلر سے پمپ سیٹ اور زرعی آلات خریدنے کے لیے پابند ہونا پڑتا ہے۔

پینے کے پانی کی فراہمی کا جائزہ

دیہی علاقوں میں پینے کے صاف پانی کی صورت حال کا جائزہ حکومت ہند کے ذریعہ آئندہ یکم دسمبر سے لیا جا رہا ہے۔ یہ اطلاع محکمہ شہری ترقی کی جانب سے جاری کیے جانے والے ایک پریس نوٹ میں دی گئی۔

پریس نوٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ اتر پردیش میں جائزہ کا کام ریاستی حکومت کی نگرانی میں جل نگم کے توسط سے کرایا جا رہا ہے۔

دیہی عوام سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ جائزہ کے کام میں تعاون دے کر اس قومی پروگرام کو کامیاب بنائیں۔

امداد باہمی اور دیہی ترقیاتی بینک کے ذریعہ رہائشی قرضے

اتر پردیش امداد باہمی زرعی اور دیہی ترقیاتی بینک کے ذریعہ گڑھوال منطقہ کے پانچوں اضلاع میں زلزلہ سے متاثر کسانوں کو متعلقہ شاخوں کے توسط سے مکانوں کی تعمیر اور مرمت کے واسطے قرضے مہیا کرائے جا رہے ہیں۔

وزیر امداد باہمی شری سدھیر کمار بالیان نے بتایا کہ نئی عمارتوں کے واسطے ایک لاکھ روپیہ تک اور مخدوش عمارتوں کی مرمت کے واسطے تیس ہزار روپئے تک کے رہائشی قرضے دیئے جا رہے ہیں۔

امداد باہمی ہفتہ کا انعقاد

اتر پردیش میں قرض و زرعی سرمایہ کاری کی تقسیم میں گزشتہ برسوں کے مقابلے میں دو تین گنا اضافہ ہوا ہے اس طرح امداد باہمی تحریک کو زیادہ وسیع اور فعال بنایا جا رہا ہے۔

یو، پی کوآپریٹیو یونین کے زیر اہتمام ۳۸ ویں کل ہند امداد باہمی ہفتہ کے دوران منعقدہ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائٹیز نے یہ اطلاع دی ہے۔

رجسٹرار نے متعلقہ افسران، ملازمین اور عوامی نمائندوں سے اپیل کی کہ وہ امداد باہمی تحریک کو عوامی تقاضوں کے مطابق بنائیں۔ انھوں نے زور دیا کہ وہ ریاست کی امداد باہمی تحریک کو مہاراشٹر اور گجرات جیسی ریاستوں کی امداد باہمی تحریک کی مانند بنانے کے لیے سخت محنت کریں۔

مظفّر نگر میں ۲ نئی شکر ملوں کا قیام

اتر پردیش میں گنّے کی پیداوار کے پیش نظر حکومت اتر پردیش ریاست میں پچاس نئی شکر ملیں قائم کرنے پر غور کر رہی ہے۔

ریاست کے وزیر امداد باہمی شری سدھیر کمار بالیان نے مونا شکر مل میں پیرائی سیشن کا افتتاح کرتے ہوئے یہ اطلاع دی ہے شری بالیان نے کہا کہ مظفر نگر ضلع میں دو نئی شکر ملیں قائم کی جائیں گی اور مونا شکر مل کے احاطے میں ایک ڈسٹلری بھی لگائی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ نئی شکر ملوں کے قیام سے کسانوں کو بہت فائدہ پہونچے گا۔

وزیر موصوف نے کہا کہ ابھی کسانوں کو گنا کم قیمت پر فروخت کرنا پڑتا ہے لیکن نئی ملوں کے قیام سے کسانوں کا زیادہ سے زیادہ گنا یہ ملیں خریدیں گی اور انھیں گنّے کی اچھی قیمت ملے گی۔

"پہاڑی کیڈر" جلد

حکومت اتر پردیش۔ پہاڑی علاقے میں "ہل کیڈر" جلد ہی بنائے گی۔ وزیر ریاست برائے پہاڑی ترقی شری پورن چندر شرما

نے یہ اعلان گیرسینڈ (جھولی) میں اپر ڈائرکٹر تعلیم (پہاڑی) دفتر کے افتتاح کی تقریب میں ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔

شری شرما نے پہاڑی علاقے کی بے روزگاری کو دُور کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے سیاحتی مقامات کو فروغ دینے پر زور دیا۔

انھوں نے کہا کہ پہاڑی علاقے میں خالی اسامیاں جلد پُر کی جائیں گی۔ وزیر موصوف نے کہا کہ ریاستی حکومت جلد ہی پہاڑی علاقے کے دیگر دفاتر کو بھی اس علاقے میں منتقل کر دے گی۔

دیہی ترقی کو ترجیح
ضروری اقدامات

"بچے ملک کا مستقبل ہیں، اس لئے ان کی تعلیم تربیت ایسی ہونا چاہئے جس سے وہ اچھے شہری بن کر ملک وقوم کی خدمت کر سکیں۔" مذکورہ بالاخیالات کا اظہار وزیر ثانوی اور تکنیکی تعلیم، سائنس وصنعت شری راج ناتھ سنگھ نے مرزاپور ضلع کے جونیر ہائی اسکول تلیٹھی میں منعقدہ اساتذہ کی یونین کے اختتامی جلسے میں کیا۔

وزیر موصوف نے کہا کہ بچوں میں ترقی کا آغاز پرائمری اور جونیئر ہائی اسکول سے ہوتا ہے، اس لیے اساتذہ کو اس بنیاد کو مضبوط کرنے کے لیے آگے آنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت اسکولوں اور اساتذہ کے مسائل سے واقف ہے اور ان کے حل کے لیے ضروری اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

بابو اپردودھ انٹر کالج، لال گنج میں ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے وزیر تعلیم نے کہا کہ ملک کسانوں اور جوانوں ہی سے محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک دیہی عوام کا معیار زندگی بلند نہ ہوگا، تب تک ملک کی ترقی ممکن نہیں ہے۔

انھوں نے مزید کہا کہ حکومت دیہی ترقی کے لیے گاؤں، غریبوں اور پس ماندہ طبقات کو ترجیح دے رہی ہے اور اس کے لیے ضروری اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

گاؤں سبھا کی سطح پر
مناسب قیمت والی دُکانیں

خشک سالی سے متاثرہ علاقوں اور پہاڑی علاقوں میں مربوط قبائل درج فہرست ترقیاتی پروگرام اور خشک سالی والے علاقوں سے متعلق ترقیاتی پروگرام کے تحت منتخب علاقوں کی ہر گاؤں سبھا میں سستے غلے کی دکانیں کھولنے کی ہدایات متعلقہ ضلع مجسٹریٹوں کو جاری کر دی گئی ہیں۔

اترپردیش کے وزیر غذا و رسد شری اعزاز رضوی نے یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ للت پور، جھانسی، جالون، ہمیرپور، باندہ، گونڈہ، بہرائچ، سیتاپور، کھیری، الہ آباد، مرزاپور، سون بھدر، پوڑی گڑھوال، دہرہ دون، اترکاشی، نینی تال، الموڑہ اور پتھوراگڑھ کے ضلع مجسٹریٹوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ تین ماہ کے اندر سستے غلے کی دکانیں کھول دی جائیں۔

ریاست میں نیائے پنچایتوں کی تشکیل

اترپردیش میں نیائے پنچایتوں کی تشکیل دسمبر تک کر دی جائے گی اور گرام پردھانوں نیز نائب گرام پردھانوں کی تمام خالی جگہوں کو انتخاب کے ذریعہ جلد از جلد پُر کر دیا جائے گا۔

وزیر ریاست برائے پنچایتی راج شری کرشن سروپ ویش نے یہ اعلان بدایوں، کاکوری گنگا میلہ میں گرام پردھانوں کے ایک جلسہ میں کیا۔

انھوں نے کہا کہ گاؤں ریاست اور ملک کی ترقی کا محور ہے۔ موجودہ حکومت گاؤں کو اقتصادی اور سماجی اعتبار سے خود کفیل بنانے کے لئے ریاستی بجٹ کی ۷۰ فیصد رقم گاؤں اور دیہی باشندوں کی ترقی پر خرچ کرے گی۔

شری ویش نے بتایا کہ جلد ہی تمام گرام پردھانوں کے پاس

"گرام پنچکا" رکھی جائے گی۔ دیہی ترقی سے متعلق تمام افسران اس پنچکا پر ہر روز اپنے دستخط کریں گے اور گاؤں کا دورہ کرنے والے دیگر ضلعی سطح کے افسران بھی گاؤں میں اپنی حاضری اس کتابچہ میں درج کریں گے۔

منصوبوں کی مقررہ مدّتی عمل آوری پر زور

دیہی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کی پالیسیوں اور ہدایات واحکامات کے مطابق منصوبوں کی مقررہ مدتی عمل آوری کو یقینی بنایا جائے۔

وزیر ریاست برائے پنچایتی راج، شری کرشن سروپ ولیش نے جو اناؤ ضلع کے انچارج وزیر بھی ہیں۔ یہ بات ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے اناؤ ضلع کے افسران سے کہی۔ انھوں نے افسران سے کہا کہ ترقیاتی اور فلاحی اسکیموں کا فائدہ سبھی مستحق افراد اور ضرورت مند لوگوں تک پہنچانا ان کی خصوصی ذمّہ داری ہے۔

وزیر موصوف نے کہا کہ افسران اور ملازمین کو اپنا طریقۂ کار اور رویّہ بدلنا ہوگا تاکہ عوام کو تبدیلی کا احساس ہوسکے۔ انھوں نے کہا کہ کمزور اور غریب عوام کی دشواریوں کو ضرور سُنا جائے اور ان کے ازالے کے لئے فوری کارروائی کی جائے۔

شری سوشیل کمار ضلع مجسٹریٹ اناؤ نے بتایا کہ افسران کے گاؤں میں ٹھہرنے اور وہیں پر ان کے مسائل حل کرنے کے بہتر نتائج سامنے آئے ہیں۔

نگرپالیکا علی گڑھ اور اترولی کو سات لاکھ روپئے

حکومت اترپردیش نے نگرپالیکا علی گڑھ اور نگرپالیکا اترولی کو سڑک کی روشنی کا بندوبست اور صفائی آلات کی خریداری کے لئے موجودہ مالیاتی سال میں بالترتیب پانچ لاکھ اور دو لاکھ روپے کی خصوصی گرانٹ منظور کی ہے۔

یوگ کی اہمیت سے عوام کا باخبر رہنا ضروری

اترپردیش کے گورنر شری بی۔ ستیہ نرائن ریڈی نے مہانگر میں آنند یوگ سوسائٹی انٹرنیشنل کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ یوگ ہندوستانی تہذیب وتمدن کا حصہ ہے، ملک کے عوام زمانۂ قدیم سے ہی یوگ کی مشق کرتے رہے ہیں۔

گورنر نے کہا کہ ہم حالانکہ آج اتنا مصروف رہنے لگے ہیں کہ اپنے ویدک نظام زندگی اور یوگ تعلیم سے بے تعلق ہوگئے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ یوگ کی اہمیت عوام کو بتائی جائے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یوگ سوسائٹی اس سمت میں مفید ثابت ہوگی۔

نوجوان طبقے پر ہی ملک کے مستقبل کا انحصار

اترپردیش کے وزیر سماجی بہبود شری رام پتی شاستری نے طلبا اور نوجوانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ سیاست سے دور رہ کر اپنی طاقت ملک کی تعمیر وترقی میں لگائیں۔ انھوں نے کہا کہ نوجوانوں پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ان خیالات کا اظہار شری شاستری نے دبے کچلے طبقوں کے طلبا کی ریاستی تنظیم کے ایک وفد سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔

انھیں تنظیم کی جانب سے ۸ نکاتی مطالبات پیش کیے گئے جس پر شری شاستری نے فوری کارروائی کی یقین دہانی کرائی۔

□□

بک قافیہ رامائن ۔۔۔۔ صفحہ ۳۱ کا بقیہ

ہاتھ اٹھائے کلکِ رنگیں اب دعا کے واسطے
ہو سری رگھناتھ جی سے طالبِ امن واماں
گرگزارش ماہتاب آبرو بڑھتا رہے
سُرخرو رکھے افق کو آفتابِ رُوح وجاں
وردِ لب وردِ زباں، وردِ دہن ہر نام ہو
ہر یہ رامائن پسندِ خلق و مرغوبِ جہاں

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "غبارِ منزل"
شاعر: غلام ربانی تاباںؔ قیمت: ۴۵/- روپئے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی

بہتر کلام کی تخلیق میں کم گوئی کافی حد تک مددگار ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں معین احسن جذبی اور غلام ربانی تاباںؔ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ تاباںؔ گزشتہ پانچ دہائیوں سے شاعری کر رہے ہیں۔ لیکن اب تک ان کے کل چار مجموعے "ساز لرزاں" (۱۹۵۲ء) "حدیثِ دل" (۱۹۶۰ء) "ذوقِ سفر" (۱۹۷۰ء) اور "نوائے آوارہ" (۱۹۷۶ء) ہی منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کا تازہ مجموعہ "غبارِ منزل" دراصل ان کے گزشتہ مجموعوں کے انتخاب اور ۱۹۷۶ء کے بعد کی ان کی غزلوں پر مشتمل ہے۔

تاباںؔ نے اپنی کم گوئی کا خود اعتراف کیا ہے کہ "۱۹۷۶ء کے بعد مشکل سے سال میں دو غزلوں کا اوسط رہا۔" اگر صرف کلام کے حجم کو ہی بنانا ہوتا تو کوئی دشواری نہ تھی کہ تاباںؔ بھی عام شعراء کی طرح ادھر ادھر دوسرے یا تیسرے درجے کا کلام شائع کرتے رہتے۔

غلام ربانی تاباںؔ کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے ان کے گزشتہ تمام مجموعوں کو بے حد سراہا گیا ہے اور صفِ اول کے شعراء میں ان کی جگہ بن چکی ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار میری اس بات کی تائید کریں گے ؎

اتفاقاتِ زمانہ ہیں خزاں ہو کہ بہار
جو گزرنا ہے گزر جائے گی غم کیا کیجے

جذبۂ شوق کو اظہار کی فرصت نہ ملی
لفظ و معنی کا فسوں ٹوٹ گیا کیا کرتے

کرتی ہیں پھر سوال پشیماں نگاہیاں
دیکھیں جواب دے دلِ امیدوار کیا

دل یوں بھی بے نیاز کرم ہائے دوست تھا
کھا کر شکست اور بھی مغرور ہو گیا

شورہ دل کا ہے ہر تہمت گوارہ کیجے
ورنہ ہونٹوں کو ابھی یارائے گویائی بھی ہے

لب پہ سامانِ تبسم کی نمائش تاباںؔ
اور دل میں کئی ناسور بھی ہوتے ہوں گے

مجموعے کا نام "غبارِ منزل" کیوں رکھا گیا یہ تو معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ بقول فیضؔ "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" میرے خیال میں کم گوئی کے باوجود منزل ابھی آئی نہیں ہے۔ ابھی تو اردو شاعری کو ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ "غبارِ منزل" میں ان کی کچھ غیر مطبوعہ غزلیں شامل نہیں ہیں۔ غالباً مجموعے کا حجم اور قیمت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ ویسے سابقہ مجموعوں سے انتخاب میں کچھ کمی کر کے غیر مطبوعہ غزلیں شامل کی جا سکتی تھیں۔ شاید اگلے ایڈیشن میں اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

——— پرکاش چندر

نام کتاب: "نفی ضرب نفی"
شاعر: ساجد حمید قیمت: ۵۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: ۱۶۔ نہرو نگر۔ ساگر

"نفی ضرب نفی" ساجد حمید کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جس میں نظمیں اور غزلیں تقریباً یکساں تناسب سے ہیں اور یہ اس کا ثبوت ہیں کہ ساجد حمید کو نظم اور غزل دونوں سے دلچسپی اور دونوں پر دسترس ہے نوجوان اور جدید شاعر ہونے کے ناتے کلام میں جدت و جودت، رعنائی و برنائی، تخیلی پیکروں کی زیبائی، گریز پا فکر و احساس کی دل کشی، داخلی کرب

انتشار میں رموز زندگی کی ہم رکابی کا ذوق وشوق موجود ہے۔

شاعر کا تخیل بہت زرخیز ہے اور حالات وحوادث کو تیزی کے ساتھ محسوس پیکر عطا کر دیتا اور تصور کو تصویر بنا دیتا ہے۔ تشبیہات و استعارات ساجد حمید کا خاص سرمایہ ہیں جن میں وہ مستقبل میں مزید اضافے کریں گے۔

امید ہے کہ وہ اپنے فن میں مزید گہرائی وگیرائی، نظموں میں ارتکاز وارتقائی اور غزلوں میں ایمائی کیفیات پیدا کر سکیں گے۔

غزلوں کے بہت سے اشعار اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ نظموں میں خاص طور پر 'دعا'، 'میں پرانا ہوا'، 'یقین کی خوشبو'، 'الجھن' اور 'نوحۂ جاں' متاثر کرتی ہیں۔

________ شمس تبریز خاں

نام کتاب: **رموزِ زندگی**
شاعر: حاجی نعیم اللہ بیگ رسوا قادری وارثی
قیمت: پندرہ روپے
ملنے کا پتہ: حاجی نعیم اللہ بیگ رسوا قادری وارثی ۹/۲ ہاتھی خانہ فتح گڑھ ضلع فرخ آباد

'رموز زندگی'، حاجی رسوا کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ ان کے پہلے مجموعہ 'آوازِ دل' کو حلقہ ادب سے خاصی پذیرائی حاصل ہو چکی ہے۔

رسوا غزل کے شاعر ہیں مگر انھوں نے حمد، نعت، منقبت اور دوسری اصناف میں بھی کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شاعری کو محض قدیم، فرسودہ یا عشقیہ شاعری کہہ کر عصری تقاضوں سے بے نیاز سمجھنا اسے نہ سمجھنے کے برابر ہے۔

حاجی رسوا کے جذبات میں بے ساختگی، انداز فکر میں جدت، اظہار میں خلوص اور زبان میں روانی ہے اور یہی اچھی شاعری کے عناصر اربعہ ہیں۔

رسوا کی غزل محبوب کے عشوہ و ادا، راز و نیاز اور وصل و فرقت کے تنگنائے عشق میں محبوس نہیں ہے بلکہ اس میں سنجیدہ رومانیت اور جاذبیت ہے جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے اور ذہن و دل پر اثر چھوڑتی ہے۔

حاجی رسوا کی نعتوں میں عقیدت اور روحانی سرمستی نمایاں ہے۔ کتاب کی چھپائی عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ مختصر یہ کہ یہ ایک قابلِ مطالعہ اور قابلِ قدر کتاب ہے۔

غزلوں اور نعتوں کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں ؎

حقیقت دل کی سچ پوچھو تو اہلِ دل سمجھتے ہیں
ظہورِ جلوۂ محبوب کی منزل سمجھتے ہیں

کیا تماشا تھا کہ وہ خود ہی تماشائی تھا
حسن ہی بزم میں خود حسن پہ شیدائی تھا

مدعا جو کچھ تھا اپنا مجھ کو حاصل ہو گیا
عشق کی معصومیت پر حسن مائل ہو گیا

جذبۂ عشق و محبت کو نہ رسوا کیجیے
دل میں اس دولت کو ہر صورت سے اخفا کیجیے

ہجر کی خاموشیاں تھیں عشق کی تاثیر تھی
اپنے ہر آنسو میں پنہاں یار کی تصویر تھی

قدیم ہو گئے اب تک یہ روشنی دیں گے
نئے چراغ جلانا ہے زندگی کے لیے

صفاتِ خالقِ کونین کے مظہر محمد ہیں
خدا کے بعد یہ ایمان ہے برتر محمد ہیں
ہوا نورِ محمدؐ خلق سب سے پیشتر بے شک!
اسی باعث مجسم نور کے پیکر محمد ہیں

________ راجندر بہادر موج

نام کتاب: "امروز"
مصنف: یعقوب یاور کوٹی   قیمت: تیس روپے
ملنے کے پتے: (۱) نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ
(۲) بھوپال بک ہاؤس۔ بدھوارہ۔ بھوپال

زیر نظر کتاب "امروز" ۴۵ مضامین پر مشتمل ہے جو دراصل ان کالموں کا مجموعہ ہے جنھیں یعقوب یاور کوٹی نے دیوناگری رسم الخط میں شائع ہونے والے اخبار روزنامہ افکار بھوپال کے لیے ۹ فروری ۱۹۸۸ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء کے دوران لکھا تھا۔ جب ہم غائر نظر سے ان مضامین نما کالموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ بظاہر تو یہ محض ایک روزنامے میں لکھے گئے کالم ہیں لیکن درحقیقت یہ متعدد ایسے طویل ترین مضامین پر بھاری پڑتے ہیں جو عصری ادب، عصری تہذیب، پیچ در پیچ عصری سیاسی، تہذیبی، اخلاقی قومی، لسانی نیز فرقہ وارانہ مسائل پر خصوصیت سے اردو اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ امروز کے بیشتر مضامین کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ منطقی اور مدلل ہیں نیز ادبی، شعری، لسانی تہذیبی، قومی، اخلاقی اور فرقہ وارانہ مسائل پر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے ان کا طرز تحریر تجزیاتی ہوتا ہے۔

منطقی، مدلل، استدلالی اور تجزیاتی ہونے کے علاوہ امروز میں شامل اکثر مضامین کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ دیانت داری، خلوص اور بے باکی کے مظہر ہیں۔

یوں تو اس کتاب میں سنجیدہ تہذیبی، سیاسی، قومی، لسانی، مذہبی اور عوامی موضوعات پر فکر انگیز طریقے سے مصنف نے خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ لیکن ایسے مضامین کی بھی کمی نہیں ہے جن میں دل کش اسلوب اور دلچسپ انداز بیان میں بعض ادبی و شعری مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مثال میں "شاعر اور غیر شاعر" کا یہ اقتباس پیش ہے:-

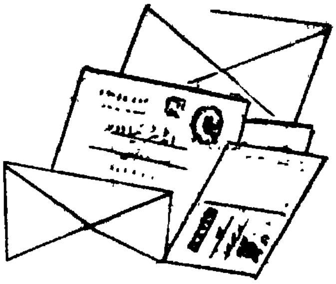
"غیر شاعر کا مرتبہ ہمارے جدید سماج میں شاعر سے بلند ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ مخلوق دلکش اور شیریں آواز کی خصوصیت رکھتی ہے اور یہ اکلوتی خصوصیت اسے دنیائے شاعری میں ایک بلند مرتبہ دلانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ایک بار ہم نے ہند و پاک کے ایک بلند پایہ شاعر سے ان دونوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا تو انھوں نے کہا "کسی طوائف کے تمول کا موازنہ شریف گھرانے کی غریب بہو بیٹیوں سے نہیں کیا جا سکتا"۔ شاید غیر شاعر کے لئے اس سے خوبصورت تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔"

اسی طرح ایک دوسرے مضمون "کرکٹ کا بخار" میں مصنف کی رائے کے مطابق:

"بچّے اسکول نہیں جا رہے ہیں اس لیے کہ انھیں کرکٹ کھیلنا ہے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سُن رکھا ہے کہ اچھا کھلاڑی بننے کے لئے پڑھا لکھا ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔ پڑھ لکھ کر ملتا بھی کیا ہے۔؟ بیکاری اور گھٹن جبکہ ایک جاہل کھلاڑی بھی لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ کتنا بے رس ہو گیا ہے حصولِ علم اور کتنا دل چسپ ہے کھیل۔ خواب ہی سہی، سنہرے ہوں تو اچھے لگتے ہیں۔ کم سے کم ٹیچر کی ڈانٹ ڈپٹ کے مقابلے میں ان کا سنہرا پن دلکش تو ہے، تو کون جائے اسکول۔"

مندرجہ بالا اقتباسات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ مصنف طنز ظرافت کو بھی فنی لطافت سے پیش کرنے پر قادر ہے نیز معاشرے میں فروغ پانے والی لعنتوں اور بدعتوں کا مشاہدہ اس نے نہایت عمق سے کیا ہے۔ بعض ادبی اور قومی شخصیات پر تحریر کردہ مضامین بھی اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ مصنف ادب شناس ہونے کے علاوہ مردم شناس بھی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض مقامات پر مصنف عصبیت کا شکار ہو گیا ہے نیز وفورِ جذبات سے مغلوب ہو گیا ہے جس کی وجہ سے بعض لسانی، قومی اور تہذیبی مسائل حالاتِ حاضرہ کے دیے پس منظر میں استدلالی اور تجزیاتی انداز میں پیش ہونے سے محروم رہ گئے ہیں۔ ان چند لغزشوں کے باوصف مجموعی اعتبار سے امروز لائقِ مطالعہ کتاب ہے کہ اس میں ہر نوع کے قاری کے ذوقِ سلیم کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ کتاب کی کتابت طباعت اور قیمت بھی غنیمت ہیں۔

——— جعفر عسکری



ہمارے نام.....

نیا دور کے لیے جو خدمت بن پڑے گی، اس کے لیے حاضر ہوں. لیکن یہ دوسری بات ہے کہ ادھر آپ کا موقر رسالہ عرصے نہیں آتا. جب (لکھنؤ) جانا ہوتا ہے تو اس کی زیارت سے مشرف ہوتا ہوں.

عبدالماجد دریابادی مرحوم کے نام مشاہیر ادب کے خطوط میرے پاس ہیں. مثلاً اثر صاحب، مسعود حسن رضوی صاحب، مرزا عسکری صاحب وغیرہ. اگر آپ پسند فرمائیں تو ان خطوط کو مع اپنے حواشی کے نیا دور کی نذر کردوں.

محمد هاشم قدوائی ______
نئی دہلی

اگست ۱۹۹۱ء کا شمارہ زیر مطالعہ رہا. آپ کی ادارت کے تحت یہ نیا دور کا پہلا شمارہ ہے جس کا ایک حصہ آزادی سے متعلق تخلیقات پر مشتمل ہے اور لائق مطالعہ بھی. دیگر مشمولات نظم ونثر آپ کے حسنِ انتخاب اور لطافتِ ذوق کے آئینہ دار ہیں.

عابد سہیل اور زین الدین حیدر کے ڈرامے متاثر کرتے ہیں.

دیگر مضامین بھی ادبی اعتبار سے باوقار ہیں.

مجھے امید ہے کہ نیا دور آپ کی ادارت میں مزید نکھرتا جائے گا.

مهدی پرتاپگڈھی ______
پرتاپ گڑھ

نیا دور پابندی سے پڑھتا ہوں. ستمبر کا شمارہ اتنی جلدی شائع ہونے پر بہت تعجب ہوا ورنہ کافی تاخیر سے نکل پاتا تھا. اس کے مضامین، نظمیں اور گیت آپ دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ نیا دور معیار کے اعتبار سے اپنی معراج پر پہونچ رہا ہے. اس کے لیے آپ لائق تحسین اور مبارکباد ہیں.

قومی یک جہتی پر نیا دور خاص نوعیت کے مضامین شائع کرتا ہے جو آج کی ضرورت ہے. عوام تک اتنے ستھرے ادبی مواد کا پہونچانا نیا دور ہی کا حصہ ہے.

سرفراز حسین ______
پرتاپ گڑھ

ہمارے محبوب ترین رسالے نیا دور کے جولائی اگست (۱۹۹۱ء) کے شمارے ایک ساتھ باصرہ نواز ہوئے. سبحان اللہ تمام تر تخلیقات اعلا معیاری ہیں. دونوں شماروں کی غزلیں، نظمیں افسانے، ڈرامے، تبصرے ذہن پر بار نہیں بنتے بلکہ غور و فکر کی نئی راہوں کی نشان دہی کرتے ہیں. میری جانب سے تمام تخلیق کاروں کو دلی مبارکباد پیش کردیں.

شهنشاه بانو فرحت ______
اجمیر شریف

نیا دور کے تین شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے. آپ کی محبت و عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں.

آپ نیا دور کے ذریعہ اُردو ادب کی جو خدمت کر رہے ہیں، اہلِ ذوق حضرات اس کے بارِ احسان سے سبک دوش نہیں ہو سکتے.

سرداری لال نشتر ______
شملہ

ہندستان سے شائع ہونے والے اُردو کے بے شمار رسائل میں نیا دور ہمیشہ ایک منفرد مقام کا حامل رہا ہے. آپ کی ادارت میں اگست ۱۹۹۱ء کا شمارہ ستمبر کے پہلے ہفتے میں ہی قارئین کے ہاتھوں میں پہونچ گیا یہ بات اور زیادہ قابلِ تعریف ہے.

اب امید ہو چلی ہے کہ رسالہ ہر ماہ پابندی سے بہترین مضامین اور غزلوں و نظموں کے حسین ترین انتخاب کے ساتھ قارئین تک پہونچتا رہے گا.

عارف علی ______
خیر آباد، سیتاپور

گوشۂ شیخ علی حزیں

عنوانات

کتابت و تزئین : حسن اختر لکھنؤ

جلد ۴۶ نمبر ۱۰

جنوری ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر

سید امجد حسین

ٹیلیفون : ۲۴۳۶۷۹

معاونین :

○ مجیب انصاری

○ محمد الیاس خاں

ٹیلیفون ۲۴۷۱۰۸

پبلشر

(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ

یونائیٹڈ بک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومتِ اترپردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

سال ۱۹۹۱ء طرح طرح کی دلفریبیوں سے رخصت ہوگیا۔ ۱۹۹۲ء کے نئے سال کی پذیرائی ہورہی ہے۔
ہم اپنے قارئین کو سالِ نو کی آمد پر خلوص و احترام کے ساتھ گلدستۂ سلام پیش کرتے ہیں،
اور دست بدعا ہیں کہ وہ پھلیں پھولیں اور ملک کی تعمیر و ترقی میں سرگرمی سے حصّہ لیں۔

ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ یہاں کی ایک ایک ریاست آبادی اور رقبے کے لحاظ سے بڑی
دنیا کے ایک ایک ملک کے برابر ہے۔ اقتدار کی رسّہ کشی کے لئے اختلاف رائے ہوسکتا ہے
لیکن ملک کی سالمیت اور یکجہتی کے لئے ہم سب کنیا کماری سے لے کر کشمیر تک ایک ہیں
ہماری آواز ایک ہے، ہمارا نظریہ ایک ہے اور ہمارا نعرہ بھی ایک ہے ——

ہندستان پائندہ باد!
جمہوریۂ ہند زندہ باد!

جمہوریۂ ہند نے بیالیسویں سال میں قدم رکھا۔ اگر حال کے آئینے میں ماضی کا مشاہدہ کیا جائے
تو ترقی و تعمیر کے اعتبار سے ہمارے ملک کا نقشہ ہی گویا بدل گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ سوئی
تک درآمد کی جاتی تھی۔ اب ترقی کا یہ عالم ہے کہ ہم ہوائی جہاز بنا رہے ہیں۔ خلا میں
راکٹ اور میزائل چھوڑ رہے ہیں۔

آبادی کے اعتبار سے بھی ترقی کرتے کرتے ہم اب آسمان چھونے لگے ہیں۔ اگر اسی رفتار سے آبادی
میں اضافہ ہوتا رہا تو ایک دن زمین تنگ ہوجائے گی۔ اور ہمارے لیے سانس لینا بھی دشوار ہوگا۔

جنوری کا مہینہ اس مناسبت سے بھی ہماری تاریخ کا ایک یادگار باب رہے گا کہ اسی مہینے ہمارے
باپو مہاتما گاندھی نے بقائے انسانیت کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کی۔

اسی مہینے میں ۷؍جنوری کو فارسی شاعر شیخ علی حزیں کے ۳سو سالہ جشن ولادت کا بھی اہتمام
کیا جارہا ہے جو نہایت ہی متبرک شہر بنارس میں محو آرام ہیں۔ اس موقع پر کل ہند
بہادر شاہ ظفر اکادمی کے جنرل سکریٹری صاحب نے ہمارے ساتھ جس تعاون
کا اظہار کیا ہم اس کے لئے شکر گزار ہیں۔ حزیں نے ہی تو کہا ہے ؎

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن پسر لچھمن و رام است اینجا

—— ایڈیٹر

سالِ نو

رباب و چنگ اُٹھاؤ کہ سالِ نو آیا
خوشی کا جشن مناؤ کہ سالِ نو آیا

نئے افق پہ نیا آفتاب آیا ہے
اُلٹ کے ظلمتِ شب کا نقاب آیا ہے
کتابِ زیست کا رنگین باب آیا ہے
رُخِ حیات پہ حُسن و شباب آیا ہے
نویدِ صبح سُناؤ کہ سالِ نو آیا
خوشی کا جشن مناؤ کہ سالِ نو آیا

نئی سحر نیا سُورج نئی کرن آئی
کلی کلی پہ جوانی نئی پھبن آئی
شفق کے سائے میں ناظورۂ چمن آئی
بہارِ لالہ و گل بُوئے نسترن آئی
چلو مہکتی ہواؤ کہ سالِ نو آیا
خوشی کا جشن مناؤ کہ سالِ نو آیا

سُناؤ بادِ خزاں کو بہار کا پیغام
نئی فضائے جہاں ہے نیا وطن کا نظام
ہے قافلہ نئی منزل کی سمت محوِ خرام
ادب سے پیش کرو سالِ نو کو نذرِ سلام
نیا ترانہ سُناؤ کہ سالِ نو آ
خوشی کا جشن مناؤ کہ سالِ نو

نظامِ نو سے کدورت کا انسداد کرو
وطن سے ختم یہ ہنگامہ و فساد کرو
نفاق دُور کرو پیدا اتحاد کرو
خلوصِ شیخ و برہمن پہ اعتماد کرو
فضائے امن بناؤ کہ سالِ نو آ
خوشی کا جشن مناؤ کہ سالِ نو آ

قدم قدم یہاں کاشانۂ مسرّت ہو
نظر نظر میں پیامِ خلوص و اُلفت ہو
کلی کلی یہاں آمادۂ محبّت ہو
روش روش پہ گمانِ بہارِ جنّت ہو
چمن چمن کو سجاؤ کہ سالِ نو آ
خوشی کا جشن مناؤ کہ سالِ نو آ

اقبال ماہر
۲۳۷، نخاس کہنہ۔ الہ آباد

قومی پرچم

اے ہمارے پرچمِ قومی تجھے لاکھوں سلام
ہے دُعا تجھ کو کرے مولا عطا عمرِ دوام

مظہرِ آزادیٔ ہندوستاں تیری اڑان
شوکتِ جمہوریت کا تجھ سے باقی ہر نشان
دیکھ کر تیری بلندی قوم کا ہے سر بلند
ارجمندی سے تری ہندوستاں ہے ارجمند
وقت کی کیا قید، ہو امروز، فردا یا کہ دوش
قوم کے دل میں ترا نظارہ بھر دیتا ہے جوش
بخشتا ہے اک مسرت جب بھی پھہراتا ہے تو
گرم ہوتا ہے لہو جس وقت لہراتا ہے تو
تین رنگوں سے ترے قوسِ قزح سی کھل گئی
تجھ سے اک مرکز پہ ساری قوم آ کے مل گئی
تو جو باقی ہے تو باقی قوم میں ہے اتحاد
مسلم و ہندو، سکھ و عیسائی ہیں سب لوگ شاد
پاٹتا ہے اختلافِ قوم کی کھائی کو تو
بخشتا ہے زندگی جذبوں کی یکجائی کو تو
تیرے نیچے ہم کھڑے ہو کر یہ کھاتے ہیں قسم
آج بھی ہم ایک ہیں کل بھی رہیں گے ایک ہم

ہے دُعا تجھ کو کرے مولا عطا عمرِ دوام
اے ہمارے پرچمِ قومی تجھے لاکھوں سلام

——— ناوکؔ حمزہ پوری
شیر گھاٹی۔ گیا (بہار)

بسلسلۂ یومِ جمہوریہ

ترنگا اپنے دیش کا بنا رہا ہے کہکشاں
ہوا ہے تازگی لیے فضا ہے روشنی لیے
نقیبِ وقت آ گیا پیامِ زندگی لیے
ترقیوں کی راہ سے گزر رہا ہے کارواں
ترنگا اپنے دیش کا بنا رہا ہے کہکشاں

جدھر نگاہِ شوق اٹھی بہار ہی بہار ہے
کلی بھی عطر بار ہے گلوں پہ بھی نکھار ہے
ادائے دل کشی لیے مہک رہا ہے گلستاں
ترنگا اپنے دیش کا بنا رہا ہے کہکشاں

اُبھار حوصلوں میں ہے ترنگ ولولوں میں ہے
بنا دیں دشت کو چمن یہ شور منچلوں میں ہے
ہر ایک ذرۂ وطن ہوا ہے رشکِ آسماں
ترنگا اپنے دیش کا بنا رہا ہے کہکشاں

ہے ذکر اتحاد کا، بیاں ہے انقلاب کا
ہر ایک آنکھ ہے لیے سماں حسین خواب کا
مگر وہ رنگ پیار کا وہ ایکتا ابھی کہاں
ترنگا اپنے دیش کا بنا رہا ہے کہکشاں

خلوص کے بغیر کچھ امیدِ بہتری نہیں
یہ کھوکھلی سی زندگی ہماری زندگی نہیں
جواں ہے آرزو تو کیا عمل بھی چاہیے جواں
ترنگا اپنے دیش کا بنا رہا ہے کہکشاں

حفاظتِ وطن میں جو شہید جان دے گئے
ہے فرض ان کے قول پر ہر ایک شخص دھیان دے
نہ گرنے پائے ہاتھ سے ہمارے دیش کا نشاں
ترنگا اپنے دیش کا بنا رہا ہے کہکشاں

نگاہ والوں کے لئے ہے شعرِ اطہرؔ آئینہ
ہمارے سارے مسئلوں کا حل فقط ہے ایکتا
پیامِ اتحاد کا امین رنگِ گلستاں
ترنگا اپنے دیش کا بنا رہا ہے کہکشاں

——— اطہرؔ نازش بخیا پوری
ساطھا لا جبری
شاہجہاں پور

ڈاکٹر آصفہ زمانی
شعبۂ فارسی۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

شیخ حزیں اور آثارِ حزیں

شیخ جمال الدین ابوالمعالی محمد علی متخلص بہ حزیں، ۲۷ ربیع الثانی کو اصفہان میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب پندرہ واسطوں سے شیخ زاہد گیلانی تک پہونچتا ہے۔ ان کے اجداد میں سے شیخ شہاب الدین علی نے ترک وطن کر کے دارالسلطنت لاہیجان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان ہی کے خاندان میں شیخ علی بن عطاء اللہ تھے جو اپنے زمانے کے معروف علماء میں سے تھے اور وحدت تخلص کرتے تھے۔ خان احمد خاں بادشاہ گیلان ان کی استعداد اور علم و فضل کی وجہ سے ان کی بہت تعظیم کرتا تھا۔ والد کا نام ابی طالب زاہدی لاہیجی جیلانی تھا۔ انھوں نے بیس سال کی عمر میں لاہیجان سے سفر کر کے اصفہان میں مستقل سکونت اختیار کی اور ۱۱۲۷ھ میں انہتر سال کی عمر میں یہیں انتقال کیا۔

شیخ حزیں اپنے والد کے سب سے بڑے بیٹے تھے، ان کے ایک بھائی نے بچپن میں اور دو بھائیوں نے عین عنفوانِ شباب میں رحلت کی۔

حزیں چار سال کی عمر سے تحصیل علم کی طرف راغب ہوئے اور فارسی نظم و نثر کی بیشتر کتابوں کا مطالعہ کیا نیز رواج زمانہ کے مطابق صرف و نحو اور فقہ و منطق کی تعلیم حاصل کی۔ شاعرانہ ذوق فطری تھا چنانچہ شعراء کے کلام کو بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے اور خود شعر کہنے کی مشق بھی شروع کر دی تھی۔ لیکن والد کی طرف سے شعر کہنے کی سختی سے ممانعت تھی اور استاد کی اجازت بھی نہ تھی کہ وہ شعر کہیں لیکن طبیعت کی جولانی شعر کہنے پر آمادہ تھی لہٰذا ابتدا میں چھپ چھپ کر شعر کہتے رہے۔ اپنے والد کے حسب منشا فنِ تجوید کا مطالعہ کیا اور قرأت بھی سیکھی۔ ان کے والد نے انھیں خود شرح جامی و نظام شرح ایساغوجی اور شرح شمسیہ نیز فقہ و حدیث کی تعلیم دی۔ انھوں نے تین سال تک شیخ خلیل اللہ طالقانی کی خدمت میں حاضر رہ کر ان سے بھی تحصیلِ علم کیا۔ شیخ خلیل اللہ طالقانی کو جب ان کی شعری صلاحیت کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھیں شعر کہنے کی ترغیب دی۔ حزیں انھیں کا عطا کردہ تخلص تھا۔ شیخ خلیل اللہ کی وفات کے بعد انھوں نے شیخ بہاء الدین گیلانی سے بھی درس لیا۔

حزیں کی عمر تقریباً دس سال کی رہی ہوگی کہ انھیں اپنے والد کے ہمراہ لاہیجان جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں وہ تقریباً ایک سال تک رہے۔ اس مدت کے دوران انھوں نے اپنے چچا شیخ ابراہیم زاہدی جیلانی (متوفی ۱۱۱۹ھ) سے رسالہ "خلاصۃ الحساب" کا درس لیا۔

تقریباً ایک سال بعد وہ اصفہان واپس آئے۔ یہاں انھوں نے اصفہان کے بعض علماء سے ہیئت، تفسیر، منطق، طب اور علم ہندسہ میں کسبِ فیض کیا۔

اگرچہ شیخ حزیں کو اپنے استاد کی طرف سے شعر کہنے کی اجازت مل گئی تھی لیکن والد کی طرف سے ان کی منشاء نہ ملنے سے انھیں کھل کر سامنے آنے سے تامل تھا۔ والد سے شعر کہنے کی اجازت کیوں کر ملی اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف "مخزن الغرائب" لکھتے ہیں کہ،

> "ایک روز اہل علم و فضل میں سے دو تین حضرات شیخ علی حزیں کے والد کے مہمان ہوئے ان میں سے ایک حزیں کو دیکھتے ہی بولے،" خدا کے فضل و کرم سے آپ کا بیٹا علم شعر میں دنیا میں مشہور ہوگا۔"

اتفاق سے اس مجلس میں گزشتہ شعراء کا ذکر شروع ہو گیا اور بات مولانا محتشم کاشی تک پہونچی۔ حاضرین نے محتشم کاشی کی بہت تعریف کی اثنائے گفتگو ان کا یہ مطلع ؎

ای گردنِ بلند قدان در کمند تو
رعنای آفریدہ قدّ بلند تو

زبان پر آگیا۔ مولانا حسن، جن کا شمار اس وقت کے عالم و فاضل اشخاص میں ہوتا تھا، اس مجلس میں تشریف فرما تھے حزیں کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

"صاحبزادے! ذرا اس مطلع کے جواب میں شعر تو کہو"۔ حزیں نے فی الفور یہ شعر کہا ؎

صید از حرم کشد خمِ جعدِ بلند تو
فریاد از تطاول مشکیں کمند تو

شعر پورا ہوتے ہی مولانا اُٹھے اور بے اختیار ان کی پیشانی چوم لی۔ دوسرے حضرات نے بھی ان کی بے حد تعریف کی۔ اس واقعہ کے بعد انھیں والد کی طرف سے شعر کہنے کی اجازت مل گئی"۔

لکھنے پڑھنے میں انہماک کا یہ عالم تھا کہ ایک بار گھوڑسواری کرتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑے۔ داہنے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور رہا کہ ایک سال تک کام نہ کر سکا۔ لیکن داہنا ہاتھ بیکار ہونے کے باوجود ان کا لکھنا پڑھنا موقوف نہ ہوا اور انھوں نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی عادت ڈال لی۔ اسی درمیان تقریباً ایک ہزار ابیات پر مبنی "ساقی نامہ" بائیں ہاتھ ہی سے لکھا۔

اصفہان کے بعض معروف ترین علماء و فضلاء سے ان کی شناسائی تھی ان میں مولانا محمد باقر مجلسی، میرزا علاءالدین محمد معروف بہ گلستانہ، شیخ جعفر قاضی، مسیح الزماں آخوند مسیحائی کاشانی، مولانا حاجی ابو ترابی، میرزا باقر قاضی، مولانا شمس الدین محمد وغیرہ شامل تھے، جن سے انھیں اکثر و بیشتر کسب فیض کے مواقع حاصل ہوتے رہتے۔

ان کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا جب دوسرے مذاہب اور فرقوں سے واقفیت حاصل کرنے کی جانب طبیعت رجوع ہوئی۔ چنانچہ شعیب نامی ایک مسیحی سے انھوں نے تورات کا ترجمہ پڑھا اور اسلام کے مختلف فرقوں سے آشنائی حاصل کی۔ شیخ علی حزیں نے کتب متداولہ کی تدریس کا کام بھی انجام دیا اور بعض مشہور کتابوں پر حواشی اور تعلیقات بھی لکھے، اور مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً رسالے بھی تصنیف کیے۔ اسی درمیان تقریباً سات آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ایک کلیات جس میں قصیدے، مثنوی، غزلیں اور رباعیات شامل تھیں، ترتیب دی۔ یہ ان کی پہلی کلیات تھی جو بعد کو تلف ہو گئی۔

شیخ علی حزیں کو شیراز کے علماء و فضلا سے بھی اکتساب علم کے مواقع حاصل ہوئے۔ ملا محمد شیرازی کی کتاب "حکمۃ العین" پر انھوں نے حواشی بھی تحریر کیے نیز دو رسالے "تحقیق غنا" اور "رسالہ منطق" تالیف کیے ۱۱۳۵ھ میں ایک نیا شعری مجموعہ بنام "مدۃ العمر" بھی ترتیب دیا۔ لیکن اصفہان کے آشوبی دور میں، جس میں ان کا کافی کلام ضائع ہوا۔ یہ مجموعہ کلام بھی نہ بچ سکا۔ انھیں فسا اور کازرون جانے کے بھی اتفاقات ہوئے جہاں انھیں علمائے وقت سے صحبت اٹھانے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اسی دوران انھوں نے ایک رسالہ "لوامع مشرقیہ" کے نام سے تالیف کیا۔ چند دیگر رسائل مسائل الٰہیہ کے متعلق بھی تالیف کیے۔

اصفہان میں انھیں مولانا صادق اردستانی سے بھی فیض صحبت رہا۔ شیخ علی حزیں نے اپنے تذکرہ "تذکرۃ المعاصرین" میں مولانا کی بہت تعریف کی ہے انھوں نے چند دیگر رسائل بھی لکھے جن کی فہرست اس طرح ہے:

رسالہ توفیق۔ رسالہ توجیہ الکلام۔ رسالہ ابطال تناسخ۔ شرح رسالہ کلمۃ التصوف از شیخ اشراق، حاشیہ بر الٰہیات شفا و فرائد الفوائد۔ حاشیہ بشرح ہیاکل النور اور رسالہ مدارج حروف وغیرہ۔ اسی دوران انھوں نے اپنی دوسری کلیات ترتیب دی جو تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل تھی۔ اور تقریباً ایک ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی "تذکرۃ العاشقین" بھی قیام اصفہان کے دوران تصنیف کی۔

۱۱۲۷ھ میں شیخ علی حزیں کے والد کا انتقال ہوا اور ان کے دو سال بعد ۱۱۲۹ھ میں ان کی والدہ نے بھی اس دار فانی کو الوداع کہا۔ والدین کے انتقال کے بعد انھوں نے شیراز کی طرف مراجعت کی او

یہاں اپنا تیسرا دیوان جو تین اشعار پر مشتمل تھا، ترتیب دیا۔

شیخ علی حزیں نے بصرہ، شوستر، خرم آباد اور کرمان شاہ کا بھی سفر کیا۔ کرمان شاہ کے قیام کے دوران انھوں نے طب سے متعلق رسالہ "مفرح القلوب" اور ایک رسالہ "تجرد نفس" تالیف کیا۔ انھیں بغداد، کربلا اور نجف اشرف کی زیارت کا بھی موقع ملا۔

چونکہ شیخ حزیں کا خط بہت صاف تھا اور بقول مصنف "تذکرہ حسینی" خط ثلث و نسخ و شکستہ میں مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے نجف اشرف میں رہ کر قرآن شریف کے نسخے کی کتابت کی اور اسے حضرت علی رض کے روضۂ مبارک پر پیش کیا۔ ۴۴-۱۱۳۵ھ کے دوران جب شاہ طہماسپ صفوی نے مشہد کو فتح کیا تو حزیں استرآباد سے مشہد پہونچے۔ یہاں رہ کر انھوں نے چند رسائل تالیف کیے اور اپنے چوتھے دیوان کی تکمیل کی۔ سعدی شیرازی کی "بوستاں" کے طرز پر انھوں نے ایک ہزار اشعار پر مشتمل ایک مثنوی بنام "خرابات" بھی کہی جو مکمل نہ ہوسکی۔

انھوں نے تین بار مکۂ مکرمہ جانے کا ارادہ کیا۔ پہلی بار ان کا جہاز طوفان باد و باراں میں گرفتار ہوگیا اور وہ نہ جا سکے۔ دوسری بار وہ راستہ ہی میں بیمار ہوگئے اور ارادہ ترک کردیا۔ ۱۱۴۳ھ میں تیسری بار حج کا ارادہ کیا اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔

۱۱۳۴ھ کا زمانہ اصفہان کے لیے اچھا نہیں رہا۔ محمود خاں افغانی نے اپنے حملۂ ایران میں اصفہان کو بھی تاخت و تاراج کیا۔ ان کے دو بھائی اسی قتل و غارت گری میں اللہ کو پیارے ہوگئے ۱۱۳۵ھ میں ترکوں کا حملہ ہمدان پر ہوا۔ حزیں ان حملوں سے دل برداشتہ ہوگئے۔ آخر ۱۱۴۶ھ میں ہندستان کا رخ کیا۔ ٹھٹھہ، ملتان ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ یہاں انھوں نے قضا و قدر سے متعلق ایک رسالہ "کنز المرام" تالیف کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان کے بھی سیاسی حالات ٹھیک نہ تھے۔ نادر شاہ کی شورش شباب پر تھی۔ تو توں ادھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ ۱۱۵۴ء میں انھوں نے "تاریخ احوال" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے ہندستانیوں کی خود خواہی اور خود غرضی کے متعلق نالہ و شیون کیا۔ ان کا یہ شعر اس سلسلے میں بہت مشہور ہے ؎

نشاس سیرتی است تمنّای مردمی
از دیو لاخ ہند کہ انساں نداشتہ است ؎

سراج الدین علی خاں آرزو کو شیخ علی حزیں کی یہ انانیت پسند نہ آئی اور انھوں نے ان کے دیوان کے بہت سے اشعار میں اغلاط کی نشان دہی کی اور ایک رسالہ "تنبیہ الغافلین" کے نام سے اسی سلسلے میں تالیف کیا۔ خان آرزو کے بھائی محسن علی نے بھی ایک کتاب شیخ علی حزیں کے اشعار میں انتقاد میں لکھی۔ اس کے علاوہ مولوی امام بخش صہبائی نے بھی "قول فیصل" اور "اعلامی حق" میں ان کے اشعار پر گرفت کی۔ لیکن ان نکتہ چینیوں کے برخلاف شیخ علی حزیں کے بہی خواہ اور معترف بھی ہندستان میں کم نہ تھے۔ ٹیک چند بہار، مرزا قتیل اور آزاد وغیرہ نے خان آرزو کے بہت سے اعتراضات کا جواب دیا اور کئی رسالے بھی ان معترضین کے جواب میں لکھے۔ لیکن وہ دلی کی رہائش سے تنگ آچکے تھے آخر مجبوراً دلی کو ترک کرکے آگرہ چلے گئے وہاں سے بنارس کا رُخ کیا اور وہیں کے ہو رہے۔ "تذکرہ مردم دیدہ" کا مؤلف لکھتا ہے کہ ــــ

"بنارس میں وہ امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے"۔ ہندستان میں بحیثیت شاعر انھیں خاص عزّت و شہرت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ ہند (۱۱۷۳-۱۲۲۲ھ) شجاع الدولہ وزیر اودھ اور میر قاسم ناظم بنگالہ نے حزیں سے ملاقات کی خواہش کی اور یہ ملاقاتیں اس لحاظ سے اہم ہیں کہ اس میں انھوں نے انگریزوں سے جنگ نہ کرنے کی درخواست بھی کی تھی۔ ؎

بنارس میں شیخ علی حزیں نے اپنا مقبرہ خود بنوایا تھا۔ ان کا انتقال ۱۱ر جمادی الاوّل کی شب کو ۱۱۸۰ھ میں ہوا، اور وہ اپنے بنوائے ہوئے مقبرہ میں دفن ہوئے۔ ؎

مؤلف خزانۂ عامرہ نے ان کی تاریخ وفات پر یہ قطعہ نظم کیا

علامہ عصر و شاعری خوب
افسوس کہ از میانہ برخاست
تاریخ وفات او نوشتم
از فوت حزیں، حزیں دل ماست

شیخ علی حزیں کی قبر پر خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ کتبہ آویزاں ہے جو انھوں نے اپنی زندگی ہی میں لکھا تھا۔

زباں دانِ محبت بودہ ام دیگر نمیدانم
ہمیں دانم کہ گوش از دوست پیغامی شنید اینجا
حزیں از پای رہ پیما بسی سرگشتگی دیدم
سرِ شوریدہ بر بالیں آسائش رسید اینجا

ہندستان میں شیخ علی حزیں کو تین گروہوں سے سابقہ رہا۔ اول وہ گروہ جو ان کا سخت نکتہ چیں تھا، دوسرا وہ گروہ جو ان کا ہم نوا تھا اور تیسرا وہ گروہ جو کسی گروہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ ہم یہاں تینوں گروہوں کے اشخاص کی آرا نقل کرتے ہیں تاکہ حزیں کو سمجھنے میں آسانی ہو

پہلے سراج الدین علی خاں آرزو کی رائے ملاحظہ ہو جو حزیں کے مخالفین میں سے تھے "مجمع النفائس" میں لکھتے ہیں:

"نادر شاہ کے ایران پر حملہ آور ہونے کے بعد۔ نارسائی روزگار کی بنا پر شیخ علی حزیں نے ہندوستان جنت نشان کی طرف رُخ کیا، جس وقت نادر شاہ دلی پر حملہ آور ہوا حزیں گم نامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ افواج شاہی رخصت ہونے کے بعد ظاہر ہوئے لیکن کوئی بھی ان کا قدر داں نہ تھا۔ ایران واپس جانا چاہتے تھے لیکن لاہور سے پھر واپس آگئے۔ طبع ناساز کی وجہ سے وطن و غربت سب برابر ہے۔ .... تعجب یہ ہے کہ شیخ مذکور نے ایک رسالہ اپنے حسب نسب اور سیر و سفر سے متعلق تالیف کیا ہے جس میں انھوں نے بلند و بالا دعوے کیے ہیں اس رسالہ کی غرض و غایت یہ ہے کہ انھوں نے اسے اہل ہند کی مذمت میں لکھا ہے۔ حالانکہ ہندوستان جنت نشان کے لوگوں میں سے کسی نے ان کی بُرائی نہیں کی۔ افسوس انھوں نے یہاں کے رہنے والوں کے متعلق اس طرح لکھا .... ان کے دیوانِ چہارم کا مطالعہ کیا۔ کہنے کو شیخ مذکور فاضل اور صاحب تصانیف ہیں لیکن ان کی کسی تصنیف سے علم و حکمت و کلام ہرگز نظر نہیں آتا۔".....

اب والہ داغستانی کی رائے ملاحظہ ہو جو شیخ حزیں کے خاص دوستوں میں تھے، "ریاض الشعرا" میں لکھتے ہیں:۔

"باوجود خان آرزو کی گرفت کے، واقعہ یہ ہے کہ شیخ کا شمار عصر حاضر کے سرآمد شعرا میں ہوتا ہے...."

غلام حسین خاں مولف سیر المتاخرین بھی حزیں کے عقیدت مندوں میں تھے ان کے فضل اور تبحر علمی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حقیر فقیر نے شیخ علی حزیں سے بہتر اس زمانے میں کسی کو نہیں پایا۔ عرب و عجم میں تمام علوم ظاہر و باطن کے لحاظ سے ان جیسا ملنا مشکل ہے۔"

خوشگو اگرچہ خان آرزو کے شاگردوں میں سے تھے لیکن حزیں سے عقیدت رکھتے تھے۔ "سفینہ" میں لکھتے ہیں:۔

"چند سال سے دارالخلافہ شاہجہاں آباد (دلی) میں زینت افروز ہیں اور ایک عالم ان کے برکات سے بہرہ اندوز ہے.... صوفی مزاج تفرد پیشہ ہیں۔ متقدمین میں سعدی، حافظ، شیرازی اور کسی حد تک فغانی سے علاقہ رکھتے ہیں۔ دوسرے تازہ گویان مثلاً صائب و سلیم و کلیم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ کسی شخص سے کوئی چیز قبول نہیں کرتے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت شیخ دستِ غیب رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔"

احمد علی سندیلوی مؤلف "مخزن الغرائب" لکھتے ہیں:۔

....."اکثر حضرات جو ایران سے ہندوستان آئے کہتے ہیں کہ شیخ کے اشعار وہاں پسند نہیں کیے جاتے جائے تعجب ہے کہ باوجود ...... سلاست کے، کہ ان کے کلام میں موجود ہے، پسند نہ کرنا کیا معنی؟ ان جیسا صاحب کمال شاعر اس زمانے میں کوئی دوسرا نہیں..... حضرت شیخ بسبب ترفع اور علوئے شان

اکثر لوگوں سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا بازار سرد ہے۔ پائے تخت کے اکثر شاعر ان کے متعلق نادرست بات کہتے ہیں اور اکثر تو ہجو بھی کرتے ہیں۔ کشمیر کے لوگوں نے بھی رکیک ہجو کی ہے ...... بنارس میں اقامت گزیں ہیں۔ وہاں کے لوگ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ان کی خاکِ پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں سے لگاتے ہیں اور دور و نزدیک سے ان کی زیارت کو آتے ہیں۔ مجھے بھی شیخ سے شرفِ صحبت حاصل ہوا ان کے خرچ کے بارے میں جو ہزار روپیہ تک ہے، لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ ہندستان کے عام آدمی اور اکثر خواص بھی ان سے عقیدت رکھتے ہیں۔ شیخ حزیں کشف و کرامات کے آدمی تھے جیسا کہ "آرائشِ محفل" (تالیف ۱۲۱۹-۲۰ھ) میں مذکور ہے کہ خدا کی طرف سے حزیں پر الہام ہوتا تھا......"

اب ان کی آراء ملاحظہ ہوں جن کا موافقین و مخالفین کسی گروہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عبدالحکیم حاکم "مردم دیدہ" میں لکھتے ہیں:۔

"...... بنارس میں دو مرتبہ شیخ محمد علی حزیں کی خدمت میں پہونچا۔ ان کے حالات و کمالات کیا لکھوں کہ ہندستان و ایران دونوں جگہ شہرت رکھتے ہیں۔ فی زمانہ ان کا کوئی ہم سفر نہیں۔ اگرچہ خان آرزو نے "تنبیہ الغافلین" میں ان کی گرفت کی ہے لیکن یہ ستم ظریفی ہے البتہ بعض جگہ ان کی گرفت بجا ہے۔"

میر حسین دوست "تذکرہ حسینی" میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں،

"...... ان کے اشعار حسنِ محاورت کے لحاظ سے بے نظیر ہیں۔ خطِ نسخ، رقاع اور شکستہ میں مہارت رکھتے ہیں۔ ژند و پاژند کو خوب سمجھتے ہیں چونکہ انھوں نے اپنے مقابلے میں ہندوستانی شعرا کو کوئی اہمیت نہ سمجھی اس لیے لوگ ان سے عداوت رکھتے ہیں...... صرف نظر اس بات کے انصاف تو یہ ہے کہ شیخ تقدس و صفا و ورع کے حامل ہیں۔

فقیر (مؤلف) نے ان کے ایک دیوان سے جو ہندستان کی تصنیف ہے، قریب میں ہزار ابیات پر مشتمل ہے انتخاب کیا ہے ......"

مسٹر ریمنڈ (Mr. Raymond) مترجم سیر المتاخرین جنھوں نے شیخ علی حزیں سے ملاقات بھی کی تھی، ان کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں "صاحب فہم و دانش" جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے:

حزیں نے اپنے چاروں دیوانوں کا ذکر "تاریخ احوال" میں کیا ہے لیکن ان کے ابتدائی تین دیوانوں کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ صرف چوتھا دیوان جو ہندستان میں ترتیب دیا گیا تھا، دستیاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں، دوسرا تہران میں موجود ہے "تذکرۃ المعاصرین" کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر مؤلف نے ذکر کیا ہے کہ اس دیوان کو انھوں نے ۱۱۵۵ھ میں ترتیب دیا۔ اس کلیات میں قصائد، غزلیات متفرقات، رباعیات اور قطعات شامل ہیں اور مثنویاں بنام "چمن و انجمن"۔ "خرابات"۔ "مطمح الانظار"۔ "صفیر دل" (۱۱۴۳ھ) "فرہنگ نامہ" اور "ودیعۃ البدیعۃ" (۱۱۴۳ھ) بھی اس میں شامل ہیں۔

ان کی نثری تصانیف جن کے نسخے آج بھی موجود ہیں، اس طرح ہیں:۔

(۱) رسالہ در حقیقت و نفس و تجرد — اس کا ایک نسخہ بانکی پور پٹنہ میں موجود ہے۔

(۲) رسالہ زمین نامہ — اس کا نسخہ بھی بانکی پور میں موجود ہے۔

(۳) الصمد — تفسیر سورہ ۳۰ آیۃ ۱۶ بزبان عربی۔ انڈیا آفس میں نسخہ موجود ہے۔

(۴) شجر الطور فی شرح آیت النور۔ (تفسیر سورہ ۲۴، آیۃ ۳۵)

(۵) رسالہ در تحقیق معاد روحانی (بانکی پور پٹنہ میں نسخہ موجود ہے)

(۶) رسالہ در اوزان مثقال و درہم و دینار (بانکی پور پٹنہ میں نسخہ موجود ہے۔

(۷) رسالہ در مسئلہ حدوث قدم۔ (بانکی پور میں نسخہ موجود ہے)

(باقی صفحہ ۷۵ پر)

کاظم رضوی
بلڈز - نبض روڈ - وارانسی (بنارس)

مولانا شیخ علی حزیں

مولانا شیخ محمد علی حزیں نے ایران کے اصفہان شہر میں ۲۷ ربیع الآخر ۱۱۰۳ھ مطابق ۱۷ جنوری ۱۶۹۲ء کو آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد شیخ ابوطالب جیلانی کا شمار اصفہان کے دولت مند لوگوں میں ہوتا تھا، اپنی علمی بصیرت، خوش اخلاقی اور دولت مندی کے سبب مولانا کا خاندان عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ مولانا حزیں کے مورث اعلیٰ شیخ زاہد جیلانی صفوی دور حکومت میں ایران کے بادشاہ شیخ صفی الدین اردبیلی کے استاد تھے جس کے باعث شیخ حزیں کے خاندان کو شاہی مراعات بھی حاصل تھیں اور سماج میں اس گھرانے کی بڑی عزت تھی۔

غربا پروری، انسان دوستی اور ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کرنے میں شیخ حزیں نے کبھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جذبۂ جود و سخا نے ان کی تمام دولت کو ضرورت مندوں میں تقسیم کرا دیا۔ مولانا نے زندگی کو قریب سے دیکھنے اور اسے بخوبی سمجھنے کے لئے اصفہان سے باہر نکل کر ایران کے کئی شہروں کی سیر کی۔ جب اس سے بھی ان کی سیری نہ ہوئی تو وہ افغانستان کے راستے سے ہندستان تشریف لے آئے۔

شیخ حزیں ابھی ہندستان آئے ہی تھے کہ ۱۷۴۸ء میں نادر شاہ نے ہندستان پر حملہ کر دیا اور دہلی کو جی بھر کے تاراج کیا۔ اس وقت مغل تاجدار محمد علی شاہ دہلی کا بادشاہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی سیاسی بحران اور سماجی خلفشار کا شکار تھی۔ چاروں طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ان حالات میں نواب امیر خان انجام نے شیخ حزیں کو دہلی کے بادشاہ سے متعارف کرایا۔ دہلی کے قیام کے دوران شیخ حزیں کی ملاقات نواب شجاع الدولہ کے والد نواب صفدر جنگ سے ہوئی جو جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔

مولانا حزیں دہلی کے ماحول سے جلد ہی اکتا گئے لیکن چند دوستوں کے اصرار کی وجہ سے وہ دہلی چھوڑ نہ سکے تاہم دوستوں کا اصرار ان کو زیادہ دنوں تک دہلی میں روک نہ سکا اور وہ دہلی کو خیرباد کہہ کر بنارس آ گئے، جہاں سے فیض آباد پہونچے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اودھ پر شجاع الدولہ کی حکومت تھی اور شجاع الدولہ فیض آباد میں، جو اس وقت اودھ کا پایہ تخت تھا، مقیم تھے۔ جلد ہی شیخ علی حزیں شجاع الدولہ سے قریب آ گئے جہاں ان کی ملاقات اردو کے مشہور شاعر مرزا محمد رفیع سودا سے ہوئی۔

شیخ حزیں بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔ کچھ تو ان کی ذہانت اور کچھ اپنے وقت کے مشہور عالم ملا محمد اصفہانی کی شاگردی نے مولانا حزیں کے علمی و ادبی ذوق کو چار چاند لگا دیئے۔ حزیں صرف چار ہی سال کی عمر میں ملا محمد اصفہانی کی شاگردی میں آئے اور دو ہی سال میں عربی اور فارسی دونوں زبانیں لکھنے اور بولنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے ان زبانوں کے ادب پر قدرت حاصل کی۔ منطق کو انھوں نے خصوصی دلچسپی سے پڑھا۔ وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے اور عمر کے آٹھ سال پورے کرتے ہی حافظ قرآن بھی ہو گئے۔ ساتھ ہی فن قرأت پر بھی قدرت حاصل کی۔ اپنی محنت اور کوششوں کی بدولت انھوں نے جلد ہی مذہبیات، ریاضیات، منطق، فلسفہ، علم نجوم اور فقہ و شرح جیسے تمام علوم میں مہارت

حاصل کرلی۔

اپنے مزاج کی پاکیزگی، سادگی، سنجیدگی اور والدین نیز اساتذہ کی تربیت کے باعث مولانا حزیں کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔

اپنی صوفیانہ اور زاہدانہ طبیعت کی وجہ سے شیخ حزیں کی شخصیت اس طرح اجاگر ہوگئی کہ کوئی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا ان کی پاک طینتی، سادگی، ایمان داری اور شرافت کا جادو لوگوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونے لگا۔

مولانا حزیں کی محبت بلا لحاظ مذہب و ملت ہر شخص کے لیے تھی۔ ان کی نظر میں نہ کوئی ہندو تھا نہ مسلمان۔ اور یہی وجہ تھی کہ شیخ حزیں کے حلقۂ احباب اور معتقدین و مقلدین میں ہندو اور مسلمان سبھی شامل تھے۔ ــــــ یہاں تک کہ بنارس کے ہندو راجہ بھی ان کے مدّاح اور شاگرد تھے۔ راجہ بلونت سنگھ حزیں سے بے انتہا عقیدت رکھتے تھے یہاں تک کہ وہ اس صوفی منش کی کفالت بھی کرتے تھے۔ بنارس کے راجاؤں سے دوستی اور قربت کی وجہ سے مولانا حزیں ان راجاؤں کی درازیٔ عمر اور خوش حالی کے لیے دعائیں بھی کرتے تھے۔

شیخ صاحب کے اخلاق و اخلاص، محبّت اور انسان دوستی سے راجہ بلونت سنگھ اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اپنے بیٹے اور جانشین چیت سنگھ کو بچپن سے ہی شیخ حزیں کے پاس اخلاقیات کا درس لینے کے لیے بھیجتے تھے۔ شیخ حزیں راجہ کے بیٹے کو چاندی کے پلنگ پر بٹھاتے اور گرمیوں میں خود اپنے ہاتھوں سے پنکھا جھلتے تھے۔ راجہ کے بیٹے کو پنکھا جھلنے کے پیچھے شیخ حزیں کی ایرانی مہمان نوازی کا جذبہ کارفرما تھا، جہاں گھر آئے ہوئے مہمانوں کی اسی طرح سے عزّت افزائی کی جاتی تھی۔

شیخ حزیں کو شہر بنارس سے، جو اب وارانسی ہے، اس قدر لگاؤ تھا کہ ان کو ایک بار پٹنہ جانا پڑا لیکن ان کا دل وہاں بالکل نہ لگا اور وہ فوراً بنارس لوٹ آئے اور تادمِ آخر بنارس ہی میں رہے۔

بنارس کی سرزمین پر اپنی زندگی کے ۱۶ برس گزارنے کے بعد شیخ حزیں نے ۱۷۶۶ء میں بنارس ہی میں انتقال کیا اور وہیں کے مقامی فاطمین میں دفن ہوئے۔ فاطمین بنارس میں وہ جائے مقدسہ ہے جو رسول مقبول حضرت مصطفٰےؐ کی دختر اور حضرت علی کی زوجہ جناب فاطمہ زہرا کے نام سے منسوب ہے۔ اس جگہ کو عقیدت مند شبیہِ روضۂ جناب فاطمہ مانتے ہیں اور عقیدت و احترام کے پھول چڑھاتے ہیں۔

فاطمین میں جس جگہ شیخ حزیں دفن ہیں، اس مقبرہ کی شیخ حزیں نے اپنی زندگی میں خود ہی تعمیر کرائی تھی۔

شیخ حزیں کو ان کی فارسی شاعری سے بہت شہرت ملی۔ اور اپنے دور میں ان کا شمار فارسی کے بہترین شعرا میں ہوتا تھا انھوں نے بڑی تعداد میں فارسی غزلیں اور نظمیں کہیں۔ ایک مفکر اور ماہر مذہبیات کی حیثیت سے شیخ حزیں نے مختلف موضوعات پر تقریباً سو سے زیادہ کتابوں اور رسالوں کی تصنیف کی۔ ان کی علمی بصیرت اور قابلیت کے قائل ہندستان کے لوگ تو تھے ہی یورپ کے دانش ور بھی تھے۔ پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن نے اپنی کتاب "تاریخِ فارس" میں مولانا حزیں کی اہلیت اور صلاحیت کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ کتاب لندن کے آکسفورڈ پریس سے شائع ہوئی ہے۔ مشہور دانشور آزاد بلگرامی نے بھی اپنی تصنیف "خزانۂ عامرہ" میں مولانا کی ادبی و مذہبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے

بنارس کے راجہ کی خواہش پر مظہر حسن نے جو کتاب اُردو میں "تاریخ بنارس" کے نام سے لکھی اس میں بھی مولانا حزیں سے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا کو بنارس سے کس قدر محبت اور عقیدت تھی اس کا اندازہ ان کے فارسی کے اس شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ؎

از بنارس نہ روم معبدِ عام است ایں جا
ہر برہمن پسرِ لچھمن و رام است ایں جا

شیخ حزیں نے اپنی پوری زندگی خدا اور اس کی مخلوق کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ان کو بڑے عہدوں اور دولت کی ہوس نے کبھی متاثر نہیں کیا۔

(باقی صفحہ [illegible])

عزیز الحسن جعفری
۱۸ - تلک مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

خانہ بدوش ادیب

شیخ علی حزیں عربی و فارسی کے مشہور و معروف ادیب ہیں۔ ان کا بچپن عیش و آسائش کے ساتھ گزرا۔ لیکن عنفوان شباب میں قسمت نے انھیں دربدر پھرنے پر مجبور کر دیا۔ ایران کے کئی شہروں اور ایران کے باہر کئی ملکوں کی خاک چھاننے کے بعد انھیں ہندستان میں قرار نصیب ہوا انھوں نے موجودہ پاکستان کے کئی شہروں میں وقت گزارا۔ دارالسلطنت ہند، دہلی میں رہے اور پھر بنارس منتقل ہو گئے۔ بنارس انھیں ایسا پسند آیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے۔

نام و نسب

شیخ حزیں کا پورا نام جمال الدین عبدالمعالی محمد علی اور تخلص حزیں ہے۔ ان کے والد کا نام ابوطالب تھا۔ وہ اپنا مختصر نام "علی ابن ابی طالب" لکھتے تھے۔ یہی نام انھوں نے اپنی انگوٹھی پر بھی کندہ کرا لیا تھا۔ ممکن ہے حضرت علیؑ سے عقیدت و مودت کی بنا پر انھوں نے ایسا کیا ہو۔

حزیں کا سلسلۂ نسب پندرھویں پشت میں عارف بزرگوار شیخ زاہد گیلانی تک پہونچتا ہے۔ شیخ زاہد گیلانی سلسلۂ طریقت میں جلیل القدر خاندان صفوی کے سلطان اول صفی الدین اردبیلی کے پیر و مرشد اور ان کے ننہالی تھے۔ حزیں کے آبا و اجداد صدیوں سے گیلان کے قصبے لاہیجان میں اپنے علم و فضل کی بنا پر معروف اور محترم شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے والد ابوطالب بھی بہت متقی و پرہیزگار عالم دین تھے۔ وطن کی نسبت سے انھیں حزیں لاہیجانی کہا جاتا ہے۔

ابوطالب کی ہجرت و وفات

حزیں کے والد ابوطالب نے ۲۰ سال کے سن میں اپنے وطن لاہیجان کو خیرباد کہہ دیا اور تحصیل علم کے لیے اصفہان چلے گئے۔ اس عہد میں شہر اصفہان اپنی عظمت کے لحاظ سے بام عروج پر تھا۔ اساتید علم و فضل و ہنر مختلف مقامات سے یہاں آکر مجتمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ علم و فضل کے لحاظ سے اصفہان کو ایران میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

ابوطالب اصفہان کے علمی ماحول میں اتنا محو ہو گئے کہ وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ء) میں جب ان کی عمر صرف ۶۹ سال تھی، انتقال کر گئے۔ ان کے تین بیٹے تھے جن میں حزیں سب سے بڑے تھے اس وقت حزیں کا سن تقریباً ۲۳ سال تھا۔

حزیں کی ولادت و بچپن

حزیں ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۰۳ھ (۱۹ جنوری ۱۶۹۲ء) بروز دوشنبہ اصفہان میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حزیں کے خاندان اور اصفہان کے حالات بہت اچھے تھے۔ ہر طرح کی خوش حالی و خوش بختی ان کو گھیرے ہوئے تھی۔

حزیں کم سنی ہی سے حصول علم میں منہمک ہو گئے تھے، چنانچہ چار سال کی عمر میں ہی ان کی ابتدائی تعلیم کا دور شروع ہو گیا۔ آٹھ سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے انھوں نے تجوید و قرأت قرآن کی تکمیلات مکمل کر لیں۔ اس کے بعد اصفہان کے جید علما و فضلا سے انھوں نے حدیث، فقہ، تفسیر، منطق، طب اور ریاضی وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔

حزیں کا بچپن بہت آرام و آسائش میں گزرا۔ پڑھنے لکھنے اور سیر و تفریح کے علاوہ ان کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ اسی زمانے میں انھیں اپنے وطن لاہیجان جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اپنے والد سے انھوں نے اصرار کیا۔ ابوطالب انھیں اپنے ہمراہ لے کر لاہیجان گئے۔ وطن میں چار سال گزارنے کے بعد پھر اصفہان واپس آ گئے۔

شاعری کا شوق اور اس پر بندشیں

بچپن سے ہی حزیں کو شعر و شاعری سے خصوصی شغف تھا لیکن ان کے والد اور اساتذہ انھیں شعر گوئی سے روکا کرتے تھے۔ یہ سبھی بزرگ ویسے تو حزیں کے لیے لائق احترام تھے لیکن شاعری پر ان کے امتناعی احکامات سے وہ اتفاق نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ کھلم کھلا شعر گوئی کے بجائے وہ چھپ چھپ کر شعر کہتے رہے۔ اتفاقاً دو مواقع ایسے آئے جنھوں نے حزیں کو ان پابندیوں سے نجات دلادی۔

اول یہ کہ ابو طالب کے ایک دوست نے ان سے حزیں کی شعر گوئی میں مہارت کی بڑی ستائش کی۔ اپنے بیٹے کی تعریف میں دوست کے کلمات ابو طالب کو بہت اچھے لگے۔ اس واقعے کے بعد حزیں کی شاعری پر ان کا امتناعی فشار کم ہوگیا۔ مگر ابھی انھیں مکمل آزادی نہیں ملی تھی۔ دوسرے واقعے نے انھیں شاعر بننے کے لئے مکمل آزادی دلادی۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ ابو طالب کے گھر ان کے بہت سے دوست آئے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ لوگ حزیں کی شعر گوئی کی صلاحیت سے واقف تھے۔ اس محفل میں ایک شخص نے محتشم کاشی کا ایک شعر پڑھا اور حزیں سے خواہش کی کہ اس پر کوئی فی البدیہہ غزل کہیں۔ حزیں نے فی البدیہہ غزل کہہ ڈالی، جس پر سبھی نے دل کھول کر داد دی۔ ان کے والد بھی بیٹے کی اس صلاحیت کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔ اس محفلِ غزل گوئی کے بعد تو حضرت حزیں تمام بندشوں سے آزاد ہوگئے اور اب انھیں اپنے اشعار کو چھپانے کی ضرورت نہیں رہی۔

علمی و ادبی مقام

حزیں عربی و فارسی ادبیات میں استادانہ مہارت رکھتے تھے وہ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شاعری کے میدان میں انھیں عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ فارسی شاعری کے تقریباً سبھی اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی وغیرہ میں انھوں نے طبع آزمائی کی۔

حزیں کا علمی مقام بہت بلند تھا۔ انھوں نے اسلام، عیسائی، یہودی اور زرتشتی مذاہب کا وسیع مطالعہ کیا اور مختلف ادیان کا خلاصہ و تقابلی تجزیہ پیش کیا۔ کتب و رسائل کی تالیفات اور اشاعت کا انھوں نے خاص اہتمام کیا تھا۔ مگر ابتلاء و بحرانِ زمانی و مکانی میں ان کی تالیفات گم ہوگئیں۔

ان کی کتاب "تذکرۃ الاحوال" (تاریخ حزیں) کی تکمیل ۱۱۵۴ھ میں ہوئی۔ اس وقت تک ان کے چار دیوان تیار ہو چکے تھے اور کئی ہزار اشعار مختلف موضوعات کے تحت منظر عام پر آچکے تھے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ان کی تاریخ نے اتنی شہرت پائی کہ ان کی تاریخ نویسی، شاعری پر سبقت لے گئی۔

"تذکرہ الاحوال" حزیں کی سرگزشت و خود نوشت ہے۔ اس میں انھوں نے وہ حالات و واقعات قلم بند کئے ہیں جو ایران میں ان کے مشاہدے میں آئے۔ اس میں کہیں کہیں انھوں نے اپنے ان تجربات و مشاہدات کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو ہندوستان میں انھیں پیش آئے۔ حزیں کے دیگر آثار میں "تذکرۃ المعاصرین" تالیف ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) "فرس نامہ" (گھوڑوں کی خصوصیات کے بارے میں)، "خواص الحیوان" (حیوان شناسی) اور ایک رسالہ مروارید کے بارے میں بھی تحریر کیا تھا۔

حزیں کے آثار کی تفصیلی فہرست ڈاکٹر سید علی رضا کی کتاب "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان"[۵۵] میں درج ہے۔ اس کے علاوہ متعدد ادیبوں اور محققوں نے حزیں کے بارے میں اجمال و تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ فرہنگ سخنوران[۵۶] میں ایسے تذکرہ نویسوں کے تقریباً ۳۰ حوالے دیے گئے ہیں۔ لغت نامہ دہخدا[۵۷] میں شیخ حزیں کی حیات کو مجملاً بیان کیا گیا ہے اور ان کے اہم آثار کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

دیگر اوصاف

حزیں غیور، باحمیت، بلند ہمت، ماہر حرب جواں مرد دلاور و بردبار اور حادثات و نا مساعد حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے انسان تھے۔ ایران کے انقلابات میں انھوں نے بہ نفس نفیس حصہ لیا۔ حتیٰ کہ جدال و قتال کے موقعوں پر ستم گروں کے مقابلے میں ستم رسیدہ افراد کے حامی بن جاتے تھے، جس کے نتیجہ میں ان کے دشمن بک

تعداد میں اضافہ ہوجاتا تھا۔

حزیں جس جگہ بھی رہے علما، امرا اور عوام سب کے لیے نمایاں طور پر قابل احترام رہے۔ وہ آزادی پسند انسان تھے اور جاہ و منصب نیز مال دنیا کی طرف ملتفت نہیں ہوتے تھے۔ ۵۲ سال کی عمر تک تو انھوں نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ اس کے بعد کی یا نہیں اس کا کچھ ذکر نہیں ملتا۔

افغانی حملہ۔ دور ابتلا کا آغاز

جب حزیں کا سن ۳۲ سال تھا تو حملۂ افغان کا جاں سوز واقعہ پیش آیا۔ محمود خاں افغانی نے ۱۷۲۴ء میں اصفہان کا محاصرہ کرلیا۔ اسی وقت سے حزیں کا دور ابتلا شروع ہوگیا۔ محاصرے کے دوران حزیں شدید بیمار تھے۔ محمود کے اصفہان پر قبضے کے چند روز قبل ہی وہ اصفہان سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔

شہر اصفہان ۹ ماہ تک قحط و محاصرے میں مبتلا رہا۔ ہر چیز آتش بیداد میں جلائی جارہی تھی، لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، ان کے پس ماندگان سرگرداں و پریشان ہوکر اطراف عالم میں آوارہ وطن زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔

حزیں کے دو بھائی، نانی اور چند اعزا اس محاصرے کے دوران قحط و بیماری کی وجہ سے موت کے آغوش میں جاچکے تھے تن تنہا حزیں داغدیدہ، نیم جاں، ہزار ہا رنج و مصائب کا بوجھ اٹھائے ہوئے کسی طرح اس محاصرے سے نکل کر قصبہ خوانسار پہونچے۔

خانہ بدوش زندگی

اصفہان چھوڑنے کے بعد حزیں نے دس سال سے زیادہ عرصے تک خانہ بدوشوں جیسی زندگی بسر کی۔ پریشان حال، رنجور و تہی دست حزیں ایران کے لرستان، ہمدان، نہاوند، دزفول اور شوستر شہروں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھرے مگر جہاں بھی گئے ایران کو جلتا ہوا پایا۔

دیگر ممالک میں حجاز، عراق، یمن، مسقط اور بحرین وغیرہ میں پناہ تلاش کی مگر کہیں بھی امن و سکون نصیب نہیں ہوا۔ ان ممالک کے سفر سے واپسی پر کرمان، مشہد، کردستان، آذربائیجان اور گیلان ہوتے ہوئے تہران پہونچے۔

تہران سے انھوں نے پھر اصفہان مراجعت کی۔ لیکن اب یہ شہر ویران ہوچکا تھا۔ ان کا کوئی دوست شہر میں باقی نہیں رہا تھا، چنانچہ وہ وہاں سے شیراز چلے گئے۔ مگر اس شہر کی حالت بھی اصفہان کی طرح خستہ ہوچکی تھی۔ آوارہ وطن حزیں نے شیراز کو بھی خیرباد کہہ دیا اور لار یہ ہوتے ہوئے بندر عباس پہونچ گئے۔ وہاں سے وہ حج کے لیے حجاز جانا چاہتے تھے لیکن وسائل فراہم نہ ہونے کی وجہ سے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

اسی دوران ایک غیر ملکی جہاز مسقط جارہا تھا، حزیں اس پر سوار ہوگئے اور اسی سے پھر بندر عباس واپس آگئے۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے کرمان کا سفر کیا۔ لیکن اس شہر پر بھی خوف و ہراس کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ مجبوراً پھر واپس بندر عباس آگئے۔ اس بار ان کا ارادہ بندر عباس سے بغداد ہوتے ہوئے حجاز جانے کا تھا۔

یہ وہ دور تھا جب نادر شاہ تخت نشین ہوا تھا اور پورے ایران کو اپنے تسلط میں لے آیا تھا۔ وہ ۱۷۳۳ء سے ۱۷۳۵ء تک ترکوں سے جنگ میں مشغول رہا۔ شروع میں ترک حاوی رہے لیکن جلد ہی نادر شاہ فتحیاب ہوگیا۔ حزیں نے محسوس کیا کہ صرف حجاز ہی ان کے لیے راہ نجات ہے لیکن جنگوں نے اس کے راستے کو بھی مسدود کردیا تھا۔ وہ ان حالات سے سخت رنجیدہ ہوئے اور حج کے لئے جانے کا ارادہ ترک کردیا۔

عازم سفر ہندستان

حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد حزیں نے حج بیت اللہ کا خیال چھوڑ دیا اور ہندستان کی طرف ملتفت ہوگئے۔ جس زمانے میں وہ کرمان میں تھے۔ علی قلی خاں داغستانی سے، وہاں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی حزیں کی طرح ایران کی بدحالی سے دل تنگ اور بہ دل ملول تھے۔ حزیں کی موجودگی میں ہی علی قلی خاں حالات سے تنگ آکر ہندستان کے لیے روانہ ہوچکے تھے اور سندھ کے مقام تتہ پر آکر مقیم ہوگئے تھے۔

حزیں ۴ر فروری ۱۷۳۴ء کو عازم سفر ہند ہوئے اور ٹھٹہ میں ہی علی قلی خاں کے پاس قیام کیا۔ وہاں سے سہوان، خدا آباد اور بکھر ہوتے ہوئے ملتان پہونچے۔ ملتان سے لاہور کے راستے دہلی وارد ہوئے۔ دہلی میں چند روز قیام کرنے کے بعد پھر لاہور واپس ہوگئے۔ اثنائے سفر انھیں نادر شاہ کے حملے کی خبر مل گئی۔ چنانچہ تیز رفتاری کے ساتھ پھر دہلی واپس آگئے۔

جن دنوں نادر شاہ دہلی کی سلطنت کو تاخت و تاراج کر رہا تھا، حزیں علی قلی خاں کے گھر ہی میں مقیم تھے۔ جب نادر شاہ ایران واپس چلا گیا تو شیخ حزیں بھی دوبارہ لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ لاہور کا حاکم زکریا خاں کسی وجہ سے حزیں کا دشمن ہوگیا اور قریب تھا کہ وہ حزیں پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑ دے کہ حسن اتفاق سے حسن علی خاں کاشی، جسے محمد شاہ نے اپنا سفیر بنا کر نادر شاہ کے پاس بھیجا تھا، لاہور وارد ہوگیا۔ اس کی شیخ حزیں سے ملاقات ہوئی اور وہ انھیں اپنے ہمراہ بحفاظت دہلی لے آیا۔

دہلی دربار میں رسائی

دہلی دربار میں حزیں کی رسائی عمدۃ الملک امیر خاں متخلص بہ انجام کی وساطت سے ہوئی۔ سلطان محمد شاہ نے حزیں کو بہت بڑی جاگیر بطور تحفہ عطا کی۔

آخری ایام

شیخ حزیں نے حج و زیارات سے مشرف ہونے کا پھر ارادہ کیا۔ اس تمنا کو لیے ہوئے وہ دہلی سے بنگال کے لئے روانہ ہوئے۔ لیکن عظیم آباد (پٹنہ) سے ہی واپس آگئے۔ واپسی میں بنارس رُکے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ بنارس میں ان کی زندگی سب کے لیے لائق احترام تھی۔

شیخ حزیں نے ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) میں دنیائے فانی سے عالم بقا کے لیے آخری سفر کیا۔ انھوں نے زندگی ہی میں اپنی قبر تیار کرالی تھی اور اس پر مندرجہ ذیل قطعہ بھی کندہ کرادیا تھا ؎

زباں دان محبت بودہ ام دیگر نمی دانم
ہمیں دانم کہ گوش از دوست پیغامی شنید اینجا
حزیں از پای رہ پیمائی بسی سرگشتگی دیدم
سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید اینجا

اور وہ خانہ بدوش شیخ جس نے مورخین اور ادبا کے لیے ڈھیروں سرمایۂ علم چھوڑا، سرزمین بنارس پر ابدی نیند سو رہا ہے۔

ایک دعا شعر میں کر کبھی ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی ؎

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

اور یہ دعا درجۂ قبولیت تک پہونچ گئی۔ حزیں بنارس میں ہی ہیں، اور اپنی خواہش کے مطابق ہمیشہ بنارس ہی میں رہیں گے۔ لیکن ان کے کارناموں کی شمع اہل علم و فضل کو ہمیشہ اور ہر جگہ روشنی دیتی رہے گی۔

حواشی

۱۔ فرہنگ سخنوران۔ تالیف دکتر ع۔ خیام پور طبع تبریز ۱۳۴۰ ھ ش میں ص۱۵۵ پر موصوف کو "حزیں لاہیجی" اور "لغت نامہ دھخدا" تالیف علی اکبر دھخدا۔ چاپ تہران ۱۳۴۰ ھ ش شمارہ مسلسل ۶۴ شمارہ حرف ح ۔۶ میں موصوف کو حزیں لاہیجی تحریر کیا گیا ہے۔

۲۔ "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" تالیف دکتر علی رضا نقوی چاپ تہران ۱۹۶۴ء ص ۳۴۲

۳۔ دیکھیے حوالہ مذکورہ بالا ۱

□□

شیخ علی حزیں ۔۔۔ ص ۱۱ کا بقیہ

یہاں تک کہ دہلی کے قیام کے دوران انھوں نے محمد علی شاہ کے بے حد اصرار اور درخواست کے باوجود عہدہ وزارت کو قبول نہیں کیا۔

مولانا حزیں کی تصنیف "تذکرۃ المعاصرین" آج الٰہ آباد یونیورسٹی اور دیگر یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب میں فارسی شعرا کی سوانح ہے۔

مولانا کی ایک اور کتاب "تذکرۃ الاحوال" کا پروفیسر ایف۔ سی بالفور نے انگریزی میں ترجمہ کیا جو ۱۸۳۱ء میں لندن سے شائع ہو چکی ہے۔

□□

ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی
۴۵۰ ۔ حیدر منزل ، نیو مفتی گنج لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

حزیں اور اُن کے تذکرے

حزیں اور ان کے تذکروں کے بارے میں کچھ لکھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کی ایک فہرست حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کردی جائے، تاکہ قاری ایک نظر میں ان سے متعارف ہو سکے۔

اس فہرست میں حزیں کی دستیاب مخطوطہ اور مطبوعہ کتابوں کے ساتھ ان کتابوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جن کا ذکر حزیں نے یا کسی دوسرے تذکرہ نویس نے کیا ہے۔ اس میں ہر کتاب کے سامنے مخطوطہ/مطبوعہ یا حوالہ لکھ دیا گیا ہے۔ ان میں مخطوطہ اور مطبوعہ کتابیں راقم نے دیکھی ہیں لیکن جن کتابوں کے آگے حوالہ لکھا گیا ہے، انھیں نہیں دیکھ سکا۔ فہرست مرتب کرنے میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ہر کتاب کا نام لکھتے وقت اس کے ماخذ کو درج کر دیا جائے تاکہ اگر قاری رجوع کرنا چاہے تو اسے دشواری نہ ہو۔

۱. آداب نوافل لیلیہ (مخطوطہ) کتب خانہ عمدۃ العلما، غفران مآب لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۱۰۲
۲. تذکرۃ الاحوال/تاریخ احوال (مطبوعہ)، کلیاتِ حزیں۔ منشی نول کشور، کان پور ۱۸۹۳ء
۳. تذکرۃ المعاصرین/تذکرہ شعرائے معاصرین (مطبوعہ) ایضاً
۴. جواب رقعاتِ شیخ حسن (حوالہ) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، علی رضا نقوی ص ۳۶۵۔ علی اکبر علمی، تہران ۱۹۶۴ء
۵. جوابی نامہ (حوالہ) فہرست مشترک نسخہ ہائی خطی فارسی پاکستان جلد اول ص ۴۱۹ احمد منزوی۔ اسلام آباد ۱۹۸۳ء
۶۔ حاشیہ بر الٰہیات شفا (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص ۴۷
۷۔ حاشیہ بر امور عامۃ شرح تجرید (حوالہ) ایضاً ص ۴۷
۸. حاشیہ بر شرح ہیاکل النور (حوالہ) ایضاً ص ۴۷
۹. حواشی بر شرح حکمت اشراق (حوالہ) ایضاً ص ۴۷
۱۰۔ خواص الحیوان/رسالہ در خواص الحیوان/رسالہ صیدیہ (حوالہ) فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان جلد اول ص ۴۳ و تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ۳۶۵
۱۱. دستور العقلاء فی آداب الملوک والوزراء/رسالہ دستور العقلاء (حوالہ) فہرست مشترک نسخہائے خطی فارسی پاکستان جلد چہارم ص ۲۳۲۹ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ۳۶۵
۱۲. دیوان اول (حوالہ) [قصائد، مثنوی، غزلیات و رباعیات پر مشتمل] تذکرۃ الاحوال ص ۳۲
۱۳۔ دیوان دوم (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص ۴۷
۱۴۔ دیوان سوم (حوالہ) ایضاً ص ۴۹
۱۵۔ دیوان چہارم (حوالہ و مطبوعہ) ایضاً ص ۸۰ و کلیات حزیں [غالباً یہی مطبوعہ دیوان ہے جو قصائد (توحید، نعت رسولؐ اور مدح ائمہؑ) رباعیات مقطعات اور متفرقات پر مشتمل ہے۔]
۱۶. رجم الشیاطین (حوالہ)، شعر العجم فی الہند، شیخ اکرام الحق ص ۲۱۱ شعبہ اشاعت الاکرام، ملتان ۱۹۶۱ء
۱۷. رسالہ ابطال تناسخ برای طبیعیین (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص ۴۷
۱۸. رسالہ امامت (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص ۹۹ و شعر العجم فی الہند ص ۲۱۴

۱۹۔ رسالہ تحقیق اوزان / رسالہ در اوزان شرعی (مخطوطہ و حوالہ) کتب خانۂ عمدۃ العلماء غفران مآب، لکھنؤ مخطوطہ ۱۰۲ و تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۶۵

۲۰۔ رسالہ تحقیق غنا (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۷

۲۱۔ رسالہ توجیہ کلام قدمای حکمای مجوس در مبداء عالم (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۷

۲۲۔ رسالہ توفیق کہ در توافق حکمت و شریعت (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۷

۲۳۔ رسالہ در تحقیق معاد روحانی (حوالہ) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۶۵

۲۴۔ رسالہ در تحقیق نفس و تجرد آن / رسالہ در حقیقت نفس و تجرد (مخطوطہ و حوالہ) کتب خانہ مدرسۃ الواعظین، لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۴۲۸ و تذکرہ نویسی در ہند و پاکستان ص۳۶۴

۲۵۔ رسالہ در حملہ ہای ایران بر ہند (حوالہ) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۶۵

۲۶۔ رسالہ در فہرست اساتذہ و تصنیفات خود (حوالہ) شعر العجم فی الہند ص۲۱۵

۲۷۔ رسالہ در مدارج حروف (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۷

۲۸۔ رسالہ در مسئلہ حدوث و قدم (حوالہ) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۶۵

۲۹۔ رسالہ صلوٰۃ (مخطوطہ) کتب خانہ عمدۃ العلماء غفران مآب لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۱۰۲

۳۰۔ رسالہ کنز المرام کہ در بیان قضا و قدر (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۱۱۸

۳۱۔ رسالہ لوامع مشرقہ در تحقیق معنی واحد و وحدت (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۳

۳۲۔ رسالہ معیار (مخطوطہ) کتب خانۂ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۴۲۸

۳۳۔ رسالہ مفرح القلوب یا در مجربات فواید طبیہ (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۳

۳۴۔ رسالہ منطق (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۷

۳۵۔ رسالہ نمازہای واجب (مخطوطہ) کتب خانۂ عمدۃ العلماء غفران مآب لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۱۰۲

۳۶۔ رسالہ وضو (مخطوطہ) کتب خانہ عمدۃ العلماء غفران مآب لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۱۰۲

۳۷۔ رقعات حزین (حوالہ) فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان جلد پنجم ص۳۳۵

۳۸۔ روائح الجنان (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۷

۳۹۔ سفینۂ شیخ علی حزین (مطبوعہ) دار الطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد ۱۹۳۰ء

۴۰۔ شجرۃ الطور فی شرح آیۃ النور (مخطوطہ و حوالہ) کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۴۲۸۔ و تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۶۵

۴۱۔ شرح رسالہ کلمۃ التصوف شیخ اشراق (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۷

۴۲۔ شرح فصوص الحکم (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۵۵

۴۳۔ شرح قصیدۂ لامیہ / قصیدۂ لامیہ خالصہ (حوالہ) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۶۵ و شعر العجم فی الہند ص۲۱۴

۴۴۔ فتاویٰ شیخ علی حزین (مخطوطہ) کتب خانہ عمدۃ العلماء غفران مآب لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۱۰۲

۴۵۔ فتح السبل (مخطوطہ) کتب خانۂ عمدۃ العلماء لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۲۱۳

۴۶۔ فوائد الفواید (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۷

۴۷۔ فرسنامہ / رسالہ فرسنامہ (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۷

۴۸۔ کتاب الدعاء / رسالہ ادعیہ (مخطوطہ) کتب خانہ سلطان المدارس لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۸۰، و کتب خانۂ عمدۃ العلماء غفران مآب لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۱۰۲

۴۹۔ مثنوی تذکرۃ العاشقین (حوالہ و مطبوعہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۸ و کلیات حزین۔

۵۰۔ مثنوی چمن و انجمن (مطبوعہ) کلیات حزین

۵۱۔ مثنوی خرابات (حوالہ و مطبوعہ) تذکرۃ الاحوال ص۹۱ و کلیات حزین

۵۲۔ مثنوی در وصف حضرت پیغمبرؐ (حوالہ) تذکرہ نویسی فارسی در ہند

...ستان ص۳۶۳

۵۳۔ مثنوی ساقی نامہ (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۱۶

۵۴۔ مثنوی صفیر دل (مطبوعہ) کلیات حزیں

۵۵۔ مثنوی فرہنگ نامہ (مطبوعہ) کلیات حزیں

۵۶۔ مثنوی مطمح الانظار (مطبوعہ) کلیات حزیں

۵۷۔ مثنوی ودیعۃ البدیعۃ / حدیقۃ الحقیقۃ (حوالہ) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۶۳ و شعر العجم فی الہند ص۲۱۸

۵۸۔ مدۃ العمر (حوالہ) تذکرۃ الاحوال ص۴۱

۵۹۔ مذاکرات فی المحاضرات (مخطوطہ) کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۴۲۸

۶۰۔ مرأۃ اللہ فی شرح آیۃ شہد اللہ (مخطوطہ و حوالہ) کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۴۲۸ و تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۶۴

۶۱۔ مواعد الاسحار (حوالہ) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۶۵

۶۲۔ وصیت شیخ علی حزیں (مخطوطہ) کتب خانہ عمدۃ العلماء غفران مآب لکھنؤ، مخطوطہ نمبر ۱۰۲۔

اس فہرست کے بعد اب شیخ علی حزیں کے مختصر حالات اور تذکروں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

شیخ محمد علی حزیں کی ولادت، ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۰۳ھ میں بمقام اصفہان ہوئی۔ ان کے والد ابی طالب اور جد عبد اللہ تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب تاج الدین ابراہیم المعروف بہ شیخ زاہد گیلانی سے ملتا ہے جو صفوی سلاطین کے جد امجد شیخ صفی الدین اردبیلی کے پیر و مرشد تھے۔[۱]

حزیں کا آبائی وطن گیلان تھا۔ بعد میں یہ لوگ لاہیجان منتقل ہو گئے اور پھر ان کے والد علم حاصل کرنے کی غرض سے لاہیجان سے اصفہان گئے جہاں شیخ محمد علی حزیں کی ولادت ہوئی۔ ابھی حزیں کی عمر چار سال ہی تھی کہ ایک دن ملا شاہ محمد شیرازی ان کے گھر تشریف لائے اور انھوں نے شیخ محمد علی حزیں کی رسم بسم اللہ کرائی۔[۲] حزیں نے ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا ملک حسین قاری اصفہانی سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی اور ان ہی سے علم تجوید کے چند رسالے پڑھے۔ اس کے علاوہ صرف، نحو، فقہ اور منطق میں شرح جامی، کافیہ، شرح نظام بر شافیہ، تہذیب، شرح شمسیہ، شرح مطالعہ۔ فقہ میں شرح ہدایہ، حکمت العین، شرائع الاحکام۔ حدیث میں من لا یحضرہ الفقیہ۔ معالم الاصول[۳] اور فلکیات میں تشریح الافلاک[۴] وغیرہ کی تعلیم دی اور ان کے چچا شیخ ابراہیم جیلانی نے خلاصۃ الحساب[۵] پڑھائی۔ اس کے بعد شیخ حزیں شیخ خلیل اللہ طالقانی کی خدمت میں تین سال تک رہے لیکن ان سے کوئی مخصوص کتاب نہیں پڑھی کیوں کہ خلیل اللہ طالقانی کسی کاغذ پر کوئی مسئلہ یا عبارت لکھ کر اسی کی تعلیم حزیں کو دے دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے حزیں کو اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ وہ عبارت کس کتاب کی ہے۔[۶] پھر انھوں نے شیخ بہاء الدین گیلانی سے احیاء العلوم، رسائل اسطرلاب اور شرح چغمینی[۷] آقا ہادی مازندرانی سے تہذیب الاحکام[۸] میرزا کمال الدین حسین فسوی سے تفسیر بیضاوی، جامع الجوامع طبرسی، امور عامہ شرح تجرید[۹] مولانا حاجی محمد طاہر اصفہانی سے شرح لمعہ، کتاب استبصار شیخ طوسی[۱۰] شیخ عنایت اللہ گیلانی سے منطق تجرید، کتاب نجات شیخ الرئیس[۱۱] امیر سید حسن طالقانی سے فصوص الحکم شرح ہیاکل النور[۱۲] میرزا محمد طاہر سے شرح تذکرہ، تحریر اقلیدس تحریر مجسطی، قوانین حسابیہ[۱۳] اور حکیم مسیحائی[۱۴] سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ علاوہ بریں آقا جمال الدین محمد خوانساری[۱۵] مولانا آخوند مسیحائی فسوی[۱۶] صدر الدین سید علی خاں[۱۷] قاضی نظام الدین علی خراسانی[۱۸] مولانا قاضی ابراہیم نہاوندی[۱۹] جیسے متعدد علماء و فضلا کی مجالس میں شریک ہو کر اکثر مذاکرے اور مباحثے میں حصہ لیا اور استفادہ کیا۔

حزیں نے علم حاصل کرنے کی غرض سے شیراز، لاہیجان اور گیلان وغیرہ متعدد شہروں کے سفر کیے اور بعد میں ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم دیکھ کر کربلائے معلیٰ، نجف اشرف، کاظمین، مکہ معظمہ، سیوستان وغیرہ ہوتے ہوئے ۱۱۴۶ھ[۲۰] میں ہندوستان آئے اور یہاں ٹھٹھہ، شاہ جہاں آباد عظیم آباد، بھکر، لکھنؤ اور بنارس وغیرہ شہروں کی سیر کرتے رہے۔ وہ جہاں بھی چاہتے قیام کرتے اور میزبان ان کی تعظیم و تکریم سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ہندوستان میں مہاراجہ رام نرائن موزوں[۲۱] مرزا عبد الرضا متین، ملا محمد عبد اللہ سابق، شیخ عطاء اللہ ثنا، علی قلی خاں والہ داغستانی[۲۲] اور دہلی کے بہت سے شاہزادے[۲۳] اپنے کلام پر حزیں سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے افراد بھی مشکل کلام کو سمجھنے

کے لیے ان سے رجوع کرتے اور اپنے کو حزیں کا شاگرد کہنے میں فخر محسوس کرتے۔ ہندستان میں حزیں کی بندرابن داس خوش گو، میر غلام حسین قاضی مصطفیٰ، نورالعین واقف [27] سید جلال الدین غالب زیدپوری وغیرہ سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ سید جلال الدین غالب سے پہلی ملاقات پر حزیں کو محسوس ہوا کہ غالب اصلاً ایرانی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے غالب سے پوچھا کہ آپ ہندستان کب وارد ہوئے؟

غالب نے جواب دیا کہ "میں ہندستان میں پیدا ہوا ہوں نہ کہ وارد۔"
اس واقعہ کو علامہ مفتی محمد عباس نے زیدپور ضلع بارہ بنکی کے حالات لکھتے ہوئے اس طرح تحریر کیا ہے:-

"شنیدم کہ شیخ علی حزیں جیلانی باآں نکتہ دانی چوں باایشان
برخوردہ گمان بردہ کہ اصلش از ایران است۔ پرسیدہ
چند گاہ است کہ اینجا وارد شدہ اند گفت اینجا متولد شدہ
ام نہ وارد" [28]

اور آگے لکھا ہے کہ بعد میں شیخ علی حزیں نے غالب زیدپوری کی اپنے یہاں دعوت کی اور دونوں میں قریبی تعلقات ہو گئے۔

ہندستان میں میر غلام علی آزاد بلگرامی سے حزیں کی پہلی ملاقات ۱۱۴۷ھ میں بمقام بھکر ہوئی اور اس موقع پر حزیں نے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشعار آزاد بلگرامی کو یادگار کے طور پر دیئے [33] پھر وہاں کچھ دن قیام کے بعد حزیں ملتان اور لاہور ہوتے ہوئے دہلی گئے۔ اس کے بعد اکبرآباد اور بنگالہ ہوتے ہوئے ۱۱۶۱ھ میں بنارس پہونچے، وہاں سے عظیم آباد کے ناظم راجہ رام نرائن موزوں کی دعوت پر عظیم آباد (پٹنہ) گئے، لیکن کچھ دن قیام کے بعد واپس بنارس آ گئے اور اسی شہر کو اپنا مسکن قرار دیا [34] جیسا کہ نشتر عشق کی اس عبارت سے ظاہر ہے:

"وبعد مرور ایام بسبب استدعا وخواہش وتکلیف
راجہ رام نرائن ناظم عظیم آباد کہ ہم نسبت شاگردی بجناب
ایشان داشت وہم بارادہ سیر سرزمین بنگال از جہاں آباد
متوجہ پیشتر گردیدہ بہ عظیم آباد رسیدہ چندی در آنجا بسر
بردہ وہوائے سیاحت بنگالہ از سر برآوردہ باز مراجعت
بہ بنارس فرمودہ وآں شہر دلچسپ را مسکن خویش
قرار دادہ" [35]

اس طرح شیخ علی حزیں نے اپنی زندگی کے تقریباً ۳۵ سال ہندستان میں گزارے لیکن ہندستان کی برائی کرتے رہے جس کا ثبوت ان کی بعض رباعیات [29] اشعار [30] اور تذکرۃ الاحوال [31] سے ملتا ہے۔ انھوں نے ہندستان کی برائی کے ساتھ ساتھ ہندستانی علماء، فضلاء اور شعراء کو پست اور کمتر قرار دیا۔ جس کی وجہ سے ہندستانی شعراء میں شیخ علی حزیں کے خلاف ایک تحریک شروع ہوئی۔ اس میدان میں دوسرے لوگوں کے ساتھ سراج الدین علی خاں آرزو بھی آئے اور انھوں نے حزیں کے اشعار پر اعتراضات کرتے ہوئے ایک کتاب "تنبیہ الغافلین" [32] لکھی۔ جس کے جواب میں حزیں نے "رجم الشیاطین" [33] لکھی اور بعد میں میر غلام علی آزاد بلگرامی [34] اور شیخ امام بخش صہبائی [35] نے آرزو کے بعض اعتراضات کا جواب دیا۔

علاوہ بریں حزیں نے ہندستانی شاعر میر محمد افضل ثابت کے ایک شعر کے لیے لکھا کہ یہ مضمون فلاں شاعر کے شعر سے چرایا گیا ہے۔ اس پر ثابت کے بیٹے محمد عظیم ثبات کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے حزیں کے کلام سے تقریباً پانچ سو شعر ایسے منتخب کیے جن کا مضمون دوسرے شعراء کے کلام سے لیا گیا تھا [36] بہرحال حزیں آرزو اور دوسرے ہندستانی شعراء کے درمیان سخت معرکہ آرائی ہوتی رہی اور حزیں ہندستان کی برائی کرنے کے باوجود بنارس میں قیام پذیر بھی رہے۔ نیز یہ کہتے رہے

از بنارس نروم معبد عام است اینجا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا [37]

بالآخر حزیں کا ۱۱ جمادی الاول ۱۱۸۰ھ [38] میں بنارس ہی میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کی تاریخ وفات بنارس کے ایک شخص نے صنعت صوری ومعنوی میں اس طرح نکالی۔

یک ہزار و یک صد و ہشتاد سال [39]
۳۰ + ۲۱۳ + ۶ + ۱۲۴ + ۶ + ۶۱۰ + ۹۱ = ۱۱۸۰ھ

ایک اور تاریخ مولوی ابو محمد عبدالغفور نساخ نے نکالی

پے سال ترحیل وفوت حزیں نوشتم جنیم جاودان حزیں
۱۰۷۶ + ۶۰ + ۴۴
۱۱۸۰ھ

ایک تاریخ بھی مرزا محمد شفیق اورنگ آبادی نے ایک فقرہ سے نکالی : ؏

غمدایش بیامرزاد [۴۱]

۹۱۵ + ۲۵۳ + ۱۲ = ۱۱۸۰ھ

اس کے علاوہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی ایک تاریخ نکالی ؎

علامۂ عصر شاعر خوب
افسوس کہ اب میانہ برخاست
تاریخ وفات او نوشتیم
"از فوت حزیں حزیں دلِ ما است" [۴۲]

۱۱۸۰ھ

ایک تاریخ مہدی علی خاں امین دولت آبادی کی ملتی ہے ؎

شیخ دانش مند استاد سخن سنجان عصر
برسر ایں خاکدان کہنہ افشاندہ آستین
سالِ تاریخش امین دولت آبادی نوشت
"رفت زیں عالم علی بن ابی طالب حزیں" [۴۳]

۱۱۸۰ھ

احمد منزوی نے اپنی تالیف فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان [۴۴] میں ان کا سن وفات ۱۱۸۱ھ لکھا ہے۔ لیکن زیادہ قرینِ قیاس ۱۱۸۰ھ ہی معلوم ہوتا ہے۔

نشترِ عشق میں ملتا ہے کہ حزیں کی قبر پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں ؎

زبان دانِ محبت بودہ ام دیگر نمی دانم
ہمی دانم کہ گوشش از دوست پیغامی شنید اینجا
حزیں از پای رہ پیمائی بسی سرگشتگی دیدم
سرِ شوریدہ بر بالین آسائش رسید اینجا [۴۵]

روشن شد از وصال تو شبہائے تار ما
صبح قیامت است چراغ مزار ما [۴۶]

منشی شیو پرشاد نے لکھا ہے کہ حزیں کے انتقال کے کچھ دن بعد ان کا ایک دوست ملاقات کی غرض سے ولایت سے دہلی اور دہلی سے بنارس پہونچا لیکن وہاں حزیں کے انتقال کی خبر سنی۔ بہرحال وہ فاتحہ کی خاطر حزیں کی قبر پر گیا اور وہاں مذکورہ اشعار کو قبر پر لکھا ہوا دیکھا جنھیں اپنے حال کے مطابق پایا۔ چنانچہ وہ حزیں کی روشن ضمیری کا قائل ہوا اور یہ شعر پڑھا ؎

دیر آمدی نگارم وایں از تو دور بود
دامن فشاندنت بمزارم ضرور بود [۴۷]

شیخ محمد علی حزیں کے مزاج میں تکبّر اور خود پسندی بے حد تھی شاید اسی لیے وہ اکثر ملاقات کرنے والوں کی تعظیم کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ جب سراج الدین علی خاں آرزو اور میر محمد افضل ثابت حزیں سے ملاقات کرنے گئے تو حزیں ان کی تعظیم کے لیے کھڑے نہیں ہوئے [۴۸] اسی طرح جب شاہ ہدایت اللہ وحدت کابلی ملاقات کے لیے گئے تو حزیں نے بیٹھے بیٹھے مصافحہ کیا اور اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلے [۴۹] اسی سلسلے میں ایک واقعہ یہ بھی ملتا ہے کہ ایک شخص حزیں سے ملاقات کے لیے گیا لیکن دربان نے اسے روکا۔ اس پر وہ ناراض ہوا اور ایک کاغذ پر یہ مصرعہ لکھ کر واپس ہوا ؏

درِ درویش را دربان نباید

اور جب حزیں کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے یہ گرہ لگائی ؏

بباید تا سگِ دنیا نیاید [۵۰]

لیکن حزیں کے تکبّر اور خود پسندی کے باوجود بہت سے لوگ صرف استفادہ کی غرض سے ان سے ملاقات کرتے تھے۔ کیوں کہ حزیں تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، معانی، ہیئت، حساب، طبیعات اور الٰہیات میں دسترس رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کے متعدد رسالوں حاشیوں اور کتابوں سے ملتا ہے۔ حزیں شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تذکرہ نویس بھی تھے جس کا ثبوت ان کے چار دیوان اور چار تذکرے ہیں۔ ان مضمون میں ان کی دیگر تصانیف سے قطع نظر صرف تذکروں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) مدّۃ العمر

شیخ علی حزیں کی خود نوشت سوانح "تذکرۃ الاحوال" کے مطالعہ

سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شیراز کے سفر اور وہاں سے واپسی کے دوران مختلف علماء کی کتابوں اور کلیات کا مطالعہ کیا، جس سے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ چنانچہ انھوں نے قدیم علماء اور فضلاء کے نفایس اور نوادر پر مشتمل ایک مجموعہ مرتب کرنا شروع کیا جس کا نام "مدۃ العمر" رکھا۔ نیز اس مجموعے سے متعلق جو بھی مواد ملتا رہا وہ اس میں درج کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱۳۵ھ کے اوائل تک اس مجموعے میں تقریباً سات ہزار اشعار جمع ہو گئے۔ لیکن اتفاق سے اسی سال اصفہان کا سانحہ رونما ہوا اور حزیں کے پورے کتب خانے کے ساتھ مذکورہ تذکرہ بھی ضائع ہو گیا جس کا حزیں کو سخت افسوس ہوا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ مکمل ہو کر علماء اور فضلاء کے سامنے آجائے گا تو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ حزیں نے لکھا ہے:

"خواستم کہ مجموعہ مرتب سازم کہ مشتمل بر نفایس
ونوادر رباشد و بر جوامع مشہورہ افاضل سلف راجح
آید۔ پس شروع در تحریر آن کردم و بمدۃ العمر موسوم ساختم
و بتدریج آنچہ لایق سیاق آن بود در آن مندرج می شد
در سفر فارس مقداری از آن نوشتہ شد و ہم چنین تا ابتدای
سال خمس و ثلثین و مایۃ بعد الالف تخمیناً بہفت ہزار بیت
رسیدہ بود کہ در آن سال سانحہ اصفہان روی داد و با کتاب
خانہ فقیر و آنچہ بود بغارت رفت و مرا بر تلف شدن آن نسخہ
تاسف ست چہ اگر انجام می یافت و بہ نظر افاضل جہان
میرسید آنرا لائق ذخیرۂ خزاین سلاطین قدر شناس
می یافتند۔" [۵۱]

اسی کے متعلق صاحب "نجوم السماء فی تراجم العلماء" نے تحریر کیا ہے:

"رسالہ مدت العمر کہ در اوقات تحصیل ہر مسئلہ
مشکلہ را کہ حل نمودہ در آن ضبط کردہ است۔" [۵۲]

یعنی حزیں نے علم حاصل کرنے کے دوران مذکورہ تذکرہ میں سات ہزار اشعار کے علاوہ اپنے نزدیک ہر مشکل مسئلہ کا حل بھی لکھ لیا تھا۔ علاوہ بریں ای۔ جی براؤن کے مطابق مذکورہ نسخہ لندن میں موجود ہے اور چارلس ریو نے اس کا تعارف ص ۳۸۲ پر کرایا ہے لیکن ڈاکٹر علی رضا نقوی کی تحقیق کے مطابق مذکورہ صفحہ پر ریو نے زمستانیہ اور خواص الحیوان کا ذکر کیا ہے [۵۳] نہ کہ مدۃ العمر کا۔

بہر حال اس نامکمل تذکرہ کے بارے میں اور کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ اس لئے اس کے بارے میں کسی قسم کی رائے قائم کرنا غیر مناسب ہوگا۔ لیکن حزیں کے مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ "مدۃ العمر" ہی ان کا پہلا تذکرہ تھا جو ضائع ہو گیا۔

(۲) تذکرۃ الاحوال

حزیں کا دوسرا تذکرہ "تذکرۃ الاحوال" [۵۴] ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے۔ یہ تذکرہ ہندستان میں کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے [۵۵] اس کا نام تاریخ احوال، تاریخ احوال بہ تذکرۂ حال مولانا محمد علی حزیں [۵۶] اور سوانح عمری شیخ علی حزیں [۵۷] بھی ملتا ہے۔ حزیں نے یہ تذکرہ ۱۱۵۴ھ [۵۸] میں اس وقت لکھنا شروع کیا جب وہ دہلی میں سخت مصیبتوں اور پریشانیوں کا شکار تھے۔ آرام و سکون ختم ہو چکا تھا، راتوں کی نیند حرام تھی انھوں نے ۱۱۵۴ھ تک کے اپنے حالات لکھنے کے لئے قلم اٹھایا اور صرف دو راتوں میں تمام حالات درج کر دیئے۔ جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے:

"ونیز پوشیدہ نماند کہ مجوع تحریر این اوراق والتفات
بنگارش خلاصہ این احوال شیوہ خامہ وپیشہ ہمت ومناسب
اوقات و مرغوب خاطر و مانوس طبیعت این خاکسار نبود
بلکہ فکرت و رویت این شیوہ بغایت بیگانی واحتراز داشتہ
بخاطر نمی گذشت .... اما باعث بر تسوید آن شد
کہ درین آوان کہ آخر سال اربع وخمسین ومایۃ بعد الالف
ست در بلدۂ دہلی باشدت آلام واسقام زاویہ نشین
اعتزال وخاطر شوریدہ لبریز ملال بود آسایش وآرام
کرانہ گرفتہ از تعطیل قوا و ہجوم اندوہ خاطر بہیچ چیز مشغول
نمی شد و شبہا خواب نبود بی اختیار آنچہ مجمل احوال بزبان
قلم آمد در دو شب تا این مقام تسوید نمودم۔" [۵۹]

یہ بات لائق ستائش ہے کہ سخت پریشانیوں میں گھرے ہونے کے باوجود حزیں نے خیالات کو مجتمع کر کے ایک ایسا تذکرہ لکھا جس کے مطالعہ سے قاری حزیں کی سوانح کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے متعدد علماء کے

حالات اور بہت سے تاریخی، جغرافیائی اور ادبی واقعات سے بھی تعارف ہوسکتا ہے۔

اس تذکرے کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حزیں لاہیجان، گیلان، عراق، فارس، آذربائیجان، شیراز، کاظمین، مکہ معظمہ، نجف اشرف، کربلائے معلیٰ، سیوستان، ٹھٹھہ، بھکر، ملتان، لاہور اور دہلی وغیرہ کا سفر کرتے رہے لیکن ان کو کہیں سکون نصیب نہ ہوا، جس کا ذکر انھوں نے اس تذکرے میں کیا ہے۔ مثلاً:

"در ہیچ گوشہ قرار نمی یافتم چنانکہ از مضمون ایں ابیات من ظاہر است ؎

آنم کہ بملک ہستی سلطانم
باسامانم اگرچہ بے سامانم
مانندۂ آسیا دریں فلک خراب
سرگردانم کہ از چہ سرگردانم"[60]

اور ؎

"چہ شد یارب کہ یکدم درد من تسکین نمی یابد
ز بیتابی سرم می گردد و بالین نمی یابد
مجملاً بچناں رنجور و ناتواں بکشتی نشستہ بہ بندر عباسی مراجعت کرم"[61]

اس تذکرے کے مطالعہ سے حزیں کے اساتذہ اور احباب کا تعارف ہوجاتا ہے نیز ان علماء و فضلا کے بارے میں بھی معلومات ہوجاتی ہیں جن سے حزیں کی ملاقات ہوئی۔ اس سے حزیں کے شعری ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے لکھتے ہیں:

"چوں طبیعت موزوں بود از شعر لذتی عظیم می یافتم و بگفتن میل میشد و مدتی مخفی بود چوں استاد مطلع شد مرا ازاں منع نمودی و والد مرحوم نیز مبالغہ در ترک آں داشتے و مرا صرف طبیعت یکبارہ ازاں ممکن نبود چیزی کہ وارد خاطر میشد مینوشتم و پنہاں می داشتم۔"[62]

حزیں نے اپنی شعرگوئی کے باب میں ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ:

"ایک دن میرے والد کے پاس کچھ ذی علم لوگ بیٹھے تھے، میں بھی موجود تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شخص نے ملا محتشم کاشی کا یہ شعر پڑھا ؎

اے قامت[63] بلند قداں در کمند تو
رعنائی آفریدۂ قد بلند تو

حاضرین میں سے بعض نے اس شعر کی بہت تعریف کی۔ مگر والد نے فرمایا کہ ملا محتشم کا دیوان میری نظر سے گزرا ہے وہ شاعری میں استاد ہے مگر اس کے کلام میں نمک نہیں ہے اور نہ ہی اس قدر شیرینی ہے کہ وہ نمک نہ ہونے کا تدارک کر سکے۔ جبکہ کلام میں شیرینی سے زیادہ نمک کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ اسی مطلع سے ظاہر ہے جس کا دوسرا مصرع بالکل ٹھیک ہے لیکن پہلا مصرعہ کھٹکتا ہے کیوں کہ "قامت" کے ساتھ "کمند" کا استعمال درست نہیں ہے۔ اس کی حاضرین نے تصدیق کی۔ اس کے بعد والد میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تم نے ابھی تک شعر کہنا نہیں چھوڑا ہے۔ اگر ہو سکے تو اسی غزل (طرح) میں کوئی شعر کہو۔

اسی لمحہ میرے ذہن میں ایک مطلع آیا اور جب والد کی نظر پھر میرے اوپر پڑی تو ان کو معلوم ہوگیا کہ میرے ذہن میں کوئی شعر آیا ہے۔ فرمایا، اگر کہا ہے تو پڑھو شرماؤ نہیں۔ میں نے مطلع پڑھا ؎

صید از حرم کشد خم جعد بلند تو
فریاد از تطاول مشکیں کمند تو

حاضرین نے بہت تعریف کی۔ وہ ابھی تعریف کر ہی رہے تھے کہ میرے ذہن میں دوسرا شعر آیا اور اسے پڑھا ؎

شد رشک طیر از آمدنت کوی عاشقاں
بنشیں کہ باد خردۂ جانہا پسند تو

اس بار والد نے بھی تعریف کی اور کہا کہ جس چیز کی نسبت میں کہتا تھا کہ ملا محتشم کے یہاں نہیں ہے وہ اس میں موجود ہے۔ اسی بیچ میں نے تیسرا شعر پڑھا ؎

مشکل شدست کار دل از عشق و خورش دام
شاید رسد بخاطر مشکل پسند تو

اسی طرح میں تھوڑی تھوڑی دیر سے شعر پڑھتا رہا اور غزل تمام ہوگئی۔

حاضرین نے کہا کہ اس طرح بدیہی شاعری کرنے کی آج کسی میں قدرت نہیں ہے اور والد نے فرمایا کہ اب میں تم کو شعر کہنے کی اجازت دیتا ہوں مگر اس قدر نہیں کہ تمہارا وقت ضائع ہو۔ انھوں نے اپنا قلم دان اس غزل کے لکھنے کے لئے مجھے عنایت فرمایا" [63]

اسی تذکرہ سے حزیں کے چار دیوان اور دو مثنویوں، مثنوی تذکرۃ العاشقین[64] اور مثنوی خرابات[65] (بوستان سعدی کی طرز پر) کے لکھے جانے کا بھی علم ہوتا ہے۔ ان کی دوسری مثنویوں میں صفیر دل۔ چمن و انجمن۔ مطمح الانظار اور فرہنگ نامہ ہیں۔ جو مطبوعہ کلیات میں محفوظ ہیں لیکن ان کا ذکر تذکرۃ الاحوال میں نہیں ملتا۔

تذکرۃ الاحوال سے ہی حزیں کے متعدد رسالوں، حاشیوں اور کتابوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ ان رسالوں اور حاشیوں میں حاشیہ بر رسالہ تحقیق غنا، حاشیہ بر رسالہ منطق، حاشیہ بر شرح تجرید[66] رسالہ لوامع مشرقہ در تحقیق واحد و وحدت[67] حاشیہ بر شرح حکمت اشراق روائح الجنان، رسالہ ابطال تناسخ، شرح رسالہ کلمۃ التصوف شیخ اشراق، حاشیہ بر الٰہیات شفا، فرائد الفوائد، حاشیہ بر شرح ہیاکل النور، رسالہ در مدارج حروف، فرسنامہ[68]، رسالہ فرح القلوب را در مجربات و فوائد طبیہ و رسالہ تجرد نفس[69]، رسالہ امامت[70] وغیرہ ہیں۔ ان کا ذکر خود حزیں نے اپنے تذکرے تذکرۃ الاحوال میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ رسالہ صلوٰۃ، رسالہ وضو، آداب نوافل لیلیہ، فتاویٰ شیخ علی حزیں، رسالہ ادعیہ، وصیت شیخ علی حزیں، رسالہ تحقیق اوزان (سبھی مخطوطے کتب خانہ عفرانمآب لکھنؤ میں موجود ہیں اور یہ سبھی مخطوطے سرفراز خاں کے نقل کردہ ہیں۔ دیکھئے مخطوطہ نمبر ۱۰۲)۔ رسالہ معیار، رسالہ در تحقیق نفس و تجرد آن، مذاکرات فی المحاضرات، شجرۃ الطور فی شرح آیۃ النور، مراۃ اللہ فی شرح آیۃ شہد اللہ (سبھی مخطوطے کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ میں موجود ہیں۔ یہ سبھی مخطوطے شیخ محمد علی حزیں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں مراۃ اللہ فی شرح آیۃ اللہ شہد اللہ اور شجرۃ الطور فی آیۃ النور کے لکھے جانے کا سنہ بالترتیب ۱۱۳۹ھ اور ۱۱۴۰ھ لکھا ہے۔ دیکھئے مخطوطہ نمبر ۴۲۸) اور کتاب الدعا (مخطوط کتب خانہ سلطان المدارس لکھنؤ میں موجود ہے۔ دیکھئے مخطوطہ نمبر ۷۰۸) بھی محفوظ ہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ تذکرہ حزیں کے بارے میں ۱۱۵۴ھ تک کی معلومات کے لحاظ سے کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ علاوہ بریں اسی تذکرہ سے شاہ حسین، شاہ طہماسپ، عباس سوم، نادر شاہ، محمد شاہ محمد خاں ترکمان وغیرہ کی تخت نشینی یا معزولی، نادر شاہ اور افغانوں کے حملے، اصفہان کی بربادی اور قتل و غارت گری، ہندستان کے حالات وغیرہ کی تاریخی اور اصفہان، گیلان، شیراز اور ہندستان وغیرہ کی جغرافیائی معلومات بھی ہوتی ہے۔

اس تذکرے میں متعدد جگہ سن وقوع درج نہیں ہے اور بعض جگہ حزیں ایک سنہ کی بات لکھتے لکھتے فوراً کئی سال پہلے کی بات لکھ دیتے ہیں جو گراں گزرتی ہے۔ مثلاً حزیں نے تذکرہ کے اختتام کے قریب اس کا سن تحریر ۱۱۵۴ھ لکھنے کے بعد ۱۱۴۸ھ[72] میں نادر شاہ کے سلطنت ایران پر جلوس اور ۱۱۵۱ھ[73] میں نادر شاہ کے ہلاک ہونے کی بے بنیاد خبر اڑائے جانے کا ذکر کیا ہے۔

اس تذکرہ میں حزیں نے اگر اپنی بقیہ زندگی (یعنی ۱۱۵۵ھ سے ۱۱۸۰ھ تک) کے حالات بھی وقتاً فوقتاً بڑھا دیئے ہوتے تو تذکرہ کی اہمیت و افادیت اور بڑھ جاتی۔

(۳) تذکرۃ المعاصرین

شیخ علی حزیں کا تیسرا تذکرہ تذکرۃ المعاصرین[74] ہے اس کا نام تذکرہ شیخ محمد علی حزیں صفاہانی مشتمل بر احوال معاصرین، تذکرہ شعرائے معاصرین[75] اور تذکرہ حزیں[76] بھی ملتا ہے۔ یہ تذکرہ کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے[77] اس میں صفوی عہد کے آخر یعنی بارھویں صدی ہجری کے نصف اول کے ان علماء، فضلاء، ادباء اور شعراء کا ذکر ہے جو حزیں کے معاصر تھے۔ اس کی وضاحت خود حزیں نے یوں کی ہے:-

" دریں صفحات بذکر بعضے از یاران معاصر و ابیات

برخی از صاحبدلان صافی ضمائر کہ بفکر قویم و طبع مستقیم

لآلی بنظم لآلی اشعار بودہ[78] "

حزیں نے اس تذکرہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ علماء اعلام سے اور دوسرا حصہ دوستوں اور دوسرے لوگوں سے متعلق ہے۔ اس میں

ترتیب پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ خود لکھا ہے:۔

"و دریں مختصر زیادہ بدیں رعایت ترتیب را لازم ندید کہ منقسم بعد فرقہ نماید فرقۂ اولیٰ در ذکر علمای اعلام فرقۂ ثانیہ در بیان سایر انام و بدوستان کرام"۔ [۸۰]

انھوں نے ہندستان میں قیام کے دوران یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ کے آخر میں اس وقت لکھنا شروع کیا جب وہ بہت افسردہ تھے لیکن اس افسردگی کے باوجود حزیں نے یہ تذکرہ صرف نو دن میں مکمل کر لیا لکھتے ہیں:

"ربّ العزت وتعالیٰ مجدہٗ والہمنا شکرہ و حمدہ فرصت بخشید کہ در مُدّت نہ روز بعض ساعات لیل نہار را با خسردگی کمال و تفرقہ تا آں کہ بہوشی باسر نیست مصروف و خویش را مشغول تسوید ایں اوراق داشتہ یکصد کسی از دوستان ہم نفس و یاران سخن رس را دریں محفل گرامی و انجمن سامی فراہم آورد و از سخن شان آنچہ خاطر آشفتہ مساعدت نمود بزبان قلم آورد"۔ [۸۱]

اور مقدمہ میں سنہ تحریر کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

مخفی نماند کہ تسوید ایں اوراق در اواخر سال ہزار و یکصد و شصت و پنج ہجری در وقتے کہ بخت غنودہ در شبستان ہند تیرہ روز ست اتفاق افتادہ"۔ [۸۲]

اس تذکرے کے بارے میں مسعود علی نے لکھا ہے:

"بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب تمام عمر اس فکر میں رہے کہ اپنے ضائع شدہ تذکرہ "مدۃ العمر" کو کسی طرح پھر زندہ کریں اور اسی دھن میں انھوں نے تقریباً ۱۱۶۵ھ میں "تذکرہ شعرائے معاصرین" مرتب کیا جو ان کے دیوان کے ساتھ ہندستان میں طبع ہو گیا ہے۔ اس میں تقریباً ایک سو شعرائے معاصرین ایران کا ذکر ہے، اس میں بھی شیخ کے تعصب اور بد دماغی کی جھلک صاف طور سے نظر آتی ہے۔ ہندستان کے بیچارے شعراء کی کیا حقیقت تھی جو وہ شیخ صاحب کے معاصرین کی محترم فہرست میں داخل ہو سکتے"۔ [۸۳]

یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں ہندستان میں میرزا بیدل، میر عبدالجلیل بلگرامی میر غلام علی آزاد بلگرامی، میرزا مظہر جانجاناں، میر محمد افضل ثابت، میر محمد عظیم ثبات، سراج الدین علی خاں آرزو، سید جلال الدین غالب جیسے متعدد شعراء تھے جو حزیں کے معاصر تھے۔ لیکن اس تذکرہ میں ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ صاحب التذکرہ "ریاض الشعراء" علی قلی خاں والہ داغستانی کا بھی ذکر نہیں ہے جو ایران سے ہندستان تک حزیں کے تقریباً ہمسفر رہے۔

اس تذکرہ میں حزیں نے سید علی خاں، محمد مسیح فسائی، مولانا شاہ محمد شیرازی، شیخ ابراہیم جیلانی، سید مرتضیٰ عالمی، میرزا ہاشمی ہمدانی، سید قاسم یزدجردی، میرزا مہدی، شیخ خلیل اللہ طالقانی، میرا بدیع اصفہانی وغیرہ کا ذکر کیا ہے (ان میں سے کچھ کا ذکر "تذکرۃ الاحوال" میں بھی ہے) جس میں بعض ان کے والد کے ساتھی اور بعض حزیں کے استاد یا دوست تھے۔ ان میں سے زیادہ تر افراد کی حزیں سے ملاقات ان کے والد کے گھر یا ان کے سفر کے دوران ہوئی تھی۔ تذکرہ میں میر رضی فائح گیلانی [۸۴] اور محمد علی بیگ [۸۵] وغیرہ ایسے شعراء کا بھی ذکر ہے جن سے حزیں کی ملاقات نہیں ہوئی لیکن کسی نے حزیں سے ان کا ذکر کیا اور کوئی شعر پڑھا تو انھوں نے اس کو تذکرہ میں درج کر دیا۔

تذکرہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے محمد مسیح فسائی [۸۶] کا سب سے زیادہ (۲½ صفحات میں) اور میرزا حسن خالص [۸۷] اور محمد علی بیگ افسر وغیرہ کا بہت کم (صرف تین سطریں حالات مع ایک شعر) ذکر کیا ہے سید علی خاں [۸۸] کے حالات تفصیل سے (دو صفحات میں) اور مومن خاں حاکم لار کا ذکر بہت مختصر (صرف ۱½ سطر میں) کیا ہے۔ علاوہ بریں ملا مختار [۸۹] زہاوندی کا ذکر دو مرتبہ کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ حزیں شاید اپنی پریشانیوں کی وجہ سے مذکورہ تذکرہ کی اصلاح یا نظر ثانی نہ کر سکے۔

اس تذکرہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حزیں نے بعض شعراء کے دیوان کو پیش نظر رکھ کر انتخاب کلام کیا ہے جب کہ زایرای شوشتری [۹۰] وغیرہ

۲۱ ر دسمبر ۱۹۹۱

لکھنؤ

نثری کلیات

ممبر پارلیمنٹ

آل ہند

مختلف

جمع

۱۹۹۱ء

میں

اعلا

سنگھ

کی

رت کا



۶ر دسمبر ۱۹۹۱ء کو اترپردیش کے وزیر اعلا شری کلیان
خطاب

علی گڑھ میں
وزیر اعلا اترپردیش
شری کلیان
پنڈت دین
اپادھیائے
کا
سنگِ بنیاد

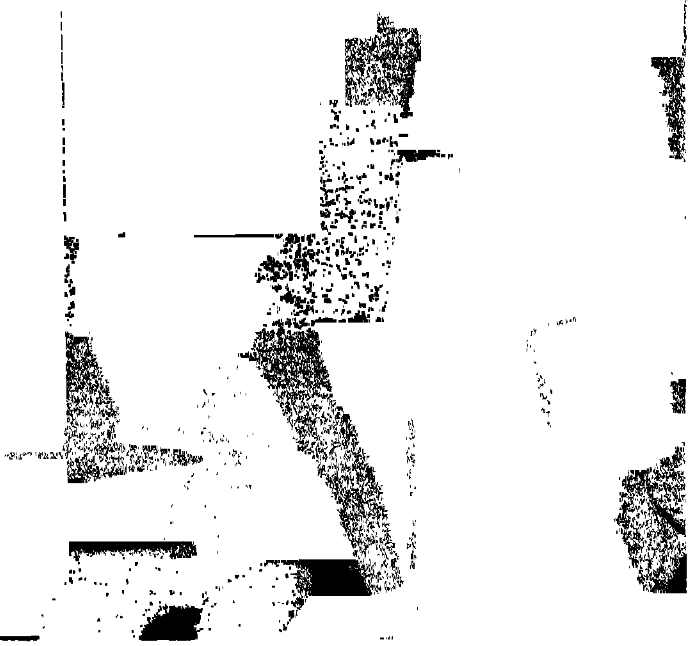


زلزلہ زدگان کی راحت کے سلسلے میں منعقدہ نشست کو
ئے .

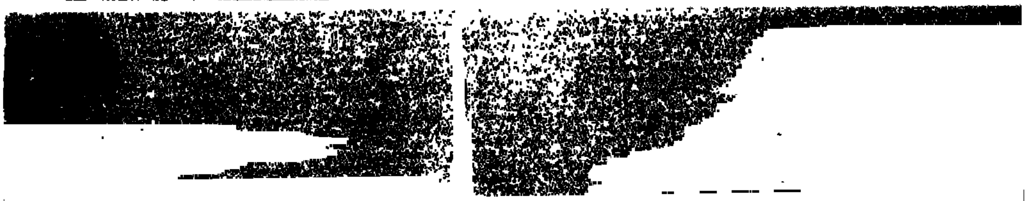


دسمبر ۱۹۹۱ء کو
بند انسداد بدعنوانی
خواتین سیل
مسعود کی کنوینر
دھر بہاجن نگر
کی امداد

کی کیان سنگھ



بیکل پر
رت کے بیر
یاست کے الا
شندے شہری
گیشن نے
ے گورنر
ے
کی



شہری لیاقت
اپنی رہائش

ملاقات

کے کلام کو اپنے حافظہ سے درج کیا ہے جس کی وجہ سے تذکرہ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس تذکرہ کے علاوہ اس کا کسی دوسرے تذکرہ میں ذکر نہیں ملتا۔

اس تذکرہ کی ایک خامی یہ ہے کہ بعض کو چھوڑ کر زیادہ تر علماء اور فضلاء کے انتقال کا سنہ نہیں لکھا گیا ہے جب کہ زیادہ تر تذکرہ نویس سنہ وفات لکھنا ضروری سمجھتے ہیں اور حزیں یا تو لکھتے ہی نہیں ہیں اور اگر لکھتے بھی ہیں تو ۲۰۔۳۰ یا ۵۰ سال پہلے مرنے کا ذکر کر دیتے ہیں جس سے صحیح سنہ وفات معلوم نہیں ہو پاتا۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس تذکرہ سے بعض تذکرہ نویسوں مثلاً میر غلام علی آزاد بلگرامی اور حسین علی خاں عاشقی عظیم آبادی وغیرہ نے بالترتیب اپنے تذکروں خزانۂ عامرہ اور نشترِ عشق وغیرہ میں استفادہ کیا ہے جو اس تذکرہ کی اہمیت اور افادیت کو ثابت کرتا ہے۔

(۴) سفینۂ شیخ علی حزیں

یہ تذکرہ شیخ علی حزیں کا چوتھا تذکرہ ہے۔ اس کے متعلق مسعود علی نے لکھا ہے :۔

"تذکرۂ معاصرین کی تکمیل کے بعد شیخ علی حزیں نے غالباً یہ سفینہ مرتب کیا ہے۔ اس میں بھی تقریباً سو شعراء کا تذکرہ یا کلام ہے اور بڑا حصہ ان شعراء کا ہے جن کا نشو و نما شیخ اور اس کے معاصرین سے ایک یا دو پشت قبل، مگر شاہانِ صفویہ ہی کے عہد میں ہوا ہے۔ اس سے قیاس یہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کا ارادہ تھا کہ اس سلسلہ کو اسی طرح بڑھاتے بڑھاتے اخیر تک لے جائیں اور اس طور سے اپنے تذکرہ "مدۃ العمر" کو زندہ کر دیں۔ مگر افسوس ہے کہ علالت اور ضعفِ بصارت کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا۔ .... سفینۂ ہذا کی تالیف کا سال نہ سفینہ میں درج ہے اور نہ مجھے کسی دوسرے ذریعہ سے معلوم ہو سکا۔ شیخ صاحب نے اس سفینہ میں شعراء کا حال نہایت مختصر کر دیا ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں مطلق کچھ نہیں لکھا ہے صرف ان کے چند اشعار نقل کر دیے ہیں البتہ جہاں تنقید وغیرہ کی، وہ ایسے ہے کہ سوائے شیخ صاحب کے اور کوئی شخص اس کی جرأت نہیں کر سکتا تھا دیکھو بابا فغانی کا تذکرہ، جس میں ملا جامی کے زمانے کی شاعری کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے"۔ [۱۹]

اس میں ابوالفتح ابراہیم[۲۰] سام میرزا[۲۱]، بابا فغانی[۲۲] وغیرہ کا قدرے تفصیل سے ذکر ہے اور انتخاب کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف ملا بیدل بابکی[۲۳] ملا حسن یزدی[۲۴] وغیرہ کا نام لکھ کر ایک شعر درج کر دیا گیا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ حزیں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے ہوں گے بہرحال صرف نام لکھ کر اشعار درج کر دینا ایک بیاض مرتب کرنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے بیاض اور تذکرہ دونوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ تذکرہ شعراء کے انتخاب کلام کی رو سے اچھا ہے لیکن حالات اور واقعات کی رو سے "تذکرۃ المعاصرین" اور "تذکرۃ الاحوال" سے کمتر ہے۔

بہرحال حزیں کے دستیاب تینوں تذکرے گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے ایرانی علماء، فضلاء، ادباء اور شعراء کی معلومات حاصل کرنے کے لیے محققین کے معاون و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

□□

حواشی

[۱] کلیات حزیں از شیخ محمد علی حزیں ص۱ منشی نول کشور، کانپور ۱۸۹۳ء نشترِ عشق از حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی، ورق، بکر، مخطوطہ نمبر ۸۹۸ سلطان المدارس لائبریری لکھنؤ، تالیف ۱۲۳۳ھ۔ خزانۂ عامرہ از میر غلام علی آزاد بلگرامی ص۱۹۳ منشی نول کشور، کانپور ۱۸۷۱ء۔ ید بیضا از میر غلام علی آزاد بلگرامی ص۶۵ مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔ ملوکہ فوٹو کاپی منیر جہاں لکھنؤ۔ مآثر الکلام از میر غلام علی آزاد بلگرامی ص۲۲۵ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ۱۹۱۳ء۔ سفینۂ شیخ علی حزیں از شیخ علی حزیں ص۲ دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۱۳۵۰ھ جب کہ سوانح عمری شیخ علی حزیں کے صفحہ ۳ پر ولادت کی تاریخ ۲۷ ربیع الآخر ۱۱۰۳ھ لکھی ہے۔ دیکھیے سوانح عمری شیخ علی حزیں مسلم پریس دہلی ۱۳۱۹ھ۔

۳؎ تا ۴؎ کلیاتِ حزیں ص۱۰ ص۱۱ اور ص۲۵

۵؎ خزانۂ عامرہ ص۱۹۳

۶؎ تا ۱۹؎ کلیاتِ حزیں صفحات ۱۲-۱۳-۸-۲۵-۲۶-۲۶-۲۶-۲۶-
۲۸-۲۷-۲۷-۳۳-۴۰-۵۸ اور ۶۰

۲۰؎ شعر العجم فی الہند۔ از شیخ اکرام الحق ص۲۰۱ شعبہ اشاعت الاکرام ملتان ص۱۹۶۱ء

۲۱؎ کلیاتِ حزیں ص۱۰۲۹

۲۲؎ شعر العجم فی الہند ص۲۱۳

۲۳؎ کلیاتِ حزیں ص۱۰۳۰

۲۴؎ شعر العجم فی الہند ص۲۱۳

۲۵؎ تجلیات، سوانح مفتی محمد عباس۔ از میرزا محمد ہادی عزیز ص۳۸۴
نظامی پریس لکھنؤ ۱۳۴۴ھ

۲۶؎ مآثر الکرام ص۲۲۵

۲۷؎ جبکہ رضا قلی خاں ہدایت نے تحریر کیا ہے، "روی بہ ہندوستان آورد در دہلی توطن گزید"۔ یعنی دہلی کو وطن قرار دیا۔ دیکھئے ریاض العارفین از رضا قلی خاں ہدایت ص۱۰۹ کتابخانۂ مہدیہ طہران۔ ایران ۱۳۱۶ھ

۲۸؎ نشترِ عشق، ورق "دکر"

۲۹؎ دیکھئے کلیاتِ حزیں ص۵۴، ص۵۵ وغیرہ

در ہند اگر کسے نہ رنجد از راست
گویم طبقات را بے کم وکاست
ہیچ است کہ شش نمی توانش کردن
باجی و دیوث و قحبہ و حیز و گداست

۳۰؎ خزانۂ عامرہ ص۱۹۴ ے

نشناس سیرتی است تمنائے مردمی
از دیولاخ ہند کہ انسان نداشتہ است

۳۱؎ کلیاتِ حزیں ص۱۲۱ "این مملکت ہمیشہ ناامن و خطرناک ست"

۳۲؎ تذکرۂ بے جگر۔ از خیراتی لعل بے جگر ص۱۳ مخطوطہ انڈیا آفس لندن ملکہ لیلڈ کاپی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ خزانۂ عامرہ ص۱۹۴
سفینۂ شیخ علی حزیں ص۳۸

۳۳؎ شعر العجم فی الہند ص۲۱۰

۳۴؎ دیکھئے خزانۂ عامرہ ص۱۹۵ ص۱۹۶

۳۵؎ دیکھئے سفینۂ شیخ علی حزیں ص۳۸ تا ص۴۳

۳۶؎ ایضاً ص۴۳ تا ص۴۶۔ شعر العجم فی الہند ص۲۱۱

۳۷؎ نشترِ عشق، ورق "دکر"۔ سفینۂ شیخ علی حزیں، مقدمہ ص۵۔ جبکہ کلیاتِ حزیں میں دوسرا مصرعہ اس طرح ہے :-

"ہر برہمن پسری لچھمن و رام است اینجا"

دیکھئے کلیاتِ حزیں ص۱۰۳۱

۳۸؎ خزانۂ عامرہ ص۲۰۰۔ شامِ غریباں : از لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی ص۸۰، انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۷ء

۳۹؎ نشترِ عشق ورق "دکر"

۴۰؎ کلیاتِ حزیں ص۱۰۳۰

۴۱؎ شامِ غریباں ص۸۷

۴۲؎ خزانۂ عامرہ ص۲۰۲۔ نشترِ عشق ورق "دکر"، کلیاتِ حزیں ص۱۰۳۰

۴۳؎ شامِ غریباں ص۸۷

۴۴؎ فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان۔ از احمد منزوی جلد اول ص۴۳۰ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد پاکستان سنہ ۱۹۸۳ء

۴۵؎ نشترِ عشق ورق "دکر"۔ جبکہ سفینۂ شیخ علی حزیں کے ص۴۵ پر دوسرا اور تیسرا مصرعہ اس طرح ہے :

"ہمی دانم کہ گوشش از دوست آوا نے شنید اینجا" ــ اور
"حزیں از پائے رہ پیما بسے فرسودگی دیدم"

اور شعر العجم فی ہند کے ص۲۰۶ پر تیسرا مصرعہ اس طرح ہے :

"حزیں از پائے رہ پیمائے من سرگشتگی دیدم"

علاوہ ازیں کلیاتِ حزیں کے ص۱۰۳۱ پر صرف تیسرا اور چوتھا مصرعہ دیا ہے جس کا تیسرا مصرعہ وہی ہے جو سفینۂ شیخ علی حزیں میں ملتا ہے۔

۴۶؎ نشترِ عشق ورق "دکر"۔ سفینۂ شیخ علی حزیں ص۵۴

۴۷؎ کلیاتِ حزیں ص۱۰۳۱

۴۸؎ شعر العجم فی الہند ص۲۰۹

۴۹ے شام غریباں ص۸۵
۵۰ے شعرالعجم فی الہند ص۲۱۳
۵۱ے کلیاتِ حزیں ص۴۱-۴۲
۵۲ے نجوم السماء فی تراجم العلماء۔ از میرزا محمد علی کشمیری ص۲۸۶ مکتبۂ بصیرتی قم، ایران ۱۳۹۴ھ
۵۳ے تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان۔ از سید علی رضا نقوی ص۳۶۷ علی اکبر علمی تہران ۱۹۶۴ء
۵۴ے ایضاً ص۱۹ سفینۂ شیخ علی حزیں ص"ہ"
۵۵ے راقم کے پیش نظر دو نسخے ہیں۔ ایک منشی نول کشور، کان پور سے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں شائع ہوا اور دوسرا مسلم پریس، دہلی سے ۱۳۱۹ھ میں۔
۵۶ے کلیاتِ حزیں ص۲
۵۷ے سوانح عمری شیخ علی حزیں، مسلم پریس، دہلی ۱۳۱۹ھ
۵۸ے جب کہ صاحب شعرالعجم فی الہند نے ۱۱۵۲ھ لکھا ہے۔ دیکھیے ص۲۰۳
۵۹ے کلیاتِ حزیں ص۱۱۸، ص۱۱۹
۶۰ے تا ۶۲ے کلیاتِ حزیں ص۷، ص۱۰۹، ص۱۱
۶۳ے یہ مصرعہ اس طرح بھی ملتا ہے:۔
"ای گردن بلند قداں در کمند تو"
دیکھیے تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۴۴
۶۴ے کلیاتِ حزیں ص۱۵-۱۶ اسی واقعہ کے ذیل میں صاحب مخزن الغرائب نے مولانا حسن کا نام بڑھایا ہے۔ دیکھیے تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۳۴۴
۶۵ے تا ۷۳ے کلیاتِ حزیں ص۴۸، ص۸۱، ص۴۰، ص۴۳، ص۴۷، ص۷۳، ص۷۴، ص۹۳، ص۱۱۵، ص۱۳۹
۷۴ے نشترِ عشق۔ ورق "یط"
۷۵ے خزانۂ عامرہ ص۵
۷۶ے سفینۂ شیخ علی حزیں ص"ہ"
۷۷ے تذکرۂ حزیں از شیخ محمد علی حزیں، کتاب فروشی تائید، اصفہان۔ ایران ۱۳۳۴ھ

۷۸ے راقم کے پیش نظر دو نسخے ہیں۔ ایک منشی نول کشور، کان پور سے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں شائع ہوا اور دوسرا کتاب فروشی تائید، اصفہان ایران سے ۱۳۳۴ھ میں۔
۷۹ے تا ۸۲ے کلیاتِ حزیں ص۹۳۳، ص۹۳۸، ص۱۰۲۵ اور ص۹۲۳
۸۳ے سفینۂ شیخ محمد علی حزیں ص"ہ" اور ص"و"
۸۴ے تا ۹۰ے کلیاتِ حزیں ص۱۰۱۴، ص۱۰۱۹، ص۹۴۲ تا ص۹۴۹، ص۱۰۲۴، ص۹۳۹، ص۱۰۱۴ اور ص۱۰۱۵، ص۱۰۰۴
۹۱ے سفینۂ شیخ علی حزیں ص"و" اور ص"ز"
۹۲ے تا ۹۶ے سفینۂ شیخ علی حزیں ص۳۲، ص۴۲ اور ص۴۳، ص۹۱، ص۲۴، ص۶۰
۱۱۳۴ھ میں افغانوں نے اصفہان پر غلبہ حاصل کر کے شاہ سلطان حسین صفوی کو معزول کر کے اس کے بیٹے محمود کو اس کا قائم مقام مقرر کیا اور ہر طرف قتل و غارت گری شروع کر دی۔ اسی میں شاہ سلطان حسین صفوی اور حزیں کے بعض دوستوں کا بھی قتل ہوا۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے کلیاتِ حزیں ص۵۲ تا ص۶۳

□□

دستیاب مخطوطات ص۱۴۱ کا بقیہ

ص۲۳۲۹ احمد منزوی۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد
— فہرست مشترک نسخہائے خطی فارسی پاکستان جلد پنجم ص۳۳۵
احمد منزوی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد ۱۹۸۶ء
— شعرالعجم فی الہند ص۲۱ اکرام الحق
۱۵ے اس نشان سے مراد ہے کہ عبارت ضرورت کے تحت چھوڑ دی گئی
۱۶ے سید محمد عسکری جون پوری۔ شیخ حزیں کے معاصر تھے اور ان کی ۱۱۹۰ھ میں وفات ہوئی۔ مطلع انوار ص۵۰۵ سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر کراچی ۱۹۸۱ء ۱۴۰۲ھ
۱۷ے اس نشان سے مراد ہے عبارت پڑھی نہ جا سکی۔

□□

سید محمد رضا ساجد رضوی
۸۱ - مقبرہ گول گنج ، لکھنؤ

لکھنؤ میں حزیں کے دستیاب مخطوطات

ایران کا عہد صفویہ وہ عہد ہے جس میں ایران سے ہجرت کر کے بہت سے شعرا اور ادبا ہندستان آئے۔ ان مہاجر شعرا میں شیخ محمد علی حزیں کا نام نمایاں اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ وہ نہ صرف عربی و فارسی کے عدیم المثال شاعر تھے بلکہ مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک جید عالم دین بھی تھے اور کثیر التصانیف بھی۔ انھوں نے اپنے ناساعد حالات اور پریشانیوں کے باوجود بہت کچھ لکھا۔ وہ ۲۷ر ربیع الآخر ۱۱۰۳ھ کو اصفہان میں پیدا ہوئے ان کا سلسلۂ نسب سلاطین صفویہ کے جد اعلیٰ شیخ صفی الدین اردبیلی کے پیر و مرشد شیخ زاہد گیلانی سے اس طرح ملتا ہے :

محمد المو عدبعلی ابن ابی طالب ابن عبد اللہ ابن
علی ابن عطار اللہ ابن اسماعیل ابن اسحاق ابن نور
الدین محمد ابن شہاب الدین علی ابن علی ابن یعقوب ابن
عبدالواحد ابن شمس الدین محمد ابن احمد ابن محمد ابن
جمال الدین علی ابن شیخ الاجل قدوۃ العارفین تاج الدین
ابراہیم المعروف بزاہد جیلانی

زاہد گیلانی (عربی میں جیلانی) کا وطن ستارا تھا جہاں ان کا مدفن بھی ہے شیخ حزیں کے اجداد میں شیخ شہاب الدین علی نے ستارا سے لاہیجان آکر سکونت اختیار کرلی تھی اور حزیں کے والد ابی طالب اپنے والد کی حیات ہی میں لاہیجان سے اصفہان آ گئے تھے اسی وجہ سے حزیں کو اصفہانی ، لاہیجانی ، گیلانی وغیرہ لکھا جاتا ہے۔

حزیں کی تعلیم چار سال کی عمر میں شروع ہوئی اور ملا محمد شاہ شیرازی نے بسم اللہ کرائی۔ حزیں کی یادداشت کے مطابق ملا شیرازی نے بسم اللہ کے بعد تین مرتبہ یہ آیت پڑھوائی :

رب اشرح صدری ویسرلی امری واحلل
عقدۃ من لسانی و یفقھوا قولی ہ

حزیں نے ملا شیرازی سمیت مختلف علما و ماہرین سے اسلامی اور ادبی علوم و فنون کی تکمیل کی۔ اس کے علاوہ سینٹ اونس سے انجیل، شرح انجیل نیز عیسائی عقائد و اعمال کی تعلیم حاصل کی۔ شعیب ربی سے توریت پڑھی اور اس کا ترجمہ لکھوایا۔ رستم مجوسی سے کتب مجوس، نجوم، تقویم، رمل، ہیئت اور اصول رصد کی تعلیم حاصل کی اور دستور مجوسی سے زردستی مذہب کا علم سیکھا۔

ایران کی سیاسی شورانگیزیوں سے پریشان ہوکر حزیں نے وطن کو خیرباد کہا اور ٹھٹھہ، بھکر، سیتان، ملتان، خدا آباد، لاہور، سرہند، دہلی، پٹنہ ہوتے ہوئے بنارس آ گئے اور یہ فیصلہ کرلیا کہ

از بنارس نروم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است ایں جا

بعض اہل ہنود نے اس کا دوسرا مفہوم نکالتے ہوئے کہا کہ یہ اہل ہنود کی مخالفت میں کہا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس لیے سمجھا گیا ہو کہ وہ صرف اس بنا پر بددماغ اور متعصب سمجھے جاتے تھے کہ انھوں نے اپنے تذکرہ "تذکرۃ المعاصرین" میں ہندستانی شعرا کو شامل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے بعض اشعار میں ہندستان کی برائی بھی کی تھی۔ یہاں کے شعرا کو ان سے پرخاش ہوگئی تھی اور سراج الدین آرزو نے "تنبیہ الغافلین" لکھی جس میں حزیں

کے چار سو اشعار پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ اسی طرح محمد عظیم ثبات ابن محمد افضل ثابت نے حزیں کے پانچ سو اشعار ایسے جمع کیے تھے جس میں مضمون دوسرے شعراء کا معلوم ہوتا تھا۔ حزیں کے ایک دوست نے کسی تقریب میں میر افضل ثابت کی ایک بیت ان کو لکھ کر دی جس پر حزیں نے یہ جملہ تحریر کردیا کہ بے ربطی سے قطع نظر مضمون فلاں شاعر کا ہے جس کو میر افضل نے چرایا ہے۔

جب یہ رقعہ ثبات کی نظر سے گزرا تو انھوں نے حزیں کے قابل اعتراض اشعار کو یکجا کرکے ضائع کردیا کہ ؎

ہر آن کہتر کہ با مہتر ستیزد
چناں افتد کہ ہرگز برنخیزد

شیخ حزیںؒ نے شب گیارہ جمادی الاول ۱۱۸۰ھ کو تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں رحلت کی اور اپنے قائم کردہ حسینیہ فاطمین بنارس میں اپنی ہی بنوائی ہوئی لحد میں سپرد خاک کیے گئے۔ ان کی تاریخ وفات اس دعائیہ فقرہ "خدا ایشاں بیامرزاد" سے برآمد ہوتی ہے۔

شیخ حزیں نے مختلف علوم و فنون پر لاتعداد کتابیں لکھیں لیکن زمانہ کی ستم ظریفی سے کتابیں تو در کنار عام طور پر ان کی کتابوں کی فہرست بھی نہیں ملتی۔ نجوم السماء کے مصنف میرزا محمد علی کشمیری کو حزیں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی فہرست کہیں سے دستیاب ہو گئی تو انھوں نے اس کو "نجوم السماء فی تراجم العلماء" میں نقل کردیا۔ مذکورہ فہرست میں تراسی عربی اور ایک سو تیرہ فارسی کی کتابوں اور رسالوں کے نام ہیں۔ عربی و فارسی کی کتابوں اور رسالوں کے نام حروف تہجی کے مطابق دیے جارہے ہیں:

عربی کتب و رسائل

۱۔ اخبار ابو الطیب المتنبی احمد بن الحسین بن عبد الصمد الجعفی الکوفی وذکر بعض اشعاره الفائقه
۲۔ اخبار ابی تمام الطائی حبیب بن اوس وبعض اشعاره
۳۔ اخبار جدی السعید الشیخ ابراهیم المعروف بزاهد الجیلانی قدس سره
۴۔ اخبار الشیخ صفی الدین الحلی ونوادر اشعاره
۵۔ اخبار الصاحب الجلیل کافی الکفاة اسمعیل بن عباد الطالقانی وذکر ما وصل الی من فصوله ونوادر اشعاره
۶۔ اخبار المحقق الطوسی
۷۔ انیس الفواد فی حقیقة الاجتهاد لولیعمل مثله
۸۔ بهجة الاقران
۹۔ تجوید القرآن
۱۰۔ تحقیق الازل والابد والسرمد
۱۱۔ تعلیقات التذکره ابن رشید
۱۲۔ تعلیقات التلویحات شیخ المقتول
۱۳۔ تعلیقات شرح اشارات (مقامات العارفین)
۱۴۔ تعلیقات شرح تجرید (امور العامه)
۱۵۔ تعلیقات شرح المقاصد
۱۶۔ تعلیقات الشفا (مبحث فلکیات)
۱۷۔ تعلیقات الفصوص الفارابی
۱۸۔ تعلیقات فی الطبیعی والالعصی
۱۹۔ تعلیقات المجطی (غوامض)
۲۰۔ تعلیقات کتاب المطارحات شیخ المقتول
۲۱۔ تعلیقات کتاب النجاة
۲۲۔ تفسیر سوره هل اتی علی الانسان
۲۳۔ جلاء الافهام فی علم المساحة
۲۴۔ جواب ابی نصر الله الحائری فی مواضع الکلام الشیخ العربی
۲۵۔ جوابات عن المسائل سال عنها الشیخ احمد بن محمد الصمیری العمانی
۲۶۔ جوابات عن المسائل الطیریه
۲۷۔ جوامع الادب
۲۸۔ جوامع الکلم
۲۹۔ حیات الاخوان

۳۰. خلاصة [illegible]
۳۱. خلق الاعمال
۳۲. خواص بعض السور والآیات (نجف میں تصنیف کی)
۳۳. دعائم الدین
۳۴. دعوات الصالحات واسماء الحسنیٰ (تصنیف نجف)
۳۵. الذخر والسعادۃ فی العبادۃ
۳۶. راح الارواح
۳۷. الرد التناسخیہ
۳۸. الرمح العقول فی الطعن علی اکثر قواعد الاصول
۳۹. رموز الکشفیہ
۴۰. رواح الجنان
۴۱. سیف اللہ المسلول علیٰ اعداء آل الرسول
۴۲. شجرۃ الطور فی شرح آیۃ النور
۴۳. شرح رسالہ حکیم عیسیٰ بن زرعہ
۴۴. شرح الرسالہ شیخ شہاب الدین یحیٰ المقتول
۴۵. شرح عیون اخبار الرضا
۴۶. شرح قصیدتی الممدودۃ (یہ سید حسین کی کوئی کتاب ہے جیسا پھر شرحها میں شرح لکھی)
۴۷. الصراط السوی فی غوایۃ البغوی
۴۸. الطول والعرض
۴۹. فتح الابواب
۵۰. فصول البلیغہ
۵۱. الفوائد الحلبیہ (میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد آگے لکھنے اور اختتام تک پہونچانے کی دعا کی گئی ہے)
۵۲. کتاب الانساب
۵۳. کتاب التوجیہ بقول قدماء المجوس فی المبداء
۵۴. کتاب الدیباج فی ابانۃ اغلاط الزجاج
۵۵. کتاب سیر عبداللہ بن بدیل ابن ورقاء الخزاعی الازدی و اخبارہ
۵۶. کتاب العین فی شرح قصیدۃ العینیہ سید حمیری
۵۷. کتاب الفصح
۵۸. کتاب الفضائل فی احیاء سنن الاوائل
۵۹. کتاب النصرۃ
۶۰. کتاب النیۃ
۶۱. کتاب الوصیۃ
۶۲. کتاب ہشام بن الحکم ومناظراتہ
۶۳. کدالقلم فی حل شبہۃ جذر الاصم
۶۴. کشف التلبیس فی ھدم اساس ابلیس
۶۵. کشف الغطا فی تحقیق الغنا
۶۶. کنہ المرام
۶۷. اللباب فی علم الحساب
۶۸. اللمع فی ازھاق البدع
۶۹. لوامع المشرقہ
۷۰. ماجری بہ القلم
۷۱. مختصر بدیع والعروض والقوافی
۷۲. مدارج العالیہ
۷۳. مدۃ العمر
۷۴. المراسد فی الرائج والکاسد
۷۵. مشاھد العالیہ
۷۶. معراج النفس
۷۷. معنی الصمد وتفسیر سورۃ التوحید
۷۸. المقلہ فی بیان النقطہ
۷۹. الناسخ والمنسوخ
۸۰. نجح الطلب فی استخراج ضلع المکعب
۸۱. نوادر ابی الحسین مھیار الکاتب الدیلمی واخبارہ
۸۲. نوادر العرب واخبارہ
۸۳. ھدایۃ الامم فی حدوث وقدم

فارسی کتب و رسائل

۱۔ ابطال التناسخ
۲۔ ابطال الجبر والتفویض
۳۔ احکام الشک والسہو در نماز
۴۔ آداب دعوۃ الاسماء والاذکار
۵۔ آداب العزلۃ والخلوۃ
۶۔ آداب المعاشرۃ
۷۔ الاسنیٰ در تحقیق قول تعالیٰ: ثم دنی فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی
۸۔ اصول المنطق
۹۔ الاغاثۃ فی الامامۃ
۱۰۔ بشارۃ النبوۃ (اس کتاب میں توریت انجیل اور صحیفہ یوشع کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔)
۱۱۔ تجرید النفس
۱۲۔ التخلیہ والتحلیہ
۱۳۔ تذکرۃ المعاصرین
۱۴۔ ترجمہ جوشن صغیر
۱۵۔ ترجمہ دعائے صباح
۱۶۔ ترجمہ دعائے علوی المصری
۱۷۔ ترجمہ دعائے مشلول
۱۸۔ ترجمہ رسالہ ابیون شیخ الرئیس
۱۹۔ ترجمہ رسالہ صفیحہ فی الاصطرلاب شیخ البہائی
۲۰۔ ترجمہ رسالہ والد در بیان قل الروح من امر ربی
۲۱۔ ترجمہ رسالہ والد در تحقیق قول علیہ السلام: عرفت ربی بفسخ العزائم
۲۲۔ ترجمہ رسالہ والد در تحقیق ماھو الحق فی مسئلۃ العلم
۲۳۔ ترجمہ کتاب اقلیدس
۲۴۔ ترجمہ منطق التجرید
۲۵۔ ترجمہ نوادر محمد بن ابی عمیر الازدی و تذکرۂ احوال و آثار آن
۲۶۔ التعریف در انواع قسمت
۲۷۔ تفسیر الاسماء و معانی آن
۲۸۔ تفسیر سورۂ حشر
۲۹۔ جام جم در بیان "موالید اور کائنات الجو"
۳۰۔ جبرائد الانتقال
۳۱۔ الجمع بین الحکمۃ والشریعۃ
۳۲۔ حیات و ممات
۳۳۔ خواص المجرب
۳۴۔ دستور العقلاء در آداب ملوک و امراء
۳۵۔ دلالت علی الخیر
۳۶۔ رد نصاریٰ
۳۷۔ رسالہ اصول اخلاق
۳۸۔ رسالہ اقسام مصدقین
۳۹۔ رسالہ تجدد امثال
۴۰۔ رسالہ تذکرہ نفس بر قول ارسطو و افلاطون الالٰہی
۴۱۔ رسالہ تضعیف شطرنج
۴۲۔ رسالہ جواب سوالات کہ از قسطنطنیہ وارد شدہ
۴۳۔ رسالہ جواب مسائل کہ از خراسان وارد شدہ
۴۴۔ رسالہ جواب مسائل کہ از گیلان وارد شدہ
۴۵۔ رسالہ حسن و قبح عقلیین
۴۶۔ رسالہ در احوال افضل احمد بن محمد القاسانی و تذکرہ بعض خطوط و فوائد آن۔
۴۷۔ رسالہ در اعمال شب جمعہ
۴۸۔ رسالہ در امامت و بحث شرائط آن
۴۹۔ رسالہ در بحث ہمراہ شیخ سہروردی در رویت
۵۰۔ رسالہ در بیان خوارق العادات و معجزات و کرامات
۵۱۔ رسالہ در بیان قوت قدسیہ و امکان نفوس قدسیہ در نوع انسانی بر قول مشائیں و تجویز کشف و الہام برائے اشراقین و صوفیہ

۵۲. رسالہ درتحقیق بعض مسائل اختلاف درمیان امت محمدیہ
۵۳. رسالہ درتحقیق نماز جمعہ
۵۴. رسالہ درتدوین خطوط (اپنے رفقاء کو لکھے گئے خطوط کا مجموعہ)
۵۵. رسالہ درجواب چہار سوالِ متناسب
۵۶. رسالہ درجواب مسئلہ وضو
۵۷. رسالہ درحل بعض اشعار خاقانی
۵۸. رسالہ دردلالت فعل مضارع
۵۹. رسالہ درشرح قصیدۂ لامیہ خود
۶۰. رسالہ درضروریات دین
۶۱. رسالہ در فرق علم و معرفت
۶۲. رسالہ درنوافل لیلیہ
۶۳. رسالہ سیرۃ المتعلمین
۶۴. رسالہ کر و احکام میاہ
۶۵. رسالہ کسوف و خسوف
۶۶. رسالہ معرفت قبلہ
۶۷. رسالہ مناسک حج
۶۸. رسالہ ریاض الحکمت
۶۹. سبب اختلاف دراخبار و بیان
۷۰. شرح بعض خطب امیرالمومنین علیہ السلام
۷۱. شرح بعض فصول افلاطون الالٰہی
۷۲. شرح دعائے عرفہ سیدالشہداء علیہ السلام
۷۳. شرح رسالہ ابی یوسف یعقوب بن اسحٰق کندی درتحقیق نفس
۷۴. شرح رسالہ والد درتحقیق حرکت
۷۵. شرح رسالہ والد درحل مسبع و متسع دردائرہ
۷۶. شرح رسالہ والد درقول ارسطو لم صاد مار عطر خفیفا
۷۷. شرح قصیدہ جیمیہ فارضیہ
۷۸. شرح مصباح الشریعۃ
۷۹. شرح مطلع الانوار درہیئت
۸۰. شعیا مایدل علیٰ نبوۃ نبینا صلی اللہ علیہ والہ وسلم
۸۱. علاجات الغریبہ
۸۲. فتح السبل
۸۳. الفرق بین اللمس والمس
۸۴. فضائل القرآن
۸۵. فضل العراق
۸۶. فلذۃ الاکباد حاصل رسالہ ابی عبداللہ معصومی درعشق
۸۷. فوائد الطب
۸۸. کتاب التالیف بین الناس
۸۹. کتاب الادعیہ والادویہ
۹۰. کتاب الحلبات
۹۱. کتاب درتحقیق رویا و اصول علم تعبیر
۹۲. کتاب الزکوٰۃ
۹۳. کتاب الصید والذبائح وخواص الحیوان
۹۴. کتاب المعادن
۹۵ کتاب المواریث
۹۶. کتاب النسب التالیفیہ
۹۷ مبحث القدم والحدث
۹۸. مختصر الدعوات والزیارات
۹۹. مصابیح الظلام فی رواۃ الکلام
۱۰۰. معرفۃ الاجسام
۱۰۱. معرفۃ الباری
۱۰۲. معرفۃ التقویم واحکام نجوم
۱۰۳. معرفۃ اللآلی
۱۰۴. معرفۃ النفس و تجرد آن
۱۰۵. معیار دراوزان شرعیہ
۱۰۶. المفصل درجبر عقل و توکل
۱۰۷ مقالات بعض المشائخ
۱۰۸ مکیال العلوم
۱۰۹ مناظرات والمحاضرات (مذاکرات فی المحاضرات)

۱۱۰. مواعظ الحکما

۱۱۱. المواہب فی لیلۃ الرغائب

۱۱۲. موائد السادیہ

۱۱۳. وجوب النص علی الامام

مذکورہ فہرست میں شامل کتابوں اور رسالوں کے علاوہ مختلف[۵] حوالوں سے حزیں کی جن دیگر کتابوں اور رسالوں کے نام ملتے ہیں، وہ اس طرح ہیں:-

۱. حاشیہ بر شرح ہیاکل النور
۲. حواشی شرح حکمت اشراق
۳. شرح کلمۃ التصوف شیخ اشراق
۴. رسالہ وجوب مسح رجلین
۵. رسالہ مدارج حروف
۶. فرائد الفوائد
۷. حاشیہ شفا الٰہیات
۸. رجم الشیاطین
۹. رسالہ در تحقیق معاد روحانی
۱۰. جواب رقعات حسن
۱۱. مراۃ اللہ
۱۲. مواعد الاسماء
۱۳. تذکرۃ الاحوال (تاریخ احوال)
۱۴. سفینۂ شیخ علی حزیں
۱۵. حملہ ہائے ایران بر ہند
۱۶. رسالہ مفرح القلوب در مجربات
۱۷. جواہر نامہ
۱۸. فرس نامہ
۱۹. مثنوی ودیعۃ البدیعۃ (حدیقۃ الحقیقۃ)
۲۰. مثنوی مطمح الانظار
۲۱. مثنوی تذکرۃ العاشقین
۲۲. مثنوی خرابات
۲۳. مثنوی صفیر دل
۲۴. مثنوی چمن و انجمن
۲۵. مثنوی ساقی نامہ
۲۶. مثنوی فرہنگ نامہ
۲۷. قصیدۂ لامیہ
۲۸. دیوان اوّل
۲۹. دیوان دوم
۳۰. دیوان سوم
۳۱. دیوان چہارم

میری معلومات کے مطابق اب تک حزیں کی صرف مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو سکی ہیں:-

(۱) دیوان چہارم بخط علی قلی والہ کراچی سے شائع ہوا۔
(۲) تذکرۃ المعاصرین
(۳) سفینۂ شیخ علی حزیں
(۴) تذکرۃ الاحوال (تاریخ احوال)
(۵) کلیات حزیں — جس میں تاریخ احوال اور تذکرۃ المعاصرین کے ساتھ دیوان چہارم کے تحت قصائد، غزلیات، متفرقات، رباعیات مثنوی صفیر دل۔ مثنوی چمن و انجمن، مثنوی خرابات، مثنوی مطمح الانظار، مثنوی فرہنگ نامہ، مثنوی تذکرۃ العاشقین اور مقطعات شامل ہیں۔ مقطعات میں پیغمبر اسلامؐ اور وصی پیغمبرؑ کی مدح و ثنا، مرثیہ امام حسینؑ کے علاوہ مرثیہ والد، قطعات تاریخ وفات میر محمد تقی خراسانی و شیخ عبداللہ اور کچھ منظوم مکاتیب وغیرہ شامل ہیں۔

حزیں کی کتابوں اور رسالوں کی تفصیل پیش کرنے کے بعد اب لکھنؤ کے تین گمنام کتب خانوں میں حزیں کے دستیاب مخطوطات کا تعارف دیا جارہا ہے۔ یہ کتب خانے گمنام اس لیے ہیں کہ ابھی تک ان کی فہرستیں (کیٹلاگ) شائع نہیں ہوئی ہیں جس کی وجہ سے عام لوگوں کو یہاں کے ذخیروں کا علم نہیں ہے۔ ان دستیاب مخطوطات کی قدر و قیمت سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ بعض مخطوطات خود مصنف کے کتابت کردہ ہیں اور بعض

مخطوطات ایسے ہیں جن کے نام بھی کہیں نہیں ملتے ۔ ان دستیاب مخطوطات میں : (۱) کتاب الالغاز (۲) کتاب الصلوٰۃ (۳) کتاب الصلوٰۃ (۴) رسالہ نماز ہائے واجب (۵) وصیت شیخ علی حزین (۶) رسالہ در بحث وضو (۷) فتاویٰ شیخ علی حزین ، شامل ہیں

یہ ایسے مخطوطات ہیں جن کے نام بھی اوپر دیئے گئے حوالوں میں نہیں ہیں ۔

ذخیرۂ مدرسۃ الواعظین میں ایک ہی جلد میں حزین کے تمام مخطوطات ہیں اور ذخیرہ عمدۃ العلماء میں ایک مخطوطے کے علاوہ تمام مخطوطات ایک ہی جلد میں ہیں ۔ اس لیے جس ترتیب سے مذکورہ جلدوں میں مخطوطات شامل ہیں اسی ترتیب سے یہاں تعارف پیش کیا جارہا ہے ہر مخطوطہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا ہے :۔

نام مخطوطہ : مذاکرات فی المحاضرات

زبان وخط : فارسی نستعلیق کاتب : شیخ محمد علی حزین
سائز : ۲۳x۱۴ سنٹی میٹر سطریں ۱۲ صفحات ۱۰۰
موضوع : کلام مخطوطہ نمبر ۴۲۸
ذخیرہ کتب خانہ مدرسۃ الواعظین ۔ لکھنؤ

ابتداء :

از فیض ایزدی خواستارم کہ دلی دہد ....
..... امابعد نامق این سطور محمد المشتہر بعلی اللاہجی عفا اللہ عنہ در ہجوم وہموم و انبوہ اندوہ والی اللہ المشتکی .... بمذاکرات فی المحاضرات تسمیہ خواہد یافت مشتمل بر چہار مقالہ ....

اختتام :

یا حبذا الوصال ولو بالخیال تم الکتاب بعون المفضل الوہاب رب اختم لی بالخیر

ترقیمہ :

....

موضوعات ۔ محاسن کلام، مناظرہ اور اس کے شرائط و آداب، علم محاورہ اور اس کے آداب ، حکم، امثال، نکات و کلمات بلغاء کے مختلف فوائد ۔

کیفیت :

عبارت صاف، خط متوسط ، رسالہ فارسی زبان میں ہے مگر مثالیں عربی میں دی گئی ہیں ۔

پہلا مقالہ دو مقامات پر منقسم ہے ۔ پہلے مقام میں محاسن کلام کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ اس مقام میں انسان اور حیوان کی مشترک صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے کلام کو انسان کی خصوصی صفت بتایا گیا ہے ۔

دوسرا مقالہ علم مناظرہ سے متعلق ہے جس میں مناظرہ کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کے آداب وشرائط بھی دیئے گئے ہیں ۔ تیسرا مقالہ علم محاورہ سے متعلق ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ علم محاورہ ہی کا دوسرا نام علم محاضرات ہے اور ساتھ ہی علم محاضرات کے آداب وشرائط بھی دیئے گئے ہیں ۔

چوتھا مقالہ فوائد متفرقہ سے متعلق ہے جس میں حکم، امثال، نکات و کلمات بلغاء، مسکت جوابات، حکایت وظرائف اور نوادر اقوال کے ذیل میں حضور خاتم النبیینؐ کے بعض خطبوں، بہلول، امام غزالی، سقراط، بوذر جمہر، افلاطون وغیرہ کے کلمات سے مثالیں دی گئی ہیں ۔ نسخہ معمولی کرم خوردہ ہے ۔

نام مخطوطہ : رسالہ معیار

زبان وخط : فارسی نستعلیق کاتب : شیخ محمد علی حزین
سائز : ۲۳x۱۴ سنٹی میٹر سطریں : ۱۲
صفحات : ۱۰ موضوع ، اوزان شرعی (فقہ)
مخطوطہ نمبر ۴۲۸ ذخیرہ کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ

ابتداء :

الحمد للہ رب العالمین حمداً کثیراً والصلوٰۃ علی محمد وآلہ وسلم تسلیما امابعد مستفید فیوض ربانی محمد المشتہر بعلی الجیلانی بر لوح ضمیر اخلاء روحانی می نگارد چون قدر و مقدار ہر یک از مثقال و دینار و درہم و صاع و مد و رطل پیوستہ ......

اختتام :

و امثال آن میل اقل نماید بعنوان احتیاط شاید بد نباشد واللہ اعلم بالصواب والیہ مرجع والمآب والحمد للہ حمداً کثیراً کما ہو تمت ایں الرسالہ ۔

ترقیمہ :

. . . .

موضوعات : شرعی اوزان ۔

کیفیت : اس میں شریعت اسلام یعنی فقہ میں رائج چیزوں کے اوزان دیے گئے ہیں۔ مثقال، رطل، مد، درہم و دینار کے ساتھ ساتھ نصاب الذہب والفضہ کے اوزان بتائے گئے ہیں۔

نام مخطوط : **رسالہ در تحقیق نفس و تجود آن**

زبان و خط : فارسی نستعلیق　　کاتب : شیخ محمد علی حزیں

سائز ۲۳ × ۱۴ سنٹی میٹر　　سطریں : ۱۲

صفحات : ۳۲　　موضوع : معرفت الٰہی

مخطوطہ نمبر ۴۲۸　　ذخیرہ : کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ

ابتدا :

نہ عقل کنہ لایزال تو رسد　　نہ نقص بدامن کمال تو رسد
وہم ارچہ محیط تحت و فوق آمد لیک　　کے گرد سراچہ جلال تو رسد
اناجیک یا قدوس و یا باری النفوس نور قلوبنا بمعرفتک

اختتام :

ہذا آخر ما اوردنا فی ھذا الرسالۃ والصلوٰۃ علی خاتم الرسالۃ محمد اشرف المرسلین و آلہ الطاہرین

ترقیمہ :

وکتب الاحرف محمد المشتہر بعلی ابن ابی طالب عبداللہ بن علی الجیلانی عاملہ اللہ فی نشاتیہ بالحسنی فی ظاہر بلدۃ کرمانشاہان حفت بالامان لاجابہ بعض الاخوان ونفعہ اللہ لمراضیہ تمت الرسالہ

موضوعات :

نفس کی شناخت اور معرفت خدا و نوع عالم

کیفیت : اس کتاب میں معرفت الٰہی کے لئے نفس کی شناخت، عقل و دانش کی اہمیت سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اس کتاب میں صفحہ نمبر ۴ - ۵ پر درج شدہ درج ذیل عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۱۳۹ھ کی تصنیف ہے۔

"چون درین وقت کہ اواخر شہر رمضان ہزار و یکصد و سی و نہ ہجری ست محرر این سواد مستمد فیوض ازلی محمد المشتہر بعلی عاملہ اللہ بفضلہ بمنزلی از سواد عراق نزول یکی از برادران کہ دوستی او خدا را بود"

نام مخطوط : **شجرۃ الطور فی شرح آیۃ النور**

زبان و خط : عربی نستعلیق　　کاتب : شیخ محمد علی حزیں

سائز : ۲۳ × ۱۴ سنٹی میٹر　　سطریں : ۱۲

صفحات : ۱۶　　موضوع : تفسیر

مخطوطہ نمبر ۴۲۸　　ذخیرہ : کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ

ابتدا :

نحمدک یا نور النور و نورا فوق کل و نصلی علی نبیک المجبور محمد و آلہ فی البطون والظہور و بعد یقول العبد محمد المشتہر بعلی ہذا قبس اقتبسہ من الوادی المقدس سمیتہ بشجرۃ الطور فی شرح آیۃ النور . . . . .

اختتام :

والی ھنا اقطع الکلام راجیا من اللہ التوفیق لما اردت بیانہ من الآیۃ اللہ حقۃ والکلام منھا فانہ خیر موفق و معین ۔

ترقیمہ :

وکتب مسوّلا احوج المربوبین الی اللہ تعالیٰ محمد المشتہر بعلی ابن ابی طالب بن عبداللہ بن علی الزاہدی الجیلانی فی عام الاربعین بعد المائۃ والالف من الہجرۃ المبارکہ حین اقامتی بمشہد طوس مشہد مولای الرضا علیہ التحیۃ والثنا حامدا اللہ وحدہ

موضوع : تفسیر آیۃ النور

کیفیت : اس میں آیۃ نور کی تفسیر بیان کی گئی ہے ترقیمہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۱۴۰ھ میں اس کی کتابت کی گئی ۔

نام مخطوط : **مراۃ اللہ فی شرح ایۃ شہد اللہ**

زبان و خط : عربی نستعلیق　　کاتب : شیخ محمد علی حزیں

سائز : ۲۳ × ۱۴ سنٹی میٹر　　سطریں : ۱۲

صفحات : ۴　　موضوع : تفسیر

مخطوطہ نمبر ۴۲۸　　ذخیرہ : کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ

ابتدا:

الحمد لملہم الحمد والشکر لواہب الشکر حمد اً دائماً متوالیاً وشکر دائماً متواتراً . . . . . .

اختتام:

هذه الوجودات الفائضة غیر محتاجة فی انوارها الا الی اصل الوجود الرشدک واللہ الی الحقیقة بمحمد والہ المیامین الطاہرین

ترقیمہ:

وکتب هذه الاسطر محمد المدعو بعلی اللاہیجی عفی عنہ فی بلدة اردبیل حفت بالامان عام ۱۱۳۹ عنہ توجہی الی خراسان

موضوعات: آیہ شہد اللہ کی تفسیر

کیفیت:۔ خط وہی جیسا مذاکرات فی المحاضرات میں بتایا گیا۔ مذکورہ پانچوں نسخوں کی کیفیت ایک ہی ہے۔ مذاکرات فی المحاضرات شروع ہونے سے پہلے یعنی سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

"مجموعہ از تصنیفات شیخ علی حزیں
مذاکرات فی المحاضرات، رسالہ میعاد، رسالہ تحقیق نفس
وتجرد آن شرح آیۂ نور، شرح آیۂ شہد اللہ"

نام مخطوطہ: کتاب الدّعا

زبان و خط: فارسی نسخ و نستعلیق   کاتب: شیخ علیم اللہ

سائز: ۲۳×۱۷ سنٹی میٹر   سطریں: ۱۸

صفحات: ۲۵   موضوع: ادعیہ

مخطوطہ نمبر ۲/۷۰۸   ذخیرہ: کتب خانہ سلطانیہ مدرسہ سلطان المدارس و جامعہ سلطانیہ لکھنؤ

ابتدا:

الحمد للہ وسلامہ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ وبعد هذا الکتاب الدعا حررہ العبد المفتقر الی اللہ الغنی محمد المشتہر بعلی ابن ابی طالب ابن عبد اللہ ابن جمال الدین علی الزاہدی الجیلانی غفر اللہ لہ ولوالدیہ

اختتام: امید کہ ایں عاجز مستحق دعا را فراموش نسازند

ترقیمہ:

و این رسالہ از شیخ محمد علی حزین ابن ابی طالب بن عبد اللہ بن جمال الدین علی الزاہدی الجیلانی حامداً للہ حق حمدہ ۱۲۰۵ھ

موضوعات:

دعا کی فضیلت و برکت اور اجابت، اوقات دُعا، اماکن دعا شرائط دُعا، حرز و ادعیہ و سورے اور آیتیں برائے حصول مطالب۔۔

کیفیت:

مخطوطہ کرم خوردہ ہے لیکن سب پڑھا جا سکتا ہے۔ کاغذ موٹا ہے —— اس کتاب سے پہلے کتاب النجوم ہے جس صفحہ پر کتاب النجوم ختم ہوئی ہے اسی صفحہ سے کتاب الدعا شروع کر دی گئی کتاب الدعا کے بعد تقویم المحسنین ہے جس کے خاتمے پر یہ عبارت درج ہے جس سے کاتب کے نام کا پتہ چلتا ہے:

"راقم الحروف این نسخہ را بمعرفت مولوی صاحب شیخ علیم اللہ نویسانیدہ شد"

چوں کہ اس جلد میں شامل تینوں کتابوں کا خط ایک ہی ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب الدعا کی کتابت بھی علیم اللہ ہی نے کی ہوگی۔ سنہ کتابت واضح نہیں ہے کتاب الدعا کے ترقیمہ میں ۱۲۰۵ھ سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ سنہ کتابت ۱۲۰۵ھ ہوگا کیونکہ کتاب النجوم کے حاشیہ پر لکھی یادداشتیں ۱۲۲۷ھ اور ۱۲۵۴ھ سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی کتابت ۱۲۲۷ھ سے قبل کی ہے نسخہ پر نظر ثانی کی گئی ہے اور بعض جگہ حاشیہ بھی لگایا گیا ہے۔

اس مخطوطہ میں دُعا کی فضیلت و برکت وغیرہ کے بیان کے بعد دُعا پڑھنے کے طریقوں کے ساتھ ساتھ حصول مراتب، خلاصی زنداں، امن و امان، رفع ظلم وغیرہ کے لیے پندرہ حرز اور دعائیں دی گئی ہیں جس میں دُعائے ابراہیم علیہ السلام اور دعا مروی از امام زین العابدین علیہ السلام بھی شامل ہے۔ اس کے بعد "فضل من بعض سور والایات" کے تحت بعض سوروں، آیتوں اور اسماء مقدسہ کا بیان ہوا ہے اور مختلف امور کے لئے اس کو پڑھنے کے طریقے اور فوائد بیان کیے گئے ہیں۔

نام مخطوطہ : فتح السبل

زبان وخط : فارسی نستعلیق کاتب : الحاج سید جعفر علی موسوی
سائز : ۱۸×۲۹ سنٹی میٹر سطریں : ۱۶
صفحات : ۱۹۹ موضوع : کلام
مخطوطہ نمبر ۲۱۳ ذخیرہ : کتب خانہ عمدۃ العلماء لکھنؤ

ابتداء :

نحمدک یا مفتح الابواب .... اما بعد این رسالہ ایست از خادم علوم دینیہ ابن ابو طالب محمد الشہیر بعلی الجیلانی اعلی اللہ مقامہما .... مسمی بفتح السبل واللہ الہادی

اختتام :

آخر ما اوردنا فی ھذا المختصر وکان الفراغ فی بلد لاہور مع تشتت البال وتفرق الاحوال نسال اللہ سبحانہ ان یجعل خاتمۃ امرنا بالخیر

ترقیمہ :

المنۃ للہ تعالیٰ کہ کتاب ہذا کہ نامش فتح السبل باشد بخط خادم خادم الحاج السید جعفر علی موسوی حشرہ اللہ مع موالیہ بتاریخ بستم صفر المظفر ۱۳۱۱ ہجری علی صاحبہا السلام باتمام رسید مطابق دوم ستمبر ۱۸۹۳ء روز شنبہ

موضوعات :

جوہر انسانی، جوہر ملائکہ، معرفت الٰہی، اختلاف علماء اور حقیقت علم کلام وحکمت، تعرفہ درمیان علم کلام اور حکمت، علم کلام کی ایجاد، اشاعرہ اور معتزلہ کا عروج وزوال، فن کلام، طریقۂ باطن، کیفیت سلوک، طریقۂ حکماء اور تہذیب اخلاق، طریقۂ صوفیاء، بحث امامت، مسلمانوں اور خاتم النبیینؐ کے درمیان اختلافات اور خلافت وامامت امیر المومنینؑ پر نصوص جلیلہ وخفیفہ۔

کیفیت :

کتاب کی عبارت جلی اور صاف ہے نسخہ پوری طرح محفوظ ہے۔ نسخہ پر نظرثانی کی گئی ہے۔ صفحہ نمبر میں کاتب سے سہو ہوا ہے صفحہ نمبر ایک تا چونسٹھ کے بعد پھر صفحہ نمبر ۵۵ سے شروع کردیا جو صفحہ نمبر ۱۹۰ تک ہے جس میں ۱۸۷ کے بعد ۱۸۹ درج ہے اوراق میں دیئے گئے اشارے سے پتہ چلتا ہے کہ صفحہ ۶۴ کے بعد ۶۵ سے شروع ہونا تھا جو ۵۵ سے شروع ہوگیا۔ علاوہ ازیں درمیان میں ۱۸۸ لکھنا رہ گیا۔ اس حساب سے کتاب ۱۹۹ صفحات پر مشتمل ہوئی۔ کتاب ایک مقدمہ تین فاتحہ اور توصیہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں جوہر انسان وملائکہ اور معرفت الٰہی سے بحث کی گئی ہے۔

پہلے فاتحہ میں علم کلام اور علم حکمت کا بیان ہے دوسرے فاتحہ میں کلام کی ایجاد اور اشاعرہ ومعتزلہ کے عروج وزوال کا ذکر ہے۔ ص۲۵ پر مقدمہ، پہلا اور دوسرا فاتحہ ختم ہوگیا ہے ص۲۵ سے ہی تیسرا فاتحہ شروع کردیا گیا ہے جس میں طریقۂ باطن، کیفیت سلوک، کیفیت سلوک دو مناہج میں ہے۔ پہلے منہج میں طریقہ حکماء اور تہذیب اخلاق سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے منہج میں کیفیت سلوک کے بعد بحث امامت ہے جو چار نمایش پر منقسم ہے۔ پہلی نمایش میں تمہید مقاصد اور مقدمات حقہ، دوسری نمایش میں وجود امام کی ضرورت تیسری نمایش میں اہل سنت کی کتابوں سے نصوص جلیلہ اور چوتھی نمایش میں نصوص خفیفہ کا بیان ہوا ہے۔

نوٹ : ص۱۸۹ کی پہلی سطر میں کتاب کا اختتام ہوگیا ہے۔ اس کے بعد بغیر کسی عنوان کے سید محمد عسکری جون پوری اور شیخ صدر جہاں عرف میاں انگنو کے درمیان مناظرہ کا مختصر حال لکھا گیا ہے جو غالباً مصنف کتاب نے یادداشت کے طور پر لکھ لیا ہوگا کیونکہ ترقیمہ مناظرہ کے بعد لکھا گیا ہے۔

نام مخطوطہ : رسالہ نمازہای واجب

زبان وخط : فارسی نستعلیق کاتب : سرفراز علی جونپوری
سائز : ۲۶×۱۵ سنٹی میٹر سطریں : ۱۷
صفحات : ۹ موضوع : فقہ
مخطوطہ نمبر ۱۰۲ ذخیرہ : کتب خانہ عمدۃ العلماء لکھنؤ

ابتداء :

بعد الحمد والصلوٰۃ باید دانست کہ نمازہائے واجب نہ است اول نماز ہائے شبانروزی کہ پنج است صبح وظہر وعصر ومغرب وعشا کہ در حضر ہفتدہ رکعت است۔

اختتام :

این چند کلمہ در حالت اختلال وتشتت بال بنا بر خواہش یکی از اخوان

ایمانی وثقہ اللہ سبحانہ رتمتم شد امید کہ وسیلہ دعائے مرحمت و غفران شود الفقیر الی ربہ محمد المشتہر بعلی الزاہدی عفی عنہ

ترقیمہ :

تمام شد بکتابت عبدالمذنب سرفراز علی عفی عنہ در شہر بنارس بتاریخ دوم شہر ذی الحجہ ۱۱۸۴ھ مقدس یوم جمعہ۔

موضوعات :

واجب نماز، نافلہ نمازیں، مستحبی نمازیں

کیفیت :

اس مخطوطہ کا نام کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ چوں کہ ابتدا میں نماز ہائے واجب کا تذکرہ ہے اس لیے اس کا نام رسالہ نماز ہائے واجب دیا جا رہا ہے۔ نسخہ کرم خوردہ ہے لیکن پڑھا جا سکتا ہے۔ واجب نمازوں کے ذیل میں نو عنوانات ہیں جس میں پنجگانہ، جمعہ، عیدین، کسوف خسوف، وقت زلزلہ، آیات، طواف خانہ کعبہ، میت، نذر و قسم کا بیان ہوا ہے۔ اس کے سنتی نمازوں کے فضائل اور روز و شب کی نوافل کا تذکرہ ہے۔ اوقات نماز یومیہ، اوقات نوافل کے بعد غیر نافلہ سنتی نمازوں کا ذکر ہے جس کے تحت نماز استسقاء، حاجت، شکر، فاطمہ، جعفر طیار، نافلہ رمضان، شب عید الفطر، روز غدیر، شب بعث، شب نیمہ شعبان کی نمازوں کا بیان ہے۔

نام مخطوطہ: رسالہ صلوٰۃ

زبان و خط: فارسی نستعلیق — کاتب: سرفراز علی جونپوری

سائز: ۲۶×۱۵ سنٹی میٹر — سطریں: ۱۷

صفحات: ۶ — موضوع: فقہ

مخطوطہ نمبر: ۱۰۱ — ذخیرہ: کتب خانہ عمدۃ العلماء لکھنؤ

ابتداء:

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علی سید المرسلین و آلہ الطاہرین اما بعد بالتماس بعضے اخوان ایمانی مختصر در بیان نماز و آداب و شرائط آن می نگارد

اختتام:

و از آں جملہ است تسبیح فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا اینست دریں مختصر مقصود بود الحمد للہ رب العالمین امید کہ این مستحق دعا را فراموش نسازند نمقہ العبد محمد المشتہر بعلی ابن ابی طالب بن عبداللہ بن علی الزاہدی۔

ترقیمہ :

بکتابت بندہ سیاست متلی سرفراز علی عفی عنہ در شہر بنارس بتاریخ دہم شہر ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ مقدس مطابق یازدہم اگست ۱۸۶۷ء

این رسالہ صلوٰۃ من تصانیف شیخ محمد علی حزین علیہ الرحمہ اختتام رسید

موضوعات : نماز کے آداب و شرائط

کیفیت :

اس میں نماز کا تذکرہ، ساتھ نماز پڑھنے کا طریقہ اور شرائط بیان کی گئی ہیں اور اذان و اقامت کے ساتھ ساتھ نماز سے پہلے اور بعد میں پڑھی جانے والی بعض سنتی دعائیں بھی درج ہیں۔ نسخہ خوش خط اور کرم خوردہ ہے۔ بعض الفاظ پڑھنے میں نہیں آتے۔ اذان و اقامت وغیرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فقہ جعفری کے مطابق تحریر کی گئی ہے۔

نام مخطوطہ: رسالہ صلوٰۃ

زبان و خط: فارسی نستعلیق — کاتب: سرفراز علی جونپوری

سائز: ۲۶×۱۵ سنٹی میٹر — سطریں: ۱۱

صفحات: ۴ — موضوع: فقہ

مخطوطہ نمبر: ۱۰۲ — ذخیرہ: کتب خانہ عمدۃ العلماء لکھنؤ

ابتداء:

سپاس و ستایش خداوند بے شریک و نیاز و نثار درگاہ معبود بے نیاز است

اختتام:

و تورک ایشاں را سنت نیست واللہ المستعان و بہ التکلان

ترقیمہ :

این رسالہ صلوٰۃ من تصانیف شیخ محمد علی حزین طاب ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ بتاریخ نہم شہر ربیع الثانی ۱۲۸۴ ہجری مطابق دہم ماہ اگست ۱۸۶۷ء یوم شنبہ در شہر بنارس بکتابت بندہ سیات متلی سرفراز علی عفی عنہ متوطن جونپور باختتام رسید

موضوعات : نماز۔ نماز کی ترکیب و شرائط

کیفیت:

یہ رسالہ صرف نماز کی ترکیب اور شرائط پر مشتمل ہے اور یہ پہلے ذکر شدہ رسالہ صلوٰۃ سے مختلف ہے اور یہ رسالہ نماز ہائے واجب سے بھی مختلف ہے۔ نماز کی ترکیب سے عیاں ہے کہ یہ بھی فقہ جعفری کے مطابق تحریر کیا گیا ہے۔

نام مخطوطہ: کتاب الدعا

زبان و خط: فارسی نستعلیق   کاتب: سرفراز علی جونپوری

سائز: ۲۶×۱۵ س م   سطریں: ۱۷

صفحات: ۲۲   موضوع: ادعیہ

مخطوطہ نمبر ۱۰۲   ذخیرہ: کتب خانہ عمدۃ العلماء لکھنؤ

ترقیمہ:

تاریخ بست و نہم شہر رجب المرجب ۱۲۸۴ھ ہجری قدسی مطابق ۲۷ نومبر در شہر بنارس بکتابت عبدالمذنب سرفراز علی ۱۸۶۷ء...

نوٹ: اس کتاب کا ایک نسخہ سلطانیہ لائبریری مدرسہ سلطان المدارس لکھنؤ میں موجود ہے جو زیر نظر نسخہ کے مقابلہ میں قدیم ہے لیکن اچھی حالت میں ہے۔ کتب خانہ عمدۃ العلماء کے نسخہ میں نظر ثانی کے ساتھ ساتھ بعض جگہ عبارت بڑھائی گئی ہے۔ یہ نسخہ شدید کرم خوردہ ہے جس کی وجہ سے مکمل پڑھا نہیں جا سکا۔

نام مخطوطہ: وصیت شیخ علی حزیں

زبان و خط: فارسی نستعلیق   کاتب: سرفراز علی جونپوری

سائز: ۲۶×۱۵ سنٹی میٹر   سطریں: ۱۷

صفحات: ۲   موضوع: وصیت

مخطوطہ نمبر ۱۰۳   ذخیرہ: کتب خانہ عمدۃ العلماء لکھنؤ

ابتداء:

وصیت شیخ علی حزیں بسم اللہ الرحمن الرحیم جزی اللہ عن الموت خیر..... جز بستی ہفتاد سالہ زندگانی سیری دیا کسی بری نکردیم

اختتام:

اینک می از عالم خاک داشت ...... کہ گوش ہوش....

نوشتہ شد بفاتحہ ...... اللہ

ترقیمہ:

راقم سرفراز علی عفی عنہ یکم ستمبر ۱۸۶۸ء

موضوعات: وصیت

کیفیت:

یہ مخطوطہ ایک ورق پر مشتمل ہے۔ اس ورق پر پہلے شیخ حزیں کے دو خواب، ایک عربی میں دوسرا فارسی میں، درج ہیں۔ وصیت صرف ۲ صفحہ پر ہے ترقیمہ بھی عبارت میں لکھی گئی ہے زبان فارسی ہے۔ یہ انھوں نے اپنی زندگی کے ستر سال گزارنے کے بعد لکھا ہے جس میں مذہبیت کے علاوہ اللہ کی مخلوقات کے ساتھ نیک برتاؤ اور عبادت الٰہی کی دعوت دی گئی ہے۔ وصیت سے پہلے درج شدہ خواب کی عبارت اس طرح ہے:—

پہلے خواب کی ابتدائی عبارت:—

"...... رایت شیئا..... سابقہ عشر من شہر رمضان عام خمس وخمسین بعد المائۃ الحادیۃ عشر من الہجرۃ فی المنام ..... امام الراجی رحمۃ اللہ سبحانہ محمد المشتہر بعلی الزاہد الجیلانی"

دوسرے خواب کی ابتدائی عبارت:

"توکلت علی القادر القاہر........ یا غیاث المستغیثین در شب پنجشنبہ بست و ششم جمیدالاول سال یک ہزار و یکصد .... پنج واقعہ مشاہدہ شد کہ لوحی از آیۂ صافی در نظر است۔"

شدید کرم خوردہ ہونے کی بنا پر پوری عبارت نہیں پڑھی جا سکی، د... پہلا خواب ۱۰ رمضان ۱۱۵۵ھ کو دیکھا ہے دوسرا خواب ۲۶ جمادی الاول سنہ ہو سکتا ہے ۱۱۵۵ھ ہی ہو کیونکہ سنہ کی دہائی کی عبارت نہیں پڑھی جا سکی۔

نام مخطوطہ: فتاوی شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمہ

زبان و خط: فارسی نستعلیق   کاتب: سرفراز علی جونپوری

سائز: ۲۶×۱۵ سنٹی میٹر   سطریں: ۱۹

صفحات: ۱۳   موضوع: فقہ

مخطوطہ نمبر ۱۰۲ — ذخیرہ: کتب خانہ عمدۃ العلماء لکھنؤ

ابتداء:

سوال چہ می فرمایند علمائے فرقہ محقہ امامیہ اثنا عشریہ انار اللہ براہینہم الجلیلہ کہ ہرگاہ در علم حق تعالیٰ سبحانہ گزشتہ کہ فلاں شخص مطیع و فلاں شخص عاصی است تخلف ازاں بنا بر طریقہ امامیہ کہ علم را عین ذات می دہند .....

اختتام:

وغیر آن بقطع دلیل این تفصیل نشود

ترقیمہ:

تمام شد جناب قدسی صفات عالم علوم خفی وجلی شیخ محمد علی حزین علیہ الرحمہ بتاریخ بست و نہم شہر رجب المرجب ۱۲۸۴ ہجری شب پنجشنبہ مطابق ۲۷ نومبر ۱۸۶۷ء در شہر بنارس بکتابت بندہ سرفراز علی عفی عنہ متوطن بلدہ جون پور۔ بقصبہ یک پاس نقل بر داشتہ شد

موضوعات:

فقہ اور کلام سے متعلق سوالوں کے جوابات

کیفیت:

اس کتاب میں ان سے کیے گئے ۳۶ سوالوں کے جواب ہیں جو علم خدا کے عین ذات ہونے، معجزہ شق القمر، نکاح متعہ، مہر، خمس، زکوٰۃ، کنیز و غلام، تجارت، رشوت وغیرہ سے متعلق ہیں۔ سوالوں کے جواب فقہ جعفری کے مطابق دیئے گئے ہیں جیسا کہ بعض سوالات کی عبارت سے ظاہر ہے۔ نسخہ بہت زیادہ کرم خوردہ ہے جس کی وجہ سے پوری عبارت پڑھنے میں نہیں آتی۔

نام مخطوطہ: رسالہ تحقیق اوزان

زبان وخط: فارسی نستعلیق — کاتب: سرفراز علی جونپوری

سائز: ۲۶x۱۵ سنٹی میٹر — سطریں: ۲۴

صفحات: ۲ — موضوع: فقہ (اوزان شرعی)

مخطوطہ نمبر ۱۰۲ — ذخیرہ: کتب خانہ عمدۃ العلماء لکھنؤ

ترقیمہ:

تمت رسالہ تحقیق اوزان من تصانیف ..... م خفی وجلی شیخ محمد علی حزین طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ بکتابت سیات مشتمل سرفراز علی عفی عنہ در مقام جونپور محلہ چتر ساری ہفتم رجب ۱۲۸۵ ہجری۔

نوٹ: زیر نظر مخطوطہ خوش خط لکھا ہوا ہے لیکن بہت زیادہ کرم خوردہ ہے جس سے کچھ عبارت پڑھنے میں نہیں آتی۔ اس کے مضامین اور عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ بھی وہی ہے جس کو مصنف نے اپنے تحریر کردہ نسخہ میں "رسالہ معیار" کا نام دیا ہے۔

نام مخطوطہ: رسالہ در بحث وضو

زبان وخط: فارسی نستعلیق — کاتب: سرفراز علی جون پوری

سائز: ۲۶x۱۵ سنٹی میٹر — سطریں: ۱۷

صفحات ۱۴۲ — موضوع: تقابلی فقہ

مخطوطہ نمبر ۱۰۲ — ذخیرہ: کتب خانہ عمدۃ العلماء لکھنؤ

ابتداء:

(ورق نمبر ۲) اجتہاد خود از کتاب مجید باری کہ باد رسیدہ الخ فہمد آں عمل میکند

اختتام:

ایں مقدار در بینہ کافی و حاجت باطناب ...... و ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب والحمد للہ رب العالمین حق حمدہ کما ھو اھلہ والصلوٰۃ ..... محمد وآلہ

ترقیمہ:

ایں رسالہ در بحث وضو من تصانیف عالم علوم خفی وجلی شیخ محمد علی حزین طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ بتاریخ سی ام شہر ذی قعدہ ۱۲۸۴ھ قدسی مطابق بست و ششم ماہ مارچ ۱۸۶۸ عیسوی یوم پنجشنبہ بمقام بنارس بقصبہ یکپاس بکتابت بندہ سیات مشتمل سرفراز علی عفی عنہ متوطن بلدہ جونپور محلہ چتر ساری با تمام رسید

کیفیت:

ابتدائی ورق نسخہ میں موجود نہیں ہے ورق نمبر ۲ سے نسخہ میں موجود ہے۔ اس میں قرآن و احادیث اور دلائل و براہین کی روشنی میں شیعہ و سنی طریقہ وضو پر بحث کی گئی ہے۔ نسخہ شدید کرم خوردہ ہے جس کی بنا پر کچھ عبارت پڑھنے میں نہیں آتی۔

نام مخطوطہ: **آداب نوافل لیلیہ**

زبان و خط: فارسی نستعلیق کاتب: سرفراز علی جونپوری

سائز: ۲۶×۱۵ سنٹی میٹر سطریں: ۱۷

صفحات: ۱۵ موضوع: ادعیہ

مخطوطہ نمبر ۱۰۲ ذخیرہ: کتب خانہ عمدۃ العلماء لکھنؤ

ابتداء

....کہ حال دل نالاں دانی احوال دل شکستہ حالاں دانی

...... وبعد ذکر مختصری از آداب نوافل لیلیہ است

اختتام:

انقر فقراء باب اللہ ابن ابوطالب بن علی الجیلانی محمد المدعو بعلی الملقب بحزین سقاہ اللہ المصیر الیہ..... فی عام ۱۱۴۲ من الہجرۃ المقدسہ لیلۃ العاشر من شہر اللہ رمضان واللہ ولی التوفیق در محروسہ کرمان بتحریر ایں اوراق توفیق یافت امید کہ یاد آوری راد سیلہ باد ـ شہر جمید الثانیہ ۱۱۴۸ والحمد للہ رب العالمین

ترقیمہ:

بتاریخ ۲۷ رجب المرجب ۱۲۸۴ ہجری در شہر بنارس بکتابت سیات متلی سرفراز علی عفی عنہ حلیہ اختتام پوشید

موضوعات:

نافلۂ شب، نافلہ شب سے متعلق دعائیں، نافلہ فجریہ

کیفیت:

یہ کیفیت پانچ فصلوں پر مشتمل ہے پہلی فصل میں بیدار ہونے کے بعد کے ادعیۂ ماثورہ۔ دوسری فصل میں نافلۂ شب کے پہلے پڑھی جانے والی دعائیں۔ تیسری فصل میں نافلۂ شب اور اس کی دعائیں۔ چوتھی فصل میں نماز شفع اور وتر اور اس کی دعائیں۔ پانچویں فصل میں نافلہ فجریہ اور دعائے اضجعۂ فجریہ کا تذکرہ ہے۔ اختتام کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ۱۱۴۲ھ میں تصنیف کیا گیا تھا جس کو مصنف نے ۱۱۴۸ ہجری میں نقل کیا ہے جس کی نقل یہ نسخہ ہے۔ زیر نظر نسخہ شدید کرم خوردہ ہے جس کی وجہ سے کچھ عبارت نہیں پڑھی جا سکتی۔

□□

حواشی:

۱؎ شام غریباں ص۸۶ لچھمی نرائن شفیق (مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی) انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۷ء

۲؎ تاریخ احوال ص۱ (مشمولہ کلیات حزیں۔ شیخ محمد علی حزیں۔ نول کشور پریس ۱۲۹۴ھ)

۳؎ تاریخ احوال ص۳-۲ (" " " " " " " ")

۴؎ " " ص۴ ایضاً

۵؎ " " ص۱ ایضاً

۶؎ مطلع انوار ص۱۶۶ سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل۔ خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر کراچی ۱۹۸۱ء (۱۴۰۲ھ)

۷-۸؎ کلیات حزیں ص۱۰۳۱ (نثر خاتمہ از مطبع) شیخ محمد علی حزیں نول کشور پریس ۱۲۹۴ھ

۹؎ سفینۂ شیخ محمد علی حزیں ص۹ (تمہید از مسعود علی) جامعہ عثمانیہ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۰ء (۱۳۴۸ھ)

۱۰؎ خزانۂ عامرہ ص۱۹۴ میر غلام علی آزاد مطبع نول کشور کانپور ۱۸۷۱ء

۱۱؎ تذکرہ حسینی ص۱۰۶ تا ص۱۰۸ میر حسین دوست مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۵ء ۱۲۹۲ھ

۱۲؎ شام غریباں ص۸۵ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۷ء

۱۳؎ فہرست عربی میں ہے اور حروف تہجی کے مطابق نہیں ہے

۱۴؎ تاریخ احوال ص۱۱ ص۲۹ ص۳۲ ص۴۰ ص۴۱ ص۴۷ ص۴۸ ص۷۳ ص۸۰ ص۸۱ (مشمولہ کلیات حزیں)

— نجوم السماء ص۲۸۶ میرزا محمد علی کشمیری مکتبہ بصیرتی قسم ایران ۱۳۹۴ھ

— مطلع انوار ص۱۷۵ سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر کراچی ۱۹۸۱ء (۱۴۰۲ھ)

— تذکرہ نویسی در ہند و پاکستان ص۳۶۴ ص۳۶۵ علی رضا نقوی

— فہرست مشترک نسخہائے خطی فارسی پاکستان جلد اول ص۴۱۶ ص۴۳۳ احمد منزوی۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد۔

— فہرست مشترک نسخہائے خطی فارسی پاکستان ۔ جلد چہارم

(باقی ص۲۷ پر)

غزلیں

ں کے دل سے زباں تک پہنچ گئی یارو
ہاں کی بات کہاں تک پہنچ گئی یارو
ن میں چپکے سے فصلِ بہار آئی تھی
بات کیسے خزاں تک پہنچ گئی یارو
لِ یار کی خوشبو مرے تعاقب میں
اں گیا میں وہاں تک پہنچ گئی یارو
اکرے وہ نظر بے زبان ہو جائے
میرے دردِ نہاں تک پہنچ گئی یارو
ارے توڑ کے لانے کی بات کرتی ہے
آرزو بھی کہاں تک پہنچ گئی یارو

—— تعزیر بستوی
وزڈم ہائیسری اسکول رحمت گنج گاندھی نگر بستی

بس یونہی دیکھا تھا اس نے بے نیازانہ مجھے
دیکھتی ہے ہر نظر تب سے حریفانہ مجھے
گنگنانا خلوتوں میں وہ کسی کا میرے گیت
مسکرانا زیرِ لب پھر کہہ کے دیوانہ مجھے
اب تو رو پڑتا ہوں ٹوٹے ساغروں کو دیکھ کر
شاید اب آنے لگے اندازِ رندانہ مجھے
ہائے رے ان سُرمگیں آنکھوں کا مبہم التفات
کر گیا جو آپ خود اپنے سے بیگانہ مجھے
دیکھ یہ انجام ہے اب اے جبینِ سجدہ خو
تک رہی ہے ہر نظر بر دردِ گارانہ مجھے

—— احمر زیدی
نردلی ہاؤس۔ خیالی گنج لکھنؤ

سدا ہم کو یقیں رہتا ہے اپنی کامرانی کا
بزرگوں سے ہمیں ورثہ ملا خود اعتمادی کا
پسینے پر تمھارے ہم نے اپنا خوں بہایا ہے
مگر بدلا دیا تم نے بُرائی سے بھلائی کا
ہے تاکہ ہمیشہ اتحادِ باہمی قائم
ازالہ کرتے رہتے ہیں برابر بدگمانی کا
چمن عالم کا ہم نے خون سے اخلاق کے سینچا
ہمارے ہی لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
وفا کی راہ میں ہم ہی رہے ثابت قدم حافظ
ہمارے نام ہی عنواں بنا ہے ہر کہانی کا

—— حافظ لکھنوی
۳۳۰/۳۶ منصور نگر۔ لکھنؤ

کبھی نہ بھول سکے لاکھ ہم بھلاتے رہے
جو غم دیے ہیں زمانے نے یاد آتے رہے
بصد فریب اُڑا کر ہمارے لب سے ہنسی
بتانِ شوخ شرارت سے مُسکراتے رہے
کڑک رہی تھی کڑکنے کو سر پہ برقِ چمن
ہم اپنی دُھن میں مگر آشیاں بناتے رہے
جُدا رہا نہ غم ان کا غمِ زمانہ سے
جہادِ زیست میں اکثر وہ یاد آتے رہے
فریبِ حسن کا احساس تھا شکیل مگر
ہم اپنی سادہ دلی میں فریب کھاتے رہے

—— شکیل رضوی
۲۶۔ جعفرا بازار۔ سبزی منڈی۔ گورکھپور

نئی سرکار جنتا کے دوار

اُترپردیش کا ترقیاتی منظرنامہ

ادارہ

اس سال ۳۹۲ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار کا نشانہ

اترپردیش کے وزیرزراعت شری گنگا بھکت سنگھ نے بتایا ہے کہ اس سال ۳۹۲ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

وزیرزراعت نے مزید بتایا کہ خریف میں ۱۳۹٫۵۰ لاکھ ٹن اور ربیع میں ۲۵۲٫۵۰ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار کا نشانہ ہے۔ اس کے علاوہ ۱۳٫۵۰ لاکھ ٹن تلہن کی پیداوار کا بھی نشانہ ہے۔

خریف میں تصدیق شدہ بیجوں، کیمیاوی کھادوں، زرعی کیمیاوی اشیاء اور فصلی قرض کے مناسب بندوبست کے ساتھ ساتھ ریاست کے چھوٹے اور مارجنل کسانوں کو کھاد بجٹ سے قبل کی مقررہ شرحوں پر مہیا کرانے کے واسطے ہر سطح پر کڑی نگرانی رکھنے کا بندوبست کیا گیا ہے تاکہ اس سال کاشت کار سستے داموں پر کھاد کا استعمال کرسکیں۔

درج فہرست اقوام کی کثرت والے ۱۰۰ سو مواضعات میں ٹیوب ویل جلد

اترپردیش کے درج فہرست اقوام کی کثرت والے ایک سو مواضعات میں ٹیوب ویل لگانے کی منظوری حکومت نے دے دی ہے۔

یہ اطلاع ریاستی وزیرآب پاشی شری ادم پرکاش سنگھ نے دی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ "دین دیال آب پاشی اسکیم" کے تحت زرعی پیداوار میں اضافے کے پیش نظر درج فہرست اقوام کے افراد کے کھیتوں تک پانی اولیت کی بنیاد پر پہونچانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں ایسے ۱۰۰ سو مواضعات کی فہرست تیار کی گئی ہے جس میں درج فہرست اقوام کے لوگوں کی اکثریت ہے اور ان کے پاس ۱۵ ہیکٹیر سے زیادہ زرعی اراضی ہے۔

شری سنگھ نے کہا کہ درج فہرست اقوام کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سی اسکیمیں بنائی گئیں لیکن ان کے کھیتوں کو براہ راست پانی پہونچانے کی اسکیم نہیں بن پائی تھی۔ دین دیال اسکیم کے تحت سماج کے کمزور طبقوں کے کھیتوں میں براہ راست اولیت کی بنیاد پر پانی پہونچانے کی اسکیم پہلی بار وضع کی گئی ہے۔

لوک عدالتوں میں ۶۵ ہزار ایک سو ۵۴ مقدمات کا فیصلہ

اترپردیش قانونی امداد مشاورتی بورڈ کے زیر اہتمام یکم اپریل ۱۹۹۱ء سے ۳۰ ستمبر تک کی مدت کے دوران ضلعوں اور ہائی کورٹ میں ۴۷ لوک عدالتوں کا اہتمام کیا گیا جن میں ۶۵ ہزار ۱۵۴ معاملات کو صلح اور سمجھوتے کی بنیاد پر نپٹایا گیا ہے۔

اس دوران مختلف عدالتوں میں معرض التوا میں پڑے ہوئے ۱۸۰ موٹر حادثات کے مقدمات کا فیصلہ کیا گیا اور ۲٫۴۲ کروڑ روپیہ سے زیادہ کی رقم متاثرہ کنبوں کو معاوضہ کے طور پر دلائی گئی۔

اسی دوران لوک عدالتوں کے توسط سے چالیس ہزار ۴ سو ۶۵ فوجداری کے چھوٹے چھوٹے مقدمات کا بھی فیصلہ کیا گیا، اور ۱۷ لاکھ ۱۰ ہزار

۰۰،سو ۹۹ روپے کی رقم جرمانے کے طور پر وصول کی گئی۔

اس کے علاوہ خاندانی معاملات سے متعلق مقدمات کو جلد نپٹانے کے لیے لکھنؤ میں تین اور کانپور میں ایک خصوصی عدالت منعقد ہوئی جس میں برسوں سے چل رہے ۱۲۹ مقدمات کو صلح اور سمجھوتے کی بنیاد پر طے کرایا گیا۔

قبائل کی ترقی کے لئے ترائی کارپوریشن کو ۹٫۹۰ لاکھ روپئے

حکومت اترپردیش نے قبائل کی ترقی سے متعلق پروگراموں کی عمل آوری کے لیے قبائل ذیلی منصوبے ۹۲-۱۹۹۱ کے تحت خصوصی مرکزی امداد کی شکل میں موصولہ ۹ لاکھ ۹۰ ہزار وسو ۵۰ روپیہ کی رقم ترائی درج فہرست قبائل ترقیاتی کارپوریشن کو بطور گرانٹ منظور کی ہے۔

یہ رقم حکومت کی جانب سے تشکیل شدہ کمیٹی کے توسط سے منظور شدہ ترقیاتی پروگراموں پر ہی صرف کی جائے گی۔ اس کا استعمال قبائلی ترقیاتی پروگراموں کے علاوہ کسی اور مد میں نہیں کیا جائے گا۔

پہاڑی علاقے کے اقوام وقبائل درج فہرست کے طلباء کے لئے فلاحی اسکیمیں

حکومت اترپردیش نے پہاڑی علاقے کے اقوام و قبائل درج فہرست کے طلباء کو پی. سی. ایس امتحان میں شریک ہونے کے پیش نظر اترانچل کے دونوں ڈویژنوں میں ایک ایک کوچنگ سنٹر کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔

وزیر ریاست برائے اترانچل ترقیات شری پورن چندر شرما نے یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ ان طلباء کے پی. ایم. ٹی اور انجینئرنگ میں بھی داخلے کے لیے کوچنگ کا بندوبست کیا جائے گا۔

شری شرما نے امید ظاہر کی ہے کہ اس طبقے کے طلباء زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان سہولتوں سے مستفید ہوں گے۔

حادثاتی بیمہ اسکیم کے تحت ۲۷ ہزار ماہی گیروں کا بیمہ

اترپردیش کے وزیر ریاست برائے دودھ ترقی اور مچھلی پالن شری چندر شیکھر سنگھ نے بتایا کہ مچھلی پالن امداد باہمی انجمنوں کے ۲۷ ہزار اراکین کا بیمہ حادثاتی بیمہ اسکیم کے تحت کر دیا گیا ہے اور ایک ہزار مزید ممبران کو اسکیم کے تحت دائرہ کار میں لانے کے لئے ابتدائی کارروائی پوری کر لی گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت ہلاک ہونے والے ممبر کے پس ماندگان کو ۲۱ ہزار روپیہ اور حادثہ میں پوری طرح معذور ہو جانے والے فرد کو دس ہزار ۵ سو روپے کی رقم دی جائے گی۔

شری سنگھ نے کہا کہ ماہی گیروں کی کثرت والے دیہی علاقوں میں بے مکان ماہی گیروں کو مفت رہائشی سہولت مہیا کرانے کے پیش نظر ریاست کے سلطان پور، رائے بریلی، بلیا، جون پور اور اعظم گڑھ اضلاع میں ۱۴۲ مکانات تعمیر کرائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تین اضلاع غازی پور، دیوریا اور مہراج گنج میں ۲۰۵ مکانات کی تعمیر کی ابتدائی کارروائی شروع کر دی گئی ہے۔

گون ندی پر ۲۰٫۱۶ لاکھ روپئے کی لاگت سے پُل کی تعمیر

ضلع سیتاپور کے رکھوناگاؤں سے ۳ کیلومیٹر دور گون ندی پر ۲۰٫۱۶ لاکھ روپئے کی لاگت سے ۷۲ میٹر لمبے پل کی تعمیر ہوگی۔

وزیر مالیات و پارلیمانی امور شری راجندر کمار گپت نے گون ندی کے پل اور رکھوناگاؤں سے پل کو جوڑنے والی سڑک کا سنگ بنیاد رکھا۔ سڑک کی لمبائی تین کیلومیٹر ہے جس کی تعمیر پر ۳۳ لاکھ روپئے صرف ہوں گے۔ سڑک اور پل دونوں کی تعمیر محکمہ تعمیرات عامہ کے پرانتیہ کھنڈ سیتاپور کے ذریعہ کی جا رہی ہے۔

سنگ بنیاد کے موقع پر جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے وزیر مالیات نے کہا کہ ندی پر پل اور رکھوناگاؤں سے پل تک سڑک تعمیر ہو جانے

سے اس علاقے کے لوگوں کو بڑا فائدہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اس سے رکھونا، دلابل، شاہ پور اور تسلیا وغیرہ گاؤں میں آمد و رفت میں آسانی ہوگی اور زرعی پیداوار کو بازار لانے لے جانے میں سہولت ہوگی۔

وزیر موصوف نے بتایا کہ یہ کام کسانوں کی ترقی کے لیے ایک موثر قدم ہے۔

دلہن، تلہن فصل تحفظ

انڈین فارمرس فرٹیلائزر کوآپریٹو لمیٹیڈ کی جانب سے منعقد ہونے والے دلہن، تلہن فصل تحفظ سمینار کا افتتاح (خیرآباد، سیتاپور میں) کرتے ہوئے وزیر مالیات و پارلیمانی امور شری راجندر کمار گپت نے کہا کہ حکومت کسانوں کو کھاد میں چھوٹ، گنے کی قیمت میں چار روپیہ کے اضافہ کی سہولت اعلا قسم کے بیج اور قرض مہیا کرا رہی ہے۔ اس کے علاوہ آبپاشی، بجلی، لنک روڈ، تعلیم اور تکنیکی معلومات فراہم کرنے وغیرہ کا بھی بندوبست کیا جا رہا ہے۔

شری گپت نے کہا کہ کسانوں کی خوش حالی کے لیے حکومت زراعت کے فروغ کو اولیت دے رہی ہے اور کھیتی نیز کسانوں کے مفاد میں گائے کی افزائش نسل کے لیے قانون بھی وضع کر رہی ہے۔

وزیر موصوف نے کہا کہ ہردوار کمبھ میلہ میں تقریباً ۲۸ کروڑ روپے خرچ کیے جا رہے ہیں جس سے پختہ تعمیراتی کام ہوں گے تاکہ ان کا فائدہ دیرپا ہو سکے۔ حکومت نے میلہ میں پلوں پر سے ٹیکس بھی ختم کر دیا ہے۔

موودھا باندھ کا تعمیراتی کام ترقی پر

موودھا باندھ پراجیکٹ کے تحت ہمیرپور ضلع میں برماندی پر ۵۴٫۶۹ کروڑ روپے کی لاگت سے باندھ بنایا جا رہا ہے۔ اس کے مکمل ہو جانے پر ضلع میں ۲۸۱۴۰ ہیکٹیر مزید آب پاشی صلاحیت پیدا ہوگی۔ اس پراجیکٹ پر گزشتہ مالی سال تک کل ۲۹٫۰۵ کروڑ روپے خرچ کیے جا چکے ہیں۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں دس کروڑ روپے کے اخراجات کی تجویز ہے جس سے ایک ہزار ہیکٹیر آب پاشی صلاحیت پیدا کرنے کا نشانہ ہے۔

موجودہ مالی سال میں گزشتہ ستمبر تک ۲٫۰۸ کروڑ روپے اس اسکیم پر خرچ کیے جا چکے ہیں۔

آثارِ حزیں

.. ص ۹ کا بقیہ ..

(۸) جواب رقعات شیخ حسن مرحوم۔ (بانکی پور پٹنہ میں نسخہ موجود ہے)

(۹) شرح قصیدہ لامیہ (" " ")

(۱۰) رسالہ صیدیہ یا رسالہ در خواص حیوان۔ (بانکی پور پٹنہ اور علی گڑھ ذخیرہ سبحان اللہ میں بھی نسخہ موجود ہے)

(۱۱) رسالہ در حملہ ہای ایران بر ہند

(۱۲) رسالہ دستور العقلاء (انڈیا آفس)

(۱۳) مواعد الاسرار در فقہ شیعہ (نسخہ آصفیہ)

(۱۴) مذاکرات فی محاضرات۔ (نسخہ آصفیہ)

(۱۵) تاریخ احوال در دہلی۔ (بانکی پور پٹنہ اور انڈیا آفس میں نسخے موجود ہیں)

(۱۶) تذکرۃ المعاصرین

(۱۷) سفینۂ علی حزیں۔ طبع حیدرآباد دکن ۱۳۶۸ھ (۱۹۳۰ء)

(۱۸) براؤن نے ذکر کیا ہے کہ حزیں کی ایک کتاب بنام "مدۃ العمر" بھی ہے جس کا ایک نسخہ لندن میں موجود ہے۔

۱۹) اور ایک رسالہ خواص حیوان سے متعلق ہے اس کا ذکر بھی براؤن نے کیا ہے۔

□□

حواشی

۱؎ اسٹوری جلد اول ص ۸۴۱

۲؎ خزانۂ عامرہ ص ۱۹۳

۳؎ سیر المتاخرین جلد (۱) ص ۴۳۲

۴؎ خزانۂ عامرہ ص ۲۰

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : **آکاش** (شعری مجموعہ)

شاعر : راجندر بہادر موج   قیمت : تیس روپے

ملنے کا پتہ : نصرت پبلشرز ۔ حیدری مارکیٹ ۔ امین آباد لکھنؤ

راجندر بہادر موج ایک انسانیت دوست شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری کے ہر پہلو میں یہ خوبی جھلکتی دکھائی دیتی ہے ۔ وہ اُردو کے زبردست شیدائی اور مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کو آسان بنانے کے بھی علمبردار ہیں ۔ روزمرہ کے استعمال میں آنے والے ہندی یا ہندستانی الفاظ کو وہ اس خوبی سے اپنی غزل یا نظم میں سمو دیتے ہیں کہ اس کے حُسن میں کوئی فرق نہیں آتا ہے ۔ دیکھا جائے تو اس وقت اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنا لینے کی شاندار روایت پر عمل پیرا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ ہم اُردو زبان کو ثقیل و بوجھل بنا کر نئی نسل سے دور کرنے کا سبب بن جائیں گے ۔ موج صاحب نے اس طرف قدم بڑھا کر اُردو کی مزید خدمت کی ہے ۔ ہندی الفاظ کو جذب کرنے کا ان کا انداز ملاحظہ ہو ؎

ہے کتنا حسیں اندردھنش کا منظر
دلدوز یہ منظر ہے مگر آپ سے کم

شاعر نے سری کرشن جی کے گوکل سے متھرا جانے کے منظر میں ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن نظم پڑھنے میں ہندی الفاظ گراں نہیں گزرتے ؎

کرشن نے گوکل سے جب جانے کی بات کی
رادھیکا دیاکُل ہوئی اور رو کے یوں کہنے لگی

آپ متھرا جا رہے ہیں مجھ کو تنہا چھوڑ کر
اپنے سارے پریم بندھنوں کو مجھ سے توڑ کر

موج صاحب ایک حساس شاعر ہیں وہ زمانہ میں پھیلی بدعنوانیوں اور مکّاریوں کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہتے ہیں اور ظلم و ناانصافی کو کبھی برداشت نہیں کرتے اور سماج کی بُرائیوں سے بے خوف جنگ کرکے اس میں کامیابی کا یقین رکھتے ہیں ؎

سب کا مقام ہے اپنا اپنا کوئی کمتر برتر کیوں
باغ کے مالی باغ کے اندر اونچ نیچ کا چکر کیوں

خار و برگ و غنچہ و گُل ہیں اب نفرت کے مظہر کیوں
نرم نرم سبزے کی زبانیں تیز مثال خنجر کیوں

سندر سندر کیاریاں جن سے رنگ و بو کی رونق تھی
بادِ سحر کے بدلے ہے اب یورش بادِ صرصر کیوں

راجندر بہادر موج کی شاعری کلاسیکی ہے وہ کسی سیاسی نظریے کے پابند نہیں ہیں مگر سماج کی بے راہ روی پر بے چین ضرور نظر آتے ہیں ؎

صحنِ چمن میں آج بھی غنچہ و گل اداس ہیں
اب کے خزاں کے بھیس میں آئے ہیں دن بہار کے

بہار آئی تو ہے مُرجھا رہا ہے یہ چمن پھر بھی
فضا میں ہر طرف ہے شورشِ زاغ و زغن پھر بھی

محبّت اور یک جہتی کی ہے تبلیغ زوروں پر
جہاں سے مٹتا جاتا ہے محبّت کا چلن پھر بھی

موج صاحب کو اپنے وطن اور وطن کے سبھی باشندوں سے عشق ہے ان پر کسی کے شک کرنے سے وہ بے چین ہو اٹھتے ہیں ؎

بدلتے جا رہے ہیں اب شرافت کے چلن کیسے
ہوئے ہیں لوگ اپنے ہی وطن میں بے وطن کیسے

چمن میں رہ کے سب کچھ جھیلنا اُن کو گوارہ ہے
چمن کی بلبلیں چھوڑیں بھلا اپنا چمن کیسے

موج صاحب سیکولرازم کو صرف ایک راہ نہیں مانتے بلکہ یہ ان کا عقیدہ ہے۔ وہ ہر مذہب اور اس کے پیشواؤں کا بے حد احترام کرتے ہیں ان کی متعدد نعتیں عوام و خواص میں زبردست مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو خوبصورت بنانے میں ہندی ہی سے کام نہیں لیا ہے فارسی سے بھی اپنے کلام کو حسن اور جلا بخشی ہے۔ ایک حمد میں فرماتے ہیں ؎

رہ حق میں ہے یہ حالت نمی دانم کجا رفتم
یہ ہے مستی کی کیفیت نمی دانم کجا رفتم

تمھارا نور آنکھوں میں تمھاری روشنی دل میں
لیے جامِ مئے وحدت نمی دانم کجا رفتم

شاعر ناانصافی کے خلاف بار بار آواز بلند کرتا ہے وہ کسی پر بھی ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا ؎

نازاں تھا کبھی میں جس تاریخ گلستاں پر
روتی ہے بہار اس کے حالاتِ پریشاں پر

کچھ وحشی بھیسے پھولوں نے گلشن کو اُجاڑا ہے
چھائی ہے اداسی سی ہر سمت گلستاں پر

موج صاحب حالات سے نپٹنے کے لیے بہرحال پُرعزم ہیں اور امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ؎

حالات بدلنے کی قوت ہے مگر ڈر ہے
داغ آ نہ کہیں جائے آدابِ گلستاں پر

تجھ میں جو ہمت ہو حق کے لیے شمشیر اٹھا
میرے ساتھی تری فریاد سے کیا ہوتا ہے

راجندر بہادر موج اُردو کے ایک معتبر شاعر ہیں۔ یہ مجموعہ

اُردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ اور نئی نسل کے لیے انسان دوستی اور عزم و عمل کا پیغام ہے۔

—— (مولانا) اسحاق سنبھلی

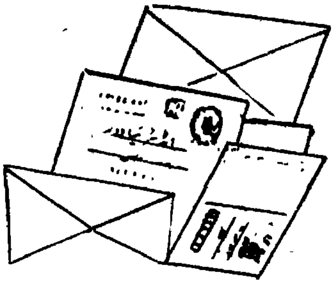
نام کتاب: **" اجل ایک خوشنما غزل "**
شاعر: جتن راج جین (جودھ پوری) قیمت: ۳۵/ روپے
ملنے کا پتہ: جے آر جین ۱/۱ ڈینسٹریٹ روڈ کلکتہ

قرآن پاک کی ایک آیت ہے جس کا ترجمہ ہے کہ " ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے "۔ مگر دنیا میں آنے والا ہر انسان اس تلخ حقیقت سے آنکھیں چراتا ہے۔ موت پر اُردو کے متعدد شعرا نے اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار کیا ہے لیکن میرے مطالعہ کے مطابق کسی شاعر نے بھی اب تک محض 'موت' کو اپنا موضوعِ سخن بنا کر کتابی شکل میں نہیں پیش کیا ہے۔ جتن راج جین مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی کتاب " اجل ایک خوش نما غزل " میں موت کو ہر زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موضوع کا یہ اچھوتا اور انوکھا انداز قاری کو موت کے بارے میں سوچنے پر ضرور مجبور کرتا ہے۔ موت جس پر عموماً انسان اپنی پوری زندگی میں کبھی نہیں سوچتا، اسی بے سوچے ہوئے موضوع پر ایک شاعر نے جس کی زبان اُردو نہیں ہے کتنی گہرائی سے سوچا ہے اور قاری کو بھی غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

" اجل ایک خوش نما غزل " میں شاعر نے موت کو بالکل نئے انداز سے دیکھا ہے۔ مجموعہ پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ واقعی موت جو ہر نفس کے لیے لازم ہے ایک خوبصورت اور خوش نما غزل ہی کی مانند ہے

زیر نظر مجموعہ میں ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء کی نظمیں شامل ہیں۔ جتن راج جین نے اپنے خیالات کا اظہار انگریزی زبان میں کیا تھا کیونکہ وہ اردو رسم الخط سے ناواقف ہیں۔ اُردو الفاظ کے لیے انھوں نے دیوناگری رسم الخط کا سہارا لیا ہے۔ مجموعہ کے ایک جانب اُردو میں اور دوسری جانب دیوناگری رسم الخط میں نظمیں لکھی ہوئی ہیں اس طرح اردو رسم الخط سے ناواقف قاری بھی دیوناگری رسم الخط میں پڑھ کر ان کے افکار سے مستفید ہو سکتا ہے۔ نظموں میں باوجودیکہ قواعد اور اُردو تلفظ کی غلطیاں در آئی ہیں مگر اردو رسم الخط سے ناواقف شاعر کی یہ کوشش بہرحال لائق ستائش ہے۔

—— سید طیّب کوکب



ہمارے نام.....

ابھی تک اکتوبر ۱۹۹۱ء کا شمارہ ہی موصول ہوا ہے، جس کے مشمولات نیز ان کی ترتیب و پیش کش اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ آپ کی ادارت نے نیا دور کو دوسری زندگی بخش دی ہے۔

آپ کا حسنِ صحافت و ادارت فی الواقع داد کا استحقاق رکھتا ہے۔ آپ نے خصوصی نمبر کے لیے بہت اچھے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ شیخ علی حزیں پر خصوصی شمارہ ضرور نکالنا چاہیئے مگر مواد کی فراہمی مشکلات سے دوچار کر رہی ہے۔ نظامی پریس بدایوں، انجمن ترقی اُردو، جامعہ اسلامیہ وغیرہ کو خطوط لکھے ہیں۔ کاش فارسی شاعری مل کر آجائے۔ اگر آپ اعانت کر سکیں تو حاصل شدہ مواد ارسال فرمائیں۔

موضوع ایک چیلنج ہے۔ آپ کی ادبیاتی بصیرتیں قابلِ داد ہیں

———— (ڈاکٹر) تارا چرن رستوگی

گوہاٹی

نیا دور کا اکتوبر کا شمارہ ۲۶ اکتوبر کو موصول ہو گیا۔ میں اسے آپ کا کارنامہ کہوں گا کہ اتنی جلدی آپ نے نیا دور کو باقاعدگی بخش دی۔ تخلیقات و مضامین بھی معیاری ہیں۔ شیخ علی حزیں پر مضامین کی اشاعت کا منصوبہ پسند آیا۔

جنوری ۱۹۹۲ء تک بہت مصروف ہوں۔ انشاء اللہ اس کے بعد ہی آپ کی کوئی خدمت کر سکوں گا۔ امید ہے کہ آپ نیا دور کو نیا رنگ نیا روپ ضرور دیں گے۔

(ڈاکٹر) اخلاق اثر

بھوپال

نیا دور کا نومبر کا شمارہ ملا۔ اداریے سے لے کر نقد و تبصرہ کے صفحات تک معیاری مواد، بہترین انتخاب اور معنوی حسن سے لبریز ہے۔ سردار احمد (علیگ) کا مقالہ "مولانا ابوالکلام آزاد اور فن موسیقی" مولانا کی پر عظمت شخصیت کے ایک اور دل کش پہلو کو دل کش انداز سے پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ نیر مسعود کا مقالہ "اودھ کی تہذیبی جھلکیاں" تاریخی مواد کا حامل ہے "زیب غوری" پر علی رضا حسینی اور "منظفر جون پوری" پر علی باقر زیدی اور "تحریک آزادی اور لکھنوی ادب" پر کاظم علی خاں کی تحریریں بھی معیاری ہیں۔ یہ سب آپ کے حسنِ ادارت کا کرشمہ ہے۔

———— (ڈاکٹر) افضال احمد

علی گڑھ

اکتوبر ۱۹۹۱ء کا شمارہ ملا۔ شکریہ! مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ ہندستان کے جن دوسرے صوبوں سے حکومت کی سرپرستی میں جو جریدے یا رسالے نکلتے ہیں ان تمام جریدوں میں نیا دور اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے اور بلاشبہ مضامین کے حصول میں آپ کی کاوشیں لائقِ صد ستائش ہیں۔

جناب جگن ناتھ آزاد اور مخمور کاکوروی کی غزلوں نے بے حد متاثر کیا۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کا مضمون "محبِ وطن جگر مرادآبادی" بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مضامین، غزلیں اور کہانی معیاری ہیں۔

میں اس پرچے کے خوشنویس صاحب کو بھی مبارک باد دینا چاہتا ہوں جن کے لکھنوی شانِ خط کی کتابت نے نیا دور میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

———— سید محمد مسلم

آل انڈیا ریڈیو پٹنہ

(بہار)

رباب مجسن نے کہا کہ اگر
نور ہے نہیں آپ
اگیا ہ

عنوانات

نیا دور

جلد ۴۶ نمبر ۱۱

فروری سنہ ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
ٹیلیفون : ——— ۲۴۳۶۷۶

معاونین :
○ نجیب انصاری
○ محمد الیاس خاں
ٹیلیفون : ——— ۲۴۲۱۰۸

پیشکش
آصل سروپ
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ
محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

فی شمارہ : ——— تین روپے
زر سالانہ : ——— تیس روپے

ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن
پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

زیر سرپرستی
ڈائرکٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

اپنی بات

ہمارا ملک سیکولرازم اور سوشلزم کا علمبردار ہے۔ تقریباً نوے کروڑ آبادی والے اس عظیم ملک میں مختلف مذہبوں اور نظریوں کے ماننے والے ایک آئین اور ایک پرچم کے تلے زندگی گزارتے ہیں۔ ہمارے آئین کے تحت تمام لوگوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ جیو اور جینے دو ہمارا نصب العین ہے۔ اظہار خیال کی جتنی آزادی یہاں ہے شاید ہی کسی اور ملک میں ہو۔ ہمارے سیاسی نظام کے تحت کل کا کسان آج کا حکمراں ہوسکتا ہے۔

ہندوستان آزادی سے پہلے بھی ایک زرعی ملک تھا، لیکن اس کے کاشت کار خستہ حال تھے، ہمارے ملک کی دولت دوسرے ملک بھیجی جاتی تھی اور اس طرح ہضم ہوجاتی تھی کہ فوراً ہی ھَلْ مِنْ مَزِیْد کا نعرہ سنائی دینے لگتا تھا۔ ریلوے کی توسیع کے لئے دوسرے ممالک کو ٹھیکے دیئے جاتے تھے تاکہ یہاں کی دولت آسانی کے ساتھ ہضم کی جاسکے۔ آبپاشی کی اسکیموں پر اس لئے توجہ نہیں دی جاتی تھی تاکہ یہاں کے عوام پیاسے اور بھوکے رہیں۔ دور دراز کے علاقوں میں روشنی کی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ گاؤں اور قصبوں میں گھپ اندھیرا رہتا تھا۔ لوگ تعلیم اور صحت کے انتظام سے محروم تھے۔

آج کا ہندوستان ہرے بھرے باغوں اور لہلہاتے کھیتوں سے مالا مال ہورہا ہے۔ بجلی اور آبپاشی کا اتنا انتظام ہے کہ دیہات اور قصبے روشنی سے منور ہورہے ہیں۔ سائنس کا دور دورہ ہے۔ ٹکنالوجی کا عروج ہے، تعلیم عام ہے۔ آبپاشی کو موثر بنانے کے لئے ندیاں اور نہریں رواں دواں ہیں۔ سڑکیں کوسوں دور تک بنائی جارہی ہیں۔ ریلوے کی بے پناہ توسیع ہورہی ہے۔ غرضکہ کوئی بھی ایسا شعبۂ حیات نہیں رہ گیا ہے جہاں ہم نے اپنی تعمیر و ترقی کا پرچم نصب نہ کیا ہو۔

اس مہینے یعنی فروری میں دو عظیم شخصیتوں کی یادگاریں بھی منائی جاتی ہیں۔ ایک شہرۂ آفاق شاعر مرزا غالب اور دوسرے مولانا آزاد ——— دونوں کا انتقال فروری میں ہوا تھا ——— فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی بھی اسی مہینے میں ہم سے جدا ہوگئے تھے۔ جوش کا یہ شعر آج بھی فضاؤں میں گونج رہا ہے ؎

ایک دن نو کی لکھوں گا کتاب زر نشاں
ثبت ہوگا جس کی زرّیں جلد پر ہندوستان

ایڈیٹر

ارباب انجمن نے کہا کہ اس سے
سچی تو ہے نہیں آپ کو پیرا
دیا گیا ہے

رات ایک کمرے کی

منظر سلیم
۱۳۰ تکیہ اعظم بیگ
بارود خانہ
لکھنؤ

اُنگلیاں پُرزوں کی مانند چلی تھیں دن بھر
سیکڑوں کھوکھلے الفاظ قلم سے نکلے
اس کے ماتھے کے پسینے کی طرح ٹپکے تھے
میز پر ایک طرف ٹھٹھرے سے اب سہمے پڑے ہیں
سرد اوراق پہ لرزاں ہیں تھکن کے سائے
اور سگریٹ کا دُھواں چمٹا ہوا ہے چھت سے
چھت کے اک گوشے سے افسردہ دُھوئیں کے دھبے
اُونگھتی سوتی کتابوں کو تکے جاتے ہیں

بند ہیں ہفتوں سے دونوں ہی دریچے ایسے
مستقل شیشے کی اینٹوں سے چُنے ہوں جیسے
باہری رُخ پہ ان اینٹوں کے بنا رکھے ہیں
تیز پالے نے عجب روئے فضا کے خاکے
اور ان خاکوں کو سہلاتا ہوا رات کا حسن
اس کے اسرار نئی برف کی چادر اوڑھے
دُور تک دامنِ صرصر میں بسے بکھرے ہیں
اور اشجار ہیں سب برف کے پھولوں سے لدے

ایک بھی درز دریچوں میں نہیں ہے ایسی
جس سے داخل ہو کوئی تیز سی رَو صرصر کی
اور اس کمرے میں جو شخص مقیّد سا ہے
اپنی برسوں کی تھکن اوڑھے ہوئے لیٹا ہے
وا نہیں کرتا ہے اک لمحے کو بھی پٹ کوئی
برف کے پھولوں کی خوشبو سے بھی اب ڈرتا ہے
اور کچھ چہروں کے خاکے جو بناتا ہے دُھواں
جن کو اب رات گئے تک وہ تکا کرتا ہے
دیکھ کر اس کو پشیماں سے رہا کرتے ہیں
پاپلر کا وہ شجر بس جو بہت اونچا ہے
کرب اس شخص کا محسوس کیا کرتا ہے

□□

گیان چند
۲۵ - سیکٹر ۹، اندرا نگر - لکھنؤ

میری بے رنگ زندگی کی بے کیف داستان

کوئی ایک سال قبل لاہور سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے مجھے لکھا کہ میں اپنی خود نوشت سوانح پر مشتمل ایک مضمون سہ ماہی "سیارہ" لاہور کو بھیج دوں۔ میں نے معذرت کر لی کہ میری زندگی اتنی اہم نہیں کہ اس کی داستان دوسروں کو سنائی جائے۔ اب "نیا دور" لکھنؤ نے سرگزشتوں پر مشتمل ایک سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے تاکہ ادیبوں کی زندگی کے صحیح حالات سامنے آجائیں۔ چونکہ میرا مصمم ارادہ ہے کہ کبھی کتابی شکل میں اپنی سوانح نہیں لکھوں گا اس لیے میں نے "نیا دور" کی دعوت قبول کر لی، تاکہ میری تحریروں پر لکھنے والوں کے لئے میری زندگی اور تصانیف کی صحیح تاریخیں فراہم ہو جائیں۔

خاندان

میرا آبائی وطن سیوہارہ ضلع بجنور، اتر پردیش ہے۔ یہ قصبہ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری، مولانا حفظ الرحمان اور حبیب احمد صدیقی آئی۔ سی۔ ایس کا بھی وطن مالوف ہے۔ یہاں کے اٹھارھویں صدی کے شاعر شہاب الدین ثاقب تلمیذ آبرو کا ذکر کئی تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ مسلم اکثریت کا قصبہ ہے۔ یہاں فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوتا۔

میرا خاندانی مذہب جین، ذات ویش اگروال اور گوتر گویل ہے۔ میری والدہ، بیوی اور داماد غیر جین ہندو ہیں۔ میری ایک بہو سکھ ہے۔ میرا شجرۂ نسب یہ ہے:

- گیان چند بن بحال سنگھ (م ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء) بن بہاری لال (م ۱۸۹۵ء) بن حکیم پدم سین (م ۱۷ فروری ۱۸۷۵ء) بن سوہن لال بن مگنی رام بن من سکھ رائے بن تھان سنگھ بن مجلس رائے بن سیتارام۔

اجداد میں حکیم پدم سین قابلِ ذکر ہیں۔ یہ فارسی کے عالم تھے۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مرزا قتیل کی چہار شربت مکتوبہ ۲۰ رجب ۱۲۶۶ھ مطابق جون ۱۸۵۰ء آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ ان کا لکھا ہوا ایک سفرنامہ ۱۹۷۴ء تک میرے ایک عزیز کے پاس تھا۔ بعد میں وہ کرم خوردگی سے ضائع ہو گیا۔ اس کے مطابق یہ حصولِ تعلیمِ طب کے لیے ایران کا ارادہ کر کے نکلے۔ لاہور کے قلعہ دار کی بیٹی کو دوا دے کر شفا دی۔ اس نے شاہی قافلے کے ساتھ انھیں کابل بھیج دیا۔ وہاں ۱۵ دن رہ کر ہرات چلے گئے، جہاں دو سال تک طبِ یونانی کی تعلیم حاصل کی۔ واپس آکر ایک سال تک کابل میں درس دیا۔ اس کے بعد وطن واپس آگئے۔ کم عمری میں ۱۸۷۵ء میں انتقال کیا۔ میرے والد لالہ بحال سنگھ اور والدہ پاروتی (م ۲۴ مئی ۱۹۴۵ء) اردو پڑھے لکھے نہ تھے۔ ان کے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہوئیں۔ ان میں سے تین بچے بالترتیب ۳ دن، ۱۵ دن اور ۹ مہینے کی عمر میں فوت ہو گئے۔ چار لڑکیاں اور تین لڑکے عمرِ طبعی کو پہنچے۔ میں ان میں سب سے چھوٹا ہوں۔ اب میری ایک بہن اور ایک بھائی زندہ ہیں۔ بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس (ولادت ۲ ستمبر ۱۹۱۱ء) نے آگرہ یونیورسٹی

سے اُردو میں پی. ایچ. ڈی کی۔

میری تاریخِ ولادت ۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء ہے۔ مجھ کو کثیرین پر بنارس یونیورسٹی کے ایک اسکالر اختر الزماں نے پی ایچ ڈی کی ہے۔ ایک لڑکی عثمانیہ یونیورسٹی میں عرصے سے کر رہی ہے۔ اختر الزماں نے میرے پرائمری اسکول سے لے کر انٹر کالج تک کے رجسٹر داخلہ وغیرہ دیکھے اور ہر کلاس میں میرے داخلے اور نتیجے کی صحیح تاریخیں معلوم کیں۔ اس کی تحقیق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں صحیح تواریخ درج کرتا ہوں۔

تعلیم

میں گورنمنٹ لور پرائمری اسکول سیوہارہ میں یکم جولائی ۱۹۲۹ء کو درجہ الف میں داخل ہوا۔ وہاں سنہ پیدائش یکم جولائی ۱۹۲۴ء لکھا ہے۔ مئی ۱۹۳۳ء میں درجہ چار پاس کیا۔ اس کے بعد سات آٹھ مہینے ایک پرائیویٹ اسکول میں انگریزی کا درس لیا جس کے بعد مسلم قدرت اسکول سیوہارہ میں ۴ر فروری ۱۹۳۴ء کو پانچویں کلاس میں داخل ہوا۔ داخلے کے لئے ماسٹر قدیر نے میرا زبانی امتحان لیا تھا۔ انھوں نے از خود میری تاریخ ولادت ۴ر فروری ۱۹۲۶ء لکھ دی، جو آج تک میری قانونی تاریخ ولادت ہے۔ پرائمری اسکول ہو یا کہ انگریزی کا تسلیم شدہ مڈل اسکول، میں نے جس تاریخ کو داخلہ لیا، ماسٹروں نے اسی کو میری تاریخ ولادت قرار دے دیا اور سنہ ولادت اپنی مرضی سے کچھ بھی لکھ دیا۔

آٹھویں جماعت کے بعد میں ۱۲ر جولائی ۱۹۳۷ء کو پارکر ہائی اسکول مراد آباد میں نویں درجے میں داخل ہوا جہاں سے ۱۹۳۹ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ فرسٹ ڈویژن میں اردو اور ریاضی میں امتیاز کے ساتھ۔ اس کے بعد میں گورنمنٹ انٹر کالج مراد آباد میں داخل ہوا، جہاں سے ۱۴ر جون ۱۹۴۱ء کو سکنڈ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ ان دنوں اسکول اور کالج میں سال میں تین امتحان ہوا کرتے تھے۔ سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ۔ میں درجہ پانچ سے بارھویں تک تینوں درس گاہوں میں صرف دو امتحانوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آیا، وہ دو ہیں: دسویں کا سہ ماہی اور بارھویں کا ششماہی امتحان۔ ان دونوں میں میں دوسرے نمبر پر رہا۔

جولائی ۱۹۴۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی ارباب انجمن نے کہا کہ اس سے اساتذہ تھے ڈاکٹر حفیظ سید اور سید اعجاز حسین۔ سستی تو ہے نہیں، آپ کو تیسرا ڈویژن میں بی۔ اے کیا۔ الہ آباد یونیورسٹی میں جولائی ۱۹۴۱ء میں پایا گیا ۱۹۴۴ء تک جین ہوسٹل میں رہا۔ اس کے بعد ہوسٹل کے حکام (سے) بغاوت کرنے پر ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ چار مہینے شہر میں کرایے پر رہا۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں بد رجہا بہتر سر پی۔ سی۔ بنرجی ہوسٹل میں جگہ مل گئی جہاں آخر تک رہا۔ ایم۔ اے اُردو ۱۹۴۵ء میں فرسٹ کلاس میں فرسٹ پوزیشن کے ساتھ کیا۔ دوسرے نمبر پر مجتبیٰ حسین آئے جو بعد میں کوئٹہ یونیورسٹی بلوچستان میں اُردو کے پروفیسر ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کی طویل تاریخ میں آج تک میں تنہا غیر مسلم ہوں جو ایم۔ اے اُردو میں اوّل آیا۔ ایم اے میں میرے اساتذہ تھے پروفیسر ضامن علی، ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر رفیق حسین۔

ایم اے کے بعد ریسرچ میں داخلہ لیا۔ نگراں تھے پروفیسر ضامن علی اور اس وقت موضوع کا عنوان تھا "شمالی ہند میں اُردو کے نثری قصے ابتدا سے ۱۸۰۰ء تک" لیکن مقالہ لکھتے وقت اسے پھیلا کر انیسویں صدی کے آخر تک کر لیا گیا۔ میں نے جولائی ۱۹۴۵ء کے آخر میں ریسرچ میں داخلہ لیا ہوگا۔ ان زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی میں ڈی فل (پی ایچ ڈی کا دوسرا نام) کا مقالہ ۳۰ ماہ کی اقل مدت میں داخل کرنے کی اجازت تھی۔ میں نے جون ۱۹۴۷ء کے تیسرے ہفتہ کے آخر میں مقالہ داخل کیا یعنی ۲۳ ماہ سے بھی کم میں۔ آزادی کے بعد ہر یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے مقالہ کی اقل ترین مدت دو سال کر دی گئی ہے۔ اس طرح میں نے اردو میں ڈی فل (پی ایچ. ڈی) کا مقالہ کم سے کم مدت میں داخل کرنے کا ریکارڈ کیا ہے۔ میرے ممتحنین تھے مرزا جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر عندلیب شادانی اور پروفیسر ضامن علی۔ چونکہ شادانی ڈھاکہ میں تھے تقسیم ملک کی وجہ سے رپورٹ حاصل کرنے میں بہت دیر ہوئی۔ آخر کار مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈگری ملی۔

مجھ سے پہلے پانچ اشخاص نے لندن یونیورسٹی سے اور آٹھ حضرات نے ہندستانی یونیورسٹیوں سے اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ ان کے نام مع سنین یہ تھے،

۔ ۱۹۲۹ء، حفیظ سید ۱۹۳۲ء، حیدر آباد کے
ن ۱۹۳۳ء، میاں تصدق حسین خالد ۱۹۳۵ء، بیگم شائستہ
...۱۹۴۰ء

ہندستانی یونیورسٹیوں سے میرے پیش رو یہ ہیں :-

موہن سنگھ دیوانہ۔ کلکتہ ۱۹۳۱ء، محمد صادق۔ لاہور ۱۹۳۹ء رفیق حسین الہ آباد ۱۹۴۲ء، ابواللیث صدیقی۔ علی گڑھ ۱۹۴۲ء، نور الحسن ہاشمی۔ علی گڑھ ۱۹۴۳ء، حامد حسن بلگرامی۔ الہ آباد ۱۹۴۴ء جگت مزائن ہیکروال۔ لکھنؤ ۱۹۴۵ء۔ (مسعود حسین خاں۔ علی گڑھ ۱۹۴۵ء)

اس طرح میں ہندستانی یونیورسٹیوں سے اُردو میں پی ایچ ڈی کرنے والا نواں اور جملہ یونیورسٹیوں کو ملاکر چودھواں شخص ہوں جو ننگِ اسلاف ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اُردو کی پوزیشن میں پیہم زوال کو دیکھتے ہوئے میرے بڑے بھائی پرکاش مونس نے اصرار کیا کہ میں احتیاطاً کسی اور مضمون میں بھی ایم' اے کرلوں۔ میں اس کا قائل نہ تھا لیکن سوچا کہ کسی جدید انسانی علوم کے مضمون میں ایم۔ اے کرنا ہی بہتر رہے گا چنانچہ میں نے ۱۹۵۴ء میں آگرہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر ایم' اے سوشیالوجی سکنڈ میں پاس کیا۔

اس کے بعد میں نے ۱۹۵۴ء کے اواخر میں آگرہ یونیورسٹی میں ڈی۔ لٹ کے لئے رجسٹریشن کرایا۔ موضوع تھا "شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقاء"۔ مقالہ ۱۹۵۶ء کے اواخر یا ۱۹۵۷ء کے اوائل میں داخل کیا ہوگا۔ ممتحنین تھے پروفیسر سروری، پروفیسر سرور اور کلیم الدین احمد۔ پہلے دو نے مقالے کو پاس کیا۔ کلیم الدین صاحب نے ترمیم کے لیے واپس کردیا۔ اس کے بعد وہ چوتھے ممتحن ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے پاس بھیجا گیا جن کا فیصلہ حتمی مانا جانا تھا۔ انھوں نے بھی ترمیم کے لیے واپسی کی سفارش کی۔ ترمیم کے بعد مقالہ جلد از جلد چھ ماہ بعد اور دیر از دیر دو سال بعد داخل کیا جا سکتا ہے۔ آگرہ یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے قواعد کے برعکس ڈی لٹ کا مقالہ جلد از جلد چھ ماہ ہی میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ دونوں صورتوں میں مقالہ چھ ماہ کے بعد داخل کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا ترمیم کا داغ کیوں لوں، نئے سرے سے رجسٹریشن کیوں نہ کرالوں۔ میں نے پُرانا رجسٹریشن منسوخ کرایا اور نیا رجسٹریشن موضوع کے الفاظ میں برائے نام ترمیم کے ساتھ "اُردو مثنوی شمالی ہند میں" کے عنوان سے کرایا۔ مقالہ ۱۹۵۹ء میں داخل کیا۔ اس بار ممتحنین تھے پروفیسر سروری، پروفیسر سرور اور سید احتشام حسین۔ تینوں نے مقالہ پاس کردیا، جس پر ۱۹۶۰ء میں ڈگری مل گئی۔

تکنیکی اعتبار سے اس مقالہ پر پہلی کوشش ہی میں ڈگری ملی ہے لیکن اس کے پیچھے یہ حقیقت نہفتہ ہے کہ یہ ترمیم شدہ مقالہ ہے۔ کلیم الدین احمد کا اعتراض تھا کہ مقالے میں مثنوی کی تاریخ ہے، ارتقاء نہیں۔ میں اس اعتراض کو سمجھ نہیں پایا۔ پھر بھی اسے رفع کرنے کے لئے ایک نیا باب چہارم' اردو مثنوی کا ارتقاء، کے عنوان سے شامل کردیا جس میں رجحانات کا مسلسل ارتقا بیان کیا گیا تھا۔ ڈگری کے انٹرویو میں احتشام صاحب یہی کہتے رہے کہ یہ باب تکرار معلوم ہوتا ہے۔ ظہیر الدین مدنی کا اعتراض تھا کہ تاریخی پس منظر بہت مختصر ہے۔ دوسری بار میں نے اس باب کو مفصل لکھ دیا۔ ان دو اضافوں کے علاوہ مقالہ کم و بیش وہی ہے جو پہلی بار داخل کیا گیا تھا بعد میں کتاب چھپنے پر ڈاکٹر محمد حسن نے تبصرہ کرتے ہوئے تاریخی پس منظر کے طول پر اعتراض کیا۔

میں اس وقت تک کلیم الدین احمد صاحب اور ظہیر الدین مدنی صاحب سے نہ کبھی ملا تھا، نہ خط و کتابت ہوئی تھی۔ مدنی صاحب کا مجھے محض ایک خط ملا۔ جب میں جموں یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ کسی غلط فہمی کے تحت اُردو ریڈر کی ایک پوسٹ مشتہر ہوگئی۔ مدنی صاحب اور ڈاکٹر مسیح الزماں نے درخواست دی۔ مدنی صاحب نے مجھے ذاتی خط لکھا کہ اگر آپ مجھے ریڈر کے اہل سمجھیں تو منتخب کرلیجئے۔ بعد میں وہ پوسٹ موخرت ہوگئی۔ مدنی صاحب سے آج تک میری ملاقات نہیں ہوئی۔ کلیم الدین احمد کو غالب انعام کی تقریب میں پہلی اور آخری بار دیکھا۔

طویل مثنویوں کے ساتھ مختصر مثنویوں کو شامل کرنا بے تکی بات ہے۔ اب میں نے کتاب سے مختصر مثنویوں کو خارج کردیا ہے۔ اس ترمیم یا تخفیف کے ساتھ مقالہ شائع کرانے کی فکر میں ہوں۔

حمیدیہ کالج بھوپال میں ایم' اے اُردو کھلنے کے بعد میں نے عام لسانیات پر ایک مفصل کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ہندی اور انگریزی کی کتابیں

پڑھیں۔ لیکن صوتیات کتابوں سے سمجھ میں نہیں آئیں اسے سیکھنے کے لیے ساگر یونیورسٹی میں مئی، جون ۱۹۶۱ء میں منعقدہ موسم گرما لسانیات اسکول میں داخلہ لیا۔ جہاں سے لسانیات کا ابتدائی سرٹیفکیٹ لیا۔ میرے ممتاز اساتذہ میں ڈاکٹر سنتی کمار چیٹرجی، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اور پونا کے ڈاکٹر گھاٹگے تھے۔ صوتیات کچھ کچھ آگئی لیکن لسانیاتی صرف و نحو اب بھی فہم سے بالاتر تھی، اس کے لیے کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں ۱۹۶۲ء کے موسم گرما لسانیات اسکول میں داخلہ لیا اور لسانیات کا ایڈوانسڈ سرٹیفکیٹ لیا۔ اس میں صرف و نحو ڈاکٹر اشوک کیلکر نے پڑھائی۔ اس کے ساتھ میری ضابطے کی تعلیم ختم ہوگئی۔

مُلازمت

جون ۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی تعلیم ختم کرنے کے بعد میں نے روزگار کی تلاش کی لیکن تین سال تک کوئی ملازمت نہ ملی میں نے دو شرائط عاید کر رکھی تھیں ـــــ ڈگری کالج سے کم میں ملازمت نہ کروں گا اور دو سو روپے ماہوار سے کم پر نہ جاؤں گا ـــــ پی ایچ ڈی کے باوجود ان دونوں شرائط کو پوری کرنے والی کوئی ملازمت نہ ملی۔ مجبور ہو کر میں نے انگریزی صحافت میں جانے کا ارادہ کیا۔ اسے سیکھنے کے لئے جنوری ۱۹۵۰ء میں پائنیر لکھنؤ میں بغیر تنخواہ کے سب ایڈیٹر ہوگیا۔

مئی ۱۹۵۰ء میں حمیدیہ ڈگری کالج بھوپال میں اردو کی لیکچرر شپ مل گئی۔ گریڈ تھا ۲۰۰ تا ۵۰۰ روپئے۔ میں نے ۱۰ر جولائی ۱۹۵۰ء کو جوائن کیا۔ میری صدر شعبہ تھیں صفیہ اختر۔ دو سال بعد وہ بیماری کے سبب چھٹی پر چلی گئیں اور اس کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح میں جولائی ۱۹۵۲ء میں صدر شعبہ ہوگیا۔ بعد میں گریڈ ۳۰۰ــ۶۰۰ روپئے کر دیا گیا۔ جولائی ۱۹۵۶ء میں ایم اے اردو کی جماعتیں کھلنے پر میرا گریڈ ۵۰۰ــ۸۰۰ ہوگیا جو دو سال بعد ۵۵۰ــ۹۵۰ کر دیا گیا۔ یہ یونیورسٹی ریڈر سے قدرے زیادہ تھا۔

مدھیہ پردیش کے سرکاری کالجوں میں ڈگری کالج لیکچرر سے شروع کر کے پوسٹ گریجویٹ کالج پرنسپل تک خود بخود سینیرٹی کے اعتبار سے ترقی دی جاتی ہے مجھے ۱۲ر جون ۱۹۵۹ء کو گورنمنٹ ڈگری کالج سیہور کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ شہر بھوپال ضلع سیہور ہے۔ ارباب انجمن نے کہا کہ اس سے انکار کر کے کالج پروفیسر بننے کو ترجیح دی۔ تدریسی فرائض نہیں، آپ کو میرا میں کالج سے نکل کر کسی یونیورسٹی میں جانا چاہتا تھا۔ ۶۴ر باگیا ۵ مجھے جموں یونیورسٹی میں اُردو کا پروفیسر مقرر کیا گیا، حالانکہ میں اس پر نہیں گیا تھا۔ میں نے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۶۵ء کو جوائن کیا اور جموں میں (نیا شعبۂ اُردو قائم کیا۔ جموں میں مجھے ہر قسم کا احترام اور آرام ملا۔ لیکن جموں کشمیر میں باہر کی ریاستوں سے آنے والوں کو ریاست کی شہریت نہیں ملتی اور کئی معذوریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ ۷ر اکتوبر ۱۹۷۶ء کو میں نے الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسری کا چارج لیا۔

سوچا کہ اب اپنی ریاست کی اپنی یونیورسٹی میں آگیا ہوں، اب کہیں نہ جاؤں گا۔ لیکن بعض عوامل نے مجھے وہاں سے بھی نکلنے پر مجبور کیا۔ یونیورسٹی نے بعض معاملوں میں میرے ساتھ بے انصافی کی۔ بعد میں اس کا ازالہ یوں ہوا کہ وائس چانسلر نے اگست ۱۹۷۸ء میں بار بار اصرار کیا کہ میں الہ آباد یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری قبول کرلوں۔ میں نے معذرت کرلی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ مرکزی حیدرآباد یونیورسٹی میں اُردو کا شعبہ کھولنے کا سوال آیا۔ مجھے تقرر نامہ مل گیا لیکن میں جانا نہیں چاہتا تھا اُردو کے کئی سینیر پروفیسروں نے مجھے مجبور کیا کہ میں وہاں ضرور جاؤں کہ مجھے نئے شعبے قائم کرنے کا تجربہ ہے۔ میں بھوپال اور جموں میں پوسٹ گریجویٹ شعبے قائم کرچکا تھا۔ حیدرآباد سے عابد علی خاں نے اصرار کیا۔ اپنے کرم فرماؤں کے امتثالِ امر پر میں ۲۶ر مارچ ۱۹۷۹ء کو حیدرآباد یونیورسٹی میں شامل ہوگیا۔ علمی اعتبار سے یہ میرے لیے بہت اچھا رہا کہ میں ایک مرکزی یونیورسٹی میں سمسٹر سسٹم والے ترقی یافتہ نصاب کو رائج کرسکا۔ حیدرآباد میں رہ کر میں نے تدریس کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ معلوم ہوا کہ علمی سطح پر مرکزی یونیورسٹیاں ریاستی یونیورسٹیوں سے اتنی ہی آگے ہوتی ہیں جتنی ریاستی یونیورسٹیاں کالجوں سے۔

میں آخر فروری ۱۹۸۷ء کو ریٹائر ہوا۔ اس کے بعد مزید دو سال دو ماہ کے لئے دوبارہ ملازم رکھ لیا گیا اور ۳۰ر اپریل ۱۹۸۹ء کو گرمیوں کی چھٹیوں سے عین پہلے سبکدوش کر دیا گیا۔ ۱۰ سال کی ملازمت کے بعد

ین کی تنخواہ نہ دی۔ اس سے قطع نظر
ہت مہربان تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی گرانٹس
ن) کے چیرمین کو نہایت پرزور چٹھی لکھ کر مجھے
رشپ دلوادی۔ اس کے تحت دو سال تک چار ہزار
روپئے ماہانہ وظیفہ اور متفرق اخراجات کے لیے دس ہزار روپئے
سالانہ کی رقم ملتی ہے۔ میں نے ۱۹ر جولائی ۱۹۸۹ء کو فیلوشپ
جوائن کی۔ ریٹائر ہونے کے بعد میں لکھنؤ میں مکان بنا کر بسنا چاہتا
تھا کہ وہاں سے میرے اعزا قریب ہیں اور وہاں اُردو کا ماحول ہے
اس لیے میں نے فیلوشپ کو لکھنؤ یونیورسٹی میں منتقل کرالیا اور یکم مئی
۱۹۹۰ء کو لکھنؤ آیا۔ ۲۲ر اگست ۱۹۹۰ء کو میں ذاتی مکان میں آگیا۔
۱۸ر جولائی ۱۹۹۰ء کو فیلوشپ ختم ہوگئی۔

اُردو تحقیق کی تاریخ بہت بڑا کام ہے۔ میں نے اس سلسلے میں تھوڑا سا کام ہی کیا تھا۔ بعد میں طے کیا کہ "اُردو کی ادبی تاریخیں" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ دوں جس میں اہم ادبی تاریخوں کا تحقیقی جائزہ لیا جائے۔ آج کل اسی میں مصروف ہوں۔

اہل وعیال

میری شادی ۲ر جون ۱۹۵۳ء کو ہوئی۔ اہلیہ اُرملا سہارنپور کی ہیں۔ شادی سے پہلے انھوں نے ۱۹۵۳ء میں ہندی کا ایم اے پرائیویٹ کیا تھا۔ شادی کے بعد فاضل بھی کرلیا۔ میرے تین اولادیں ہیں: ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ لڑکی کیلی فورنیا امریکا میں بس گئی ہے اور وہاں کی شہریت لے چکی ہے۔ داماد ڈاکٹر ہے اور بے حد خوش حال ہے۔ دونوں لڑکے انجینئر ہیں۔ بڑا لڑکا نائجیریا افریقہ میں ہے۔ چھوٹا لڑکا دلی میں تھا اس لیے اس کے نام سے لکھنؤ میں مکان بنایا لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ہی وہ بھی مستقلاً امریکہ چلا گیا اور کیلی فورنیا میں ملازمت کرلی۔ تینوں بچوں کے اولادیں ہیں لڑکے اور لڑکیاں دونوں۔ ہندستان میں ہم میاں بیوی تنہا رہتے ہیں۔ بچوں کا اصرار ہے کہ ہم بھی امریکہ منتقل ہوجائیں لیکن وہاں جاکر میرا اُردو لکھنا پڑھنا ختم ہوجائے گا۔ اُردو کے شوق اور خاکِ وطن کی خاطر بچوں سے دور پڑا ہوں۔ ان سے ملنے اہلیہ کے ساتھ تین بار مغرب ہو آیا ہوں۔ پہلی بار ۱۹۸۳ء میں۔ اس سفر میں لندن امریکہ اور کناڈا دیکھا۔ دوسری بار ۱۹۸۸ء میں۔ اس بار جاپان کی طرف سے گیا اور محض ایک دن کے لئے جاپان کو دیکھا۔ تیسری بار ۱۹۹۱ء میں گیا ہوں۔ اس بار واپسی میں تین دن ٹوکیو اور ایک دن سنگاپور میں ٹھہرا۔ ٹوکیو کے شعبۂ اُردو کے جاپانیوں نے غیر معمولی مدارات کی۔ پہلے دو سفروں کا مالی بار داماد نے اٹھایا۔ تیسری بار ان کی پیشکش کے باوجود میں نے اپنی جیب سے صرف کیا۔

تصانیف

ادبی سفر کا آغاز شاعری سے ہوا۔ پہلی غزل دسمبر ۱۹۳۷ء کی ہے جب میں نویں درجے میں تھا۔ پہلا نثری مضمون فانی بدایونی کی شاعری پر ہارکر اسکول میگزین ۳۹-۱۹۳۸ء میں شائع ہوا جب میں دسویں درجے کا طالب علم تھا۔ ابتدائی کاوشوں سے قطع نظر میں نے چند مستقل کتابیں لکھی ہیں جو ایک موضوع پر ہیں ان کے علاوہ کئی سو مضامین لکھے، ان میں سے قابلِ ذکر مضامین کو مجموعوں کی شکل میں مرتب کرکے شائع کردیا۔ لیکن ہوس کی وجہ سے ان مجموعوں میں اچھے مضامین کے ساتھ کچھ ہلکے مضامین بھی شامل ہوگئے ہیں۔ ۱۹۸۹ء تک کے تمام قابلِ ذکر مضامین کسی نہ کسی مجموعے میں سمو لیے گئے ہیں۔ کتابوں اور مجموعوں کی فہرست حسبِ ذیل ہے:-

(۱) "اُردو کی نثری داستانیں" (ڈی فِل کا مقالہ)۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی، طبع اوّل ۱۹۵۴ء۔ دوسرا ایڈیشن مزید ایک سال کی تحقیق کے بعد اتنی ترمیم واضافہ سے تیار کیا گویا یہ ایک نئی کتاب ہوگئی۔ تیسرا ایڈیشن یوپی اُردو اکاڈمی لکھنؤ نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ (صفحات ۹۲۰)۔ اس بار دکنی داستانوں کا جائزہ بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ چوتھا ایڈیشن کراچی میں زیرِ طبع ہے۔

(۲) "تحقیقیے" (تنقیدی وتحریری مضامین - ۳۲۸ صفحات)۔ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۴ء

(۳) "اُردو مثنوی شمالی ہند میں" (ڈی۔لٹ کا مقالہ) طبع اول۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۹ء۔ ترمیم شدہ طبع دوم دو جلدوں میں (۸۹۱ صفحے) انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی ۱۹۸۷ء

(۴) "تفسیرِ غالب" (غالب کے پورے منسوخ اُردو کلام کی شرح ۵۹۶ صفحے) جموں کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر۔ طبع اول پر ۱۹۷۱ء درج ہے لیکن دراصل یہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ طبع دوم ۱۹۸۶ء

(۵) "لسانی مطالعے" (لسانیاتی مضامین ۲۸۷ صفحے) طبع اوّل نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا۔ ۱۹۷۳ء۔ طبعِ دوم ترقی اُردو بورڈ دہلی ۱۹۷۹ء طبع سوم زیرِ طبع۔

(۶) "تجزیے" (تحقیقی و تنقیدی مضامین۔ ۳۵۲ صفحے) مکتبۂ جامعہ دہلی۔ ۱۹۷۳ء

(۷) "رموزِ غالب" (غالب پر تحقیقی و تنقیدی مضامین۔ ۳۴۴ صفحے) مکتبۂ جامعہ دہلی ۱۹۷۶ء

(۸) "حقائق" (تحقیقی و تنقیدی مضامین۔ ۴۲۸ صفحے) ناشر خود الہ آباد۔ ۱۹۷۸ء

(۹) "ذکر و فکر" (تحقیقی و تنقیدی مضامین۔ ۴۸۸ صفحے) ناشر خود الہ آباد۔ اس پر سنہ اشاعت ۱۹۸۰ء درج ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ۱۹۸۱ء کے اوائل میں شائع ہوئی

(۱۰) "عام لسانیات" (۹۱۰ صفحے) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۵ء

(۱۱) ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال، ۱۹۰۸ء تک (۳۷۴ صفحے)۔ اُردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد ۱۹۸۸ء۔ نیز شائستہ پبلشنگ ہاؤس کراچی ۱۹۸۸ء

(۱۲) "اُردو کا اپنا عروض" (۹۶ صفحے) یہ رسالہ "اُردو ادب" کے خاص نمبر کی صورت میں ۱۹۸۹ء میں انجمن ترقی اُردو ہند دہلی سے شائع ہوا۔ بعد میں اسے کتابی صورت میں مجلد کر دیا گیا اور اس پر سنہ ۱۹۹۰ء درج کیا گیا۔

(۱۳) "کھوج" (تحقیقی مضامین۔ ۴۴۰ صفحے) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۱۹۹۰ء

(۱۴) "پرکھ اور پہچان" (تنقیدی اور شخصیات پر مضامین۔ ۴۳۹ صفحے) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۰ء

(۱۵) "تحقیق کا فن" (۶۸۰ صفحے) یو، پی اُردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۰ء

(۱۶) "ادبی اصناف" (اس کی کوئی کاپی نہ۔ اربابِ انجمن نے کہا کہ اس سے تقریباً ۷۵ صفحے ہیں۔ نظم اور نثر کی اصناف پہ تو ہے نہیں، آپ کو بیرا رسالوں میں شائع کئے۔ بعد میں انھیں منسلک کر دیا گیا سہ کی شکل دے دی، جیسے گجرات اُردو اکیڈمی، گاندھی نگر نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔ (کر)

(۱۷) "مقدمے اور تبصرے" (مجموعۂ مضامین۔ ۲۰۰ صفحے) انجمن ترقی اُردو ہند۔ دہلی۔ ۱۹۹۰ء

(۱۸) کچے بول (میرے کلام کا مجموعہ) ناشر خود۔ ۱۹۹۱ء (زیرِ طبع)

(۱۹) "اُردو ادب کی تاریخ" ۱۷۰۰ء تک باشتراک ڈاکٹر سیدہ جعفر ترقی اردو بیورو، دہلی۔

مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کتابیاتِ گیان چند (۲۷ صفحے) شائع کر رہی ہے جو میری مرتبہ ہے۔

مطبوعہ کتابوں میں "ابتدائی کلام اقبال" تحقیقی تدوین ہے۔ اس کے علاوہ ذیل کی کتابیں مستقل موضوعات پر ہیں۔

(۱) نثری داستانیں (۲) اُردو مثنوی
(۳) تفسیرِ غالب (۴) عام لسانیات
(۵) اُردو کا اپنا عروض (۶) تحقیق کا فن
(۷) ادبی اصناف

میں ان میں "تحقیق کا فن" کو اپنی بہترین کتاب مانتا ہوں۔ اس کے علاوہ نثری داستانیں اور تفسیرِ غالب بھی قابلِ قدر ہیں۔ مضامین کے مجموعوں کو میں چنداں اہم نہیں گردانتا۔ نو مجموعوں میں "تحریریں" اور "ذکر و فکر" سب سے کمزور ہیں۔

انعامات

مجھے کتابوں پر یا مجموعی خدمات پر جو انعامات ملے ہیں ان کی تفصیل ذیل میں بے کم و کاست بیان کرتا ہوں۔ عام طور سے لوگ انعام کی رقم ظاہر نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنی آمدنی کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ چونکہ عوام الناس انعام کی وقعت کا اندازہ اس کی مالیت ہی سے کرتے ہیں اس لئے میں دھڑلّے سے ہر انعام کی رقم بھی ظاہر کر رہا ہوں۔

(۱) اردو مثنوی شمالی ہند میں ۔ یو، پی اُردو اکاڈمی کا ۱۹۶۹ء کا انعام

۲ ہزار روپے ———

——— یوپی اردو اکاڈمی کا ۱۹۷۲ء کا انعام

۱۹۷۰ء میں ——— ۳ ہزار روپے

...نی مطالعے" ——— یوپی اردو اکاڈمی کا ۱۹۷۳ء کا انعام

مارچ ۱۹۷۴ء میں ——— ۳ ہزار روپے

(۴) "تفسیرِ غالب" ——— غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۷۳ء کا

غالب انعام اپریل ۱۹۸۴ء میں ——— ۵ ہزار روپے

(۵) "تجزیے" ——— جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی کا انعام

مارچ ۱۹۷۵ء میں ——— ۲ ہزار روپے

(۶) امتیازِ میر انعام ——— آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ ۲۰ نومبر ۱۹۷۰ء

کو ——— پانچ سو روپے

(۷) "حقائق" ——— یوپی اردو اکاڈمی کا ۱۹۷۸ء کا انعام

مارچ ۱۹۷۹ء میں ——— ۳ ہزار روپے

(۸) "ذکر و فکر" ——— ساہتیہ اکیڈمی دہلی کا ۱۹۸۲ء کا انعام

فروری ۱۹۸۳ء میں ——— ۵ ہزار روپے

(۹) اعزازِ میر انعام ——— آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ ۲۲ دسمبر

۱۹۸۵ء ——— ۳ ہزار روپے۔

انعامات کے سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ میں نے کبھی انعام کے لیے کتاب داخل نہیں کی۔ اس کے باوجود کرم فرماؤں نے بن مانگے موتی دیئے اور وہ بھی متعلقہ اکیڈمی کے سب سے بڑے انعام کی شکل میں۔

انعامات کا فیصلہ کرنے کے لیے کتنی ہی کمیٹیاں وغیرہ کیوں نہ ہوں لیکن بسا اوقات ان کے پیچھے کوئی ایک کرم فرما ہوتا ہے۔ یوپی اردو اکاڈمی کے انعامات ڈاکٹر محمود الٰہی کی عنایت ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے جب انعامات کا سلسلہ شروع کیا تو مجھے پہلے ہی سال نوازا۔ اس سال میرے علاوہ کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر قاضی عبدالستار کو انعامات ملے۔ میں اپنے انعام کو قاضی عبدالودود کی دین مانتا ہوں۔

ساہتیہ اکیڈمی نے ۲۵ دسمبر ۱۹۸۲ء کو ۱۹۸۲ء کے انعامات کا اعلان کیا۔ اس زمانے میں میرے ہم زلف (جو مجھ سے عمر میں بڑے ہیں) حیدرآباد میرے یہاں مہمان تھے۔ وہ اور میری اہلیہ نیچے ڈرائنگ روم میں تھے میں نے اوپری منزل میں ریڈیو پر اعلان سنا کہ مجھے "ذکر و فکر" پر اردو کا انعام ملا ہے۔ میں سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے سان گمان بھی نہ تھا کہ اس کتاب پر یہ وقیع انعام ملے گا۔ "ذکر و فکر" بہت ہلکی کتاب ہے۔ اس میں متعدد ہلکے مضامین شامل ہیں۔ اس سے پیشتر کا مجموعہ "حقائق" کہیں زیادہ وقیع ہے۔ ذکر و فکر پر اتنا موقر انعام ملنے پر میں بہت محجوب ہوا۔ میں نے نیچے کی منزل میں آ کر اپنی اہلیہ اور ہم زلف کو یہ خبر سنائی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سوچتا ہوں کہ انعام سے انکار کر دوں کیوں کہ میری کتاب اس کے لائق نہیں۔ ہم زلف صاحب نے ڈانٹ پلائی کہ انکار کرنے کا کیا سوال ہے؟

بعد میں میں نے بھی سوچا کہ انکار کرنا منتخب کرنے والوں کے منہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف ہوگا۔ انتخابی پینل میں جناب مالک رام کنوینر اردو کمیٹی، عصمت چغتائی اور حکم چند نیر تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ۱۹۸۱ء میں بھی ذکر و فکر اور کلیم الدین احمد صاحب کی کسی کتاب پر غور کیا گیا تھا، کسی ایک نام پر اتفاق نہ ہو سکا جس کی وجہ سے ۱۹۸۱ء میں ساہتیہ اکاڈمی نے اردو کا انعام دیا ہی نہیں۔ اس پر اردو کے حلقوں میں بہت لے دے ہوئی۔ جس کی وجہ سے ۱۹۸۲ء میں کسی نہ کسی کتاب پر انعام دینا ضروری تھا۔ قرعۂ فال مجھ دیوانے کی کج مج تحریر پر پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ انعام کے لیے غور کرتے وقت اس مخصوص کتاب کے علاوہ صاحبِ کتاب کی مجموعی تصانیف کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ شاید یہ صحیح ہو کیونکہ مجھ سے پہلے اور مجھ سے بعد میں بعض بڑے آدمیوں کی چھوٹی کتاب پر انعام دیا گیا ہے۔

میر اکیڈمی کے صدر جناب مقبول احمد لاری نے ۲۵ جولائی ۱۹۸۵ء کو مجھے لکھا کہ "اعزازِ میر" ابھی تک پروفیسر رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، قاضی عبدالودود اور کلیم الدین احمد کو ملا ہے۔" یہ رقم آپ کے شایانِ شان نہیں ہے ... آپ سے درخواست ہے کہ اس رقم کو ہماری طرف سے خیر سگالی کی ایک علامت سمجھیں۔"

اپنے پیش رووں کے ناموں کے پیشِ نظر میں اس انعام کو بھی بڑا اعزاز مانتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے کوئی اور انعام نہیں ملا۔ کتابیں بہت سی شائع کیں لیکن انھیں کبھی انعام کے لئے داخل نہیں کیا۔ اب یوپی

ادھر اکاڈمی کا یہ قاعدہ ختم ہو گیا ہے کہ جو کتاب داخل نہ کی گئی ہو اس پر بھی انعام دیا جا سکتا ہے۔ میرا ایک شعر ہے ؎

خود سے آ جائے گا جو کچھ وہ دل و جاں سے قبول
کسی خلعت کے لیے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا

میر اکیڈمی کے علاوہ مجھے اور کہیں سے مجموعی خدمات کا انعام نہیں ملا۔

انجمنوں کی رکنیت

میں اردو کی سبھی بڑی انجمنوں کا رکن رہ چکا ہوں مثلاً

(۱) انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کی حیاتی رکنیت
(۲) غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی حیاتی رکنیت
(۳) ساہتیہ اکاڈمی کی اردو کمیٹی
(۴) ترقی اردو بورڈ
(۵) بھارتیہ گیان پیٹھ کی اردو کمیٹی
(۶) گجرال کمیٹی برائے فروغ اردو
(۷) مدھیہ پردیش کے اقبال سمان کے پہلے سال کی جیوری۔

حیرت کی بات ہے کہ فلپائنس (Phillipines) کے موقر میگ سائی سائی ایوارڈ (Mag say say Award) ۱۹۸۷ء کے لیے مجھے ایک ریفری مقرر کیا گیا۔

انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کی رکنیت کا معاملہ دلچسپ ہے میں اس سے بالکل بے خبر تھا کہ اس مجلس کی رکنیت کیسے ملتی ہے۔ کبھی اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ احتشام صاحب نے ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء میں میرا نام تجویز کیا اور دوسرے امیدواروں کے ساتھ میرے نام پر بھی ووٹ لیے گئے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو اور مجھے برابر ووٹ ملے طے ہوا کہ قرعہ ڈال کر فیصلہ کیا جائے۔ قرعہ اس دیوانے کے نام پر نکلا۔ اس وقت تک مجلس عام کی رکنیت حیاتی ہوتی تھی۔ میرے نام کے بعد حیاتی رکنیت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ میں اس پورے واقعے سے بے خبر تھا۔ جب 'ہماری زبان' میں نتیجے کا اعلان ہوا تو مجھے معلوم ہوا۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کی میعاد محدود ہونے کے پیش نظر اپنا وقت تصنیفی کاموں میں صرف کروں گا۔ اس لیے جملہ کمیٹیوں کی رکنیت سے استعفےٰ دے دیا۔ میں انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کا حیاتی رکن تھا۔ ارباب انجمن نے کہا کہ آپ استعفا کیونکر دے سکتے ہو، میں نے کہا کوئی زبردستی تو ہے نہیں، آپ کو میرا استعفا منظور کرنا ہوگا۔ اس طرح میرے اصرار پر مجھے رہا کر دیا گیا ؎

آب حیات وہی نا جس پر خضر و سکندر مرتے ہیے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ، یہ بھی ہماری ہمت تھی (میر)

اب میں صرف غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کا حیاتی رکن ہوں۔ اسے اس لیے رہنے دیا کہ یہ پانچ سو روپے چندہ دے کر خریدی تھی۔ لکھنؤ آنے پر یو پی اردو اکاڈمی کی بعض کمیٹیوں کی رکنیت اس لیے قبول کی کہ حکام اکاڈمی کو عدم تعاون کا احساس نہ ہو۔

چند ناکامیاں

میں بہت سی سلیکشن کمیٹیوں میں بطور امیدوار مسترد ہوا ہوں۔ دو معاملے بڑے انوکھے ہیں۔ ان کی دلچسپی بلکہ ستم ظریفی کے پیش نظر بیان کرتا ہوں۔

۱۹۶۲ء میں سروری صاحب کے ریٹائر ہونے پر عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسری خالی ہوئی۔ سروری صاحب نے درخواست کا فارم خرید کر میرے پاس بھیجا اور مجھ سے درخواست لگوائی۔ بعد میں میرے پاس اطلاع آئی کہ میں عثمانیہ کی پروفیسری کے لیے ماہر مقرر کیا گیا ہوں۔ میں نے یونیورسٹی کو خبردار کیا کہ میں خود اس جگہ کے لیے امیدوار ہوں اور سلیکشن کمیٹی کی رکنیت پر امیدواری کو ترجیح دوں گا۔ جب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی اس جگہ کے لیے امیدوار ہیں، میں نے سروری صاحب کو لکھا کہ مسعود صاحب کی کوالیفیکیشن مجھ سے زیادہ ہے اس لیے مجھے درخواست واپس لے لینا چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا، "ابھی ایسا نہ کیجئے۔ اگر اس کی ضرورت ہوئی تو میں آپ کو لکھ دوں گا۔" انھوں نے نہ لکھا۔ مسعود صاحب منتخب ہوئے اور یہ فیصلہ مناسب تھا۔

۷۳-۱۹۷۲ء کے لگ بھگ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اردو پروفیسر کا اشتہار ہوا۔ میں اور ڈاکٹر محمد حسن امیدوار تھے۔ میں جموں یونیورسٹی میں پروفیسر تھا، محمد حسن کشمیر یونیورسٹی میں۔ میں انٹرویو کے لیے نہیں گیا۔ سلیکشن کمیٹی میں سرور صاحب اور مسعود حسین خاں تھے۔ ادھر معلوم ہوا کہ تیسرے ماہر ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی تھے۔ لیکن وہ نہ پہنچے جامعہ سے

شیخ الجامعہ مجیب صاحب اور پرنسپل جامعہ کالج ضیاء الحسن فاروقی تھے سرور صاحب نے میری حمایت کی، مسعود صاحب نے محمد حسن کی۔ ضیاء الحسن خاموش رہے۔ حال میں سرور صاحب سے معلوم ہوا کہ ان کے علاوہ مجیب صاحب نے بھی کئی بار مجھے منتخب کرنے کو کہا۔ عدم اتفاق کی وجہ سے فیصلہ کیا گیا کہ پوسٹ کا دوبارہ اشتہار کیا جائے۔

بعد میں مسعود صاحب جامعہ کے شیخ بن کر آئے۔ میں نے انھیں مطلع کیا کہ اب میں وہاں کی پروفیسری کا خواستگار نہیں۔ اس پر انھوں نے مجھے اسی پوسٹ کی سلیکشن کمیٹی کا رکن مقرر کیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر محمد حسن امیدوار تھے۔ محمد حسن کمیٹی کے سامنے نہیں آئے، نارنگ منتخب ہوئے۔ اس طرح مجھے زندگی میں غیر معمولی تجربے ہوئے ہیں کہ عثمانیہ میں جس پوسٹ کے سلیکشن کے لیے ماہر مقرر کیا گیا وہاں بحیثیت امیدوار کے منتخب نہ ہوا۔ جامعہ ملیہ میں جس پوسٹ پر بحیثیت امیدوار ناکام رہا، بعد میں اسی کے لیے ماہر سلیکٹر کیا گیا۔ سونے پر سہاگا یہ ہے کہ پہلے سلیکشن میں جس فاضل نے میری مخالفت کی تھی اسی نے شیخ الجامعہ ہونے پر مجھے بطور ماہر مقرر کیا۔ سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ زندگی کے رنگ ہزار۔

چند امتیازات

میرے چند اکتسابات و امتیازات ہیں جن کے بارے میں لاف و گزاف کرنا چاہتا ہوں:-

(۱) میں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ ۲۳ ماہ کی اقل مدت میں داخل کیا۔

(۲) میں جولائی ۱۹۵۲ء سے فروری ۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہونے کی مدت تک صدر شعبہ رہا جس میں جولائی ۱۹۵۶ء سے آخر فروری ۱۹۸۰ء تک پوسٹ گریجویٹ شعبوں کی صدارت ہے۔ سبکدوش ہونے کے بعد دوبارہ ملازم ہونے پر (توسیع) کوئی پروفیسر صدر شعبہ نہیں رہ سکتا اس لیے میں اپنی ملازمت کے آخری دو سوا دو سال میں صدر شعبہ نہ تھا۔

(۳) میں چار پوسٹ گریجویٹ شعبوں میں پروفیسر و صدر شعبہ رہا ہوں۔ ان میں سے آخری تین یونیورسٹیوں کے شعبے تھے۔

(۴) میں نے تین نئے پوسٹ گریجویٹ شعبے قائم کیے: بھوپال، جموں اور حیدرآباد میں۔

(۵) مجلس اساتذہ اُردو جامعات ہند کے شعبۂ تحقیق کی مسلسل تین سال تک صدارت کی۔ دوسری، تیسری اور چوتھی کانفرنس میں جو بالترتیب سری نگر، علی گڑھ اور لکھنؤ میں منعقد ہوئیں۔

(۶) ۱۹۹۰ء میں میری چھ تحقیقی و تنقیدی کتابوں کے پہلے ایڈیشن شائع ہوئے۔ اگر "اُردو کا اپنا عروض" کو ۱۹۸۹ء کے کھاتے میں ڈال دیا جائے تو بھی ۱۹۹۰ء میں پانچ کتابوں کی اشاعت بھی ایک ریکارڈ ہے۔

حرفِ آخر

میری زندگی کے کچھ اصول رہے ہیں۔ مثلاً کبھی قرض نہیں لیتا۔ کبھی کسی سے کسی کمیٹی کی رکنیت یا ممتحنی کی درخواست نہیں کی۔ کبھی کسی انعام کے لئے کتاب داخل نہیں کی، نہ کبھی کسی انعام کے لیے پیروی کی۔ کبھی کسی سے اپنی کتاب پر تبصرہ لکھنے یا رائے دینے کو نہیں کہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میری کئی کتابوں کے بارے میں کسی نے کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔ حد یہ ہے کہ "تحقیق کا فن" جیسی اہم کتاب پر کسی نے ایک لفظ نہیں چھاپا۔ ذاتی خطوں میں بڑھ چڑھ کر تعریف کی ہے۔ بہرحال میرے لیے کتاب کا لکھ لینا ہی کافی صلہ ہے۔

میں روابط عامہ کے معاملے میں بہت پچھڑا ہوا ہوں۔ کمیٹیوں اور سمیناروں سے بچتا ہوں۔ ساہتیہ اکادمی کی اردو کمیٹی کا پانچ سال تک رکن رہا۔ ایک بار بھی میٹنگ میں نہیں گیا۔ مسلم یونیورسٹی میں دوبار اور لکھنؤ، جموں، ترویندرم اور بنگلور یونیورسٹیوں میں ایک ایک بار پروفیسر کی سلیکشن کمیٹی میں شرکت سے معذرت کر لی۔

قیامِ حیدرآباد کے دوران یو۔ جی۔ سی نے مجھے انسانی علوم کی پینل (Humanities panel) کا ممبر مقرر کیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ حالانکہ اس کی رکنیت اقتدار کی حامل ہوتی ہے۔ رسالہ "شاعر" میں جب گوشہ نکالنے کا سلسلہ شروع ہوا تو اعجاز صدیقی مرحوم نے مجھے دعوت دی، میں آمادہ نہ ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نے مجھے لکھا کہ اپنا گوشہ نکالنے کی اجازت دیجئے، ابا مرحوم کی خواہش

تھی۔ اس پر میں مان گیا۔ بعد میں بلراج ورما نے تناظر کا پورا نمبر اور اطہر پرویز نے "الفاظ" میں میرا گوشہ نکالنے کی پیش کش کی، میں نے دونوں کو روک دیا۔ حال میں طلوعِ افکار" کراچی نے بھی میرا گوشہ نکالنے کو لکھا ہے، میں انھیں بھی ٹال رہا ہوں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ عثمانیہ اور بنارس یونیورسٹی میں مجھ پر تحقیق کے لیے رجسٹریشن ہو گیا ہے' میں نے دونوں جگہوں کے صدرِ شعبہ کو لکھا کہ امیدواروں کو اس سے باز رکھا جائے لیکن میری نہ سنی گئی۔

چاہتا تھا کہ مختلف علمی، ادبی و قومی مسائل پر اپنا نقطۂ نظر ظاہر کرتا چلوں لیکن میں، میں کرتے ہوئے یوں ہی مضمون کافی طویل ہو گیا۔ تین باتوں کے اعتراف و اعلان پر اس ہفوات کو ختم کرتا ہوں۔

(۱) مجھے اردو سے جو قدردانی ملی وہ میرے استحقاق سے زیادہ ہی رہی، کم کسی طور نہیں۔ مجھے جو کچھ ملا ہے میں اس سے پوری طرح مطمئن ہوں۔

(۲) خود احتسابی کرتا ہوں تو خود کو بڑا محقق نہیں گردانتا۔ نقادی کا تو سوال ہی کیا ہے۔ دوسروں کو چھوڑیے، اپنے بعض شاگردوں کو خود سے زیادہ معتبر اور ژرف نظر تحقیق کار مانتا ہوں مثلاً ڈاکٹر حنیف نقوی اور ڈاکٹر عابد پشاوری۔ آخر الذکر کو میں نے کبھی درس نہیں دیا لیکن ریسرچ میں ان کا رہنما تھا۔

(۳) کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب میرے دل میں کسی شخص کے خلاف کوئی عناد، کوئی گلہ نہیں۔ ملازمت کے دوران سلیکشن کمیٹیوں میں یا ادبی بحثوں میں کبھی کسی سے معمولی اختلاف ہوا لیکن عمر کی اس منزل پر پہونچ کر میرا دل آئینے کی طرح صاف ہے۔ اردو کے کسی ایک بھی آدمی، عزیز یا دوست کے خلاف کوئی آزردگی، کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں۔ میں زندہ یا مردہ کسی شخص کا دشمن نہیں۔ سب کی بقدرِ استحقاق بہتری چاہتا ہوں۔

زندگی میں اب صرف یہی ارمان رہ گیا ہے کہ اردو کی ادبی تاریخوں کا مفصل تحقیقی جائزہ مکمل کرلوں۔

□□

تصویر

ایک چہرہ
شکست و ریخت لیے
حلقۂ تارِ عنکبوت میں ہے
اور یوں جھانکتا ہے صدیوں سے
کوئی محبوس جس طرح جھانکے
روزنِ درد کی سلاخوں سے
میرے غم تک کوئی پہنچ نہ سکے
یہ نہ پوچھے کہ کس کا چہرہ ہے
وقت کی تیز تر ہواؤں میں
آ کے ٹکراتا ہے خیالوں سے
ٹوٹ کر آئینہ پہ گرتا ہے
صورتِ تاج
رنگِ آئینہ ■■

——— اسرار سیّد
سوچنا بھون
بنارسی باغ لکھنؤ

ڈاکٹر مظفّر حنفی
اقبال پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی ۔ کلکتہ

عصری سماج میں تشدّد کا رُجحان

اور ہمارے دانش ور

انسان نے اپنے آپ کو اشرف المخلوقات اور نائبِ خدا جیسے بے شمار عالیشان خطابات سے مزین کر رکھا ہے لیکن چشمِ بصیرت ہزار ہا سال سے دیکھتی آئی ہے کہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے کمزور ہونے کے باوجود کرّۂ ارض پر وہی سب سے زیادہ خونخوار اور ظالم جانور ہے ۔ بلاشبہ، شیر، بھیڑیے، گھڑیال، اژدہے، بچھو اور ہزاروں دوسرے درندے، پرندے اور کیڑے مکوڑے بھی آزار دہندہ ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی انسان یا دوسرے جانداروں پر بے سبب قہر و غضب نہیں ڈھاتا بلکہ بحالتِ مجبوری کبھی اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے تو کبھی اپنی مدافعت کے طور پر ایذا رسانی کرتا ہے ۔ کبھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آتا کہ کسی شیر نے بہت سے ہرنوں کو مار کر آئندہ کے لیے اپنی خوراک کا ذخیرہ کیا ہو ۔ کئی کئی دن کی فاقہ کشی کے بعد وہ ایک جانور کا شکار کرتا ہے اور جب تک اُسے ہضم نہیں کر لیتا کسی دوسرے جانور کو نقصان نہیں پہنچاتا ۔ کوئی ہاتھی کسی چیتے کو جیتے جی اس لیے نہیں روندتا کہ وہ اس کی طرح سبزی خور نہیں گوشت خور ہے ۔ اپنی ہیبت اور دبدبے کا اظہار کرنے کے لیے آج تک کسی بھیڑیے نے دوسرے جانوروں کی کھوپڑیوں کا مینار نہیں تعمیر کیا ۔ کبھی ریچھوں نے ہرنیوں کی اجتماعی آبرو ریزی نہیں کی حالانکہ ان کے جسموں پر ریچھوں جیسے سیاہ اور لمبے بال نہیں ہوتے ۔ جلتے ہوئے جنگل کا سہانا سماں دیکھ کر کوئی شاہین چین کی بنسری اس لیے نہیں بجاتا کہ آگ اس کے چٹانی بسیرے تک نہیں پہنچ سکتی ۔ ناگ کوڑیالے سانپ کے بچوں کو نیزوں پر کبھی نہیں اُچھالتا کہ وہ دھبّے دار کیوں ہیں سیاہ کیوں نہیں ۔ گھڑیال خواہ اپنے قبیلے کا سردار کیوں نہ ہو، اپنی لال کنور کو تماشہ دکھانے کے لیے سیکڑوں مسافروں سے بھری کشتیاں نہیں ڈبوتا ۔ گِدھ کسی تالاب میں زہر اس خیال سے نہیں ملاتے کہ مرنے والی مچھلیاں ان کے کام آئیں گی ۔ ایسی ان گنت کار پردازیوں کا شرف تو صرف اور صرف ہمارے اشرف المخلوقات کو حاصل ہے جو کبھی مذہب، کبھی قوم اور کبھی ملک کے نام پر خون کے دریا بہا دیتا ہے تو کبھی زبان، کبھی نظریے اور کبھی تہذیب کے اختلاف پر برہم ہو کر دوسرے انسانوں کی جان کا دشمن بن جاتا ہے ۔ کبھی اپنے چھوٹے سے مفاد کی خاطر لاکھوں دوسرے ہم جنسوں کا جینا دوبھر کر دیتا ہے اور اکثر محض تفریح کے طور پر اپنے بھائیوں کے گلے کاٹتا اور خوش ہوتا ہے ۔ انسان پر انسان کے ظلم و ستم کا یہ سلسلہ روزِ ازل سے تا حال جاری ہے، ہابیل اور قابیل سے صدام حسین اور بُش تک انسانوں کی مجبوری اور قہاری کی لاکھوں داستانیں پھیلی ہوئی ہیں ۔ نمرود، فرعون، شدّاد، بروٹس، نیرو، کنس، دُریودھن، راون، یزید، ابو جہل، ہندہ، کیکئی، جعفر، صادق، ڈائر، چنگیز، ہلاکو، تیمور، نادر شاہ، ہٹلر جیسے ایک دو نہیں لاکھوں نام تاریخ کے سینے پر خون اور بارود سے لکھے ہوئے ہیں اور یہ سب جانور نہیں انسان ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے ۔

حضرات ! خالقِ اکبر نے جب سے کُن ، ارشاد فرمایا ہے نسل در نسل انسانوں کی پیدائش اور افزائش کا سلسلہ جاری

ہے لیکن خُدائے سخن میر فرماتے ہیں :

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

یعنی ان کے نزدیک خود کو انسان کہنے والے سبھی لوگ انسان نہیں ہیں بلکہ یہ جنس کمیاب ہے۔ غالب نے اسی اینٹ پر اینٹ رکھ کر نکتے کی وضاحت کی :

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

میر و غالب تو بہت بعد کے لوگ ہیں عہدِ قدیم سے عام انسانوں میں کچھ ایسے بھی لوگ نظر آتے ہیں جن کا خیال تھا کہ ہر آدمی انسان نہیں ہوتا۔ صرف انھیں کو انسان سمجھنا چاہیئے جو کُل بنی نوعِ انسان کو اپنے برابر کا درجہ دیں۔ دوسروں سے محبّت کریں، سب کے کام آئیں اور واقعی انسانیت کی اعلیٰ صفات سے متصف ہوں۔ آدمی اور انسان میں تمیز کرنے والے اپنے اپنے عہد کے ان دانشوروں میں پیر، پیغمبر، رِشی، اوتار، سنت، صوفی، صحافی، شاعر، ادیب، مصوّر، نقاش، فلسفی، استاد، عالم اور رہبر بھی شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے بھانپ لیا تھا کہ آدمی کی فطرت میں خون آشامی کے اُبھرے ہوئے جذبے کے ساتھ ایثار، محبّت اور ہمدردی جیسے دوسرے نرم و نازک جذبات بھی شامل ہیں۔ اُس کے ناخن اور دانت تو اُدھر سے بھی نظر آتے ہیں لیکن اس کے سینے میں دل اور سر میں دماغ بھی ہے جسے راہِ راست پر لائے بغیر یہ دنیا جہنم زار بنی رہے گی۔ قدرت نے دانشور طبقے کو گہری اور دوررس نگاہ کے ساتھ حساس دل، روشن دماغ اور اپنے افکار و جذبات کے مناسب اظہار کی صلاحیت عطا فرمائی تھی چنانچہ ان لوگوں نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں لوگوں کو مختلف طریقوں سے سمجھایا کہ دنیا کا کاروبار اسی صورت میں جاری رہ سکتا ہے جب ہم 'جیو اور جینے دو' کے اصول پر کاربند ہوں۔ اپنے آرام و آسائش کے ساتھ دوسروں کے جذبات اور ضروریات کا بھی لحاظ رکھیں، صرف اپنی رائے کو ہی مقدم نہ جانیں بلکہ دوسروں کی بات بھی کھلے دل سے سنیں اور سچ ہو تو تسلیم کریں وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

لوگوں میں مساوات، وسیع النظری، بقائے باہم، اشتراکِ عمل، بلندیٔ اخلاق اور روشن خیالی جیسے اوصافِ حمیدہ پیدا کرنے کے لیے مختلف دانشوروں نے مختلف حربے استعمال کیے۔ کہیں مذہب کے سہارے دوزخ، جنّت، عقبیٰ، سورگ، نرک، پرلوک وغیرہ میں جزا و سزا کی لالچ یا خوف سے آدمی کو انسان بنانے کی کوشش کی گئی تو کہیں نیک نامی، مقبولیت اور شہرت کی خوبصورت تصویریں دکھا کر اُسے صالح اعمال کی طرف مائل کیا گیا۔ کبھی قانون نے خونخواری کو بیڑیاں پہنائیں تو کبھی تعلیم و تربیت نے شخصیتوں کو تراشا خراشا۔ قائدوں نے ملک و ملت کے نام پر بے لوثی اور قربانی کے جذبات اُبھارے تو موسیقاروں، رقاصوں، مجسمہ سازوں، مصوّروں، شاعروں اور ادیبوں نے سبق دیا کہ رنگ و نسل، علاقے اور زبان سے بلند درجہ انسانیت کا ہے۔ تمام مذاہب در اصل خدا تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں اور انسان کی انسان سے محبّت ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ دنیا میں دانشوری اور بربریت کی کشمکش مسلسل جاری ہے کیونکہ ظالم و جابر لوگوں کی کسی بھی دَور میں کمی نہیں رہی اور وہ دانشوروں کو اپنے اقتدار کی راہ کا روڑا سمجھتے آئے ہیں۔ اگر دانشوری آڑے نہ آئے تو طاقت اور جبر کے سہارے مظلوموں پر بآسانی حکومت کی جا سکتی ہے۔

حضرات! میری ناقص رائے میں ہمارے دَور کا المیہ یہ ہے کہ بربریت اور دانشوری کی کشمکش میں اوّل الذکر کا پلّہ اب بھاری پڑتا نظر آتا ہے چونکہ میرا تعلق ادب، خصوصاً اردو ادب کی تخلیق و تدریس سے ہے اس لیے دانشوری کے دوسرے شعبوں کی بہ نسبت مثالیں شعر و ادب سے ہی پیش کر سکوں گا۔ ادب عوام کو متاثر کرنے کا موثر ترین حربہ ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ شاعر اور ادیب اگر سچا ادب تخلیق کر رہے ہوں اور اس کی مناسب ترویج و اشاعت بھی ہو رہی ہو تو معاشرے میں تشدّد کا رجحان پنپ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر اس کی صحیح معنوں میں تدریس ہو تو آئندہ نسل میں سچے انسان ہی معاشرے کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔ تلسی کو پڑھ کر کون چاہے گا کہ شر کا ساتھ دے اور راون کی طرح تباہ و برباد ہو۔ کبیر کو پڑھنے کے بعد آدمی کوتاہ نظر ہو ہی نہیں سکتا۔ میر کو پڑھ کر جو سیادت پر فخر کرتے

غزلیں

راستے جب زیست کے دشوار ہو کے رہ گئے
تیز رو جو تھے سبک رفتار ہو کے رہ گئے

ان کے دامن میں نہ پہونچے گر کے میری آنکھ سے
ہائے سب آنسو مرے بیکار ہو کے رہ گئے

رہبروں کی کیا خطا ہے منزلوں کا کیا قصور
ہم خود اپنی راہ میں دیوار ہو کے رہ گئے

دیکھتے ہی دیکھتے ایسی بہار آئی کہ بس
پھول جتنے تھے چمن میں خار ہو کے رہ گئے

کون سا یہ وقت آیا ہے مرے پروردگار
خون کے رشتے بھی دل آزار ہو کے رہ گئے

اب کسے جا کے سنائیں اپنے دردِ دل کا حال
شہرِ چارہ گر میں ہم بیمار ہو کے رہ گئے

اس طرح بدلا ہوائے وقت نے اپنا مزاج
ہم غبارِ کوچہ و بازار ہو کے رہ گئے

میرے فن کی قدر و قیمت جو نہیں سمجھے کمال
ان کو بھی از بر مرے اشعار ہو کے رہ گئے

کمال لکھنوی
۱۱۰، بنیا گھاسی ۔ وزیر گنج لکھنؤ

میرا اپنے آپ سے بھی فاصلہ ہو جائے گا
کیا خبر تھی یوں بھی اپنا سامنا ہو جائے گا

اپنے دل کا درد مجھ کو سونپ کر دیکھے کوئی
اس طرح اپناؤں گا کہ وہ مرا ہو جائے گا

سوچتا کوئی نہیں کیوں دھند ہے ماحول میں
سب یہی کہتے ہیں کوئی حادثہ ہو جائے گا

اس قدر کیوں ہو پریشاں اے مرے چارہ گرو
کب ہرا تھا زخم دل جو پھر ہرا ہو جائے گا

رنگ لائے گی مرے ہر قطرۂ خوں کی بہار
دستِ قاتل ایک دن دستِ دعا ہو جائے گا

کیا خبر یہ تھی وہ رکھتا ہے ہواؤں کا مزاج
اک ذرا سی بات پر مجھ سے خفا ہو جائے گا

آؤ وہ خط ہی پڑھیں اس نے جو بھیجے تھے کبھی
رات کٹنے کا کوئی تو سلسلہ ہو جائے گا

ٹوٹ کر ملتے رہو احباب سے شبنم یہاں
کون کس کے بیچ سے کب لاپتہ ہو جائے گا

شبنم نقوی
۱۸۷ ۔ ہمت گنج، الہ آباد

اکبر حیدری کشمیری
معرفت راج پارک ریو ہوٹل۔ امین آباد، لکھنؤ

اقبال کی نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" کی شانِ نزول

(الہلال کے آئینے میں)

اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ نے اپنی چند خامیوں کے باوجود "الہلال" کی جدید اشاعت سے ایک ایسا شاندار کارنامہ انجام دیا ہے جسے فخر کے ساتھ دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔

اکادمی نے الہلال اور البلاغ کے تمام شماروں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ان شماروں کی تعداد ۱۴۶ اور قیمت چھ سو روپے ہے۔ "الہلال" کی تینوں جلدوں میں بعض مضمون کی عبارتیں ہلکی روشنائی میں اتر آئی ہیں اور بعض پریس میں اس قدر چپک گئے ہیں کہ عبارتیں محو ہو چکی ہیں۔ گو کہ یہ خامیاں معمولی ہیں پھر بھی ان کو دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی۔

اتر پردیش اردو اکادمی اگر ہفتہ وار اخبار "پیغام" کو بھی اسی طرح از سر نو شائع کرتی تو سونے پر سہاگہ ہوتا اور "الہلال" کی چوتھی جلد (آٹھ حصے) کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ یوں تو پیغام کے ایڈیٹر آزاد کے دیرینہ دوست عبدالرزاق ملیح آبادی تھے، لیکن اصل میں یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی نگرانی ہی میں شائع ہوتا تھا، اس کا حجم بھی الہلال جیسا تھا اور یہ بھی اردو ٹائپ میں کلکتہ سے شائع ہوتا تھا اس کی ضخامت ۱۶ صفحات تھی۔

پیغام ۲۳ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو جاری ہوا تھا۔ اس کا آخری شمارہ نمبر ۱۳ جلد ۱ جمعہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء کا تھا۔ میری نظر سے اس کے سبھی شمارے گزرے ہیں۔ کاش آزاد کے ابتدائی اخبار "صدق اللسان" کی دستیابی کے لیے بھی کوشش کی جاتی۔ اس کے اشتہار دکن ریویو اور تالیف و اشاعت لاہور کے ۱۹۰۴ء کے پرچوں میں موجود ہیں۔ یہ اخبار اب عنقا ہو گیا ہے۔

آزاد کو ابتدائے عمر ہی سے صحافت کا شوق ہو گیا تھا۔ ابھی وہ سن بلوغ کو نہیں پہونچے تھے کہ ۱۹۰۰ء میں ایک مصری اخبار "مصباح الشرق" کی رعایت سے اخبار "المصباح" کے ایڈیٹر ہوئے۔ پہلا شمارہ "عید نمبر" نکالا۔ اس کا افتتاحیہ اتنا پسند کیا گیا کہ اسے کئی اخباروں نے جن میں مولوی محبوب عالم کا پیسہ اخبار لاہور بھی تھا، فخر کے ساتھ دوبارہ شائع کیا۔ کچھ عرصے کے بعد کلکتہ میں ہی ہفت روزہ "احسن الاخبار" کی ترتیب میں بہت عمل دخل ہو گیا۔ اس کے مالک مطبع مصطفائی کے عبدالغفار تھے۔ یہ اخبار زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ اس کے بعد "تحفہ محمدیہ"، "لسان الصدق"، "الندوہ"، "خدنگ نظر لکھنؤ"، "وکیل" امرتسر اور "دارالسلطنت" کلکتہ، ان کی ادارت میں نکلتے رہے۔ آخر کار ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو مشہور زمانہ اخبار "الہلال" ہفت روزہ کلکتہ سے جاری کیا۔

یوں تو بظاہر یہ اخبار لگتا ہے لیکن در اصل ایک علمی و ادبی رسالہ ہر جو اُردو ٹائپ میں $\frac{20\times30}{4}$ سائز پر سولہ صفحات میں نکلتا تھا۔ سرورق اور اشتہارات کے صفحے اس پر مستزاد، ہر شمارے میں رنگین تصویریں بھی چھپتی تھیں۔ یہ زیادہ تر طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں سے متعلق ہوتی تھیں مولانا آزاد مصر، ترکی، طرابلس اور دیگر عرب ممالک سے مشہور اخبار منگواتے تھے اور متعلقہ مواد کا اُردو ترجمہ الہلال میں شائع کرتے تھے میرے خیال میں یہ اخبار جنگ طرابلس کے پس منظر میں جاری ہوا تھا۔ ابتدا ہی سے اس میں "نامودان غزوۂ طرابلس" اور "کامزار طرابلس" کے مضامین نیز مجاہدین کے حالات مع تصاویر شائع ہوتے رہے۔

مجاہدین میں ذیل کے افراد قابل ذکر ہیں :

فاطمہ بنت عبداللہ (یازدہ سالہ) فرہاد بک ، ڈاکٹر کریم شباتی بک ، فتحی بک ، احمد خیری بک ، مولائے حفیظ ، کمانڈر موسیٰ بک ، میجر محمد نوری بک ، احمد علمی بک ، غازی انور بک ، خلیک بک ، ادہم پاشا ، ابراہیم ثریا بک ، حضور پاشا ، علی نظمی آفندی (پانزدہ سالہ) .

مولانا آزاد الہلال مطبوعہ ۴ ، ۱۱ مارچ ۱۹۱۴ء ۱۹ اور ۲۶ مئی ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۷ میں ، ناموروانِ غزوۂ بلقان ، چند قطراتِ اشک ، شہدائے طرابلس ، میں لکھتے ہیں :—

" آج میں ایک ضرورت سے الہلال کی پہلی جلد کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ متعدد صفحات پر ناموران غزوۂ طرابلس " کا عنوان نظر آیا اور اپنی گزری ہوئی صحبت ماتم کی خوں نابہ فشانیاں ایک ایک کرکے سامنے آگئیں .

ع حلقۂ ماتم زدن شیون ہم داشتن

الہلال کی پہلی جلد میں یہ باب تقریباً ہر نمبر میں ہوتا تھا . اس کے نیچے عموماً ان جاں فروشانِ ملت اور مجاہدین حق کے غزواتِ مقدسہ کی سرگزشتیں ایک مخصوص انداز میں بیان کی جاتی تھیں ، جنھوں نے غزوۂ طرابلس کے دوران اپنی جان و مال اور محبوبات و مطلوبات کا تحفہ اپنے خدائے قدوس کے حضور میں پیش کیا . وہ خدائے نیرنگ کار و کرشمہ ساز جس کی بارگاہ محبت میں خونِ شہادت کی روانی اور جسم خونچکاں کی تڑپ اور بے قراری سے بڑھ کر اور کوئی تحفہ مقبول نہیں کہ ؎

کو زخم عاشقانہ کہ در جلوہ گاہِ حسن
صد چاک دل بتازگی ہے رفو کنند

جنگِ طرابلس کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایسی حالت اور ایسے لوگوں کے ساتھ شروع ہوئی جو باقاعدہ فوجوں اور منظم سامان جنگ سے بالکل محروم تھے اور معدودے چند ترکوں کے سوا کوئی جماعت وہاں ایسی نہ تھی جس پر سلطنت کے عسکر و سپاہ ہونے کا اطلاق ہو سکے . پھر جنگ کی ابتداء ایک ایسے ظلم صریح اور وحشیانہ اقدام سے کی گئی جس کی نظیر ملکوں اور بادشاہوں کی پرانی وحشیانہ لڑائیوں کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی اور گو یورپ کا ہر حملہ اور قبضہ جو مشرق سے تعلق رکھتا ہے ظلم و وحشت کی مثالوں سے لبریز ہوتا ہے . تاہم اٹلی نے جو خوفناک درندگی اور بہیمیت اس موقع پر اختیار کی تھی وہ مشرق اور مغرب کے تعلقات کی جدید تاریخ میں بھی ہمیشہ بے نظیر یقین کی جائے گی . ان اسباب نے اس جنگ کی حالت یکایک منقلب کر دی اور اس کو بادشاہوں اور ملکوں کی ان لڑائیوں سے بالکل الگ کر دیا جن میں بیش بہا قرار تنخواہیں لینے والے جنرل اور تنخواہوں کے ذریعہ طیار (تیار) کی ہوئی فوجیں حریف کے مقابلے میں بڑھتی ہیں .

دشمن نے ساحل پر قبضہ کر لیا تھا اور خشکی کا دروازہ گو دشمن کے قبضے میں نہ تھا مگر دشمن کے ایک ایسے حامی کے زیر تسلط تھا جو پس پردہ رہ کر تماشا دیکھنا چاہتا تھا پس نہ تو فوج باہر سے آسکتی تھی اور نہ ہی سامانِ جنگ میسر آسکتا تھا . یہ ممکن تھا کہ ایسی حالت میں کوئی نئی فوج بھرتی کی جاتی اور اسی کو تعلیم دے کر جنگ میں بھیجا جاتا . مگر اس کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی اور سونے کے سکے ریگستان کے ذروں میں نہیں بن سکتے تھے .

اس واقعۂ طرابلس کی یہی خصوصیت ہے جس نے اسے قرون اخیرہ کی تمام جنگوں سے الگ کر دیا ہے . اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اشاعت سے " الہلال " نے اس واقعہ کو عام لفظ جنگ سے نہیں بلکہ " غزوہ " کی اصطلاح مخصوص سے تعبیر کیا اور ہمیشہ حفظ ملک و دیانت کا ایک مقدس جہاد قرار دیا . غالباً تمام عالم مطبوعات میں الہلال ہی ایک ایسا رسالہ ہے جس نے اس حیثیت سے اس واقعہ پر نظر ڈالی ہے "

مولانا آزاد نے طرابلس کے خونچکاں واقعہ کی المناک تصویر الہلال مطبوعہ

۱۴ نومبر ۱۹۱۲ء صد۱۳ تا صد۱۵ میں طرابلس کے ایک صحافی ڈاکٹر اسمٰعیل شباتی بک کے حوالے سے کھینچی ہے۔ اخبار کے صد۱۳ میں دو تصویریں اوپر نیچے ہیں۔ اوپر کی تصویر ایک "یازدہ سالہ مجاہد عثمانی الشہید فی سبیل اللہ علی نظمی بے" کی ہے۔ نیچے والی تصویر ایک "یازدہ سالہ مجاہدۂ عربیہ السید فاطمہ بنت عبداللہ" کی ہے۔ علی نظمی کی تصویر کے اوپر قرآن مجید کی دو آیتیں اور فاطمہ بنتِ عبداللہ کی تصویر کے اوپر ایک آیت درج ہے۔

اس کے بعد "نامورانِ غزوۂ طرابلس" کے تحت فاطمہ بنتِ عبداللہ پر ذیل کا دل خراش اور نادر و نایاب مضمون درج ہے۔ مولانا آزاد کا طرزِ اسلوب قابلِ غور ہے۔ سادگی اور فصاحت بھی لاجواب: ——

"چند دل کے ٹکڑے ہیں جن کو صفحوں پر بچھانا چاہتا ہوں۔ کیونکر بچھاؤں۔ چند آنسو ہیں جن کو کاغذ پر پھیلانا چاہتا ہوں۔ کیونکر پھیلاؤں؟ آہ لفظوں کو کہاں سے لاؤں، جو دلوں میں ناسور پیدا کر دیں؟ — آہ! اپنے دل کے زخموں کو کیونکر دکھاؤں کہ اوروں کے دل بھی زخمی ہو جائیں؟ پتھر میں سوراخ ہو جاتا ہے مگر جب دل پتھر کے بن جاتے ہیں تو ان کا پگھلنا محال ہے اور کائنات انسانیت میں جتنی زندگی ہے دل کے ناسوروں اور جگر کے زخموں ہی کے دم سے ہے۔ جب تک دل زخمی ہیں، روح تندرست ہے لیکن جس دن دلوں کے زخم بھر گئے اس دن یقین کیجیے کہ آپ زندگی سے خالی بھی ہو گئے —— آج کے نمبر کے ساتھ ایک خاص صفحہ تصویر کا شائع کیا جاتا ہے۔ مگر میں آنکھوں کا طالب نہیں ہوں جو اس کو دیکھیں، دل کا طالب ہوں جو اس کو پڑھیں۔ پھر کوئی ہے جو اپنے پہلو میں دل رکھتا ہو؟ غزوۂ طرابلس کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ صدیوں کے بعد اس کے صدرِ اوّل اسلام کے غزوات و مجاہدات کے واقعات زندہ کر دیئے اور مدتوں کے بعد عربِ بادیہ کو موقع ملا کہ ان کے اصلی جوہر نمایاں ہوں۔ بدر اور اُحد کے واقعات میں ہم پڑھتے تھے کہ ایسی عورتیں تھیں جو اپنے آٹھ آٹھ لڑکوں کو اللہ کی راہ میں زخمی کرا کے پھر خود بھی زخمی ہو جاتی تھیں مگر اپنے جسم کو ان کے سامنے ڈھال کی طرح رکھتی تھیں، یہ ہم پڑھتے تھے، مگر جنگِ طرابلس نے تمام واقعات دُہرا دیئے۔

عربی جنگ کی پہلی خصوصیت عورتوں کی شرکت ہے غزوۂ طرابلس کے لئے جب اطراف و جوانب اور اندرونِ صحرا سے قبائل جمع ہونے لگے تو ہر قبیلے کے ہمراہ اس کا پورا خاندان تھا، ان میں ہر طرح کی عورتیں ہوتی تھیں جن کے جسم کے قویٰ جواب دے چکے تھے۔ بہت سی عورتیں ایسی بھی ہوتی تھیں کہ ان کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور وہ ان کو الگ نہیں کر سکتی تھیں۔ ہم نے وہ تصویریں بھی دیکھی ہیں جن میں کسی عورت نے ایک طرف تو گود میں بچہ اٹھا لیا ہے اور دوسری جانب پانی کی مشک ہے۔ اسی حالت میں میدانِ جہاد کے زخمیوں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں۔ جن قبائل نے سب سے زیادہ جنگ میں حصہ لیا، ان میں ایک مشہور قبیلہ (قبیلۃ البراعصہ) تھا جو کثرتِ نفوس اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے اندرونِ طرابلس کا سب سے بڑا قبیلہ سمجھا جاتا ہے۔

اس قبیلے کا سردار (شیخ عبداللہ) تھا، جس کو عرب اپنی بول چال کے قاعدۂ تخفیف سے عبداہ پکارا کرتے ہیں اس مجاہدِ غیور نے آغازِ جنگ سے خالصاً لوجہ اللہ جو عظیم الشان خدمات انجام دیں ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ جنگ کے تمام افسر اس بارے میں متفق اللسان ہیں کہ اگر شیخ عبداللہ کے جاں فروشانہ عزائم اوّل کالمہ میں ساتھ نہ دیتے تو بعد کی کامیابیاں ہرگز حاصل نہ ہو سکتیں۔ مختصر یہ کہ اس فدائے اسلام نے اپنے

قبیلے کو اُبھارا۔ اطراف و نواح کے دوسرے قبائل کو آمادۂ جہاد کیا، اپنا تمام مال و متاع ترک افسروں کے سپرد کر دیا۔ تمام عربوں کو بطور نفقۂ جنگ کے روزینہ دیا جاتا تھا۔ اس کے لینے سے بھی اس نے انکار کر دیا پھر اپنے خاندان کے تمام مردوں اور عورتوں کو لا کر دشمنانِ اسلام کے آلاتِ جہنمی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ ان کو کٹوایا اور آخر میں خود بھی ان کی رفاقت میں روانہ ہو گیا۔ خدائے بے نیاز نے اپنی محبت کی پہلی شرطیہ قرار دی تھی کہ ؎ ——

" تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس کی راہ میں ان چیزوں کو نہ لُٹا دو جو تم کو محبوب و مطلوب ہیں" کیونکہ ایک دل میں محبت کے دو آشیانے نہیں بن سکتے۔ انسان کی دنیوی محبوبات میں مال و متاع اہل و عیال اور پھر نفس و جان یہی تین چیزیں وہ سب سے زیادہ بوجھل زنجیریں ہیں جو اس راہ میں پاؤں سے ملنے نہیں دیتیں۔ اس فانی فی اللہ عاشق صادق نے ایک ہی وقت میں ان تینوں منزلوں کو سر کر لیا۔ سب سے پہلے مال و متاع کو اس کی راہ میں لُٹایا، پھر اپنے عزیزوں کو آخر میں جان رہ گئی تھی۔ یہ بھی جان آفریں کے سپرد کر دی ——

اس کا تمام خاندان مصروف پیکار و خدماتِ جہاد تھا لیکن اولاد میں سے صرف ایک گیارہ برس کی لڑکی فاطمہ تھی جس کی محویت و استغراق کو دیکھ کر تمام ترک افسر اور سپاہی جبل ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر اسماعیل تباتی بک جنھوں نے اس کی تصویر اتاری تھی لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے میں نے اس معصوم انسان کو اس وقت دیکھا جب میں پہلی مرتبہ اپنی جماعت لے کر عزیزیہ سے زوارہ آیا تھا۔ عورتوں اور لڑکیوں کے لشکر میں کمی نہ تھی، کیونکہ ہر عرب مع اپنے پورے خاندان کے شریکِ جہاد ہوا تھا لیکن چند مخصوص باتیں فاطمہ میں ایسی نظر آتی تھیں جن کی وجہ سے وہ ہزارہا مردوں اور عورتوں میں بھی پہچان لی جاتی تھیں۔ اول تو اس کی عمر بہت چھوٹی تھی زیادہ سے زیادہ گیارہ برس کی ہوگی۔ دوسرے اس کو جنگ اور جنگ کے زخمیوں سے کچھ ایسا انس ہو گیا تھا کہ سخت سے سخت معرکوں میں بھی اس کی سابقت اور پیش قدمی کو ہر سپاہی محسوس کرتا تھا۔ جنگ خواہ حملے کی ہو، خواہ مدافعت کی، ساحلی بیڑے سے توپوں کی بارش ہو رہی ہو، یا تلواروں اور سنگینوں کے سامنے صفیں ہوں مگر زخمی مسلمان کی آہ اس کے لیے ایسی کشش تھی جس کو سن لینے کے بعد محال ہو جاتا تھا کہ اس کی چھوٹی سی مشک اپنے فرض کو بھول جائے۔ وہ کم سن تھی لیکن اس کے اندر ایک کہن سال عشق موجود تھا۔ یہ عشق لہو و لعب یا تمتعاتِ حیات کا نہ تھا۔ لیکن خون، زخم اور کٹی ہوئی انسانی رگوں کا۔ جہاں کہیں یہ چیزیں موجود ہوتیں وہ ایک بار رفتار ہرنی کی سستدی، مگر فرشتۂ عشق کے پروں پر اُڑتی ہوئی پہونچ جاتی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ بارود کے دھوئیں سے تمام فضا تاریک ہو رہی ہے، کانوں کے پردے توپوں کی سامعہ شکن صداؤں سے پھٹے رہے ہیں، گولوں کے پھٹنے سے ایک عارضی روشنی نمودار ہو جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی انسانی احتضار کی چیخیں، پچھلی مہیب گرجوں کے ساتھ مل کر ایک عجیب وحشت انگیز ہنگامہ برپا کر دیتی ہیں۔ ایسے جگر پاش اور زہرہ گداز عالم میں وہ معصوم ہرنی (مجھے اچھی طرح یاد ہے) اپنا اونچا کرتا پہنے ہرے اور پھٹی ہوئی خمار کمر کے گرد لپیٹے ہوئے اس طرح دوڑ رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا مظلوم و محتاج زخمیوں کی خبر گیری کیلئے کوئی فرشتۂ ربانی آسمان سے اُتر آیا ہے اور اللہ نے ہوا اور زمین کو اس کا تابع کر دیا ہے کہ وہ اٹھائے رہے اور یہ لپٹتی جائے۔ سامنے سے گولوں کی لگاتار بارش

ہو رہی تھی مگر یہ اس بارش پر تیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ انسانی لاشیں ایک کے اوپر ایک گر رہی تھیں مگر ہر نئی لاش کے گرنے کی آواز خوف کی جگہ اس میں قوت کی نئی لہر پیدا کر دیتی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر میں بے اختیار ہو گیا۔ کچھ بعید نہیں کہ ایسے خطرناک اور یکسر موت و ہلاکت کے عالم میں یہ برق وش چہرہ ہمیشہ کے لئے نظروں سے چھپ جائے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب کی مرتبہ اگر وہ نمودار ہوئی تو کسی نہ کسی طرح پکڑ لوں گا اور سمجھاؤں گا کہ موت کی اس درجہ آرزو مند کیوں ہو گئی ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹا سا سایہ قریب سے گزرا میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ـــ

"کیا تجھے نہیں معلوم کہ تو اپنے باپ کی ایک ہی بیٹی ہے؟"

"چھوڑ دو۔ کیا تم بھول گئے کہ اسلام اور وطن کے کتنے فرزند یہاں پیاسے دم توڑ رہے ہیں۔؟"

یہ کہا اور نظروں سے غائب ہو گئی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ مجھ کو سرخ رنگ سے عشق ہے ـــ آہ! یہی رنگ ایک دن اس کی گردن اور دل کے نیچے سے بہتا ہوا دیکھا۔"

۱۲ رجب ۱۳۳۰ھ (مطابق مئی ۱۹۱۲ء) کو زوارہ میں اطالیوں نے دو ماہ کی مسلسل تیاریوں کے بعد ایک بڑا حملہ کیا تھا۔ عربوں نے بھی جو عرصے کی بےکاری سے گھبرا اٹھے تھے، بھوکے شیر کی طرح تڑپ کر ان کا استقبال کیا۔ روما سے جو خبر بعد کو شہر کی گئی تھی اس میں اطالیوں کی تعداد چھ ہزار بتلائی گئی تھی۔ مگر دراصل بارہ ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ عربوں اور ترکوں کی متحدہ فوج کی تعداد زیادہ سے زیادہ تین ہزار تھی۔ یہ لڑائی دن بھر جاری رہی اور عصر کے وقت تک ۱۲۰۰ لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر اپنی عادت مستمرۂ جنگ کے مطابق اطالیوں نے ساحل کا رخ کیا۔

عین دوپہر کا وقت تھا۔ اٹالین توپ خانہ دونوں جانبوں سے آگ برسا رہا تھا۔ دس ہزار بندوقوں کے چھوٹنے کی آواز ایک ہی وقت کڑک رہی تھی۔ تمام ریگستان میں موت اور ہلاکت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس وقت اس بہشت زار شہادت کی حور عین فاطمہ کہاں ہے؟ وہ بدستور اپنے ایک ہی کام میں مشغول ہے۔ اس کی دائمی رفیق مشک اس کی پیٹھ پر ہے۔ دھوئیں اور تپش کی شدت سے چہرہ جھلسا ہوا ہے بالوں پر سرخی مائل ریت کی تہ جمی ہوئی ہے کپڑے اس کے محبوب "سرخ رنگ" کے دھبوں سے رنگین ہو رہے ہیں۔ اور اپنی مخصوص مجنونانہ محویت کے پروں سے فضائے جنگ میں اڑ رہی ہے۔ اس کی ماں بھی اس خدمت میں شریک ہے۔ مگر اس کا ساتھ کون دے سکتا ہے؟ اس کا باپ بھی اپنے قبیلے کے ساتھ مصروف جانبازی ہے، مگر اس کو اپنے کام کے انہماک میں اس کی یاد کی مہلت ہی کب ہے؟

عصر کا وقت جب قریب آیا تو مجاہدین آخری عزم فیصلہ کن کے ساتھ دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور لوگوں کی صفوں میں گھس کر تلواروں سے کاٹنا شروع کر دیا۔ احمد نوری یک ترکی کمان افسر نے عربوں کے ہجوم کو دیکھا تو خود ہی اپنی جماعت کے گرد دشمنوں کے شرقی توپ خانے تک بڑھتا ہوا چلا گیا توپ خانے کے پاس اطالیوں کی ایک تازہ دم جماعت موجود تھی جس نے اب تک لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا ایک چھوٹی سی جماعت دیکھ کر وہ ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور تیس ترک سپاہیوں کو چاروں طرف سے گھیر کر بندوقوں کا نشانہ بنا دینا چاہا۔ نہیں معلوم کون سا محافظ ہاتھ تھا جس نے عربی صفوں سے اس قدر دور فاطمہ کو پہونچا دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جانباز ترک تلواروں کے بےامان ہاتھ مار کر صاف نکل آئے ہیں۔ مگر چار زخمی ترک زمین پر پڑے ہوئے سسک رہے ہیں۔ نامرد اطالوی حریفوں کو روک تو نہ سکے۔ مگر اب زخمیوں کے سر و سینہ میں

سنگینیں چبھو کر اپنا غصہ نکال رہے ہیں۔ گیارہ برس کی فاطمہ دیکھتے ہی لپکی اور بغیر ان لوگوں پر نظر ڈالے ہوئے جو پاس ہی کھڑے تھے، اپنی مشک ایک زخمی کے منھ سے لگا دی پورا ایک گھونٹ بھی ابھی زخمی کے حلق سے نہیں اترا تھا کہ دو اطالیوں نے بڑھ کر گردن کے پاس سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ فاطمہ تڑپی مگر دشمن کی گرفت مضبوط تھی فوراً اس نے زخمی ترک کی پڑی ہوئی خون آلود تلوار اٹھالی اور اس زور سے ماری کہ اطالوی سپاہی کے داہنے ہاتھ کا پہنچا زخمی ہو کر لٹک گیا۔ اس نے گردن چھوڑ دی تاکہ بائیں ہاتھ سے اپنے دشمن پر حملہ کر سکے۔ ادھر بندوق چھوٹنے کی آواز آئی اور ادھر اٹالین فوج شکست کھا کر بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ عرب اور ترک سپاہی جب دشمنوں کا تعاقب کرتے ہوئے میدان جنگ سے آگے بڑھے تو انھوں نے دیکھا کہ چار زخمی ترک زمین پر پڑے ہوئے ہیں۔ پاس ہی فاطمہ کی لاش پڑی ہے مگر اس حالت میں کہ مشک کا حلقہ ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے اور مشک ایک بے ہوش ترک کے سینے پر پڑی ہے۔ شاید مرتے دم بھی زخمی ترک کو پانی پلانے کی کوشش کی تھی مگر مشک منھ تک نہیں لے جا سکی۔"

بعض لوگوں کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اقبال کا کلام "الہلال" میں چھپتا تھا۔ مجھے ان کی کوئی نظم "الہلال" کے کسی شمارہ میں نہیں ملی۔ البتہ کئی شماروں (یکم جولائی ۱۹۱۴ء ص۲۴ وغیرہ) میں فہرست کتب کے تحت ان کے "مجموعہ کلام" کا بھی ذکر موجود ہے جو (اقبال کی مختلف نظمیں) ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا اور جس کی قیمت آٹھ آنے تھی۔ اس کے علاوہ ۱۵ جولائی ۱۹۱۴ء کے شمارے میں منقول پر اقبال نے مینیجر دی مینوفیکچر بمبئی دہلی کو "تاج روغن و آملہ بنولہ" کے اشتہار کے لئے جو خط لکھا تھا وہ درج ہے اور یوں ہے:۔

"یہ کہہ سکتا ہوں کہ تاج کے استعمال سے دماغ کو آرام اور قلب کو راحت ملتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خوش رنگ اور مصفّا تیل ہندستان کے دل و دماغ پر حکومت کریگا۔"

الہلال کے بند ہو جانے کے بعد مولانا آزاد نے اسی اسٹائل میں اخبار "البلاغ" کلکتہ سے جاری کیا۔ اس کے اولین شمارہ مطبوعہ جمعہ ۴ محرم ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء جلد ۱ نمبر ۱ ص۱ میں "ادبیات" کے تحت اقبال کی نظم بعنوان "عرفی" سات شعر میں موجود ہے۔ بانگ درا میں نظر ثانی کے بعد شائع کی گئی ہے۔ دونوں اشاعتوں میں کہیں کہیں اختلافات بھی ہے البلاغ میں اس طرح درج ہے ؎

"نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی"

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
میسر جس سے آنکھوں کو ہراب تک رشکِ عنابی

مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بیتابی

تغیر آگیا ایسا مزاجِ اہلِ عالم میں
کہ رخصت ہوگئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی

فغانِ نیم شب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف بے خوابی

کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم کُن
نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی

"حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی"

مولانا آزاد اور اقبال کے درمیان خط و کتابت بھی تھی (اقبال نامہ جلد اول ص۱۳۲، مرتبہ شیخ عطاء اللہ) اقبال نے جب ۱۹۱۸ء میں آزاد کو "رموزِ بیخودی" کا نسخہ ڈاک سے بھیجا تو آزاد نے رسید بھیجی اور اسے پسند کیا تھا۔

مولانا آزاد جب رانچی جیل سے رہا کیے گئے تو اقبال ان کی رہائی کی خبر سُن کر بہت خوش ہوئے (اقبال نامہ ص۲۰) اس کے بعد دونوں کے درمیان اختلافات رونما ہوئے۔ اقبال ۱۰ر نومبر ۱۹۱۹ء کو سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے، مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد (اس زمانے میں الہلال اخبار اور الہلال پریس کے منیجر تھے) لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں"۔

شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ ان کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر (انگریزی و اُردو) میں موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں۔ بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا، مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا، تحریک الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے، ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام آزاد کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی، مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سُنے گئے ان میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے"۔

معلوم نہیں انھوں نے کیا سُنا تھا اور سُنی سنائی بات پر اعتبار کر کے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہوں، کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں، ورنہ یہ موخرالذکر شکایت براہ راست ان سے کرتا۔ اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہونچا دیجئے"۔

مولوی فضل الدین کے الفاظ یہ ہیں:-

"تعلیم یافتہ جماعت میں فدائے قوم مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی خان اور ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ ان دونوں اسلام پرستوں کو مذہب کی راہ اسی نے دکھائی اور بتدریج اپنے رنگ میں رنگ دیا۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سُنا ہے اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" فی الحقیقت الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں"

(تذکرہ۔ ابوالکلام آزاد۔ دیباچہ فضل الدین احمد ۱۶ر اگست ۱۹۱۹ء۔ کلکتہ)

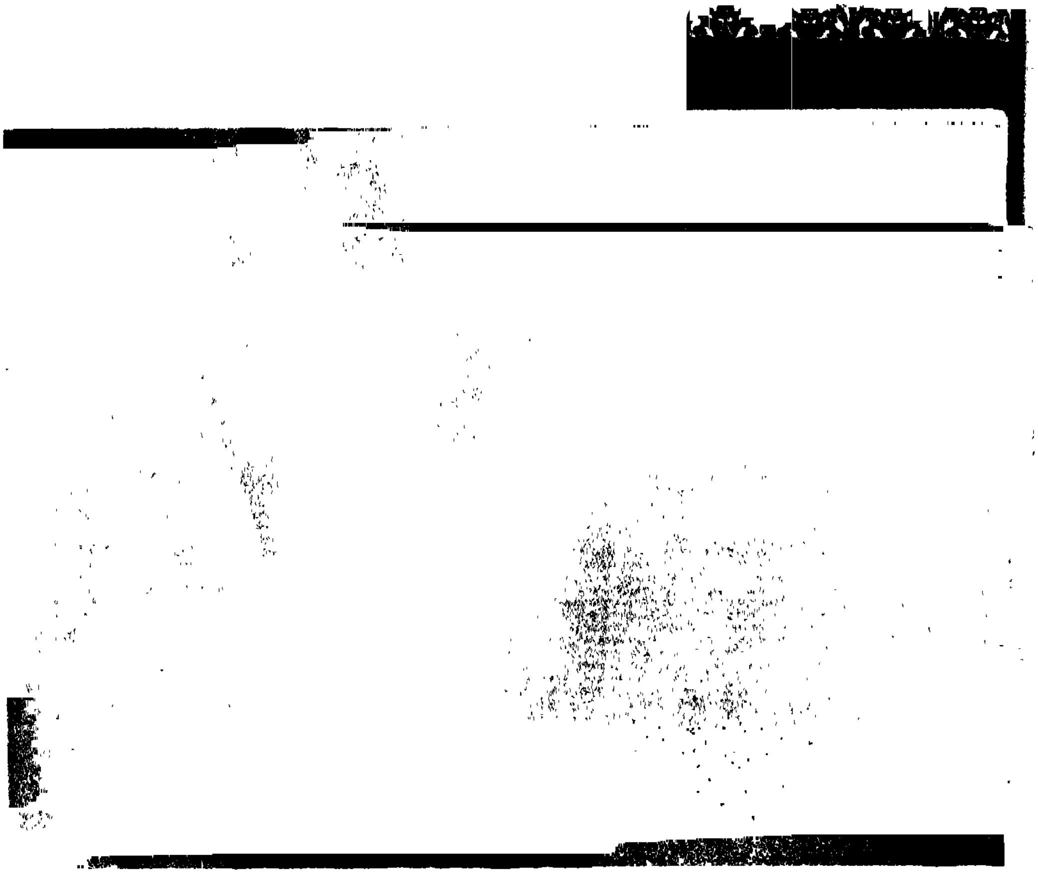
مولوی صاحب کا یہ کہنا درست نہیں معلوم ہوتا ہے کہ الہلال نے اقبال کو مذہب کی راہ دکھلائی۔ ہمارے پیش نظر اقبال کی وہ نظمیں بھی ہیں جو انھوں نے ۱۹۰۵ء یعنی یورپ جانے سے پہلے کہی تھیں ان نظموں سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال صحیح معنوں میں ایک پکے مسلمان تھے اور ان کے مذہبی عقاید نہایت پختہ اور غیر متزلزل تھے۔ صوم و صلوٰۃ اور دیگر امور شرعی کے بھی پابند تھے۔ کردار و سیرت میں رواداری کا جذبہ غالب تھا۔ پیغمبر اسلام کو ختم المرسلین اور نبی آخر الزمان دل سے تسلیم کرتے تھے۔ ان عقائد کا اظہار انھوں نے اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو۔ تصویرِ درد۔ خطِ منظوم۔ پیغام بیعت کے جواب میں۔ نالۂ یتیم۔ دردِ دل۔ فریادِ اُمت۔ برگِ گل اور سپاس جناب امیر وغیرہ کی نظموں میں کیا ہے۔ ان کے علاوہ وہ نظمیں بھی قابلِ ذکر ہیں جو یورپ کی واپسی کے بعد اور الہلال

وزیر اعلیٰ
۴ر جنوری
محکمہ اطلاعات
اتر پردیش کی
شائع کردہ
گوشہ ملیحہ
کا مجموعہ
رشید جعفری
کی رسم
انجا





گر کو
یک سیوا سنگھ
صدر
ت ترپاٹھی
ے متاثرہ
کی امداد
کے لئے
یک
ش
ے
ے



وزیر اعلا شری
کلیان سنگھ کو
اتر پردیش ونایک سیوا سنگھ
کے صدر
تری اوما کانت ترپاٹھی
سے متاثرہ



جلسہ اترپردیش نری گیان سنگھ کی صدارت میں منعقد
سے بات چیت کرتے ہوئے۔ تصویر میں مدھیہ پردیش کے





ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
(۱۰) پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
(۱۱) آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
(۱۲) دیدۂ انسان نامحرم ہے جن کی موجِ نور

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
(۱۳) جن کی ضو ناآشنا ہے قیدِ صبح و شام سے

ہے ابھی جن کے لیے رفتار کی لذت نئی
(۱۴) آسماں کا خم نیا، وسعت نئی عظمت نئی

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی نو بھی ہے
(۱۵) اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

اختلاف کے علاوہ شعر نمبر ۴، ۶ اور ۱۴ "بانگِ درا" سے حذف کیے گئے ہیں۔

جب نظم شائع ہوئی اور "ہمدرد" میں آزاد کی نظر سے گزری تو انھوں نے اس کی اشاعت پر ذیل کا تبصرہ کیا جو الہلال جلد ۳ نمبر ۲ صہ مطبوعہ ۱۶ جولائی ۱۹۱۳ء میں درج ہے:

"ہمدرد کے پہلے پرچے کا سرآغاز ڈاکٹر اقبال کی ایک موثر نظم تھی، جس میں انھوں نے ایک عرب مجاہدہ لڑکی کی شہادت کا واقعہ نظم کیا ہے قارئین الہلال کو یاد ہوگا کہ گزشتہ نومبر میں بسلسلہ نامورانِ غزوۂ طرابلس ایک مضمون الاحیآء الذین لا یموتون" کے عنوان سے الہلال میں نکلا تھا اور اس میں فاطمہ بنتِ عبداللہ" نامی ایک یازدہ سالہ مجاہدۂ عربیہ کے حالاتِ شہادت مع اس کے مرقع خونین کے شائع کیے تھے۔ اس واقعہ کو ڈاکٹر اقبال نے اس نظم میں درج کیا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے بعض زہرہ گداز و عظیم الاثر حالات جو الہلال میں لکھے گئے ہیں، ان کے متعلق احباب کرام کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے ذرائع علم اس درجہ نادر اور غیر معمولی ہیں کہ مصر و شام کے عربی اخبارات کا بھی ان پر دست رس نہیں۔ چنانچہ "فاطمہ بنت عبداللہ" کا واقعہ شہادت مصر کے تمام مشہور و غیر مشہور جرائد میں کسی اخبار کو بھی نصیب نہ ہوا۔ ترکی میں بھی صرف ایک ماہوار رسالے کو یہ حالات معلوم ہوئے تھے۔ اسی طرح اب "نامورانِ غزوۂ بلقان" کا سلسلہ بھی الہلال میں جاری رہے گا۔"

ابوالکلام آزاد کے ان خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کو اپنی نظم میں "الہلال" کا حوالہ دینا چاہیے تھا، جس طرح اقبال نے اپنی بعض دیگر نظموں کے ماخذ فراخدلی کے ساتھ درج کیے ہیں۔ اسی طرح اگر "فاطمہ بنتِ عبداللہ" کا ماخذ بھی دے دیتے تو اعتراض کی کوئی گنجائش نہ رہ جاتی۔

اس میں شک نہیں کہ آزاد اور اقبال دونوں نے اس گیارہ سالہ مجاہدۂ طرابلس کے کردار و سیرت اور اس کے جذبۂ شہادت کو موثر انداز میں ہندستانی عوام کے سامنے پیش کر کے اپنے کمالِ فن کا سکہ بٹھا دیا ہے۔

□□

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں

(۱۰) پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں

(۱۱) آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور

(۱۲) دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے

(۱۳) جن کی ضو ناآشنا ہے قیدِ صبح و شام سے

ہے ابھی جن کے لیے رفتار کی لذت نئی

(۱۴) آسماں کا نام نیا، وسعت نئی عظمت نئی

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی نو بھی ہے

(۱۵) اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

اختلافات کے علاوہ شعر نمبر ۲، ۳ اور ۱۴ بانگ درا سے حذف کیے گئے ہیں۔

جب یہ نظم شائع ہوئی اور ہمدرد میں آزاد کی نظر سے گزری تو انھوں نے اس کی اشاعت پر ذیل کا تبصرہ کیا جو الہلال جلد ۳ نمبر ۲ مطبوعہ ۲ جولائی ۱۹۱۳ء میں درج ہے:

ہمدرد کے پہلے پرچے کا آغاز ڈاکٹر اقبال کی ایک موثر نظم تھی جس میں انھوں نے ایک عرب مجاہدہ لڑکی کی شہادت کا تذکرہ کیا ہے۔ قارئین الہلال کو یاد ہوگا کہ گزشتہ نومبر میں بسلسلہ ناموران غزوۂ طرابلس ایک مضمون "احیاء الدین لا یتم الا بالدم" کے عنوان سے الہلال میں نکلا تھا اور اس میں فاطمہ بنت عبداللہ نامی ایک پاکدامن مجاہدہ کے حالات شہادت مع عکس کے درج متن کے شائع کیے گئے تھے۔ اسی واقعہ کو ڈاکٹر اقبال نے اس نظم میں درج کیا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے بعض اور دیگر اکثر مفقود الاثر حالات جو الہلال میں لکھے گئے ہیں، ان کے متعلق احباب کرام کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے ذرائع علم اس درجہ نادر اور غیر معمولی ہیں کہ مصر و شام کے عربی اخبارات تک بھی ان کی دسترس نہیں۔ چنانچہ فاطمہ بنت عبداللہ کا واقعہ شہادت مصر کے تمام مشہور و غیر مشہور جرائد میں کسی اخبار کو بھی نصیب نہ ہو۔ ترکی میں بھی صرف ایک ماہوار رسالے کو یہ حالات معلوم ہوئے تھے۔ اسی طرح اب ناموران غزوۂ بلقان کا سلسلہ بھی الہلال میں جاری رہے گا۔

ابوالکلام آزاد کے ان خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کو اپنی نظم میں الہلال کا حوالہ دینا چاہیے تھا جس طرح اقبال نے اپنی بعض دیگر نظموں کے ماخذ کا اعتراف کے ساتھ درج کیے ہیں۔ اس طرح اگر فاطمہ بنت عبداللہ کا ماخذ بھی دے دیتے تو معترض کی کوئی گنجائش نہ رہ جاتی۔

اس میں شک نہیں کہ آزاد اور اقبال دونوں نے اس گیارہ سالہ مجاہدہ طرابلس کے کردار و سیرت اور اس کے جذبۂ شہادت کو موثر انداز میں ہندوستانی عوام کے سامنے پیش کر کے اپنے کمال فن کا سکہ بٹھا دیا ہے۔

□□

اہلِ قلم حضرات نیادور کو اپنی غیر مطبوعہ اور معیاری نثری و شعری تخلیقات بغرض اشاعت روانہ کریں۔

تمام تخلیقات فل اسکیپ سائز کے کاغذ پر صاف و خوش خط اور کاغذ کے ایک ہی طرف تحریر کریں۔

ارسال کردہ تمام تخلیقات واپس کرنا ممکن نہیں ہے، لہٰذا قلمکار حضرات اپنی تخلیق کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں۔

نیادور میں شائع شدہ تخلیقات پر معاوضہ نہیں دیا جاتا ہے۔

ادارہ

غزلیں

پھر آج ہم نے یہ ذلت قبول کر لی ہے
امیرِ شہر کی دعوت قبول کر لی ہے

ہمارے قتل کا لینا تھا انتقام جسے
اسی نے خون کی قیمت وصول کر لی ہے

مری نیام سے تلوار جب بھی نکلی ہے
منافقوں نے اطاعت قبول کر لی ہے

مکان جب نہ ملا شہر میں کرائے کا
تو مسجدوں میں سکونت قبول کر لی ہے

ہمارے عہد کی سچائی لکھنے والوں نے
ضمیر بیچ کے دولت قبول کر لی ہے

رئیس انصاری
معرفت مکتبۂ دین و ادب
امین آباد
لکھنؤ

خودی ہے کیا انا ہے کیا
وہ جو بھی ہو برا ہے کیا

یہ بے لباس گفتگو!
وہ کوئی دیکھتا ہے کیا

یہ خامشی یوں ہی نہیں
کسی نے کچھ کہا ہے کیا

غزل سہی یہ زندگی
ردیف قافیہ ہے کیا

فضا فضا دھواں تو ہے
نظر نظر خلا ہے کیا

سماعتوں پہ دھند ہے
کسی نے کچھ سنا ہے کیا

روشن لال روشن بنارسی
ڈی ۴۷/۱۱۱ اے، رانا پورہ
وارانسی

زندانِ جسم لمحوں میں برباد ہو گیا
میں آج اپنی قید سے آزاد ہو گیا

تشنہ بکف تھا کون، پتہ کچھ نہ چل سکا
لیکن میں اپنے وقت کا فرہاد ہو گیا

قدرِ حیات سے وہ ہو گا آشنا
تشنہ لبی کا جس کو سبق یاد ہو گیا

رغبت نہیں تھی ذائقۂ وقت سے مجھے
بیزار مجھ سے ہی مرا ہمزاد ہو گیا

ہے سب اسی نظر کے تغیر پہ منحصر
دلشاد ہو گیا کبھی ناشاد ہو گیا

پھسلا در بہشت جہاں پے انا کا پاؤں،
اور فوت میرے ذہن کا شداد ہو گیا

موسم نگار خانۂ دل کے تھے مختلف
ہر رنگ میں ہوا کبھی بہزاد ہو گیا

لے آج میں نے چھوڑ دیا شہرِ آرزو
لے دستِ اجتناب بھی آباد ہو گیا

معراج صدیقی (کانپوری)
۱۰۳/۱۱۲، کرنیل گنج
کانپور

وقار ناصری
شیش محل ۔ حسین آباد ۔ لکھنؤ

شہر میر اور ناصر کاظمی

اُردو شاعری میں شہر کی علامت اتنی جدید نہیں جتنی وہ قدیم ہے اب یہ اور بات ہے کہ نئی شاعری نے شہر کی علامت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اور شہر کا استعمال اس بے دردی سے ہوا کہ بے چارہ شہر، شہر نہ ہو کر شہر کا قبرستان بن گیا۔ چند ایک کے سوا نئی شاعری میں کسی نے شہر کے اس داخلی کرب کو نہیں جانا جہاں شہر تھا اور شہر کے سوا، کچھ نہ تھا۔ یہ شاعری کا المیہ ہے کہ وہ علامتیں جو اپنے آپ میں تحرک اور حیرت کا باعث تھیں اور جن پر شعری محاسن کا دار و مدار تھا، ان کو برتنے والوں نے اس طرح برتا کہ وہ اپنی معنوی تہ داری اور وسعت کے باوجود اس طرح سکڑ کے رہ گئیں کہ ان کے استعمال میں وہ جہت پیدا نہ ہوسکی جو شعر کے داخلی اور خارجی رابطوں کے علاوہ شعر کو شاعری کے تلازمہ میں شعریت عطا کرتی ہے۔

شہر کی علامت جس آفاقیت کا استعارہ تھی، اس کو اسی طرح برتنے والوں میں ناخدائے سخن میرؔ اور نئی غزل کے میرؔ یعنی ناصر کاظمی کے اشعار کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ علامت کے ساتھ ساتھ لفظ و حرف کی وہ رمزیت جو اس کی حرکت اور زندگی ہے اگر اشعار میں ڈھل جائے تو وہ علامت کتنے نہاں خانوں کے در وا کر کے افق در افق پھیلتی چلی جاتی ہے۔

میرؔ کے لیے "شہر" اصل میں ایک مثبت زندگی، بہتر معاشرہ اور تہذیب و تربیت کا نام تھا۔ ان کے لیے شہر کوئی طلسمی دُنیا نہیں تھی اور نہ کوئی خواب تھا بلکہ وہ تو اس زندگی کی علامت تھا جہاں قدریں اپنے بہتر اوصاف میں سامنے ہوں۔ ان کا یہ شہر نہ صرف دنیا کے سارے شہروں اور خوش رنگ بستیوں تک محدود تھا بلکہ وہ تو ان چھوٹے چھوٹے قصبوں اور بے نام قریوں تک کو محیط تھا جہاں آدمی اور زندگی، زندگی اور آدمی بغیر کسی بغض و حسد کے، محبتوں، چاہتوں اور خوشبو سے رچی بسی فضاؤں کے درمیان سکھ اور چین کی سانس لے سکے۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ جس شہر کی جستجو میں آوارہ ہوئے، نگر نگر ناشاد پھرے وہ شہر ان کو اپنے شہر کے اُجڑنے کے بعد کہیں نہ مل سکا۔ وہ تمام عمر اس شہر کو تلاش کرتے رہے جو بے نشان ہو چکا تھا، جس کی شناخت کھو چکی تھی۔ "شہر" نے ان کو کیا کچھ دیا تھا اور وقت کے سیلاب نے ان کا کیا کچھ چھین لیا تھا، یہ تو وہی سمجھ سکتا ہے جس پر میرؔ جیسی افتاد پڑی ہو۔

میرؔ ۲۳-۱۷۲۲ء کے آس پاس پیدا ہوئے اور ۱۷۳۹ء کے بعد دلّی آئے۔ اکبرآباد (آگرہ) کی بے نام زندگی کے برخلاف میرؔ کو یہاں وہ زندگی نظر آئی جو اوراقِ مصوّر جیسی تھی۔ نادرشاہ کے قتلِ عام کے باوجود شہر، شہر تھا اور اپنی بچی کھچی سانسوں کو سمیٹ کر جینے کے عمل میں معروف تھا۔ میرؔ کے لیے دلّی، دلّی نہ ہوکر ان کا دل تھا جو اپنی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ اس زندگی کی شناخت تھا، جس کے لیے کوئی تہذیب مسلسل سفر کرتی ہے، حالانکہ ان کو اندازہ ہو چکا تھا ؎

دل و دلّی دونوں ہیں اگرچہ خراب
پہ کچھ لطف اُجڑے نگر میں بھی ہیں

وہ قدروں پر یقین کرتے رہے لیکن مرہٹوں، جاٹوں اور ابدالیوں نے دلّی ہی نہیں ان کے دل کو بھی اس بے دردی سے پامال کیا کہ ہزار ضبط کے باوجود وہ فریادی بن گئے :-

" بندہ (میرؔ) اپنی عزت تھامے شہر میں بیٹھا رہا
شام کے بعد منادی ہوئی کہ " بادشاہ " نے امان دے دی ہے

رہا کو چاہیے کہ پریشان نہ ہو۔ مگر جب گھڑی بھر رات گزری تو غارت گروں نے ظلم وستم ڈھانا شروع کیے۔ شہر کو آگ لگادی گھروں کو جلادیا اور سارا سازوسامان لے گئے۔ صبح کو جو (گویا) صبحِ قیامت تھی، تمام شاہی (درانی) فوج اور روہیلے ٹوٹ پڑے اور قتل و غارت گری میں لگ گئے۔ (شہر کے) دروازوں کو توڑ ڈالا اور لوگوں کو مقید کرلیا، بہتوں کو جلادیا اور سر کاٹ لیے، ایک عالم پر ظالم توڑے اور تین دن رات تک اس ظلم سے ہاتھ نہ کھینچا...... چھتیں توڑ دیں دیواریں ڈھادیں ...... نیا شہر جل کر سیاہ ہوگیا.
...... بارے منتظمین نے لوٹ مچانے والوں کو شہر سے نکال کر احتیاطی تدابیر شروع کیں، اب وہ بے رحم لوگ پرانے شہر کو تاراج کرنے میں لگ گئے۔ وہاں بےشمار انسانوں کو قتل کردیا۔ سات آٹھ دن تک یہ ہنگامہ رہا۔
...... ہزاروں خراب اس ہنگامے سے نکل کر بصد حسرت ترکِ وطن کر گئے اور جنگل کی طرف منہ اٹھا کر چل دیے
...... پرانے شہر کا علاقہ جسے رونق و شادابی کے باعث "جہانِ تازہ" کہتے تھے، کسی گرتی ہوئی منقش دیوار کی مانند تھا یعنی جہاں تک نظر جاتی تھی، مقتولوں کے سر، ہاتھ، پاؤں اور سینے ہی نظر آتے تھے ...... میں کہ (پہلے ہی) فقیر تھا اب اور زیادہ مفلس ہوگیا، افلاس اور تہی دستی سے حال ابتر ہوگیا، سڑک کنارے جو مکان تھا وہ بھی ڈھے کر برابر ہوگیا، غرض کہ وہ ظالم سارے شہر کا اسباب لاد کر لے گئے اور شہر کے لوگ بڑی ذلت اور رسوائی اٹھا کر جان سے گزر گئے۔"

اس تباہی اور بربادی کا جو نقشہ میر نے کھینچا ہے، کم و بیش وہی سب سودا، حاتم، مصحفی، جعفر علی حسرت اور قائم چاندپوری کے شہر آشوب میں ملتا ہے۔ ایک طرف تو مرہٹے اور جاٹ بستیوں کو اجاڑ رہے تھے، دوسری طرف ابدالیوں کے لگاتار حملے ہر اس "شے" کو تاراج کرتے جا رہے تھے جس سے "شہرِ میر" تہذیب کا نمونہ تھا: دلی پھر لٹی" کے عنوان سے میر نے لکھا ہے کہ:

"میں ایک دن ٹہلتا ہوا شہر کے تازہ ویرانوں سے گزرا، ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا، جوں جوں آگے بڑھتا، حیرت بڑھتی گئی۔ مکانوں کی شناخت نہ کرسکا آبادی کا پتہ نہ تھا، نہ عمارتوں کے آثار نہ ان کے مکینوں کی خبر... گھر کے گھر مسمار تھے اور دیواریں شکستہ ...... نہ وہ بازار تھے جن کا بیان کروں، نہ وہ بازار کے حسین لڑکے۔ اب حسن کہاں جسے تلاش کروں، وہ یارانِ عاشق مزاج کدھر گئے، پیرانِ پارسا چلے گئے، بڑے بڑے محل خراب ہوگئے۔ گلیاں ناپید ہوگئیں، ہر طرف وحشت برس رہی تھی، انس ناپید تھا...... ناگاہ اس محلے میں آنکلا جہاں میں رہتا تھا، جلسے کرتا تھا، شعر پڑھتا تھا، عاشقانہ زندگی گزارتا تھا، راتوں کو آہ و زاری کرتا، خوش قدوں سے عشق لڑاتا، ان (کے حسن) کی تعریفیں کرتا اور لمبی لمبی زلفوں والے (معشوقوں) کے ساتھ رہتا تھا، حسینوں کی پرستش کرتا اور ایک لمحے کے لئے بھی ان سے جدائی ہوتی تو بےقرار ہوجاتا تھا، محفل سجاتا تھا، حسینوں کو بلاتا تھا، ان کی مہمان داری کرتا تھا (اور یوں) زندگی گزارتا تھا، اب کوئی مانوس چہرہ نظر نہیں آیا جس سے دو باتیں کرلیتا کوئی معقول انسان نہ پایا جس کے پاس جا بیٹھتا۔ اس وحشت انگیز گلی سے نکل کر ویران راستے پر آ کھڑا ہوا اور حیرت سے تباہی کے چھوڑے ہوئے نشان دیکھتا رہا۔ بہت صدمہ اٹھایا اور عہد کیا کہ اب ادھر نہ آؤں گا اور جب تک رہوں گا شہر کا قصد نہ کروں گا۔"

ہر چند کہ میر کے عہد میں دلی وہ دلی نہ تھی لیکن اس کی دیواروں کے سائے اب بھی چناروں سے زیادہ خنک چھاؤں رکھتے تھے۔ کیا عوام کیا خواص سب کو اس شہر پر ناز تھا اور یہ ناز بیجا بھی نہ تھا۔ یہ شہر کیا تباہ ہوا میر بھی تباہ ہوگئے۔ ۱۷۸۱ء کے قریب وہ لکھنؤ پہونچے۔ یہ وہ وقت تھا

جب نواب آصف الدولہ جیسا سخی اور صاحبِ مروّت لکھنؤ میں موجود تھا یہاں میرؔ کی ہر طرح پذیرائی ہوئی۔ دو سو روپے ماہوار وظیفہ ٹھہرا، لیکن میرؔ کی بے کلی نہ گئی ؎

لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اُداس
میرؔ کی سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

اس شہر کی آب و ہوا سے وہ مانوس نہ ہو سکے کیونکہ وہ شہر جو ان کی زندگی تھا، ان کا دل تھا، وہ تو کب کا تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ ان کے لیے تو بس وہی شہر، شہر تھا جس کی جستجو ان کو یہاں تک لے آئی تھی۔

لکھنؤ میرؔ کے لیے بس ایک پڑاؤ تھا، جہاں وہ اپنے شہر کی جستجو میں بھٹکتے بھٹکتے آ نکلے تھے، ان کے روبرو تو یہ محض تماشا تھا اور وہ اس کے تنہا تماشائی کیونکہ جس تہذیب اور جس زندگی کو وہ چھوڑ آئے تھے، یہاں اس کے خط و خال ہر چند کہ دل پذیر تھے مگر ان کو اپنے نہ لگتے تھے۔ دل سے دلبری تک ساری فضا جیسی بھی تھی وہ، وہ نہ تھی جس سے ان کا شہر ان کا دل یا دلّی عبارت تھا۔

اس عہد کے میرؔ، ناصر کاظمی کا بھی وہی المیہ ہے جو میرؔ کا المیہ تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ تقریباً ایک سو بیاسی تراسی سال کے بعد یعنی ۱۹۱۵ء میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے اور جب وہ ناصر کاظمی کی شخصیت میں ڈھل کر سامنے آتا ہے تو اس کی فریاد میرؔ کی فریاد بن کر پھر ان راستوں پہ چل نکلتی ہے جہاں سے "شہرِ میرؔ" کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ عجیب دردِ مشترک تھا جس نے قرب و بعد کے سارے فاصلے مٹا دیے تھے۔ ناصرؔ کے لئے ابھی شہر ایک شناخت تھی اور اس شناخت کے لئے وہ بھی مسافت پہ مسافت طے کر کے ان در و دیوار کو تلاش کرتا رہا، جن کی پرچھائیاں اب تک ناپید ہو چکی تھیں۔

ناصر کاظمی نے میرؔ کی طرح کوئی آپ بیتی نہیں لکھی کیونکہ وہ "جگ بیتی" کے اس خونچکاں سیلاب سے گزرا جہاں اس کی طرح نہ جانے کتنے لوگ ساحلوں سے کٹ کر ان ادھورے جزیروں میں پناہ لے چکے تھے جن کو کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں اس سمندر میں غرقاب ہونا تھا جس میں اس کا شہر بہت پہلے ڈوب چکا تھا۔

ناصرؔ کے ہوش سنبھالنے سے پہلے اس کا دیس اس کا شہر جس کشاکش سے دوچار ہوا اس کو اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ایسی ہوا چلی کہ مدتوں اس کے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ ملک دو نیم ہوا، تقسیم نے اس کے پیروں میں ہجرت رکھ دی، اس کو اپنا شہر چھوڑنا پڑا لیکن کیا اس سے وہ شہر چھوٹ گیا۔؟

لاہور اور "زندہ دلانِ لاہور" میں اس کو اپنے شہر کی تھوڑی بہت جھلک دکھائی دی۔ زندگی اور گہما گہمی سے بھرپور، رس بھری ہواؤں میں سانس لے کر اس نے اپنے شہر کو لاہور کی دھرتی پر پھیلا کر دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ میں شہر میں ہوں اور یہ میرا شہر ہے۔ یہ گلیاں، یہ بازار سب میرے ہیں اس نے پھر سننے والے تلاش کرنے شروع کیے، لوگ جمع کیے اور محفلیں جمائیں مگر دھرتی پر حکومت کرنے والوں کو اس کی فرماں روائی پہ، اس کی گرفت اور اثر و نفوذ پر حسد ہوا۔ اربابِ سیاست نے دیکھتے ہی دیکھتے روشنی کی ہر بساط اُلٹ دی، تیرگی شہر کا مقدر بن گئی۔ ہر چند کہ وہ جانتا تھا:—

"اس دورِ ابتلا میں نالہ آفرینی محض ایک دیوانے کی پکار ہی نہیں، کئی دلوں کی دھڑکنیں اس کی ہم ساز و ہم نوا ہو سکتی ہیں اگر مصلحت آشنا ذہن ان دھڑکنوں کو ملفوف نہ کر دے۔"

لیکن اس نے دیکھا کہ وہ بھرے پُرے شہر میں اکیلا ہے کوئی اس کا ہم نوا نہیں ہے۔ شہرِ بے چراغ میں کتنی راتیں جاگ جاگ کر اس نے اس دھرتی کے ذرّے ذرّے سے باتیں کیں جن کو سمیٹ کر اس نے وہ بستی وہ شہر بسایا تھا جو میرؔ کی دلّی یا اس کا دل تھا۔

وہ شہر کہ جس کے لیے اس نے دائم آباد رونقوں کی دُعا مانگی تھی، جہاں رت جگوں میں راتیں گزاری تھیں، محفلیں سجائی تھیں اس کی بے رونقی دیکھ کر اس کے دل سے ہوک اٹھی ؎

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا
اُگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی

اس نے جس طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھا سناٹا ہی سناٹا تھا۔ بڑے بڑے صاحبِ دل، صاحبِ صدا سرنگوں ہو کر خاموش ہو چکے تھے۔ اس کے پاس نہ تلوار تھی نہ تیغ، لے دے کے ایک قلم تھا، سو اس کی حرمت

اسے عزیز تھی۔ اس نے میر کی طرح قلم کی حرمت کو جانا اور اس کی آبرو رکھنے کے لئے ان گلی کوچوں میں سفر جاری رکھا جہاں بازار بند راستے سنسان اور بے چراغ ہو چکے تھے۔ اس نے رک رک کر ہر دل کے دروازے پر دستک دی اور پھر خاموشی سے اسی راستے پر ہولیا جو میر کی رہگزر تھی۔

میر اور ناصر کاظمی کے لیے شہر کیا تھا، یہ تو وہی کچھ سکتے ہیں جنھوں نے ان قدموں کی دھمک سُنی ہو جو آن کی آن میں ان شہروں کو پامال کر گئے جہاں کے شب و روز زندگی سے عبارت ہوا کرتے تھے ؎

خرابی دل کی کیا انبوہِ درد و غم سے پوچھو ہو
وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لُوٹ جاتا ہو
——— میر

خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے
کیا کیا اُن نے سلوک کیے ہیں شہر کے عزت داروں سے
——— میر

کس سے کہوں کوئی نہیں سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میّتِ شہر بے کفن
——— ناصر کاظمی

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں
——— ناصر کاظمی

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا
——— میر

نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں گلیوں میں ساری رات
یہ شہر چھپ کے رات کو سوتا ہے آب میں
——— ناصر کاظمی

حال میرا شہر میں کہتے رہیں گے لوگ دیر
اس فسانے کے تئیں ہوئے تو وہ مشہور تک
——— میر

شہر میں اب ہمارے چرچے ہیں
جگمگاتے ہیں کاغذ کو ہم سے
——— ناصر کاظمی

یارب کدھر گئے وے جو آدمی روش تھے؛
اوجڑ دکھائی دے ہیں شہر و دہ نگر سب
——— میر

کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا
وہ لوگ تھے نہ وہ جلسے نہ شہر رعنائی
——— ناصر کاظمی

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے
پھیلا تھا اس طرح سے کاہے کو یاں خرابا
——— میر

جی ٹھکانے نہیں جب سے ناصر
شہر لگتا ہے بیابان مجھے
——— ناصر کاظمی

جلا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا
——— میر

یہاں اک شہر تھا شہر نگاراں
نہ چھوڑی وقت نے اس کی نشانی
——— ناصر کاظمی

عشق نے دے کر آگ یکایک شہر تن کو پھونک دیا
دل تو جلا ہے دماغ جلا ہے اور جلا ہے کیا کیا کچھ
——— میر

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
——— ناصر کاظمی

یہ چند اشعار میر اور ناصر کاظمی کے شہر کا مختصراً جائزہ ہیں۔
ان کی تمام شاعری میں شہر سے متعلق اتنے اشعار موجود ہیں جن کے لیے یہ مضمون

ناکافی ہے۔ پھر بھی ان اشعار سے اس شہر کی تھوڑی بہت نشاندہی ہوتی ہے جس کے لیے ناصر کاظمی نے راتیں جاگ جاگ کر گزاریں اور جس کے لئے دعا مانگی ہے

شہر لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

اور جس کے لیے میر کا دل مرثیہ بن گیا ہے

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے اب پاس نشانی اس کی

□□

حواشی:

(۱) اٹھارھویں صدی میں ہندستانی معاشرت
(۲) کلیاتِ میر
(۳) برگِ نے
(۴) دیوان

عصری سماج میں تشدد کا رجحان صفحہ ۱۵ کا بقیہ

ہوئے تشقہ کھینچے اور دیر میں بیٹھنے پر رضامند نظر آتے ہیں اور غالب کو پڑھ کر، جو برہمن کو وفاداری کے صلے میں کعبے میں دفن کرنا چاہتے ہیں کون متعصب رہ سکتا ہے۔ اقبال اگر بتانِ رنگ و نسل سے بیزار کر کے انسان کامل بننے کی تلقین کرتے ہیں تو پریم چند اور منٹو اور ان جیسے سیکڑوں تخلیق کار اونچ نیچ کی تفریق سے اپنے پڑھنے والوں کا دل صاف کر دیتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ ایسی تخلیقات اب نصاب سے خارج کر دی گئی ہیں اور عصر حاضر کا تخلیق کار اب ایسے ادب پارے تخلیق نہیں کر رہا ہے بایں ہمہ اب قول و فعل میں تضاد بڑھ گیا ہے چنانچہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس پر خود یقین نہیں رکھتے، جو پڑھاتے ہیں خود اس پر عمل نہیں کرتے لہٰذا پڑھنے والوں پر اس کا خاطر خواہ عمل نہیں ہوتا اور ردِ عمل کے طور پر معاشرے میں تشدد کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

مجھے عرض کرنے دیجئے کہ آزادیِ ہند کے بعد سے اب تک دانشوروں کے تساہل، مصلحت پسندی، منافقت یا دوسرے لفظوں میں دانشوری کے زوال نے ہمارے معاشرے میں تشدد پسندی کو بہت بڑھاوا دیا ہے۔ آج کے بیشتر دانشور یا تو بکے ہوئے ہیں یا پھر دانشور ہی نہیں ہیں۔ قوم کی قیادت کرنے والوں کو کرسیوں سے محبت ہو گئی ہے۔ نام نہاد صوفی سنت سادہ لوحوں کو لوٹنے میں مصروف ہیں تو خود ساختہ علمائے دین تفریق و تعصب پھیلانے میں خود غرض سیاستدانوں کے آلۂ کار بن گئے ہیں۔ درسی کتابیں آزادانہ مرتب کرنے کی جگہ اہلِ اقتدار کی مصلحتوں کے پیشِ نظر تیار کی جاتی ہیں اور تاریخ کے نام پر متعصبانہ داستانیں پیش کی جاتی ہیں۔ موسیقار، مصور، رقاص سبھی سرکاری انعامات اور اعزازات پر مرنے لگے ہیں۔ شاعر، ادیب، مکالمہ نگار، اداکار سب سرمایہ داروں کی کٹھ پتلیاں بن گئے ہیں کوئی فلم کے لیے لکھ رہا ہے تو کوئی ٹی۔ وی، اخبار، رسالے، اشتہاری ادارے اور ریڈیو کے لیے۔ آزادی کے ساتھ اپنے لیے اور اپنوں کے لیے بہت کم لکھتے ہیں۔ مشاعروں کا حال اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ عامیانہ اور سفلی جذبات کی ترجمانی عام ہے اور سطحیت روز افزوں۔ حقیقتاً دانشوری اب ایک کارِ زیاں تصور کر لی گئی ہے۔ لوگ ذہن و فکر، قلب و نظر کی کشادگی کے ساتھ دانشور نہیں رہے۔ اکثر نے محض دانشوری کا نقاب پہن رکھا ہے۔ غالباً انھیں حالات کے پیشِ نظر ایک کانفرنس میں فراق گورکھپوری نے کہا تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کو شاعر، افسانہ نگار یا دانشور نہیں روک سکتے، ان سب کی مجموعی کاوش سے زیادہ موثر ایک کانسٹبل کا ڈنڈا ہوتا ہے۔ میں بھی سمجھتا ہوں کہ معاشرے میں تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان پر فوری قابو پانے کے لیے حکومت اور انتظامیہ کو براہ راست اقدام کرنا چاہیئے اور ہمیں دانشوری کی سچی آزاد اور جرأتمندانہ روایت کا احیا کرنا چاہیے کیونکہ موجودہ صورت میں تو ـــــــ

دیتے ہیں دھوکا یہ دانشور، کھلا

■ ■

حقیقت

ڈاکٹر احسن نشاط
(یوپی)

زندگی اداکارہ موت اک حقیقت ہے
دونوں ساتھ چلتی ہیں دونوں ساتھ رُکتی ہیں
زندگی کی چھاؤں میں
پچھائی سڑکیں بھی
زندناتی کاریں بھی
ننھے مُنّے بچے بھی
مسکراتی مائیں بھی
نوجواں سجیلے بھی
کھانستے ہوئے بُوڑھے
اور بوڑھیاں جن کو
صرف بیتے لمحوں کی یاد آتی رہتی ہے
ان کے پاس جب دیکھو تجربوں کے دفتر ہیں
راتیں نیند سے خالی
دن نصیحتیں کرتے
یوں ہی بیت جاتے ہیں
ننھے مُنّے بچّوں کو ماں کی مُسکراہٹیں کافی
اور کچھ کھلونوں سے اُن کا جی بہلتا ہے
نوجواں سجیلوں کو فکر و آگہی سے کیا
درد و غم سے کیا مطلب
لذّتِ الم کیا ہے
کرب کس بلا کا نام ہے
مستیوں میں کٹتی ہیں ان کی راتیں اُن کے دن
موت اک حقیقت ہے سب پہ مُسکراتی ہے
اور گنگناتی ہے
تھپکیاں بھی دیتی ہے
لوریاں سناتی ہے
زندگی کا سودائی پھر تو سو ہی جاتا ہے
اور کھو ہی جاتا ہے۔
جانے کن خلاؤں میں؟

آنسو

دَرد بَن کے آتا ھے
دُوست بَن کے آتا ھے
پُربہار لمحوں مَیں
بے قرار ساعت مَیں
غمزدہ نگاھوں مَیں
کِس طرح چمکتا ھے
خُوب مُسکراتا ھے
آپ نے تو دیکھا ھے
آنکھ مَیں مِرے آنسو

سلمیٰ شاھین
شعبۂ اُردو۔ دہلی یونیورسٹی
دھلی

سُہیل وحید
نو بھارت ٹائمز۔ فریسر روڈ۔ پٹنہ

غالب الاخبار — سیتا پور کا پہلا اخبار

سیتاپور کی اُردو صحافت کی ایک یہی خصوصیت نہیں ہے کہ اس شہر سے جو پہلا اخبار جاری ہوا وہ دُنیائے ادب کے عظیم شاعر غالب کی نسبت سے جاری ہوا بلکہ سیتاپور کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ اُردو صحافت کی پہلی معلوم کتاب " اختر شہنشاہی " جو کہ اُردو صحافت کی اولین تاریخ کا درجہ رکھتی ہے۔ کتابی صورت میں آنے سے قبل یہاں سے جاری ہونے والے ماہنامہ " تہذیب الآثار " میں ذخیرہ اشرف کے نام سے قسط وار چھپ چکی تھی۔

سیتاپور کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۸۶۹ء میں ہوا جب یہاں سے ہندستان بھر میں اپنی نوعیت کا پہلا ہفتہ وار " غالب الاخبار " جاری ہوا۔ مرزا غالب کے محب خاص مرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی نے یہاں سے " غالب الاخبار " جاری کیا۔ مرزا غالب سے ان کی خط و کتابت کے بہت سے ثبوت ملتے ہیں۔ ان کی مثنوی " شعاع مہر " کی تعریف غالب نے اپنے خطوط میں کی ہے۔ اسی زمانے میں حکیم مومن خاں مومن کے داماد مولوی عبدالغنی وکیل اور آغا عبدالغنی مستقل طور پر سیتاپور پہونچ چکے تھے۔ " مارہرے " کے شاہ محمد صادق بھی یہیں آبسے تھے خاندان مارہرہ غالب پسندی کے لئے مشہور رہا ہے۔ شاہ محمد صادق نے سیتاپور میں " مطبع صبح صادق " کے نام سے ایک پریس قائم کیا جو سیتاپور کا پہلا پریس تھا۔ یہ غالب الاخبار کے جاری ہونے سے پہلے کی بات ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مرزا غالب کی شہرت ہندستان گیر ہو چکی تھی۔ لکھنؤ اور دلّی کے دبستانوں کی چشمک کی زد میں مرزا غالب آچکے تھے لکھنؤ کے مشہور زمانہ اخبار " اودھ اخبار " میں آغا علی شمس اور ان کی دو نوں شاگرد " زہرہ و مشتری " نے مرزا کے خلاف اچھا خاصا محاذ جنگ قائم کر رکھا تھا اور جوہر لکھنوی " برہان قاطع " کی بحث میں " حکم " بن کر نظم آرائی میں مصروف تھے۔ ظریف لکھنوی غالب کی مشکل پسندی پر مسلسل چوٹیں کر رہے تھے۔ ریاض خیر آبادی اس استادِ فن کے معترف ہونے کے باوجود دیوانِ غالب کا جواب کہنے میں مصروف تھے۔ لکھنؤ ہی میں نہیں، دہلی میں بھی استاد ذوق نے غالب کی پُر تکلف اور بے تکلف اصطلاحوں، حسنِ ادا اور لطفِ زبان و کلام کو کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ صہبائی نے غالب کی پیچیدگیٔ ادا کے خلاف کیا کچھ نہیں کر رکھا تھا۔

دبستانِ لکھنؤ کا وہ عروج تھا۔ آتش، ناسخ، انیس اور دبیر کا رنگ کچھ ایسا جم چکا تھا کہ کسی دوسرے کا اثر انداز ہونا ممکن نہ تھا کلام سے زیادہ دبستان اہم ہو چکا تھا اور باقاعدہ طور پر دبستانی تضحیک کا کام ہو رہا تھا۔ بزم آرائیوں میں رزم انگیزیاں بھی شروع ہو گئی تھیں ؎

دلّی کے لوگ لکھنؤ والوں کے سامنے
چلتے ہیں جیسے شیر غزالوں کے سامنے

جواباً ؎

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

داغ کو بھی نہیں بخشا جاتا تھا ؎

" آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی "

کو اس طرح پڑھا بلکہ مشہور کیا جاتا تھا ؎

"پیچھے پیچھے داغ آ گئے آگے رُسوائی ہوئی"

ایسی فضا میں بھی کچھ صاف گو اور حقیقت پسند لوگ موجود تھے۔ مرزا حاتم علی مہر انھیں میں سے ایک تھے۔ گو کہ وہ خود لکھنؤ اسکول سے وابستہ تھے اور ناسخ کے شاگردوں میں سے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں غالب سے والہانہ عشق تھا۔ اپنے اسی جذبے کے تحت انھوں نے غالب کے خلاف ان ہنگامہ آرائیوں کو ختم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان کا یقین تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب یک طرفہ ہے اور اس کا سدباب ضروری ہے

یہ حسنِ اتفاق تھا کہ اسی دوران مہر کے پوتے مرزا قاسم علی قزلباش کا تبادلہ سیتاپور ہو گیا۔ مہر جب سیتاپور آئے تو یہاں آغا عبدالغنی پہلے سے موجود تھے جو نہ صرف دہلوی تھے بلکہ مرزا غالب کی صحبتوں کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔ مہر چونکہ غالب پر لکھنؤ اسکول کی زیادتیوں سے نالاں تھے اور اس کے سدباب کے لیے کوشاں تھے یہاں آنے پر جب ان کو ایک اور غالب شناس مل گیا تو ان کی کوششیں اور زیادہ تیز ہو گئیں۔ دونوں میں صلاح و مشورہ ہوا اور ایک مطبع "نادرکار" قائم کر کے ہفت روزہ "غالب الاخبار" جاری کیا گیا۔

لیکن جب "غالب الاخبار" کا پہلا شمارہ نکلا تو غالب کو دنیا ٹھکرائے ہوئے دو ہفتے بیت چکے تھے۔ ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو غالب اس جہاں سے رخصت ہوئے اور یکم مارچ ۱۸۶۹ء کو غالب الاخبار کا پہلا شمارہ نکلا ؎

ہوں گرمیِ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

مشہور مستشرق گارساں دتاسی کے مطابق غالب الاخبار ۱۸۸۶ء میں نکلا تھا۔ نادم سیتاپوری لکھتے ہیں کہ گارساں دتاسی کی یہ تاریخ غلط ہے۔ ہاں اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ "غالب الاخبار" ۱۸۸۶ء میں بھی نکلتا تھا۔ "اختر شہنشاہی" میں اختر الدولہ لکھتے ہیں :-

"غالب الاخبار۔ محلہ تامسین گنج (سیتاپور)
ہفتہ وار۔ آٹھ ورق۔ اوسط۔ یوم (اشاعت) دوشنبہ
سالانہ گیارہ روپیہ۔ مجاریہ سید محمد صادق وکیل سرکار
و آغا عبدالغنی وکیل عدالت۔ "مطبع نادرہ کار" سے
مرزا محمد قایم علی منصرم نے یکم مارچ ۱۸۶۹ء کو جاری
کیا۔"

(ص ۱۸۰ اختر شہنشاہی۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۸ء)
(بحوالہ انتخاب نقد ص ۱۶)

اختر شہنشاہی میں غالب الاخبار کے رنگ و آہنگ کے بارے میں کچھ بھی بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں اس کی ان خصوصیات کا ذکر تک نہیں ملتا کہ یہ اخبار اپنے نام کی انفرادی نسبت کے اعتبار سے ہندستان کا پہلا اخبار تھا۔ تاہم یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور خطّہ اودھ کی کسی ادبی شخصیت کو یہ گمان بھی نہیں گزرا ہوگا کہ غالب کے دفاع میں سب سے پہلے محاذ آرائی اودھ کے کسی علاقے سے ہی شروع ہوگی اور لکھنؤ اسکول کے متعلقین ہی اس میں پہل کریں گے کیونکہ سیتاپور سمیت لکھنؤ کی ادبی فضا آتش اور انیس کے کلام سے معطر ہو چکی تھی اور کچھ اس طرح کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا کہ غالب کا نام تک نہیں لیا جاتا تھا جبکہ غالب اس وقت تک شہرت کی بلندیوں کو چھو چکے تھے وہی ان کے خطوط کا زمانہ ہے اور وہی ان کی جاودانی شاعری کا لیکن اودھ میں سیتاپور واحد شہر تھا جہاں غالب کے پرستار موجود تھے۔ مہر کے علاوہ عبدالغنی اور آغا عبدالغنی وکیل پہلے سے موجود تھے۔ شاہ محمد صادق اور ایک صاحب حکیم محمد شریف طالب تھے ان کو بھی غالب سے والہانہ لگاؤ تھا اور وہ غالب کے رنگ میں شاعری کرتے تھے اور غالب کی رعایت سے طالب تخلص کرتے تھے۔

ریاض خیرآبادی کی ابتدائی شاعری پر بھی غالب کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ رئیس احمد جعفری نے "رندِ پارسا" میں لکھا ہے کہ :

"ابتدا میں ان پر غالب کا رنگ غالب تھا۔ چاہتے تھے
انھیں کی طرح مشکل الفاظ پُر پیچ ترکیبوں اور ثقیل جملوں کو
استعمال کر کے استادی اپنی دھاک بٹھائیں۔"

تب ریاض "شیفتہ" تخلص کرتے تھے اور میر مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد تھے۔

ریاض چونکہ خود بھی لکھنؤ اسکول سے وابستہ تھے اس لئے ان کا

(باقی ص ۴۴ پر)

غزلیں

یوں وسعتِ نگاہ کے منظر دکھائے ہیں
صحنِ چمن میں ہم نے قفس بھی سجائے ہیں

تیرے جنوں پسند وہ محفل سجائے ہیں
دیوانگانِ ہوش جہاں کھینچ آئے ہیں

غم اپنے دل کی طرح کسے راس آئے ہیں
رونا جہاں جہاں تھا وہاں مسکرائے ہیں

تارے بہت حسین سہی مجھ کو ہے گماں
فطرت کے درد مندوں نے آنسو بہائے ہیں

خود اپنی آرزوؤں کا خالق ہے آدمی
حسبِ مزاج اس نے خدا بھی بنائے ہیں

قاسم ہے ہم سے بات بھی کرنے میں اُن کو عار
ہم نے جنھیں زباں کے سلیقے سکھائے ہیں

قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی

شبیر منزل۔ نصیر آباد
رائے بریلی

کہاں ہیں پھول کہاں پر ہیں خار جانے ہے
چمن کا حال چمن کی بہار جانے ہے

تھکے تھکے سے قدم چاہے جو سلوک کریں
ہمارا ذوقِ طلب کوئے یار جانے ہے

ہر ایک شے سے ہے ظاہر اسی کی جلوہ گری
نگاہِ دیر و حرم کا وقار جانے ہے

مجھے فریب نہ دے حسنِ حرفِ تسکیں سے
قرار کیا ہے دلِ بے قرار جانے ہے

شرابِ ناب سے مطلب نہ تشنگی کا گلہ
زمانہ پھر بھی ہمیں بادہ خوار جانے ہے

کسی پہ اور یہ ظالم کرم نہیں کرتا
بس ایک ہم کو غمِ روزگار جانے ہے

قدم قدم ہے مصیبت سے آشنا شاعر
وطن ہے کیا یہ غریب الدیار جانے ہے

شاعر فتحپوری

۸۹/۸۸۔ جگر اکاڈمی
چمن گنج۔ کانپور

میں جس کے وصل میں سجدہ کروں گا
تو اس کے ہجر میں کیا کیا کروں گا

میں اپنے خال و خد دیکھا کروں گا
ترے چہرے کو آئینہ کروں گا

تمہارے خواب پھولوں کی ردائیں
انھیں کو تان کر سویا کروں گا

محبت ہو گئی ناپید کیسے
یہی اک بات اب سوچا کروں گا

سجا کر اپنا سر نیزے پہ اک دن
وفا کے نام کو اونچا کروں گا

مرے دکھ درد تو میرے ہیں اختر
مداوائے غمِ دنیا کروں گا

اختر شاہجہانپوری

رنگین چوپال
شاہجہاں پور

افسانہ

معزالدین ماجد

۵۶۷/بی للت نگر (ریلوے کالونی) الہ آباد — ۲۱۱۰۰۱

سپردگی

آخر وہی ہوا، جس کا اسے خوف تھا۔ لڈن اپنے حساب کتاب کے لئے بڑی ڈھٹائی سے کھڑا تھا… اور اُرملا ایک مجرم کی طرح سر جھکائے اشک آلود آنکھوں سے زمین گھورے جا رہی تھی۔

اس نے شوہر کی طویل بیماری میں سب کچھ داؤں پر لگا دیا تھا… مگر وہ اس جوئے میں بری طرح ہار گئی تھی۔ وہ لڑکھڑائی ضرور تھی۔ لیکن پھر اس نے خود کو جلد ہی سنبھال لیا تھا… اور اپنے بچوں کو آشاؤں کی کرن سمجھ کر چھاتی سے چپکائے حالات کی ڈگر پر چل پڑی تھی ——

ہر آن ایک خوف تھا۔!

ہر لمحہ ایک خطرہ تھا۔!!

ہر گھڑی ایک امتحان تھا۔!!!

وہ محنت مزدوری کے سہارے کولھو کے بیل کی طرح زندگی کی گاڑی کھینچتی رہی تھی…… مگر زندگی کی پیچیدگیوں اور مسائل کے حصار میں قید ایک مجبور، بے بس تنہا عورت کر ہی کیا سکتی تھی۔ دلدل میں ہاتھ پاؤں مارتے مارتے نڈھال ہو گئی تھی وہ — اس نے شدت سے محسوس کیا کہ بچوں کی تعلیم، گھر کے اخراجات اور روز افزوں مہنگائی کے درمیان وہ بکھرتی جا رہی ہے۔ قرض ہستی چکاتے چکاتے اس کا وجود جیسے مٹتا جا رہا تھا۔ پھر بھی زندگی کا سود جوں کا توں منہ پھیلائے تھا

لڈن بڑی مستعدی سے اپنا حساب لینے کے لیے سر پر سوار تھا۔ وہ آٹھ سو کا انتظام کیسے…… کہاں سے کرتی۔ اس نے دھیرے دھیرے ادا کر دینے کی التجا کی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا:

"مجھے روپیہ ابھی…… اسی وقت چاہیئے۔ اُدھار لیتے وقت تو آدمی کو بڑا اچھا لگتا ہے……"

"نہیں لڈن……!" نظریں جھکائے وہ منمنائی — "مجھے اُدھار لین دین بالکل پسند نہیں — مگر……" اس نے بڑی بے چارگی سے گھر کی زبوں حالی کے بارے میں سوچا اور ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگی۔ اچانک اس کی نگاہ لڈن کی بدمست آنکھوں پر پڑی تو وہ لرز اُٹھی — اندیشے اور وسوسے ذہن میں کلبلانے لگے۔

لڈن ٹکٹکی باندھے مسکرا رہا تھا……

"اگر تم چاہو تو……" لڈن کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی —— "اپنا قرض ابھی ادا کر سکتی ہو۔!!"

اس کی گستاخ نگاہیں سکڑے سہمے اُرملا کے جسم پر رینگنے لگیں۔ لڈن کو اس انداز میں دیکھ کر وہ نفرت اور غصے سے کانپنے لگی۔ اس نے اپنا غصہ اپنے تین سالہ بیٹے رمیش کی پٹائی کر کے ٹھنڈا کیا۔ جو دیر سے بسکٹ کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔

"کم بختو!…… تمھیں لوگوں کی بدولت آج……"

رمیش زور زور سے رونے لگا — اس نے سوچا کہ شاید بچے پر ہی اس ظالم کو دیا آجائے۔ مگر وہ نہیں پگھلا۔ جب آدمی پر شیطان سوار ہو جاتا ہے تو وہ صرف درندہ رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں ——!

لڈن کھڑا کھڑا سب دیکھتا رہا…… دیکھتا رہا…… اور مسکراتا رہا ——

اُرملا نے جی بھر کے بچّے کو پیٹا اور زور زور سے ہانپنے لگی!
چوڑیاں ٹوٹ کر ہاتھ میں چبھ گئیں جس سے رس رس کر خون نکلنے لگا۔ بال بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ شانے پر سے ساڑھی کا آنچل سرک گیا...

لڈن خراماں خراماں اُرملا کے نزدیک آگیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ چبا چبا کر بولا---

"تو کیا فیصلہ کیا آپ نے میم صاحب...؟

وہ اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گئی۔ گویا لڈن نے "میم صاحب" کہہ کر اُرملا کے زخموں پر نمک چھڑک دیا تھا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا اس نے لڈن کا ہاتھ جھٹک دیا اور بوسیدہ ساری کا آنچل درست کرتے ہوئے چیخی---

"اپنی اوقات میں رہو لڈن! کمزور اور تنہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ......" وہ بڑی بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی --- کہیں کوئی نہیں تھا۔ سوائے ایک معصوم بچّے کے --- جو ٹوٹی چارپائی پر پڑا روتے روتے سو گیا تھا۔ باقی دونوں بچّے اسکول میں تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا---
اس نے دل ہی دل میں سوچا---

"کاش! زمین پھٹ جائے اور میرے ساتھ میری پریشانیاں بھی زمین میں دفن ہو جائیں"--- مگر نہ زمین پھٹی اور نہ ہی....

پھر عاجز آکر اس نے ان خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور ارادہ کرلیا کہ اب آگے کوئی بات بڑھائے بغیر وہ حالات سے سمجھوتہ کرلے گی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے مایوسی اور عجلت میں کیے گئے اپنے فیصلے پر غور کیا تو اس کا سارا وجود لرز گیا--- دلدل سے نکلنے کی اس کی ہر کوشش ناکام ہوتی نظر آرہی تھی۔ وہ گم سُم سی خلا میں گھورتی رہی....

پھر جانے کیا سوچ کر وہ بچّہ کو کوٹھری نما دوسرے کمرے میں لٹا کر واپس آگئی۔ کمرے کا دروازہ بند کیا--- اور غم و غصّہ کے عالم میں کسمساتی ہوئی بولی---

"لو کھڑی ہوں، چکالو اپنا حساب! وصول کرلو اپنا قرض...!!"
یہ کہتے ہوئے وہ چارپائی پر ایک لاغر مریضہ کی طرح لڑھک گئی اور ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کرلیں--- اس کی آنکھوں کے گوشے جلنے لگے۔ اس کے وجود کا سارا کرب آنسو بن کر پھوٹ پڑا۔

وہ بے سُدھ پڑی رہی... بے حس و حرکت بالکل لاش کی مانند۔
تبھی اسے لگا گویا کسی نے اس کے تلووں پر پگھلتا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو---

اس نے ہولے ہولے آنکھیں کھولیں تو خلافِ توقع لڈن کو، جس کی آنکھیں سرخ اور بھری بھری تھیں، دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔

لڈن دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے کچھ کہے سُنے بغیر پھرتی سے دروازے کی سمت لپکا اور زنجیر کھول کر ایک جھٹکے کے ساتھ کمرے کے باہر نکل گیا۔

اُرملا سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آخر ہوا کیا---؟ یک بیک اس کی نظر اپنے پاؤں کے پاس پڑی روپئے کی ایک گڈی کی طرف گئی تو وہ اُچھل سی پڑی--- لڈن کے پیچھے پیچھے وہ بے تحاشہ ننگے پاؤں بھاگی---

"لڈن!..... لڈن!..... مجھے تمھاری بھیک--- نہیں چاہیے....!!"

مگر تب تک لڈن اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔!

□□

سمان

ص ۱۴ کا بقیہ

وہ لفظ بولنے کو کہا تو اس کی زبان گنگ ہوگئی۔ بہ مشکل تمام اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں یوں شکریہ ادا کیا---

"ان اُپہاروں کے لیے آپ سب کا دھنیواد۔ مگر مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے تھا۔ میرے لیے تو بس آپ لوگوں کا پریم، محبت اور ہمدردی ہی کافی تھی۔ آپ نے جو میری سیواؤں کو سویکار کرکے میرا سمان کیا یہی میرے لیے سب سے بڑا انعام ہے اور زندگی بھر کا سرمایہ بھی۔"

غزلیں

ہر شخص میرے حال پہ یوں مہرباں رہا
پردیس میں بھی مجھ کو وطن کا گماں رہا
میں کیا بتاؤں زیست ہوئی کس طرح بسر
ہر ہر قدم پہ میرا یہاں امتحاں رہا
اک پل بھی زندگی میں نہ مجھ کو ملا سکوں
دشمن تمام عمر غمِ دوجہاں رہا
اس سے جدا ہوئے تو زمانے گزر گئے
لیکن وہ میرے قلب و نظر میں نہاں رہا
میں نے تو دوسروں کے سدا غم بٹائے ہیں
ہر شخص مجھ سے کس لئے پھر بدگماں رہا

—— سُلیمان صِدّیقی
سی۔ ۲۱۱ راجہ جی پورم لکھنؤ

ایک دو کا ذکر کیا سارا جہاں دُہرائے گا
جو سُنے گا وہ ہماری داستاں دُہرائے گا
داستانِ خونِ ناحق کب بھلائی جائے گی
یہ زمیں دُہرائے گی یہ آسماں دُہرائے گا
کون یوں سجدے کرے گا آستانِ یار پر
کون یہ ربطِ جبین و آستاں دُہرائے گا
کیا بتائیں کس طرح سے کٹ رہی ہے زندگی
ہاں مگر خمیازۂ عمرِ رواں دُہرائے گا
کس کو پھر آئے گی انورؔ حسرت و انور کی یاد
کون میرے بعد ذکرِ رفتگاں دُہرائے گا

—— حبیب الدین انورؔ قدوائی
(الف) ۳۳۷/۸۷ اچھوتی گلی۔ منصور نگر۔ لکھنؤ

سبک ہواؤں کو طوفان کا عمل دے گا
غریب جاگا تو حالات کو بدل دے گا
تو اپنے آپ میں جوشِ یقیں تو پیدا کر
زمانہ سارے سوالوں کا تیرے حل دے گا
خیالِ یار خدارا نہ میرے دل سے نکل
ترا قیام مری فکر کو غزل دے گا
تم اپنے خونِ جگر سے تو آبیاری کرو
درختِ زرد بھی اک روز تم کو پھل دے گا
تمام عمر رہے جس کے رنگ و بُو کا اثر
فنِ حبیبؔ زمانے کو وہ کنول دے گا

—— حبیب الہ آبادی
سی/۸۳۔ شجاعت گنج۔
نئی بستی۔ کانپور

کسی سے بیر نہیں ہے کوئی رقیب نہیں
نہ جانے کیوں یہ زمانہ مرے قریب نہیں
ہجومِ غم میں رفاقت کا حق ادا کر دے
اب اس زمانے میں ایسا کوئی حبیب نہیں
کچھ ایسے درد کے مارے بھی ہیں زمانے میں
جنھیں درخت کا سایہ تلک نصیب نہیں
جو آئے مصائب تو ہم نے پہچانا
جنھیں قریب سمجھتے تھے وہ قریب نہیں
میں دوسروں کو خوشی بانٹتا رہا فیضانؔ
یہ اور بات خوشی خود مجھے نصیب نہیں

فیضان بھادوی ——
موضع بھادی۔ ڈاکخانہ شاہ گنج
جون پور

افسانہ

تسکین زیدی
بزم خضرراہ، ۵۴۷/۱۲ گوال ٹولی، کانپور

سمّان

آج وہ اداس اور بے چین بیٹھا ہوا، اسکول کی ایک ایک چیز کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ منظر اب کچھ لمحوں میں روپوش ہو جائے گا۔ اس کے احساس نے اس کے دل کا سکون منتشر کر دیا تھا۔

وہ اس وقت چونکا جب آفس کے ہیڈ بابو نے اُسے پکار کر کہا۔ "کہاں کھوئے ہوئے ہو رام دین دادا ـــ وقت ہو گیا ہے گھنٹی بجاؤ، ورنہ پرنسپل صاحب ناراض ہوں گے۔"

وہ بوجھل قدموں سے اٹھا اور گھنٹی بجانے لگا۔

"ٹن۔ ٹن۔ ٹن" گھنٹی بج اٹھی۔

لڑکے ایک کلاس سے دوسری کلاس میں آنے جانے لگے۔ راستے میں وہ باتیں بھی کرتے جاتے تھے ـــ ان کی گفتگو کا موضوع یہی گھنٹی کی آواز تھی ـــ

"آج یہ گھنٹی کی آواز کو کیا ہو گیا ہے؟ کیسی گھٹی گھٹی سی آواز ہے جیسے کسی نے سو کر یا رو کر اسے بجایا ہو ـــ کیا رام دین نے سوتے سے اٹھ کر گھنٹی بجائی ہے۔؟"

وہ سرگوشی سن کر چونک پڑا۔ پھر بڑبڑانے لگا۔

ٹھیک کہو ہو بچو ـــ اب تو میں تھک گیا ہوں، بوڑھا ہو گیا ہوں، بس اسکول میں میرا آج آخری دن ہے کل میں کہاں ہوں گا اور یہ کہاں؟ تم لوگ بھی مجھ سے دُور ہو جاؤ گے۔ اسی احساس نے میرے ہاتھوں کی ساری جان ہی نکال لی ہے کانپتے ہاتھوں سے جب گھنٹی بجائی جائے گی تو یوں ہی مدھم سی آواز نکلے گی۔

یہ کہتے ہوئے وہ پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا اور خیالوں میں کھو گیا اس کے پینتیس برس اس اسکول میں گزرے ہیں اور آج اس سے جدا ہوتے ہوئے ایسا لگ رہا ہے کہ اب اس سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں رہ گیا

رام دین کو پرنسپل سے لے کر ٹیچرس اور طلبا سبھی دل سے چاہتے تھے ویسے تو اس اسکول میں پانچ چھ چپراسی اور بھی تھے مگر اس کا برتاؤ اتنا اچھا تھا کہ سب اسی کو ہر کام کے لیے پکارتے تھے اور وہ بھی کسی کام سے انکار نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر شخص کو مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا تھا اسی لئے سب لوگ اس کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اب تو پرنسپل بھی اس کے کام اور اخلاص سے متاثر ہو کر اس کو "رام دین دادا" کہنے لگے تھے۔ وہ بھی ہر وقت اسکول کی بہبودی کا خیال رکھتا تھا۔ صبح سے رات تک اسکول کے کاموں میں منہمک رہتا تھا۔ پتہ نہیں کب کھاتا اور کب آرام کرتا۔ اسکول کے گیٹ کی نگرانی، آفس کا کام، پیڑ پودوں کی سینچائی اور اسکول کے سامان کی دیکھ بھال، فرائض کی ادائیگی کا اتنا احساس کم ہی دیکھا یا سنا گیا ہے۔

اسکول میں گیٹ کے پاس ہی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں تھک کر وہ لیٹ جاتا تھا۔ کھانا وہ خود اپنے ہاتھ سے پکاتا تھا۔ معمولی کپڑا پہنتا تھا۔ دھوتی اور بنیان میں ہی اس نے اپنی ساری زندگی کاٹ دی۔ کبھی کسی نے اس کے پیروں میں چپلیں یا جوتا نہیں دیکھا تھا۔

وہ بڑا ایماندار تھا۔ کبھی کسی کی کوئی چیز کہیں بھولے سے رہ جائے تو وہ اسے اٹھا کر رکھ دیتا یا آفس میں جمع کر دیتا اور پھر اس کی یہ کوشش بھی رہتی تھی کہ جس کی چیز ہے اس تک جلد از جلد پہونچ جائے۔

ایک بار کلاس میں کسی لڑکے کا پرس رہ گیا۔ وہ کسی مالدار گھرانے کا لڑکا تھا۔ پرس میں دو ڈھائی سو روپے تھے۔ رام دین جب شام کو کمرے میں آیا تو اسے بنچ پر یہ بٹوہ پڑا ہوا ملا۔ اس نے اسے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا اور دوسرے دن اس لڑکے کو ڈھونڈھ کر دے دیا۔ اس نے خوش ہو کر اسے دس روپے بطور انعام دینا چاہے تو وہ ناراض ہو کر بولا۔

جاؤ بچو! خوش رہو۔ تم میرے بچے ہو۔ کوئی اپنے بچوں سے بھی انعام یا بخشیش لیتا ہے؟"

اس طرح اس نے سب کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ سبھی لوگ اس کے کردار کی انھیں خوبیوں کی وجہ سے اسے بہت چاہتے تھے اور جب اس کی لڑکی کی شادی گاؤں میں ہوئی تو لوگوں نے سیکڑوں روپے کے تحفے تحائف دیئے۔ اس کی لڑکی کی شادی بڑی شان سے ہوئی۔

آج رام دین کی اُداسی کا سبب یہ تھا کہ وہ پینتیس برس کی خدمت انجام دینے کے بعد اسکول کی نوکری سے ریٹائر ہو رہا تھا۔ اسے اسکول کی ایک ایک چیز سے بے حد لگاؤ تھا۔ چابیوں کے گچھے کو وہ اپنے سینے سے یوں لگائے رکھتا تھا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو چمٹائے رکھتی ہے۔ آج وہ بھی اس سے چھین لیا جائے گا۔ اس کے زمانے میں اسکول میں چوری کی کبھی کوئی چھوٹی سی واردات بھی نہیں ہوئی۔ وہ دوسرے چپراسیوں کو سمجھاتا رہتا تھا کہ دیکھو جیسے اپنے گھر کا خیال رکھتے ہو ویسے ہی اسکول کی ہر چیز کی نگرانی رکھا کرو۔ جس اسکول سے تمھاری روزی روٹی جڑی ہے اس کے لئے تمھیں وفادار رہنا چاہئے۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ اسکول کے ہال میں رام دین کی الوداعی پارٹی کا انتظام ہو رہا تھا۔ طلبا میں بھی اس کے لیے بڑی محبت کا جذبہ تھا وہ اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے ہوئے اس کے منتظر تھے۔ ٹیچر بھی اسی کی باتیں کر رہے تھے اور اسے کچھ تحفہ پیش کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد پرنسپل صاحب ہال میں آ گئے اور ایک ٹیچر نے اناؤنس کیا کہ "یہ جلسہ رام دین جی کے ریٹائرمنٹ کے سلسلے میں منعقد ہو رہا ہے۔ جو لوگ باہر کھڑے ہیں وہ جلد از جلد اندر آ جائیں۔"

سبھی کی نظریں رام دین کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ تھکے قدموں سے آیا اور ہال کے دروازے پر گم صم بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور دل ڈوبتا جا رہا تھا۔

پرنسپل نے پاس آکر اس سے کہا۔

"یہاں کیوں بیٹھے ہو رام دین؟ آج تمھاری جگہ یہاں نہیں، وہاں ہے"۔ انھوں نے ڈائس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس کی بانہیں پکڑ کر اسے اندر ہال میں لے آئے اور اپنے پاس کرسی پر بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی۔

وہ بڑے تکلف سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "حضور! میں تو آپ کا سیوک ہوں۔"

پرنسپل نے خوش ہو کر اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ پتہ نہیں وہ کیوں کانپ رہا تھا۔

اس قدر منزلت کے لیے وہ سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا آنسو اس کی پلکوں پر ٹھہرے ہوئے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"دادا رام دین! تم تو اس سے بھی زیادہ سمان کے مستحق ہو اسکول کے لیے تمھاری خدمات کیا ہم لوگ آسانی سے بھلا سکیں گے ــــ کبھی نہیں۔ ہمیں تم پر ناز ہے۔ اسکول کے بچوں کو ایسی مثالی زندگی سے سبق لینا چاہئے کہ کیسے کام کرنا چاہئے۔ کیسے زندگی گزارنا چاہیے۔ آج جو یہ ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے ہیں تو ہم کیوں ان کی عزت کر رہے ہیں ــ؟ یہ عزت ان کی نہیں، ان کے کام کی ہے۔ ان کی ایمانداری، محنت اور لگن کی ہے۔"

پھر پرنسپل صاحب اس کو مخاطب کرتے ہوئے بولے ــ

"لو یہ ہماری طرف سے چھوٹی سی بھینٹ سویکار کرو۔"

ایک شال اور ہاتھ کی گھڑی۔ انھوں نے اسے پہنا دی۔

اس کے بعد ٹیچروں کی طرف سے ایک دھوتی اور کرتا پیش کیا گیا۔ طلبا میں سے ایک لڑکے نے اپنی اور ساتھیوں کی طرف سے ایک سو ایک روپے لفافے میں رکھ کر اسے پیش کیے، جسے اس نے لے لیا۔

اب وہ حیرت بھری نظروں سے ان تحفوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب سب نے اس سے

(بقیہ ۴۲ پر)

اُترپردیش کا ترقیاتی منظر نامہ

ادارہ

طلبا، گرو کل تعلیمی تہذیب پر عمل پیرا ہوں گورنر کا خطاب

اترپردیش کے گورنر شری بی ستیہ نرائن ریڈی نے یہاں راجہ ہرش چندر بال نکیتن جونیئر ہائی اسکول کی سلور جبلی تقریب کا شمع روشن کر کے افتتاح کیا اور اسکول کے ہونہار طلبا کو انعامات تقسیم کر کے ان کی عزت افزائی کی۔

گورنر نے اس موقع پر منعقدہ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے بھارت کے قدیم آدرش گرو کل تعلیمی نظام پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اُس وقت گرو کل طلبا اپنے اساتذہ کی عزت اپنے والدین کی مانند کرتے تھے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے طلبا گرو کل تعلیمی تہذیب کو اپنا کر اپنے کردار کو آدرش کردار بنائیں۔

شری ریڈی نے کہا کہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کو تعلیم حاصل کرنے کے مساوی مواقع ملنا چاہئیں۔

مرکزی وزیر غذا سے اترپردیش کے لئے اناج کے کوٹے میں اضافے کی اپیل

اترپردیش کے وزیر غذا و رسد شری اعزاز رضوی نے بتایا کہ ریاست کی ضرورت کے مطابق مرکز سے تین لاکھ میٹرک ٹن گیہوں، دو لاکھ میٹرک ٹن چاول اور ایک لاکھ میٹرک ٹن شکر کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

شری رضوی نے مطلع کیا کہ مرکزی وزیر غذا سے خود ملاقات کر کے انھوں نے بتایا کہ ۵۰ ہزار میٹرک ٹن گیہوں، ۵۳ ہزار میٹرک ٹن چاول اور ۳۰ ہزار میٹرک ٹن شکر ابھی تک اترپردیش کو الاٹ کی گئی ہے۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس سے صرف ۶۲۰ گرام فی یونٹ کی شرح سے گیہوں عوام کو فراہم کرایا جا رہا ہے۔ جبکہ دہلی کے عوام کو فی یونٹ ۱۰ کیلو گیہوں اور مہاراشٹر میں فی یونٹ ۸ کیلو گیہوں اور ہریانہ میں ۱۴ کیلو فی یونٹ کی شرح سے اناج دیا جا رہا ہے۔

وزیر موصوف نے بتایا کہ اترپردیش کی جانب سے ہر سال بڑی مقدار میں اناج خرید کر مرکزی پول میں دیا جاتا ہے۔ گزشتہ ۵ برسوں میں ۱۱۸ لاکھ میٹرک ٹن اناج مرکزی پول میں دیا گیا۔ جبکہ گزشتہ ۵ برسوں میں اترپردیش کو مرکزی حکومت نے صرف ۳۲ لاکھ میٹرک ٹن اناج دیا۔

شری رضوی نے بتایا کہ مرکزی وزیر غذا سے یہ بھی اپیل کی گئی ہے کہ وہ اناج مہنگا نہ کریں، اس سے یہاں کے عوام پر کافی بوجھ پڑے گا

۲۰ نکاتی پروگرام میں ریاست کی خصوصی کامیابی

۲۰ نکاتی پروگرام کی عمل آوری کے سلسلے میں حکومت کی جانب سے جاری کردہ تجزیاتی رپورٹ کے مطابق کل ہند سطح پر اترپردیش کو چوتھا مقام حاصل ہوا ہے۔

وزیر مالیات و پارلیمانی امور شری راجندر گپتا نے بتایا کہ مسائل کی زیادتی اور وسائل کی تنگی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس سال ریاست کی کامیابی قابل تحسین ہے۔ یاد رہے کہ گزشتہ سال کی اس مدت میں ریاست کا ۱۳ واں مقام تھا۔

وزیر موصوف نے بتایا کہ بیس نکاتی پروگرام کے تحت منتخب پانچ خاص حلقوں میں سے اس سال سیلنگ آراضی کا الاٹمنٹ اور شجر کاری پروگرام کے تحت ماہ اکتوبر کے آخر تک سالانہ نشانہ سے زیادہ کامیابی مل چکی تھی۔

شری گپتا نے کہا کہ ستمبر تک ریاست سیلنگ زمین کے الاٹمنٹ میں اور شہروں میں کمزور طبقوں کے لیے مکانات کی تعمیر میں سرفہرست رہا ہے۔

وزیر موصوف نے کہا کہ خصوصی کامیابی والے ان پروگراموں کے علاوہ مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم، چھوٹی صنعتوں کے قیام، بندھوا مزدوروں کی بازآبادکاری، درج فہرست قبائل کو مالی امداد، پمپ سیٹوں کی بجلی کاری بایوگیس پلانٹوں کی تنصیب میں ریاست "بہت اچھے" زمرے کے تحت ہے۔

آیوروید علاج کو عوامی بنائیں

اترپردیش کے صحت، علاج، تعلیم اور خاندانی بہبود کے وزیر ریاست ڈاکٹر امر سنگھ نے آیوروید علاج اور تحقیقی امور سے متعلق ڈاکٹروں، لیکچراروں اور ریسرچ اسکالروں سے اپیل کی ہے کہ وہ آیوروید کی مجموعی ترقی کے لئے محنت، ایمان داری اور لگن سے کام کریں۔ آیوروید کی ترقی کے لئے خیالات میں تبدیلی لائیں۔

وزیر ریاست برائے صحت نے کہا کہ آیوروید علاج کا طریقہ سب سے قدیم ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستانی آیوروید علاج کا طریقہ آج دنیا کا بیش قیمتی اثاثہ ہے جسے پوری طرح عمل میں لانا ہم لوگوں کا اہم فریضہ ہے۔

وزیر ریاست برائے صحت نے کہا کہ وسائل کی کمی کے باوجود آیوروید کے علاج، تعلیم اور ریسرچ کے لیے رقم میں کٹوتی نہیں ہونے دی جائے گی۔

انھوں نے مزید کہا کہ آیوروید میں ضبط نفس پر زور دیا گیا ہے ۴۴ برسوں میں آیوروید کے طریقوں میں اتنی ترقی نہیں ہو پائی جتنی کہ اس سے توقع تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ریاست کی موجودہ حکومت آیوروید کی ترقی کے لئے پرعزم ہے اور اس کے لیے کام کر رہی ہے۔

اترانچل کے مربوط قبائل ترقیاتی پراجیکٹوں کے لئے ۵۰ لاکھ روپئے منظور

اترپردیش کے وزیر ریاست برائے اترانچل وکاس شری پورن چندر شرما نے بتایا ہے کہ اترانچل کے پانچ مربوط قبائلی ترقیاتی پراجیکٹوں کی عمل آوری کے لیے حکومت نے ۵۰ لاکھ روپئے منظور کیے ہیں۔

الاٹ کی ہوئی رقم میں سے مربوط قبائل ترقیاتی پروجیکٹ باجپور کو ۱۵ لاکھ ۸۳ ہزار ۲۵۰ روپے، کھٹیما پراجیکٹ کو ۱۳ لاکھ ۵۵ ہزار روپے ناجینی کو ۷ لاکھ ۴۶ ہزار ۵۰۰ روپے، جوشی مٹھ کو ۵ لاکھ ۸۸ ہزار ۱۲۵ روپے اور پراجیکٹ چکراتا کالسی کو ۸ لاکھ بیس ہزار چارسو روپے منظور کیے گئے ہیں۔

محنت کش خواتین کے لئے دو نئے ہاسٹل

حکومت اترپردیش نے ریاست کی کارکن خواتین کی سماجی سطح کو بلند کرنے اور انھیں محفوظ رہائشی سہولت فراہم کرانے کے مقصد سے آگرہ اور وارانسی میں ہاسٹل تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔

اترپردیش خواتین بہبود کارپوریشن کے توسط سے تعمیر کرائے جانے والے ہر ہاسٹل کی تعمیر پر ۱۸٫۱۱ لاکھ روپئے صرف ہوں گے۔

یہ اطلاع اترپردیش خواتین بہبود کارپوریشن کی مینیجنگ ڈائرکٹر محترمہ ادا اورما نے دیتے ہوئے بتایا کہ ریاست میں پہلی بار اس قسم کے ہاسٹلوں کی تعمیر کرائی جارہی ہے۔

محترمہ ادا ورما کے مطابق ان ہاسٹلوں میں ۶۰-۶۰ خواتین کی رہائش کا بندوبست ہوگا اور ان میں تمام ضروری سہولتیں بھی فراہم کرائی جائیں گی۔ ان ہاسٹلوں میں تین ہزار روپئے ماہانہ پانے والی اسی شہر میں برسرکار بیوہ، طلاق شدہ، غیر شادی شدہ کارکن خواتین رہ سکیں گی۔

دہشت گردی کو ختم کرنے میں نوجوان تعاون دیں

وزیر ریاست برائے سیاحت شری ہرک سنگھ راوت نے طلباء اور طالبات سے جماعتی سیاست سے دور رہ کر اپنا سلسلہ تعلیم جاری رکھنے کی اپیل کی ہے۔

شری راوت نے رشی کیش میں واقع گڑھوال کے پنڈت للت نرائن ڈگری کالج کی طلباء یونین کے عہدیداروں کی حلف برداری تقریب کو خطاب کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔

وزیر ریاست برائے سیاحت نے کہا کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے نوجوانوں کو آگے آنا ہوگا۔ اسے صرف پولیس اور فوج کے بل پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپیل کی کہ وہ باشندگان ملک کی فلاح وبہبود کے لیے آگے آئیں اور دہشت گردی کو ختم کرنے میں تعاون دیں۔

شری راوت نے کہا کہ میں نے سیاست کی ابتدا گاؤں پردھان اور بلاک پرمکھ سطح پر نہیں کی تھی بلکہ طلباء یونین کے توسط سے کی تھی۔ اسی لیے میں طلبا اور تعلیم سے متعلق تمام دشواریوں سے بخوبی واقف ہوں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت گڑھوال یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ کے تمام مسائل کے حل کے لیے ہر طرح سے کوشاں ہے۔

موقع پر ہی مسائل کا حل

وزیر ریاست برائے غذا شری بابو رام نے ضلع اڑی کے موضع دھورو سے ٹکریا، بھٹارہ، بچوکھرہ، کرکرو، کھڈانی، بنیرا، ابدھاپور، منسی، گرتھان، سومئی، کنکن کھیڑہ خرد، کنکن کھیڑہ کلاں، برد، دولت پور، رمگوا خرد، اکوڑی اور ایٹہ کے باشندوں کے مسائل کو سنا اور موقع پر متعلقہ محکموں سے ان کو حل بھی کرایا۔

شری بابو رام نے بتایا کہ ان مواضعات کے درج فہرست اقوام کے دس افراد کو دیئے گئے پٹوں پر قبضہ دلایا گیا، ننسی گاؤں میں بجلی کا تار کھنچوا کر بجلی کی فراہمی کو یقینی بنایا گیا اور ایٹہ میں مٹی کے تیل کی دکان کو زیادہ قیمت لینے کے الزام میں رد کر دیا گیا۔ ایندھا میں گرگی، ورد سے دولت پور، ایٹہ سے رمگوا کلاں اور ننسی لنک روڈس فوری تعمیر کے احکامات بھی دیئے۔

وزیر موصوف نے بتایا کہ آئندہ بھی اسی قسم کا دورہ کر کے مسائل کا ازالہ موقع پر ہی کروں گا تاکہ کسی قسم کی شکایت کے لئے عوام کو ادھر ادھر بھٹکنا نہ پڑے۔

انھوں نے مزید کہا کہ ہم کو خود غرضی سے بلند ہو کر عوام اور ملک کے مفاد میں کام کرنا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ دیہی عوام کو مٹی کا تیل اور اشیاء ضروری فراہم کرانے کے لیے راشن کارڈ بنوانے کی کارروائی بھی جلد ہی کر لی جائے گی۔

ہومیو پیتھی کے فروغ کے لیے روپے کی کمی نہ ہونے دی جائے گی

اتر پردیش کے وزیر ریاست برائے صحت ڈاکٹر امر سنگھ نے کہا کہ ریاستی حکومت اقتصادی وسائل کی کمی کے باوجود ہومیو پیتھی علاج ومعالجہ تعلیم اور تحقیق میں پیسے کی کمی نہ ہونے دے گی۔

وزیر صحت نے کہا کہ پریشان حال غریب عوام ہومیو پیتھی کے علاج سے ہی راحت محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ پیتھی زیادہ سود مند اور ہندستان جیسے ملک کے لئے سستی ہے۔

ڈاکٹر امر سنگھ نے ہومیو پیتھی سے وابستہ معالجین اور محققین سے اپیل کی کہ وہ اس پیتھی کی اعلا پیمانے پر نشر واشاعت کر کے اس کے فوائد عوام تک پہونچائیں۔

امداد باہمی زراعت اور دیہی ترقی بینک کے ذریعہ ۱۱۹۱ کروڑ روپئے کے قرضے تقسیم

ریاست کے امداد باہمی وزیر شری سدھیر کمار بالیان نے کہا کہ امداد باہمی کے ذریعہ سے ہی غریبوں اور کسانوں کی معاشی وسماجی ترقی ممکن ہے۔

شری بالیان نے دوران بجٹ میں کسانوں کے ایک وفد کو یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ ریاستی امداد باہمی زراعت و دیہی ترقی بینک کسانوں کو آبپاشی کی سہولت دلانے اور زراعت کی پیداوار میں اضافہ کے لئے قلیل مدتی قرض دیتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بینک کی ۲۶۷ برانچوں کی جانب سے کسانوں کو قرض فراہم کرایا جا رہا ہے۔

وزیر امداد باہمی نے بتایا کہ بینک نے ہر کھیت کو پانی مہیا کرانے کے لئے گزشتہ نومبر تک ۹ء۱۸ لاکھ کسانوں کو ۷ء۱۱۹۱ کروڑ روپے کا قرض تقسیم کرتے ہوئے ۸۱۶۱ ہیکٹیر علاقوں کو مزید آبپاشی کے مواقع فراہم کرائے ہیں۔ بینک نے پردیش میں زراعت کے میدان میں اہم رول ادا کیا ہے۔

شری بالیان نے کہا کہ مربوط دیہی ترقی اسکیم کے تحت منتخب کسانوں کو قرض کی ادائیگی "اکاؤنٹ پیئی چیک" کے ذریعہ کرانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

گنڈک کمانڈ ایریا میں ۲۲۶ ٹیوب ویل لگائے جائیں گے

گنڈک کمانڈ ایریا کے علاقوں مہراج گنج، دیوریا اور گورکھپور اضلاع میں ۲۲۶ ٹیوب ویل لگائے جائیں گے۔

یہ اطلاع دیتے ہوئے وزیر آبپاشی، شری اوم پرکاش سنگھ نے بتایا کہ گنڈک کمانڈ ایریا کے تحت ۳ کیوسک صلاحیت والے جو ٹیوب ویل لگنے تھے انھیں ان تین اضلاع میں لگانے کے لیے افسران کی سطح پر فیصلہ کر لیا گیا ہے۔

سروے کے لیے ہدایات دیتے وقت یہ بھی احکامات دیئے گئے ہیں کہ ٹیوب ویل ایسے مقامات پر لگائے جائیں جس سے کمانڈ ایریا میں آنے والے ان تینوں اضلاع کے ہر بلاک میں آبپاشی صلاحیت میں اضافہ ہو اور علاقائی نابرابری کم کی جا سکے۔

دیہی ریاں آبپاشی اسکیم کے تحت ان اضلاع کے کچھ بلاکوں کی آبپاشی کو صد فی صد کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ان ۲۲۶ ٹیوب ویلوں کے قائم ہوجانے پر ۴۵ ہزار ہیکٹیر آراضی کی مزید آبپاشی ہو سکے گی۔

وزیر موصوف نے اعلا افسران کو یہ بھی ہدایت کی کہ ریاست میں جن ۲ ہزار ٹیوب ویلوں کی بجلی کاری کی گئی ہے ان کا نظام تقسیم بے ترتیب ہونے کے باعث صلاحیت بھر ان کا استعمال نہیں ہو پا رہا ہے، انھیں جلد ہی ٹھیک کیا جائے۔

غالب الاخبار .... صفحہ ۲۴ کا بقیہ —

اس ماحول سے متاثر ہونا ایک فطری بات تھی۔ لیکن غالب کے پرستار تھے اور ان کے رنگ و آہنگ سے بے حد متاثر تھے۔ نادم سیتاپوری کے مطابق دراصل واقعہ یہ ہے کہ ریاض نے غالب کے رنگ کو اپنایا نہیں تھا بلکہ ان کے دیوان کا جواب کہہ رہے تھے لیکن ریاض لکھنؤ اسکول کے ہونے کے باوجود دہلی اسکول کے پرستار تھے۔ اس کا ثبوت ان کا "فتنہ اور عطر فتنہ" ہے جس میں دہلی اسکول کے نمائندہ شعراء کا کلام چھپتا تھا اور اس کے دروازے دلی اسکول کے لئے کھلے تھے۔

"فتنہ اور عطر فتنہ" کے اکثر ایسے شمارے بھی ملتے ہیں جن میں داغ کے شاگردوں کے علاوہ کسی کا کلام نہیں ملتا اور بقول نادم سیتاپوری اسیر جلال، نسیم، امیر اور داغ جیسے اساتذہ کی غزلوں کا انتخاب نہیں کیا جاتا تھا بلکہ پوری پوری غزلیں شائع کی جاتی تھیں۔ "فتنہ اور عطر فتنہ" ریاض خیرآبادی کے اخبار "ریاض الاخبار" کے ضمیمے کے طور پر گورکھپور سے شائع ہوتا تھا۔

غرضیکہ خطۂ اودھ کا شہر سیتاپور اس وقت جبکہ لکھنؤ اور دلی کے درمیان ادبی محاذ آرائیاں شباب پر تھیں، دلی کے ساتھ تھا۔ یہاں غالب کے پرستار بھی موجود تھے اور غالب شناس بھی۔ لکھنؤ میں غالب کو عدم مقبولیت کے باوجود سیتاپور کی ادبی محفلوں میں غالب کا کلام ذوق و شوق سے سنا جاتا تھا اور کئی شعرا غالب کے رنگ میں اپنا کلام پیش کرتے تھے اور داد تحسین وصول کرتے تھے۔

□□

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "خوابوں کے بدن" (افسانے)
مصنفہ: مہ ناز انور   قیمت ۵۰/ روپے
ملنے کے پتے: (۱) مکتبہ جامعہ اُردو بازار، دہلی
(۲) نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

خوابوں کے بدن" مہ ناز انور کے سترہ افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا پیش لفظ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تحریر کیا ہے۔ "روایت" کے عنوان سے خود مصنفہ نے اُردو افسانے کی روایت کا جائزہ لیا ہے اور "میں اور میرے افسانے" کے تحت اپنے بعض افسانوں کا پس منظر بھی پیش کیا ہے۔ ان تمام تحریروں کو پڑھنے کے بعد مہ ناز انور کی شخصیت اور ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں قدرتی طور سے ذہن میں ایک خاکہ بن جاتا ہے مگر ان کے افسانوں کی جو فضا ہے وہ اس ذہنی خاکے سے من وعن مطابقت نہیں رکھتی۔ مہ ناز انور کے افسانوں کے موضوعات میں گھریلو زندگی اور عورت کے سماجی اور شخصی مسائل کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ افسانہ نگار کو انہیں موضوعات کو افسانے میں پیش کرنا چاہیے جن سے اس کی حقیقی واقفیت ہو۔ مگر دور حاضر کی چند خاتون افسانہ نگاروں نے ان موضوعات پر اتنی گہرائی اور گیرائی سے لکھا ہے کہ اب کسی اور افسانہ نگار خاتون کا انھیں موضوعات پر ہلکے پھلکے انداز میں لکھنا اس کی اپنی شناخت بنانے کے لیے ناکافی ہے۔

اس کتاب کے بعض افسانے مثلاً زاویے، خالی لفافہ، جزیرہ اور برنت پگھلنے کے بعد قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر ان کی بُنت میں ماورائے سخن کوئی بات نظر نہیں آتی۔ میرے خیال میں اس مجموعے کا سب سے اچھا افسانہ "ایک لمحہ" ہے۔ اس میں ایک غریب آدمی (مالی) کی نفسیاتی کیفیت کا اظہار بھی ہے اور سماجی اونچ نیچ پر خوبصورت طنز بھی ـــ اس افسانے کا بیانیہ بھی نقطۂ عروج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

اس مجموعے میں کم از کم ۲ افسانے ایسے ہیں جن کو افسانہ کہنا مشکل ہے۔ "فردوس گم شدہ" جذباتی وابستگی کی بنا پر ایک جانے پہچانے گاؤں کا محض رائٹ اپ ہے۔ اسی طرح "سوالیہ نشان" ایک ہلکا پھلکا سفرنامہ ہے جس میں مہ ناز انور نے قاری کو بمبئی اور گوا کے ساحلوں کی سیر کرائی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کو کسی زاویے سے بھی افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ افسانے کے تقاضے کو پورا نہیں کرتے۔

مہ ناز انور کی زبان عام فہم اور افسانے کی فضا سے ہم آہنگ ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ افسانے نوجوان قارئین، خاص طور سے خواتین کے لیے پرکشش ثابت ہوں گے۔

ــــــــــــ نامی انصاری

نام کتاب: "ترسیل سخن" (شعری مجموعہ)
شاعر: ناوک حمزہ پوری
ملنے کا پتہ: قوس اُردو لائبریری۔ حمزہ پور، ڈاک خانہ شیر گھاٹی۔ گیا

اُردو کے بزرگ شاعر ناوک حمزہ پوری کا شعری مجموعہ "ترسیل سخن" نظموں اور رباعیوں پر مشتمل ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔

اس مجموعے کی منظومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناوک صاحب اپنے خیالات و احساسات نظم کرنے میں پوری طرح قادر ہیں۔ وہ صالح اور تعمیری ادب کے علمبردار ہیں۔ ان کے یہاں خلوص و صداقت ہے۔ زبان میں روانی اور سادگی ہے۔ خیالات میں عمدگی اور پاکیزگی ہے۔ البتہ طرز سخن ضرور روایتی ہے جس کا اعتراف خود شاعر نے اپنے "ابتدائیہ" میں کیا ہے۔ مجموعہ کی بعض نظمیں جیسے "انتظار" اور "خطوط متوازی" شاعر کے جمالیاتی ذوق اور ادبی شعور کی آئینہ دار ہیں ؎

ہے تصویر خلوص بیکراں اُلفت کا پیکر ہے
یہ ایثار مجسم ہے یہ قربانی کا زیور ہے
یہ بیوی ہے یہ بیٹی ہے، یہ خواہر ہے، یہ مادر ہے
مگر ہر روپ میں مہر و مروّت کی یہ خوگر ہے

اسی سے رونق افروز محبت آپ کا گھر ہے

کسی نے خوب فرمایا کہ عورت نصف بہتر کر

(خطوط متوازی)

مجموعہ میں شامل "بہار آزادی"۔ "جمال آزادی"۔ "دردیش خود آگاہ" "پندرہ اگست"۔ "یوم جمہوریہ" اور "مہر نامہ" وغیرہ نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ شاعر کا احساس قومی و حب الوطنی کے پاکیزہ جذبات سے سرشار ہے "ثنائے رسولؐ"۔ "پیغام اسلامی" "ماہِ صیام" اور "مومن" جیسی نظمیں شاعر کے جذبۂ ایمانی کا ثبوت ہیں۔ مجموعہ میں شامل رباعیات مختلف رنگ میں ہیں۔ کسی میں دین کی پرکیف تاثیر ہے اور کسی میں ناصحانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ بعض رباعیات موجودہ رفتار زمانہ کا پتہ دیتی ہیں اور کسی رباعی سے قومی یک جہتی اور بھائی چارہ کا پیغام ملتا ہے ؎

ہے خاکِ وطن عزیز از جاں ناوک
دھرتی اپنی ہے اپنی ہی ماں ناوک
ناموسِ وطن کے ہیں نگہباں دونوں
ہندو ہو یا کوئی مسلماں ناوک

مجموعہ کی کتابت اور طباعت بہتر ہے۔

—— ڈاکٹر انور حسین خاں

نام کتاب: "گلِ آبرو" (شعری مجموعہ)
شاعر: پنکج سرحدی
ملنے کے پتے: (۱) پنکج سرحدی اے، شاہ دانا کالونی۔ بریلی
(۲) دانش محل۔ امین آباد لکھنؤ

"گلِ آبرو" پنڈت سدرشن لال شرما پنکج سرحدی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہو چکا ہے پنکج نے ریلوے کی ملازمت کی مصروفیات کے باوجود شمع شعر و سخن کو روشن رکھا اور آج ان کا دوسرا مجموعۂ کلام منظر عام پر آگیا۔

"گلِ آبرو" کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ حمد اور نعت کے بعد ۳ نظمیں اور ۵۹ غزلیں ہیں۔ پنکج کا انداز شاعری روایتی ہوتے ہوئے بھی بہت دلکش اور موثر ہے۔ وہ زندگی کے تقاضوں، زمانے کے نشیب و فراز اور عصری رجحانات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ان کا کلام دلی جذبات و محسوسات کا مظہر ہے اور زندگی کے گہرے مشاہدے کا آئینہ دار ہے۔ ان کی نظمیں "سرحد"۔ "عورت"۔ "تاج محل"۔ "معاہدۂ تاشقند" اور "نزولِ وارث" کافی متاثر کرتی ہیں۔ غزلوں کے بیشتر اشعار قاری پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں ؎

ملتا جلتا ہے تیری صورت سے
میں نے کھلتا گلاب دیکھا ہے

اک تری ذات کے سوا میں نے
جو بھی دیکھا سراب دیکھا ہے

پنکج سنا رہا تھا محبت کی داستاں
کیوں آپ اپنے آپ پریشان ہو گئے

میں سلگتی ہوئی آگ ہوں   مجھ کو تھوڑی ہوا دیجئے
عہدِ نو کا میں سقراط ہوں   زہرِ نفرت پلا دیجئے

ربط سب سے بڑھایئے لیکن
کوئی زنجیرِ پا نہ ہو جائے

ان کے رخ پر حسین گیسو ہیں
چاند روشن ہے رات باقی ہے

"گلِ آبرو" پنکج سرحدی کی صلاحیت اور ریاضتِ فن کا عکاس ہے مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ اہلِ دل پسند کریں گے اور اہلِ نظر اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

—— مخمور کاکوروی

نام کتاب: "شعور و ادراک"
مصنف: محمد ایوب واقف۔   قیمت: ۸۰/- روپے
ملنے کا پتہ: دانش محل۔ امین آباد لکھنؤ

تصنیف اور تالیف کی دنیا میں محمد ایوب واقف کا نام اجنبی نہیں ہے۔ وہ ہمارے ان ادیبوں میں سے ہیں جو شعر و ادب کی خدمت کو

دت سمجھتے ہیں ۔ وہ ایک طویل عرصے سے لکھ رہے ہیں ۔ زیرِ نظر تاب ان کے سلسلۂ مطبوعات کی چھٹی کڑی ہے جو تنقیدی اور یقیقی مضامین پر مشتمل ہے ۔

اس مجموعہ کے بیشتر مضامین بے حد اہم اور معلوماتی ہیں اور ان ، افادیت بہر حال مسلم ہے " اندرادت اور اس کا مصنف " ۔ تلی قطب شاہ "۔" پارو ایک منظوم ڈرامہ " اور " اُردو اور ہندی مسئلہ " وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن میں مصنف نے پوری دیانتداری رنیک نیتی کا مظاہرہ کیا ہے اور جو ان کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں ئکری جودت کے آئینہ دار ہیں ۔ البتہ " اُردو کا ایک نایاب مرثیہ " عنوان سے شامل مضمون میں فاضل مقالہ نگار سے سہو ہوا ہے ۔ انھوں خوشتر احمد آبادی کے جن اشعار کو مرثیہ قرار دیا ہے وہ نفسِ مضمون رساخت دونوں اعتبار سے " سلام " کے اشعار ہیں جو ایک الگ ینفرد صنفِ سخن ہے ۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں ؎

ہے نورِ چشمِ احمد شبیرؑ اس کی الفت
نورِ صراط ہے اور ایمان کا ضیا ہے

اللہ ہی جانتا ہے آلِ نبیؐ کا رتبہ
رُوح الامیں کو پر کچھ اس کا پتہ چلا ہے

۲۶۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں خواجہ احمد عباس اور لانا صباح الدین عبدالرحمٰن کے شخصی خاکے بھی شامل ہیں جنھیں دلچسپ یرایہ میں قلم بند کیا گیا ہے ۔

مجموعی طور پر یہ کتاب معلوماتی اور لائقِ مطالعہ ہے ۔ کتابت اور عت بہتر ہے ۔

——— لئیق رضوی

کتاب : بادۂ حجاز (نعتیہ مجموعہ)

ناعر : مولانا بدر القادری قیمت : ۱۲/- روپے

نے کا پتہ : المجمع الاسلامی فیض العلوم ، محمد آباد (اعظم گڑھ)

نعت گوئی ایک مشکل فن ہے جس میں توحید و شرک اور مقام رہیت و مقامِ نبوت سے واقفیت اور فرقِ مراتب کا لحاظ اشد ضروری ہے ورنہ نعت اور حمد کی تمیز مشکل ہو جائے گی اور کہنے والا بجائے ثواب کے عذاب کا مستحق ہو جائے گا ۔

مولانا بدر القادری ایک عالمِ دین ہیں ان کے اس مجموعۂ نعت کی بہت سی نعتیں اچھی ہیں اور ان میں جدت ، لطافت اور شعریت کا احساس ہوتا ہے ۔ اس مجموعہ کلام کا بیشتر حصہ لائقِ تحسین ہے

——— شمس تبریز خاں

نام کتاب : " معصوم کرنیں "

شاعر : حشمت کمال پاشا قیمت ۱۵/- روپے

ملنے کا پتہ : پاشا پبلی کیشن ، بی۔۱۱۹ ، بنگالی بازار گارڈن ریچ ۔ کلکتہ

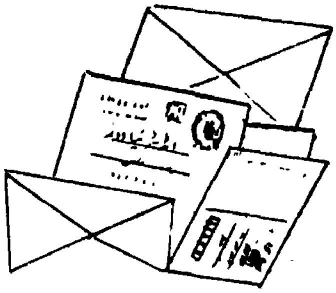
بچوں کے ادب کا تصور آتے ہی سب سے پہلے اقبال کا نام اُبھرتا ہے پھر اسمٰعیل میرٹھی ، حامد اللہ افسر ، شفیع الدین نیّر اور تلوک چند محروم کا ذکر لازم ہے ۔ اُردو ادب میں اس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے ۔ جو لوگ اس میدانِ فکر میں ہیں انھیں اطفال میں وہ مقبولیت نہیں مل رہی ہے جیسی کہ مذکورہ شاعروں کو نصیب تھی ۔ اس کا خاص سبب شاید اس صدی کے نصف کے بعد سے بچوں کے مزاج میں غیر معمولی تغیر ہے ۔ ان کے معمولات اور ان کے تربیتی محرکات میں دیگر اسباب کے ماسوا والدین کی لاپروائیاں بھی شامل ہیں ۔

" معصوم کرنیں " میں انتساب وتقریظ وغیرہ کے بعد چودھویں صفحہ پر حمد سے آغاز ہوا ہے ۔ سولھویں صفحہ پر " نیا قاعدہ " کے عنوان سے ایک ایسی نظم ہے جو بچوں کو حروفِ تہجی سے واقف کرانے کے لیے کہی گئی ہے یہ نظم کچھ سپاٹ سی ہے ۔

اس کتاب میں حشمت کمال پاشا نے جو منظوم کوششیں کی ہیں ان میں کتابت کی خامیوں کے ساتھ ساتھ اور دوسری کمیاں بھی ہیں ۔

——— تسنیم فاروقی

□□



ہمارے نام.....

نیادور بابت نومبر ۱۹۹۱ء نظر نواز ہوا، دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ سردار احمد علیگ نے اپنا مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد اور فن موسیقی" بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کیا ہے۔ موسیقی سے مولانا آزاد کے اشتغال پر اس سے خاصی روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود کا مضمون "اودھ کی تہذیبی تاریخ کی جھلکیاں" بھی بڑا معلوماتی اور دلچسپ ہے ان کے علاوہ "منظفر جون پوری۔ فکر و فن کے آئینے میں" (ڈاکٹر علی باقر زیدی) اور "زیب غوری کا آہنگِ فکر و فن" (علی رضا حسینی) یہ مقالات بھی متعلقہ فن کاروں کی شاعری اور ان کے اکتسابات و انسلاکاتِ فن کا اچھا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ حصہ منظومات میں زاہدہ زیدی اور اظہر عنایتی خاص طور سے پسند آئے۔ توقع ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ اُردو جریدہ مزید ترقی کرے گا۔

میری دعائیں اور تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

—————— فضا ابنِ فیضی

مئو ناتھ بھنجن

مجھے خوشی ہے کہ آپ کا پرچہ نئی آب و تاب کے ساتھ نکل رہا ہے۔ بہ حیثیت مدیر آپ کی یہ کوشش ہونا چاہیے کہ یہ آب و تاب آئندہ بھی اسی طرح باقی رہے۔ میں پرچے کی خوب سے خوب تر اشاعتوں کے لیے دُعاگو ہوں۔

—————— انیس اشفاق۔ لکھنؤ

آپ کی ادارت میں "نیا دور" دن بہ دن نکھرتا جارہا ہے۔ ترسیل کی بے قاعدگی کچھ کچھ باقاعدگی میں بدلنے لگی ہے۔ اگست ۱۹۹۱ء کا شمارہ موصول ہوا۔ اس میں بیشتر تخلیقات آزادیٔ وطن سے متعلق ہیں جو بہت خوب ہیں۔ سبھی تخلیقات جیسے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں ہوں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح خوب ہی نہیں بلکہ خوب تر ہے۔

—————— سراج انصاری ایڈوکیٹ

مومن پورہ۔ برہان پور

نیا دور ستمبر ۱۹۹۱ء موصول ہوا۔ بہت مسرت ہوئی۔ کافی عرصے کے بعد پرچہ کی زیارت ہوئی۔ ماشاء اللہ پچھلے دور سے نیا دور بہت عمدہ ہے۔ مضامین اعلیٰ، ٹائٹل دیدہ زیب، کتابت و طباعت اور کاغذ بہت خوب ہے اس معیار کو قائم رکھیے بلکہ اور اونچا اٹھایئے۔ امید ہے کہ آپ کے دور میں یہ مزید بہتر ہوگا۔

—————— اعجاز احمد قاسمی

ایڈیٹر دیوبند ٹائمز۔ دیوبند

آپ کی ادارت میں شائع ہونے والے اگست، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۹۱ء کے شمارے ملے۔ آپ کی سربراہی میں اس جریدے کے معیار و افادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر نظموں اور غزلوں کی بابت کچھ نہیں کہنا ہے مگر مجھے اب بہت زیادہ مشہور شاعروں پر مضامین و مقالات سے الرجی ہوگئی ہے۔ اگست کے شمارے میں "اودھ کی لسانی وحدت"، "متین مچھلی شہری" اور "ہندی کہانی کا آغاز و ارتقا"۔ ستمبر کے شمارہ میں "پروانہ اور اقبال"، "نشور واحدی کی شاعری" اور "شاطر مدراسی کی شاعری" کے ساتھ اکتوبر کے شمارہ میں "تصور کے صنم خانے"، "تحریکِ آزادیٔ ہند اور لکھنوی ادب" اور "ناصر کاظمی کی شاعری" وغیرہ مضامین و مقالات بطورِ خاص پسند آئے۔

—————— محمد ابراہیم صدیقی

الہ آباد

□□

نیا دور

جلد ۴۶ نمبر ۱۲

مارچ ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر

سید امجد حسین

ٹیلیفون : ـــــــــ ۲۴۳۶۷۹

معاونین :

○ ـ نجیب انصاری

○ ـ محمد الیاس خاں

ٹیلیفون ـــــــــ ۲۴۷۱۰۸

پیشکش : ـــ

آسل سروپ

(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ

یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

ـــ شائع کردہ ـــ

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

فی شمارہ : ـــــ تین روپے

زر سالانہ : ـــــ تیس روپے

ـــ ترسیل زر کا پتہ ـــ

سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

ـــ خط و کتابت کا پتہ ـــ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

ـــ بذریعہ رجسٹری ـــ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

کتابت و تزئین . حسن اختر. لکھنؤ

اپنی بات

اتر پردیش اقتصادی اور سماجی نقطۂ نظر سے کافی پچھڑا ہوا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ رہی ہے کہ گزشتہ سبھی پانچ سالہ منصوبوں میں فی شخص سرمایہ کاری دیگر ریاستوں کی بہ نسبت کم تھی۔ اسی وجہ سے عوام کو کافی پریشانیوں کا سامنا رہا موجودہ حکومت نے عوامی نظامِ تقسیم کو چاق و چوبند اور مستحکم کر کے صارفین کو ہر ممکن راحت دینے کا عہد کیا ہے۔ چور بازاری، منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کے خلاف حکومت نے سخت کارروائی کی ہے۔

ریاست کی ہمہ جہت ترقی کی خاطر حکومت نے مختلف سماجی اور اقتصادی پروگراموں پر عمل آوری کے لئے کچھ اقدام کئے ہیں۔ ریاست کی خوش حالی گاؤں کی خوش حالی پر منحصر ہے۔ سرکار نے گاؤں کی ترقی کو اولیت دی ہے۔ سرکار نے یہ بھی عزم کیا ہے کہ کسانوں کے مسائل نیائے پنچایت سطح پر ہی حل ہو جائیں۔ ترقیاتی پروگراموں میں پیش آنے والی رکاوٹیں بھی مقامی سطح سے حل کی جاسکیں۔

نئی سرکار نے جو نعرہ دیا ہے۔ "نئی سرکار جنتا کے دوار"۔ اس پر عمل درآمد کرنے میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہ پیش آئے۔ روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں، اس کے لئے دیہی ترقیاتی اسکیم اور جواہر روزگار اسکیم پر تندہی سے کام ہو رہا ہے۔

ہماری سرکار کو تقریباً چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ اس دوران ہماری ریاست نے کافی ترقی کی ہے اور وہ دھیرے دھیرے مزید ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارا "کل" آج سے زیادہ روشن اور تابناک ہوگا۔

مارچ کا مہینہ ہم ہندستانیوں کے لئے موسم بہار کی آمد کا مژدۂ جانفزا لاتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے امسال اسی مہینے میں رمضان المبارک کا بھی آغاز ہو رہا ہے اور ہولی بھی اسی مہینے کے وسط میں منائی جائے گی۔ ہم ان عظیم تہواروں کی مبارکباد اپنے تمام قارئین کو پیش کرتے ہیں

——— ایڈیٹر

غزل

فضا ابنِ فیضی

جمال پورہ۔ مئوناتھ بھنجن

فائدے کی چیز ہے یہ خاکِ جاں، محفوظ کرلے
میں سہی، ہر چند حرفِ رائیگاں، محفوظ کرلے

کل، یقین و علم کی ترتیبِ نو میں، کام دے گا
تو کہیں، میرا یہ جہلِ خوش گماں محفوظ کرلے

راکھ کردے گی جلاکر، لفظ و معنی کی یہ حدت
دھوپ میں، اپنے لئے اک سائباں محفوظ کرلے

میں بھی ہوں اک لمحۂ آوارہ، مل جاؤں جو تجھ کو
چلتی پھرتی ساعتوں کے درمیاں محفوظ کرلے

کیوں پشیماں ہے، مری کشتی کو پانی میں ڈبو کر
اب کہو پاگل ہوا سے، بادباں محفوظ کرلے

مستعار انفاس کے رشتے کہاں تک ساتھ دیںگے
توڑ دے سب تیر میری جاں! کماں محفوظ کرلے

ہجرتوں کا سلسلہ بھی، سلسلہ ہے زندگی کا
تو اسی جلتے کھنڈر میں اک مکاں محفوظ کرلے

لوحِ جاں کی روشنائی میں بھگو لے آستینیں
اور خود کو صورتِ سترِ نہاں محفوظ کرلے

کام کس دن آئے گی، فکر و تخیل کی بلندی
تو انھیں لفظوں میں سارا آسماں محفوظ کرلے

مجھ سے یوں غافل نہ رہ، میراث ہوں لوح و قلم کی
اپنے سینے میں یہ نقشِ جاوداں محفوظ کرلے

پھر کہاں میں، پھر کہاں تو، آج تیرے روبرو ہوں
تو مری طرزِ بیاں، میری زباں محفوظ کرلے

لوگ، اس آواز کو ترسیں گے میرے بعد ورنہ
میں ہوں اس بستی میں صحرا کی اذاں محفوظ کرلے

اے فضا! مجھ کو ورق اندر ورق تقسیم مت کر
مختصر جملوں میں، میری داستاں محفوظ کرلے

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی
شعبۂ اُردو ۔ دہلی یونیورسٹی ۔ دہلی

"رَو میں ہے رخشِ عُمر کہاں دیکھیے تھمے"

میری پیدائش ۱۹۲۸ء میں بدایوں (جس کو مدینۃ الاولیا کہا جاتا ہے) میں ہوئی۔ میں ان خوش قسمت لوگوں میں ہوں جن کو ہر جگہ ماحول علمی ادبی اور مذہبی ملا۔ بدایوں میں جس خاندان میں پیدا ہوا وہاں مذہب اور ادب کے چرچے تھے بچپن سے وہ آوازیں کان میں پڑتی رہیں۔

دادی، پھوپی اور تایا حج کی سعادت حاصل کر چکے تھے یہ میرے بچپن کی بات ہے اور بعد کو خاندان کے متعدد لوگوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ علمی اور ادبی ماحول کا یہ حال تھا کہ دادا رفیع احمد عالی۔ تایا رضی احمد رضیؔ والد ضیا احمد ضیاؔ، اور چچا آفتاب احمد جوہر شاعر تھے۔ ان کے شعر و ادب کا اعتراف ممتاز اہلِ قلم نے کیا ہے والد کے چچا شفیع احمد محو اور مولوی مطیع احمد رخشاں امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ان حضرات کو تو میں نے نہیں دیکھا مگر ان کا ذکر ہمہ وقت رہتا تھا۔ جب احباب جمع ہوتے تو مذہبی واقعات کا ذکر ہوتا، یا شعر و ادب کا تذکرہ ہوتا۔ میرے بڑے بھائی حبیب احمد صدیقی حبیبؔ مرحوم اور رفیق احمد بیکس مرحوم بہت اچھا شعر کہتے تھے۔ چچا صاحب قبلہ کا کلام سن کر فراقؔ نے کہا تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بدایوں خود ایک دبستانِ شاعری ہے۔

جہاں تک میرے مسلک کا تعلق ہے، اس کا اظہار ضروری ہے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اول بھی مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان ہوں۔ ابتدا میں ممکن ہے کہ میں مسلمان اس لئے ہوں کہ میرا خاندان مسلمان تھا۔ مگر جب شعور بیدار ہوا تو مجھ کو اپنی اس نعمت پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں خدا سے واقف نہیں تھا مگر جس برگزیدہ شخصیتؐ نے خدا کے وجود کا اعلان کیا، اس کے بارے میں جانتا تھا کہ اس نے غلط بیانی کبھی نہیں کی۔ حضورِ اکرمؐ کی ذات مبارک میں مجھے وہ دل کشی نظر آئی جو مجھے دوسری جگہ نظر نہیں آئی۔ میں سنّی صدیقی حنفی ہوں اور یہ میرا مسلک ہے۔ صحابۂ کرام رضؓ کا احترام اور محبت اپنے ایمان کا جزو خیال کرتا ہوں۔ میرے بعض قریبی عزیزوں میں شیعہ مسلک کے لوگ تھے اس لئے شیعہ حضرات کے درمیان مجھے کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ یہی سبب ہے کہ میرے خاندان میں شیعہ سنّی نزاع تو کیا کبھی بحث کا موضوع بھی نہیں بنا ؎

ما قصّۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

میری تمام تر تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ ابتدا سے لے کر یونیورسٹی تک میں نے علی گڑھ میں پڑھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اُردو (۱۹۵۳ء) اور فارسی (۱۹۵۹ء) میں ایم، اے کیا۔ اس کے بعد جب دہلی آیا تو یہاں "مومن ۔ شخصیت اور فن" پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسکول کے زمانے میں دو اُستادوں سے خاص طور پر متاثر رہا۔ سید محمد ٹونکی مرحوم اور مولوی مفتی عبدالقیوم صاحب ۔ اوّل الذکر انگریزی اور اُردو پڑھاتے تھے اور موخرالذکر دینیات کا درس دیتے تھے۔ حق گوئی اور بیباکی ان دونوں کے مزاج کا حصّہ تھے۔

یونیورسٹی میں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب، معین احسن جذبی صاحب، مسعود حسین خاں صاحب، محمد عزیز صاحب اُردو کے اساتذہ تھے اور فارسی کا درس پروفیسر ہادی حسن صاحب اور والد مرحوم مولانا ضیاء احمد بدایونی سے لیا۔ ان تمام اساتذہ میں مرکزی حیثیت حضرت قبلہ والد صاحب مرحوم کی تھی۔ جن کے قدموں میں بیٹھ کر میں نے ادبی ذوق کی تسکین حاصل کی۔

میں نے اسکول کے زمانے سے مضمون لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اسکول کے زمانے میں جبکہ نویں کلاس میں پڑھ رہا تھا تو اسکول میگزین میں مضمون لکھا "فانی کے کلام میں درد کیوں ہے" اس مضمون پر میرے استاد سید محمد ٹونکی صاحب نے بڑی محبت سے میری تعریف کی اور اسکول کا بہترین مضمون نگار کا انعام دلوایا۔ اس کے ساتھ اسکول میگزین کے بورڈ میں مجھے بھی شامل کرلیا۔ وہ کون سا مبارک دن تھا، کس مقدس شخصیت نے ہمت افزائی کی تھی کہ اس کے بعد یہ شوق برابر بڑھتا گیا۔ میں مضمون لکھتا، والد صاحب قبلہ سے اصلاح لیتا۔ قبلہ کے اصلاح دینے کا عجیب انداز تھا وہ صرف ایک آدھ لفظ بدل دیتے یا کوئی جملہ بدل دیتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پیراگراف حذف کر کے خود لکھ دیا ہو۔ البتہ جن باتوں کی کمی کا احساس ہوتا ان کی نشان دہی ضرور فرما دیتے۔ اسکول میگزین کے علاوہ میری ہمت افزائی علی گڑھ کے ایک ہفتہ وار اخبار "جمہور" نے کی جو بالائے قلعہ سے شاہد خان شیرانی صاحب نکالتے تھے۔ ایم۔ اے تک یہ اخبار ہمارا ساتھ دیتا رہا۔ یہ لطیفہ بھی یاد ہے کہ فانی پر ایک مضمون لکھا اور جوش میں آکر رسالہ "آج کل" کو بھیج دیا۔ عرش ملسیانی اس کے دیر تھے۔ ہمارا مضمون شکریہ کے ساتھ واپس آگیا۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کا ذکر میں نے خلیل الرحمان اعظمی مرحوم سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا مضمون اچھا ہے۔ شاید آپ سے ناواقف ہونے کی وجہ سے مضمون واپس آگیا ہے۔ خلیل صاحب نے مضمون "فانی کا فلسفۂ غم وعشق" مجھ سے لیا اور خود آج کل کو بھجوادیا اور عرش صاحب کو لکھ دیا کہ ظہیر صاحب میری فرمائش پر یہ مضمون آپ کو بھجوا رہے ہیں۔ اس دن بڑی خوشی ہوئی جب رسالہ میں مضمون شائع ہوا اور غالباً چالیس روپیہ کا منی آرڈر معاوضہ مضمون موصول ہوا۔ ——— یہ پہلا معاوضہ تھا جو مضمون کے سلسلے میں ملا تھا۔ مضمون کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی یاد آ رہا ہے کہ میں نے اپنا مضمون میاں بشیر الدین صاحب مدیر ھمایوں لاہور کو بھیجا۔ مضمون تھا "فلسفۂ غم کی ماہیت اور اس کی اہمیت" روانہ کرنے کے بعد انتظار کرنے لگے کہ کب معذرت کے ساتھ مضمون واپس آتا ہے۔ ایک روز میاں بشیر الدین صاحب کا خط آیا کہ آپ کا مضمون بے حد پسند آیا اور اس کو میں نے ہمایوں کے سالنامے کے لئے رکھ لیا ہے۔

میرے دادا کا انتقال تو اس وقت ہوگیا تھا جب میں بہت چھوٹا تھا۔ ان کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور نظر میں ہے۔ دادا صاحب شاعر تھے اور فن شاعری اور زبان پر غیر معمولی عبور حاصل تھا چنانچہ ان کی تالیف تصحیح اللغات زبان کے سلسلے میں سند کہی جا سکتی ہے۔ ان کا پیشہ وکالت تھا، ظاہر ہے کہ ان سے استفادہ کا موقع ممکن نہ تھا البتہ والد صاحب مرحوم کے قدموں میں بیٹھ کر سیکھنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ وہ میرے والد بھی تھے اور استاد بھی۔ اپنے تمام بھائیوں کے مقابلے میں یہ نعمت مجھے حاصل رہی کہ ان سے فیض حاصل کروں۔

میری ملازمت کی یہ کہانی بھی دلچسپ ہے: ۱۹۵۲ء میں جب میں نے اُردو میں ایم۔ اے کیا تو فطری طور پر ملازمت کی جستجو ہوئی۔ رشید احمد صدیقی کی مہربانی سے شعبہ میں عارضی طور پر لیکچرر بھی مقرر ہوگیا۔ اسی زمانے میں ایک مستقل لیکچرر کی جگہ کا اشتہار ہوا۔ مجھ کو یہ اعتماد کہ میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے ہوں عارضی طور پر کام کر رہا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرے خاندان کی خدمات اس درس گاہ سے وابستہ ہیں اور شاید ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے وائس چانسلر ذاکر صاحب، صدر شعبۂ اردو رشید احمد صدیقی صاحب اور ایکسپرٹ آل احمد سرور صاحب نے بعض لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ اس جگہ پر خلیل الرحمن اعظمی یا ظہیر احمد صدیقی کا تقرر ہوگا۔ انٹرویو ہوا اور اس میں نہ میرا تقرر ہوا اور نہ خلیل الرحمن

مرحوم کا، بلکہ سرور صاحب لکھنؤ سے ڈاکٹر محمد حسن صاحب کو لے کر آئے تھے اور اپنے [illegible] سے ان دونوں حضرات (وائس چانسلر اور صدر شعبہ) کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ یہ میرے لیے زندگی کا پہلا سانحہ تھا اور میں یہ تصور کر کے رہ گیا کہ اتنے بڑے لوگ بھی کسی سیاست کا شکار ہو سکتے ہیں۔

انٹرویو کے دوران یہ قصہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہم غالب، اقبال وغیرہ کو یاد کر کے پہونچے تھے۔ تاریخ ادب کے ادوار کو بار بار دہرا رہے تھے مگر جب سلیکشن کمیٹی کے سامنے پہونچے تو ذاکر صاحب نے اچانک سوال کر دیا کہ "ایک اچھے استاد کی پہچان کیا ہے؟"۔ آپ یقین جانیے کہ پسینہ آگیا اور ذہن سے غالب و اقبال وغیرہ سب غائب ہو گئے۔ چند لمحات تک تو نروس رہا، پھر ذہن نے رہنمائی کی کہ ذاکر صاحب غیر متعلق سوال کر دیتے ہیں تو کیوں نہ غیر متعلق جواب دیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ

"استاد کو ایمان دار ہونا چاہیئے۔"

کہنے لگے ــ "استاد ایمان دار ہے مگر پڑھانا نہیں آتا۔"

میں نے کہا۔ "اگر ایمان دار ہے تو استعفا دے دے گا۔"

اب سوچتا ہوں کہ جواب غیر متعلق نہیں تھا کہ من جانب اللہ رہنمائی ہو رہی تھی۔ بعد کو اس جواب کی رشید احمد صاحب سے داد ملی اور سب ذہنی تکدر دور ہو گیا۔ اپنے تقرر نہ ہونے پر کافی دن تک ذہنی طور پر الجھا رہا۔ اسی الجھن میں ایک روز ذاکر صاحب کے پاس پہونچ گیا۔ میرے افسردہ لہجے میں تلخی تھی۔ میں نے کہا۔

"اب تک خیال تھا کہ اردو اور علی گڑھ والے کے لیے ہندوستان میں جائے پناہ علی گڑھ ہے مگر اب معلوم ہوا کہ میرے سوچنے کا انداز غلط تھا۔ اب نوجوان پاکستان نہ جائیں تو کیا کریں۔"

ذاکر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا اور برہمی سے بولے۔

"تم ہاں آپ بھی پاکستان چلے جائیے اور جو کر سکتے ہوں وہ کیجیے۔"

میں نے عرض کیا کہ "میں کیا کر سکتا ہوں۔ البتہ یہ ضرور یاد رہے گا کہ میرے وائس چانسلر صاحب نے مجھ سے یہ کہا ہے۔"

ذاکر صاحب کا لہجہ نرم ہو گیا اور جب میں افسردگی کے ساتھ اٹھ کر جانے لگا تو کمرہ کے باہر تک ساتھ آئے۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے ــ

"میرے عزیز! زندگی کی چھوٹی چھوٹی ناکامیوں سے اس طرح متاثر ہو گئے تو بڑی ناکامیاں کیسے برداشت کرو گے؟"

اس جملے نے واقعی مجھے حوصلہ دیا۔ جب باہر آیا تو میں نے اللہ سے توبہ کی کہ میں نے تیرا سہارا لینے کے بجائے کمزور سہاروں کو اپنانے کی کوشش کی۔ شاید خدا کو بندہ کا یہ عجز پسند آگیا اور اچانک ایک روز دہلی کالج کے پرنسپل مرزا محمود بیگ صاحب علی گڑھ تشریف لائے اور پروفیسر عمرالدین صاحب (شعبہ فلسفہ) سے کہا کہ ہم کو سینٹ اسٹیفن کالج کے لیے ایک لکچرر کی ضرورت ہے۔ عمرالدین صاحب نے اس زیادتی کی داستان سنائی جو میرے ساتھ ہوئی تھی۔ بیگ صاحب نے مجھے بلوایا اور دریافت کیا کہ میں دہلی میں ملازمت کرنا پسند کروں گا۔ علی گڑھ کو چھوڑنے کا تصور میرے لیے روح فرسا تھا مگر ذہن اس قدر ماؤف تھا کہ میں نے فوراً اپنی رضامندی دے دی۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ کار سے چلیے اور کل جوائن کر لیجیے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملازمت اس طرح خود چل کر میرے پاس آئے گی ـــــ بے ساختہ زبان سے نکلا کہ واقعی سب سے مضبوط سہارا صرف اللہ کا ہوتا ہے۔

دہلی آئے اور سینٹ اسٹیفن کالج کے استاد ہو گئے۔ یہ جگہ عارضی تھی مگر ایک سال کے بعد ہی دہلی کالج میں جگہ ہوئی اور میں مستقل ہو کر دہلی کالج آگیا۔ ابھی دہلی کالج میں پانچ سال ہوئے تھے کہ دہلی یونیورسٹی میں میرا تقرر (۱۹۶۱ء) ریڈر کی حیثیت سے ہو گیا۔ اسی کے ساتھ خواجہ احمد فاروقی صاحب کے امریکہ چلے جانے کی وجہ سے قائم مقام صدر شعبہ مقرر ہوا۔ اس کے بعد قائم مقام اور مستقل شعبۂ اردو کی صدارت کا موقع ملا۔ گویا ملازمت چار حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۵۵ء میں سینٹ اسٹیفن کالج، ۱۹۵۵ء میں ہی دہلی کالج میں تقرر ہو گیا اور ۱۹۶۱ء میں دہلی یونیورسٹی پہونچا۔

میری شادی میری پھوپی کی لڑکی افتخار بیگم سے ۱۹۵۴ء میں ہوئی۔ اس وقت وہ بی اے میں پڑھ رہی تھیں۔ علی گڑھ سے بی اے کرنے

کے بعد دہلی سے فرسٹ ڈویژن میں ایم، اے کیا اور اس کے بعد جب وہ علی گڑھ میں لیکچرر تھیں اس زمانے میں شاکر ناجی کے کلیات کی تدوین پر ان کو پی ایچ. ڈی کی ڈگری ملی. علی گڑھ سے دہلی آگئیں اور یہاں ذاکر حسین کالج میں شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں. ہمارے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں. لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے اور صاحب اولاد ہیں. لڑکے ابھی پڑھ رہے ہیں.

میں نے مولوی شفیع احمد محو کا ذکر کیا تھا وہ افتخار بیگم کے دادا اور افضال احمد بسمل ان کے تایا تھے. یہ دونوں امیر مینائی کے شاگرد تھے. افتخار بیگم کے بھائی پروفیسر ظفر احمد صدیقی شعبۂ فلسفہ کے صدر تھے. دوسرے بھائی پروفیسر اختر اقبال کمالی. اظہر احمد کمالی مرحوم اور نیر اقبال کمالی یہ سب شعر کہتے ہیں اور بہت اچھا کہتے ہیں. خدا نے حافظہ غیر معمولی دیا ہے. اس ماحول کا اور علی گڑھ کی تعلیم کا اثر تھا کہ افتخار بیگم کو شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا. انھوں نے پہلی نظم حج بیت اللہ جاتے وقت اس وقت کہی جب گھر پر دو برس کے بچہ (منیر احمد عرف شیخو بابا) کو چھوڑ کر جا رہی تھیں اور قیام بیت اللہ کے وقت گھر کی یاد بھول گئیں اور نعتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا. شاعری کے علاوہ ان کو خاکے لکھنے کا بھی شوق ہے. خاندانی روایت کے مطابق انھوں نے بھی گوشۂ گمنامی اور گھر کی چہار دیواری کو زیادہ پسند کیا.

مجھ کو ادبی ذوق و شوق کچھ تو ورثہ میں ملا اور کچھ ماحول کا احسان ہے. ورنہ میں کیا اور میرا ادبی سفر کیا. خوش قسمتی سے وطن وہ تھا جس کے شعر و ادب کا چرچا تاریخ کا حصہ بن چکا ہے. خاندان وہ ملا جس کے علم و فضل کی قسم کھائی جا سکتی ہے. تعلیم کے لئے وہ سرزمین ملی جس کو مدینۃ العلم (علی گڑھ) کہا جا سکتا ہے. اسکول اور یونیورسٹی کے استاد وہ ملے جن کو علم کا کوہ پیکر کہیے. ملازمت کے لیے غالب و مومن کی سرزمین ملی اور لطف یہ ہے کہ کالج وہ ملا جس کی ادبی روایت آزاد، نذیر احمد. مولوی مملوک علی اور صہبائی سے شروع ہوتی ہے یعنی میری مراد دلی کالج سے ہے. خدا نے جب اتنی نعمتیں فراہم کر دیں تو شعر و ادب سے دلچسپی نہ ہوتا کفران نعمت نہ ہوگا تو کیا ہوگا.

اس پورے سفر میں جو تصنیفات وجود میں آئیں ان کی تفصیل یہ ہے:

۱. مومن ۔ شخصیت اور فن (۲) مومن دہلوی
(۳) انشائے مومن (مرتبہ و مترجم)
(۴) شرح قصائد مومن (۵) انتخاب دیوان مومن
(۶) دیوان درد (مرتبہ) (۷) بچوں کے میر و درد
(۸) جذبات رضی
(۹) نقش ہائے رنگ رنگ (غالب کے فارسی کلام کا انتخاب اور ترجمہ)
(۱۰) فانی کی شاعری (۱۱) مثنوی سحر البیان (مرتبہ)
(۱۲) مثنوی گلزار نسیم (مرتبہ) (۱۳) مطالعۂ انیس
(۱۴) مطالعۂ حالی (۱۵) فانی کی شاعری
(۱۶) بچوں کے فانی (۱۷) فکری زاویے (مضامین)
(۱۸) احساس و ادراک (مضامین) (۱۹) ادب میں جمالیاتی اقدار
(۲۰) علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر
(۲۱) دلی کالج میگزین ۔ دلی کا دبستان شاعری نمبر

اس وقت فانی کا کلیات مرتب کر چکا ہوں جو عنقریب شائع ہو جائے گا. اس سلسلے میں یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ جب مجھے کسی مشورہ کی ضرورت ہوئی تو برادر مکرم پروفیسر ظفر احمد صدیقی پروفیسر اختر اقبال کمالی. پروفیسر صبیح احمد کمالی نے رہنمائی کی اور بیگم ظہیر کے تعاون نے بہت سے مسائل کو سہل بنا دیا.

قیام دہلی کے زمانے میں جس شخص نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خواجہ احمد فاروقی تھے. خواجہ صاحب نے دہلی میں اردو کی شمع اس وقت روشن کی جب حادثات زمانہ اس کو بجھانے پر آمادہ تھے. خواجہ صاحب نے زبانوں کے ارتباط پر اس وقت زور دیا جب تک ساہتیہ اکاڈمی وجود میں نہیں آئی تھی. انھوں نے دہلی یونیورسٹی اور اس کے کالجوں میں اردو تعلیم کا بیڑہ اس وقت اٹھایا جب صرف تین استاد اور ایم اے میں چار طالب علم ہوا کرتے تھے. میں اس بات کا گواہ ہوں کہ انھوں نے شعبہ کے فروغ کے لیے کبھی دن کو دن اور رات کو رات نہیں کہا. جب وہ کام کرتے کرتے تھک جاتے تو یہ ان کے لیے کام کا آغاز ہوتا. خواجہ صاحب

میرے صرف صدر شعبہ ہی نہیں تھے بلکہ محسن بھی تھے۔ آپ کو شعبہ کے بیشتر اصحاب وہ ملیں گے جو خواجہ صاحب کے ممنون کرم ہیں وہ اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں۔ اُردو کے احسانات تو بہت سے لوگوں پر ہیں مگر خواجہ صاحب کا احسان اُردو پر ہے۔ ان کی اس بے لوث خدمت کا اعتراف بہرنوع کرنا ضروری تھا۔ اس لئے ان کے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے اپنی صدارت کے زمانے میں تین کاموں کو انجام دینے کا بیڑہ لیا۔ ایک یہ کہ خواجہ احمد فاروقی کے نام پر گولڈ میڈل دیا جانے لگے۔ دوسرے وہ پروفیسر ایمرٹیس ہو جائیں اور تیسرے ارمغان فاروقی شائع ہو جائے۔ خدا نے مجھے سرخرو کیا اور شعبہ کے احباب کا تعاون تھا کہ یہ سب کام اس خوبی سے ہوئے کہ لوگوں کو تعجب تھا۔ ان کاموں کی تکمیل خواجہ صاحب کی ہردلعزیزی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اکثر لوگ دریافت کرتے ہیں کہ میں نے شاعری کب سے شروع کی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں شاعر نہیں بلکہ نثر نگار ہوں تو آپ کو تعجب تو نہیں ہونا چاہیئے۔ کبھی کچھ ٹوٹے پھوٹے شعر لے کر برادر محترم اظہر احمد کمالی مرحوم کی خدمت میں اور کبھی برادر محترم میکش بدایونی مرحوم کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ ان کی اصلاح ان اشعار کو اس قابل بنا دیتی کہ احباب کی محفل میں پیش کر سکوں۔ یہی سبب ہے کہ شعری سرمایہ اس قدر کم ہے کہ تازہ غزل بھی معلوم نہیں کہ کتنی مرتبہ محفل میں سنا چکا ہوں۔

ہاں البتہ اس روایت کا دوسرا حصّہ دلچسپ ہو سکتا ہے کہ میں کن شعرا سے متاثر ہوں۔ میں جب اپنی پسندیدگی کی بات کر رہا ہوں تو کسی شاعر کو کسی دوسرے شاعر پر ترجیح کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ چند شعرا ہیں جن کو ہمیشہ میں نے پسند کیا ہے اور ان کی عظمت کا قائل رہا ہوں ـــــ میر۔ غالب۔ اقبال۔ انیس۔ فانی۔ مومن۔ اپنی طالب علمی کے زمانے سے معلوم نہیں کیوں فانی کو ذہنی طور پر قریب پایا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اسکول کی تعلیم کے زمانے میں کسی نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہِ محبّت میں قدم میرا

شعر میں معلوم نہیں کون سا جادو تھا کہ آج بھی جب اپنی اس پسند پر نظر ڈالتا ہوں تو کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مومن خاں سے دلچسپی میری بعد کی دریافت ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اگر مومن کے زمانے میں ایک پہاڑ (غالب) درمیان میں نہ آجاتا تو اس شاعر کی بلندی کا لوگ زیادہ بہتر اندازہ کر سکتے تھے۔ نثر نگاروں میں شبلی کی تحریروں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا جو شگفتگی اور رچا ہوا لیاقت رچاؤ مجھے شبلی کے یہاں نظر آتا ہے وہ کسی دوسرے ادیب کے یہاں نہیں نظر آتا۔

مجھ کو اگرچہ شاعری کا دعوا نہیں مگر بقول غالب "کفانِ طبع کی خاطر اپنے سے لگا رکھا ہے۔ چند متفرق اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

ہزاروں بار ترکِ مے پہ آمادہ ہوا لیکن
مجھے ہر بار ساقی کی مروّت روک دیتی ہے

کم سے کم کانٹوں کو اے بادِ فنا رہنے دے
موسمِ گل میں یہ دیوانوں کے کام آئیں گے

چلے ہیں زیست کی راہوں میں روشنی کرنے
جو اپنے گھر کے اندھیرے نہ کر سکے روشن

کسی کی یاد شریکِ رہِ حیات رہی
ہمیں تو ڈر تھا کہ گزرے گا یہ سفر تنہا

میرے گھر میں دُھوپ خوشی کی آئے بھلا تو کیسے آئے
میرے گھر کا آنگن چھوٹا، دریچے، دیوار بلند

فن محدود نہیں ہے یارو رنگوں اور لکیروں میں
دل کے لہو کی آمیزش سے ہوتا ہے فنکار بلند

یہ سناٹوں کے محرم، یہ سیاہ راتوں کے سیلانی
سحر کے نور سے کتنے پریشاں ہو گئے ہوں گے

غزل

ماں اس سے اور زیادہ نہیں مجھے
س کے سوا کسی کی تمنا نہیں مجھے

ٹب ہوا تمام ہی چہروں سے آب و رنگ
رہ نظر میں اب کوئی جچتا نہیں مجھے

یں خود سے آگیا ہوں تمھاری گرفت میں
ب مجھ کو پا گئے ہو تو کھونا نہیں مجھے

نکھوں سے اپنی دیکھ لیا اتنا کچھ کہ بس
طلوب اور سیر و تماشا نہیں مجھے

ک قرض آخری تو چکانے کی بات ہے
س شہر میں اب اور ٹھہرنا نہیں مجھے

کر اسے تلاش کروں کس پتے پہ میں
نا پتا جب اس نے بتایا نہیں مجھے

کہتے ہیں آپ آتا نہیں گفتگو کا فن
سچ یہ ہے جھوٹ بولنا آتا نہیں مجھے

پہچانتا وہ کیسے مجھے ایسی بھیڑ میں
س نے کبھی الگ سے تو دیکھا نہیں مجھے

لگی ہی اپنا خاک اڑانے کو ہے بہت
رکار کوئی دامنِ صحرا نہیں مجھے

وس یہ ہوا کوئی جیسے ہو سامنے
یکھا تو کوئی بھی نظر آیا نہیں مجھے

سن میں اپنی دھن میں تھا، بڑھتا چلا گیا
س نے بھی آ کے سامنے روکا نہیں مجھے

محسن زیدی

۱۰۔ راؤز ایونیو
ئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

تھا اک ہجومِ بندگاں کوئی کسی کا رب نہ تھا
اُس کے حضور ذہن میں فخرِ حسب نسب نہ تھا

کیا طلمِ حسن ہے لب بھی تھے اور لفظ بھی
برسرِ لب تو کیا کہ حرف ایک بھی زیرِ لب نہ تھا

میرے اور اس کے درمیاں کیا تھا خیال فاصلہ؟
اس سے الگ میں کب رہا وہ میرے ساتھ کب نہ تھا

جب بھی رہے جہاں رہے اس کے ہی روبرو رہے
پیش ہی پیش وہ رہا اس کا کوئی عقب نہ تھا

رات بڑا سکون تھا برگ گرے نہ گرد اڑی
سوئے تھے درد کے شجر زورِ ہوائے شب نہ تھا

کوئی ہمارے نام کی شمع جلا کے رو پڑا
بے وجہ تھیں نہ ہچکیاں، درد بھی بے سبب نہ تھا

پورا ہو اب تو کس طرح، دستِ جنوں کا حوصلہ
انجم بہار آئی کب، جیب میں تار جب نہ تھا

انجم عرفانی

شعبۂ اردو۔ ایم۔ ایل۔ کے۔ کالج
بلرامپور۔ گونڈہ

کالی داس گپتا رضا

۴۳-اے، بجل درشن، چوتھی منزل
نیپئن سی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۳۶

احوال و آثارِ بے صبر

بے صبر کا کچھ حال مثنوی لختِ جگر (سالِ تکمیل پہلی روایت ۱۸۳۷ء، دوسری روایت ۱۸۵۹ء)، رسالہ بدیع البدایع (سالِ تکمیل ۱۸۶۰ء) اور کلیاتِ بے صبر (قلمی) سے، ان کی اپنی زبانی سنیئے:

ولادت

مرا سالِ ولادت ہندوی میں،
جو کوئی صورت و معنی میں پاوے
تو کردے قافیہ کو دور تا ہاتھ
ہزار و ہشت صد شصت، و نہ آوے[1]

۱۸۶۹ بکرمی

نام و تخلص:

ہے بال مکند نام رنجور
بے صبر تخلص اپنا مشہور

قوم، سکونت:

کایتھ ہوں قوم کا میں ناشاد
ہے میرا وطن سکندر آباد

تعلیم، استاد، تصانیف:

دلی سے دوآب میں سوئے شرق
ہے بیش کروہ کا اُسے فرق[2]

(۲)

"بندۂ نیاز مند بال مکند، المتخلص بہ بے صبر، قوم کایتھ، رہنے والا قصبہ سکندر آباد علاقہ ضلع بلند شہر کا عرض کرتا ہے کہ بعد تحصیل علوم درسی و رسمی کے مجھ کو شوق انشا، پردازی و سخن طرازی کا دامن گیر ہوا اور زانوئے ادب خدمتِ حضرت اُستادی مولانا مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب دہلوی میں طے (تہ) کرکے مدتوں خونِ جگر کھایا اور مشقِ سخن کو صاف کرکے سرمایۂ دو دیوان اور تین مثنوی کا زبان اردوئے معلّٰی میں اور ایک دیوان فارسی بہم پہونچایا۔"[3]

چند اوّلین قطعہ ہائے تاریخ

قطعۂ تاریخ وفات شولعل طبیب سکندر آبادی[4]

مسیحِ عصر و فلاطونِ عہد خود شولعل
چو از قضائے الٰہی شدہ بہشت نصیب
بہ فکرِ سالِ وفاتش دلم تردد داشت
ندا ز غیب بر آمد "طبیب بود غریب"

۱۲۴۷ھ

ایضاً رباعی

بے صبر چو از جہان شد آں یارِ قدیم
در شہر و دیار گشت اندوہ عظیم
دل از سرِ وسواس بتاریخش گفت
ہیہات جواں بمرد شولعل حکیم

۱۲۴۱ + ۶ = ۱۲۴۷ھ

قطعۂ مولد پسر شادی لعل سے

ہوا جو طفل تو لد بساعتِ مسعود
بلند بخت، مبارک قدم خجستہ لقا
جب اس سے سال ولادت طلب کیا بے صبر
تو مجھ سے دل نے کہا "نونہالِ باغ لقا"

۱۲۴۸ھ

قطعۂ تاریخ مولد پسر منشی جہانگیری لعل

پسر خوش قدم و خوش طالع
چوں بوقتِ سحر آمد بو قوع
گفت بے صبر بسالِ عیسیٰ
شدہ خورشید جہانگیر طلوع

۱۸۳۴ع

سالِ تکمیل مثنوی "لختِ جگر" (روایتِ اول)

لختِ جگر اس نے نام پایا ۱۲۵۳ھ
نام و سنِ اختتام پایا
فکرِ سنِ عیسوی جو آیا
بالغ خرد اس کا سال پایا

۱۸۳۷ع

چھوٹے بھائی نے بھی تاریخ کہی

ہے میرا جو نیک، چھوٹا بھائی
اس کو جو یہ بول چال بھائی
تاریخ کا کر کے فکر فی الحال
مرغوبہ کہا کہ اس کا ہے سال

۱۲۵۳ھ

سالِ ولادت کشن سروپ (دوسرا بیٹا)

میلادِ کشن سروپ کے وقت
تھا میں مے خوری سے سرمست
تھے ظاہری معنوی میں ہجری
سن ایک ہزار و دو صد شصت

۱۲۶۰ھ

سنِ ولادت برہما سروپ (تیسرا بیٹا)

خدا کے فضل سے برہما سروپ میرا پسر
ہوا بساعتِ فرخندہ جس زماں پیدا
یہ آئی غیب سے آواز سالِ ہندی میں
پسر یہ واہ ہوا فخرِ خانداں پیدا

۱۹۰۴ بکرمی

سنِ ولادت بینی سروپ (چوتھا بیٹا)

فرزند چار میں چو بمن داد کردگار
ہر دم زدیدنش دلِ من شاد مے شود
بے صبر چوں بظاہری و معنوی شمرد
سالِ ہزار و دو صد و ہفتاد مے شود

۱۲۷۰ھ

اصلاحِ دیوانِ بے صبر از غالب

جب حضرتِ غالب نے دی اصلاح اس دیوان کو
بے صبر کامل ہوگیا اور معتبر میرا سخن
بعد از سر اصلاح ہیں اب ظاہری و معنوی
سالِ ہزار و دو صد و ہفتاد و چار آئے جانِ من

(۱۲۷۵-۱) = ۱۲۷۴ھ

تاریخ مثنوی "اخگرِ عشق"

جس کا سن لالۂ پُر داغ ملا ۱۲۷۳ھ
پردہ لالہ بسترِ باغ ملا ۲

۱۲۷۳+۲ = ۱۲۷۵ھ

مثنوی "لختِ جگر" (روایت ثانی)

اب تک ہے جو یہ سال سالِ مسعود — بارہ سو پچھتر افزود
ترمیم کیا پھر اس کو میں نے — ترتیب دیا پھر اس کو میں نے
آراستہ کر دیا اب اس کو — پیراستہ کر دیا اب اس کو
غالب کی نگاہ سے گزر کر — بے عیب یہ ہوگئی سراسر

تصنیف کا سال تھا "جگر لخت" ۱۲۵۳ھ
ترمیم کا سن "زہے میرا بخت" ۱۲۷۵ھ

بے جُھے بیٹے ہرسروپ کا سالِ وفات :

مرگیا جب نوجواں لڑکا ہمارا ہرسروپ
ہر طرف تھا اس کے غم میں شور و غوغا ہائے ہائے
سالِ تاریخِ وفات اس کا دلِ بے صبر نے
سنِ ہجری میں کہا ہے ہے دریغا وائے وائے[۱۵]

۱۲۷۹ھ

— ایضاً —

رخصت ہوا جہاں سے جب ہائے ہرسروپ
اتم میں اس کے سب کو ہوا رنج اور تعب
بے صبر مجھ کو فکر تھی سالِ وفات کی
عیسیٰ نے دی ندا کہ ہوا ہائے کیا غضب[۱۶]

۱۸۶۲ء

نبیرۂ بے صبر رام چندر سروپ کا سال ولادت :

نبیرہ میرے جب بے صبرا پیدا
ہوا وقت سعید و ساعتِ نیک
عدد کا جو تقدم ہے، درمیاں ہیں
ہزار و دو صد و ہشتاد اور ایک

۱۲۷۷ھ

یعنی ۴ + ۱۲۷۷ = ۱۲۸۱ھ[۱۷]

تاریخ وفات مرزا غالب استادِ بے صبر

رماں میرزا غالب اوستادِ من
یکجاں آفریں جاں بحق آخر سپرد
بپرسیدم از دل سنِ رحلتش
بنالید و گفتا آہ غالب بمرد[۱۸]

۱۲۸۵ھ

— ایضاً —

اسد اللہ خاں وہ غالب آہ
جس سے اہلِ کلام تھے مغلوب
سخن ان کے اتم میں سینہ کوب
اس سپہرِ سخن کے اختر کا
مجھ کو سالِ غروب تھا مطلوب
کہا عیسیٰ نے از سرِ حسرت
ہوا حیف آفتابِ ہند غروب

۱۸۶۱ء

۸ + ۱۸۶۱ = ۱۸۶۹ء

تکمیل رسالہ بدیع البدایع

آخر کار بیچ سال ہزار و نہصد و بست و شش
ہندی مطابق ہزار و دو صد و ہشتاد و شش ہجری
موافق سن ہزار و ہشت صد و ہفتاد عیسوی کے کہ یہ
قطعہ مخبر تاریخ ادس کا ہے۔ قطعہ تعمیہ

پے تاریخ ختم این رسالہ
بسالِ عیسوی دل در شمار است
بگویم از سرِ بہجت کہ بے صبر
بنام ایزد عجب باغ و بہار است

یہ مختصر رسالہ بہ ترتیب تین فصل کے اختتام کو پہنچایا
اور نام اس کا بدیع البدایع رکھا۔[۱۹]

سالِ طباعت مثنوی لختِ جگر

چھپی جبکہ بے صبر لختِ جگر
مجھے فکر تھی اس کی تاریخ کی
یہ دی سالِ ہجری میں دل نے ندا
اہا ہا یہ کیا خوب ہے مثنوی

۱۲۸۸ھ

— ایضاً —

طبع شد چوں مثنوی لختِ جگر بے صبر گفت
ہر کہ بیند بعد جان و دلش شیدا شود
دور از اعداد مصرع لفظ یک را کن عدد
یک ہزار و ہشتصد و ہفتاد و یک پیدا شود[۲۰]

۱۸۷۱ء

سالِ وفات بینی سروپ پسر بے صبر

مرگیا بیٹا مرا بینی سروپ — کیا تھا اور ہائے مرکر اب کیا ہوا
مہر غروب اپنا ہوا صبحدم — روز مرا ہوگیا شب کیا ہوا
سالِ وفات اس کا جو بے صبر تو — پوچھے ہے سمبت میں کہ کب کیا ہوا

عالمِ فانی سے ہو بیدل وہ ماہ
چھپ گیا ہے ہے یہ غضب کیا ہوا

۱۹۳۱ - ۱ = ۱۹۳۰ ب

از سرِ افسوس سنِ عیسوی — ہے یہی، یہ شور و شغب کیا ہوا

۱۸۷۴+۱ = ۱۸۷۳ ء

سالِ وفات اس کا ہے ہجری میں یہ — دے گیا غم حیف سبب کیا ہوا

۱۲۹۰ ھ

سالِ وفات مرزا ہرگوپال تفتہ

براہ سخن رفتہ رفتہ بمردہ — تو گوئی کہ ماہ دو ہفتہ بمردہ
چو تفتہ کہ بُد شاعرِ فارسی گو — شبستانِ شعر و سخن گشتہ بمردہ

چو سالِ وفاتش بہ بے صبر جستم
بفرمود بس حیف تفتہ بمردہ

۱۲۹۶ ھ

ان اقتباسات کو مربوط کر کے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ کچھ یوں ہوگا:

"میں بال مکند المتخلص بے صبر، قوم کائستھ، قصبہ سکندر آباد، علاقہ بلند شہر کا رہنے والا ہوں۔ سکندر آباد دلی سے مشرق کی طرف دوآب میں بیس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ میری ولادت ۱۸۶۹ بکرمی میں ہوئی۔ درسی اور رسمی علوم حاصل کر لینے کے بعد مجھ کو انشار پردازی اور سخن طرازی کا شوق ہوا۔ چنانچہ میں مرزا اسداللہ خاں غالب کے تلامذہ میں شامل ہوگیا اور مدتِ دراز تک ان سے اصلاح لیتا رہا۔ اس مشقِ سخن کے نتیجے میں ۱۸۷۰ء تک دو دیوان اور تین مثنویاں اُردو میں اور ایک دیوان فارسی میں جمع کر لیے۔ ضخیم مثنوی لختِ جگر (پہلی روایت) میں نے چوبیس پچیس سال کی عمر تک کہہ لی تھی۔ ظاہر ہے کہ مشقِ سخن اس سے بھی پہلے کی ہے جو میرے اولین قطعہ ہائے تاریخ سے ظاہر ہے۔

میرے ایک چھوٹے بھائی کو بھی شعر و شاعری سے رغبت ہے۔ چنانچہ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں جب پہلی بار مثنوی لختِ جگر مکمل ہوئی تو اس نے بھی یک لفظی مادہ بہم پہنچایا تھا یعنی "مرغوب"۔

میرا دوسرا بیٹا کشن سروپ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا تیسرا بیٹا برہما سروپ ۱۹۰۴ ب (بڑے بیٹے ہر سروپ کا سالِ ولادت یاد نہیں۔ سالِ وفات حسرت آیات آگے آئے گا) اور چوتھا بیٹا بینی سروپ ۱۲۷۰ھ میں۔

میں نے اپنا پہلا دیوان پورا کا پورا استادِ محترم حضرت غالب کو دکھایا تھا۔ یہ ۱۲۷۴ھ کی بات ہے۔ ۱۲۷۵ھ میں میں نے دوسری مثنوی "انگرِ عشق" مکمل کی اور اسی سال مثنوی لختِ جگر کو جو ۲۲ سال پہلے کہی جا چکی تھی، پھر سے ترمیم کیا اور استادِ محترم حضرت غالب کی نظر سے گزار کر تسلی کر لی۔ چنانچہ پہلے اس کا سالِ تصنیف "لختِ جگر یا جگر لخت" (۱۲۵۳ھ) تھا اور اب "زہے میر الخت" (۱۲۷۵ھ) ہوگیا۔

چند سال بعد نوجوانی میں میرا لڑکا ہر سروپ جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔ ہجری سنہ ۱۲۷۹ تھا اور عیسوی ۱۸۶۲ء۔ چار سال بعد ۱۲۸۱ھ میں میرا پوتا رام چندر سروپ پیدا ہوا۔ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) میں استاذی غالب کا انتقال کیا ہوا گویا ہندوستان کا آفتابِ شاعری غروب ہوگیا۔ خود شعر ماتم میں سینہ کوب نظر آتا تھا۔ (۱۹۲۶ب = ۱۲۸۶ھ)۔ ۱۸۷۰ء میں رسالہ بدیع البدایع کی تکمیل ہوئی۔ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں مثنوی لختِ جگر چھپ کر تیار ہوئی۔ دو سال بعد سب سے چھوٹا یعنی چوتھا بیٹا بینی سروپ سورگ باش ہوگیا۔ سالِ وفات سمبت ۱۹۳۰، عیسوی ۱۸۷۳ اور ہجری ۱۲۹۰ تھا۔

۱۲۹۶ھ میں مشہور فارسی گو شاعر منشی ہرگوپال تفتہ
انتقال کر گئے۔ یہ گویا تفتہ کی نہیں آسمانِ شاعری کے
تفتہ کی موت تھی۔"

اس کے صرف تین ماخذ ہی ایسے ہیں جو بے صبر کی زندگی میں لکھے گئے۔ اوّل:

"تذکرۂ نادر (دیوانِ غریب ۱۸۶۶ء) جس سے صرف یہ اطلاع ملتی ہے کہ بے صبر، ہرگوپال تفتہ کے شاگرد رہے تھے۔

"بے صبر۔ لالہ بال مکند متوطن سکندر آباد ضلع بلند شہر خلف لالہ کانجی مل شاگرد لالہ ہرگوپال تفتہ (پانچ شعر درج ہیں)۔"

دوم: "تذکرۂ سخن شعرا از نساخ۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ بیشتر فارسی کہتے ہیں:

"بے صبر تخلص بال مکند ولد لالہ کانجی مل باشندہ سکندرآباد شاگرد ہرگوپال تفتہ۔ بیشتر فارسی کہتے ہیں (کلام میں صرف اردو کا ایک شعر درج ہے)۔"

سوم: "تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود از بشاش۔ اگرچہ اس تذکرے کی طباعت 'بے صبر کے انتقال کے چند ماہ بعد (ستمبر ۱۸۸۵ء) میں شروع ہوئی تھی تاہم بے صبر کے ترجمے کا متن بے صبر کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا بلکہ بیشتر بے صبر ہی نے فراہم کیا تھا:

"بے صبر تخلص منشی بال مکند ولد رائے کانہہ سنگھ کایتہ بھٹناگر سکندرآباد ضلع بلند شہر۔ اب عمر قریب ستر برس کے ہے۔ پندرہ برس کے سن سے اب تک شعر کہتے ہیں۔ فارسی اور اردو میں مرزا غالب کے شاگرد ہیں۔"

صاحب دیوان اور تصنیفات متعددہ جن کی تفصیل 'تذکرۂ معیار الشعرائے ہنود' میں کہ جہاں فارسی کلام ان کا درج ہوا ہے، قلم بند ہو چکے ہیں۔ ۱۷ برس کی عمر سے ۴۷ برس تک مناصب داروغگی و منشی گری وغیرہ سرکار انگریزی پر مامور رہا۔ اب پنشن دار ہیں اور لڑکے نوکر چاکر ہیں۔ سوائے علم رسمی فارسی عربی اور کچھ سنسکرت کے جملہ فنِ شاعری و علمِ الٰہی و تاریخ و جغرافیہ و نجوم و منطق و مذاہب سے بخوبی واقف ہیں، مذہب خدا پرستی موحدانہ رکھتے ہیں اور ذوق، مومن، غالب، تفتہ اور شیفتہ وغیرہ شعرائے نامی کے معاصر اور ہم مشاعرہ ہیں۔ راقم تذکرہ سے بھی خط و کتابت ہے اور مندرجہ ذیل کلام خود ان کا اس تذکرہ کے لیے بھیجا ہوا ہے اور حق یہ ہے کہ ہماری قوم میں غنیمت ہیں اور قابلِ افتخار۔" (چونکہ بیشتر کلام آخر میں انتخابِ کلام کے تحت درج کیا جا رہا ہے، اس لیے یہاں سے حذف کیا جاتا ہے۔ ۔ رضا)

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے یا تو خود بے صبر راوی ہیں یا پھر وہ لوگ راوی ہیں جو بے صبر کے ہم عصر تھے اور جو کچھ وہ ضبطِ تحریر میں لائے، بے صبر کو اس سب کی خبر تھی۔ بشاش صاحب تذکرہ آثار الشعرائے ہنود کی تو بے صبر سے براہِ راست خط و کتابت تھی۔ افسوس کہ بشاش کا ہندو فارسی گویوں کا تذکرہ معیار الشعرائے ہنود دستیاب نہیں۔ ورنہ بے صبر کی تصانیف کا مفصل احوال اس سے معلوم ہو سکتا تھا۔

اب بے صبر کے کچھ سوانح نگاروں سے اخذ کیا ہوا مواد پیش کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ان کے بیٹے برہما سروپ کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

جب ۱۸۹۴ء میں آخر کار رسالہ بدیع البدایع شائع ہوا اس وقت بے صبر کا انتقال ہو چکا تھا۔ انتقال کا حال اور کچھ ضروری کوائف رسالہ بدیع البدایع کے سرورق کی پشت پر لکھی" سوانح عمری مصنف "سے کھلتے ہیں جو بے صبر کے دوسرے بیٹے برہما سروپ نے چھپوائی تھی۔

"سوانح عمری مصنف

...... مصنف اس رسالہ موسومہ بدیع البدایع کے جناب منشی بال مکند صاحب المتخلص بے صبر (ساکن) سکندرآباد ضلع بلند شہر ہیں۔ ۱۸۱۰ء میں بمقام سکندرآباد پیدا ہوئے اور پچھتر برس کی عمر میں ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء میں شیوراتری کو بمقام میرٹھ رحلت فرمائی۔ جناب والا نے ذہنِ رسا اور فہمِ ذکا کی وجہ سے سولہ برس کی عمر میں فارسی عربی میں لیاقت کامل حاصل کی اور علوم ریاضی و

نجوم، ہیئت، منطق اور ویدانت صوفیہ مت میں بھی دستگاہ بہم پہنچائی۔ بوجہ موزونیت طبیعت خداداد اور بصحبت مرزا منشی ہرگوپال تفتہ کہ ماموں جناب موصوف کے تھے شوق شعر و سخن کا دامن گیر ہوا اور بعد اجتماع سخن آخر کو زانوئے ادب بخدمت نواب اسد اللہ خاں صاحب مرزا نوشہ غالب دہلوی کی تہہ کیا۔ دس کتابیں تالیف و تصنیف فرمائیں۔ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت صنائع بدایع معنی و محاورہ چوچلہ بول چال روزمرہ کنایہ و اشارہ تلاش و بندش قابل ملاحظہ ہے، کیوں نہ ہو بچپن برس کی مشق سخن ہے اور حضرت غالب کے شاگرد رشید ہیں۔ مجھ کو کہ فرزندان موصوف سے ہوں تعلی اور غلو زیب نہیں، البتہ بعد مرزا غالب اور مرزا تفتہ کے حضرت بے صبر کا دم غنیمت تھا کہ وہ بھی اس دار فانی سے راہی عالم بقا ہوئے۔ افسوس صد افسوس ؎

روزہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش
زاہدے را خرقہ گردد یا ستورے را رسن
ماہہا باید کہ تا گردون گردان یک شبے
عاشقے را وصل بخشد یا غریبے را وطن
سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
قرنہا باید کہ تا یک کودکے از راہ فہم
عارفے کامل بود یا شاعر شیریں سخن

تفصیل تالیفات بے صبر مؤلف

رسالہ ھذا

۱۔ دیوان اول اُردو۔ موسوم بہ دیوان عام۔ اس میں غزلیات، رباعیات، قطعات وغیرہ درج ہیں۔ عنقریب طبع ہوگا۔

۲۔ دیوان دوم اُردو موسوم بہ دیوان خاص۔ اس میں صرف غزلیات ہیں۔ چھپنے کو باقی ہے

۳۔ دیوان فارسی: اس میں کل کلام فارسی غزلیات و قطعات و تضمین و دیوان رباعیات ہے۔ چھپنے کو باقی ہے

۴۔ دیوان قصائد اُردو: اس میں ۴۵ قصیدے اور ترکیب بند و ترجیع بند درج ہیں۔ چھپنے کو باقی ہے

۵۔ مثنوی سخت جگر: ایک پُر فصاحت مثنوی دید ہے و شنید ہے۔ چھپ گئی

۶۔ مثنوی اخگر عشق: درحقیقت یہ مثنوی اسم بامسمیٰ اخگر ہے۔ چھپ گئی

۷۔ سراپا سخن: تصنیف بہ طرز جدید۔ یادگار فرزندان میں نوحہ و سراپا قابل داد ہے چھپ گئی

۸۔ رسالہ بدیع البدایع ہذا: اس میں بیان علم صنائع و بدایع کا ہے۔

۹۔ رسالہ ادیب البنات: یہ نثر ہے اور تہذیب اخلاق اور تعلیم نسواں کے لیے قابل رواج مدارس ہے (زیر طبع)

۱۰۔ گلستان ہند نثر: اُردو میں تتبع گلستان سعدی اس میں پانچ باب ہیں۔ زیر طبع ہے

العبد

نیاز مند سری برہما سروپ پسر خورد مصنف"

رسالہ بدیع البدایع ہی کے صفحہ ۳۴۴ پر بے صبر کے بڑے بیٹے (بعد از آنجہانی ہر سروپ) منشی کرشن چند سروپ صاحب منیر کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ وفات " قبلہ و کعبہ والد بزرگوار جناب منشی بال مکند صاحب بے صبر تخلص سکندر آبادی" درج ہے جو یوں ہے :-

بے صبر چوں ز عالم فانی بخلد رفت
عالم بچشم اہل بصیرت سیاہ شد
بازم بپرس حال دل بے قرار من
دور از سرم چو سایۂ آں قبلہ گاہ شد
آئے سایۂ سعادت ازلی، کجا شدی

تاریخ حال منشیانت تباہ شد
بآرے بگو کہ "تا چہ گنہ دیدۂ زمن
اے دیدہ ام نجاک رہت فرش راہ شد
۵، سال وفات تو زکہ پرسم کہ بعدِ تو
ایں سلسلہ گسستہ چو متروک راہ شد
چوں نکو سال "تاختم" اندر جگر خلید
ازیمن و برکتت سوئے غیبم نگاہ شد
الف بگفت ترک دو کردہ بسال ہند
بستہ در سخن چو فنا فی اللہ شد = ۱۹۴۱ب

۱۹۵۱

اعدادِ حرفِ اولین ابیات کن شمار
سن شریف دان کہ چہ شام و پگاہ شد

یہاں فرزندان بے صبر ش۲۵ ی کرشن چند سروپ اور سری برہما سروپ نے لوگوں کو تو مغالطے میں رکھا ہی تھا لیکن وہ خود بھی غلطی کا شکار رہے ۔ بے صبر نے خود لکھا ہے کہ ان کا سال ولادت ۱۸۶۹ب ہے اور یہ معلوم ہے کہ وہ ۱۹۴۱ب میں بروز شیوراتری سورگباش ہوئے۔ اس طرح عمر ۷۲ سال سے کچھ زیادہ ہوئی ۔ سال وفات ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء مطابق ہے ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ کے ۔ اگر ۱۳۰۲ھ سے ۷۵ سال نکال دیے جائیں تو ۱۲۲۷ھ ہوتے ہیں جو برابر ہے ۔ ۱۶ جنوری ۱۸۱۲ء تا ۴ جنوری ۱۸۱۳ کے اور ۱۸۶۹ب = ۱۴ مارچ ۱۸۱۲ء تا یکم اپریل ۱۸۱۳ء گویا یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ بکرمی اور عیسوی سنین کی رو سے عمر ۷۲ سال سے اوپر ہوگی ۔ اب سال ولادت اور وفات یہ ہوں گے :

بکرمی ولادت ۱۸۶۹ وفات ۱۹۴۱ : عمر ۷۲ تا ۷۳ سال
عیسوی " ۱۸۱۲/۱۳ " ۱۸۸۵ : عمر ایضاً
ہجری " ۱۲۲۷ " ۱۳۰۲ : عمر ۷۵ سال

سری برہما سروپ پسر بے صبر کا ۱۸۸۵ء سے ۷۵ سال ہجری منہا کرکے ۱۸۱۰ سال ولادت برآمد کرنا قطعاً غلط ہے ۔

تصانیف بے صبر

"سوانح عمری مصنف" مرتبہ برہما سروپ پسر بے صبر میں، بے صبر کی دس تصانیف کا ذکر پہلے آچکا ہے ۔ اس فہرست سے ظاہر ہے کہ دس میں سے صرف چار تصانیف طبع ہو سکیں ۔ اتفاق سے ان میں سے دو یعنی "مثنوی سخت جگر" اور رسالہ "بدیع البدایع" میرے کتب خانے میں موجود ہیں اور بہت اچھی حالت میں ہیں ۔ مثنوی زنگر عشق (مطبوعہ) کا آج تک کوئی سراغ نہیں مل سکا اور یہی حال "سراپا سخن" کا ہے ۔ چار غیر مطبوعہ تصانیف دیوان اول اُردو، دیوان دوم اُردو، دیوان فارسی اور دیوانِ قصائد اردو اب شاید اصلی شکل میں موجود نہیں مگر کافی حد تک ان کی نشاندہی کلیاتِ بے صبر (غیر مطبوعہ) میں کی جا گئی ہے ۔ بے صبر کے وارثوں کے پاس بھی بے صبر کے کلام کے مسودے موجود ہیں ۔ باقی ماندہ دو تصانیف "ادیب البنات" اور "گلستانِ ہند" جو نثر میں ہیں ان کے مسودے بھی ان کے یہاں محفوظ ہیں ۔

یہاں ایک مضمون سے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جو بعنوان "منشی بال مکند رائے بے صبر" نیا دور لکھنؤ کے ستمبر ۱۹۵۹ کے شمارہ میں چھپا تھا ۔ اس کے مصنف جناب ہری کرشن راز ہیں جنھوں نے اسے بے صبر کے وارثوں سے حاصل شدہ معلومات کی بنا پر لکھا ہے، اس لیے اہم ہے ۔ اس میں بے صبر کی بعض تصانیف کے کوائف بھی معلوم ہو جاتے ہیں جو کہیں اور بیان نہیں ہوئے :

"منشی بال مکند نام تخلص بے صبر بمقام سکندرآباد ضلع بلندشہر (یوپی) ۱۸۱۰ء ۲۵ میں پیدا ہوئے ۔ وہاں کے ایک متمول بھٹناگر کائستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ آپ کے بزرگ دگال کے رہنے والے تھے جو پنجاب میں واقع ہے ۔ اسی رعایت سے آپ کی خاندانی ال دگائیہ ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ بے صبر کے بزرگ اپنے وطن دگال کو کس سلسلے میں خیرباد کہہ کر سکندرآباد میں آکر مقیم ہوئے ۔ ان کے والد بزرگوار کا نام رائے کانہہ سنگھ تھا ۔ صحیح یوم و تاریخ پیدائش کا پتہ نہ چل سکا جناب بے صبر نے اپنی تصنیف "بدیع البدائع" میں اپنا سن پیدائش ذیل کے چار مصرعوں میں تحریر فرمایا ہے ؎

یہ ہے کہ اس کے علاوہ اس کے متعلق آپ کو علم ہے
یا نہیں ؟

افسردہ کا کچھ حال آپ کو معلوم ہے ؟ کسی شخص نے ان
کے متعلق کوئی مضمون لکھا ہے ؟

کے۔ ڈی۔ گپتا، رضا اُردو کے شاعر ہیں اور مضامین
بھی لکھتے ہیں، انھیں ان دونوں باتوں سے دل چسپی ہے۔

اگر آپ افسردہ و دل گیر کے متعلق معلومات میں اضافہ کر سکیں تو
براہ مہربانی انھیں براہ راست لکھیں، اور میرا حوالہ دیں۔ ان کا
پتا یہ ہے :

43 A Jal dan shan
4 th. Floor
Napean sea Rd.
Bombay. 36

خیر طلب
قاضی عبدالودود

قبل کے خط میں اگر کوئی بات نہ پڑھی جا سکی ہو تو لکھیں۔ قاطع
برہان و رسائل متعلقہ کی دوسری جلد شاید ہی چھپے۔

——— (۵) ———

پٹنہ ۴ (بنام کاظم علی خاں۔ ۲۹ر نومبر ۱۹۷۶ء)

۲۹/۱۱ ۷۶

عزیزی ! میں مدتوں سے بیمار ہوں، یاد آتا ہے
کہ آپ کا ایک خط آیا تھا اور میں نے اس کا جواب نہیں
دیا تھا۔ خط نہ جانے کیا ہوگا (ہوگا ؟ کذا ۔ ہوگیا)

خیال آتا ہے کہ آپ نے دبیر کے متعلق میرے مضمون کی
نقل مانگی تھی۔ یہ مضمون معاصر میں شائع ہوئے تھے (کذا
ہوا تھا) اگر وہ شمارہ جس میں یہ ہے، وہاں نہ ملے تو آپ
ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری، پٹنہ
سے اس کی نقل حاصل کر لیں۔

اگر اور کوئی چیز مطلوب ہو تو اس کے لیے بھی
انھیں لکھیں۔ معاصر کا قاضی عبدالودود نمبر جو آپ نے
مانگا تھا نکل گیا ہے۔ اس کے کچھ شمارے برائے فروخت
کلیم الدین احمد صاحب نے ان کے پاس رکھوا دیے ہیں۔

آپ نے اپنا پتا جو اپنے خط میں لکھا ہے اس میں
20 Victoria Street 201 کے بعد تو ایک نشان
ہے اس کے بعد کیا ہے پڑھا نہیں جاتا ہے، اس لیے خط
بوساطت نیا دور جاتا ہے۔

خیر طلب۔ قاضی عبدالودود

——— (۶) ———

پٹنہ ۴ (بنام کاظم علی خاں ۳ر جولائی ۱۹۷۸ء)

۳/۷ ۸۷ (۸۷ کذا؟ ۷۸)

شفیق مکرم !

آپ کا خط ملا۔ مجھے تو یاد نہیں کہ آپ نے خط لکھا ہو
اور میں نے جواب نہ دیا ہو۔ میں ڈھائی سال سے علیل ہوں
ذیفراشی تو نہیں ؟ مگر اس کا اثر توانائی، قوت ارادی
اور حافظے پر پڑا ہے۔

" قاطع برہان و رسائل متعلقہ " کی دوسری جلد نہ شائع
ہوئی ہے، نہ قرینہ ہے کہ آئندہ شائع ہو سکے

غالب سے متعلق میرا طویل ترین مقالہ " غالب بحیثیت
محقق " ہے، یہ نقد غالب مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد
میں شامل ہے۔ اس میں مختصراً نثر غالب سے بھی
بحث ہے۔

میں نے ایک مضمون معنف علی گڑھ میں بھی غالباً
حقیر کے نام کے خطوط کی اشاعت سے پیش تر لکھا تھا۔
یہ غالب کی خطوط نویسی کی ابتدا سے متعلق تھا۔

میرے مضامین کی ایک فہرست معاصر کے 'قاضی
عبدالودود نمبر' میں ہے۔ مگر یہ جامع نہیں۔ یہ تو ممکن ہے
کہ میں اس میں کچھ اضافہ کر دوں۔ مگر مکمل فہرست تیار
کرنا اب میرے لیے بھی ممکن نہیں، اور یہ بھی میرے لیے
ممکن نہیں کہ کتابوں کی طرف رجوع کر کے آپ کے

سوالات کے جواب دوں۔ عمر بھی ۸۳ سال کی ہو گئی۔

آپ جن امور کے متعلق میری رائیں معلوم کرنا چاہتے ہیں ان کے بارے میں زبانی گفتگو ہو سکتی ہے، بشرطیکہ کتابیں آپ ساتھ لائیں۔ میرے پاس غالب سے متعلق بہت سی کتابیں ہیں مگر کیا ہے کیا نہیں، میں کل کتابوں کو دیکھے بغیر نہیں کہہ سکتا۔

مرزا دبیر پر آپ کا کام جب تک آپ پٹنہ نہ آئیں مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس کا امکان ہے کہ کوئی نئی بات ان کے متعلق معلوم ہو سکے۔

شاد نے دبیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے آپ نے دیکھا ہے؟ وہ خدائے دروغ گویاں ہیں۔ مگر آپ انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ منیر بلگرامی کی جلوۂ خضر وغیرہ میں دبیر کے بارے میں جو کچھ ہے، آپ کی نظر سے گزرا ہے؟

میرے علم میں یہاں سے لکھنؤ جانے والا کوئی شخص نہیں، (آم)[۳] بھیجنے کا خیال ترک کریں۔ آپ کو اس کا خیال آیا، اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ یہاں آنا چاہیں تو میرا گھر حاضر ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے[۴]

خیر اندیش

قاضی عبدالودود

حواشی: از کاظم علی خاں

۱ قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ (جلد اول) شائع کردہ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ طبع ۱۹۶۶ء قاضی عبدالودود صاحب کی مرتب کردہ کتاب جس کی دوسری جلد شائع نہ ہو سکی۔

۲ "حقیر کے نام خطوط" سے مراد ہے نادرات غالب: مرتبہ آفاق حسین آفاق۔ مشہور پریس کراچی طبع اول مطبوعہ ۱۹۴۹ء جس میں غالب کے وہ غیر مطبوعہ خطوط پہلی بار چھپے تھے جو منشی نبی بخش حقیر کے نام تھے، اس میں چند خطوط فرزند حقیر عبداللطیف کے نام بھی ہیں۔ اسی کتاب میں حقیر کے نام غالب کا ۹ مارچ ۱۸۴۸ء کا وہ اردو خط بھی شامل ہے جو غالب کے معلوم و موجود مطبوعہ اردو خطوط میں قدیم ترین ہے

۳ قاضی صاحب کے خط میں لفظ "آم" سہواً چھوٹ گیا تھا

۴ ان لینڈ (INLAND) لفافے پر قاضی صاحب کا یہ خط مجھے ۸ جولائی ۱۹۷۸ء کو ملا تھا جس کا جواب میں نے ۱۰ جولائی ۱۹۷۸ء کو ارسال کیا تھا۔

— (۷) —

پٹنہ۔۴ (بنام کاظم علی خاں۔ ۱۵ جولائی ۱۹۷۸ء)

۱۵/۷/۷۸

عزیزی۔ آپ کا خط ملا۔ میرا ایک مقالہ "غالب زباں پہلوان" اردو کراچی کے غالب نمبر میں چھپا تھا، اس میں اس سے مجملاً بحث ہے کہ نثر کیسی ہونی چاہیے اور غالب کی نثر کیسی ہے۔

مصنف کے مدیر الطاف علی بریلوی تھے جو مدت ہوئی کراچی چلے گئے اور رسالہ بند ہو گیا۔ میرے پاس وہ شمارہ تھا جس میں میرا مضمون شائع ہوا تھا۔ مگر میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اب ہے یا نہیں۔ میرے لیے اس کی تلاش کرنا ناممکن ہے۔ بہار اردو اکاڈمی میرے مضامین کے مجموعے شائع کر رہی ہے۔ اس میں غالب سے متعلق مضامین بھی آجائیں گے۔

معاصر کا قاضی عبدالودود نمبر ایک صاحب لے گئے اور تقاضے کے باوجود انھوں نے اسے واپس نہیں کیا۔ ان کی ایک کتاب میرے یہاں سے چوری ہو گئی تھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کا انتقام لے رہے ہیں۔ نقل کے لئے آپ ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری بانکی پور پٹنہ کو لکھیں۔ میرے پاس خاص نمبر ہوتا بھی تو نقل کرنے والا کوئی نہیں۔

میرے لیے یہ بتانا اب ممکن نہیں کہ میرے پاس

کیا ہے اور کیا نہیں (ہے)۔ معاصر کے لیے میں کلیم الدین احمد صاحب کو کہہ دوں گا۔ معاصر (کا) قاضی عبدالودود نمبر تین سال قبل شائع ہوگیا (تھا) ۲؎ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب مل سکتا ہے یا نہیں۔

شاد عظیم آبادی مشاہیر میں تھے اور آپ ان کے اقوال کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بیچارے کو مجبوراً سچ بولنا پڑتا تھا تو انھیں سخت تکلیف ہوتی تھی مثلاً یہ پوچھا جاتا کہ آپ کے والد کا نام کیا ہے اور مجبوراً (انھیں) کہنا پڑتا کہ عباس مرزا، تو اس کا رنج ہوتا کہ کاش کوئی بڑا آدمی میرا باپ ہوتا۔ انھوں نے اپنے حالات و کمالات پر ایک شاگرد کے نام سے کتاب لکھی تھی اور یہ چھپ گئی ہے۔ وہ کس حد تک جھوٹ بول سکتے ہیں اس کا اندازہ اس کتاب کے تبصرے کے مطالعہ سے ہوگا۔ یہ تبصرہ میری کتاب 'اشتر و سوزن' میں شامل ہے ۳؎

مجھے آپ کے ٹھہرنے سے کچھ تکلیف نہ ہوتی۔ آپ کا کوئی عزیز یا خاص دوست یہاں ہوتو اور بات ہے۔ ۴؎

پروفیسر محمد حسن ۱۳ جولائی کو یہاں آئے تھے اور ۱۴ کو رخصت ہوگئے۔ ان سے آپ کا ذکر بھی آیا تھا۔

خیر طلب

ق ۔ ع ۔ و

حواشی۔ از کاظم علی خاں :-

۱؎ قاضی عبدالودود صاحب نے یہاں اپنے جس مقالے 'غالب ۔ زباں پہلوان' کا ذکر کیا ہے اس مقالے سے ان کے مطبوعہ مقالات کی وہ دونوں فہرستیں خالی ملتی ہیں جو معاصر پٹنہ نیز غالب نامہ نئی دہلی کے قاضی عبدالودود نمبروں میں شامل ہیں۔ اس لحاظ سے میرے نام قاضی صاحب کا زیر تبصرہ خط اہمیت رکھتا ہے۔ قاضی صاحب کا مقالہ 'غالب ۔ زباں پہلوان' جس سہ ماہی رسالہ اردو کراچی جنوری تا مارچ ۱۹۷۰ء (ص۵ تا ص۲۲) میں شائع ہوا ہے وہ میرے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

۲؎ قاضی صاحب نے اپنے ۱۵ جولائی ۱۹۷۸ء کے اس خط میں لکھا ہے کہ معاصر کا قاضی عبدالودود نمبر کم و بیش ۳ سال قبل شائع ہوگیا تھا۔ یہ نمبر اگست ۱۹۷۶ء میں یعنی اس خط کے زمانۂ تحریر جولائی ۱۹۷۸ء سے ایک سال گیارہ ماہ قبل چھپا تھا۔

۳؎ 'اشتر و سوزن': قاضی عبدالودود۔ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ طبع ۱۹۶۵ء ص۱۱۶ تا ص۱۲۸ میں کتاب شاد کی کہانی شاد کی زبانی پر مفصل تبصرہ موجود ہے۔

۴؎ قاضی صاحب نے اپنے ۳ جولائی ۱۹۷۸ء کے گزشتہ خط میں مجھے پٹنہ آنے اور اپنے گھر پر ٹھہرنے کی جو دعوت دی تھی اسی کا اعادہ ۱۵ جولائی ۱۹۷۸ء کے اس زیر تبصرہ خط میں بھی کیا ہے چنانچہ میں اوائل مئی ۱۹۷۹ء میں چار پانچ روز کے لئے پٹنہ گیا تھا اور قاضی صاحب کی میزبانی کا لطف بھی حاصل کیا تھا۔

—— (۸) ——

(بنام کاظم علی خاں۔ ۳۰ جون ۱۹۷۹ء)

عزیزی،

خط ملا شکریہ۔ آپ کو مفصل خط کچھ دنوں بعد لکھوں گا۔ براہ مہربانی مدیر نیا دور کو اس حادثے کی اطلاع دے دیں اور کہہ دیں کہ موعودہ مضمون کچھ دنوں بعد جاسکے گا ۱؎

خیر طلب

قاضی عبدالودود

حاشیہ: از کاظم علی خاں۔

۱؎ قاضی عبدالودود صاحب کا یہ خط دراصل ان کے فرزند قاضی محمد مسعود صاحب کے ۳۰ جون ۱۹۷۹ء کے اس خط میں ہی مرقوم ہے جو مجھے ۴ جولائی ۱۹۷۹ء کو ملا تھا۔ اپنے چند سطری مختصر سے خط میں قاضی عبدالودود صاحب نے جس حادثے کا ذکر فرمایا ہے وہ ان کی اہلیہ صاحبہ کی وفات ہے جو ۱۸ جون ۱۹۷۹ء کو واقع ہوئی تھی اور جس کی اطلاع مجھے قاضی محمد مسعود صاحب کے ۲۰ جون ۱۹۷۹ء کے خط سے ملی تھی۔ میں نے

سانحے کی خبر روزنامہ قومی آواز لکھنؤ میں شائع کرائی تھی اور خبر کا تراشا تعزیتی خط کے ساتھ ارسال کیا تھا۔ قاضی عبدالودود صاحب کا یہ چند سطری خط میرے اسی تعزیتی خط کا جواب ہے۔

—— (۹) ——

پٹنہ ۴ (بنام کاظم علی خاں ۲۶ر جولائی ۱۹۷۹ء)
۲۶ ۷ ۷۹

عزیزی۔ خط ملا۔ میری صحت خراب ہوگئی ہے۔ داہنا ہاتھ اور داہنا پاؤں ٹھیک سے کام نہیں کرتا انگلیاں (کذا ؟ انگلیوں) کا بھی یہی حال ہے۔ معاصر نہ جانے کب نکلے گا۔ آخری شمارہ برسوں قبل نکلا تھا۔ حمیرا کو آپ کا پیام پہونچا دیا گیا۔ شیر کا ایک شعر ہے جس کا قافیہ "احمق الذینوں" اور ردیف "کو" ہے براہ مہربانی یہ شعر لکھیں اور بتائیں کہ یہ کہاں سے نقل ہوا۔ اس وقت کچھ لکھنا مشکل ہے۔ آپ کا مضمون ابھی میں نے نہیں پڑھا۔ مسعود سلام کہتے ہیں۔

خیر طلب
ق۔ ع۔ و

—— (۱۰) ——

۳ر ستمبر ۷۹ء (بنام کاظم علی خاں ۳ر ستمبر ۱۹۷۹ء)
پٹنہ ۴

عزیزی۔ خط ملا، اور شعر بھی۔ شکریہ!
آپ کی (؟ کو) اس کی خبر نہیں کہ میں مفلوج ہوگیا ہوں داہنے ہاتھ اور داہنے پاؤں پر اثر ہے۔ ہاتھ سے (وہ) سب کام کرلیتا ہوں جو پہلے کرتا تھا، مگر دقّت کے ساتھ پاؤں پر اثر زیادہ ہے۔ کھڑا ہو سکتا ہوں لیکن چلنا مشکل ہے۔

کچھ پڑھنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ افسوس ہے کہ آپ کا مضمون بھی اب تک نہ پڑھ سکا۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

خیر طلب ق۔ ع۔ و

نثر غالب کے بارے میں میری رائے اردو کراچی شمارہ اول ۱۹۷۰ء کے باب ۴ میں دیکھیں۔

—— (۱۱) ——

۵ر اگست ۸۰ء (بنام کاظم علی خاں ۵ر اگست ۱۹۸۰ء)
پٹنہ ۴ عزیزی،

یاد آتا ہے کہ (آپ کی) کتاب کا شکریہ ادا کر چکا ہوں لیکن ممکن ہے کہ یہ حافظے کا دھوکا ہو۔[1] اگر ایسا ہی ہو تو میں عذر خواہ ہوں گا۔

کتاب آپ نے محنت سے لکھی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ کو اس کا موقع ملتا رہے گا کہ اسی طرح لکھتے رہیں۔

کتب خانہ خدا بخش میں کسی کتاب کا ایک سے زیادہ نسخہ نہیں خریدا جاتا۔ اس قاعدے کی خلاف ورزی ممکن نہیں۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

خیر اندیش
ق۔ ع۔ و

حاشیہ از کاظم علی خاں:
[1] قاضی صاحب نے اس خط میں میری کتاب "تلاش دبیر" طبع دسمبر ۱۹۷۹ء کا ذکر فرمایا ہے۔

—— (۱۲) ——

پٹنہ ۴ (بنام کاظم علی خاں ۶ر فروری ۱۹۸۲ء)
۶ ۲ ۸۲

عزیزی خوش رہیں، عمر دراز پائیں، اور اردو کی خدمت کرتے رہیں۔ کتاب[1] اور دو خط یکے بعد دیگرے ملے، شکریہ!

ابھی کتاب میں نے نہیں پڑھی ہے۔ سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک شاگرد صبا کا دیوان میں نے دہلی یونیورسٹی کے کتب خانے میں دیکھا تھا۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

رباعیات ٍ

افقی و عمودی خط و خم پہچانو
کس کا ہے یہ اعجازِ قلم پہچانو
تاریک بساطِ شب پہ روشن روشن
بے خواب نشاناتِ قدم پہچانو

ٹھہرا غلط آخر کو یہ اقدام ترا
رُسوائی کا اک نقش بنا نام ترا
ہنستے ہوئے شہروں کو کیے دیتا ہے راکھ
کیسا ہے پرومی تھیئس انعام ترا[1]

ثانی نہیں تیرے یہ گہر اور گلاب
شعلوں کی طرح گرم گلوں سی شاداب
اے ساعتِ تخلیق تری چھاؤں کی خیر
تو لمسِ شفق، موجِ صبا، سیلِ سحاب

پھیلا ہوا اک جالِ گراں تا بہ کراں
بکھری ہوئی اک دُھند سی تنویم گراں
تفہیم کی خوشبو سے ہے بیگانہ ابھی
پیچیدہ پُراسرار چراغوں کی زباں

جنگل سے یہ شب کے گزرتا ہوا میں
ہر لمحہ نئے خوف سے مرتا ہوا میں
کس کس سے کہوں اپنے سفر کا احوال
نادیدہ نشیبوں میں اترتا ہوا میں

چڑھتا ہوا دن ہوں، سیلِ دریا ہوں میں
آواز کی شعلگی سے خاک ہوتا ہوں میں
پھر اپنی سیہ راکھ سے ققنس کی طرح
چلتی ہے ہوا، سے نم تو جاگ اٹھتا ہوں میں

کب روشنیٔ تازہ کے گلزار میں آئے
جب آئے تو ماحولِ شب آثار میں آئے
آزادیٔ جاوید کی خواہش تھی ہمیں
غاروں سے جو نکلے در و دیوار میں آئے

ہے زیرِ قدم پھیلا ہوا دشتِ قیود
تقدیر میں لکھا ہے نزول اور صعود
اس قید میں سر پھوڑ کے مرنا ہے مجھے
ہر سمت ہے دیوارِ افق اور عمود

---

[1] یونانی صنمیات کا ایک اہم کردار جس نے دیوتاؤں کے ذخیرہ سے آگ چرا کر انسانوں کو دی تھی ـــــ ع . ظ

عشرت ظفر

معرفت ـــــ جوبلی واچ کمپنی، سائیکل مارکیٹ، لال امام باڑہ؟ کرانگ
کانپور

کاظم علی خاں،
۲۰۱، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

خطوط قاضی عبدالودود

بہ نام کاظم علی خاں

اُردو تحقیق کے خارزاروں کی تاریک راہوں میں گام فرسائی کرنے والوں کے لیے قاضی عبدالودود کی ذات وہ منارۂ نور تھی، جس نے کم و بیش نصف صدی تک قدم قدم پر کاروانِ تحقیق کی کامیاب رہبری و رہنمائی کر کے اُردو تحقیق کو مقدار و معیار دونوں ہی اعتبار سے ایک نئے وزن و وقار سے ہم کنار کرانے میں جو یادگار کارنامے سرانجام دیے ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قاضی صاحب نے جس طرح اپنی زندگی کا بہترین حصہ نہایت ایمان داری سے حق و صداقت کی تلاش و تحقیق میں صرف کیا اس کی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔ قاضی عبدالودود کیمبرج یونیورسٹی کے سند یافتہ بیرسٹر تھے اور ان کے تحقیقی مزاج میں حقائق کو دریافت اور بے نقاب کرنے کا جیسا اور جتنا دخل تھا اس کے پیش نظر یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ انھوں نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنالیا تھا کہ "جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا"۔ ان کے بارے میں سربرآوردہ محقق و نقاد پروفیسر مسعود حسین خاں کا ارشاد ہے کہ قاضی صاحب جب بھی تحقیق کے (ریگستان) میں اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گزرتا دیکھتے، بے تحاشا اس حرکت پر نشتر لے کر دوڑ پڑتے۔ اُردو کے بہت سے "فاضلانِ عاجل" ان کی نشترزنی سے مجروح ہو چکے ہیں۔ وہ عالموں کے قدردان اور طالب علموں کے مددگار رہے۔ لیکن نیم عالم کے لیے ان کا قلم خطرۂ جاں بن جاتا تھا۔

قاضی عبدالودود ایک منفرد محقق سے زیادہ تحقیق کی ایک ایسی جیتی جاگتی مجسم درس گاہ تھے جس سے نہ صرف میدانِ تحقیق کے نووارد بلکہ پختہ کار بھی ادبی تحقیق کے آداب کا درس حاصل کرتے رہتے تھے۔ وہ کاروانِ تحقیق کے لئے خضرِ راہ تھے۔ انھوں نے اپنے انبار در انبار بلند پایہ تحقیقی ادبی آثار کی بنیاد پر نہ صرف اردو تحقیق کے قصرِ جمیل کی تعمیر و تشکیل کی بلکہ اپنے تیار کردہ ایوانِ تحقیق کی سختی سے پاسبانی بھی کی تھی کہ کوئی نااہل اس میں آسانی سے داخل ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔ گویا قاضی صاحب قصرِ تحقیق کے مشاق معمار ہونے کے ساتھ ساتھ مستعد نگراں و پاسباں بھی تھے۔ ممتاز نقاد پروفیسر محمد حسن کا یہ ارشاد بھی یاد رکھنا چاہیے کہ میدانِ تحقیق میں گام فرسائی کرنے والوں کو قاضی عبدالودود کے احتساب کا خوف محتاط بنا دیتا تھا۔

تحقیق کی عدالت کے بے شمار قضیوں کو بیرسٹر قاضی عبدالودود نے قانونِ شہادت پر اپنے زبردست دسترس کی بدولت حل کیا تھا وہ بے دلیل دعوے پیش کرنے والے وکیل نہ تھے۔ ان کی تحقیق منطقی دلائل و شواہد اور حقائق کے معروضی تجزیے پر مبنی ہوتی تھی۔ قاضی صاحب ایک منصف مزاج مصنف، محتاط ترین محقق، ایک سچے اور حق گو عالم اور ایک نڈر اور بے باک نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے وسیع المطالعہ و عمیق النظر دانش ور تھے جن کے دماغ میں لائبریریوں کی لائبریریاں آباد تھیں۔ تحقیق قاضی صاحب کے لیے پیشے سے زیادہ شوق و شغف کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُردو تحقیق کی تاریخ میں قاضی عبدالودود ایک عہد ساز محقق تھے۔

قاضی عبدالودود میرے ان بزرگ مشفقوں اور کرم فرماؤں میں تھے جنھیں میں تحقیقی کاموں میں اپنا معیار قرار دیتا ہوں۔ تحقیق کی جانب میرے رُجحان کی اجمالی داستان یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۴ء (یعنی کم و بیش بیس برس) تک نوشت و خواند کے اپنے نومشقی کے دور میں تنقید نگاری یا مراسلہ نگاری کے دائرے میں کاوِ کاوِ کرکے تقریباً پون درجن مطبوعہ کتابوں کا مرتب، مترجم یا مصنف اور درجنوں مطبوعہ مراسلوں کا محرر بننے کے بعد جب میں نے ۱۹۷۵ء کے آس پاس تحقیق کے خارزار میں قدم رکھنے کی کوشش کی تو اس دشوار گزار راہ گزر سے بعافیت گزرنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس فکر کی بدولت میں نے اُردو کے جن بزرگ و ممتاز محققوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی، ان میں قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، پروفیسر مسعود حسن ادیب، پروفیسر مختارالدین احمد، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، مولانا امتیاز حسین فاضل، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، عبدالقوی دسنوی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور جناب مالک رام کے نام شامل ہیں۔ چنانچہ مجھے ان تمام اہلِ قلم سے نہ صرف خط و کتابت بلکہ ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا۔ ان تمام حضرات کے انبار در انبار خطوط جو میرے پاس موجود ہیں، میرے لیے سرمایۂ عزیز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مختلف کتب خانوں اور اداروں نے ان "گنج ہائے گراں مایہ" کو مجھ سے طلب بھی فرمایا مگر میں نے ان سے محروم ہونا منظور نہ کیا۔ لیکن اب کہ میں اوائل ۱۹۸۹ء میں اپنے سفرِ حیات کا نصف سے زیادہ راستہ طے کرکے منزلِ شباب سے نکل کر وادیٔ شیب میں قدم رکھ چکا ہوں تو مجھے یہ فکر دامن گیر ہے کہ مشاہیر کے ان خطوط کو رفتہ رفتہ اشاعت کے ذریعہ ادبی حلقوں کے سپرد کر دوں تاکہ یہ غیر محفوظ بھی ادبی ذخیرہ محفوظ اجتماعی امانت بن جائے اور میں اس بارِ گراں کی حفاظت کی فکر سے سبک دوشی حاصل کرکے یہ شعر پڑھ سکوں ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

مذکورۃ الصدر مکتوب نگاروں کی فہرست میں سے متعدد اصحاب ان مکاتیب کی اشاعت سے قبل زندگی کا سفر طے کر چکے ہیں۔ رہا مکتوب الیہ تو اب اس کی بھی زندگی کا کیا بھروسا، بہ قول نواب مرزا شوق لکھنوی ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ان حالات میں دل یہ چاہتا ہے کہ ان خطوط کا مکتوب الیہ مکتوب نگاروں کی طرح اپنی زندگی کا سفر طے کرنے سے قبل ان کی اشاعت کا انتظام کر دے، قاضی عبدالودود صاحب کے خطوط کی یہ اشاعت میرے اسی منصوبے کی پہلی عملی شکل ہے۔ مرحوم مکتوب نگاروں کی عنایتوں سے محروم ہو کر میر فتح علی شیدا کا یہ شعر پڑھتا رہتا ہوں ؎

وہ صورتیں الٰہی کس (دیس) بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں[1]

قاضی عبدالودود صاحب سے میں نے جب مارچ ۱۹۷۶ء کے آس پاس خط و کتابت شروع کی تو وہ بیماریوں کے ہاتھوں جسمانی طور پر نحیف و نزار ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود ذہنی اعتبار سے وہ اہلِ تحقیق کے لیے بہترین رہبر ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ قاضی صاحب کی تاریخِ ولادت ۸ مئی ۱۸۹۶ء بتائی جاتی ہے۔ اس طرح ۱۹۷۶ء تک وہ کم و بیش اپنی زندگی کے اسّی سال پورے کر چکے تھے۔ قاضی صاحب سے میری مکاتبت یوں تو مارچ ۱۹۷۶ء سے ان کی وفات (۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء) سے ایک آدھ ماہ قبل تک جاری رہی لیکن مکاتبت کی اس کم و بیش آٹھ سالہ مدت میں سے تقریباً سات سال (مئی ۱۹۸۲ء) تک تو یہ خط و کتابت دو طرفہ رہی یعنی وہ مجھے میرے خطوط کے جوابات سے سرفراز فرماتے رہے البتہ آخری ایک سال میں اس مکاتبت کی نوعیت یک طرفہ ہو گئی یعنی میری جانب سے تو انھیں خط روانہ کیے جاتے رہے مگر وہ جواب دینے سے قاصر رہتے اور کبھی کبھی کسی مددگار کے ذریعے مجھے جواب یا سلام و پیام لکھوا دیا کرتے تھے۔ ان مددگاروں میں قاضی عبدالودود صاحب کے فرزند مجتبیٰ قاضی محمد مسعود صاحب اور محترمہ

---

[1] تذکرۂ گلشنِ سخن، مرزا علی خاں مبتلا لکھنوی۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب علی گڑھ طبع ۱۹۶۵ء ص۲۲



اترپردیش شری کلیان سنگھ ۸ر فروری ۱۹۹۲ءکو لکھنؤ میں عالمی بینک کے" بھار
ہیبنچ ورجن اور ٹیم کے ممبروں کو اترپردیش کے پراجیکٹوں کے سلسلہ میں جانکاری دیتے

ایشین فیڈریشن کے سفیر شری ا ... ڈول ایم. دراکوف ۱۴ر فروری ۱۹۹۲ءکو سچوالیہ انیکسی
میں وزیراعلا شری کلیان سنگھ سے ملاقات ... تے ہوئے



[illegible] کے [illegible] کو [illegible] کے [illegible] کے [illegible]

[illegible]



اترپردیش کے گورنر شری بی. ستیہ نرا
کی سلا

وزیر اعلا
شری کلیان سنگھ
۱۰ر فروری ۱۹۹۲ء
کو
ہستناپور (میرٹھ)
میں
ترقیاتی کونسل کی
۱۴ ویں
آل انڈیا کانفرنس
کو خطاب
کرتے ہوئے





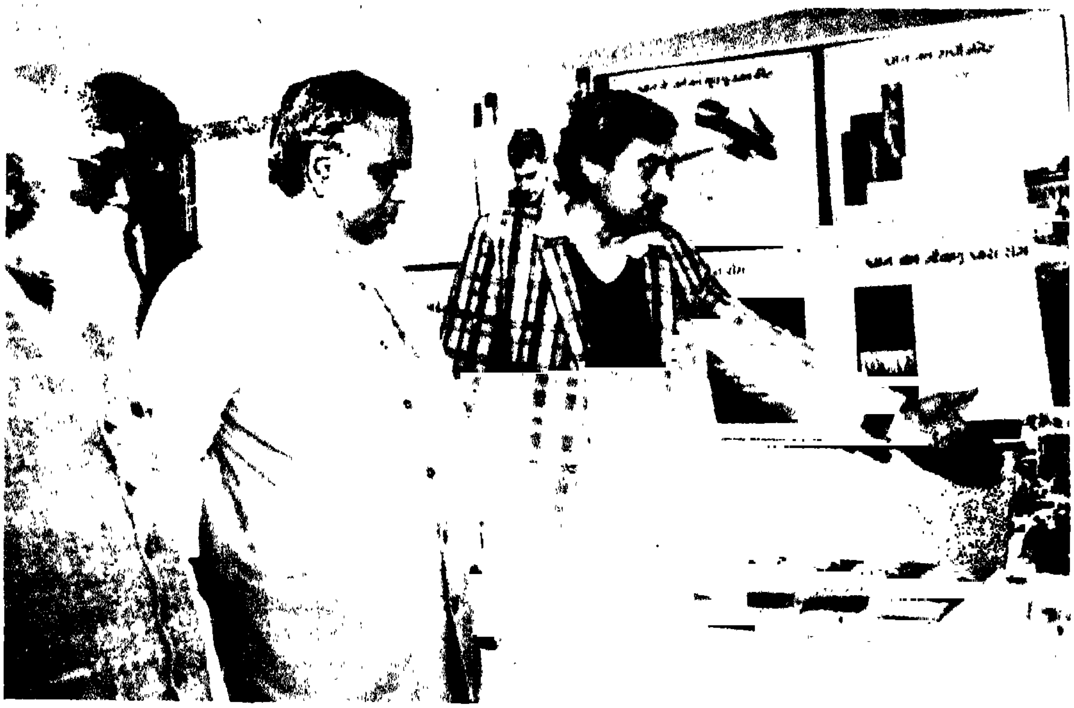
دی یو ... کے موقع پر پریڈ
... ہوئے

شری کلیان

وزیر زرا
گنگا ... گت
زلزلہ ز
کی ا
پیش کر







وزیراعلیٰ شری کلیان سنگھ ۹ر فروری ۱۹۹۲ء کو دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
گونڈہ کے زیراہتمام منعقدہ کسان میلہ اور دیہی صنعتی نمائش کا افتتاح
کرنے کے بعد نمائش دیکھتے ہوئے۔



یوم شہیداں کے موقع
پر لکھنؤ میں شہید اسمارک
پر وزیر شہری ترقی شریمتی
پریم لتا کٹیار، وزیر
تعمیرات عامہ شری
سرجیت سنگھ ڈنگ اور
وزیر غذا و رسد شری
اعزاز رضوی
دیپ دان کرتے ہوئے

(۱) ".... میں مدّتوں سے بیمار ہوں ...."

(مکتوب مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۷۶ء)

(۲) "..... میری صحت خراب ہوگئی ہے۔ داہنا ہاتھ اور داہنا پاؤں ٹھیک طرح کام نہیں کرتا۔ انگلیاں (کذا؛ انگلیوں) کا بھی یہی حال ہے ...."

(مکتوب ۲۶ جولائی ۱۹۷۹ء)

(۳) "..... میں ڈھائی سال سے علیل ہوں۔ ذیابطس تو نہیں، مگر اس کا اثر توانائی، قوت ارادی اور حافظے پر پڑا ہے ...."

(۱۳ جولائی ۱۹۷۸ء)

(۴) "....... آپ کو اس کی خبر نہیں کہ میں مفلوج ہوگیا ہوں۔ داہنے ہاتھ اور داہنے پاؤں پر اثر ہے۔ ہاتھ سے (وہ) سب کام کرلیتا ہوں جو پہلے کرتا تھا، مگر دقّت کے ساتھ۔ پاؤں پر اثر زیادہ ہے۔ کھڑا ہوسکتا ہوں لیکن چلنا مشکل ہے ...."

(۳ ستمبر ۱۹۷۹ء)

(۵) "..... میری صحت برسوں سے خراب ہے ....."

(۱۱ مئی ۱۹۸۲ء)

ان خطوط میں کہیں کہیں قاضی صاحب کے ایجاز کاوہ اعجاز بھی ملتا ہے جو ان کی تحریر کا خاص وصف ہے اور یہ کمال انھوں نے برسوں کی مشق کے بعد حاصل کیا تھا۔ وہ کم سے کم الفاظ میں بڑے سے بڑے مطلب کو بیان کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ میں جب اوائل مئی ۱۹۷۹ء میں چار پانچ روز کے لئے ان کے یہاں پٹنہ گیا تھا تو انھوں نے گفتگو کے دوران فرمایا تھا کہ بڑے سے بڑے مطلب کو اگر آپ کم سے کم لفظوں میں بیان کرنے کا گُر سیکھ لیں تو اس سے آپ کی تحریروں میں وزن و وقار پیدا ہوسکتا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ انھوں نے مختصر نویسی کے اس فن پر عبور حاصل کرنے کے لئے بڑی کڑی مشق کی تھی۔

قاضی صاحب کے ان خطوط میں مزے سے زیادہ کام کی باتیں ملیں گی مگر بعض موقعوں پر ان میں قاضی صاحب کی سوئی ہوئی مزاح کی وہ حس بھی بیدار ہوگئی ہے جو ان کی سنجیدہ اور سخت گیر شخصیت کے نیچے دب کر رہ گئی تھی۔ ۱۵ جولائی ۱۹۸۰ء کا خط اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کے یہ دو تراشے حاضر کر کے اس تمہید کو تمام کرتا ہوں:

(۱) "..... معاصر کا قاضی عبدالودود نمبر ایک صاحب لے گئے اور تقاضے کے باوجود انھوں نے اسے واپس نہیں کیا۔ ان کی ایک کتاب میرے یہاں سے چوری ہوگئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کا انتقام لے رہے ہیں ...."

(۲) "..... شاد عظیم آبادی مشاہیر میں تھے اور آپ ان کے اقوال کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ بچارے کو مجبوراً سچ بولنا پڑتا تو انھیں سخت تکلیف ہوتی تھی۔ مثلاً یہ پوچھا جاتا کہ آپ کے والد کا نام کیا ہے اور مجبوراً (انھیں) کہنا پڑتا کہ عباس مرزا، تو اس کا رنج ہوتا کہ کاش کوئی بڑا آدمی میرا باپ ہوتا ...."

لیجئے۔ اب ان مکاتیب اور ان کے قارئین کے درمیان سے مکتوب الیہ کو رخصت کی اجازت دیجئے اور اب آپ ان خطوط کو خود ملاحظہ کیجئے:۔

خطوط قاضی عبدالودود

(بہ نام کاظم علی خاں ۱۱ مارچ ۱۹۷۶ء)

پٹنہ ۔ ۴
۲۱/۳ ۱۹۷۶ء

مکرمی! آپ کا خط اور مضمون ملا[1]۔ یاد آوری کا شکریہ۔ محرم، سینہ بند، مؤنث ہے۔ آتش کے زمانے میں یائے معروف و مجہول کے لکھنے میں فرق نہیں کیا جاتا تھا، اس لئے آتش کا شعر تانیث یا تذکیر کی سند میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ جان صاحب کے یہاں البتہ یہ لفظ اس طرح آیا ہے کہ قطعی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ ان کی زبان پر مؤنث تھا۔ کسی کا کوئی ایسا شعر میرے علم میں نہیں جس سے تذکیر ثابت ہوتی ہو[2]۔

آپ نے مضمون محنت سے لکھا ہے[3]۔ میں نے مدّت ہوئی ایک مضمون میں اس سے بحث کی تھی کہ غالب نے اُردو میں خط لکھنا کب سے شروع کیا۔ الطاف علی

بریلوی صاحب جو ایجوکیشنل کانفرنس سے وابستہ تھے، علی گڑھ سے ایک سہ ماہی رسالہ "معلّم" نکالتے تھے۔ میرا مضمون اسی رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ ؎۵ علی گڑھ میں کہیں نہ کہیں وہ شمارہ جس میں میرا مضمون ہے، ضرور ملے گا، آپ اسے دیکھیں گے تو یہ سری رائے معلوم ہو جائے گی"!

خیر اندیش
قاضی عبدالودود

حواشی: از کاظم علی خاں (مکتوب الیہ)

؎۱ قاضی عبدالودود صاحب نے یہاں میرے جس مضمون کا ذکر فرمایا ہے وہ بہ عنوان "غالب کی اُردو مکتوب نگاری۔ آغاز و محرکات" ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، ماہ نومبر ۱۹۷۵ء نیز ماہ جنوری ۱۹۷۶ء میں دو قسطوں میں چھپا تھا۔ میں نے دونوں قسطیں قاضی صاحب کی رائے کے لیے ارسال کی تھیں۔

؎۲ لفظ "محرم" کی تذکیر و تانیث پر قاضی عبدالودود صاحب نے یہ تمام بحث میرے جس استفسار کے جواب میں فرمائی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۷۶-۱۹۷۵ء کے دوران میں ایک مفصل مقالے کے ذریعہ "تذکرۂ نادر: مرتبہ مسعود حسن ادیب لکھنؤ طبع ۱۹۵۷ء کا تحقیقی جائزہ لے رہا تھا۔ میرا یہ طویل مقالہ چھ قسطوں میں ہے جس کی پانچ قسطیں غالب نامہ نئی دہلی، "شیرازہ" سری نگر، قومی آواز لکھنؤ، "زبان و ادب" پٹنہ نیز "ہماری زبان" دہلی جیسے رسائل میں شائع ہو چکی ہیں اور ایک قسط ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس مقالے کی ایک قسط میں (جو بعد کو ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۲۹ راگست ۱۹۷۶ء صفحہ ۳ میں شائع ہوئی تھی) "تذکرۂ نادر (صفحہ ۵۶) میں شامل سید علی حسن (حسن، کذا حسین) حزیں کی غزل کا یہ مطلع زیر بحث تھا ؎

اتریں گے گر نہ وصل میں محرم تمام شب
گستاخیاں کریں گے یونہی ہم تمام شب

حزیں کے اس مطلع میں لفظ "محرم" کے لئے "اتریں گے" آیا ہے جس سے محرم کی تذکیر نکلتی ہے جو مجھے محلِ نظر معلوم ہوئی۔ لفظ محرم (بمعنی سینہ بند) کی تذکیر و تانیث کے لیے میں نے مختلف مآخذ میں اس لفظ کی چھان بین کی اور کئی محققین سے استفسار کیا۔ اس چھان بین اور استفسار کے نتیجے میں مجھے آتش لکھنوی اور جان صاحب کے یہ دو اشعار دستیاب ہوئے:۔

(۱) خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی (منقول از کلیات آتش مطبع نول کشور کانپور طبع اپریل ۱۸۸۸ء صفحہ ۳۴) ؎

کسی کی محرم آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

(۲) میر یار علی جان صاحب لکھنوی (ماخوذ از تاریخ ریختی مع دیوان جان صاحب: مرتبہ سید محمد مبین نقوی مطبع انوار احمد الہ آباد سنہ اشاعت ندارد صفحہ ۲۱) ؎

وہ ہاتھا پائی رات کو کی مجھ سے چاند خاں
محرم کتاں کی تم نے مری تار تار کی

میں نے آتش اور جان صاحب کے یہ دونوں اشعار قاضی صاحب کو ارسال کر کے ان سے اس مباحثے پر محاکمے کی درخواست کی، جس کے جواب میں قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے زیر بحث خط میں یہ محاکمہ کیا ہے جو میری رائے کی تائید کر رہا ہے۔

؎۳ قاضی صاحب نے میرے جس مضمون پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے اس کی تفصیل مذکورالصدر حاشیہ نمبر۱ میں تحریر کر چکا ہوں۔

؎۴ یہاں قاضی صاحب نے اپنے جس مقالے کا حوالہ دیا ہے وہ "غالب نے اُردو میں خط و کتابت کب سے شروع کی" کے عنوان سے قاضی عبدالودود کے مقالات کی ان دونوں فہرستوں میں موجود ہے جو درج ذیل مآخذ میں شامل ہیں:

(۱) رسالہ معاصر پٹنہ (قاضی عبدالودود نمبر) مرتبہ کلیم الدین احمد طبع اگست ۱۹۷۶ء صفحہ ۳۰۔ فہرست مرتبہ ذکی الحق و محمد منصور عالم میں یہ مقالہ ۲۰۶ نمبر پر ملتا ہے۔

(۲) رسالہ غالب نامہ نئی دہلی (قاضی عبدالودود نمبر) جنوری ۱۹۸۷ء صفحہ ۲۴۷ اشاریہ مرتبہ کردہ جمیل احمد خاں میں یہ مقالہ ۲۸ نمبر پر

درج ہے۔

مذکورالصدر دونوں رسائل اس بات کی وضاحت نہیں کرتے کہ قاضی صاحب کا مقالہ کس جریدے میں چھپا تھا۔ قاضی صاحب کا زیرِ مطالعہ خط بہ نام راقم الحروف بتاتا ہے کہ ان کا یہ مقالہ الطاف علی بریلوی کے سہ ماہی رسالے "معلّم" علی گڑھ میں چھپا تھا۔

—— (۲) ——

۴ر اپریل ۷۰ء (بنام کاظم علی خاں)

پٹنہ ۴

شفیق مکرّم!

آپ کا خط ملا۔ مدیر مصنف الطاف علی بریلوی تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے تھے، اس کا وہ شمارہ جس میں میرا مضمون ہے، اس سے قبل شائع ہوا تھا۔ میرے پاس بہت سے رسائل ہیں، اس کا ڈھونڈھ نکالنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی لے گیا ہو۔ دانش گاہ علی گڑھ میں مصنف کے کل شمارے ہوں گے اور میرا خیال ہے کہ پروفیسر مختارالدین احمد (شعبۂ عربی دانش گاہ علی گڑھ) کے پاس بھی وہ شمارہ ہے۔ آپ انھیں اس کے متعلق خط لکھیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے معاصر میں اودھ اخبار میں جو کچھ وفات دبیر کے متعلق تھا نقل کر دیا تھا۔[۱] اودھ اخبار کے ایک شمارہ میں دبیر کے قطعہ تاریخ وفات میر انیس پر جو اعتراضات ہوئے تھے ان کا ذکر بھی ہے۔[۲] شاد عظیم آبادی نے قبل اس کے کہ "فکرِ بلیغ" میں دبیر کا حال لکھیں "نوائے وطن" میں ان کا حال لکھا تھا، اور اس کی اشاعت کے بعد ہی ان پر اعتراضات ہوئے تھے۔ "نوائے وطن" بہ آسانی مل جائے گی، مگر تردیدی رسالہ شاید نہ ملے۔ دبیر سے متعلق آبِ حیات میں جو کچھ ہے، اس پر ایک صاحب نے اعتراض کیے تھے اور ایک رسالہ اس کے متعلق لکھا تھا۔ میں نے نوائے ادب میں جو مقالہ "آزاد بہ حیثیت محقق" کے عنوان سے لکھا تھا اس میں اس سے کام لیا تھا۔

آپ کا مضمون اچھا ہے[۳] مگر آپ کو یہ لکھ دینا تھا کہ "دفترِ ماتم" کی جلدیں کہاں کہاں ہیں۔[۴] لفظ "نایاب" بہت کمیاب کے لیے بھی آتا ہے۔ لیکن ایسی شے کے لیے بھی آتا ہے جو بالکل نہ ملتی ہو، اس لیے اس کے استعمال سے احتراز مناسب ہے۔

سال گزشتہ کشمیر سے ایک صاحب پٹنہ آئے تھے، وہ بھی دبیر پر کام کر رہے تھے۔[۵] معاصر کے لیے کلیم الدین احمد صاحب کو لکھیے: پتا[۶] 7 B Sri Kirishnapuri Patna

خیر اندیش

قاضی عبدالودود

حواشی: از کاظم علی خاں (مکتوب الیہ)

[۱] دبیر پر قاضی عبدالودود صاحب کا یہ مقالہ بہ عنوان "مرگِ دبیر" رسالہ معاصر پٹنہ حصہ اول ص ۱۳۱ تا ۱۴۱ میں چھپا ہے۔

[۲] رجوع کیجیے معاصر پٹنہ حصہ اول ص ۸۴ تا ۹۰ (مقالہ "مرگِ انیس" از قاضی عبدالودود)

[۳] یہاں قاضی عبدالودود صاحب نے میرے جس مقالہ پر اظہارِ پسندیدگی فرمایا ہے وہ رسالہ نیا دور لکھنؤ ماہ مارچ ۱۹۷۰ء میں بہ عنوان "مرزا دبیر کے مجموعۂ کلام "دفترِ ماتم" کی بیس جلدیں" چھپا تھا اور میں نے اس مطبوعہ مقالہ کا تراشا قاضی صاحب کو ان کی رائے کے لئے اپنے خط مورخہ ۷ر مارچ ۱۹۷۰ء کے ساتھ ارسال کیا تھا۔

[۴] "دفترِ ماتم" کی جلدیں کہاں کہاں ہیں اس امر کی وضاحت میرے محولہ بالا مقالے میں عمداً اس بنا پر نہیں کی گئی تھی کہ جن زیدپوری کرم فرما نے مجھے وہ جلدیں مستعار دی تھیں خود انھوں نے یہ تاکید بھی فرمائی تھی کہ مقالے میں یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ یہ جلدیں کہاں موجود ہیں۔ میرے یہ کرم فرما سید دل شاد حسین صاحب زیدپوری تھے۔ افسوس کہ وہ اب وفات پا چکے ہیں۔ مرحوم دبیریات پر بہت اچھی نظر رکھتے تھے ۔۔۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

۵۵ قیاس ہے کہ یہ صاحب شاید ڈاکٹر محمد زماں آزردہ ہوں گے یا ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری بھی ہو سکتے ہیں۔

۵۶ یہ سطر پوسٹ کارڈ کے صفحہ اوّل کے بائیں جانب بغلی حاشیے میں مرقوم ہے۔

(۳)

پٹنہ۔ ۴ (بہ نام کاظم علی خاں)

۵ رمئی ۷۶ء

"آپ کا خط آیا تھا، نہ جانے کیا ہوا۔ نیا دور کے پتے سے یہ کارڈ جاتا ہے۔ امید تو ہے کہ آپ کو مل جائے۔

معتقد تقسیم ہند کے بعد ہی بند ہو گیا، اور اس سے قبل دو چار سال ہی جاری رہا۔ علی گڑھ میں اس کے کل شمارے ہوں گے۔ آپ کو (کو؟ کذا کا) کوئی شناسا وہاں ہو تو اسے مضمون کے بارے میں لکھیں، تلاش میں بہت تھوڑا وقت صرف ہوگا۔

معاصر پہلے ہر ماہ نکلتا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں سہ ماہی ہو گیا اور اواسط ۱۹۵۱ء (میں) اس طرح پہلی بار نکلا تھا اور پہلے ہی شمارے میں اودھ اخبار میں وفات دبیر کے متعلق جو کچھ تھا نقل ہوا ہے۔"

خیر اندیش۔ قاضی عبدالودود

(کارڈ کے دونوں بغلی حاشیوں میں یہ عبارت بہ طور پس نوشت مرقوم ہے۔ کاظم علی خاں):

"ایک رسالہ یہاں 'موازنہ انیس و دبیر' میں دبیر کے متعلق جو کچھ ہے اس کی رد میں ہے۔ ایک دوسرا امیر مینائی کے بارے میں 'حیاتِ دبیر' میں جو کچھ ہے اس سے بحث کرتا ہے۔ "آزاد بہ حیثیت محقق" کے بارے میں 'نوائے ادب' سے دریافت کریں۔"

(پوسٹ کارڈ کے پتے والے دوسرے رخ پر اڈیٹر نیا دور کے لئے یہ عبارت بھی ملتی ہے):

"اڈیٹر صاحب۔ کاظم علی خاں صاحب کا مضمون مراثی دبیر سے متعلق نیا دور میں چھپا تھا، ان کا خط آیا تھا، غائب ہو گیا براہ مہربانی اس کارڈ پر ان کا پتا لکھ کر ڈاک گھر بھجوا دیں۔ شکریہ۔"

قاضی عبدالودود

(پوسٹ کارڈ پر پتا یوں لکھا گیا ہے):

"جناب کاظم علی خاں'
Nea Daur
(Urdu monthly)
Lucknow"

(۴)

پٹنہ۔ ۴ (بہ نام کاظم علی خاں۔ ۲۳ رمئی ۷۶ء)

۲۳/۵ ۷۶

عزیزی! آپ کا خط ملا۔ آج کل جو صاحب نیا دور کے مدیر ہیں، میں ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ پہلے جو صاحب تھے، وہ کبھی کبھی مجھے خط لکھتے تھے اور مضمون طلب کرتے تھے۔ آج کل نیا دور میرے پاس کبھی آتا ہے، کبھی نہیں، چنانچہ وہ شمارہ جس میں آپ کا مضمون ہے، مجھے نہیں ملا۔ اس صورت میں کسی خاص مضمون کے متعلق مدیر کو کچھ لکھنا میری روش کے خلاف ہے۔ مطلوبہ کتابیں آپ کو مل جائیں گی۔

آپ پٹنہ آنا چاہیں تو بشوق آئیں، مگر پہلے سے مجھے مطلع کر دیں۔ لوگوں نے میری مخالفت میں بھی لکھا ہے اور میری موافقت میں بھی۔ کسی کو اس کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنے متعلق "نقوش" کے آپ بیتی نمبر میں لکھ چکا ہوں۔

آپ کے پاس اس کا کچھ ثبوت ہے کہ دلگیر مسلمان ہو گئے تھے اور ان کا اسلامی نام غلام حسین تھا؟ مسلمان ہونا شیفتہ و ناصر دونوں نے لکھا ہے اور اسلامی نام تذکرہ ناصر ملک کتب خانہ خدا بخش کے حاشیے میں ہے۔ میرا ادعا

مرا سالِ ولادت ہندوی میں
جو کوئی صورت و معنی میں پاوے
تو کر دے قافیے کو دور تا ہاتھ
ہزار و ہشت صد شصت و نہ آوے

سمت ۱۸۶۹ بکرمی

روزِ پیدائش سے سنِ شعور تک بے صبر سکندر آباد میں رہے۔ خداداد فہم و فراست و قابلیت و ذہانت کی وجہ سے آپ نے پندرہ سال کی عمر میں عربی فارسی نجوم، منطق اور علمِ تصوف میں کمال حاصل کیا۔ فارسی کے مشہور شاعر اور مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کے مشہور شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ آپ کے ماموں تھے بے صبر نے حضرت تفتہ سے علم عروض پڑھا اور شروع شروع انھیں سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ تفتہ کے فیضِ صحبت اور اصلاح سے بے صبر نے شاعری میں دن دونی رات چوگنی ترقی کی اور بالآخر ان کے ہی ایماء سے بے صبر نے مرزا غالب کی شاگردی اختیار کی، جس سے بے صبر کے کلام کی وقعت اور بڑھ گئی ......

سترہ سال کی عمر میں بے صبر سرکاری ملازمت میں محکمہ پرمٹ میں داخل ہوئے لیکن کچھ عرصے بعد دل برداشتہ ہو کر مستعفی ہو گئے۔ پھر کلکٹری سہارن پور میں ملازم ہو گئے اور ۱۸۶۴ء میں پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے......

۱۳ فروری ۱۸۸۵ء کو بروز شیو راتری اس دارِ ناپائیدار سے کوچ کیا۔ آخری عمر میں آپ شیو جی کی عبادت میں ہر وقت مصروف رہا کرتے تھے اور شیو منتر کا ہر وقت جاپ کیا کرتے تھے۔ شیومت کے عقائد کے بموجب شیو راتری کے دن بے صبر کا انتقال فرمانا نہایت سعد تھا ....

حضرت بے صبر کے پس ماندگان میں دو صاحبزادے منشی کرشن سروپ تنبر، بابو برہما سروپ اوور سیر اور بابو رام چند سروپ خلف منشی کرشن سروپ تنبر تھے۔ مگر عرصہ ہوا کہ یہ تینوں صاحبان بھی قیدِ حیات سے آزاد ہو چکے ہیں۔ آپ کے ورثا میں سے اب بابو گردھر سروپ اور بابو جیوتی سروپ باقی ہیں مضمون کا زیادہ تر مواد بابو گردھر سروپ سے حاصل ہوا۔

انھوں نے راقم الحروف کو اخبار بھٹناگر سماچار دلد بے صبر کی غزلوں اور قصیدوں کے مسودوں کے علاوہ ان کی تصنیف ادیب البنات کا قلمی نسخہ عنایت فرمایا اسی سلسلے میں ان کے بہت سے خاندانی حالات بھی بتلائے۔ سکندرآباد ضلع بلند شہر میں بابو موہن دیال دگالہ، بابو بھجن لال دگالہ، منشی نرائن سروپ، منشی کلیان سروپ، منشی آتما سروپ، بابو بھگوان سروپ اور ردھولی پور میں بابو کرشن سروپ جناب بے صبر کی یادگار ہیں۔

حضرت بے صبر کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) دیوان عام اردو (غیر مطبوعہ) جس میں غزلیں رباعیاں و قطع ترجیع بند وغیرہ ہیں۔

(۲) دیوان خاص اردو (غیر مطبوعہ) صرف غزلیات کا مجموعہ ہے۔

(۳) دیوان فارسی (غیر مطبوعہ) منشی دیبی پرشاد بشاش نے اپنی تصنیف تذکرہ آثار الشعراء ہند میں اس کا ذکر کیا ہے

(۴) دیوان قصائد اردو (غیر مطبوعہ) اس میں چون قصیدے ہیں، ترکیب بند، ترجیع بند ہیں۔ اس کے اکثر صفحات ضائع ہو گئے ہیں۔ قصائد نمبر ۳۰، ۳۱، ۴۶ اور ۵۳ ملکۂ برطانیہ کی خدمت میں روانہ کیے گئے تھے۔ دیگر قصائد میں قصیدہ نمبر ۴ سدرہ توحید میں، نمبر ۶ لوہار ہندوستان کی تعریف میں، نمبر ۹ قداحت روح کے بارے میں، نمبر ۱۱ مستقل (جو بے نقط ہے) نمبر ۱۶، پر کالۂ آتش حضرت غالب کی مدح میں، نمبر ۱۸ جناب تفتہ

کی تعریف میں، نمبر ۱۹ آرام جاں مہاراجہ بنارس کی تعریف میں نمبر ۲۱، دلپذیر مہاراجہ کشمیر کی مدح میں، نمبر ۲۴ حالات ہجوم ہر ردار، نمبر ۲۷ بہار کی تعریف میں، نمبر ۲۰ نور علی نور ملکہ وکٹوریہ قیصرہ ہند کی مدح میں، نمبر ۳۱ تیغ برہنہ مبارکباد بر فتح افغانستان، نمبر ۴۴ مبارکباد بحضور لارڈ رپن وائسرائے ہند بہ موقع دربار منعقدہ ۱۵ نومبر ۱۸۸۰ء اور نمبر ۵۳ دوبارہ تہنیت بر فتح مصر و مدح ملکہ وکٹوریہ ہے قصائد مذکورہ بالا سے جناب بے صبر کی قادر الکلامی اور علمی تبحر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

(۵) مثنوی لخت جگر اُردو (مطبوعہ ۱۸۷۱ء) اب نایاب ہے۔

(۶) مثنوی اخگر عشق اُردو (مطبوعہ) بھی اب نایاب ہے۔

(۷) سراپا سخن اُردو (مطبوعہ فروری ۱۸۷۹ء) اس میں مصنف نے اپنے دو فرزندوں منشی ہر سروپ اور منشی بینی سروپ کا سراپا اور نوحہ لکھا ہے۔

(۸) رسالہ ادیب البنات، اُردو نثر (غیر مطبوعہ) اس کے دیباچے میں بے صبر تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے ساری عمر اپنی شعر و شاعری میں گزاری اور خاک اس گلی کی خوب چھانی۔ تین دیوان اور تین مثنویاں اردو فارسی میں کہیں کہ وہ مجھ سے یادگار ہیں۔ لیکن کوئی ایسی کتاب جو واسطے تعلیم طلبا مدارس دیسی اور سرکاری کے مفید ہو، بہ سبب کم فرصتی کام عہدہ نائب منشی یعنی نائب سررشتہ داری ثانی محکمہ کلکٹری ضلع بلند شہر و سہارن پور تصنیف نہ کر سکا۔ ... نام اس کا ادیب البنات رکھا ہے اردو کے سیدھے سادے، سلیس اور صاف محاورے میں بنائی۔ سال ۱۸۷۰ء میں مراد بر آئی۔ یہ کتاب بتاریخ ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء بحضور جناب سکریٹری صاحب گورنمنٹ بغرض منظوری روانہ ہوئی۔"

(۹) گلستان ہند نثر اُردو (غیر مطبوعہ) گلستان شیخ سعدی شیرازی کے ڈھنگ پر لکھی گئی ہے۔ عبارت سلیس اور بامحاورہ ہے۔ یہ پانچ بابوں میں منقسم ہے اور ان ابواب کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

پہلا باب۔ بادشاہوں اور امیروں کے ذکر میں ۳۴ بیان
دوسرا باب۔ فقیروں کے بیان میں ۱۷ بیان
تیسرا باب۔ حکیموں اور طبیبوں کے حال میں۔ ۱۶ بیان
چوتھا باب۔ شاعروں کے حال میں ۔ ۱۸ بیان
پانچواں باب۔ نکات، لطائف، پند اور نصائح وغیرہ میں ۴۵ بیان

بطور نمونہ چوتھے باب کی حکایت نمبر ۹ ذیل میں درج ہے:-

"کہتے ہیں کہ عبدالرحیم خانخاناں کی مجلس میں کسی شاعر نے شعر پڑھا۔ نواب صاحب کو پسند آیا۔ فرمایا: "ہجو تو مول لیتے ہیں اور شصت دینار قیمت دیتے ہیں۔ شاعر نے کہا شصت کم است۔ کم کے عدد بھی ساٹھ ہوتے ہیں۔ گویا دو شصت ہو گئے۔ نواب اس لطیفہ حسن الطلب سے خوش ہوا اور ایک سو بیس دینار دے کر خرید لیا اور خلعت اضافہ کیا۔ شعر

جو قدرداں ہیں وہ کرتے ہیں قدر شاعر و شعر
ستم ہے گر کوئی دنیا میں قدرداں نہ رہے

اس کتاب کا سن تصنیف ۱۸۷۱ء ہے۔

(۱۰) رسالہ بدیع البدایع اُردو (مطبوعہ) یہ کتاب فن شاعری پر ہے ... علم عروض و صنایع بدایع کے شائقین کے لیے نہایت مفید چیز ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۰ء میں مطبع دبیر ہند بلند شہر میں طبع ہوئی۔ اب اس کی صرف ایک جلد بے صبر کے وارث بالو گردھر سروپ صاحب کے پاس ہے اور بازار میں نہیں ملتی۔"

ایسا کم ہوتا ہے کہ ایک شخص اچھا شاعر اور اچھا نثر نگار دونوں ہو،

جناب بے صبر اپنے زمانے کے معیار کے مطابق اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے اور نثار بھی۔ ان کی تصنیف رسالہ ادیب البنات جو اخلاقی تعلیم سے پُر ہے، ان کی اعلیٰ درجے کی نثر نویسی اور دل کش اندازِ تحریر کی شاہد ہے۔ اس رسالے میں اول آپ ایک اخلاقی اصول کو لوحِ دل پر نقش فرماتے ہیں۔ ذیل میں رسالہ ادیب البنات سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے:۔

رحم کی تعریف

اصل کائنات خدا کی ہے اور خدا رسیدہ ہونا اپنی اصل کو پہنچنا ہے۔ خدا کی صفات میں سے ایک صفت رحم ہے۔ اس کو وہی جانتا ہے جس کو فہم ہے۔ خدا کا رحم عام ہے۔ راحم۔ رحیم۔ رحمٰن اسی کے نام ہیں۔ آدمی کا کمال یہی ہے کہ خدا اس کو ملے۔ پس لازم آیا کہ صفاتِ حیوانی کو چھوڑ کر پہلے صفتِ انسانی کی طرف مائل ہو تاکہ صفت ربانی حاصل ہو۔ اس مقام سے رحم کے مرتبے کو خیال کرو اور رحم کرو تاکہ کمال حاصل ہو۔ بے رحمی کی سزا خدا دیتا ہے۔ کمزور کا بدلہ زور آور سے لیتا ہے۔ اس کا نمونہ بنیئے اور نائی کے لڑکوں کی کہانی ہے۔

بنیئے اور نائی کے لڑکوں کی کہانی

ایک بنیے اور نائی کے دو لڑکے پانچ پانچ چھ چھ برس کے جو سر راہ کھیلتے تھے لڑ پڑے۔ بچے ہی تو تھے نہ جانے کس بات پر جھگڑ پڑے۔ لڑائی میں اوپر تلے ہونے لگے۔ دونوں رونے لگے۔ بنیا آیا اپنے بچے کو گلے لگایا، پچکارا، پیار کیا، گھر کو بھیج دیا۔ پھر نائی کے لڑکے کو مارا اور یہ بھی کہا کہ کیوں بے کمینے۔ تو ہمارے ہی گھر سے کھاوے اور ہمارے ہی بچے پر ہاتھ اٹھاوے۔ اتنے میں نائی بھی آیا اور اس نے شور مچایا۔ بنیے نے سوچا اب ایسا نہ ہو زیادہ فساد ہو داد بیداد ہو۔ دوڑ کر گھر کو چلا۔ نائی اس کے پیچھے لگا۔ بنیئے نے جانا کہ میں بے ڈھب گھرا۔ گھبراہٹ میں چوکھٹ پر ایسا گرا کہ کواڑ کی کیل اس کے گال میں گڑ گئی اور ایک ڈاڑھ صاف اکھڑ گئی۔ زخم کاری اور خون جاری ہو گیا۔ نائی نے کہا کہ تم کو میرے بچے پر رحم نہ آیا۔ پر میں نے اپنا انصاف خدا سے بھر پایا۔"

□□

حواشی:

۱؎ رسالہ بدیع البدائع ص۴۳ (۱۸۶۹ بکرمی = مارچ ۱۸۱۲ء تا یکم اپریل ۱۸۱۳ء
۹؍ صفر ۱۲۲۷ھ تا ۲۸؍ ربیع الاول ۱۲۲۸ ہجری)

۲؎ مثنوی لخت جگر ص۹

۳؎ رسالہ بدیع البدائع ص۱

۴؎ کلیات بے صبر (قلمی) ۱۲۴۷ھ = ۱۸۳۱ء = ۱۸۸۷ ب بعمر ۱۸ سال

۵؎ کلیاتِ بے صبر (قلمی) ۱۲۴۸ھ = ۱۸۳۲ء = ۱۸۸۸ ب بعمر ۱۹ سال

۶؎ کلیات بے صبر (قلمی) ۱۸۳۳ء = ۱۸۸۹ بکرمی = ۱۲۴۹ھ بعمر ۲۰ سال

۷؎ مثنوی لخت جگر (مطبوعہ ص۹) بعمر ۲۴ سال

۸؎ مثنوی لخت جگر (مطبوعہ ص۱۴۲) اگر بھائی دو سال چھوٹا تھا تو
گویا یہ مادہ اس نے ۲۲ سال کی عمر میں نکالا

۹؎ کلیات بے صبر (قلمی) ۱۲۶۰ھ = ۱۸۴۴ء = ۱۹۰۰ ب بعمر ۳۳ سال

۱۰؎ 〃 〃 (قلمی) ۱۹۰۴ ب = ۱۸۴۸ء = ۱۲۶۴ھ بعمر ۳۵ سال

۱۱؎ کلیاتِ بے صبر (قلمی) اور رسالہ بدیع البدائع ص۳۲
(۱۲۷۰ھ = ۱۸۵۴ء = ۱۹۱۰ ب) بعمر ۴۱ سال

۱۲؎ کلیات بے صبر (قلمی)
(۱۲۷۴ھ = ۱۸۵۸ء = ۱۹۱۴ ب) بعمر ۴۵ سال

۱۳؎ رسالہ بدیع البدائع ص۳۲
۱۲۷۵ھ = ۱۸۵۹ء = ۱۹۱۵ ب) بعمر ۴۶ سال

۱۴؎ مثنوی لخت جگر (مطبوعہ ص۱۰)

۱۵ے کلیات بے صبر (قلمی) ، ۱۲۷۹ھ = ۱۸۶۲ء = ۱۹۱۸ب
رسالہ بدیع البدایع میں قطعہ کا آخری مصرع یوں ہے:
ع پیٹ کر سر کو کہا تم ہے ریختا والے والے" بعمر ۴۹ سال

۱۶ے کلیات بے صبر (قلمی)

۱۷ے " " " (۱۲۸۱ھ = ۱۸۶۵ء = ۱۹۲۱ب) بعمر ۵۲ سال

۱۸ے " " " (۱۲۸۵ھ = ۱۸۶۹ء) بعمر ۵۶ سال

۱۹ے رسالہ بدیع البدایع ص۲ (۱۹۲۶ب = ۱۲۸۶ھ = ۱۸۷۰ء) بعمر ۵۷ سال

۲۰ے مثنوی سخت جگر (مطبوعہ) ص۱۴۲ بعمر ۵۸ سال

۲۱ے کلیات بے صبر (قلمی) بعمر ۶۰ سال

۲۲ے کلیات بے صبر (قلمی) ۱۲۹۶ھ = ۱۸۸۰ء = ۱۹۳۶ب
بعمر ۵۷ سال ۔ چوتھا مصرع کچھ یوں ہوگا ع
" شبستان اشعار گشتہ بمردہ " اشعار کی جگہ غلطی سے
شعر وسخن لکھا گیا۔

۲۳ے جیسا کہ بے صبر کے شاگرد سُندر پرشاد مجنوں کے سہروں سے
ظاہر ہے۔ ہرسروپ کی شادی ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں
شادیاں گو چھوٹی عمر میں ہی ہو جاتی تھیں تاہم خیال ہے کہ انتقال
کے وقت عمر ۲۰ سال سے کم نہ ہوگی۔ اس طرح سالِ ولادت
۱۸۴۲ء قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۴ے نادر اور نساخ دونوں نے بے صبر کے والد کا نام لالہ کا نجی مل لکھا
ہے، بے صبر کے والد کا نام رائے کانہ سنگھ ہی تھا، مگر ہو سکتا ہے
کہ انھیں لالہ کانجی مل کے نام سے بھی پکارا جاتا ہو۔

۲۵ے تذکرہ معیار الشعرائے ہنود طبع نہیں ہوا۔ میں نے مخطوطے کی اطلاع
ملتے ہی دو ایک جگہ اسے تلاش بھی کیا مگر دستیاب نہیں ہوا
شاید کبھی ہاتھ لگ جائے۔ فی الحال معدوم سمجھا جائے۔

۲۶ے مطابق ۱۸۸۶ء = ۱۳۰۲ھ

۲۷ے اس شعر کے دوسرے مصرعے کو "بستہ در سخن چو ثنائی الرشد"
پڑھنا چاہیئے۔ یہاں اللہ = الہ = ۳۶ شمار کر کے مصرعہ
کے عدد ۱۹۵۱ء برآمد ہوں گے۔ اس میں سے دو = ۱۰
نکال کر ۱۹۴۱ بکرمی مستخرج ہوگا ۱۹۴۱ب = ۱۸۸۵ء

۲۸ے بے صبر کے بیٹوں اور پوتوں کے نام سے پہلے سری لکھنے سے
نام مکمل ہوتا ہے۔ مگر ناموں کے ساتھ کہیں یہ لفظ لکھا گیا ہے
اور کہیں نہیں لکھا گیا، اس لئے سری برہا سروپ بھی درست ہے
اور صرف برہا سروپ بھی۔

۲۹ے ۱۸۶۹ بکرمی = ۱۳-۱۸۱۲ء۔ اس لئے ۱۸۱۰ء درست نہیں

۳۰ے دیریندر پرشاد سکینہ بدایونی۔ ہماری زبان کے ۸ر دسمبر ۱۹۶۰ء
کے شمارے میں اضافہ کرتے ہیں کہ: "بے صبر نے محلہ خندق شہر
میرٹھ میں ایک عالی شان مکان بنوایا تھا۔ اسی مکان میں آپ کی
وفات ہوئی۔ یہ مکان آپ کے وارث اور پوتے بابو گردھر سروپ
کے قبضے میں ہے۔"

■■

رَو میں ہے رخشِ عمر ..... ص۴ کا بقیہ

کوئی اب خار تلووں سے نکالے بھی تو کیا حاصل
بہت کانٹے تو پیوستِ رگِ جاں ہو گئے ہوں گے

شدت احساس کا زنداں بھی ہے کتنا عجیب
اس میں دیواریں ہی دیواریں ہیں دروازہ نہیں

اب ضروری ہے کہ گلشن میں نشیمن اپنا
آتشِ لالہ و گل سے بھی بچایا جائے

مجرموں نے دامنِ انصاف میں پائی پناہ
ہم ہوئے معتوب جرمِ بے گناہی کے لیے

ڈھونڈتا ہے آدمی ٹوٹے مکانوں میں پناہ
تم کو وحشت کا کھلے منظر کی اندازہ نہیں

□□

خیر طلب
قاضی عبدالودود

یہ خط ۶ر فروری کو لکھا گیا لیکن آج ۱۶/۲ ڈاک گھر جا رہا ہے۔ دیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

حاشیہ از کاظم علی خاں :———

۱؎ یہ میری کتاب خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ طبع اول ۱۹۸۱ء کا ذکر ہے۔

——— (۱۳) ———

۱۶/۲ ۸۲ (بنام کاظم علیخاں ۱۶ر فروری ۱۹۸۲ء)

میری کتابیں برائے فروخت ظل عباس عباسی کے حوالے کی گئی تھیں۔ اسے کئی برس گزرے۔ قرینہ ہے کہ وہ ہضم کر گئے۔ آپ انھیں خط لکھ کر دیکھیں۔ میرے پاس کتب مطلوبہ کا کوئی زائد نسخہ نہیں۔

ق۔ ع۔ د

——— (۱۴) ———

(بنام کاظم علی خاں ۱۱ر مئی ۱۹۸۲ء)

ادارۂ تحقیقات اُردو۔ پٹنہ ۴
۱۱ر مئی ۸۲ء

عزیزی خوش رہیں، عمر دراز پائیں اور اُردو کی خدمت کرتے رہیں۔ صبا آتش کے بزرگ ترین شاگرد ہیں اور ان کا دیوان نہج جدید کے مطابق مرتب کر کے شائع کرنا چاہئے۔

آپ نے دیوانِ کیف سے متعلق دریافت کیا تھا اس کا مطبوعہ نسخہ میں نے کتب خانۂ دانش گاہ دہلی سے مستعار لے کر دیکھا تھا۔

میری صحت برسوں سے خراب ہے، وہ کتاب جو آپ نے بھیجی تھی، اب تک نہیں پڑھی ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

خیر طلب
قاضی عبدالودود

حاشیہ از کاظم علی خاں :۔

۱؎ یہ میری کتاب "خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ" طبع ۱۹۸۱ء کا ذکر ہے قاضی صاحب کا یہ خط میں شیعہ کالج میگزین صبا نمبر ۸۲-۱۹۸۱ء میں شائع کرا چکا ہوں۔

□□

"قد کے چھوٹے ہیں ہم"

چاہے جتنی زیادہ کڑاکے کی
ٹھنڈک پڑے
چاہے کہرے کی چادر ہو پھیلی یہاں
اور دن میں اندھیرا ہو کتنا گھنا
چاہے نازک بدن دھوپ کے لمس کو ہوں ترستے یہاں
اور پانی کی خواہش اٹھاتی ہو سر
چاہے تازہ ہوا گھر نما مقبروں کو میسّر نہ ہو
پھر بھی زندہ ہیں سب
ہم بھی ایسی ہی بستی کے پروردہ ہیں
قد کے چھوٹے ہیں ہم
اس لئے صاحبو.....

——— ملک زادہ جاوید
سی-۱۳۳۹، اندرا نگر
لکھنؤ

عربی کہانی

نجیب محفوظ

ترجمہ: ڈاکٹر اطہر نسیم صدیقی
... منزل، حیدر مرزا روڈ
لکھنؤ

خدا کی دُنیا

دفتر میں عمر ابراہیم کے داخل ہوتے ہی جیسے وہاں زندگی آگئی ـــ اس نے ایک کے بعد دوسری کھڑکی کھولی اور کمرے میں تیزی سے جھاڑو لگائی۔ اس دوران اس کا سر ایک مخصوص انداز میں ہلتا رہا اور اس کے گالوں کی حرکت سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ چبا رہا ہے۔ اس کا سر بالوں سے قطعی محروم تھا۔

پھر اس نے میزوں کی گرد جھاڑنے، فائلوں کو ترتیب سے رکھنے اور میز کا سامان درست کرنے کا کام انجام دیا۔ یہ کام ختم کرنے کے بعد اس نے کمرے پر ایک نظر ڈالی اور میزوں کی جانب اس طرح دیکھا جیسے وہ سارے اسٹاف کو وہاں بیٹھے دیکھ رہا ہو۔ ایک لمحے کو وہ مطمئن نظر آتا تو دوسرے ہی لمحے غیر مطمئن۔ وہ مسکرایا اور یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا "اب میں ناشتہ لینے جاؤں گا۔"

دفتر میں سب سے پہلے آنے والا احمد، فائلنگ کلرک تھا۔ وہ تقریباً ۵۰ برس کی عمر کا تھا لیکن اپنی عمر سے زیادہ نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر مسلسل ناپسندیدگی اور اکتاہٹ کے تاثرات رہتے تھے۔ دفتر میں داخل ہونے والا دوسرا شخص مصطفیٰ ٹائپسٹ تھا۔ وہ ہمیشہ ہنستا رہتا تھا لیکن اپنی اس ظاہری خوش طبعی کے پردے میں وہ اپنے تفکرات چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے بعد سمیر آیا جو "پُراسرار" شخص کہلاتا تھا۔ اس کے بعد بچوں جیسے معصوم چہرے والا الجندی داخل ہوا اور پھر لطفی نے اپنی آمد کا اعلان کیا جو بالکل چھیلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی انگوٹھی، گھڑی اور ٹائی پن وغیرہ سونے کی تھیں۔ پھر حامد آیا جو دبلا پتلا، نازک اندام اور غیر مجلسی شخص تھا۔ سب سے آخر میں آنے والا شخص ڈائرکٹر کمال تھا جسے اپنے وقار کا پوری طرح احساس تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں تسبیح لیے ہوئے تھا۔

اس کی آمد کے ساتھ ہی بظاہر سرگرمی شروع ہوگئی، آوازیں بلند ہونے لگیں اور کاغذات سرسرانے لگے۔ ڈائرکٹر نے خود کو ٹیلی فون میں مشغول کر لیا۔ اخبارات اس طرح کھولے جانے لگے جیسے مختلف پرچم ہوا میں لہرا رہے ہوں۔ لطفی نے سرخیوں پر نظر ڈالتے ہوئے لیکن بے توجہی سے کہا۔ "یہ سال دنیا کا خاتمہ دیکھے گا۔" ڈائرکٹر نے مسرت آمیز لیکن بلند آواز میں کہا۔ "بے وقوف مت بنو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میں کس قسم کا آدمی ہوں۔" سمیر نے سوال کیا: "ہم شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کی جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہیں؟ ایک نوجوان کے بارے میں خبر ہے کہ اس نے اپنی ماں کے سامنے اپنے باپ کو قتل کر دیا۔" احمد نے لقمہ دیا: "اگر تم دوا حاصل نہیں کر سکتے تو نسخہ لینے کی کیا ضرورت ہے؟" الجندی سڑک کے دوسری جانب ایک دواخانے میں دیکھ رہا تھا، جس کی کھڑکی میں ایک نوجوان نرس کھڑی تھی۔ لطفی نے اپنی بات دہرائی! "یقین کرو، دنیا کا خاتمہ اس سے زیادہ نزدیک ہے جتنا تم سوچتے ہو۔"

ڈائرکٹر نے ٹیلی فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر حامد سے کہا: "فائل ۳۰/۴۳ سال .... تیار کرو" اور دوبارہ اپنی دلچسپ گفتگو میں مصروف ہوگیا۔ حامد نے اپنا سر اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کی۔ وہ اخبار میں غرق رہا اور ساتھ ہی بڑبڑاتا بھی رہا۔

عمر ابراہیم ایک بڑے میں سنڈوچ لے کر لوٹا۔ اور انھیں

شات میں تقسیم کرنے لگا۔ سب کے منہ چلنے لگے، لیکن ان کی نگاہیں بنے اپنے اخباروں سے چپکی رہیں۔ عم ابراہیم اپنی آنکھوں میں مایوسی لیے دروازے میں کھڑا ان لوگوں کو دیکھتا رہا۔ احمد نے اسے بلایا اور کہا "جاؤ ہماری تنخواہیں اور لسٹ لے آؤ۔" عم ابراہیم کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک گھنٹہ بعد ٹائیاں اور عطریات فروخت کرنے والا شخص آیا۔ اس کا طریقہ تھا کہ ہر ماہ کے ابتدائی دنوں میں وہ دفتر کا چکر لگایا کرتا۔ وہ میزوں کی درمیانی جگہ میں گھوم گھوم کر لوگوں کو اپنی اشیاء دکھانے لگا۔ مگر جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کی تنخواہ ملنے کے بعد وہ پھر آئے۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ مکھن فروش اپنی بقایا رقم وصول کرنے آپہنچا۔ مصطفیٰ نے ہنستے ہوئے کہا: "ابراہیم کے آنے کا انتظار کرو۔" وہ شخص دروازے کے قریب رک گیا اور اس کے ہونٹ اس طرح حرکت کر رہے تھے جیسے کہ وہ خاموشی سے دعا کر رہا ہو۔ اس دوران ٹائپ رائٹر کے تیزی سے چلنے کی آواز گونج رہی تھی۔ سمیرا اٹھ کر ڈائرکٹر کے پاس کچھ کاغذات دکھانے چلا گیا۔ سورج کی کرنیں پہلی مرتبہ کھڑکی کے اس حصہ سے کمرے میں داخل ہوئیں جہاں سے الجندی دواخانے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

ڈائرکٹر نے عم ابراہیم کو یاد کیا تو مصطفیٰ نے انھیں بتایا کہ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ اسی وقت احمد بولا: "اسے دیر ہوئی کیوں؟" "مکھن فروش دوبارہ آنے کے ارادے کے ساتھ چلا گیا۔ احمد نے کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں ادھر اُدھر دیکھا اور واپس آکر بولا: اس کا کوئی پتہ نہیں ہے آخر وہ دیر کیوں کر رہا ہے۔"

جب تیسرا گھنٹہ بھی گذر گیا تو احمد کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ بلند آواز میں بُرا بھلا کہتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ خزانچی کے پاس ابراہیم کو تلاش کرنے جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے چہرے سے غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا۔ وہ ایک گھنٹہ قبل لسٹ لے کر جا چکا ہے۔ وہ کہاں ہو سکتا ہے — بے وقوف کہیں کا۔؟

لطفی نے پوچھا: کیا اس نے اپنی تنخواہ لے لی ہے؟

سپاٹ لہجے میں جواب تھا۔ ہاں، یہ بات مجھے خزانچی کے کاؤنٹر پر معلوم ہوئی۔

ایک بولا۔ ہو سکتا ہے ہماری تنخواہیں لے کر آنے سے پہلے وہ خریداری کرنے چلا گیا ہو۔

کسی دوسرے نے لقمہ دیا۔ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ روزانہ کوئی نہ کوئی نئی بات لے کر آتا ہے۔

لیکن ان سب کے چہروں سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ ڈائرکٹر جو کافی عرصہ تک ایک نچلے درجہ کی آسامی پر کام کر چکا تھا، بہت خفا نظر آ رہا تھا۔ اس مختصر خاموشی کو مصطفیٰ نے اپنی مخصوص ہنسی سے توڑا۔ وہ بولا۔ اگر اسے راستہ میں لوٹ لیا گیا ہو۔

یہ جملہ سن کر سبھی لوگ اپنے مضطرب جذبات چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔

لطفی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "ممکن ہے اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔" لوگوں کے مایوس چہروں کو دیکھ کر اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اگر وہ کسی حادثہ کا شکار ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پورا سیکشن حادثے کی زد میں آگیا ہے۔

احمد نے تیزی سے اپنی بات جوڑی! صرف اس شخص کے علاوہ جس کے گھر میں خزانہ موجود ہو۔

اس کی اس رائے میں سبھی کی رضامندی شامل تھی۔ ڈائرکٹر اپنی میز پر اس 'پارکر' قلم سے کھٹ کھٹ کر رہا تھا جو اسے کسی خوشگوار موقع پر بطور تحفہ پیش کیا گیا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسروں کا کیا ذکر الجندی تک یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا، اس صورت میں رقم کا کیا ہوگا؟

لوٹ کی صورت میں؟

اس نعرے پر کوئی نہیں ہنسا۔ الجندی نے مزید ایک خدشہ ظاہر کیا: اور کسی حادثہ کی صورت میں؟

"سڑک پر بھیڑ بھاڑ کے باوجود اسے کڈ نیپ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر پولس اس کا پتہ لگا بھی لیتی ہے تو وہ اسے اس وقت تک لبنق

تحویل میں رکھے گی جب تک مکمل حقائق معلوم نہ ہو جائیں اور اس میں قیامت تک کا وقت لگ سکتا ہے۔"

چہروں پر سے خوش دلی کے تمام تاثرات غائب ہو چکے تھے۔ وقت اس سے بھی زیادہ سست رفتاری سے گزرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا جتنا بستر پر پڑے کسی مریض کو لگتا ہے۔ ایک آواز بلند ہوئی جو کہہ رہی تھی۔

"آج صبح کالی بلی نے کس کا راستہ کاٹا تھا؟"

احمد نے عم ابراہیم کی تلاش میں ہر سیکشن کا چکر لگایا لیکن جب وہ واپس آیا تو اس کے چہرے سے ناکامی ظاہر ہو رہی تھی۔ ڈائرکٹر بھی اسی مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ بے وقوف اچانک دروازے پر نمودار ہوگا اور ہر شخص اسے لعنت ملامت کرے گا۔ وہ مختلف قسم کے بہانے بنائے گا لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو اسے کیا کرنا ہوگا؟ لطفی کی بیوی تو دولتمند تھی، لیکن احمد جیسے لوگ کیا کریں گے؟ اس طرح کی بدقسمتی اس کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

مکھن فروش واپس آیا، لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنا منھ کھولتا ڈائرکٹر چیخ پڑا، صبر کرو! دنیا ختم نہیں ہوئی جا رہی ہے۔ ہم سب ایک سرکاری محکمہ کے افراد ہیں، یہ کوئی بازار نہیں ہے۔

وہ واپس لوٹ گیا۔ خبر سن کر دوسرے سیکشنوں کے لوگ بھی آ چکے تھے۔ انھوں نے اس واقعہ کو مذاق کے طور پر لینا چاہا مگر وہاں کا ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ان کے پر مذاق فقرے ان کے حلق میں ہی رہ گئے۔

تشویش میں اضافہ ہوا۔ تمام کام یکسر بند ہو گیا۔

احمد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا! "میرا دل کہہ رہا ہے کہ کوئی سنگین واقعہ ہوا ہے۔ ہم سب تباہ ہو چکے ہیں۔" وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور بولا! میں وزارت کے پورٹر سے اس کے بارے میں دریافت کروں گا۔" اور فوراً ہی وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے تمتما رہا تھا اس نے اعلان کیا' پورٹر بتاتا ہے کہ آج صبح ۹ بجے اسے وزارت کی عمارت سے نکلتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔" احمد نے مزید اطلاع دی۔ یہ تو کسی بھی سانحہ سے زیادہ بدتر ہے۔ وہ محض ڈیڑھ یا دو سو پونڈ کے عوض اپنی زندگی واپس نہیں خرید سکتا۔ حادثہ خدایا! کون جانتا ہے؟ یہ مہینہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

لطفی کو اپنی جانب وقتاً فوقتاً اٹھنے والی نگاہوں کا احساس تھا۔ دبی ہوئی آواز میں اس نے کہا! کیا تم خدا پر یقین رکھتے ہو؟ میں خدائے واحد کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مہینے کے دوسرے ہی دن سے میں خالی جیب گھومنے لگوں گا۔ میرے پاس کافی، چائے، سگریٹ یہاں تک کہ بس اور ٹرام کے ٹکٹ کے لیے بھی پیسے نہیں ہوں گے۔ اسکول میں پڑھنے والے بچے..... دوائیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں خدا! میرے خدا!

ایک بجے کے بعد ڈائرکٹر مایوسی کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی نشست چھوڑ دی، ہمیں جنرل سپروائزر کو مطلع کر دینا چاہیئے۔

جنرل سپروائزر نے بڑی بے توجہی کے ساتھ پوری کہانی سنی اور بولا! یہ ممکن ہے کہ آپ لوگوں کے تمام خدشات کے باوجود وہ واپس آجائے۔

"درحقیقت میں نے ہر امید ختم کر دی ہے، اب دو بجنے والا ہے۔"

جنرل سپروائزر نے متنبہ کرنے والے لہجہ میں کہا! آپ جانتے ہیں کہ آپ نے جو کیا ہے وہ غلط اور تمام ضابطوں کے خلاف ہے۔"

ڈائرکٹر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بڑبڑایا! تمام شعبے ایسا ہی کرتے ہیں۔

"ایک غلطی دوسری کو جائز نہیں کر دیتی ہے۔ آپ ایک میمو لکھ کر مجھے دیں اور میں اسے انڈر سکریٹری کو پیش کر دوں گا۔"

ڈائرکٹر نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا! "پورے عملے کو فوری طور پر تنخواہ کی سخت ضرورت ہے۔ اس سے قبل ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"ہمیں تنخواہیں نہیں ملی ہیں اور ہم نے لسٹ پر دستخط بھی نہیں کیے ہیں۔"

"جو کچھ ہوا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا پھر بھی آپ اپنی

ذمہ داری سے نکل نہیں سکتے ۔"

سکوت نے ماحول کو اور بوجھل بنا دیا تھا۔ ڈائرکٹر پوری طرح خالی الذہن تھا۔ جنرل سپروائزر ناراض ہو گیا تھا اور اس نے اپنی میز پر پھیلے کاغذات میں خود کو غرق کر لیا تھا۔ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ڈائرکٹر بوجھل قدموں سے باہری دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ کمرہ چھوڑتے ہوئے اسے سپروائزر کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا! "پولس کو مطلع کر دیجئے ۔"

دفتر کا پورا عملہ پولس تھانے جا پہنچا۔ ڈائرکٹر کمال نے پولس افسر کو شروع سے آخر تک پورا واقعہ سُنایا اور عم ابراہیم کے بارے میں ضروری اطلاعات فراہم کیں۔ سب سننے کے بعد پولس افسر نے کہا کہ پہلے تو پولس دیکھے گی کہ عم ابراہیم کسی حادثہ کا شکار تو نہیں ہو گیا ہے۔ پھر تفتیش کی جائے گی۔

دفتر کے لوگوں کو وہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لہٰذا وہ باہر چلے آئے۔ وہ سب اپنی اپنی گھریلو پریشانیوں کے سلسلہ میں فکر مند تھے۔ ڈائرکٹر اپنے گھر چلا گیا اسے پولس کے علاوہ کسی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ ٹائپسٹ اس مہاجن کے پاس چلا گیا جس سے اپنی ضرورت کے وقت کافی زیادہ شرح سود پر قرض لیا کرتا تھا۔ لطفی کی بیوی گھر کے اخراجات کے لیے رقم دینے کو راضی ہو گئی تھی مگر وہ اپنا جیب خرچ نکالنے کے لیے اسے بے وقوف بنانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ الجندی نے سوچا کہ وہ اپنے والد سے کہے گا کہ وہ دوبارہ ایک طالب علم مان کر اس کے اخراجات برداشت کر لیں۔ حمام اپنی بیوی کو اس بات کے لیے راضی کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی کوآپریٹو سوسائٹی سے قرض کی وہ رقم حاصل کر لے جسے انھوں نے اپنے ملبوسات پر خرچ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے لیے اسے کتنے ہی جھگڑوں اور آنسوؤں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ سمیر کا حال اتنا برا نہیں تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے رشوت نہ لی ہوتی تو وہ بھی بدترین صورتحال کا شکار ہوتا۔

فائلنگ کلرک احمد سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا اسے اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں تھی۔ پست ہو کر وہ گھر واپس آ گیا۔ اس نے خود کو صوفے پر گرا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی بیوی باورچی خانے سے کھانے کی خوشبو کے ساتھ اس کے قریب آئی اور فکر مندی سے بولی! کیا بات ہے؟ اس نے کہا! تنخواہ نہیں ملی۔ اس ماہ ہمیں تنخواہ نہیں ملے گی"۔ اس نے حیرت سے پوچھا! کیوں؟... مگر عم ابراہیم تو صبح تمھاری تنخواہ دے گیا ہے۔

احمد جیسے دوبارہ زندگی پانے والے شخص کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی اندر گئی اور نوٹوں کا ایک بنڈل لے آئی۔ احمد کو اپنی پوری تنخواہ مل گئی۔ خوشی سے پاگل ہو کر اس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اپنے دل کی گہرائیوں سے چلّایا! خدا تمھیں سلامت رکھے، عم ابراہیم! سلامت رکھے، سلامت رکھے!

پولس عم ابراہیم کے گھر جا پہنچی جہاں اس کی بیوی ملی۔ پولس نے جب اس سے اس کے شوہر کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کا شوہر ابھی وزارت سے نہیں لوٹا ہے اس کے فرار سے وہ قطعی بے خبر تھی۔ تلاشی لینے پر پولس کو اس کے کپڑوں میں حشیش کا ایک ٹکڑا مل گیا اور پولس اسے اپنے ہمراہ پولس اسٹیشن لے آئی۔ سوالات کے دوران اس نے بتایا کہ شروع میں اس کا شوہر بہت اچھا تھا۔ ان کے بچے بھی ہیں۔ جن میں سے ایک لڑکا سوئز نہر کے علاقہ میں کام کرتا ہے لیکن اس سے ان لوگوں کا اب کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔ دوسرے لڑکے کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ ایک بیٹی ہے، اس سے بھی شادی کے بعد کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔

اس نے اعتراف کیا کہ گذشتہ چند مہینوں میں عم ابراہیم میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ حالانکہ اب وہ ادھیڑ ہو چکا ہے، میں نے سنا ہے کہ وہ لاٹری بیچنے والی ایک لڑکی کی جانب راغب ہو گیا ہے جو فواد کیفے کے پاس اکثر آتی ہے۔ اسی وجہ سے میرا اس سے کئی بار جھگڑا بھی ہوا جس کے پڑوسی گواہ ہیں۔

پولس نے فواد کیفے پر چھاپہ مارا اور سگریٹ کے ٹکڑے جمع کرنے والے لڑکوں کو گرفتار کر کے تھانے لے آئی۔ ان میں کچھ بوٹ پالش کرنے والے بھی تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ گذشتہ چند مہینوں سے عم ابراہیم کیفے میں بالکل پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ کر ایک "انگریز لڑکی" کو دیکھا کرتا تھا۔

اس انگریز لڑکی سے ان کی مراد سترہ سالہ نیلی آنکھوں والی لاٹری فروش لڑکی تھی۔ عم ابراہیم اس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اس لڑکی کو ادھر سے گزرتے دیکھ لیا تھا اسی وقت سے وہ کیفے میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا تھا۔ وہ لاٹری کا ٹکٹ خریدنے کے بہانے لڑکی کو اپنے پاس بلاتا مگر ٹکٹ کبھی نہ خریدتا، اس کا مقصد تو لڑکی کو بس اپنے قریب بلانا ہوتا۔

لڑکی نے عم ابراہیم کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو بتا دیا تھا وہ سب عم ابراہیم کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ لیکن اچانک لڑکی بھی کیفے سے غائب ہوگئی تھی۔

پولس نے اتنی معلومات حاصل کرکے سمجھ لیا تھا کہ معاملے کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ مگر دوسرا سرا ابوقیر کے ساحل پر موجود تھا۔

اس کی نگاہیں بار بار یاسمین کی جانب اٹھ جاتیں جس کی زلفیں ہوا میں اُڑ رہی تھیں۔ جامہ زیبی نے یاسمین کی خوبصورتی اور جوانی کو دوبالا کر دیا تھا۔ اس نے بھی بڑی نفاست سے شیو بنایا تھا اور اس کے سر پر دودھ جیسی سفید ٹوپی تھی۔ اس کے چہرے سے بے فکری ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ دونوں اپنی محبت کی دنیا میں مگن تھے۔

عم ابراہیم نے اس سے قبل ابوقیر کے بارے میں لطفی سے محض سُنا ہی تھا جو ہر سال چھٹیاں گزارنے وہاں جاتا تھا۔ آج اسی ساحل کا پورا لطف خود ابراہیم اٹھا رہا تھا۔ وہ یہاں ہنی مون منانے کی پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے محض ایک ہفتہ میں اتنا خرچ کر ڈالا تھا جتنا وہ پورے سال میں کرتا تھا۔ لیکن اس کی محبوبہ کے مطالبات ختم ہی نہ ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنی فرمائشوں سے اس کا ناطقہ بند کیے تھی بلکہ وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں مضحکہ خیز جملے بھی کس دیتی۔ عم ابراہیم اس کے باوجود خوابوں کی اس دنیا سے اس وقت تک نکلنا نہیں چاہتا تھا جب تک کہ اس کی پائی پائی خرچ نہ ہوجائے۔

عم ابراہیم کو یہاں لطف اندوز ہوتے ہوئے اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ ساحل پر چھٹیاں گزارنے والا پہلا کنبہ آ پہنچا تھا۔ عم ابراہیم کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے سوچا کہ میری خوشی کے یہ لمحات جلد ہی ختم ہونے والے ہیں۔ اس احساس نے اسے یکے بعد دیگرے سگریٹ پینے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران اس نے لطفی کو ایک مکان ایجنٹ کے ہمراہ بازار میں دیکھ لیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اور وہ جلدی سے ایک گلی میں گھس گیا۔ لطفی کو دیکھ کر عم ابراہیم کو اپنے خوابوں کا محل گرتا ہوا نظر آیا۔ حالانکہ وہ خوابوں کی اس دنیا سے باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنی محبوبہ کے لیے خدا سے دعا مانگی۔

جب وہ تنہا ہوا تو اس نے اپنی بقیہ رقم کا شمار کیا اور اسے مضبوطی سے اپنی کمر کے گرد باندھ لیا۔ اسی وقت اسے دروازے کے قریب قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو وہی لڑکی دکھائی دی۔ عم ابراہیم کو بار بار یہ خیال آتا کہ "اس لڑکی کو رقم دے کر آزاد کر دے"! وہ اسی تگ و دو میں مبتلا تھا کہ اس نے اپنے بدن پر لڑکی کا ہاتھ ایک سانپ کی طرح محسوس کیا، اسے جلد اندازہ ہوگیا کہ لڑکی اس کی رقم ہتھیانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ابراہیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ چیخ پڑی۔ اس کے بعد سکوت ہوگیا۔

کچھ دیر بعد ابراہیم نے سوال کیا! کیوں؟ پھر اس نے مزید پوچھا کیا میں نے تمھیں کسی چیز کے لیے کبھی منع کیا ہے جس کی تم نے خواہش کی ہو؟ لڑکی نے اچانک اس کے ہاتھ میں زور سے کاٹ لیا۔ ابراہیم کراہ اٹھا اور اس نے لڑکی کو دھکا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ابراہیم اس کے ساتھ سختی اور تشدد سے پیش آیا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور بتی جلا دی۔ پہلے اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے منھ سے نکلا! اتنی کم عمر اور اتنی بدطینت! ایک لمحہ کے لئے لڑکی نے اس کی جانب دیکھا اور بغیر کچھ کہے ہوئے اپنے بے پناہ غصے کا اظہار کیا۔ "میرے پاس جو کچھ ہے اس سے زیادہ کی مجھے خواہش نہیں ہے۔ خدا تمھیں اجر دے!" ابراہیم بولا۔

صبح کو اس نے بقیہ رقم لڑکی کے حوالے کی، اس کے ملبوسات پیک کیے اور اپنے ہمراہ اسٹیشن لے گیا۔ وہ ابوقیر جو اب تک بیابان لگ رہا تھا، اب وہاں چھٹیاں گزارنے والے آنے لگے تھے۔ وہ گھومتا ہوا اسکندریہ جا پہنچا۔ ایک بار اس کا گزر ابوالعباس مسجد کے سامنے سے ہوا۔ وہ مسجد میں داخل ہوگیا اور دعا مانگنے لگا، وہ خدا سے کہہ رہا تھا، تو بے شک اس سے خوش نہیں ہے جو کچھ میرے

(باقی آئندہ)

دعائے رنگ و نور

نہ جانے کیا ہے؟ آخر کیوں قلم ساکت ہے ہاتھوں میں
یہ آخر کس ہوائے وقت کا جھونکا اِدھر آیا؟
شناسا، دوست، احباب اور ہم مجلس سبھی چہرے
خدا معلوم کیا گزری؟ یہ کیسے رُوپ دھائے ہیں؟
کہیں برکھا عبیروں کی، گلالوں کے کہیں نقشے
کہیں مل کر گلے پیروں پہ اک تعظیم سجدہ ہے
جبیں پر ایک افشاں ہے، سنہری ہے کہیں سیمیں
زِ سر تا پا قدم ہر چیز پر رنگ تغیر ہے
کہیں سبزی، کہیں لالی، کہیں نیلا، کہیں پیلا
کسی جا سرخ انگارے، کہیں تاریکیٔ شب ہے
کہیں معلوم ہوتا ہے دھنک سے رنگ برسے ہیں
کہیں نرگس، کہیں سوسن کہیں چمپا نکل آئی
گلستاں کے ہزاروں رنگ گویا ایک ہی شب میں
منظم طور پر کچھ لوگ جیسے لوٹ لائے ہیں

تذبذب، شبہ اور تشکیک نے جب کروٹیں بدلیں
مرے احساسِ خفتہ کی اچانک کھل گئیں آنکھیں
تخیل تلملا اُٹھا، تصور کو ہنسی آئی
کہا ذہنِ رسا نے مسکرا کر "آج ہولی ہے"
سمجھ بولی، "یہ سارے رنگ وقتی رنگ ہیں بی بی"
یہی دس پانچ گھنٹے صرف ان کی زندگی ہوگی

یہ سب سورج کے ڈھلتے ہی ہوا کے ساتھ اُڑ لیں گے
اِدھر غسل و طہارت نے انھیں للکار کر دیکھا
سبھی کافور ہو جائے گی جو کچھ رنگ و رونق ہے
انھیں کیا سوچنا یہ سارا اک وقتی شگوفہ ہے۔

مگر فکرِ رسا نے یک بیک اپنی زباں کھولی!
کہا "اے شاعرہ! اک اور بھی تصویر اس کی ہے"
یہی جو رنگ چہروں اور کپڑوں پر نمایاں ہیں،
انھیں کا عکسِ رنگیں کاش دل پر بھی اتر آئے
دلی تاریکیاں سب دُور ہوں اور شیشۂ دل پر
نئی قوسِ قزح اُبھرے، نیا رنگِ شفق آئے
ہر انساں کے لیے پھر اشرف الناسی مبارک ہو
ہر انساں ایک دوجے کے لئے رحمت نظر آئے

نہ بھاگلپور کا قصہ سُنائے کوئی رو رو کر!
نہ کشمیر اور پنجاب اپنی آنکھوں سے لہو پونچھیں
نہ مندر اور مسجد روپ دھاریں قتل گاہوں کا
نہ امن و آشتی کے صاف ملبوسوں پہ دھبے ہوں

خدایا! اُمِّ ہانی کی دعا مقبول ہو جائے
تری رحمت کی وسعت کے لئے ہر چیز ممکن ہے!

ڈاکٹر رُخسانہ نکہت لاری اُمِّ ہانی
مقبول لاری منزل
نزد سٹی اسٹیشن لکھنؤ

سوکھا شجر

عمر کی یہ مُسافت
سفر در سفر
یونہی کٹتی رہی
زندگی در بدر
روز تازہ مناظر میں بٹتی رہی
ہم کہاں سے چلے تھے
کہاں آ گئے
خواب کتنے بکھے
کتنے دُھندلا گئے
ہاں مگر یاد ہے وہ گھنیرا شجر
جس نے پہلے پہل
میرے دل کی فصیلوں پہ سایہ کیا
میری معصوم خواہش کو بوسہ دیا
کتنے مسرور لمحات
کتنی خوشی
دو گھڑی کی رفاقت
فقط دو گھڑی
میں مسافر سفر میری تقدیر تھی
اس کا سایہ ہواؤں کی تحریر تھی
اور اب راہ میں
کوئی سُوکھا شجر
دیکھ کر سوچتا ہوں کہیں یہ مرا
منتظر تو نہیں؟

عامر ریاض
۲۴۴ ایم ایم آئی جی اسٹیٹ بنگلہ
سیتاپور روڈ ... سیکٹر ... لکھنؤ

غزلیں

آپ آئے تو مٹے ذہن کے اوہام کئی
شوق دیدار پہ تھے دید کے الزام کئی
جیسے پتھر کو تراشے ہے کوئی سنگ تراش
یوں تراشے ہے مرے نام پہ الزام کوئی
تیرے آنے کی خبر سن کے یہ محسوس ہوا
وہ انجم بھی اتر آئے لب بام کئی
شوقِ وارفتگی و کوچۂ جاناں کی قسم
تجلیاں ہوکے رہے دامنِ احرام کئی
اِس محبت میں ذرا ڈوب کے دیکھو شمعؔ
ایک عنواں ہے افسانے کا انجام کئی

—— شمعؔ کاکوروی
مکان ۱۲۱۴، وارڈ ۶ کٹرہ بازار
کاکوری لکھنؤ

سب ہیں کوشاں مکان کی خاطر
ہم ہیں اک آشیان کی خاطر
ریزہ ریزہ ہوئے بکھر بھی گئے
ایک نامہربان کی خاطر
کیوں کترتے کسی کے بال و پر
اپنی اونچی اڑان کی خاطر
کر نہ پائے تلاش چہرے
یارو اردو زبان کی خاطر
خود کو قربان کر دیا ہم نے
اپنے نام و نشان کی خاطر

قربان انصاری ——
محلہ بختیار، گورکھپور

ہوگا غم اور کیا کسی کے لئے
دل تڑپتا ہے آپ ہی کے لئے
محفلِ ناز کس لئے آخر
اب ترستی ہے روشنی کے لئے
آج سارے جہاں کو بھول گیا
درسِ عبرت ہے بیخودی کے لئے
اپنی آنکھوں کا جام دو مجھ کو
کچھ کرو میری تشنگی کے لئے
اے مجیبؔ ان کے آستانے پہ
سر جھکے گا تو بندگی کے لئے

—— مجیب بستوی
سریاواں بازار
ضلع بستی

جب بھی ہوتی ہے تو بس اتنی پریشانی مجھے
کھینچتا ہے اپنی جانب عالمِ فانی مجھے
اک ذرا سی آرزو میں حال کیا سے کیا ہوا
یاد آتی ہے تیری اے دل وہ نادانی مجھے
لذتیں جب سے ملی ہیں بے خودیٔ عشق کی
ہوش میں رہنا بھی اب لگتا ہے بے معنی مجھے
میں تو قائل ہوں حجابِ حسن کا کچھ اس قدر
باعثِ وحشت ہے جلووں کی بھی عریانی مجھے
دیکھتا ہوں جب بھی تیرے آئینے کو غور سے
خود نظر آتی ہے اکثر اپنی حیرانی مجھے

نریندر کمار سنافیقؔ ——
اے/۶۰۲ لال باغ کامپلکس
لکھنؤ

نئی سرکار جنتا کے دوار

اترپردیش کا ترقیاتی منظر نامہ

ادارہ

گورنر کے ہاتھوں ادیبوں اور شاعروں کو اعزاز

اترپردیش کے گورنر شری بی. ستیہ نرائن ریڈی نے یہاں سہکاریتا بھون میں کلاشری کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں شرکت کی اور لکھنؤ دوردرشن کیندر کے ڈائرکٹر شری ولایت جعفری، مشہور نقاد ڈاکٹر سلیم. صادق، معروف شاعر شری عنبر بہرائچی اور ادبی منچ کے جنرل سکریٹری شری سہیل کاکوروی کو نشان امتیاز دیئے.

گورنر نے اس موقع پر حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انسان کی زندگی میں فن کی بڑی اہمیت ہے. اس طرح اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انسان کا مختلف فنون سے زمانۂ قدیم ہی سے گہرا تعلق رہا ہے. وہ چاہے موسیقی ہو یا رقص، گلوکاری ہو یا مصوری، ادب ہو یا شاعری سبھی کا انسانی زندگی پر اثر پڑتا ہے حقیقت میں فن کے بغیر انسان کی زندگی بڑی بے کیف رہتی ہے فن ہی انسان کو سرشار کرکے اس کی زندگی میں نیا جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے اور ناامیدی کے اندھیروں میں امید کی روشنی لاتا ہے.

شری ریڈی نے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے اپیل کی کہ وہ تعمیری ادب پر زیادہ توجہ دیں کیونکہ ادبی یا شعری تخلیق" دل کو مسحور کر دینے والی موسیقی کا انسانی دل پر براہ راست اثر ہوتا ہے. فن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سماج کو جوڑنے کا کام کرتا ہے.

گورنر نے کہا کہ ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو اعزاز دینے کی روایت زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی ہے اور آزادی کے بعد بھی جاری ہے جس کی زندہ مثال آج کی یہ تقریب ہے. انھوں نے تقریب میں اعزاز پانے والے اترپردیش کے مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں کو دلی مبارک دیتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ سماج کی رہنمائی کرتے رہیں گے

مذہبی اختلافات کو فراموش کرکے انسانیت کی خدمت کے لیے سجادہ نشین پرعزم

پوری ریاست سے آنے والے خانقاہوں کے صوفی سنتوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ آپسی اختلافات کو فراموش کرکے انسانیت کی خدمت کریں. صوفیوں نے ایثار و قربانی اور ریاضت کے ذریعہ اس پیغام کو عام لوگوں تک پہونچاکر آنے والی نسلوں کی رہنمائی کی ہے.

قومی اتحاد خانقاہی مشن کے زیر اہتمام وزیر غذا و رسد اور مسلم اوقاف کی صدارت میں ان کی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک جلسے میں ریاست کی ۱۰۲ اہم خانقاہوں کے سجادہ نشینوں نے شرکت کی.

صوفی سنتوں نے اس بات پر زور دیا کہ اسلام کی مانند دیگر مذاہب نے بھی انسانیت اور قومی یک جہتی کے آدرشوں پر چلنے کا پیغام دیا ہے.

جلسے میں گنگا جمنی تہذیب کا روح پرور منظر اس وقت دیکھنے میں آیا جب صوفی سنتوں نے کہا کہ درگاہوں پر جانے والا ہر شخص وحدت کے تصور میں ضم ہو جاتا ہے.

وزیر غذا و رسد شری اعزاز رضوی نے آخر میں شرکا کے
اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ صوفی سنتوں نے جو بات کہی
وہ ملک کے ہندو مسلم عوام کے دلوں پر نقش ہوئی ہے اور آج بھی یہ
لوگ ان کی درگاہوں پر جاتے ہیں تو سب کے ساتھ یکساں سلوک
ہوتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ کسی بھی مذہب پر چلنے کی آزادی سب
کو ہے لیکن حب الوطنی سب سے بالاتر اور اسلام کا اہم حصہ ہے۔
آئندہ اپریل میں کل ہند سطح کے صوفی سنتوں کی ایک اور میٹنگ لکھنؤ
میں منعقد کی جائے گی۔

اس موقع پر قومی اتحاد خانقاہی مشن اترپردیش کے صدر کے
عہدہ پر شری اعزاز رضوی (وزیر مسلم اوقاف) اور جنرل سکریٹری کے
عہدہ پر شری شکیل الرحمن شمسی اور دیگر عہدے داروں کا انتخاب
عمل میں آیا۔

صحافی جمہوری نظام کے مضبوط محافظ

—— وزیر زراعت

اترپردیش کے وزیر زراعت شری گنگا بھگت سنگھ نے کہا کہ
پریس عوام اور حکومت کے درمیان پیغام رسانی کا بہترین ذریعہ
ہے۔

وزیر زراعت نے سلطان پور میں منعقدہ علاقائی صحافی سیمینار
کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ حکومت پریس کی آزادی پر پابندی
عائد کرنے اور عوام تک صحیح معلومات پہونچانے میں رکاوٹ
پیدا کرنے کی مخالف ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت پریس کی آزادی اور
غیر جانبداری کی روایت کی حامی ہے۔

وزیر موصوف نے صحافیوں سے اپیل کی کہ حکومت کو درپیش
چیلنجوں کا سامنا کرنے اور ترقیاتی پروگراموں کے لئے موافق ماحول
بنانے میں حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔

ریاست کے سبھی مواضعات میں نوجوان اور خواتین فلاحی دستوں کا قیام

حکومت اترپردیش نے ریاست کی سبھی گاؤں سبھاؤں میں یووک
منگل دل اور مہیلا منگل دل تشکیل کرنے کا نشانہ مقرر کیا ہے۔ اس وقت ۴۲ ہزار
۲۰۳ یووک منگل دل اور ۳ ہزار ۸۴۸ مہیلا منگل دل سرگرم کار ہیں جن میں
۳۵ ہزار ۹۶۷ یووک منگل دل اور ۱۵ ہزار ۳۳۳ مہیلا منگل دل سوسائٹی
رجسٹریشن ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہیں۔

اترپردیش کے وزیر نوجوان بہبود اور سیاحت شری کیدار سنگھ فونیال نے
یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ ان دستوں کو کھیل کود کے سامان اور رکھ رکھاؤ
کے لیے فی دستہ ایک ہزار روپے کی امداد دی جاتی ہے۔ انھوں نے
یہ بھی بتایا کہ مہیلا منگل دلوں کی تشکیل اور اس میں خواتین کی زیادہ سے
زیادہ حصہ داری کو یقینی بنانے کی غرض سے ہر بلاک میں رضاکار
خواتین اداریے سرگرم کار ہیں۔ ان کو پانچ سو روپے ماہانہ اعزازیہ
دیا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کے پیچھے نہ بھاگیں
وزیر غذا کی اپیل

اترپردیش کے وزیر غذا و رسد شری اعزاز رضوی نے طلباء
سے اپیل کی ہے کہ وہ مغربی تہذیب کا دامن چھوڑ کر ہندستانی تہذیب
کے آدرشوں پر عمل پیرا ہوں اور خود کو ہندستانی کہلانے میں فخر
محسوس کریں۔

وزیر غذا ادم ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب کے
موقع پر طلباء اور طالبات کو خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے سماج میں
بڑھتی ہوئی مغرب پرستی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہی رجحان
سماجی قدروں کے زوال کا خاص سبب ہے۔

شری رضوی نے کہا کہ جاپان، جرمنی اور فرانس وغیرہ ترقی کے

بتیاں کو مجبور ہے ہیں اور اپنی تہذیب و تمدن اور زبان کو اپنائے ہوئے ہیں جبکہ ہم انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو کانوینٹ طرز تعلیم کے راستے پر لے جا رہے ہیں۔

وزیر موصوف نے کہا کہ لوگ اپنی تجارت کے فروغ کے لئے اپنی دکانوں پر تعویذ اور مورتیاں رکھتے ہیں لیکن جب تول کر گاہک کو سامان دیتے ہیں تو بیشتر کم تولتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب کسی بھی صورت میں دھوکہ دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ سبھی نے اسے جرم قرار دیا ہے۔

اس موقع پر سوسائٹی کے منیجر خواجہ یونس، ڈائرکٹر شری ایم اے فاروقی اور پرنسپل شریمتی اعظمی وغیرہ نے وزیر موصوف کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کو یقین دلایا کہ ہندی میڈیم سے ہی وہ اپنے اسکول کے تعلیمی معیار کو بلند کریں گے۔ اس موقع پر طلباء نے کلچرل پروگرام بھی پیش کیا۔

۲۰ ہزار میٹرک ٹن گیہوں ۲۵ء۴ روپے فی کلو کی شرح سے عوام میں تقسیم کرنے کی ہدایت

کھلے بازار میں گیہوں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر قابو پانے کی غرض سے ۲۰ ہزار میٹرک ٹن گیہوں ۲۵ء۴ روپے کی شرح سے عوام میں تقسیم کرنے کی ہدایت ریجنل فوڈ کنٹرولر کو دے دی گئی ہے۔

اس گیہوں کو راشن کارڈ ہولڈروں میں ۵ کلو فی یونٹ کی شرح سے اترپردیش ریاستی غذا و لازمی اشیاء کارپوریشن، اترپردیش صارفین امداد باہمی یونین اور اترپردیش ریاستی ملازمین بہبود کارپوریشن کے توسط سے تقسیم کیا جائے گا۔

ریاستی حکومت نے لکھنؤ کو ۲ ہزار میٹرک ٹن، آگرہ کو ۲ ہزار ... میٹرک ٹن، میرٹھ کو ۲ ہزار ۵ سو میٹرک ٹن، الہ آباد کو ۲ ہزار میٹرک ٹن، مرزاپور، سون بھدر، باندہ اور ہمیرپور کو بالترتیب ۵ سو میٹرک ٹن۔ کانپور، علی گڑھ، غازی آباد اور گورکھپور کو بالترتیب ایک ہزار ۵ سو میٹرک ٹن۔ فیض آباد اور جھانسی کو بالترتیب ایک ہزار میٹرک ٹن۔ جالون کو ... میٹرک ٹن اور للت پور ضلع کو ۲۵۰ میٹرک ٹن گیہوں الاٹ کیا ہے۔

یاد رہے کہ سرکاری سستے غلے کی دکانوں کے توسط سے بھی اس ماہ فروری میں ۲۰ ہزار میٹرک ٹن گیہوں عوام میں تقسیم کرایا جا رہا ہے۔

امداد یافتہ ہائر سکنڈری اسکولوں / انٹر کالجوں کے غیر تدریسی ملازمین کو ترقیاتی شرح تنخواہ

حکومت نے سمتا کمیٹی اترپردیش ۱۹۸۹ء کی سفارشات پر کیے جانے والے فیصلے کے مطابق ریاست کے امداد یافتہ ہائر سکنڈری اسکولوں اور انٹر کالجوں میں غیر تدریسی عہدوں پر ترقی یا اس سے آگے کی شرح تنخواہ منظور کی ہے۔

یہ اطلاع دیتے ہوئے ریاست کے وزیر ثانوی تعلیم شری راج ناتھ سنگھ نے بتایا کہ اس فیصلے سے ایسے غیر تدریسی ملازمین کو جو باضابطہ ہوں اور انھوں نے ایک عہدے پر ۱۶ سال تک تسلی بخش خدمات انجام دی ہوں (جس میں چھ سال کی خدمات سلکشن گریڈ میں ہوں) اور جن کی شرح تنخواہ ۳۵۰۰ روپے سے زائد نہ ہو، یکم جنوری ۱۹۸۶ء سے نظرثانی شدہ شرح تنخواہ میں ترقی یا اس سے آگے کی شرح تنخواہ انفرادی طور پر یکم جنوری ۱۹۹۲ء یا اس کے بعد کی تاریخ سے دی جائے گی۔

تعلیمی ادارے تہذیب و تربیت کا مرکز بنیں ——— بالیان

"تعلیم یافتہ انسان ہی اچھا شہری بن سکتا ہے اور ملک کی تعمیر میں مثبت رول ادا کر سکتا ہے۔" ان خیالات کا اظہار وزیر امداد باہمی شری سدھیر کمار بالیان نے رویندرالیہ میں ڈی اے وی پبلک اسکول اندرا نگر کے سالانہ جلسہ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ درس و تدریس کا پیشہ مقدس ہے اور اساتذہ ہی ملک کے معمار تیار کرتے ہیں۔

انھوں نے سوامی دیانند سرسوتی کو جدید ہندوستان کا معمار اور رہبر قرار دیتے ہوئے کہا کہ سوامی جی کے آدرشوں اور ان کے افکار و خیالات کو عوام الناس تک پہونچانے میں ڈی اے وی اداروں نے

اہم کردار ادا کیا ہے جو اب ایک تعمیری تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ شری [illegible] نے کہا کہ طلباء میں قومیت اور اخلاقی قدروں کو فروغ دینے والے ان اداروں کو فعال اور موثر تحریک کے طور پر بڑھاوا دینے کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر شری بالیان نے ہونہار طلباء وطالبات کو انعامات بھی تقسیم کیے۔

اتراکھنڈ کے بُکسا قبائل کی فلاح کیلئے ۲٫۸۸ لاکھ روپیے

رواں سال کے دوران اتراکھنڈ علاقے کے بُکسا قبائل کی ترقی وفلاح کے لئے ریاستی حکومت نے خصوصی اسکیم کے تحت ۲٫۸۸ لاکھ روپئے منظور کیے ہیں۔

وزیر ریاست برائے اتراکھنڈ وکاس شری پورن چندر شرما نے یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ مذکورہ بالا پروگراموں کے تحت گرانٹ مقررہ عمر کے افراد کو اس طرح دی جائے گی کہ غریب ترین شخص سب سے پہلے مستفید ہو۔ اس رقم میں سے نینی تال اور دہرہ دون اضلاع کو ایک ایک لاکھ روپئے اور ضلع پوڑی کو ۸۰ ہزار روپئے الاٹ کیے گئے ہیں۔

بمبئی، کوچین، بنگلور اور نئی دہلی میں اترپردیش کی دستکاری کی نمائش

ریاست کی شہری و دیہی علاقوں کی روایتی دستکاریوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اور بیرون ریاست ان کی مقبولیت میں اضافہ کرنے کی غرض سے اترپردیش خواتین بہبود کارپوریشن نے بمبئی، کوچین، نئی دہلی اور بنگلور میں نمائشوں کا اہتمام کیا ہے۔

یہ اطلاع ریاست کے وزیر سماجی بہبود اور ترقی خواتین واطفال شری رامجی شاستری نے دی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ریاست سے باہر چار مقامات پر نمائش کے انعقاد کے لیے حکومت نے چار لاکھ روپئے منظور کیے ہیں۔ یہ رقم دستکاروں کی آمد ورفت، قیام اور ترویج وتشہیر وغیرہ پر صرف کی جائے گی۔ نمائش میں لکھنؤ کی چکن، زردوزی، کامدانی اور بلاک پرنٹنگ کے علاوہ بجنور اور شاہجہاں پور کی اونی، سوتی دریاں بھی دکھائی جائیں گی۔

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹۔ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ نیا دور کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کی جارہی ہیں:

(۱) مقام اشاعت : ——— لکھنؤ

(۲) وقفۂ اشاعت : ——— ماہوار

(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ : شری راجیو اروڑہ۔ ہندستانی۔ یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس۔ گوتم بدھ مارگ، لکھنؤ

(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ : شری انل سروپ۔ ہندستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ۔ اترپردیش، لکھنؤ

(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ : شری سید امجد حسین۔ ہندستانی۔ محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ۔ اترپردیش، لکھنؤ

(۶) ان اصحاب کے نام اور پتے جو اس رسالہ کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایہ کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔ } نیا دور سرکاری جریدہ ہے، اس لیے اسکے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدہ کے مالک یا حصہ دار ہیں، یا ساری پونجی کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصہ دار ہیں، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں انل سروپ اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) انل سروپ (پبلشر)

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: جہانِ افکار

مصنف: ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی قیمت: ۴۵ روپے

ملنے کے پتے: (۱) نوشین پبلیکیشنز۔ ۴-۶-۴۳۔ موتی مارکیٹ حیدر آباد ۲۰

(۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی - ۶

جہانِ افکار ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی کے بیس تنقیدی تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں مختلف النوع موضوعات پر مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ شروع میں "ضرب خانقاہ" کے عنوان کے تحت، ڈاکٹر گیان چند جین کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں انھوں نے سید مجاور حسین رضوی کے شخصی صفات اور تحریری اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مقدمے میں ایک جگہ انھوں نے تحریر کیا ہے:

"ان کا قلم اور روح دراصل ایسے ہی موضوعات میں کھلتی ہے جہاں وہ لفظوں کے گل بوٹے بنا سکیں ـــ ادبی مضامین میں بھی بار بار ان کا قلم انشائیہ سازی کی طرف لپک جاتا ہے۔"

تنقید و تحقیق میں انشائیہ نگاری کا کیا محل ہے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر ان کے مضامین کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو شعر و ادب کے سرمائے پر ان کی گہری نظر ہے اور وہ اپنے مخصوص طرز نگارش میں ایسے نکات آسانی سے بیان کر دینے پر قادر ہیں جن کو معاصرین نے زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھا۔ مثلاً اقبال کی شاعری میں "نگاہ" کی کارفرمائیاں اور ان کا "تصورِ سجدہ"۔ اقبال کے یہاں "نگاہ" کی کارفرمائیوں کا عہد بہ عہد جائزہ لے کر انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ارتقائی راہیں طے کرتی ہوئی ایسی منزل پر پہنچ جاتی ہے جہاں حجابات کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور اول و آخر، ظاہر و باطن نیز من و تو کا فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح اقبال کے تصورِ سجدہ میں انھوں نے "سجدے" کی مختلف جہات کا جائزہ لے کر، اقبال کے تصورِ الٰہ کی روشنی میں اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

"بجھتے چراغ کی لو" میں سید مجاور حسین رضوی نے لکھنؤ کے ایک نسبتاً کم مشہور شاعر، صبا کے کلام کا جائزہ لے کر ان کی خصوصیاتِ شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ تذکروں میں یوں تو رند کے ساتھ ساتھ صبا کا نام بھی آجاتا ہے مگر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو ان کے کلام میں بامزہ اشعار کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ رضوی صاحب نے اس مضمون میں اس الزام کی تردید کرتے ہوئے ان کے کئی اشعار ایسے پیش کیے ہیں جو نہ صرف بامزہ اور پرلطف ہیں بلکہ یہ ضرب المثل بھی بن گئے ہیں مثلاً صبا کے یہ اشعار

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب، اگلے زمانے والے

دل میں اک درد اٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

اس میں شک نہیں کہ بہت سے لوگوں کو یہ اشعار ازبر ہوں گے مگر ان کے شاعر کا نام شاید ہی معلوم ہو۔ پس منظر کے طور پر اس مضمون میں سید مجاور حسین رضوی نے لکھنؤ کے اس وقت کے ماحول کی جو منظر نگاری کی ہے اس سے ان کی "انشائیہ سازی" کا نمونہ بھی سامنے آجاتا ہے:

"یہ بانکا شہر جیالوں کا شہر ہے، آزاد مشربوں کا شہر ہے۔ یہاں مذہبی اختلافات نہیں ہیں، رواداری اور وسیع النظری ہے۔ خاکساری میں سرفرازی بھی جاتی ہے، کہیں مصافحہ، کہیں معانقہ، تہذیب اور جامدانی کے انگرکھے، نیمہ کا جامہ، کسی نے بھوؤں پر ٹوپی رکھ چھوڑی ہے، کوئی بٹیریں ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔ کہیں مشاعرے ہو رہے ہیں، ...... کہیں علامہ درس دے رہے ہیں، کہیں مجلسیں ہو رہی ہیں۔"

"ہندوستان میں مشترکہ کلچر (تعارف و تاریخ)" میں سید مجاور حسین نے کلچر اور تہذیب کے فرق کو نمایاں کرتے ہوئے دقتِ نظر سے کام لیا ہے اور کلچر کے اجزائے ترکیبی پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

اس کتاب میں ان کا ایک اور اہم مضمون "خطابت اور شعر" ہے

میں انھوں نے شاعری میں خطابت کی اہمیت اور افادیت سے بحث کی ہے۔ آج کل شاعری میں خطابت کو مذموم سمجھا جانے لگا ہے کیونکہ شاعر ... ہے نہ مصلح یا مذہبی رہنما۔ شاعر اپنے گرد و پیش کی زندگی سے جو اکتساب اور انجذاب کرتا ہے اس کی جمالیاتی بازیافت شاعری کا سرچشمہ ہے۔ البتہ مخصوص حالات میں شاعر رجز خواں بھی ہو سکتا ہے۔ آزادی سے قبل ایسے ہی حالات تھے جنھوں نے اقبال اور جوش کی خطیبانہ شاعری کی راہ ہموار کی۔ اقبال تو اپنے علوئے تخیل اور زبردست ملکۂ شاعری کے باعث دامن بچا لے گئے مگر جوش کی خطیبانہ شاعری گھن گرج اور لفظی بازیگری میں بدل کر نقادوں کی چین جبیں کا باعث بن گئی۔ رضوی صاحب نے خطابت کے اجزائے ترکیبی بیان کرتے ہوئے نتیجہ نکالا ہے کہ خطابت "جذبات کی تہذیب و تربیت اور سامعین یا قارئین کی ذہنی تشکیل، ہم نوائی اور ہم خیال بنانے کے لیے ضروری ہے۔ یہیں سے ایک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ خطابت میں مقصدیت ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔"

اس مجموعے کے دیگر اہم مضامین میں "فسانۂ عجائب کا جوگی"، "فراق کا وصال"، "خواتین اساتذہ کی ادبی خدمات" اور "عملی تنقید تدریسی نقطۂ نظر سے" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ عملی تنقید پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے مگر رضوی صاحب نے اس مضمون میں عملی تنقید کے مختلف النوع پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کی تمام جزئیات پر تسلسل سے روشنی ڈالی ہے۔

"جہانِ افکار" کے مضامین اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بیحد مفید ثابت ہوں گے اور ان کے مطالعہ سے بہت سے ایسے پہلو سامنے آئیں گے جو اب تک نگاہوں سے اوجھل تھے۔

——— نامی انصاری

نام کتاب: وامق جون پوری۔ شخص اور شاعر
مصنف: ایس۔ ایم۔ عباس قیمت: ۲۵ پچیس روپے
ملنے کا پتہ: ایس ایم۔ عباس ایڈوکیٹ۔ تارتلہ۔ جون پور

وامق جون پوری ہماری بزرگ نسل کے ممتاز شاعر ہیں۔ آنکھوں میں رکھنے والی ایسی شخصیات آہستہ آہستہ فضا کو بے نور کرتی جا رہی ہیں۔

اب ایسے حضرات کا کوئی بدل نہیں۔ جس تہذیب نے ایسے دل نواز پھول کھلائے وہ خود کتابوں میں اپنے کو سمیٹ رہی ہے۔ جن قدروں نے ان کو پُرکشش بنایا اور ہمہ گیری عطا کی اب وہ افسانوی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ یہ ایسا حالات ایسے ترشے ہوئے پیکر جیب تک رونقِ حیات و کائنات ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ نہ صرف اُن کے ادبی کارناموں کو خراجِ عقیدت پیش کریں بلکہ اُن کی زندگی کے تمام گوشوں کو محفوظ کریں۔ جس سے آنے والی نسلیں اپنے اکابرین کی عظمت و اہمیت سے روشناس ہو سکیں۔ ہماری مُردہ پرستی ضرب المثل ہے۔ مگر یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ جناب ایس ایم۔ عباس ایڈوکیٹ نے اپنے پیشے کی مصروفیات کے باوجود وامق صاحب پر ایک کام کر ڈالا اور نتیجے میں ایک اہم شاعر کی زندگی کتابی شکل میں سامنے آسکی۔

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے اور فہرست اس طرح ہے۔ وامق جونپوری ایک مطالعہ۔ ماضی کے جھروکے سے۔ افتادِ طبع۔ سیاسی و سماجی پس منظر اور وامق کے شعور کی نشو و نما۔ وامق کی شخصیت کے چند پہلو۔ وامق کا نظریۂ حیات و ادب۔ ترقی پسند شاعری کے رجحانات اور وامق جونپوری۔ ترقی پسند شاعری۔ چند الزامات اور غلط فہمیاں اور وامق۔ وامق، ترقی پسند شاعری سے نوکلاسیکی ادب تک۔ پہلے باب میں خاندانی حالات و ماحول پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے قیام علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی میں ملازمت کی تفصیل اُنھیں کے لفظوں میں سنیے۔

"علی گڑھ میں اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین کی سربراہی تھی، وہ بہت ہی ادب نواز اور ادیب دوست انسان تھے۔ وہاں کی ملازمت ذاکر صاحب کی تائید اور انگریزی کے استاد پروفیسر محمود حسین کی مساعی کی مرہونِ منت تھی۔ محمود صاحب مجھ کو بے حد عزیز رکھتے اور اکثر و بیشتر میرے کلام پر انگریزی ادب کے نقطۂ نظر سے تبصرہ بھی کیا کرتے۔ ان کا قول تھا کہ انگریزی زبان میں کوئی اوڈ (ODE) اتنی حسین نہیں لکھی گئی جتنی کہ اردو میں میری نظم "زمین" ہے۔"

ڈاکٹر سید فضل امام کے بقول:

"وامق کی شاعری، فکر و فن کا حسین امتزاج ہے۔ اس لیے اُن کی فکر عمیق اور فن بڑا البیلا اور دلکش ہے۔ بہ ... کافی

گمبھیرپن ہے۔ وامق کی شاعری دیر تک اور دُور تک ہماری زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی ہے اور چلتی رہے گی۔ وہ بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ نثر نگار بھی ہیں۔ "عوامی ادب" پر اُن کے مقالات بڑے معلومات افزا ہیں ؟

اس کتاب میں وامق جون پوری کی زندگی سے متعلق تمام واقعات یکجا کر دیے گئے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی میں اُن کی شمولیت۔ سجاد ظہیر سے قربت۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی۔ عادات وخصائل۔ پسند و ناپسند اور فکر وفن پر سیرحاصل بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف کی محنت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ وامق صاحب کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

______ رَباب رشیدی

نام کتاب: سُہانی بارش   شاعر: مسرور حسین سرور
قیمت: پندرہ روپے   ملنے کے پتے: (۱) ۱/۲۸۹، ہاتھی خانہ فتح گڈھ۔ ۲۰۹۶۰۱   (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی

"سہانی بارش" مسرور حسین سرور کا مجموعۂ کلام ہے اس میں بیشتر غزلیں ہیں۔ مجموعہ کی ابتدا حمد ونعت سے ہوتی ہے اس کے بعد غزلیں متفرق اشعار، دوہے اور منظومات ہیں۔ اپنے ذاتی تجربات مشاہدات کو سرور نے اپنی غزلوں میں ڈھال کر سُہانی بارش کا روپ دیا ہے۔

مرے آنگن کا یہ کچا گھروندا   سُہانی بارشوں کا ہم سفر ہے

موسمِ ہجر میں یہ راز بھی کھل جائے گا
زرد ہونا ہے کہ پتوں کو ہرا ہونا ہے

سرور نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کی عکاسی بڑے سلیقہ سے کی ہے۔ ان کے اشعار ان کے جذبات و دلی کیفیات کے آئینہ دار ہیں ۔

بہت مشکل ہے دامن کا بچانا
لہو کرنا بھی دل کا اک ہنر ہے

سرور کے یہاں جدت اور کلاسیکیت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ جذبات اور فکر کو بڑی خوبی سے ہم آہنگ کرتے ہیں، انھیں ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ ۔

لفظوں کو نیلام نہ کرنا   لہجے کو معیاری رکھنا

سادگی اور روانی سے بھرپور غزلوں کے علاوہ سرور کے دوہے بھی عام فہم ہوتے ہیں جن میں کہیں کہیں ہندی کے شیریں الفاظ کا استعمال بھی ہوتا ہے ۔

کون کسی کا میت ہے، جھوٹا ہے سنسار
تتلی بھنورے سب کریں، پھولوں سے دیا پیار

سرور کی شاعری ان کے تجربات، مشاہدات، جذبات اور دلی کیفیات کا عکس ہے جن میں سادگی بھی ہے اور روانی بھی۔ اور یہی صفات ان کے کلام کو مقبولیت بخشنے کے لیے کافی ہیں۔

______ اخلاق احمد

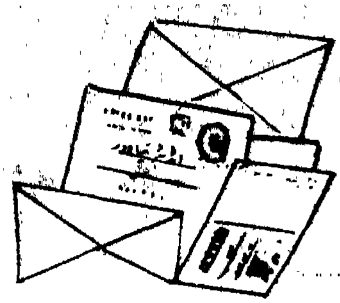
خدا کی دُنیا ...... ۳۸ کا بقیہ

ساتھ ہوا ہے اور نہ ہی اس سے جو کچھ ہر جگہ ہو رہا ہے۔ نوجوان، خوبصورت اور بدطینت! کیا تو مطمئن ہے! اور میرے بیٹے، وہ کہاں ہیں؟ کیا تو اس پر بھی مطمئن ہے؟ پوری دنیا میرے خلاف ہے محض اس لیے کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں؟ کیا تو مطمئن ہے؟ میں زبردست تنہائی محسوس کر رہا ہوں حالانکہ میں لاکھوں انسانوں کے درمیان ہوں۔ کیا تو خوش ہے؟

اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

جب وہ مسجد سے نکل رہا تھا تو اسے اپنا نام لے کر پکارتی آواز سُنائی دی! "عم ابراہیم!" اس نے مڑ کر حیرت اور بے بسی سے دیکھا ایک طویل القامت شخص اپنے چہرے پر فتح مندی کے تاثرات لیے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ یہ شخص جاسوس ہے۔ وہ رک گیا۔ اس شخص نے اس کو بازو سے پکڑ لیا اور بولا! تمھیں تلاش کرنے میں ہمیں کافی دشواری پیش آئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دھکا دیا۔ ابراہیم نے کسی قسم کی مدافعت نہیں کی۔ پولس والے نے کہا! اس عمر میں ایسا بُرا کام کرنے کے لیے کس چیز نے تمھیں رغبت دلائی! ابراہیم نے ایک انگلی اٹھائی اور گہری سانس لینے کے انداز میں اس کے منھ سے نکلا! خدایا!

□□



ہمارے نام.....

مجھے نیا دور دو تین مہینے سے برابر مل رہا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آئندہ بھی ملتا رہے۔ کیوں کہ ہر مہینہ اس میں کچھ نہ کچھ دلچسپ مضامین اور اچھی نظمیں مل جاتی ہیں۔ رسالہ بھیجنے کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں۔

—— پروفیسر زاہدہ زیدی
علی گڑھ

شکرگزار ہوں کہ مجھے نیا دور پابندی سے مل رہا ہے۔
یہ ایسا اہم رسالہ ہے کہ اسے پڑھے بغیر گزارہ مشکل ہے۔
اس لیے ازراہ کرم نیا دور مسلسل بھیجتے رہیے۔ میرے ذہن میں نیا دور کو بہتر بنانے کے سلسلے میں کچھ تجویزیں ہیں۔ انشاءاللہ کچھ عرصے میں آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔

—— خلیق انجم
جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی

نیا دور برابر مل رہا ہے۔ آپ نے نیا دور کے معیار کو بہت بہتر بنا دیا ہے۔ ترتیب اور طباعت بھی پہلے سے بہت اچھی ہے۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی بہت معیاری ہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود کا مضمون "اودھ کی تہذیبی تاریخ کی جھلکیاں" بہت دلچسپ مضمون تھا۔ اس سے اودھ کی تہذیب کے بعض اہم ماخذات کی نشان دہی ہوتی ہے۔ سردار احمد علیگ کا مضمون "مولانا آزاد اور فن موسیقی" بھی محنت سے ترتیب دیا ہوا مضمون ہے۔ "چاندنی بیگم" پر نامی انصاری کا مضمون اچھا تھا لیکن ضرورت تھی کہ اس کے بعض اور پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی جاتی، اس لیے مضمون تبصرہ بن کے رہ گیا۔ ڈاکٹر عبدالحلیم پر عابد سہیل کا مضمون ذاتی ہونے کے باوجود بہت پُراثر ہے۔

—— شارب ردولوی۔ دہلی

نیا دور برابر مل رہا ہے۔ پہلے سے اب بہتر طباعت ہے۔ گیٹ اپ نثری شعری گوشے دونوں معلوماتی اور خوبصورت ہیں۔ میں اپنی مصروفیت کی وجہ سے ادھر نیا دور کے لئے کچھ بھیج نہیں پایا۔ معذرت طلب ہوں۔
اگر نیا دور برابر ملتا رہے تو کرم ہوگا۔

—— بیکل اتساہی
ممبر پارلیمنٹ۔ دہلی

نیا دور ہر لحاظ سے ایک اچھا اور معیاری جریدہ ہے۔ اچھے مضامین کا انتخاب مدیر کی صلاحیتوں پر منحصر کرتا ہے۔ آپ نے اچھے مضامین منتخب کر کے شائع کیے ہیں جس سے آپ کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔
اگر مناسب سمجھیں تو ہر ضلع کا ایک ادبی گوشہ شائع کریں تاکہ اس ضلع کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں معلومات ہو سکے۔

—— عظیم اختر
نئی دہلی

نیا دور میں شائع ہونے والے مضامین اور شعری تخلیقات کے انتخاب اور ترتیب میں غیر معمولی ندرت، آپ کی خصوصی ادارتی صلاحیت کی مظہر ہے۔ آپ کی جانفشانی سے اس موقر جریدے کا معیار یقیناً بلند ہوا ہے۔ آپ کے اداریے بھی معلومات سے پُر اور ادبی و عوامی افادیت کے حامل ہوتے ہیں
اتنی کم مدت میں آپ نے نیا دور کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

—— راجندر بہادر موج
فتح گڑھ

□□